UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224080

UNIVERSAL
LIBRARY

OUP—880—5-8-74—10,000.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۶ ن۳۰۵ Accession No. U 974

Author نعیم

Title بہارِ نظر نعیم

This book should be returned on or before the date last marked below.

ندیم

بہار نمبر ۱۹۴۰ء

قیمت
دو روپے

مرتبہ

۷۸۶

رسولِ پاک

کا

ارشاد عالی ہے

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ

(علم کا طلب کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے)

پس آپ اپنے

قیمتی وقت کو ضایع نہ کریں۔ بلکہ فرصت کی گھڑیوں کو کتب بینی میں صرف کرکے

فلاح دارین حاصل کریں

شاعر اسلام زندہ جاوید

حضرتِ اقبال رح

و

تمام دیگر مصنفین کی تصانیف

اقبال بکڈپو پٹنہ

سے

منگائیں

ضروری اطلاع ← اس کے پڑھنے سے لاکھوں کا بھلا ہوگا

صاحبان! میں وہ حکیم ہوں نہ ڈاکٹر بلکہ ایک معمولی آدمی ہوں بدقسمتی سے مجھے اپنے ہاتھوں اپنی جوانی کا ستیاناس کر لینے کی عادت پڑ گئی تھی جسکے نتیجہ سے بچ رہا عرصہ ڈیڑھ سال کے بعد مجھے نامردی کا مرض لاحق ہو گیا۔ سرعت بریان، احتلام وغیرہ کی شکایتوں کے سبب میرا چہرہ دن بدن لاغر ہوتا جاتا تھا۔ سو کچھ دل ہر وقت ڈوبتا سر چکرانا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنا۔ گھبراہٹ سستی اور اداسی چھائی رہتی تھی دوست میری زردی کا سبب پوچھتے تھے مگر میں کسی کو اپنی حالت سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا مگر در پردہ مشہور شہروں کے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور حکیموں سے ادویات منگوا کر استعمال کرتا رہا۔ لیکن مجھے بالکل مخالف بھی فائدہ نہ ہوا بلکہ علاوہ خرچ کے کئی اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مایوسی کی حالت میں زندہ درگور ہونے کو ترجیح دیتا تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے ایک ملازمت میں پیشاوہ جانا ہوا۔ پشاور جس جگہ جا کر ٹھیرا اسی منظر صورت جو ہاں مقیم تھے مجھ سے پوچھنے لگے کہ تمہاری صورت مرغیوں کی سی کیوں ہے۔ میرے پر درد دل نے اس خضر صورت سے سارا ماجرا کہہ ڈالنے کی عادت کی چنانچہ میں نے یہی کہہ یا کہ اب میں زندگی سے ہتک آکر خودکشی کرنے پر آمادہ ہوں۔ اس فقیر صاحب کمال نے رحم فرما کر ایک نسخہ کھانے کیلئے مقوی گولیوں کا دوسرا نسخہ پچکاری اور پٹھوں کی سستی دور کرنے کیلئے مالش کا بتلایا۔ چنانچہ میں نے حسب ارشاد اس صاحب کمال کے لاتعداد ہتکی بڑی بوٹیاں اور کئی ادویات بازار سے خرید کر۔ دو ہفتہ کیا اور دو ہفتہ اس صاحب کمال کے تیار کرکے استعمال کرنا شروع کیا۔ ناظرین میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ کہتا ہوں کہ ساتویں روز ہی میری تمام شکایتیں رفع ہونی شروع ہو گئیں اور میں اپنے آپ کو قابل فخر مرد کہنے کا مستحق ہو گیا۔ اگرچہ مجھے چند ہی روز کے استعمال سے مکمل کرنا دشوار ہو گیا۔ مگر چونکہ ارشاد اپنے محسن خضر صورت کا مکمل سننا تھا اسی کے ۲۱ روز تک پرہیز اور علاج جاری رکھنا پڑا۔ ہر دو تین سیر ساڑھے تین سیر دودھ بصفر کرتا رہا۔ میرا چہرہ بارونق بدن مضبوط توانائی طاقتور ہو گئی اب میں ایسا قابل فخر مرد بن گیا ہوں کہ جس کے بیان کرنے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ واپس آکر باقی ماندہ دوائی کا مایوس مرغیوں پر تجربہ کیا تو ہر قسم کی نامردی سستی جریان۔ احتلام۔ سرعت غیرہ کیلئے اکسیر پایا۔ پھر کئی دوراندیش اصحاب کے اصرار پر مشتہار بغرض رفاہ عام دیا جاتا ہے کہ جو صاحب اس شرمناک عادت کے شکار بن کر حظوظ انسانیت سے محروم بیٹھے ہوں اور سینکڑوں روپیہ علاج معالجہ پر صرف کر کے بھی مایوس ہو چکے ہوں وہ اس نسخہ کا دوائی کو استعمال کر کے محتیاب ہو جائیں۔ اور خدا کے فضل کے کیت کامیں۔ قیمت مقوی گولیاں جس میں اکیس روز کی ۴۲ خوراک موجود ہیں صرف ۵ روغن مالش طلا جس میں ۲۱ روز تک لوگوں اور پٹھوں کیلئے کافی ہے۔ فی شیشی ۲ جریان کیلئے گولیاں ازحد مفید ہیں روغن مالش طلا سے کسی قسم کی کھینچی یا آبلہ ہرگز نمودار نہ ہوگا۔ اس دوائی میں کشتہ وغیرہ کی آمیزش نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ہر بچہ اور بوڑھا جوان باآسانی بغیر لحاظ موسم کے ان گولیوں کا استعمال کر سکتا ہے اور لطف یہ کہ اس دوائی کے استعمال کے بعد دوبارہ کسی دوائی کی ضرورت نہ رہیگی۔ آخر یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اشتہار نکالنے سے میری کوئی ذاتی غرض نہیں، در نہ میرا مطلب حاصل اشتہار شائع کر کے پبلک سے روپیہ کمانے کا ہے۔ بلکہ فائدہ خاص و عام کا مدنظر رکھ کر اور احباب کے اصرار پر شائع کیا جاتا ہے۔ تندرست اصحاب بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کیونکہ اسکے استعمال سے نسبت سے چستی اور چستی سے طاقتور بن جاتا ہے۔ اگر بڑھاپے میں بھی لطف جوانی اٹھانا چاہتے ہیں تو ان گولیوں اور روغن مالش طلا کا استعمال کریں۔ ان کے استعمال سے بدن میں خون پیدا ہو جاتا ہے۔ الغرض جب تمام جوڑ ڈھیلا ہو گیا ہو تو ان کا استعمال کریں۔ مکمل پرچہ ترکیب ہمراہ دوا ہوگا۔ محصول ڈاک ۸ علاوہ۔ تمام خط و کتابت پوشیدہ رکھی جاتی ہے۔

نوٹ: ۔ کوئی صاحب مجھے اور دوائی کے لئے تحریر نہ کریں۔ یہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ رجسٹرڈ ہے۔ آرڈر دیتے وقت اپنا پتہ مکمل خوشخط تحریر کریں۔

شرطیہ علاج اور شرطیہ وعدہ ہندو کو دھرم اور مسلمان کو ایمان کی قسم ہے کہ اگر میری دوائی کے استعمال سے فائدہ نہ ہو تو صاف تحریر بھیجکر قیمت واپس منگوالیں۔ یہ کوئی صباغ دوائی سے اب بھی فائدہ نہ اٹھائیں تو انکی قسمت

ضروری اطلاع ۔ یاد رہے کہ میری دوائی نامردی سستی۔ جریان۔ احتلام۔ سرعت۔ کمزوری لاغری یہ امراض خواہ کسی سبب سے ہوں۔ جلق یا کثرت مباشرت یا عادت بد سے بنگلے یکساں مفید ہے۔ سوزاک یا آتشک سے پیدا کی ہوئی کمزوری کیلئے اس کا استعمال کرنا طاقت کا ہیرا کرانا ہے۔ اور مادرزاد نامردی کے سوا میری دوا اکسیر ہے۔

ہزاروں تعریفی خطوط۔ سرٹیفکیٹ موجود ہیں۔ جن کے لکھنے والے عام صاحبان کے علاوہ کئی ڈاکٹر اور ویدکی رائے ہے کہ دارالشفاء مقوی گولیاں و روغن مالش طلا تیر بہدف ہے۔

خط و کتابت و دوائی ملنے کا پتہ:۔

منیجر دارالشفاء گولیاں رجسٹرڈ۔ بٹالہ ضلع گورداسپور (پنجاب)

روحانی دوا

ہومیوپیتھک

ڈائیلوشن ۱ روپیہ ڈرام
مدر ٹنکچر خارجی ۳ ر "
ایضاً داخلی ۴ ر "

بائیوکیمک

× ۳ × ۳۰ مفوف ۵ ر نصف اونس
× ۶۰ × ۲۰۰ " ۸ ر "

عارضی عنایت

یکشت کم از کم ساڑھے روپیہ کی دوا لینے پر ایک جلد معتبر میٹریا میڈیکا "بہ تشریح الاعضاء" قیمتی دو روپیہ ہدیہ ہوگی

شائقین کی سہولت کیلئے دیگر جملہ لوازمات متعلقہ ہمہ وقت موجود اور ان کا نرخ تقریباً کلکتہ جیسا

ہومیو ہوم

ہومیو ہوم بانکی پور پٹنہ
(زیر بام)

قطعہ

مستمندانہ بادشاہی ہے — خاکسارانہ کجکلاہی ہے
حال کا غم نہ خوف مستقبل — صبر و تسلیم و مست حالی ہے
بغض و کینہ و رشک و آز نہیں — راستی کی زبان عادی ہے
ہمت و عزم شرم و خودداری — سیر چشمی و بردباری ہے
منصفی و خلوص و حسن پسند — سینہ آئینۂ الٰہی ہے
دامن اغدار پاک و صاف — فیض جام طہور ساقی ہے
اوستادانہ دردمندانہ — سعیٔ کسب معاش جاری ہے
حسب حاجت فلوس و سیم و زر — بیم پرسش سے جیب خالی ہے
مار در آستیں سراسیمہ — نوشدارو سے آسمانی ہے
خاص ہیں غیر غیر خود غرضے — چند سے لطف زندگانی ہے
گھر کے اندر سکون کی دنیا — جنت ارضی و سماوی ہے
دل دفینہ ہزار حسرت کا — فکر گنجینۂ معانی ہے
فارسی کا دقیق شاعر تھا — دسترس فلسفہ میں کافی ہے
ابتلا انقلاب ہنگامہ — پردہ راز درمیانی ہے
پیر تعلیم ذوق و شوق خلش — فضل پروردگار شانی ہے
مصلحت راز نکتۂ باریک — فرط ارزانی و گرانی ہے

خود فراموش کسمپرس اختر
جام جم خاک کیمیائی ہے

نگراں
اختر حسن ہومیوپیتھ۔ ایم اے۔ بی اے بی ایل ایم ڈی ایچ

روحانی غذا

عظیم آباد کی موسیقی فضا اصلاح طلب ہے۔ انقلاب ہمارا ذمہ
بشرطیکہ
آپکی ہمدردی شامل حال ہوا
بہترین و کم خرچ بالانشین

گرامفونوں

کے علاوہ عام پسند و اخلاقی و صوفیانہ

ریکارڈوں کا

نادر ذخیرہ ہمارا طرۂ امتیازی ہے گا

تا اطلاع ثانی فی الحال ریڈیو وغیرہ پیشگی آرڈر ملنے پر منگا دیے جائیں گے

عنقریب (اشائقین کیلئے)
سکنڈ ہینڈ گرامفون کی خرید و فروخت کا معمول سلسلہ قایم کیا جائیگا۔

میوزک میوزیم

بانکی پور۔ پٹنہ
(بالائے بام)

غسل کیلئے مثالی صابون

دنیائے سائنس کی کامیاب تحقیق

کینیا وھائٹ سوپ

اپنی خوشبو سے آپ کے غسل کو فرحت بخشنے کا تین عدد صابون کے پیکٹ کیلئے صرف ۱۴ علاوہ محصول ڈاک۔ ہر بڑے شہر کے اسٹور اور دوکان میں بکثرت ملتا ہے۔ پرسپیکٹ کیلئے ۲ آنہ کا ٹکٹ روانہ کریں۔

دوسری قسمیں کینیا صندل سوپ دل بہار سوپ کینیا لونڈر سوپ اوخس وغیرہ تین عدد صابون کے پیکٹ کے لئے ۱۴ آنہ علاوہ محصول ڈاک۔

عمدہ اور سستے صابون کی دوسری قسمیں

کینیا ٹرکش باتھ سوپ کینیا مورننگ سوپ اگ سوپ اور کینیا بابا سوپ

کینیا	ٹرکش	باتھ	سوپ	قیمت	فی درجن	عدد
〃	مورننگ	〃	〃	〃	〃	۱۰
〃	اگ	〃	〃	〃	〃	۱۴
〃	بابا	〃	〃	〃	〃	۱۲

بازار کے ہر اسٹور میں ملتا ہے محصول ڈاک علاوہ۔ نمونے معائنہ کیلئے البتہ نیچے کا کوپن پر کر کے بھیجئے نمونہ بھی مفت بھیجا جائے گا۔

سول ایجنٹس:- اینگلو انڈین ڈرگ اینڈ کیمیکل کمپنی بمبئی نمبر ۲

مفت نمونہ طلبیہ:- کا کوپن مہربانی کر کے اپنے تیار کئے ہوئے مالوں کے چار عدد نمونے بھیج دیجئے محصول کیلئے ۲ کے ٹکٹ روانہ کر رہا ہوں۔

نام و پتہ:-

تصانیف حضرت مولینا شاہ محمد عزالدین صاحب پھلواروی ندوی سابق خطیب شاہی مسجد لاہور

(۱) علوم الحدیث

حدیث اپنی گوناگوں عظمت کے باعث دین میں جو مرتبہ رکھتی ہو کسی اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ لیکن اب تک بجز مختصر مضامین اور چھوٹے چھوٹے رسالوں کے جو اپنے باب میں بالکل ناکافی ہیں، علم حدیث کی مفصل تاریخ کی طرف کوئی توجہ نہ کی گئی، الحمدللہ کہ یہ بڑا کام بھی کافی تحقیق و تدقیق کے ساتھ عربی اور غیر عربی ماخذوں سے بڑی دیدہ ریزی اور عرق سوزی کے بعد تکمیل کو پہنچ گیا اس میں سب سے پہلے ضرورت حدیث اور سنت کی تعریف اس کے اقسام بیان کئے گئے ہیں۔ پھر سنت کے سینوں کے محفوظ خزانے سے نکل کر سفینوں میں آنے کی وجہ اور نفس حدیث کے جزو دین ہونے کے دلائل بیان کئے گئے ہیں۔ کیونکہ اس دور میں ایک نیا فتنہ انکار حدیث کا بھی پیدا ہو گیا ہے۔ جو حدیث کے جزو دین ہونے سے انکار کرتا ہے۔ اور اپنے زعم فاسد میں یہ سمجھتا ہے کہ حدیث رسول کریم صلعم کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ حدیث کے جزو عقائد ہونے پر اس کتاب میں نہایت محکم اور حقیقت تک پہونچانے والے دلائل دئے گئے ہیں، پھر علم حدیث کی ہر ایک مدون شاخ کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔ اور بیان حدیث میں صحابہ کے مسلک کی توضیح بھی ہے۔ حدیث کی جملہ اقسام سے بحث کی گئی ہے۔ مثلاً علم الجرح والتعدیل، علم غریب الحدیث، علم اسباب الحدیث و منسوخہ، علم الانساب والکنیٰ والالقاب، علم موضوعات الحدیث وغیرہ سبھوں سے پوری بحث کی گئی ہے۔ خلاصہ یہ کہ وہ حضرات جو اہل قرآن ہونے کے مدعی ہیں اور حدیث نبی کریم صلعم کو اپنی نافہمی کی وجہ سے وقعت نہیں دیتے، ان کے روبرو یہ ایک زبردست خزانہ ہے جو کتابی شکل میں قوم کے سامنے آ گیا ہے۔ نیز طلبائے مدارس عربیہ کے لئے یہ ایک ایسا مجرب تریاق ہے جو بڑی تلاش و جستجو کے بعد مہیا کیا گیا ہے، علماء و طلباء مدارس عربیہ کے لئے یہ نادر موقع ہے، اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہئے، طلبہ کے لئے امتحانات کے موقع پر بھی یہ کتاب نہایت کارآمد ہے غرض جلد از جلد اس کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ ورنہ پھر کف افسوس ملنا پڑے گا۔ اور دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا ہوگا۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ) رکھی گئی ہے۔ لیکن طلبہ کے لئے خاص طور پر یہ رعایت ہے کہ ان کو صرف ایک روپیہ (عہ) میں دیدی جاتی ہے۔ علاوہ محصول ڈاک۔

(۲) حیات احمد بن حنبل

دنیائے اسلام جن چار اماموں کی نام لیوا ہے، ان میں ایک حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ بھی ہیں اردو زبان میں اب تک حضرت امام ابوحنیفہ امام مالک، امام شافعی رحمہم اللہ کے حالات زندگی آ چکے ہیں لیکن حضرت امام احمد رح کی کوئی سوانح عمری اردو میں نہیں لکھی گئی تھی، اور بڑی ضرورت تھی کہ ان کے حالات زندگی بھی اردو کا جامہ پہن لیں۔ اس کتاب میں امام احمد رح کے پورے حالات زندگی، تحصیل علم شیوخ حدیث و فقہ، تقویٰ و زہد، مسئلہ خلق قرآن میں بے نظیر ثبات قدمی، جبر و استقلال، ظالم بادشاہوں کے مقابلہ میں حق کی حمایت، پھر جسم مبارک پر کوڑوں کا لگنا اور حضرت کا اصرار حق کرتے جانا یہ تمام باتیں بڑی تفصیل سے بیان ہوئی ہیں۔ موجودہ زمانے کے مجاہدین اور اہل حق کے لئے یہ کتاب بہترین بصیرت ہے۔ تمام مسلمانوں کو جلد از جلد اس کی خریداری کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، کیونکہ یہ کتاب اپنی خوبیوں کے باعث بہت مقبول ہے۔ اور ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہے۔ قیمت صرف ۵

(۳) کشف الظلام فی ترجمہ شفاء السقام

شیخ الاسلام علامہ تقی الدین سبکی کی معرکۃ الآرا کتاب شفاء السقام فی زیارت خیر الانام کا یہ اردو ترجمہ ہے۔ ایک عرصہ سے اس کتاب کے اردو ترجمہ کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ الحمدللہ کہ یہ بڑا کام بڑی خوبی کے ساتھ پورا ہو گیا۔ ترجمہ کے ساتھ مصنف علام کے سوانح حیات اور ایک مبسوط دیباچہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ علامہ سبکی نے یہ تصنیف علامہ ابن تیمیہ کے بعض غلط معتقدات کی تردید میں لکھی تھی۔ جن مسائل پر اس کتاب میں خصوصیت سے بحث کی گئی ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:- "زیارت قبور، استمداد، توسل، تشفع، حیات انبیاء و شہداء مقام محمود، اقسام شفاعت، ادعیہ ماثورہ وغیرہ، اتنے یکجا مواد اس کتاب کے علاوہ دوسری کتاب میں نہیں مل سکتے۔ ترجمہ کی زبان صاف و سلیس ہے۔ بلا مبالغہ کہا جاتا ہے کہ کتاب ہاتھوں ہاتھ نکل چکی ہے۔ صرف معدودے چند نسخے باقی رہ گئے ہیں۔ ان مسائل پر ایسی بے نظیر کتاب ہے جس کا اعتراف ملک کے ہر اہل علم طبقہ نے کیا ہے۔ جلد آرڈر بھیجئے ورنہ ایک بڑی نعمت سے محروم ہو جائیں گے۔ نیز ایجنسیاں بھی اس کی طرف متوجہ ہوں۔ اگر کوئی بک ایجنسی اس کا حق تصنیف لینا چاہے۔ یہ کتاب دو سو آٹھ صفحوں کی ہے۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ:- مصنف علام یا مینجر مجیبیہ بک ڈپو۔ پھلواری شریف (ضلع پٹنہ)

ہر قسم کی جسمانی طاقت اور قوت مردمی کیلئے

AMICO'S TONIC
امیکو ٹانک

لاثانی دوا ہے جو اپنے اثرات میں سو فیصدی کامیاب ہے۔ ملک کے ہر علاقہ میں کافی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ ہزاروں مایوس مریض اسکے استعمال سے اچھے ہو گئے۔

جریان یہ وہ مرض ہے جو انسان کی صحت کو بالکل برباد کر دیتا ہے۔ اس مرض کے لئے امیکو ٹانک نہایت مجرب اکسیر ہے۔ اس کے استعمال سے جریان نیا ہو یا پرانا جڑ سے جاتا رہتا ہے۔ دھات گاڑھی ہو جاتی ہے اور قطرہ آنا بند ہو جاتا ہے۔

نامردی کے لئے یہ بیمثل دوا ہے۔ اس دوا کا استعمال قوت مردمی کو بڑھاتا ہے۔ نامردی کی جملہ شکایت کو دور کرتا ہے۔ تمام جسم میں قوت جوانی عود کر آتی ہے۔ دل و دماغ قوی ہو جاتے ہیں۔ یہ دوا تمام اعضاء رئیسہ اور تمام جسمانی پرزوں کی اصلاح کرتی ہے۔ مرد و عورت کے تعلقات خوشگوار بناتی ہے

امیکو ٹانک کے استعمال سے زندگی کا پورا لطف حاصل ہوتا ہے۔ بھوک بڑھتی ہے۔ ہاضمہ درست رہتا ہے۔ غذا جزو بدن ہوتی ہے۔ کمزوری کی جملہ شکایات دوران سر، حافظہ کی کمزوری، اختلاج قلب، اعضا رشکنی، وغیرہ رفع ہو جاتی ہیں جسم میں خون کا بڑھانا اور نیا خون پیدا کرنا اس دوا کی خاص صفت ہے۔

یہ دوا ہر موسم میں بلا خطر استعمال کی جاتی ہے۔ عورت و مرد دونوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ اس دوا کو عام اشتہاری دوا تصور نہ کریں۔ دعوی سے کہا جاتا ہے کہ یہ نہایت مجرب دوا اکسیر ہے۔ ایک مرتبہ آزمائش کر کے دیکھئے۔ اس کے فوائد آپ کو حیرت میں ڈال دیں گے۔ قیمت فی شیشی:- ۳۲ خوراک ایک روپیہ آٹھ آنہ (یعنی) تین شیشیاں چار روپیہ (للعہ) علاوہ محصول ڈاک

امیکو طلا یہ عجیب و غریب دوا ہے۔ حکمت قدیم اور سائنس جدید کی معلومات کا نچوڑ ہے۔ اس دوا کا ہر جز قابل قدر ہے۔ اس کے استعمال سے عضو مخصوص کی تمام خرابیاں، لاغری، کجی اور تمام کمزوریاں رفع ہو جاتی ہیں۔ یہ طلا، نہایت قوت بخش اور مفید ہے۔ ضعیف اور کمزور انسانوں کے لئے اور وہ نوجوان جو اپنی غلط کاریوں کے باعث زندگی کی لذت سے محروم ہیں ان کی معاون و مددگار ہے۔ یہ طلا، بالکل بے ضرر ہے۔ اس کے استعمال سے نہ چھالا پڑتا ہے نہ جلن ہوتی ہے۔ ترکیب استعمال کا پرچہ ہمراہ دوا ہے۔ یہ دوا کریم کی شکل میں ٹیوب میں بند ہے

قیمت:- فی ٹیوب پچیس مرتبہ استعمال کی دوا صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ

امین اسمٰعیل۔ انگریزی دواخانہ نمبر ۸۰ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

(مکمل علاج کی فہرست مع جنتری سنہ ۱۹۴۰ء مفت طلب فرمائیے)

اخبار اتحاد کا دورِ جدید

آزادہ روہوں اور مرامسلک ہے صلح کل

اخبار اتحاد ۱۹۱۲ء میں قایم ہوا اور مختلف دور سے گذرا، لیکن گذشتہ مارچ ۱۹۳۷ء میں اس کو جس مصیبت کا سامنا کرنا پڑا حقیقت میں وہ لمحہ اس کے لیے جانگسل تھا، اور اگر اس کے مدیر مکرم جناب سیٹھ سلطان احمد صاحب سہسرامی اپنے زبردست تحمل بردباری، خلوص، نیک نیتی اور ایثار نفس سے کام لیکر ہمت نہ باندھتے تو آپ کی صوبہ کا یہ قدیم اخبار اس وقت تک خاکم بدہن ختم ہو چکا ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا صد ہزار شکر ہے کہ وہ پوری پابندی اور نہایت آب و تاب کیساتھ نہ صرف جاری ہے بلکہ اپنے اندر اس نے وہ تمام خصوصیات پیدا کر لی ہیں جو کسی قوم کے مخصوص طرز عمل کیلئے از بس ضروری ہیں۔ اب قوم کا فرض ہے کہ اس کی جانب متوجہ ہو۔

اردو ادیب و مشاہیر کی اخبار اتحاد کے لیے زبردست اپیل!

انجمن ترقی اردو ہند کی جو مجلس انتظامیہ ۲۸-۲۹ اگست ۱۹۳۷ء کو پٹنہ میں منعقد ہوئی تھی، اس نے ان تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، حسب ذیل اپیل شایع کی ہے:-

"اتحاد صوبہ بہار میں زبان اردو کا پرانا اخبار ہے جو عرصہ سے قومی اور ملی خدمات انجام دے رہا ہے لیکن ہمیں یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ وہ اتنی مدت مستقل اشاعت کے باوجود اسوقت تک اپنے پیروں پر کھڑے ہونیکی صلاحیت حاصل کر سکا ہے۔ اگرچہ خیالات کے اعتبار سے ممکن ہے وقتاً فوقتاً ہر طبقہ و خیال کی نمایندگی باحسن وجوہ پوری نہ کر سکا ہو، لیکن زبان کی خدمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ اردو زبان کا یہ ترجمان قایم و جاری رہے، اس لئے ہماری خواہش ہے کہ بہار کے تمام اردو خواں بلا کسی لحاظ ذاتی کے محض زبان اردو کی بقا و ترقی کیلئے اخبار اتحاد کے قایم و جاری رکھنے میں کوشاں ہوں جس کی سب سے آسان صورت یہی ہے کہ اس کی توسیع اشاعت میں جہانتک ممکن ہو ہاتھ بٹایا جائے۔"

اس وقت اس کی مالی حالت اطمینان کے قابل نہیں ہے

اور اگر اردو کے بہی خواہوں نے اس طرف جلد توجہ نہ کی تو اردو زبان کا یہ قدیم خادم عنقریب دم توڑ دیگا۔ ہمیں امید ہے کہ اہالیان بہار اس کی امداد و استعانت فرمائیں گے اور اس کو زندہ و قائم رکھیں گے۔"

الداعـــ

(مولانا) عبدالحق سکریٹری آل انڈیا انجمن ترقی اردو۔ (علامہ) سید سلیمان ندوی۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی (حضرت) مظہر الملک ایڈیٹر ان ناظر لکھنؤ۔ (مولانا) نظام الدین حسین نظامی ایڈیٹر دو القرنین بدایون۔ خواجہ غلام السیدین پرنسپل ٹریننگ کالج علیگڈھ پروفیسر محمد مجیب جامعہ ملیہ دہلی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی علیگڈھ مسلم یونیورسٹی۔ مسٹر آل احمد سرور۔ ایم اے ایڈیٹر مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڈھ

(مینیجر اتحاد پٹنہ)

فون نمبر ۲۶-۲۰ تار کا پتہ

دواخانہ یادگار اجمل

دہلی کا دواخانہ

جس کا ایک مدت سے انتظار تھا کلکتہ میں قائم ہوگیا

عالیجناب مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کی وفات کے بعد عالیجناب مسیح الملک حکیم جمیل خاں صاحب نے طب یونانی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی اور ہندوستانی دواخانہ کی سرپرستی قبول فرما کر طب یونانی کے معجز نما اثرات سے مردہ رگوں میں جان بخشی جس کی وجہ صحیح تشخیص اور مرکبات کے درست نسخے پورے پورے اجزا سے تیار کرنا ہے۔ اسی اصول پر **دواخانہ یادگار اجمل** کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ جس میں دہلی کے مشہور مرکبات و مجربات خاص تیر بہدف نسخوں سے تیار کردہ دہلی کی فہرست کی قیمت کے مطابق صرف اس ہی دواخانہ میں ملتے ہیں اور شاگرد عالیجناب مسیح الملک حکیم حافظ **اجمل خاں** صاحب مرحوم و مغفور اوقات ذیل پر مطب فرماتے ہیں۔

المشتہر

مینیجر دواخانہ یادگار اجمل نمبر ۱۵۔ زکریا اسٹریٹ کلکتہ

قائداعظم مسٹر محمد علی جناح

فرماتے ہیں!

تمہاری سیاسی برتری تمہاری تنظیم میں پوشیدہ ہے

ہم بھی یہی کہتے ہیں (یعنی)

تمہاری اقتصادی ابتری صرف تمہارے انتشار کے سبب سے،

دولت کی فراوانی

اگر دیکھنا چاہتے ہو تو اپنے پیسوں کو منظم شکل میں کچھ کرنے دو

شیر بنگال مسٹر اے۔کے فضل حق

لنگرین سمنٹ فیکٹری کے ہڈ آفس کے معائنہ کے بعد تحریر فرماتے ہیں

میں بلا تامل کہونگا کہ اس آفس کے تجارتی ماحول سے میں بیحد متاثر ہوا اس کے ارباب اقتدار کافی دور اندیشی سے کام لے رہے ہیں اور اعلیٰ تجارتی اصول پر عمل نظر آتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کامیاب ہو کر رہیں گے اور مجھے توقع ہے کہ مستقبل قریب میں یہ مارکٹ میں اپنا قدم جمالیں گے۔

اپنے ساتھ اپنے پیسوں کی بھی تنظیم کیجئے۔ حصے تیزی کے ساتھ بکتے چلے جارہے ہیں۔ کمپنی کے متعلق مفصل معلومات و پراسپکٹس و دیگر کاغذات کے لئے

جلد درخواست کیجئے

ہڈ آفس:۔ لنگرین سمنٹ فیکٹری لمیٹیڈ
۱۰۰ کلایو اسٹریٹ کلکتہ

فون ۱۸۹۲ / Cal
نمبر ۱۸۹۲ کلکتہ

کا

سو فیصدی شرطیہ علاج

دنیا کی وہ پہلی معرکۃ الآرا ایجاد جس کی نظیر فی صدی کامیابی سے بڑے بڑے ماہرین فن انگشت بدنداں ہو جائیں گے۔ ایشیائی دماغ کا ایک نادر الوجود شاہکار۔ ہندوستان کی سربلندی کا ایک عظیم الشان افتتاحی باب۔ دنیا میں پائریا کے واحد معالج ایک ہفتہ کے اندر سو فیصدی صحت کے ساتھ بغیر کسی تکلیف کے شرطیہ ورگارنٹی کیساتھ علاج کیا جاتا ہے۔ سینکڑوں معززین کے سارٹیفکیٹ موجود ہیں۔ نیز ہمارے علاج کو غلط یا مضر رساں ثابت کرنیوالے کیلئے منھ مانگا انعام مقرر ہے۔

(نوٹ) دانتوں کی صفائی کیلئے ہمارے یہاں کا تیار کردہ لطیف ٹوتھ پوڈر طلب فرمائیں جو دانتوں کے تمام متعلقہ امراض کے حق میں سو فیصدی کامیاب اور مجرب ہے۔ پسند نہ ہونے پر دام واپس۔ قیمت ۸ر

پتہ

سید مشتاق علی (ماہر معالج پائریا)
ڈنٹا ہال نمبر ۵۷ لورحیت لور روڈ۔ کلکتہ

جوانی اور تندرستی قائم رکھنا ہو تو استعمال کریں

غزنی ٹانک

مردانہ کمزوریوں کیلئے آبحیات

جریان۔ احتلام۔ سرعت انزال۔ جلق۔ کثرت جماع۔ نامردی۔ عصبی کمزوری کیلئے غزنی ٹانک کا ہر قطرہ آبحیات کا کام کرتا ہے۔ قیمت فی شیشی ایکروپیہ چودہ آنہ

۳ شیشی کے خریدار سے محصول ڈاک نہیں لیا جائیگا۔

برانچ:۔ غزنی فارمیسی!

ڈاکٹر یار محمد خاں ۱۷ لاگیٹ روڈ کاشی پور کلکتہ

ندیم

بہار نمبر شمارہ

عورتوں کی سپوت کی بیماری اور سفید اطہارت

دُور کرنے کی زُود اثر اور لاثانی دوا

نسوانی

رجسٹرڈ

قیمت فی شیشی ایک روپیہ

آجکل ہر گھر میں بیاہی ہوئی اور جوان عورتوں کو سفید سفید رطوبت آنے کی شکایت رہتی ہے جسکی وجہ سے اُن کے بدن میں کمزوری بڑھتی جارہی ہے اور بہت تھوڑی عمر میں چہرے کی چمک اور بدن کی پھُرتی غائب ہو جاتی ہے۔ یہ رطوبت جسکو پرسوت کی بیماری بھی کہتے ہیں مثل پانی کے سفید سفید قطرہ نکلتا رہتا ہے اور اکثر میلے رنگ کی گاڑھی گاڑھی سفید رطوبت برابر نکلا کرتی ہے اور کپڑے پر دھبّہ آجاتا ہے۔ اِسکی وجہ سے تھوڑے دِن میں بدن پیلا پڑکے سوکھنے لگتا ہے (۱) ٹانگ میں دَرد (۲) آنکھ تلے اندھیرا (۳) اُٹھتے بیٹھتے سر چکرانے لگتا ہے (۴) کوئی چیز کھانے کو جی نہیں چاہتا (۵) ہاتھ پیر کا تلوہ جلتا رہتا ہے (۶) کمر میں دَرد (۷) طبیعت میں سُستی (۸) بھوک نہ لگنا (۹) مَرد کی صحبت سے جی گھبرانا (۱۰) حمل نہ رہنا (۱۱) یا حمل گر جانا (۱۲) یا اولاد کمزور پیدا ہونا (۱۳) اولاد پیدا ہو کر زندہ نہ رہنا۔ غرضکہ اِن سب بیماریوں کے لئے اگر آپ ہمارے یہاں کی لاجواب دوا **نسوانی** استعمال کرائیں گے تو خدا چاہے تو عورت کی جملہ مندرجہ بالا شکایتیں جاتی رہینگی۔ عورت کی کمزوری سستی۔ لاغری دُور ہو کر بدن میں پھرتی ہاتھ پیر میں طاقت۔ چہرہ پر رونق۔ اور دِل میں جوانی کی اُمنگ آجائیگی۔ صرف تین شیشی نسوانی پلانے سے رطوبت کا آنا بند ہو جائیگا۔ قیمت فی شیشی۔ ایک رُوپیہ۔ تین شیشی کی قیمت۔ ۲ دو روپیہ بارہ آنہ۔ محصول علاوہ

قدرتِ خدا کا تماشہ دیکھئے۔ بانجھ عورت کو حمل قرار پا گیا۔ جناب محمد اسحاق صاحب۔ ضلع سلطان پور سے تحریر فرماتے ہیں۔ کہ مَیں نے چھ شیشی نسوانی منگا کر استعمال کیا۔ حالانکہ عورتیں بالکل بانجھ تھیں۔ اب خدا کے فضل و کرم سے دونوں عورتیں حاملہ ہیں۔ مَیں تہہ دِل سے آپ کا مشکور ہوں۔ لہذا تین شیشی نسوانی اور روانہ فرمائیے۔ (فرمائش لکھتے وقت "ندیم" کا حوالہ دیجئے)

ملنے کا پتہ۔ ایس۔ اے۔ بی بخشی کمپنی۔ گھڑی والی کوٹھی ۳۲ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

شربت اکسیر

تندرستی کا بیمہ

رجسٹرڈ

اگر تندرستی میں فرق ہے۔ تو۔ زندگی۔ بیکار ہے۔

اگر آپ اشتہاری ادویات سے بدگمان ہو گئے ہوں تو صرف ایک رُوپیہ اور بھی خرچ کر کے

ہمارے کارخانے کا شربت اکسیر استعمال کر کے قدرتِ خدا کا تماشہ دیکھئے

سنئے جناب! یہ شربت اکسیر جسکا اشتہار آپ کے پیش نظر ہے۔ اس کا اشتہار دینے کے قبل صدہا مریضوں پر جب مجھے کامل اطمینان ہو گیا تو یہ اشتہار آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اگر میری تحریر لغو نہ سمجھیں تو ایک شیشی شربتِ اکسیر منگا کر ضرور استعمال فرمادیں۔

میری تحریر کی صداقت آپ کو فوراً ہو جاویگی

جریان جو نامردی اور ضعف باہ کا پیش خیمہ ہے۔ کیسا ہی پُرانا کیوں نہ ہو شربت اکسیر کے استعمال سے جڑ سے جاتا رہتا ہے۔ جسم میں کمزوری۔ پیشاب کے قبل یا بعد سفید سفید دھات کا گرنا۔ منی کا پتلا ہو جانا۔ احتلام کا ہونا۔ نطفہ کا قرار نہ پانا اور درد سر کا برابر رہنا۔ سستی۔ کاہلی۔ چہرے پر بالکل بے رونقی۔ خون کا بدن میں نہ پیدا ہونا۔ اِن سب مہلک امراض کے لئے شربت اکسیر نہایت ہی مفید ثابت ہوا ہے۔ مقوی دل و دماغ تو ایسا ہے کہ شاید ہی اس کے مقابلہ کی دوسری دوا ہو۔ ہاضم اس قدر ہے کہ آپ ایک ہفتہ کے بعد دونی غذا نوش کرنے لگیں گے۔

قیمت۔ فی شیشی ایک رُوپیہ تین شیشی کی قیمت۔ دو رُوپیہ بارہ آنہ۔ محصول علاوہ

سرٹیفکٹ ملاحظہ فرمائیے۔ جناب حکیم محمد احسان الحق صاحب بردوان سے تحریر فرماتے ہیں:۔

میں کئی بار شربت اکسیر خود استعمال کر چکا ہوں اور اکثر ایسے مریضوں کو جو جریان کے مرض میں لاحق پریشان تھے۔ ان کو بھی استعمال کرایا۔ چنانچہ واقعی شربتِ اکسیر اکسیر ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ ایس۔ اے۔ بی بخشی۔ کمپنی۔ گھڑی والی کوٹھی ۳۲ کو لوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

صوبہ بہار کے اسکولوں اور کالجوں میں ۱۹۳۱ء سے منظور شدہ

سہ ماہ ندیم گیا

قیمت سالانہ ۴ روپے
للعہ شستماہی ۲ روپے

بہار نمبر سنہ ۱۹۴۰ء

قیمت فی پرچہ ۵ آنہ
قیمت بہار نمبر ۶ آنہ

مرتبہ
سید ریاست علی ندوی

جلد ۱۳	ماہ صفر تا جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۵۹ھ مطابق ماہ مارچ لغایت جون سنہ ۱۹۴۰ء	نمبر ۴ تا ۶

فہرست تصاویر بہار نمبر سنہ ۱۹۴۰ء

نمبر شمار	اسماء	مقابل صفحہ مضامین
۱	ساقی بنور بادہ برافروز جام ما ۔ مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما (سہ رنگی شاہکار عمل بہن جی)	صفحہ عنوان حساب کتاب اول صفحہ نظرات
۲	اسٹاف ندیم وندیم پریس	۸
۳	اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز ہے حسن (دو رنگی شاہکار عمل بہن جی)	۹
۴	فخر بہار یادگار رواع تاجدار سخن حضرت مبارک عظیم آبادی	″
۵	نامحداے سخن تاج الشعراء فصیح العصر حضرت نوح ناروی	″
۶	جناب پروفیسر طاہر رضوی ام۔ اے	۹۶
۷	جناب سید رضا قاسم صاحب مختار	″
۸	جناب سید علی حیدر صاحب	″
۹	جناب سید آظہر الحق صاحب قادری سونہر ساوی	″
۱۰	جناب سید شاہ ولی الرحمٰن صاحب ولی ام۔ اے ڈپٹی مجسٹریٹ	۹۷
۱۱	جناب حمید عظیم آبادی	″
۱۲	جناب جی آر تھیک شیخپورہ روی	″
۱۳	جناب سید بدرالدین صاحب صبر رضوی مخدوم آبادی سریری	″
۱۴	جناب پروفیسر ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب ام۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی	۱۸۴
۱۵	جناب بہزاد فاطمی	″
۱۶	جناب سید محمد ایوب صاحب قدر آبگوی	″
۱۷	جناب مولانا مسعود عالم عالم ندوی	۱۸۵
۱۸	جناب نسیم گورگانوی	″
۱۹	جناب جوہر ڈیادی	″
۲۰	جناب منصور کاکوی	″
۲۱	شاہکار "پنسل اسکیچ" نمبر ۱	۲۴۸
۲۲	شاہکار "پنسل اسکیچ" نمبر ۲	″

سید ریاست علی ندوی اڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ندیم پریس گیا میں چھپوا کر دفتر ندیم گیا سے شائع کیا

نمبر شمار	اسماء	مقابل صفحہ مضامین
۲۳	جناب محمد کمال صاحب راز بھاگل پوری	۲۴۸
۲۴	جناب سید محمد صابر صاحب قمر کاروی	"
۲۵	جناب سید عبدالغنی صاحب محو بہاری مرحوم	۲۴۹
۲۶	جناب خان بہادر نواب سید احمد علی خاں صاحب	"
۲۷	جناب سید مشہود عالم صاحب میکش عظیم آبادی	"
۲۸	جناب ایم۔ ذوالفقار ہاشمی اعظم آبادی	"
۲۹	حضرت جمیل مظہری ایم۔ اے ایجوکیشنل آفیسر حکومت بہار	۳۲۸
۳۰	جناب سید زین العابدین صاحب عابد نقوی منصف اول شہر گیا	"
۳۱	جناب ملک فضل امام صاحب شہید اکبرودی	"
۳۲	جناب سید عزیز الحسن صاحب ضیا بایزیدپوری	"
۳۳	حضرت الیاس اسلام پوری	۳۲۹
۳۴	جناب سہیل عظیم آبادی	"
۳۵	جناب خواجہ عبدالقیوم صاحب بی۔ اے (آنرز)	"
۳۶	جناب سید عبدالحی صاحب حبیب عثمانی	"
۳۷	حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ	۴۰۴
۳۸	جناب ڈاکٹر سید محمود ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی	"
۳۹	جناب عزیز ملت سید عبدالعزیز صدر المہام عدالت و امور مذہبی حکومت آصفیہ حیدرآباد دکن	"
۴۰	جناب سید حسن امام صاحب بیرسٹر مرحوم	۴۰۵
۴۱	جناب آنریبل سید حسین امام صاحب ممبر کونسل آف اسٹیٹ	
۴۲	قلعہ رہتاس کا ایک منظر	ٹائیٹل کا تیسرا صفحہ
۴۳	فرمان عالمگیر (یہ سلسلہ مضمون قلعہ رہتاس)	"
۴۴	مسجد شیر شاہی مغل پورہ میٹیٹی (" ")	" چوتھا صفحہ
۴۵	روضہ شیر شاہ سہسرام	" "

گرافک آرٹس کمپنی

بلاک میکرز اینڈ فائن آرٹ پرنٹرز

اگر آپ بہترین بلاک بنوانا چاہتے ہیں۔ اور آرٹ کی نقیس پرنٹنگ چاہتے ہیں تو

گرافک آرٹس کمپنی

کے خدمات حاصل کیجئے۔ آپ کی تشفی کے لئے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ

بہار نمبر سنہ ۴۰ء

کا

چہار رنگی شاہکار ٹائیٹل، سہ رنگی شاہکار اور دو رنگی شاہکار اور اکثر ہاف ٹون بلاک اسی کمپنی میں بنوائے گئے ہیں۔ اور سب بلاک اسی میں چھپوائے گئے ہیں۔ یہ ہمارے نقیس کام کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ خاص بلاک پرنٹر مشینیں ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں صرف چند ہی کمپنیوں کے پاس ہیں۔ معمولی میکروں سے بلاک بنوا کر اور ٹائپ کے عالم پر سیسوں پر چھپوا کر اپنی تصویریں خراب نہ کریں۔ خوب یاد رکھئے کہ فائن آرٹ کی خوشنما تصویریں سب سے بہتر اسی کمپنی میں چھپ سکتی ہیں۔ ہندوستان کے بڑے سے بڑے فرموں کے بلاک اسی کمپنی میں بنتے ہیں۔

نیازمند مینیجر گرافک آرٹس کمپنی نمبر ۴۰ چترنجن ایونیو ساؤتھ کلکتہ

فہرست مضامین بہار نمبر ۴۲ء

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
	(۱) **افتتاحیہ** (۱-۱۰)		
۱	نظرات	سید یاست علی ندوی	۱-۸
۲	نوید نو بہار	فخر بہار، یادگار داغ تاجدار سخن حضرت مبارک عظیم آبادی	۹-۱۰
	(۲) **مقالات** (۱۱-۱۵۰)		
۱	مولانا شبلی اردو شاعر کے لباس میں	حضرۃ الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ	۱۱-۲۰
۲	سپاہی کی بیٹی	ادیب جلیل جناب سید وصی احمد بلگرامی ڈپٹی مجسٹریٹ مونگیر	۲۱-۳۰
۳	بہار کی بہار	ادیب شہیر حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی بی۔اے مدیر صدق لکھنؤ	۳۱-۳۴
۴	فاتح بہار و بنگالہ محمد بن بختیار خلجی	مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی پروفیسر گجرات کالج احمد آباد	۳۵-۴۲
۵	فاتح پلاسوں عمدۃ الملک نواب داؤد خاں قریشی	جناب سید رضا قاسم صاحب مختار	۴۳-۵۷
۶	شیر شاہ کا کردار نئی روشنی میں	جناب مولانا عبدالباقی خاں صاحب بی۔اے اجمالی مفصل پروپیگنڈا آفیسر صوبہ بہار	۵۸-۶۰
۷	انتظام الملک ممتاز الدولہ مہاراجہ کلیان سنگھ تہور جنگ	جناب سید حسن عسکری صاحب ایم۔اے بی۔ال۔ پروفیسر تاریخ پٹنہ کالج	۶۱-۷۴
۸	مولانا سید عبدالغنی دارفی علیگ مرحوم	حضرت مولانا سید مناظر حسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ	۷۵-۹۱
۹	فردوسی و دستیقی	جناب پروفیسر ظاہر رشتوی ایم۔اے	۹۲-۹۹
۱۰	کیا موجودہ ایران ہند کا تصوف اسلامی ہے؟	جناب پروفیسر مولانا سید مظفر الدین ندوی ایم۔اے	۹۹-۱۰۴
۱۱	اقبال کی شاعری" مرتبہ جناب عبدالمالک آروی	حضرت دیوجانس بہاری	۱۰۵-۱۱۹
۱۲	غالب کی خودداری	جناب سید علی حیدر صاحب حسنین منزل گیا	۱۱۹-۱۲۹
۱۳	موجودہ طرز آفرینش اور اس کے اجزاء	جناب سید مظفر حسین صاحب ایڈیٹو کمیٹ	۱۳۰-۱۳۲
۱۴	تاریخ عقلیہ پر ایک نظر	جناب پروفیسر ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب ایم۔اے۔پی۔ایچ ڈی (لندن)	۱۳۳-۱۳۴
۱۵	یورپ میں علم وادب کا چرچا	جناب محمد سلیمان صاحب بی۔اے۔بی ال کشن گنج پورنیہ	۱۳۵-۱۳۷
۱۶	فن مصوری مدرسہ پٹنہ قلم	جناب رادھا موہن صاحب ایم اے۔ال۔ال۔بی پرنسپل پٹنہ اسکول آف آرٹس	۱۳۸-۱۴۰
۱۷	حضرت صوفی منیری کی تاریخ گوئی کا ایک شاہکار	جناب رشاں امدادی اسلام پوری	۱۴۱-۱۴۲
۱۸	گوتم بدھ کے قبل جنوبی بہار	جناب سید اظہر الحق صاحب فاروقی سوہنیرسادی	۱۴۳-۱۴۴
۱۹	صوبہ بہار کا ایک دلکش اجمالی مرقع	جناب سید شاہ اسد غنی صاحب رمیس گیا	۱۴۵-۱۵۰
	(۳) **بہار میں اردو زبان اور شاعری** (۱۵۱-۲۰۳)		
۱	بہار اور اردو	جناب حمید عظیم آبادی	۱۵۱-۱۶۱
۲	پیام نظیر	جناب حمید تاج محلی	۱۶۲-۱۶۶
۳	شاد کا تغزل	جناب سید شاہ ولی الرحمن صاحب ولی ام۔اے ڈپٹی مجسٹریٹ موتیہاری	۱۶۷-۱۷۹
۴	شاد کا امتیازی رنگ تغزل	جناب گلاب چاند صاحب بی۔اے	۱۸۰-۱۸۳
۵	عصر حاضر میں بہار کے شعراء	جناب بہزاد فاطمی بی۔اے آنرز	۱۸۴-۱۹۷
۶	شعرائے بہار دور حاضر میں	جناب ڈاکٹر سید نسیم گورکھپوری (ہومیوپیتھ)	۱۹۸-۲۰۳
	(۴) **خواتین بہار** (۲۰۴-۲۰۷)		
۱	بہار کی ایک مایہ ناز فاضلہ	مولانا سید محمد طہ صاحب اشرف التھوی	۲۰۴-۲۰۷
	(۵) **آثار عتیقہ** (۲۰۸-۲۱۸)		
۱	قلعۂ رہتاس	مولانا حافظ سید عبدالرؤف صاحب ندوی	۲۰۸-۲۱۷

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۲	رونمائی سلطان فریدالدین شیرشاہ	جناب سید محمد صابر صاحب قمر قادری	۲۱۶-۲۱۸

(۶) گلشنِ صوبہ بہار میں

(۲۱۹ - ۲۳۴)

۱	غدر میں گیا کے سیاسی حالات	جناب خواجہ جلال الدین صاحب وکیل	۲۱۹-۲۳۲
۲	صوبہ بہار کا ایک بہادر باغی	جناب خواجہ عبدالقیوم صاحب بی اے (آنرز)	۲۳۳-۲۳۴

(۷) منظومات

(۲۳۵ - ۲۴۸)

۱	ترانۂ اُردو	فخر بہار یادگار داغ تلامیذ ارشد حضرت مبارک عظیم آبادی	۲۳۵
۲	قلندر ہٹا سکے	بلبل بہار حضرت سریر کاکوی میسانی گیا دی	۲۳۶
۳	حقیقت اسکی	حضرت جمیل مظہری ام-اے	۲۳۷
۴	سلطان المجاہدین	ناخدائے سخن تاج الشعراء فصیح العصر حضرت نوح ناروی	۲۳۸
۵	میری شاعری اور سامعین	حضرت رضی	۲۳۹
۶	نغمۂ بہار	حضرت ضیا رشیدی ام-اے-بی-ایل	۲۴۰-۲۴۱
۷	یہ دنیا!	جناب اختر قادری بلیاروی ام-اے	۲۴۲
۸	خیالات کی رو میں	مولوی سید ناظر امام صاحب بیخود ندوی آنکلوی	۲۴۲
۹	منگل تالاب کی ایک رات	جناب جوہر فریادی	۲۴۳
۱۰	چمن اردو	جناب سید بدرالدین احمد صاحب صہبر رضوی سہسروی مخدوم آبادی گیادی	۲۴۳
۱۱	اقبال	جناب فخرالدین خاں صاحب بھاگلپوری ڈسٹرکٹ سب جسٹس مونگیر	۲۴۴
۱۲	مولانا سید منظر علی ندوی مرحوم	حضرت اختر شہنشاہی ام-اے	۲۴۵
۱۳	صبح کا ستارہ	جناب محمد عبدالغنی صاحب شمس کرائے پرسائے	۲۴۵
۱۴	آنسو	جناب سید مرتضیٰ حیدر صاحب نقاد عظیم آبادی	۲۴۶
۱۵	کسی کی یاد	جناب قیصر عثمانی	۲۴۶
۱۶	شرابی سنسار	جناب شفیق قادری سونبرسادی	۲۴۷
۱۷	مقصد حیات	جناب محشر کاکوی	۲۴۷
۱۸	انتظار شوق	جناب محمد کمال احمد صاحب راز بھاگلپوری	۲۴۸

(۸) بادۂ کہن

(۲۴۹ - ۲۵۴)

۱	سید عبدالغنی فخر بہاری		۲۴۹-۲۵۳
۲	میر حسیر عظیم آبادی	مولوی مسعود الرحمٰن صاحب ندوی	۲۵۴

(۹) افسانہ و محاضرات

(۲۵۵ - ۳۱۴)

۱	فرض کی قربانگاہ پر	حضرت جمیل مظہری ایم-اے پبلسٹی آفیسر صوبہ بہار	۲۵۵-۲۷۹
۲	غیرت اور شدت	پروفیسر محمد مسلم صاحب ام-اے	۲۸۰-۲۸۵
۳	داغ کی شکست	جناب پروفیسر شکیل ابراہیمی ام-اے	۲۸۶-۲۹۰
۴	تاریخ بہار کا ایک خوں آلود ورق فسانہ کے رنگ میں	جناب رحمت علی صاحب طاہر پورنوی محوی	۲۹۱-۲۹۵
۵	ہڑبونگ سبھا	حضرت ماہپوری	۲۹۶-۳۰۳
۶	تاتاری کی موت	جناب عبدالباقی خاں صاحب بی اے جاسوسی منصل پروپگنڈا افیسر صوبہ بہار	۳۰۴-۳۱۰

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۷	شادی	جناب آفتاب حسن صاحب بی ایس۔ سی علیگ	۳۱۱-۳۱۸
۸	شادی کے تحفے	جناب پروفیسر سید اختر احمد صاحب اختر اورنیوی	۳۱۹-۳۲۳
۹	بھوک	جناب سہیل عظیم آبادی	۳۲۴-۳۲۸
۱۰	"بہرزمیں کہ رسیدیم ..... "	حضرت الیاس اسلام پوری	۳۲۹-۳۳۷
۱۱	تالی	جناب کامریڈ انیس الرحمن صاحب	۳۳۸-۳۴۱
۱۲	کامریڈ	جناب خواجہ عنایت اللہ صاحب فخری	۳۴۲-۳۴۵
۱۳	وطن کی قربانی	جناب جی۔ آر۔ تمیمی صاحب شفیع پوروی	۳۴۶-۳۴۷
۱۴	جنات	جناب کامریڈ خیر النساء بیگم	۳۴۸-۳۵۱
۱۵	بہاری صاحب	جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی بی اے۔ ال۔ ال۔ بی علیگ	۳۵۲-۳۶۱
۱۶	"..... بخیر گذشت"	جناب سید محمد ایوب صاحب آنجلوی	۳۶۲-۳۶۴
۱۷	بھکاری	جناب ایم۔ ذکی اختر صاحب ہاشمی عظیم آبادی	۳۶۵-۳۶۶
۱۸	مکافاتِ عمل	جناب مخزوں چکسکوئی جناب عبدالکریم صاحب آزاد بھاگلپوری	۳۶۷-۳۷۹

(۱۰) **جہانِ اسلام** ۳۸۰-

۱	نوفیز عراق اور اسکی پہلا بھری بیڑا	مولانا مسعود عالم صاحب ندوی	۳۸۰-۳۸۲
۲	مصر کی نئی سیاسی تشکیل	جناب منصور کاکوی	۳۸۳
۳	افغانستان جنگ عظیم کے بعد	جناب سید محبوب احمد صاحب وارثی بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ)	۳۸۴

(۱۱) **صوبہ بہار کے چند مشاہیر** (۳۸۵-۳۸۸)

۱	سلیمان ندوی	جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم۔ اے رفیق دارالمصنفین	۳۸۵-۳۸۸
۲	ڈاکٹر سید محمود	سید علی مظفر امام آنجلوی مدیر معاون و مہتمم رسالہ ندیم	۳۸۹-۳۹۹
۳	عزیز ملت سید عبدالعزیز	جناب سید ابوالاعلیٰ صاحب بی۔ اے	۴۰۰-۴۰۴
۴	آنریبل سید حسین امام		۴۰۵-۴۰۸
۵	ہیرالال بن جی		۴۰۹-۴۱۰

(۱۲) **یادِ رفتگاں** ۴۱۱-۴۱۸

۱	میت کی پریت	جناب سید حسن امام صاحب رکن ادارۂ شعبۂ منظومات رسالہ ندیم	۴۱۱-۴۱۸

(۱۳) **افکار و خیالات** (۴۱۸-۴۲۱)

۱	زندگی کدھر؟	جناب کامریڈ علی اشرف محبوس سنٹرل جیل ہزاری باغ	۴۱۹-۴۲۰
۲	کیا لکھوں؟	جناب سید نصیر حیدر صاحب نصیری بی اے۔ ال ال۔ بی ڈپٹی کلکٹر گیا	۴۲۰-۴۲۱

(۱۴) **اصلاح و ترقی** (۴۲۱-۴۲۲)

۱	صوبہ بہار میں محکمۂ اصلاح دیہات	جناب سید محمد یحییٰ صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ایل۔ ڈپٹی ارگنائزر محکمۂ ترقیات سدھار صوبہ بہار	۴۲۲-۴۲۳

(۱۵) **آثارِ علمیہ و ادبیہ** ۴۲۴-۴۳۳

۱	چند مشاہیر کے غیر مطبوعہ مکاتیب بنام ڈاکٹر سید محمود		۴۲۴

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۲	عکس غیر مطبوعہ تحریر علامہ شبلی نعمانی مرحوم		۴۲۵
۳	" " " حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ		۴۲۶-۴۲۷
۴	" " " رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم		۴۲۸-۴۲۹
۵	" " " سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی مرحوم		۴۳۰-
۶	" " " جناب پنڈت موتی لال نہرو مدظلہ		۴۳۱-۴۳۲
۷	مکتوب سر اقبال بنام مولانا مسعود عالم ندوی		۴۳۲-
۸	مکتوب حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ بنام مولانا عبدالماجد دریابادی		۴۳۳-۴۳۴

غزلیات (۱۶) (۴۳۵ - ۴۴۳)

۱	عام فہم	حضرت علامہ فضل حق آزاد	۴۳۵
۲	جذبات مبارک	حضرت مبارک عظیم آبادی	۴۳۶
۳	بادۂ عرفان	حضرت سید شاہ اکرام الدین احمد صاحب عرفاں رئیس اسلام پور	۴۳۷
۴	نالۂ بلبل	حضرت بلبل بہار سریر کاہری	۴۳۷
۵	افکار جمیل	حضرت جمیل مظہری ایم۔اے پبلسٹی آفیسر صوبہ بہار	۴۳۸
۶	نقوش عابد	جناب سید زین العابدین صاحب عابد نقوی منصف اول شہر گیا	۴۳۹
۷	ادعا	حضرت تمنا عمادی مجیبی	۴۴۰
۸	بادۂ کوثر	حضرت رسا بہوانی ایم۔اے	۴۴۰
۹	رنگ شفق	مولانا ابواحمد عبدالوہاب صاحب شفق ایڈووکیٹ گیا	۴۴۰
۱۰	کیفیت تغزل	جناب سید شاہ ولی الرحمن صاحب ولی ایم۔اے ڈپٹی مجسٹریٹ موتیہاری	۴۴۱
۱۱	کوئی دیوانہ بناتا ہے کوئی دیوانہ ہوتا ہے	جناب اودھ کشور پرشاد صاحب کشتہ گیاوی	۴۴۱
۱۲	نبرد عشق یہ ساغر تو نہیں ہے	جناب توحید عظیم آبادی	۴۴۲
۱۳	ہر دی ہے ابو دشت دو چار آدمی میں	جناب سید بدرالدین احمد صاحب صبر رضوی مخدوم آبادی	۴۴۲
۱۴	پھول	جناب شاہ علی شطاری صاحب رئیس پٹنہ	۴۴۲
۱۵	کمال رضا	مولانا حکیم سید محمد طٰہٰ صاحب کمال ندوی	۴۴۳
۱۶	ہمیں کیا ہو گیا کیوں چشم تر ہے	جناب سید محمد ایوب صاحب قدر آبگلوی	۴۴۳
۱۷	بادۂ مشیت	جناب مشہود عالم صاحب مشیت عظیم آبادی	۴۴۳

رباعیات (۱۷)

۱	رباعیات صبیح	مولانا سید شاہ صبیح الحق صاحب عمادی خانقاہ عمادیہ پٹنہ	۴۴۴
۲	افکار فلسفی	جناب مولوی سید احمد حسین صاحب فلسفی بی۔ایل	۴۴۴
۳	ہستی	مولوی سید محمد ایوب صاحب تسنیم ندوی شہسرامی	۴۴۴
۴	رباعیات مبارک	فخر بہار یادگار داغ تاجدار سخن حضرت مبارک عظیم آبادی	۴۰۸
۵	رباعیات حمید	حضرت حمید عظیم آبادی	۴۰۸
۶	رباعیات توحید	جناب توحید عظیم آبادی	۴۱۰
۷	بیان اعجاز	جناب سعید احمد صاحب اعجاز	۴۲۱
۸	جرعات	جناب اختر قادری ایم۔اے	۴۲۳

تصویر جذبات (۱۸) (۴۴۵ - ۴۴۶)

۱	حسن و محبت کا تذکرہ	جناب سید عزیز الحسن صاحب عنبا بازیدپوری	۴۴۵
۲	سنگدل حسینہ	جناب ملک فضل امام صاحب شہید کیموروی	۴۴۵-۴۴۶
۳	کیوپڈ	جناب ملک ولی امام صاحب شباب کیموروی	۴۴۶

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
	(۱۹) نوادر (۴۴۷)		
۱	عکس وصلی تحریر بزرگوار حضرت سید شاہ اکرام الدین احمد صاحب رئیس اسلام پور		۴۴۷
	(۲۰) قند پارسی (۴۴۸-۴۵۲) (۴۴۸-۴۵۲)		
۱	گلگونۂ شفق	جناب سید حسن مرتضیٰ صاحب شفق عماد پوری	۴۴۸
۲	کلام حسن	جناب سید حسن امام صاحب حسن رئیس گیا	۴۴۹
۳	کلام شفق	جناب سید حسن مرتضیٰ صاحب شفق عماد پوری	۴۵۰
۴	عالم تمام افسانۂ مادر دما یہ ہیچ	جناب خان بہادر نواب سید احمد علی خاں صاحب	۴۵۰
۵	قطعۂ تاریخ وفات حضرت سید شاہ حسین الدین احمد	جناب سید ریاض حسن خاں صاحب خیال رئیس مظفر پور	۴۵۱
۶	قطعۂ تاریخ طبع بہار نمبر ۱۳۴۰ھ	جناب خان بہادر نواب سید احمد علی خاں صاحب	۴۵۲

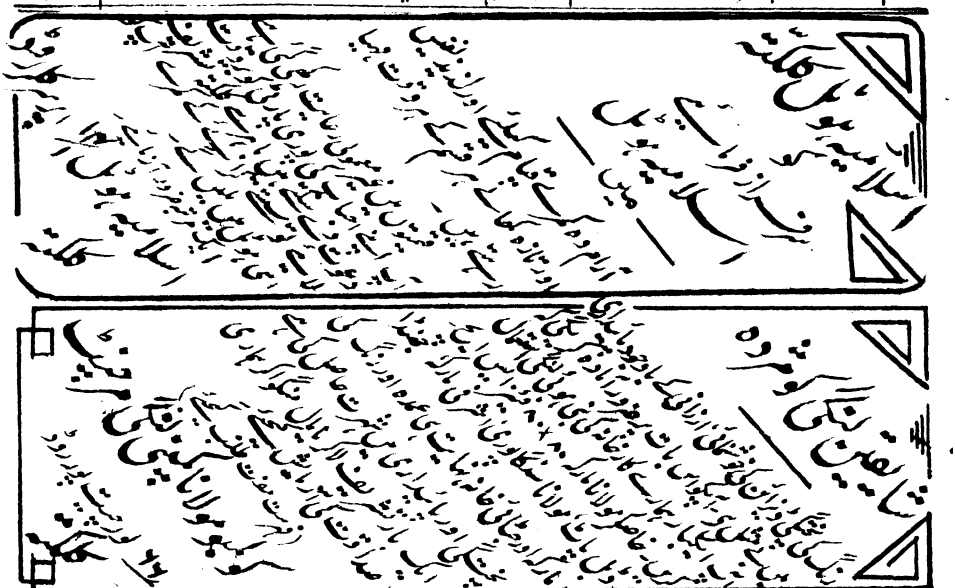

خریداروں کو خوشخبری

لیجئے کمی پوری ہو گئی

ناظرین ایم نے آپ حضرات کی سہولت اور آسائش کی خاطر اپنی دوکان واقع ۲۴۱ راجہ کٹڑہ، پان پوستہ، بڑا بازار کلکتہ میں کرانہ اور پرچون کے کل سامان فراہم کئے ہیں۔ جس میں کھانے میں ڈالنے کے ہر قسم کے مصالحہ جات (Spices) اور پان کے ساتھ کھانے کے مختلف قسم کے مصالحہ جات مثلاً کیسٹ بلاس کھ بلاس وغیرہ، کیلا کتھہ اور جنک پوری کتھہ دونوں اقسام کے کتھہ اور مختلف قسم کی ڈبی اور تمام مشہور کارخانوں کے ذردہ اور پیکٹ کی شکل میں اور کھلا ہوا قوام، تازہ عرق گیوڑہ۔ گلاب، قسم قسم کے خوشبودار تیل اعلیٰ ترین شربت کے اسنس اور بوتلیں انگور لکھ سرکے ہر وقت بازار سے تشنہ دام پر دستیاب ہوں گے۔ نیز آرڈر آنے پر بنگال اور آسام کا پان بھی ہماری کمپنی سپلائی کرتی ہے۔

امید گر آپ ایک مرتبہ بطور آزمایش ایک بار آرڈر مرحمت فرما کر یا خود تشریف لاکر ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں گے تفصیل خط وکتابت سے یا خود تشریف فرما کر معلوم فرمائیں۔

پتہ۔ امین برادرس کرانہ مرچنٹس ۲۴۱ راجہ کٹڑہ۔ پان پوستہ۔ پوسٹ بڑا بازار۔ کلکتہ

حساب کتاب

خریداران ندیم سے

ندیم کی اشاعت میں تاخیر اور اسکے اسباب کا علم "نظرات" کے مطالعہ سے آپکے علم شریف میں آئیگا لیکن ضرورت ہے کہ دفتر کی طرف سے خریداران ندیم کو انکا حساب کتاب بھی جزئی تفصیل کیساتھ سمجھا دیا جائے

آپ کو یاد ہوگا!

بہار نمبر اوائل اپریل میں تین سو صفحوں کی ضخامت میں نکلنے والا تھا اور وہ پچھلے بہار نمبروں کی طرح مارچ اور اپریل کا مشترک نمبر ہوتا۔ لیکن افسوس کہ اسوقت یہ نمبر شائع نہ ہو سکا۔ اور دو مہینوں کے مزید پرچے اس میں بڑھا دئے گئے۔ مئی اور جون کی مشترک ضخامت ۶۴ صفحے ماہانہ کے اعتبار سے ۱۲۸ صفحے ہوتی۔ اسطور پر چار سو اٹھائیس صفحے آپ کے واجب الادا تھے۔ لیکن یہ نمبر ۴۲۰ صفحوں کے بجائے صرف صفحہ مضامین ۴۶۰ صفحوں میں شائع ہو رہا ہے۔ اور تصویروں اور اشتہاروں کے صفحات مزید ہیں۔ اس طور پر ۴۲ صفحے اس تاخیر کے سبب مزید بڑھ گئے۔ مجموعی طور پر چار مہینوں کے مجموعی صفحات ۶۴ صفحے ماہانہ کے اعتبار سے ۲۵۶ صفحے ہوتے اس طرح صرف صفحہ مضامین میں چار مہینوں کی ضخامت ادا کرنے کے بعد دو سو صفحات سے بالا صرف بہار نمبر کی خاطر اس میں مستزاد کئے گئے ہیں۔ پھر یہ بھی خیال شریف میں رہے کہ بہار نمبر کے ہر صفحہ میں ۲۵ کے بجائے ۳۳ سطریں ہیں اور حروف باریک ہیں گویا ندیم کے عام نمبروں کے چار صفحوں کا مضمون اس میں صفحوں سے بھی کم میں آیا ہے۔ اس طرح یہ مجموعی ۴۶۰ صفحے گویا ۶ سو صفحوں سے بالا ہیں۔

بہر حال

گرچہ یہ رسالہ چار مہینوں کے رسالوں کا مجموعہ ہے۔ لیکن دو سو سے بالا صفحات صرف صفحہ مضامین (ریڈنگ میٹر) کے اس میں خاص بہار نمبر ہی کے ہیں اور پچیسوں تصویریں متعدد رنگین شاہکار وغیرہ مستزاد۔

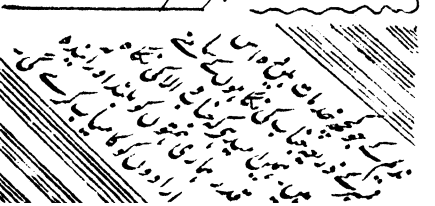

نیازمند

سید علی مظفر امام آنگلوی

مینیجر رسالہ "ندیم" گیا

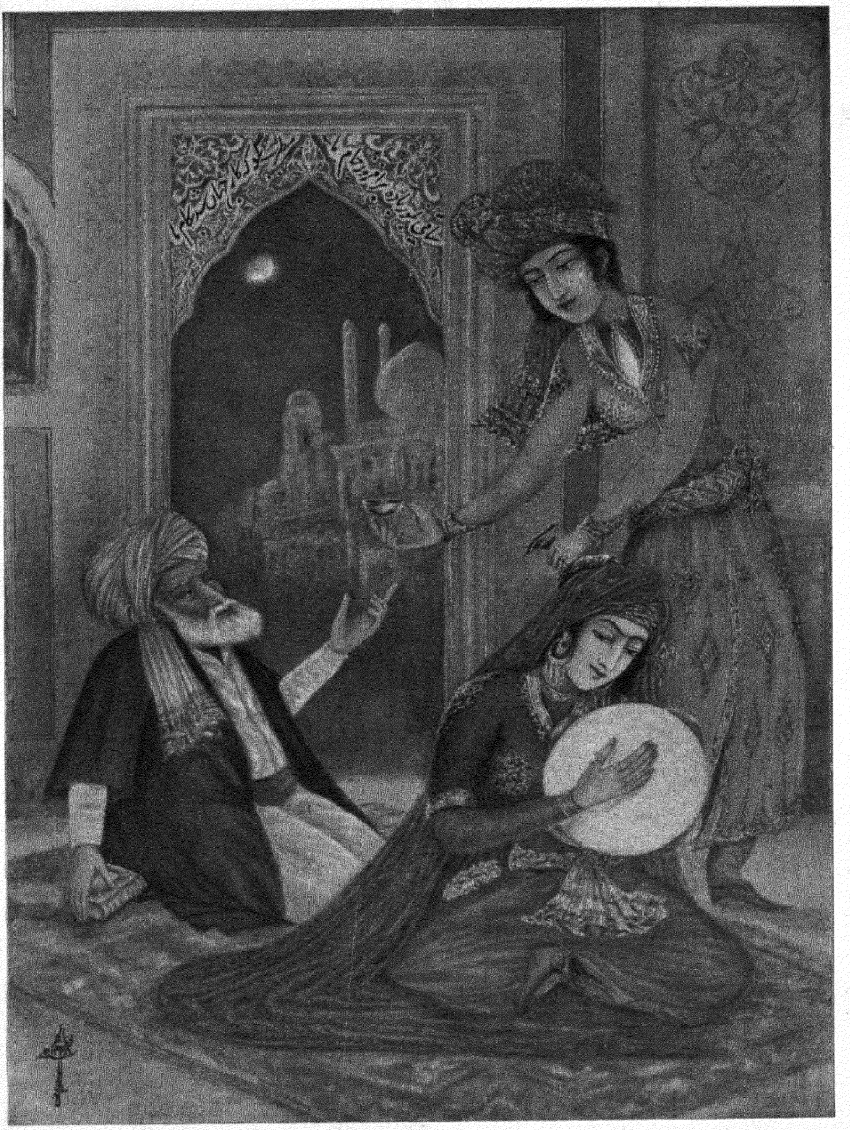

ساقی بنورِ بادہ برافروز جامِ ما ❦ مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکامِ ما

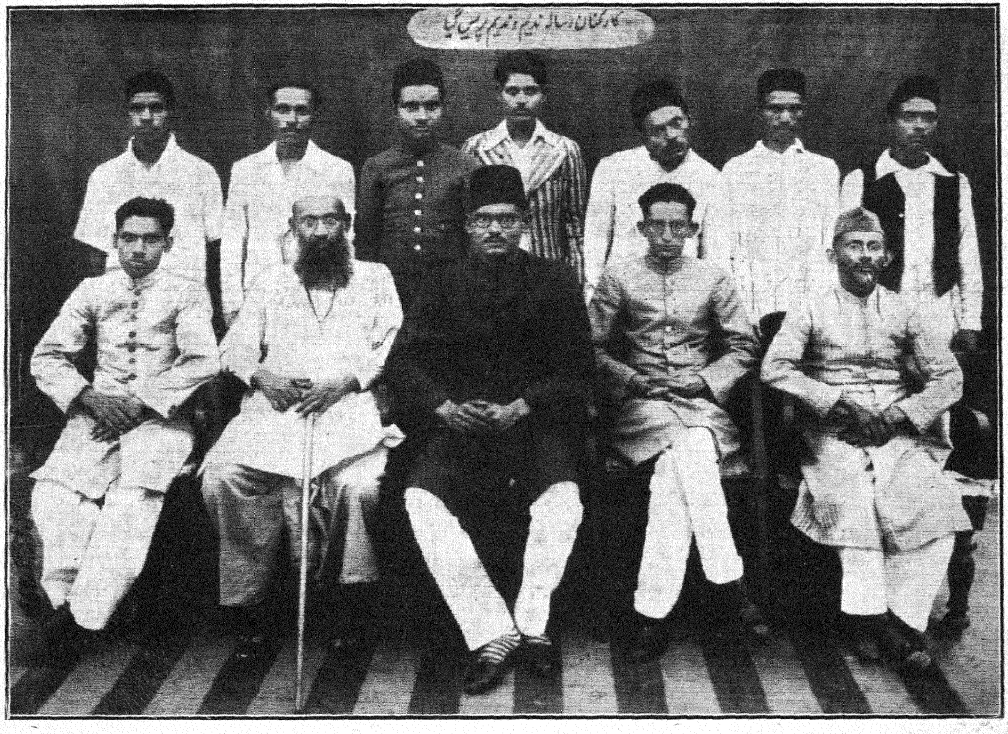

منشی محمد یوسف (کاتب) — سیّد علی مظفر امام آبگلوی (سب اڈیٹر و مینیجر) — سیّد ریاست علی ندوی (اڈیٹر و پروپرائیٹر) — جناب ابو محمد سیّد حسن امام وارثی حسن (رکن اعزازی شعبۂ مطبوعات) — سیّد نظام الدین (ہڈر کاتب)

بقائی (کلمین)، شمس الدین عرف رجو (کلمین)، سیّد محمد اقبال حسین (پریسین)، عبدالستار (مشین مین)، سیّد ظہیر حسن (کاتب)، محمد ہاشم خاں (دفتری)، محمد زمان خاں (پیپر مین)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

خداوند تعالیٰ کا فضل و کرم ہو کہ بہار نمبر ۱۹۴۰ء کے انتظار کی آخری حدیں بھی گذر چکی تھیں بالآخر اتمام کو پہنچا۔ اور ان سطروں کے ملاحظہ کے وقت وہ ناظرین ندیم کے ہاتھوں میں ہوگا۔ جسوقت بہار نمبر کا اعلان کیا گیا تھا۔ ندیم پریس دو عدد دستی پریسوں پر مشتمل تھا۔ جن میں سے ایک اپنی پرانی فرسودگی کے سبب بیکار سا تھا۔ اس لئے ایک ہی پریس پر دو پریس منٹوں سے دن اور رات دونوں وقتوں میں کام لیا جاتا تھا۔ بہار نمبر کی چھپائی بھی اسی طور پر شروع ہوئی۔ لیکن چند ہی دنوں کام کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اس راہ سے منزل مقصود تک پہنچنا شاید ممکن نہ ہو۔ اسلئے کارکنان ندیم کے سامنے اب دو راہیں تھیں یا تو کاپیاں لکھوا کر شہر کیساتھ کسی دوسرے شہر میں لکھوکر مشین پریس سے اسکو چھپوایا جائے یا ندیم پریس ہی کو ترقی دیکر "ندیم الکٹرک مشین پریس" کر دیا جائے۔ اول الذکر صورت کا اختیار کرنا مختلف اسباب کے لحاظ سے مزید دقتوں کا باعث تھا اس لئے کارکنان ندیم مجبور ہوئے کہ وہ خدا کی ذات پر بھروسہ کرکے موخر الذکر صورت ہی کیلئے اپنی ہمتوں کو بلند کریں راہ کے دشوار گذار مرحلوں کا پورا علم تھا۔ لیکن انہیں خاطر میں نہ لاکر صرف خداوند ذوالمنن پر توکل کرکے عزم راسخ کے ساتھ قدم اٹھایا گیا۔ اور بحمداللہ کہ ۶ اپریل کو مشین پریس ندیم پریس میں لے آیا گیا۔

× × ×

الکٹرک مشین پریس کا لانا کارکنان ندیم کی دیرینہ آرزوؤں میں داخل تھا۔ جس کا تذکرہ متعدد مرتبہ ان صفحوں میں آتا رہا ہے۔ اس میں جس طور پر کامیابی ہوئی اسکو بجز فضل خداوندی کے اور کسی امر سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر دنیاوی اسباب علائق کو دیکھا جائے تو بہار شریف کے سنجیدہ باوضع صاحب ذوق اہل علم جناب سید شاہ حسین سجاد صاحب جناب مولوی سید ابوالفتح محمد شمس صاحب وکیل و مخلص محترم مولوی سید محمد ایوب صاحب تعلقدار بنگلوی کی اخلاقی معاونت ندیم کے ارکان دامی کا بروقت ایفائے عہد بہار نمبر کے شائقین کا بیشکی عطا کردہ زرخریدہ اور ندیم اور ندیم پریس کے نام نہاد پروپرائیٹر کا تھوڑا بہت ذاتی اندوختہ اس راہ کی اقتصادی صعوبتوں کے مرحلوں کے طے کرنے میں کام آیا۔ اور بیک وقت مشین پریس اور بہار نمبر کے تعلقات توقع غیر معمولی کثیر سہارت پورے ہو سکے۔

× × ×

۶ اپریل کو ندیم کے قبضہ میں مشین پریس کے آجانے کے بعد خیال تھا کہ اس پر بہار نمبر کو چند دنوں میں آسانی سے چھاپ لیا جائیگا۔ اسی توقع پر اطلاعات بھیجدی گئیں کہ بہار نمبر اواخر اپریل یا اوائل مئی میں اپنے قدردانوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائیگا۔ لیکن جب مشین کے نصب (فٹ) کرنے اور اسکی آزمایش (ٹرائی) کرنے کی نوبت آئی تو معلوم ہوا کہ مشین کا ایک رولر مشین کے لائے جانے کی راہ میں کہیں گر کر ٹوٹ گیا ہے۔ نئے رولر کے تیار ہونے اور مشین کے چالو ہونے میں خاصی دیر لگی۔ یہاں تک کہ ۱۵ مئی سے پہلے ہم اس پر صحیح طور پر کام کرنے کے قابل نہ ہو سکے۔ اور یہ تقریباً ڈیڑھ مہینے کا وقفہ "تعطل" میں گذر گیا۔ سینڈ پریس کو معطل اس لئے کر دیا گیا کہ کہیں اس پر قدرتی مزید زیادہ ہو سکتا تھا اور یہ بعینہٖ بخواہ مشین کے آجانے کے بعد رسالہ کو بری چھپائی کیسایہ جان بوجھ کر چھاپنا طبیعت کو گوارا نہ ہو سکتا۔ اٹھنے سارے ستم ظریفی یہ تھی کہ اس کا بھی صحیح اندازہ نہ تھا کہ فٹنگ اور ٹرائی میں اتنے دن گذر جائیں گے۔ ورنہ ہینڈ پریس کو کسی نہ کسی طور پر جاری رکھا جاتا۔ بہرحال ۱۵ مئی سے کام شروع ہوا۔ اور ۱۹ سے اپنی پوری تیزی کے ساتھ جاری ہو گیا یہاں تک کہ ۲۰ جون کو تقریباً پانسو صفحات پر مشتمل بہار نمبر چھپ کر تیار ہو سکا۔

× × ×

ہمیں بخوبی معلوم تھا کہ بہار نمبر کی اشاعت میں اس قدر غیر معمولی تاخیر ناظرین کیلئے سوہان روح ثابت ہو رہی ہے۔ انکے بیتابانہ خطوط ذکر میں آتے رہے ابتداءً انہیں جوابات دئے گئے۔ لیکن جب انکی کثرت اس حد تک بڑھ گئی کہ انکے جوابات کیلئے ایک مستقل علیحدہ دفتر قائم کرنے کی ضرورت سامنے آئی تو ہمیں مجبوراً اعلانی کارروائی کی راہ دیکر تقریباً پانچ چھ سو خطوط کو بادل ناخواستہ جواب دئے بغیر قابل کر دیا۔ بہار نمبر کی تاخیر اشاعت کے یہ تفصیلی وجوہ اور اصل انہی کی مذکورات میں مذکورات کے ساتھ بطور معذرانہ جواب کے پیش ہیں۔

× × ×

بہرحال جو واقعات گذر رہے تھے گذر چکے۔ ان کا تذکرہ چھوڑیئے۔ اب یہ ہمارے لئے موجب اطمینان ہے کہ مشین کے آجانے کے باعث خدا کے فضل و کرم سے ندیم کی دو بنیادی خرابیوں کا ازالہ ہمیشہ کیلئے ہو گیا۔ اب نہ اسکی اشاعت میں تاخیر پیش آئیگی کہ جو کام پہلے ہینڈ پریس پر مہینوں میں انجام پاتا تھا۔ وہ اب مشین سے ایک دن میں پار لگ جاتا ہے۔ اور نہ چھپائی کی وہ خامیاں ہونگی جن کو ہینڈ پریس کے باعث اب تک انجیر کئے ہوئے تھے بمقتضیٰ فضل و کرم خدا کے گویا بالکل نئی مستعد صناع (ریڈ کلیف میکر) کی بنائی ہوئی نہایت اچھے حال (ہیئر کنڈیشن) میں ہے چھپائی صاف ستھری اور اہتمام سے چھاپا جائے تو نہایت پاکیزہ ہوتی ہے۔ ہم نے اسوقت تک ندیم کی اشاعت کی کوئی ضمنی تاریخ مقرر نہیں کی تھی۔ "آئین ندیم" کے صفحہ کو خارج کر دیا گیا تھا۔ حالات قابو میں نہ تھے مگر اب مشین کے آجانے سے ہم پوری ذمہ داری سے اعلان کرتے ہیں کہ ان شاء اللہ بہار نمبر کے شائع ہوتے ہی جولائی کا رسالہ چند دنوں میں چھاپ کر پہلے ہفتہ میں شائع ہو جائیگا۔ اور پھر ہر آئندہ کا رسالہ وقت کی پوری پابندی کے ساتھ ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو دفتر سے روانہ ہو جایا کرے گا۔ والقصد منی والاتمام من اللہ۔

مشین کے آجانے سے اب ہمیں صفحہ ندیم کے ذریعہ مفید اور معیاری تصنیفات کے شائع کرنے کا موقع بھی حاصل ہوگا۔ توقع ہے کہ امسال ہم ایک دو کتابیں منظر عام پر لاسکیں گے۔

× × ×

ندیم کو وقت پر لانے اور مکتبہ ندیم سے کتابوں کے شائع کرنے کے بعد اس کے تو ردالوقتی ادا فرض کے احساس کی ذمہ داری ان کے سامنے آئیگی۔ امید ہے کہ وہ بھی اپنے فرائض سے غافل نہ ہوں گے۔ اور صوبہ میں علم و ادب کے صحیح مذاق کے پھیلانے میں وہ ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

× × ×

ندیم کی رکنیت دوامی کا اعلان پچھلے سال ماہ جنوری میں کیا گیا تھا کہ ایسے ایک سو اہل ذوق ہمارے ادارہ کی رکنیت دوامی قبول فرمائیں جو پچیس روپے یکمشت ادا کر سکیں تاکہ ورانہیں اس حق سے یہ آسانی حاصل ہو کہ ندیم انکی خدمت میں عمر بھر بلا معاوضہ حاضر ہو۔ اور مکتبہ کی تصنیفات نصف قیمت پر انہیں پیش کی جا سکیں۔ ہماری صدا پر بہتیروں نے لبیک کہا۔ بہت سے اسمائے گرامی رجسٹر میں درج کئے گئے۔ یہاں تک کہ ایفائے عہد کا موقع آنے کے بعد حسب ذیل ارباب کرم کے اسمائے گرامی رجسٹر میں درج رہ سکے۔ ہم انکی خدمات میں مخلصانہ شکریہ کا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔ موصوفین کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جناب خان بہادر نواب سید شاہ واجد حسین صاحب م۔ ا۔ ں۔ سی خسرو پور (۲) جناب سید حسین امام صاحب وارثی رئیس گیا (۳) جناب از بیل سید حسین امام صاحب بیرسٹر ایٹ لا (۴) جناب سید مظفر علی امام صاحب حسین منزل (۵) جناب سید ابو العاص صاحب ابو العاص پٹنہ (۶) جناب سید شاہ محمد حسین صاحب خسرو پور (۷) جناب سید علی حیدر صاحب گیا (۸) جناب سید شاہ حسین سجاد صاحب رئیس بہار شریف (۹) جناب مولوی سید محمد ایوب صاحب آنکلوی (۱۰) جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ عربی جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد (۱۱) جناب خان بہادر حاجی چودھری شیخ محمد بخش صاحب رئیس کھٹیار (۱۲) جناب خان بہادر صفدر الرحمن صاحب رئیس راجگی (۱۳) جناب پروفیسر سید مظفر الدین صاحب بندوی ایم۔ اے۔ کلکتہ (۱۴) جناب ڈاکٹر سید افتخار احمد صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ال (۱۵) جناب سید شاہ رحمت اللہ صاحب بیرسٹر پولیس سپرنٹنڈنٹ (۱۶) جناب سید عبد الجلیل صاحب صدر مہتمی انسپکٹر اسکولز (۱۷) جناب خواجہ غلام احمد صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ال (۱۸) جناب مولانا سید محمد طاہر صاحب اثر اتھوی (۱۹) جناب مولوی عبد الکریم صاحب آزاد بھاگلپور (۲۰) جناب مولوی محمد جمال صاحب ندوی گیا۔ (۲۱) جناب حسیب الحسن صاحب عظیم آبادی (۲۲) جناب سید رضا قاسم صاحب مختار پلاموں (۲۳) جناب سید آفتاب حسن صاحب ایم۔ ایس۔ سی علیگ (۲۴) جناب ڈاکٹر سید امداد امام صاحب گیا (۲۵) جناب سلیم الدین احمد صاحب اف رانچی

پچھلے فروری کے پرچہ میں اطلاع شائع کی گئی تھی کہ رکنیت دوامی کے لئے زرچندہ کی یہ رقم آئندہ باقی نہ لگائی جائیگی۔ لیکن مولوی سید محمد ایوب صاحب اور بعض دوسرے قدر دانوں کے خطوط آئے جن میں اس تحدید کو آگے بڑھانے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اسلئے اعلان کیا جاتا ہے کہ دوسری اطلاع تک رکنیت دوامی کا زرچندہ بھی باقی رکھا جائیگا کہ شین پریس کے آجانے کے باوجود بعض دوسری بنیادی ضرورتیں ہیں نیز الکٹرک کی فٹنگ کا کام باقی رہ گیا ہے۔ امید ہے کہ اہل ذوق اس مہلت سے فائدہ اٹھائینگے۔

× × ×

اب آیئے ندیم کے بہار نمبر کے مالع و بہار مضامین کی بھی سرسری طور پر ایک سیر کر لیں۔ بہار نمبر کا افتتاح حضرت مبارک کی نظم "نوید نو بہار" سے کیا گیا ہے۔ جو گویا بہار نمبر کے خیر مقدم میں کہی گئی ہے۔ مبارک عظیم آبادی ہمارے صوبے کے گہنہ مشق استاد فن ہیں۔ موصوف کے وجود گرامی سے عظیم آباد کی شاعری کا سینہ بلند ہے۔ اور اسکی روشنی سے سارا صوبہ فیض اٹھا رہا ہے۔ مسرت ہے کہ موصوف ندیم کو اپنی شاعری کا ترجمان جانتے ہیں۔ بہار نمبر میں جتنے اضافے تحسین پہنچے ہیں۔ مبارک کی نمائندگی ان سب میں موجود ہے۔ "نوید نو بہار"۔ "ترانۂ اردو"۔ "جذبات مبارک"۔ "رباعیات مبارک" آپ کی فکر رسا کے نتائج ہیں۔

× × ×

مضامین کا آغاز حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہٗ کے مقالہ سے کیا گیا ہے۔ مولانا شبلی علیہ الرحمہ کے خدمات کے علمی ادبی اور تنقیدی پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اسوقت تک انکی اردو شاعری پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا۔ یہ انکی اردو شاعری کی خوش نصیبی تھی کہ وہ موضوع محققین کے تحقیقی نقص کے حصہ میں آئی۔ راقم سطور نے الاستاذ مدظلہٗ سے اردو شاعری میں مولانا کے صحیح مرتبہ سے ارباب ذوق کو آگاہ فرمایا۔ ندیم کے بہار نمبر کو نالہ ہے کہ اس کے مضامین کا آغاز دور حاضر میں ہندوستان کے سب سے زیادہ جامع کمالات گرانمایہ ہستی کے اس کم تر مقالہ سے کیا گیا ہے۔ ولافخر ——— حضرت وحی احمد بلگرامی ہمارے صوبہ کے وہ مایہ ناز ادیب ہیں جن کی انشائے شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کی انشا کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ لیکن وہ کسی کے متبع نہیں بلکہ دور حاضر میں وہ خود ایک صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ ان کے مضامین بہت کم شائع ہوئے ہیں۔ لیکن جو دو چار پہلے ہیں انکی حلاوت قدر سے وہ ہندوستان کے بلند مذاق اہل علم کے طبقہ میں احترام اور اعتراف کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ جن لوگوں کی نگاہوں سے پچھلے بہار نمبر میں انکا اچھوتے انداز کا مضمون "س ریش۔ ص" گزر چکا تھا۔ وہ بہار نمبر ۱۹۳۸ء میں ان کے مضمون "سیاہی کی بیتی" کی نقاب کشائی کے دیر سے متشوق تھے۔ اس مضمون کے عنوان کی ندرت بھی کچھ کم نہیں۔ ارباب نظر مقالہ کے مطالعہ سے لطف اندوز ہوں ——— دور حاضر کے مایہ ناز ممتاز انشا پرداز اور ہمارے دیرینہ مخدوم محترم مولانا عبد الماجد دریابادی کے "بہار کی بہار" میں اپنے بہاری دوستوں عزیزوں اور مخلصوں کی سلام محبت سے یاد فرمایا ہے۔ مولانائے محترم کی ذات گرامی پر اردو علم و ادب کو ناز ہے۔ ہم صوبہ بہار کے عظیم دوست طبقہ کی جانب سے ندیم کے بہار نمبر میں مولانائے موصوف کا مخلصانہ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ انھوں نے اودھ کے خطہ سے بہار کی خاک پاک کی طرف محبت کے جو ہاتھ پھیلایا ہے۔ ہم اس کو عقیدت کی نگاہوں سے چومتے ہیں۔ اور انکی خدمت میں ان کے بہاری قدر دانوں کے اخلاص و محبت کا تحفہ پیش کرتے ہیں۔

× × ×

اس کے بعد علمی مقالات کی ترتیب میں اولاً تاریخی دوروں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے برادر محترم مولانا سید ابو ظفر ساحب ندوی کے "فاتح بہار بختیار خلجی" کی جگہ قدرۃً سب پر مقدم ہے۔ اس میں اختصار، جامعیت اور سادگی کے ساتھ علمی پر عالمانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ پھر "اورنگ زیب" کی ترتیب کے لحاظ سے ہمارے محترم دوست مولانا عبد الباقی کے "انشیر شاہ" کی جگہ تھی لیکن یہ یہ تاخیر موصول ہوا۔ عمدۃ الملک نواب داؤد خاں اس پر طباعت میں سبقت لے جا چکا تھا یورپ کے ایک ممتاز علمی رسالہ میں ایک مستشرق نے شیر شاہ کے کردار کو غلط روشنی میں دکھایا تھا۔ مولانا عبد الباقی نے اس فاضلانہ مضمون میں اور اصل [illegible]

اس مضمون میں شہ شاہ کے کردار پر ایک نئے زاویہ میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ مقالہ کی افادیت کا پہلو اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے ——— جناب سید رضا قاسم صاحب کا مضمون انکی مساعی کا آئینہ دار ہے۔ داد و دعا پر کیا جامع مقالہ اردو میں اب تک شائع نہیں ہوا۔ ہم موصوف کو اس کامیاب مقالہ پر دلی مبارکباد دیتے ہیں ———

جناب محترم پروفیسر جین عمکری کے ہم شکر گذار ہیں کہ انھوں نے اسلامی عہد کے "آخری ہندوستانی گورنر بہار جہاز" کے متعلق ان مستند معلومات کا نفیع مقالہ کیلئے عنایت فرمایا۔ موصوف ملیہ یونیورسٹی میں علم تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ انگریزی کے ممتاز معیاری تاریخی رسالوں میں ان کے مضامین وقعت کے ساتھ چھپتے رہتے ہیں۔ اردو میں شاید ان کا یہ پہلا مقالہ ہے جو ندیم کے صفحہ میں آیا ہے۔ اس موضوع پر اس وقت تک اردو نہیں انگریزی زبان میں بھی ایسا ذخیرہ فراہم نہیں ہوا ہے۔ امید ہے کہ موصوف اب اسکو انگریزی تاریخ میں منتقل فرمائینگے

ان تاریخی مضامین کے سلسلہ کی آخری کڑی ہمارے دیرینہ کرمفرما جناب مخدوم محترم مولانا سید منا ظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ کی "مضمون" مولانا سید عبد العزیز وارثی ہے۔ گرچہ اس مضمون کا موضوع ایک صاحب کمال کے سوانح حیات کا پیش کرنا ہے۔ لیکن دراصل اس مضمون میں صوبہ بہار میں اسلامی حکومت کے زوال اور انگریزی حکومت کے آغاز کے دور میں مسلمانوں کی مذہبی، اجتماعی اور تعلیمی زندگی پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ اور اس سلسلہ میں بہت سے ایسے معلومات جو کبھی احاطہ تحریر میں نہیں آئے۔ قلمبند کئے ہیں۔ اس موضوع پر کوئی صاحب تصنیت دردمند صاحب دل اہل علم ہی قلم اٹھا سکتا تھا۔ حق یہ ہے کہ حضرت ممدوح نے اس منت کا حق ادا کیا۔ گفتگو طولی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک مقالہ میں اسکی گنجائش نہ تھی۔ بشاشیہ مولانا کے محترم کبھی اسکی تکمیل فرمائیں اور اس سلسلہ میں ایک صاحب کمال کے قابل قدر سوانح حیات بھی ترتیب پاجائیں۔ ندیم کے صفحات موصوف کے لئے ہر وقت حاضر ہیں۔

× × ×

اس کے بعد مختلف موضوعوں پر مختلف اہل علم کے قابل قدر مضامین آئے ہیں جن میں پہلا مضمون "فردوسی و دقیقی" پر ہمارے عنایت فرما پروفیسر عطا کاظمی رضوی کا ہے۔ موصوف فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر ایران تشریف لیجانے گئے تھے۔ فردوسی پر یا معان نظر ڈالی گئی ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے دکھایا ہے کہ فردوسی نے دقیقی کی طرف جو اشعار شاہنامہ میں منسوب کئے ہیں۔ وہ بھی دراصل فردوسی ہی کے ہیں۔ اس نظریہ کے ثبوت میں جو دلائل و براہین موصوف نے پیش کئے ہیں۔ وہ کم سے کم ہماری عام نظر میں تو ند عاکو ثابت کرتے ہیں۔ اس سلسلہ کے وہ اور دیگر مضامین وقتاً فوقتاً اردو کے رسالوں میں شائع کراتے رہیں۔ اور اہل علم کی تذکر کی انکا دیکھنے ہیں ——— برادر محترم مولانا پروفیسر سید مظفر الدین ندوی ام۔ اے علی ہندوستان کے موجودہ "خانقاہ ازم" پر نظر ڈالی ہے۔ شاید دینی نقطہ نظر سے تو اس میں وہی کچھ ہو جو اب تک سلف کا مسلک رہا ہے۔ خداوند تعالیٰ موصوف کو انکے حسن نیت کا اجر عطا فرمائے۔ ان مباحث پر اگر روشن خیال طبقے وقتاً فوقتاً لکھتے جائیں تو شاید آہستہ آہستہ بہت سے مجادلات اوٹھتے جائیں۔

× × ×

یادش بخیر حضرت "دیو جانس بہاری" انھوں نے اپنے گرانقدر مقالہ میں "فلسفہ خود بینی و خود نمائی" کے تار و پود کیسے اچھوتے انداز میں بکھیرے ہیں کہ شاید یادگار زمانہ رہ جائے۔ اور انکی صدائے بازگشت دیر تک سنائی دیتی ہے۔ ہمارے صوبہ میں یہ مرض اب کچھ عام سا ہوا جاتا ہے۔ بات میں بات یاد آئی۔ ہمارے صوبہ کے ایک روشناس شاعر قدیم وضع کے لکھنوی رنگ میں شاعری کرتے ہیں۔ کچھ دن ہوئے ان کا کچھ کلام دفتر میں ان کے چھپے ہوئے لیٹر پیپر پر آیا۔ موصوف نے اس سبز رنگ کے کیرکٹر پیپر کے سرنامہ پر انگریزی میں موٹے حروف میں " ALLAMA " (علامہ) "تھلاں" چھاپ رکھا تھا۔ ضرورت ہے کہ ان خود ساختہ خطابات کے بتوں اور خود نمائی کی ایسی کج نما تصویروں کو توڑ دیا جائے۔ بوسوں کے دامن سے یہ ہوا نوجوانوں کے حلقہ میں پہنچ رہی ہے۔ اور صوبہ میں بد ذائقی کی وبا پھیل رہی ہے ——— گویا اسی قسم کی ذہنیتوں کو منظر عام پر لے آنے کے لئے حضرت دیو جانس بہاری کا یہ طنزیہ و تبسم مزاحیہ مکمل مقالہ ہے۔ اور جو اپنے نوع کی تو پہلی کڑی ہے۔ نوجوانوں کو کسی غلط روش سے آگاہ کرنا اور اس کے اتباع سے باز رکھنا بھی ادب کی ایک خدمت ہے۔ دیو جانس بہاری کی انشا کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنی زبان اور طرز ادا میں امکان بھر "مقفود علیہ" کی عبارتوں "قفوں" طرز اور ادران کے "بدیع الخیال" اختراعات فقرہ ہی کے لباس میں انکی انشا اور انکی تصنیف پر نظر ڈالی ہے۔ اس لحاظ سے اردو زبان میں اس مضمون کے ذریعہ طرز تنقید کی ایک نئی طرح ڈالی گئی ہے۔ امید ہے کہ سنجیدہ علمی مضامین کے پڑھنے والے اس طنزیہ طرز کے علمی مقالہ سے لطف اوٹھائیں گے۔

× × ×

اس کے بعد "غالب کی خودداری" کے عنوان سے جناب سید حیدر صاحب کا مضمون ہے۔ "غالب کی خودداری" کے واقعات اس کے سوانح حیات اور رقعات میں بکثرت ہیں۔ صاحب مضمون نے اس مقالہ میں غالب کے اردو اور فارسی کلام سے اس موضوع کے شواہد کمال دیدہ ریزی اور وسعت نظر سے بہم پہنچائے ہیں۔ امید ہے کہ یہ مقالہ اہل علم میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائیگا۔ غالب کے سلسلہ میں ایک اور مضمون ہا دیا، وہ ڈاکٹر سید اختر امام صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کا "غالب ایک نئے زاویہ نگاہ سے" کے عنوان سے تھا جس میں چند شعراء کے کلام کی روشنی میں ڈاکٹر موصوف کے مقدمہ غالب پر نظر ڈالی گئی تھی۔ افسوس کہ یہ مقالہ ابھی تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ شاید کسی آئندہ اشاعت میں شریک ہوسکے ——— اس موجودہ طرز تحریر، پیش اور اسکے اخبار میں لائق مضمون نگار نے گویا سوشلزم کے پیدا ہونے کے فطری اسباب کی طرف مخفی اشارات کئے ہیں۔ اس نوع کے مضامین سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے یہ دلچسپ مقالہ ہوگا ——— ہمارے محترم دوست ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب (ام۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی) پروفیسر گورنمنٹ کالج ملتان) نے تاریخ حقلیہ پر ایک نظر ڈالی ہے۔ ہمارے لائق دوست نے تاریخ حقلیہ کے مصنف کے ہماری ہوئے سے ہمارے ہی صفحہ میں اس مضمون کی اشاعت کیلئے ایک دلچسپ قانون مشتد جواز" حاصل کیا ہے۔ موصوف یورپ کی کئی زبانوں کے مستند عالم ہیں علم کا پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین پر

کے مختلف رسالوں اور اسلامک کلچر حیدرآباد میں چھپتے رہتے ہیں۔ اردو میں اورینٹل کالج میگزین اور معارف میں کبھی کبھی لکھتے ہیں۔ قدیم کے دو جدید مضمون نے ایک سے زیادہ مرتبہ اسکو بھی نوازا۔ بہار نمبر میں انکی تحریر کا جو عجیب انداز ہے ——— پورے میں علم و ادب کا چرچا" مولوی محمد سلیمان صاحب سے وہ مسئلہ جسے صاحب ذوق اہل علم کے قلم کا رہین منت ہے۔ اس مضمون میں اس دیار میں علم و ادب اور انکی نشر و اشاعت کا قابل قدر نقشہ جامعیت سے مرتب کیا گیا ہے۔ اور بعض ایسے معلومات ہیں جو کبھی احاطۂ تحریر میں نہیں آئے۔ موصوف کی ذات گرامی سے ان اطراف میں علم و ادب کا مذاق قائم ہے ——— بہار نمبر نے اردو میں ایک نئے تیاری پسند و خوش مذاق اہل قلم جناب راقم الحروف صاحب امیر کو روشناس کرنے کی عزت حاصل کی ہے۔ موصوف نے شستہ اور پاکیزہ اردو میں اپنے محبوب فن مصوری پر چند صفحے لکھ کر ہمیں عنایت فرمائے ہیں۔ موصوف کو فن مصوری میں بلند رتبہ حاصل ہے۔ اس عہد میں ہمارے صوبہ کے باکمال مصوروں میں سے ہیں۔ رام گڑھ کانگریس سشن کی نمائشوں میں صوبہ بہار کے جو مصور تاریخی مرقع کا کمرہ تھا۔ وہ موصوف کی خدمات کے اندازہ کیلئے کافی ہے۔ موصوف نے اپنے ذوق سے پٹنہ میں "پیٹنہ اسکول آف آرٹس" کے نام سے ایک ادارہ کی بنا ڈالی ہے۔ اور تھوڑی مدت میں اسکو ترقی کے عروج پر پہنچا دیا ہے۔ موصوف نے وعدہ فرمایا ہے کہ وقتاً فوقتاً اپنے مضامین اور مصوری کے نوادر سے ندیم کو سرفراز فرمایا کرینگے ——— اس کے بعد حضرت رخشاں ابدالی نے "حضرت صوفی منیری کی تاریخ گوئی کا ایک شاہکار" پیش کیا ہے۔ موصوف علم کا ستھرا مذاق رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ ان کے مضامین سے ندیم کے اوراق کی زینت بڑھے گی ——— آخر میں ایک فرع کے چند مضامین کا خاکہ بہار نمبر کی مناسبت سے دو مضمونوں پر کیا ہے۔ جن میں سے ایک "مجموعہ بدھ کے قبل جنوبی بہار"۔ جناب اظہر الحق قادری کا ہے۔ جو ایک قابل قدر مضمون کا نزعم رہے۔ اور دوسرا "صوبہ بہار کا ایک دلکش اجمالی مرقع" کے عنوان سے ہے جو ایک دوسرے طویل و لچسپ مقالہ کی مناسب تلخیص ہے۔

× × ×

اس کے بعد دوسرے باب "بہار میں اردو زبان اور شاعری" کا آغاز ہوتا ہے جس میں چند قابل قدر مضامین ہیں۔ "بہار اور اردو" پر حضرت حمید عظیم آبادی نے قابل قدر قیمتی معلومات یکجا کئے ہیں۔ اس عنوان پر شاد و بسمل مرحوم اپنا اپنا خاکہ اڑا چکے تھے۔ حضرت حمید نے ان پیشروؤں سے کسی تحقیق و اضافہ کا معلوم نہیں کوئی قدم آگے بڑھایا یا نہیں اس کا پتا نہ چلا۔ محسوس کرانے پیشروؤں کے لکھے ہوئے مباحث کے ذہن نشین نہ ہونے کے باعث اسوقت دشواری ہوئی۔ بہرصورت اس مضمون میں اس موضوع کے تمام معلومات نور بکھیرے ہوئے ہیں ——— اس کے بعد ایک مضمون "آبادی شاعر جس پر اکبر آبادی نے قصیدہ کہا ہے" از اعزاز خود ایک اکبر آبادی اہل علم کا ہے۔ اظہر اکبر آبادی اردو شاعری میں قدرتی مناظر کی مصوری کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ یہ عظیم آباد کے لئے باعث فخر ہے کہ وہ اسکی خاک اوڑھا۔ اس مضمون میں اسکی ایک تخلی مثنوی کے کچھ اقتباسات جھلائے گئے ہیں ——— اس کے بعد شاد عظیم آبادی پر دو قابل قدر مضامین آئے ہیں۔ جناب سید شاہ ولی الرحمن صاحب شاد کی شاعری پر تبصرانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ مسرت ہوئی کہ موصوف نے تبصرہ کے لئے اسی موضوع کو منتخب کیا۔ اور انکی غزل گوئی پر سیر حاصل بحث فرمائی۔ ہمارے عزیز دوست جناب گلاب چاندنی۔ اے نے بھی اسی موضوع پر قلم اٹھایا اور شاد کی غزل گوئی میں ایک نئے پہلو کو ——— سامنے رکھا ہے۔ عزیز موصوف ہمارے صوبہ کے ماہر ناز مصور جناب ہیرالال جی کے خلف رشید ہیں۔ ایک وقت ام۔ اے میں تعلیم پا رہے ہیں۔ ادب کا ستھرا مذاق رکھتے ہیں۔ مستقبل میں ان سے توقعات وابستہ ہیں ——— جناب نبزاد فاطمی خانزاد کشاد کے گل شبچراغ ہیں۔ اسوقت ام۔ اے میں پڑھ رہے ہیں۔ ذوق بلند نظر وسیع اور طبیعت سنجیدہ پائی ہے۔ امید ہے کہ مستقبل میں یہ ادب کے گرانقدر خدمات انجام دیں گے۔ ان کا مضمون "عہد حاضر میں بہار کے شعراء" انکی نوعمری کے باوجود انکی پختہ کاری کا شاہد ہے۔ ترتیب، چنانچہ استقصا اور مناسب لفظوں میں نقد اسکی نمایاں خصوصیات ہیں ——— جناب نسیم گورکھپوری نے بھی حسن اتفاق سے اسی موضوع پر قلم اٹھایا۔ مگر خوشی ہوئی کہ ان کا اصل روئے سخن شعراء پر نقد کے بجائے ان کے خستہ سوانح حیات کی جانب تھا۔ اس لحاظ سے یہ دلچسپ اور قابل قدر مضمون ہے ——— ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس باب میں "عالم علی اور اسکی تصنیفات" کے عنوان سے جناب مختار الدین آرزو کا لکھا مضمون پیش نہ کر سکے۔ وہ آئندہ اشاعت میں شریک ہے۔

× × ×

تیسرا باب "خواتین بہار" ہے اس میں صرف ایک مایہ ناز مضمون ہمارے مخلص دوست مولانا سید محمد طہٰ اشرف ہاشمی کا ہے۔ موصوف کے بصیرت افروز مضامین معارف، الاصلاح اور ندیم میں چھپتے رہتے ہیں۔ اور اہل نظر سے سند قبولیت حاصل کر چکے ہیں ——— اسی باب میں خضر بانو خیری کے عنوان سے جناب عبدالوکیل عزیزی کا ایک مضمون تھا۔ جسے شریک اشاعت کرنے سے ہم محروم رہے۔ آئندہ ماہ تین ناظرین کے مطالعہ میں ہوگا۔

× × ×

"آثار عتیقہ" کے باب میں پہلا مضمون قلعہ رہتاس پر تاجم مسطور کے فاضل دوست مولانا سید عبدالرؤف ندوی کا ہے۔ رہتاس گڑھ کے متعلق مستند تاریخوں میں جو کچھ ہے۔ ان سب کو انھوں نے اپنے اس مضمون میں سمیٹ رکھا ہے۔ موصوف معارف اور ندیم کے قدیم اہل قلم ہیں۔ تحریر میں خطری مناسبت رکھتے ہیں۔ اخذ و مطالعہ اور ترتیب مواد کی اچھی استعداد کے مالک ہیں۔ اور اسی حیثیت سے یہ مقالہ ترتیب پا سکا ہے لیکن افسوس ہے کہ گنجائش نہ ہونے کے باعث اس پورے مضمون کو دو مستقل مضمونوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ ایک میں وہاں کے آثار ہیں جو شریک اشاعت ہے۔ اور دوسرے میں اسکی مکمل تاریخ سرگذشت جو آئندہ مہینہ میں نظر عالی سے گذرے گا ——— دوسرا مضمون جناب سید محمد صابر صاحب قمر کاردی کا "روضہ شیر شاہ" پر ہے۔ یہ مختصر اور رواں ہے۔

× × ×

بہار نمبر کا پانچواں باب "شعرائے صوبہ بہار میں" کے انوکھے عنوان سے ہے۔ سرماں ہمارے مخلص دوست عنایت اللہ ابدالی

صاحب وکیل گیا کا پرمغلوبات و قابل قدر مقالہ "قدر میں کیا کے سیاسی حالات ہے - موصوف ہمارے شہر میں علم کا سکہ اشاعت بخشتے ہیں - مطالعہ کے مستقل عادی ہیں - اور ہمیشہ تازہ رہتا ہے - ابھی سنجیدہ قدیم و جدید مطبوعات ان کی نظر سے گذرتی رہتی ہیں یا اس عنوان پر ایسا جامع اور بصیرت افروز مقالہ اسوقت تک اردو میں شائع ہوا ہے - خصوصاً ہمارے صوبہ کے متعلق اب تک اس باب کا صفحہ سادہ تھا - اس مقالہ میں گویا پورے صوبہ کے واقعات کا ذکر ملک گونہ آگیا ہے - مقالہ کا تہائی حصہ اسباب واقعہ اور اس کے نتائج پر جس سلامت روی بنجیدگی غور و فکر مناسب اور نپے تلے لفظوں میں نظر ڈالی گئی ہے وہ انکی تبادر انتخابی پر شاہد ہے ——— اس باب کا دوسرا مضمون ہمارے نوجوان عزیز جناب خواجہ عبدالقیوم کا ہے - اس میں "صوبہ بہار کے ایک بہادر باغی" کو روشناس کرایا گیا ہے - یہ مضمون الہ آباد یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر تاریخ ڈاکٹر اشتوری پرشاد کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے جس میں داخل اس عہد کے مشہور مورخ کنور سین کے سبب تفاوت پر روشنی ڈالی گئی ہے - عزیز موصوف اگر اسے اچھے طالب علموں میں ہیں - اس سے پہلے ان کے مضامین ندیم میں چھپ چکے ہیں - توقع ہے کہ وہ مستقبل میں صاحب نظر اہل قلم میں ہوں گے -

× × ×

اس کے بعد چھٹا باب منظومات پر مشتمل ہے - مبارک کے ترانہ اردو کے بعد ہمارے صوبہ کے کہنہ مشق ممتاز شاعر جلیل سمار حضرت سریر کابری میسانی کی قابل قدر نظم "قلعہ مناتھ" پر ہے - موصوف کو نظم نویسی میں ید طولیٰ حاصل ہے - اور اس نظم میں ان کا خاص انداز نمایاں ہے ——— ہمیر حضرت جمیل مظہری کی ایک تازہ نظم آتی ہے ——— تازہ کی نظر بیح اس لئے کہ ان کے پرانے کلام آئے دن بار بار رسائل و اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں ——— حضرت جمیل صوبہ کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے امام ہیں - یا یوں کہئے کہ "نئے ادب" یا "ترقی پسند مصنفین" کی صف میں ہمارے صوبہ کے نمائندوں کے سرخیل و مقتدی ہیں - ان سے تفصیلی ذاتی تعارف کا اتفاق ابھی چند ماہ گذرے حاصل ہوا - موصوف جدید تعلیم یافتہ ہیں لیکن خیالات عقائد بیطرہ روکرتاریخ، آداب مجلس اور اخلاق میں قدیم تہذیب کی روایات کے حامل ہیں - ادب میں نئے رجحانات کے پیدا کرنے کے دلدادہ لیکن اس روش میں سختی سے جادۂ اعتدال پر قائم رہنے کے پابند ہیں - قدرت نے شعر و ادب کا ذوق بقدر وافر ملک کے ان کی طبیعت میں ودیعت کیا ہے - انکی ایک نظم "حقیقت اسکی" اور ایک تازہ غزل شریک اشاعت ہے - پھر ایک افسانہ "گرفس کی قربانگاہ پر" افسانہ کے باب کے آغاز میں ہے انکا پہلا حصہ چھپے بہار نمبر میں شائع ہو کر قبولیت عام حاصل کر چکا ہے - انکی غیر معمولی سرکاری مشغولیتوں کے باوجود شبانہ روز کے انہماک کے ساتھ اس دوسرے حصہ کو انھوں نے مرتب کیا - اس میں فرض، محبت کی کشمکش اور اس کے مختلف مرحلوں میں غیر شعوری نفسیاتی احساسات کی حقیقی ترجمانی کو حسن طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے - وہ انکی آپ مثال ہے - زبان کی شیرینی اور طرز ادا کی ندرت سے مطالعہ کے وقت کہیں ہمیں زبان سے بے ساختہ واہ تحسین نکلتی ہے - اگر جمیل صاحب کچھ مستقل ادبی زندگی سے وابستہ ہوتے تو اردو ادب میں گرانمایہ جواہر کا اضافہ کرتے - تاہم انھوں نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ کبھی کبھی اپنی تحریروں سے ندیم کو سرفراز فرمایا کریں گے ——— اس کے بعد منظومات میں حضرت نوح ناروی نے بہار نمبر کی مناسبت سے سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی کی نظم عنایت فرمائی ہے - اجو ہمارے لئے تبرکات میں سے ہے ——— پھر حضرت رضی بادش بخر ——— بھی وہ ادارۂ ندیم سے وابستہ ہیں - انکی نظم "میری شاعری اور سامعین" ہے - حضرت رضی صوبہ کے نوجوان شعراء کی صف اول میں ہیں - ابھی حال میں انکی کئی نظموں کے سننے کا اتفاق ہوا - انکی موجودہ شاعری ان کے موجودہ سیاسی رجحانات کی آئینہ دار ہے - یعنی ——— ع - شعر کی گرمی میں پگھلا کر سیاسی ڈھالنا ——— موصوف نے وعدہ کیا ہے کہ وہ آئندہ اپنے کلام سے ندیم کو نوازا کریں گے کہ شاید انکی فوج میں اس راہ سے بھی کچھ "سیاسی" انتقال ہو جائیں ——— اس کے بعد "نغمہ بہار" کی لے حضرت ضیا رشیدی ایم - اے نے سنائی ہے - اور یہ ہے کہ پوری نظم کچھ عجیب دلکش دھن میں ہے - اور شاید بہار نمبر کی مناسبت سے سب نظموں سے زیادہ مناسب حال - اس میں انھوں نے پرمنت نے میں بہار کا نغمہ سنایا ہے - اور اسی لحن میں - یہ کے قابل ذکر ارباب کمال اہل علم ادبا اور شعرا کی خدمت میں انھوں نے گویا ندیم کی جانب سے خراج عقیدت پیش کیا ہے - موصوف کے تازہ کلام آئندہ اشاعتوں میں بھی نظر آئیں گے اسی انداز کی ایک دوسری نظم "چمن اردو" ہمارے لائق دوست جناب سریر کی ہے - یہ نظم انھوں نے بہار کے "نمائندہ" کی حیثیت سے دلی کے ایک مشاعرہ میں سنائی تھی - اور بہار نمبر کی مناسبت سے بھی اشاعت کے لئے مرحمت کی ہے ——— جناب اختر قادری بلند روی ایم - اے کی منظم "یہ دنیا" بھی ہماری توجہ کی مستحق ہے - موصوف نوجوان ادیبوں میں شان امتیاز رکھتے ہیں - اور اردو فارسی میں نمایاں استعداد کے مالک ہیں - ان کے مضامین نظر و نثر سے ناظرین ندیم بارہا محظوظ ہو چکے ہیں ——— جناب اختر شہنشاہی ایم - اے نے ہمارے مرحوم دوست مولانا سید منظر علی ندوی کی یاد میں چند آنسو بہائے ہیں - اور ایک مرثیہ ادا ہوا ہے - کاش سفر کوئی درد مند شاعر نے صوبہ کے ایک دوسرے جوان مگر نابغہ نازاد ادیب سید یونس الہدیٰ مرحوم کی یاد تازہ کی ہوتی ——— جناب فخر الدین خاں صاحب نے اقبال مرحوم کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا ہے - اور ان کی جدائی پر آنسو بہائے ہیں ——— "خیالات کی رو میں" برادر عزیز یوسف سید ناظر امام ندوی کی ایک دلچسپ نظم ہے - اسی طرح "صبح کا ستارہ" (جناب تجدالغنی شمس) - منگل تالاب کی ایک رات (جناب جوہر فرہادی) آنکھو (جناب نقاد عظیم آبادی) کسی کی یاد (جناب قیصر عثمانی) اشتراکی سنسار (جناب تنقیح قادری) مقصد حیات (جناب نجم کاکوی) اور "انتظار شوق" (جناب تراز بھاگلپوری) ہمارے صوبہ کے نوجوان شعراء کے لطیف و دلکش جذبات کی آئینہ دار نظمیں ہیں -

× × ×

"بادۂ کہن" میں پچھلے دور کے دو باکمال شعرائے بہار کے مختصر سوانح حیات اور کلام کو روشناس کرایا گیا ہے - ان کے فضل و کمال کے اشارات ان دونوں مضامین میں ملاحظہ عالی سے گذریں گے -

آٹھواں باب افسانوں کا ہے جس کا آغاز "قرض کی قرمانگا" پر کے چھبیس صفحوں کے طویل اور دلچسپ افسانہ سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہمارے صوبہ کے لائق احترام کہنہ مشق، باکمال اہل قلم پروفیسر مسلم کا افسانہ ہے۔ جس میں دشمنت انگیز جماعت کے طریق کار اور افسانہ کی ہیروئن کے عجیب کردار کو پیش کیا گیا ہے ——— پھر پروفیسر شبلی ابراہیمی نے افسانہ "دماغ کی شکست" میں دکھایا ہے کہ عورت میں محبوبیت اس کی مردانہ کردار کی نقل میں نہیں اسکی نسوانی خصوصیات میں مضمر ہے۔ ——— اس کے بعد جناب بیدار پور محاوری نے نیر قاسم کے دو معصوم بچوں کی داستان غم پیش کی ہے ——— پھر "ہر ٹونگ سبھا" کا نظارہ حضرت ماپوری کے موئے قلم سے کھینچا گیا ہے۔ جس میں ماپوری کے مخصوص طرز ادا کی تیز لطف انداز بیان میں بعض سیاسی مسائل کی بحث آتی ہے۔ ادھر مدت کے بعد ادھی کے قلم سے ان کے انداز کی انچھوتی چٹخ نکلی ہے ہمارے صوبہ میں مزاحیہ مضامین سے دلچسپی کا ذوق حضرت ماپوری ہی نے پیدا کیا ہے۔ خوشی ہوتی کہ بہار نمبر کے شائقین کے ذوق کی تسکین کا انھوں نے پورا سامان بہم پہنچایا ——— "ٹل ٹل کی موت" کی جگہ "ہر ٹونگ سبھا" کے بعد خوب آئی ہے۔ اس میں مشہور سوشلسٹ لیڈر بابو جے پرکاش نرائن کی چٹخیلی چڑیا کی موت کا فسانہ ہے۔ جوان کے جیل کی زندگی میں ان کی دلچسپی کا محور تھی۔ ایسی مشغل میں فسانہ کے مصنف مولانا عبدالباقی نے اپنے مخصوص طرز انشا میں جیل کی دلچسپ یکساں زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ اس وقت ہمارے صوبہ کے ممتاز ترین انشا پردازوں میں ہیں۔ خدا کرے کہ سرکاری مشغولیتیں انہیں کبھی کبھی کچھ لکھنے کا موقع دیتی رہیں ——— "شادی" کے عنوان سے جناب آفتاب حسن صاحب نے صوبہ بہار کے "میکل براتیوں" کا خاکہ کھینچا ہے۔ زمانہ بہت آگے بڑھ چکا مگر ابھی ہمارے صوبہ میں معاشرتی زندگی اور اسکی رسم و رواج کا وہی فرسودہ نظام باقی ہے۔ ایسے افسانے رسم و رواج کی بد نمائیوں پر فکر کی نظر ڈالنے کی عادت ڈالتے ہیں ——— "شادی کا تحفہ" پروفیسر اختر اورینوی کے قلم سے ہے۔ اس میں یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ "رنگین زندگی" کا سماں دکھایا گیا ہے۔ لیکن درپردہ معاشی تنگ دستی کے وقت کسی بیدار و حساس دل کے آبگینہ سے زیادہ لطیف و نازک جذبات کے احساسات کی مصوری کی گئی ہے۔ اور اس حیثیت سے یہ ایک کامیاب افسانہ ہے ——— "بہر حال میں کہہ رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ہمارے جناب الیاس اسلام پوری کے تازہ افکار کا حامل ہے۔ موصوف پہلے نگار کے مستقل افسانہ نگار تھے۔ اب ندیم کا دامن ان سے وابستہ ہے۔ ان کے افسانوں کا دلنواز مجموعہ امید ہے کہ جلد ناظرین کے ہاتھوں میں ہوگا ——— "بھوک" جناب شمیم عظیم آبادی کا افسانہ ہے۔ اور وہ ان کے اسی طرز میں ہے۔ جو اب ان کا ایک مخصوص طرز بنتا جاتا ہے۔ اس سلسلہ کا عمدہ افسانہ "پیاس" کے عنوان سے آپ کی پچھلی اشاعت میں چھپ چکا ہے ——— ہمارے نوجوان دوست کامریڈ انیس الرحمٰن ہمارے صوبہ کے ترقی پسند اہل قلم میں۔ ان کے لٹریچر میں زندگی ہوتی ہے۔ ان کا افسانہ "تالی" نصوری محاکاۃ کی ایک لطیف مثال ہے ——— محترمہ کامریڈ نجمہ الغفار بیگم کا فسانہ "نجات" بھی کامیاب افسانوں میں ہے ——— جناب خواجہ عنایت اللہ صاحب نے اپنے افسانے "کامریڈ" میں مزدور تحریک کی ترقی کے اسباب نہایت بصورتی سے دکھانا چاہے ہیں۔ کہ ایک کسان محنتی ماحول کے پیش آنے سے رفتہ رفتہ اس تحریک کے قریب آجاتا ہے۔ امید ہے کہ یہ فسانہ دلچسپی سے دکھایا جائے گا ——— جناب جی۔ آر قیس ہمارے صوبہ کے خوش مذاق نوجوان ہیں۔ تحریر میں سلاست اور شستگی موجود ہے۔ ان کا افسانہ "وطن کی راہ میں قربانی" آپ کی نگاہوں سے گذر چکا افسوس کہ ان کا ایک قابل قدر مضمون "میتھلی زبان کے چند گمنام شعراء" جو کہ بہار نمبر کا ایک ضروری جز رہنا تھا۔ ہم اس نمبر میں شائع نہ کر سکے اسکو آئندہ پرچہ میں ملاحظہ فرمایئے گا ——— جناب چغتائی کی نوازشیں ندیم پر بہت پہلے سے ہیں۔ بہار نمبر کے لئے انھوں نے خاص طور پر اپنے کئی قیمتی خطوط بہاری دوست" کی سرگذشت اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں لکھی ہے اور اپنے "فن کا حق ادا کیا ہے۔ غیر بہاری اہل قلم میں سے دو محترم افسانہ نویسوں کے دلچسپ افسانوں سے ہم اپنے شرائط مضامین کے باعث ناظرین بہار نمبر کو محروم کرنے کے مجرم بھی رہے ہیں ایک ہمالہ سے پروفیسر رشید احمد صدیقی ہیں۔ اور دوسرا افسانہ جناب اکبر الہ آبادی کا ہے یہ دونوں افسانے آئندہ شمارہ میں شائع کئے جائیں گے۔ پروفیسر رشید احمد صاحب اس کی تلافی میں اپنے سفر بہار (پٹنہ یونیورسٹی میں زبانی افتتاح کے سلسلہ میں سالہا سال تشریف لاتے رہے) کی بعض دلچسپ داستان کے لکھنے کا وعدہ فرمایا۔ لیکن افسوس ہے اس کا موقع نہ آسکا۔ "۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نجر گذشت" (مولوی سید محمد ابوب آبگلوی) شکاری (ذی اختر ہاشمی عظیم آبادی اور "رکاوٹ عمل" (جناب محزوں چکوئی۔ جناب عبدالکریم آزاد) ہمارے صوبہ کے نوخیز نوجوان افسانہ نویسوں کے نتائج فکر ہیں۔ امید ہے کہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔

× × ×

اس کے بعد "جہان اسلام" کا باب آتا ہے جس میں تین قابل قدر مضامین ہیں۔ برادر عزیز مولانا مسعود عالم ندوی نے نوخیز عراق کی نئی کروٹ پر بصیرت افروز نگاہ ڈالی ہے۔ جناب منصور کاکوی نے مصر کی سیاسی تشکیل کا تجزیہ مرتب کیا ہے۔ اور جناب محبوب احمد صاحب وارثی نے چنگ کو کلم کے بعد افغانستان کے سیاسی حالات" دکھائے ہیں۔ اسی طرز پر انھوں نے ایران پر بھی ایک مضمون لکھنا تھا۔ جو افسوس ہے کہ اس نمبر میں شریک نہ ہو سکا۔

× × ×

دسویں باب میں "صوبہ بہار کے چند موجودہ مشاہیر" کو پیش کیا گیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں سر خواجہ محمد نور۔ ڈاکٹر سچدانند سنہا۔ سلطان احمد۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ مسٹر محمد یونس بابو انوگرہ نرائن۔ مسٹر سری کرشن کے سوانح بروقت موصول نہ ہو سکے بخصوصاً اول الذکر جناب سر خواجہ محمد نور کے سوانح حیات ہمارے ہی شہر سے موصول ہونے والے تھے۔ مگر آج اور کل پر مدت بڑھتی گئی۔ بالآخر مایوس ہونا پڑا۔ بہر حال

ہم ان تمام مضمون نگاروں کے شکر گذار ہیں جنھوں نے حضرۃ الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہٗ جناب ڈاکٹر سید محمود عزیز ملت سید عبدالعزیز آنریبل سید حسین امام اور جناب ہیرالال بتن جی کے سوانح حیات پر مضامین اور معلومات عنایت فرمائے۔

× × ×

یادرفتگاں کے ذیل میں چند ایسے ارباب فضل کا تذکرہ کرنا مقصود تھا جو ابھی حال میں ہم سے جدا ہوئے ہیں جناب مخدوم محترم حسین امام صاحب کے ہم شکر گذار ہیں کہ انھوں نے بڑی توجہ سے اپنے "میت کی پرت" لکھی۔ مسٹر سید حسن امام مرحوم بیرسٹر کے سوانح حیات پر ایسا جامع مقالہ آج تک لکھا نہیں گیا۔ اور نہ شاید کسی دوسرے کے قلم سے یہ فریضہ اس خوبی سے ادا ہو سکتا تھا۔ اس ضمون کے ذیل میں "خانوادۂ بورہ" کی سرسری سرگذشت بھی آگئی ہے۔ پھر ان کے ذاتی سوانح، بیرسٹری کے کمالات، سیاسی خدمات، دربارداری، ذہنی عقائد اور خانگی حالات تفصیل سے درج کئے گئے ہیں۔ اثنائے تحریر میں ایسے بہت سے واقعات قلمبند ہو گئے ہیں جن کو ضبط تحریر میں کسی نہ کسی طور پر لے آنا تھا۔ کاش وہ اسی انداز میں مخبش شرف الدین۔ سر علی امام اور نواب امداد امام اثر کے سوانح حیات بھی مرتب فرما سکتے کہ ان بزرگوں کے پائیدار نقوش اس صوبہ میں موجود ہیں۔ اور موصوف کے ذاتی مراسم ان میں سے ہر ایک کے ساتھ قائم تھے۔ اس لئے جو کچھ کے موصوف کے علم میں ہے وہ شاید کسی اور ذریعہ سے مجموعی طور پر حاصل نہ ہو سکے۔ کاش وہ کسی آئندہ فرصت میں ان اکابر پر قلم اٹھاتے

یادرفتگاں کے سلسلہ میں برادر عزیز مولوی سید حسن تقی صاحب بندوی نے ایک قابل ذکر مضمون حضرت مولانا سید سلیمان صاحب علیہ الرحمہ پر مرتب کیا تھا۔ یہ بہار نمبر کے لئے بہترین تحفہ تھا۔ لیکن افسوس کہ تاخیر سے موصول ہونے کے باعث ہم اس کو بہار نمبر کے لئے ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے سے معذور رہے۔ یہ قیمتی مقالہ کسی آئندہ نمبر میں آپ کی نگاہوں سے گذریگا۔

× × ×

"افکار و خیالات" کے تحت جناب کامریڈ سید علی اشرف اور جناب سید نصیر حیدر صاحب ڈپٹی کلکٹر گیا کے تازہ افکار پیش کئے گئے ہیں۔ اول الذکر غیر معمولی صلاحیتوں کے نوجوان ہیں۔ امید ہے کہ وہ مستقبل میں قابل قدر مفکرین کی صف میں ہوں گے۔ موخرالذکر اہل قلم کے بعض مضامین پہلے ندیم میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور چند قیمتی افسانے دفتر میں آگئے ہیں۔ جو آئندہ اشاعتوں میں ناظرین کی ضیافت طبع کا سامان ہونگے

× × ×

"اصلاح و ترقی" کے ذیل میں جناب سید محمد مجتبیٰ صاحب ڈپٹی آرگنائزر محکمۂ دیہات سدھار کا ایک مختصر مضمون ہے۔ جس میں موصوف نے اپنے محکمہ کو پبلک سے متعارف کیا ہے۔ اور اس سے فائدہ اٹھانے اور دیہی ترقی کی جانب متوجہ ہونے کی تحریک پیش کی ہے۔

× × ×

"آثار علمیہ و ادبیہ" کے باب میں اس کے محتویات کی ندرتیں ..... جناب مخدوم محترم ڈاکٹر سید محمود کی نوازشوں سے اس قدر بے پایاں ہیں کہ ناظرین ورق الٹنے کی بخشش خود ملاحظہ فرمائیں۔ علامہ شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی مرحوم، پنڈت موتی لال نہرو اور میر اکبر الہ آبادی وغیرہ کے خطوط کے عکس ناظرین کی نگاہوں کے سامنے آئیں گے۔ اور جن سے بعض غیر معمولی سیاسی دلچسپی کا باعث ہونگے۔ اسیطرح علامہ سر اقبال مرحوم اور علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہٗ کے مکاتیب سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

× × ×

ادبیات کے باب میں جو دراصل غزلیات پر مشتمل ہے۔ حضرت آزاد کے تبرکات، حضرت مبارک و مبہل بہار حضرت سریر و جناب جمیل مظہری کے افکار ہیں۔ اسیطرح حضرت عرفان اسلام پوری، حضرت تمنا عمادی، یادگار کوثر خیر آبادی حضرت رسا سہاتی۔ جناب مشفق گیاوی، ہمارے شہر کے روشناس خوش فکر حضرت عابد نقوی جناب ولی کاکوی۔ جناب کشتہ گیاوی، جناب توحید عظیم آبادی۔ جناب صبر سریری جناب کمال ندوی، جناب شاہ علی شطاری جناب قدر آبگلوی اور جناب میکش عظیم آبادی کے گلہائے رنگا رنگ سے اق صفحات کے دامن مالا مال ہیں۔ پھر رباعیات میں مولانا شاہ صبیح الحق عمادی۔ جناب سید راحت حسین فلسفی۔ محبی مولوی سید محمد ایوب شمیم ندوی، جناب اختر قادری۔ مبارک عظیم آبادی۔ حمید عظیم آبادی، توحید عظیم آبادی اور جناب اعجاز صدیقی کے افکار پیش کئے گئے ہیں۔

× × ×

تصویر جذبات میں نوخیز و نوجوان ادبا، جناب ضیا بازید پوری، جناب شہید اکبروی اور جناب شباب کیرووی کے طبع زاد اور رنگ رنگ لطیف شہ پارے ہیں ——— نوادر کے عنوان سے حضرت عرفان اسلام پوری کے دست مبارک کی لکھی ہوئی ایک وصلی پیش کی گئی ہے

آخری باب "قند پارسی" ہے جس میں مولوی سید حسن مرتضیٰ صاحب شعنق عمادپوری، جناب سید حسن امام صاحب وارثی، اور خان بہادر نواب سید احمد علی خاں کی فارسی غزلیات ہیں۔ سب سے آخر میں علم دوست و اہل علم نواز جناب سید یاسین حسن خاں صاحب خیال کا قطعہ تاریخ جناب سید شاہ حسین الدین احمد کے سانحہ وفات پر ہے۔ اس طرح ندیم کے دیرینہ کرمفرما کی یاد اور بہار نمبر کا خاتمہ اسی قند پارسی کے آخری منظوم کلام قطعہ تاریخ طبع بہار نمبر سنہ ۴۰ء پر ہوتا ہے۔ جو جناب خان بہادر نواب سید احمد علی خاں صاحب کی فکر رسا کا رہین منت ہے۔

× × ×

بہار نمبر کے مضامین کا مکمل جائزہ آپ نے لے لیا۔ ہم آپ کی حاشیہ سے ان تمام اہل قلم ادبا، شعرا کی خدمت میں مخلصانہ شکریہ پیش

کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ موصوفین ہمارے توسط سے آپ کے پیغام مسرت و جذبہ تشکر کو قبول فرمائیں گے۔

* * *

خاتمہ پر دو تین اہل قلم کے مضامین سے محرومی کا تذکرہ بھی کر لینا ہے۔ سب سے بڑی تکلیف ہمارے قدیم رفیق کار پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی سے سرزد ہوئی ہے۔ لاکھ موانع اور خانگی پریشانیاں سہی وہ کسی نہ کسی حیثیت سے شریک بزم ہو سکتے تھے۔ اسکی پاداش انہیں بھگتنی ہے۔ خواہ وہ جس شکل میں ہو۔ اس کا فیصلہ ہماری اور ان کی آئندہ ملاقات پر موقوف ہے۔ دوسرے جناب قاضی سید عبدالودود صاحب پر سزاوار ہیں۔ موصوف وعدہ کے باوجود اپنی مسلسل علالت کے باعث کچھ ارسال نہ فرما سکے جس کا دلی افسوس ہے۔ شعرائے آرام میں حضرت نجم گیلانی کی عدم شرکت کا افسوس رہا۔ اور جناب احتشام رضوی نے اپنی ایک چیز بھیجی بھی تو ایسے اخیر وقت میں کہ وہ شریک اشاعت نہ ہو سکی۔

اس کے ساتھ ہم ان بہ کثرت اہل قلم کے شکر گذار ہیں۔ جنہوں نے اپنے مضامین ارسال فرمائے اور ہم انہیں شریک بزم کرنے سے کسی نہ کسی سبب کے باعث معذور رہے۔ جن میں بعض ایسے اہل قلم کے مضامین بھی تھے، جن کے تتابع افکار سے ہندوستان کے ادبی رسالے لبریز رہتے ہیں۔ لیکن انتخاب میں اگر سختی برتی گئی تو صرف اسکے لئے کہ آپ کے صوبہ کا ترجمان آپ کے یہاں کے اہل کمال کے شایان شان رہے۔ امید ہے کہ ارباب کرم ہماری مودبانہ معذرت کو قبول فرمائیں گے۔

* * *

چند سطریں تصویروں کے متعلق بھی کہہ دینی ہیں۔ ناانصافی ہوگی اگر ہندوستان کے مایۂ ناز آرٹسٹ جناب ہیرالال بن ہی کے نمایاں فن، اور ندیم یاران کی نظر عنایت کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ موصوف نے گویا اپنے نگار خانہ بین کو کمال فیاضی سے ندیم کے حوالہ کر دیا۔ اور اجازت دی کہ جس شاہکار کو چاہے وہ اٹھا لائے۔ چند تصویریں دفتر میں لائی گئیں۔ پھر موصوف نے اپنے ذوق سے ہمارے نمبر کے لئے سرورق تیار فرمایا۔ میاں مظفر (منیجر ندیم) کمال شوق سے ان تصویروں کو لے کر بلاک بنوانے کے لئے کلکتہ گئے ہیں۔ ان سے بھی غیر معمولی تاخیر عمل میں آچکی ہے۔ اب انہیں انگلستان بھیج دی گئی ہے کہ بلاک کے کام جس حد تک پہنچے ہیں۔ وہیں تک انہیں رکھ کر تصویریں چھپوا کر اپنے ساتھ لے آئیں۔ اور ان سطروں کے پہنچتے ہی رسالہ شائع ہو جائے ——— بہار نمبر عمومی حیثیت سے کیا کچھ ہے اس کا اندازہ تو آپ نے لگایا ہوگا۔ اب مضامین کا مطالعہ براہ راست کیجئے

تصحیح۔ "ہائیل کے آخری صفحہ پر مسجد شیر شاہ کی تصویر چھپی ہے۔ افسوس ہے کہ محمد دھولپور راجپوتانہ" کے بجائے محل دھولپور راجپوتانہ چھپ گیا ہے۔ نیز نظرات کا صفحہ ۸ سطر ۹ میں سیدہ باجیہ کے بجائے افسوس کہ محمد سین چھپ گیا ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔

مکتبہ ندیم گیا

مکتبہ ندیم سے حسب ذیل کتابیں طلب کریں۔

سلطانی محلوں کے راز - از ہزاکسلنسی جنرل جمال پاشا الغزی۔ مترجمہ مولانا لیم آبادی۔ اس میں سلطان عبدالعزیز، سلطان مراد، سلطان عبدالحمید کے حالات انتہائی دلچسپ پیرایہ میں جمع کر دئے گئے ہیں۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ آپ اس کتاب کو پڑھ کر بے حد محظوظ ہوں گے اور بے حد خوش بھی اس موضوع پر آج تک کوئی کتاب اردو زبان میں شائع نہیں ہوئی۔ فوراً خرید لیجئے۔ کتاب سوا پانچ سو صفحہ سے زیادہ میں ختم ہوئی ہے۔ سرورق نہایت حسین ہے۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے ہے۔

انور پاشا - غازی انور پاشا کے حیرت انگیز کارناموں کی یہ داستان جنرل جمال پاشا الغزی نے نہایت ہی دلچسپ پیرایہ میں لکھی ہے۔ ترجمہ لیم آبادی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

فتوح الشام - صحابۂ و تابعین کے مجاہدانہ کارناموں کی نہایت مستند تاریخ یہ واقدی کی کتاب نہیں ہے۔ ترجمہ لیم آبادی۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

شہید کربلا - حضرت حسین علیہ السلام کی شہادت اور واقعات کربلا کی سچی تاریخ۔ تالیف لیم آبادی۔

رحلت خلفاء راشدین - یہ کتاب خلفاء راشدین کے آخری مرض اور وفات یا شہادت کی مستند تاریخ ہے۔ تالیف لیم آبادی قیمت آٹھ آنے۔

صراط مستقیم - توحید خالص کیا ہے؟ دین اتباعی کیا ہے؟ شرک و بدعت کی تاریکیاں کس درجہ خطرناک ہوتی ہیں؟ قبر پرستی کیا ہے؟ اور اسکی مضرتیں کتنی بے شمار ہیں؟ اور دوسرے حقائق ایمانی اس قابل دید کتاب میں آپ کو ملیں گے۔ قیمت عہ "منیجر"

رخِ یار سے بوصل ... کرتا تھا انتظار دای

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز ہے حُسن

ع بن سہیل

حضرت نوح ناروی

حضرت مولانا حکیم محمد آبادی

بہار نمبر ۱۹۴۲ء

نوید نوبہار

از

فخر بہار یادگار داغ تاجدار سخن حضرت مبارک عظیم آبادی

نکلا ندیم کا پھر اک بہار نمبر — ہے یادگار صوبہ بہ یادگار نمبر
مضمون ہیں گل تر گلشن نثار نمبر — ہے نمبروں میں اپنے یہ شاہکار نمبر

اک سکۂ رواں ہے یہ پیکر صحافت
چلتا ہوا ادارہ چلتی ہوئی ادارت

ہر خط ہے خط آخر باں ہر نقطہ خال نکلا — یعنی باوج خوبی ۔ ماہ کمال نکلا
کیا بے نظیر نکلا کیا بے مثال نکلا — مصر ادب میں گویا یوسف جمال نکلا

وہ صاحب نظر ہے وہ جاذب نظر ہے
جو دل ہے اس کا گھر ہے جو آنکھ ہے ادھر ہے

مضموں بلند پایہ اعلیٰ ترین ہے صنعت — ہر نقش سے ہے جسکے نقاش کو بھی حیرت
شاداب بیل بوٹے وہ تازگی و فرحت — رکھ دیں اگر چمن میں تو ہو چمن کی زینت

کہتے ہیں کس کو گلشن کیسی بہار گلشن!
کھل جائیں اُسکی آنکھیں دیکھے جو اس کا جوبن

مضمون نو بنو کا اک دلکش آئینا ہے — معنی شناس اس کا ہر صورت آشنا ہے
پرداز میں سراپا اک پیکر صفا ہے — اللہ ری صفائی کیا روپ کیا جلا ہے

جوہر فصاحتوں کے جلوے بلاغتوں کے
سطریں نہیں وہاں ہیں دریا سلاستوں کے

اللہ رے تیرا جوبن اے خط و خال تصویر — تصویر ہے سراپا حسن و جمال تصویر
فن مصوری کو مژدہ مآل تصویر — بولے گی کوئی دم میں ہے یہ کمال تصویر

ڈالی ہے جان بھر کر رنگ انکے پیکروں میں
شوخی اُبھارتی ہے یہ رہ چکیں گھروں میں

مقالات :-

مولانا شبلی اردو شاعر کے لباس میں

از حضرۃ الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

مولانا شبلی نعمانی شاعر نہ تھے، مولانا شبلی نعمانی شاعر تھے - دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں - وہ شاعر نہ تھے کیونکہ ان کا نام شاعروں کی فہرست میں نہیں - اور پبلک میں شاعری کی حیثیت سے ان کی شہرت نہیں - لیکن وہ شاعر تھے - کیونکہ ان کا اردو اور فارسی کا دیوان موجود ہے - علی گڈھ کالج - علی گڈھ ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے جلسوں میں وہ بڑے دھوم دھام سے اپنی نظمیں پڑھتے اور اپنے قصیدے سناتے تھے - سننے والے سر دھنتے - آنسو بہاتے اور قدر جاننے والے ان کی زبان کی فصاحت معنی کی بلاغت اور طرز ادا کی خوبی کو مانتے تھے - مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی ہماری زبان کے مشہور مقرر تھے - ان کی عادت تھی کہ اپنے لکچر سے پہلے اپنی سرسید حمی بنا دی نظم بھی سنایا کرتے تھے - اپنی اسی قسم کی ایک نظم میں وہ اپنے شعروں کی بے اثر کیفیت کو دیکھ کر کہتے ہیں :-

تم اپنی نثر کو تو نظم کو مصنوعی نذیر احمد کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالی اور نعمانی

مولانا حالی کی شاعرانہ حیثیت تو مشہور ہے - مگر مولانا شبلی نعمانی کی شاعری ان کے مجموعہ کمالات کے ڈھیر میں ایسی چھپ گئی کہ وہ بہت کم لوگوں کو نظر آئی -

مولانا شبلی مرحوم بچپن سے شاعر تھے - ان کے بچپن کے ایک استاد کہتے تھے کہ مولانا شبلی بچہ تھے - اور چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھتے تھے - تو ان کو اوڑھنے کی ایک چادر کی ضرورت ہوئی - ان کے باپ اعظم گڈھ کے نامور وکیل تھے - تو بیٹے نے باپ سے زبانی کہنے کے بجائے یہ شعر کاغذ پر لکھ کر دیا ؎

میں ہوں کایوں صاحب تاج ہو پسر اُس کا چادر کو محتاج ہو

باپ بہت خوش ہوئے اور بیٹے کو چادر انعام دی -

مولانا شبلی جب اوپر کی کتابیں پڑھنے لگے تو اردو اور فارسی میں شعر کہنے لگے - فارسی شاعری کا ذوق تو بہت اچھا تھا - مگر اردو شاعری ایسی ہی تھی جیسے اکثر نوجوان ملک کے نئے نئے جوانی کے جوش سے شعر کہنے لگتے ہیں - حاضر جوابی یہ تھی کہ فوراً شعر کہتے تھے - ان کے عربی اور فارسی کے استاد جرجیا کوٹ ضلع اعظم گڈھ کے مشہور عالم اور ادیب مولانا فاروق تھے - شاگرد ایک دفعہ ننگے سر بیٹھا تھا - استاد نے آکر پیچھے سے سر پر ایک ہلکی سی چپت لگائی اور فوراً طبع سے فرمایا ؎

ہے کاپیت گناہ خلائق پہ سر

شاگرد نے فوراً جواب دیا ؎

جتنے ہیں سر ان پہ ہے خالق پہ سر

اعظم گڈھ میں ایک کتب فروش تھے جو اردو کے دیوان بھی بیچتے تھے - مولانا کو اپنے بچپن میں شعر سننے کا شوق اتنا تھا کہ چھٹیوں کے اوقات میں ان کی دکان پر پہنچ جاتے تھے - اور وہیں بیٹھ کر دیوان پڑھا اور دیکھا کرتے تھے - اور طبیعت کو مناسبت ہوتی تو چند شعر بھی ازبر یاد ہو جاتے تھے - اور ان کو اون کے اس حافظہ پر تعجب ہوتا تھا -

مولانا کی جوانی کے زمانہ میں شعر و سخن کا عام چرچا تھا۔ ہر پڑھا لکھا آدمی کچھ نہ کچھ اس سے دلچسپی لیتا تھا۔ شہروں میں مشاعروں کی مجلسیں ہوتی تھیں۔ نوجوان اور بوڑھے شوق سے شریک ہوتے تھے۔ اور داد سخن دیتے تھے مولانا بھی اپنے وطن اعظم گڈھ میں اسی قسم کی مجلسیں کرتے تھے غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ واہ واہ ہوتی تھی سبحان اللہ اور جزاک اللہ کے نعرے بلند ہوتے تھے۔

اس زمانہ میں مولانا کا تخلص تسنیم تھا۔ خیال ہوتا ہے کہ اوس زمانہ میں منشی امیر اللہ صاحب تسلیم لکھنوی کی شہرت تھی۔ اسی لئے تسلیم کے وزن پر تسنیم کا تخلص پسند کیا گیا۔ لیکن اس کے بعد اونھوں نے خود اپنے نام شبلی کو تخلص قرار دیا۔ مولانا شبلی نے کچھ دن ۱۸۸۴ء کے قریب غازی پور کے مدرسہ چشمۂ رحمت میں گذارے تھے۔ وہاں اردو کے مشہور شاعر تمنا لکھنوی مدرس تھے۔ وہ اچھے شاعر تھے۔ اون کے دیوان چھپ چکے ہیں۔ اور مولانا سے بھی انکو تعلق بھی تھا۔ مولانا کی فارسی شاعری کے اصل استاد مولوی فاروق صاحب چریاکوٹی تھے۔ جو فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ اسی کے ساتھ اردو میں بھی نظمیں کہا کرتے تھے۔ اون میں سے دو مسدس اون کے چھپے ہوئے ہیں۔ مسدس فاروقی۔ اور مسدس عوامی پہلے میں اعظم گڈھ کے سنہ ۱۸۸۷ء کے سیلاب کا حال لکھا ہے۔ اور دوسرے میں مولانا حالی کے مشہور مسدس کا جواب لکھا ہے۔

مولانا شبلی کی اردو شاعری بالکل خود رو پودا ہے۔ نہ اونھوں نے اس میں کسی سے اصلاح لی۔ نہ کبھی کسی سے مشورہ کیا۔ اردو شاعری کو عزت و شہرت کا ذریعہ سمجھا۔ یہاں تک کہ ۱۸۸۳ء میں علی گڈھ سے جانے سے پہلے وہ اردو میں خط و کتابت کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اوس زمانہ کے اہل علم کی طرح وہ فارسی ہی میں خط لکھتے تھے۔ اور غالب کی طرح محنت سے لکھتے تھے۔ سیرۃ النعمان جو ۱۸۸۶ء میں لکھی ہے اوس تک میں یہ لکھا ہے۔ ع حرف ہا رد و زدن آئین نبود یعنی اردو میں لکھنا میرا دستور نہ تھا۔ مگر کیا عجیب بات ہے کہ جس زبان میں لکھنا پڑھنا انکے لئے عار تھا وہی انکی شہرت اور انکی غیر فانی زندگی کا سبب بن گئی۔

مولانا کی اردو شاعری کے چار دور ہیں :-

پہلا: شروع سے ۱۸۸۳ء تک جب وہ علی گڈھ کالج گئے ہیں۔
دوسرا: علی گڈھ کے قیام کا زمانہ ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۸ء تک
تیسرا: حیدرآباد کا زمانہ اور کچھ لکھنؤ کا یعنی ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۱ء تک
چوتھا: ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۴ء تک جس میں اونھوں نے وفات پائی۔

پہلا دور پہلے دور کی یادگار اونکی چند غزلیں ایک قصیدہ اور ایک لمبی نظم ہے۔ غزلوں کا نمونہ یہ ہے۔

ضعف میں بھی یہ مرے تیر فغاں میں زور ہے — روک لے اوسکو کہاں یہ آسماں میں زور ہے
نیست تھی اوسکی کمر پر تو نے ثابت کر دیا — واہ وا تسنیم کیا تیرے بیاں میں زور ہے

اوس زمانہ کا قصیدہ سلطان عبدالحمید خاں کی تعریف میں ہے۔ زمین وہی ہے جو انشاء کے اس مشہور قصیدہ کی ہے۔

گھٹیاں پھولوں کی تیار کرائے بوی سمن — کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانان چمن

مولانا فرماتے ہیں اور کس قدر پرجوش فرماتے ہیں۔ تشبیہیں اور استعارے کیسے نازک ہیں۔

پھر بہار آئی ہے شاداب ہو پھر دشت چمن — بن گیا رشک گلستان ارم پھر گلشن
شعلہ زن پھر چمنستان میں ہوئی آتش گل — پھر ہوا خلق ہے گلشن میں بجا کر دامن
آگ پانی میں لگا دی ہے کسی نے شاید — حوض میں عکس گل و لالہ ہے یا قلزم فتن
باغ میں باد بہاری کی جو آمد کی ہوا — بہر تسلیم ہر اک شاخ کی خم ہے گردن
مست آرائے تجمل جو ہوا شاہد گل — مرغ گلشن پہ صدا دیتے ہیں اللہ لمن
شاخیں انگڑائیاں لیتی ہیں صبا ہو بدمست — وجد میں تالی لگاتا ہے ہر اک برگ سمن
سر نکالے ہیں حبابوں نے تہ آب سے کیوں — نظر آتی نہ تھی پانی میں گر شیر چمن
چوکتے ہیں جو کبھی خواب سے اطفال بہار — تھپکیاں دیتی ہے سونے کے لئے باد چمن

اسی زمانہ کی یادگار اونکی ایک لمبی نظم ہے۔ کسی انگریز شاعر نے انگریزی میں "قندہار اور کابل کی لڑائی کا حال نظم کیا تھا۔ جس میں اس فوج کے انگریز افسروں کی تعریفیں ہیں۔ ان میں سے کسی کو کوئی انگریز بدل کر یہ نظم گڈھ آیا تھا۔ اوسکی فرمائش سے اوسکی انگریزی نظم کا اردو میں ترجمہ فرمایا۔

لو سنو تیغ و سناں کی داستاں — رایت طبل و نشاں کی داستاں
پہلوانانِ جہاں کی داستاں — شاہ کے اعزاز و شاں کی داستاں

حکمرانِ بحر و بر کی فتح ہے
قیصرِ ہندوستاں کی فتح ہے

یہ ایسی ہی نظم ہے جیسی ایک فرمائشی نظم ہونی چاہئے۔

مولانا کے پہلے دور کی اردو شاعری کی کل کائنات یہی ہے۔

دوسرا دور دوسرے دور میں اونکی چند غزلیں ہیں۔ اوس طرح محفوظ رہ گئی ہیں کہ انھوں نے اوسی زمانہ میں علی گڈھ سے اپنے بعض عزیزوں کے خطوں میں لکھ کر بھیجا۔ اور چونکہ وہ خط اون کے خطوں کے مجموعہ میں جس کا نام "مکاتیبِ شبلی" ہے چھپ گئے ہیں۔ اس لئے وہ غزلیں عام نگاہوں کے سامنے آگئی ہیں۔

مولانا علی گڈھ جنوری سنہ ۱۸۸۳ء میں گئے۔ اور ایک ایسے محلہ میں مکان لیکر رہے جو خواجہ محمد یوسف صاحب وکیل (خواجہ عبدالمجید بیرسٹر کے والد) کے پڑوس میں تھا۔ اون کے ہاں ایک شاعر جو قیس تخلص کرتے تھے رہتے تھے۔ مولانا کی آمد و رفت اون کے ہاں رہتی تھی۔ اور شعر و شاعری کا تسلسل رہتا تھا۔ ایک اور صاحب عبدالحمید صاحب تھے۔ جو گو شاعر نہ تھے مگر دیوان کے دیوانہ تھے۔ اون سے بھی ملتے تھے۔ پھر اس وقت میر اکبر حسین صاحب جو اکبر الہ آبادی کے نام سے مشہور ہیں۔ علی گڈھ میں منصف تھے۔ اتحاد مذاق نے دونوں کو ملا دیا تھا۔

کالج میں جو مختلف قومی تقریبیں ہوتی تھیں ان میں مولانا عام طور سے اپنے فارسی قصیدے پڑھا کرتے تھے۔ لیکن اوس زمانہ میں مولانا حالی بھی اکثر آکر علی گڈھ میں رہا کرتے تھے۔ اور اون کا مسدس جو ۱۸۷۹ء میں چھپ کر مقبول ہو چکا تھا اس سے اردو نظموں و قصیدوں کا شوق دن کے دل میں پیدا ہوا۔ اس لئے کبھی کبھی اردو نظمیں اور قصیدے بھی اونھوں نے کہے۔

غزل اس دور میں اونھوں نے جو اردو غزلیں کہیں اونکی کائنات تین چار سے زیادہ نہیں۔ اور یہ مشغلہ صرف دو برس رہا۔ یعنی ۱۸۸۳ء اور ۱۸۸۴ء میں ان غزلوں میں سوائے غزل ہونے کے کوئی خاص خوبی نہیں۔ اس دور کی پہلی غزل کا مطلع ہے۔

تیرِ قاتل کا یہ اماں رہ گیا — جائے دل سینہ میں پیکاں رہ گیا
کی ذرا وحشت جنوں نے کوتہی — چاک آکر تا بداماں رہ گیا
حسن میکا یار کا اب آفتاب — اک چراغِ زیرِ داماں رہ گیا
بزم میں ہر سادہ رو تیرے حضور — صورتِ آئینہ حیراں رہ گیا

مقطع ہے:۔

یاد رکھنا دوستو اس بزم میں — آکے شبلی بھی غزلخواں رہ گیا

جنوری سنہ ۱۸۸۴ء میں انکی دوسری غزل ہے:۔

..... — اب جو تشریف صبا لائی ہے
نکہت زلفِ نگارِ دوست — آخر اوس کو چھیڑ کیا لائی ہے
مجھ کو لے جا کے مری آنکھ وہاں — اک تماشا سا دکھا لائی ہے

۲۶ جنوری سنہ ۱۸۸۴ء کو دو غزلیں بھیجیں پہلی یہ ہے:۔

پوچھتے کیا ہو جو حال شبِ تنہائی تھا — رخصت صبر تھی یا ترکِ شکیبائی تھا
شبِ فرقت میں دلِ غمزدہ بھی پاس تھا — وہ بھی کیا رات تھی کیا عالمِ تنہائی تھا

انگلیاں دشتی تھیں مژگاں کی اسی زخم پیہم
جس طرح بزم میں وہ فرفر سائی تھا

دوسری غزل:

تیس دن کیلئے ترک مے و ساغر کر لوں
واعظ سادہ کو دو روز میں قائل کر لوں
اور پھر کس کو پسند آئیگا ویرانۂ دل
تم سے مانا بھی کہ اس دل کو میں راضی کر لوں

فروری ۱۸۸۷ء کو ایک غزل لکھی:

یار کو جب خبط انکار نہ ہونے پایا
قتل تر کو ہوس کشتہ نہ ہونے پایا
چپکے وہ آتے ہیں گلشن میں کہ غنچے بادصبا
بھی بھی بار نہیں پیدا نہ ہونے پایا

ان غزلوں میں گو کوئی خاص ندرت نہیں۔ پھر بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ نازک ترکیبوں سے وہ اپنے کلام کو [illegible] خاص سلیقہ تھا۔

مثنوی اس دور میں مولانا نے ایک مثنوی، ایک مسدس اور دو قصیدے لکھے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی پختہ عمر میں کوا رخصوں نے اپنی تصنیفات سے باہر کر دیا تھا۔ خاص چیز ہے۔ اسرت تک مثنوی صرف قصوں کہانیوں کے لئے تھی اعلیٰ تک اسکو کوئی مقصد کے لئے کام میں نہیں لایا گیا تھا۔ بلکہ اب بھی وہ اس کیٹیگری سے گویا محروم ہی ہے۔ مولانا نے اس میدان میں پہل کی۔ اردو چیز جواب تک میر حسن۔ مرزا شوق اور پنڈت دیا شنکر نسیم کی سحر بیانیوں سے صرف حسن و عشق اور سحر و طلسم کا تماشا گاہ تھی۔ قومی ترقی و تنزل کا عبرت انگیز منظر بن گئی۔ لفظ فقرے۔ معنی بلند پر ترکیبیں دلپذیر۔ تشبیہ اور استعارے نازک مثنوی زبان کی اندرونی پاک اور بیان پر اثر۔ یہی چیزیں مثنوی کی جان ہوتی ہیں۔

مثنوی ان شعروں سے شروع ہوتی ہے:

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام
جب قوم تھی بے ملائے آلام
وہ قوم کی جان تھی جہاں کی
جو تاج تھی فرق آسماں کی
محفل کر دے تھے چراغ جس نے
قندیل کر دے تھے داغ جس نے
نخلے تھا دماغ جس سے جگر پر
وہ زخم کے دھوئیں اڑا رہے تھے
ردا کے دھوئیں اڑا رہے تھے
اعلیٰ کو کہ تھے جھکا دیئے تھے

منزل کا نقشہ اس طرح دکھایا ہے:

جس چشمہ سے اک جہاں تھا سیراب
وہ سوکھ کے ہو رہا تھا بے آب
پستی نے دبا لیا فلک کو
خورشید ترس گیا چمک کو
اب خضر کو گمرہی کا ڈر ہے
عیسیٰ کو نہ اپنی چارہ گر ہے
چلو ابر بھی برس گیا ہے
اک بوند کو اب ترس گیا ہے
کس باغ میں کوئی پھول ہنستا
بیکار برسی ہوئی ہیں شبنم
بیکار بچھا ہے نظام تہ دل
پہلو میں برائے نام تھا دل

منزل کا یہ پورا نقشہ دکھا کر سرسید کی بھی ایک جھلک دکھا دیا ہے۔

ناگاہ تھا یہی کہ آئی ناگاہ
اک سمت سے اک بلند و جانکاہ
اس کشتی ان کی بھی وہ آہ دلگیر
پہلو میں اثر نہ تھی تاثیر
ڈھیلی ہمت جو تھی اثر میں
تشہیری اثر گئی جگر میں

سرسید کی تعریف:

صورت سے عیاں جلال شاہی — چہرہ پر فروغ صبوگاہی
وہ ابرِ سیاہ دراز کی سپیدی — پھیلی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم — توفیر کی صورت مجسم

خاتمہ کے شعر یہ ہیں :

اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی — اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی
اس حال میں بھی روش وہی ہے — ان ڈھل ہی گیا طریق وہی ہے
اک جام میں ہے شراب باقی — اب تک ہے کمر میں آب باقی
گو خوار ہیں عنبر و خوں ہی ہے — مرجھائے ہیں پھول بو وہی ہے

ان شعروں سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ شاعرانہ خوبیوں کے لحاظ سے یہ مثنوی مصنف کے بہتر سے کم نہیں ہے۔

مسدس سنہ ۹۰ء میں سرسید نے علی گڈھ کی سالانہ نمائش کے موقع پر "تماشائے عبرت" کے نام سے عبرت کا تماشا دکھایا تھا۔ اس میں سرسید اور ان کی تحریک کے دوسرے حامیوں نے جمالیہ پوز کی تھیں اور اخلاقی پرچے تھیں۔ اس موقع پر مولانا شبلی نے اردو دیوان کا ایک مسدس پڑھا تھا۔ یہ کہنا زیادہ نہ ہوگا کہ مولانا شبلی کے پڑھنے کا ایک خاص موثر انداز تھا۔ اور وہ اپنی آواز کی دھن میں پڑھتے تھے۔ جس کو سکر سننے والے اثر میں ڈوب جاتے تھے اور سر دھننے لگتے تھے۔ اون کی یہ اتنی پھیلی ہوئی علی گڈھ کالج کے لڑکوں اور قومی جلسوں سے نکل کر اب مشاعرہ کی محفلوں تک پہونچ گئی تھی۔ لیکن اسوقت یہ بات بالکل نئی تھی۔ مولانا نے اس تماشا گاہ میں جب اپنے مسدس کے یہ بند پڑھے ہیں تو ایک سماں بندھ گیا تھا۔

ہم نے مانا کہ دل سے یہ مٹا دیں تجھے — یہ بھی ہو لیں کہ ہم ایسے ہی تھے اب ہیں جیسے
یہ بھی منظور ہے ہم کو کہ ہمارے بچے — دیکھتے پا نہیں یہ تاریخ عرب کے قصے

کبھی جو لے بھی سلف کو نہ کریں یاد اگر
یاد کاروں کو زمانہ سے مٹا دیں کیوں کر

مرد و شیر از و صفاہاں کے وہ زیبا منظر — بیت حمرا کے وہ ایوان وہ دیوار وہ در
مصر و غرناطہ و بغداد کا اک اک پتھر — اندر وہ دہلی مرحوم کے بوسیدہ کھنڈر

اون کے ذروں میں چمکتے ہیں وہ جو ہراب تک
وا نما میں انھیں سب یاد ہیں از براب تک

اس مسدس کے ۱۴۱ بند ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ شاعرانہ استادی کے لحاظ سے یہ مولانا حالی کے مسدس سے کم ہے۔

قصیدے اس دور میں مولانا نے اردو کے تین قصیدے کہے ہیں۔ ایک وہ ترکیب بند ہے جس کو ۱۹۰۳ء کے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھا تھا۔

بجا ہے آج اگر اس بزم میں یہ ساز و ساماں ہیں — یہ اونکی بزم ہے جو یادگار رسل عدناں ہیں
خلیل اللہ سے مہماں نوازی جن کو ہو پہونچی ہے — ہزاروں کوس آ آ کے وہ اس گھر میں مہماں ہیں

یہ قصیدہ تین بندوں میں تمام ہوا ہے۔ تاریخی واقعات سے مسلمانوں کو عبرت دلائی اور ترقی کی روح پھونکی گئی ہے۔

تیسرا قصیدہ بھی مولانا نے کسی جلسہ ہی میں پڑھا تھا۔ اس کا تماشا گاہ عبرت میں ۱۹۰۴ء میں ایک طالب علم نے پڑھکر سنایا تھا مطلع یہ تھا

بزم احباب ہے پر جوش ہے جلسہ کیسا — جم گیا پھر عرب وعیش کا نقشا کیسا

اس قصیدہ میں بلیغ تشبیبیں اچھوتی ہیں۔

صفحۂ عیش کی سطریں ہیں برابر دیکھو — حسن و خوبی سے یہ مجمع ہے صف آرا کیسا

فوجیں جمع ہیں یا جوش کی تصویریں ہیں — میں نے اس بزم کا کھنچا ہے سراپا کیسا
اب بھی اس راکھ میں تھوڑے سے شرر ہیں پنہاں — اب بھی اک شعلہ ہے یہ شاہد زیبا کیسا

مقطع ہے :

اے حریفو! تمہیں خالق کی قسم سچ کہنا — شبلی سچ مچ نے لکھا یہ قصیدہ کیسا

چوتھا قصیدہ آنریبل جسٹس سید محمود کی شادی کی مبارکباد میں ہے۔ موقع بھی یہ خوشی کا تھا۔ اس لئے مولانا کا یہ قصیدہ بھی باغ و بہار ہے۔ فرماتے ہیں :

پھر ہوا باد بہاری کا جو عالم میں عمل — چھا لیا سبزۂ نوخیز نے سبزہ زاروں پر جل
نازسے سوئے چمن جاتی ہے پھر باد بہار — جھومتے آتے ہیں بجرے سوئے گلزار چلو
نوعروسان چمن کے ہیں نرالے انداز — کہ صبا گود میں لیتی ہے تو ہٹ جاتی ہے
سمت قبلے سے جو اٹھتی ہیں گھٹائیں ہر بار — کہتی ہیں یہ تو نہ زاہد سے کہ ابکی تو بھی چل
کچھ عجب شان سے نکلے ہیں بداماں چمن — بعض گلزار ہے یا مشرب و مذہب کا دنگل
جھومتی چلتی ہے بیخود روشوں پر جو نسیم — غنچے کہتے ہیں چٹک کر کہ ہمیں بھی لے چل
اے صبا باغ میں آ تو دبے پاؤں ذرا — نیند میں سبزۂ نوخیز ہے بچہ کی طرح
بوئے خوش سے یہ نسیم سحری کہتی ہے — صحن گلشن میں کیا کرتے ہیں آرام کو پھل
اوج اقبال تو دیکھو کہ سلیماں کی طرح — سیر کرتے ہوئے پھرتے ہیں ہوا پر بادل
مژدہ اے بادہ کشو اب تمہیں ڈر کس کا ہے — ابر کا عام بلا پر بھی ہے اب تو مسل

اس کے بعد سید محمود کی تعریفیں ہیں۔ اور آخر میں مقطع ہے :

میں بھی ہوں عنصری وقت محمود ہے تو — میں بھی ہوں نازسلف تو ہے اگر فخر اول

مولانا کا یہ اردو قصیدہ بہت پر زور اور پرشکوہ ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کہنے وقت شاعر کی نگاہ میں دو قصیدے تھے۔ ایک انشا کا وہ قصیدہ ع کہ ہوا کھائے کو نکلیں گے جواناں چمن

اور دوسرا محسن کاکوروی کا یہ قصیدہ ع سمت کاشی سے چلا جانب بطحا بادل۔ مقطع کا فخریہ انداز بھی لاجواب ہے۔

تیسرا دور | مولانا کی اردو شاعری کا تیسرا دور حیدرآباد کے قیام کا ہے۔ جو صرف چار برس رہا یعنی ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۸ء تک۔ اس زمانہ میں حیدرآباد کے شعر و شاعری کی زمین مضرت داغ کے وجود سے بڑی زرخیز تھی۔ داغ سے وہ ملتے بھی تھے اور ان کی شاعری کے وہ بڑے مداح تھے۔ اون کے بہت سے اچھے شعر مولانا کو یاد تھے۔ اسی لئے حیدرآباد میں ایک فارسی قصیدہ شروع کیا تھا۔ اوس میں کہا ہے۔

ہاں تو دعوی کن و مانیز مسلم داریم — شبلی سحر فن و داغ فرخاں از تست

حیدرآباد میں مشاعرے ہوتے تھے مجلسیں جمتی تھیں۔ غزلیں پڑھی جاتی تھیں مگر افسوس ہے کہ سوائے ایک غزل کے اس زمانہ کی کوئی چیز ہاتھ نہیں آئی۔

اثر کے پیچھے دل حزیں نے سراغ چھوڑا نہیں کہیں کا — گئے ہیں نالے جو سوئے گردوں۔ تو اشک نے رخ کیا زمیں کا
وہی ڈکیتی کی شوخیاں ہیں۔ وہی اگلی سی شرارتیں ہیں — سنانے ہونگے تو ہاں بھی ہوگی۔ ابھی تو سن ہے نہیں نہیں کا
یہ نظم آئین یہ طرز بندش۔ سخنوری کیا فسوں گری ہے — کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی۔ مزہ ہے طرز علی حزیں کا

چوتھا دور | یہ دور ۱۹۰۸ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۴ء یعنی اوکی وفات تک قائم رہا اور حقیقت یہ ہے کہ اوکی اردو شاعری کا امتیازی دور ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی دنیا میں انقلاب برپا تھا۔ مسلم لیگ کا ہنگامہ۔ مسلم یونیورسٹی کا قیام۔ اور اس کے

بعض حقوق کے لئے گورنمنٹ اور مسلمانوں کے درمیان شدید اختلاف - کان پور کی مسجد کا خونی منظر - بنگال کی تنسیخ - طرابلس کی لڑائی - بلقان کی جنگ - ندوہ کے طلبا کی وہ اسٹرائیک جس نے پورے ہندوستان میں شورش پھیلا دی تھی - اور آخر میں دنیا کی بڑی لڑائی -

اس وقت ..... یورپ کی طرف سے ٹرکی اور برطانیہ کی طرف سے خاص طور سے مسلمانوں کے دل جلے ہوئے تھے - سرسید کی پرانی پالیسی کا عہد توڑ کر مسلمان علانیہ بغاوت کا اظہار کر رہے تھے - بنگال کی تقسیم کی جو "طے شدہ امر" کہا جا رہا تھا - تنسیخ نے ایک قیامت سی برپا کر رکھی تھی - اور اوس کا مجموعی اثر یہ تھا کہ اوس زمانہ میں مسلمانوں کی طبیعتوں میں سخت اشتعال تھا - اس پر آشوب زمانہ کا شاعر اگر کوئی ہے تو وہ مولانا شبلی تھے - ہر ہفتہ جو واقعہ پیش آتا تھا - اوس پر وہ ایک ایسا شاعرانہ اظہار خیال کرتے تھے کہ اوس زمانہ کے بچہ بچہ کی زبان پر وہ اشعار چڑھ جاتے تھے - ان نظموں میں جوش بیان - قوت نظم - اور موثر طنز کا ایسا تیز شربت چھپا تھا کہ وہ جس پر پڑتا تھا تلملا جاتا تھا مولانا کی اسی شاعری کے نمونے ہیں جن کو اردو شاعری کی ایک نئی چیز کہنا چاہیے - اس زمانہ میں لاہور میں "زمیندار" دلی میں "ہمدرد" لکھنؤ میں "مسلم گزٹ" اور کلکتہ میں "الہلال" نکل رہا تھا - یہ چاروں اخبار آگے بڑھنے والے مسلمانوں کی جن کو "احرار" کہا جاتا تھا زبان حال تھے - انھیں میں مولانا کی نظمیں چھپتی تھیں - اور خاص طور سے "الہلال" کلکتہ میں - جو مولانا ابوالکلام کا ہفتہ وار اخبار تھا - مولانا ابوالکلام اور مولانا شبلی میں اس زمانہ میں بعید علمی و عملی تعلقات اور سیاسی اتحاد خیال تھا - اور اسی لئے الہلال اوں کی نظموں کی اشاعت کا خاص ذریعہ بن گیا تھا -

یہ نظمیں مولانا شبلی کے نام کے بجائے پہلے کشاف کے نام سے چھپیں - ایک ہی دو نظمیں چھپی تھیں کہ لوگوں کی نظریں اوٹھ گئیں - اور شاعر کی تلاش شروع ہو گئی اور آخر بعض بعض پر اوں کی شخصیت کا بھید کھل گیا - تو کشاف نے وصاف کا بھیس بدلا - مگر اس بھیس میں بھی شخصیت پر پردہ نہ پڑ سکا - اور یہ راز سب پر کھل گیا - تب مولانا نے اپنے نام سے نظمیں لکھنی شروع کیں -

مسلمانوں کی سیاسی نظموں میں سے سب سے پہلے قابل ذکر وہ نظم ہے جو شہر آشوب اسلام کے نام سے جنگ بلقان کے زمانہ میں لکھی یہ نظم رفاہ عام لکھنؤ کے جلسہ میں پڑھی گئی تھی - اور جب پڑھی گئی تھی تو اوس کا یہ اثر تھا کہ صدر سے لے کر پائیں تک ماتم برپا ہو گیا تھا -

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک — چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دئے پرزے — فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جا چکا - فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے — کہ بیضا ہے یہ ٹرکی کا مریض خستہ جاں کب تک

خواجہ کمال الدین صاحب لاہور نے ایک خط میں مولانا کو لکھا تھا کہ اس نظم نے مجھ کو لندن میں تڑپا دیا - اور اسلامک ریویو کے نکالنے کے محرکات میں سے ایک یہ نظم بھی تھی - اس نظم کا اتنا چرچا ہوا - کہ کئی صاحبوں نے اس زمین میں طبع آزمائی کی اس کے آخر کے چند شعر بالکل الہامی ہیں

زوال دولت عثمان زوال شرع و ملت ہے — عزیزو فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک
پرستاران خاک کعبہ دنیا سے اگر اٹھے ! — تو پھر یہ احترام سجدہ گاہ قدسیاں کب تک
جو گونج اٹھے گا عالم شور ناقوس کلیسا سے — تو پھر یہ نغمۂ توحید و گلبانگ اذاں کب تک
کہیں اڑ کر تہ داماں کو بھی نہ چھو آئیں ! — غبار کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں — تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کے آشیاں کب تک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں — کہ اب امن و اماں شام و نجد و قیروان کب تک

بلقان کی لڑائی میں ڈاکٹر انصاری کا طبی وفد ہندوستان سے گیا تھا - وہ جب واپس آیا تو مولانا بمبئی میں تھے - وہیں خیر مقدم لکھا اور وہیں جلسہ میں پڑھا گیا - اس نظم میں دو بند ہیں - دوسرا بند قیامت کا ہے - ناممکن ہے کہ آج بھی وہ پڑھا جائے اور سننے والوں کا دل اثر سے تھرا نہ جائے -

مسلمانوں کے تم نے طالع آخر دیکھے ہیں — نئے سب انقلاب گردش گردوں بھی دیکھے ہیں
تمہارا درد دل سمجھیں گے کیا ہندوستاں والے — کہ تم نے وہ مظالم ہائے روز افزوں بھی دیکھے ہیں

یتیموں کے سنے ہیں نالہ ہائے جانگزا تم نے
زنانِ بے نوا کے چہرۂ محزوں بھی دیکھے ہیں
گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلا دینا
بلادِ مغربی کے یہ نئے قانوں بھی دیکھے ہیں
مسلمانوں کا قتلِ عام - اور ترکوں کی بربادی
نتائج ہائے امید گلیڈسٹوں بھی دیکھے ہیں
تمہیں نے غازیوں کے زخم پر ٹانکے لگائے ہیں
شہیدانِ وطن کے جامۂ پرخوں بھی دیکھے ہیں
لہو کی چادریں دیکھی ہیں رخسارِ شہیداں پر
زمیں پر پارہ ہائے سینۂ پرخوں بھی دیکھے ہیں
نگاہ آرائیاں دیکھی ہیں چشم گوہر افشاں کی
شہیدانِ وفا کے عارضِ گلگوں بھی دیکھے ہیں
تمہیں سے کچھ پتہ ملتا ہے شیدایانِ ملت کا
کہ تم نے شاہدِ اسلام کے مفتوں بھی دیکھے ہیں
جنونِ جوشِ اسلامی کوئی سمجھا تو تم سمجھے
کہ تم نے لیلیِ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں

اخیر کے تین شعر ایسے ہیں جن کو پیشین گوئیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی
تو تم نے وہ رموزِ قوت مکنوں بھی دیکھے ہیں
عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر ابھر آئے
کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

مچھلی والان کانپور کی مسجد کے انہدام پر سارے ہندوستان میں کہرام مچ گیا تھا اس سانحہ پر مولانا نے خوب خوب نظمیں لکھیں۔ جو مدت تک سب کی زبانوں پر تھیں۔ مولانا اس وقت بمبئی میں تھے۔ اونٹی پیلی نظم یہ نکلی:

بہائی جا رہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں
یہ زیورِ سید سجاد عالی کی وراثت ہے
یہی دس بیس اگر ہیں کشتگانِ خنجر اندازی
تو مجھ کو سستی بازوئے قاتل کی شکایت ہے
عجب کیا ہے جو فوجیوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ بچے ہیں سو رہے انکو سو جانے کی عادت ہے
شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محرومِ سعادت ہے

کانپور کے سلسلہ کی سب سے موثر نظم کے چند شعر یہ ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر شعر کس طرح شاعر میں ڈوبا ہوا ہے۔

کل مجھکو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفلِ خرد سال ہیں جو چیخ ہیں خود بخود
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آ گئی ہے منتظرِ نفخِ صور ہیں
کچھ نوجوان ہیں بیخبر نشۂ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بیدریغ
مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینوں پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار
اڑ کر مستِ بادۂ نازِ غرور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا
جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرقِ نور ہیں

پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں!

بلقان و طرابلس کے خونیں معرکوں کی تصویریں بھی اسی خوبی سے مولانا کے شاعرانہ مرقع میں موجود ہے۔

مسلم لیگ جس نے ۱۹۱۲ء میں سوٹ ایبل گورنمنٹ کا نقاب اپنے چہرہ پر ڈال لیا تھا۔ مولانا نے اوسکی خوب خوب دھجیاں اڑائی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اسوقت اونکی شاعری کے اس حصہ سے پردہ اٹھانے کا موقع نہیں۔ ورنہ ستیاگرہ کا ڈر ہے صرف ایک نظم پر اکتفا کی جاتی ہے۔ جس میں اس بات کا بیان ہے کہ سرسید کی وفادارانہ پالیسی اونکی طبیعت کی اصلی آمد نہ تھی۔ بلکہ کالج اسٹاف کے انگریز ممبروں کی سکھائی ہوئی تھی۔ فرماتے ہیں:-

کوئی پوچھے تو کہدو نگاہزاروں میں یہ بات
روشِ سیدِ مرحوم خوشامد تو نہ تھی

ہاں گریہ ہے کہ تحریک سیاسی کے خلاف اونکی جو بات تھی آزردنہ تھی آمد تو نہ تھی

مسلم یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی نے مسلمانوں کے عام مطالبہ کے برخلاف جس میں علی گڈھ یونیورسٹی کے بجائے مسلم یونیورسٹی نام رکھے جانے کی تمام ہندوستان کے اسلامی اسکولوں اور کالجوں کے الحاق کے حق اور وائسرائے کے اختیارات کم کئے جانے کے مطالبے بہت سخت تھے۔ مولانا نے اس مسئلہ کے متعلق نہایت ہی پرزور نظمیں لکھی ہیں۔ جس کے ایک ایک دو دو شعر بھی سنائے جائیں تو ہمارے قریبی احباب ہم کو اجازت نہیں دے سکتے۔ ان سیاسی نظموں میں جیسے بڑی خوبی نظم کی متانت۔ الفاظ کا دروبست۔ ترکیبوں کی چستی اور ان کا طنزیہ طرز بیان ہے۔ ہر شعر مخالف پر تیر و نشتر کا اثر رکھتا ہے۔ اور پھر گرفت کی کوئی چیز نہیں۔

کامیابی میں بس اک آدھ برس باقی ہے — لیگ سے سلسلۂ کانگرس باقی ہے
اب بھی آجاتی ہے کالج سے خوشامد کی صدا — جا چکا قافلہ اب بانگ جرس باقی ہے

اس دور میں سیاسی نظموں کے علاوہ مولانا نے تاریخی اور اخلاقی نظموں کے دو الگ سلسلے شروع کئے۔ جن میں سے ہر ایک اپنی خوبی اور بلندی کے لحاظ سے اردو کے بڑے بڑے ضخیم دیوانوں کے مقابلہ میں بھاری ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اردو ادب میں اونکی کوئی مثال نہیں۔ اور نہ اب تک اونکی تقلید کی جاسکی۔ ان نظموں نے ایک طرف اسلامی تاریخ کے انمول موتیوں کو ایک دھاگے میں پروکر قومی اخلاق کے حسن کو دوبالا کیا۔ دوسری طرف ہماری زبان کی شاعری میں صحیح واقعات کو نظم کرنے کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ اکثر کہا گیا ہے کہ بہترین شاعری وہ ہے جس میں جھوٹ یعنی مبالغہ اور خیال آرائی کا حصہ زیادہ ہو۔ مگر مولانا کی ان نظموں نے یہ دکھا دیا کہ واقعیت کی سطح پر بھی شاعری کا کمال دیکھا یا جاسکتا ہے عموماً ان نظموں میں روایت کے الفاظ کا ٹھیٹھ ترجمہ کردیا گیا ہے۔ پھر بھی کمال یہ ہے کہ خوبی ادا اور تعبیر میں شاعری کا پورا زور ہے۔

افلاس سے تھا سیدۂ پاک کا یہ حال — گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں — چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
سینہ پر مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار — گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا
اٹھا جاتا تھا لباس مبارک غبار سے — جھاڑو کا مشغلہ بھی جو ہر صبح و شام تھا
آخر گئیں جناب رسول خدا کے پاس — یہ بھی کچھ اتفاق کہ واں اذن عام تھا
محرم نہ تھے جو لوگ تو کچھ کہہ سکیں نہ عرض — واپس گئیں کہ پاس حیا کا مقام تھا
پھر جب گئیں دوبارہ تو پوچھا حضور نے — کل کس لئے تم آئی تھیں کیا خاص کام تھا
حیرت یہ تھی کہ اب بھی نہ کچھ منہ سے کہہ سکیں — حیدر نے اون کے منہ سے کہا جو پیام تھا
ارشاد یہ ہوا کہ عزیزان بے وطن — جن کا کہ صفۂ نبوی میں قیام تھا
میں اُن کے بندوبست سے فارغ نہیں ہنوز — ہر چند اس میں خاص تجھے اہتمام تھا
جو جو مصیبتیں کہ اب ان پر گذرتی ہیں — میں اون کا ذمہ دار ہوں میرا یہ کام تھا
کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم ہیں اون کا حق — جنکو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا
خاموش ہو کے سیدۂ پاک رہ گئیں — جرأت نہ کرسکیں کہ ادب کا مقام تھا

یوں کی ہے اہل بیت مطہر نے زندگی
یہ ماجرائے دختر خیر الانام تھا

ان نظموں میں اسلامی روایتوں کے ایسے پُرتاثیر اقتباس موزوں کئے گئے ہیں جو اسلامی تاریخ کے پرفخر کارنامے ہیں۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں ندوۃ العلماء اور اس کے دارالعلوم کا جو اصلاحی ہنگامہ سارے ملک میں برپا ہوا تھا۔ گو لوگ اوسکو بھول چکے۔ مگر مولانا کی وہ چند نظمیں جب تک باقی ہیں جن میں ادھر اشارہ کیا وہ بھلایا نہیں جاسکتا۔

مولانا کی طبیعت بہت ہی حساس تھی۔ اس لئے وہ فوری واقعات سے بہت جلد متاثر ہوتے تھے۔ اور یہی تاثیر اونکی شاعری کی روح تھی۔ یہی سبب ہے کہ مولانا نے اپنے زمانہ کے اکثر نامورو کی وفات پر مرثیے لکھے اور بڑے پُر درد لکھے۔ مگر یہ سب مرثیے فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ لیکن اپنی زندگی کے سب سے آخری سانحہ اپنے بھائی مولوی محمد اسحاق وکیل ہائیکورٹ الہ آباد کی وفات پر جو ولولہ و زور لکھا ہے وہ اردو ہی میں لکھا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک اردو مرثیہ ہماری زبان کے بہترین مرثیوں کے لئے ایک عمدہ نمونہ ہے۔ مرثیہ کیا ہے درد کی پوری تصویر ہے:

وہ برادر کہ مرا یوسف کنعانی تھا — وہ کہ مجموعۂ ہر خوبیٔ انسانی تھا
وہ کہ گھر بھر کے لئے رحمتِ یزدانی تھا — قوتِ دست و دلِ شبلیٔ نعمانی تھا
جوشِ اوسی کا تھا جو میرے سرِ پُرشور میں تھا
بل اوسی کا یہ مرے خامۂ پُرزور میں تھا

اسی طرح مسدس کا ہر بند نالہ و فریاد ہے۔

فوری واقعات پر اون کے دو دو تین تین شعر کے قطعے اردو ادب میں پہلی پہلی چیز ہیں۔

عجم کی مدحت کی عباسیوں کی داستاں لکھی — مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

پیغمبرِ خاتم اور خاتمہ بالخیر کی مناسبت چھپی نہیں۔ مگر اس میں جو بات چھپی ہے وہ یہ کہ اونکی یہ شاعری گویا الہامی تھی کہ شاعرانہ پیشین گوئی تاریخ کا واقعہ ہو کر رہی۔

سستے دام کے پرستارو

خوش آمدید

ہر قسم کی سوتی، ریشمی اور جاپانی گنجیاں۔ موزے۔ رومال تولیہ وغیرہ بہت سستے داموں پر یہاں ملتے ہیں۔ اگر آپ کو اپنے دوستوں اور عزیزوں کو گنجی وغیرہ رومال یا تولیہ کی ضرورت ہو تو ہمارے سستے اسٹور کو ضرور تشریف لائیے اور خود جا کر خواہ چیزیں خرید کر سستے داموں کی داد دیجئے۔

خادم

ہردو پرائیٹرس۔ ایم۔ الطاف

سستا اسٹور۔ کچہری روڈ گیا

لاؤڈ اسپیکر

قدرتی آواز سنئے نہایت سستے نرخ پر

سارے صوبہ میں اس سے بہتر لاؤڈ اسپیکر کسی دوسرے مقام پر نہیں مل سکتا۔ اس سے قدرتی آواز پھیلتی ہے۔ جس میں کشش اور دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ کرایہ کا نرخ سستا ہے۔ اپنے جلسہ میں ضرور طلب کریں۔ شان و شوکت بڑھے گی۔

صوبہ کے تمام بڑے بڑے جلسوں میں یہیں سے منگایا جاتا ہے۔ اجرت زبانی یا خط و کتابت سے طے کریں۔

عبدالشکور محمد سعید اینڈ برادرس کچہری روڈ گیا

"سپاہی کی بیٹی"

از: ادیب جلیل جناب سید وصی احمد صاحب بلگرامی ڈپٹی مجسٹریٹ مونگیر

دیکھا کہ ایک بڑھیا چلی آرہی ہے ـــــ ہزار سالہ۔ تصویر آہ و نالہ۔ خمیدہ کمر۔ خاک بسر۔ غمناک۔ برباد۔ سراپا فریاد۔ نقش قدم زنجیر پا۔ دیدۂ عبرت کا تو تیا۔ آنکھیں طاق فریدوں کا جواب۔ مرغ روح رگوں کے جال میں بیتاب!

اور دیکھا کہ اس بڑھیا کے ساتھ ایک ماہ و ہفتہ بھی ہے۔ چودھویں کا چاند نگینیں گہنا ہیں۔ یہ دیکھ کر ہم نے بڑھیا سے پوچھا ؎

کہاں سے آتی ہے؟ جاتی کہاں ہے؟ قصد ہے کیا؟
یہ اور کون ہے؟ تو کون؟ کیوں ہے یوں دلگیر؟

وہ بولی۔ حال دل خستگاں چہ می پرسی؟ — مجمل ز غم خودم از حوادث تقدیر!
من آنم آہ کہ عبرت سراست خانۂ من — سنوح سانحہ ام عشر را کند تعبیر
من آنم آہ کہ نامم شدہ غریب وطن — شروع قصۂ من می کند ز ورد نفیر
من آنم آہ کہ بودم ز انتخاب زماں — کنوں ببیں بچہ حالم ز گردش تقدیر

غریب ماندہ ام و کارواں گزشت و گزاشت
پئے کشائش دل ـــــ پامالی صغیر و کبیر

بداں کہ گوہرم از فارس است و ترکستان — بپاک طینتیم کو معترف بود تقدیر
نخست ہمرہ محمود غزنوی سوئی ہند — رسید موکب عالی من بصد توقیر
سن مسیح بدہ۔ نہ صد و نود بانہ ۹۹۹ — اگرچہ کردہ شہ غزنوی بسے تدبیر
نیافت شگون قیام در حد ہند — مرا گرفتہ و برگشت صورت تقدیر

بڑھیا نے کہا ہمارے حال پر مت جائیو! حال اور ماضی کے بیچ میں ایک گاڑھا پردہ ہے۔ اس پردہ کو اوٹھا کر دیکھیو! ہم کون ہیں؟ یہ ہم سے کیوں پوچھو؟ پوچھنا ہے تو فارس سے پوچھو۔ ترکستان سے پوچھو۔ فارس ہم کو لکھتا ہے تو ریشم طول عمر ہا۔ ترکستان ہم کو لکھتا ہے نور دیدہ مدعا۔ نور دیدۂ فارس و ترکستان نے ہندوستان کی صورت اول اول سنہ ۹۹۹ھ میں دیکھی۔ دیکھی مگر نہیں دیکھی۔ آنکھیں دیکھیں۔ دل نہیں دیکھا۔ دل نہیں دیکھا تو کچھ نہیں دیکھا۔ کیوں نہیں دیکھا؟ وہی نتاوے کا پھیر۔ سنہ ۹۹۹ھ!

یہ اوس وقت کی بات ہے جب محمود غزنوی نام ایک پرستار زادہ ہماری پرستاری میں تھا۔ مگر تم غریب ہمارے محمود کو کیا جانو۔ محمود شاگرد تھا برق و سیلاب کا۔ باڑھ آتی ہے آندھی کے پاؤں بجلی دوڑتی ہے لک الوت کے پاؤں۔ باڑھ آنا جانتی ہے مڑ کر دیکھنا نہیں جانتی۔ بجلی دوڑنا جانتی ہے۔ کہیں ٹھہرنا نہیں جانتی۔ برق و سیلاب کا شاگرد رشید بھی ہندوستان میں کبھی ٹھہرا نہیں

سپس محمد غوری ز فارسم آورد — بہند رخت بیند اختم ز لطف قدیر

سن مسیح ہزار و صد و نود و دو یک — ز بخت خود متمتع شدم چو شاہ و وزیر
کشادہ اند زمن صلح و جنگ را صدراہ — کہ فتح باب سخن بودم از سر تسخیر
شدم بہند چو من روشناس شاہ و گدا — درے کشود زمن بر رخ صغیر و کبیر

پھر سنہ ۱۱۹۱ھ میں دو بارہ آنا ہوا تو ہم نے ہندوستان کی صورت بھی دیکھی دل بھی دیکھا۔ اور دل دیکھا تو سب کچھ دیکھا۔ یہ اوس وقت کی بات ہے جب ہمارے غلاموں میں ایک زرخرید غلام، محمد غوری نام، ہمارے لئے ہندوستان کا دروازہ کھول چکا تھا۔

ہنوز سائلِ ہندوستاں بدم۔ ناگاہ — رسید موکبِ تیمور با شکوہ کثیر
رواج یافت ہر حکم از ذریعۂ من — شد از وسیلۂ من دفترِ نہی تحریر
ز بس رسیدۂ ہندوستاں بدم چوں شاہ — گلِ شباب ہندم شگفت بے تاخیر
بوصفِ حسنِ صفاتی کہ داشتم از بخت — سرود زمزمہ منقار بلبلِ تصویر
بقصرِ شہ کہ محلِ حجاب و صد ادب است — بر آستانِ وزیر و بنجا ہنائی امیر
بجایگاہ رئیس و شریف و اہلِ ہنر — بہ مامنِ غربا و بہ آشیانِ فقیر
باہلِ سیف۔ باہلِ قلم۔ باہلِ صلاح — بہ ہر مکاں کہ رسی بشنوی ز من تقریر
درونِ متقیاں جایگاہِ الفت من — برونِ اہلِ علوم از من انتظام پذیر
تمام خلق بدنبالِ من رواں و دواں — مگر مرا ہوسِ اہلِ طبع دامن گیر
مدام مسکن و ماوائی من دلِ شعرا — کہ بود تر بستم حق این گروہ کبیر

پھر تو یہ حال ہوا کہ ہندوستان ہمارا کلمہ پڑھنے لگا۔ عاشقانِ باصفا کی صفیں آراستہ تھیں۔ ان صفوں میں شاہ و گدا، اہلِ سیف و اہلِ قلم، اہلِ صلاح و اہلِ ہنر سبھی استادہ تھے۔ ہر فدائی اپنا دل ہتھیلی پر لئے منتظر کھڑا تھا۔ مگر نظرِ انتخاب ہماری صرف ایک دل پر پڑی۔ یعنی حضورِ محل کے لئے ہم نے شاعر کا دل چن لیا۔ کیونکہ یہی وہ بیت الشرف ہے جہاں وحدت میں کثرت اور خلوت میں جلوت کی بہار ہے!

یہ اوس وقت کی بات ہے جب ہمارے گھر کا ایک پاسبان، صاحبقران امیر تیمور گورکان، شرفِ حضوری کے لئے ہمارے پاس دلّی میں حاضر ہوا تھا۔ امیر تیمور کا بیٹا میران شاہ مرزا۔ اوس کا سلطان محمد مرزا۔ اوس کا سلطان ابوسعید مرزا۔ اوس کا عمر شیخ مرزا اور اوس کا ظہیر الدین محمد بابر۔

یہ سب خانہ زاد تھے۔ ہمارے قدیم نمک خوار تھے۔ مگر تیغِ ہجر کے گھائل تھے۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل تھے۔ زیارت تک کو ترستے تھے۔ ہم دلّی میں یہ غریب سمرقند اور کابل میں۔ پھر زیارت ہوتی تو کیونکر ہوتی؟ ادھر دلّی کا یہ حال کہ یہاں بھی عرصہ سے عشق کا بازار گرم تھا۔ یہاں بھی شمع اپنے پروانوں کے جھرمٹ میں تھی۔ اللہ اللہ! ہندی پروانوں کا وہ عالم کہ فدائیوں کی فوجیں بہ یک وقت ناپید اور پیدا ہوتی تھیں! شام سے سحر تک ہا اور یہ عالم ایک شب نہیں۔ ایک ماہ نہیں۔ ایک سال نہیں۔ اسی میں صدیاں گذر گئیں!

تب ظہیر الدین محمد بابر کابل سے دلّی آیا۔ اور سراج الدین محمد بہادر شاہ دلّی سے رنگون گیا۔ ہندوستان کو آلِ تیمور سے وہی مناسبت ہے جو کوہِ رقیم کو اصحابِ کہف سے۔ اوس غار میں اصحاب کہف کو اور دلّی میں آلِ تیمور کو نیند آ گئی۔ ایسی نیند آئی کہ مسلسل تین سو برس کے بعد آنکھ کھلی۔ جب آنکھ کھلی تو کسی نے ان کو پہچانا نہیں! شہر افسوس[1] نے اصحاب کہف کو نہیں پہچانا۔ شہر رنگون نے

---

[1] شہر افسوس (EPHESUS) ارضِ روم میں بحر ابیجین کے کنارے واقع تھا۔ دقیانوس فرمانروائے وقت تھا۔ اوسی کے ظلم سے بچنے کے لئے سات آدمیوں نے شہر افسوس چھوڑا تھا۔ اور دو فرسخ کے فاصلہ پر ایک پہاڑ کے غار (یعنی کہف) میں پناہ لی تھی۔ اسی نسبت سے یہ لوگ اصحاب کہف

آل تیمور کو نہیں پہچانتا۔ شہر رنگون بھی آل تیمور کے لئے آج تک شہر افسوس ہے!

بابر کابل سے دلی آیا۔ بہادر شاہ دلی سے رنگون گیا۔ کابل کی بہار بہتی ہوئی دلی آئی۔ دلی کی بہار روتی ہوئی رنگون گئی۔ قسم ہے بابر دلی اور رنگون کی کہ ہندوستان میں آل تیمور کا آنا شباب کا آنا تھا۔ اور ہندوستان سے آل تیمور کا جانا شباب کا جانا تھا۔ دریغا کہ عہد جوانی گذشت!

پرسس بازچہ شد حاصلم زکشت امید — مجوی ماز درونم کہ می شوی دلگیر
ہنوز چہرۂ من زنگ ارغوانی دشت — ہنوز بود دو گیسوی من سیاہ چو قیر
نظر زمانہ فریب و لبم رواں افزا — کمان دو ابروی پیوستہ۔ قامتم چوں تیر
کہ ناگہاں زکمیں گاہ جستہ وزد ناوک — بسینہ ام قدر انداز شکر تقدیر

افسوس کر دیکھنے کی چیز تم نے دیکھی نہیں۔ لیجا کا خواب۔ یا ہمارا شباب۔ وہ بھی رنگین۔ یہ بھی رنگین۔ جوانی میں ہمارے پاس کیا نہیں تھا؟ تم ہوتے تو دیکھتے۔ نگر سرمۂ فن سحر بنگالہ کا جواب۔ ابروی پیوستہ کماں کا جواب۔ قامتِ بالا تیر کا جواب۔ زلفِ مشکیں ظلمات کا جواب۔ لب جاں بخش آب حیواں کا جواب۔ چہرۂ لالہ رنگ مئی ارغواں کا جواب۔ گیسوئی شب رنگ لیلیٰ کا جواب!

ان سب کا جواب ہمارے پاس موجود تھا۔ لیکن مارآستین کا کیا جواب؟ دشمن دوست نما کا کیا جواب؟ اس عیاری کا کیا جواب کہ قدر انداز نے تیر چھوڑا تو چوروں کی طرح چھپ کر۔ اور پھر ایسا تیر جو وہاں کمان سے چھوٹا اور یہاں دل میں آکر ترازو ہوگیا۔ سچ پوچھو تو اسی عیاری نے ہمکو مار ڈالا!

رسید موسم نکہت۔ خمید نخل قدم — دمید موی سپید و زید باد صریر
نماند بخت نہ دولت نہ قدردان سخن — زحادثات مرا چرخ کرد چوں خود پیر
بہ سن کے میں نے کہا۔ اے اداطراز یہ کیا — کہ تو نے مجکو مفصل سنائی سب تقریر
نگردہ پیچ دکھائے کہ کچھ نہ حال کھلا — سنے چو نام تو پائے نشان کچھ نہ پذیر
بیکاری زدوکے۔ کمن جستجوئی نام کہ نیست — بجز ذلیل وحقیر و ظہیر و لے تو قیر
بریدہ اند چو سلمان فارسی ز وطن — چو شعر خوشتر سلمان بہند گشتہ شہیر
عزیز اہل خرد فارسی بود نامم — اگرچہ در جہلا گشتہ نام ظہیر و حقیر
پراز علوم درونم چو سنگہا ز شرار — پراز فنون دل من ہمچو دق در انجیر
مرا کہ فاتحۃ الباب خواندہ اند چہ حظا — کہ گستہ اند بروئم در ہمہ تدبیر
مرا کہ گوہر شہوار گفتہ اند۔ چہ سود — کہ بخت خاک مذلت بفرق من تقدیر

یہ داستانِ غم سن کر ہم نے بڑھیا سے نام پوچھا تو اس نے کہا اسکو سلمان سے پوچھو۔ ہم بھی فارسی سلمان بھی فارسی قسمت کی ترازو میں سلمان فارسی ہے اور فارسی سلمان! ثبوت یہ کہ ؎

بریدہ اند چو سلمان فارسی ز وطن

کل تک ہمارا نام تھا دُرِ شہوار۔ آج ہمارا نام ہے ذلیل و خوار۔ کل تک محبوبِ چمن۔ آج مردودِ چمن۔ کل تک عزیز وطن! کیوں؟ اسلئے کہ کارواں آگے بڑھ چکا۔ عاشقانِ باصفا سب مرمٹے۔ اب کوئی نازبردار نہیں رہا۔ جس نے شق القمر نہ دیکھا ہو وہ ہمارا دل دیکھ لے وہاں

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲) مشہور ہوئے۔ ان کے ساتھ قطمیر نام ایک کتا بھی تھا۔ بعد میں اصحاب کہف کے نام اوس جگہ کندہ کردئے گئے۔ اسلئے اوس کا نام کوہِ رقیم ہوا۔ ——— اصحاب کہف کے نام تاریخ کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں لیکن ناموں میں کچھ اختلاف ہے۔

ایک چاند کے دو ٹکڑے، یہاں ایک دل کے سو ٹکڑے۔

تب ہم نے فارسی سے پوچھا کہ تیرے ساتھ یہ اور کون ہے ؎

وہ بولی۔ آہ ہمیں دختِ خواندہ ام اردو ست — چو من ہمین جوانی شدہ زحادثہ پیر
مدام مونس جان من است قوتِ روح — من آفتاب منیرم چو او ست بدر منیر
چو من بہند رسیدم شدہ ولائت او — پس از حکومتِ بابر بلطف حی قدیر
بہ عہد شاہجہاں تاختہ بہ اردو شد — ز ربقۂ لشکر و آمیزش صغیر و کبیر
ز ہر کہ رابطۂ اولیں نمود۔ منم — اگرچہ از عربی ہم شدہ است لذت گیر

نو دیدۂ فارس نے جواب دیا کہ اس نے ہمارا دودھ پیا ہے۔ یہ ہماری چچیری ہے۔ راج دلاری کہہ لیں۔ یعنی سگی ہے۔ گدڑی کا لعل ہے۔ عصائے پیری ہے۔ سپاہی کی بیٹی ہے۔ سپاہی کی جان ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ میر امّن کی فیاضی نے یہی خطاب تلوار کو بخش دیا۔

سپاہی کی بیٹی اردو بازار میں پیدا ہوئی۔ اس کی آنکھ تلواروں کی جھنکار سے کھلی۔ اس کا عقیقہ بھی اردو بازار میں ہوا۔ نام نکالنے کے لئے کلام اللہ کھولا گیا تو اللہ کا الف نکلا۔ ایک تو اس الف کی برکت۔ پھر جائے ولادت کی رعایت اور پھر شجرہ کی مخالفت۔ یہی وجہ تھی کہ سپاہی کی بیٹی کا نام اُردو رکھا گیا۔ یہ اوس وقت کی بات ہے جب سدا ہماگن دلّی بارہویں مرتبہ دُلہن بنی تھی۔ اور میر کاشی نے اس کے سہاگ کی تاریخ لکھی تھی۔ ؎ "شد شاہجہان آباد از شاہجہاں آباد" ۱۰۵۸ھ ہجری ——— اب جانے بھی دو اس قصہ کو۔ رات کی بات گئی رات کے ساتھ۔

سنا یہ حال جو میں نے کہا بصد حیرت — کدھر کا قصد ہے۔ تم کس طرف کو ہو رہگیر
وہ بولی۔ تنگ شدہ بر من این فضای جہاں — درے نماند کہ ما نم زسہم گوشہ پذیر
نہ آں زمان و نہ آں مردماں نہ آں نازش — سخن شناس و نہ اہل سخن نہ آں تاثیر
کجا روم۔ چہ کنم۔ یہ دریغ کہ رُو آرم — کہ نیست یار و مددگار ایں نزار و حقیر
گہے بشرقی شتابم۔ گہ بہ غرب کردم رو — نبود جای و دلم گرد آخر ایں تدبیر
کہ غرق بحر شوم و چو عمر خویش گذرم — نہ لطمہ ہای بلیات تجربہ تقدیر
بہ کہہ کے صدمۂ ہلوا فارسی کے دل کو کمال — جگر کو تھام کے بیہوش ہو گئی دلگیر
تمام ضعف سے پھیلائے جو ہاتھ اوپاؤں — سراوس کا گود میں اردو نے رکھا بے تاخیر

تب ہم نے خانماں برباد فارسی سے پوچھا کہ اس وقت تو جاتی کہاں ہے۔ اوس نے کہا دریا میں ڈوبنے۔ بات یہ ہے کہ یہاں سے ہمارا دانہ پانی اوٹھ گیا۔ ہماری صاحبقرانی تخت طاؤس کی طرح فنا نہ ہو چکی۔ ہماری نور جہانی اور جہانگیری اور عالمگیری پر ایمان لانے والے مر مٹے اب زمین دشمن۔ آسمان دشمن۔ شمع انجمن انجمن سے نکال دی گئی۔ تجہری محفل میں یہ رسوائی سچ پوچھو تو ڈوب مرنے کی بات ہے۔ ڈوب مرنے کا نسخہ ہم کو غالب کے سفینہ سے ملا۔ بڑی بات اس نسخہ میں یہ ہے کہ سائیدن کو فتن بجتن آمیختن یعنی جنازہ اور مزار کا کھڑاک نہیں! ؎

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا — نہ کہیں جنازہ اوٹھتا۔ نہ کہیں مزار ہوتا

اتنا کہنے پائی تھی کہ فارسی شدّت غم سے بیہوش ہو گئی۔ اردو نے اوس کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ کہنے لگی کہ اللہ رے انقلاب زمانہ! مسیحا آج خود بے ہوش ہے۔ اور ایک چلو پانی نہیں ملتا ؎

کل جو اوٹھتے تھے بٹھانے کے لئے — صفیر بلگرامی
آج بیٹھے ہیں اوٹھانے کے لئے

ہم نے اُردو سے پوچھا کہ تو یہاں کسی کو جانتی ہے؟ اوس نے کہا ؎

فصاحت اور بلاغت حقیر زادیاں ہیں — پسند آئی اونھیں خدمتِ اُنیس و دبیر
حقیر ایک ہیں حضرت دبیر کے شاگرد — ہر ایک اون سے ہے واقف۔ امیر ہو کہ فقیر
میں وشناس ہوں اونکی۔ مجھے ہے اب تک یاد — وہ اونکے شعر۔ وہ لکنت بھری ہوئی تقریر
یہ کہہ کے سوچ کے بولی۔ ادھر تو دیکھیں آپ! — تو مسکرا کے کہا میں نے۔ ہاں میں ہی ہوں حقیر
یہ سن کے خوش ہوئی ایسی کہ۔ رنج بھول گئی! — پھڑک کے کہنے لگی۔ اب کھلی مری تقدیر

بسانِ نقشِ قدم فارسی جو تھی سرِ خاک
پکاری دیدۂ حیرت کو کھول کر دلگیر

تو ہی حقیر سخن سنج اے خجستہ صفات؟ — تو ہی کہ ہست کلامت زحسن عالمگیر؟
تو ہی کہ داد مرا نام تو ز رنج نجات؟ — زہے نشاط و زہے وقت و حبّذا تقدیرا
بگو کہ در سرِ خیالی؟ چہ شغل ہا داری؟ — بگو بگو کہ پئے من چہ می کنی تدبیر؟

اردو نے کہا تم لاکھ چھپاؤ۔ ہم پہچان گئے! حضرت موتی کی قسم۔ پہچان گئے! تم حقیر ہو! حقیر ہو! حقیر!
حقیر کا نام سننا تھا کہ بیہوش کی بیہوشی جاتی رہی۔ فارسی نے آنکھیں کھول دیں۔ پوچھا سچ مچ حقیر نہیں ہو؟ کلیم ذلت نہیں ہو؟ حقیر
سخن آرا نہیں ہو؟ تو ہی کہ ہست کلامت زحسن عالمگیر؟ نہیں۔ تم حقیر نہیں ہو سکتے! حقیر ہم پر مرتا ہے۔ تم حقیر تو وہ چاہت کہاں گئی؟
نگردد زہست مشو رنجے خماند؟

ہم نے کہا تیرا حقیر تجھ پر اب بھی مرتا ہے۔ مگر وہ کفر کی موت مرتا نہیں جانتا۔ ڈوب مرنے کا نسخہ نہیں جانتا۔ مذہب یا اس اور کس کا مذہب نہیں۔ رات سے دن ہوتا ہے۔ اور اندھیرے سے اُجالا۔ اچھا۔ ہم سے ایک بات سن لے

زمانہ آئی سر نو ہے تحوّل آرائش — جہاں آج طراوت سے ہے بہشت نظیر
ہماری قیصرِ ہند آبروی تاج و نگیں — شہ اریکۂ انگلینڈ آفتاب سریر
پچاس سال ہوئے اونکو تخت پر بیٹھے — ہے اس خوشی کا زمانہ میں ذکر عالمگیر
کہ فروری کے مہینہ کی سولہویں تاریخ — اس انتظام کی خاطر ہے ٹھہری بے تاخیر
ہمارے آرہ میں سامان ہے وہ کچھ موجود
کرا در جا کی ہوس اب نہیں ہے دامن گیر

کلکٹری کا جو رمنہ ہے سج کے ہے تیار — وہاں تہیۂ دربار ہے بحسن کثیر
ادھر ہے کثرتِ مردم۔ ادھر ہے کثرتِ فکر — چلے ہی آتے ہیں مضمون تازہ جیسے بہیر
اسی سبب ہوئی قافیوں میں بھی تکرار — پولس کا دستِ تحکم بھی اس جگہ ہے قصیر
تمام فرش ہے مانندِ صفحۂ قرطاس — کہ جس پہ نظم ثریا مثال ہو تسطیر
تمام خطۂ انگلینڈ و گوشۂ گوشۂ ہند — اسی شاہ پہ مامور ہے بصرف کثیر
نہ پوچھ جشن جو کلکتہ پر ہے ان دنوں — کہ دیسرائی کا مسکن ہے اور مقام سریر
نہ پوچھ جشن جو لندن میں ہے مسرت زا — کہ جائے قیصرِ ہندوستاں ہے خلد نظیر
سنیں گے خلعت و انعام بھی خطاب کے ساتھ — یقین ہے کہ غنی ہونگے اب تمام فقیر

لہ خطاب۔ جوبلی ۱۸۸۷ء میں گورنمنٹ نے مفتی میر محمد عباس اعلی اللہ مقامہ اور چند دیگر حضرات کو شمس العلما کا خطاب دیا۔ مفتی صاحب (باقی ص ۲۶ پر)

پہونچ گئی جو تم اس جلسہ میں تو دیکھیو پھر
ملاوہ کچھ کہ کہیں لوگ۔ واہ ری تدبیر!

یہ ۱۸۸۷ء ہے۔ فروری کی آج ۱۶ تاریخ ہے۔ ۱۸۳۷ء میں ملکہ وکٹوریہ تخت پر بیٹھی تھی۔ تخت نشینی کو آج پچاس سال ہوئے۔ اسی کا جشن ہے۔ اس ملک میں بھی۔ سات سمندر پار بھی۔ گھر گھر دیوالی ہے۔ گھر گھر چراغاں ہے۔ لندن میں۔ کلکتہ میں۔ آگرہ میں۔ ملاوہ کٹوریہ کا دربار ہے۔ خاص نہیں۔ عام ہے۔ تو بھی چلی چل!

پھڑک گئی یہ سخن سنتے ہی وہ صورت چشم	شگون نیک دکھانے لگی اوسے تقدیر
دو فور شوق میں اک بار پھل گئیں باچھیں	پکڑ کے ہاتھ کو بولی۔ "بیا بہانہ مگیر"
تو شاعری و سخن من سخن رس آں ممدوح	جذب من شو و ایں درد را بکن تدبیر
نہ مونسے نہ رفیقے نہ ہمدمے دارم	دیلتے نہ مہینے نہ دست و نہ تدبیر
بدست تست ہمہ احتشام من اکنوں	ز مردمی بنما دستگیری من پیر
بیا رگاہ معلائے او مرا برساں	بحضرتش بکن ایں عرض از زبان تقریر

چہ شد گناہ زمن اے پناہ اہل زماں؟
چہ شد زدخترم اردو بحضرت تقصیر؟

ز آستان تو ما را چرا ندر کردند؟	اگر گناہ نمودیم۔ عذر ما بپذیر
شہان بدہر ہر جا ئی خویش عید کنند	بخلق بذل کنند و رہا کنند اسیر
چنانکہ وقت خطاب جناب قیصر ہند	رہا شدند اسیران واجب التعذیر
من اسیر ملاہائے بے پنہ رانیز	اگر ز لطف رہائی دہی۔ زہے تقدیر
بحال من نہ کنی رحم اگر۔ بر اردو کن	کہ در شباب نمودہ است آسمانش پیر

شہان بپاس سخن ہائے خویش مشہور اند
عزیز کردہ خود را کن ذلیل و حقیر!

سراپا فریاد فارسی نے کہا ہکو ملکہ وکٹوریہ سے بہت کچھ کہنا ہے۔ کہنا ہے کہ ہمارے چین میں ایک بادشاہ تھا۔ اوس کے محل سے..... ایک سونے کی زنجیر لٹکتی تھی۔ ہماری جوانی میں ایک بادشاہ تھا۔ اوس کے محل سے بھی ایک سونے کی زنجیر لٹکتی تھی۔ عدل جہانگیری عدل نوشیروانی کا جواب تھا۔ اے ملکہ! تیرے راج میں بڑا اندھیر ہو رہا ہے۔ ۱۸۳۸ء میں لارڈ ولیم بنٹنک نے فارسی کو سولی دیدی۔ ۱۸۴۱ء میں لارڈ ناتھ بروک نے اردو کو سولی دیدی۔ ہندوستان فریادی تھا۔ فریادی کی زبان تک کھینچ لی گئی۔ دہلی نوشیرواں کی دہائی جہانگیر کی! وہ سونے کی زنجیر کیا ہوئی؟ اے ملکہ! عضب ہے کہ ؎

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵) اسکی منطق گرفت کی۔ یعنی آفتاب ایک ہوتا ہے۔ ایک سے زیادہ نہیں ہوتا۔ پھر بیک وقت اتنے آفتاب کس طرح پیدا ہو گئے۔ شمس العلما کسی ایک کو ہونا چاہئے تھا۔ ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ شمس العلما نہیں ہو سکتے ؎

گر دشش چرخ بہیں۔ لات ذریں نگر	کہ نام دل تمن سوختہ شمس العلما
بندہ را نسبت سر و کار و تعارف با او	نہ من غم زدہ را قوت تحریک سما
شہرہ چوں یافت۔ نوشتند من تبنیتے	کہیں شکوہ و عظمت باد مبارک بجا
ہر بانس نام ملقب شدہ اشخاصے چند	گرچہ شمس است یکے۔ نے متعدد چوں ما
سلطنت رفت ز اسلام بنا دانی ہا	مرزبوم است ہمایون و چو عنقاست ہما

رسائی زمانے کی ہو تیرے گھر میں
نہ پوچھے تو میری خبر تک نہ پوچھے (منیر شکوہ آبادی)

اے ملکہ! سن ستاون نے تجھکو قیصر ہند کیا۔ اس خوشی میں تو نے قیدیوں کو رہا کیا تھا۔ آج پھر جشن قیصری ہے۔ اس قید فرنگ سے ہم کو بھی آزاد فرما۔

اے ملکہ! تیری طرح ہم بھی کبھی ملکہ تھے۔ تیرے ہاتھ میں شمشیر ہے۔ ہمارے ہاتھ میں قلم تھا ——— دشمن کہتا ہے کہ یہ دعوی باطل۔ ہم کہتے ہیں" ولیکن قلم در کف دشمن است!"

اے ملکہ! فارسی اگر مجرم تھی تو اردو سے کیا تقصیر ہوئی تھی؟ اے ملکہ! تو نے اردو کو پہچانا نہیں۔ اردو تیغ ہندی ہے۔ اردو شاہجہانی تحفہ ہے۔ آگرہ میں تاج محل اور ہندوستان بھر میں اردو۔ شاہجہانی تحفہ ہے۔ اے ملکہ! افسوس کہ تو نے اس شاہجہانی تحفہ کی بھی قدر نہ کی!

اے ملکہ! تیرا فرمان تھا کہ سپاہی کی بیٹی کے واسطے فورٹ ولیم خالی کردو۔ پھر فرمان ہوا کہ سپاہی کی بیٹی فورٹ ولیم خالی کرکے دریہ رہنے کو کہا۔ اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا غالب

اے ملکہ! الف اپنے ملک کا بادشاہ ہے۔ کیوں بادشاہ ہے؟ بادشاہوں کی زبان ایک ہوتی ہے۔ الف کی زبان ایک ہے۔ اسی حق سے الف حروف تہجی کا بادشاہ ہوا۔ اے ملکہ! تیری زبان بھی الف کی زبان کیوں نہ ہوئی؟ اردو کو نظروں سے گرانا تھا تو آنکھوں پر بٹھایا کیوں تھا؟

حضرت بلقیس زمانی کو سلیمانی مبارک! مگر فارسی کا آفتاب غروب ہو چکا۔ پھر کون کہتا ہے کہ تیری سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا؟ حضرت مریم زمانی کو اردو[1] دانی مبارک! مگر اردو کو سوتی دیدی گئی۔ پھر کون کہتا ہے کہ تیرے راج میں خون ناحق نہیں ہوتا؟ فارسی کی یہ فریاد سنکر ہم نے ملکہ وکٹوریہ سے فریاد کی۔ اے ملکہ! سوہن وگنگ وجمن کی طرح ہندوستان میں تیرا فیض بھی عام ہے ؎

اگر عجب ہے تو اس کا کہ اے سپہر نشاں! — زبان ہند میں کس واسطے ہوئی تغیر؟
یہ فارسی ہے۔ یہ اردو ہے۔ تجھ سے داد طلب — کہ تیرے وقت میں کیوں گھٹ گئی مری توقیر
نہیں ہے فارسی اس وقت تجھ سے یہ خواہاں — کہ ہو مرے لئے اجرا و نشر کی تدبیر
مگر یہ اردوئے پر مغز جس میں غیب سے ہے — ہر اک زبان کے انداز و طرز کی تخمیر
ہوئی ہے کس لئے دور آستان رحمت سے — کہ خاص تو نے ہی اس کی بڑھائی تھی توقیر

رموز مصلحت خویش خسرواں دانند
من تیرے رمز کی کس طرح سے کروں تحقیر

اگر عجب مجھے آتا ہے اس سے اے سلطاں — مجھے عزیز کرے تو۔ وہ یوں ہو زار و حقیر
کسی زبان میں ہندوستاں کی ہیبت — نہیں ہے اور نہیں ہے کہ سب ہیں اس سے خمیر
امید وار ہوں میں بھی کہ عطیہ جوبلی میں — جہاں بڑھائے تو "اقبال" کی توقیر
ذلیل کردہ تری چاہتی ہے اردو بھی — عزیز کرلے۔ اے ملکہ نگین و سریر

---

[1] اردو دانی — حافظ عبدالکریم ساکن آگرہ ملکہ وکٹوریہ کو اردو پڑھاتے تھے۔

رواں رہیں ترے احکام ہند میں دائم ذبانِ اردوئے پُر مغز میں بفضل قدیر
پچاس سال مبارک سریر آرائی صدی بھی ساتھ ہی ہوویں ہی شش پذیر
جو کچھ دے بذل ہو۔ پر میں ہوں طالبِ دو دو
صلہ قصیدہ کا اپنے یہ چاہتا ہے صفیر

صفیر بلگرامی نے جس وقت یہ قصیدہ کہا تھا اوس وقت آرہ میں خانہ جنگی تھی۔ اس بات پر کہ ملکہ وکٹوریہ کا نمایندہ اس ضلع میں کون ہے جج کہتا تھا ہمارے ہوتے کلکٹر کوئی چیز نہیں ـــــ کلکٹر کہتا تھا "تاؤ! تاؤ! کتنے بال؟ - جمعدار جی! اتنا گھبراتے کیوں ہو؟ مونڈسے تا مونڈے آگے آئیں گے"! یعنی ذرا دربار ہو لینے دو۔ اوس وقت کہہ لینا کہ ملکہ کا نمایندہ کون ہے!

بات زیادہ بڑھی تو گورنمنٹ نے فیصلہ کیا کہ ضلع کا حکمیا کلکٹر ہے۔ جج حکمیا نہیں ہو سکتا۔ آرہ میں اوس وقت اسے بی پاور کلکٹر تھے۔ ایک تو ملکہ کی پچاہ سالہ جوبلی۔ پھر جج کے مقابلہ میں میدان مار لینے کی خوشی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شب پنجشنبہ ۱۶ فروری ۱۸۸۷ء کو آرہ میں جلوس اس شان سے نکلا گویا خود پاور صاحب کی برات دلہن کے دروازہ لگ رہی ہے! سڑکوں پر جا بجا محراب۔ جلوس میں پیادے سوار - ہاتھیوں کی قطار۔ نقیب عصا بردار۔ نالکی پالکی۔ دیگ چتابی۔ بینڈ شہنائی۔ قمقموں کے جھرمٹ میں۔ ایک تخت روان۔ تخت روان گویا موج روان۔ اوس تخت روان پر ایک طرف سید نصیر الدین۔ دوسری طرف لطیف عالم۔ اور بیچ میں نوشاہ یعنی خود پاور صاحب کلکٹر!

(۱) سید نصیر الدین خلف مولوی سید فرزند علی رئیس نیورہ ضلع عظیم آباد۔ سید نصیر الدین کے دو بھائی اور دو بہنیں۔ بڑے بھائی سید فخر الدین۔ چھوٹے بھائی آنریبل جسٹس سید شرف الدین بھکیلہ ہائی کورٹ۔ ایک ہمشیر کی شادی نواب محمد امداد امام اثر عظیم آبادی سے ہوئی۔ اور دوسری ہمشیر کی شادی خان بہادر سید ظہیر الدین سے ہوئی۔ جشن جوبلی ۱۸۸۷ء کے بعد ہی مولوی سید نصیر الدین ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔

سید نصیر الدین جہان آباد ضلع گیا میں سب ڈویزنل آفسر تھے کہ بھوپال میں بھوچال آیا۔ اور وزیر بھوپال نواب عبد الجبار اپنے پرائیوٹ سکریٹری ابو القاسم کے ساتھ وہاں سے دامن جھاڑ کر کلکتہ چلے آئے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے گورنمنٹ بنگال کو خط لکھا کہ ہم کو نواب عبد الجبار کی دیانت و سطوت کا آدمی درکار ہے۔ بنگال گورنمنٹ نے تین نام پیش کئے:-

۱- نواب سید محمد آزاد[۱] - ساکن ڈھاکہ بنگال۔
۲- مولوی سراج الحق ڈپٹی کلکٹر - ساکن استھانواں ضلع عظیم آباد۔
۳- مولوی سید نصیر الدین ڈپٹی کلکٹر - ساکن نیورہ ضلع عظیم آباد

تب بیگم بھوپال نے اپنے معتمد مولوی غلام قادر کو ہارون الرشید کے بھیس میں بھوپال سے روانہ کیا کہ چپکے سے ان تینوں کو دیکھ آؤ کہ کون کیسا ہے۔ اتفاق یہ کہ مولوی غلام قادر ساکن ہوگلی بنگالہ عرصہ تک بہار شریف ہائی اسکول میں مدرس رہ چکے تھے۔ اس لئے بھوپال سے تیر کی طرح یہ بہار شریف پہونچے۔ اور خلوت میں احباب خاص سے اپنے آنے کی حقیقت ظاہر کر دی۔ بہار شریف نے کچھ سمجھ بوجھ کر اپنا ووٹ نیورہ کو دیا۔

---

[۱] نواب سید محمد آزاد - انسپکٹر جنرل رجسٹریشن صوبہ بنگال - ممبر کونسل بنگال - ان کے ظریفانہ مضامین اودھ پنچ - اودھ اخبار اور آگرہ اخبار میں نکلتے تھے - دیکھو تاریخ ادب اردو مولفہ رام بابو سکسینہ - حصہ نثر - ص ۱۰۶۔

[۲] مولوی سراج الحق استھانوی کے بیٹے مسٹر ملک محمود بیرسٹر کلکتہ و پٹنہ - ان کے تین لڑکے - انوار الحق - اسرار الحق اور ابرار الحق -
مولوی انوار الحق مدرس ہائی اسکول بہار شریف -
مولوی اسرار الحق وکیل بہار شریف -

اس کے بعد مولوی غلام قادر نے ہارون الرشیدی دورہ شروع کیا - اور تینوں قلندروں کی زیارت کی - دیکھا کہ نواب سید محمد میں قصاید غزنی کی تمکنت اور مولوی سراج الحق میں مقدس حالی کی سادگی - اور مولوی سید نصیر الدین میں دیوان حافظ کی بہار ہے - چنانچہ یہ بہار جہان آباد سے بھوپال پہونچی - سید نصیر الدین[1] بھوپال پہونچتے ہی نصیر الہام ہوئے - کچھ دنوں کے بعد بورڈ آف ریونیو بنگال کے جوائنٹ سکریٹری ہو کر کلکتہ چلے آئے - پھر کلکتہ سے دوبارہ بھوپال گئے - اور ۱۹۱۱ء میں وہیں پیوند خاک ہوئے -

(۲) محمد لطیف عالم خلف قاضی محمد ظہور عالم رئیس آرہ - کلکٹر شاہ آباد کی کوٹھی دراصل قاضی محمد ظہور عالم کی ..... کی کوٹھی ہے - گورنمنٹ نے یہ کوٹھی قاضی صاحب سے ۳۵ ہزار میں خریدی تھی - قاضی ظہور عالم کا ایک دوسرا مکان تری محلہ میں آرہ ٹاؤن اسکول کی پشت پر تھا - اور اس زمین پر سید شاہ محمد مسعود ڈپٹی کلکٹر نے مدرسہ وحیدیہ کی عمارت اٹھائی -

جشن جوبلی ۱۸۸۷ء کے بعد ہی قاضی لطیف عالم ڈپٹی کلکٹر ہوئے - ۱۹۰۰ء میں تعمل از وقت پنشن لی لیکن پنشن کا ایک پیسہ زندگی بھر پر آمد نہیں کیا - اور اس طرح ۳۲ ہزار روپے چھوڑ دئے خیال یہ تھا کہ پنشن کا روپیہ لینے والا (سرکار کے اقبال سے) بہت جلد مرجاتا ہے - مگر بقول صبا لکھنوی ؎

"موت کس پردہ میں آئی - دیکھئے!"

قاضی لطیف عالم کو اپنے لڑکے نظیر عالم سے حشق عقوبی تھا - نظیر عالم کی شادی سکینہ خاتون سے بہار شریف میں ہوئی تھی - شادی کے چند ماہ بعد دوشنبہ ۱۱ فروری ۱۹۰۲ء کو لطیف عالم اور نظیر عالم ایک تار پاکر بانکی پور سے بہار شریف پہونچے - اسی شام کو رمضان کا چاند ہوا - چاند دیکھ کر یہ دونوں اپنے موٹر پر بانکی پور کے لئے روانہ ہوئے - راستہ میں ملک الموت نے اپنا ہم ڈرائیور کو دھکا دے کر نیچے گرا دیا اور موٹر اپنے ہاتھ میں لے لیا - موٹر میں اب تین شخص تھے - عاشق و معشوق اور ملک الموت! ملک الموت نے موٹر کو درخت سے ٹکرا دیا - لطیف عالم کو کسی کی نظر کھا گئی - نظیر عالم کو اوس کی جوانی کھا گئی - عاشق و معشوق کی جان ایک ساتھ نکلی - کیوں ساتھ نکلی؟ ؎

اے بلائے تو تولائی من — از خود و از غیر تبرائی من
عشق تو سرمایۂ سودائی من — گر بشکافند سراپائی من — محمد باقر صحبت شیرازی
جز تو نیابند در اعضائی من!

رہے نام اللہ کا! آج سید نصیر الدین نہیں - قاضی لطیف عالم نہیں - اے بی پاور نہیں - جشن جوبلی ۱۸۸۷ء میں یہ تینوں رات کے وقت آرہ میں تخت رواں پر نکلے تھے - آج وہ تخت رواں بھی نہیں - موج فنا ان تینوں کو تخت رواں کی طرح خدا جانے کہاں بہالے گئی - رہے نام اللہ کا!

طالب و مطلوب میں بھی فراق ہو چکا - مطلوب کون؟ اردو! طالب کون؟ صغیر بلگرامی ؎

جہاں تک ہند میں ہے وصف میر و مدحت مرزا — جہاں تک آتش و ناسخ کا ہے آفاق میں چرچا
جہاں تک ذوق و غالب کا سخن ہے انجمن آرا — جہاں تک لطف اردو کو ہے موقع اور بڑھنے کا
مبارک جشن جوبلی قیصر ہندوستان کو ہو — خوشی اسکی صغیر طالب اردو زباں کو ہو

---

[1] نصیر الہام سید نصیر الدین - ان کے دو صاحبزادے - سید عزیز الدین سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس - سال رحلت ۱۹۳۰ء - اور سید وحی الدین منصف - سال رحلت ۱۹۳۰ء -

طالب صادق کی پہچان یہی ہے۔ وہ اپنی نمود نہیں چاہتا۔ وہ چاندی سونا نہیں مانگتا۔ موتی مونگا نہیں مانگتا۔ فنافی المطلوب صرف اپنے مطلوب کو مانگتا ہے۔ صفیر ملگرامی بھی اپنی لیلیٰ کا مجنوں تھا۔

مجنوں مرگیا۔ لیلیٰ جیتی ہے۔ لیلیٰ جیتی ہے تو مجنوں بھی جیتا ہے۔ مجنوں مر نہیں سکتا۔ مجنوں زندۂ جاوید ہے۔ ایک مجنوں مرتا ہے دوسرا سامنے آتا ہے۔ ایک مجنوں کی خاک سے ایک ہزار مجنوں اور اٹھتے ہیں۔ پھر کون کہتا ہے کہ مجنوں مرگیا؟ مجنوں مرنا چاہے بھی تو ملک الموت آکر پلٹ جائے گا۔ لیلیٰ باؤلی نہیں۔ بڑی سیانی ہے۔ جانتی ہے کہ لیلیٰ کی لالی مجنوں تک! مجنوں نہیں تو لیلیٰ کہاں؟ مجنوں را "بچشم لیلیٰ" باید دید! لیلیٰ اپنے مجنوں کو کبھی مرنے نہیں دیتی۔ قم باذنی کہہ کر جھٹ پٹ جلا لیتی ہے۔ لیلیٰ مجنوں رہتی دنیا تک!

لیلیٰ دیوانی نہیں۔ بڑی ہوشیار ہے۔ آنکھ والی ہے۔ داغلوں کی دانا ہے۔ وہ خوب پہچانتی ہے۔ اپنے دشمن کو۔ دشمن کے دوستوں کو۔ آشکارا نہیں خفیہ دوستوں کو۔ دشمن سے رشوت لینے والوں کو۔ دشمن سے سازش کرنے والوں کو۔ دشمن کی چوکھٹ پر سجدہ کرنے والوں کو۔ وہ خوب پہچانتی ہے۔ ان اوتاد کو۔ مار آستین کو۔ مکاروں کو۔ عیاروں کو۔ غداروں کو۔ یہی روح اللہ تک کو تیس روپے پر بیچ دینے والوں کو۔ چودھویں صدی کے جعفران بنگالہ اور صادقان دکن کو۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن — ننگ آدم۔ ننگ دیں۔ ننگ وطن
ناقبول و نا امید و نا مراد — ملتے از کارِ شاں اندر فساد
دینِ او آئینِ او سوداگری است — عنتری اندر لباسِ حیدری است
ظاہراً از غمِ دیں دردمند — باطنش چوں دیر یا زنّار بند
از نفاقش دودکِ قومی دو نیم — ملت او از وجودِ او سقیم
ملتے را ہر کجا غارت گرے است — اصلِ او از سادتے یا جعفرے است

الاماں از روحِ جعفر الاماں
الاماں از جعفراں ایں زماں

اقبال

لیلیٰ اس وقت کہاں ہے؟ جہاں اوس کا تخت ہے! تخت اوس کا کہاں ہے؟ مجنوں کے دل میں! لیلیٰ کون؟ اردو!
مجنوں اس وقت کہاں ہے؟ جہاں اوس کا دل ہے! دل اوس کا کہاں ہے؟ لیلیٰ کی زلفوں میں! مجنوں کون؟ عبدالحق!
لیلیٰ اردو۔ مجنوں عبدالحق۔ مبارک ہو مجنوں اورنگ آباد سے دلّی آگیا۔ کیوں آگیا؟ زلفِ لیلیٰ کا سودا عبدالحق کے سر میں۔ زلفِ لیلیٰ کی زنجیر عبدالحق کے پاؤں میں۔ زنجیر ہو تو ایسی ہو۔ اور سودا ہو تو ایسا ہو۔ عبدالحق کہتا ہے انا لیلیٰ۔ لیلیٰ کہتی ہے انا الحق!

جیشوال شوکینی، گیا۔ بہار

نفیس، پائدار اعلیٰ درجہ کے جوتوں کے لئے صوبہ بہار میں نام پیدا کر چکا ہے۔ ہر سائز اور ہر قسم کے خوبصورت جوتے آپ کو یہیں ملیں گے۔ ایک مرتبہ تشریف لاکر آزمائیے، پھر دوبارہ سفارش کی ضرورت نہ ہوگی۔

بہار کی بہار

(ایک بہار دوست اور بہار دوست غیر بہاری کے قلم سے)

از ادیب شہیر حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر "صدق" لکھنؤ

مارچ ۱۹۰۷ء کا ذکر ہے کہ انگریزی ہائی اسکول کے ایک نویں درجہ کے طالب علم کو اُس کے والد ماجد کے ہمراہ دارالعلوم ندوہ کی شہرت اُس کے جلسۂ دستار بندی میں کھینچ کر لکھنؤ لائی۔ کانوں کو اشتیاق تھا دو تقریروں کے سننے کا اور آنکھوں کو تماشا تھی دو چیزوں کی زیارت کی۔ اللہ نے دونوں شوق پورے کرائے۔ پہلی بار تقریر سننی نصیب ہوگئی مولانا شبلی کی اور زیارت ہوئی اُن کے چہرہ کی۔ دوسرے نمبر پر آرزو تھی ایک ندوی طالب علم کے دیکھنے اور سننے کی۔ جس کے مضامین استاد کے رنگ میں ڈوبے ہوتے۔ انہیں کے سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ الندوہ میں چھپتے رہتے تھے۔ جلسہ گاہ (رفاہ عام) میں پہنچ کر دیکھنے میں آیا کہ ایک جوان عمر خوش لباس طالب علم ہے، چہرہ پر خوشنما چھوٹی سی داڑھی، عینک، سر پر ٹوپی وضع کی مندیل، بشرہ سے ذہانت ٹپکتی ہوئی۔ سب کی نظروں کا مرکز و مرجع۔ ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔ دستار بندی ہوئی ـــــ صاحب کی لائی ہوئی اور پھیلائی ہوئی اصطلاحوں میں یوں کہئے کہ کانووکیشن ایڈریس پڑھا گیا اور ڈگریاں تقسیم ہوئیں ـــــ اور اس ندوی نوجوان کی مفصل تقریر اردو میں ہوئی اور برجستہ تقریر عربی میں بھی۔ آنے والے اسکولی طالب علم کی دونوں تمنائیں۔ لڑکپن کی پرخلوص مسرتوں کا نشہ اب کوئی کہاں سے لائے؟ ـــــ جی بھر کر پوری ہوئیں۔ ۱۹۰۷ء کا اسکولی طالب علم وہی تھا جو آج ان سطور کا راقم ہے اور فاضل ندوی نوجوان وہ تھا، جو بحمداللہ اردو میں سیرت نبوی کے ضخیم دفتر تیار کر چکا ہے، اور جسے دنیا اب "مولانا" اور "علامہ" کے القاب کے اضافے کے ساتھ "سید سلیمان ندوی" کہہ کر پکارتی ہے۔

اودھ کی سرزمین پر بہار کی محبت و خلت کا تخم پڑا، اور وہ دن ہے اور آج، کہ تخم نے جڑ پکڑی، پودا بنا، برگ و بار پیدا کئے، اور آج ایک درخت بنی نہیں، پورا باغ کا باغ تیار، ۳۲ برس کی مدت کچھ تھوڑی ہوتی! قرن کا قرن گزر گیا۔ خدا جانے کتنی آندھیاں کیسے کیسے طوفان اتنی مدت میں آئے اور کیسے کیسے چھن لٹ کر رہے۔ لیکن بہار کی خوشگوار یاد کی بہار آج بھی قائم۔ بلکہ اُس میں اضافہ و ترقی و بہبود!

میں بیحد شرمیلا اور بہت الندوہ کے مقالہ نگار کی علمی عظمت کا رعب دل پر طاری۔ ملنے کی جرأت اُسوقت نہ ہوئی۔ کئی سال بعد جب لکھنؤ کے کیننگ کالج میں بی۔ اے کے پہلے سال کا طالبعلم تھا۔ غالباً آخر ۱۹۱۰ء تھی اور مولانا شبلی مرحوم کی الکلام پر ملحانہ تنقید کے سلسلہ میں "نام" حاصل کر چکا تھا، جب جا کر تعارف کی نوبت آئی۔ اور نیازمندی کے تعلقات رفتہ رفتہ اتنے بڑھے کہ دوستی کے ڈانڈے عزیزداری سے جا ملے اور اب سید صاحب میں اور اپنے قریب کے عزیزوں میں کوئی فرق ہی نہیں معلوم ہوتا۔

مقامی خصوصیات تمدن، معاشرت ہر صوبہ کے الگ الگ ہوتے ہیں۔ پنجاب، بمبئی، سی۔ پی سب کہیں کا رنگ اودھ سے جدا گانہ ہے۔ یہاں تک کہ خود یو۔ پی کے شمالی، مغربی، جنوبی علاقے طرز معاشرت میں اودھ سے بالکل الگ مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن خصوصیت بہاری میں دیکھنے میں آئی کہ وہاں کا رنگ ڈھنگ بالکل اودھ والوں کا سا۔ اجنبیت کم از کم مجھے تو کسی موقع پر محسوس نہیں ہوئی۔ پٹنہ کا تمون، لکھنؤ کے تمدن کا مثنیٰ ہیں بہاری سے ملا، معلوم ہوا اپنے ہی

جوار کے کسی شخص سے مل رہا ہوں۔

سید صاحب ہی کے سلسلہ میں ان کے متعدد عزیزوں، ہموطنوں سے ملاقاتیں ہوتی گئیں۔ سید نجیب اشرف ندوی جواب ایم۔ اے ہیں اور کسی کالج کے پروفیسر مگر میری نظر میں اُنکی وہی لڑکپن کی صورت پھر رہی ہے۔ جب وہ ندوہ میں پڑھ رہے تھے۔ اور اپنے بیٹے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ، نو عمر بچوں میں ایک ہونہار مقرر تھے۔ مولوی ابوظفر صاحب ندوی۔ مولوی سید ہاشم ندوی (دائرۃ المعارف والے) مولوی سید محمد ندوی (شاگرد مولانا عبدالرحمٰن نگرامی مرحوم) اور مولوی سید عبدالحکیم صاحب دسنوی وغیرہم۔ ان میں سے بعض کی ضمنی ملاقاتیں خود مستقل داستان بن گئیں۔

بہار اور اودھ کے تعلقات کی تاریخ اس سے بھی قدیم تر ہے۔ یہ ذکر تو میری اور سید صاحب کی ملاقات کا تھا۔ لیکن سید صاحب ہی کے ایک بزرگ ہمنام، ابھی کل تک زندہ وسلامت، مولانا قاری سید شاہ سلیمان صاحب پھلواروی تھے۔ ۳۰۔ ۳۵ سال اُدھر علیگڈھ کانفرنس کا ہر اجلاس اُن کے دم سے آباد تو ندوہ کا ہر جلسہ اُن کے وجود سے شاد اور محفل میلاد بیان کرتا تو گویا ان کا حصہ تھا۔ انکا ذکر خیر اپنے بالکل بچپن میں اپنے بزرگوں سے بارہا سننے میں آیا تھا، اور اپنے والد ماجد کے ان سے مخلصانہ تعلقات ۱۳۱۲ھ تا ۱۳۱۷ھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ شاہ صاحب کی طالب علمی کا ایک زمانہ لکھنؤ فرنگی محل میں گزرا تھا۔ اور ہمارا خاندان بھی اپنے قرب تعلقات کی بنا پر گویا فرنگی محل ہی کا ایک جزو تھا۔ شاہ صاحب نے بعض کتابیں ہمارے بزرگوں سے پڑھی تھیں اور اسی تعلق سے کبھی کبھی دریا باد میں تشریف لاتے تھے۔ مگر میری یاد سے پہلے۔ اس کا تذکرہ خود موصوف نے اپنی زبان سے فرمایا۔ جب بہت مدت کے بعد غالباً ۱۳۲۱ھ میں مجھے ذاتی طور پر شرف نیاز حاصل ہوا۔ انکی تر رگانہ شفقت اور کمسنی کی عمر بھی چیز تھی ۱۳۲۷ھ میں جب پھلواری تھوڑی دیر کے لئے حاضری کا اتفاق ہوا تو خود شاہ صاحب اور ان کے ایک بھائی صاحب (غالباً مولوی علی حافظ نام تھا) اور صاحبزادے شاہ حسین میاں صاحب نے پردیس کو وطن بنا دیا۔ دوسرے صاحبزادے شاہ جعفر میاں اور نواسہ مولوی شاہ عزالدین سلمہ کی زحمت فرمائیاں عین اپنی روایات خاندان کے مطابق۔

لکھنؤ میں درسگاہ ندوہ ایک بڑا مرکز نوجوان اہل بہار رہا ہے۔ اپنی انگریزی طالب علمی کے زمانہ میں کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ بہار کا آدھا صوبہ کھنچ کر لکھنؤ آگیا ہے اور ندوہ کا دارالاقامہ پٹنہ ہی کا کوئی محلہ ہے۔ خدا جانے کتنوں سے ملاقات اس سلسلہ میں ہوگئی۔ مولوی حاجی معین الدین ندوی اس دور کے اوائل کی۔ مولوی ابوالمحسنات ندوی مرحوم اور مولوی شاہ احمد حبیب ندوی اور اسطالی اور مولوی مسعود عالم ندوی اواخری خوشگوار یادگاریں ہیں۔ مولوی حاجی معین الدین (صاحب خلفائے راشدین) اور مولوی مسعود عالم (ایڈیٹر "الضیاء" عربی) کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ مولوی ابوالمحسنات بیچارہ کی یادگار شاید چند مضامین سے زاید نہ ہوں۔ بڑے ہونہار تھے۔ عین شباب میں وفات پاگئے۔ جلسوں میں نظم بالکل مولانا شبلی کے لہجہ میں پڑھتے تھے۔ مولوی احمداللہ ندوی، مولوی عبدالقدوس ہاشمی ندوی (راقم یہ سب حیدرآباد میں ہیں) سے بھی تعارف اسی زمانہ میں ہوا۔ مولوی سید ریاست علی ندوی آج ماشاءاللہ دوسروں کے "ندیم" رہبر ہیں۔ ان کا وہ زمانہ یاد ہے، غالباً ۱۳۲۷ھ میں جب وہ بالکل سبزہ آغاز تھے اور مولانا عبدالرحمٰن نگرامی مرحوم کے عزیز و مخصوص شاگردوں میں تھے۔ مولوی عبدالغفور صاحب شرر کا نام لیجئے میں بھول ہی چلا تھا — دفتر ندوہ کے بڑے پرانے سرگرم کارکن تھے اور اب تو شاید نائب ناظم ہی ہیں۔

دارالعلوم کے بورڈنگ کے مقابل کیننگ کالج کا ہوسٹل تھا (جواب یونیورسٹی ہوسٹل ہے) اس میں ۱۹۱۰ء میں ایک سال میرا بھی قیام رہا۔ یہاں پٹنہ کا ایک نوجوان سید باقر حسن مرحوم پہلے سے بورڈ تھے۔ بہار کے مشہور بیرسٹر سر سلطان احمد کے چھوٹے بھائی بڑے وجیہ و خوشرو بڑے ہونہار و خوش خو۔ علیگڈھ سے آئے تھے۔ انگریزی تحریر و تقریر دونوں میں برق مسلمانوں کے ہر کام میں آگے آگے۔ مجھ سے ایک سال سینیر تھے۔ بی۔ اے کے پہلے سال میں تھا، وہ آخری سال میں۔ بیچارہ کالج چھوڑتے ہی بیمار پڑے اور کچھ ہی روز بعد دق میں انتقال کر گئے۔ سر علی امام کے بھائی حسن امام اور والد ماجد نواب امداد امام محسن۔ نواب نصیر حسین خیال اور سوگفت کے مشہور بیرسٹر مظہر الحق کو راجہ صاحب محمود آباد کے ہاں اور قومی جلسوں میں قریب سے دیکھنے کا اتفاق بارہا ہوا۔ لیکن ذاتی تعارف کی نوبت نہ آئی۔ پٹنہ ہی کے رہنے والے ایک ڈاکٹر ڈاکٹر محمد واحد بیڈ بڑے یونیورسٹی کے ایم۔ ڈی۔ لکھنؤ میں پریکٹس کرتے تھے۔ حکیم مہدی کے مقبرہ کے متصل۔ ۱۹۱۰ء تھا کہ اپنی مرض آنکھوں کا علاج

کرانے گیا۔ بڑی توجہ و شفقت سے دیکھا۔ میں طالبعلم بھلا فیس کیا پیش کر سکتا تھا۔ اور اسی بنا پر شہر کے ایک بہت نامور مسلم ڈاکٹر صاحب سے نیاز بھی کر چکے تھے۔ انکی توجہ بہت غنیمت معلوم ہوئی۔ ملاقاتوں کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ اکثر ان کے ہاں جاتا رہتا۔ کام تو یوں ہی سا چلتا۔ لیکن ان کی قابلیت بہت بڑھی ہوئی تھی۔ گزشتہ جنگ یورپ کے زمانہ میں کہیں سول سرجن ہو کر چلے گئے۔ اس کے بعد صرف ایک بار سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ جہاں کہیں ہوں اللہ خوش رکھے۔

خلافت و ترک موالات کی تحریک نے دور دور کے مسلمانوں کو یکجا کر دیا تھا۔ بہار اور اڑیسہ کا تو پڑوس ہی تھا۔ میں تحریک میں اٹھوتنت شریک ہوا' جب تحریک خود فنا ہو رہی تھی' تاہم محمد علی کی ذات بجائے خود ایک مرکز و مرجع تھی۔ میں تو عاشقوں میں تھا۔ باقی اور بھی خدا معلوم کتنے اس شمع کے پروانے تھے۔ دہلی بار بار میری آمد و رفت تھی۔ اور دفتر ہمدرد و کامریڈ میں سب کہیں کے مسلمان اکٹھے ہوتے رہتے تھے۔ مولوی محمد شفیع داؤدی مولوی عبدالغنی ممبر صوبہ کونسل' پروفیسر عبدالباری (جواب شاید "باری جی" کہلاتے ہیں) مولوی سید حسن آزاد وغیرہم سے اس سلسلہ میں بارہا ملاقاتیں ہوتی رہیں حضرات بہار کی سادگی اور اخلاصمندی سے دل خاص طور پر متاثر رہا۔ مولوی شفیع داؤدی اور مولوی عبدالغنی کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی' کہ اسمبلی اور کونسل کے ممبر ہو کر نماز کے پابند ہیں' لباس سادہ رکھتے ہیں' بازار میں پیدل چلتے پھرتے۔ اور اپنے ہاتھ سے سودا سلف لے آتے ہیں۔ بھلا ہمارے ہاں کے ارکان کونسل مسجد کی حاضری اور موٹر چھوڑ کر پیدل چلنا گیا جانیں؟ مولانا سجاد صاحب نائب امیر شریعت کو پہلی بار مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم کے مکان پر دیکھا' پھر خلافت وغیرہ کے جلسوں میں متعدد بار لکھنؤ میں ملاقات رہی۔ دل ان کے علم و تدقیق دونوں کا قائل رہا۔ اور آگے چل کر مولوی شفیع صاحب داؤدی اور ان کے درمیان جو شدید جنگ برپا ہو گئی اس سے برابر رنج ہی ہوا کیا دنیا میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ محمد کے دونوں فریق اپنی اپنی جگہ بے قصور ہی تھے۔

ایک مرکز اہل بہار کا علیگڈھ بھی ہے۔ یونیورسٹی کورٹ کی ممبری کے سلسلہ میں وہاں سالہا سال سے آمد و رفت قائم ہے۔ مولانا سلیمان اشرف مرحوم اب بہاری ہو گئے تھے۔ لیکن انکا خاندان تھا ہمارے اودھ ہی کے قصبہ کچھوچھہ کا۔ انکی زبردست شخصیت بعض نادر خصوصیات کی مالک تھی۔ اور پروفیسر ابوبکر محمد حلیم صاحب ایم۔ اے جو اب عرصہ سے پروویس چانسلر ہیں۔ اسم بامسمّیٰ۔ پیکر علم و خوش خلقی ہیں۔ مرزا اختر حسین صاحب رجسٹرار پٹنہ یونیورسٹی' مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر ہیں۔ ان سے بارہا نیاز حاصل ہوتا رہا۔

پٹنہ بھی ایک ذریعہ اہل بہار کی توجہات منعطف کرنے کا تھا۔ ملکڈ کن کے بعد پٹنہ کی شاید سب سے قدر افزائی علاقہ بہار ہی نے کی۔ چھپرہ کے وکیل محمد اسمٰعیل صاحب' نرہٹ ضلع گیا کے قاضی احمد حسین صاحب' راچی کے ہیڈ ماسٹر الطاف کریم صاحب' اور مولوی منظر علی ندوی مرحوم اس سلسلہ سے مہربان ہوئے۔ مولوی منظر مرحوم تو خدا کے گھر سدھارے۔ باقی حضرات کی خیریت ادھر ایک عرصے دریافت نہیں ہوئی۔ الطاف کریم صاحب دریا باد کو بھی سرفراز کر چکے ہیں۔

سال اب خوب خیال میں تو نہیں۔ سنہ ۳۰ء یا سنہ ۳۱ء ہوگا۔ ایک بار حیدرآباد جانا ہوا۔ مولانا ثروانی صدر الصدور امور مذہبی کے دولتکدہ پر کوئی علمی مجلس تھی۔ نظر ایک نئے چہرہ پر پڑی اور جی چاہا کہ اب پڑی ہے تو نہ ہٹے۔ اور اب اسی چہرہ کو دیکھتے چلے جائیں۔ بتانے والے نے بتایا کہ یہ مولانا مناظر احسن گیلانی ہیں۔ اللہ اللہ کیا دھوکا ہوا نام سے عرصے واقف تھا لیکن صورت' سیرت' ہر چیز نے شوق انداز کس قدر غلط نکلا۔ خیال تھا کہ مسن ہونگے یہ نوجوان ہیں۔ قیاس تھا کہ بڑے بجاٹ ہونگے اور نرے مناظر اور خشکی و کرختگی تو مناظرہ بازی کے لوازم میں ہے۔ مشاہدہ نے بتایا کہ ایک لطیف روح لطیف تر جسم میں ہے! خندہ رو' نرم خو۔ نہ کہیں سے کرختگی نہ ثقالت۔ برعکس اس کے ایک مجسمہ لطافت! چہرہ معصومیت کی تصویر' بشرہ پر لطافت قلب کی تنویر! صورت پر نورانیت برستی ہوئی۔ گفتگو سے محبوبیت ٹپکتی ہوئی۔ علم کی جگہ علم' عشق کی جگہ عشق۔ تعارف ہوا' اور ملاقات کے چانس بڑھے۔ اس اٹھارہ انیس سال کی مدت میں کیا کچھ دیکھا گیا کچھ پایا' کیا کچھ سیکھا' ان سوالات کو بس سوال ہی بنا رہنے دیجئے۔ حیدرآباد کی بھوائیاں' لکھنؤ کی بچائیاں' دریا باد کی سرافرازیاں' اور پھر عرشہ جہاز پر ساتھ۔ مدینہ کے روضۂ جنت میں ساتھ' بیت اللہ کے طواف و زیارت میں ساتھ۔ منیٰ کی نمازوں میں ساتھ' یہ ساری داستان کہیں پھیلنی شروع ہو گئی تو سمیٹنی مشکل ہو جائیگی

مختصر یہ کہ دماغ اگر ایک بہاری کے علم و فضل کے آگے جھک گیا تھا، تو دل دوسرے بہاری کی محبوبیت کی نذر ہو گیا۔ دماغ اگر ایک کی عظمت کا قایل، تو دل دوسرے کی محبت کا گھائل۔ "بہار کی بہار" اب بھی روح پرور نہ ہو تو کیا ہو؟

۱۹۲۹ء میں سفر حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ جہاز پر مولوی نصیر الدین صاحب چیف منصف اورآن کے صاحبزادہ عزیز الدین صاحب کا جو سوسائٹی ایک پرجوش خلاقی تھے، خوب ساتھ رہا۔ اور اس لطف کی تجدید۔ ۸۔۹ سال بعد خاص شہر پٹنہ میں ۱۹۳۷ء میں ہوئی۔ مولوی شاہ لطف اللہ صاحب مونگیری۔ اور ان کے برادران عزیز مولوی نور اللہ و مولوی منت اللہ (جواب ایم۔ ال۔ اے ہیں) خصوصیت پیدا ہو جانے کے لئے اتنا ہی بس تھا کہ یہ حضرات مولانا گیلانی کے عزیز قریب ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ ان حضرات کا لطف و اخلاص بجائے خود بھی یاد رہ جانے والی چیز ہے۔ اور مدینہ منورہ میں ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب کا وجود تو ہر مسافر و زایر کے لئے ایک تائید رحمت ہے۔ اور پھر ہم لوگوں پر تو کرم خاص رہا۔ مسجد نبوی کے باب جبرئیل کے دربان بھی ایک بہاری تھے۔ اور خوب شخص تھے۔ ہم لوگ عموماً اس دروازہ سے جاتے تھے۔ رکنا، ملاقات رہتی تھی۔ نام اس وقت ذہن میں نہیں

جامعہ عثمانیہ کے سنہ تالیف و ترجمہ کے سلسلہ میں ستمبر ۱۹۱۷ء سے ستمبر ۱۹۱۸ء تک، ایک سال مسلسل حیدرآباد میں قیام رہا۔ سرکار عالی کے نائب صدر محاسب مولوی عبدالغنی مرحوم تھے۔ ان کے کرم بے حساب رہے ——— ان کے صاحبزادہ محی الدین صاحب بی اے بیرسٹرایٹ لا محکمہ تعلیمات میں تھے۔ اب شاید اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہیں۔ جوانی ہی میں مذہبی دلدادہ۔ لطف و کرم میں باپ کے قدم بہ قدم۔ انہیں کے ہاں شمس العلماء مولوی محب الحق کی زیارت کئی بار ہوئی۔ اس وقت تو بہت بزرگ صورت معلوم ہوئے۔ بعد کو سننے میں آیا کہ عقاید کچھ اہل قرآن کے سے ہیں۔ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ بہاری سے ایک صاحب مولوی ابو محمد مصلح ایڈیٹر حسن و عشق مراسلت عرصہ سے فرما رہے تھے۔ حیدرآباد کی آمد و رفت کے سلسلہ میں ملاقات ان سے ہوئی۔ تحریک قرآن کے دھن میں لگے ہوئے۔ ایک اور بہاری عبدالرحمن خاں صاحب بھی یاد آگئے۔ اسسٹنٹ پولیس تھے۔ مدتوں مہربان رہے۔

پٹنہ کی حاضری کا اتفاق کل دو بار ہوا۔ پورے اس شہر کی گلی گلی سے آئی۔ نئی کوٹھیوں سے کہنہ عظیم آباد کے کھنڈروں سے بیشتر پہلی بار ۱۹۲۷ء میں جانا ہوا۔ مولانا مناظر صاحب شدید علیل ہو کر پٹنہ کے بڑے اسپتال میں داخل ہوئے۔ تار پا کر عیادت کو دوڑا ہوا گیا۔ مہاراجہ مولوی منظفر علی مرحوم ایڈیٹر "البشیر" نے کی۔ مولانا کے والد ماجد حیات تھے۔ انکی زیارت ہوئی۔ اور مولانا کے برادر عزیز سید کارم حسن سے خوب ملنا ملانا رہا۔ مولوی محمد شفیع صاحب داؤدی، قاضی احمد حسین صاحب ایم۔ ال۔ سی۔ مولوی نور محمد صاحب ایڈیٹر "اتحاد" وغیرہم لطف فرماتے رہے۔ اور مولوی سید محمد ندوی تو ہمہ وقت خدمت کیلئے وقف رہے۔ میزبان جناب موٹر پر سواری لے گئے۔ مزارات کے علاوہ زندہ بزرگوں میں امیر شریعت مولانا محی الدین صاحب کی زیارت نصیب ہوئی۔ نیز مولانا قاری شاہ سلیمان مرحوم و مغفور انکے اہل خاندان اور جناب ثنا کی لطف فرمائیاں ہیں۔ غرض "پھلواری کی سیر سے دل باغ باغ رہا اور اسکی سدا بہار سرسبزی کی دعائیں نکلتی ہیں

دوسرا سفر ۱۹۳۸ء میں ایک اردو کمیٹی کے سلسلہ میں ہوا۔ جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر تھے۔ میرا قیام مولانا سید سلیمان کی رفاقت میں، ریاض حسن خاں صاحب رئیس مظفر پور کی کوٹھی پر رہا۔ موصوف مولانا شبلی مرحوم کے شیدائی اور اسی رشتہ سے میرے بھی بزرگ ہوئے۔ بزرگانہ شفقتیں عین روایات بہار کے مطابق رہیں۔ تمنا صاحب ایکی بھی کرم فرماتے رہے۔ اور انکے علاوہ ضیاء الدین صاحب۔ اور متعدد حضرات کی عنایتوں کا مینھ دن بھر برستا رہا افسوس ہے کہ انکے اسماء گرامی ذہن میں نہیں۔ شام کو ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم کے اعزاز میں علیگڑھ اولڈ بوائز کی طرف سے ایٹ ہوم تھا۔ متعدد نوجوانوں سے ملاقات رہی۔ سب خلوص و محبت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے۔ ایک ڈپٹی مجسٹریٹ اور دو یونیورسٹی کے طلبہ کی صورت کا نقش ذہن میں ہے۔

لیجئے ایک چلتا ہوا سا ہدیۂ بزرگان بہار کی خدمت میں پیش کرنے کیلئے گو انکے مرتبہ کے قابل نہیں۔ تیار ہو گیا۔ موضوع "احباب بہار" خود ایڈیٹر صاحب ندیم کا عنایت کیا ہوا تھا۔ محفل خاص میں اغیار کے بار پانے کے کوئی معنی نہیں۔ بہار نمبر میں ایک غیر بہاری کیلئے جگہ نکالنا محض اس کا دل بڑھانا ہے۔ لیکن یہ نمبر ایسا ہو کہ اس پر نمبر کا اطلاق ذرا مشکل سے ہو گا۔ ایک تو اودھ اور بہار کے تمدن و معاشرت کی یہ حماقت کہ ایک کو دیکھ، بے اختیار دوسرے کی زبان سے نکلے۔

جو تو ہے وہی میں ہوں

اور پھر اس عموم میں ان سطور کا راقم کا اہل بہار کیساتھ تیاز مندانہ خلوص ——— قدم قدم کو جب توڑتے ہیں تو عشق خانساماں کے زیر بھی قند و شکر کی کے حکم میں داخل ہو جاتے ہیں

فاتحِ بہار و بنگالہ

محمد بن بختیار خلجی

از مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی سابق پروفیسر ٹیگور کالج شانتی نکیتان بنگال

تاریخ آل سلجوق کے مصنف کا بیان ہے کہ خلج ترک بن یافث کے گیارہویں لڑکے کا نام تھا[۱] جس سے یہ سلسلہ چلا، ممکن ہو کہ اس سلسلہ میں کوئی شخص خلج نامی ہوا ہو، جس نے ترکستان میں ایک بستی خلج نام سے آباد کی۔ جہاں سے یہ سلسلہ شروع ہوا۔ کیونکہ لغت میں "خلج" ترکستان کے ایک خطہ کا نام ہے[۲]۔ جہاں کے لوگ بڑی اچھی فوجی قابلیت رکھتے تھے، کچھ لوگ وہاں سے غور اور گرم سیر (افغانستان) ممالک میں آکر آباد ہو گئے، جیسا کہ قاضی منہاج نے لکھا ہے، جو قریب تر عہد کا مصنف ہے[۳]۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آبادی غور اور گرم سیر ممالک تک پھیلی ہوئی تھی۔

خلجی خاندان افغانستان میں کب آیا۔ اس کے متعلق کوئی صحیح بات ابھی تک میری نظر سے نہیں گذری۔ البتہ غزنوی عہد سے ہندوستان کی تاریخ میں اس کا ذکر آتا ہے۔ چنانچہ ایلک خاں بادشاہ ماوراء النہر کے مقابلہ میں سلطان محمود نے جو فوج ترتیب دی ہے[۴]۔ وہ اس طرح ہے کہ قلب میں امیر نصیر الدین، میمنہ پر التونتاش، میسرہ پر ارسلان جاذب کے ساتھ افغانی اور خلجی امیروں کو مقرر کیا[۵] پھر آگے چل کر اندپال کی شکست کے متعلق تاریخ میں ہے کہ عبد اللہ طائی اور ارسلان جاذب دو ہزار ترکی، افغانی اور خلجی سپاہیوں کے ساتھ دو دن دو رات بھاگنے والوں کا تعاقب کرتے رہے[۶]

اس سے اس قدر معلوم ہو گیا کہ خلجی سپاہی غزنوی فوج میں بڑی تعداد میں تھے، اور ان کے خاص خاص اشخاص امارت کے درجہ تک پہنچ چکے تھے، پس مصنف طبقات اکبری کا یہ بیان کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ "خلج" کا ماخذ "فالج" ہے، جو چنگیز خان کے خاندان سے تھا[۷] اور غور میں بعد وفات چنگیز خان آبسا تھا۔ جس کی اولاد فلجی اور پھر خلجی کہلائی۔ کیونکہ عہد غزنوی میں چنگیز سے کئی صدی قبل خلجیوں کا ہونا مذکور ہو چکا ہے۔

پس صحیح تر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترکستانی قوم سبکتگین کے عہد میں اس کی شہرت سنکر فوج میں داخل ہوئی۔ اور پھر اسی ملک میں رہ پڑی۔ انہیں میں سے محمد بن بختیار خلجی کا خاندان تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کا خاندان معززین کے طبقہ میں شمار کیا جانے لگا[۸]

نام و نسب محمد نام، اختیار الدین خطاب، باپ کا نام بختیار، خاندان خلج سے تعلق رکھتا، اور یہی پہلا آدمی ہے جس نے ہندوستان کی تاریخ میں خاندان خلج کا نام روشن کیا۔ غزنہ پر جب زوال آیا تو یہ لوگ غوریوں کی فوج میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ شہاب الدین غوری رائے پتھورا کی جنگ میں جب زخمی ہو کر گرنے لگا ہے تو ایک خلجی ہی تھا جو گھوڑے پر بٹھا کے میدان جنگ سے نکال لایا[۹]

---

[۱] تاریخ آل سلجوق مطبوعہ مصر ابتدا۔ [۲] کشف اللغات قلمی ولغات سعیدی کانپور۔ [۳] فرشتہ جلد اول صفحہ ۵ حیدر آباد [۴] کتاب مذکور صفحہ ۹ [۵] طبقات اکبری جلد اول صفحہ ۱۱۹ کلکتہ۔ [۶] کتاب مذکور صفحہ ۲۶ جلد اول کلکتہ۔ [۷] طبقات ناصری صفحہ ۱۹۱ کلکتہ۔

محمد بن بختیار خلجی کے جاں نثار لوگ بھی پہلے ہی سے غزنہ اور ہندوستان آ چکے تھے۔ چنانچہ بختیار خلجی کا چچا محمد بن محمود غزنہ میں رہ کر اور ہندوستان آیا، علی ناگوری کے ماتحت پہلے کمشنر ہوا، پھر اس کے انتقال کر جانے پر قنوج کا گورنر ہو گیا[1]

تقسیم اور ملازمت

محمد بن بختیار کے ابتدائی حالات کسی تاریخ میں میری نظر سے نہیں گذرے، لیکن خاندانی دستور اور رواج کے بموجب اس نے فوجی تقسیم کا حصہ حاصل کی جب کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

جب جوان ہوا تو اپنے خاندان کے قدم بہ قدم چل کر سلطان معز الدین (شہاب الدین غوری) کے عہد میں غزنہ پہنچا اور سرکاری ملازمت کا خواہاں ہوا۔ مگر دیوانی دفتر کے اہل کاروں کی نظر میں کچھ جچا نہیں، اسلئے مایوس ہو کر اس کو ہندوستان کا رخ کرنا پڑا۔ لیکن بدقسمتی سے یہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ چنانچہ تقریباً ۱۱۹۳ء میں جب وہ دہلی آیا اور محکمہ دیوانی میں درخواست دی تو یہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

آخر دہلی سے بدایوں پہنچا اور سپہ سالار ہزبر الدین حسن کی خدمت میں حاضر ہوا، جو اس وقت بدایوں کے صوبہ دار تھے، انہوں نے اس کو اپنے یہاں ملازموں میں شامل کر لیا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس جگہ سے خوش نہ تھا، اور موقع کی تاک میں رہا۔ کیونکہ جیسے ہی اودھ میں اس کو کچھ امید بندھی کہ فوراً وہاں روانہ ہو گیا۔

اودھ میں اس وقت سلطان شہاب الدین کا ایک مشہور امیر ملک حسام الدین اغلبک تھا، جو فتح بنارس کے بعد اودھ کا گورنر مقرر ہوا تھا اور بنارس ہی میں رہتا تھا۔ اور تنخواہ کے معاوضہ میں امیر کو دو آب (گنگا جمنا) کے درمیان کے کئی پرگنے دئے گئے تھے[2]۔ محمد بختیار اس کے پاس حاضر ہو کر ملازم ہو گیا اور جب دو چار موقعوں پر اس نے اپنی بہادری کا نمونہ دکھایا تو امیر نے خوش ہو کر "کنیلہ اور پنیالی" اس کے سپرد کئے، لیکن لطیفات ناصری میں اس کے بجائے "سہلٹ اور سہلی" لکھا ہے، ممکن ہے کہ دونوں ایک ہی ہوں، یہ واقعہ غالباً ۱۱۹۵ء کا ہے۔

محمد بن بختیار فطری بہادر تھا۔ اس کے بدن کی ساخت بھی ایسی تھی کہ لوگ دیکھ کر مرعوب ہو جاتے، ایک عجیب بات اس میں یہ تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ اس قدر لمبے تھے کہ جب چھوڑ دیتا تو زانو سے آگے بڑھ جاتے، اس سے وہ اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ فائدہ اٹھاتا تھا۔

محمد بختیار کو اپنے اس جدید عہدے کے ذریعہ جب فارغ البالی حاصل ہوئی تو اس نے اپنی حالت کو بہت اچھی طرح درست کرنے کی بڑی کوشش کی اور جب قدرے اس کو اطمینان ہو گیا تو تھوڑے سواروں کا دستہ لیکر بہار اور منیر پر اکثر دھاوا کیا کرتا اور مال غنیمت لیکر واپس آیا کرتا۔ اس طرح جب اس کی شہرت دور دور ہوئی تو ہندوستان کے اطراف سے تمام خلجی دوڑ پڑے اور اس کے اردگرد جمع ہو گئے، غور اور غزنہ کے لوگ بھی اس کی فوج میں بھرتی ہونے لگے، اب یہ بڑی شان سے زندگی بسر کرتا، اس نے آس پاس کے تمام سرکشوں کو زیر کیا۔ بہار اور منیر پر بھی حملہ جاری رکھا۔

جب اس کی بہادری الوالعزمی اور سخاوت کا شہرہ سلطان قطب الدین کے کانوں تک پہنچا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے ایک خلعت اور علم شاہی بھیج کر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔ اس سے اس کی ہمت بہت بڑھ گئی اور اب اس نے بہار اور منیر کو مستقل طور پر فتح کرنے کا ارادہ کیا۔

بہار

بہار دراصل وہار (ویہار) ہے، یہ سنسکرت لفظ ہے جس کے اصلی معنی "کھیل کود" کے ہیں۔ پھر اس جگہ کو کہنے لگے جہاں سادھو عبادت الٰہی میں مصروف ہو کر خوشی و خرمی رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اس کے معنی میں وسعت ہوتی گئی، اور مٹھ (خانقاہ) کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔ اور آخر میں دار العلوم (یونیورسٹی) کے معنی ہو گئے[3]

اس سے اس قدر واضح ہو گیا کہ بہار (وہار) کبھی ملک یا شہر کا نام نہ تھا، بلکہ ہر اس مقام پر جہاں ایسے کام ہوتے ہیں اس کو بہار (وہار) کہتے، اب یہ دیکھنا ہے کہ اس عہد میں بہار کس مقام کو کہتے تھے؟

چھٹی صدی ہجری (بارہویں صدی عیسوی) میں مگدھ کی سلطنت بڑی مضبوط تھی۔ مگدھ ویشیں کے وسط میں اس کا پایہ تخت "کوساگر پورہ" نامی تھا۔ چونکہ اس عہد میں ایک مخصوص طرز کا گھاس "کوسا" بکثرت ہوتی تھی اسلئے اس کا نام کوساگر پورہ ہو گیا، اس کے چاروں طرف پہاڑ تھے، صرف مغرب کی جانب ایک راستہ پہاڑ کاٹ کر شہر کے اندر جانے کے لئے بنایا گیا تھا[4]

---

[1] تاج المآثر صفحہ ۲۶۱ کلکتہ۔ [2] فرشتہ جلد چہارم صفحہ ۶۵ حیدر آباد [3] سنسکرت انگلش ڈکشنری مصنفہ سر ایم۔ مونیر ولیمس۔ [4] سفر نامہ ہیونگ شیانگ صفحہ ۷۰ لاہور

راج گڑھ یا راجگیر

مگدھ کے راجوں میں ایک طاقتور حکمراں بم بسار (بعضوں نے بم بسیر لکھا ہے) تھا۔ اس کی راج دھانی یہی کوسا گر پورہ تھی، اس کے عہد میں اس کی آبادی بڑھ گئی تھی، اس لیے شہر میں بار بار آگ لگ جاتی۔ آخر راجہ نے حکم دیا کہ آیندہ جس گھر میں آگ لگے اس کو جنگل میں آباد کیا جائے۔ اس حکم کے جاری ہونے کے تھوڑے عرصہ بعد خود راجہ کے محل میں آگ لگ گئی، اس نے شاہی حکم ہو برقرار رکھنے کے خیال سے شہر چھوڑ کر جنگل میں خود قیام کیا۔

جب یہ خبر ڈیسائی کے راجہ کو ہوئی تو اس نے خاموشی کے ساتھ اس کو گرفتار کر لینا چاہا۔ اتفاقاً اس کی خبر یہاں کے سپاہیوں کو ہو گئی۔ جنھوں نے راجہ کو اطلاع دی۔ راجہ نے اس جنگل کے گرد ایک زبردست فوجی پہرہ بٹھا دیا، پھر آہستہ آہستہ اس کی آبادی بڑھتی گئی اور اس کا نام "راج گرھ" پڑ گیا، جس کو آجکل راجگیر کہتے ہیں۔

جب راجہ مر گیا تو اس کے لڑکے "اجات شترو" نے راج گرہی کو راجدھانی بنایا۔ اس کے بعد راج اشوک نے پٹالی پتر (پاٹلی پتر) میں راجدھانی تبدیل کر دی[1] جس کو آج کل پٹنہ کہتے ہیں۔ اس سے پہلے یہاں کسم پورہ نام شہر تھا۔ اسی کے کھنڈر پر پاٹلی پتر آباد ہوا[2]

پایہ تخت تبدیل کرنے کے بعد اشوک نے راج گرھ میں برہمنوں کو آباد کرایا۔ ساتویں صدی عیسوی کی ابتدا میں جب ہوشنگ شیاانگ چینی سیاح آیا ہے تو اس میں ایک ہزار برہمن خاندان آباد تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ "اگرچہ اس کی شہر پناہ اس وقت برباد کر دی گئی ہے لیکن شہر کے اندر اب بھی عالیشان عمارتیں ہیں"[3]

نالندہ

راجگیر سے کچھ فاصلہ پر اتر طرف ایک "امرباغ" تھا، جہاں ایک تالاب میں ناگ رہتا، اسی کا نام "نالندہ" تھا[4]۔ غالباً اس جگہ ناگ قوم کی بستی ہوگی! اس قوم کے سردار کا مکان اور باغ ہوگا۔ کیونکہ میرے محدود علم کے مطابق لفظ نالندہ کوئی غیر ملکی (اردو و فارسی عربی، ترکی، انگریزی وغیرہ) لفظ نہیں ہے، اور کہا جاتا ہے کہ سنسکرت بھی نہیں ہے، اس سے گمان ہوتا ہے کہ غالباً ناگ ہی قوم کی زبان کا یہ لفظ ہے۔ (وفوق ذی کل علم علیم)

پھر اس لفظ نے آہستہ آہستہ وسعت اختیار کی، یعنی ذاتی نام سے تالاب کا نام ہوا، پھر تالاب سے مکان کا، اور مکان سے گاؤں کا نام پڑ گیا (جس طرح سومنات کا لفظ کہ لنگ سے مندر اور مندر سے شہر کا نام ہو گیا) چونکہ بودھوں کی خانقاہیں بھی وہیں بنتی تھیں اسلیئے ان خانقاہوں کو بھی نالندہ کہنے لگے، اور ان خانقاہوں (مٹھ) میں تعلیمی سلسلہ چونکہ اعلیٰ پیمانہ پر تھا اسلیئے نالندہ کے لفظ میں اعلیٰ تعلیم کا خیال مفہوم ہونے لگا، جیسے آج علی گڑھ اور دیوبند میں سمجھا جاتا ہے۔ چینی سیاح کے بیان کے مطابق سنہ ۴ تمام میں اس کی بنیاد رکھی گئی اور آہستہ آہستہ اس عرصہ میں ترقی کر کے ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہو گئی۔

مذکورہ بالا حالات کے بعد چینی سیاح کا مندرجہ ذیل بیان بھی پیش نظر رکھیں جو مگدھ پہونچکر جنوب کی طرف سفر کر رہا تھا، تاکہ بہار کی صحیح پوزیشن آپ کو معلوم ہو جائے۔

"اس کے بعد ایک مسافت طے کر کے مگدھ دیس میں پہنچا جہاں لوگ ذی علم، نیک اور راستباز ہوتے ہیں۔ پھر وہاں سے پٹالی پتر (پٹنہ) آیا۔ اس وقت یہ شہر ویران ہے۔ شہر کے چار دیواریاں، کھنڈر، اور مندر باقی رہ گئے ہیں۔ اس کے جنوب میں ایک خانقاہ ہے جسے اشوک نے بنایا تھا۔ اس خانقاہ کے جنوب میں ایک ستون ہے جس پر اشوک نے جشن خیراتی کا حال لکھا ہے۔ اس کے جنوب مشرق میں رام دیپ ہے، اس میں ایک ہزار پوجاری رہتے تھے، اس سے آگے "تاوک" کی خانقاہ ہے جہاں مذہبی کتب خانہ اور پجاری تھے، اس سے آگے نالندہ کا مندر ہے۔" (اس کا یہاں پر تپاک خیر مقدم کیا گیا اور مخزن شریعت سلابھدر نے اس سے ملاقات کی۔

نالندہ کے امرباغ میں عرصہ تک بدھ رہا۔ اس کے زوال پانے پر وہاں کے راجہ "سکرادت" نے ایک خانقاہ بنوادی۔ اس کے بعد اس کے

---

[1] سفر نامہ ہونگ شیانگ صفحہ ۴۷ لاہور۔ [2] سفر نامہ مذکور صفحہ ۵۳
[3] سفر نامہ ہونگ شیانگ صفحہ ۵۳ لاہور

جانشین لڑکے "بدھ گپت" نے روایات ماسبق کو برقرار رکھ کر جنوب کی طرف ایک اور خانقاہ کا اضافہ کیا، پھر اس کے جانشین "تھاگاتا" نے مشرق کی جانب دوسری خانقاہ تعمیر کی۔ اس کے بعد راجہ "بالادت" نے رہبانیت اختیار کرلی اور اپنا محل خانقاہ میں شامل کردیا۔ اس کے لڑکے "وجر راجہ" نے شمال میں ایک خانقاہ کی بنیاد رکھی۔ یہ ساری خانقاہیں ایک چار دیواری (فصیل) سے محصور ہیں۔

خانقاہوں کے درمیان میں ایک بڑا مدرسہ ہے، جس کے گرد آٹھ بڑے کمرے ہیں۔ خانقاہوں میں بلند مینارے ہیں، اور متعدد تالاب جن میں کنول کے پھول ہیں۔

خانقاہ کے متعلق جو مکانات ہیں ان میں پجاری رہتے ہیں، دس ہزار کے قریب پوجاری (طلبہ) دینیات کی تعلیم حاصل کرنے میں مشغول ہیں۔ یہاں ایک سو استاد (پروفیسر) ہیں اور چانسلر سالی بھدر ہے۔ اس کے اخراجات کے لئے ایک سو گاؤں وقف ہیں، اور دو سو خاندان سے روزانہ طلبہ کے لئے چاول اور دودھ وغیرہ آتا ہے۔

غرض اسی طرح سے چینی سیاح نے نالندہ کے شمال اور جنوب اور اس کے اطراف میں بے شمار خانقاہوں، میناروں اور باغوں کا پتہ بتایا ہے، یقین ہے کہ اس یونیورسٹی سے متصل پبلک آبادی بھی ہوگی جہاں تاجر (بنئے) اور کچھ شہر غیر مستقل طور پر قیام کرتے ہوں گے۔

گردش ایام سے بارھ سلطنت کے اختتام پر اس کا زوال شروع ہوا۔ اور آہستہ آہستہ ویران ہوتا گیا، یہاں تک کہ محمد بن بختیار کی آمد کے وقت بہار کی آبادی تو ترقی پاگئی تھی اور نالندہ کا دارالعلوم چار دیواری میں محدود ہوکر رہ گیا تھا۔ نالندہ کی چار دیواری سے جو آبادی باہر تھی وہ آج بہار (قصبہ) کے نام سے موسوم ہے، جو آہستہ آہستہ جنوب جانب ترقی کرکے بڑا شہر بن گیا تھا۔ دراصل محمد خلجی کا حملہ اسی پر ہوا تھا۔

فتح بہار

محمد خلجی تقریباً آٹھ برس تک اس عہدہ پر اودھ میں رہا، اس درمیان میں اس نے کافی طور پر فوجی تیاری کرلی، اور جب اس کو اطمینان ہوگیا کہ اس فوج سے باقاعدہ جنگ کی جاسکتی ہے تو ایک فوج لیکر بہار کی طرف بڑھا۔ ۵۹۹ھ میں وہ نالندہ (بہار) پہنچ گیا، چونکہ وہ کئی سال تک بہار اور منیر پر غارت گری کررہا تھا اسلئے اس کی آمد کی خبر سنتے ہی بہار کی عام آبادی خوفزدہ ہوکر نالندہ میں پناہ گزین ہوئی، ٹھیک اسی طرح جیسے محمد فاتح کے قسطنطنیہ فتح کرتے وقت تمام عیسائی آبادی سینٹ آیا صوفیا میں جمع ہوگئی تھی۔ نالندہ چاروں طرف مضبوط فصیل سے گھرا ہوا تھا، اس وقت اس میں عوام، سپاہی۔ پروفیسر اور طلبہ سب ہی بھرے تھے، محمد خلجی صرف دو سو سپاہی (سوار) لیکر یلغار کرتا ہوا بہار آیا اور انہیں سواروں سے نالندہ کی فصیل پر حملہ کردیا۔

اس جنگ سے بیالیس برس بعد (۶۴۱ھ میں) قاضی منہاج کی ملاقات دو فرغانی بھائیوں سے ایک صمصام الدین نامی کے ساتھ لکھنوتی (بنگال) میں ہوئی جو اس جنگ میں شریک تھا۔ اس کا بیان ہے کہ "محمد بختیار اپنی قوت اور بہادری کے سبب اس قلعہ کے دروازہ کے سامنے کود پڑا، اور بزور قلعہ فتح کرڈالا، لوٹ کا مال بہت حاصل کیا۔"

پھر لکھتا ہے:- "اس مقام میں زیادہ تر باشندے برہمن (بودھ بھکشو) تھے، جن کے سر منڈے ہوئے تھے سارے یہ سب مارے گئے۔ یہاں

کتب خانہ

ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، جب ان کتابوں پر مسلمانوں کی نظر پڑی تو بہت سے لوگوں کو بلاکر ان سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی کہ یہ کس قسم کی کتابیں ہیں۔ لیکن (افسوس) کہ کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ کیونکہ تمام اہل علم مارے جاچکے تھے (اور عوام پالی یا سنسکرت سے جن میں یہ کتابیں تھیں ناواقف تھے) بعد کو معلوم ہوا کہ اس فصیل کے اندر یعنی نالندہ اور شہر (باہر کی آبادی) کل کا تعلق مدرسہ سے تھا، اور بہار (وہار) ہندی زبان میں مدرسہ کو کہتے ہیں۔ [1]

چونکہ یہ کتابیں مسلمانوں کے کام کی نہ تھیں، اسلئے اغلب یہ ہے کہ وہیں چھوڑ دی گئیں۔ اور بعد کو برہمنوں اور بودھوں نے وہاں سے منتقل کرلیا ہو

فتح بہار کی مسرت میں دہلی میں عام دربار، اور بختیار کی سرافرازی

۵۹۹ھ میں قطب الدین کالنجر، کالپی، فتح کرکے بدایوں میں مقیم تھا۔ خلجی نے اس موقعہ کو غنیمت جانا۔ اور فتح بہار کے بعد مال غنیمت کے ساتھ وہ قطب الدین سے ملنے کے لئے بہار سے روانہ ہوا۔ قطب الدین بدایوں سے دہلی جانے کی تیاری کررہی رہا تھا کہ محمد خلجی اس کے دربار میں حاضر ہوا۔ بیش قیمت تحفے، ہر قسم کے جواہرات نذر کئے۔ اور پھر سلطان قطب الدین کے ساتھ وہ دہلی چلا گیا۔ [2]

---

[1] طبقات ناصری صفحہ ۱۴۲ کلکتہ۔ [2] فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۳۳ حیدرآباد۔

دہلی پہنچکر قطب الدین نے ایک دربار کیا اس میں محمد خلجی کی فتوحات کی داد دل کھول کر دی، خلعت اور انعامات سے سرفراز فرما کر تمام ہمعصروں میں سربلند کیا۔

حاسدوں کی کینہ پروری

درباریوں میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی، اُنہوں نے اس سے حقارت آمیز برتاؤ شروع کر دیا، جس نے اس نے نہایت فراخدلی سے برداشت کیا، لیکن اس سے ان کی تسکین نہ ہوئی۔ اور اس کی جان لینے کے درپے ہوئے۔ مگر بظاہر کوئی ایسا حیلہ نظر نہ آیا جس سے اُن کی امید پوری ہو، اس لئے ایک ایسی تدبیر سوچی کہ ذاتی نقصان کے بغیر اس کی موت یقینی ہو۔ روضۃ الصفا میں ہے کہ

حاسدوں نے سلطان قطب الدین سے کہا کہ محمد خلجی فیل مست سے مقابلہ کا مدعی ہے، سلطان نے ہلاکت کے خوف سے پہلے تو انکار کر دیا لیکن لوگوں کے اصرار کرنے پر آخر راضی ہو گیا۔

سفید فیل مست سے مقابلہ

چنانچہ ایک دن قطب الدین دہلی میں دربار آراستہ کر کے بیٹھا، خاص و عام بار یاب ہوئے۔ کہ ایک سفید فیل مست لوگ لائے اور عرض کیا کہ تمام ہندوستان میں اس کو کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ سلطان نے محمد بختیار سے کہا کہ اگر مقابلہ کی ہمت ہو تو اس کے سامنے جاؤ؛ اس سے قبل محمد بختیار خلجی کو اس سازش کی مطلق اطلاع نہ تھی، اسلئے سلطان کا ارشاد بِرغبتِ شجاعت سے انکار نہ کر سکا، اگرچہ دل میں سمجھا کہ دشمنوں نے اس کی ہلاکت کا سامان مہیا کیا ہے۔ اس نے ایک گرز ہاتھ میں لیا، اور ہاتھی کے مقابلہ کو آ کھڑا ہوا۔ خلجی نے ہاتھی کے دونوں دانتوں کے درمیان سونڈ پر اس زور سے گرز مارا کہ دانت کی جڑوں پر سخت ضرب آئی۔ اس نے دوبارہ مارنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ہاتھی گھبرا کر بھاگا؛ اور سارا دربار انگشت بدنداں رہ گیا۔

سلطان بہت خوش ہوا، اس نے خود بھی بہت انعام و اکرام سے سرفراز فرمایا اور امرا کو بھی بخشش کا حکم صادر کیا۔ جس کی تعمیل تمام امرا نے کی[1] قاضی منہاج کا بیان ہے کہ سب نے مل کر اس قدر مال و دولت عطا کی کہ تحریر سے باہر ہے، لیکن جس طرح ظاہر جسم سے وہ بہادر تھا، اسی طرح دل کا بڑا، اور ہمت کا بلند، چنانچہ جس قدر انعام و اکرام اس کو ملا، کُل کا کُل لوگوں کو بخش دئے۔ اور صرف سلطان کا خاص خلعت لیکر دربار سے خالی ہاتھ نکل آیا۔[2]

فتح بنگال

محمد بن بختیار سے سلطان قطب الدین اس قدر خوش ہوا کہ فتح بنگال کا اس کو حکم دیا، اور فتح کے بعد وہاں کی حکومت بھی اسی کے سپرد کی گئی، چنانچہ دربار دہلی سے رخصت ہو کر وہ بہار پہنچا اور خوجی انتظام میں مشغول ہو گیا۔ اس درمیان میں اس کی بہادری کی شہرت دور دور پہنچی۔ بنگالہ، کامروپ (آسام) کے حکمران اس کی بہادری اور پیش قدمی کا حال سُن سُن کر لرز رہے تھے، اس وقت بنگال کا پایہ تخت نودیہ (ندیا) تھا اور راجہ کا نام "لکھنیہ" اس کی عمر اسی سال کی تھی۔ اور یوم ولادت سے تاج شاہی اس کے سر پر تھا۔

اس کے متعلق ایک دلچسپ کہانی قاضی منہاج نے لکھنوتی (بنگال) میں معتبر بزرگوں سے سُنی ہے، کہتے ہیں کہ راجہ کا باپ مرگیا اور یہ بحکم مادر میں تھا، لوگوں نے ماں کے شکم پر تاج رکھ دیا۔ اور تا ولادت اس کی ماں حکمران رہی، جب ولادت کا وقت قریب آیا اور برہمن منجم سے شگون نیک کا وقت دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ اس وقت اگر ولادت ہوئی تو بڑا منحوس لڑکا ہوگا، لیکن دو گھڑی بعد کی ولادت البتہ باسعادت ہوگی۔ اور اسّی برس حکومت کریگا۔ مادرِ مہربان نے یہ سُنکر حکم دیا کہ مجھے سرنگوں کر کے دونوں پاؤں اوپر باندھ دیئے جائیں۔ حکم کی تعمیل کی گئی اور منجم ساعت نیک کے منتظر رہے، اُن کے خیال کے موجب جیسے ہی نیک ساعت آئی کہ دونوں پاؤں کھول کر نیچے کر دیئے گئے۔ اسی ساعت لکھمنیہ (اصل لفظ لکشمنیا) پیدا ہوا، لیکن اسی نیک ساعت میں اس کی مادر مہربان ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو گئی۔

قاضی منہاج لکھتے ہیں کہ میں نے معتبر لوگوں سے سُنا کہ اس نے اسّی برس حکومت کی، اور عمر بھر کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا۔ اور جب کبھی

---

[1] روضۃ الصفا قلمی کتبخانہ ہادیالہ احمد آباد۔ [2] طبقات ناصری صفحہ ۱۴۸ کلکتہ۔

کسی نے دست سوال دراز کیا تو ایک لاکھ سے کم نہیں دیتا تھا، واضح ہے کہ بنگالہ میں جیتل (پیسہ) کے بجائے کوڑی کا رواج تھا۔ [1]

غرض جب محمد بختیار کی شجاعت اور پیش قدمی کا حال راجہ کے درباریوں اور امرا کو معلوم ہوا تو یہ لوگ خوفزدہ ہو گئے، اور راجہ کو لیکر کسی اور جگہ چل جانے کی یہ تدبیر نکالی کہ منجموں اور برہمنوں کو دربار میں پیش کیا، اور انہوں نے عرض کیا کہ ہمارے یہاں کتابوں میں ایسی پیشین گوئی لکھی ہے کہ یہ سلطنت ترکوں کے پاس چلی جائے گی، چنانچہ بہار تک فتح کر چکے ہیں اور اگلے سال بنگالہ پر حملہ ہوگا۔ اسلئے بہتر یہ ہوگا کہ راجہ تمام ارکین دولت کے ساتھ کسی دوسری جگہ چلا جائے۔

راجہ نے دریافت کیا کہ جو شخص ہمارے ملک پر قابض ہوگا اس کی کوئی علامت ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! اُس کے دونوں ہاتھ اس قدر لمبے ہوں گے کہ زانو سے نیچے تک پہنچ جائیں گے، راجہ نے کہا کہ بہتر ہے کہ معتبر جاسوس بھیجکر پہلے تحقیقات کرائیں۔ چنانچہ ان معتمد جاسوسوں نے واپسی کے بعد جب حقیقت حال سے آگاہ کیا تو اکثر برہمنوں نے ترک وطن کرکے جاجن ناتھ کی راہ لی، اور دیگر امرا مشرقی بنگال اور آسام کی طرف چلے گئے۔

محمد بن بختیار نے دہلی سے واپس آکر پہلے فتح بہار کی تکمیل کی اور پھر باقاعدہ فوج کا انتظام کرکے بنگالہ فتح کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ چنانچہ سنہ ۶۰۰ھ میں پوری تیاری کے ساتھ بنگالہ کی طرف بڑھا، وہ خوب جانتا تھا کہ حریف کو اگر غفلت میں لگ گئی تو راجپوتوں کا سخت مقابلہ کرنا پڑیگا۔ اسلئے خاموشی اور بڑی تیزی سے روانہ ہوکر پایہ تخت نودیہ پہنچ گیا۔

شہر کے دروازہ پر جب آیا تو اس کے ساتھ صرف اٹھارہ سوار تھے، اس نے اس قدر خاموشی اور اطمینان قلب کے ساتھ راستہ طے کیا تھا کہ کسی کو وہم و گمان بھی نہ ہوا کہ یہ کوئی فوجی جماعت ہے اور فاتح بہار محمد خلجی اس میں موجود ہے، بلکہ لوگوں کو خیال ہوا کہ شاید یہ لوگ گھوڑے کے تاجر ہیں اور اسی لئے جب یہ لوگ شہر کے دروازہ پر پہنچے تو دربانوں نے کوئی روک ٹوک نہ کی، اور خلجی نے بھی کسی کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ دی۔ جب قصر شاہی کے پھاٹک پر پہنچا تو اچانک اس نے تلوار نکالی اور قتل عام شروع کر دیا، تمام محل اور شہر میں ترکوں کی آمد کا شور مچ گیا۔ اس وقت راجہ لکشمنیا کھانا کھانے میں مصروف تھا، اچانک اس شور و غل سے گھبرا گیا، ترکوں کی آمد اور قصر میں محمد بختیار کی موجودگی کا حال معلوم ہونے سے اس پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ بجز راہ فرار اختیار کرنے کے کوئی چارہ اس کو نظر نہ آیا۔ چنانچہ ننگے سر اور بغیر جوتے کے گھر کے پیچھے کھڑکی سے کود کر بھاگا، پہلے اڑیسہ، پھر جگن ناتھ میں جاکر پناہ لی، اور کچھ عرصہ کے بعد اسی جگہ دنیا سے رخصت ہوگیا۔ لیکن اس کی اولاد قافی منہاج (سنہ ۶۴۰ھ) کے زمانہ تک بنگالہ کے بعض اضلاع میں حکومت کرتی تھی۔ [2]

غرض محمد خلجی قصر شاہی پر قبضہ کرنے میں مصروف ہی تھا کہ عقب سے اس کی فوج بھی آپہنچی، پھر تو چند گھنٹوں ہی میں سارا شہر قابو میں آگیا، تمام خزانہ، محلات کی عورتیں، خدم، حشم، اور جنگی ہاتھی سب اس کے قبضہ میں آگئے۔ اور وہ اسی جگہ مقیم ہوگیا۔ لیکن اس نے اس شہر کو لوٹ کر بالکل تباہ کر دیا اور ایک دوسرے شہر کی بنیاد رکھی جسکو آج لکھنوتی کہتے ہیں، اس نے اسی کو اپنا پایہ تخت بنا کر آس پاس فوجی کاروائی شروع کر دی، چنانچہ تھوڑی مدت میں جاج نگر (اڑیسہ) لوکوٹ اور بارسوئی فتح کرکے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کیا۔ [3]

لیکن فرشتہ لکھتا ہے کہ اس جدید پایہ تخت کا نام "رنگ پورہ" رکھا، اس میں مسجدیں، خانقاہیں اور مدارس بنائے اور اسلامی احکام رائج کئے، مال غنیمت میں سے انتخاب کرکے بہترین مال سلطان قطب الدین کے پاس روانہ کئے

فتح آسام و تبت

تقریباً دو سال اس نے اس ملک کے انتظام میں صرف کئے اور اس ضمن میں اپنے ہمسایہ ملکوں کے حالات سے آگاہی حاصل کرتا رہا، جب فوجی انتظام مکمل ہوگیا تو سنہ ۶۰۲ھ میں دس بارہ ہزار سوار اکٹھا کرکے روانہ ہوا۔ ان اطراف میں تین قسم کے لوگ آباد تھے، ایک کا نام "کوچ" دوسرے کو "میچ" اور تیسرے کو "ہجارد" کہتے تھے، گو ان کے نام الگ الگ تھے، لیکن شکل و صورت اور شباہت سے سب ترکی نسل معلوم ہوتے، ان کی زبان بھی ایک تھی۔ اور ہندوستانی اور تبتی سے الگ۔

میچ خاندان کا رئیس علی نامی محمد بن بختیار کی ہدایت سے مسلمان ہوگیا تھا، اس نے فوج کی راہبری قبول کر لی۔ اور فوج کو ایک ایسے شہر

---

[1] طبقات ناصری صفحہ ۱۴۹ کلکتہ۔ [2] طبقات ناصری صفحہ ۱۵۱ کلکتہ۔ [3] فرشتہ جلد چہارم صفحہ ۶۶۰ حیدرآباد

کے قریب لاکھ اکوٹا جس کا نام "سردھن کوٹ" تھا، اور اس کو برہمن گڈھ بھی کہتے تھے۔[۱]

ایسا بیان کیا جاتا ہے کہ گرشاسپ شاہ ایران چین سے واپسی کے وقت اس راستہ سے گذرا، اور اس شہر کو آباد کرتا ہوا چلا گیا۔ اسی کے ساتھ دریا بھی تھا جس کا نام "بنگ متی" ہے۔ یہی آگے چل کر سمندر میں مل جاتا ہے۔ (غالباً یہ برہم پتر ہوگا) اس کا پاٹ گنگا سے کچھ زیادہ ہے۔

جب فوج اس کے کنارے پہنچی تو اس کو عبور کرنا مشکل نظر آیا۔ اسلئے علی مبچ لشکر کو دس روز تک اوپر ہی اوپر لیتا چلا گیا، پہاڑوں اور درّوں سے نکال کر ایک پل کے سامنے لے آیا جو پتھر کے ۲۹ کمانوں پر بنا ہوا تھا۔ محمد بن بختیار کی پوری فوج اس پل کے ذریعہ پار ہوگئی اور حفاظت کے خیال سے دو امیر ایک خلجی اور دوسرا ترک چھوڑ دئے۔[۲]

راجہ کامروپ (آسام) کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو ایک سفیر بھیجکر اطاعت قبول کی، مگر ساتھ ہی اس نے یہ مشورہ دیا کہ اس نگلاغ زمین کا فتح کرنا ذرا مشکل کام ہے، اسلئے اس سال آپ واپس جائیں اور سال آیندہ پوری تیاری کے ساتھ آئیں۔ میں بھی اس معاملہ میں پوری مدد دیکر تبت کا ملک فتح کرادوں گا، لیکن خلجی نے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا اور آگے روانہ ہوگیا۔[۳]

قاضی منہاج کا بیان ہے کہ ۶۰۰ھ میں ایک شب لکھنوتی میں معتمد الدولہ مقبل کے یہاں جو گھاٹوں کو طے کرتے ہوئے سولہویں دن تبت کے مسطح زمین پر پہنچے، وہ ملک شہروں اور گاؤں سے آباد تھا۔ سب سے پہلے ایک ایسی جگہ پہنچے، جہاں ایک مضبوط قلعہ بنا ہوا تھا۔ مسلمانوں نے آس پاس کو لوٹنا شروع کردیا، مجبوراً قلعہ والے بھی مدافعت کے لئے تیار ہوگئے۔ صبح سے عصر تک دونوں میں سخت خون ریز جنگ ہوئی، جس میں بڑی تعداد مسلمانوں کی شہید اور زخمی ہوئی۔

ایک دلچسپ بات قابل ذکر یہ ہے کہ ان کے تمام اسلحے نرکل کے تھے، مثلاً جوشن جول، اسپ، نیزہ، سپر، خود وغیرہ جو ریشم سے بندھے اور منڈھے ہوئے تھے، وہ اعلیٰ درجہ کے تیر انداز بھی تھے، ان کی کمانیں بڑی لمبی لمبی تھیں جس کے سبب سے فاصلہ تک تیر اندازی کر سکتے تھے،

شام کے وقت جب قیدی افسر کے سامنے پیش ہوئے اور حالات دریافت کئے گئے تو معلوم ہوا کہ یہاں سے پانچ فرسنگ (۱۵ کوس) کے فاصلہ پر ایک بڑا شہر کرم پٹن نامی ہے[۴] جہاں تین لاکھ پچاس ہزار تیر انداز ترک ہیں[۵] جیسے ہی کہ مسلمان اس سرزمین پر وارد ہوئے، ایک قاصد وہاں بھیجدیا گیا، اور کل صبح تک سواروں کی مدد یہاں آجائے گی۔ چونکہ اول ہی روز مسلمان بکثرت شہید اور زخمی ہوئے۔ اور اب کمکی فوج کا حال بھی معلوم ہوا، اور ادھر مسلمانوں کو پیچھے سے کسی امداد کی بھی توقع نہ تھی اسلئے سالار فوج نے اپنے امرا سے مشورہ کیا، سب کی متفقہ رائے یہ ہوئی کہ اس وقت واپس ہوجانا ہی بہتر ہے اور آیندہ سال بڑی تیاری کے بعد واپس آنا چاہئے۔ چنانچہ اس رات کو یہ لوگ واپس ہوگئے۔

کرم پٹن

قاضی منہاج لکھتے ہیں کہ جب میں لکھنوتی میں تھا تو اس شہر کی نسبت میں نے پوری تحقیقات کی، معلوم ہوا کہ کرم پٹن ایک بڑا شہر ہے، جس کی فصیل ایک پتھر سے تراش کر بنائی گئی ہے، برہمن اور تونی قوم کی کثیر آبادی ہے۔ انہیں میں بہت ایک شخص کی سرداری میں یہ آرام زندگی بسر کرتے ہیں۔ آتش پرستی ان کا مذہب ہے۔ شہر اس قدر بڑا ہے کہ اس کے بازار میں روزانہ ۱½ ہزار گھوڑے فروخت ہوجاتے ہیں۔

لکھنوتی کے بازار میں زین کسے ہوئے گھوڑے جو نظر آتے ہیں وہ اسی جگہ سے آتے ہیں۔ یہاں سے لکھنوتی آتے ہوئے بہت سے درّے راستہ میں ملتے ہیں۔ اور عام طور پر یہی راستہ زیادہ مشہور ہے۔ چنانچہ کامروپ سے تبت جاتے وقت ۳۵ درّے ملتے ہیں۔ اور پھر وہاں سے لکھنوتی لاتے ہیں۔[۶]

---

[۱] ریاض السلاطین صفحہ ۶۵۔ [۲] طبقات اکبری جلد اول صفحہ ۴۹ کلکتہ۔ [۳] فرشتہ جلد چہارم صفحہ ۶۶۱
[۴] فرشتہ میں اس شہر کا نام کرسین اور طبقات اکبری میں کرم سین لکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دونوں میں کتابت کی غلطی ہے۔ [۵] لیکن فرشتہ اور طبقات اکبری میں صرف پچاس ہزار سوار لکھا ہے جو غالباً زیادہ صحیح ہے۔ یہ غوجی لوگ ہونگے اور وہ شہر کی آبادی ہوگی۔ [۶] طبقات ناصری صفحہ ۱۵۴۔

واپسی بنگال

محمد بختیار خلجی جب وہاں سے واپس ہوا تو تمام راہ پریشان حال رہا۔ تبتی لوگوں نے تمام مقامات میں آگ لگا کر ویران کر ڈالا تھا، اور کل آبادی خالی پڑی تھی۔ پندرہ دن کے اندر ایک سیر غلہ اور جانوروں کے کھانے کے لئے ایک پتہ بھی نصیب نہ ہوا۔ مجبوراً گھوڑوں کے گوشت پر گزارہ کر کے سب لوگ کامروپ پہنچے، لیکن جب اس پختہ پل پر آئے تو اس کو شکستہ پا کر بے حد مایوس ہوئے۔

بات یہ ہوئی کہ دونوں سردار ترک اور خلجی جن کے ذمہ پل کی حفاظت تھی دونوں آپس میں متحد نہ رہ سکے اور ایک دوسرے سے لڑ کر مر گئے۔ چونکہ ان دونوں امیروں سے کامروپ والوں کو سخت تکلیف پہنچی تھی، اسلئے عداوت سے انہوں نے پل کی دو کمانیں توڑ ڈالیں۔ [۱]

جب محمد خلجی نے یہ حال دیکھا تو امراء سے مشورہ کر کے یہ رائے قایم کی کہ پل تیار ہونے تک کسی محفوظ مقام میں قیام کا بندوبست کیا جائے، جاسوسوں کے ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ قریب ہی ایک بڑا اسٹیگین مندر ہے جہاں آرام سے رہ سکتے ہیں اور اس میں سونے چاندی کے بت بھی بکثرت ہیں۔ جس میں سے ایک بڑا بت دو تین ہزار مثقال سونے کا ہے۔ محمد خلجی اور اس کے تمام لشکر نے اسی بت خانہ (مندر) میں پناہ لی، لکڑی اور رسّی وغیرہ کا انتظام کرنے لگا۔ لیکن کامروپ کے لوگ ان دونوں سرداروں کی بدعنوانیوں سے جلے بیٹھے تھے، جیسے ہی کہ راجہ کو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا لشکر تباہ حال مندر میں مقیم ہے اُسے انتہائی رنج ہوا۔ اس نے فوجوں کو حملہ کا فوراً حکم دیا۔ رعایا بھی سابقہ ظلم اور مندر کے قبضہ سے راجہ کے ساتھ ہو گئی یہانتک کہ سب مندر کے پاس جمع ہو گئے۔ راجہ نے کہا کہ میدانی جنگ میں ہماری فوج غیر تعلیم یافتہ ہے۔ اسلئے بہتر ہے کہ مندر کا محاصرہ کر لو تاکہ بھوکے پیاسے خود ہی فنا ہو جائیں۔

چنانچہ زکلوں کو مندر کے چاروں طرف گاڑ کر اور ایک دوسرے کو رسّی سے باندھ کر ایک دیوار کی شکل بنا دی۔ اسلامی فوج نے جب یہ حال دیکھا تو بہت گھبرائے آخر سب نے مشورے سے یکبارگی ایک طرف زوردار حملہ کر کے باہر نکل آئے۔ اور دریا کنارے پہنچے [۲] آسامی بھی اُن کا تعاقب کرتے ہوئے نزدیک آ گئے، اب آگے پانی اور پیچھے دشمن، لوگ پار اترنے کے سامان کی فکر کر رہے تھے کہ اچانک ایک سوار نے گھوڑا دریا میں ڈال دیا، وہ تھوڑی دُور تک گیا تو پایاب نظر آیا، مایوسی کا وقت تھا، تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ تمام لشکر میں خوشی کی لہر بجلی کی طرح دوڑی، اور ہر شخص نے گھوڑا دریا میں ڈال دیا، جب کچھ دُور نکل گئے تو حقیقت کھلی، اب سامنے دریائے سوآج اور پیچھے آسامیوں کی فوج، غرض ساحل تک پہنچتے پہنچتے فوج کا بڑا حصّہ غرق بحر فنا ہوا اور بہ مشکل تمام دو تین سو سپاہیوں کے ساتھ محمد بن بختیار خلجی دریا پار ہوا۔ [۳]

علالت اور وفات

غشکلی میں جب کچھ دُور چلے تو کوچ اور میچ قوم کو اطلاع ہوئی، علی میچ اپنے حدود دریا تک میں جن جن رشتہ داروں کو حفاظت راہ کے لئے چھوڑ گیا تھا، سب استقبال کے لئے آئے، اور ہر طرح سے اُن کی خدمت کی، جب محمد خلجی دیوکوٹ آیا تو ناکامی اور کلفت راہ کی کوفت سے سخت بیمار ہو گیا، تلف شدہ سپاہیوں کی ہوی، بچوں کی شرم سے سوار ہو کر باہر نہ نکلتا تھا، اور کسی وقت اگر نکلا تو کوٹھوں پر سے سر بازار عورتیں اُسے گالیاں دیتی تھیں۔ اسی علالت کے زمانہ میں اکثر محمد خلجی کہا کرتا تھا کہ ضرور سلطان معز الدین محمد شہاب الدین غوری کے ساتھ کوئی واقعہ ہوا، اسی لئے ہماری صنعت پھر گئی۔ اور واقعہ بھی یہی تھا کہ انہیں دنوں وہ پنجاب میں کھوکھروں کے ہاتھ سے ۶۰۲ھ میں شہید کیا گیا تھا۔

محمد بن بختیار خلجی انتہائی غم و غصّہ کے سبب مرض قولنج میں مبتلا ہو گیا، اور اس کی حالت دن پر دن گرتی گئی۔ یہانتک کہ ۶۰۲ھ میں صاحب فراش ہو کر عالم بقا کی طرف کوچ کر گیا، [۴]

قاضی منہاج کہتے ہیں کہ بعض لوگوں نے بیان کیا کہ علی مردان خلجی ایک امیر تھا جس کو ایک ضلع کا حاکم بنایا تھا۔ جب محمد خلجی کی حالت اس کو معلوم ہوئی تو فوراً دیوکوٹ پہنچا، اس وقت محمد خلجی کی حالت بہت نازک ہو چکی تھی، اور تین دن سے بار یاب ہونے کا کسی کو موقعہ نہیں ملا تھا۔ علی مردان نے کسی طرح اندر داخل ہو کر اسکی چہرہ سے چادر اٹھائی اور چہرے سے اس کا کام تمام کر دیا [۵]۔ — محمد خلجی کی لاش بعد وفات دیوکوٹ سے بہار لائی گئی اور اسی جگہ سپرد خاک ہوئی، اس کا ایسا قیاس ہوتا ہے کہ غالباً اس کی قریبی رشتہ دار اور خاندانی لوگ بہار ہی میں مقیم تھے اسی لئے اس کی لاش یہاں لائی گئی۔ [۶]

بہار میں اس کی قبر کہاں ہے صحیح طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن میرے خیال میں باتوا سکی قبر اندازہ کی پاس ہونی چاہئے کہ اصل شہر ہی کی طرف تھا، یا موجودہ کاغذی کی پاس جو پہاڑی ہے اور شرقی قریبی پر ایک بلند جگہ میں ہیں، انہیں میں سے ایک بختیار خلجی کی ہے کیونکہ فوجی آبادی ہمیشہ شہر سے دُور رہتی تھی اور جنگی نقطہ نگاہ سے یہ مقام فوج کیلئے بالکل موزوں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسکی قبر بختیار پور کے متعلق مشہور ہے کہ اسی کا آباد کیا ہوا ہے، جو بہار سے تقریباً بیس کوس پر شمال جانب آباد ہے۔ — میں پڑھے۔ — بطریقہ سے صاحبان بہار سے درخواست کرتا ہوں کہ اس فاتح بہار کی قبر ضرور تلاش کریں۔ اور فتح بہار کی سالانہ یادگار منائیں۔

---

[۱] طبقات ناصری صفحہ ۱۶۳ [۲] طبقات ناصری صفحہ ۱۶۴ [۳] طبقات ناصری صفحہ ۱۶۵ [۴] طبقات ناصری صفحہ ۱۶۶ [۵] طبقات ناصری صفحہ ۱۶۷ [۶] طبقات ناصری صفحہ ۱۶۸ [۷] طبقات ناصری صفحہ ۱۶۹ [۸] طبقات ناصری صفحہ ۱۷۰

عمدۃ الملک نواب داؤد خاں قریشی

(صوبہ دار بہار سنہ ۱۰۶۹ھ - سنہ ۱۰۷۴ھ / ۱۶۶۰ - ۱۶۶۵)

از جناب سید رضا قاسم صاحب مختار

گماں مبر کہ تو چوں بگذری جہاں بگذشت ہزار شمع بکشتند و انجمن باقیست

صوبہ بہار کی تاریخ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس صوبہ میں جس طرح ضلع پٹنہ (عظیم آباد) اپنے خاص اعزاز و احترام کے باعث مشہور ہے، اسی طرح ضلع گیا بھی خاص تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور دنیا کے پرانے دھرم بودھ مت کے بانی کا مرکز ہے، نیز آب و ہوا و قدرتی مناظر کے لحاظ سے بھی یہ ضلع بہت سی خوبیاں اپنے دامن میں لئے ہے، مواقع سیر و شکار و کوہستانی سلسلوں سے تو اس کی خوشنمائیاں اور بھی دوچند ہو گئی ہیں۔ چنانچہ ضلع گیا میں جہاں اور دوسرے مقامات اپنی تاریخی و جغرافیائی عظمت رکھتے ہیں وہاں قصبہ داؤد نگر بھی اپنی آبادی، تجارتی کاروبار، آب و ہوا، اور اپنی تاریخی اہمیت میں ایک خاص امتیازی شان رکھتا ہے، اس کو نواب داود خاں قریشی نے سنہ ۱۰۷۴ھ میں آباد کیا تھا۔

یہ قصبہ شہر گیا سے تقریباً پچاس میل دور مغربی سمت اور رنگ آباد سب ڈویژن (تحصیل) میں دریائے سون کے مشرقی کنارہ پر واقع ہے۔ جس کے کنارے ریت اور سرپت کے جنگل از دھن دور تک پھیلے ہوئے ہیں جس میں وحشی جانور صانبھر، نیل، ہرن اور جنگلی سور وغیرہ بکثرت پائے جاتے ہیں، قصبہ داؤد نگر ریلوے لائن سے تقریباً چودہ میل کی دوری پر جانب شمال واقع ہے، اور ای۔ آئی۔ آر کی جولائن مغل سرائے سے گیا کو جاتی ہے اس پر سون ایسٹ بینک (بارون) اور اس کے بعد کامشہور اسٹیشن بامر گنج، یہ دونوں ریلوے اسٹیشن داؤد نگر جانے کے لئے تریکٹا کم و بیش فاصلہ رکھتے ہیں، لیکن بامر گنج اسٹیشن سے داؤد نگر تک گیا ڈسٹرکٹ بورڈ کی پختہ سڑک ہے جس پر موٹر لاریاں آیا جایا کرتی ہیں۔

داؤد خاں قریشی کون تھا؟ کس خاندان سے تعلق رکھتا تھا، کس طرح یہاں آیا اور کیونکر قصبہ داؤد نگر آباد کیا؟؟ گرچہ اس کی دنیہ داری صوبہ بہار کی تاریخ لکھنے والوں پر رہتی لیکن ہمارے صوبہ بہار کی جہاں اور بدنصیبیاں ہیں وہاں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس صوبہ کے سیکڑوں مشاہیر سلف کو زمانے کی ناسازگاری و کجروی نے قعر گمنامی میں ڈال دیا ہے لیکن یہ لائق اطمینان ہے کہ بعض ان میں سے ایسے ہیں جن کے حالات متعدد پرانی کتب تاریخ میں جا بجا تھوڑے بہت مل جاتے ہیں، جنہیں اگر تھوڑی سی کاوش و دیدہ ریزی کے ساتھ یکجا کیا جائے تو یقیناً اُن کے پورے پورے حالات پر کافی روشنی ڈالی جا سکتی ہے، مگر افسوس کہ صوبہ بہار کی تاریخ مرتب کرنے والوں نے اس کاوش کو گوارہ نہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے صوبہ بہار کی نئی مطبوعہ تاریخیں[1] عمدۃ الملک نواب داؤد قریشی جیسی نامور و ذیوقار شخصیت کے ذکر سے خالی ہیں۔ اسلئے ناچیز راقم نے مناسب جانا کہ اس مرتبہ ندیم کے بہار نمبر میں داؤد خاں پر کچھ پیش کرے۔ چنانچہ مختلف کتابوں[2] کی ورق گردانی سے جس قدر بھی معلومات نواب موصوف کے خاندان و حالات کی حاصل ہو سکی انہیں یکجا منضبط کرکے بطور ذیل میں ہدیۂ ناظرین کرتا ہے۔

---

[1] یعنی مطبوعہ تواریخ صوبہ بہار تصنیفات حضرت شاد عظیم آبادی علیہ الرحمۃ و جناب اولاد حیدر صاحب فوق بلگرامی مدظلہ العالی۔

[2] مآخذ کے متعلق یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ عالمگیر نامہ قلمی نسخہ، مراۃ العالم قلمی نسخہ و گلشن قلمی نسخہ، دستور العمل قلمی نسخہ، ماثر الامرا قلمی و مطبوعہ ہر دو نسخہ، ماثر عالمگیری، تاریخ داؤدیہ، سیر المتاخرین و نیز مراۃ السلاطین (اردو ترجمہ سیر المتاخرین مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۹۶ء) وغیرہ کے علاوہ بعض انگریزی کتب مثلاً اسٹوڑ ان مغل انڈیا، ہسٹری آف اورنگ زیب تصنیفات سر جادو ناتھ سرکار، اور پلاموں گزیٹر وغیرہ کی ورق گردانی کرکے یہ مضمون مدون و مرتب کیا گیا ہے۔

نسب اور خاندان

نواب داؤد خاں قریشی کا سلسلۂ نسب حضرت علی مرتضیٰ کی زوجہ ثانیہ جناب لبابہ سے جو سپہ سالار حضرت عباس تھے انہیں تک منتہی ہوتا ہے۔ جناب عباس کے دو فرزند عبداللہ اور افضل تھے۔ عبداللہ سے حسن، ان سے عبداللہ (جو اپنے دادا کے نام پر موسوم ہوئے) اور جن کی اولاد کثیر بلاد و امصار عالم میں پھیلی) ازانجملہ ابراہیم بن طاہر اُن سے یحییٰ اُن سے احمد، ان سے محمد، ان سے زکی، ان سے تقی، اُن سے صلاح الدین، ان سے وجیہہ الدین، ان سے نجیب الدین، اُن سے بدرالدین، اُن سے عبداللہ، اُن سے وجیہہ اللہ، اُن سے محمد رمضان، ان سے محمد رضی ہوئے۔

جب محمد رضی مذکور کو تنگی معاش نے بہت پریشان کیا تو وہ معہ اہل و عیال سنہ ۹۲۹ھ / ۱۵۲۲ء میں مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے کابل چلے آئے۔ کابل میں یہ وہ زمانہ تھا جب کہ شاہ ظہیر الدین محمد بابر تسخیر لاہور کی تیاریاں کر رہا تھا۔ چنانچہ محمد رضی مذکور معہ اپنے دو سگے فرزندوں کے شاہ مذکور کے دربار میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے ان کا کمال اعزاز و احترام کیا اور ان کو اپنے ہمراہ یلغار لاہور روانہ ہو گیا، اور صرف محمد رضی مذکور معہ مستورات کابل میں رہ گئے۔ کچھ دنوں بعد جب کہ لاہور میں مورچہ جنگ و پیش تھا محمد رضی کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کا سارا کنبہ کابل سے لاہور چلا آیا اور جب ظہیر الدین محمد بابر کو تسخیر لاہور سے فراغت حاصل ہوئی اور وہ کابل واپس جانے لگا تو محمد رضی مرحوم کے فرزندوں نے کابل جانا پسند نہ کیا، اور وہ کل بھائی معہ اپنے کنبے کے عازم دہلی ہوئے۔ دہلی میں اُس وقت ابراہیم لودی برسر حکومت تھا، اُس نے ان میں سے نو بھائیوں کو فوجی خدمت سپرد کی اور محمد راضی پسر پنجم محمد رضی مرحوم کو جو فضل و ہنر میں کمال رکھتے تھے، اُن کے علم و فضل کا احترام کرتے ہوئے عہدۂ قضا تفویض فرمایا۔

سنہ ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء میں جب ظہیر الدین محمد بابر تسخیر دہلی کو آیا تو ابراہیم لودی بھی مقابلہ کو نکلا، اس مہم میں محمد راضی کے بقیہ کل بھائی اس کے ہمراہ جنگ کے لئے پانی پت روانہ ہو گئے، اور ادھر ابراہیم لودی کی غیر موجودگی میں چند بر آشوب عہدہ داران شاہی نے بعداوت باطنی موقع غنیمت پا کر ایک شخص کو محمد راضی کی توہین کے لئے آمادہ کیا۔ چنانچہ وہ شخص ایک روز محکمہ قضا میں آیا اور بھرے اجلاس میں محمد راضی کے روبرو ان کی شان میں نا ملایم کلمات زبان پر لایا، ہر چند انہوں نے منع کیا مگر نہ مانا تو درکنار بلکہ اس کی گستاخیاں و بیہودگیاں حد سے اتنی زیادہ بڑھ چلیں کہ محمد راضی کے ضبط و برداشت سے باہر ہو گئیں اور انہوں نے مجبور ہو کر اس شخص کو قتل کر ڈالا۔

اس واقعہ سے ایک فساد رونما ہوا۔ اور محمد راضی نے باوجودیکہ اُس فتنے کو فرو کرنے کی بلیغ کوششیں کیں لیکن جب اُنہیں اپنی کوششیں کارگر ہوتی نظر نہ پڑیں تو وہ نویں ماہ رجب المرجب سنہ ۹۳۳ھ / ۱۵۲۶ء کو معہ عورتوں اور اثاث البیت کے پوشیدہ طور پر حصار فیروزہ روانہ ہو گئے۔ جب وہ حصار فیروزہ پہنچے تو انہیں اپنے بھائیوں و نیز ابراہیم لودی کے قتل ہو جانے کی خبر ملی۔ چنانچہ اس حادثہ جانکاہ کی خبر پانے کے بعد دنیا سے دون کو زشت و زبون سمجھ کر وہ تارک جاہ و حشم ہو گئے۔ ذات خداوندی پر بھروسہ کر کے کمر باندھ لی اور حصار فیروزہ ہی میں توطن اختیار کر لیا، اور کچھ دنوں بعد لاہور جا کر شاہ یوسف قتال قدس سرہٗ سے مرید ہو آئے، جنہوں نے ان کو راضی خاں کا خطاب عطا کیا۔ اور اسی زمانے سے بجائے محمد راضی کے وہ راضی خاں کے نام سے مشہور ہو گئے۔ (تاریخ داؤدیہ مرتبہ سید محمد ناصر بلگرامی مرحوم)

تاریخ داؤدیہ (مرتبہ محمد ناصر بلگرامی مرحوم) کی روایت بغیر کسی حوالہ کے ہے کہ محمد راضی الملقب براضی خاں کے سات فرزند ہوئے، منجملہ ان کے ایک اُف سے فرید خاں تھے جن کے بیٹے کبیر خاں تھے۔ کبیر خاں کی دو شادیاں ہوئیں۔ محل اولیٰ سے تین فرزند بھیکن خاں، داؤد خاں اور محمد خاں تھے، اور محل ثانیہ سے صفی خاں ہوئے۔ مگر مآثر الامرا (جلد دوم مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سنہ ۱۸۹۱ء صفحہ ۳۲ و ۳۳) کی مندرجہ ذیل عبارت

"داؤد خاں قریشی پسر بھکن خان است۔ از شیخ زادہ ہائی حصار فیروزہ کہ نوکر عمدہ و معتبر خانجہان لودی بود۔۔۔۔۔"

سے ظاہر ہوتا ہے کہ داؤد خان کے باپ کا نام کبیر خاں نہیں بلکہ بھیکن خاں تھا، مگر کتاب دستور العمل قلمی نسخہ (سنہ ۱۷۳ کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ) صفحہ ۶۰ باب فہرست نامائمان صوبہ الہ آباد کی مندرجہ ذیل عبارت

"در سنہ ۱۴ جلوس داؤد خاں ولد خضر خاں کہ صوبہ داری برہان پور معزول شدہ آمدہ بود از تغیر سیہ خاں شش ہزاری۔۔۔۔۔"

سلہ محمد کاظم، محمد سابر، محمد داسع، محمد شاکر، محمد راضی، محمد عالم، محمد تقی، محمد نقی، محمد جواد، اور محمد ذکی۔ (تاریخ داؤدیہ)

سلہ شاہ صاحب موصوف قاضی جلال الدین لاہوری قدس سرہٗ کے مرید و جانشین تھے اور آپ کی خانقاہ لاہور میں ہفت پلہ کے نام سے مشہور تھی۔ (تاریخ داؤدیہ)

سلہ صفی خاں کے دو اور کے مزارات قصبہ داؤد نگر کے جنوبی گوشے پر ہنوز موجود ہیں۔

سے باپ کا نام خضر خاں ظاہر ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان کتب تواریخ کے مختلف البیان روایات کی بنا پر نواب داؤد خاں کے والد کے اسم گرامی کا متیقن طریق پر پتا جلانا مشکل ہے۔ لیکن دیگر تذکرہ کتب سے پتہ چلتا ہے جیسا کہ آگے آئیگا کہ داؤد خاں کے ایک بھائی کا نام بھی بھیکن خاں تھا۔ اس لیے قیاس یہ چاہتا ہے کہ باپ کا نام خضر خاں ہی تھا۔ یا کبیر خاں یا بھیکن خاں۔

پیدائش و ابتدائی زندگی داؤد خاں ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر بمقام **حصار فیروزہ** پیدا ہوا تھا[1]۔ اور اس نے اپنی زندگی کی ابتدا خانجہان لودی کی ملازمت میں کی تھی اور[2] پہلی جنگ میں وہ شریک ہوا۔ وہ دھولپورہ میں شاہی فوج اور خانجہان کے درمیان واقع ہوئی اور خانجہاں کے مرنے کے بعد وہ داراشکوہ کی ملازمت میں داخل ہو گیا۔

داراشکوہ کی ملازمت شاہجہان کے سنہ جلوس میں متھرا، مہابن، جلیسر، اور دیگر محالات جو داراشکوہ کو سعد اللہ کے مرنے کے بعد جاگیر میں دیے گئے تھے، داؤد خاں اُن کا فوجدار مقرر ہوا، اس کے علاوہ آگرہ اور دہلی کے درمیان دو ہزار سواروں کے ساتھ اس کو راہ داری کی خدمت بھی سپرد کی گئی تھی، اور اسی سال داراشکوہ کی سفارش پر اس کو خان کا خطاب عطا ہوا تھا[3]۔ لیکن تاریخ داؤدیہ (مرتبہ سید محمد ناصر بلگرامی مرحوم مطبوعہ مطبع آئینی الہ آباد) میں نواب داؤد خاں قریشی کی نسبت داراشکوہ کی ملازمت کے متعلق اس طرح مذکور ہے کہ

"نواب داؤد خاں قریشی اپنے بڑے بھائی بھیکن خاں کے مقتول ہو جانے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی محمد خاں کو ساتھ لیکر کے از عاید شاہی اعظم خاں کی سرکار میں رہا کرتا تھا، یہاں تک کہ ایک روز سلطان شہاب الدین شاہجہاں نے دربار عام میں فرمایا کہ اگر بھیکن خاں کے بھائیوں میں سے کوئی اُن کے وطن میں ہو تو طلب کیا جائے، حاضرین دربار نے عرض کی کہ خان مرحوم کے دو بھائی داؤد خان اور محمد خاں اعظم خاں کے ہمراہ ہیں۔ چنانچہ فوراً فرمان شاہی بنام اعظم خاں بطلب ان دونوں بھائیوں کے جاری ہوا۔ اعظم خاں نے دونوں بھائیوں کو باعزاز تمام روانہ کیا اور جب یہ دونوں بھائی دربار شاہی میں پہنچے تو شاہجہاں نے خوش ہو کر فرمایا "آفتاب اقبال ما بدولت در ہفت اقلیم تاباں و درخشاں شد" اس عرصہ میں داراشکوہ نے عرض کی کہ یہ دونوں جوانمرد جانثار کو مرحمت فرمائے جائیں۔ چنانچہ شاہجہان نے ان دونوں بھائیوں کو اپنے فرزند اکبر محمد داراشکوہ کے سپرد کر دیا۔"

سنہ ہجری کی گیارہویں صدی میں جب شہنشاہ محمد شہاب الدین شاہجہان بیمار رہنے لگا۔ تو اُس کے لڑکوں[4] میں تخت کے وراثت کی نزاع پیدا ہوئی، اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کو مٹا کر تخت لینے کا آرزومند تھا۔ محی الدین اورنگ زیب اگرچہ اس وقت دکن میں تھا۔ لیکن وہ اس قدر دُور اندیش تھا کہ اس کے بقیہ تینوں بھائی نہ تو اس کو کچل سکتے تھے، نہ عقل و تدبیر میں اس کو مات کر سکتے تھے اور اس کے موجود رہتے ہوئے نہ کوئی دوسرا اس پر سبقت لے جا سکتا تھا، چنانچہ جوں ہی اورنگ زیب کو معتبر ذرایع سے یہ خبر ملی کہ شہنشاہ اس قدر بیمار ہیں کہ سلطنت کے کاموں کو بذات خود دیکھ نہیں سکتے ہیں اور داراشکوہ کے بالکل ہی اختیار میں ہیں، اور در اصل داراشکوہ شاہجہاں کے نام سے حکومت کر رہا ہے، تو وہ فوراً پوری تیاریوں کے ساتھ دربار شاہی کی جانب روانہ ہوا، راہ میں جو شہر و قلعے ملتے گئے اُن کو لوٹتا، فتح کرتا اور جس قدر خزانے اور سامان جنگ اُن شہروں اور قلعوں میں دستیاب ہوئے وہ سب اپنے ساتھ سمیٹتا چلا۔

---

[1] افسوس کہ باوجود تلاش و جستجو داؤد خاں کا سنہ ولادت معلوم نہ ہو سکا،

[2] مآثر الامرا قلمی نسخہ (کتب خانہ مشرقی پٹنہ) صفحات ۱۵۸ و ۱۵۹

[3] ماخوذ از مراۃ السلاطین۔ ترجمہ سیر المتاخرین

(۱) محمد داراشکوہ ولادت سنہ ۱۰۲۴ھ وفات بذریعہ قتل سنہ ۱۰۶۹ھ

(۲) شاہ شجاع ولادت سنہ ۱۰۲۵ھ

(۳) محی الدین اورنگ زیب۔ ولادت ۱۵ ذیقعدہ سنہ ۱۰۲۷ھ وفات ۳ ذیقعدہ سنہ ۱۱۱۸ھ بعمر اکانوے سال بمقام احمد نگر۔

(۴) مراد بخش ولادت ۲۵ ذالحجہ سنہ ۱۰۳۳ھ بمقام قلعہ روہتاس (بہار) وفات بذریعہ قتل ۲۱ ربیع الاول سنہ ۱۰۶۷ھ

محی الدین اورنگ زیب سے جنگ اس کے بعد داراشکوہ اور اورنگ زیب میں وہ عظیم الشان فیصلہ کن معرکہ آرائی ہوئی جو ہندوستان کی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے اور جس کی تفصیلات میں ہمیں جانے کی ضرورت نہیں۔ اس جنگ میں اورنگ زیب کے خلاف داؤد خاں نے بھی داراشکوہ کی جانب سے حصہ لیا۔ داراشکوہ نے ۱۶ شعبان المعظم مطابق وسط ماہ مئی سنہ ۱۶۵۸ء کو خلیل اللہ خاں کو ایک دستہ فوج کے ساتھ ہراول کے طور پر روانہ کیا کہ وہ دھولپور کے قریب جاکر ٹھیرے اور دریائے چنبل کی گھاٹیوں کی نگرانی کرے۔ اور خود ۲۵ ماہ مذکور کو مع اپنے چھوٹے بیٹے سپہر شکوہ اور کل فوج (جس میں کئی ممتاز و نامور سپاہی جنرل بھی موجود تھے) اور توپخانہ و نیز داؤد خاں اور عسکر خاں اپنے ملازمین خاص وغیرہ کے ساتھ روانہ ہوا اور دھولپور سے پانچ منزل ادھر ہی قیام پذیر رہکر اپنے بڑے لڑکے سلیمان شکوہ کا (جس کے ساتھ ایک بڑا لشکر جرار تھا) انتظار کرتا رہا، اُدھر اورنگ زیب دھولپور کے زمینداروں کی معاونت اور رہنمائی سے رات کے وقت ایسے گھاٹ سے پار اتر آیا جہاں دریا کا پانی ران سے اونچا نہ تھا، اور خوش قسمتی سے وہاں پر اس وقت داراشکوہ کے ہراول کا کوئی سپاہی بھی نگرانی کے لئے موجود نہ تھا۔

القصہ جب داراشکوہ کو اورنگ زیب کے لشکر کے دریا پار ہوجانے کی خبر ملی تو وہ نہایت سراسیمگی اور تیز رفتاری کے ساتھ جنگ کرنے کا عزم بالجزم کرکے دھولپور کو (لشکر فراہم کردہ) روانہ ہوا۔ اور ۵ رمضان المبارک مطابق ۱۶ جون سنہ ۱۶۵۸ء کو موضع راجپورہ میں پہنچکر اپنے لشکر کی ترتیب اور مست ہاتھیوں کی اراستگی میں مصروف ہوا۔ دوسرے دن یعنی ۶ ماہ رمضان المبارک مطابق ۱۷ ماہ جون کو وہ اور آگے بڑھا اور سموگڑھ کے قریب دھولپور کے وسیع میدان میں صف آرا ہوا،

داراشکوہ نے بھی جب طنطنہ عالمگیری دیکھا تو اپنی فوج کو اس طرح ترتیب دیا کہ اپنا توپخانہ جو باہتمام میر آتش تھا، داہنی طرف کو، اور توپخانہ شاہی جو حسین بیگ خاں کے زیر اہتمام تھا بائیں جانب کو فوج کے آگے مقرر کیا اور امرائے بادشاہی سے راؤ ستر سال ہاڑا کوا (جو ہندوستان کے راجپوتوں میں شجاعت، دلاوری اور سپاہگری میں معزز و ممتاز تھا) معہ راجہ روپ سنگھ راٹھور، اعظم زادہ راجہ جسونت سنگھ) راجہ گردھر (برادر زادہ راجہ بیٹھل داس) کنور گور بھیم (پسر راجہ بیٹھل داس) اور راجہ شیوارام وغیرہ راجپوتان نامی کو ہراول بنایا، اور (اپنے ملازم) نواب داؤد خاں قریشی کو معہ چار ہزار سوار اور عسکر خاں کو تین ہزار پیدل سپاہیوں کے ساتھ اس فوج کا ضمیمہ بنایا۔

الغرض دوپہر کے وقت دونوں لشکر کوہ دوپیکر کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرائے اور بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی تیر و سنان سے گذر کر شمشیر و خنجر تک نوبت پہنچ گئی، دونوں طرف سے ہزاروں تیر چلے اور سینوں کو برماتے ہوئے نکل گئے، طرفین کے سیکڑوں سپاہی زخمی اور ہلاک ہوئے۔ اس کے بعد سپہر شکوہ اور نواب داؤد خاں نے بارہ ہزار سواروں کے ساتھ اورنگ زیب کے توپخانہ پر حملہ کیا اور جلال و قتال کرتے ہوئے آگ برسانے والی صف سے گزر گئے۔ اس مہم میں نواب داؤد خاں نہایت بہادری اور دلیری سے لڑا۔ ہر چند عالمگیری فوج نے بہت کچھ ہاتھ پیر مارے مگر داراشکوہ کی انبوہ کی مدافعت نہ ہوسکی اور قریب تھا کہ داراشکوہ ہی لشکر شہزادہ محمد سلطان کے ہراول پر حملہ کرکے عالمگیری فوج کے قدم اکھاڑ دے کہ یمین کی طرف سے اسلام خاں معہ بہادران بہر الغار کے اُٹھ کر جا بھڑا اور شیخ میر بھی معہ فوج التمش کے برابر جا پہنچا، اور ایسی خونریز جنگ ہوئی کہ زمین و آسمان تھرّانے لگے۔

داراشکوہ گرمی جنگ سے محض ناآشنا رہا تھا اور داؤد خاں کی بہادری اور سپہر شکوہ کی دلیری دیکھکر فوراً قول (انبوہ) اور التمش کی فوج لیکر عالمگیری فوج کے ہراول اور توپخانہ کی طرف پڑا اور جوش میں آکر اپنے ہراول کو زیر کرکے اپنے توپخانہ سے بھی آگے جانکلا اور اپنے مخالف کے توپخانے کے پاس جا پہنچا اور جب اُسے آگے بڑھنے کی راہ نہ ملی تو پھر اپنے دست راست کی فوج کو حائل ہوگیا۔ جس کے باعث طرفین کے ہراول میں آویزش کی نوبت پہونچگئی اور داراشکوہ کو مجبوراً مراد بخش سے جو مع فوج عالمگیری جرانغار کا سردار تھا روبرو ہونا پڑا۔ ساتھ ہی خلیل اللہ خاں بھی جو مع فوج بہر الغار پر متعین تھا اپنے آقا داراشکوہ کی مدد پر پہنچکر حملہ آور ہوا اور گروہ از بکیہ جو اس کے ہمراہ تھے گرم برأت ہوئے۔ مراد بخش نے بہت کوشش کی اور آخر کو زخمی ہوکر پیچھے ہٹ گیا، یہ دیکھ کر اورنگ زیب نے داراشکوہ کی طرف اپنے ہاتھی کا رُخ کیا، معًا اس کی فوج و نیز قول خاص (گروہ) نے بھی ادھر توجہ کی، اُس وقت نواب داؤد خان و نیز اُن راجپوتوں نے جنھوں نے مراد بخش کو شکست دی تھی اور اورنگ زیب کی فوج پر حملہ کیا۔ اورنگ زیب کی جانب کو بھی دلاوران جانفشان نے حق نمک ادا کرنے پر کمر باندھ لی۔

اس سخت حملے میں اگرچہ ہمراہیان اورنگ زیب نے شجاعت و مردانگی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا مگر داؤد خاں اور دارا شکوہ کے دوسرے افسران نے قیامت برپا کر رکھی تھی، چنانچہ راو ستر سال ہاڑا، رام سنگھ راٹھو، کنور بھیم (ولد راجہ بیٹھل داس) راجہ شیو رام اور رستم خاں وغیرہ نے قول (انبوہ) عالمگیری تک پہنچکر داد جوانمردی دی اور زخمی ہو کر مارے گئے۔ الغرض جب دارا شکوہ نے دیکھا کہ اس کے سرداران جانباز جن کی پشت پناہی پر وہ باپ کا کہنا نہ مانتا تھا اسے جا چکے تو اس کا پائے ثبات متزلزل ہوا، باوجودیکہ نواب داؤد خاں اور اس کی فوج ہنوز اس کے ہمراہ تھی اور ابھی جنگ کا قطعی فیصلہ بھی نہ ہوا تھا مگر خدا جانے دارا شکوہ کے دل میں کیا بات پیدا ہوئی کہ وہ ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گیا، داؤد خاں کی فوج نے جب دارا شکوہ کا یہ اضطرار و اضطراب دیکھا تو اس کی فوج میں کھلبلی مچ گئی، اس درمیان میں دارا شکوہ کا ترکش دار بھی تیر اجل کا نشانہ ہو گیا، ان حالات نے دارا شکوہ کے قدم اکھاڑ دیے، پھر کیا تھا ہر ایک نے اپنی اپنی راہ پکڑی، سپہر شکوہ بھی بھاگ کر اسی رو داری میں باپ سے جا ملا، اور اورنگ زیب جو ایک آزمودہ کار جنگجو تھا اس نے فتح پائی۔ دارا شکوہ میدان جنگ سے فرار ہو کر آگرہ آیا اور صرف چند گھنٹے قیام کر کے راتوں رات اپنے چند ملازمین اور اہل و عیال کو ساتھ لیکر دہلی پہنچا، داؤد خاں اور دوسرے سردار بعد کو روانہ ہوئے اور جا کر دارا شکوہ سے مل گئے۔[1]

دہلی میں دارا شکوہ نے بہت کم قیام کیا اور جوں ہی اس کو خبر ملی کہ اورنگ زیب اس کے تعاقب میں چلا آ رہا ہے وہ زر نقد، جواہرات اور گرانبہا اسباب جس قدر اس کو مل سکے ساتھ لیتا ہوا پنجاب کی طرف بھاگ نکلا اور چلتے وقت گھبراہٹ میں باپ سے ملاقات تک نہ کر سکا راہ میں داؤد خاں کو ایک دستہ فوج کے ساتھ تالون[2] (TALWAN) میں چھوڑتا گیا کہ وہ اورنگ زیب کی بڑھتی ہوئی فوج کو روک دے اور دریا کے پار نہ ہونے دے تاکہ دارا شکوہ کو لاہور میں کچھ وقت مل جائے اور وہ شاہی خزانہ پر قبضہ کر کے اورنگ زیب کے مقابلے کے لئے ایک بڑی فوج تیار کر سکے، لیکن اورنگ زیب کی فوج جو بڑھتی آ رہی تھی نہیں رک سکی اسلئے کہ بعد کو دارا شکوہ نے داؤد خاں کو لاہور بلا لیا تھا چنانچہ اورنگ زیب کی فوج بلا روک ٹوک دریا کے پار اتر گئی، اور تب داؤد خاں فوج کا ایک دستہ لیکر دریائے بیاس کو روانہ ہوا لیکن وہاں پہنچکر جب اس نے دیکھ بھال کی تو وہ مقام جنگ کے لئے بیکار نظر آیا جس کی اطلاع دارا شکوہ کو دی گئی تو اس کے جواب میں داؤد خاں کو سپہر شکوہ کے ساتھ گوبند وال[3] روانہ ہونے کا فرمان آیا کہ وہاں جا کر وہ غنیم کی فوج کو روک دے۔

داؤد خاں گوبند وال پہنچا، لیکن قبل اس کے کہ اورنگ زیب کی فوج وہاں آئے دارا شکوہ نے اپنے بیٹے سپہر شکوہ کو لاہور بلا لیا اور اس کو اپنے ساتھ لیتا ہوا موتو بھانہ[4] کل سامان جنگ اور گراں بہا اسباب ملتان روانہ ہو گیا، اور داؤد خاں کو حکم دیتا گیا کہ وہ دریا کے کنارے کچھ دنوں قیام کرے اور جس قدر کشتیاں نظر آئیں ان کو غرق کرتا ہوا پھر دارا شکوہ سے آ کر مل جائے۔ داؤد خاں نے اپنے آقا کی ہدایتوں پر عمل کیا اور ملتان پہنچکر دارا شکوہ سے مل گیا، لیکن غنیم نے یہاں پر پھر آ لیا اور دارا شکوہ کو مجبوراً بھکر[5] روانہ ہونا پڑا۔ یہاں پہنچکر اوائل ماہ محرم الحرام ۱۰۶۹ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۶۵۸ء میں داؤد خاں اور دوسرے سپاہی دارا شکوہ سے کٹ کر الگ ہو گئے۔ داؤد خاں جالیمر[6] ہو کر اپنے وطن حصار فیروزہ کو روانہ ہو گیا۔ دارا شکوہ نے کچھ دنوں بھکر میں قیام کیا اور پھر ۲۹ صفر کو دریائے سندھ عبور کر کے گجرات چلا گیا۔

شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب کی ملازمت میں دارا شکوہ کے میدان سے ہٹ جانے کے بعد مغلیہ سلطنت کی درخشندہ سپاہ بھر جمع ہوئی۔ نامی گرامی سرداروں کو معافیاں عطا ہوئیں اور وہ رفتہ رفتہ پرچم عالمگیری کے گرد جمع ہونے لگے۔ چنانچہ ۲۰ ربیع الاول مطابق ۲۳ ماہ دسمبر ۱۰۶۹ھ / ۱۶۵۹ء[7] کو داؤد خاں اورنگ زیب کے دربار میں حاضر ہوا، جہاں اس کو ایک قیمتی خلعت، تلوار اور منصب چار ہزاری عطا ہوا۔ اسی تاریخ سے اس

---

[1] اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی جنگ کے حالات کے لئے عالمگیر نامہ قلمی نسخہ صفحات ۱۹۲ تا ۲۲۰ و مراۃ السلاطین (ترجمہ سیر المتاخرین) جلد اول

[2] یہ مقام موجودہ ضلع جالندھر میں واقع ہے۔

[3] بھکر یہ مقام ضلع میانوالی (پنجاب) کی ایک تحصیل ہے۔

[4] مآثر عالمگیری قلمی نسخہ صفحات ۱۱ تا ۱۶۔ [5] یہ مقام جودھپور (راجپوتانہ) میں واقع ہے۔

کی شاہی ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور دربار عالمگیری کے افسران و امراء میں اس کا شمار ہونے لگا۔ [1]

جنگ کجوا میں شرکت KHAJVHA

داؤد خاں ماہ ربیع الآخر مطابق ماہ جنوری سنہ ۱۰۶۹ھ میں اورنگ زیب کے ساتھ شاہ شجاع کے خلاف مہم میں شریک ہوا اور نہایت قابلیت و بہادری سے اور نگ زیب کی فوج یسار کی افسری کی اور جنگ کجوا میں اپنی ذاتی بہادریوں اور جانبازیوں کا ثبوت دیا۔ اس جنگ میں شاہ شجاع نے شکست کھائی اور میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ اورنگ زیب نے ایک جرار فوج اپنے لڑکے شہزادہ محمد سلطان کی ماتحتی میں شاہ شجاع کے تعاقب کے لئے روانہ کی اور نواب داؤد خاں و نیز دوسرے مشہور بہادروں نے اس مہم میں شہزادہ محمد سلطان کا ساتھ دیا۔ اپنی شکست کے بعد شاہ شجاع الہ آباد آیا اور یہاں سے ناخوش ہو کر اس کو بنگال کی طرف میں واپس پلٹنے جانا پڑا۔

باب دوسرا

پٹنہ (بہار) کی صوبہ داری

اس کے بعد نواب داؤد خاں کو ایک شاہی فرمان موصول ہوا جس کے رُو سے وہ پٹنہ (بہار) کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ اور اس ملازمت کے اعزاز کے علاوہ مزید ایک ہزار سوار دو اسپہ و سہ اسپہ اس کی ماتحتی میں دیئے گئے۔ چنانچہ وہ فی الفور پٹنہ روانہ ہو گیا۔ [2]

اس وقت نواب داؤد خاں کا پٹنہ کا صوبہ دار مقرر ہونا بہت بڑی سیاسی مصلحت پر مبنی تھا، اس لئے کہ ملک کی سیاسی حالت یہ تھی کہ اورنگ زیب کی شاہی عالم تزلزل میں تھی اور تھوڑے ہی دنوں پہلے داؤد خاں دوسرے دعویدار تخت یعنی دارا شکوہ کی جانب سے خود اورنگ زیب کے خلاف لڑ چکا تھا اور گرچہ اورنگ زیب کے حریف (دارا شکوہ) کو شکست ہو چکی تھی، لیکن وہ اس وقت تک زندہ تھا، یہ باتیں ہرگز کسی طرح خطرے سے خالی نہ تھیں، ماسوا اس کے ملک کے تقریباً کل صوبوں میں شہزادوں یعنی شاہجہاں کے بیٹوں کی آپس کی جنگ و جدال اور تاج و تخت کو حاصل کرنے کی سعی میں عام شورش اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی، ایسی حالت میں عالمگیری سلطنت کے کل نظم کا درہم برہم ہو جانا لازمی تھا اور مقامی سرداروں اور امراء کا بغاوت کرنا اور اورنگ زیب کی حکومت سے برگشتہ ہو جانا حد درجہ قرین قیاس تھا اور اس پر مزید طرہ یہ تھا کہ شاہ شجاع صوبے کے اندر اور باہر طرح طرح کے فسادات برپا کرنے میں دن رات مصروف تھا۔

اس لئے اس پر آشوب زمانہ میں صوبہ بہار کی حکمرانی کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو صوبے کے کل حالات سے اچھی طرح واقف ہو اور حکومت و نظم سلطنت کی ذاتی لیاقت رکھتا ہو اور ساتھ ہی ساتھ جنگ آزمودہ اور بہادر ہو تاکہ وہ شاہ شجاع کی بخوبی روک تھام، باغیوں کو سزا اور عام رعایا کو اپنی سیاسی چال اور صلح کن روش سے رام کرے۔

نواب داؤد خاں قریشی میں یہ کل صلاحیتیں موجود تھیں کیونکہ اس کے پہلے وہ دارا شکوہ کی ملازمت میں صوبہ بہار کے حالات اور یہاں کے باشندوں سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا، اسلئے کہ دارا شکوہ شاہجہاں کے طرح دئے جانے سے ملک کے کئی صوبوں کی حکومت اور نظام سلطنت میں دخل اندازی کیا کرتا تھا، علاوہ اس کے نواب داؤد خاں قریشی بذات خود اپنی لیاقت حکومت و نظم سلطنت کا جبکہ وہ فوجدار تھا اور راہداری کی خدمت اس کے سپرد کی گئی تھی، کافی ثبوت دے چکا تھا اور اورنگ زیب اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ شخصی حکومت میں

---

[1] شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب کی ملازمت کے متعلق مندرجہ بالا چند سطریں عالمگیر نامہ قلمی نسخہ کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ صفحات ۲۲۱ تا ۲۳۱ سے ماخوذ ہیں۔ لیکن تاریخ مراۃ العالم قلمی نسخہ (مملوکہ محترمی سید حسن عسکری پروفیسر شعبہ تاریخ پٹنہ کالج) کے صفحہ ۶۱۱ پر اورنگ زیب کی ملازمت کے ضمن میں یہ مندرج ہے کہ تاریخ ۷ ربیع الاول کو نواب داؤد خاں قریشی، امیر خاں سردار کی مساعدت میں آستان بوس عالمگیر ہوا اور اس کو ایک خلعت فاخرہ و نیز باساز مینا چار ہزاری سہ ہزار سوار عطا ہوا۔ ان دونوں قلمی نسخوں میں تاریخ کا اختلاف غالباً ۷، ۱۰ یا ۱۲ کی کتابت سو پیش آگیا صحیح ۱۲ ربیع ہے جس کا قطعی فیصلہ عیسوی تاریخ سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ [2] یہ مقام موجودہ ضلع فتح پور میں واقع ہے۔ [3] عالمگیر نامہ قلمی نسخہ صفحہ ۲۸۶

افسر حکومت کے چال چلن، روش، چال ڈھال اور اندرونی حالات سے باخبر ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ داؤد خاں بڑی خوبی سے عظیم آباد کی صوبہ داری کے فرائض کو انجام دینے لگا۔

شاہ شجاع سے جنگ و فتح بنگالہ

۱۰۶۹ھ (۱۶۵۹ء) میں شہزادہ محمد سلطان (پسر اورنگ زیب) جو شاہ شجاع کی سرکوبی کیلئے بھیجا گیا تھا (جس کا ذکر جنگ کھجوہا کے ضمن میں گذر چکا ہے) ٹانڈہ[1] پہنچکر اچانک شاہ شجاع سے مل گیا۔ جب یہ خبر اورنگ زیب کو ملی تو اس نے نواب داؤد خاں کے نام یہ ضروری فرمان جاری کیا کہ وہ سارا لشکیان و تابعان کو ہمراہ لیکر معظم خاں (میر جملہ) کی مدد کیلئے (جو شاہ شجاع اور شہزادہ محمد سلطان کا تعاقب کر رہا تھا) فوراً پٹنہ پہونچ جائے۔ چنانچہ اس فرمان کو پاکر نواب داؤد خاں اپنے بھتیجے محمد حیات کو ڈیڑھ ہزار سوار اور دو ہزار پیدل سپاہیوں کے ساتھ پٹنہ میں اپنا قائم مقام چھوڑ کر فوراً دریائے گنگا کے پار اتر گیا اور جس قدر کمک و امدادی فوج مل سکی ساتھ لیتا گیا[2] لیکن برسات شروع ہو چکی تھی اسوقت سفر کرنا نہایت دشوار تھا اور شدت بارش سے دریائے کوسی میں طغیانی کے باعث اطراف و جوانب کی کل سرزمین تہ آب ہو گئی تھی اور بغیر کشتیوں کے فوج کا لے جانا ممکن نہ تھا اس لئے داؤد خاں بھاگلپور کے قریب موضع قاضی گریہ میں ٹھہر گیا، لیکن شاہ شجاع نے دریا پار ہو کر اکبر نگر اور راج محل پر قبضہ کر لیا تو داؤد خاں بھی جرأت ذاتی سے استفادہ کر کے گنگا کے اس پار اتر آیا اور بھاگلپور اور کہل گاؤں کے درمیان کچھ دنوں پڑاؤ ڈالے رہا اور جب دریا اتنا پر آیا تو معظم خاں (میر جملہ) اور شاہ شجاع میں بڑے معرکے کی لڑائی ہوئی جس میں شاہ شجاع ہار کر مرشد آباد کی جانب روانہ ہوا اس عرصے میں داؤد خاں پھر گنگا سے پار اتر کر شمال کی جانب بڑھا اور شاہ شجاع نے دریائے کوسی کے کنارے جو مورچال (دھنس) بنا رکھی تھی اس کو توڑ ڈالا اور محاذ قطبین کے سردار کو مار ڈالا[3]

جب یہ خبر شاہ شجاع کو ملی تو اس نے مرشد آباد جانے کا ارادہ فسخ کر کے دوبارہ جنگ کے ارادہ سے ایک ایسے نالے کے قریب قیام کیا جس کے تین طرف دلدل تھا اور توپخانہ لگا کر خود مع فوج و سوار اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اسی روز معظم خاں تھی (جو شاہ شجاع کے تعاقب میں چلا آ رہا تھا) اس مقام پر پہنچا و نیز حسن اتفاق سے دن گزر کر رات کو اسی روز داؤد خاں بھی مع اپنی فوج کے معظم خاں (میر جملہ) کی فوج سے جا ملا۔ تین روز تک جنگ رہی آخر روز شام کو شاہ شجاع پسپا ہو کر پیچھے بھاگنے لگا اور داؤد خاں و معظم خاں اس کے تعاقب میں آگے بڑھتے گئے اور اس طرح تعاقب ہی کی حالت میں[4] راجمحل مالدہ اور بنگال کے دوسرے مقامات کو داؤد خاں فتح کرتا گیا اور شاہ شجاع نے

---

[1] یہ مقام موجودہ ضلع فیض آباد (اودھیا) میں ہے [2] شاہزادہ محمد سلطان کے شاہ شجاع سے مل جانے کے متعلق صاحب سیر المتاخرین کا بیان ہے کہ جیکہ اورنگزیب داراشکوہ کا بتجاب کے علاقہ میں تعاقب کر رہا تھا اور محمد سلطان شاہجہاں آباد (دہلی) میں رہکر انتظام و انصرام کی نگہداشت کر رہا تھا تو اسوقت شاہ شجاع نے موقعہ غنیمت پاکر پوشیدہ مراسلات کے ذریعہ شہزادہ محمد سلطان سے اپنی لڑکی کو بیاہ دینے کا قول و قرار کر لیا تھا۔ اورنگ زیب جب مراجعت فرمائے دہلی ہوا تو اسکو شاہ شجاع کی نسبت اپنے خلاف فوج کشی کی خبر ملی تو اس نے شہزادہ محمد سلطان کو ایک دستہ فوج کے ساتھ اسکی سرکوبی کے لئے روانہ کیا، شاہ شجاع نے شہزادہ محمد سلطان کی آمد کی خبر سے خوش ہو کر اپنے چھوٹے بیٹے بلند اختر کو جان بیگ کے ہمراہ اس کے استقبال کیلئے بھیجا اور اپنی لڑکی کے نکاح کا سامان شہزادہ محمد سلطان کے ساتھ ٹانڈہ میں کیا اور اپنے ملازم سراج الدین میر علاء الدولہ دیوان اور محمد باقر میر سامان وغیرہ کو حکم دیا کہ شادی کا انصرام کریں تاکہ بعد نکاح شہزادہ محمد سلطان کو خوشنودی اور ہا بدولت کو بھی حاصل ہو (مراۃ السلاطین ترجمہ سیر المتاخرین مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ماہ جون ۱۸۹۸ء مطابق ماہ صفر ۱۳۱۶ھ جلد اول صفحات ۴۰۵ و ۴۰۶)۔

[3] مذکورہ بالا حالات عالمگیر نامہ قلمی نسخہ صفحہ ۵۱۳ و سیر المتاخرین قلمی نسخہ صفحہ ۳۲۷ سے ماخوذ ہیں لیکن یہاں پر بطور تعلیق تاریخ مراۃ العالم قلمی نسخہ (مصورہ محترمی سید حسن عسکری پروفیسر تاریخ پٹنہ) صفحہ ۴۶۶ کی عبارت بھی نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتی ہے "داؤد خاں صوبہ دار بہار بموجب فرمان واجب الاذعان شیخ محمد حیات برادر زادہ را باجمعی بنیات خود در پٹنہ گذاشتہ خود با رشید خاں و مرزا خان و ہادی داد خان و سائر کومکیان صوبہ بہار عزۂ مبارک رمضان از گنگ گذشت ..... [4] مراۃ السلاطین مذکور جلد اول صفحہ ۴۰۵ [5] مراۃ السلاطین (ترجمہ سیر المتاخرین مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۹۸ء ۱۳۱۶ھ جلد اول صفحات ۳۹۶ تا ۳۹۰۔ و عالمگیر نامہ قلمی نسخہ صفحات ۵۱۳ تا ۶۶۰ اور سیر المتاخرین قلمی نسخہ صفحات ۳۲۷ تا ۳۳۰۔

جب اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نہ دیکھی تو آخر کار وہ اراکان بھاگ گیا۔

داؤد خاں قریشی چونکہ اس جنگ میں میر جملہ کے ساتھ مل کر برابر لڑتا رہا۔ اور اس مہم میں اُس نے اپنی بہادریوں اور دلیریوں کی بدولت بہت کچھ وثوق حاصل کر لیا تھا اس لئے اس جنگ کے فتح ہو جانے کے بعد شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب نے اسکو اپنے دربار شاہی میں طلب فرما کر سات پارچے کا خلعت، ایک زنجیر فیل، ایک مرصع جمدھر (کٹار) و نیز نواب کے معزز خطاب سے سرفراز فرمایا۔

تسخیر پلاموں اور سلطنت مغلیہ سے اس کا الحاق

نواب داؤد خاں قریشی جتنے دنوں (یعنی ۱۰۶۹ھ بمطابق ۱۶۵۹ء تا ۱۰۷۴ھ بمطابق ۱۶۶۴ء) پٹنہ (بہار) کا صوبہ دار رہا اتنی مدت میں سب سے بڑا کام جو اُس نے کیا وہ علاقۂ پلاموں کی تسخیر اور اس کا سلطنت مغلیہ سے ملحق کرنا تھا اور اس مہم میں یہ بات خوب اچھی طرح ثابت ہو گئی کہ وہ بہت بڑا جنگجو، جانباز، زود تجویز اور ایک قابل حکمران تھا۔

کسی زمانہ میں پلاموں کا علاقہ رکسل راجپوتوں کے زیر اثر تھا لیکن ۱۶۳۳ء عیسوی میں چیرو قوم کے سردار بھگونت رائے نے اپنی قوم کی مدد سے رکسل راجپوتوں کو نکال کر اس علاقے کو خود اپنے زیر نگیں کر لیا۔ اسوقت سے ۱۶۶۱ء تک چیرو قوم اس علاقے میں آزادانہ حکومت کرتی رہی[1]۔ چنانچہ راقم السطور تسخیر پلاموں کے ضمن میں جس زمانے کا ذکر کرنا چاہتا ہے اُس زمانے میں پلاموں کا علاقہ موجودہ ضلع پلاموں سے دستمبر میں بہت بڑا تھا اور پٹنہ سے اتنی میل جنوب اسکی شمالی حد قرار دی جاتی تھی، یہ پورا علاقہ پہاڑیوں اور گھنے جنگلوں سے معمور تھا اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ زیادہ جو قوم یہاں آباد تھی اس کا نام بیرو تھا جن کا سردار راجا میدنی رائے نامی ۱۶۶۹ء سے نہایت زور شور کے ساتھ فرماں روائی کر رہا تھا اور اپنے علاقہ کو گیا سے لے کر ہزاری باغ اور ریاست سرگوجا (سی پی) تک بڑھا لیا تھا، اپنے علاقے میں اس نے متعدد قلعے بنوائے تھے، تا آنکہ نواب داؤد خاں قریشی صوبہ دار پٹنہ (بہار) نے شہنشاہ اورنگ زیب کے حکم سے ۱۶۶۱ء میں فوج کشی کر کے دوسرے سال یعنی ۱۶۶۲ء میں اس علاقے کو سلطنت مغلیہ کے زیر اثر کر لیا (جس کا مفصل ذکر ہم آگے کریں گے) اور پھر ۱۷۷۲ء سے یہ علاقہ گورنمنٹ برطانیہ کے قبضہ و دخل میں آ گیا[2]۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے چیرو قوم بالکل خود سر اور اپنے علاقے کی تنہا مالک و مختار تھی، شاہی حکام کی نظروں میں کوئی وقعت نہ رکھتے تھے اور چونکہ یہ لوگ قلعہ بند رہا کرتے تھے جہاں کسی کا پہنچنا نہایت دشوار تھا اسلئے وہ شاہی علاقوں میں دلیرانہ لوٹ مار کیا کرتے تھے۔

اول اول شاہجہاں کے زمانۂ حکومت میں شائستہ خاں جو اُسوقت پٹنہ کا صوبہ دار تھا ۱۰۵۱ھ بمطابق ۱۶۴۱ء میں ایک بڑی فوج لیکر چیروں کے سردار پرتاپ ابن بالا بھدر چور کی سرزنش کے لئے روانہ ہوا تھا لیکن اسکو پوری کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ تاہم شائستہ خاں نے آٹھ ہزار روپئے خراج وصول کر لئے تھے مگر اس کے بعد پھر کوئی خراج ان لوگوں نے خزانۂ شاہی میں داخل نہیں کیا تھا اس لئے داؤد خاں کو شاہی فرمان موصول ہوا کہ وہ اپنی کل فوج نیز امدادی فوج کے ساتھ پلاموں کو روانہ ہو اور اسکو فتح کر کے سلطنت مغلیہ میں ملحق کر لے۔

اس فرمان کو پا کر نواب داؤد خاں دوسری شعبان المعظم ۱۰۷۱ھ ہجری مطابق ۲۳ ویں مارچ ۱۶۶۱ء عیسوی کو پلاموں روانہ ہوا اور اپنے ساتھ مرزا خاں فوجدار رہتاس، تہور خاں برلاس جاگیردار چین پور (علاقہ سہسرام) اور راجا بہروز زمیندار مونگیر کو لے لیا اور فوج شاہی کے علاوہ زمینداروں اور صوبے کی امدادی فوج کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔

پلاموں کا شہر پٹنہ سے سو میل کی فصل پر تھا، شہر کے گرد و نواح میں دو بڑے بڑے قلعے واقع تھے، ایک تو قریب کی پہاڑی پر کھڑا دور تک نگراں تھا اور دوسرا سرزمین پر قلعہ سے مقابلے کے لئے قدم جمائے اپنی شان دکھا رہا تھا۔ ان دونوں قلعوں کے نیچے ارگا نامی ایک زخار ندی موج زن تھی اور ہر چہار جانب اونچے اونچے پہاڑ، گھنے اور خوفناک جنگلوں کے علاوہ اور تین بڑے بڑے قلعے پہاڑ کی سرحد پر واقع تھے جن کے نام ملاحظہ ہوں:۔

(۱) قلعۂ کوٹی[3]۔ جو قلعۂ پلاموں سے چالیس میل اتر تھا

---

[1] پلاموں گزیٹیر زبان انگریزی مطبوعہ ۱۹۰۷ء [2] پلاموں گزیٹیر مطبوعہ ۱۹۰۷ء [3] گورنمنٹ آف انڈیا کے اٹلس کی فرد نمبر ۱۰۴ کے رو سے اس قلعے کا محل وقوع موجودہ ضلع گیا کے مشہور قصبہ نام گنج سے چوبیس دکھن چوکی اور مورہر ندیوں کے سنگم پر پایا جاتا ہے۔ (ہسٹری آف اورنگ زیب مصنفہ سرجدوناتھ سرکار جلد سوئم فٹ نوٹ صفحہ ۳۹)

(۲) قلعہ کونڈا[1] - جو قلعہ کوٹھی سے پورب اٹھارہ میل پر واقع تھا۔
(۳) قلعۂ دیوگن - جو کوٹھی سے تقریباً بائیس میل پچھم واقع تھا۔

نواب داؤد خاں نے پہلے قلعۂ کوٹھی کو دخل کرنے کی ٹھان لی چنانچہ پانچویں رمضان المبارک ۱۰۷۱ھ (مطابق ۲۴ ویں اپریل ۱۶۶۱ء) کو وہ اس قلعے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ چیروں کے قلعہ داروں کو جب خبر ملی کہ ایک بڑی جرار فوج اُن سے مقابلے کے لئے آ گئی ہے تو وہ گھبرا کر حواس باختہ ہو گئے اور فوراً قلعے کو چھوڑ کر فرار کر گئے، اس طرح یہ قلعہ بلا کسی جنگ کے داؤد خاں کے قبضے میں آ گیا اور داؤد خاں اس قلعے پر اپنا تسلط جما کر قلعۂ کونڈا کو فتح کرنے کے لئے آگے بڑھا۔

یہ قلعہ ایک پہاڑی کے اوپر واقع تھا اور اسکی محافظت کے لئے چیروں کی ایک بڑی فوج وہاں موجود تھی اور یہاں سامان و آلات جنگ بھی کافی مقدار میں موجود تھے اور گرچہ یہ قلعہ کوٹھی کے قلعے سے صرف اٹھارہ میل پر تھا لیکن راہ نہایت دشوار گذار تھی گھنے جنگلوں کے علاوہ دس میل تک نہایت تنگ راستہ تھا جو پہاڑیوں سے ہو کر قلعے تک جاتا تھا، اس لئے داؤد خاں کو نہایت مشکل آن پڑی۔ پہلے تو وہ جنگلوں کو کٹوا کر سڑک بنواتا تھا اس کے بعد فوج کو لے کر آگے بڑھتا تھا اس طرح ابھی دو ہی میل تک جنگل کاٹ کر جوں ہی فوج آگے بڑھی چیرو یہ خبر پا کر گھبرا گئے اور خوف زدہ ہو کر اس قلعے کو بھی چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ چوتھی شوال المکرم مطابق ۲۳ ویں مئی ۱۰۷۱ھ ۱۶۶۱ء کو داؤد خاں یہاں پہنچا اور اس قلعے پر اپنا عمل درآمد کر لیا۔

اس قلعہ کے محل وقوع کی اہمیت کا لحاظ کر کے داؤد خاں نے اسکو آلات حرب و سامان مدافعت سے بالکل خالی کر دیا، لیکن چونکہ اس وقت برسات شروع ہو گئی تھی اسلئے داؤد خاں نے تا موسم برسات یہاں قیام کرنے کا ارادہ کر لیا اور کونڈا اور کوٹھی کے درمیان برسات آٹھ میل پر اُس نے مٹی کے قراول خانے بنوائے اور ان میں سے ہر ایک میں ایک سو سواروں کو چند بندوق چلانے والے زمیندار افسروں کے ساتھ قیام کرنے کا حکم دیا اور انہیں ہدایت کی کہ سڑک کی محافظت کے علاوہ جس قدر بھی رسد آئے اس کو اپنی نگرانی اور حفاظت میں لے آئیں۔

جب برسات ختم ہو گئی تو داؤد خاں نے قلعۂ پلاموں پر حملہ کرنے کی تیاریاں کیں، چیروں کے سردار کو جب یہ خبر ملی کہ حملہ آور فوج آگے بڑھتی چلی آ رہی ہے تو اُس نے داؤد خاں کو پیغام دیا کہ وہ سالانہ خراج دیا کریں گے اور آئندہ شاہی حکومت کے ماتحت رہیں گے بشرطیکہ شاہی فوج بغیر کسی مزید اقدام کے فوراً واپس چلی جائے۔ داؤد خاں نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا اور جنگ کی پوری تیاریاں کر کے یکم ربیع الاول مطابق ۱۵ ویں اکتوبر (۱۰۷۲ھ ۱۶۶۱ء) کو قلعۂ پلاموں کی جانب روانہ ہو گیا۔

تین سو سوار اور دو سو پیادوں کے ساتھ مرزا خاں کو آگے کی فوج کا سردار مقرر کیا، تہور خاں برلاس کو سات سو سوار اور اور تین سو پیادوں کے ہمراہ فوج کے داہنے بازو کی افسری سپرد کی اپنے بھانجے شیخ تاتار کو پانچ سو سواران جانباز کے ساتھ اور راجا ہرو رتو چار سو سواروں اور پندرہ سو پیادوں کے ہمراہ فوج کے بائیں بازو کی کمان دی اور قلب لشکر میں خود داؤد خاں ایک ہزار سواروں کے ساتھ جم گیا اور شاہی فوج و نیز اپنے ملازمین کی ماتحتی میں جنگل کاٹ کر پلاموں تک سڑک بنانے کی خدمت سپرد کی تاکہ غنیم اس میں چھپ کر جاتی ہوئی فوج پر حملہ نہ کر سکیں نیز راہ میں جا بجا چوکیاں بھی بٹھائیں جن میں مسلح سپاہی حفاظت کیلئے متعین کر دئے۔

غرض اس طرح فوج مختصر تھوڑی دور تک روزانہ بڑھتی چلی، آگے تو جنگل کاٹ کر سڑک بنتی جاتی اور پیچھے سارا لشکر قدم بہ قدم بڑھتا جاتا تھا اور جہاں کہیں شام کو فوج قیام کرتی وہاں کھائی (خندق) کھود کر دشمنوں کے شب خون سے بچنے کا انتظام کیا جاتا یہاں تک کہ نو دنوں میں بیس میل کی مسافت اسی طرح طے ہوئی چنانچہ نویں ربیع الاول (مطابق ۲۴ ویں اکتوبر ۱۰۷۲ھ ۱۶۶۱ء) کو داؤد خاں کی فوج نے ٹہرنی[2] گاؤں تک پہنچ کر

---

[1] اس قلعے کے خستہ آثار اب تک پائے جاتے ہیں نیز فی زمانہ کونڈا نام کا ایک بڑا گاؤں بھی آباد ہے۔ جہاں چیرو قوم کا ایک راجا رہتا ہے اور ان اطراف کا علاقہ اسی کی زمینداری میں ہے

[2] عالمگیر نامہ قلمی نسخوں کی فارسی عبارت میں لفظ ٹہرسی لکھا ہوا ہے مگر سرجادوناتھ سکار نے اپنی تصنیف ہسٹری آف اورنگ زیب کے جلد سوم میں انڈین اٹلاس کے حوالے سے اسکو کاتب کی غلطی بتاتے ہوئے ٹوھرسی لکھا ہے نیز موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسٹر بلوک مین BLOCHMANN نے اس مقام کو توھاسی TARHASI لکھا ہے۔ ناچیز کو مسٹر بلوک مین کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ پلاموں ضلع کے موجودہ نقشہ میں ترھاسی مندرج پایا جاتا ہے۔

اپنا پڑاؤ ڈال دیا جہاں سے پلاموں کا قلعہ دکھن پچھم سمت میں صرف سترہ یا اٹھارہ میل کے فاصلہ پر رہ جاتا ہے۔

داؤد خاں کی فوج کے اس مقام پر اترنے کے بعد چیروں کا سردار میدنی رائے گھبرا اٹھا اور اپنے معتمد و خیر خواہ وکیل سورت سنگھ کو داؤد خاں کے پاس بھیجا (جس نے راجا بہروز کو اپنی سفارش کئے جانے سے قبل سے ملازم رکھا تھا) اور سردار قوم نے اپنی ماتحتی کا یقین دلاتے ہوئے استدعا کی کہ اس سے دوستانہ سلوک کیا جائے اور ساتھ ہی یہ پیغام دیا کہ اگر اسکی استدعا منظور کی جائے گی تو وہ ایک لاکھ روپیہ شہنشاہ اورنگزیب کی خدمت میں پیش کرے گا اور پچاس ہزار روپیہ نقد داؤد خاں کو دے گا۔

داؤد خاں نے اورنگ زیب کو اس تجویز کی اطلاع دی اور جواب کا انتظار کرتا رہا لیکن اس عرصے میں اس کو خبر ملی کہ سترہ اٹھارہ میل کی فصل پر غنیم نے حملہ کر دیا ہے اور اسکی فوج کے لئے جو رسد آرہی تھی وہ کل لوٹ لی گئی۔ چیروں کے سردار یعنی پلاموں کے راجا نے اپنے وکیل کی معروضات اس جرم کی بہت کچھ معذرت کی اور یقین دلایا کہ یہ لوٹ مار اسکی اطلاع اور حکم کے ہوئی ہے اور اس زبانی معذرت کے ساتھ ایک لاکھ روپیہ جو اس نے پیشکش کرنے کا وعدہ کیا تھا اس میں سے پچاس ہزار روپیہ نقد داؤد خاں کے پاس بھیجدیا تاکہ داؤد خاں آزردہ اور غضبناک نہ ہو۔ مگر راجا کی یہ معذرت قبول نہیں کی گئی اور داؤد خاں اس نجرمانہ گستاخی کی بنا دی پر آمادہ ہوگیا اور نہری سے وہ ۱۲ ویں ربیع الاول مطابق ۲۷ ویں اکتوبر سنہ ۱۶۶۱ء کو روانہ ہوکر قلعۂ پلاموں سے سات آٹھ میل کی فصل پر ایک کوہستانی میدان میں پہنچکر ٹھہرا۔ سولہویں ربیع الاول مطابق ۳۱ ویں اکتوبر کو وہ دو میل اور آگے بڑھا اور اپنا پڑاؤ ڈالدیا۔

غنیم قلعے کے باہر نکل آئے اور داؤد خاں کی فوج سے ایک میل کے فصل پر اپنا پڑاؤ جمایا اور خندق کھود کر مدافعت کی تیاریاں کرانے لگے اس عرصے میں شاہی فرمان داؤد خاں کی اطلاع دہی کے جواب میں آگیا اور وہ یہ تھا کہ اگر پلاموں کا راجا اسلام قبول کرے تو اسکی استدعا منظور کی جائے گی ورنہ نہیں[1]

داؤد خاں نے اس فرمان سے راجا کو مطلع کر دیا اور اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا لیکن اسکی فوج جنگ کرنے کے لئے بیتاب تھی اور بیکار پڑی رہنے سے اکتا گئی تھی چنانچہ ۲۴ ویں ربیع الثانی (مطابق ۷ ویں دسمبر سنہ ۱۶۶۱ء) کو داؤد خاں کو اطلاع دئے بغیر تہور خاں برلاس نے غنیم پر حملہ کر دیا۔

داؤد خاں یہ خبر پاکر فوراً آگے بڑھا اور دشمن کی فوج سے صرف ایک گولی کے فاصلے پر ٹھہر گیا اور پھر وہاں سے اس نے غارت و تباہ کرنے کے لئے آگے بڑھا تو نیچے دن سے غروب آفتاب تک جنگ ہوتی رہی۔ تہور خاں برلاس چونکہ غنیم کی فوج کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا اس لئے اس کے سولہ جانباز سپاہی مارے گئے اور پچاس جوان زخمی ہوئے۔ اور اندھیرا ہو جانے کے بعد حملہ آور فوج اپنی قیام گاہ پر پلٹ آئی۔

سوتی رات کو غنیم دو توپیں قلعے سے باہر لائے اور داؤد خاں کی فوج پر گولا باری شروع کر دی، چند سوار اور سپاہی اور کئی گھوڑے مارے گئے۔ داؤد خاں کی فوج چونکہ نشیب میں تھی اس لئے غنیم کی اس گولہ باری سے ان کا بچنا نہایت دشوار ہوگیا اور انکی حیات کا دارومدار محض دشمن کے رحم پر قرار پایا۔ جب صبح ہوئی تو داؤد خاں نے غنیم کا پڑاؤ چھین لیا اور بڑے غضبناک حملے کئے۔ غنیم نزدیک کی پہاڑی کی چوٹیوں پر چڑھ گئے اور خوب تلوار چلی۔ داؤد خاں نے بھی اپنی توپوں کو چڑھایا اور دشمن کی فوج پر گولا باری شروع کر دی۔ ستائیسویں (ربیع الثانی ۲۷ ویں دسمبر) سے دشمن اپنی ہمت ہار کر پیچھے بھاگنے لگے اور ارکا ندی کے کنارے جو زیریں حصہ پر رہی تھی جا کر قیام کیا۔

داؤد خاں کی فوج سے دشمن کی کھائی تک جو راستہ تھا وہ نہایت دشوار گزار تھا اور گھنے جنگل ہو کر جاتا تھا جس کے صاف کرنے میں دو تین روز گزر گئے۔ تا اینکہ جب یہ راستہ فوج کے گزرنے کے قابل ہوگیا تو یکم جمادی الاولیٰ (۱۳ ویں دسمبر سنہ ۱۶۶۱ء) کو داؤد خاں حملہ کرنے کی غرض سے آگے بڑھا اور اپنے دونوں برادر زادوں شیخ تاتار اور شیخ احمد کو چند شاہی منصب دار اور راجا

[1] عالمگیر نامہ اور مآثر عالمگیری اور اورنگ زیب (مصنفہ سر جادوناتھ سرکار) جلد سوم۔

بہروز کے لڑکے کے ساتھ ایک ہزار فوج کے ہمراہ جس میں مرزا خاں کی فوج کے سپاہی بھی شامل تھے لشکر کا بایاں بازو قرار دیا اور انکو حکم دیا کہ پہاڑیوں سے ہو کر غنیم پر حملہ کریں اور فوج کے دوسرے دستے کے ساتھ شیخ شفیع کو داہنے بازو پر مقرر کیا اور خود مرزا خاں، تہور خاں، راجا بہروز، ابوسلم اور سید انجا بہت وغیرہ کو جو نہایت بہادر و جانباز شاہی منصب دار تھے ساتھ لیکر قلب لشکر میں رہا اور اس طرح تین جانب سے دشمن پر حملے ہوئے۔ یہ لڑائی مسلسل چھ گھنٹے گرم رہی۔ داؤد خاں کے جانباز سپاہیوں نے کئی موقعوں پر نہایت دلیری کے کام کئے اور آخرش فتح پائی۔ غنیم بے شمار مارے گئے اور زخمی ہوئے لیکن انکی زیادہ تعداد پہاڑوں اور جنگلوں میں فرار ہو گئی اور کچھ جو بچ رہے وہ حصار شہر کے اندر پناہ گزیں ہو گئے۔

اس لڑائی کے بعد داؤد خاں کا ارادہ تھا کہ وہ غنیم کی کھائی پر قبضہ کرلے اور پھر کچھ دم لے کر قلعے کو اُن سے چھین لے لیکن داؤد خاں کے سپاہیوں پر ایک جوش کا عالم طاری تھا اور وہ اپنی کامیابی پر اسقدر خوش اور نازاں تھے کہ آخر نہیں رک سکے اور فوراً ہی حصار شہر پر حملہ کر دیا اور آگ کا تندی سے یلغار ہو کر شہر کی دیواروں پر پہنچے نہایت جوش و خروش میں حملے کرتے گئے۔ غنیم نہایت سراسیمگی و اضطراب کی حالت میں پسپا ہو گئے اور نہایت پریشانیوں اور دشواریوں سے اپنی جانیں بچا کر جنگلوں اور پہاڑوں میں بھاگ گئے۔

راجا نے کل گراں بہا اسباب، رسد اور آلات حرب سے قلعے کو خالی کر دیا اور نہایت عجلت سے اپنی کل عورتوں اور بچوں کو جنگل میں بھیجدیا اور خود چند جانباز سپاہیوں کے ساتھ قلعے میں جو نہایت دشوار گذار تھا۔ نہایت بہادری اور مستحکم ارادے کے ساتھ جنگ کے لئے ڈٹ گیا۔ بہادر حملہ آور حصار بیرونی کو توڑ کر شہر میں داخل ہو گئے اور قلعے کے دروازے تک پہنچکر اس کو توڑ ڈالا اور جوں ہی قلعے کے اندر داخل ہوئے راجا نے اُن پر نہایت جانبازی سے حملے کئے، خوب تلوار چلی اور یہ لڑائی نو بجے رات تک جاری رہی آخرش جب راجا کے رفقا ہارنے لگے تو ڈیڑھ بجے شب کو راجا قلعے کے چور دروازے سے نکل کر جنگل میں بھاگ گیا اور اس طرح دونوں قلعوں[1] کو حملہ آور فوج نے فتح کر لیا اور پلاموں کا پورا علاقہ داؤد خاں کے دخل میں آگیا۔ اس مہم میں نواب داؤد خاں کے اکسٹھ[2] سپاہی کام آئے اور ایک سو ستہتر زخمی ہوئے لیکن چیر و قوم کا کثیر نقصان ہوا اور اس کے بہت آدمی مارے گئے[3]۔

---

[1] پلاموں کے متذکرہ دونوں قلعوں کے آثار شکستہ پلاموں کے گھنے جنگلوں میں ہنوز موجود ہیں و نیز اُرگا ندی بدستور زیریں قلعہ موج زن ہے جس کو فی زمانہ یہاں جانے کا آسان راستہ ہو کر ڈالٹن گنج کے بعد تقریباً نو میل دور کیچکی KICHKI نام کا ایک ریلوے اسٹیشن ہے جہاں سے تقریباً چھ سات میل کی مسافت باقی رہ جاتی ہے جو اسکو یا بیل گاڑی سے ذریعے کی جاسکتی ہے۔ نیز ڈالٹن گنج سے بیکسر موٹر پر جایا جاسکتا ہے۔ سڑک پختہ اور عمدہ ہے اور کرایہ کی موٹریں بھی ملتی ہیں [2] تنخ پلاموں کے یہ حالات عالمگیر نامہ قلمی نسخہ دینر ہسٹری آف اورنگ زیب (مصنفہ سرجادوناتھ سرکار جلد سوم سے ماخوذ ہیں لیکن تاریخ داؤدیہ مصنفہ سید محمد ناصر بلگرامی مرحوم مطبوعہ اہنی پریس الہ آباد میں اس طرح مندرج ہے کہ "دوسرے دن قلعے کا پھاٹک کھلتے ہی داؤد خاں کی فوج درآنہ قلعے میں داخل ہو گئی اور داؤد خاں بذات خاص جہاں راجا پلاموں رسوئی بنا رہا تھا پہنچ گیا اور فوراً راجا کو مغلوب کر کے اپنا زانو اس کے سینے پر رکھدیا اور پیش قبض کمر سے نکال کر اس کے پہلو پر رکھدیا اسوقت ایک عجیب شور و غوغا بلند ہوا، راجا کے رفیقوں نے داؤد خاں پر وار کرنا چاہا یہ دیکھ کر داؤد خاں نے کہا کہ ہم تو جان دیکر اور سر ہتھیلی پر رکھ کر یہاں آئے ہیں مجھے مار ڈالنا کچھ مشکل نہیں لیکن ساتھ ہی اس کے راجا کی بھی خیریت نہیں ہے یعنی میری جان کے ساتھ راجا کی جان ہے۔ مجھ پر اگر کچھ آنچ آئی تو راجا کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔ شدہ شدہ یہ خبر راجا کے محل میں پہنچی اسکی ماں سر و پا برہنہ داؤد خاں کے سامنے آکر دست بستہ کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی کہ تیرے لڑکے کی جان بخشی کیجئے اور ہمو زن اسکے زر و جواہر قبول فرمایئے۔ داؤد خاں نے جواب دیا کہ ہم بطمع زر یہاں نہیں آئے ہیں راجا کو معہ خراج شاہی میرے ساتھ کر دو میں اس امر کی قسم کھاتا ہوں کہ جس طرح لئے جاتا ہوں اسی طرح ساتھ خیریت کے واپس بھی بھیجدونگا۔ غرضکہ راجا کو معہ خراج ہمراہ لے کر داؤد خاں دہلی روانہ ہو گئے۔ بعد طے مراحل و قطع منازل بارگاہ سلطانی مشرف ہوئے۔ چونکہ راجا عادت سے باغی و سرکش تھا اسلئے حکم اسکی گردن زدنی کا صادر ہوا یہ سنکر نواب داؤد خاں نے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ اسکی ماں کی حالت بیان کرتے ہوئے اسکی جان بخشی کا معروضہ پیش کیا اور خراج شاہی داخل درجے خزانۂ شاہی میں داخل کرادیا اور ایک روپیہ فی موضع خراج مقرر کرا کے راجا کو اسی جاہ و حشم کے ہمراہ لیکر دوبارہ پلاموں روانہ ہوئے اور راجا کو صحیح و سالم اسکے قلعہ میں بھیجدیا۔

[3] افسوس ہے کہ تاریخ داؤدیہ کے ماخذ کا علم نہ ہو سکا کہ اس کی جانچ پڑتال کی جاتی۔

داؤد خاں نے اپنی اس فتح کی یادگار میں قلعۂ پلاموں میں ایک مسجد تعمیر کرائی جو شکستہ حالت میں ہنوز موجود ہے اور جس کی دیوار پر مندرجہ ذیل شعر سے بطریق ابجد ۱۰۷۲ھ ہجری فتح پلاموں کی تاریخ نکلتی ہے۔ کندہ کرادیا ہے

گفت دراین بود پلاموں از بَرد حالیا داؤد خاں اسلام کرد
۱۰۷۲

بختاور خاں مصنف مراۃ العالم کا بیان ہے کہ نواب داؤد خاں کی اس گراں قدر کامیابی پر شہنشاہ محی الدین اورنگزیب نے اسکو خاص خلعت عطا کیا اور ان خدمتوں کا لحاظ کرکے اسکو مزید ترقی دی اور اب وہ پانچ ہزار سواروں کا افسر مقرر ہوا۔ نیز مصنف موصوف کا یہ بھی بیان ہے کہ فتح پلاموں میں داؤد خاں کو جو مال غنیمت ہاتھ لگا تھا اس میں دو ہاتھی بھی تھے جن کو اس نے شہنشاہ کی خدمت میں دہلی بھیجدیا اور شہنشاہ نے انکو شکار کے مصرف کے لئے مخصوص کر رکھا تھا[1]

اس کے بعد داؤد خاں وہاں کا انتظام درست کرکے اور اس علاقے کی حکومت منگلی خاں[2] کے سپرد کرکے اپنے صدر مقام پٹنہ کی طرف واپس لوٹا۔

قصبہ داؤدنگر کی بنا

صوبہ بہار میں داؤد خاں کا دوسرا کارنامہ قصبہ داؤد نگر (ضلع گیا) کی بناؤ تعمیر ہے۔ اس نے پلاموں سے پٹنہ واپس ہوتے ہوئے دریائے سون کے کنارے موجودہ ضلع گیا کے اینچھا[3] گاؤں کے قریب ایک چوکی قائم کرنے کے لئے سلوٹا بھکوری نامی ایک جنگلی مقام کا انتخاب کیا تاکہ سڑک پر آنے جانے والے مسافروں کے جان و مال کی محافظت ہوسکے کیونکہ یہ جگہ نہایت پرخطر اور مخدوش سمجھی جاتی تھی جہاں گھنے جنگلوں میں دہزنوں اور ڈاکوؤں کا قدیم مسکن تھا۔ اور یہ کہاوت کہ

"اینچھا لانگھے اور بھدوہی تب جانو گھر آئے پوتی"[4]

ان اطراف میں زبان زد ہر خاص و عام تھی۔ چنانچہ نواب داؤد خاں نے پہلے منگلوں کو بٹوا کر صاف کرادیا اس کے بعد ایک قصبے کی آبادی کا نقشہ جو حقیقت مخدوش ہونے مقام مذکور کی بطور ایک عرضداشت شہنشاہ کی منظوری کے لئے بھیجا۔ اورنگ زیب نے نقشہ و عرضداشت ملاحظہ فرمانے کے بعد مجوزہ قصبے کی آبادی کی منظوری کے ساتھ ساتھ اینچھا، منورہ اور گوہ تین پرگنے پلاموں کی فتح کے صلے میں داؤد خاں کو بطور جاگیر التمغہ عنایت فرمائے چنانچہ داؤد خاں نے ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۳ء میں وہاں پر ایک قصبے کی آبادی کی بنیاد ڈالی جو اس کے نام پر اب تک داؤد نگر کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ وہ قلعۂ کوٹھی میں فوج کا ایک دستہ بحیال محافظت چھوڑتا گیا جہاں بعد کو شدہ شدہ ایک بہت بڑا گاؤں آباد ہوگیا۔ جہاں کے موجودہ پٹھان باشندے اپنے کو داؤد خاں کے بہادر افغان سپاہیوں اور سرداروں کی اولاد بتاتے ہیں

باب تیسرا

اصلاحات صوبۂ بہار

داؤد خاں نے اپنی صوبہ داری بہار کے زمانے میں کون کون سے اصلاحات اس صوبہ میں کئے؟ باوجود تلاش و تجسس اس کا کوئی مفصل حال معلوم نہ ہوسکا البتہ ایک کتبہ سے جو پٹنہ سٹی کے موجودہ خواجہ کلاں تھانے کی عمارت پر چسپاں ہے صرف اس قدر پتہ ملتا ہے کہ شیخ جعفر نامی نے جو داؤد خاں کا ملازم تھا ایک عمارت "دارالعدل" بنوائی تھی جو اس وقت کے عدل و انصاف کے محکمے کی عمارت تھی۔ اس عمارت پر حسب ذیل شعر کندہ ہے:۔

بہر عدل و داد مظلوماں ز دست ظالماں ساخت دارالعدل جعفر بندۂ داؤد خاں

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ مراۃ العالم مصنفہ بختاور خاں قلمی نسخہ صفحات ۶۸۳ و ۶۸۴ (مملوکہ محترمی سید حسن عسکری پروفیسر تاریخ پٹنہ کالج)

[2] بادشاہی فرمان کے ذریعہ اس نئے علاقہ (پلاموں) کا فوجدار مقرر کیا گیا تھا۔ (عالمگیر نامہ قلمی نسخہ)

[3] یعنی اینچھا اور بھدوہی گاؤں سے مسافر بخیریت تمام گزر کر جب آگے بڑھے تب سمجھے کہ بخیریت سے اس کا سفر تمام ہوا۔

نی زمانہ اُس عمارت کا کوئی نشان نہیں ملتا ہے لیکن متذکرہ تھانے کے صحن میں ایک قبر پر مندرجہ ذیل کتبہ ثبت ہے جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ متذکرہ دارالعدل کی عمارت اسی مقام پر تھی اور جس کو نواب فخر الدولہ کے ملازم حسن علی نے ۱۱۴۳ھ میں دوبارہ تعمیر یا مرمت کرایا تھا ؎

بندہ نواب فخر الدولہ ممدوح زماں — آنکہ در ناموش حسن را با علی باشد قراں
ساخت دارالعدل جائے نکو مناسب داد — در ہزار و یکصد و چہل و دو بنا کرد تاریخ آں

داؤد نگر تاریخ داؤدیہ میں قصبہ داؤد نگر کی آبادی کے متعلق مندرج ہے کہ ۱۰۸۰ھ میں اس قصبے کی آبادی کی بنیاد ڈالی گئی۔ سنہ ۱۰۸۳ھ میں قلعۂ داؤد نگر کی بنیاد پڑی اور ۱۰۸۴ھ کے اوائل میں قلعہ مذکور کی تعمیر ختم ہوئی نیز اسی سال یعنی بارہ سال کی مدت میں قصبہ داؤد نگر کی آبادی تکمیل کو پہنچی اور اس مدت میں اچھا اور گوہ دو پرگنوں کی آمدنی میں سے ایک خطیر رقم آبادئ قصبہ اور تعمیرات مسجد و قلعہ میں خرچ ہوتی رہی

نواب داؤد خاں نے قصبہ داؤد نگر کو اس قرینے اور طرز پر آباد کیا کہ ہمارے صوبۂ بہار میں کوئی دوسرا قصبہ اس سلیقے سے آباد نہیں ہوا، ہر محلے میں ہر قسم کے اہل حرفہ آباد کئے تاکہ کوئی شخص تکلیف نہ اٹھائے یعنی ہر محلے میں دھوبی، حجام، تیلی، بنوٹی، حلوائی، بنے اور دوسرے ہر قسم کے لوگ بسائے کہ ہر شخص کو ضروری چیزیں اپنے ہی محلے میں مل جائیں اور صرف قصاب، ڈوم، چمار اور مہتر (بھنگی) وغیرہ کی قسم کے لوگوں کو البتہ آبادی کے کنارے بسایا، چنانچہ قصبۂ داؤد نگر کے مشرقی کنارے پر باغ پراہی[1] میں قصابوں کی آبادی بدستور ہنوز موجود ہے

یہ قصبہ نہایت لمبا چوڑا آباد کیا گیا تھا۔ چوک[2] پر جوہری رستے تھے جس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اس مقام پر اب بھی سنگ تراشیدہ کے ریزے کبھی کبھار مل جاتے ہیں۔ جنہیں حکاک نگینے تراشتے وقت پھینک دیتے ہیں۔ غرضکہ نواب داؤد خاں نے اس قصبے کو ہر فن و حرفت کے لوگوں سے نہایت وسیع پیمانے پر آباد کیا تھا لیکن اب اس قصبے میں وہ پہلی سی شان و رونق جو نواب داؤد خاں کے وقت میں تھی باقی نہیں ہے بلکہ اسکی حالت مندرجہ ذیل شعر کے مصداق ہے ؎

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ — آثار پدید است صناديد عجم را

اس قصبے کی ویرانی و بربادی کی دو تاریخی وجہیں بھی ہیں، ایک تو صاحب سیر المتاخرین کے بیان[3] کے مطابق ۱۱۷۳ھ میں جبکہ بالاجی راؤ کا اس طرف سے گزر ہوا تو نواب احمد خاں نبیرہ نواب داؤد خاں قریشی اس کی اطاعت و فرماں برداری میں حاضر ہوا اور اس گمان میں قلعۂ داؤد نگر میں بیٹھا رہا کہ بالاجی راؤ محمد علی وردی خاں نہایت جنگ کی کمک کو جاتا ہے ہمارے قلعے کے محاصرے سے اسکو کیا غرض چنانچہ بالاجی راؤ نے داؤد نگر کی تخریب کے لئے فوج بھیجی جس نے قصبہ داؤد نگر کو جلا کر خاک کر دیا۔ (ملاحظہ ہو مراۃ السلاطین ترجمہ سیر المتاخرین مطبوعہ مطبع لوکشور لکھنؤ، جلد دوم صفحات ۱۵۱ و ۱۵۲)

دوسری تاریخی وجہ اس قصبہ (داؤد نگر) کی ویرانی و بربادی کی حسب روایت مرتب تاریخ داؤدیہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ نواب احمد خاں (نبیرۂ نواب داؤد خاں) کی غیر موجودگی میں ریاست نو کھا (ضلع شاہ آباد۔ آرہ) کا راجا داؤد نگر آیا اور میدان خالی پاکر بزعم جواں مردی قلعۂ داؤد نگر کے پھاٹک اکھاڑ کر لے بھاگا۔

یوں تو نیرنگئ زمانہ نے اس قصبے کا وہ پہلا سا حال باقی نہ رکھا ہے مگر پھر موجودہ حکومت انگریزی کے دور میں دریائے سون کی بڑی نہر جو بارون (سوں سٹ بینک) کے قریب سے نکال کر دیگھا (پٹنہ) کے پاس دریائے گنگا میں گرائی گئی ہے وہ قصبہ داؤد نگر سے گزرتی ہے جس میں داؤد نگر سے گھگول (پٹنہ) تک ہفتے میں دو بار مسافروں اور مال کو لے کر اسٹیمر آیا جایا کرتا ہے اور اسی نہر کی وجہ سے فی زمانہ قصبہ

---

[1] باغ پراہی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس مقام پر ایک روضہ سرور سلطان قدس سرہٗ کا ہے جس کے مجاور پراہی کے لقب سے مشہور تھے اور انکو نواب داؤد خاں کی طرف سے جاگیریں بھی ملی تھیں لیکن اب پراہی مجاور نسیت و نابود ہو گئے اور انکی اولاد منتشر ہو کر دوسرے ضلعوں میں آباد ہو گئی نیز انکی جاگیریں بھی انکے قبضے سے نکل گئیں لیکن سرور سلطان قدس سرہ کا روضہ اب تک بدستور موجود ہے اور اہل حاجت ——— نذر و نیاز کرتے ہیں۔ (تاریخ داؤدیہ)

[2] اس قصبہ کا چوک مرتضےٰ خاں اور اللہ داد کے مزارات کے قریب (جو اب ایک وسیع میدان ہے) تھا (تاریخ داؤدیہ)

[3] کیونکہ نواب احمد خاں قریشی نبیرۂ نواب داؤد خاں قریشی زیادہ تر محلہ مغلپورہ پٹنہ سٹی میں رہا کرتا تھا (تاریخ داؤدیہ)

داؤدنگر ہمارے صوبۂ بہار میں محکمۂ نہر کا ایک مشہور سب ڈویژن ہی جہاں ایک نائب انجینئر مقیم رہتا ہے۔ اور ڈاک خانہ، تار گھر، ڈاک بنگلہ، ایک ہائی انگلش اسکول، اسپتال اور تھانے کے علاوہ ایک میونسپل بورڈ کے ذریعہ روشنی اور صفائی کا انتظام بھی اس قصبہ میں جاری ہوا اور ہنوز ضلع گیا کا یہ قصبہ جنوبی بہار میں اپنے تجارتی کاروبار کے لئے تمامی مشہور و معروف ہے۔

صوبہ داری بہار سے تبادلہ

داؤد خاں ماہ محرم مطابق ماہ اگست ۱۰۷۴ھ تک پٹنہ (بہار) کا صوبہ دار رہا۔ اس کے بعد شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب نے اسکی خدمات خود حاصل کرلیں۔ اور اسکی جگہ پٹنہ کی صوبہ داری پر لشکر خاں کو مامور کیا

داؤد خاں کی دیگر سیاسی مہمات

اس کے بعد داؤد خاں کی دیگر سیاسی مہمات کا آغاز ہوا۔ جن کا سلسلہ ۱۰۷۸ھ سے ۱۰۸۱ھ تک قائم رہا۔ اس اثنار میں اس نے حکومت مغلیہ کے غیر معمولی اہم خدمات انجام دئے۔ چنانچہ ۱۰۷۸ھ میں وہ خاندیش کا صوبہ دار بنایا گیا۔ پھر دکن میں سیواجی کی سرکوبی کے لئے جو فوج بھیجی گئی اس میں شریک ہوا ۱۰۸۰ھ میں یہ مہم جاری رہی اور ۱۰۸۱ھ میں بیجاپور کی مہم میں شریک تھا۔ پھر برار کی صوبہ داری پر مامور ہوا پھر ۱۰۸۲ھ میں الہ آباد کی صوبہ داری پر بھیجا گیا۔

مراجعت وطن

لیکن ان تمام سیاسی خدمات سے وابستہ رہنے کے باوجود اس کے تعلقات صوبہ بہار سے قائم رہے۔ نیز کہ جاگیر کے باعث قصبہ داؤدنگر کو اس کے وطن کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی

وفات

چنانچہ اسکی زندگی کا سب سے اخیر واقعہ یہ ہے کہ جب کابل میں بدعملی پھیلی تو اورنگ زیب نے باضافہ منصب شش ہزاری ذوالفقار الملک کے خطاب سے سرفراز فرما کر داؤد خاں کو کابل جاگیر دہاں کے انتظامات درست کرنے کا حکم دیا چنانچہ اورنگ زیب کا یہ حکم پاکر وہ فوراً اپنے اہل وعیال سے ملنے و نیز اپنی جاگیر کے انتظام و انصرام کے لئے داؤدنگر آیا اور یہاں بعجلت کل کاموں سے فراغت حاصل کرکے حکم سلطانی کی بجاآوری کے خیال سے رنگر رائے کابل ہوا مگر ابھی وہ قلعۂ رہتاس ہی تک پہنچا تھا کہ اذا جاء اجلھم فلا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون کے اٹل قانون خداوندی کے مطابق موت کا پیغام آپہنچا اور کابل جانے کے بجائے سکوراہی ملک عدم ہونا پڑا اور وہ وہیں قلعۂ رہتاس (ضلع شاہ آباد) میں مدفون کیا گیا۔

اولاد و احفاد

داؤد خاں نے صرف ایک فرزند چھوڑا جس کا نام حمید خاں تھا جس نے قصبۂ داؤدنگر کے پورب جانب تقریباً اسوا سترہ میل کی دوری پر پرگنہ گوہ میں اپنے نام پر ایک گاؤں حمیدنگر آباد کیا تھا۔ داؤد خاں کے مرنے کے بعد اورنگ زیب نے حمید خاں کو دربار شاہی میں طلب کیا اور جسونت سنگھ کی وفات کے بعد ۱۰۸۶ھ میں جو شورش پیدا ہوگئی تھی اسکو دبانے کے لئے روانہ کیا تھا اسکے بعد ۱۰۹۲ھ میں وہ بھوجپور کا نوجدار مقرر ہوا تھا اس کے بعد اورنگ زیب نے اس کو گجرات کی صوبہ داری کچھ دنوں کے لئے مرحمت فرمائی تھی۔ لیکن ابھی اس کا سن چالیس سال کا تھا کہ پیک اجل نے صدائے رحیل سنائی اور برہان پور میں ۱۵ ویں ربیع الآخر ۱۰۹۱ھ کو اس دار فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کرگیا۔

حمید خاں کا ایک لڑکا نواب جیون خاں تھا اور جیون خاں کے دو فرزند عنایت اللہ خاں عرف حمید خاں ثانی۔ اور فقیر اللہ خاں عرف احمد خاں ہوئے۔

عنایت اللہ خاں کے ایک فرزند سکر اللہ خاں تھے جن کے چار فرزند اسد اللہ خاں۔ رحم اللہ خاں۔ روح اللہ خاں اور اکرام اللہ

---

۱ مآثر عالمگیری قلمی نسخہ ص ۴۹ ۲ تاریخ داؤدیہ ۳ مآثر عالمگیری قلمی نسخہ ص ۲۱۷ و ۲۱۸ کے مطالعہ سے یہی پتہ ملتا ہے کہ نواب داؤد خاں کا ایک لڑکا جمشید خاں نامی بھی تھا جس نے ۱۰۹۸ھ میں برہان پور میں انتقال کیا تھا۔ ۴ مرتب تاریخ داؤدیہ کا بیان ہے کہ عنایت اللہ خاں عرف حمید خاں ثانی کے فرزند شکر اللہ خاں مذکور کی حیات تک پرگنات انچھا، گوہ اور منورہ حسب دستور سابق بطور جاگیر اس خاندان کے قبضہ و دخل میں رہے لیکن ۱۱۷۴ھ میں جب انگریزی عملداری کا دار دورہ ہوا تو دفعتہً بندوبست سرکار انگریزی نے خلاف امید نہ معلوم کیوں ان پرگنات کی جو کرشاہی عطیہ تھے مالگذاری تضمیں کردی جیسے اولاد و احفاد نواب داؤد خاں نے قبول و منظور نہ کیا چنانچہ گورنمنٹ نے یہ علاقے دوسرے زمینداروں کے ساتھ بندوبست کردئے اور صرف مبلغ پانچ سو روپے ماہانہ کا وظیفہ محض تین پشتوں تک مقرر کردیا اور حسب الحکم سرکار انگریزی صرف تین پشتوں تک (باقی صفحہ ۵۰ پر)

خاں عرف امام الدین خاں تھے۔ امام الدین خاں کے محل اولیٰ سے ولایت اللہ خاں اور محل ثانی سے ولی اللہ خاں ہوئے۔
فقیر اللہ خاں عرف احمد خاں کے محل اولیٰ سے ایک فرزند غلام غوث خاں اور محل ثانی سے دولڑکے حیدر قلی خاں اور احسان علی خاں کا پتہ تاریخی کتابوں میں ملتا ہے۔

تاریخ وفات

نواب داؤد خاں کی تاریخ وفات کسی ہمعصر معتبر مورخ نے تو نہیں لکھی مگر تاریخ داؤدیہ میں داؤد خاں کے پوتے نواب عنایت اللہ خاں عرف حمید خاں ثانی کا مندرجہ ذیل قطعہ مندرج ہے جس سے اس کی وفات کی تاریخ ۱۱۷۳ھ (مطابق ۱۷۶۰ء) نکلتی ہے۔ اب یہ تاریخ صحیح ہے اس کا کہنا دشوار ہے لیکن یہ قطعہ چونکہ خود اس کے پوتے کا ہے اس لئے اسکی صحت پر یک گونہ وثوق کیا جا سکتا ہے۔

(قطعہ)

چہ دل بندی دریں دنیا کہ افسون ست و افسانہ — ہزاراں عاقل و فرزانہ را کردہ ست دیوانہ
بزیر گردش گردوں چہ امید بقا باشد — کجا ماند سلامت درمیان آسیا دانہ
اگر آید دم اول دم دیگر مجو از پس — کہ آں بد آشیا اول در آخر گشت ویرانہ
مجو اساس از مشیت داؤد خاں کز سیاد او — شدے آباد شہرے گر گزر کردے بہ ویرانہ
بسے شمشیر ہا زد بر سر بنگالہ و دکھن — کز و شد داستاں رستم دستاں بہ افسانہ
چو جاں بسپرد ایماں بردد راہ جواں مردی — بتاریخش خرد گفتا "بایماں رفت مردانہ"
۱۱۷۳ھ

انا للہ وانا الیہ راجعون

ہے دل اکس کو دوام اکس گردش لیل و نہار میں — خاک کے پتلے ہزاروں مل گئے ہیں خاک میں

(بقیہ ص ۵۶) اس خاندان کو مقررہ ماہانہ وظیفہ ملتا رہا۔ اسکے بعد نواب داؤد خاں کی اولاد و احفاد میں سے کسی کو بھی ایک پیسہ خزانۂ سرکار سے عطا نہیں ہوا اور نواب داؤد خاں کی آل اولاد گورنمنٹ برطانیہ کے اس نمک حلال کی بدولت نان شبینہ کو محتاج ہوگئی۔ ناچیز راقم السطور کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ آخر ماہانہ وظیفہ میں یہ تین پشت کی قید کیوں لگائی گئی تھی؟ حالانکہ شہنشاہ محی الدین اورنگزیب نے عموماً بعوض خدمت لائقہ و خصوصاً بعوض فتح پلامو عمدۃ الملک نواب داؤد خاں قریشی فاتح پلامو و بانی قصبۂ داؤدنگر کو ازروئے فرمان نسلاً بعد نسلٍ متذکرہ پرگنے بطور جاگیر التمغہ عطا کئے تھے اگر علاقے دوسرے زمینداروں کو بندوبست کر دئے گئے تھے تو کم از کم مقررکردہ وظیفہ بھی ازروئے انصاف نسلاً بعد نسلٍ مقرر رہتا جیسا کہ گورنمنٹ نے پرگنہ بلونجا (پلامو) کی نسبت اولاد و احفاد نواب ہدایت علی خاں اسد جنگ کے ساتھ قائم و برقرار رکھا ہے کہ پرگنہ بلونجا کی زمین تو دوسرے زمینداروں مثلاً بھوپ ناتھ ساہی و بھیا بھوانی سنگھ وغیرہ کے ساتھ گورنمنٹ نے بندوبست کر دی لیکن مبلغ نو ہزار روپیہ (۹۰۰۰) کی رقم سالانہ بطور وظیفہ پٹنہ کے سرکاری خزانہ سے نواب اسد جنگ کے ورثا کو ملا کرتی ہے نیز لوگوں کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کو بیچ دالیں چنانچہ اولاد و احفاد نواب اسد جنگ نے تقریباً کل وظیفے فروخت کر دئے ہیں اور دوسرے اضلاع کے غیر متعلق عہدہ دار انہیں خرید کر ہنوز مستفید و مستفیض ہو رہے ہیں۔

(۱) نواب داؤد خاں کی اولاد و احفاد کا ذکر کتاب دستور العمل مشتمل بر دستور بادشاہان سند قلمی نسخہ ص ۱۴ ب (مملوکہ بابو رام بہادر عرف بابو چھوٹے لال محلہ ہرمندر کی گلی پٹنہ سٹی سے ماخوذ ہیں۔ اگر قارئین کرام نے ناچیز کی اس کاوش دماغ کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور راقم السطور کو ہمت دلائی تو پھر ان شاء اللہ کسی آئندہ فرصت میں نواب داؤد خاں کی اولاد و احفاد کے متعلق ایک مستقل مضمون لکھنے کی بسیط کوشش کروں گا۔
وما توفیقی الا باللہ وعلیہ التکلان۔

از پئے کار جہاں کار کنے باید شد
مرد کاراں کہ ہمہ وقت بکارے باید شد

شیر شاہ کا کردار نئی روشنی میں

از جناب عبدالباقی خاں صاحب بی اے جامعی

دنیا کا کیا کہنا' اخلاقیات کے بندھے بندھائے ضابطوں کی کسوٹی پر پرکھنے کی عام کوشش کچھ فلاطوں ہی کا خاصہ نہ تھا' بلکہ طنزیات کے موجودہ ماہر اکسفورڈ کے استاد پروفیسر ناہلے کا بھی ایک خاص فن ہوگیا ہے' مظلوں نے لندن کی مجلس ارتباط علمی میں تقریر کرتے ہوئے کہا :-

"شیر شاہ ملا سے شاہ ہو' لیکن جب تک اسکی شخصیت میں ہمیں علمیت اور ادبیت کی چاشنی نہیں ملتی' ہم تو اسے معمولی سا پٹھان ہی سمجھیں گے' جو چیزیں لوٹ بھی سکتا ہے' اور دنیا کی سڑکے بڑی اسپیریلزم کو تنگی کا تاج بھی پہنا سکتا ہے۔"

ہمیں خیال ہوا کہ پروفیسر صاحب کی تسکین کے لئے کچھ لکھا جائے' اور ندیم کا بہار نمبر' ان کی خدمت میں ان تمہیدی فقروں کیساتھ بھیج دیا جائے

"مغرب کے لئے مشرق کو سمجھنا' طنزیات کا کام نہیں ہے ورنہ آپ ندیم کا بہار نمبر ضرور پڑھ سکتے' اور چونکہ آپ اردو نہیں پڑھ سکتے' اس لئے طنزیات کی استادانہ مہارت کے باوجود آپ کو ہم دانا پور رجمنٹ کے اس گورے ٹامی سے زیادہ کیا سمجھ سکتے ہیں جو ہندوستان پر حکومت کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔"

ہمارے پاس شیر شاہ کے معتمد خاص اور مدشتہ کے چچا ناظم خاں کا ایک مخطوطہ ہے۔ اس کی ایک نقل رام پور کے کتب خانہ میں دیکھنے کا اتفاق ہوا' اور دوسری نقل امپیریل لائبریری کلکتہ میں بھی ہے۔ رام پور کا نسخہ ہمارے ذاتی نسخہ کی واقعی نقل معلوم ہوتا ہے۔ امپیریل لائبریری کا نسخہ بہت مسخ ہے' اور کرم خوردہ بھی۔ صحافتی مصروفیتوں اور نجی مشغلوں نے اب تک موقع نہ دیا کہ میں ان تینوں نسخوں کا موازنہ کردں اور اس اہم کام کی ترتیب کا وہ فرض انجام دوں جو ایک قیمتی امانت کے امین کی حیثیت سے مجھ پر عائد ہوتا ہے۔ میں سردست اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ وہ نسخہ جو میرے پاس ہے صحیح کیوں مانا جائے اور وہ مجھے کیسے ملا۔ یہ ایک مستقل بحث ہے۔ اور کسی دوسری فرصت کا محتاج۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے ابھی تو اتنا ہی کیا جائے گا کہ اس نسخہ کے کچھ اقتباسات جو میرے موضوع کے لئے کافی ہیں پیش کئے جائیں گے۔ اس کتاب کا نام "شہر اللہ" ہے' اور زبان کچھ تو فارسی اور کچھ اس زمانہ کی چالو ہندی ہے۔ یہ نسخہ کسی طرح چھپ سکے تو اس سے یہ اندازہ بھی ہوگا کہ عہد شیر شاہی کی زبان کیا تھی' اور خود شیر شاہ زبان کے بارے میں کیا رائے رکھتا تھا۔ اس مخطوطے میں مکالمے بڑی کثرت سے ہیں' اور اس مضمون میں انہی مکالموں پر قناعت کی جائے گی۔ رقم الحروف نے زبان اپنی لکھی ہے۔ کہیں کہیں ہندی رہنے دی ہے۔ تاکہ زبان کے مسئلہ سے جو لوگ دلچسپی رکھتے ہوں وہ نسخہ کے ایک اہم مسئلہ کا پس منظر دیکھ سکیں کوشش کی گئی ہے کہ مضمون کی دلچسپی باقی رہے اور یہ قارئین کے لئے بوجھل نہ ہو۔

شیر شاہ مابعد الطبیعاتی مسائل پر گفتگو کر رہا ہے۔ خدا کی صفات پر بحث کرتے کرتے' وہ جنت کا تصور کرتا ہے۔

شیر :- تو جنت کیا ہے؟ کوئی "عشرت خانہ" (یہ شیر شاہ کی اصطلاح ہے)

ناظم :- سلطان تو اسے اعمال حسنہ کا انعام ہی جانتے ہیں۔

شیر :- تو مجھ ایسا خدا کا ایک عاجز بندہ بھی جنت کی تعمیر کر سکتا ہے اور تم ایسے نیک صفت غلاموں کو اس میں بند کر سکتا ہے۔

ناظم :- اسے زندیقیت کہیں گے جہاں پناہ!

شیر :- زندیقیت یہ ہے یا وہ جو جنت کو ایک کھلونا بنائے۔

ناظم:۔ تو پھر کیا ہونا چاہیئے۔
شیر:۔ جنت ہر بندے کے دائیں ہاتھ میں ہے۔ بندہ دنیا ہی میں جنت اور دوزخ بنا لیتا ہے۔ ہر اچھے عمل کے صحیح نتیجہ کا نام جنت اور ہر برے عمل کے برے نتیجہ کا نام دوزخ ہے۔ پاکیزہ اور بلند روح کی انتہائی سرشاری جنت کی مثال ڈھونڈھتی ہے۔
ناظم خاں خاموش ہو جاتا ہے۔ گفتگو کا موضوع بدلتا ہوا 'روح' پر سمٹ آتا ہے۔
شیر:۔ بندے کو یہ جاننے کی خواہش تو ہونی چاہیئے کہ روح کیا ہے؟
ناظم:۔ نہ جاننا ہی اچھا ہے۔
شیر:۔ میں "موفی خواہ" ہوں (یہ شیر شاہ کے الفاظ ہیں)۔ "ہند کوں پرانے پنڈتوں سوں پوچھو" (ہندوستان کے پرانے پنڈتوں سے پوچھو)۔
ناظم:۔ وہ بھی کچھ ٹھیک جواب نہیں دیتے۔
شیر:۔ جواب نا ہیں اتر کہو۔ (جواب نہیں۔ اتر (معنی جواب) کہو۔ اچھا ہم سے سنو۔ روح وہ شکتی (یہ شیر شاہ کا لفظ ہے) ہے جو آدمی میں کچھ کرنے کی طاقت دیتی ہے۔ یہ روح ہی تھی جس نے ہم سے اتنا بڑا کام کرایا کہ میں آج بشاہ ہوں۔ لیکن میری روح صاف نہیں ہے۔ ہمایوں کی روح زیادہ صاف ہوگی' مظلوم روحیں صاف ہوتی ہیں۔ اچھی ہوتی ہیں۔
روح کی تعریف کتنی ہی ادھوری ہو لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ شیر شاہ نے ان مسئلوں پر سوچا اور شاید معقول بات کہی خصوصاً ہمایوں کا ذکر جس انداز سے کیا گیا ہے' وہ اس کی سیرت کی بلندی کا پتہ دیتا ہے۔ اپنے نفس کا اتنا کڑا محاسبہ کوئی سہل کام نہیں۔ ذرا شیر شاہ کی پوزیشن میں رہ کر اس بے لاگ تنقید کی داد دیجئے۔ یہ ایک فاتح انسان کا اپنی فتحمندیوں پر طنز ہے۔ تاریخ ایسی مثالیں کم پیش کر سکتی ہے۔

ہندوستان کے علوم و فنون سے شیر شاہ کو کتنی دلچسپی تھی اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہوگا۔
شیر:۔ مہا بھارت کی کہانیاں تم نے سنی ہیں؟
ناظم:۔ بہت کم۔
شیر:۔ تو پھر تم نے اس ملک پر رہ کر جانا ہی کیا۔
ناظم خاموش رہا۔
شیر شاہ کچھ سوچ کر بولا "میں چاہتا ہوں کہ مہا بھارت کے مضامین تمام دنیا تک پہنچ جائیں۔ اس میں فلسفہ اور حکمت کی بہت سی باتیں ہیں۔ اسکی بہت سی باتیں پرانے ایرانیوں کی کہانیوں سے ملتی جلتی ہیں۔ مجھے کچھ علما، مل جائیں تو میں یہ ثابت کر دوں کہ ہند' ایران اور عرب میں بہت زمانہ سے میل جول چلا آتا ہے۔ دارا سے بھی پہلے پیش دادی اور کیانی خاندانوں تک کے زمانہ سے ہمارا سابقہ رہا ہے۔ ہندیوں کی تقدیر کتاب رامائن بھی بہت خوب ہے۔ مہا بھارت میں جو دھشتر کے تخت و تاج سے دست بردار ہونے کا واقعہ بالکل شاہنامہ میں کیخسرو کے عزل سلطنت کے واقعہ سے ملتا جلتا ہے۔ رامائن میں سیتا مہا رانی (یہ شیر شاہ کا انداز بیان ہے) اور راون کا قصہ شاہنامہ کے ہوماتی بہ آفرید اور ارجاسپ کے قصہ سے مشابہ ہے۔
ناظم:۔ یہ کام تو بڑا مشکل ہے۔
شیر:۔ آدمی مشکل کام کرنے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔
اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ کی نظر کتنی وسیع تھی اور فن علم الانسان اور علم آثار قدیمہ پر اس کی فطرت صالح کو کتنا عبور تھا۔
کیا یہ کہنا غلط ہوگا کہ اکبر نے مہا بھارت کے فارسی ترجمہ کا جو کام شروع کرایا۔ اور ابوالفضل' نقیب خاں' مولانا عبدالقادر بدایونی' شیخ سلطان تھانیسری' ملا شیری اور شیخ فیضی وغیرہ نے جو کچھ کیا' وہ شیر شاہ ہی کے زرخیز دماغ کی اپج تھی۔ شیر شاہ نے رہنمائی کی دوسروں نے اس کی تقلید کی۔

شیر شاہ کے پیش نظر شاید ہندوستان کی مکمل تمدنی تاریخ کی ترتیب تھی۔ اسے صرف ہند قدیم کی تمدنی تاریخ سے دلچسپی نہ تھی، بلکہ وہ قرون وسطیٰ اور اپنے زمانہ کی تاریخ کو بھی اتنا ہی ضروری جانتا تھا۔ اس نے کہ ماضی اور حال کے رشتے جب تک جوڑے نہ جائیں، کسی معتقدات کے فطری ارتقا کے بھی برعکس ہوگا اور انسانی زندگی کے لئے بھی کچھ مفید نہ ہوگا۔

ناظم خاں، شیر شاہ کی جدت طبع کی تعریف کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"شیر شاہ کم سخن آدمی نہ تھا، لیکن ایک دن خلاف معمول وہ بہت خاموش تھا۔ کئی پہر کی خاموشی کے بعد وہ بولا 'کتنا اچھا ہو کہ میں ہند کی ہر اس اینٹ کو بچا سکوں جو ہندوستان کے مسلمان ناجداروں نے تیار کرائی۔ فلک سب کچھ بھول جائے لیکن اسے یہ نہ بھولنا چاہئے کہ محمدؐ کی امت نے بھی ہند کو سجایا اور سنوارا۔ کاش! میں کوئی ایسی چیز بنا سکتا جسے رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے!"

شیر شاہ شاعر نہ تھا، لیکن اس نے طبیعت موزوں پائی تھی۔ حسینی شاہ کا بیان اگر صحیح مان لیا جائے، اور اس کے مان لینے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی تو شیر شاہ کے یہ اشعار آج بھی سہسرام کی پہاڑیوں پر ستاکنڈ کے قریب ملہار کے دھن میں گائے جا سکتے ہیں

برکھا شب کے ہوت ہیں — بھور بھی ہو گوئیں بھینگ
دل مارا مضطر ہووے — سبزہ ڈولت پینگ
خوشتر ہووے سارا عالم
بدبختی بھی سو گوی نیند

(یعنی رات کو بارش ہوتی ہے۔ بھور بھی بھینگ گئی ہے۔ دل میرا بے چین ہے۔ سبزہ اس طرح ڈول رہا ہے جیسے کوئی پینگیں مار رہا ہو۔ سارے عالم کو خوش ہونا چاہئے۔ اس وقت بدبختیاں بھی گہری نیند سو گئی ہیں)۔

موضوع کا انتخاب کہتا تو کہا تو ہندوستان کی برسات دنیا کو سنوالا بنا دے اور وہ تو پھر شیر شاہ ہی تھا! انداز بیان بھی بہت ستھرا ہے۔ مگر یہ اشعار بقول عروض کی پابندیوں کی تاب نہ لا سکیں۔ لیکن پھر بھی ایک سچے آدمی کے سچے تاثرات ہیں جو دل میں پیر جاتے ہیں۔ غور طلب بات یہ بھی ہے کہ اس زمانہ کی ہندی یا اردو کی شکل کیا تھی اور اب تک اس نے کتنی ارتقائی منزلیں طے کی ہیں۔

آکسفورڈ کے ماہر طنزیات کو شاید یہ جواب کافی ہو۔ لیکن اسی سلسلہ میں ایک موضوع اور بھی چھیڑ دیتا ہے اور اسے تشنہ بھی چھیڑ دیتا ہے۔ حکومت کے آجکل بہت سے طریقے علم السیاست نے مان لئے ہیں۔ جمہوریت، اشتراکیت، آمریت، شخصی اقتدار وغیرہ وغیرہ۔ شیر شاہ اس مسئلہ پر یوں سوچتا ہے:۔

حکمرانی یوں تو میری ہے، لیکن یہ کچھ اچھا نہیں ہے۔ خدا ایک ہے اور فرد ہے (یہ شیر شاہ کا لفظ ہے) اسی کی شان ہے۔ جو اس بارے میں [illegible] مشرک۔ تو۔ اللہ مجھے معاف کرے کہ کچھ کچھ میں بھی مشرک ہوں۔ حکومت تو اس کے بندوں کو کرنی چاہئے تاکہ وہ ہی انہ اچھائیوں کے [illegible] ہو [illegible] ایک شخص میں بہت سی اچھائیاں بھی گھٹ آتی ہیں اور بہت سی برائیاں بھی۔ حکومت بہت لوگوں میں بانٹ دی جاتی ہے تو اچھائیاں اور برائیاں بھی بٹتے بٹتے نفی کے برابر ہو جائیں۔ خدا مجھے توفیق دے کہ میں اسکے عام ہندو نیکی حکمرانی میں ایک ادنیٰ غلام ثابت ہوں۔

[illegible] شیر شاہ ہندوستان کے پٹھان دماغ سیدھے سادے طور سے سوچتا تھا۔ کیا امید کی جائے کہ آکسفورڈ کے ماہرین علم السیاست شیر شاہ کے اس شعر یہ اسی طرح تجزیہ کریں گے جس طرح افلاطون، روسو، ہابس، لاکس اور ہل کے نظریوں کا کرتے ہیں۔

---

[1] حسینی شاہ شیر شاہ کے ہم عصر تھے اور سہسرام کے پڑوس میں رہتے تھے اور شاعری ہی ان کا ذریعہ معاش تھی، انھوں نے اپنے تذکرے میں جو مخطوطہ ہے، یہ دعویٰ کیا ہے کہ شیر شاہ شاعر بھی تھا۔ مسئلہ بیان کی دلچسپی قائم رکھنے کے لئے راقم الحروف نے اس کا ذکر کر دینا بھی مناسب جانا۔ ع۔ ب۔

صوبۂ بہار کے آخری ہندوستانی گورنر

انتظام الملک ممتاز الدولہ مہاراجہ کلیان سنگھ بہادر تہور جنگ

(از جناب سید حسن عسکری ایم اے، بی ال، پروفیسر شعبۂ تاریخ پٹنہ کالج)

تاریخ ہندوستان سے دلچسپی رکھنے والے **خلاصۃ التواریخ** اور **واردات قاسمی** کے مصنف سے ناآشنا نہیں، لیکن اردو داں طبقہ مہاراجہ کلیان سنگھ **عاشق** کے حالات اور سیاسی و ادبی کارناموں سے بہت کم واقف ہے۔ اور جہاں تک راقم السطور کی محدود معلومات کا تعلق ہے شاید مرحوم مؤلف تاریخ شعرائے بہار اور **دیبی پرشاد مرتب** تذکرۂ شعرائے ہند سے زیادہ **عاشق** ایسے سیاسی انسان اور لفرنگا شاعر کے حالات پر کسی اور نے روشنی نہیں ڈالی ہے، مگر دو تین صفحات کی بساط ہی کیا۔ یوں کہنے کو تو اردو میں لکھی ہوئی بہار کی دو عدد تاریخیں بھی موجود ہیں مگر مہاراجہ کلیان سنگھ کا ذکر ان میں مفقود ہے، ممکن ہے کہ تاریخ بہار کے مؤلفین کو مہاراجہ کلیان سنگھ کی تصنیفات کے مطالعہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

مہاراجہ موصوف نے اپنی تصنیف خلاصۃ التواریخ کے شروع میں اپنے والد بزرگوار کے "حالات و واردات" "سوانحات و وقعات" کے متعلق محض چند سطروں پر اکتفا کیا ہے اور اس "داستان مجمع بیان" اور "امر خطیر" کو وقت فرصت کے لئے اٹھا رکھا۔ جو افسوس کہ میسر نہ ہو سکا، مگر تاریخی ذوق رکھنے والوں کے لئے آگے چل کر اسی کتاب میں جا بجا اشارات بلکہ جزوی اور تفصیلی واقعات بھی کہیں کہیں مل جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں اخبار ہیں اور افسوس صد حیف کے رد اعمال میں لکھی ہوئی فارسی تاریخیں بالخصوص سیر المتاخرین، تحفۂ تازہ وغیرہ، انڈیا آفس لائبریری دہلی کے دفاتر (جن تک دسترس بغیر دشواری اور خرچ کثیر ممکن نہیں) مسٹر ہیڈلے جیسے شاہ آباد (آرہ) کی مختصر کتاب سر ولیم ہنٹر کے مرتب کردہ بنگال گزیٹیر میں پٹنہ گزیٹیر اور فارسی خطوط کی چھ بیش قیمت اور کارآمد جلدیں (جنہیں امپیریل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ نے کلینڈر کے نام سے وقتاً فوقتاً شائع کر دیا ہے) اپنے دامن میں مہاراجہ کلیان سنگھ کے سیاسی اور کسی حد تک نجی سوانح زندگی کے متعلق بہت کچھ غیر محدود مواد رکھتی ہیں۔ فارسی تذکرہ کی کتابوں میں بھی خال خال حالات ملتے ہیں جو نہایت تشنہ ہیں، اور جن تذکروں میں نسبتاً زیادہ حالات پائے جاتے ہیں وہ لندن آفس اور پیرس کے کتب خانوں کی زینت ہیں، المختصر مہاراجہ کلیان سنگھ کے حالات پر بہت کچھ مواد موجود ہے مگر اکثر کتابیں کمیاب اور عسیر الحصول ہیں۔

اتنی لمبی دوڑ کے بعد کسے فرصت ہے کہ ان تمام دقت طلب ذرائع کی چھان بین کر سکے مگر خوش قسمتی سے راقم السطور کو شہر پٹنہ میں مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق کے چند نادر[1] و غیر نادر[2] مجموعہ تصانیف کے اولین قلمی نسخوں کے دیکھنے اور انگریزی میں ان پر مختصر نوٹ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ چنانچہ ان اوراق کے سرسری مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو گئی اور یہ خیال پیدا ہوا کہ اس زریں موقعہ سے فائدہ نہ اٹھانا اور اب بھی عاشق ایسے باکمال کو منظر عام پر لانا انتہائی ظلم ہوگا، اس لئے سرِدست پٹنہ میں جو مواد

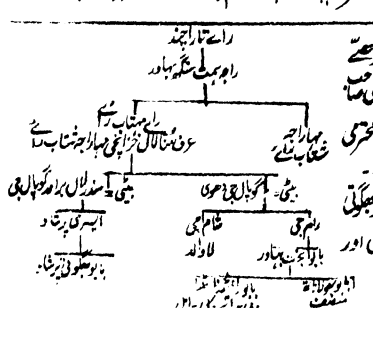

[1] اضلاع پٹنہ و شاہ آباد کے متعلق فرانسس بوکانن کا جرنل۔ [2] یہ دونوں دراصل ایک ہی کتاب کے دو حصے ہیں۔ عظیم آباد میں ۱۹ ۱۲ھ مطابق ۱۸۱۶ء میں انکی تکمیل ہوئی پیش نظر قلمی نسخہ نواب زادہ سید محمد مہدی صاحب ۲۷ ۱۲ھ چرمین میونسپلٹی سے راقم الحروف کو مستعار ملا جسکے لئے موصوف کا شکریہ واجب ہے۔ [3] محترمی قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر پٹنہ کی نظر سے یہ تذکرے بالخصوص تذکرۂ شورش و تذکرۂ عشقی گذر چکے ہیں۔

[4] کلیان سنگھ کے چچا مہتاب رائے کا براہ راست سلسلہ اب بھی موجود ہے انکے اخلاف میں ایک معمر بزرگ بابو بھولا ناتھ برخوردار راقم السطور کو بنیاد حاصل ہے، اور موصوف کے پوتے بابو رامیشر ناتھ بی۔ ایس سی راقم کے کالج کے ساتھی اور دوست ہیں، کئی قلمی نسخے اور ضروری کاغذات موصوف کے پاس سے دستیاب ہوئے۔

بآسانی مل سکا اس کی مدد سے مہاراجہ کلیان سنگھ کے سوانح زندگی کا مختصر خاکہ کھینچنے کی سطور ذیل میں کوشش کی گئی ہے۔ مفصل و سیر حاصل مقالہ جو کل ماخذات کا تجزیہ ہو، مشاہد انگریزی میں کبھی پیش کرنے کی نوبت آئے، السعی منی والاتمام من اللہ۔

مہاراجہ کلیان سنگھ المتخلص بہ عاشق[1] شاہجہان آباد دہلی کے ایک مشہور سکینہ کا بسنہ خاندان کے ممتاز فرد تھے، خاندانی امتیاز اس سے ظاہر ہے کہ مہاراجہ کے پردادا تاراچند[2] نواب اسد خاں وزیر اعظم و وکیل مطلق اور ان کے فرزند امیر الامرا ذوالفقار خاں کے "ابتدائے عروج دولت" سے "زمان زوال" (۱۷۳۹ء) تک "دیوان اور تصدی مہمات" تھے۔ مہاراجہ کے دادا رائے ہمت سنگھ[3]: خواجہ عاصم یعنی امیر الامرا صمصام الدولہ خاں دوران اور ان کے بیٹے مرزا عاشق عاشوری یعنی صمصام الدولہ دوم کے نہایت خیر خواہ دیوان تھے، اور نادر شاہ جیسا مردم شناس حکمران رائے ہمت سنگھ کی وفاداری، لیاقت، جرأت اور کاردانی کا معترف تھا، چنانچہ مہاراجہ کلیان سنگھ کا اکاون[4] اشعار کا قصیدہ[5] جو صمصام الدولہ کی شان میں کہا گیا، اور خلاصۃ التواریخ کے صفحات پر موجود ہے، مذکرہ تعلقات پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ مہاراجہ موصوف کے نامور باپ ممتاز الدولہ مہاراجہ شتاب رائے منصوبہ بیگ کے حالات زندگی رسالہ ندیم کے گذشتہ بہار نمبر ۱۹۳۵ء میں شایع ہو چکے ہیں، اگرچہ "کیلنڈر" انگریزی دفاتر اور بالخصوص خلاصۃ التواریخ سے اس جلیل القدر اور عظیم المرتبت شخصیت کی (جس نے انگریزی راج کے قایم کرنے میں ہندوستانیوں میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ لیا) مفصل تاریخ پیش کرنے کی ضرورت کیوں نہیں سمجھی گئی، بہر حال ہم دیکھتے ہیں کہ مہاراجہ کلیان سنگھ خاندانی اعتبار سے ایک موقر ہستی اور "عمدہ زادگان ہند" میں سے تھے، اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے دوسرے افراد کی مانند ان کا شمار نو دولتوں میں نہیں ہو سکتا، مگر بدقسمتی سے اوروں کی طرح ان کی ابتدائی زندگی بھی بڑی حد تک پردۂ خفا میں مستور ہے۔

مہاراجہ موصوف کی پیدائش کے متعلق ان کی خاندانی روایات بتاتی ہے کہ مہاراجہ شتاب رائے کو رانی سے (جو ان کے کفو کی نہ تھیں) بہت دنوں تک کوئی اولاد نہیں ہوئی، یہاں تک کہ ان کی دوسری غیر کفو کی بیوی چندا بائی نے (جو خود بھی لاولد تھی) ایک لڑکے مسمے خوشحال سنگھ کو گود لیا، (جو آگے چل کر بڑا سپوت ثابت ہوا) مگر قدرت کے کرشموں سے کون واقف ہے، تھوڑے دنوں بعد رانی صاحبہ پر اللہ نے فضل کیا اور یکے بعد دیگرے دو فرزند کلیان سنگھ اور بھوانی سنگھ عطا کئے اور ان دونوں بیٹوں کی پیدائش کے بعد مہاراجہ شتاب رائے کی مذکورۃ الصدر بیوی حاملہ مشہور ہوئی اور ایک بچہ جو آگے چل کر بسنت رائے کے نام سے مشہور ہوا معرض ظہور میں آیا۔ قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو، بسنت رائے کی اولاد تو باقی رہی مگر خوشحال سنگھ کا سلسلہ بھی خواہ وہ گود ہی کے ذریعہ کیوں نہ ہو قایم رہا، لیکن کلیان سنگھ اور بھوانی سنگھ، جو مہاراجہ شتاب رائے کے حقیقی جانشین اور جائداد وارث تھے اُن کا سلسلہ منقطع ہو گیا، شاید اس عالم فانی کے کسی فرد کی نسلاً بعد نسلٍ "سالیانہ مستمرہ" اور "جاگیرات بطریق استمرار" کی پیہم تکرار تقدیر الٰہی کو ناگوار گذری فاعتبروا یا اولی الابصار

مہاراجہ کلیان سنگھ اپنے آبائی وطن دہلی میں پیدا ہوئے (معراج الخیال از عبرتی) پیدائش کی تاریخ کا اندازہ ایک آٹھ ہزار ابیات کی فارسی مثنوی تاریخ زیبا[6] سے جو انہوں نے اپنے تیسرے بیٹے مسمے کنور حشمت سنگھ عرف راجہ ڈھولن کے لیے جو ایک بیگم کے بطن سے تھے اور جسے انہوں نے

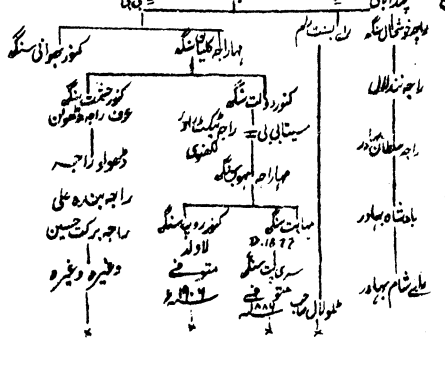

---

[1] خلاصۃ التواریخ صفحہ ۱۱۸

[2] " " صفحہ ۱۳۰

[3] " " صفحہ ۱۳۰-۱۲۴

[4] [illegible] ان کے خاندان میں سب سے زیادہ وقیع شخصیت رائے سلطان بہادر [illegible] کی تھی، بہادر ایسیہ ریسرچ جنرل دسمبر ۱۹۳۵ء میں راقم السطور کا ایک مقالہ بعنوان موصوف کی لائبریری اور اس کے ایک مخطوطہ کے متعلق شایع ہو چکا ہے۔

[5] خلاصۃ التواریخ میں یہ قصیدہ متعدد مواقع پر ملتے ہیں۔

زمانہ قیام کلکتہ اور نابینا ہونے کے بعد لکھوائی تھی، ہوسکتا ہے اس تصنیف کے تتمہ میں مہاراجہ موصوف فرماتے ہیں ؎

تمام این مثنوی شد در دو سہ ماہ — شد آخر داستان الحمد للہ
تمامی داستاں چوں کردم اظہار — نہادم نام او تاریخ زیبا
گذشت از عمرم اکنوں شصت و شش سال — بود ضعف و نقاہت عائد حال

پیش نظر نسخہ ۲۵ ذوالحجہ ۱۲۳۱ھ ہجری بمقام چیت پور کلکتہ اختتام کو پہنچا، نیز تاریخ "زیبا" کے الفاظ سے بھی یہی سال یعنی ۱۲۳۱ھ (مطابق ۱۸۱۵ء) نکلتا ہے، چنانچہ اس حساب سے مہاراجہ کلیان سنگھ کا سال پیدائش (۶۶ - ۱۲۳۱) ۱۱۶۵ھ ہجری قرار پاتا ہے۔

جس شخص کا خاندان مدت دراز تک متوسل رہا ہو، جسکے فضل و کمال کی نہ صرف اسکی تصانیف نظم و نثر بلکہ فقیر خیر الدین جیسا فاضل ہمعصر موثق بھی شہادت دے، اور جو شتاب رائے ایسے شفیق چچا کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھا ہو اس کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کی تحقیق و تفتیش تحصیل حاصل ہے۔

ابھی مہاراجہ کلیان سنگھ کا عہد طفولیت ہی تھا جب کہ ۱۱۷۶ھ ہجری میں ان کے باپ راجہ شتاب رائے کو "فتنہ ساز" غازی الدین عماد الملک نے صمصام الدولہ (دوم) میر آتش کا نائب مقرر کیا (خلاصۃ التواریخ صفحہ ۱۶۶) اور چند سال بعد جب غالباً ۱۱۷۷ھ ہجری میں بادشاہ وزیر (عماد الملک) کی طرف سے راجہ شتاب رائے کو دیوانی خالصہ شریفہ بہار اور صمصام الدولہ کی جاگیرات بہار و بنگال کے انتظام و بندوبست کی خدمت تفویض ہوئی (سیر المتاخرین صفحہ ۴۹۱) تو اس وقت راجہ شتاب رائے نے اپنے کمسن بیٹے کلیان سنگھ کو عماد الملک کے حضور دہلی میں چھوڑ کر خود عظیم آباد کی راہ لی، بہار میں راجہ رام نرائن نائب بہار کی مزاحمت و مخاصمت کا اندیشہ تھا (خلاصۃ التواریخ صفحہ ۱۷۱) لیکن خوش قسمتی سے راجہ شتاب رائے کے ورود عظیم آباد کے قبل ہی سے میر جعفر اور کرنل کلایو اس شہر میں موجود تھے، چنانچہ میر جعفر اور کرنل کلایو کی معاونت کام آئی، کرنل کے ساتھ راجہ شتاب رائے مرشد آباد پہنچے اور بعد مراجعت کاروبار دیوانی کا مقرر اور فعلی انتظام کیا (سیر المتاخرین صفحہ ۶۵۱)

گھر کا حال گھر والے بہتر جانتے ہیں، اگرچہ کلیان سنگھ اس وقت کمسن تھے مگر اس زمانے کی بعض بہت پتے کی باتیں لکھ گئے ہیں، مثلاً چند سال بعد شتاب رائے کی وطن مالوف کی طرف لوٹنے کی خواہش۔ مسٹر امیٹ صاحب کلاں عظیم آباد کی بہار کے منصب داروں سے بادشاہ ہند سے ان کے تقرب کا حال سنکر میر جعفر اور انگریزوں سے دوستی کا ڈور اڈالنا اور خیر خواہی کی درخواست اور ان کا مندرجہ ذیل جواب

"من سر رشتہ کارہائے کمپنی انگریزی بحضور بادشاہ ہندوستان آنجاں پختہ کردہ ام کہ تمام ملک بنگالہ بے شرکت دیگرے بدخل و تصرف کمپنی انگریز در آمدہ سالہائے دراز قایم ماند"

کرنل کلایو (مختار جمیع کارہائے کمپنی انگریز) سے مرشد آباد میں ملاقات "رفاقت دائمی نواب صاحب و کمپنی انگریز" کا عہد و پیمان اور بطور مژدہ اس کام کے انجام دینے کے بعد "خدمت نیابت صوبہ و نیابت دیوانی صوبہ مع یک لک روپیہ سالیانہ بطریق استمرار اور بہار کی جاگیرات و التمغا کے شتاب رائے اور کنور کلیان سنگھ کو دئے جانے کا قول و قرار، یہ کل باتیں نہایت دلچسپ ہیں، چنانچہ جب مندرجہ بالا قول و قرار پختہ و پرہو گیا تو بقول کلیان سنگھ

"مہاراجہ شتاب رائے و بندہ ہم از اینجا (بہار) ناشتا بہماں آباد محنت ہائے فراواں و سعی ہائے بے پایاں بعمل آوردہ سند صوبہ داری صوبجات بنگالہ و بہار و اڑیسہ بنام میر محمد جعفر خاں و سند دیوانی صوبجات مذکورہ بنام کمپنی انگریزی از حضور بادشاہ ہندوستان کہ در آن وقت عالمگیر ثانی بود حاصل نمودہ حوالہ نواب صاحب و کرنل کلایو صاحب نمودہ" (خلاصۃ التواریخ صفحہ ۵۹)

یہ طویل اور بظاہر موضوع سے غیر متعلق داستان نہ صرف دلچسپ بلکہ بہت ہی اہم ہے، اور اس میں کئی باتیں غور طلب ہیں اس لئے کہ کلیان سنگھ کی ساری سیاسی زندگی کی عمارت اسی بنیاد پر قایم ہوئی جو ان کے باپ مہاراجہ شتاب رائے کے ہاتھوں ڈالی گئی۔ چنانچہ اگر مصنف خلاصۃ التواریخ کا مندرجہ بالا بیان صحیح مان لیا جائے تو ۱۷۶۵ء کے کئی سال قبل ہی دیوانی بنگال و بہار کی بات پختہ ہوگئی تھی اور عہد عالمگیر ثانی ہی میں شتاب رائے کے ذریعہ شاطران مغرب کی چالیں شروع ہوگئی تھیں، بنگال و مدراس کے مراسلات کلایو کی جلد اول میں دو خطوط مورخہ ۱۷ اپریل ۱۷۵۸ء ۱۱۷۱ھ عالمگیر ثانی اور وزیر غازی الدین کے نام ملتے ہیں، جن میں کلایو اپنے گذشتہ خطوط کا حوالہ دیتا ہے جو "چند ماہ قبل" لکھے گئے تھے، ان میں "فدوی شاہنشاہ"

شتاب رائے کے ذریعہ خطوط کے ارسال کا ذکر موجود ہے، اس کے علاوہ ایک مراسلہ شتاب رائے کے مربی وزیر غازی الدین کا کرنل کلایو کے نام موخر الذکر کے عرائض کے جواب میں بھی ہمیں اس جگہ ملتا ہے جس میں میر حبیب خان کے لئے سند صوبہ داری کے ارسال کی خبر ہے، البتہ سند دیوانی کے حصول کے لئے "شتاب رائے کی سعی بے پایاں" کا کوئی دوسرا تحریری ثبوت عہد عالمگیر ثانی میں نہیں ملتا ہے، لیکن یہ یقینی ہے کہ جب شاہزادہ عالی گوہر (شاہ عالم ابن عالمگیر ثانی) کی تسخیر بہار کی مہم کو کوششیں ناکام رہیں (وزیر غازی الدین کے عہد کے معتمد و مراسلات شاہزادہ کے اسیر کئے جانے اور اخراج کے احکامات پر مشتمل کیلنڈر جلد اول میں موجود ہیں، شتاب رائے کی نہ صرف حکمت عملی بلکہ زور بازو بھی ان مواقع پر نمایاں تھا) تو ۱۷۶۰-۶۱ء میں دیوانی کی گفتگو شتاب رائے کے توسط سے شروع ہو گئی تھی، کلایو اور گورنر ولنسی ٹارٹ کے خطوط اس کے شاہد ہیں، چنانچہ کیلنڈر جلد اول میں کئی خطوط اس بحث پر موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شتاب رائے نے شاہ عالم سے دیوانی کا عطیہ پیش کرایا مگر نواب میر قاسم کے سخت احتجاج نے اس امر کو دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھنے پر مجبور کر دیا (مراسلات نمبر ۹۲-۱۲۹۱ و ۴۰-۱۳۳۸، اس ضمن میں قابل ملاحظہ ہیں)

سطور بالا سے معلوم ہوا کہ کلیان سنگھ کا بیان کسی حد تک حقیقت پر مبنی ہے، اگرچہ ان کے سن کا لحاظ کرتے ہوئے "بندہ" کا لفظ بالکل ہی بے معنی ہے اور وعدہ وعید اور قول و قرار کی نوعیت بھی شبہ سے خالی نہیں، مگر اتنا ضرور ہے کہ سابقہ پڑتے ہی شتاب رائے کی دور رس اور مردم شناس نگاہ نے انگریزوں سے دوستی کے نتائج کا اندازہ کر لیا تھا لہٰذا ان کی بہی خواہی میں ہر ممکن کوشش شروع کر دی تھیں۔ میر جعفر نے تو نہیں، البتہ میر قاسم نے ہر ممکن خطرات کا احساس کیا اور اولاً انہیں پوشنے کی کوشش کی، عذر (جو سنا نہ گیا) پیش ہوا "بالفعل ہوائے وطن و دیدن زن و فرزند کہ از مدت چہار سال در بلاد غربت گذاشتہ آمدہ ام لہٰذا افتادہ" اس اثنا میں نواب نے شتاب رائے کی خلوت کی ملاقاتوں (خصوص راجہ رام نرائن سے) کا حال سنا "کاوش ہائے بیجا شروع نمود"، جان کے لالے پڑ گئے۔ ہارے انگریز اس آڑے وقت میں کام آئے، پہلے تو کلکتہ بھیجوا دیا، بعد ازاں مسٹر شنگٹن صاحب کو چک عظیم آباد نے اپنی حفاظت میں دریائے کرمناسا کے پار سد شجاع الدولہ میں پہنچا دیا۔ اس وقت اودھ میں مہاراجہ بنی بہادر کا دار و رہ تھا، فوراً دو ہزار سوار و پیادہ کی رسالداری مل گئی "عقل خداداد اور لیاقت و حسن کار آئی" کے باعث بنی بہادر کے "نفس ناطقہ" اور شجاع الدولہ کے منظور نظر ہو گئے، (خلاصۃ التواریخ ص ۲۶۲-۲۶۹)

بقول کرم علی اوائل ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء میں شتاب رائے جان سلامت لیکر بہار سے اودھ پہنچے (مظفر نامہ صفحہ ۲۷۶) کلیان سنگھ شکر نواب وزیر ملک بنگالہ (شجاع الدولہ) اپنا پہنچنا اس سے "دو نیم سال" قبل (یعنی ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء) میں بتلاتے ہیں (خلاصۃ التواریخ ص ۳۴۶) یہ وہ وقت تھا جب عالمگیر ثانی کی شہادت، مرہٹوں کی تاخت، مغلوں اور روہیلوں کی کشمکش اور ابدالی کی آمد نے دہلی اور اس کے نواح میں ایک خلفشار مچا رکھا تھا، بدامنی عالمگیر ہو رہی تھی، جان و مال محفوظ نہ تھا، چنانچہ شتاب رائے کی ذریات کو دہلی چھوڑنا پڑا۔ بہت ممکن ہے کہ جس وقت شجاع الدولہ کی فوج دتاجی سندھیا کے خلاف نجیب الدولہ روہیلہ کی مدد کر کے سکرتال سے واپس ہوئی ہو تو اس وقت کلیان سنگھ اور ان کا سارا خاندان ساتھ ہو لیا ہو، مگر عقل کسی طرح باور نہیں کر سکتی کہ آٹھ نو سال کا لڑکا دو ہزار سوار اور پیادوں کا رسالدار اور چار ہزار روپیہ کا تنخواہ دار ہو جائے، (خلاصۃ التواریخ ص ۳۴۷) خصوصاً اس حالت میں کہ "جہاندیدہ اور دانائے عصر" باپ کی اسی دربار میں ملازمت کا آغاز اٹھنے ہی بلکہ اس سے کمتر رتبہ سے ہو (خلاصۃ التواریخ ص ۳۳۰) چنانچہ تقریباً ایسی ہی دقت ہمیں اس تفصیلی سرگذشت کی صحت کو تسلیم کرنے میں بھی ہوتی ہے جس میں کلیان سنگھ جنگ بکسر کے قبل و بعد میر قاسم (شکست خوردہ معزول و مفرور نواب بنگال و بہار) کے خلاف جو سازشیں ہوئیں ان میں اپنے ذاتی کارہائے نمایاں کا تذکرہ کرتے ہیں، چنانچہ ہم پہلے تقریباً ۳۸ صفحات پر پھیلی ہوئی طویل داستان کو چند لفظوں میں سمیٹنے اور بعد ازاں اس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔
(خلاصۃ التواریخ صفحات ۳۳۰ لغایت ۳۶۷)

(۱) مہاراجہ شتاب رائے کی امور کمپنی سے دلچسپی برابر قائم رہی، یہی وجہ ہے کہ جب میر قاسم شجاع الدولہ کے پاس بہ امید اعانت پہنچا تو مہاراجہ موصوف نے اپنے متصدی سادھو رام کے ذریعہ سلسلہ جنبانی شروع کر دی اور میر جعفر اور صاحبان انگریز نے اپنے دشمن جانی کے اخراج اور تخریب کے لئے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا، خطوط و عرایض بادشاہ و وزیر کے نام اور تحفے لاکھ ہندی بطور پیشکش شتاب رائے کے پاس سادھو رام کے ذریعہ ارسال کی۔

(۲) شتاب رائے نے ایک وقتی عارضہ کے باعث کلیان سنگھ کے ہاتھ یہ کاغذات مہاراجہ بنی بہادر اور موخر الذکر کی وساطت سے

۱۷ تاریخ مرشد آباد از نواب علی ابراہیم خان۔

نواب وزیر کے پاس بھیجے۔

(۳) کمسن لیکن ہونہار بیٹے (کلیان سنگھ) نے یہ ذمہ دارانہ فرائض بہ حسن و خوبی انجام دیے۔ پہلے انہوں نے بینی بہادر سے ملاقات کی اور (یوں مہاراجہ موصوف سواد خواندن نداشت) مضامین مکتوب پڑھکر سنائے، کل امور کے حسن وقبح پر تشفی بخش گفتگو کی اور بالآخر بینی بہادر کو میر جعفر اور صاحبان انگریز کا "مربی و خیر خواہ" بنا ڈالا، پھر دونوں نواب وزیر کے پاس پہنچے، پہلے بینی بہادر نے کچھ دیر تک نواب سے آہستہ آہستہ گفتگو کی، اس کے بعد کلیان سنگھ کو پیش کیا۔ یہاں بھی موخر الذکر کی بن آئی اور نواب نے کہا "ملتمسات شما را کہ بہ حسن تقریر ادا نمودند قبول نمودم"۔ اس کے بعد دونوں رخصت ہوئے، نواب کا خواجہ سرا راستہ سے کلیان سنگھ کو واپس لے گیا، ان کی کمر بند سے نواب نے کاغذات اپنے ہاتھ سے نکالے اور ان میں سے کچھ لالکی ہنڈی لیکر اپنی جیب میں رکھ لی اور سادھو رام کی عرضی میں ہنڈی مذکور کی عبارت پر اپنے ہاتھ سے روشنائی اونڈیل دی تاکہ بادشاہ کو اس کی خبر نہ ہونے پائے۔ جب بینی بہادر نے یہ سنا مبارک باد دی کہ اب تیر نشانہ پر لگا۔

(۴) شتاب رائے ساری روئداد سنکر خوش ہوئے اور دوسرے روز بھی بادشاہ و وزیر کے پاس وکالت کے لئے کلیان سنگھ ہی کو منتخب کیا، یہ مرحلہ بھی حسب خواہ انجام پذیر ہوا۔ چنانچہ خلاصۃ التواریخ کی متعلقہ عبارت قابل ملاحظہ ہے:

"تا دو گھڑی کامل دریں باب فیمابین بندہ و حضرت بادشاہ و نواب وزیر جواب سوالہا و تکرار ہا و مناظرہا بمیان ماند، آخر الامر بفضل الٰہی و ربانی معاملہ صورت بنگالہ و بہار بر بست و چہار لک روپیہ سالیانہ و دو لک روپیہ سالیانہ نواب وزیر و دو لک روپیہ نقد یکمشت بطریق پیشکش و عطائے سند صوبہ داری صوبہ بنگالہ و صوبہ اڑیسہ و صوبہ بہار بنام میر محمد جعفر خان و سند دیوانی مذکور بنام کمپنی انگریز بہادر مع خلاع فاخرہ برائے نواب صاحب و سرداران جماعۃ انگلشیہ تقرر عہد و میثاق محبت و وداد بتجدید حکم حضور شرف انفاذ یافت۔" (صفحات ۳۴۵ و ۳۴۶)

اس کے بعد اسناد، عہد نامے اور جواب عرائض منشی خانہ میں تیار ہوئے اور کلیان سنگھ کو سپرد کئے گئے، موخر الذکر نے لالہ کشمیری مل سے شجاع الدولہ کو چھ لاکھ روپے دلوائے، رقم مذکور کی رسید نواب کے دستخط اور مہر کے ساتھ وقت تحریر مصنف خلاصۃ التواریخ واپس موجود تھی۔

(۵) ان اسناد، عہد ناموں، جواب عرائض اور خلعت ہائے فاخرہ کو میر جعفر اور سرداران انگلشیہ کے پاس جو اس وقت کرمناسا کے دوسری جانب خیمہ زن تھے، پہنچانے کی خدمت بھی کلیان سنگھ ہی کو تفویض ہوئی تاکہ وہاں بھی ان کی (عزت و حرمت) کی بنیاد قایم ہو۔ کلیان سنگھ نے ملازمت کا عذر کیا، نواب وزیر نے نہ صرف اجازت دی بلکہ خلعت مشمل بر چہ سر و پیچ مرصع بقبضہ شمشیر، بالکی جھالردار، ایک بے نظیر فیل و نیز راجہ کا خطاب بھی عطا کیا۔ راجہ کلیان سنگھ نے اپنے چچا مہتاب رائے کو اپنی نیابت میں نواب وزیر کے حضور میں چھوڑا اور اپنے رسالہ کے دو سو سوار اور تین سو پیادوں کو ساتھ لیکر حشم و خدم کے ساتھ الہ آباد سے مشرق کی جانب روانہ ہوگئے۔

(۶) دو روز کے بعد بنارس پہنچے، راجہ ہلوند سنگھ (کہ آشنائے قدیم من بود) سے سرسری ملاقات کی اور اس سے میجر کارنگ کے نام ایک خط لیا اور آگے روانہ ہوگئے، دو روز کے بعد دہل لشکر میر جعفر ہوئے، سادھو رام نے ملاقات کی اور میر جعفر اور انگریزوں کے حالات سے مطلع کیا۔

(۷) جس وقت کلیان سنگھ لشکر نواب میں پہنچے میجر کارنگ، میجر ادم، میجر فلیچر، میجر نوکس اور دو تین دوسرے صاحبان نے سرو قد اٹھ کر تعظیم کی، انگلستان کے اس کے بعد جب رخصت ہوئے تخلیہ ہوا، میر جعفر، سادھو رام، راجہ کلیان سنگھ اور انگریزوں کے درمیان راز دارانہ گفتگو ہونے لگی، خلط ملبس ہوئے، دو گھڑی کامل باتیں جاری رہیں اور مشورے ہوتے رہے، راجہ نے اودھ والہ آباد کے حالات بتائے، اوضاع و اطوار، تعداد فوج اور مالی القصر کا انکشاف کیا، پھر صحبت تمام ہوئی۔ دوسرے روز تین گھڑی دن چڑھے نواب میر جعفر مع انگریزوں کے پایادہ بادشاہ و وزیر کے وکیل یعنی راجہ کلیان سنگھ کے پاس پہنچے، موافق رضا بطلہ سلاطین دو زرہ امیر جعفر اور انگریز سرداروں کو خلعتیں پہنائی گئیں، میر جعفر نے ایک ہزار ایک اور سرانگریز سردار نے ایک سو ایک اشرفیاں بادشاہ کی نذر کے لئے پیش کیں، سند صوبہ داری اور سند دیوانی بنام کمپنی انگریز کو راجہ بلند پڑھ کر سنائی گئی۔ راجہ کلیان سنگھ کو بھی خلعت شش پارچہ، پچاس ہزار روپے نقد بطریق انعام، اکیس بلد خوان پستول و بندوق اور بعض دیگر تحفہ جات فرنگ پیش کئے گئے۔ راجہ موصوف نے بھی پانچ اشرفیاں بطور نذر میر جعفر کے ہاتھ پر رکھ دیں، ہر طرف سے مبارک باد کا غل ہوا، خلاصہ یہ کہ آدھے دن تک یہ جشن قایم رہا۔

(۸) بعد ازاں راجہ کلیان سنگھ نے سادھو رام کو بھی خلعت دلوایا اور اس کو دیوانی بادشاہی اور اپنی جاگیرات کے بندوبست کے لئے عظیم آباد روانہ

کرنے کے بعد راجہ بلوند سنگھ (کہ بنائے دوستی راجہ مذکور با کمپنی انگریز درست گردانیدہ بودم) کے عریضہ کا جواب حاصل کیا۔ اور سات روز انگریزی لشکر میں رہنے (ہر روز دو دفعہ ملاقات کر کے کارخود بوجہ احسن ساختم) کے بعد رخصت ہوئے۔ اور کرنا ساغور کر کے رام نگر میں پہنچے، بلوند سنگھ سے ملاقات کی، جواب عریضہ حوالہ کیا، (او را در ہر حال مطیع دفرمانبردار کمپنی و صاحبان انگریز ساختم) رات کو وہیں قیام کیا، پھر روانہ ہوئے، پانچ چھ روز میں بمقام جیوسی (الہ آباد) شجاع الدولہ کے لشکر میں پہنچے،

(۹) وہاں پہونچکر فی الفور مہاراجہ بینی بہادر سے خلوت میں ملاقات کی، سب ماجرا کہہ سنایا لیکن موخر الذکر سے جب یہاں کے حالات معلوم ہوئے (کیونکہ میر قاسم حصول سند اور درستگی معاملہ کی خبر سنکر نواب سالار جنگ کے ذریعہ نواب شجاع الدولہ کی خدمت میں حاضر ہوا، جزائے وفوج شروع کی، شتاب رائے کو جمیع فتنہ و فساد کا بانی اور اپنا جانی دشمن قرار دیا اور اپنی دستار نواب وزیر کے قدموں پر رکھ کر اور دس لاکھ کی رقم پیش کر کے درخواست کی کہ شتاب رائے کا خاتمہ کر دیا جائے، لیکن نواب وزیر نے بدنامی کے ڈر سے استمداد و کمک کا قول و قرار کیا مگر شتاب رائے کو محض پرتاب گڈھ بھیجدینے پر اکتفا کی) تو راجہ کلیان سنگھ کے ہاتھ کے طوطے اُڑ گئے، بینی بہادر نے تسلی دی اور وعدہ کیا کہ "سرشتہ محبت و وداد صاحبان عالیشان انگریز در ہر صورت از دست نخواہند داد کہ آخر بکار آن صاحب خواہد آمد" خود شتاب رائے کے پرتاب گڈھ کی طرف جانے سے قبل بینی بہادر سے ملاقات کی تھی، اور "گفتگوئے کہ بائست نمودہ وجمیع مراتب را نمایندہ مرخص شد" یہی وجہ تھی کہ بینی بہادر اپنے عہد پر دل سے قایم رہا "کہ در جنگ بکسر تن ندادہ"

(۱۰) اس کے بعد کلیان سنگھ نواب وزیر کے بجرے کو حاضر ہوئے، بے رسمی پائی، نہایت دلتنگ ہوئے، بارے جب تخلیہ ہوا نواب نے راجہ کو سینہ سے لپٹالیا، خیر و عافیت پوچھی، اطمینان دلایا کہ بصلاحت شتاب رائے کو پرتاب گڈھ روانہ کیا گیا ہے، اور بدستور معمول بکلیان سنگھ اپنی جگہ پر سرفراز رہیں گے، البتہ موذی میر قاسم کے سامنے حضور میں آنے کی مخالفت ہوئی، کلیان سنگھ نے موقع پاکر میر قاسم کی تلون مزاجی، انگریزوں کی راسخ الاعتقادی اور باوجود قلت فوج جنگ کے کاموں میں دلیر روگا ہونے پر ایک پُرزور تقریر کر دی جس کی جواب میں نواب نے بس اتنا کہا کہ "باید دید"

شتاب رائے کی انگریزوں کی خیر خواہی، مسلسل رسل و رسائل اور صاد موہرام گئے ذریعہ سلسلہ جنبانیوں کا ثبوت کیلنڈر جلد اول میں موجود ہے۔ بیٹے کی سیاسی تعلیم کے لئے سوانح کی فراہمی کی خواہش و کوشش بھی ایک فطری اور قرین قیاس امر ہے، چنانچہ بینی بہادر کی حامیانہ بنگال کی جانب نظر عنایت، بلوند سنگھ راجہ بنارس کا صاحبان انگلشیہ سے ارتباط، ان دونوں کی جنگ بکسر میں اپنے آقا نواب وزیر سے میر قاسم اور انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث غداری کے شواہد کی بھی کمی نہیں۔ سندھیا کا معاملہ بھی شجاع الدولہ کی طینت سے بعید نہ تھا اور نواب کی مہر و دستخط سمیت رسید کی مصنف خلاصۃ التواریخ کے پاس بروقت مخبر موجود کی نظر انداز نہیں کی جاسکتی، گورنر بنگال اور انگریز سرداروں کی نواب وزیر سے مراسلات، صوبہ داری کے اسناد اور میر قاسم کے خلاف کارروائیوں کی اسناد بھی مختلف دوسرے ذرایع سے ثابت ہے، شجاع الدولہ کا میر قاسم کو سبز باغ دکھانا، تعلقات کی کشیدگی، موخر الذکر کے پے بہ پے چار گی، سالار جنگ کی وساطت سے نواب وزیر کا رام کیا جانا، شتاب رائے کا بصلاحت الگ کیا جانا، میر جعفر اور اس کے انگریز حامیوں کا کمیٹا سا اسمبلی جمع ہونا، صوبہ جات مشرقی کی صوبہ داری کے اسناد اور غالباً ۲۴ لاکھ سالیانہ خراج کی گفتگو، یہ سب باتیں بھی تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔

سطور بالا میں جو کچھ لکھا گیا وہ اجمالی تفصیلی سرگذشت، بیانات کے چشمدید اور معتبر اوراق کے ذاتی مشاہدہ پتہ دیتی ہے مگر ان حقایق کے باوجود کلیان سنگھ کے بیانات خصوصاً ان کی ذاتی کارگذاریوں کی لمبی چوڑی فہرست کی حقیقت صحت کو تامل تسلیم کرنے میں چند دقتیں حائل ہیں، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ۱۷۷۶ء میں (جس قت کے واقعات حوالہ قلم کئے گئے ہیں) ان کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی، ظاہر ہے کہ بادشاہ و وزیر اور انگریز ایسے ماہرین سیاست کے درمیان سفارت و وکالت کے اہم اور ذمہ دارانہ فرایض کا بار محض ایک نوخیز لڑکے خواہ وہ کتنا ہی ہلا کا ذہین اور معاملہ فہم کیوں نہ ہو، کے کمزور کاندھوں پر ہرگز ڈالا نہیں جاسکتا، البتہ بار اسیاست کسی ماہر شاطر کے ساتھ شریک وسیمت کسی حد تک تسلیم کی جاسکتی ہے، نیز راجہ بلوند سنگھ کے "آشنائے قدیم" ہونے کا فقرہ بھی کچھ طلب ہے۔ بلوند سنگھ اور مہاراجہ بینی بہادر جیسے جہاندیدہ صمصر اور با اقتدار اشخاص اور کمپنی انگریز کے درمیان "بنائے دوستی"

سلہ مراجیکا جو کیلنڈر جلد اوّل کے خطوط نمبر ۲۴۵۹ - ۲۴۶۰ - ۲۴۶۸ وغیرہ راجہ ہنمانت رائے کو لکھتے ہیں، راجہ بلوند سنگھ نے عہد موافق کی مطابق جنگ میں شرکت نہیں کی اور یا تو وہ سرحد جانب جاری کا بہانہ کر کے پڑے رہے" نسخۂ بلوند نامہ اور مخطوطات بریٹش میوزیم میں اسی ضمن میں قابل ملاحظہ ہے۔ سلہ کیلنڈر اور گلارا کے خطوط مندرجہ جنگال وغیرہ پیرسس سلہ سیر المتاخرین۔ تحفہ تازہ کلارا کے خطوط مورخہ ماہ مارچ و فروری بروسس اور اودھ کی تاریخیں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

کے قائم کرنے کا دعویٰ کوئی معنی نہیں رکھتا، جب ہم ان دونوں کو تین سال قبل شاہ عالم کے خلاف نواب صادق علی خاں عرف میرن (اسپر میر جعفر) راجہ رام نرائن اور کرنل کلایو سے خطوط کتابت کرتے ہوئے پاتے ہیں[1]۔ ہم نے مانا کہ انگریزوں کے مرتب کردہ دفاتر ہر طرح جامع نہیں اور بہت ممکن ہے کہ کچھ چھپنے کی باتیں منظر عام پر لائی جانی مناسب نہ سمجھی گئی ہوں، مگر جبکہ شتاب رائے اور شاہ وزیر کے دربار کے بہتیرے اشخاص کی خفیہ مراسلات کیلنڈر اور بنگال و مدراس پیپرس میں موجود ہیں تو پھر کلیان سنگھ کی کارروائیوں کے درج کتب نہ ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ کلیان سنگھ نے خلاصۃ التواریخ ایک انگریز کی فرمائش پر آخر عمر اور نابینا ہونے کے بعد لکھوائی تھی، لیکن چونکہ اپنے متوسلین کی احسان ناشناسی اور انگریزوں کی بہتیری بڑھتی ہوئی لالچ کے باعث سب کچھ کھو چکے تھے، پھر بھی اقتدار و جاگیرات کی بحالی و واگذاشت کی فطری امید موہوم موجود تھی اس لئے تاریخ کے ساتھ لگے ہاتھوں اپنے کیس کی مسل بھی تیار کرنے گئے، لیکن افسوس کہ موصوف کی یہ سعی مشکور نہ ہو سکی۔

ہم عصر مورخین اور کیلنڈر کے خطوط ہمیں بتلاتے ہیں کہ شتاب رائے عظیم آباد سے نکل کر شجاع الدولہ کے نوکر ہوئے۔ آٹھ مہینہ لشکر شاہی میں رہے بعد ازاں بنی بہادر نائب وزیر کے پاس بھیجے گئے، برابر اس کی رفاقت میں رہے، اور انگریزوں کے خطوط بادشاہ اور وزیر کے پاس پہنچاتے رہے۔ ایک خط میں جو ساتویں دسمبر ۱۷۶۳ء کو داخل دفتر ہوا شتاب رائے میجر ایڈم کے پاس اپنے وکیل سادھو رام کے بھیجنے کا ذکر کرتے ہیں اور میر جعفر اور انگریزوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ مناسب عنوان سے بادشاہ و وزیر سے صوبہ داری کے اسناد کی درخواست کریں تاکہ میر قاسم کی حمایت کا خیال جاتا رہے اور اس "ظالم" کا بھی جی چھوٹ جائے (کیلنڈر جلد اول صفحہ ۳۵۶) نیز اسی تاریخ کا میجر ایڈم کے نام بنی بہادر کا بھی ایک خط ہے جس میں سند کا بھیجا جانا، شاہی پیشکش، نواب وزیر کا نذرانہ اور جاگیرات کے معاملات طے ہونے اور معاہدات کے پہنچنے پر منحصر رکھا گیا ہے، (کیلنڈر جلد اول صفحہ ۳۵۷) بقول کرم علی بنی بہادر سے جو نواب وزیر کے حکم سے سر حد کر مناسا پر موجود تھا شکست خوردہ میر قاسم نے، ارجمادی الاول ۱۱۷۷ھ کو ملاقات کی "صحبت بہم خورد" بوجوہ چند کدورت بڑھتی گئی (مظفر نامہ صفحہ ۸۸) چنانچہ بنی بہادر "برہمن مطالب مرجوعۂ عالی جاہ و مرغب مصالحہ و معاملہ با محمد جعفر خان و فرقۂ انگلستان بود" (سیر المتاخرین صفحہ ۷۴۵) میر جعفر ہمراہ صاحبان انگریز کرمناسا کے پاس اپنی سرحد میں رودخانہ درگاوتی پر پہنچکر چار ماہ خیمہ زن رہا، "جواب و سوال خزانہ شاہی رو داد" لیکن باوجود "پیشکش و نذورات شجاع الدولہ" (کہ در سر ہوائے تسخیر ہنگالہ بود") کسی صورت راضی نہیں ہوا، (مظفر نامہ صفحہ ۸۵) - میجر ایڈم کے نام راجہ شتاب رائے کا خط مورخہ ۲۰ نومبر ۱۷۶۳ء میر قاسم کے کرمناسا پہنچنے، میجر اور میر جعفر کے لئے خلعت کی تیاری اور اسے پہنچانے کے لئے راجہ کا ایک سو سواروں کے ساتھ روانہ ہونے کا پتہ دیتا ہے، نیز اسی خط سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شجاع الدولہ کی منیت محض میر قاسم کی دولت حاصل کرنی تھی اور خوف شر سے اسے اپنے زیر نگرانی رکھنا تھا (کیلنڈر جلد اول صفحہ ۳۶۶) ماسوا اس کے سند کا شتاب رائے کو حوالہ کیا جانا۔ لیکن میر قاسم کے مکتوب کے باعث رک جانا، خطوط نمبر ۲۰۹۶ - اور ۲۱۲۵ سے بھی ظاہر ہوتا ہے - علاوہ ازیں مکتوب نمبر ۲۱۲۹ سے تو قطعی طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بکسر میں ہی سادھو رام کے ذریعہ میجر کا رتک سند پہنچ چکی تھی، نیز اس سے بھی واضح مکتوب نمبر ۲۱۵۴ ہے جس میں بنگال و بہار و اڑیسہ کی صوبہ داری کے اسناد کا ۲۴ مارچ ۱۷۶۴ء کو راجہ شتاب رائے کے نائب سادھو رام کے ہاتھ بکسر میں پہنچنے کا تذکرہ ہے، ممکن ہے کہ کلیان سنگھ سادھو رام کے ساتھ کر دئے گئے ہوں لیکن اس کا کوئی قطعی ثبوت ہمیں نہیں ملتا۔

میر قاسم اور بادشاہ و وزیر کے حملہ بہار کے اسباب اور افواج ثلاثہ، میر جعفر اور انگریزوں کی تسخیر پہاڑی عظیم آباد و پٹنہ) اور بکسر میں جنگ کی تفصیل سے ہمیں زیادہ بحث نہیں، اس لئے کہ کلیان سنگھ اس ضمن میں اپنے کسی کارنمایاں کا ذکر نہیں کرتے، البتہ اتنا ضرور لکھتے ہیں کہ پہلواری کے پندرہ روز قیام میں لشکر شاہی میں یہ خود بھی موجود تھے اور سادھو رام (منصدی راجہ شتاب رائے در عظیم آباد) کے ذریعہ بادشاہ کی دہ پردہ توجہ

---

[1] علاوہ کیلنڈر اور انگریزی ذرائع ایک نہایت نادر الوجود قلمی نسخہ "بیاض راجہ رام نرائن" پر مشتمل موسوم "بہ دستور لال" راقم السطور کے پاس موجود ہے، ان خطوط کے حوالے اور ضروری اقتباسات ایک انگریزی مقالہ میں جو ہسٹری کانگریس کلکتہ کے لئے لکھے گئے ہیں پا سکتے ہیں۔ [2] صاحب شفق مسٹر ارہم ویلیڈ بہادر صاحب کلاکورٹ پیل عظیم آباد معرفت ... [3] پیشہ کنور دولت سنگھ تکلیف دہ ایجی ٹیشن داد و تحد کہ مفصل حالات و واقعات میر محمد قاسم خاں بقلم خود مرتبہ مظفر ایشان رآورد، (خلاصۃ التواریخ صفحہ ۱۱) [4] ان میں سب سے زیادہ راجہ خیالی رام کی مہاراجہ کلیان سنگھ نے اپنی تصنیف میں خبر لی ہے - ملاحظہ ہو خلاصۃ التواریخ -

وارثاط بالمی، بلوند سنگھ کے رسوخ اور اپنی اور اپنے والد بزرگوار (عظیم پرتاب گڑھ) کی دولتخواہی، لشکر کمپنی میں پیغام رسانی اور صاحبان انگریز سے کامو کی بہتری ہیں حتی الوسع کوشاں رہے (خلاصۃ التواریخ صفحات ۳۷۳ و ۳۷۴) اور بچ پہاڑی کی جنگ کے فوراً بعد (جس میں بینی بہادر اور بلوند سنگھ ارجانہ جلبیدہ بودند) یہ پوشیدہ طور پر میجر کارنک کے پاس پہنچے "انچہ گفتنی و پرسیدنی بود گفتہ پرسیدہ ہمانوقت بر گشتم و بہ بچھمہ کاوہ خود رسیدم" (خلاصۃ التواریخ صفحہ ۳۷۸)

جنگ مدھ بچ پہاڑی کے بعد تقریباً ایک ماہ تک "جنگ زرگری و قراولی" ہوتی رہی، یہاں تک کہ بارش کا موسم آپہنچا، نواب وزیر نے براہ منیر شریف بکسر کی راہ لی، اور وہاں پہنچکر پڑاؤ ڈالدیا۔ بینی بہادر کی دشمنی سوعودہ اخراجات جنگ کی عدم ادائگی "تن ندادن بجنگ حصار عظیم آباد" بدگوئی اور دیر کرنے وجوہات کے باعث میر قاسم مقید ہوا۔ اور اس کا مال و اسباب ضبط ہوا۔ پھر صلح کی سلسلہ جنبانی کے لیے بینی بہادر اور کلیان سنگھ کے مشورہ سے رشتاب رائے پرتاب گڑھ سے بلوائے گئے اور ناقابل قبول شرائط (تیس لاکھ سالانہ خراج بنگال، تمامی صوبہ بہار الا قریب بحاش نالہ خرچ صفر) کو منوانے کے لئے عظیم آباد اور وہاں سے کلکتہ پہنچ گئے۔ (خلاصۃ التواریخ صفحات ۳۸۴ لغایت ۳۹۱) یہاں گرم عملی کا جشمدید بیان نہایت دلچسپ ہے۔ "میر محمد جعفر خاں کہ بدقولی و بدعہدی انگریز مشاہدہ کردہ بود اکثر اعضی صلح فرستادہ رائی بہ تسلیم فرمان صوبہ عظیم آباد شد شرط آنکہ بر تفویض مہمات صوبہ باشند مغلوبیت نواب وزیر مطلق نمی خواست"، (منظر نامہ صفحہ ۸۹) لیکن انگریز پر کرنے والے کتنے شجاع الدولہ کو بھی کثرت فوج پر زعم تھا جو جنگ بکسر میں میجر منرو کے ہاتھوں بلکہ اپنی غفلت بینی بہادر کے بچوں فرار اور بلوند سنگھ کی غداری سے کوتاہی کے باعث ٹوٹا۔ بقول کرم علی بدنام میر جعفر نے اپنی اور انگریزوں کی ان فتوحات کی نذر نہ لی "بلکہ بزبان آورد کہ بصحبت و ہمدستی ایشان بسر آورد کہ بود آں ہم بباد رفت"، (منظر نامہ صفحہ ۹۱)

اس کے برعکس ہاقت مآب بادشاہ سالمات کا حال سنئے "از جائے خود حرکت نہ کردہ بودند"، بلکہ گورنر اور میجر کو اپنے خطوط میں ہدیہ تہنیک پیش کرتے ہیں اور ان کی فتح خود اپنی فتح قرار دیتے ہیں، کمپنی اور انگریزوں کی بہتری میں کوشاں رہنے کا وعدہ فرماتے ہیں اور اس ضمن میں تفصیلی حالات کو راجہ شتاب رائے پر محمول کرتے ہیں، (کیلنڈر جلد اول مکتوبات نمبر ۲۴۶۷ و ۲۴۶۹) بعد جنگ شجاع الدولہ نے بینی بہادر اور کلیان سنگھ کو موقوف کے پاس بھیجکر دریائے گنگا پر کے نواب وزیر کے ساتھ الہ آباد کو روانہ ہوا میں لیکن "آنحضرت بسبب اینکہ معرفت مہاراجہ شتاب رائے بہادر زبان بست و رفاقت جماعۃ انگلشیہ در کوشش (کلکتہ) مستحکم بودند ازخائے خود نہ جنبیدند"، کلیان سنگھ لشکر بادشاہ میں ٹھیر گئے اور "سشقہ خاص بادشاہ" اپنے خطوں ملفوف کرکے بیغیر منرو سپہ سالار افواج انگریزی کے پاس بھیجا اور بادشاہ کی ملازمت پر آمادہ کیا، نواب منیر الدولہ (مورث خاندان نوابان بھکنا پہاڑی پٹنہ) اور راجہ کلیان سنگھ پیشوائی کو بھیجے گئے (خلاصہ صفحہ ۴۰۱-۴۰۲) چنانچہ شاہ عالم کا ایک دستخطی خط میجر منرو اور کمیشنر اسٹیلس کی ملازمت کی تصدیق کرتا ہے جس میں "غلام محمد" "سخاوت الدولہ" "(کہ دیدانچہ دید)" کو مہلت نہ دئے جانے کا پرزور مشورہ دیا جاتا ہے (کیلنڈر جلد اول مکتوب نمبر ۲۴۸۵) کلیان سنگھ کھیلا کھیلا کر بچوں کے والے تھے، منیر صاحب سے تخلیہ میں ملاقاتیں کیں "قسمیکہ بموجب گفتہ پدر خود حضرت قدر قدرت راجہ عہدہ علیشان کمپنی قایم داشتہ از مراہی نواب وزیر باز داشتہ بود اظہار نمود"، میجر نے خوش ہوکر اپنے ساتھ رہنے کی دعوت دی "من گفتہ کہ بر ہمین کار رسن ہمانجا ماندہ ام پس رخصت شدہ بخیمہ خود کہ در لشکر بادشاہ بود آمدم ..... و وقیقہ از دقائق حسن خدمات کمپنی انگریز واگذاشتم" (خلاصۃ التواریخ صفحہ ۴۰۳)

شکست خوردہ نواب وزیر کا لکھنو اور وہاں سے روہیلوں کے علاقہ میں جانا، ان کی اعانت حاصل کرنے کی بے فائدہ کوشش کرنی، انگریزوں کا حملہ آور ہونا، الہ آباد کی تسخیر، میر قاسم کے حوالہ کئے جانے پر صلح کا دار و مدار، اور نواب وزیر کا پیہم انکار، نواح کوڑہ جہان آباد میں جنگ، نواب زیر شکست خوردہ کا بہار اور بنارس کی طرف بھاگنا، میر قاسم کا مارا جانا، شکست کھانا بالآخر احمد خاں بنگش نواب فرخ آباد کے مشورہ کو "صلح نمودن با انگریزان بوساطت مہاراجہ شتاب رائے بہادر والد ماجد خاکسار (کلیان سنگھ)" ان امور کی تفصیل میرے موضوع سے خارج ہے، البتہ اتنا کہنا ضروری ہے کہ جب شتاب رائے کلکتہ سے جنرل کارنک کے ہمراہ بنارس پہنچے تو کلیان سنگھ ان دونوں کی ملازمت سے فائز ہوئے اور "منسلک بسلک ملازمان کمپنی انگریز بہادر گردید" (خلاصۃ التواریخ صفحہ ۴۱۱) شتاب رائے کے ذریعہ نواب نجف خاں رفیق کمپنی اور ملازم بادشاہ ہوئے، الہ آباد اور جنگل کوڑہ جہان آباد کا بندوبست کیا گیا اور اس کے ۹ لاکھ روپے محاصل بادشاہ کے مصارف کے لئے مقرر ہوئے، اور بادشاہ کو

قلعہ الہ آباد میں مقیم کر دیا گیا - بنی بہادر کے فرار کے باعث کمپنی کی طرف سے شتاب رائے کو خلعت نیابت صوبہ نواب وزیر اور باپ کی نیابت بیٹے (کلیان سنگھ) کو عطا کی گئی - شتاب رائے، منیر الدولہ اور کلیان سنگھ تینوں، جنگ ثانی میں شجاع الدولہ کے خلاف انگریزوں کے ساتھ رہے، باپ اور بیٹے دونوں نے اس جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دئے، کلیان سنگھ کپتان سلیٹن کے ہمراہ پیش قدمی کر کے گولہ اندازی میں شریک رہے (خلاصۃ التواریخ صفحات ۴۱۲ - ۴۱۹) بالآخر شکست کھا کر جب شجاع الدولہ نے سپر ڈال دی اور انگریزوں کے رحم و کرم پر خود کو چھوڑ دیا تو شتاب رائے کی وساطت سعی و اہتمام سے صلحنامہ ہوا، اسناد صوبہ داری بنگالہ و بہار و اڑیسہ بنام نواب ناظم بنگالہ اور سند دیوانی صوبجات مذکور بنام کمپنی انگریز شاہ عالم بادشاہ کی طرف سے عطا ہوئی، صوبہ الہ آباد اور چکلہ کوڑہ جہان آباد مصارف بادشاہ کے لئے مخصوص کیا گیا، صوبہ اودھ بدستور سابق نواب وزیر کے پاس بحال و برقرار رہا اور موخر الذکر نے پچاس لاکھ روپے نقد اخراجات جنگ کے لئے اور قلعہ چنار انگریزوں کو دیدیئے - بلاشبہ شتاب رائے نے شجاع الدولہ سے اس موقع پر نہایت خلوص اور وفاداری برتی اور کھویا ہوا ملک واپس لایا، اگرچہ انگریزوں کی مصلحت اس وقت اسی کی مقتضی تھی -

میر جعفر کا انتقال، نجم الدولہ کی مسند نشینی، کلایو کا انگلستان سے مختار کار امور کمپنی ہو کر ہندوستان واپس آنا، میر محمد کاظم (برادر میر جعفر) کی نیابت صوبہ بہار، دھیرج نرائن (برادر راجہ رام نرائن) کا پہلے دیوانی سرکار بہار، بعد ازاں میر کاظم کی جگہ نائب ناظم بہار ہونا، شتاب رائے کی دیوانی بادشاہی خالصہ شریفہ صوبہ بہار، کلیان سنگھ کی نیابت دیوانی خالصہ اور سادھو رام کی نائب مختاری، لارڈ کلایو کا سفر الہ آباد، استحکام بنائے صلح و آشتی، دیوانی کمپنی کا باضابطہ اجراء لارڈ موصوف کی شتاب رائے اور کلیان سنگھ پر مہربانیاں، بحالی دیوانی و التفاتہ و جاگیرات اور کمپنی کی طرف سے قریب ایک لاکھ روپیہ کا سالانہ محصول ..... وبطریق استمرار بہر و دستخط لارڈ موصوف کلیان سنگھ کے نام مقرر کیا جانا، سفر مشرق، شتاب رائے کا کلیان سنگھ کو عظیم آباد چھوڑ کر کلکتہ جانا، مسٹر مڈلٹن صاحب کلان عظیم آبادگی کلیان سنگھ پر نظر عنایت، شتاب رائے کا ۱۱۷۳ھ فصلی میں عظیم آباد آنا، چھیرہ میں کلایو، شجاع الدولہ اور بلوند سنگھ کا ۱۱۷۶ھ میں اجتماع، راجہ بنارس اور نواب وزیر کے درمیان بذریعہ شتاب رائے صفائی معاملات، شتاب رائے کا پہلے دھیرج نرائن کے ساتھ بہار کا نائب ناظم اور نائب دیوان ہونا اور قلعہ عظیم آباد میں (کہ در آنوقت کچہری نظامت در آن مقرر شدہ بود) اپنے دولت خانہ (موجودہ بنیا باوس) سے نہایت شکوہ و تجمل کے ساتھ پہنچکر دھیرج نرائن کے پہلو میں مسند نشین ہونا، پھر ۱۱۷۵ھ میں دھیرج نرائن کے تغلب بے شعوری اور طمع کے باعث معزولی اور مہاراجہ شتاب رائے کا "منصب بلند پایہ نیابت صوبہ بہار" بر محمد رضا خاں مظفر جنگ کے معائنہ حساب و کتاب کے بعد تفویض ہونا (مظفر نامہ صفحہ ۹۷)، کلیان سنگھ کا نیابت پر تقرر (خلاصۃ التواریخ صفحہ ۴۵۶)، شتاب رائے کا حسن انتظام، انصرام معاملات مالی و ملکی، السداد خیانت، انفصال مقدمات اور ۱۱۷۸ھ کے قحط عظیم میں خلایق کثیر کی دستگیری اور ان کی قوت لایموت کی بہم رسانی ۱۱۷۵ھ میں بعض عمال کی بے شعوری اور بدانتظامی کے باعث بنگال و بہار میں کونسل انگریزی کا قایم ہونا، شتاب رائے کے متعلق فتنہ انداز وں کا "ہتانہ تقلب و تصرف ..... کہ سراسر کذب و دروغ بود"، شتاب رائے کی نیابت صوبہ سے تغیری، کلکتہ میں مقدمات، کلیان سنگھ کا عاملان، مالگذاری صوبہ بہار اور عمال نظامت سے جواب و سوال، کاغذات کی رد و بکاری کا بہ مہر و دستخط نواب ہوشیار جنگ (جارج والنسی ٹارٹ برادر گورنر) حاصل کرنا اور ان کی نقل بھیجکر باپ کے استخلاص کی کامیاب کوشش، بالآخر شتاب رائے کی برأت لیکن رنج و غصہ کے باعث اسہال کے عارضہ میں مبتلا ہونا، کلکتہ سے نیابت صوبہ پر بحال ہو کر ۱۱۸۱ھ میں عظیم آباد پہنچنا، لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد بروز سہ شنبہ ۱۹ جمادی الثانی ۱۱۸۷ھ مطابق ۶ آسن سنہ ۱۸۱۱ فصلی کو وفات پانا اور پھری گھاٹ میں واہ کر کے رفع بدنامی کے خیال سے گورنر جنرل ہسٹنگ کا مہاراجہ کلیان سنگھ کو عین عالم شباب میں باپ کی جگہ مامور کرنا اور جاگیرات وغیرہ کی بحالی "تا باشتاب رائے کینہ

۱؎ کیلکٹر جلد اول کے مکتوب نمبر ۲۸۱۲ مورخہ ۲۸ جنوری ۱۷۶۵ء میں راجہ کلیان سنگھ کی نیابت دیوانی صوبہ بہار کا پروانہ کا ذکر پایا جاتا ہے - ۲؎ خلاصۃ التواریخ ۴۸۹-۴۹۰ اس ضمن میں کلیان سنگھ کی صاحب سیر المتاخرین (نواب غلام حسین) سے گفتگو سوال و جواب اور اول الذکر کے اشارات قابل ملاحظہ ہیں - ۳؎ عقائد او و پرسش اگرچہ مطابق ہنود نہ بود بلکہ طرف اسلام غالب داشت اما بنا بر استمالت قلوب اقوام و مصلحتہائے دیگر موافق مشرب ہنود جسد شش برادر آتش سوختند (سیر المتاخرین مطبوعہ نولکشور) موجودہ بنیا ہاؤس جس میں بادشاہ نواب گورنس اسکول قایم ہے پہلے مہاراجہ شتاب رائے کی ملکیت تھی، چونکہ راجہ بنیا نے کلیان سنگھ کو مہاراجہ کی مغائی کے ثبوت بہم پہنچانے میں بہت مدد دی تھی اسلئے یہ عمارت راجہ بنیا کو دیدی گئی تھی جہاں مہاراجہ کی لاش جلائی گئی - وہاں ایک چبوترہ اور ایک پختہ چوکی اور ڈوم کی جھونپڑیاں بنادی گئی تھیں جو اب ناپید ہیں - ۴؎ راجہ کلیان سنگھ پسر راجہ شتاب رائے اگرچہ لیاقت این منصب باعتبار و [illegible] سال کہ عنفوان شباب بود نداشت بکار رائے مامور شش مامور گردانید و جاگیرات و در ماہ

مظنون مردم نگردد" یہ کوئی باتیں دلچسپ لیکن تفصیل طلب ہیں اور موضوع سے زیادہ متعلق نہیں اسلئے محض تسلسل واقعات کے لئے صرف اشارات پر اکتفا کی گئی ہے۔ اور اب ہم بطور ذیل میں مہاراجہ کلیان سنگھ کے زمانِ نیابت صوبہ داری و دیوانی بہار (بلا شرکتِ غیرے) کے واقعات (سنہ ۱۱۸۵ھ فصلی نیابت سنہ ۱۱۸۶ھ فصلی سپرد قلم کرتے ہیں۔

خلاصۃ التواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ شتاب رائے نے علالت کے باعث اپنی زندگی ہی میں صاحب کلان عظیم آباد کی اجازت سے کلیان سنگھ کو امور صوبہ کی انجام دہی کے لئے کونسل کا شریک کر دیا تھا (ص۵۲۳) لیکن ہمیں دوسرے ذرائع سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، البتہ مسٹر وارن ہسٹنگس کا مکتوب ۱۱ جمادی الاول ۱۱۸۶ھ (مطابق اوائل اگست ۱۷۷۲ء) میں بنارس جاتے ہوئے عظیم آباد میں قیام، علیل مہاراجہ شتاب رائے کی عیادت کو جانا، زندگی سے مایوس مہاراجہ کا اپنے بیٹے کی سفارش اور خدمات نیابت نظامت و دیوانی اور بحالی المعافی و جاگیرات کی استدعا کرنا، گورنر کا آبدیدہ ہو کر فرمانا "ایں پسر بزرگ شمار ایں خود خواہم خواند و ہمیشہ متوجہ حال او و محمد و معاون او خواہم بود، صاحب بہ ہمہ وجوہ ازین امر خاطر جمع دارند" نیز گورنر مذکور کی تعزیت کے لئے کلیان سنگھ کے مکان پر جانا اور دوسرے دن اپنے جائے قیام باقی پور (بانکی پور) میں موخر الذکر کو بلا کر صاحبان کونسل کے ہمراہ کرسی نشین کرنا، نیابت صوبہ داری اور دیوانی خالصہ شریفہ کی خدمت تفویض کرنی اور نوبت و جلوس کے ساتھ ہاتھی پر سوار کر کے نائب ناظم کو بھیجے دروازہ کی جانب سے ان کے مکان[1] تک پہنچوانا، مہاراجہ کلیان سنگھ کا اپنے دیوان خانہ میں باقاعدہ مسند نظامت و دیوانی پر بیٹھنا، رؤسائے شہر کی مبارکباد دینی، نذریں پیش کرنی اور گورنر مذکور کے چند روزہ قیام کے دوران میں روزانہ مہاراجہ موصوف کا ملاقات کو حاضر ہو کر صاحبان کونسل کے ساتھ مشورہ میں شریک رہنا، معاملات ملکی و مالی کے باحسن وجوہ انجام دینے کی تاکیدیں اور ہدایتیں، یہ کل باتیں نہ صرف قرین قیاس بلکہ حقیقت پر مبنی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اسناد نیابت و دیوانی اور خلعت ہفت پارچہ سرپیچ مرصع قبضہ شمشیر، یک رشتہ مروارید اور عطائے خطاب انتظام الملک مختار الدولہ تہور جنگ (ص۵۱۸) وغیرہ بعد کی باتیں ہیں، چنانچہ کیلنڈر جلد چہارم کے خطوط ۵۵۴-۵۵۹-۵۶۰ مورخہ اکتوبر ۱۷۷۲ء ہمیں بتاتے ہیں کہ گورنر کی سفارش پر نواب مبارک الدولہ کی طرف سے منی بیگم نے مجلس رائے و کیل کلیان سنگھ کی معرفت مرشد آباد سے دو مہریں ایک ہاتھی، خلعت، اسناد عہدہ و حمایت اور مہاراجہ کا خطاب بھیجا تھا۔ کیلنڈر جلد پنجم کے ایک مکتوب مورخہ ۲۸ اپریل ۱۷۷۳ء سے معلوم ہوتا ہے کہ انتظام الملک تہور جنگ کا خطاب شاہ عالم بادشاہ کا عطا کردہ تھا، لیکن ان فقروں کے مہر پر کندہ کرنے اور استعمال کی اجازت گورنر سے بہت بعد کو ملی تھی، خلعت نیابت دیوانی صوبہ بہار دسمبر ۱۷۷۳ء میں بھیجی گئی تھی۔

مہاراجہ کلیان سنگھ فرماتے ہیں کہ ابتدائے سنہ ۱۱۸۶ فصلی (مطابق ۱۷۷۳ء) سے نصف سنہ ۱۱۸۸ فصلی (مطابق سنہ ۱۱۹۴-۵ھ / ۱۷۸۰-۱ء) تک موصوف ہمیشہ شریک صاحبان کونسل عظیم آباد اور ملا شرکت دیگرے قائم مقام ناظم بہار اور دخیل امور و جمیع معاملات صوبہ رہے اور اس ہفت سالہ مدت میں نہایت حسن کارروائی، جانفشانی، کفایت شعاری، دیانت کا ثبوت دیا کئے، معاملات ملکی و مالی اور امور عدالت بحسن و خوبی انجام دیتے رہے، دن کو کونسل اور عدالت کونسل میں حاضر رہتے اور شب کو اپنے دیوان خانہ میں دربار کرتے اور اہالیان پٹنہ اور عاملان و مالگذاران صوبہ سے سرگرم گفتگو رہتے اور خرچ میں کفایت کی وجہ مقررہ کے علاوہ ایک خرچہ بھی کبھی بطور نذرانہ اور رشوت مخفی یا علانیہ نہیں لیا۔ اپنی حسن خدمت سے انگریزوں کو ہمیشہ خوشنود رکھی اور سارا الناس کی رفاہ میں کوشاں رہے، کبھی کسی کو آزار نہیں پہنچایا، کسی گھر کو باقی خزانہ یا محاسبہ کے لئے تباہ و برباد نہیں کیا، بہ سہولت نذر سرکاری وصولتا کرتے رہے، بلکہ اس میں اضافہ بھی کیا اسلئے گورنر جنرل اور صاحبان کونسل کی اسی عرصہ میں تفضلات شامل حال رہیں، غرضکہ یہ سات سال نہایت اطمینان اور جمعیت خاطر سے گذارے اور بہ کمال اقتدار و اختیار نائب ناظم کے فرائض انجام دیتے رہے، ان کی مصیبت کی ابتدا (۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۱ء) اس وقت سے ہوئی جب عظیم آباد کی کونسل موقوف کی گئی اور "کافر نمکحرام" راجہ خیالی رام نے فتنہ برپا کر کے تمام صوبہ بہار کی مقرری ۳۴ لاکھ میں مہاراجہ اور اپنے اور گنگا گوبند کے نام لکھوائی، اور جمیع معاملات میں اپنے کو شریک

---

[1] مہاراجہ شتاب رائے کا اصلی جائے قیام اور نقش و نگار سے مزین جمیع دعالیشان مکان درگاہ شاہ ارزان کے نزدیک آج جہاں ہمایونی خلیفہ کا اکھاڑہ اور کھنڈر پایا جاتا ہے واقع تھا، دیوان خانہ جو بعد کو ان کے خاندان کا مسکن قرار پایا دریائے گنگا کے کنارہ دیوان محلہ میں عرصہ تک موجود تھا، سیر بعلی گھاٹ مہاراجہ کلیان سنگھ کی بدولت کا منایا ہوا ہے جو بجز مٹی کے ڈھیر اور عالیشان پھاٹکوں کے نشانات کے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ؎ چند نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

مہاراجہ کردیا (خلاصہ ص۵۱۹ تا ص۵۲۲)

کیلنڈر جلد چہارم میں گورنر کے نام ایک مراسلہ مورخہ یکم نومبر ۱۷۷۳ء موجود ہے جس میں مہاراجہ کلیان اور ان کے آنجہانی پدر بزرگوار کے اوقات وضوابط اور انجام فرائض کے طریقوں کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے، ہفتہ میں دو بار کونسل کی حاضری، ممبران کونسل سے مشورت، ایک بار کچہری کرنی، مقدمات فیصل کرنے، تین روز اپنے مکان یا دیوان خانہ میں دربار کرنا، جمعہ کو تعطیل منانی، حضور کے اضلاع کا خود براہ راست انتظام و بندوبست کرنا، کسانوں کی زیادتیوں کے متعلق مناسب احکام جاری کرنے، فصل کی خرابی کے اسباب کی جلد وقوع پر تحقیق کرنی، اپنی مساری عملداری میں کبھی کبھی دورہ کرنا - یہ کل باتیں مہاراجہ کلیان سنگھ نے اپنے نامور باپ سے سیکھی تھیں اور اُن ہی کے نقش قدم پر چلنے کی (کم از کم اوائل میں) کوشش کرتے رہے،

ایک دوسرے مکتوب مورخہ ۱۲ نومبر ۱۷۷۳ء سے معلوم ہوتا ہے کہ بھادوں ۱۱۷۷ھ فصلی میں صوبہ کو کمی آب یا زیادتی بارش کے باعث بہت نقصان پہنچا، مہاراجہ موصوف نے مسٹر لین ممبر کونسل کو ہدایت کی کہ مقامی معائنہ کریں، رعایا اور کسانوں کی حالت کی تحقیقات اور ان کی ہمت افزائی کریں، اور مالگذاری کی تشخیص پیداوار کی مناسبت سے کی جائے، نیز مہاراجہ گورنر سے اسدعا کرتے ہیں کہ یہ طریقہ منظور کیا جائے تاکہ صوبہ کی خوشحالی اور زرکاری کے اضافہ کا باعث ہو۔

مہاراجہ موصوف کو شہر فیاپروری کا بہت خیال تھا، چنانچہ ایک خط میں نواب منیر الدولہ کے افراد خاندان خصوص ان کے صاحبزادے مسمی فرزند خاں کی کل جاگیرات بحکم کمپنی ضبط کیے جانے کے باعث ان کے حال زار کا نہایت افسوس کے ساتھ تذکرہ کرتے ہوئے گورنر سے پرزور سفارش کرتے ہیں کہ ان کی جاگیرات واگذاشت کر دیجائیں تاکہ ان کی حالت کچھ درست ہو سکے[1] (کیلنڈر جلد چہارم مکتوب نمبر ۶۶۱)

معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ تک مہاراجہ نے نہایت انہماک سے فرایض انجام دینے کی کوشش کی اور گورنر کے احکامات کی تعمیل کرتے رہے، گورنر اور بادشاہ اور امراء کے درمیان اکثر امور میں واسطہ کا کام کیا، صوبے کے امن وامان کو برقرار رکھنے اور رہزنوں اور خون کرنے والوں کے فرار واقعی سزا دینے میں ہمیشہ انگریزوں کا ہاتھ بٹاتے رہے - تحصیل وصول کا کام بھی چلتا رہا - گو اس امر میں اپنے باپ کے پرانے رفیق خیالی رام، ہادھو رام و نیز دوسرے حضرات پیش پیش تھے - واقعہ یہ ہے کہ جوں جوں نوجوان مہاراجہ دوسرے اشغال کی طرف متوجہ ہوتے گئے مہمات ملکی و مالی کا کل بار ان کے رفقا اور اہل کاران پر آپڑا اور وہ حاوی ہوتے گئے، یہاں تک کہ ان لوگوں کی بعض کارروائیاں شکایتیں پیدا کرنے لگیں اور صاحبان کونسل مہاراجہ سے بدظن ہونے لگے - مکتوب مرسلہ ۲۷ جون ۱۷۷۳ء میں مہاراجہ موصوف نے گورنر سے اُن احسان ناشناس بے وفا نوکروں کی جو ہمیشہ ان کے اور ممبران کونسل کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کی فکر میں رہتے تھے شکایت کی ہے، مگر فی الحقیقت مہاراجہ موصوف زیادہ قابل الزام تھے -

نوجوان کلیان سنگھ نے شروع شروع بست سالہ محمد شاہ کیطرح[2] جس نے بادشاہ گر سیدوں کا زور توڑنے اور قتل وقید کرنے کے بعد عیش وعشرت میں ڈوب کر "رنگیلا بادشاہ" کا خطاب حاصل کیا، اور جب سلطنت مغلیہ کی اینٹ سے اینٹ بجنے لگی تو اس وقت بھی گالوں پر جوئیں نہ رینگیں) تندہی اور مستعدی دکھلائی لیکن رفتہ رفتہ امور حکومت و دیوانی کی طرف[3] سے غفلت برتنے لگے، علمی ذوق، شعر وشاعری کا

---

[1] لیکن جہاں اپنا مفاد معرض خطر میں ہوتا مہاراجہ کسی کا خیال نہیں کرتے تھے، ایک مراسلہ مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۷۷۳ء میں نواب مہدی خاں پسر بلند خاں سابق ناظم بلدہ - گجرات، الہ آباد و کابل سے ایک حویلی کے متعلق جسے نواب سیف خاں سابق فوجدار مرہٹے پٹنہ میں بنوائی تھی اور جس پر مہاراجہ دخیل تھے جھگڑا کا تذکرہ ہے -

[2] یہ کل اور کیلنڈر جلد چہارم کے خطوط سے ماخوذ ہیں -

[3] ایضاً

[4] سیر المتاخرین

[5] علاوہ سیر المتاخرین کے کیلنڈر کے خطوط بھی اس امر کے شاہد ہیں - ایک خط مورخہ ۸ مئی ۱۷۷۱ء میں مجلس برائے گورنر کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی نوجوان آقا نے اپنی حرکتیں ترک کر دی ہیں اور زیادہ انہماک سے کاموں کو انجام دے رہے ہیں تاکہ ناواقفی اور غفلت کا الزام دور ہو جائے - مسٹر ڈیسی اور دوسرے صاحبان انگریز سے اس امر کی تصدیق کرائی جاتی ہے -

شوق، طبیعت کی رنگینی اور یاران ناتجربہ کار کی ہمنشینی آخر رنگ لائی۔ پانچ ہزار ماہانہ کی تنخواہ (جو تھوڑے ہی عرصہ میں ۱۶ ہو گئی) جو "رائے رایان صوبہ بہار" کی حیثیت سے انہیں کمپنی کی طرف سے ملتی تھی کہاں تک کفایت کرتی۔ صوبہ اودھ اور صوبہ آباد، جونپور اور دہلی کی جاگیریں جو ان کے باپ نے حاصل کی تھیں شجاع الدولہ نے ضبط کر لیں اور باوجود ان کے متعدد عرائض اور گورنروں کی سفارش کے واپس نہ ملنا تھا نہ ملیں۔ مالدہ چمپارن اور دوسرے اضلاع بہار کی جاگیریں بھی آگے چل کر مقرری کے اندر ہوئیں۔ داد عیش کیسے دی جاتی، کیونکہ زر مال واجب سرکار بھی آخر مہیا ہونا چاہیے تھا۔ اگر ان کے نائبین عمال اور اہل کاران نے تحصیل زر میں سختی برتی، زمینداروں کو شکنجہ میں کسا اور کچھ الٹ پھیر کی تو ساری ذمہ داری ان پر کیسے عاید ہو سکتی ہے؟ غفلت و ناتجربہ کاری کے باعث کونسل والوں سے پیش نہ سکی، اگر کونسل میں کچھ اقتدار تھا تو خیالی رام ایسے چلتے ہوئے ہوشیار طلیق اللسان کا۔

مہاراجہ کلیان سنگھ اور راجہ خیالی رام کے تعلقات کا سلسلہ بابہ النزاع اور تفصیل طلب ہے، مہاراجہ نے راجہ کو نمک حرام غدار مکار سب کچھ بنایا اور سارا الزام ان کے سر تھوپ دیا، لیکن بقول صاحب "باوجود آنکہ نہایت دروغ گو و قول او لائق اعتماد نیست" بغیر خواہی و حقوق شناسی و محنت و جانفشانی کچھ بھی ظہور پذیر نہیں ہوا، مہاراجہ کا کہنا ایک حد تک صحیح ہے، ۱۷۸۸ء ضلعی میں راجہ نے (برخلاف متی صاحب جان کونسل رسالہ) چند مجالات یعنی ترگھنا، چین پور و شمسہرام و سرلس کٹنہ اپنے اجارہ میں لے لئے، لیکن زور سرکاری ادا نہ کر سکے، اسلئے اپنے مکان میں نظر بند کر دئے گئے، مہاراجہ نے رہائی و لائی (خلاصہ ص ۵۴۲) اس کے بعد ہی راجہ نے مہاراجہ کو ششہ میں اتارا صرف استقلال کار اور جاگیرات مغرب کے واگذاشت کا ذکر کر کے گورنر کے نام سفارشی خط لیا کہ "آنچہ او طوعاً و کرہاً مفید بذیرا گشند" اور کلکتہ جا کر گورنر وارن ہسٹنگس کی ناک کے بال گنگا گوبند کے ذریعہ سے تمام صوبہ بہار کی مقرری ۳۴ لاکھ (بقول مسٹر ہیڈ ۲۹۲۱۰۷ چونکہ سال ماسبق کا بندوبست ۲۸۰۲۱۸۵ پر ہوا تھا ص ۳۱) روپیہ سالیانہ کے عوض مہاراجہ اپنے اور گنگا گوبند کے نام ۱۱۸۸ء (۱۷۸۱) میں لکھوائی، یہ بھی صحیح ہے کہ مجلس نے مہاراجہ کے وکیل نے بہت روکا، لیکن گورنر نے ایک نہ سنی۔ جب قبولیت و قسط بندی کے کاغذات پہنچے مہاراجہ نے گورنر کی مرضی دیکھ کر دستخط و مہر ثبت کر دیں۔ جب راجہ خیالی رام عظیم آباد پہنچے تو بقول صاحب سیر (ص ۸۱) مہاراجہ اغوائے بعض مشعلہ قشاں و غرور جوانی از راجہ مذکور گردیدہ و منحرف گردیدہ و شکایت او ہنگورز ہاملٹن و با مسٹر میکسویل نمبر سعیدیت نمودن آغاز نہاد" لیکن خلاصۃ التواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ نے تین شقیں پیش کیں خواہ راجہ مختار "جمیع کارہائے مالی و ملکی" رہیں اور مہاراجہ کو کچھ بولنا منع (مگر باقی خود دیکھیں اور سرکاری مال کی ذمہ نہ لیں۔ لیکن مہاراجہ کے بعض اقتدار پر حرف نہ آنے دیں۔ خواہ یہ ہی صورت مہاراجہ سے متعلق کر دیں اور اگر یہ بھی پسند نہ ہو تو صرف اپنے نام کے مجالات کا گوشوارہ علیحدہ کر کے انکی پوری ذمہ داری لیں اور بقیہ مہاراجہ کے سر رہنے دیں۔ خیالی رام نے معاملہ کو گومگو میں ڈالدیا، مسٹر میکسویل سے بھنکا بھنوی ہاکر قائل کرتے رہے، مہاراجہ کی حاضری سے قاصر رہے اور مشہور کیا کہ مہاراجہ تو برائے نام ہیں صوبہ کی زمام حکومت میرے ہاتھ میں ہے۔ مہاراجہ نے اپنے حصہ کی پہلی قسط ادا کر دی لیکن گنگا گوبند کی قسط بھی انہیں کو دینی پڑی اور باوجود قسم کھانے کے خیالی رام نے کچھ فکر نہ کی یہاں تک گورنر وارن ہسٹنگس نواب علی ابراہیم خاں "شیخ پوریہ" کو لیکر ۱۷۸۸ء شمہ ہو گئے۔ بھنکا پہاڑی میں ٹھیرے، مہاراجہ نے ملاقات کی، سارا ماجرا کہہ سنایا، چونکہ گورنر کو بنارس جانے کی جلدی تھی معاملہ مسٹر اہنڈرسن کے سپرد ہوا۔ خیالی رام کی عدم ادائگی ثابت ہوئی ڈانٹے گئے اور گورنر کی بنارس سے مراجعت پر تو حویلی بیگیان میں سادھو رام کے ساتھ قید بھی کر دئے گئے۔ مہاراجہ قسط وار اپنے حصہ کا روپیہ ۱۷۸۹ء اور ۱۷۹۰ء تک ادا کرتے گئے۔ (خلاصہ ص ۵۴۰ - ۵۶۶)

مسٹر ہیڈ مسٹر بروک کے مکتوب مورخہ ۲۴ نومبر ۱۷۸۱ء کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ خیالی رام کی گرفتاری (قید) نے مہاراجہ کلیان سنگھ کی بھی آنکھیں کھول دیں، زر قسط بندی ادا ہونے لگا مگر اس کے ساتھ ہی مسٹر ہیڈ مہاراجہ کی مطلق العنانی رویہ نیو چیف کو آنکھ نہ لگانا خود کو ایک آزاد حاکم

۱؎ بہار میں انگریزوں کا انتظام حکومت ۱۷۸۵ - ۱۷۸۱ - لنڈسے ہیڈ۔ ۲؎ تفصیل علاوہ خلاصۃ التواریخ کے کیلنڈر کے متعدد خطوط میں ملاحظہ ہو۔
۳؎ مسٹر ہیڈ کی کتاب مینوئر کا بنگال ریکارڈس اور کیلنڈر کے خطوط سے اس کا پتہ چلتا ہے۔
۴؎ سیر المتاخرین۔
۵؎ خلاصہ ص ۵۴۱ - سیر المتاخرین سے بھی یہ گو اس کی تصدیق ہوتی ہے خیالی رام مصطر اون لا اور رام لوچن بنگالی کے تعلقات ملاحظہ ہوں۔

سمجھ کر بجز گورنر کے کسی کی بات نہ ماننا، زمینداروں اور عمال محصلین سے مستبدانہ طور پر پیش آنا، انہیں قید و بند کرنا، اُن کی جائدادیں ضبط کرنی۔ راجگان ترہت و ٹکاری یعنی راجہ مادھو سنگھ اور راجہ مترجیت سنگھ ایسے بڑے زمینداروں کو بلاکر زیر حراست رکھنا، بلکہ موخر الذکر کو باوجود صاحب کلان عظیم آباد کی فہمایش کے رہا نہ کرنا، ان باتوں کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس کیلنڈر جلد ششم اور پنٹ کے بنگال ریکارڈز[1] جلد اول میں کلیان سنگھ کے متعدد خطوط کا خلاصہ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مادھو سنگھ موجودہ مہاراج ادھیراج دربھنگہ کے مورث اور کلیان سنگھ کے چھوٹے بھائی کنور بھوانی سنگھ کے درمیان مالکانہ اور دستورات کے اضافہ کے مادہ میں جھگڑا ہوا۔ اور عدالت دربھنگہ نے خواہ مخواہ مذکورۃ الصدر کی حمایت کرنی شروع کی۔ اسی طرح مترجیت سنگھ راجہ ٹکاری کے ذمہ کئی لاکھ باقی گر گیا، جب سختی کی گئی اور قطب علی بیگ سردار اول بخاری نے مہاراجہ کے حکم سے ان کا ناطقہ بند کیا تو شکایتیں ہونے لگیں، اصحابان عظیم آباد نے دخل دینا چاہا بالآخر مترجیت سنگھ نے اپنے مالکانہ وغیرہ کا حصہ مکفول کر کے چھٹکارہ کی کوشش کی، لیکن انگریزی عدالت نے مہاجنان کو روک دیا، جب مہاراجہ نے ادائگی نہ فسط میں مجبوری ظاہر کی تو بدقت تمام مالکانہ کے رہن و مکفول کی اجازت ملی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مہاراجہ اپنے اور اپنے باپ کے حقوق خدمات اور کلائیو اور وارن ہسٹنگ سے رسوخ کے باعث اپنے رتبہ اور اقتدار کا ضرورت سے زیادہ اندازہ کرنے لگے تھے، اسلئے مسٹر میکس ویل ہون یا مسٹر روکس یا مسٹر بروک کسی ریسیونیو چیف کا حکم اپنے حکم پر بالا نہیں سمجھتے تھے، فطرتاً یہ لوگ نوجوان مہاراجہ سے بدظن ہو گئے اور اکثر کاموں میں خلل انداز بھی ہوئے، یہاں تک کہ جب ہنگامہ مترجیت سنگھ راجہ بنارس سے بہار بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہا اور نرائن سنگھ زمیندار سدیس کٹہنہ۔ راجہ اکبر علی خان زمیندار نرہٹ سہائے۔ بیتہر سنگھ زمینداری ٹکاری فتح شاہ زمیندار سارن نے بغاوت پر کمر باندھی اور سورشیں برپا کیں تو مہاراجہ کلیان سنگھ نے اپنی خدمات پیش کیں، فوج اکٹھا کرنے اور نفیس نفیس جنگ میں شرکت پر آمادگی ظاہر کی، لیکن انہیں اس کا موقع نہ دیا گیا اور گورنر سے اُلٹے شکایت کی گئی کہ مہاراجہ اپنے دیوان سے اس بہانہ چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جب بہت اصرار ہوا تو مہاراجہ کی عرضیاں گورنر کے پاس مسٹر روس نے بھیجدیں، لیکن یہ فقرہ بھی تحریر کر دیا کہ یہ مشکلات سے فائدہ اٹھانا اور محدود ملک کو لوٹنا لیکن الزام مترجیت سنگھ کے آدمیوں پر رکھنا چاہتے ہیں۔ مہاراجہ خود لکھتے ہیں کہ مسٹر ہٹنگ کی جنہیں گورنر باقی پور (بھجو باغ) کی کوٹھی میں چھوڑ کر خود ماسر نٹ لیف لے گئے تھے، انہوں نے ہنگامہ کے دوران میں برابر حفاظت کی، تسلی و دلاسا دیتے رہے۔ ہمیشہ ایک حوری ہرکارہ کے ذریعہ گورنر کی خبر منگواتے رہے، جب خود بنارس کا قصد کیا بی بی صاحبہ نے جانے نہ دیا۔ مسٹر گرام سارن کے کلکٹر کے لکھنے پر اپنے نئے اور پرانے سپاہیوں سے ایک مختصر دستہ تیار کر کے فتح شاہ زمیندار ہوئی اور سارن سے جنگ کے لئے بھیجا، اور اسی طرح اقبال علی خاں پسر کامگار خاں مئی کی سورشں کے دفعیہ میں حصہ لیا۔ سہ بندی میں کافی روپیہ خرچ ہوا۔ لیکن ایک خرمہرہ کمپنی سے مجرا نہ ہوا۔

زمانہ ہمیشہ کسی کا ساتھ نہیں دیتا، مہاراجہ کلیان سنگھ کا بھی دور حکومت و اقتدار عارضی ثابت ہوا۔ جب مہاراجہ شتاب رائے جیسا خیر خواہ کمپنی اور بانی سلطنت انگلشیہ تاجر ہمیشہ حکمرانوں کی مصلحت یا جذبۂ انصاف (حرص و آز) کے زد سے بچ نہ سکا تو کلیان سنگھ ایسے نوجوان محرور المزاج رئیس طبع سہولت پسند اور تن آسان شخص کی کیسی نبہتی۔ پہلے تو خیالی رام کی مہربانی سے مقرری کی لعنت سر پر ڈالی گئی اور جب ادائگی زر سے کار میں قبضیں حائل ہوئیں تو مسٹر بنچر سٹ اور مسٹر جوناتھن ڈنکن سپرنٹنڈنٹ آف کلکٹین کی حیثیت سے مہاراجہ پر تسلط کر دیے گئے۔ موخر الذکر کو جو عزلی دفتر کے بھی انچارج تھے گورنر کا ایک خط مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۷۸۲ء[2] پہونچا ہے کہ انکا تقرر پٹنہ میں محض اسلئے ہوا ہے کہ کلیان سنگھ کو حالات سے بے دخل کر کے سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیں تو ۱۱ نومبر کو بے کس مہاراجہ اپنی بے دخلی اور نئے بندوبست پر رضامندی کا خط گورنر کو لکھتے ہیں (ریکارڈز بنگال ریکارڈس) یہ سب کب ہوا جب مہاراجہ اپنے جواہرات اپنے نقود و اسباب کو مہاجنوں کی نذر کر کے دیوان کو اوا کرنے کی کوشش کر چکے تھے، اپنی کتاب کے آخر میں ۱۴۴-۱۴۳ - انگریزوں کا مجمل تذکرہ اور انسے اپنی خصوصیات کا ذکر کیا ہے مگر صرف تین اشخاص اول الذکر دو اور سر جان شور کے متعلق انکے فقرے قابل ملاحظہ ہیں۔ "بدولت ایشاں نقصان کلی ہمیں رو داد" (مسٹر بنچر سٹ) "در حساب کتاب واجبی من غور رسی نکرد مناخ خیر من (وقت

---

[1] جلد اول اورینٹل لائبریری پٹنہ، یہ خطوط سب ۱۷۸۲ء کے ہیں۔ [2] تفصیلات مسٹر ہینڈ کی کتاب میں ملاحظہ ہوں۔
[3] تفصیلات مسٹر ہینڈ کی کتاب میں ملاحظہ ہوں۔ [4] خلاصہ ۵۶۴ - ۵۶۶

از ناتو جی ایشاں بخارت رفت چنانچہ تمامت اسشرفی یا روپیہ وظروف طلاو نقرہ نظر بپاس آبروئے خود طلائی بسیار وکم قیمتی فروختہ در باقی اختراعی لیتھان دادم و تا حال پرداختم آخر چوں کار نمودند تاسف خوردہ ازمن عذر خواستند لیکن چہ فائدہ کہ من تہیدست شدہ بودم ..... (مسٹر ڈنکنسن)

"باوجود طلعت و توجہات ظاہری ہیچ در کار این خاکسار نیاماد" (سر جان شور) اور تو اور گورنر وارن ہسٹنگ اور لارڈ کورنوالس نے بھی باوجود حقوق خدمات کے مہاراجہ کی قرار واقعی (بقول مہاراجہ) خبر نہ لی تفصیل پرگنان اوراق خلاصۃ التواریخ موجود۔ پنشن پانے والے مہاراجہ (پچاس ہزار فصلے اٹھارہ ہزار اور بعد کو تو علی الحساب کبھی تیس ہزار روپیہ کبھی عید الضحیٰ اور عید الفطر کے مواقع پر چند مختصر رقمیں کافی سمجھی گئیں) نے باوجود اس احساس کے کہ "نوشتن نمی توانم زیرا کہ در نوشتن آن گنہگاری شوم" چھپے چھپے بہت کچھ لکھوا ڈالا ہے۔

یوں تو نام کو کلیان سنگھ کی مہاراجگی اور مہاراللہائی عرصہ تک قایم رہی، سنہ ۱۸۴۳ء تک کے خطوط کلینڈر جلد ششم میں موجود ہیں جن میں گورنر نے مہاراجہ کلیان نائب ناظم صوبہ بہار" کے خطاب سے موصوف کو یاد کیا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ مقرری کے معاملہ کے دو ایک سال بعد ہی ان کا دور حکومت ختم ہوگیا۔ عظیم آباد بنارس۔ غازی پور اور کلکتہ کے دورے کچھ بھی مفید ثابت نہیں ہوئے۔ ۱۹۵۲ف (۱۷۸۸) میں مہاراجہ عظیم آباد چھوڑ کر کلکتہ جا پہنچے۔ جاگیرات والتمغائے دیوانی مغرب اور اسناد صوبہ بہار و بنگال کے واگذاشت اور عمل و دخل کی بے فائدہ کوششیں کرتے رہے۔ کبھی تو جواب کتاب ہوتا رہا۔ کبھی انگلینڈ سے احکامات کے انتظار میں رکھا گیا۔ غرضکہ اس وعدہ وعید اور لیت ولعل میں ۲۴ برس کلکتہ میں گذر گئے۔ آنکھیں جاتی رہیں سنہ ۱۲۱۸ف میں مختلف عوارض کا سامنا کرنا پڑا۔ بیماری وعسرت میں تبدیلی آب وہوا کا مشورہ ملا۔ ۲۰ ربیع الاول ۱۲۱۸ف میں کلکتہ سے عظیم آباد روانہ ہوئے، ہیہو نچکر دیکھا کہ عمارات رنگین ومنقش اور باغات دلکش ویران ومسمار پڑے ہیں، ناچار شہر کے گھاٹ ہی پر کرایہ کا مکان لیکر اتر پڑے، ساکنان دیار کی بے رخی وکم روتی نے دل توڑ ڈالا، امراض نے بجائے کمی کے زیادتی پکڑی۔ اس شہر ناپرسان جہنم آباد سے کلکتہ پھر بھی غنیمت معلوم ہوا۔ قصد مراجعت کر ہی رہے تھے کہ مسٹر ابراہم اور مسٹر لمسڈن کے نمود دولت سنگھ کے ذریعہ واردات قائمی کی تصنیف کی فرمایش کر دی۔ ایک برس میں شخصے مسمی مہدی حسن کے مکان میں رہکر ساری کتاب معہ خلاصۃ التواریخ لکھوا دی۔ پھر کلکتہ واپس گئے۔ بصارت کا زوال جودت طبع پر اثر انداز نہیں ہوسکا۔ دیوان پر دیوان، مثنوی پر مثنوی پرگو شاگردوں کو لکھواتا گیا اور اسی شغل سے غم غلط کیا بالآخر ۷۳ سال کی عمر میں ۲۶ شوال ۱۲۳۷ھ میں یہ باکمال ہمہ دان شیریں زبان" عاشق مزاج رنگیں تماشا شیخ وبرہمن دوست مسلمانان ہند کے مشترکہ تمدن کا بہترین نمونہ عقیدتاً مسلمان لیکن "ہندو مسلم کا فرنژاد ام من مسلمان تخلیص کے مضمون کو دو زبردست قصاید کے ذریعہ ہمارے لئے چھوڑ جانے والا کائستھ فیاض، قدر دان علم وفن اور "صوبہ بہار کا آخری ہندوستانی گورنر" اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف ہمیشہ کے لئے کوچ کر گیا۔ ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

۱؎ یہ کل باتیں خلاصۃ التواریخ سے ماخوذ ہیں، ملاحظہ ہوں مختلف اوراق۔

۲؎ "حرام عظیم آباد" کا فقرہ سفینۃ المتاخرین علی حزین رحمۃ اللہ کے ایک خط میں موجود ہے جن سے فیضاب ہونے کا مہاراجہ اپنی ایک غزل کے مقطع میں اشارہ کرتے ہیں۔

۳؎ میر وزیر علی عبرتی مہاراجہ کے بیٹے کے نواسہ راجہ بھوپ سنگھ کے منشی تھے۔ مہر الخیال میں لکھتے ہیں "از افکار رسن خود بست دیوان، ومثنوی سلسلہ بہ زیبا وردہ ہزار شعر در مدح ائمہ اطہار علیہم السلام وجیب السیر منظومہ خود در صفحۂ روزگار گذاشت" اس میں اردو مثنوی اور کتاب حنیہ الزائرین جس کا حوالہ فیض الباری نے دیا ہے دو تصنیفات مہاراجہ کی نظر انداز ہوگئی ہیں۔

۴؎ معراج الخیال میں غلطی سے "سی" کا لفظ چھوٹ گیا ہے اسلئے ۱۲۰۷ کی تاریخ غلط ہوگئی ہے۔

مولانا سید عبدالغنی وارثی (علیگ) مرحوم

سابق مدرّس صدر محاسب حکومت آصفیہ خلد اللہ وحماہا

از حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ عہد آباد دکن

تمہید باوجود مسلمان ہونے یا نسل انسانی کے اس طبقہ سے تعلق رکھنے کے جو محدود قوتوں والی مخلوقات سے آزاد ہو کر صرف ایک لامحدود اور ذرہ کائنات کے ہر کون میں مشہود ہونے والی طاقت کی پشت پناہی میں اپنی زندگی بلکہ ابدی پائندگی حاصل کئے ہوئے ہے جس کی حیات و ممات، صلاۃ و نسک، کسی گاؤں، کسی ضلع، کسی صوبہ، کسی ملک بلکہ سفلی یا علوی کرہ کے لئے نہیں بلکہ صرف عالمین کی پالنے والی توانائی کے لئے ہے۔ وہی امت جو مخلوق سے الوہیت کا تاج اتار کر صرف خالق کو آسمان و زمین کی بادشاہت کا سزاوار قرار دینے پر مصر ہے۔ اس توحید کی طبقہ و جماعت کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے مجھ پر طعنہ کیا جاتا ہے کہ میں مسقط الراس سرزمین بہار کا نقارچی ہوں۔ تجھ پر تحریروں واقع زید میں طنز کیا گیا، دہلی ہنسی، اور لکھنؤ نے قہقہہ لگایا، دکن والوں نے غل مچایا، حالانکہ میں نے اگر کبھی کچھ لکھا، یا کبھی کچھ کہا، اس کا مقصد زمین کے کسی خاص خطہ کی جھوٹی حمایت نہیں، بلکہ ایک مظلوم قبیلہ اور سسٹم رسیدہ علاقہ کی داد رسی کے سوا کچھ نہ تھا۔ جو عالم تھے ان کو جاہل ٹھہرایا گیا تھا جنھوں نے کام کیا تھا ان پر نکمے پن کا الزام تھوپا گیا تھا، جو زندہ ہیں ان کو مردہ مشہور کیا گیا تھا۔ یہی جھوٹ تھا جس کو میں نے سچ سے بدلا یہی واقعہ تھا، جس کو چھپایا گیا تھا، حقیقت کے چہرہ سے نقاب اٹھانا، ناواقفوں کے لئے واقفیت کا بہم پہونچانا، اس سے توحید کے یقین پر کیا ضرب پڑتی ہے، آخر ایسا کہنے والوں نے اتنا بھی نہیں سوچا۔

بہار کی کیا خصوصیت ہے، حق کے حامیوں کا فرض ہے کہ جن کا حق چھینا گیا ہے اس کے دلانے میں وہ کوشش کریں، بلاشبہ اس سلسلہ میں حالانکہ جتنا چاہئے میں نے کچھ نہیں کیا ہے، اور جو کچھ بھی کیا ہے، شخص اس پاک نیت کی بنیاد پر کیا ہے۔ بہار کے بزرگوں نے ہندی زبان کے الفاظ کا عربی اور فارسی کے الفاظ سے معانقہ کرایا، اور جیسا کہ پروفیسر شیرانی ٹونکی کا دعویٰ ہے کہ اس "ملاپ" کا سہرا سب سے پہلے میر کے اس فرزند سعید کے سر تاریخی طور پر بندھتا ہے، جو بعد کو بہار کا قطب دوام اور ملک ہند کا مخدوم انام قرار پایا، رضی اللہ تعالیٰ عنہ، بنیاد رکھ دینے کے بعد ہر چند کے شمال و جنوب کے علاقوں میں ہلچل پیدا ہوئی۔ اس معانقہ و مصافحہ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہونا شروع ہوا۔ دکن سے اسی نے میں گانے کی آواز آنے لگی، دلی میں بھی اس کا راگ چھیڑا گیا۔ لیکن جاننے والوں نے جان کر اس حقیقت کو ظاہر ہونے نہ دیا۔ کہ ارتقاء و عروج کے ہر دور میں ہندوستان کی اس آخری اور ابدی قرار پانے والی زبان (جیسا کہ مقدر ہو چکا ہے اور شاید اس تقدیر مبرم کو وقتی ہنگامے مچالے والی بچاتیں ٹال نہیں سکتیں)۔ بہرحال ہندوستان کی اس زبان کے چڑھتے ہوئے دریا کی ہر موج میں بہار کا ہاتھ شریک رہا۔ لیکن کہا گیا ہے کہ اس کا سارا تلاطم دلی اور لکھنؤ کی شعری اور انشائی میثوں کی رہین منت ہے اور اب کہا جاتا ہے، کہ اس میں لکھنؤ و دلی کے سوا دکن کے مذہبی رسالہ نگاروں اور غزل سراؤں کا بھی حصہ ہے۔ اس سے انکار نہیں ہے، جو کہا گیا، لیکن اس کے ساتھ وہ بھی کہا جاتا ہے جو نہ کہا گیا۔ اور جب کہنے والے اس کے کہنے

لہ سب سے زیادہ تعجب جامعہ طیبہ کے باوقار مجلہ "جامعہ" پر ہے کہ اس راہ میں اس نے بھی مجھ پر ملامت کی ۱۲

کے لئے اٹھے، تو ان پر صوبجاتی تعصب کا الزام دھر اجاتا ہے۔

یہ بات کہ بہاری خاندان کے ایک فرزند بلند اختر نے اردو زبان کی سب سے زیادہ ضخیم لغت لکھی، یا بہار ہی میں سب سے پہلے مغربی فلسفہ اور یورپین حکماء کے حالات اردو زبان میں شائع ہوئے، بہار ہی نے سب سے پہلے یورپ کے شعراء ہومر، ورجل، دانتے، شیکسپیر، گیٹے کے ناموں سے واقف اور آپ کے شاگردوں کو مطلع کیا، بہار ہی نے سب سے پہلے یورپ کے جدید ترین کامیاب زود اثر طب موہیو پیتک طریقہ علاج کے متعلق لٹریچر کا ایک عظیم ذخیرہ مہیا کیا۔ بہار ہی نے ابتداءً یورپ کی جدید طریقہ زراعت و باغبانی کے اصول و نظریات کو عام اردو داں پبلک تک پہونچایا۔ اردو زبان بلکہ اب تو شاید مبالغہ نہ ہو تمام اسلامی زبانوں کی سب سے بہترین سیرت نبوی (علی صاحبہا الف سلام و تحیہ) کے بڑے حصہ کی تدوین و تالیف کی سعادت بھی بہار ہی کے ایک مصنف اعظم کو میسر آئی، یہ اور اس کے سوا ان دوسری خصوصیتوں سے قطع نظر کے جن کا تذکرہ میں نے اپنے بعض گذشتہ مقالوں میں کیا ہے، مجھے کس قدر حیرت ہوئی جب اس سوال کی تحقیق میں کہ "پادریوں کے مناظرانہ مباحث اور کتابوں نے اردو زبان کی ترقی پر کس حد تک اثر ڈالا ہے" میں نے بعض حلقوں میں دعوی کیا کہ اس سلسلہ میں بھی بہار کے خدمات بہت زیادہ نمایاں ہیں، کیونکہ بائبل کے ترجمہ کے سوا جس کے متعلق بوجوہ مختلف سرا خیال ہے، کہ مترجمین کی جماعت میں زیادہ تعداد بہار ہی کے اہل علم کی تھی، اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ پادریوں نے اپنی تبلیغی جدوجہد کے لئے بازار کی اس صرف شعری اور افسانوی زبان کو علمی رنگ میں رنگین کرنے کے لئے خاصی کوشش کی، ابتداء میں عیسائیوں نے فارسی زبان کو مسیحی دین کی اشاعت کا ذریعہ ہندوستان میں قرار دیا۔ لیکن ان کتابوں کے افادہ کا دامن صرف اہل علم تک محدود رہتا تھا عام باشندوں تک اپنی آواز کو پہونچانے کے لئے ضرورت ہوئی کہ اردو میں بھی رسالے لکھے جائیں، ان پادریوں کے اس اقدام نے علماء اسلام کو بھی مجبور کیا، اور جواب تک اردو یا ہندوستانی زبان میں لکھنا اپنے لئے ننگ و عار خیال کرتے تھے۔ انھوں نے بھی اردو میں علمی مسائل کو ادا کرنے کا سلیقہ اپنے اندر پیدا کیا، اردو زبان کی بعض اہم ترین کتابیں مثلاً سرسید احمد خاں کی خطبات احمدیہ، یا تفسیر ثنائی بائبل کے بعض حصوں پر رسائل، مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "پیغام محمدی"، "براہین حجاز"، پادری فنڈر کی کتاب "میزان الحق" طریق المحاسبات، مفتاح الاسرار، ازین العابدین، عماد الدین، عبداللہ آتھم، منشی محمد حنیف، ڈاکٹر ہنوردار خاں وغیرہ مجنوں نے اسلام سے اس تعداد میں عیسائی مذہب اختیار کیا ان کے سینکڑوں رسائل کی بنا میں نقلے ان ہی مذہبی مناظروں کی بدولت اردو زبان کے ذخیرہ میں داخل ہوئیں۔

لیکن کبھی یہ بھی غور کیا کہ ہندوستان کے علماء جو بالکلیہ عیسائی مذہب اور مسیحی دین سے ناواقف تھے، یکایک انھوں نے کس کی امداد سے فارسی میں تو بہت کم لیکن اردو میں "رد عیسائیت" کے متعلق دفتر کے دفتر کہاں سے تیار کر دئے نہ صرف بائبل بلکہ اس کے متعلقہ تاریخی و تشریحی لٹریچر، عیسائی مذہب کی تاریخ، علماء دین مسیحی، ان کے حالات، ان کے عقاید، مسیحی فرقوں کے اختلافات الغرض ہر پہلو پر کہاں تک ایک ہندوستانی عالم کی رسائی اس قدر ممکن تھی، جتنی کہ اس وقت ہمیں، جاپان کے بدھسٹ، یا ہندو وغیرہ کے علماء ہیں، فیالات سے علماء ہند ناواقف ہیں۔

[illegible] سے علماء کی مجلسوں میں مولانا رحمت اللہ الہندی صاحب "دعوۃ الحق" کا نام لیا جاتا ہے۔ پادری فنڈر اور اس کے ساتھیوں کا ذکر کیا جاتا ہے، صحیح ہے کہ مولانا رحمت اللہ (حق تعالیٰ کی ان پر رحمت ہو) انھوں نے فنڈر کو ہندوستان میں بھی زک دی، اور جب فنڈر کے نکاح میں فوراً ہو کر وہ مطمئن ہو پہونچے، تو قسطنطنیہ فرمان سلطانی کی بناء پر وہ بلائے گئے۔ بھاگے ہوئے فنڈر نے ان کو قسطنطنیہ میں گرفتار کرا دیا، یہ سب کچھ ہوا، لیکن ان تمام واقعات کی تہ میں کس کا ہاتھ کام کر رہا تھا، مولانا رحمۃ اللہ کو رحمۃ اللہ کس نے بنایا تھا۔

پھر مجھ پر خدا جانے کس کا الزام لگایا جائے گا۔ پھر مجھ کو صوبجاتی تعصبات کا بانی ٹھہرایا جائے گا۔ لیکن مظلوم کی داد رسی سے میں

لہ جب زیادہ کمی دیمک خاص بہاری الفاظ و محاوروں کا وہ ذخیرہ ہے جو اب تک اردو بائبل محفوظ ہے۔ ان شاء اللہ کسی مستقل صحبت میں اس پر بحث کی جائے گی ۱۲

کس طرح بازآ ؤں۔ جو چھپایا گیا ہے اس حق کو میں بھی کس طرح چھپا رہنے دوں۔ واللہ مخرج ما کنتم تکتمون (اور خدا کھول کر رہنے والا ہے جسکو تم چھپاتے ہو) آخر وہ غریب بہاری ڈاکٹر جس کا نام ڈاکٹر وزیر تھا، جد و جہد کے تمام سلسلوں میں اس کا نام کیوں چھپایا گیا حالانکہ اب لوگ نہ جانتے ہوں اس زمانہ کے مولویوں میں اس کا ذکر موجود نہ ہو، پر جب ہم میں حال کو ماضی سے اور ماضی سے مستقبل کو توڑنے کا عارضہ نہ پھیلا تھا۔ سلف کے کارناموں پر خلف فراموشی کے جالے نہ تنے تھے۔ اس وقت کے علماء تو جانتے ہیں یا جانتے تھے کہ "علمی جہاد" کی اس ساری صف آراؤں میں جس نقاب پوش کمانڈر کا ہاتھ تھا، وہ بہاری کا پہلا انگریزی داں مسلمان تھا، جس نے ان حشراتی اسکولوں اور کالجوں سے بہت پہلے ایک خاص جذبہ کے تحت انگریزی زبان سیکھی۔ اور ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی، اور جیسا کہ مجھ سے حضرت قبلہ مولانا محمد علی صاحب مونگیری نور اللہ مرقدہ نے بیان فرمایا تھا کہ ان کو کسی وجہ سے یورپ جانا پڑا، اور وہاں کی اندرونی "مسیحی مذہب" کے تمام مستندات و وثائق کا مطالعہ کرکے کتابوں کا ایک ذخیرہ اپنے ساتھ ہندوستان لائے، اور کبھی بے پناہ ہتھیار تھے جو تیار ہوئے بھاری دماغ کے کارخانہ میں، اور مشہور ہوئے یورپ کے بازاروں سے، جہاں بنے، اسے سب بھول گئے، لیکن جہاں سے کے دی سب کو یاد رہا۔ حتیٰ کہ آج مصر کے الازہر اور قسطنطنیہ، بیروت، دمشق کے عام مدرسوں میں مولینا رحمۃ اللہ علیہ کی یہی کتابیں ان لوگوں کے نصاب میں شریک ہے، جو عیسائیوں کے مقابلہ میں اپنے کو تیار کرتے ہیں۔

لیکن کیسی عجیب بات ہے، بدقسمت بہار کو انہوں نے بھلا دیا۔ مولینا رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں میں ڈاکٹر وزیر کا کہیں ذکر نہیں ہے، اور ان کے تذکروں میں اگر کبھی ڈاکٹر مرحوم کا نام لیا بھی جاتا ہے، تو اس سے شاید ہی کوئی واقف ہو کہ اسلام کا یہ مخلص خادم بہار کا باشندہ تھا۔

مگر جس کو انہوں نے بھلایا، دیکھو اغیروں نے اس کو کس طرح یاد رکھا ہے، حال میں ایک کتاب مصر سے چھپ کر آئی ہے جس کا نام "الغارۃ علی الاسلام" یعنی "اسلام پر دھاوا" ہے یہ دراصل ایک فرانسیسی مصنف اور مسیحی مشنری ا۔ل۔ شاتلیہ L. ALCONQUCTE DU'MONDE-MUSULMAN کی کتاب A. LE. CHATCLICR کا ترجمہ ہے۔

یہ کتاب دراصل دین عیسوی کے منادیوں کی ان کوششوں کی رپورٹ ہے، جو اسلامی ممالک میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی سے اسوقت تک مختلف شکلوں میں جاری رہی ہیں، ایشیا، افریقہ میں کلیسا کے سفیروں نے اب تک جتنے کام کئے ہیں ان پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس ذیل میں ہندوستان کا بھی باب ہے۔ خواجہ مذکور نے فرانس کے مشہور تبلیغی رسالہ "مجلۃ العالم الاسلامی" سے انیسویں صدی کے ہندوستانی مشنریوں کی سرگرمیوں کے متعلق یہ لکھ کر کہ

"اس وقت ہندوستان کے طول و عرض میں ہزارہا مشنری جماعتیں سرگرم عمل ہیں۔ ان مسیحی مشنریوں کے تقریباً ایک ہزار مدارس ہیں، جن میں ۸۰ ہزار طلبہ تعلیم پاتے ہیں، ان کے سالانہ مصارف پانچ لاکھ فرنک ہیں، ان جماعتوں اور ان کے معاہد کی کارروائیاں مختلف شکلوں میں اپنے مقصد براری میں مصروف ہیں، ہر ملک میں اس کے حضری حالات کی بنا پر تبلیغی طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔" ان کے بعض منادیوں کا گروہ بنگال میں بھی کام کر رہا ہے جن کا کام اب صرف مسلمانوں تک محدود نہیں ہے۔"

آخر میں، بھولے ہوئے بہار اور اس کے گمنام مخلص خادمانِ اسلام کی نام و نمود سے پاک خدمتوں کا اعتراف ان لفظوں میں پڑھ کر تاہے

لہ العبدۃ علی الرادی مولینا رحمت اللہ علیہ کے جانشیل و خلیفہ مولوی محمد سعید صاحب کیرانوی مرحوم جن کا حال ہی میں انتقال ہوا، انھوں سے ڈاکٹر وزیر کے ان تمام کارناموں کی توثیق کی، اور میں نے ان ہی سے سنا کہ ڈاکٹر وزیر مرحوم کے انگریزی اور ڈاکٹری پڑھنے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ڈاکٹر مرحوم مرشد آباد کی حکومت میں کسی عہدہ پر ملازم تھے، جب سراج الدولہ اور فورٹ ولیم میں جنگ ہوئی، پلاسی کے میدان میں آسمان نے مسلمانوں کے متعلق آخری فیصلہ کا اعلان کیا، اس جنگ میں اور اسکے بعد جن بے دردیوں سے گوروں نے کالوں کو مارا تھا، ڈاکٹر وزیر مرحوم کے دل میں ان واقعات نے بغض و عناد کی آگ بھر دی۔ اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے خواہ کچھ ہی رائے قائم کی جائے۔ لیکن اس کا کیا کہ اس بحران میں انکے جنون نے یہ رائے دی کہ وہ انگریزی پڑھیں، اور باضابطہ کسی میڈیکل اسکول میں داخل ہو کر ڈاکٹری کی سند حاصل کرکے گوروں سے کالوں کا بدلہ لیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں وہ کامیاب ہوئے۔

عربی زبان میں یہ اعتراف جن لفظوں میں ادا کیا گیا ہے میں بجنسہ اسے یہاں نقل کرتا ہوں۔

وقد تتفق حدوث مشاكل بينهم وبين المسلمين كما هو الامر في (بيحار) حيث قام مشائخ القرى واعترضوا على المبشرين ولكن هذه الاعمال لم تحل دون انتشار التوراة باللغة الاوردية۔

(الغارة على الاسلام صـ۳۳)

کبھی کبھی عیسائی علماء اور مسلمانوں کے درمیان مشکلات بھی پیش آئے ہیں جیسا کہ بہار کا حال ہے کہ وہاں دیہاتوں کے مشائخ (علماء) کھڑے ہو گئے اور انھوں نے عیسائی مشنریوں کی راہوں میں رکاوٹیں پیدا کیں لیکن یہ مخالفانہ کارروائیاں تورات کو اردو زبان میں منتقل ہونے میں حائل نہ ہو سکیں۔

یہ انیسویں صدی کے آغاز اور اٹھارہویں صدی کے اختتام کے عہد کی رپورٹ ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ابتداء میں عیسائی پادریوں میں ہندوستانی مسلمانوں کو عیسائی بنا لینے کی امیدیں کس قدر قوی تھیں، انھوں نے یہ دیکھ کر کہ مسلمان اس ملک کی ایک ایسی قوم ہے جو بہ نسبت دوسری قوموں کی عیسائیت سے بالکل قریب ہے۔ اس کا ایمان تورات و انجیل پر بھی ہے، وہ تمام توراتی و انجیلی انبیاء و رسل اور اس کے اصول ایمانی بلکہ اکثر و بیش تر عملی قانون پر ایمان رکھتی ہے۔ خود حضرت مسیح علیہ السلام کی بزرگی اور انتہائی تقدس کی معترف ہے۔ ایسوں کا عیسائی بنا لینا بہ نسبت ان لوگوں کے یقیناً آسان سمجھا جا سکتا تھا، جو مسیحی دین سے تو خیر اس دین کے ہادیوں اور پیشواؤں کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔ خصوصاً ہندوستانی علماء کا عیسائی مذہب اور اسرائیلی دین کے ادبیات سے بالکلیہ ناواقف ہونا، اس نے اس توقع میں اور بھی قوت بہم پہونچائی۔ لیکن ہندوستان کے اس تعصب کو داعیان مسیحیت کے لب و دنداں کے لئے لوہے کا چنا جن لوگوں نے بنا دیا ابتداءً وہ نہ دہلی کے علماء تھے، اور نہ لکھنؤ کے مناظقہ، بلکہ وہی کس پرس صوبہ جس کا نام مٹایا گیا ہے، اور اس حد تک مٹایا گیا ہے کہ اب اگر ان خدمات کے سلسلہ میں اس کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ تو پیشانیاں چڑھتی ہیں، اور اظہار واقعہ کا نام "صوبجاتی عصبیت" رکھا جاتا ہے۔

بہار اور بہار میں بھی شہر کے باشندے نہیں بلکہ "قری" اور "دیہاتوں" کے مشائخ نے وہ کام کیا، کہ آج پیرس کے علمی ایوانوں سے ان کے خدمات کی داد دی جاتی ہے، مسیحی علماء ان کا ذکر کر کر کے اپنا سر پیٹتے ہیں، "قری بہار" کے یہی مشائخ و علماء تھے، جنھوں نے بالآخر ان مشنریوں کو بجائے آباد علاقوں، اور متمدن شہروں کے رگید رگید کر بالآخر اس پر مجبور کیا کہ وہ رانچی کے جنگلوں اور ہزاری باغ کے بیابانوں، دمکہ کی ویران وادیوں، سنتھال پرگنہ کے کوہستانی علاقوں کو اپنے تبلیغی سرگرمیوں کا حلقۂ عمل قرار دیں، اسی کی طرف اس رپورٹ میں ان لفظوں سے اشارہ کیا گیا ہے، کہ اب مشنریوں کا رخ صرف مسلمانوں کی طرف نہیں ہے" یقیناً اس خصوصیت کو جس نے عمومیت سے بدلا دیا "مشائخ قری" کے ان دفاعی کارناموں کا نتیجہ ہے لیکن یہ بات کہ "مشائخ قری بہار" میں یہ طاقت کس راہ سے آئی؟ خیال گذرتا ہے کہ اس مقابلہ کی قوت اس بے روریا، مخلص اسلام ڈاکٹر وزیر مرحوم کی اندرونی تائیدوں سے پیدا ہوئی ہوگی، لیکن تاریخ کی ان تمام کڑیوں کا اکثر حصہ ہماری نگاہوں سے ناپید ہے، کچھ نہیں معلوم کہ یہ ڈاکٹر وزیر مرحوم بہار کے کس علاقہ کے باشندے تھے، انھوں نے اپنے وطن کے کن کن مولویوں کو اندرونی طور پر اسلام کے اس علمی جہاد پر آمادہ کیا، بھولے بسرے قصوں میں کچھ بزرگوں کی زبانی مولینا نعمت اللہ صاحب کلکٹر (نیکوکار) جو مظفر پور میں صدر اعلیٰ تھے۔ مولانا شجاع الدین خاں بہادر مرحوم جو کسی زمانہ میں دہلی کے بھی صدر اعلیٰ رہے تھے۔ مولانا محمد حسن گیلانی مرحوم کی چند کتابوں کا نام سنا جاتا ہے، جن میں سے مولانا محمد حسن گیلانی مرحوم کی کتاب کا ذکر خاکسار نے "ندیم" ہی کے کسی گذشتہ بہار نمبر میں کیا تھا، اور جس کے بعض علمی نظریات کا ذکر دارالمصنفین

لہ عربی زبان میں یہ لفظ فرانسیسی زبان کی راہ سے منتقل ہوا ہے ہمارے صوبوں ہندوستان کے اس اسلامی صوبہ سے اسی قدر ناواقف ہیں۔ کہ بجائے بہار، ہوز اس کا املا حاء علی سے کیا گیا۔ اگر واقعات کا علم پہلے سے ہوتا، تو شاید یہ بھی دشوار تھا کہ آخر یہ بیحار ہندوستان کا کون سا علاقہ ہے

کے مجلہ علمیہ "معارف" میں بھی کچھ دن ہوئے کہ شائع ہوا تھا' ان چند گشتہ و شکستہ واقعات کے سوا "بجارے مشائخ اتھری" کے ان خدمات کی کوئی تفصیل معلوم نہیں ہوئی' بجز ماسٹر محسن علی مرحوم بانی انجمن حمایت الاسلام لاہور کے تاریخ نے ان مجاہدوں کے ناموں کو عہد ماضی کے شکنوں میں لپیٹ دیا۔

میرا ارادہ ہے و الاتمام علی اللہ تعالیٰ کہ اگر موقعہ و فرصت بدست ہوئی تو کچھ دن بہار کے ان قریوں میں گھوم کر اسلاف کے ان گم شدہ تذکروں کو مہیا کر کے کسی کتاب کی شکل میں شائع کر دوں۔ لیکن اس مرتب و مسلسل تاریخ کی ترتیب کے لئے وقت و فرصت درکار ہے کاش مجھ فرسودہ دائمی بیمار کی جگہ کسی بہاری نوجوان تازہ کو اس کی توفیق رفیق ہو۔ بہر حال بالفعل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بہار کے جن علماء و اہل قلم کے حالات تک رسائی ہوئی ہے۔ ان کے حالات "ندیم" کے خاص و عام نمبروں میں شائع کر دیئے جائیں۔ اور آج اس سلسلہ میں ناظرین کے سامنے مشرقی پٹنہ یا (گیدھ) کے ایک مشہور گاؤں اسلتھاواں کے ایک بزرگ عالم و صوفی مولانا عبد الغنی وارثی مرحوم کے کچھ حالات جو اب تک ہمیں ملے ہیں پیش کروں۔ اس سے مقصود صرف افسانہ خوانی اور "ذکر آبا" ہی نہیں ہے' بلکہ پچھلوں کے آگے پہلوں کے کارنامے ماضی کے متحرک کئے جاتے ہیں کہ ہو سکتا ہے اس ذریعہ سے بجھی ہوئی کجلائی چنگاریاں شاید پھر چمک اٹھیں جن کو آج کچھ نہیں سمجھا جاتا ہے ان کو معلوم ہو کہ یہی کل کیا کچھ تھے' ان بزرگوں نے کن صعوبتوں اور تکلیفوں سے زندگی کی پرخار راہوں میں خود اپنے لئے راہیں بنائیں۔ انھوں نے کس طرح علم و عمل کے آئیں کو اپنی زندگی پر منطبق کیا' کس طرح انھوں نے دنیا کی بلندیوں کے ساتھ آخرت کی رفعتوں پر بھی اپنی آنکھیں برابر لگائے رکھیں' پرتشاط' آرام بخش' نعمتوں سے بھری ہوئی زندگی میں بھی موت کی تیاریوں سے غافل نہ رہے' واقعہ یہ ہے کہ مولانا عبد الغنی مرحوم کی زندگی جیسا کہ آئندہ پڑھنے سے معلوم ہوگا۔ اس قسم کی عبرتوں اور بصیرتوں کے بہترین سرمایہ کو پیش کرتی ہے۔ فاقصص القصص لعلھم یتفکرون۔ اور اس سال کے بہار نمبر "ندیم" کے لئے میں نے ان ہی کے ترجمہ کا انتخاب کیا ہے' اس نمبر میں پوری سوانح عمری کا اندراج تو مشکل ہے لیکن اس سے ابتدا کی جاتی ہے۔

ملک بہار

یوں تو مگدھ دیش جو بعد کو مہاتما بدھ کی دہاروں کے مرکز ہونے کی وجہ سے بہار کے نام سے مشہور ہوا عمومی طور پر ہندوستان کے ایک وسیع علاقہ کا نام ہے' لیکن یہی لفظ مگدھ خبیث مگدھ بنا' اور مگدھ کے بعد کثرت استعمال نے اس لفظ کو مگہ کی شکل میں بدل دیا' تو اب اس کا اطلاق بجائے پورے صوبہ بہار کے صوبہ کے ایک محدود خطہ پر ہونے لگا' دریائے گنگا کے جنوبی ساحل کی وادی کا وہ حصہ جو دریا سے کم و بیش سات آٹھ کوس کے فاصلہ پر شرقاً و غرباً پھیلا ہوا ہے' اور شمال میں جس کی حد بندی بہار' گریک' بھیکم پور' کوہی' شیخپورہ وغیرہ کی وہ پہاڑیاں کرتی ہیں جن کا شمار سلسلہ وندھاچل کے زنجیروں میں ہے' دوسرے لفظوں میں یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ متشرقی پٹنہ اور ضلع مونگیر کا مغربی حصہ' گیا کا شمالی علاقہ۔ ان کے مجموعہ کا خاص نام مگہ ہے۔ جس کا مرکزی شہر اب وہ قصبہ ہے' جو کسی زمانہ میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے تمام صوبہ کا نام تھا' یعنی سب ڈویژن بہار' المشہور بہ (بہار شریف)۔

یہ مگہ جو کچھ پہلے تھا' اس کی داستان سے قدیم ہند کی تاریخ معمور ہے' سیاسی و علمی و روحانی و اخلاقی حیثیت سے قرنہا قرن مگہ یہ سارے ہندوستان کا قلب و دماغ بنا ہوا تھا۔ ہندوستان کی سب سے بڑی سلطنت عہد قدیم میں یہیں قائم ہوئی'

۱؎ سرچین بہار کے علمی غزانہ میں ماسٹر مرحوم کا نام بہت نمایاں ہے' ان کا کارنامہ آج بھی انجمن حمایت اسلام لاہور اسکی کتابیں' اس کے اسکول کالج وغیرہ کے ذریعہ سے زندہ ہے' یہ مطلب نہیں ہے کہ انجمن کا سارا کام از ابتدا تا انتہا ماسٹر مرحوم کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ لیکن اگر کسی مہم کی بنیاد رکھنے والوں کو کوئی عزت و امتیاز عطا ہو سکتا ہے تو انجمن کے تمام زندہ کارناموں میں ماسٹر مرحوم کی ہستی یقیناً بہت اہمیت رکھتی ہے۔ افسوس ہے کہ انکے بھی تفصیلی حالات کا مجھے علم نہیں' کاش! انکے دیکھنے والے بزرگوں میں سے کوئی صاحب انکے حالات شائع کر کے بہار کے نوجوانوں کو بیداری کا

ہندوستان کا سب سے بڑا مدرسہ بلکہ مبالغہ نہ سمجھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ پرانی دنیا کا سب سے بڑا مدرسہ اسی سرزمین سے علم و حکمت کی روشنی سارے مشرق میں تقسیم کر رہا تھا۔ مشرقی ایشیا کے سب سے بڑے واعظ اور مصلح کی عملی جدوجہد کا مرکز یہی علاقہ تھا' یہ اور اس قسم کے بیسیوں امتیازات ہیں جن سے قدرت نے اس سرزمین کو نوازا تھا' اگرچہ یہ سارے کارنامے تاریخ میں بڑے مگدھ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں' لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کمالات کی بڑی مقدار کا سرچشمہ دراصل وہی مختصر سا قطعہ ہے' جس پر آج کل لفظ مگدھ کا اطلاق ہوتا ہے' راجگرہا کی راجدھانی ہو' یا نالندا کی یونیورسٹی' مہاتما بدھ ہوں' یا ان کے شاگردوں کی خانقاہیں' ان کی تعلیم گاہیں' تلاش کرو۔ ان میں اکثر کا سراغ اسی سب ڈویژن بہار یا اس کے اطراف کے علاقوں میں ملے گا۔

لیکن یہ اقبال اس وقت کا ہے' جب بہار' بہار کی مٹی' بہار کا پانی' بہار کی ہوا' بہار کی پیداوار سب بہاریوں کی تھی۔ پر جب آسمانی گردشوں نے رخ بدلا' جو بہار میں رہتے ہیں' ان کا اس ملک کے کسی جزء سے کوئی تعلق نہیں رہا' ہوتے یہ ہیں' کاٹتے دوسرے ہیں' فطرت ہے کہ جب کسی ملک کے اقبال کے گیندوں پر اس قسم کی نحوستوں کے الو بیٹھ جائیں' اس کے باشندوں سے کس بات کی توقع کی جاسکتی ہے' اور اس حال میں بھی اگر کوئی کچھ کر گذرے' تو سچ یہ ہے کہ اس نے بہت کچھ کیا۔ بدقسمتی سے آج ہم مگدھ بدبخت مگدھ کے جس فرد کا ذکر کرنا چاہتے ہیں' اس کا تعلق اسی عہد ادبار و تعبد سے ہے۔

سب جانتے ہیں کہ غلامی کا وہ طوق جس نے خود اپنے اوپر حکومت کرنے والے ہندوستان کو دوسروں کی محکومی میں داخل کر دیا۔ سب سے پہلے یہ طوق بنگال و بہار ہی کی گردن میں ڈالا گیا۔ گنگا و جمنا کے سنگم الہ آباد میں ہندوستان کے نابینا بادشاہ نے جب اپنا ملک غیر ہندی قوت کے ہاتھ میں سونپنا شروع کیا۔ تو اس کا آغاز اسی منحوس و سوختہ اختر علاقہ سے ہوا جس میں بہار بھی داخل تھا۔ حکومت کے اس انقلاب نے صرف حکومت ہی کو نہیں بدلا۔ بلکہ حکومت گیا بدلی سب کچھ بدل گیا' دماغ بدلے' دل بدلے' زبان بدلی' وضع بدلی' ہیئت بدلی' اندر بدلا باہر بدلا' اور بہ تدریج اس انقلاب کی چڑھائی اس حد کو پہونچی' کہ موچھوں اور ڈاڑھیوں' بلکہ سر کے بال بال تک اس کے اثرات پھیل گئے' پہلے جو عالم سمجھے جاتے تھے۔ وہ جاہل ٹھہرائے گئے۔ ناکاروں کو بے کار قرار دیا گیا۔ دانشمندوں کو ہنرمندوں کے گروہ میں ڈھکیلا گیا۔ ملک ترقی کے معاشی' اقتصادی' معاشرتی ذہنی' کشمکش میں جکڑ کر راہ رہا تھا' کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا' کہ کیا کیا جائے' ملک کے جن افراد کا کچھ نہیں گیا تھا' یا جن کے پاس اس انقلاب سے پیش تر کوئی سرمایہ نہیں تھا' ان کے لئے اگرچہ اس انقلاب میں زیادہ دشواریاں نہ تھیں۔ لیکن وطن کا وہ گروہ جو یکایک اپنا سب کچھ کھو بیٹھا تھا' اسکی عزت حکومت' دولت' ذہنیت سب کچھ برباد ہو رہی تھی' اس کا حال عجیب تھا' وہ روتا تھا۔ لیکن رونے کے کار تھا' وہ روٹھتا تھا' لیکن کسی کو اس کے منانے کی پروا نہ تھی۔

یہی وقت ہوتا ہے' جب سب کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں' سب ہوش کھو بیٹھتے ہیں' اس وقت چند توفیق یافتہ افراد سب سے الگ ہو کر اپنی قوم' اپنی ملت' اپنے مذہب کے انجام پر غور کرتے ہیں' اور ان ہی نامرادیوں' ناکامیوں کے ہجوم میں بالآخر اپنے لئے' اپنی قوم کے لئے کوئی راہ بناتے ہیں' اگرچہ عہد غلامی میں ان کو وہ امتیاز میسر نہیں ہوتا' جس کے وہ اپنی آزادی کے دنوں میں صحیح طور پر مستحق تھے' لیکن سچ یہ ہے کہ ان کی کوششوں کی ایک رتی ایسے نامساعد عہد میں زمانہ اقبال کی پہاڑوں کا مقابلہ کرتی ہے۔

مگر کے اس عہد ادبار میں جن بزرگوں نے بجائے گریہ و بکاء' ماتم' اور سوگ کے کچھ کر گذرنے کا تہیہ کیا؟ ان میں جہاں چند اکابر کے نام سنہرے حروف میں لکھے جائیں گے۔ اسی میں ایک تابندہ و درخشندہ نام اس ہستی کا بھی ہے جن کا نام" مولوی عبدالغنی وارثی مرحوم ہے۔ اور آج ہم جن کے حالات کا ایک سرسری خاکہ ناظرین کے آگے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

اس وقت ہندوستان یا بہار کے بھی دوسرے خطوں سے مجھے بحث نہیں' بلکہ صرف مگدھ کا وہ خاص علاقہ پیش نظر ہے' جس کے مختلف قری اور دیہات استھانواں' دسنہ' گیلانی' ڈمرانواں' اگانواں' بازید پور' دیوکلی' رمضان پور' جانا کوند' معافی' بلچی' شکرانواں وغیرہ کے نام سے موسوم ہیں۔ ان بستیوں میں مسلمانوں کی مختلف قومیں آباد ہیں بعضوں میں صرف

سادات ہیں مثلاً گیلانی - بعضوں میں برادران سادات کے ساتھ قوم ملک کے لوگ بھی رہتے ہیں جیسے استھانواں دسنہ اور بعض میں شیوخ کرام کی آبادیاں ہیں جیسے رمضان پور، جانا - بعضوں میں شیوخ کے ساتھ سادات بھی رہتے ہیں جیسے کوسنہ -

شرفار نگہ کی یہی چند بستیاں ہیں جو اس عہد رست وخیز، دار وگیر میں بھائے رونے اور چلانے کے کچھ کرنے پر آمادہ ہوئیں - اٹھے اور بڑے زور شور کے ساتھ اٹھے، کرنا سب چاہتے تھے، لیکن کیا کرنا چاہیئے، اس میں مختلف بستیوں اور گروہوں کا خیال مختلف تھا، ایک عجب ہنگامہ تھا، کچھ لوگ تھے، جو بے تحاشا انگریزی کے کھولے ہوئے اسکولوں اور کالجوں کی طرف بھاگے جاتے تھے، اور ان کی راہوں سے وہ انگریزی دفتروں اور کچہریوں پر قبضہ کر رہے تھے، کوئی ان دفتروں میں ملازمت کی راہ سے جاتا تھا، اور کوئی وکالت ومختاری کے بھیس میں داخل ہوتا تھا، اس طبقہ میں زیادہ افراد ان لوگوں کے تھے جن کی نگاہوں میں سامنے کی زندگی کو آنے والی زندگی سے زیادہ اہمیت حاصل تھی، جد وجہد کے اس سلسلہ میں انگریزی کتب خانوں کے پہلے کلاس سے کیمرج اور اکسفورڈ تک کے ہالوں میں گہ کے ان دیہاتوں کے مسلمان پھیلے ہوئے تھے، حتیٰ کہ انیسویں صدی کی پچھلے حصہ ہی میں گذشتہ بالا بستیوں میں سے شاید ہی کوئی بستی ایسی ہوگی جس کے ایک دو آدمی انگلینڈ تک نہ پہونچ گئے ہوں -

دوسرا طبقہ ان کا تھا، جس کو کام سے انکار نہ تھا، لیکن آغاز سے زیادہ ان پر انجام کی بہتری کا خیال مسلط تھا، وہ مسلمانوں کی دولت، مسلمانوں کے رویے سے زیادہ ان کے دین کی حفاظت کو اہمیت دیتے تھے، تقریباً اس خیال کے لوگ بھی ہر گاؤں میں تھے، دیکھا جاتا تھا، کہ اس وقت جب کہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریلوے ای - آئی - آر کی بھی بنیاد نہ ہوئی تھی، کچی دیہاتوں کے نوجوان مسلمان دہلی اور لکھنؤ پیادہ یا قافلہ در قافلہ کی شکل میں جا رہے ہیں، انگریزی پڑھنے کا سامان تو بہاری میں موجود تھا - لیکن اسلامی علوم کے تشنہ کاموں کی سیرابی کے جتنے سامان معتلی عہد میں اس علاقہ میں موجود تھے - اس غیر اسلامی اجنبی حکومت نے مختلف تدبیروں سے ان کو برباد کر دیا تھا، مجبوراً ان لوگوں کو اپنے وطن کو خیرباد کہنا پڑتا تھا - اس زمانہ کے دشوار گذار خصوصاً عہد طوائف الملوکی کی بدامنیاں جس کا مرکز زیادہ تر ہندوستان کا بالائی علاقہ تھا - یکہ وتنہا صرف علم کے شوق میں نکل جانا، اور سالہا سال بے سروسامانی کے ساتھ ہر علم کے مشہور اساتذہ سے اپنے لئے علمی سرمایہ مہیا کرنا، حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کے یہی وہ زرین کارنامے ہیں جو ان کے خاندانوں میں آج تک طلب علم کی ان دلچسپ دشواریوں کے قصوں کی شکل میں نقل ہوتے چلے آرہے ہیں -

بہرحال یہ دونوں جماعتیں یکطرفہ تھیں، ایک صرف دنیا کا طالب تھا - اور دوسرا صرف دین کو اپنا مطمح نظر بنائے ہوئے تھا - لیکن زمانہ کے صادق مطالبہ پر دونوں منطبق نہیں تھے، پہلوں کی دنیاوی شادابیاں دیکھ کر مسلمان خوش ہوتے تھے - لیکن ٹھیک جس طرح طاؤس اپنی ٹانگ کو دیکھ کر سرگریباں ہو جاتا ہے، ان کی دینی لاپروائیوں کو دیکھ کر نہ صرف دوسرے بلکہ خود ان کے گھر والے ان کے ماں باپ شرما جاتے اور سرد آہ کھینچ کر رہ جاتے تھے، تقریباً کچھ یہی حال دوسرے گروہ کا بھی تھا، ان کے مذہبی جوش وخروش، دینی زندگی، روحانی بلندیاں، دلوں میں مسرت کی لہریں پیدا کرتیں - لیکن اسی کے ساتھ ان کی معاشی تنگ حالیاں، اور پھر اس تنگ حالی سے نکلنے کے لئے تنگ مایہ شخصیتوں کا ناگفتنیا وناکردنیا میں مبتلا ملت کے عام افراد کو عرق ندامت میں غرق کر دیتا تھا، ممبر ومحراب کی یہ ترانیاں، جب خلوت وخانہ خالی کی لاپروائیوں میں بدل جاتی تھیں، تو واقعہ یہ ہے کہ بسا اوقات مخلصوں کے دل سے یہ آواز نکل پڑتی تھی، کہ

بہ تمار خانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم چو بصومعہ رسیدم ہمہ پاکم دغا دیدم

کس قدر عجیب بات ہے، کہ محسوس سب کر رہے تھے، لیکن گرفت کرنے کی جرأت کسی میں نہ ہوتی تھی، بات کچھ بھی نہ تھی، ایک پایہ پر بندوق کا گھوڑا اکھڑا تھا - سب حیران تھے، کہ فائر کیوں نہیں ہوتا، حالانکہ بادی جنبش اسی گھوڑے کو دو پاؤں پر چڑھا دو - پھر دیکھو کہ شکاروں کا انبار تمہارے سامنے پڑا ہے یا نہیں، صاف لفظوں میں زمانہ پکار رہا تھا کہ اب اسلامی اور

دینی علوم کے ساتھ مغل دربار کے عقل اور دنیوی فنون کی تعلیم و ترویج نہ صرف غیر مفید بلکہ مضر ہے لیکن باوجود سمجھنے کے کوئی اس آواز پر کان دھرنا نہیں چاہتا تھا۔ عام ہلاکت بھی چاہتی تھی۔ لیکن ہلاکت کی خواہشوں سے اغماض کرتے ہوئے ہر شخص اپنی خواہشوں کی تکمیل میں مصروف تھا۔ اور اس کا نتیجہ تھا کہ جس مقبولیت کی توقع عام مسلمانوں کے ہر گروہ سے اُن دینی علم کے علم برداروں کو ہو سکتی تھی، روز بروز وہ سرد پڑتی جاتی تھی۔

یوں تو ملت کے اس عام مطالبہ کی تشخیص اور اس کا اعتراف بعد کو علماء کی اس جماعت نے ضرور کیا جس کا نام "ندوۃ العلماء" ہے اور گو عملی طور پر اس حد تک جس حد تک زمانہ کا مطالبہ تھا، وہ پورا نہ کر سکی، اور اب تک اس سلسلہ میں اس کی کوششوں کا دائرہ بہت تنگ ہے، لیکن انفرادی طور پر جہاں تک میرے حقیر معلومات ہیں، اس بات میں کم از کم ہمارے علاقہ میں عملی اقدام اس کی طرف جس گاؤں کے باشندوں نے کیا، اس کے ناصیہ فہرست میں سب سے پہلے جس بستی کا نام درج ہو سکتا ہے۔ وہ استھانواں ہے، استھانواں کے ان ہی ارباب فکر و بصیرت عزم و عمل میں نمایاں ہستی جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا مولانا عبدالغنی وارثی مرحوم کی بھی ہے۔ یہ استھانواں ضلع پٹنہ عظیم آباد کے تعلقہ (سب ڈویژن) بہار سے تین کوس پورب ایک متوسط درجہ کا گاؤں ہے۔ آبادی کے لحاظ سے اسکو اپنے نواح کے دیہاتوں میں جو اہمیت حاصل ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس علاقہ کا تھانہ، ہسپتال، بڑا ڈاک خانہ استھانواں ہی میں قائم ہے، اگرچہ یہاں کوئی مستقل بازار نہیں ہے لیکن مختلف ٹولوں اور گلیوں میں بنیوں حلوائیوں کی کچھ دکانیں پائی جاتی ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں بھی مل جاتی ہیں۔ یہ اس شاہراہ پر واقع ہے جو اسٹیشن بہار کو شیخورہ اسٹیشن سے ڈسٹرکٹ بورڈ کی اسی سڑک پر شیوخ کرام کی مشہور بستی جہانا اور سادات عظام کا پاک قریہ محی الدین پور گیلانی (جس کا عام نام گیلانی ہے) واقع ہے، اسی پر علاقہ مگہ مشہور بازار بارنگھا (یا بقول بعض بہار باغ) آباد ہے۔

محمد بن بختیار خلجی کے مفتوحہ علاقہ سے نکھی سہرا کے راجہ نے مسلمانوں کو جب بے دخل کر دیا تو قطب الدین ایبک کے حکم سے سادات اور ملوک کی ایک فوج پھر بہار آئی، اسی فوج میں جاجیزی سادات کے ایک بزرگ حضرت مولانا سید احمد جاجیزی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، جن کو وندھاچل کی ایک شاخ جس کا نام بزرگوں نے "کوہ بم بر" سنتے چلے آتے ہیں کے دامن میں جاگیر ملی۔ اس جاگیر کا مرکزی گاؤں اکساری تھا، جہاں حال میں سوتھ بہار ریلوے نے اب اسٹیشن بھی بنا دیا ہے۔ اکساری کے آس پاس میں ان سیدوں کے اور بھی آباد یاں بسائیں جو تعداد میں غالباً بارہ تھیں۔ اسی بنیاد پر سادات کی ان بارہ بستیوں کا نام بارہ گاؤں ہوا، جن میں مانہ کمنڈا بیت رہنٹہ جموا زدہ کنٹی کوتل چوارہ وغیرہ اب تک مشہور بستیاں ہیں۔ لیکن ان بارہ گاؤں میں اکساری کو سب میں اہمیت حاصل تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارباب عز و سعادت کی قیامگاہ کا شرف اسی قریہ کو حاصل تھا۔ کثرت آبادی یا بوجوہ دیگر مختلف اوقات میں اکساری کے سادات بارہ گاؤں سے نکل نکل کر دوسری بستیوں میں آباد ہونے لگے، محی الدین پور گیلانی جو تاریخی طور پر بھانوں کا گاؤں تھا، یہاں اکساری ہی کے ایک سید میر محمد مقیم تشریف لاکر آباد ہوئے۔ اور ایسے جمے کہ اب اس گاؤں میں بجز ان کی اولاد کے غریب بھانوں کا نام و نشان بھی باقی نہیں، اسی طرح اکساری کے کوئی بزرگ جن کا نام مجھے معلوم نہ ہو سکا استھانواں میں بھی قیام پذیر ہوئے۔

جاجیزی سادات کے اس خاندان سے جو اکساری سے منتقل ہو کر استھانواں میں آباد ہوا، ہمارے مولانا عبدالغنی وارثی مرحوم کا جدی تعلق ہے۔ آپکے والد کا نام سید واحد علی بن سید فرزند علی بن سید کرم علی تھا۔ اور آپ کی والدہ ماجدہ سیدی کی تھیں جو سب ڈویژن بہار ہی کا ایک مشہور گاؤں ہے۔ اور سادات ملوک کا وطن ہے، ان کے والد کا نام میر رحیم بخش تھا۔

مادر مہربان کی جدائی

سنہ ۱۲۶۱ھ ہجری مطابق سنہ ۱۸۴۵ء پوس میں یہ مقام استھانواں آپ کی ولادت ہوئی۔

کسی خاص ملک یا عصر کے ساتھ خدا کی نشانیاں مخصوص نہیں ہوتیں، بلکہ جیسا کہ آسمانی بیان میں اعلان کیا گیا ہے کہ کَاَمِنْ مِّنْ رَّبِّیَۃٍ یَّمُرُّوْنَ عَلَیْھَا وَھُمْ عَنْھَا مُعْرِضُوْنَ (کتنی نشانیاں ہیں جن پر لوگ گذرتے ہیں اور وہ ان سے بے توجہی برتتے ہیں) ورنہ زمانہ کی صدیوں، سالوں اسکے مہینوں بلکہ ہفتوں، دنوں اور سچ تو یہ ہے کہ گھنٹوں اور پلوں میں زمین کے ہر خطہ پر ہر

شہر، ہر قصبہ، ہر گاؤں بلکہ ہر گھر میں جو چونکنا چاہتے ہیں ان کے لئے چونکانے والی آوازیں ہر لحہ بلند ہوتی ہیں، اصلی طاقت سے نظر بچا کر جھٹوں نے محسوس قوتوں کے ساتھ اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کا رشتہ جوڑا ہے، وہ کانپ جاتے ہیں، جب ان کے ہاتھ کے گڑھے ہوئے بتوں میں سے کوئی بت سرنگوں ہوتا ہے۔ ہوش اڑ جاتے ہیں، جب ان اختراعی بھروسوں میں سے کوئی بھروسہ ان کو بے بھروسہ کر کے ناپید ہو جاتا ہے۔ رب سن، بلکہ جو خود مربوب ہے اور دوسرے کا پروردہ ہے۔ جوان کو رب ٹھہراتے ہیں انکا کیا خیال ہوتا ہے جب کسی شیر خوار بچہ کی ماں مرجاتی ہے۔ چیختے ہیں کہ اب اسکو کون پالے گا۔ حالانکہ جو یہ کہہ رہا ہے وہ یہ بھول جاتا ہے کہ خود اسکو کون پال رہا ہے۔ کیا واقعی ہوش والوں کا پالنے والا ان کا ہوش ہے یا عقل رکھنے والوں کا رکھوالا ان کا دماغ ہے۔ کتنی بدعقلیاں پوشیدہ ہیں ان عقلوں میں جو رکھنے کے باوجود عقل سے کام نہیں لیتی۔ جب مسلم ہے کہ ہوش و گوش والوں کے نگہدار یہی صاحبانِ عقل و ہوش نہیں ہیں تو بے ہوش و حواس بچوں کے متعلق کیوں اضطراب ظاہر کیا گیا۔ کہ اسکی پاسبانی کون کریگا۔ صرف ایک اس امانی غلطی جو ایمانی کے ساتھ عقلی بھی ہے اسکی تصحیح کے لئے مشاہدات کے کتنے جنگل ہیں۔ جو تاریخ کے ناپیدا کنار وادیوں میں پھیلے ہوئے ہیں یقین دیکھنے کے بعد بھی لوگ دیکھنا نہیں چاہتے دیکھئے یہی مولانا عبدالغنی واثقی مرحوم ہیں، پیدا ہوئے۔ پیدا ہونے کے کچھ ہی دن بعد یعنی ان فرضی خداؤں کے ظہور سے پہلے جس کا نام ہوش و حواس، عقل و دانش رکھا گیا ہے۔ اپنی پرورش کے سب سے بڑے ذریعہ یعنی مادر مشفقہ کی آغوش رحمت سے محروم ہو جاتے ہیں اور بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی ہے آپ کے والد کی جوانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی، چند دنوں کے بعد مولوی صاحب کی سوتیلی ماں کو لاکر انھوں نے آپ کو مہر پدری کے بھی ایک بڑے حصہ سے محروم کر دیا۔ ہندی کی مثل "ماں مری باپ پیتا" کی کلیت یہاں بھی ٹوٹنے نہ پائی۔ اب مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم ہیں جو اس وقت بہاریوں کی اصطلاح میں توآز عبدالغنی تھے اور ان کے ساتھ ان کی غالباً دو چھوٹی بہنیں سب کہہ رہی تھے کہ ان کو کون پالے گا۔ ماں کو تو خدا نے اٹھا لیا اور باپ کو سوتیلی ماں نے چھڑا لیا۔ لیکن اس توآر عبدالغنی کو ان ہی کہنے والوں نے دیکھا کہ وہ حیدرآباد سے تقریباً ۲۰ سال استھانواں نظام الملک آصف جاہ خلد اللہ ملکہ کے ایک رفیع القدر عہدہ کی حیثیت سے نوابانہ تزک و احتشام کے ساتھ آتا ہے اور اپنی دین و دنیا کی دولت سے سرکہ و مہ کو مالا مال کر رہا ہے۔ اس تماشے کو لوگوں نے نصف صدی سے بھی کم حصہ میں دیکھا۔ اسکی ابتدا کو بھی دیکھا اور انتہا کو بھی دیکھا۔ لیکن اس دیکھنے کے بعد کتنی گردنیں ایسی خوش نصیب ثابت ہوئیں جو چھوٹی قوتوں سے ٹوٹ کر اس قوت کے آگے جھک جاتیں جسکی ربوبیت کی یکتائی کے اعلان کے لئے خدا نے انسانوں تک سے زیادہ برگزیدہ جماعت انبیا علیہم السلام کو منتخب فرمایا۔

بہر حال مولینا مرحوم کی طفولیت کا وہ زمانہ ظاہر بینوں کے لئے یقیناً دردناک تھا، گھر جاتے ہیں تو اس ماں سے وہ خالی ہے جسکی گود میں پہونچکر ہر سب کچھ بھول جاتا ہے، باہر نکلتے ہیں تو جو گھر میں نہیں پوچھا گیا اسے باہر والے کیا منہ لگاتے، خود کبھی بھی زندگی کے ان بیتے ہوئے دنوں کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے:۔

"سرما کا موسم ہم پر یوں بھی گذرا ہے کہ کھدر کی صرف ایک دوہر ہوتی جس میں ہم تینوں بھائی بہن نے جاڑے کے چار مہینوں کو کاٹا۔"

یہ سب کچھ تھا لیکن جسکو پالنے والا پالنا چاہتا تھا وہ پل رہا تھا بڑھ رہا تھا اسکے قدرتی ملکات اور فطری صفات روز بروز شگفتہ ہو رہے تھے، شرفاء سادات کے گھرانے سے آپ کا تعلق تھا، کچھ ہی دن کے بعد برطرف سے حق کے خود اپنے اندر سے مطالبہ پیدا ہونے لگا کہ اب اس بچہ کو پڑھنا چاہیے۔

آغاز تعلیم میکالے کی رپورٹ کے بعد شور برپا کیا گیا ہے کہ جاہل ہندوستان علم سے بھر گیا اور واقعہ بھی یہی ہے کہ آج پاٹشالوں، مکتبوں، اسکولوں، کالجوں، مدرسوں اور اسکے ساتھ دوسرے علمی تعلیمی اداروں سے ملک کا گوشہ گوشہ پٹا ہوا ہے اور ان کی راہوں سے مغربی کارخانوں کے بنائے ہوئے قلم پنسل، کاغذ، پرسیوں کی چھپی ہوئی وہ کتابیں جن کی نصابی عمر برسات کے کیڑوں سے بھی کم ہوتی ہے، آئی تجارت ہو رہی ہے۔ لیکن کس قدر عجب بات ہے کہ جس وقت یہ سب کچھ نہ تھا لیکن ایک شخص چاہتا تھا کہ اس کا بچہ قرآن ناظرہ پڑھے یا حفظ کرے اسکو لکھنا آجائے خوشخط ہو جائے۔ ہندوستان کے عام معاشی وسیلہ یعنی زراعت کی راہ سے جو آمدنی ہوتی ہے۔ اس کے تحصیل و وصول جمع و خرچ جیسے پیچیدہ کاروبار میں مہارت حاصل ہو جائے۔ عام دنیاوی مشاغل میں جس حد تک حساب کی ضرورت ہے اس میں ماہر ہو جائے اور

اسی کے ساتھ اردو آجائے۔ اتنی اردو آجائے کہ نہ صرف میر و مرزا، انیس و دبیر کے کلام سمجھنے کی بلکہ تیر مرزا بننے تک کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ فارسی آجائے اور اتنی فارسی آجائے کہ سعدی، حافظ، عرفی، نظامی، جامی، خاقانی، قاآنی وغیرہم اساتذہ کے نظم و نثر کی افہام و تفہیم کی پوری قدرت پیدا ہو جائے۔ بلکہ اگر کسی کا جی چاہتا تھا کہ مرے بچہ کو بقدر ضرورت اتنی عربی آجائے کہ باسانی قرآن و حدیث سمجھ میں آنے لگے تو شہروں اور قصبوں ہی میں نہیں، بلکہ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں علم و فن کی ان گوناگوں منزلوں کو طے کرانے کا داعر سامان تقریباً ہندوستان کے ان تمام دیہاتوں میں موجود تھا، جہاں تھوڑے بہت بھی شرفاء آباد تھے صرف اسی قدر نہیں، بلکہ ان ساری تعلیمی صلاحیتوں کے حصول میں ہاں بایں کہ نہ اتنا پیٹ کاٹنا پڑتا تھا، اور نہ اس کے لئے شہر میں رہنے والے دکیلوں مختاروں یا سرکاری حکاموں کی اس لئے خوشامد کرنی پڑتی تھی کہ کسی طرح اپنے بادرچی خانہ سے لڑکے کے لئے کھانا جاری کردیں، نہ اسکول کی فیس اور یونیورسٹی کے مطالبوں کی تکمیل کے لئے ماں بہنوں کا زیور، ماں کا پاندان گروی کرنا پڑتا تھا، بلکہ سب جانتے ہیں کہ جن دنوں کا نام "ایام جاہلیت" رکھا گیا ہے ان میں اس قسم کے اکثر قریوں میں جو صاحب حیثیت آدمی ہوتا تھا، دس پانچ روپیہ کا کوئی معلم اپنے دروازہ پر رکھ دیتا تھا، معلم کی سب سے بڑی تنخواہ یہی ہوتی تھی، جو شاہ مکتب کا باپ ادا کرتا تھا، اس کے سوا بستی کے تمام لڑکے بغیر کسی تخصیص کے ۸ر۔ ۴ر اور بسا اوقات مفت ہی مکتب کے اس معلم سے تعلیم حاصل کرتے تھے، اور ان میں ہر ایک پندرہ سولہ کی عمر تک تعلیم کے گذشتہ سارے مراحل طے کر کے اپنی اپنی قدرتی صلاحیتوں کے لحاظ سے ملک و قوم کی خدمت میں مصروف ہو جاتا تھا۔ آج مسلمان اپنے اس "مکتبی نظام" کو توڑ کر جن تعلیمی پریشانیوں میں سرگرداں ہیں، ان کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو صاحب اولاد ہیں، کن کن مشقتوں اور کن کن مصیبتوں کے ساتھ ایک متوسط درجہ کا آدمی اپنی اولاد کو میٹرک تک پہونچاتا ہے۔ اور میٹرک پاس ہونے کے بعد بھی اتنی نوے فی صدی کا یہ حال ہے کہ نہ ان کو قرآن پڑھنا آتا ہے، نہ اپنی مادری زبان کا ان میں معتدبہ مذاق پیدا ہوتا ہے۔ اور عربی، مادری زبان کا یہ حال ہو تو بیچاری فارسی اور عربی کس شمار میں ہے۔

در پئے دنیا دیں ہم رفت ۔۔۔ ایں ہم رفت و آں ہم رفت

بہرحال جس طرح اس زمانہ میں تقریباً ہر اسلامی شریف آبادی میں ان "قدیم مکاتب" کا سلسلہ جاری تھا، استثنا نواں میں بھی متعدد محلوں کے دروازوں پر مکتب قائم تھے۔ نہایت آسانی کے ساتھ اس بے مادر اور گویا لاوارث بچہ کو اپنے تعلیمی شستگی کے بجھانے کا موقعہ میسر آیا، اپنی خود نوشت سوانح عمری میں خود ارقام فرماتے ہیں :-

"میری ابتدائی تعلیم بستی ہی کے مختلف مکتبوں میں ہوئی"۔

لیکن اس ابتدائی تعلیم کے کیا معنی تھے، کیا صرف مروجہ شناسی اور چند پہاڑوں کے علم تک اس کا دائرہ محدود تھا، ان ہی کا بیان ہے کہ گلستان و بوستان تک کی اعلیٰ فارسی کی قابلیت انکو بستی کے ان ہی مکاتب میں میسر آگئی، جو آب یونیورسٹی کالجوں میں بھی میسر نہیں آتی۔

لہ یہ سچ ہے کہ عصر حاضر کی سیاسی حالات نے اہل ہند کو جزیرہ برطانیہ کی زبان سیکھنے پر مزدور مجبور کر دیا ہے۔ لیکن صرف اسی ایک زبان کا حصول کیا اتنا دشوار تھا کہ اسکے لئے اپنی ساری قومی خصوصیتوں کی تعلیم ضامن تھی، اسکو اس بے دردی کیساتھ کچل دیا جائے آج بھی اگر ہم اپنے پرانے "کمیٹی نظام" کو قدیم اصول پر زندہ کریں گاؤں کے زمیندار یا قصبوں اور شہروں کے ارباب ثروت دوسروں کیلئے نہیں اپنے بچوں ہی کیلئے ایک عربی داں مولوی اور ایک گریجویٹ یا انڈر گریجویٹ ماسٹر مقرر کردیں اور بستی والوں یا محلہ ٹولے کے بچے انکو اس سے استفادہ کا موقعہ اسی طرح دیں جس طرح پہلے اسلاف دیا کرتے تھے تو بآسانی ہماری تمام معاشی اور قومی ضرورتوں کی تکمیل کرنیوالی تعلیم مہیا ہو سکتی ہے مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ ہماری ساری قومی اور دینی زندگی کی بنیاد اردو پر قائم ہے اور اردو کی اعلیٰ قابلیت اردو ہی کی کتابوں سے پیدا نہیں ہو سکتی، بلکہ جو اردو کو قومی کرنا چاہتا ہے اسکو فارسی میں بصیرت حاصل کرنا چاہئے اور جو فارسی میں بلند ہونا چاہتا ہے اسکو عربی سیکھنی چاہئے۔ ان تینوں زبانوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بجائے اسکے کہ بچوں کا سارا سال اردو کے پڑھانے میں صرف کیا جاتا ہے ایک سال اردو دوسرے سال فارسی اور دو تین سال قرآن و حدیث کے ذریعہ سے عربی پڑھائی جائے تو تینوں زبانوں کی اعلیٰ قابلیت بھی لڑکوں میں پیدا ہو جائیگی اور دین کی تعلیم اس ذیل میں خود بخود ہو جائیگی ان زبانوں کا کام مولوی کیلئے جا سکتا ہے انگریزی حساب، قدیم جغرافیہ تاریخ کا کام ماسٹر انجام دے سکتا ہے موجودہ زمانہ میں مولویوں اور گریجویٹوں کی جو ارزانی ہے تھوڑے دانے گھاس میں ایسے مکاتب قائم ہو سکتے ہیں۔ زمانہ اور ہم مسلمانوں کا قومی مطالبہ اسی تعلیم کا ہے۔ اسی قسم کے مکاتب انگریزی کالجوں کی اعلیٰ تعلیم اور عربی مدرسوں کی اعلیٰ تعلیم دونوں کیلئے مقدمہ اور بنیادی کام دے سکتی ہیں۔

عم محترم کی توجہ اور تعلیمی سفر کا آغاز

جیسا کہ میں نے لکھا ہے سوتیلی ماں کے آنے کے بعد والد مرحوم کی توجہ آپ کی طرف اتنی باقی نہ رہی تھی جتنی کہ چاہئے لیکن آپ کے ایک چچا مولوی مسیح اللہ مرحوم بہار سب ڈویژن کے ایک ممتاز اور سربرآوردہ وکیل تھے انھوں نے اپنے بھتیجے کی بلند پیشانی پر اقبال و ترقی کے ستاروں کو چمکتا ہوا محسوس کیا۔ ہونے والے پودے کے چکنے چکنے پتوں سے انھوں نے کچھ اندازہ لگایا۔ تعطیل کے دنوں میں گھر آئے ہوئے تھے، بھتیجے نے دیہاتی مکتب میں جو کچھ سیکھا تھا اس کے نمایاں آثار کو محسوس کر کے انھوں نے مشورہ ہی نہیں بلکہ حکم دیا کہ تم میرے ساتھ اب بہار چلو، میرے ساتھ رہو، تمہاری تعلیم کا خاطر خواہ انتظام ہو جائے گا۔ جس کا کوئی مددگار نہ تھا۔ حق تعالیٰ کی رحمت مولوی مسیح اللہ مرحوم کی شکل میں جلوہ گر ہوئی۔ اور اس وقت سے آخر تک وہ ایسے مددگار ثابت ہوئے، کہ جب تک مولانا عبدالغنی مرحوم علم کے انتہائی بلندیوں تک نہ پہونچے انھوں نے اپنی مشفقانہ سلوکوں کا سلسلہ منقطع نہیں کیا، بلکہ جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، مولوی مسیح اللہ مرحوم نے بوجہ لاولد ہونے کے گویا مولوی محمد الغنی صاحب مرحوم کو اپنا منھ بولا بیٹا ہی بنالیا، اتفاق جس کے سامنے مستقبل کے بھیانک دن اور تاریک راتیں نصب چشم زدن میں روشنی سے بدل گئیں۔ بیرونی سامانوں کی جس حد تک ضرورت تھی، قدرت کی غیبی لطائف نے ان سب کو آپ کے سامنے اکٹھا کر دیا۔ اب صرف آپ کے اندرونی شوق و ذوق، جد وجہد، خدمت و اطاعت کی ضرورت تھی، حق تعالیٰ نے فطرۃً ان تمام کمالات سے آپ کو مالا مال کیا تھا، جب بیرونی اور اندرونی ہر قسم کے موافق اسباب جمع ہو جاتے ہیں، تو اب چلنے والوں کو کون روک سکتا ہے۔ مولوی مسیح اللہ صاحب مرحوم کے غیر معمولی توجہات کا ذکر مولینا مرحوم خود ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

"وہ (مولوی مسیح اللہ مرحوم) ہمارے امور کے متکفل ہو گئے، ان کے ظل عاطفت اور پدرانہ و مادرانہ شفقت میں بہار راشش، سکندر نامہ تک فارسی اور ہدایۃ النحو تک عربی بہار ہی میں پڑھی۔"

اس میں شک نہیں کہ مولوی مسیح اللہ مرحوم نے صلہ رحمی کا یہ بڑا کام انجام کیا۔ لیکن صرف ان کی توجہ و شفقت قطعاً بار آور نہیں ہو سکتی تھی، اگر مولوی عبدالغنی مرحوم بھی اپنے تمام ارادات، وجدبات سے دست بردار ہو کر ان کے قدموں پر اپنے کو نہ ڈال دیتے، ادھر سے لطف و کرم بڑھ رہا تھا، ادھر سے وفاداری و اطاعت اس کا جواب دے رہی تھی۔ کام جب پورا ہونے والا ہوتا ہے، تو اسکی یہی صورتیں ہوتی ہیں۔

فارسی کا اختتام اور عربی کا اہتمام

اگرچہ استھانواں کے اعتبار سے بہار بھی آپ کے لئے ایک اجنبی جگہ تھی، اور بجائے حضر کے اسکو بھی سفری شمار کرنا چاہئے۔ لیکن وطن سے اسکی دوری کل چند میلوں کی تھی، پھر یہاں آپ کا قیام ایسے مہمان کے گھر تھا، جو باپ سے بھی زیادہ مہربان تھا، گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ باوجود بے وطن ہونے کے اب تک آپ وطن ہی میں تھے، بلکہ استھانواں میں آپ کی زندگی جس کس میپرسی میں گذر رہی تھی۔ بہار آکر ہر قسم کی رفاہیت اور نعم سے بدل گئی۔ مولوی مسیح اللہ صاحب مرحوم کی آمدنی اچھی خاصی تھی اور انھوں نے آپ کو اسی شان و آن کے ساتھ رکھنا شروع کیا۔ جس طرح کسی وکیل کا لڑکا رہ سکتا ہے۔ لیکن علم کی بڑھتی ہوئی پیاس کے سامنے گھر کی یہ ساری راحتیں آپ کو زحمت معلوم ہوتی تھیں۔ پڑھنا چاہتے تھے، تکلفا چاہتے تھے، لیکن اس کے لئے بہ ظاہر کوئی سامان نہ تھا، اور اسی لئے فارسی کی تکمیل کے بعد آپنے بالآخر عربی کی تعلیم کا آغاز بہار ہی میں ایک مشہور عالم مولوی تفضل حسین صاحب سے شروع کر دیا۔ مولوی تفضل حسین صاحب بہار کے طبیب تھے، اور مولوی مسیح اللہ مرحوم کے حقیقی سالے بھی تھے۔ اس تعلق کی وجہ سے انھوں نے مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم کو توجہ خاص کے ساتھ پڑھانا شروع کیا۔ کچھ نہیں معلوم کہ کیا اسباب پیش آئے کہ یکایک بجائے بہار کے مولوی تفضل حسین کیا (جس کو اس زمانہ میں صاحب گنج کہتے تھے) تشریف لے جانے پر مجبور ہوئے، مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم کے لئے یہ وقت نہایت سخت تھا، مولوی حکیم تفضل حسین صاحب کی تعلیم و درس سے وہ مانوس ہو چکے تھے، امن و عافیت کے ساتھ کتابیں نکل رہی تھیں کہ یکایک اس انقلاب نے ان کے تعلیمی پروگرام کو درہم و برہم کر دیا۔ ادھر چچا مرحوم کی محبت اس درجہ شدت پذیر ہو چکی تھی۔ کہ ایک دن کے لئے آنکھوں سے جدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشمکش و سفارش سے وکیل صاحب اس پر راضی ہو گئے، کہ حکیم صاحب کے ساتھ وہ بھی گیا چلے جائیں، خود ارقام فرماتے ہیں۔

"مولوی تفضل حسین صاحب ..... جب صاحب گنج تشریف لے گئے، تو میں بھی باجازت عم محترم کے وہاں پہونچا۔"

اس زمانہ کا صاحب گنج موجودہ عہد کا گیا نہ تھا، کہ کسی مفصلاتی اسٹیشن سے ریل پر بیٹھے اور چند گھنٹوں میں گیا پہونچ گئے، بلکہ خود مولانا عبدالغنی

مرحوم کے الفاظ میں جب خاکسار کو وہ حیدرآباد جانے پر اصرار رہے تھے کہ اس وقت صاحب گنج بہار کا مسافر تین دن میں پہونچتا تھا' ایک رات اکبری بازار اور دوسری رات پتھرگٹی یا کسی اور گاؤں میں گذارنے کے بعد تیسری رات میں گیا ملتا تھا" گویا جتنے دنوں آج بہار کا مسافر دکن پہونچتا ہے۔ بہرحال گیا میں ابھی دس ہی مہینے گذرے تھے کہ محبت کرنے والے چچا کے دل میں فراق و ہجر کی سختیوں کی برداشت کی قوت باقی نہ رہی' تقاضوں کے بعد آخر پھر بہار بلا لیا۔ بہار میں اس وقت مولوی ناظر حسین صاحب مرحوم مرداد والے درس و تدریس کا بازار گرم کئے ہوئے تھے' چچا کے حکم سے ان ہی کے حلقہ درس میں مولوی عبدالغنی صاحب شریک ہوگئے' لیکن یہاں ان کا جی نہیں لگتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ علمی حیثیت سے تشفی نہیں ہوتی تھی' بلکہ جیسا کہ خود آپ کا بیان ہے "یہاں سبق ناغہ ہوتا تھا"

آج اسکولوں اور کالجوں کے ان طلبہ کے لئے یہ "ناغہ" کی شکایت حیرت انگیز ہوگی' جن کی تعلیمی مدت کا زیادہ حصہ تعطیلوں' جھٹیوں اور ٹورنمنٹوں' ازیں قبیل دیگر سرکاری و قومی تقریبوں کی نذر ہوتا ہے' بمشکل ایک سال میں دو تین مہینے سبق خوانی اور تکرار کے ہوتے ہیں' لیکن کبھی وہ دن بھی تھے کہ ایک ایک دن کا ناغہ "برسوں کے مساوی سمجھا جاتا تھا' کیونکہ اس وقت پچھتر فی صدی کی حاضری اور ۳۳ فی صدی نمبر میں کامیابی کا مغالطہ پھیلا یا نہیں گیا تھا۔

بہرحال وہ دو تعلیمیں خلط ملط تھی یا صحیح مگر مولوی عبدالغنی مرحوم پر اس ناغہ کا اثر بہت سخت ہوا' حالانکہ چچا کی شفقتوں اور مہربانیوں نے خود ان کے دل کو انکی محبت اور اطاعت کے جذبات سے لبریز کر دیا تھا۔ جی نہیں چاہتا تھا کہ ان کو چھوڑ کر کہیں باہر جائیں' لیکن علم کا شوق بے پروا' ہر چیز سے بے پروا ہونے پر آمادہ کر رہا تھا' کچھ دن اسی کش مکش میں گذرے۔ دیکھ چکے تھے کہ سفر گیا کہ اجازت چچا نے بڑی مشکل سے دی تھی' حالانکہ گیا میں بھی اپنے قریب ترین رشتہ دار بزرگ ہی کے پاس ان کا قیام تھا۔ پھر وہ کسی ایسی جگہ کے لئے کیا اجازت دیتے' جہاں نہ کسی سے جان تھی نہ پہچان۔ اسپر دوسری دقت یہ تھی' کہ پاس میں کچھ سرمایہ بھی نہ تھا' غیور طبیعت اس پر بھی آمادہ نہ ہوئی کہ چپ چاپ چچا ہی کے صندوق سے کرایہ نکال لیا جائے جیسا کہ ایسے مواقع پر عموماً لڑکے کیا کرتے ہیں' لیکن ان تمام موانع کے آگے تلاش علم کی حرارت بجھنے نہ پائی تھی' آخری درجہ اس کی حرارت کا یہ ہوا کہ ایک دن گھر بازار دوست احباب اعزہ و اقربا' یار و دیار سب سے منہ موڑ کر چل کھڑے ہوئے' اور جن بہ تقدیر جیسا کہ خود فرماتے ہیں :-

"جب چاپ پیادہ پا چار دن میں آرہ پہونچا"

الف! مولوی شیخ اللہ وکیل کا بھتیجہ بلکہ بیٹا جس نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ بہار میں نازونعمت میں گذارا تھا' اور جو شاید بہار سے اسقدر اوان تک کبھی سواری کے بغیر کبھی نہیں گیا ہوا آج جنون علم کے ہاتھوں سر پر گٹھری بغل میں کتابیں دبائے' پیادہ پا چار ہا ہا دن بھی گذرتا ہے اور رات بھی گذرتی ہے۔ ایک دن دو دن کا سفر نہ تھا' کامل چار دن کا پیادہ پا سفر تھا' خدا ہی جانتا ہے کہ کن صعوبتوں سے راہ کی ان دشواریوں کو مولوی صاحب نے قطع کیا' کس کس گاؤں کی مسجدوں میں ٹھہرے' وہاں کے لوگوں نے آپ کے ساتھ کیا کیا سلوک کیا' افسوس ہے کہ ان کی یادداشت میں اسکی کوئی تفصیل نہ مل سکی۔ بہرحال چوتھے دن کا آفتاب جب ان کے سامنے نکلا تو شہر آرہ کا سواد تھا۔

آرہ جس کا نام شاہ آباد بھی ہے آج سے کچھ دن پہلے بعض مقامی خصوصیتوں کی بنیاد پر صوبہ بہار کے اسلامی علوم کا مرکز بن گیا تھا۔ اسکی بھی مرکزیت تھی جس نے بہ تدریج ترقی کرتے کرتے ہندوستان کے اس عظیم و عجیب مدرسہ جس کا نام مدرسہ احمدیہ آرہ تھا اس کو محل و قوع بن گیا' آج وہ مدرسہ معمولی حالت میں ہے لیکن گذشتہ نصف صدی میں چند مخلص صاحبان عزم و عمل علماء جن میں مولینا ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی سب سے نمایاں ہے اس مدرسہ نے ہندوستان کے تمام عربی مدارس کے مقابلہ میں اپنی شہرت و عظمت کا علم بلند کیا تھا' اسی مدرسہ نے قدیم درس نظامیہ کے نصاب پر نہ وہ سے پہلے یا ندوہ کے ساتھ ساتھ غور کیا' منطق' فلسفہ' صرف و نحو و تعقد اسلامی علوم کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرا کے نیا یکسر نصاب کیا۔ اس مدرسہ میں صرف بہار ہی کے طلبہ نہیں پڑھتے تھے بلکہ ہندوستان کے جنوب و شمال کے دور افتادہ علاقوں سے کھنچ کھنچ کر یہاں آگئے تھے' جن کی تعداد کسی زمانہ میں پانچ چھ سو تک

---

[1] نائب یہی مولوی ناظر حسین صاحب ہیں جن کے پوتے مولوی عبدالرحیم (فاضل دیوبند) ہیں اور آج کل بوگلی کالج میں کامیاب ہیڈ مولوی ہیں۔

پہونچ گئی تھی' اسی مدرسہ کے فارغ التحصیل حیدرآباد کے ایک مشہور نواب اظہر جنگ بہادر تھے' جو اعلیٰ حضرت حضور نظام خلداللہ ملکہ کے پرائیوٹ سکرٹری کے عہدہ پر سرفراز تھے' اور جن کی بدولت گذشتہ آرہ رائٹ میں حضور نظام خلداللہ ملکہ نے ایک لاکھ کا گراں قدر عطیہ تمام تر دوں کی امداد کے لئے عطا فرمایا تھا۔ اس مدرسہ کی ایک علمی مجلس "مجلس مذاکرہ علماء" کی یاد علماء کے دلوں سے اب تک محو ہوئی ہوگی خصوصاً مولینا عبداللہ غازی پوری جو اس مدرسہ کے صدر تھے انکی تحریر و تقریر کی اسی مجلس کی بدولت ہندوستان میں دھوم مچی ہوئی تھی' اسی مدرسہ اور مجلس کے تعلق سے یہاں عربی زبان کی کتابوں کے چھاپنے کے لئے پہلے پہل ایک مطبع بھی قائم ہوا تھا۔ جس میں بعض نادر کتابیں شائع ہوئیں' خصوصاً تفسیر ابن کثیر کی اشاعت کا فخر غالباً اسی مطبع کو حاصل ہوا۔ آرہ کی یہ علمی سرگرمیاں بعد کی چیز ہیں لیکن اس سے پہلے بھی وہاں جید صاحب درس علماء موجود تھے ان ہی میں سے کسی کے حلقہ درس میں شریک ہوگئے' یہاں پہونچ کر آپ کو محسوس ہوا جیسا کہ خود لکھتے ہیں "جو کچھ اب تک پڑھا تھا بغیر سمجھے پڑھا تھا"

مطالعہ کی عادت

آرہ سے پہلے اب تک انکی تعلیم صرف سبق پڑھنے اور ایک حد تک اسکو یاد کر لینے تک محدود تھی' لیکن یہاں پہنچ کر قدیم اصول تعلیم کے ایک جدید ضابطہ سے روشناس ہوئے۔ اور اسی ضابطہ کے التزام نے آخر عمر تک ہمیشہ علمی جد و جہد میں ان کا ساتھ دیا۔ کالج اور اسکول میں تعلیم پانے والے شاید اس سے واقف نہ ہوں لیکن پرانے زمانے کا دستور تھا' کہ طالب العلم کل کے سبق کو استاد سے پڑھنے والا ہوتا۔ رات کو اطمینان کے ساتھ اپنی استعداد اور قابلیت کی آخری حد تک اس پر غور و فکر لگاتا' کہ جہاں تک ممکن ہو اس سبق اور اس کے تعلقات کی واقفیت خود حاصل کرو۔ سبق کے مفردات تا حل پھر جملوں کا مطلب ان جملوں سے جو عبارت بنتی اس کا مطلب اسکو گھر پر خود ہی حل کرنا' طلبہ کے اسی کام کا نام "مطالعہ" تھا' اساتذہ اسکی سخت نگرانی رکھتے تھے' کہ درس میں کوئی طالب العلم بغیر مطالعہ کے شریک نہ ہو۔ وقتاً فوقتاً طلبہ کا امتحان لیا جاتا تھا' کہ اس نے گھر پر اپنے سبق کا مطالعہ کر لیا ہے یا نہیں۔ اسکی بڑی سخت تاکید ہوتی تھی کہ جہاں تک یہ مطالعہ ہو کسی شرح و حاشیہ و حل کی امداد سے نہ ہو' مگر اخیر استعداد اگر کسی بدقسمت طالب العلم کے متعلق استاد کو معلوم ہو جاتا کہ اس نے حاشیہ یا شرح کی مدد سے مطالعہ دیکھا ہے تو پھر اسکی خیر نہ تھی' واقعہ یہ ہے "درس قدیم" کا یہ ایسا قیمتی جزء تھا کہ جید سے جید کتابوں کے بعد طلبہ اساتذہ سے بے نیاز ہو جاتے تھے' ان میں خود بخود استعداد پیدا ہو جاتی تھی' اور عمر بھر ایک عالم کو جو چیز کام دے سکتی ہے' وہ صرف یہی مطالعہ کی قوت ہوتی ہے۔ ورنہ استادوں کی باتیں کسے یاد رہتی ہیں اور یاد رہیں بھی تو آدمی کہاں تک دوسروں کے بھروسہ جی سکتا ہے۔ مطالعہ کی عادت آرہ میں جو پیدا ہوئی اس کے متعلق فرماتے ہیں:-

"اس وقت سے (یعنی جب سے آرہ میں پڑھنا شروع کیا) آئندہ بغیر مطالعہ اور پورے طور سے سمجھے بغیر نہ پڑھا تھا"

خود درس دینے کی ابتدا

لیکن یہ کام تو ان ہی کتابوں کے متعلق کر سکتے تھے' جنہیں پڑھ رہے تھے' مگر جو کتابیں اب تک بہار و غیرہ میں پڑھ چکے تھے' اور جن کے متعلق ان کو اطمینان نہ تھا۔ ان پر عبور حاصل کرنے کے لئے کیا کریں۔ اس مشکل کے حل کرنے کے لئے بھی ان کے سامنے "درس قدیم" کی دوسری چیز کارآمد ثابت ہوئی۔

اس زمانہ میں عموماً تعلیم و تعلم کے لئے خواہ وہ اعلیٰ تعلیم ہی کیوں نہ ہو' مدارس کا بہت کم رواج تھا' بلکہ عام قاعدہ یہ تھا کسی جگہ کوئی ممتاز عالم بیٹھ گیا' اور اس کے ارد گرد طلبہ جمع ہونے شروع ہوئے' رفتہ رفتہ اس عالم کی شخصیت ایک مدرسہ کی شکل میں تبدیل ہو جاتی تھی' یہ ظاہر ہے عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک عالم سے اوپر تک کی تمام جماعتوں کی تعلیم کا کام کس طرح انجام دیتا تھا لیکن صورت یہ ہوتی تھی کہ ابتداءً یہ عالم چھوٹی کتابوں کی کسی جماعت کو پڑھانا شروع کرتا تھا' جوں جوں اس جماعت کے لوگ اوپر کے درجوں تک ترقی کرتے جاتے' پڑھنے کے ساتھ ان ہی کا فریضہ ہوتا تھا کہ آئندہ چھوٹی کتابوں کے طلبہ کے پڑھانے کا کام بھی انجام دیں' اور اس طرح بغیر کسی جدید مدرس کے اضافہ کے ایک ہی عالم کے زیر تعلیم طلبا نیچی جماعتوں کے معلم بن جاتے تھے' علاوہ مالی سہولت کے اس میں سب سے بڑا علمی فائدہ یہ ہوتا تھا' کہ اوپر کی جماعت کے طلبہ کا قلم روز بروز تازہ سے تازہ تر ہوتا جاتا تھا۔ گویا فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ میں اس تدبیر سے ایسے علماء اکثر ہوتے تھے' جو درس کی اکثر و بیش تر کتابیں ایام تعلیم ہی میں پڑھا کر اس کے پورے ماہر بن چکے تھے اس عرصہ میں ایک ایک کتاب کو متعدد بار پڑھانے کا موقعہ مل جاتا تھا۔ اسی نے ان کا علم مستحکم و مضبوط ہوتا تھا' یہ صورت نہ ہوتی تھی'

کو ایک طرف سے پڑھتے جاتے ہیں اور دوسری طرف سے قے کرتے جارہے ہیں۔ تا آنکہ ادھر طالب العلمی۔ اسے سے فارغ ہو کر کالج سے نکلا اور ادھر جو کچھ پڑھا لکھا تھا نیاز نے اسے یکدم میں بھلا دیا۔ یا بقول مولانا شبلی مرحوم "ادھر کالج سے نکلے ادھر جو کچھ پڑھا تھا سب کو تے کر دیا"

مولانا عبدالغنی مرحوم کو بھی اپنی گذشتہ کتابوں کے تازہ کرنے کا موقعہ اسی صورت سے ہاتھ آیا، خود فرماتے ہیں:۔

"پچھلی کتابوں کو بذریعہ مطالعہ اور تدریس صاف کرنے کا مصمم ارادہ ہوا" اور

اور اس ارادہ پر پورے استقلال کے ساتھ عمل کرتے رہے فرماتے ہیں:۔

"اسی زمانہ میں نیچے کی کل درسی کتابیں شرح جامی و شرح تہذیب تک کرات و مرات پڑھائیں"

ایک غیبی اعانت اور آرہ سے پٹنہ آنا

آرہ میں ابھی پورا سال بھی نہیں گذرنے پایا تھا بلکہ خود ارقام فرماتے ہیں کہ "تقریباً نصف سال وہاں پڑھنے کے بعد ایک زندہ کتاب جس کے بغیر انسان کی زندگی میں انقلاب نہیں ہوتا، اس کے مطالعہ کا قدرت نے موقعہ فراہم کیا" آپ کے وطن مالوف استھانواں کے ایک نوجوان عالم جو بعد کو بہار کے ممتاز ترین علماء کی صف میں شمار کیے گئے، بلکہ سچ یہ ہے کہ بلا مبالغہ اس وقت بھی بہار کی علمی اور دینی ہلچل کا مختلف حیثیتوں سے آپ ہی کا وجود باسعود سرچشمہ ہے، ان کا نام مولانا سید وحید الحق رحمۃ اللہ علیہ تھا، قصبہ بہار کا مشہور اسلامی مدرسہ جو بحمد اللہ اب تک باقی ہے آپ ہی کا قائم کیا ہوا ہے اور آج بہار میں دین کی سرکاری تعلیم کا سررشتہ جس بزرگ کے ہاتھ میں ہے یعنی مولانا خان بہادر مبارک کریم اور جس کی ذات غیر سرکاری اسلامی تحریکوں کی بھی بہار میں ماوی و ملجا ہے یعنی حضرت ابوالمحاسن مولانا سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار، یہ دونوں سرکاری و غیر سرکاری ہستیاں اسی آسمان علم کے دو مختلف انجم تاباں ہیں، بہرحال مولانا عبدالغنی مرحوم ارقام فرماتے ہیں کہ میں آرہ سے:۔

"مولانا المولوی وحید الحق جو فارغ التحصیل ہو کر پٹنہ میں ایک امیر کے یہاں ملازم ہوئے تھے چلا آیا"

مولانا وحید الحق مرحوم جیسا کہ اشارۃً میں نے پہلے ہی ذکر کیا، ایک خاموش انقلابی وجود کے مالک تھے، خانکسار کی والدہ[1] مرحومہ چونکہ استھانواں ہی کی تھیں۔ بچپن میں ان سے "وحید الحق بھائی" (کہ اس لقب سے والدہ مرحومہ ان کو یاد فرماتی تھیں) کے متعلق جو واقعات میں نے سنے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو کچھ کر گذرنا چاہتے ہیں انھوں نے بجائے شہر کے ممبروں لیڈری کے اسٹیجوں کے دیہات کی گلیوں اور چوپالوں کے چھپروں میں اپنے مقصد کو تلاش کیا ہے، مشرکانہ عقائد و رسوم جن میں مسلمانوں کی جہلی نسلیں غیر اقوام کی صحبت اور حکومت کی غفلت کی بدولت مبتلا ہو گئی تھی۔ مولینا نے عورتوں اور جاہل مردوں کو کن خاموش راتوں سے ان خانوں کے اس قافلہ کو جرم تک بنے جانے کی کوشش فرمائی ہے۔ آپ دیدہ و ہوگا اماں مرحومہ یاد کرتی تھیں کہ موٹیا کا لانا کرتا اور موٹیا کا بجامہ موٹیا کی ٹوپی میں اسلام کا یہ مخلص خادم گھر گھر مسلمان خواتین کو نرمی اور دل دہی کے ساتھ بدعات اور مشرکانہ رسوم کے چھوڑنے کی ہدایت کرتا تھا۔ ان کی تدبیر میں [illegible] خدا نے ان کی باتوں میں تاثیر بخشی تھی ان شاء اللہ آئندہ کسی خاص مقالہ کے ذریعہ سے ان کے حالات بھی "ندیم" میں شائع ہوں گے۔

بہرحال یہ خدا کی ایک غیبی تائید تھی کہ وہی نور اور عبدالغنی جو اپنے زندہ باپ کی نگاہ لطف و کرم سے بھی ایک حد تک محروم ہو چکا تھا، اب قدرت نے انکو ایک ایسی جگہ پہونچا دیا۔ جہاں پہونچنے کے بعد آدمی پر ان مقاصد تک پہونچنے کی راہیں کھل جاتی ہیں جن تک پہونچنے کے لئے کائنات کا سارا نظام قائم کیا گیا ہے۔ یہ مولوی وحید الحق رحمۃ اللہ علیہ مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم کے حقیقی ہم قریہ اور ہم وطن ہی نہ تھے، بلکہ بڑا دینی کا بھی رشتہ تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ جس کے پاس وہ پہونچے تھے اس کی محبت اس نگاہ میں صرف وہی رشتہ جو ایک عربی کو عجمی سے ایک مغربی کو ایک مشرقی سے بھائی بنا کر ملاتا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم کیا ہوا ایمانی ناتہ، ان تمام منقوش اور عنایتوں کے لئے کافی تھا۔ جن کا تذکرہ مولانا عبدالغنی مرحوم جب زبانی

---

[1] میری والدہ مرحومہ کا نام "کبریٰ خاتون" تھا، ان کا میکہ استھانواں تھا، کبھی کبھی اپنے بعض مضامین و مقالات کو میں نے "ابن کبریٰ" یا "کبریٰ زادہ" کے نام سے لکھا ہے، احتساب گرامی ان ہی ذات کی طرف ہے، خانکسار پر ان کے خاص عادات و خصائل کا مماثل ہے۔ رحمہا اللہ تعالیٰ وغفرلہا کما ربیانی صغیرا

کرتے تو بیان کرنے سے نہیں تھکتے تھے اور اپنی زندگی کی مختصر یادداشت میں تحریر ہیں - اس کا تذکرہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں :-

"انھوں نے (مولوی وحیدالحق مرحوم) نے جس محنت و شفقت کے ساتھ اور جس جاں فشانی اور دل سوزی کے ساتھ میرا پڑھانا اپنے ذمہ لیا اس کے بیان کے لئے ایک دفتر چاہئے۔"

ایک خاص علم کا ذوق

مولینا وحیدالحق مرحوم جیسا کہ اس زمانہ کا عام دستور تھا' تمام علوم متداولہ میں کافی دستگاہ رکھتے تھے لیکن عموماً اس عہد کے علماء میں جس فن کا عام چرچا تھا وہ "عربی علم ادب" تھا۔ بڑے بڑے عالم معمولی عربی شعر کے ترجمہ پر قادر نہ تھے' عموماً عربی لکھنے خصوصاً بولنے کی قابلیت تو شاذ ہی کسی میں ہوئی تھی - چند خاص لوگوں کو کچھ لکھنے کی مشق بھی تھی' تو قریب قریب وہ ایک قسم کی اردو عربی ہوتی تھی' زیادہ تر معقولات کی کتابوں پر وہ عربی زبان میں حواشی لکھتے تھے' ان فنون کے مسائل کی تعبیر کے لئے چند مقررہ اصطلاحیں معین تھیں' چند رابطی الفاظ و حروف کو ملا کر عبارت بنالی جاتی تھی' خود اس زمانہ میں اس عربی کا نام "کان یکون" کی عربی تھی' جس وقت ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا رواج شروع ہوا' اور انگریزی مدرسوں میں تمام چیزوں سے زیادہ انگریزی ادب ہی پر زور دیا جاتا تھا' کوشش کی جاتی تھی کہ طلبہ میں انگریزی کا ذوق اتنا پیدا ہو جائے کہ بے ساختہ اس زبان میں لکھنے پڑھنے پر وہ قادر ہو جائیں' یہی ذوق آتا بڑھا کہ کچھ ہی دنوں کے بعد ہندوستانی باپ فادر اور ہندوستانی ماں مدر' ہندوستانی بیوی "فیملی" کے نام سے موسوم ہونے لگی' سنا جاتا ہے کہ موت کے وقت تو نہیں لیکن خواب تو عموماً لوگ انگریزی ہی میں دیکھنے لگے' انگریزی زبان میں اس غلو پیدا کرنے کا کیا مقصد تھا' علم اور ہر فن کو ایک مغربی جزیرہ کی زبان میں ہندوستانیوں کو پڑھنے پر کیوں مجبور کیا جا رہا تھا' اس کا راز کچھ تو مخفی ہی رہا اور آئندہ کھلے گا۔ لیکن اس کی وجہ سے مصیبت ان غریب مولویوں پر آگئی - جنہیں بیس سال عربی پڑھنے کے بعد جب انگریزی خوانوں کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ بچارا مولوی عربی کے دو صحیح فقرے نہ لکھ سکتا ہے نہ بول سکتا ہے' تو ان کو اپنی جہل و تحمق کا یہ اچھا آلہ ہاتھ آگیا' انھوں نے ان کے علم و فضل کا انکار کیا - بچارے مولوی لاکھ کہتے تھے کہ بھائی ہم عربی میں لکھ پڑھ نہ سکتے ہوں - لیکن قرآن و حدیث و فقہ جس عربی میں ہے اس کا صحیح مطلب سمجھتے ہیں' لیکن اس گروہ کا مطالبہ تھا کہ تم عربی میں ہمارے سامنے تقریر کرو' ورنہ ہم تمہیں عالم نہیں مانیں گے' کہا جاتا تھا کہ بھینس کے آگے بین بجانے کا کیا نفع ہوگا۔ لیکن ادھر سے برابر یہی اصرار ہوتا رہا اور دوسری طرف لطف یہ تھا۔ کہ جمعہ کے دن بچارا مولوی عربی زبان کا لکھا ہوا کوئی خطبہ اگر سناتا تھا تو اسی جماعت کی طرف سے ہنگامہ برپا کیا جاتا تھا' کہ جس کے یار کی زبان ترکی نہیں ہے۔ دیکھئے جناب اس کے آگے یہ ترکی خطبہ پڑھتے ہیں' بہرحال فہمیدہ علماء کو اس طفلانہ مطالبہ کا جب احساس ہوا' تو انھوں نے محنت پوری کرنے کے لئے بہ تدریج عربی زبان کے انشاء و گفتگو میں مہارت پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی - یہاں تک کہ ندوۃ العلماء کے دارالعلوم کا تو ایک اہم نصب العین ہی یہ رکھا گیا' کہ یہاں کے طلبہ کی خاص خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ عربی ہی میں بولیں گے' اور عربی میں لکھیں گے۔ اگرچہ جب تجربہ کے اتمام کا وقت آیا' تو یہ توقع کماحقہ اب تو منکرین کا گروہ علماء کی فضیلت کا انکار نہ کریگا - پوری نہ ہوئی - ندوی طلبہ میں سے کتنوں نے بڑے بڑے جلسوں میں فی البدیہہ فصیح و بلیغ معیاری عربی کی تقریروں کا مظاہرہ کیا' لیکن مولوی بہرحال منکرین کی نگاہوں میں وہی مولوی باقی رہا[1] بلکہ ادھر اجنبی دباؤ سے متاثر ہو کر مولویوں پر یہ نیا الزام تراشا گیا کہ انہیں لوگوں نے اردو زبان کو عربی کے موٹے موٹے ثقیل الفاظ سے بھر کر بوجھل بنا دیا ہے[2]

بہرحال اس جدید مطالبہ سے متاثر ہو کر ندوی تحریک سے پہلے ہی جن بزرگوں نے ادھر توجہ کی ان میں ایک مولوی وحیدالحق صاحب اسستھانوی مرحوم بھی تھے' مولینا عبدالغنی صاحب مرحوم ارقام فرماتے ہیں :-

"ادب عربی جس میں ان (مولوی وحیدالحق) کو بہت اچھی مداخلت تھی۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ہونہار سعید شاگرد میں بھی انھوں نے اسی ذوق کو پیدا کرنا شروع کیا' اور یہ بھی مولانا عبدالغنی صاحب کے ساتھ خدا کی امداد تھی کہ آئندہ جو کچھ وہ ہونے والے تھے' اس میں اس جدید ذوق سے انکو بہت مدد ملی' ورنہ اگر وہ بھی "قبل الندوۃ" والے دور کے مرد معقول نولوی ہو کر رہ جاتے' تو یقیناً جو کام آئندہ ان سے بن پڑا' شاذ اتنی خوبی کے ساتھ وہ انجام نہیں دے سکتے تھے' خود لکھتے ہیں کہ :-

"مولوی وحیدالحق صاحب مرحوم نے علاوہ معمولی درسی کتابوں کے ادب عربی کا مختلف طور پر سبق دینا آغاز کیا۔"

[1] ندوی طلبہ کے اس طرز عمل کا ذکر مولانا عبدالغنی صاحب مرحوم نے اپنی خود نوشت سوانح میں بھی کیا ہے۔

[2] ندوی طلبہ کے اس طرز عمل کا ذکر مولانا عبدالغنی صاحب مرحوم نے اپنی خود نوشت سوانح میں بھی کیا ہے۔

علم کے ساتھ عمل کا شوق

اور یہ تو صرف علم کا حال تھا، لیکن ظاہر ہے کہ صرف علم کی بار برداری نے کتنوں کو سب کچھ پڑھنے اور سب کچھ سیکھنے کے بعد چار پاؤں والوں سے آگے بلند ہونے نہ دیا۔ ان میں کتنوں کو قرآن کی زبان میں اس گدھے کا ہم قدم و ہمدم قرار دیا گیا ہے جو اپنی پیٹھ پر کتابوں کو لادے پھرتا ہو، مولانا عبدالغنی کی خوش اختراعی پر چار چاند لگ گئے، کہ ان کو ایسے برگزیدہ پاک، روح کی رفاقت اور صحبت کا موقعہ میسر آیا، اور اپنے وطن ہی میں گھر سے نکلے بغیر ہی میسر آیا۔ اسی صحبت کی برکت تھی کہ عروس دنیا ان کے سامنے زندگی کے مختلف ادوار میں بن ٹھن کر مختلف راہوں سے آئی جیسا کہ آگے معلوم ہوگا، لیکن عنفوان شباب کا یہ ایسا گہرا نقش ان کے دل پر مولوی وحیدالحق صاحب نے بٹھا دیا تھا، کہ سب کچھ گذرتا رہا لیکن جس قسم کی بلند نظری اور ژرف نگاہی ان میں پیدا ہو چکی تھی، اس نے ایک لمحہ کے لئے ان کو اس مغالطہ میں مبتلا ہونے پر آمادہ نہ کیا، کہ جو چیز فانی ہے اسکو بلا وجہ باقی باور کر لیا جائے جو مرنے والے ہیں انہیں نہ مرنے والا یقین کیا جائے۔ انکی بلند فطرت نے ہمیشہ انکی نگاہ اونچی رکھی، ارقام فرماتے ہیں :-

"علاوہ کتابی تعلیم کے شب و روز انکی صحبت با برکت میں رہنے کی وجہ سے انکی پاک اور بے ریا زندگی سے بے شمار فوائد حاصل ہوں گے۔"

مولینا وحیدالحق کا پٹنہ چھوڑنا اور سعید شاگرد کی رفاقت میں وفاداری

صحیح طور پر مجھے اس کا پتہ نہ چل سکا کہ اس پٹنہ کی ملازمت میں مولینا وحیدالحق اور ان کے ساتھ مولوی عبدالغنی مرحوم کب تک رہے، بہرحال کچھ ایسے اسباب پیش آئے کہ استاد کو پٹنہ چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا پٹنہ چھوڑنے کے بعد بہ ظاہر مولوی وحیدالحق صاحب کے لئے کوئی ایسا مستقل ٹھکانا نہ تھا۔ جہاں جم کر بیٹھ جاتے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پٹنہ سے جدا ہو جانے کے بعد ان کو چندے معاشی دشواریوں میں مبتلا ہونا پڑا۔ اور اسی لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ تیسری جگہ وہ منتقل ہوتے رہے، ابتلا و آزمائش کا یہ دور کب تک جاری رہا۔ اس کا بھی مجھے صحیح علم نہ ہو سکا۔ البتہ مولوی عبدالغنی صاحب کے بیان سے جیسا کہ آئندہ ذکر آئے گا۔ "سالہا سال تک" کی مدت اس حال میں گذارنی پڑی مولوی وحیدالحق مرحوم کسی مستقل ٹھکانہ کی تلاش میں تھے۔ تاکہ باطمینان وہاں بیٹھ کر دل کے حوصلوں کی تکمیل کریں۔ لیکن ابھی قدرت انکو گرمی و سردی کے مختلف حالات سے گذار کر کچھ اور پختہ کرنا چاہتی تھی خیر مولوی وحیدالحق صاحب پر جو کچھ گذر رہی تھی، وہ اسکی برداشت کی قوت اپنے اندر پیدا کر چکے تھے، لیکن حیرت ہے اس نوجوان پر جو ابھی اس راہ کے نوگرفتاروں میں تھا، اور جس پیشہ کا آخر وہ شیر بن کر دنیا سے رخصت ہوا، اس کی دشت پیمائی کی ابھی بسم اللہ ہوئی تھی۔ علم اور علم کے ساتھ شب و روز اپنے استاد کی صحبت با برکت سے ان کو جو بے شمار فوائد حاصل ہو رہے تھے، اس کا ذوق اس کمسنی کے زمانہ ہی میں ان پر کچھ اس طرح مسلط ہو گیا تھا کہ بہرحال میں استاد کی رفاقت دینے کیلئے تیار ہو گئے، جہاں جہاں وہ جاتے تھے پیچھے پیچھے ان کا دامن تھامے مولوی مسیح اللہ وکیل کا یہ جہیتا ناز و نعمت میں پلا ہوا بھتیجہ ساتھ ساتھ جاتا تھا۔ خود فرماتے ہیں :-

"اس زمانہ سے (یعنی پٹنہ کی رفاقت کے عہد سے) سالہا سال تک مختلف مقامات یعنی پٹنہ کے سوا نگر نہسہ، آرہ، وغیرہ میں برابر ان کے ساتھ رہا۔"

مولوی عبدالغنی مرحوم کا یہ تعجب علمی ذوق تھا کہ شہر گردی کے اس دور میں بھی پڑھنے اور سیکھنے کے ساتھ دوسروں کے پڑھانے اور بنانے کا جذبہ بھی ان پر برائندہ خاطری ان دنوں میں بھی بڑی حد تک طاری تھا۔ جیسا کہ خود لکھتے ہیں :-

"اسی زمانے میں (یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے دنوں میں) بیچے کی کل درسی کتابیں شرح جامی و شرح تہذیب تک کرات و مرات پڑھائیں بھی۔"

تقدیر کی نئی گردش استاد و شاگرد کی جدائی۔

در بدر شہر بشہر پھرنے کی آخری منزل پھر شہر آرہ شاہ آباد ہی ہوئی، قصہ یہ ہوا کہ مختلف مقامات کے قیام کے بعد مولوی وحیدالحق مرحوم کو آرہ کے مسلمانوں نے دعوت دی، یا خود ہی وہ وہاں پہونچے۔ بہرحال کسی طرح وہ آرہ پہونچے، جیسا کہ پہلے بھی لکھ چکا ہوں، شہر آرہ کو صوبہ بہار کے مختلف شہروں پر یہ فوقیت اس

وقت بھی حاصل ہوا اور اس زمانہ میں بھی تھی، بلکہ جیسا کہ اجمالاً آپ سن چکے کہ اسی شہر میں مسلمانوں نے صوبہ بہار کا سب سے بڑا عربی مدرسہ احمدیہ قائم کیا تھا مدرسے مولوی وحیدالحق مرحوم کو اس شہر میں اپنے درمقصود کے حصول کی امید قائم ہوئی، وہ بہار میں عربی تعلیم کے لئے ایک مستقل دارالعلوم قائم کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ قدیم شخصی تعلیم گاہوں کی بربادی کے بعد اس صوبہ میں عربی تعلیم کا جو نظام منتشر اور پراگندہ ہو گیا ہے۔ پھر اسکی شیرازہ بندی ہو جائے، یہاں کے مسلمانوں پر ان کے علم و تقویٰ کا اچھا اثر مرتب ہوا۔ اور کچھ ہوا کہ اسی مقام کو صوبہ کی عربی تعلیم کا مرکز قرار دیا جائے۔ شاید صوبہ بہار میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ مدرسائی اصول پر ایک تعلیم گاہ کی بنیاد فخر المدارس کے نام سے رکھی گئی، صوبہ کے مختلف حصوں میں تجربہ کار مشق اساتذہ اپنی ناقدریوں کے ہاتھوں پریشان حال تھے، انہیں اس مدرسہ میں کام کرنے کی دعوت دی گئی، اس مدرسہ میں کن کن مدرسین کا تقرر عمل میں آیا، ابھی یہ مسئلہ تشنۂ تحقیق ہے لیکن سردست اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ "تاوالہ گنگ" (دربھنگہ) کے مشہور عالم مولوی فدا حسین صاحب محی الدین نگری قدس اللہ سرہ العزیز جو اپنے عہد کے مسلم الثبوت اساتذہ اور پرانے مشاق مدرسوں میں شمار کئے جاتے تھے، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مولانا مرحوم کا تذکرہ ان کے کسی شاگرد نے معارف (اعظم گڈھ) میں چند سال قبل شائع بھی کرایا ہے۔ بہرکیف اس مدرسہ کی خدمت جن لوگوں کو سپرد کی گئی، ان میں ایک تو خود مولانا وحیدالحق استھانوی مرحوم اور دوسرے مولانا فدا حسین محی الدین نگری تھے، بلکہ مولوی عبدالغنی مرحوم کی یادداشت کے ایک مقام سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آرہ کے فخر المدارس کی تاسیس و قیام میں مولانا وحیدالحق کے ساتھ مولوی فدا حسین بھی شریک تھے۔ فرماتے ہیں:-

"فخر المدارس جس کے بانی مولانا وحیدالحق و مولانا فدا حسین نگری محی الدین نگری تھے۔"

یہ مدرسہ کب تک جاری رہا۔ میں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا قطعی ہے کہ مولانا عبدالغنی مرحوم کی مدت تعلیم کے "سالہا سال" کا ایک بڑا حصہ اسی مدرسہ میں گذرا۔ آخر کسا صورت پیش آئی۔ کہ چانک مولوی وحیدالحق مرحوم کے اس شیرازہ پر بھی بجلی گری، مولوی عبدالغنی صاحب کا بیان ہے کہ:-

میرزا ہد طاجا[illegible] ایک زمانے نے کروٹ بدلی اور فخر المدارس کے ذریعہ سے جس تعلیم کی شیرازہ بندی کی گئی تھی اس کا شیرازہ ٹوٹا، (اس بری طرح ٹوٹا کہ) فخر المدارس کے بالکل اٹھ جانے کی وجہ سے میں پٹنہ چلا آیا۔ اور مولانا وحیدالحق رونق افروز بہار ہوئے"۔

اور یوں سالہا سال کی رفاقت کا رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ شاگرد استاد سے اور استاد شاگرد سے جدا ہو گئے،

(باقی انشاء اللہ آئندہ کبھی)

۱؎ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس وقت بھی حنفیوں اور اہل حدیث کے متعدد مدارس اس شہر میں اب تک قائم ہیں، چند سال ہوئے ایک وظیفہ یاب مسلمان ڈپٹی کلکٹر نے کوئی نیا مدرسہ یہاں جاری فرمایا۔ اس سے اس شہر کے مسلمانوں کے اس ذوق اور تعلق کا پتہ چلتا ہے جو اسلامی و مشرقی علوم سے انہیں ہے۔

۲؎ ——— یہ اس زمانہ میں تعلیمی اسٹینڈرڈ کے اظہار کا ایک طریقہ تھا۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے کی اصطلاحیں اس زمانہ میں کہاں تھیں۔ مختلف کتابوں کو ان مراتب کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا گیا تھا۔ منطق کا مشہور متن تہذیب جس کے مصنف علامہ تفتازانی اسکی شرح جلال الدین دوانی نے لکھی تھی، ان ہی کو "ملا جلال" بھی کہتے ہیں۔ اور اب انکی اس شرح ہی کا نام "ملا جلال" ہو گیا ہے جیسے شکسپیر وغیرہ کے بعض ڈراموں ہی کو لوگ شکسپیر کہنے لگے، اسی کتاب پر عالمگیری فوج کے صدر محاسب (اکاؤنٹنٹ جنرل) سید زاہد جن کے والد ہرات کے تھے اس کے باوجود ہندوستان لاہور میں پیدا ہونے کے وہ "میرزا ہد ہروی" کے نام سے مشہور ہوئے، شخص باوجود یکہ حکومت کے انتظامی صیغہ کا ایک ممتاز عہدہ دار تھا، لیکن درس و تدریس تصنیف و تالیف کا بھی شوق رکھتا تھا۔ طبیعت میں ایچ اور حدت تھی، تین کتابوں پر انھوں نے حواشی لکھ کر اپنے خاص خیالات کا اظہار کیا ہے، جو تقریباً دو سو سال تک ہندوستان کے علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے گئے ان تینوں حاشیوں کے مجموعہ کا نام "زواہد ثلثہ" ہو گیا تھا، پچھلے دور میں بڑے عالم ہونے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان تین کتابوں میں سے کسی پر یا کسی ایک پر حاشیہ لکھا جائے اسی لئے ان تین کتابوں کے حاشیوں کی نقلیں اور سینکڑوں سے متجاوز ہیں ادھر بیس پچیس سال سے اب "زواہد ثلثہ" کا زور عربی مدرسوں میں کم ہو گیا ہے ورنہ عالم عالم ہی شمار نہیں ہو سکتا تھا، جب تک ان کتابوں کو کم از کم اس نے نہ پڑھ لیا ہو۔ بہرحال ان تین حاشیوں میں سے بحر شرح مواقف کے میرزا ہد کے اور دو حاشیے یعنی قطبیہ اور ملا جلال کے حاشیوں کا شمار متوسطات درمیانی درجہ کی کتابوں میں تھا، مولانا عبدالغنی مرحوم کی مراد گذشتہ بالا فقرہ سے یہی ہے کہ اس زمانہ کے تعلیمی نصاب کے وسط تک وہ پہنچ چکے تھے، گویا

فردوسی اور دقیقی

از جناب پروفیسر طاہر رضوی ایم اے

فردوسی اور اُس کا "شاہنامہ" بے شک ایسی ہی قدر افزائی کا مستحق تھا کہ صدہا پر از تحقیقات و معلومات کتابیں اور مقالے خود شاعر اور اس کے کلام کے متعلق لکھے اور ترتیب دئے جائیں۔ چنانچہ ان تحقیقات میں تقریباً تمام ممالک نے بلا تفریق مذہب و ملت حصہ لیا اور ہمارے معلومات میں کافی اضافہ کیا۔ ہم اس جگہ شاہنامۂ فردوسی کے اُن مخصوص ہزار اشعار کے متعلق جن کو فردوسی نے دقیقی شاعر سے منسوب کیا ہے، اپنا خاص نظریہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔

اپنے ذاتی مطالعہ اور تحقیقات سے ہم اب تک جس نتیجہ پر پہونچے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ ہزار اشعار بھی حقیقۃً فردوسی ہی کی فکر رسا کا نتیجہ تھے لیکن بوجوہ چند اُس نے یہ ابیات اپنے پیشرو شاعر دقیقی کے نام منسوب کر دئے ہیں۔ اپنی اس جدید تحقیق کے ثبوت میں ہم دلیل بھی رکھتے ہیں جسے فی الحال مختصر طور پر پیش کریں گے۔ چونکہ یہ نظریہ سیکڑوں برس سے قائم شدہ عقیدہ کے خلاف پڑیگا لہذا اکثر و بیشتر حضرات کو حیرت ہوگی اور وہ اسے نظریہ کہکر ٹال جائیں گے۔ مگر یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ ایسے ایسے اکثر غلط عقائد اب سے چند سال کے اندر علماء کی تحقیقات کی بدولت بالکل ہو چکے ہیں۔ مثلاً کچھ عرصہ قبل تک ایک مثنوی موسومہ بہ یوسف زلیخا کو لوگ فردوسی کی تصنیف سمجھتے رہے اور اس کی نظم کے اسلوب بھی بڑی شد و مد کے ساتھ بیان کئے جاتے تھے، مگر آج ہندوستان کے مایۂ ناز مشتشرق اور محقق پروفیسر حافظ محمود شیرانی مدظلہ (پنجاب یونیورسٹی) نے ثابت فرمادیا کہ یہ خیال محض لغو ہے اور یوسف زلیخا کسی صورت میں بھی فردوسی کی منظومہ تصنیف نہیں ہو سکتی، اس طرح پر چہار مقالہ نظامی عروضی" اور "تذکرۂ دولت شاہی" میں ایسے خلاف عقل روایات کا طومار ہے جسے عقل سلیم رکھنے والا انسان آج قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اب ہم اپنے ان دلائل کو جن کی بنا پر شاہنامہ کے ان ہزار اشعار کو شاعر دقیقی کی تصنیف سمجھنے سے معذور ہیں گوش گذار کرتے ہیں

ہر وہ شخص جس نے عہد فردوسی کی معاشرت کا بغور مطالعہ کیا ہے، آج اس حقیقت کا اقرار کریگا کہ اس زمانہ کے لوگ بوجوہ نوناگوں تنگ نظر اور متعصب تھے اور ان میں فردوسی جیسی آزاد خیالی اور عالی ظرفی مطلقاً نہ تھی، چنانچہ اس کا مظاہرہ فردوسی کی جلت کے بعد یوں ہوا کہ اس کی میت کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونے نہ دیا گیا۔ مولانا شبلی مرحوم نے شعر العجم میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ فردوسی کے معاصرین میں سے ایک مسلمان بزرگ اور عالم نے شاہنامہ کے جواب میں محض تعصباً ایک کتاب معسوم بہ "عمر نامہ"[1] تصنیف کی تھی کہ جس میں خلفائے راشدین کے کارنامے اور عربوں کی فتوحات کا تذکرہ تھا۔ اور غرض صرف اس قدر تھی کہ لوگوں کو شاہنامہ سے اور غیر مسلم بادشاہوں اور ان کے کارناموں سے نفرت ہو جائے۔ مسلمانوں نے شاہنامہ نظم کرنے کا صلہ فردوسی کو جو کچھ دیا ہے وہ اس مصرع سے صاف ظاہر ہے کہ

ع دلش گیر و جاں گیر و گیری زبان۔

فردوسی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ شاہنامہ کے اکثر حصص پر اس کے ہمعصر سختی سے معترض ہوں گے اور اسے طرح طرح پر متہم کریں گے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے یہ ہزار اشعار متعصب مسلمانوں کو محض اسلئے ناپسند ہوں گے کہ ان میں قدیم پیغمبر ایران زرتشت کے ظہور کا حال خالص زرتشتی اور ایرانی نقطۂ نگاہ سے بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ بات فردوسی کے لئے ناممکن تھی کہ تاریخ ایران کے اس اہم ترین باب کو بالکل ذہن سے فراموش کر دے یا لکھے بھی تو ادھورے دل سے۔ لہذا فردوسی نے اسی شد و مد کے ساتھ جیسا کہ اس واقعہ کے شایان شان تھا۔ ان ہزار اشعار کو بھی نظم کیا مگر اپنے تئیں طعن و تشنیع سے محفوظ رکھنے کے لئے اس نے شاہنامہ کے اس پورے باب کو دقیقی کے نام سے منسوب کر دیا، اس طرح پر اپنے اصول کی پابندی کرتے ہوئے اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گیا اور کوئی اس پر اعتراض بھی کرنے کی جرأت نہ کر سکا، اس لئے کہ اب جبکہ دقیقی بقید حیات نہ تھا اس کی تردید کرنے

[1] ندیم "عمر نامہ" کی نایاب تحقیق پر مدیر ندیم کا ایک مفصل مقالہ "معارف" بابت ماہ ستمبر سنہ ۴۲ء میں شائع ہو چکا ہے اس کا مطالعہ اس مخلف کے مباحث کو بخوبی سمجھنے والے اہل علم کیلئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

والا کون تھا وہ جانتا تھا کہ لوگ مشہور عوام روایت سے باخبر ہیں کہ دقیقی قدیم تاریخ ایران کو نظم کا جامہ پہنانے کا ارادہ رکھتا تھا بلکہ کچھ اجزا نظم بھی کر چکا تھا لیکن قبل اس کے کہ اپنے اس کارنامہ کی تکمیل کر سکے اس کی موت واقع ہو گئی۔

فردوسی نے زیر بحث باب کا آغاز حسب ذیل طور پر کیا ہے:-

چناں دید گوینده یک شب بخواب — که یک جام مے داشتے چوں گلاب
دقیقی ز جائے پدید آمدے — بداں جام مے داستانہا زدے
بہ فردوسی آواز داد که مے — فخور جز بآئین کاؤس و کے
بدیں نام هرچند گشتانتے — کنوں هرچه جستی همه یافتے
از اندازه من بیش نگفتم سخن — اگر بار یابی بنجیلی من
ز گشتاسپ و از جاسپ بیتے هزار — بگفتم سر آمد مرا روزگار
گر آن مایه نزد شهنشه رسد — روان من از خاک برمه رسد
بزیر فتم آن گفت او را بخواب — بخوبی و نرمیش دادم جواب
که من هم بپایش تو خواهم رسید — از ین شاخ بیخم بباید چشید
کنون من بگویم سخن کو بگفت — نیم زنده او گشته باخاک جفت

یہ یاد رہے کہ دقیقی کو خواب میں دیکھنا بالکل اسی طرح ہے جس طرح آغاز شاہنامہ میں سلطان محمود کو فردوسی نے خواب میں دیکھنے کا واقعہ نظم کیا ہے۔

چناں دید روشن روانم بخواب — که رخشنده شمعے برآمد ز آب
همه روئے گیتی شب لاجورد — ز آن شمع گشتے چو یاقوت زرد
درو دشت پرساں دیباست دی — بپے تخت پیروزه بیاشتی
نشسته بروشن بپاری چو ماه — بسے تاج برسر بجائے کلاه
یکے پاک وستور پیشش بپائے — بداد و بدیں شاه را رہنمائے
چو آن چهرهٔ خسروے دیدمے — ز آن نامداران بپرسیدمے
یکے گفت زیں شاه روم است و هند — ز قنوج تا پیش دریائے سند
بایران و توران و را بنده اند — برای و بفرمان او زنده اند
جهاندار محمود شاه بزرگ — به آبش خور آرد همی میش و گرگ
تو نیز آفرین کن که گوینده ام — بدو نام جاوید جوینده ام

یہ مخصوص خواب شاہنامہ کے عین آغاز ہی میں ہے۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ شاہنامہ تکمیل ہو جانے کے بعد فردوسی نے دربار غزنوی کا قصد کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب شاعر شاہی دربار میں باریابی کی عزت حاصل کر چکا تو اس نے شاہنامہ کے اندر مختلف مقامات پر سلطان محمود کی مدح سرائی کر کے اپنی گراں قدر کتاب کو سلطان کے نام نامی سے معنون کرنے کی کوشش کی۔ فردوسی خواب دیکھنے اور دکھلانے کا بہت زیادہ عادی نظر آتا ہے۔ شاہنامہ کے دوران نظم میں اکثر و بیشتر کسی اہم واقعہ کے سلسلہ میں وہ کسی نہ کسی کا خواب دیکھنا ضرور نظم کرتا ہے۔

سلطان محمود کو خواب میں دیکھنے کا واقعہ جو نظم کیا گیا تھا اس سے غرض یہ تھی کہ سلطان کی خوشنودی حاصل ہو، اور دقیقی کو خواب میں دیکھنے سے یہ غرض تھی کہ درباری امرا ران اشعار کے سبب اُن متعصب مسلمانوں کی ہمنوائی نہ کرنے لگیں جو فردوسی پر گبر ہونے کا الزام رکھتے تھے، بلکہ وہ یہی سمجھیں کہ یہ سارے ابیات دقیقی نے نظم کئے تھے اور فردوسی نے انہیں اس مقام پر صرف نقل کر دیا ہے۔

ذرا سوچنا چاہئے کہ آخر فردوسی جیسے پرگو اور پرمایہ شاعر کو کون سی ایسی دقت آن پڑی تھی کہ نئے اشعار نظم نہ کرکے دقیقی کے یہ ہزار اشعار شاہنامہ میں شامل کرے۔ اگر فردوسی کو دقیقی سے کچھ اشعار یا شاہنامہ کا کچھ منظوم حصہ لینا ہی تھا تو اس نے احوال دولت گشتاسپ اور ظہور پیغمبر ایران ہی کے واقعہ کو کیوں نقل کیا۔ کیونکہ دقیقی کے متعلق بعض تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ اس نے شاہنامہ کے تقریباً بیس ہزار اشعار نظم کئے تھے، اگر یہ کہا جائے کہ دقیقی نے محض یہی ہزار بیت نظم کئے ہونگے تو پھر یہ سوچنا چاہئے کہ آخر اس واقعہ میں کون سی ایسی بات دلچسپ تھی کہ دقیقی جیسے مرد مسلمان نے اسی واقعہ پر سب سے پہلے قلم اٹھانا اپنا فرض سمجھا۔ دقیقی کو یا تو بالکل ابتدائے تاریخ ایران سے اپنی نظم کا آغاز کرنا تھا۔ یا پھر داستان گشتاسپ ہی اگر اسے بہت زیادہ پسند خاطر تھی تو تخت نشینی گشتاسپ سے قبل کے واقعات بھی جو نسبتہً زیادہ دلچسپ تھے نظم کرنا تھا، برعکس اسکے گشتاسپ کی تخت نشینی سے کچھ مدت بعد عین جب کہ زرتشت کا ظہور ہوا دقیقی نے اپنے شاہنامہ کا آغاز کیا۔

یہ لطیفہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں کہ شاہنامہ کی اس داستان گشتاسپ اور ظہور زرتشت کے متعلق فردوسی کی خواب دیدہ روایت کی بدولت نیز دقیقی کے اس قطعۂ منظومہ کے سبب کہ :-

دقیقی چار مصلحت بر گزید ہ ، بگیتی ماز ہمہ خوبی و زشتی،
لب یاقوت رنگ و نالۂ چنگ نئی خوں رنگ و دین زردہشتی

یہ بیچارا بیشمر و فردوسی آج اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگوں کے نزدیک مجوسی اور پیرو زرتشت سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ایک معمولی سی معمولی عقل رکھنے والا شخص بھی اس قطعہ کو پڑھ کر یہی کہیگا کہ یہ صرف شاعرانہ خیالات ہیں اور انہیں مذہبی عقاید سے کچھ بھی واسطہ نہیں۔

اب ذرا یہاں اس بات پر غور کیجئے کہ فردوسی جس نے اپنی ساری عمر غیر مسلم بادشاہوں اور پہلوانوں اور مجوسیوں کے کارناموں کے سرانے میں بسر کی ہو اگر ان مجوسیوں کے پیغمبر اور ایرانیوں کے ریفارمر یعنی زرتشت اور اس کے سرپرست گشتاسپ کی مذہبی تبلیغ اور دینی کارنامے بھی ظاہراً اپنے ہی قلم سے نظم کرتا تو ایسے مسلمان جو دقیقی کو اس کے مرنے کے بعد مجوسی کہیں اور فردوسی کا مردہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ ہونے دیں، فردوسی کے ساتھ اس کی زندگی میں کیسا سلوک کرتے۔ یہاں پر فردوسی کی مصلحت بینی اور دوراندیشی پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے کہ اس نے ایسی مناسب تخصیص کے نام و مخصوص اشعار منسوب کئے جو متعصبین کی گرفت سے باہر ہو چکی تھی۔

عام طور پر لوگوں نے دقیقی شاعر کو جس کا نام ابو منصور محمد تھا مجوسی اور کیش زرتشت کا پیرو سمجھا۔ یورپین مستشرقین تو خیر قابل معافی ہیں خود ایران کے فضلا اب تک اس بات کے قائل ہیں کہ دقیقی مسلمان نہ تھا۔

پروفیسر "نولدیکی" نے بجا طور پر اظہار خیال فرمایا ہے اور اس کے مبنی برحقیقت ہونے کا ہر وہ شخص جس نے ادبیات ایران کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، اقرار کرے گا کہ اگر فردوسی اپنے شاہنامہ میں ان ہزار اشعار کو دقیقی سے منسوب نہ کرتا تو شاید ہی کوئی شخص یقین کر سکتا تھا کہ دقیقی ایسے ابیات کے نظم پر بھی قدرت رکھتا تھا، ان ہزار بیت کے علاوہ دقیقی کے افکار عالیہ جو ہم تک پہنچے ہیں وہ محض چند مدحیہ قصاید اور بیت ہائے رندانہ ہیں پروفیسر موصوف کے اس خیال پر ہمیں اس اضافہ کی اجازت دیجئے کہ اگر فردوسی اس قسم کا اشارہ نہ کرتا تو شاید ہی کوئی تمیز کر سکتا کہ ان اشعار میں اور شاہنامہ کے بقیہ اجزا میں کسی قسم کا اختلاف ہے۔ اب جبکہ فردوسی نے اس طرح کا اشارہ کر دیا تو بعد وفات فردوسی ہمارے تذکرہ نویسوں کو دور دور کی سوجھنے لگی۔ اور پھر کیا تھا فردوسی تو خود ایک ہزار ابیات کا اقرار کرے اور انہیں شاہنامہ میں بیس ہزار اشعار نظر آئیں۔ دنیا جانتی ہے کہ ان سارے طومار کی بنیاد صرف فردوسی ہی کی مصلحت آمیز تنہا روایت ہے، اور نہ کسی دوسرے راوی کا سرے سے پتہ بھی نہیں جو دقیقی کے اشعار شاہنامہ کا بطور واقعی نشان بتلا سکے۔

فردوسی کے زمانہ اور اقرار سے قبل کے ادبیات اور تذکروں میں کسی جگہ بھی دقیقی کے ان ہزار اشعار کے عالم وجود میں ہونے کا تذکرہ نہیں ملتا جب فردوسی نے اس طرف مصلحتہً اشارہ کیا تو پھر بعد کے ہر تذکرہ نویس نے فردوسی کے بیان کو سند سمجھ کر شاہنامہ کے ناظموں میں دقیقی کا بھی شمار کیا۔ اور جو اشعار نمونے کے طور پر دقیقی کے پیش کئے وہ بھی انہیں ہزار اشعار سے، اس کے علاوہ انہیں کوئی اور شعر نہ مل سکا۔

"اسدی طوسی" ناظم گرشاسپ نامہ" جس کا زمانہ بھی فردوسی کی وفات سے قریب تر ہے، اپنی تالیف "لغات الفرس" میں دقیقی کے جن اشعار کو نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہے وہ وہی ہیں جن کو فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں دقیقی سے منسوب کیا تھا۔ آخر بھلا کیا یہ ممکن تھا کہ دقیقی کے اجزائے شاہنامہ

منظوم کا وجود ہو اور ان لوگوں کی دسترس تک ان ہزار اشعار کے سوا اور کوئی شعر نہ پہونچے - کتاب معروف "المعجم فی معیار اشعار العجم" دقیقی کے شاہنامہ کے تذکرہ سے قطعی خالی ہے - تذکرہ "لباب الالباب" مولفہ محمد عوفی میں جو اس وقت قدیم ترین تذکرۂ شعرائے فارسی سمجھا جاتا ہے فردوسی کے حال میں لکھا ہے کہ شاہنامہ کی ابتدا دقیقی نے کی اور شاہنامۂ فردوسی میں بیس ہزار اشعار دقیقی کے ہیں - بقیہ ساٹھ ہزار اشعار فردوسی کے ہیں - مگر لطیفہ یہ ہے کہ کم و بیش ساٹھ ہزار اشعار تو شاہنامہ میں پائے جاتے ہیں، باقی بیس ہزار شعر کا کہیں پتہ ہی نہیں - ظاہر ہے کہ ان تذکرہ نویسوں کے ایسے بیانات خود ان کے اقوال کے ضعیف اور غیر مستند ہونے پر کافی دلالت کرتے ہیں -

اب معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ داستان گشتاسپ کی نظم اور شاہنامہ کے بقیہ اجزا میں بلحاظ زور کلام اور طرز بیان کافی فرق ہے جیسا کہ خود فردوسی نے کہا ہے :- ؎

نگہہ کردم ایں نظم سست آمدم — بسے بیت ناتندرست آمدم
من ایں را نوشتم کہ تا شہریار — بداند سخن گفتن نابکار

لیکن اگر "زگشتاسپ و ارجاسپ بیتے ہزار" کا مطالعہ کرتے وقت ہم فردوسی کے بیان سے مرعوب نہ ہوں تو کوئی بیت "ناتندرست" نہ ملیگی - نفسیات سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ جب لوگوں نے فردوسی کے اس بیان سے متاثر ہو کر داستان گشتاسپ کا مطالعہ کیا تو انہیں دھوکہ ہوا اور سچ مچ ابیات "سست" نظر آنے لگے "تولدیکی" جیسے جفاکش عالم اور مستشرق نے جب فردوسی کے اس بیان کو سچ ثابت کرنے پر کمر باندھی تو ان ہزار ابیات میں انہیں طرح طرح کے ضعف اور نقائص نظر آنے لگے اور جن کا انہوں نے اپنی کتاب "رزمیات ایران" میں مبسوط تذکرہ بھی کیا ہے - لیکن یہ تمام زحمتیں بے سود تھیں اسلیئے کہ ان ہزار ابیات سے ہٹکر جب "تولدیکی" صاحب بقیہ اشعار شاہنامہ کا بھی اس کاوش سے مطالعہ کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ وہ تمام نقائص اور اغلاط جو انہیں ان ہزار ابیات میں نظر آئے تھے پورے شاہنامہ میں بھرے پڑے ہیں - اگر ہم بنظر انصاف پڑھیں گے تو جو نقائص اور محاسن ان ہزار اشعار میں ملیں گے وہی نقائص اور محاسن بقیہ ابیات شاہنامہ میں بھی نظر آئیں گے - فردوسی کی مشہور عادت ہے کہ وہ اپنے اشعار کی بکثرت تکرار کرتا ہے - جب ہم شاہنامہ پڑھتے ہیں تو دیکھتے کہ ان ہزار ابیات اشعار کے اکثر اشعار کی فردوسی نے دوسرے اجزا میں بصورت شعر اور مصرع تکرار کی ہے - اگر یہ اشعار بصورت بیان اور تخیل "سست و نادرست" تھے اور اس نے داستان گشتاسپ میں محض اس خیال سے کہ دقیقی کا نام زندہ رہے اور اسے ممنون احسان کرے، انہیں نقل بھی کیا تھا تو پھر دوسری جگہوں پر خود ان کی تکرار کیوں کی؟ آخر اس میں کیا مجبوری تھی -

اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ ان ہزار ابیات میں خامیاں ہیں تو اسے ہم فردوسی کی نوعشقی کی مثال سمجھیں گے - اس وقت فردوسی کے کلام میں بہت ممکن ہے کہ اس قدر پختگی نہ ہو جیسی آخری حصص و اجزا میں ہے - غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمیں اوائل اجزائے شاہنامہ اور ان ہزار ابیات میں بحیثیت کلام زیادہ قربت نظر آتی ہے - بخلاف اس کے آخری حصص میں کلام کی پختگی زیادہ نمایاں ہے - کہنے والا تو کہہ سکتا ہے کہ یا تو ابتدائی اجزا یا آخری دونوں میں کوئی ایک صرف فردوسی کے نظم کیے ہوئے ہیں - مگر بھلا یہ کون سی سمجھ کی بات ہوگی - عموماً یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ عمر کے مختلف دور کے کلام اور تحریر میں یکسانی نہیں ہوتی -

فردوسی کی بالعموم یہ عادت معلوم ہوتی ہے کہ "دانش و خرد" کا ذکر وہ مختلف صورتوں میں اور چند معروف طریقوں کے ساتھ نفس بیان سے باہر ایسے مقام پر لاتا ہے جو کسی خاص سلسلہ میں اہمیت رکھتا ہو - اسی طرح "درخت و شاخ" یا "سرو" کی تشبیہ کا بکثرت استعمال انسانی زندگی یا کسی اہم واقعہ کے سلسلہ میں کیا گیا ہے - شاہنامہ کے آغاز ہی میں "گفتار اندر ستایش خرد" کا ایک مستقل باب نظر آتا ہے اور اس "گفتار" کا خاتمہ جس شعر پر ہوتا ہے وہ یہ ہے ؎

چو دیدار یابی بشاخ سخن — بدانی کہ دانش نیاید بہ بن

اسی طرح آفرینش روم کے سلسلہ میں یوں گہر افشانی ہوتی ہے -

چو زیں بگذری مردم آمد پدید — سخنہا بنہ با سر اسر کلید
سرش راست بر شد چو سرو بلند — بگفتار خوب و خرد کار بند

پھر "گفتار اندر فرہ آور دین شاہنامہ" میں حسب ذیل اشعار ملتے ہیں - ؎

سخن ہر چہ گوئیم ہمہ گفتہ اند، — بر باغ دانش ہمہ رفتہ اند
اگر بر درخت برومند جای — نیابم کہ از بر شدن نیست رای
کسی کو شود زیر شاخہا بلند — بداند کہ بن دارند گزند

توانم مگر پایگہ ساختن ، بر شاخ آں سرو سایہ فگن
کزیں نامہ نامور شہریار بگیتی بمانم یکے یادگار

شاہزادہ منوچہر کی پیدائش پر بادشاہ فریدوں کی زبان سے فردوسی اس طرح خوشی کا اظہار کرتا ہے ۔

چنیں گفت کز پاک مام و پدر ، یکے شاخ شایستہ آمد بہر

پھر فریدوں کی موت کا یوں ذکر کرتا ہے ۔

چو آں کردہ شد روز برگشت و بخت بپژمردہ برگ کیانی درخت

رستم کے پیدا ہونے پر اُس کے متعلق سیمرغ یہ پیشین گوئی کرتا ہے کہ :-

برائی و خرد سام سنگی بود بچشم اندروں شیر جنگی بود

اور یہی سیمرغ پھر زال کو اس طرح مخاطب کرتا نظر آتا ہے ۔

ترا زیں سخن شاید بایدبدن ، بہ پیش جہاندار باید شدن
کہ او دادت ایں خسروانی درخت کہ ہر روز نو بشگفاندت بخت
بدیں کار دل ہیچ غمگیں مدار کہ شاخ برومندت آمد ببار

بادشاہی کیخسرو کی داستان کے آغاز میں یہ اشعار نظر آتے ہیں ۔

بپالیز چو برکشد سرو شاخ سر سبز شاخش برآید بکاخ
ببالائے او شاد باشد درخت چو بیند ش بنیاد دل و نیک بخت
دل روزگارش ہمی پرورد ، جہانے نکردار او برخورد ،
اگر بادشاہی بود در گہر ، بباید کہ نیکی کند تاجور ،
سزد گر گمانے برد بر سہ چیز ، کزیں سہ گذشتی چہارست نیز
ہنر بانژاد است و با گوہرست سہ چیزست و ہر سہ بہ بنداندرست

* * * * * * * * * * * * * * * * * * *

چو ایں ہر سہ بابی خرد بایدت شناسندۂ نیک و بد بایدت ،
چو ایں چار با یکتن آید بہم بیاساید از آزو از رنج و غم

اس طرح کی تشبیہات سے سارے کا سارا شاہنامہ بھرا پڑا ہے ـــــ اب ذرا ہزار اشعار منسوب بہ دقیقی کے آغاز ہی میں " پیدا شدن زردشت و پذیرفتن گشتاسپ دین او " کا تذکرہ جس طور پر ہوتا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔ یہاں بھی یہی تشبیہیں ، جابجا نظر آئیں گی اور ان ہزار ابیات میں بھی " دانش و خرد " کا تقریباً اُسی طرز میں ذکر ملے گا ، جس طرح کہ شاہنامہ کے کل بقیہ اشعار میں تذکرہ ہوتا ہے ۔

چو یکچند گاہے برآمد بریں درختے پدید آمد اندر زمیں
از ایوان گشتاسپ تا پیش کاخ در ختے گشن بیخ و بسیار شاخ
ہمہ برگ او پند و بارش خرد کسے کو چناں برخورد کے مُرد
یکے پاک پیدا شد اندر زماں بدست اندرش مجمر عود یاں ،
فجستہ پئے و نام او زردہشت کہ آہرمن بدکنش را بکشت ،

* * * * * * * * * * * * * * * * * * *

نگر تا چہ گوید براں کار کن ؛ خرد بر گزیں ایں جہاں خوار کن

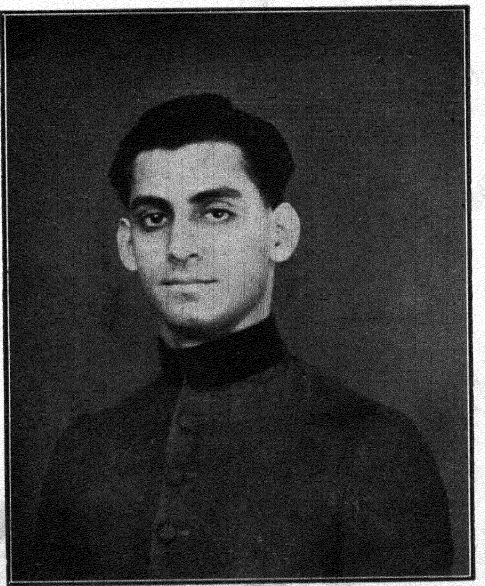

جناب سید علی حیدر

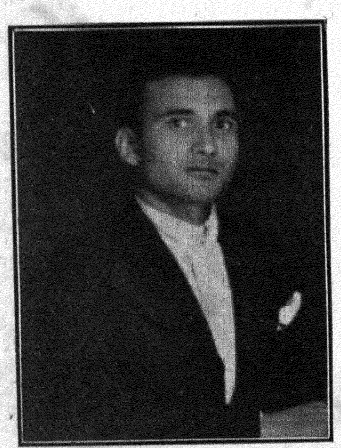

جناب اظہر الحق قادری

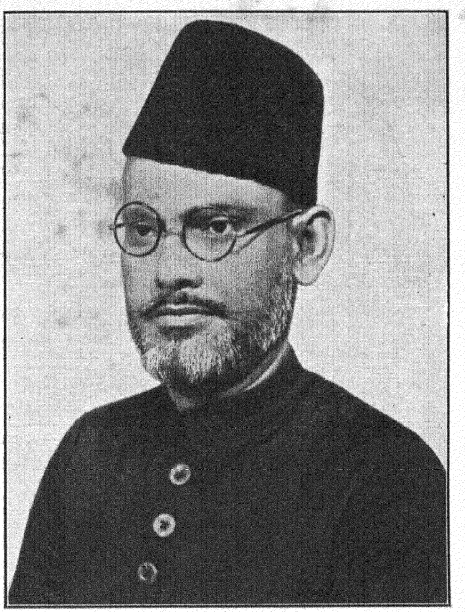

جناب حمید عظیم آبادی

جناب شاہ ولی الرحمٰن ولی

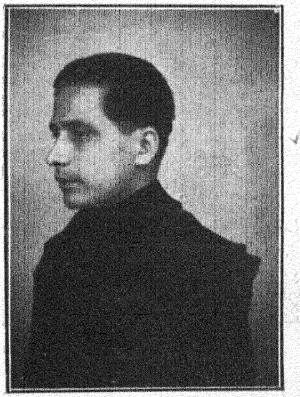

جناب جی۔ آر قیس

* * * * * * * * * * * * * * * * * * * *

یکے سرو آزادہ را زود ہشت ۔۔۔ بہ پیش در آذر اندر بکشت
نشستش بران زاد سرو سہی ۔۔۔ کہ بذرفت گشتاسپ دین بہی
گوا گرد مرسرو آزاد را ۔۔۔ چنیں گشتر اندر خرد داد را

اسی طرح ان ہزار ابیات کے اور بھی مقامات پر غور کیجیے۔ بادشاہ بہراسپ کی گوشہ نشینی اور عبادت گذاری کے متعلق یہ شعر نظر آتا ہے۔

بہ پوشید جامہ پرستش پلاس ۔۔۔ خورد را بر ینگونہ باید سپاس

بت پرست شاہ توران اور جاسپ اپنے مکتوب بنام بادشاہ گشتاسپ میں اُسے اس طرح دھمکی دیتا ہے۔

بسوزم نگاریدہ کاخ ترا ۔۔۔ زبن برکنم بیخ و شاخ ترا

بادشاہ گشتاسپ اپنے درباریوں کے سامنے بت پرست از جاسپ توورانی اور اپنے درمیان کے تعلقات پر جب اظہار خیال کرتا ہے تو یوں کہتا ہے۔

چہ ناخوش بود دوستی با کسے ۔۔۔ کہ مایہ ندارد ز دانش بسے

اسی طرح جاماسپ وزیر گشتاسپ کی تعریف میں یہ ابیات نظر آتے ہیں۔

چناں پاک تن بود و پاکیزہ جاں ۔۔۔ کہ بودے برو آشکارا نہاں
ستارہ شناسی گرامایہ بود ۔۔۔ ابا او بدانش گراں پایہ بود

میدان جنگ میں شاہزادہ زریر برادر گشتاسپ کی موت واقع ہونے کے سلسلہ میں یوں ذکر ہوتا ہے۔

سرانجام گرد بروتیرہ بخت ۔۔۔ بریدہ شود آں گزیدہ درخت

گرزم اور گشتاسپ کے درمیان جو گفتگو شاہزادہ اسفندیار کے متعلق ہوتی ہے۔ اُس میں یہ شعر ملتا ہے۔

گرزم بد آہوش گفت ازخرد ۔۔۔ نباید جز آں چیز کاندر خورد

اس جگہ ایک اور بات قابل غور ہے۔ تیس پینتیس سال کے عرصہ دراز میں پچاس ساٹھ ہزار اشعار کی ایک بڑی کتاب ترتیب دینے میں جب کہ رزم و بزم وغیرہ کے مناظر مختلف اور متعدد موقعوں پر بار بار پیش کرنے کی ضرورت لاحق ہوگی تو ایک شاعر کے لئے فطری طور پر اکثر پورا شعر کا شعر یا کم از کم ایک دو مصرعہ جسے وہ پہلے کسی وقت چند سال قبل کسی دوسری تیسری داستان کے سلسلہ میں نظم کر چکا ہے۔ دوبارہ سہ بارہ نظم کر دینا لازمی ہو جائے گا۔ یعنی قبل کے کہے ہوئے اشعار یا مصرعوں کی تکرار ہونی ضروری بات ہے۔ شاہنامہ فردوسی میں اس طرح کی تکرار بکثرت دیکھنے میں آتی ہے۔ برعکس اس کے اگر کوئی شاعر محض تھوڑی مدت میں چند سو شعر یا ہزار دو ہزار ابیات نظم کرے گا کہ جس کا سرمایہ صرف چند صفحہ قرطاس پر مشتمل ہو تو اس میں اس قسم کی تکرار غیر معمولی اور نامناسب بات ہوگی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ دقیقی سے منسوب کئے ہوئے اشعار میں بھی بہت سے شعر دوبارہ سہ بارہ نظم ہو گئے ہیں۔ بلکہ اکثر تو ایسے شعروں کی بھی تکرار ہو گئی ہے جنہیں بلاشبہہ فردوسی نے شاہنامہ کے دوسرے مقامات پر نظم کیا ہے۔ اور مصرعوں کی تکرار تو بے انتہا ہے۔

پھر فردوسی کی بیان کردہ روایت کے مطابق جس میں دقیقی نے اُس سے خواب میں اپنے ہزار شعر کہنے کا ذکر کیا تھا کہ

ز گشتاسپ و ارجاسپ بینی ہزار ۔۔۔ بگفتم سرامد مرا روز گار

اگر ان کا شمار کیا جائے تو اس سے بھی مسئلہ زیر بحث پر کافی روشنی پڑے گی۔ دقیقی سے منسوب شدہ اشعار جنہیں فردوسی نے خود لکھا ہے کہ میں نے اول سے آخر تک نقل کر دیے ہیں پورے ہزار شعر نہیں نکلتے۔ لوسو ستاسی شعر تو گنتی کے ہیں اور ان میں بھی اکثر اشعار دو دو تین تین بار مختلف مقامات پر نظم ہو گئے ہیں جس کے سبب پورے ہزار ابیات کا پتہ تاب نہیں ملتا۔

فردوسی کے متعلق چند اور بھی مستقل غلط فہمیاں ہوئی ہیں اور ان پر اکثر و بیشتر حضرات طبع آزمائی کرنے دکھائی دیتے ہیں۔ ستمبر ۱۹۳۸ء کے زمانہ (کانپور) میں صوبہ بہار کے مشہور اہل قلم سید رضا قاسم صاحب مختار (حسین آباد) نے ایک مضمون فردوسی اور سلطان محمود کے تعلقات پر تحریر فرمایا تھا

کہ جس کا ایک تردیدی جواب مارچ ۱۹۳۶ء کے زمانہ میں مسٹر محمد یحییٰ تنہا ایم اے کے قلم سے شایع ہوا تھا۔ دونوں مقالے میری نظر سے گذرے۔ تاریخ ادب کے ایک افسوسناک اور مسلم الثبوت واقعہ سے انکار حقیقۃً حیرت خیز بات معلوم ہوتی ہے۔ سلطان محمود کے دربار میں فردوسی بڑی بڑی امیدیں لیکر آیا تھا۔ اور اگرچہ یہ امر متحقق نہیں کہ فردوسی سے محمود نے کسی قسم کا وعدہ بھی کیا تھا، تاہم اس بات کا تو کم از کم ضرور ہی اقرار کرنا پڑے گا کہ دربار غزنوی میں فردوسی کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں ہوا۔ شاہنامہ جیسی عظیم المرتبت کتاب کو سلطان محمود کے نام سے معنون کرنے کا صلہ فردوسی کو امید سے زیادہ ملنا چاہیے تھا۔ خلاف توقع برتاؤ نے شاعر کا دل مکدر کر دیا۔ اور اُس نے چند ابیات ہجو ملیح کے یقیناً نظم کئے۔ ہاں ہجو یہ اشعار کا طومار بلاشبہ بعد کی چیز ہے، مگر فردوسی کے قلم سے ہجو محمود کے متعلق سرے سے انکار ایک تاریخی حقیقت سے دانستہ چشم پوشی ہوگی۔ محمود غزنوی کی علم دوستی اور اُس کے دربار میں شعرائے باکمال اور فضلائے عصر کی سرپرستی مسلم۔ اگر اس کو کیا کیجئے کہ فردوسی کی بدقسمتی سے چند تنگ حوصلہ اور حاسد لوگوں کو اس بات کا موقع مل گیا کہ سیاسی اسباب اور مذہبی رنگ نمایاں کرکے سلطان کی نظر میں فردوسی کی شخصیت کو گھٹا دیں۔ اور سلطان کے نام شاہنامہ معنون کرنے کا صلہ مصنف شاہنامہ کو اس درجہ کم دلوانے کا بندوبست کریں کہ جس سے شاعر برداشتہ خاطر ہوکر دربار سلطانی سے کنارہ کش ہوجائے اور چند ہجو یہ اشعار کہہ کر اپنے جلے دل کے پھپھولے توڑے۔

بغداد کے مشہور شاعر ضیاوی (مرحوم) نے جشن ہزار سالۂ فردوسی کے موقع پر طہران میں شاعر ملی ایران کو مخاطب کرتے ہوئے جو فارسی نظم پڑھی تھی جس کا ایک شعر ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے یہاں پر نقل کرنا نہایت برمحل ہوگا۔

ندانست قدرے تو گر غزنوی
بگویش سبق گیر از پہلوی

ہجو محمود سے قطعی انکار کے سلسلہ میں ہمارے ملک کے محققوں نے فردوسی کے مذہب کے متعلق بھی طرح طرح کی خیال آرائیاں کی ہیں، اور یہ بھی صرف اس وجہ سے کہ ہجو کے الحاقی اشعار میں جو بعد وفات فردوسی وجود میں آئے، شاعر کے دین و مسلک پر کافی سے زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور سلطان محمود کا متعصب ہونا دکھلایا گیا ہے۔ طرفداران محمود نے یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہ فردوسی اور محمود کے مذہب کی بنا پر کوئی اختلاف نہ تھا، سرے سے فردوسی کو ایک عام حقیقت کے خلاف کہہ اور ثابت کرنا چاہا ہے، اور دلیل میں آغاز شاہنامہ میں سو چند شعر پیش کئے ہیں میرے اصل مضمون کو اس بحث سے تعلق نہیں۔ ہاں مختصر طور پر اس قدر کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کے وہ ایک شعر کی بنا پر جو یقیناً اُس کے دربار محمود میں آنے کے بعد نظم ہوکر شاہنامہ میں شامل کئے گئے، اُس کے مذہب کے متعلق خلاف واقعہ کچھ کہنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ دقیقی کے منظومہ قطعہ متذکرہ بالا کو اُس کے گبر اور زرتشتی ہونے کی دلیل میں پیش کیا جاتا ہے، یا جس طرح کہ حافظ شیراز کی غزلوں میں "پیر مغاں" کی تعریف و توصیف دیکھ کر بمبئی کے ایک پارسی نژاد مشہور اہل قلم نے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ حافظ کو مجوسی ثابت کرنے میں صفحے کے صفحے سیاہ کئے تھے۔

"رسالہ الندوہ"

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان صاحب ندوی

جنوری سنہ ۱۹۳۷ء سے شایع ہو رہا ہے

چندہ سالانہ ——— صرف دو روپیہ

حامد علی ندوی منیجر رسالہ الندوہ - لکھنؤ

کیا موجودہ پیرانِ ہند کا "تصوف" اسلامی ہے؟

پیری و مریدی پر ایک مذہبی تبصرہ

از جناب پروفیسر سید مظفر الدین صاحب ندوی ایم۔اے

جب ہم اگلے صوفیائے کرام کے سوانح عمری اور ان کی تعلیمات و ہدایات پر نظر ڈالتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ان کی زندگی کا ہر شعبہ اسلامی رنگ میں رنگا ہوا تھا، ان کو خدا اور رسول کی خوشنودی کا بھی خیال تھا اور قوم کی اصلاح کی بھی کد تھی، وہ جسمانی محنت بھی کرتے تھے اور روحانی ریاضت بھی، وہ اسلام کے ظاہری اور باطنی ہر دو صیغوں کو مستحکم کرنا چاہتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اسلام سے ایک طرف ہمارے ظاہری حالات، اخلاق و عادات اور اوضاع و اطوار سدھرتے ہیں۔ تو دوسری طرف اس سے ہمارے دلوں میں صفائی، روحوں میں پاکیزگی اور عقلوں میں جلا آتی ہے۔ ان کی تعلیم تھی کہ ہر مسلمان پہلے اپنے آپ کو سنوارے اور ظاہری احکام کے مطابق سچا مسلمان ہو جائے، اس کے بعد اگر اسے ذوق ہو تو باطنی احکام کی طرف رجوع کرے، یعنی جب تک ایک مسلمان اسلام کے ظاہری شعبے میں (جس کو صوفیوں کی اصطلاح میں شریعت کہا جاتا ہے) کمال حاصل نہ کرے وہ باطنی شعبے میں (جس کا نام انہوں نے طریقت رکھا ہے) ہاتھ نہ لگائے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم کسی مذہب یا مسلک کی ظاہری باتوں کو پہلے اچھی طرح نہ سمجھ لیں اور ان پر عمل نہ کر لیں تو پھر اس کے اندرونی رموز و اسرار تک کیونکر پہونچ سکتے ہیں

یہ تو اگلے صوفیوں کا عقیدہ اور عمل تھا، مگر جب ہم موجودہ پیرانِ ہند کے اقوال و افعال پر نظر ڈالتے ہیں تو ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ آیا یہ دونوں ایک ہی جڑ کی دو شاخیں ہیں یا دونوں مختلف الاصل ہیں۔ اور یہ فیصلہ کرنا نہایت مشکل ہے کہ آیا ہندوستان کی موجودہ پیری و مریدی اوائل اسلام کے سلسلہ تصوف کی کوئی کڑی ہے یا کوئی علٰحدہ چیز ہے۔ پیر صاحبان کے زبانی دعووں اور مریدوں کے ہتھیاروں سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پیری و مریدی "تصوف اسلام" کا دوسرا نام ہے۔ مگر جب ۹۵ فی صدی پیرانِ ہند کے افعال و اعمال اور اخلاق و عادات پر غور کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں کوئی وجہ شرکت نہیں، اور ان کو صوفی کہنا کیسا معمولی درجہ کا مسلمان سمجھنا بھی قلب ماہیت سے کم نہیں۔ آپ خانقاہوں کی سیر کریں، شاہوں کی گدیوں میں تشریف لیجائیں یا مشہور مزاروں کی زیارت کریں (خاص کر عرس کے موقعوں پر) تو یہ تلخ حقیقت عیاں اور واضح طور پر آپ کی آنکھوں کے سامنے آجائیگی۔

میں اس مضمون میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ملک کی موجودہ پیری و مریدی کو تصوف اسلام سے کوئی واسطہ نہیں اور یہ کہ جس چیز کو ہم اسلام کا جوہر سمجھے ہوئے ہیں وہ درحقیقت اسلام کے لئے ننگ و عار ہے۔ مضمون شروع کرنے کے قبل یہ لکھ دینا ضروری ہے کہ آجکل اہل علم ان معاملات پر اس ڈر سے قلم نہیں اٹھاتے کہ جہلا اور عوام (اپنے پیروں کی تعلیم کے مطابق) ان کو فورًا وہابی، ملحد، دہریہ وغیرہ کے لقب سے پکارنے لگتے ہیں، گو یا حق بات کہنا، یا گمراہوں کو راستہ بتانا، یا قوم کی اصلاح کرنا شدید جرم ہے، لوگ پیروں اور مریدوں کی غیر اسلامی بلکہ مشرکانہ اعتقادات و حرکات کو دیکھتے ہیں اور برداشت کرتے ہیں، بہرحال غلط فہمی دور کرنے کے لئے میں ابتدا ہی میں یہ کہہ دیتا ہوں کہ میں حنفی ہوں اور اصلی تصوف کا قائل ہوں بلکہ مداح، اور میرے مستند مضامین اس کی حمایت میں شائع ہو چکے ہیں۔ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں مذہبی حیثیت سے اور خالصۃً للہ لکھ رہا ہوں، اگر کوئی صاحب قرآن و حدیث سے، یا امام ابوحنیفہؒ کے قول سے، یا کسی اور امام یا فقیہ کے بیان سے یہ ثابت کر دیں کہ ہندوستان کی خانقاہوں میں تصوف کے نام سے جو مشرکانہ رویہ اختیار کیا جاتا ہے، اور عرس کی محفلوں میں مذہب کے قالب میں تاج و کانے کا جو تماشا دیکھا جاتا ہے اور مقبروں میں زیارت اور فاتحہ کے نام سے قبر پرستی کا جو منظر پیش کیا جاتا ہے وہ شرعًا جائز اور درست ہے تو میں نہایت خوشی کے ساتھ اپنی غلطی تسلیم کرونگا اور اپنی رائے بدل دونگا۔

اب میں اصل مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں، یوں تو بہت سے غیر اسلامی امور موجودہ سلسلۂ پیری و مریدی میں داخل ہو گئے ہیں، مگر میں صرف چند اہم باتوں کو مختلف عنوانوں کے ماتحت درج کرتا ہوں۔ :-

نمبر ۱- استعانت تعلیماتِ اسلامی کا اصل اصول یہ ہے کہ ہم خدا ہی کو قبلۂ حاجات سمجھیں، اسی سے اپنا مدعا طلب کریں، اور اسی کے سامنے دستِ سوال پھیلائیں، جیسا کہ فرقانِ مجید میں ہے "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ط" (یعنی ہم صرف تیری ہی پرستش کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مانگتے ہیں) لیکن آجکل اکثر میدانِ ہند اپنی تمنائیں اور آرزوئیں پیروں کے سامنے پیش کرتے ہیں، اور ان ہی کے سامنے دستِ حاجت دراز کرتے ہیں۔ ہزاروں اور لاکھوں مسلمان ہر سال عرس کی محفلوں میں اس غرض سے جاتے ہیں کہ بیماروں کو وہاں شفا مل جائے۔ بے روزگاروں کو روزی نصیب ہو، بے اولاد لوگوں کو اولاد میسر ہو۔ حاجتمندوں کی حاجتیں پوری ہوں، خدا ہی جانتا ہے کہ ان "پیرزدہ" گمراہوں کی تشنگیٔ ذوق وہاں بجھتی ہے یا نہیں، مگر میرا سوال یہ ہے کہ خدائے حاضر و ناظر کو چھوڑ کر کسی انسان سے مرادیں طلب کرنی شرک ہے یا نہیں؟ کیا انسان کو شافی سمجھنا اور قاضی الحاجات قرار دینا مشروع جائز ہے یا عقلاً درست ہے؟

اگلے صوفیائے کرام کے ہاتھ کبھی بھی ان مشرکانہ رسوم اور نحوِ حرکات سے آلودہ نہ ہوئے۔ پھر موجودہ پیرانِ ہند نے یہ عادتیں کہاں سے سیکھیں؟ اگر وہ ان عادات سے باز آجائیں تو دشمنانِ اسلام کا ایک بہت بڑا اعتراض اٹھ جائے گا۔

نمبر ۲- خدا سے بلاواسطہ مانگنا اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان اپنے خالق کو اپنے سے بہت قریب سمجھے اور ہر موقع پر اپنی ضروریات بے تکلف اور بلا واسطہ اس کے سامنے پیش کرے، جیسا کہ کلامِ مجید میں وارد ہے "وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ، اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ، فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ" (ترجمہ:- اور جب تجھ سے (اے پیغمبر) میرے بندے میرے بارہ میں پوچھیں (تو کہدے کہ) میں قریب ہوں، میں دعا مانگنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا مانگتا ہے، پس چاہیئے کہ لوگ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ ہدایت پائیں)

دوسری جگہ ارشاد ہے "فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ" (ترجمہ: پس تم مجھے یاد رکھو، میں تم کو یاد رکھونگا، اور میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری نہ کرو)

اگلے صوفیائے کرام بلکہ عموماً تمام مسلمان خدائے پاک کے ان ہدایات پر دل و جان سے عمل پیرا رہتے تھے اور ہر موقع پر خداوند کریم کو حاضر و ناظر اور سب کارکھنے والا سمجھتے تھے، لیکن اب تو دنیائے اسلام کی کایا پلٹ ہو گئی ہے اور خاصکر حاملانِ لوائے طریقت نے تو اسلام کی تعلیم مسخ کر دی ہے۔ ان کا فرمان یہ ہے کہ کوئی شخص بغیر پیر کی وساطت کے خدا تک پہونچ نہیں سکتا، اور ہر مرید پہلے اپنی ضروریات اپنے مرشد کے سامنے پیش کرے، اور مرشد صاحب اگر مناسب سمجھیں تو وہ ضروریات مالکِ حقیقی تک پہونچا دیں۔ مثال میں یہ لوگ ملک اور حکومت کا دستور پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح ایک معمولی شخص بغیر کلکٹر کے ذریعہ کے کورنر کے ہاں اور کورنر کے وسیلے کے بغیر وائسرائے یا بادشاہ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا، اسی طرح کوئی مسلمان بغیر پیر و مرشد کی وساطت کے اپنے خالق کے ہاں نہیں پہنچ سکتا اور نہ اس کے سامنے اپنا مدعا پیش کر سکتا ہے۔

ان بندگانِ خدا سے کوئی پوچھے کہ تصوف کا تعلق خانۂ قلب سے ہے یا پیر پرستی سے، اور روحانیت کی بنیاد قرآنی ہدایات پر قائم ہے یا ملک کے رواج پر؟ یہ کون ان لوگوں کو سمجھائے کہ خدا حاضر و ناظر ہے "عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ" ہے اور مختارِ مطلق ہے "فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ" لیکن ملک کا بادشاہ معمولی انسان کی طرح مجبور ہے، وہ بغیر اپنے حکام کے مشورہ یا سفارش کے کچھ کر نہیں سکتا، اور نہ اسے ملک کے حالوں و غرض کی خبر ہو سکتی ہے جب تک اس کے وزیر اسے مطلع نہ کریں، پس پیر صاحبان کی یہ مثال نہایت مہمل، اور عقل و نقل کے خلاف ہے۔ بادشاہِ ملک ملائکین کا محتاج ہے اور پروردگارِ عالم بے نیاز۔

معلوم ہوتا ہے کہ پیرانِ ہند نے یہ مراسم یا دیوتاؤں اور پنڈتوں کے اقوال و افعال سے حاصل کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ تصوف کا قالب تو اسلامی ہے، مگر اس کی روح میں عیسائیوں کی رہبانیت اور ہندوؤں کا فلسفہ حلول کئے ہوئے ہے۔ یہ ایک نیا مسلک معلوم ہوتا ہے جس میں اسلامی عنصر بہت کم ہے۔ اور بیرونی عناصر بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ راہبوں نے اسلام کے پہلے خدائی اختیارات کا دعویٰ کیا تھا، اور عام عیسائیوں نے اسے تسلیم کر لیا تھا۔ یہ شرک ہے اور قرآن مجید میں ایسے راہبوں کو "ارباب" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ بہت سے مرشدانِ ہند ان راہبوں کی طرح "ارباب" بن گئے ہیں، نَعُوْذُ بِاللّٰہِ۔

نمبر ۳ - اسلام کی جامعیت

مسیحیت اور یہودیت کی طرح اسلام کسی محدود مذہب کا نام نہیں ہے، جن لوگوں نے اسلام کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے، ان سے یہ مخفی نہیں کہ اسلام مذہب بھی ہے، سیاست بھی۔ دین بھی ہے دنیا بھی، شریعت بھی ہے حکومت بھی، ظاہر بھی ہے باطن بھی، جسم بھی ہے روح بھی، یہ ایک جامع مانع ادارہ ہے جس میں حیاتِ انسانی کے تمام شعبوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ اگلے مردانِ خدا نے اپنے طرزِ زندگی سے اسلام کی اس جامعیت کو برقرار رکھا، وہ دنیاوی کام بھی کرتے تھے اور خدا کو یاد بھی، وہ تصفیہ قلب میں بھی مشغول رہتے تھے اور قوم کی اصلاح میں بھی۔ وہ تصوف کی مشق کے ساتھ غیر مسلموں میں اشاعتِ مذہب بھی کرتے تھے۔ لیکن موجودہ مرشدانِ ہند کی زندگی کا انحصار اس اصول پر ہے کہ اسلام کا باطن (طریقت) ان کے حصے میں ہے۔ اور ظاہر (شریعت) دنیاداروں کے حصے میں، اس اصول کے ماتحت ملک کے اکثر بلکہ تمام پیر و مرشد اپنی زندگی خانقاہوں اور حجروں میں گذارتے ہیں۔ دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں رکھتے۔ قوم پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹے تو ان کو حس تک نہیں ہوتی، ملک تہ و بالا ہو جائے تو ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ سیلاب ہو یا طوفان، آتشزدگی ہو یا زلزلہ، نہ ان کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی ہے اور نہ ان کی نبض کی رفتار۔ حال میں ہندوستان میں کتنے مذہبی انقلابات، سیاسی حوادث اور معاشرتی تغیرات واقع ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ مگر ان کی دنیائے خلوت میں فراہمی جمع شروع ہوئی تھی جو عہد مرشدوں کی زندگی میں ہر سال ایک شاندار تقریب منعقد ہوتی ہے جس کا نام عرس رکھا گیا ہے، اس موقع پر جشن کے تمام لوازم مہیا رہتے ہیں اور دھوم دھام سے محفل رقص و سرود رچائی جاتی ہے۔ دور دور سے مریدانِ اسادہ لوح آتے ہیں۔ ایرا غیرا گاڑھی کمائی کا گاہ نذرہ پیر و مرشد پر نچھاور کر کے چلے جاتے ہیں، عرس کے موقع پر جو مشرکانہ رسوم انجام پاتے ہیں ان سے قطع نظر حجرہ نشینی اور خلوت نشینی از روئے روحِ اسلام کے منافی ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی زندگی (یعنی ترکِ دنیا اور کنارہ کشی) کو ممنوع قرار دیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے "لا رھبانیۃ فی الاسلام"۔ قرآن مجید میں سورۂ حدید میں صاف طور سے مذکور ہے کہ عیسائیوں نے رہبانیت ایجاد کی۔ اگرچہ خدا نے ان پر اسے فرض نہیں کیا تھا، مگر وہ اسے اچھی طرح نباہ نہ سکے، بعینہٖ یہی حال مرشدانِ ہند کا ہے کہ تعلیم اسلام کے خلاف حجرہ نشینی اور ترکِ دنیا کی رسم نکالی، مگر اسے نباہنا تو درکنار کی بات ہے، وہ دنیادار دل سے بھی بدتر ہو گئے، مذہب کا ظاہر بھی گیا، باطن بھی، خدا رحم کرے۔

نمبر ۴ - تصوف کی پہلی شرط

ہر شخص جانتا ہے کہ تصوف کی راہ میں قدم رکھنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ سالک اپنے مذہب کو جانتا ہو اور اس پر کما حقہٗ عمل کرتا ہو۔ یعنی اپنی طرف وہ شریعت کا عالم ہو، قرآن و حدیث سے واقف ہو خدا اور رسول کے اوامر و نواہی سے باخبر ہو اور اچھے برے کی تمیز رکھتا ہو اور دوسری طرف اس کے دل میں خوفِ خدا ہو، وہ مذہب کے احکام پر پورے طور عامل ہو، اس کے اخلاق و عادات اچھے ہوں اور اس کی زندگی عام مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل اور دلیلِ راہ ہو۔

اگلے صوفیوں کے سوانح عمری پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرط (جامعیت علم و عمل) تمام صوفیوں میں بدرجۂ اتم موجود تھی، اس زمانہ میں مشکل سے ایسا صوفی ملے گا جو جاہل ہو یا غیر عامل ہو، علم و عمل کے بغیر صوفی ہونا تو بڑی بات ہے، کوئی اچھا مسلمان بھی نہیں ہو سکتا۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے بارہا اعلان کیا کہ شریعت پر عمل کئے بغیر کوئی طریقت کی راہ پر چل نہیں سکتا۔ ہندوستان کے مشہور صوفی شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں کئی جگہ لکھا ہے کہ جب تک انسان ظاہر اسلام (شریعت) میں کامل نہ ہو وہ باطنِ اسلام (طریقت) کا اہل نہیں ہو سکتا۔ یہ تعلیم تمام صوفیا چشتیہ کی کتابوں میں ملتی اور اسی پر ان کا عمل تھا۔

لیکن موجودہ مرشدانِ ہند کا جائزہ لیجئے، عجب تماشا نظر آئے گا۔ تصوف کی ابتدائی شرط (علم و عمل) ۹۰ فی صدی میں مفقود ہے۔ اکثر سجادہ نشین جاہل اور نرا اہل ہیں، نہ شریعت سے واقف ہیں اور نہ طریقت سے۔ وہ صرف اس وجہ سے صوفی بن گئے ہیں کہ ان کے باپ دادا صوفی تھے، یہ عجیب مسلک ہے جس میں مال و دولت کے ساتھ ساتھ تصوف اور تقدس بھی ترکے میں ملتا ہے۔ لائق اسلاف کی گدیاں نالائق اخلاف کو مل گئیں، نتیجہ ظاہر ہے، عمل کا یہ حال ہے کہ بعض سجادہ نشیں پانچ وقت کی نماز تک نہیں پڑھتے اور جو پڑھتے بھی ہیں تو حجروں میں یا بالفرض مریدان کعبۂ معظمہ میں مسجدوں میں جماعت کے ساتھ شاید سیکڑے میں ایک نماز پڑھتے ہوں، زکوٰۃ دینے کی عادت نہیں کیونکہ الٰہی کی زندگی کا دارومدار زکوٰۃ اور صدقہ لینے پر ہے، نہ کہ دینے پر باوجود استطاعت کے اکثر حج نہیں کرتے، الغرض ارکانِ اسلام کی تعمیل بہت کم کرتے ہیں اور نواہی سے

احتراز کرنے کی بہت زیادہ کد نہیں رکھتے۔

ایسی حالت میں تصوف کا دعا مذاق نہیں ہے تو کیا؟ اس سے بڑھکر شریعت کی توہین اور کیا ہو سکتی ہے؟ اسلام کے مخالف ہر زمانہ میں رہے اور رہیں گے، مگر سب سے بڑا دشمن اسلام وہ ہے جو اسلام کے نام سے اسلام کی عزت خاک میں ملانا چاہتا ہے، خدا اور رسول کی ناقدری کرتے ہوئے ہر وقت موجود تھے اور رہیں گے، لیکن اس سے بڑھ کر ناقدری اور بے حرمتی کیا ہوگی کہ خدا اور رسول کے نام سے خدا و رسول کے احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

خداوند کریم تصوف اور تقدس کو موروثی چیز نہیں سمجھتا، اس کا فرمان عالی یہ ہے "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ" (یعنی بیشک تم میں سب سے زیادہ عزت دار خدا کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے) خوف خدا علماء (یعنی علماء باعمل) ہی کو ہوتا ہے، جاہلوں کو نہیں ہوتا، جیسا کہ کلام مجید میں ہے "اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا" (یعنی خدا سے اُس کے بندوں میں علماء ہی ڈرتے ہیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عالم کی معمولی عبادت کو جاہل کی شب بیداری پر فوقیت دی ہے، آپ نے علم و عمل دونوں کو مسلمانوں کیلئے ضروری قرار دیا ہے، آپکا ارشاد ہے "العلم بلا عمل کشجر بلا ثمر" (یعنی علم بغیر عمل کے ایک ایسا درخت ہے جس میں پھل نہیں) آپنے علم بے عمل کو وبال قرار دیا ہے۔ پس اکثر مرشدانِ ہند در اصل صوفی نہیں ہیں بلکہ متصوف ہیں، وہ تعلیم اسلام کی رو سے ادنی درجہ کے مسلمان بھی مشکل سے ہونگے راہ طریقت کیا خاک دکھائیں گے؟

نمبر ۵۔ زیارت قبر زیارت قبر یا فاتحہ خوانی کا مقصد اسلام کی تعلیم کے مطابق یہ ہے کہ جو مسلمان بھائی بھی دنیا سے گذر گئے ہیں ان کا ذکر خیر کیا جائے، ان پر رحمت خدا نازل ہونیکی دعا کیجائے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے آنیوالے وقت (موت) کو بھی یاد کیا جائے، مگر آجکل مقصد بدل گیا ہے، آپ مقبروں کی سیر کریں خاصکر اولیاء اللہ کے مزاروں پر تشریف لیجائیں تو عجب نظر آنکھوں کو سامنے آئیگا۔ قبر پرستی یا بت پرستی کا پورا سماں آپکے سامنے کھچ جائیگا۔ جس طرح مندر والا اپنے بتوں کی زینت و آرائش میں مشغول رہتا ہے، پھول چڑھاتا ہے، سٹھائیاں نثار کرتا ہے، اسی طرح مجاور قبروں کی سجاوٹ اور آراستگی میں اہتمام کرتا ہے، پھول بھی چڑھاتا ہے اور سٹھائیاں بھی نقسیم کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ رسوم (جو آجکل پیر پرستی کا جزو لاینفک ہو گئی ہیں) اسلامی ہیں؟ کیا اب سے اسلام میں صوفیوں یا عام مسلمانوں کو ہاتھ ان بدعات و لغویات سے کبھی بھی آلودہ ہوئے تھے؟ اور تماشا یہ ہے کہ جس طرح ایک پجاری بت کے سامنے عقیدت مندانہ کبھی کھڑا ہوتا ہے کبھی بیٹھتا ہے، کبھی سجدہ کرتا ہے، بت کو ہاتھ سے چھوتا ہے، آنکھوں سے لگاتا ہے اور منہ سے چومتا ہے۔ اسی طرح ایک زائر قبر کے سامنے پیش آتا ہے۔ زیارت کا مقصد ملاحظہ فرمائیے:۔ کوئی مزار پر بچہ مانگنے کے لئے جاتا ہے، کوئی روزی طلب کرنے کیلئے، کوئی مرض کی شفا وہاں تلاش کرتا ہے۔ لبِ مقدمہ کی جمیت وہاں جاتا ہے الغرض مختلف لوگ مختلف مرادیں مانگتے جاتے ہیں اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ ان بزرگان دین نے جس ہستی سے برابر مانگا (یعنی خدائے پاک سے) اسی سے تم کیوں نہیں مانگتے ہو تو وہ یہی جواب دینگے کہ ہم دنیا دار گنہگار خدا کے ہاں براہ راست نہیں جا سکتے اسلئے ان بزرگوں کے ذریعہ سے مرادیں طلب کرتے ہیں، اگر آپ ان سے کہیں کہ یہ بزرگان دین اب زندہ نہیں ہیں بلکہ خدائے پاک کے ارشاد "اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ" (یعنی تو مرنے والا ہے) اور وہ لوگ مرنے والے ہیں) کے مطابق وہ مر گئے ہیں تو وہ کبھی یقین نہیں کرینگے اور یہی کہے جائیں گے یہ لوگ غیر فانی ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ تعجب ہے کہ خدا اپنے پیغمبر کو فانی قرار دیتا ہے اور مرید سب اپنے پیروں کو غیر فانی، نعوذ باللہ، کیا پیروں کا درجہ پیغمبروں سے بلند ہے؟ یہاں ایک واقعہ یاد آیا مولوی غلام محمد صاحب مثنوی مرحوم سفیر ندوۃ العلماء ایک موقع پر بڑودہ میں نواب رالدین صاحب مرحوم کے مہمان تھے، نواب صاحب کے مذہبی گفتگو کے دوران میں چند معزز یمنی حاجیوں سے سفیر ندوہ کے سامنے یہ سوال کیا کہ "رسول اللہ بڑے ہیں یا پیر صاحب" تاجروں کا متفقہ جواب یہ تھا "پیر صاحب بڑے ہیں کیونکہ رسول اللہ کا ختم سال میں ایک بار ہوتا ہے اور بڑے پیر صاحب کا ہر مہینے (گیارہویں)"۔ خدا مسلمانوں کی اصلاح کرے،

اب قارئین کرام فرمائیں کہ کیا اس قسم کی روحانی تعلیم خدا و رسول کے احکام کے مطابق ہے؟ یہی وجہ ہے کہ ہمارے آقائے نامدار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر پختہ بنانے سے منع فرمایا، آپ کو یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ بعد کو آنے والے مسلمان اپنے بزرگوں کو ضرورت سے زیادہ درجہ دیکر یہود یوں اور عیسائیوں کی طرح ایک رب العالمین کو چھوڑ دینگے اور بہت سے "ارباب" کے قائل ہو جائیں گے۔ اور رفتہ رفتہ قبر پرستی کی شکل میں بت پرستی پھر نمودار ہو جائے گی۔

نمبر ۶۔ تعلیم و تعلم اسلام نے تعلیم و تعلم تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔ تمام مسجدیں اور عبادت خانے کم و بیش تعلیم گاہیں ہیں، جہاں مسلمان لڑکے اور لڑکیاں بے دھڑک علم حاصل کرنے کے لئے جاتی رہیں۔ پہلے بزرگان دین اور صوفیا کرام کے مکانات بھی مرکز علم ہوا کرتے تھے۔ ہر عالم و صوفی اپنے وقت کا کافی حصہ اشاعت علم اور ازالہ جہالت میں خرچ کرتا تھا، وہ تعلیم و تعلم کو اپنی زندگی کا ایک فریضہ سمجھتا تھا۔ اور اس کیلئے جائداد یں وقف کرتا تھا۔ علمی مذکرے اور تعلیمی مباحث کسی طرح عبادت سے کم نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ ایک دن مسجد تشریف لے گئے

ایک جماعت کو عبادت و ریاضت میں مشغول، اور ایک جماعت کو علمی تذکروں میں مصروف پایا، آپنے فرمایا کہ دونوں جماعتیں کارِ خیر میں لگی ہوئی ہیں، مگر میں علمی محفل کو ترجیح دیتا ہوں، چنانچہ آپ دوسری جماعت کے ساتھ شریک ہوگئے۔ پس استطاعت رکھتے ہوئے تعلیم و تعلم سے منہ موڑنا یا اشاعت علم کی مخالفت کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ کیونکہ تمام امراض کی جڑ جہالت ہے اور تمام محاسن کا سرچشمہ تعلیم۔

آجکل پیر و مرشد صاحبان تعلیم پھیلانے میں بہت سست ہیں، اور باوجود اوقافِ موروثی کے مسلمان بچوں اور بچیوں کی تعلیم و تربیت میں بہت کم خرچ کرتے ہیں۔ بجز معدودے چند اکثر پیروں کا خیال ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم عام ہونے سے ان کا بازار سرد ہو جائے گا۔ اور ان کی آمدنی گھٹ جائیگی لوگ جب خدا اور رسول کو پہچاننے لگیں گے اور قرآن و حدیث سے واقف ہو جائیں گے تو سیروں کے دام بلا میں گرفتار کم ہونگے۔ اگر ہر شہر یا قصبہ کا پیر اوقاف کی آمدنی سے مخلصانہ طور پر ایک تعلیم گاہ کھولدے تو میری رائے میں ایک مسلمان بھی جاہل نہیں رہیگا، اور مسلمانوں کا مستقبل شاندار ہو جائیگا۔ آخر پیر صاحبان کو خیال کرنا چاہیے کہ جہالت بہت بُری بلا ہے۔ ع کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

نمبر ۷۔ تبلیغ اسلام

اسلام نے تبلیغ اسلام کو مسلمانوں کے لئے فرض کفایہ قرار دیا ہے، خداوند کریم کا فرمان ہے "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (ترجمہ:۔ اور چاہیئے کہ تم لوگوں میں ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف بلائے، بھلائی کا حکم کرے، اور بُرائی سے روکے) اوائل اسلام میں مسلمانوں نے عموماً اور صوفیاء کرام نے خصوصاً اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تبلیغ حق اور اشاعت مذہب میں گزارا، ہندوستان میں آج اسلام کی جو روشنی نظر آرہی ہے وہ لشکر جرار یا بادشاہ کرار کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ اللہ والوں کی مساعی جمیلہ کا صدقہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ بنگال جو عموماً مسلمان بادشاہوں کے صدر مقام (دہلی و آگرہ) سے آزاد رہا۔ وہاں مسلمانوں کی تعداد ۵۰ فی صدی سے زیادہ ہے، اور جہاں مسلمان حکمرانوں کا مستقر رہا وہاں مسلم آبادی ۱۵ تا ۲۰ فی صدی سے زیادہ نہ ہوئی۔ عام لوگ خواجہ معین الدین چشتی رح کے کرامات بیان کرنے میں رطب اللسان رہتے ہیں مگر ان کا سب سے بڑا احسان اور ان کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت بہت کم لوگ بیان کرتے ہیں، یعنی خواجہ صاحب رح کے ہاتھ پر ایک زبردست گروہ باطل پرستوں کا حق کی طرف مائل ہوا اور بہت بڑی تعداد میں گمراہ لوگ مسلمان ہوئے اور خدا کی روشنی سے منور ہوئے۔

اب موجودہ پیران ہند کا حال بھی ملاحظہ فرمائیے، اشاعت اسلام کا تصور بھی شاید ان کے دماغ میں نہ آتا ہوگا، غیر مسلموں کا مسلمان بنانا ایک طرف، وہ مسلمانوں کو غیر مسلم بنانے میں اُستاد ہیں۔ جہاں کسی نے حق بات ان کے خلاف کہی، اس کی تکفیر کا اعلان کر دیا گیا۔ ان کی زندگی کا مطمح نظر یہ ہے کہ مسلمانوں کو (خصوصاً جہلاء کو) کافی تعداد میں مرید کر لیا جائے اور اپنے سلسلۂ ارادت میں جکڑ دیا جائے۔ تاکہ ان کی رونق میں زیادتی ہو اور آمدنی میں اضافہ، وہ غیر مسلموں کے پاس اظہار حق اور اعلان کلمۃ اللہ کے لئے کبھی نہیں جائیں گے، وہ استطاعت کے باوجود اشاعت اسلام کو اپنے لئے بیکار اور غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہ کہہ کر قارئین کو غلط فہمی میں ڈالا جا سکتا ہے کہ اگر آجکل کے پیر و مرشد ترک تصوف کیوجہ سے صوفی نہیں ہیں تو عام مسلمان بھی ترک اسلام کے باعث مسلمان نہ رہے، پس مذکورہ بالا اعتراض کی وجہ سے عام مسلمانوں پر بھی وارد ہوتے ہیں، صرف پیران ہند سے مخصوص نہیں۔ ایسا کہنا ایک حد تک صحیح ہے، مگر ان دونوں کے درمیان جو فرق عظیم ہے اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے، عام مسلمانوں کی حالت جداگانہ ہے، اعتقاد کی حیثیت سے ہر شخص جو "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کہے مسلمان ہے اس کلمۂ طیبہ کے اقرار کے بعد کوئی طاقت اسے دائرۂ اسلام سے خارج نہیں کر سکتی، ہاں اگر کسی کے اعمال اچھے ہیں تو وہ اچھا مسلمان ہے اور اگر کسی کے اعمال بُرے ہیں تو وہ بُرا مسلمان ہے۔ اس کے مقابلے میں ہم یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ جو پیر و مرشد دین دار اور متقی ہو وہ اچھا پیر و مرشد ہے، اور جو فاسق و فاجر ہے وہ خراب پیر و مرشد ہے؟ فاسق صوفی نہیں ہو سکتا، پیر و مرشد ہونا اور فاسق و فاجر ہونا یہ دونوں متضاد الفاظ ہیں، جو کسی طرح یکجا جمع نہیں ہو سکتے، ایک گنہگار مسلمان ہو سکتا ہے، مگر ایک فاسق شیخ طریقت یا مہبر منزل نہیں ہو سکتا، رہنما کے بغیر چلنا بہ نسبت اس کے زیادہ محفوظ ہے کہ خطرناک رہبر کے ماتحت چلا جائے۔ عام مسلمانوں کی حیثیت انفرادی ہے ان کا خیر و شر ان کے ساتھ ہے۔ اور ثواب و عذاب کا تعلق صرف ان کی ذات سے ہے مگر رہبران شریعت یا مرشدان طریقت کی پوزیشن مختلف ہے، ان کے بننے سے قوم بنتی ہے اور ان کے بگڑنے سے قوم بگڑتی ہے، اگر وہی لوگ تعلیم اسلام کی مخالفت کرنے لگیں

یا عظمتِ اسلام کی ہیٹکی کرنے لگیں یا اپنی زندگی کا نمونہ قوم کے سامنے مکروہ شکل میں پیش کرنے لگیں تو پھر کشتیِ اسلام کا خدا ہی حافظ،

ع چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

خاتمہ

میں خالصۃً لِلّٰہ حاملانِ لواء طریقت کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ وہ مندرجہ بالا باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کریں، اور تمام مشرکانہ رسوم اور جاہلانہ بدعات کو مٹانے کی کوشش کریں، میرا مدعا حاشا و کلا اُن کی عظمت گھٹانا نہیں ہے بلکہ اسلام کی عظمت قایم رکھنا ہے، میں تمام صوفیانِ باصفا کی بزرگی کا قائل ہوں مگر خدارا مجھے کوئی بتائے کہ انہوں نے یہ کہاں لکھا ہے کہ ہمارے مرنے کے بعد ہمارے جسم کو قبلۂ حاجات اور مزار کو حرم پاک سمجھا جائے، کیا مسلمانوں کو یہ نہیں معلوم کہ ان کا خاکی بدن خاک سے مل گیا ہے اور ان کی روح عالم ارواح میں پہونچ گئی ہے، پھر مزار کی مشرکانہ تعظیم کیوں کیجاتی ہے، بعض لوگوں کو یہ دھوکے میں رکھا گیا ہے کہ پیر و مرشد مرے نہیں ہیں بلکہ ہمیشہ زندہ ہیں، اور دلیل میں یہ پیش کرتے ہیں کہ خدائے پاک نے قرآن مجید میں بعض برگزیدہ ہستیوں مثلاً شہداء وغیرہ کو زندہ کہا ہے، حالانکہ ان آیتوں کا لفظی ترجمہ مقصود نہیں ہے بلکہ اصلی مفہوم مطلوب ہے۔ یعنی اُن کی شہرت زندہ ہے، اُن کی عظمت غیر فانی ہے اور اُن کے کارنامے ہمیشہ کی یادگار ہیں، نہ یہ کہ ان کا جسم زندہ ہے، ان کا گوشت پوست غیر فانی ہے اور ان کی ظاہری حیات دائمی ہے، اور اگر یہی مانا جائے کہ وہ اسی معنی میں زندہ ہیں، جس معنی میں ہم زندہ ہیں اور ان کا جسم اور ان کا گوشت پوست غیر فانی ہے، تو بھی یہ سمجھنے کی بات ہے کہ وہ اپنی ابدی زندگی کے دن قبر کی تاریک کوٹھریوں میں نہیں کاٹ رہے ہیں، بلکہ وہ اپنے رب کے پاس ہیں وَعِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ (اور وہ اپنے رب کے پاس روزی پا رہے ہیں)

اختتام مضمون پر یہ لکھنا ضروری ہے کہ تصوف کا سرچشمہ طریقت کا منبع اور روحانیت کا مخزن ہمارے آقائے نامدار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔ آپ سب سے بڑے صوفی، سب سے بڑے مرشد اور سب سے بڑے رہبر تھے۔ مگر آپ کی حالت کیا تھی؟ آپ دیندار بھی تھے، دنیادار بھی، عبادت گذار بھی تھے عیالدار بھی، خدا کو بھی یاد کرتے تھے اور قوم کو بھی، آپ کو اپنے خالق کی خوشنودی کا بھی خیال رہتا تھا اور اُمت کی اصلاح کا بھی، جنگ بھی کرتے تھے صلح بھی، مذہبی تذکرے بھی کرتے تھے سیاسی مشورے بھی، حکمرانی بھی کرتے تھے گلہ بانی بھی، خلاصہ یہ کہ آپ تمام کاموں میں جو انسان کے لئے انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے ضروری اور مفید ہیں بنفس نفیس حصّہ لیتے تھے، آپ کے صحابہ کرام ہمیشہ آپ کے نقش قدم پر چلے اور دین و دنیا اور ظاہر و باطن دونوں کا خیال کرتے رہے۔ کیا وجہ ہے کہ آجکل پیرانِ ہند اپنے سردار (روحی فداہٗ) کے اسوۂ حسنہ کو اپنی زندگی کی دلیل راہ نہیں سمجھتے؟ یہ کہاں کا تصوف ہے کہ خود قوم سے الگ رہیں اور قوم کو امراض کی خبر نہ رکھیں اور پھر قوم کی روحانی اصلاح کا دم بھرتے رہیں، یہ کیسی طریقت ہے کہ خود کشمکش حیات سے منہ موڑ لیں اور سکون کی ساٹھ تجریدیشن میں اور امت مرحومہ زندگی کے آخری وقت سے گذر رہی ہے، اصلاحِ قوم خواہ ظاہری ہو خواہ باطنی اعلانیہ اور رگذر عام پر ہونی چاہئے، نہ کہ پوشیدہ اور منزل خاص پر، پس سجادہ نشینان ہند کو چاہیئے کہ وہ اپنے حجروں سے نکل آئیں اور قوم کی مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی علمی، اور تعلیمی اصلاح کے لئے کوشش کریں۔ وما علینا الا البلاغ۔

بلاغ

جو صوبہ بہار کا علمی، ادبی، و مذہبی جریدہ ہے ہر مہینہ کی پندرہویں تاریخ کو التزام سے شایع ہوتا ہے، یہ پرچہ علم دوست حضرات کی خاص توجہ کا مستحق ہے۔ اسلئے یہ علمی اور ادبی معلومات کا صحیح ترجمان اور مذہبی مسئلوں کی عقدہ کشائی میں صوبہ بہار کا واحد رہنما ہے۔ چندہ سالانہ صرف ۲ فی پرچہ ۳

المشتہر:۔ حافظ سید محمد ظفیر۔ سعدیہ پریس، گھسیاٹولہ۔ پٹنہ

"اقبال کی شاعری"

مرتبہ

جناب عبدالمالک صاحب آروی

پر

دیوجانس بہاری کی ایک نظر

علامۂ عصر جناب عبدالمالک صاحب آروی ان مشاہیر علماء اور اکابر فضلاء میں ہیں جن پر نہ صرف ہمارے صوبہ بہار کو ناز ہے بلکہ دوسرے صوبے ادبا و شعراء ان کی روح پرور علمی صحبتوں میں شریک ہو کر عزت و افتخار حاصل کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو "خواب کی دُنیا" میں مش لفظ از ادیب عصر حضرت نیاز فتحپوری) ملک کی کجفتاری اور عاشقان علوم و معارف کی ناقدردانی کے سبب سے گو وہ اپنی حیثیت سے فروتر ملازمت میں مشغول اور پراگندہ خاطر رہتے ہیں مگر اپنی طبیعت نے "تخلیقی رجحان"[1] (Productive) اور "ذوق و وجدان (intulton)" کے باعث غیر معمولی علمی احساس فریضہ (Sense of Duty) رکھتے ہیں، اسی لئے فروتر ملازمت کی خشکی اور بیزاری سے ذہنی تشاؤم میں مبتلا ہونے یا ایک علیحدہ (isolated) زندگی بسر کرنے کے بجائے اپنی "نفسیاتی احتیاجیت (Psychological Heponism)" سے کام لیکر اور میکڈوگل (یا میکڈوگل) کے "اصول عمل (Theories of action)" پر کارفرما ہو کر "حدیث و انساب، شعر و ادب، تاریخ و تنقید، فلسفہ و تصوف، لسانیات و نفسیات، نجوم و مصوری" کی علمی خدمت کرتے رہتے ہیں، اس میں ان کی غرض کوئی شخصی "شہرت و نمود" اور "ذاتی تشخصات و امتیازات" نہیں، بلکہ اپنی تخلیقیت (Originality) اور "تبعیت (Suggestibility)" سے نہ صرف ریسرچ، تحقیق، تنقید اور تبصرہ کی "لطیف تصوریت (Transcendental idealism)" پیش کرنا چاہتے ہیں، بلکہ بہار کے "جمود و تعطل" اور اس کے ارباب علم کے "سکر و خمول" کو دُور کر کے اس کی علمی زندگی کا "دور نہضت (Renaissance)" پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ نہ صرف ان کے بلکہ بہار کے نام میں "چار چاند" لگ جائیں گے، چنانچہ اب علامہ ممدوح نے بلند پایہ رسالوں میں مضمون نگاری کی "فلسفیانہ نکتہ سنجی" اور "محققانہ دقت پسندی" سے علیحدہ ہو کر ایک "ادارۂ نشر و اشاعت" قایم کیا ہے جس کا نام شاید "کیٹس" یا "گوئٹے" یا "فریڈرک دی گریٹ" یا "ونسنٹ" یا "سپینوزا" یا "شوپنہار" یا "ڈیکارٹ" یا "سوفقلس" یا "ٹامس ویٹاکر" یا ممکن ہے "ابن سینا" "ابن باجہ" "فارابی" "ابن عربی" "ابوالعلاء معری" کی کسی اصطلاح سے مستعار لیا گیا ہے، ورنہ ہم جیسے طلبہ معنی کے لحاظ سے اس ترکیب میں کوئی "توفق و ربط" یا "مرابطت" نہیں پاتے، پٹنہ یونیورسٹی کے اساتذہ نے ہم کو طاق ابرو، طاق ایوان، طاق بل، طاق خضرا، طاق مدقی، طاق نگون، طاق مزار، طاق طارم، طاق فیروزہ، طاق کلی، طاق لاجوردی، طاق مقرنس، طاق نیلوفری، طاق نیم خایہ، طاق شکرلبورہ اور طاق نسیان تو بتایا ہے، مگر طاق بستان نہیں بتایا، اور وہ بتاتے کیسے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بستان (باغ) میں طاق (محراب) نہیں ہوتا ہے، ممکن ہے کہ کاتب نے طاق نسیان کو طاق بستان لکھ دیا ہے، تو پھر کسی اعتراض کی گنجایش نہیں، اور اگر واقعی طاق بستان ہے تو "ارسطو" جس کی طرف "فلسفہ مشائین" منسوب ہے یا "زینو" جو فلسفہ "اشراقیون" کا بانی ہے۔ یا

---

[1] داوین اور نوٹس میں لکھے ہوئے الفاظ اور جملے علامہ موصوف کے ہیں جو راقم السطور نے بطور استفادہ جابجا استعمال کئے ہیں۔

"قارنیادس" جو "فلسفہ شکلیین" کا موجد ہے - بیسویں صدی میں ہوتا تو طاق بستان کو کسی علمی ادارہ کا نام نہ سمجھتا بلکہ "گاتھک فن تعمیر" کی کوئی اصطلاح تصور کرتا، البتہ "ڈی ولف" ہوتا تو ممکن ہے کہ اس کو "مستیقین (Sehoolostics)" کا ادارہ سمجھتا، مگر ہم بہاریوں کو عموماً نام سے کم اور کام سے زیادہ غرض ہوتی ہے اسلئے بہار کی نجر اور شور زمین میں ایک "ادارۂ نشر و شیوع" کا قایم ہوجانا ہی ہمارے "فخر و ابتہاج" کے لئے کافی ہے، اور جس طرح اہل یونان ارسطو کی اکاڈمی سے مستفیض ہوتے رہے تھے، اسی طرح ہم کو امید ہے کہ طاق بستان کے علمی "مہبط انوار کی مختلف کرنوں" سے ہمارا دل منور اور دماغ روشن ہوتے رہیں گے -

ابھی طاق بستان کو قایم ہوئے کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ہمارے "فخر و ابتہاج کی کوئی حد" نہ رہی، جب اس کی طرف سے علامہ ممدوح کا ایک بے مثل مقالہ "اقبال کی شاعری" کے عنوان سے شایع ہوا - جس میں نقاد ان فن کی رائے ہے کہ "الغزالوس" کی طرح "جذبات کی اثیریت" "دیاغنوس" کی طرح "امتزاز فکر" "قارنیادس" کی طرح "طرز استدلال" اور "فلاطینوس" کی طرح "فلسفیانہ نکات" اور "بقاط اٹیس" کی طرح "منطقیانہ رموز" ہیں، کتاب کے ان ہی "غیر ارادی محاسن کی جلوہ ریزیوں" کے باعث پٹنہ یونیورسٹی کے اُردو کے ایم اے کورس میں داخل ہوگئی ہے جو ہم بہاریوں کے "سکر و خمول" کے علیحدہ ہونے کی پہلی دلیل ہے - کیونکہ یہ ایک بہاری کی پہلی کتاب ہے جو اُردو کے نصاب میں داخل ہوئی ہے - "یہی کیا کم فخر کی بات ہے -"

"ہیگل" اور "برگسان" کی تقلید و تتبع کرتے ہوئے علامہ موصوف نے اقبال کے فلسفہ شاعری کے "غوض و دقایق" کی "تنقیح و تحلیل" کر کے اور اپنے "دلنواز ادب و انشار" کے "اخراعات فایقہ" اور "رشحات فکر" کی "ایجادات رائقہ" سے اپنی ذات بابرکات کو آیندہ نسل کے "تاثرات و تہیجات" پر تو "مرتسم" کرلیا ہے، مگر اقبال کی شاعری کی "گہری معنویت" اور "سنگین حقیقت" کو سمجھانے کی جو "عالمانہ کاوشیں" کی ہیں یا ان کے اسلوب انداز بیان میں اقبال کی ذات سے جو "دلولۂ ارادت کی کارفرمائیاں" ہیں یا مقالہ میں شروع سے لیکر آخر تک جو ان کے "تصورات کی بلندی، تخیل کی نزاکت، بلیغ معنی آفرینی اور فلسفیانہ نکتہ سنجی" ہے یا ان کے "معتقدات کے ماتحت غیر ارادی بلکہ غیر شعوری طور پر جو رفعت خیال متمایز" نظر آتی ہے - ان کی بنا پر راقم السطور اپنا ایک علمی "احساس فریضہ" سمجھتا ہے کہ ایم اے کے طلبہ کے لئے زیر نظر رسالہ پر تمام مشکل اور پیچیدہ سوالات کے جوابات لکھدے تاکہ امتحان میں شریک ہونے والوں کیلئے یہ رسالہ "ارسطو کی ارغنون" یا "فارفیری کی ایساغوجی" یا "سیوڈوڈیانوسیس" کی تصانیف کی طرح ایک عقدۂ لاینحل نہ رہ جائے، اگر یہ کام علامہ ممدوح کی حیات مستعار میں طے پا گیا تو نہ صرف میکڈوگل کی اس بحث کی تکمیل ہوجائے گی جو اس نے "جبلت عایلہ (Family instinct) (Ancestor worship)" کے سلسلہ میں "اسلاف پرستی" پر کی ہے بلکہ علامہ کی موجودگی کی وجہ سے جو "ہماری خوش قسمتی سے شعور و ذوق کے لحاظ سے اسی عہد کے پیدا وار ہیں" ان کے مقالہ پر تنقیدی نظر ڈالنے میں نہ "مرفوضات" نہ "زمان و مکان کے بعد" اور نہ "ظن و اعتبار" کا کوئی جھگڑا باقی رہیگا -

پہلا سوال علامہ ممدوح کے الفاظ میں یہ ہوسکتا ہے "اقبال کی شاعری اردو شعرار کے کس دور سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی میں کتنے قدیم عناصر ہیں" علامہ موصوف نے یہ سوال قایم کر کے خود ہی جواب لکھنے کی کوشش کی جو طلبہ کی سہولت کے لئے اختصار کے ساتھ ذیل میں درج ہے :

"مولانا محمد حسین نے اُردو شاعری کے پانچ دور قایم کئے ہیں - اول ..... دوم ..... سوم، تحقیق و نظر نے اب یہ بات پایہ ثبوت تک پہونچا دی کہ ولی اُردو کا پہلا شاعر نہ تھا، قایم کے نزدیک عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ریختہ کو بہت زیادہ رواج ہوا - مولانا عبدالحق صاحب کو اس پر اعتراض ہے، مگر ان کا اعتراض بے محل ہے - قایم نے اُردو کا سب سے پہلا شاعر سعدی کو بتایا ہے قایم کا مطلب سعدی سے سعدی شیرازی ہے - مگر میر تقی نے اس کی تردید کی ہے - دکھن میں کوئی سعدی تھے جو ریختہ کہا کرتے تھے، قایم نے اُردو شاعری کے تین طبقات قایم کئے ہیں - اول .... دوم ..... سوم، صفیر بلگرامی نے بھی دکنی شعرار کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے، محمد حسین آزاد نے پانچ دور پر اُردو شاعری کو ختم کیا ہے، مگر دور اول کے متعلق ان کی رائے ساقط الاعتبار ہے، حالی کو غالب کی ماقیاۃ الصالحات میں گنا جاسکتا ہے - وہ ایک جدید اسکول کے بانی ہیں، اور یہیں سے اس کا عہد نہضت شروع ہوتا ہے، ان کی مسدس اُردو زبان کا ایک غیر فانی شاہکار ہے، یہ حالی ہی کا

فیض تھا کہ اس نے اُردو زبان میں اکبرالہ آبادی جیسا نادرالوجود شاعر پیدا کیا، اسمٰعیل میرٹھی وغیرہ اسی سلسلۂ ارتقا کی کڑی ہیں، حالی کے بعد اُردو شاعری نے کوئی انقلابی صورت اختیار نہ کی، ہندوستانیوں نے مغرب کی تقلید میں اپنا مشرقی ناموس کھو دیا، اب ضرورت تھی کہ کوئی پیمبر سخن پیدا ہو، چنانچہ قدرت نے اس کے لئے اقبال کا انتخاب کیا "

طلبا نے اقبال کی شاعری کے قدیم عناصر کے اجزائے ترکیبی کی تحلیل و تنقیح میں یہ مربوط، مرتب اور مدلل جواب سپرد قلم کیا تو علی گڈھ یونیورسٹی کے پروفیسر رشید احمد صدیقی ممتحن ہوئے تو وہ خوش ہونگے کہ ان کو ریڈیو پر ایک تقریر کرنے کے لئے مواد مل گیا۔ یا ڈاکٹر عبدالحق (انجمن ترقی اردو) ممتحن ہوئے۔ تو ان کو مسرت ہوگی کہ رسالہ اُردو کے اقبال نمبر میں ایک اہم موضوع رہ گیا تھا، جو الحمدللہ علامہ عصر عبدالمالک آروی کے مقالہ اقبال کی شاعری سے پُر ہو گیا، یا پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سچتانند سنہا ممتحن ہوئے تو ان کے "فخر واحتیاج" کی کوئی انتہا نہ ہوگی کہ ان کی یونیورسٹی کے طلبا کے جوابات کا معیار کس قدر بلند ہو گیا ہے "

اس کے بعد علامہ ممدوح نے دوسرا سوال پھر خود ہی قایم کیا ہے کہ "اقبال کی شاعری کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟" مولانا نے اس کا جو جواب لکھا ہے، اس کا خلاصہ ان ہی کے الفاظ میں ہم پیش کرتے ہیں۔

(۱) نہ تو فارسی میں اقبال کے رنگ کا کوئی شاعر پایا جاتا ہے اور نہ اُردو میں ان سے قبل کوئی اس انداز کا شاعر گذرا ہے۔

(۲) اُردو میں وہ حالی اسکول کی پیداوار ہیں، یقیناً حالی، اسمٰعیل میرٹھی، اور اکبرالہ آبادی کے تاثرات سے بڑی حد تک اثر پذیر ہیں،

(۳) ہندوستان کا کوئی ایسا نظم نگار نہیں جس کے افکار شعریہ کی تنقیح و تحلیل کی جائے تو اس کا انتساب حالی اسکول سے نہ ہو، پھر بھی اقبال اپنی نظیر آپ ہیں۔

(۴) اقبال نے فارسی شعرا بالخصوص صوفیانہ شاعری سے بڑی حد تک استفادہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سنائی، عطار رومی اور خاقانی کا نام لیا جا سکتا ہے،

(۵) ان کی شاعری پر زبان فارسی کے اور ہندی اور ایرانی شعرا کا بھی اثر پڑا ہے، مثلاً حافظ، صائب، طالب، آملی، بیدل وغیرہ کا کلام بھی ان کے زیر مطالعہ رہا ہے،

(۶) انگلستان اور جرمنی کی شاعری نے ان پر گہرا اثر کیا ہے، لانگ فیلو کی اخلاقیات، ورڈسورتھ کی راہبانہ اور صوفیانہ نگارش، کیٹس کی عشقیہ اور دل فروشانہ آہنگ اور گوئٹے کے فلسفیانہ اور متین پیام و تلقین نے اقبال کو اثر پذیر کیا،

(۷) اقبال یورپ کے قدیم و جدید فلسفہ سے متاثر ہیں، انہوں نے اسپینوزا، افلاطون، نطشے اور ہیگل کا مطالعہ کیا ہے چینی فلاسفر ورہما کا نیشوس کی تعلیمات ان کی نظر سے گزری ہیں۔

(۸) وہ ہیگل اور برگسان کی طرح فلسفہ کے غموض و دقایق بیان کرتے ہیں،

(۹) ابن عربی، سنائی، رومی اور عطار کی طرح اسرار و نکات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

(۱۰) اقبال نے رومی کا مطالعہ مریدانہ اعتقاد سے کیا تھا، اور وہ رومی کو اپنا روحانی رہبر سمجھتے تھے،

(۱۱) حضرت حسان اور ابن رواحہ کی طرح ان کا موضوع شعر مسلم قوم، ممالک اسلامیہ، نبی اسلام اور شان اسلامی ہے۔

(۱۲) اقبال خاقانی سے متاثر تھے،

(۱۳) اقبال نے بیدل کا بھی مطالعہ کیا اور ان کی تقلید و تتبع کی سعی کی، لیکن بیدل کے تصورات کی بلندی، تخیلی نزاکت، بلیغ معنی آفرینی، اور فلسفیانہ نکتہ سنجی اس سطح کی چیز نہیں کہ ہر شخص آسانی سے اس کی تتبع کر سکے،

(۱۴) اقبال نظامی سے بھی متاثر تھے۔

(۱۵) اقبال کی شاعری پر عربی ادب کا اثر نہیں، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہمارے شاعر نے عربی زبان کی طرف توجہ نہ کی،

(۱۶) ان کے کلام پر کبھی ابن عربی اور رومی کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔ ان کی نظم "تقدیر" ابن عربی ہی سے ماخوذ ہے،

(۱۰) اقبال شاعر ہیں میر رضیا کی طرح، ان کے کلام میں درد و الم کی چاشنی ہے،

اس جواب میں تضاد اور تناقض صرف پیدا ہو گئے ہیں، مگر انگلستان کا کوئی "ڈکٹور" ممتحن ہو تو طلبہ کی کثرت مطالعہ، وسعت نظر اور عالمانہ بلکہ "شاعرانہ تخیل نگار" سے متاثر ہو کر امید ہے کہ پورا نمبر دے گا۔

آگے چل کر علامہ اجل نے "اقبال اور اسلامیات" اور "اقبال کے بین الاقوامی تاثرات" کی جلی سرخیاں قایم کی ہیں، مگر طلبہ خوش ہوں گے کہ جس طرح ویسٹر مارک اپنی کتاب اخلاقی تخیلات کی ابتدا اور نشو و نما (The origin and Development of The moral idea) اور پروفیسر کاڈل نے اپنی تصنیف شوپنہار کا نظام اپنی فلسفیانہ اہمیت میں (Schopenhauer's system in its philosophical significance) یا ہڈسے نے اپنی کتاب فلسفۂ برگساں (The philosophy of Bergson) میں بعض مباحثات کو مختصر طور پر لکھ کر آگے بڑھ گئے ہیں، اس طرح ہمارے علامہ مدفوضہ نے بھی مذکورہ بالا بحث پر ایک سرسری نظر ڈال کر کے "جادۂ پیما" ہو گئے ہیں، تاکہ ان کے "افکار و تصورات" اقبال کی شاعری کے اہم پہلو کو واضح کرنے کے لئے محفوظ اور مصئون رہیں؛

اس کے بعد علامہ مذکور کے رسالہ کا وہ باب آتا ہے جس کو میکس مولر کی اصطلاح میں علمی Psycho-metry اور Fichte کے الفاظ میں Quantum of Reality یا مہدی مرحوم کے لفظ نظر سے ادب العالیہ کہا جا سکتا ہے، مگر جس طرح کینٹ نے بعض حقایق کو حسی اور بدیہی (Anodictic) سمجھ رکھا ہے، اسی طرح علامہ موصوف نے اقبال کے اصلی فلسفہ خودی اور رموز بیخودی کو اظہر من الشمس سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے، اور مشہور سائنس دان آئنسٹائن کے نظریۂ اضافیت کی طرح اقبال کے فلسفہ کے اجزائے ترکیبی میں یونانی فلسفہ، عربی فلسفہ، یہودی فلسفہ اور یورپین فلسفہ میں جو "مراجلات" ہے اس کو دکھانے کی کوشش کی ہے، البتہ ہیگل، برگساں اور شتلر کی طرح نفس موضوع کے پابند تو نہ ہو سکے ہیں لیکن ہوب ہوس کی طرح جو اپنی ضخیم تصنیف اخلاق ارتقا میں (Morals in Evolution) کی باعث حیات جاوداں کا مالک ہو چکا ہے، علامہ ممدوح نے بعض مباحث ایسے پیدا کر دئے ہیں جن کا تعلق گو ان کے موضوع سے نہ ہو لیکن ایم۔ اے کے طلبہ میں "فلسفیانہ عمق نظر" اور "حکیمانہ رفعت خیال" "جاری و ساری" کرنے کے لئے کافی و شافی ہے، تاکہ وہ اپنا ذہنی جمود و تعطل دور کر کے "نیوی" کی اصطلاح میں "Representative Thinker" ہو سکیں۔

اس باب میں علامہ عصر نے جا بجا سوالات قایم کئے ہیں، ہم محض طلبہ کے مفاد کی خاطر ان کے جوابات حتی الوسع سلیس اردو میں لکھ دیتے ہیں، تاکہ مولانا کے حقایق و دقایق کو آسانی سے سمجھ کر امتحان کے پرچوں میں لکھ سکیں،

سوال:۔ اقبال کی شاعری پر کس نظام فلسفہ کا اثر ہے؟

جواب:۔ "یہ نہایت اہم سوال ہے، ان کے افکار و تخیلات پر قدیم، وسطی اور جدید تینوں دور کے فلسفہ نے اثر کیا ہے، اس وقت یہ بتانا مشکل ہے کہ ادوار ثلاثہ کے مختلف اسکول کا تجزیہ کر کے یہ بتایا جائے کہ اقبال کو کس اسکول نے اثر پذیر کیا کیونکہ ابھی اپنے پرچے کے بہت سے سوالات لکھنے ہیں، پھر بھی مختصر "تینوں ادوار پر بحث کر کے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اقبال فلسفہ کے کس اسکول سے علاقہ رکھتے ہیں۔

عام طور سے فلسفہ قدیم سے فلسفہ یونان ہی مراد لیا جاتا ہے، اس فلسفہ کا بانی تھالیس ملطی تھا، مگر افسوس ہے کہ اس کے حال یعنی کا حال معلوم نہ ہو سکا، البتہ یہ معلوم ہوا کہ اس کے زمانہ میں ایک بہت بڑا سورج گرہن ہوا تھا، اس کے بعد فیثاغورث، یہ قلیطوس، زینوفنس کا زمانہ آتا ہے، ان میں سے ہر ایک مقررہ وقت پر اپنی اپنی موت سے مرتے گئے معلوم نہیں ان لوگوں نے کوئی اولاد چھوڑی کہ نہیں، اس دور کے بعد انغاغورس، دیاغنوس، اور اقلیدس ہوئے یہ سب تو قید میں شاید لٹا دئے گئے یا شاید جلا کر خاک سیاہ کر دئے گئے، ان کے بعد سقراط، افلاطون، ارسطو، فلاریداس، اور فلاطینوس ہوئے، یہ سب بڑے اچھے آدمی تھے، ان کے زمانہ میں فلسفہ کو بڑا فروغ ہوا،

عہد قدیم ختم ہوا تو عہد وسطی شروع ہوا، اسی زمانہ میں گوتھک طرز تعمیرات کا آغاز ہوا، اس عہد میں ایک اہم واقعہ ہے، اس دور میں بہت سے فلسفی گذرے جن میں ہر ایک بالکل بچے ہوئے تھے،

یہودی فلسفہ، عربی فلسفہ، ایرانی فلسفہ، عیسائی فلسفہ، تورانی فلسفہ، چینی فلسفہ، شامی فلسفہ، حبشی فلسفہ اسی عہد کے پیداوار ہیں، اس زمانہ میں یونانی سے شامی زبان میں بہت سی کتابیں ترجمہ کی گئیں، افسوس ہے کہ میرے پاس وقت نہیں ورنہ میں بتاتا کہ ایران اسکول اور شامی اسکول کو یونانی افکار نے کہاں تک اثر پذیر کیا تھا، مگر اتنا لکھے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں کہ عربوں کے فلسفیانہ تخیلات پر صرف شامی مسیحیوں کے یونانی فلسفہ نے اثر نہیں کیا ہے بلکہ عربی فلسفہ کے اجزائے ترکیبی میں ہندی، ایرانی، تورانی، چینی، جاپانی، ترکستانی، یونانی، مراکشی، مصری اور شامی افکار بھی شامل ہیں، عربی کے اکابر فلاسفہ کے نام یہ ہیں :- ابن مسکویہ، ابن سینا، غزالی، ابن ماجہ، ابن حزم ابن طفیل، ابن رشد وغیرہ، یہ سب کے سب اللہ والے تھے اور صوم وصلوٰۃ کے بیحد پابند تھے،

اس کے بعد وہ دور آتا ہے جس کو ہم دورِ جدید کہتے ہیں، اس عہد میں کینٹ، شوپنہار، ہیگل، ڈیکارٹ، سپینوزا، لیکلے، ہیوم ہوبسن، جان لاک، ایڈم اسمتھ، ہارٹلے، ڈارون، والٹر روسیو، کونٹ، اسپنسر، ہرمن لوٹز، ہارٹ مین، فریڈرک البرٹ اور مختلف ممالک کے مختلف شہروں اور مختلف قصبوں اور گاؤں کے مختلف مفکرین نے فلسفہ جدید کو چار چاند لگائے۔

مختصر یہ کہ اقبال نے فلسفہ کے ان تینوں ادوار کا مطالعہ کیا، اور انہوں نے اپنی شاعری شروع کی، شکوہ، جواب شکوہ، اور بانگ درا لکھی، مگر ان کتابوں میں گہرائی نہیں، کیونکہ ان کی شاعری پر اس وقت تک فلسفہ کا رنگ نہیں چڑھا، "اسرار خودی اور رموز بیخودی" میرے خیال میں یورپ کی تقلید کا نتیجہ ہیں۔ ان کتابوں میں تخلیقیت سے زیادہ میک ڈاؤگل کی اصطلاح میں تبعیت کا غلبہ ہے" (اطلہ قوسین کے سطور کو از بر کریں تاکہ اپنے پوچوں میں ان کو لفظ بہ لفظ نقل کر سکیں)

بال جبریل زاویہ نشینی کا نتیجہ ہے، مگر خوب چیز ہے، اس سے بڑھیا خدا کی قسم ضرب کلیم ہے، ضرورت ہے کہ اس کا ترجمہ ہر زبان میں ہو جائے"

- "اقبال اور سنگ" اور "موت" کیا کہتے ہیں" اس پر علامہ عبد المالک صاحب آروی کے طرز میں اقبال کی فلسفیانہ خیالات ملحقے
- زندگی اور موت ایسے مسائل ہیں جن پر فلاسفہ نے بہت کچھ پر فشانیاں کی ہیں، برگسان نے اس مسئلہ پر Soul and Rationality کی بحث میں خوب خوب جولانیاں دکھائی ہیں، اور وہ زندگی کو ظل معبود (!!!!) سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا، کینٹ نے بھی اپنی کتاب Critique of Pure Reason میں Solution of the Cosmological ideas with regard to the Totality of the Derivation of Cosmical events from their Causes کی بحث میں اس موضوع پر بہت ہی فاضلانہ تبصرہ کیا ہے، جس کو پڑھنے کے بعد عش عش کرنے کو جی چاہتا ہے، شوپنہار نے تو اس مسئلہ پر قلم ہی توڑ دیا ہے، وہ بڑا ہی انوکھا انسان گذرا ہے، عجیب غریب آدمی تھا، وہ فلسفہ کے ایک نئے نظام کا بانی ہے، اس نے تصوریت (Idealism) نظریہ علم (Theory of knowledge) اور جبریت (Determinism) (Positivism) اور انسان کی غلامی کے سلسلہ میں ثنویت آرٹ، اخلاق، مذہب، اور مابعد الطبیعات کے متعلق بالکل اچھوتا اور انوکھا خیال پیش کیا ہے، شوپنہار نے "عالم بہ حیثیت تصور" میں ایک بحث چھیڑی ہے جو غالب کے "عالم تمام حلقۂ دام خیال" سے ملتا جلتا ہے، مگر یہ کوئی نئی حقیقت نہیں، تمام فلاسفر نے یہی بات لکھی ہے، چنانچہ ڈیکارٹ جو ۱۵۹۶ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۵۰ء میں شہید مر گیا اور جس نے اوائل عمر میں (۱) Musicae Compendium (۲) The world (۳) Principii (۴) Le Monde اور پھر آگے چل کر

(۵) [illegible]

(۶) La Formation du foetus

(۷) Meditation on The first Philosophy.

(۸) Discourse of Method

(۹) Rules for The Direction of Mind

وغیرہ وغیرہ لکھی، بالکل یہی بات لکھتا ہے، برکلے جس کی کتاب (۱) New Theory of Vision اور (۲) Principles of Human Knowledge پر کلمات عام طور سے بہت پسند کئے جاتے ہیں، مگر نہ جانے کینٹ کو کیا ہوا تھا کہ اس اصول سے اس نے تغافل کیا، یہ اس کی سخت غلطی تھی،

یہ مسئلہ ویدانت میں بھی ہے، جس پر سر ولیم جونس نے اپنے آخری مقالہ "ایشیاٹک والوں کا فلسفہ" میں خوب خوب روشنی ڈالی ہے، غرضیکہ ارسطو، سوفقلس، شیکسپیر، حتی کہ ارنسٹ ہیکل (واضح رہے کہ یہ ہیگل نہیں ہیکل ہے جس کی کتاب Riddle of The Universe پر بہت سے حلقوں سے ملامت لعن کی بوچھاڑ پڑی) نے بھی یہی کہا، پھر اقبال کیوں کسی سے پیچھے رہتے، انہوں نے بھی اپنی نظم مقصود میں اس مسئلہ پر خوب خوب روشنی ڈالی ہے، پہلے انہوں نے افلاطون اور اسپینوزا کے نظریے لکھے ہیں، اسپینوزا کا نام آگیا تو ذرا اس کا بھی ذکر سن لیجئے، کہ جواب طویل ہو رہا ہے اور وقت نکلتا جا رہا ہے، مگر کیا کیا جائے، جواب کو بہرحال ٹھوس بنانا ہے اسپینوزا اپنے وقت کا عجیب انسان تھا، اس کی مادیت اور لامذہبیت کی گہرائی سے لوگ کانپتے تھے، ہیوم نے لکھا ہے وہ کس طرح مطعون بنا، اس کو ضرور پڑھ لیجئے، اس کا فلسفہ ابیقوریس سے ملتا جلتا تھا، وہ حیات کو سرمایۂ نشاط سمجھتا تھا، افلاطون زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے، اب دیکھئے ہمارا ہندوستانی فلسفی کیا کہتا ہے،

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

اقبال نے یہ خیال کہاں سے لیا، افسوس اس پر بحث کرنے کا موقع نہیں، کیونکہ وقت ختم ہو رہا اور ابھی بہت سے سوالات باقی رہ گئے ہیں "

اس سال تو ہم علامہ ممدوح کی کتاب پر بھی چار سوالات کے جوابات لکھ کر اکتفا کرتے ہیں، آئندہ سال انشاء اللہ العزیز اور جوابات لکھے جائیں گے، مگر طلبہ مطمئن رہیں کہ ان سوالات میں دو تو ضرور امتحان میں آئیں گے، اور اگر یہی جوابات لکھ دئے گئے تو پھر ان کا بیڑا پار ہے، ہاں ایک یقینی سوال اور رہ گیا ہے جس کا جواب ہم اسی سال کے طلبہ کے لئے لکھ دیتے ہیں،

سوال - علامۂ عبدالمالک آروی کی کتاب "اقبال کی شاعری" پر ایک مفصل ناقدانہ تبصرہ لکھیے،

جواب - "اقبال کی شاعری" کا آغاز پروفیسر میکڈوگل کے ایک قول سے ہوتا ہے جو بظاہر بڑی عجلت میں کہیں سے منتخب کر لیا گیا ہے، یہ قول قوموں کی اسلاف پرستی سے متعلق ہے، جس سے یہ مراد ہے کہ وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو اپنے اسلاف کی پرستش کرتی ہیں، اقبال کی شاعری کے مؤلف اس قول کو نقل کر کے خوش ہیں کہ اسی اسلاف پرستی کے جذبہ میں یوم اقبال منایا جا رہا ہے، مگر یوم اقبال کی تقریب اس وقت منائی گئی تھی جب اقبال مرحوم زندہ تھے، اور ابھی ہم لوگوں کے اسلاف میں سے نہ تھے، پھر اسلاف پرستی کی مدح و ستایش سے اقبال کی شاعری پر ایک مقالہ لکھنا کیسا نامبارک اور غیر مستحسن کام تھا۔

اقبال کی شاعری پر نقد و تبصرہ کرنے سے پہلے مؤلف نے ان کی شاعری میں اُردو شاعری کے قدیم عناصر بتانے کی کوشش کی ہے، اس کے لئے ساڑھے چار صفحے لکھے ہیں، ہم ان کو بار بار پڑھتے ہیں، جن سے ہم کو یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ "مولانا محمد حسین آزاد نے اُردو شاعری کے پانچ دور قایم کئے ہیں، ولی اُردو کا پہلا شاعر نہ تھا۔ میر تقی نے دکنی شعرا کے حالات اہتمام سے نہیں لکھے ہیں، قایم نے دکنی شعرا کی زندگی کے واقعات بڑی

کاوش سے ترتیب دئے ہیں، عبدالحق صاحب قایم کو غلط سمجھتے ہیں، اور قایم پر ان کا اعتراض بالکل بے محل ہے، ولی کے بجائے سعدی دکھنی اردو شاعری کے پہلے شاعر تھے، قایم نے اردو شاعری کے جو تین طبقات قایم کئے ہیں، وہی اصل میں صحیح ہیں، اردو شاعری کے دور اول کے متعلق محمد حسین آزاد کی رائے بالکل ساقط الاعتبار ہے، بہادر شاہ ظفر کے زمانہ میں اردو شاعری کو بڑی ترقی ہوئی، حالی کو غالب کی باقیات الصالحات میں گنایا جاسکتا ہے، حالی کی مسدس اردو زبان کا ایک شاہکار ہے، اکبر اور اسمٰعیل میرٹھی حالی اسکول کے مقلد تھے" مگر ہم کو کہیں سے اس کی واقفیت نہیں ہوتی کہ اقبال کی شاعری کے اجزائے ترکیبی میں قدیم عناصر تھے کہ نہیں، یا تو ہم اپنی قلت لیاقت کی وجہ سے سمجھنے سے معذور ہیں، یا مولف نے محض اپنی معلومات کی نشر و اشاعت میں اس مسئلہ کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، بہر حال ہم مولف کی فہم و لیاقت سے مرعوب ہو کر تسلیم کر لیتے ہیں کہ ان کی شاعری میں قدیم عناصر تھے، مگر فاضل مولف نے اپنی کتاب کے آخر حصہ میں ہم کو یہ بتایا ہے کہ اقبال اردو شاعری میں جدید طرز کے بے مثل شاعر تھے (صفحہ) اگر اقبال واقعی جدید طرز کے بے مثل شاعر تھے تو پھر ان کی شاعری میں قدیم عناصر کی تلاش کیوں تھی؟ اور اگر ان کی شاعری میں قدیم عناصر ہیں تو جدید طرز سے ان کی مماثلت کیسی؟

علامہ موصوف کے خیال اور تحریر کی پراگندگی اور ژولیدگی اپنے منتہائے کمال پر اس وقت پہونچتی ہے جب کہ انہوں نے اقبال کی شاعری کے اجزائے ترکیبی میں سنائی، عطار، رومی، خاقانی، حافظ، صائب، طالب املی، بیدل، نظیری، میر، سودا، حالی، ابن عربی، ابوالعلاء معری، حسان ابن ثابت، لانگ فیلو، ورڈسورتھ، کیٹس اور گوئٹے کے اثرات کا ذکر ایک سانس میں کر دیا ہے، اگر یہ تقریر کسی نئی انتشار اور خلجان کا نتیجہ نہیں ہے تو پھر ہم یہ تصور کر لیں کہ اقبال چور تھے جو اپنے تمام خیالات مختلف شعراء سے سرقہ کرتے رہے، مگر علامہ کی تحریریں خود پراگندگی اور ژولیدگی کا ثبوت پیش کرتی ہیں، ان کا دعویٰ ہے کہ اردو میں اقبال سے قبل کوئی اس انداز (؟) کا شاعر نہیں گذرا ہے (صفحہ) مگر اپنے مقالہ میں جابجا جو جملے انہوں نے لکھے ہیں وہ ملاحظہ ہوں :-

"اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اردو میں وہ حالی اسکول کی پیداوار ہیں، یقیناً حالی، اسمٰعیل میرٹھی اور اکبر الہ آبادی کے تاثرات سے بڑی حد تک اثر پذیر ہیں (صفحہ)

"میرا خیال ہے کہ ہندوستان کا کوئی ایسا نظم نگار نہیں جس کے افکار شعریہ کی تنقیح و تحلیل کی جائے تو اس کا انتساب حالی اسکول سے نہ ہو، پھر بھی اقبال اپنی نظیر آپ ہیں (صفحہ)

"اقبال حالی اسکول کی پیداوار ہیں ..... پھر بھی وہ اپنے طرز کے یگانہ شاعر ہیں، (صفحہ)

"اقبال کی شاعری حالی اسکول کی خصوصیات کا کمال پیش کرتی ہے" (صفحہ)

"اقبال شاعر ہیں میر و سودا کی طرح، ان کے کلام میں درد و آہ کی چاشنی ہے" (صفحہ)

اسی طرح علامہ موصوف نے ارشاد فرمایا ہے کہ فارسی میں اقبال کسی رنگ کا کوئی شاعر نہیں (صفحہ) مگر بعض اقتباسات ملاحظہ ہوں :-

"اقبال نے فارسی شعراء بالخصوص صوفیانہ شاعری سے بڑی حد تک استفادہ کیا ہے، اس سلسلہ میں سنائی و عطار رومی و خاقانی کا نام لیا جاسکتا ہے، ان کی شاعری پر زبان فارسی کے اور ہندی الاصل شعراء کا بھی اثر پڑا ہے، مثلاً حافظ و صائب، طالب املی و بیدل وغیرہ کا کلام ان کے زیر مطالعہ رہا ہے" (صفحہ)

"حدیقہ ان کے زیر مطالعہ رہی ہے" (صفحہ)

"اقبال نے رومی کا گہرا مطالعہ کیا ہے" (صفحہ)

"اقبال نے رومی کا مطالعہ مریدانہ اعتقاد کے ساتھ کیا تھا" (صفحہ)

"اقبال نے خاقانی کی مشہور مثنوی تحفۃ العراقین ..... کا مطالعہ کیا ہے" (صفحہ)

"اقبال نے اپنی ایک نظم میں نظامی کا بھی اقتباس دیا ہے (صفحہ)

(ان تحریروں سے یا تو اپنی قلت بصیرت سے ہم یہ سمجھیں کہ اقبال نے سنائی، عطار، رومی، خاقانی، صائب، طالب املی، اور بیدل کے دواوین کو صرف درسی طور پر مطالعہ کیا تھا، اگر یہی امر واقعہ ہے تو پھر فاضل مولف نے قاعدہ بغدادی، اردو کا قاعدہ، گلستان، بوستان، کریما، مقیما، اور کیا سیاہ

کے نام سہو اً چھوڑ دئے، کیونکہ یہ کتابیں بھی اقبال کے مطالعہ میں ضرور رہیں، یا نہیں تو پھر ہم یہ سمجھیں کہ ان کے مطالعہ بلکہ مریدانہ اعتقاد کے ساتھ مطالعہ و استفادہ کے یہ معنی ہیں کہ اقبال نے ان میں سے ہر ایک کا رنگ کچھ نہ کچھ ضرور قبول کیا، تو پھر یہ دعوی کہاں قایم رہتا ہے کہ فارسی میں اقبال کے رنگ کا کوئی شاعر نہیں،

دلائل و براہین کے تضاد، تناقض اور بے ربطگی کے ساتھ علامہ ممدوح نے غیر متعلق اور غیر ضروری عبارتوں کا ایک ڈھیر لگا دیا ہے، مثلاً

"اقبال نے فارسی شعرا، بالخصوص صوفیانہ شاعری سے بڑی حد تک استفادہ کیا ہے، اس سلسلہ میں سنائی و عطار رومی و خاقانی کا نام لیا جا سکتا ہے، ان کی شاعری پر زبان فارسی کے اور ہندی اور ایرانی شعرا کا بھی اثر پڑا ہے، مثلاً حافظ و صائب، طالب آملی و بیدل وغیرہ کا کلام بھی ان کے زیر مطالعہ رہا ہے، اقبال نے اپنی مایۂ ناز کتاب "ضرب کلیم" "نواب سر حمید اللہ خان فرمانروائے بھوپال کے نام معنون کی ہے، اسی ضمن میں نواب صاحب کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

تو صاحب نظری اینچہ در ضمیر من است — دل تو بیند و اندیشۂ تو می داند
بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من، — "کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند"

چوتھا مصرعہ طالب آملی کے ایک مشہور شعر کا آخری مصرعہ ہے، گو ضرب کلیم میں اس کا حوالہ نہیں دیا جا سکا معتمد خاں کی روایت ہے کہ طالب آملی نے چھ ماہ تک فکر کی لیکن کوئی پیش مصرعہ فکر میں نہ آتا تھا۔ آخر میں انہوں نے یہ مصرعہ کہا:-

زغارت چمنت بر بہار منتہا ست

میر حسن جیسا نقاد اور سخن شناس قایم چاند پوری کو طالب آملی کا ہمرنگ بتاتا ہے جو بالکل بے جوڑ سی بات ہے، قایم کی آشفتہ سامانی اور سوز جگری کو طالب آملی کی اس کاوش مژہ سے کوئی سروکار نہیں، پہلے وہ خواجہ میر درد کے شاگرد تھے، پھر سودا سے شرف تلمذ حاصل کیا، اگر درد ہی سے وابستہ ہوتے تو آج ان کا پایہ اردو شاعری میں کچھ اور ہی ہوتا، بہر حال اقبال باوجود اس کے کہ حالی اسکول کی پیداوار ہیں اور انہوں نے فارسی شاعری سے بھی بڑی حد تک استفادہ کیا ہے پھر بھی وہ اپنی طرز کے یگانہ شاعر ہیں"

بحث تھی کہ اقبال نے فارسی شعرا سے کہاں تک استفادہ کیا، علامہ موصوف کی منطقیانہ دلائل کے کبریٰ، صغریٰ اور نتیجہ کو غور سے پڑھئے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ ان میں معتمد خاں کی روایت، میر حسن کی نقادی اور سخن شناسی، قایم کی آشفتہ سامانی اور سوز جگری اور میر و سودا سے اس کے شرف تلمذ اور طالب آملی کی کاوش مژہ کا یہاں کیا "جوڑ" تھا، اور یہ جوڑ علامہ ممدوح کے گریز سے اور بھی بے معنی اور بے ربط ہو گیا ہے،

ایک اقتباس اور ملاحظہ ہو،

"اقبال نے خاقانی کی مشہور مثنوی "تحفۃ العراقین" کے دو شعر کا اقتباس اپنی نظم "ایک فلسفہ سیہ زادہ" میں درج کیا ہے، دولت شاہ کا بیان ہے کہ خاقانی نے شروان شاہ کے سامنے درباری زندگی سے علیحدگی کے لئے استعفا پیش کیا، لیکن اس نے قبول نہ کیا، آپ بلا اجازت بلیقان کی طرف چلے گئے، گرفتاری ہوئی، سات ماہ تک قید ہوئے۔ عبادت و یاد الٰہی کا غلبہ ہوا، قید سے چھوٹے تو پھر ملازمت نہ کی، مکہ کا رخ کیا، رستہ میں ایک قصیدہ کہا جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے،

صبح از حمائل فلک آہیخت خنجرش

طالب بن محمد اصفہانی کی روایت ہے کہ شرفائے مکہ نے اس کو آب زر سے لکھ کر خانہ کعبہ میں آویزاں کیا،

اقبال نے خاقانی پر ایک نظم بھی لکھی ہے، اسی میں فرماتے ہیں،

وہ محرم عالم مکانات، — ایک بات میں کہہ گیا ہے سو بات،
خود بوئے چنیں جہاں تواں برد — کا بلیس بماند بوالبشر مرد

(ص ۲۳۰)

مذکورہ بالا اقتباس کی سطروں میں ربط اور تسلسل طلبا یا تو اپنے "امتزاز فکر" سے خود پیدا کرلیں یا نہیں تو پٹنہ یونیورسٹی کے مشہور نوٹس رائٹر پروفیسر بنرجی گولڈ مڈلسٹ کی طرف رجوع کریں،

علامہ موصوف کی "بے جوڑ" "بے محل" اور "بے سر و پا" عبارتوں کی "دلنواز بہاریں" تو "اقبال کی فلسفیانہ شاعری" کے عنوان میں نظر آتی ہیں، اس کی تمہید میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ تصوف، شعر اور فلسفہ ایک ہی "ہبط انوار کی مختلف کرنیں" ہیں اس پر علامہ ممدوح نے جو اپنی "فلسفہ طرازیاں" اور "رشحات فکر" کے نمونے دکھائے ہیں، ان کے بارہ میں یا تو راقم السطور یا علامۂ عصر ہی کو کچھ معلوم ہے کہ یہ "بلند پروازیاں" کس کی ہیں، مگر مولانا شاید اپنے ان فلسفیانہ خیالات کے بارگراں کو سنبھال نہ سکے، اور آخر میں یہ لکھ کر مطمئن ہو گئے ہیں کہ شعر میں فلسفہ بھی ہو سکتا ہے اور تصوف بھی، یہ تو کوئی نئی بات نہیں، یا یہ کون نہیں جانتا کہ ایک شاعر کا فلسفی اور صوفی ہونا ممکن ہے، یا ایک فلسفی یا ایک صوفی شاعر بھی ہو سکتا ہے، ہاں اگر علامہ موصوف نے اپنے ناظرین کو یہ مرعوب کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ نہ صرف ابن سینا، ابن باجہ، اسحٰق اسرائیلی، اور داؤد بن مروان، سبزی سقطی، رابعہ بصریہ، ابوسعید، ابن ابی الخیر، اور عراقی کے نام جانتے ہیں، بلکہ امقوریس، شوپنہار، ٹامس ویٹاکر، شکسپیر، نیذار، سوفقلس، اور اس ڈی۔ ولف کے نام اور ان کی تصانیف سے بھی واقف ہیں، تو ہم بھاری ہونے کی حیثیت سے ان کی وسعت نظر پر فخر کرتے ہیں۔ مگر اس کا افسوس ضرور ہے کہ علامۂ اجل کی معلومات کے سمندر کے سیلاب میں عزیب مجنوں گورکھپوری اپنی شومی قسمت سے غرقاب ہو گئے،

معلوم نہیں مجنوں گورکھپوری سے کون سی شوخی، گستاخی اور بے ادبی سرزد ہو گئی تھی کہ مولوی عبدالحق (ملاحظہ ہو ص۔) محمد حسین آزاد (ملاحظہ ہو ص۔) میر حسن (ملاحظہ ہو ص۳۳) اور شیخ عبدالقادر (ملاحظہ ہو ص۵۹) کی طرح بہار کے علم و ادب کی لیلےٰ کے بے پناہ عشقوں اور عشوں سے نیم جان اور نیم بسمل بنا کر چھوڑ دئے گئے ہیں، مگر ہم جیسے عشق و عاشقی سے کورے اور الھڑ مسلمان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ اس مختصر رسالہ میں شوپنہار کے فلسفہ پر بحث و تمحیص کی آخر کیا ضرورت تھی، علامہ ممدوح کو وقت کی قلت کی وجہ سے اس کا موقع نہ ملا کہ وہ بتائیں کہ "فلسفہ کے ادوار ثلاثہ کے کس اسکول نے اقبال کو اثر پذیر کیا" (ص۳۹) یا فلاں شعر کا خیال اقبال نے کہاں سے لیا (ص۔) مگر چھوٹی تقطیع کے ۶۶ صفحے کے مختصر رسالہ کے ۵ صفحے میں یہ بتانے کے لئے وقت اور موقع میسر تھا کہ مجنوں کی کتاب شوپنہار ٹامس ویٹاکر کی تصنیف سے سرقہ ہے ..... اور شوپنہار کا باپ تجارت پیشہ تھا، اس پیشہ میں اس کو سخت خسارہ ہوا، اور وہ مرا تو ہیمرگ کی نہر میں اس کی لاش پائی گئی، شوپنہار یکسر قنوطی نہ تھا، اس نے اپنی مشہور کتاب "عالم بہ حیثیت ارادہ تصور" کو اپنے باپ ہی کے نام سے معنون کیا ..... اسی طرح کے اور بھی معلومات ہیں، جن کے بارے میں علامۂ عصر نے لکھا ہے،

> "آج کل چونکہ ان موضوع پر بہت توجہ مبذول کی جا رہی ہے، اس لئے میرا خیال ہوا کہ لطیف تصوریت کی توضیح مع شوپنہار کی تعمیری اور تخریبی تنقید کے ان لوگوں کے لئے مفید ہوگی جو در اصل زبان میں کینٹ اور شوپنہار کا بہ یک وقت مطالعہ نہیں کر سکتے"

آج کل تو ہم لوگوں کی توجہ اشتراکیت، اجتماعیت، شہنشاہیت، آمریت، فاشزم، نازی ازم، تشدد، عدم تشدد، کانگریس، مسلم لیگ، احرار، اور خاکسار کی تحریک کی طرف بھی مبذول ہے، علامہ موصوف کا احسان ہوتا اگر کسی صفحہ کے حواشی میں ان مسائل پر لکھ کر ہم کو مستفیض فرماتے، پھر لطیف تصوریت کی جو توضیح یا شوپنہار کی جو تعمیری اور تخریبی تنقید انہوں نے سپرد قلم کی ہے ان کو پڑھ کر ہم نے علامہ ممدوح کے لیکن شوپنہار اور اس کی لطیف تصوریت کی اہمیت الحمدللہ ذہن سے جاتی رہی، البتہ علامۂ اجل کی تعمیری و جد فرد قابل توجہ ہے، انہوں نے اقبال کی شاعری پر مقالہ لکھنے کے سلسلہ میں شوپنہار پر محض اس لئے خامہ فرسائی کی ہے کہ ان کے نالائق ناظرین اصل زبان میں مطالعہ نہیں کر سکتے، مگر ہم جیسے نا اہل ناظرین تو زرتشت، کنفیوشس، سوفقلس، فیثاغورث، اغزاوس، کو اصل زبان میں کیا اپنی مادری زبان میں بھی مطالعہ نہیں کر سکتے، علامہ موصوف کی یہ "مخصوص بارش کرم" (ص۔) ہوتی اگر نہ صرف ان ارباب عقل و دانش بلکہ ان تمام اصحاب علم اور اکابر فلسفہ کے حالات اپنے اس رسالہ میں کچھ نہ کچھ لکھ دیتے، جن کے متعلق ہم اصل زبان میں بہ یک وقت مطالعہ نہیں کر سکتے ہیں،

مگر یہ استدعا محض سوءِ ادب ہے، کیونکہ اس کی تکمیل اظہار سے پہلے فلسفہ کے ادوار ثلاثہ کی بحث میں ہو چکی ہے، علامہ کے اس مقصد کی براری سے ہم خوش تو ضرور ہوئے لیکن انہوں نے ان مباحث کی ابتدا میں جو عنوانات اور سوالات قایم کئے ہیں، ان کو خلط ملط بلکہ بے ربط ہوتے دیکھ کر افسوس ہوا، مثلاً علامہ ممدوح نے صفحہ ۳۹ سے صفحہ ۴۶ تک یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ فلسفہ کے قدیم، وسطی، اور جدید دور میں اقبال کی شاعری کس اسکول سے علاقہ رکھتی ہے، مگر ہر دور کے فلسفیانہ خیالات و نظریے پر بحث کرنے کے بجائے علامہ عصر نے تینوں دور کے فلسفیوں کے صرف نام گنا دئے ہیں، اور اپنی بحث سے مطمئن ہو کر اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ "اقبال نے تینوں ادوار کے فلسفہ کا مطالعہ کیا" صرف اتنی ہی بات للعینی تھی تو موءدبانہ عرض ہے کہ علامہ موصوف کا جہاں پر جی چاہتا، یہ لکھ کر آگے بڑھ جاتے، ہم اقبال کی طرف سے کب ازالۂ حیثیت عرفی کا دعوی کرنے بیٹھے تھے جو پانچ صفحے کی دقیق اور غامض بحث کے پڑھنے کی خواہ مخواہ زحمت دی گئی البتہ اب ہم کو یہ خوف ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں فروتاغورس، زینوفنس، سقراط، زینوڈس، ارسطو، فارابی، کندی، ابن سینا، ابن حزم، اسپنوزا، ہکسلے، ہیوم، اور ہوبس، پرستار اور حامی اب علامہ بہاری کو قانونی گرفت میں نہ لے آئیں کہ انہوں نے بے محل اور غیر ضروری طور پر ان کے اسماء گرامی کیوں استعمال کئے۔

پھر ہم ایسے بدمذاق ناظرین کو صرف یہ کہہ کر کیسے مطمئن کیا جا سکتا ہے کہ اقبال صوفیانہ شاعری میں سنائی، عطار، رومی، خاقانی، انوری، فلسفہ میں نطشے، اسپنوزا، شوپنہار وغیرہ، اخلاقیات میں لانگ فیلو، عشقیہ خیالات میں کیٹس وغیرہ سے متاثر تھے، دلائل و شواہد پیش کئے جاتے تو ہم کو تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہ تھا، مگر صرف لکھ دینا کافی ہے تو ہم بھی بہانگ دہل کہتے ہیں کہ اقبال نے فارسی زبان میں منہاج سراج، ضیاء الدین برنی، شمس سراج عفیف، یحیی سہروردی، عباس خاں شروانی، میر خوند، بابر، میرزا حیدر دوغلت، جوہر، ابوالفضل، عبدالقادر بدایونی، جہانگیر، معتمد خان، ملا محمد صالح کنبوہ، عبدالحمید لاہوری، میرزا کاظم، سبحان رائے کھتری اور دارستہ سے استفادہ کیا، صوفیانہ رموز و نکات کے لئے ابوالحسن علی عثمان ہجویری رح، حضرت معین الدین چشتی رح، شہاب الدین علی بن ہمدانی رح حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح، حضرت فرید الدین گنج شکر رح، حضرت نظام الدین اولیا رح، حضرت نصیر الدین چراغ رح، بوعلی قلندر رح، ضیاء الدین سنبھلی رح خواجہ رکن الدین عماد کاشانی رح، شرف الدین یحیی منیری رح، نظام حاجی غریب یمنی رح، خواجہ بہاء الدین نقشبندی رح، خواجہ گیسو دراز رح شیخ عبدالحق رودولوی رح عبدالقدوس گنگوہی رح، اشرف جہانگیر سمنانی رح، حضرت مجدد الف ثانی رح اور حضرت شاہ ولی اللہ رح کی کتابوں کا مہذبانہ اعتقاد سے مطالعہ کیا، غزل گوئی میں نکاتی، ابوالفرج رونی، شہاب الدین بدایونی، امین الدین سنائی، امیر خسرو، میر حسن، فیضی، شکیبی، نظیری، حیاتی گیلانی، اور انیسی سے متاثر تھے، اور فلسفیانہ مغالیق و دقایق کے لئے مہابھر، گوتم بودھ، گرونانک، کبیر داس، گرو گوبند سنگھ، جیسیانہ، تلسی داس، سور داس، اور رام موہن رائے کے رہین منت رہے ہیں، شاید میرے اس دعوی سے بعض اصحاب علم کے زیر لب مسکراہٹ آجائے۔ مگر کیوں؟ محض اس لئے کہ مذکورہ بالا افراد نیٹو ہندوستانی ہیں، اور علامہ موصوف کے گنائے ہوئے اکا برسے زیادہ وزنی اور مقتدر نہیں؟

گستاخی نہ ہوتی تو یہ ضرور کہتا کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ بہاری نے زیر نظر رسالہ یا تو آرہ کے کلکٹری آفس میں بیٹھ کر یا کچہری سے فوراً آکر، یا رات کے آخری حصہ میں اونگھ اونگھ کر لکھا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ خاقانی کو صوفی شاعر، ابوالعلا معری کو فارسی زبان کا بلند پایہ شاعر، اور اسپنوزا کو یونان کا فلسفی نہ کہتے، حتیٰ کہ قرآن مجید کے الفاظ بھی صحیح نہیں لکھ سکے، "ظل منضود" (صفحہ ۴۶) کے کیا معنی ہوئے، جس آیت کا ٹکڑا علامہ عصر نقل کرنا چاہتے ہیں، وہاں "طلح منضود" اور "ظل ممدود" مذکور ہے، اسی طرح علامہ موصوف نے "مئات الفرق" (صفحہ ۱۱) کے معنی "سیکڑوں برس کا فرق" لکھ دیا ہے،

پھر معلوم نہیں علامہ بہاری نے اس کا التزام کیوں رکھا ہے کہ ایک پیرا دوسرا پیرا کے مطالب و معانی سے ملنے نہ پائے، شروع سے آخر تک ایسے جملے بکثرت ملیں گے جن میں تسلسل بالکل قایم نہ رہ سکا ہے، قابل اصلاح جملے تو بکثرت ہیں، مثلاً

"اقبال نے پوری نظم بڑے جوش و خروش میں کہی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبات کا سیلاب ان کی پوری ہستی کو اپنے اندر جذب کر چکا ہے"

سیلاب بہائے جاتا ہے یا جذب کرتا ہے؟ یا ممکن ہے کہ فروتاغورس نے جذب کرنا ہی لکھا ہو، ؟

" اقبال نے اُن مسائل پر بھی شعر کہے ہیں جن کا تعلق نہ تو ان کے وطن ہند سے ہے اور نہ ان کی مذہب اسلام سے، اس سلسلہ میں انہوں نے جو نظمیں کہی ہیں وہ زیادہ تر ضرب کلیم میں پائی جاتی ہیں "
اس قسم کے عنبر فصیح جملوں کا تو انبار ہے،
" اقبال فلسفی ہیں، انہوں نے یورپ جاکر باضابطہ اس کی تکمیل کی، اور " ڈکٹور فلسفہ " کی ڈگری لائے، انگریزی زبان میں آپ کی کتاب " ایران میں علم مابعد الطبیعہ کی ترقی " بہت مشہور ہوچکی ہے، آپ کی شاعری پر بھی فلسفہ کا گہرا اثر ہے "
علامہ بہاری ان جملوں کی شتر گربگی خود ملاحظہ فرمالیں، صرف توجہ مبذول کرانے کی ضرورت ہے،
" زندگی اور موت ایسے مسائل ہیں جن پر فلسفہ نے بہت کچھ پر افشانیاں کی ہیں، زندگی اور موت کے متعلق فلاسفہ کے مختلف نظریے ہیں "
" پر افشانیاں " اور زندگی اور موت کی تکرار سمجھ میں نہ آئی،
" دوسرے لوگ اس کی مادیت اور لا مذہبیت کی گہرائی سے کانپتے تھے "
گہرائی سے کانپنا شاید اسپنوزا سے مستعار لیا ہو ؟
" وہ مرغ زریں بنے خانقاہ میں جلوہ فروش رہا کرتے ہیں "
" دیا غورسس " کے محاورہ میں شاید " جلوہ فروش رہنا " ہی ہو،
" پوری غزل اقبال نے گہری معنویت اور بلندی انشا، کے ساتھ ختم کی ہے "
فارسی اور اُردو اضافتوں کی شتر گربگی معلوم نہیں علامہ بہاری نے کس مصلحت سے پسند کی ہے،
" ان کے خیال میں نزاکت خیالی ۔۔۔۔۔۔ "
" نزاکت خیالی " شاید بدخیالی میں لکھا گیا ہو،
" ہندوستان کے نوجوانوں میں ایک رسم سی چلی آتی ہے کہ فلسفہ پڑھا اور گمراہ ہی ہوئے "
" ہی " معلوم نہیں " کن جذبات کی اثریت " میں لکھا گیا ہے ؟
" اس کو خوشگوار بنانے کے لئے کوئی جسمانی قربانی یا " سنجیدہ دوا دوش نہیں کرسکتے "
" سنجیدہ دوا دوش " سے نہ جانے کیا مراد ہے ؟
پھر موضوع الفاظ کے مہمل مجموعے کے " اجزائے ترکیبی " کی بھی چند مثالیں ملاحظہ ہوں،
" اقبال کے یہاں عہد ظفر اور اس سے قبل کے اُردو شعرا کی طرح شعر گوئی نفسیاتی ابتہاجیت کا نتیجہ نہیں "
" اُردو میں غالب اور مومن ایسے شعرا گذرے ہیں جن کے یہاں شعر گوئی کی محرکات میں نفسیاتی ابتہاجیت اور تصوریت کے ساتھ احساس فریضہ بھی تھا، اقبال کے کلام میں اسی نوع کی ترنم ریزیاں ہیں "
" زندگی کی حقیقت ایسی ہی ہے جیسے تاریکی میں ایک چنگاری کا جلوہ گریزپا "
" ہماری خوش قسمتی ہے کہ اقبال ہمارے دور کے شاعر ہیں اور شعور و ذوق کے لحاظ سے اسی عہد کے پیداوار ہیں، بنا بریں ہمیں ان کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالنے میں کچھ زیادہ وقت بھی نہیں، کیونکہ ظن و خیال کے مقابلہ میں ہمارے سامنے مشاہدات کی دنیا ہے "
" وہ اپنے استاد کی طرح شباب کی معصیت کوشاں اور اہیفورین ذوق کے ماتحت رنگ رلیاں

بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں "

" اسرار خودی اور پیغام مشرق میرے خیال میں یورپ کی تقلید کا نتیجہ ہیں، ان کتابوں میں تخلیقیت سے زیادہ میک ڈاوگل کی اصطلاح میں تبعیت کا غلبہ ہے "

" مریدانِ وفاکیش کے نذرانے صوفی اور خواجہ صاحب کی کارگاہ تجارت قایم ہے "

" اقبال کا سیاسی نظریہ ..... قربان نواز ہے "

" ایک شاعر کو مورد الزام بنانے سے زیادہ اہل دنیا کی پرورش تمنا قابل الزام ہے "

" (اقبال نے) جرمن شاعر شوپنہار کی طرح فلسفہ و شعر کے اختلاط سے ایک دل نواز ادب کی تخلیق کی "

"تخلیق" کے لفظی معنی اگر علامۂ ممدوح کو معلوم ہوتا تو اپنے دلنواز ادب میں یہ کفریات رائج نہ کرتے،

علامۂ بہاری کو اپنے جواہر ریزے مثلاً آہنگ حیات، فخر و امتیاز، دل فروشانہ آہنگ، جذبات کی اثریت، آہنگ از فکر و روح، تنقیح و تحلیل، وطن و اعتبار، غیر ماہرانہ تنقید، ولولہ ارادات کی کارفرمائیاں، تدین و تشرع، غیر مخلصانہ، اور حریصانہ شورش، مہبط انوار، ذوق و مراقبت، طبیعت کا تخلیقی رجحان، پرفشانیاں، سنگین حقیقت، سکر و خمول، تشدد و شیوع پر ناز ہوگا، مگر بے ادبی اور شوخی نہ ہوتی تو کہتا کہ ہم جیسے بد مذاق اور ادب و انشا سے ناآشنا ناظرین علامہ ممدوح کے بے مثل مقالہ کی تحریر کے لئے سنگریزے بلکہ روڑے اور کھپرے سمجھتے ہیں،

علامۂ موصوف نے جابجا انگریزی الفاظ لکھنے میں بڑی فیاضی کی ہے، معلوم نہیں یہ فیاضی احساس برتری یا احساس کمتری کا نتیجہ ہے، اگر احساس برتری میں انگریزی الفاظ لکھے گئے ہیں تو مودبانہ گذارش ہے کہ Ancestor Worship, Intuition, Communal, Sense of Duty, Action, Idea, Conservative, Shades, originality, وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن کے اردو مترادف مجھ جیسا نالایق اور نااہل بہاری بھی جانتا ہے، اور اگر اس احساس کمتری میں یہ الفاظ سپرد قلم کئے گئے ہیں کہ ناظرین ذہن نشین کرلیں کہ علامۂ موصوف نے گو انگریزی میں صرف اسکول تک کی تعلیم پائی ہے، لیکن وہ ایسے تمام الفاظ سے بھی واقف ہیں جو عام طور سے پٹنہ یونیورسٹی کے بی اے - اور ایم اے کے طلبہ جانتے ہیں تو ہم دعاگو ہیں کہ خدا کرے ناظرین کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہوجائے - آمین،

احساس برتری اور احساس کمتری کے ملے جلے جذبے میں علامہ ممدوح کے ادب شناس قلم نے جو گہرافشانیاں بلکہ پرافشانیاں کی ہیں، وہ بھی ملاحظہ ہوں،

" قایم کے نزدیک عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ریختہ کو بہت زیادہ رواج ہوا - مولانا عبدالحق صاحب کو اس پر اعتراض ہے ..... مگر عبدالحق صاحب کا اعتراض بے محل ہے "

" دور اول کے متعلق ان کی (یعنی محمد حسین) کی رائے بالکل ساقط الاعتبار ہے "

"میر حسن جیسا نقاد اور سخن شناس قایم چاندپوری کو طالب آملی کا ہمرنگ بتاتا ہے جو بالکل بے جوڑ سی بات ہے"

" یہاں ہمیں اقبال سے اختلاف ہے، انھوں نے صوفیا کے والہانہ انداز میں عقل کو حضور کے منافی سمجھا، اور فلسفہ چونکہ عقل ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے، اس لئے حقیقتاً فلسفہ نام ہے زندگی سے دوری کا، درانحالیکہ فلسفہ طرازیوں ہی نے اقبال کو ایک غیر فانی زندگی بخشی "

" شیخ عبدالقادر ..... کے اس بیان پر بے اختیار ہنسی آگئی، اور صفیر و شاد کی استادی شاگردی اس کی نزاع و مناقشہ کا منظر اور اس کی لغویت و رکاکت کا نقشہ سامنے آگیا، حقیقت یہ ہے کہ علم حاصل کرنا دوسری چیز ہے، اور ذوق تنقید بالکل دوسری شے ہے، یہ قدرت کا محض عطیہ ہے، جس کو مل جائے، .....

ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ علم و معارف کے حاصل ہونے کے باوجود بعض اوقات انسان کے اندر ستم ظریفانہ اپج کیوں پیدا ہو جاتی ہے ؟"

راقم السطور بھی علامۂ ممدوح بہاری سے یہی سوال کرتا ہے ، امید ہے کہ اس کا جواب دیکر ہم جیسے نا اہل نقاد کو بھی مستفیض فرمائیں گے ، ہم جیسے "علم و معارف" سے بے بہرہ ناظرین علامۂ ممدوح کے رسالہ "اقبال کی شاعری" کو بار بار پڑھتے ہیں اور آپ نے "امتیاز فکر" سے سلجھنے کی حتی الوسع کوشش کرتے ہیں کہ یہ رسالہ اقبال کی شاعری کی مخالفت یا حمایت میں لکھا گیا ہے ، اس رسالہ کو پڑھنے کے بعد ہم اپنی "قلت بصیرت" سے اقبال کو جو سمجھتے ہیں وہ علامہ ممدوح کے الفاظ میں از سر نو ترتیب دیتے ہیں ؛

(۱) اقبال کی شاعری میں اردو شاعری کے قدیم عناصر ہیں (ص ۹ ، ۸ ، ۷ ، ۶ ، ۵ ، ۴)

(۲) اقبال حالی اسکول کی پیداوار ہیں ، (ص ۱)

(۳) اقبال یقیناً حالی ، اسمٰعیل میرٹھی اور اکبر الہ آبادی کے تاثرات سے بڑی حد تک اثر پذیر ہیں ، (ص ۱)

(۴) اقبال سنائی ، عطار ، رومی ، خاقانی ، حافظ ، صائب ، طالب آملی ، نظامی ، بیدل ، لانگ فیلو ، ورڈ سورتھ ، کیٹس ، گوئٹے ، سپنوزا ، فلاطون ، نطشہ ، شوپنہار ، ہیگل ، برگساں ، ابن عربی ، وغیرہ وغیرہ سے متاثر تھے ، (ص ۱۲ ، ص ۱۳ ، ص ۱۶ ، ص ۲۵ ، ص ۹۴) گویا انہوں نے اپنی طرف سے کوئی نئی چیز پیش نہ کی ، اور وہ بیچ میں شاعر اور فلسفی تھے ،

(۵) اقبال شاعر ہیں میر و ضیا کی طرح (ص ۵۷)

(۶) اقبال کی اسرار خودی اور پیام مشرق یورپ کی تقلید کا نتیجہ ہیں (ص ۴۵)

(۷) اقبال جب اسلامیاتی شاعری پر اترتے ہیں تو ان کے اندر ایک سخت قسم کا فرقہ وارانہ رجحان پیدا ہو جاتا ہے جس کو ہم شعر نہیں کہہ سکتے ، (ص ۲۸)

(۸) بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اقبال کی اسلامیات پرستی نے ان کو قدامت پرست بنا دیا ہے ، ناقدوں کا یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے ، (ص ۵۱)

(۹) اقبال فلسفہ ، شعر اور تصوف کے امتزاج سے کچھ عجیب چیز بن گئے ہیں ، میری رائے ہے جوش کے کلام میں اقبال سے زیادہ ادب و انشا کی شگفتگی ہے ، (ص ۴۳)

(۱۰) اقبال عملی دنیا میں اس قدر تن آسان اور عافیت کوشان ہیں کہ ان کو حق و باطل میں کوئی تمیز ہی نہیں ، اقبال کے اس تضاد فکر و عمل پر حامیان آزادی نے خوب خوب پھبتیاں اڑائی ہیں (ص ۵۷)

(۱۱) اقبال کو ڈاکٹر نکلسن نے فلسفہ اور تصوف کی طرف متوجہ کیا ، (ص ۲۵)

(۱۲) اقبال کے کلام کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ایک نقاد ادب اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ان کے یہاں ادب و انشا کی خامیاں ضرور ہیں ، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا وطن مرکز زبان سے بہت دور سیالکوٹ میں واقع تھا ہے ، اس لئے ان کی روزمرہ کی زبان میں ادب و انشا کے غیر ارادی محاسن کی جلوہ ریزیاں نہیں پائی جاتی ہیں ، یہی سبب ہے کہ ان کی تحریروں میں بعض جگہ زبان کی خامیاں ہیں ، (ص ۶۴)

(۱۴) ہندوستان کے لوگوں کو خوش ہونا چاہئے کہ اقبال کا صحیح جانشین شاعر ہے ، (ص ۶۵)

(۱۵) وطنی ماحول اور مرکزیت زبان کے لحاظ سے جوش اقبال سے آگے ہیں ، اور وہ زمانہ بہت جلد آئیگا جب یہ جوش کا کلام اقبال سے بھی زیادہ سنگین حقیقت اور معنویت کا حامل ہوگا کیونکہ جوش کے کلام میں شگفتگی و نشاط اب بھی اقبال سے زیادہ ہے (ص ۶۵)

(۱۶) پنجاب کے ارباب علم "اقبال کی شاعری کے اجزائے ترکیبی" کی اس "تنقیح و تحلیل" کے بعد معلوم نہیں کیا رائے قائم کریں گے ، ابھی حال ہی میں بہار کے اہل قلم نے "سکر و خمول" سے نکل کر صوبہ کے "علمی جمود و تعطل" کو دور کرنے کے جذبہ سے راجگیر کے ایک پر حیہ میں اقبال پر ایک تنقیدی مضمون لکھا تھا ، اس کا جواب احسان لاہور نے اپنی ایک شاعت میں "راجگیر کے ادبی گھسیارے" کے

عنوان سے دیا تھا، سُرخی پڑھکر ہنسی تو آئی مگر پھر بہاری ہونے کی حیثیت سے آنکھیں شرم سے جُھک گئیں۔ اب خوف یہ ہے کہ پنجاب والے ہمارے علامہ بہاری کے مذکورہ بالا "علمی شہ پارے" کے غموض و دقایق کو تو سمجھ نہ سکیں گے، پھر نہ جانے مولانا کے علم و معارف اور اس ذوق تنقید پر جو قدرت سے ان کو "محض عطیہ" ملا ہے، کون کون سی سُرخیاں قایم کر کے نقد و تبصرہ کرنے کی کوشش کریں گے، مگر وہ اس مقالہ پر خواہ کچھ بھی لکھیں، مگر ہم بہاری ہونے کی حیثیت سے علامہ بہاری کو یقین دلاتے ہیں کہ پنجاب والوں کی تنقید و تنقیص سے متاثر ہونے کے بجائے ان کے "بے مثل مقالہ" کو بار بار پڑھیں گے، کیونکہ ان ہی کے عالمانہ اونچ کے ذریعہ سے نہ صرف "بہار کا ادب و اثار منظر عام پر" (صفحہ ۶۶) آرہا ہے، بلکہ حدیث و انساب، شعر و ادب، تاریخ و تنقید، فلسفہ و تصوف، نجوم و مصوری، ریاضی و موسیقی، نفسانیات و نفسیات، کیمیا و طبعیات، عضلیات و احشائیات، مفلیات و عضویات، عصبیات و حروفیات پر علامہ موصوف کے محققانہ اور مبسوط مباحث سے ہم جیسے گمنام اور زاویہ نشین بہاری مستفید اور متمتع ہو رہے ہیں،

حضرت ایم۔ اسلم کی نادر روزگار تصنیفات

۱ - مرزا جی حصّہ اوّل
۲ - مرزا جی حصّہ دوم
۳ - سراب ہستی
۴ - آشوب زمانہ
۵ - مضامین اسلم
۶ - ثمر گناہ
۷ - طلسم سامری
۸ - پیغام سروش
۹ - گناہ کی راتیں
۱۰ - غزّال
۱۱ - بقاء دوام
۱۲ - کارزار حیات (چالیس افسانے)
۱۳ - تفسیر حیات (چالیس افسانے)
۱۴ - عروس غربت
۱۵ - خط تقدیر
۱۶ - بڑی بی (لڑکیوں کیلئے افسانے)
۱۷ - ساربان (بچّوں کے لئے)
۱۸ - نور ہدایت

۱۹ - ارمغان عرب (بچّوں کے لئے)
۲۰ - پیمان وفا 〃 〃
۲۱ - ہجرت 〃 〃
۲۲ - امانت 〃 〃
۲۳ - بلقیس ملکہ سبا 〃 〃
۲۴ - حکایات عرب 〃 〃
۲۵ - شیطان کا چرخہ 〃 〃
۲۶ - کبڑا شہزادہ 〃 〃
۲۷ - حور 〃 〃
۲۸ - پھولوں کا ہار 〃 〃
۲۹ - حوروں کی شہزادی 〃 〃
۳۰ - اورنگ زیب 〃 〃
۳۱ - چار سہیلیاں 〃 〃
۳۲ - پن شہزادی 〃 〃
۳۳ - چور اور گرہ کٹ 〃 〃
۳۴ - کلیان 〃 〃
"قاتل اور دیگر افسانے"
"ٹھونگے" "انقلام اسلام" (مصنفہ ایم۔ اسلم)

نہایت سستے اور ارزاں قیمت پر مفصل فہرست حسب ذیل پتہ سے طلب کریں :-
حاجی ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب بل روڈ۔ لاہور

غالبؔ کی خودداری

از جناب سید علی حیدر صاحب حسنین منزل گیا

مرحوم عبدالرحمن بجنوری آج بھی زندہ ہیں تو اپنی معرکۃ الآرا تحریر "محاسن کلام غالب" سے۔ لیکن کسی نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ کلام غالب کو ہمیشگی اور قبولیت عام بخشنے والی یہی تحریر تھی؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ جناب غالب خود فرما گئے تھے ؎

غالب اگر سخن دیں بودے آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

اور یہ بھی فرمایا تھا کہ ؎

نکتہ داں را در عدم ادراج قبولی بودہ است شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

مولانا حالی نے "یادگار غالب" لکھ کر حق شاگردی ادا کر دیا تھا۔ مگر انگریزی داں طبقہ اور کالج اور مدارس کے طلبا و اساتذہ نے کلام غالب کی معرفت "محاسن کلام غالب" ہی پڑھ کر عزت محسوس کی۔ بجنوری مرحوم نے غالب کو اتنا اونچا اٹھا لا کر بعد والوں کو بہت دنوں تک صرف وہی کچھ نظر آتا رہا جس کی طرف بجنوری مرحوم اشارہ کر چکے تھے۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ جہاں بجنوری مرحوم نے چنگو دکھلایا تھا وہاں یاروں نے تاروں کو سیاروں کا پتہ لگایا۔ پھر تو دھوئیں کا چاند اور دوپہر کا آفتاب بننے کیا دیر لگتی تھی۔ اس طرح ہندوستان کی روایتی "دیوتا پوجن" تو ہو گئی مگر غالب خود اپنے ہی اس شعر کا ہیولیٰ بن کر رہ گئے ؎

پوچھ مت رسوائیِ انداز استغنائے حسن دست مرہون حنا رخسار رہن غازہ تھا

اس کا ردعمل ضروری تھا چنانچہ ہو کر رہا۔ ایک طبقہ ایسا پیدا ہو ہی گیا جسکی رہنمائی کے لئے غالبؔ کے زمانہ ہی میں "ہر ہا الشعرا" منقار رنگ پیدا ہو چکے تھے۔ خلاصہ یہ کہ اس نقار خانہ میں ضرب المثل "طوطی" کی آواز بھی بلند نہ ہوئی کہ اس افراتفری کے بارہ میں غور و فکر کی دعوت دی جا سکے۔

غالبؔ کے فلسفی ہونے سے انکار نہیں اور بھی جتنی خوبیاں انکی بتائی جاتی ہیں سب کا اقرار ہے لیکن میں غالبؔ کی اس خصوصیت کو پیش کرنا چاہتا ہوں جو انکو اور شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔ فارسی اور اردو دونوں زبان کی شاعری چونکہ شاہی درباروں اور امرا کے خلات کی پیداوار ہے۔ اس لئے شعرا میں "خودداری" کی تلاش ہی بیکار ہے۔ لیکن غالبؔ کا فارسی کلام ہو یا اردو دونوں میں یہ خاص چیز یعنی "خودداری" پورے طور پر اودجاگر پائیں گے۔ یہ زمانہ کا ستایا ہوا اکثر پیسے کو محتاج مگر غیرت مند شاعر کس طرح نازک سے نازک موقعہ پر بھی نہیں چوکا اور اپنے کو لئے دئے آن بان سے گذر گیا۔ آیئے میں آپ کو چند مثالیں دے کر بتلاؤں۔

(۱)

موقعہ یہ ہے کہ غالبؔ کی پنشن بند ہو چکی ہے۔ بھائی دیوانہ ہو گیا ہے۔ نہایت سخت پریشانی کی حالت میں دہلی سے کلکتہ چلے ہیں راستے میں لکھنؤ پڑا۔ اسوقت نصیر الدین حیدر اودھ کے بادشاہ تھے۔ مگر دربار مغلیہ میں انکی حیثیت ایک وزیر یا صوبہ دار سے زیادہ نہ مانی جاتی تھی اور جناب غالبؔ "نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ" مصاحب و استاد شہنشاہ ہندوستان ہونے کے دعویدار تھے۔ اس پر بھی بڑی امید کے ساتھ شاہ اودھ کی شان میں وہ لاجواب قصیدہ لکھا جس کا جواب سوائے عرفی شیرازی کے اور کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ یہ غالبؔ ہی کا کام تھا کہ شاہ اودھ کے روبرو مدح و ثنا کے ساتھ یہ بھی کہہ گئے ؎

نستم مبرم و بر طبع گرانی نکنم از تو فرمان عطا وز وے احساں رفتم
ناز پروردۂ خلوت گہ آزادگیم کافرم گر بسر ایں پردۂ سلطاں رفتم
صیقل جوہر تیغم و شعر فروشی نکنم راہ مدح تو بسر گرچہ ایساں رفتم
من ہم از نخل کریمانم و نخلت نہ بود گر بدریوزہ بدرگاہ کریماں رفتم

آمدم بر درِ گنجور علی مدح سرائے — نہ بدر کوئی گنجینۂ خاقاں فرستم
مدحت نائب مہدی زمحبت باشد — شاد مانم کہ بہنجار محباں فرستم

اب ملاحظہ فرمائیے کہ افلاس نے تو یہاں تک نوبت پہونچادی کہ کھلے بندوں سوال کے سوا چارہ نظر نہیں آیا۔ مگر اس پر بھی کہا تو یہی کہا کہ بارِ خاطر ہونا نہیں چاہتا۔ آزادگی کی خلوت ناز کا پروردہ ہوکر اگر سراپردۂ سلطانی کچھ کرآیا ہوں تو کافر۔ صلا نہیں چاہتا۔ شعر فروشی نہیں کرتا بلکہ محض ایمان کا مقتضا تھا جو آپ کی تعریف کی۔ میں بھی بے منت بخشش کرنے والوں کا نام لیوا ہوں لہذا آپ کو بھی ایسا ہی سمجھ کر اگر آپ سے طالب امداد ہوا تو اس میں شرم کی کوئی بات نہیں جب آپ مولائے علی کے خوانچی ٹھہرے تو آپ سے مدد چاہنی کسی دنیاوی شاہی خزانے کی زنجیر ہلانے کے مرادف نہیں ہوسکتی۔ نائب مہدی کی مدح محض برنائے محبت ہوسکتی ہے۔ لہذا خوش ہوں کہ میری حاضری از راہ دوستی ہے۔

کیا اس کے بعد بھی غالب کی خودداری پر شک ہوسکتا ہے؟

(۲)

آئیے ایک واقعہ اور آپ کو سناتا ہوں متقدمین میں سے کسی سے مضمون لڑگیا۔ مخالفوں کو منظر انداز کیجئے۔ احباب و معترضوں نے اسکو توارد سے تعبیر کیا۔ جناب غالب اسکو بھی برداشت نہ کرسکے۔ اور اپنے ندرت آفریں تخیل سے شاعر متقدم کو "دزدِ متاعِ خویش" بنا چھوڑا۔ فرماتے ہیں ؎

مبر گمانِ توارد یقین شناس کہ دزد — متاعِ من زنہاں خانۂ ازل برداشت

(۳)

انتہا یہ ہے کہ حضور خداوند جلیل بوجب مناجات عرض کرتے ہیں تو وہاں بھی نہیں چوکتے۔ چنانچہ کہتے ہیں:۔

دگر ہم چنیں ست فرجام کار — کہ می باید از گردہ راندن شمار
مرا نیز یارائے گفتار دہ مگو — چو گویم برآں گفتہ زنہار دہ
دریں خستگی پوزش از من مجوئے — بود بندہ خستہ گستاخ گوئے
دل از غصہ خوں شد نہفتن چہ سود — چو ناگفتہ داں نہ گفتن چہ سود
ہمانا تو دانی کہ کافر نیم — پرستار خورشید و آذر نیم
نہ کشتم کسے را بہ اہریمنے — نہ بردم زکس مایہ در رہزنی
گرمے کہ آتش بگورم از وست — بہ ہنگامہ پرواز مورم از وست
من اندوہ گین ومے اندوہ ربائے — چہ می کردم اے بندہ پروردگائے
حسابے و رامش و رنگ و بوئے — زجمشید و بہرام و پرویز جوئے
کہ از باوہ تا چہرہ افروختند — دل دشمن و چشم بدسوختند
نہ از من کہ از تاب مے گاہ گاہ — بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
نہ بستاں سرائے نہ میخانۂ — نہ دستاں سرائے نہ جانانۂ
نہ رقص پری پیکراں بر بساط — نہ غوغائے رامش گراں در رباط
شبانگہ بہ بیمے رہ نوم شدے — سحرگہ طلبگار خوم شدے
تمنائے معشوقہ بادہ نوش — تقاضائے بیہودہ مے فروش
چہ گویم چو ہنگام گفتن گذشت — زعمر گراں مایہ بر من گذشت
بسا روزگاں بداں دادگی! — بسا نوبہاراں بہ بے بادگی!
بسا روز باراں و شب ہائے ماہ — کہ بود است بے مے بچشم سیاہ

افعیا پرانا بہمن ہی
سفالینہ جام من از مے تہی
بہاران و من در غم برگ و ساز
درخانۂ از بے نوائی فراز
جہان از گل و لالہ پر بوئے و رنگ
من و حجرہ و دامنے زیر سنگ
دم عیش جز رقص بسمل نہ بود
بہ اندازہ خواہش دل نبود
اگر تا نہ تم رشتہ گوہر شکست
وگر یافتم بادہ ساغر شکست
چہ خواہی ز دلق مے آلود من
بہیں چشم خمیازہ فرسود من!
زما ئیز گوہر بہا رم گذشت
زمے بگذرم روزگارم گذشت
نباساز کاری ز ہمسائگاں
بر سرمایہ چوئی ز مے مایگاں
سراز منت ناکساں زیر خاک
لب از خاک پوس خان چاک چاک
بگیتی درم بے نوا داشتے
دلم را اسیر ہوا داشتے
نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد
بہ ہر بار زر بیل بارم دہد
کہ چوں پیل زاں جا برانگیزمے
زرش برگدایان فرو ریزمے
نہ نازک نگارے کہ نازش کشم
بہ ہر بوسہ زلف دراز ش کشم
چوں زاں غمزہ نمشے بدل برخورد
رگ جاں غم نوک نشتر خورد
بد آں عمر ناخوش کہ می داشتم
زجاں خار در پیرہن داشتم
چو دل زیں ہوسہا بہ جوش آیدسا
زدل با نگ خونم بہ گوش آیدے
ہنوزم ہماں دل بہ جوش اندرست
زدل با نگ خونم بہ گوش اندرست
چوں آں نامرادی بہ یاد آیدم
بہ فردوس ہم دل نیاسایدم
دلے را کہ تیر تشکیبد بہ باغ
در آتش چہ سوزی بہ سوزندۂ داغ
نبوچی خورم گر شراب طہور
گجا زہرۂ صبح و جام بلور
دم شب روای ہائے مستانہ کو
بہ نیکا مہ غوغائے مستانہ کو
دراں پاک میخانہ بے خروش
چہ گنجائے شورش نائے و نوش
سیہ مستی ابرو باراں گجا
خزاں چوں نباشد بہاراں گجا
اگر حور در دل خیالش کہ چہ
غم ہجر و ذوق وصالش کہ چہ
چہ منت نہد نا شنا سا نگار
چہ لذت دہد وصل بے انتظار
گریزد دم بوسہ ا ندیشش گجا
فریبد بہ سوگند دیدش گجا
برد حکم و نبود دلیش تلخ گوئے
دہد کام و نبود دلیش کام جوئے
نظر بازی و ذوق دیدار کو
بفردوس روزن بہ دیوار کو
نہ چشم آرزومند و لالۂ
نہ دل تشنہ ماہ پر کالۂ کو
ازیں ہا کہ پیوستہ می خواست دل
ہنوزم ہماں حسرت آلاست دل
چو پرسش رگے را بکاود ز دل
دو صد دجلہ خونم تراود ز دل
بہ ہر جرم کز روئے دفتر رسد
زمن حسرتے در برابر رسد
بہ فرمائے کایں داوری چوں بود
کہ از جرم من حسرت افزوں بود

ہر آئینہ ہم چوں منے را بہ بند — تلافی فراغسر بود نے گزند
بدیں مویہ در روز امید دیم — بگریم بدآنساں کہ عرش عظیم
شود از تو سیلاب اچارہ جوئے — تو بختش بدآں گریہ ام آبروئے
وگر خون حسرت بدر کردۂ — زیادش قطع نظر کردۂ
گذشتم ز حسرت امید یم ہست — سفید آبروئے سفید یم ہست
کہ البتہ ایں رند ناپارسا — کج اندیش گبر مسلماں نما
پرستار فرخندہ منشور ست — ہوادار فرزانہ وخشور ست
بہ ہندا امید ستواری فرست — بہ غالب خط رستگاری فرست

غور فرمائیے کیا کیا کہہ گئے اور کس کس پیرائے سے کہہ گئے۔ شراب نوشی کا اقرار ہی نہیں بلکہ اسکا جواز اپنے ایک شعر میں کس طرح بیان کرکے رحم وکرم ستار عیوب کو مخاطب کیا ہے ؎

من اندوہ گین وتو اندوہ رہائے — چہ می کردم اے بندہ پرور خدائے

پھر سپر ڈال دیتے ہیں کہ "جمشید و بہرام و پرویز" کی طرح عیش کوشی کے لئے شراب تھوڑا ہی پی تھی۔ یہاں وہ ساز وسامان ہی میسر کہاں تھا؟ یہ تو محض "غم غلط" کرنے کی سبیل تھی۔ کیوں کہ حال تو یہ رہا کہ ؎

بہ آں عمر ناخوش کہ من داشتم — زجاں خار در بستر من داشتم

یعنی جسم کو اگر ایک ملبوس تصور کیا جائے تو اس جامے میں جان یوں تھی جیسے کسی کپڑے میں کوئی کانٹا پیوست ہوکر رہ گیا ہو۔ جنت کی ہجو ہے۔ اس ماحول کی دل کو گھبرا دینے والی مکیانی۔ حوروں کا جذبات سے عاری ہونا۔ جو کچھ بیان کیا گیا ہے صرف زور قلم دکھانے کی غرض سے نہیں بلکہ دنیا میں "تحمل یک معمائی" کے موثر ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ نظر سے اوجھل جنت جو عیش وعشرت کی آخری تخیل سمجھی جاتی ہے اسکے بالمقابل دنیا بالفاظ دیگر پیش منظر ماحول کس کس رخ سے زیادہ اثر انداز ہے۔ قدم قدم پر دعوت نگاہ وگوش اور طلب وتقاضائے نقد ہوش کی فراوانیوں میں انسان کھو جا سکتا ہے۔ چہ جائیکہ محروم وتشنہ رہنے پر بھی داد دستگاہ کے لئے پکڑا جائے ؎

بفرمائے کایں داوری چوں بود — گداد جرم من حسرت افزوں بود

اسی عذر کو اردو میں اس سے بھی نادر پہلو سے پیش کرتے ہیں ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اس مثنوی "گہربار" کا ایک شعر ہے کہ ؎

بہر جرم کز روئے دفتر رسد — زمن حسرتے در برابر رسد

اس مضمون کو اردو میں یوں ادا کیا ہے ؎

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ممکن ہے احباب فرمائیں کہ اس مثنوی میں سوائے گستاخی اور ڈھٹائی کے کیا دھرا ہے تو ایسے حضرات کی توجہ کا انعطاف غالب کے دو شعروں کی طرف چاہتا ہوں۔ جن میں انھوں نے اس "گستاخی وبے باکی" کا فلسفہ اپنی خودداری قائم رکھتے ہوئے بیان کر دیا ہے ؎

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے — شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
حب کرم رخصت گستاخی وبیباکی دہے — کوئی تقصیر بجز تحلت تقصیر نہیں

یہ چند کار وبار عالم اثر پذیر مصالح ایزدی نہیں۔ مگر انسان پر اس حیات فانی میں جو کچھ گذر رہا ہے وہ بسا اوقات اسکے ایمان کو متزلزل کئے بغیر نہیں رہتا۔ کشمکش حیات میں پڑنے والے جانتے ہیں اور تلخ کامان زندگی مانتے ہیں کہ تقسیم نعمائے الٰہی بظاہر کسی اصول کی پابند نہیں ہے۔ بقول ؎

خدا کے دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال — کہ آگ لانے کو جائیں ہمیسری مل جائے ن کا منتظر

باوجود اس کے پروانہ شمع طور بننے کی خواہش کی کوئی روک تھام نہیں ہے۔ اس "جذبہ بے اختیار شوق" کا ردعمل کیا کچھ نہیں ہوسکتا ہے بعور

غم نا امیدیٔ من مگر آں زماں بدانی — کہ برون زباغ آئی دگلے نہ چیدہ باشی

غالب دعوت دیتے ہیں کہ ؎

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

بات میں بات نکل آتی ہے۔ اسی شعر کو لیجئے۔ طور اور موسیٰ کے تلازمہ کے ساتھ داد سخن کوئی ہر شاعر دیتا آیا ہے مگر یا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بزرگ و اشرفت سے قطع نظر ہے یا پھر سپر افگنی اور پسپائی۔ بہ خلاف اس کے غالب نے بھی کہا سب ہی کچھ مگر نہ خودداری ہاتھ سے جانے دی نہ حضرت موسیٰ کا بظاہر کہیں نام بھی آنے دیا۔ اسی کو کہا ہے الکنایۃ ابلغ من الاشارۃ۔ میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ کلام غالب ہر قسم کی لغزشوں سے پاک ہے۔ مگر جس حمام میں سب ننگے نظر آئیں وہاں کسی موقعہ پر بھی کوئی ستر چھپائے ہو تو اسکی داد دینی چاہیے۔

اب مثنوی کے ہر بار کے اس شعر پر غور فرمائیے ؎

دل از غصہ خوں شد نہفتن چہ سود — چو ناگفتہ دانی نہ گفتن چہ سود

انسان مجبور ہے۔ واردات و ماحول کا اثر دل و دماغ پر مترتب ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ خود فروش زاہدان ریاکار چاہے انکار کریں لیکن شاعر تلخ سے تلخ حقیقت بھی بیان کر دیتا ہے۔ خدا کے حضور "دل از غصہ خوں شد" کے اظہار کی اس سے زیادہ اور کیا معقول وجہ ہوسکتی ہے کہ۔ ع۔ چو ناگفتہ دانی نہ گفتن چہ سود؟ دوسرا خوبصورت پہلو یہ بھی ہے کہ دل میں رکھ کر اس جذبہ کی پرورش سے یقینی یہ بہتر ہے کہ کھلی کھلی سنا کر جذبہ قابل گرفت کو ہلکا کر لیا جائے اس بارہ میں غالب ایک خاص "مذہب" رکھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔ ؎

کر دی ہے بدمستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ — جس کے جلوہ سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

اب "خودداری" کے چند شواہد اردو فارسی کلام غالب سے مختصراً عرض کئے جاتے ہیں۔ اہل ذوق لطف اندوز ہوں۔

(۴)

اپنی باتوں کی طرف خلق کی ناتوجہی سے شاعر کو اپنی ذلت کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے اظہار سے "خودداری" باز رکھنا چاہتی ہے۔ مگر غالب تندرت آفریں نہ تو واقعہ کو چھپاتے ہیں نہ خودداری کا خون کرتے ہیں۔ ؎

محرم راز جہاں روزگارم کردہ اند — تا بجز من گوش نہند خلق خوارم کردہ اند

(۵)

اصول تواضع کے سمجھنے میں عموماً غلطی ہوا کرتی ہے۔ ع۔ ہند شناخ پرمیوہ سرزمیں۔ صحیح سہی مگر ع۔ ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد۔ عاشق کی معراج تیغ یار پر قربان ہو جانا۔ گردن عرفی کو اس انتہا پر پہونچکر ابتدا نظر آئی ہے بقول ع۔ شہادت ابتدائی جنگ عشق است۔ بہرکیف عامۃ الورود تخمیل یہی ہے چنانچہ خود غالب ایک غزل میں یوں بھی فرما چکے ہیں کہ ؎

شہادت تھی مری قسمت میں۔ جو دی تھی یہ خو مجھکو — ہمان موارکو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

مگر معلوم ہوتا ہے کہ جب تنہا ہوا تو تواضع کے اصول معیار کو درست کرنے کے لئے کہا ؎

تواضع نہ کم نے تواضع غالب — بسا پایہ خم تیغش خمید نم بنگر

دیکھا آپ نے تیغ کو جھکا ہوا (خم) دیکھ لیا تب سر جھکایا ہے۔ چنانچہ سیدھے سپاٹ ہاتھ سے گردن کٹنے کو ذلت کا ثبوت بتلاتے ہیں ؎

چہ ناکس شمرد آنکہ می کشت مارا — بہ تیغے کہ ترکیب او خم ندارد!

(۶)

کسی موقعہ پر معشوق صاحب رقیب کی طرف آنکھ بچا کر پھاڑ کر دیکھ رہے ہوں اور غریب عاشق کی طرف ع۔ وہ اک نگہ کہ بظاہر

نگاہ سے کم ہے۔ یہی دریغ رکھتے ہوں۔ تو کہئے غیرت مند عاشق اس حالت میں خاک خودداری کا لحاظ رکھ سکتا ہے؟ مگر اس سخت جاں غالب سے یہ امید نہ رکھئے کہ وہ عام شاعروں کی طرح ملبلا اٹھے گا۔ اس موقعہ کے صرف دو شعر سن لیجئے ؎

تو اور سوئے غیر! نظر ہائے تیز تیز — میں اور دکھ ترے مژہ ہائے دراز کا

کہہ تو ڈالا "مژہ ہائے دراز" مگر غور فرمائیے تو "مژہ" نے جس کو برا یا جائے۔ وہ قریب ثبات ہوتا ہے یا جو "تیز تیز" نظروں کے وار پر لیا جائے؟ یہی غالب کا اصلی رنگ ہے۔ جوار دو میں بہ تکلف ادا ہوا ہے۔ مگر اسی کو فارسی میں کتنا صاف صاف نظم کرتے ہیں ؎

از دبا در ندارد دعوی ذوق شہادت را — نگاہش بار رقیب و خاطرش ما ماست۔ پنداری!

(۷)

غالب کے ایک شعر کے متعلق عجیب غلط فہمی ہوئی ہے۔ بظاہر وہ "خودداری" کے بالکل منافی معلوم ہوتا ہے اگر محض لفظی معنی کے اعتبار سے دیکھا جائے۔ لیکن معاملہ بالکل برعکس ہے جس طرح واسوخت میں فرضی دوسرا معشوق کھڑا کرکے اصلی "مخاطور نظر" کو جلی کٹی سنائی جاتی ہے۔ درانحالیکہ مخاطب خاطر ہوتی ہے صفائی اور تعلقات کی بہتری۔ بعض اشعار غالب نے بھی اسی طرز کے لکھے ہیں۔ پہلے شعر زیر بحث کو سن لیجئے پھر دوسرے اشعار اپنے بیان کے ثبوت میں پیش کرونگا۔ وہ شعر جس پر منافی خودداری ہونے کا اعتراض وارد ہوتا ہے وہ یہ ہے ؎

ستمکش مفتکوت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہو — تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

ایک مطلب تو اس کا یہ ہو سکتا ہے کہ جس کو غالب ہی دوسرے موقعہ پر فرما چکے ہیں کہ ؎

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک دوسرے پہ — آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہئے

لیکن اگر اس سے تشفی نہ ہو تو یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ وہ ایک شعر میں "واسوخت" لکھ رہے ہیں۔ طبیعت کی بذلہ سنجی نے اس قسم کے شعر لکھنے پر انکو بارہا مجبور کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

(۱) طاق شد طاقت ز عشقت بر کراں خواہم شدن — مہرباں شو ورنہ برخود مہرباں خواہم شدن

(۲) من آں نیم کہ دگر میتواں فریفتہ مرا — فریبتی کہ مگر میتواں فریفتہ مرا

(۳) خدارا اے بتان گرد دلش گردیدنی دارد — دریغا آبروئے دیر گر غالب بر مسلماں شد

(۴) گفتم ز شادی نبود م گنجیدن آساں در بغل — تنگم کشید از سادگی در وصل جاناں در بغل

(۵) ہمچنیں بیگانہ زی با من۔ دل و جان کسے — بدگماں گردم اگر دانم کہ می دانی مرا

(۶) ایں سخن حق بود و گاہی بر زباں ما نہ رفت — چوں تو خود گفتی کہ خوباں را دل از ما راست نیست

(۸)

معشوق کو پیشہ کے جور و جفا نے مجبور کر دیا ہے کہ "رحم" پکار اٹھیں۔ مگر ع ۔ ایں کیم از ہمہ اتراک۔ کہیں اس آسانی سے زیر ہوتے ہیں۔ کرتے تو ہیں وہی جو ایسے موقعہ پر ناگزیر ہے مگر اس طرح نہیں جیسا سب کرتے آئے ہیں۔ اس ترک کے پیترے ہی اور ہیں ؎

ہے دل شوریدہ غالب طلسم پیچ و تاب — رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

دیکھ لیا آپ نے؟ اپنے پر رحم غالب کیوں چاہنے لگے؟ خدا ان کے دشمن کو نصیب نہ کرے!

(۹)

خودداری کی کوئی انتہا ہے۔ اپنی طرف سے کسی کی شہادت بھی پیش کرنا گوارا نہیں ؎

غالب آزادۂ موحد کیشم — بر پاکی خویشتن گواہ خو شیم

اردو میں سہرے کی معذرت کے موقعہ پر کہتے ہیں ؎

جام جہاں نماہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

(۱۰)

حضرت حسن سنجری قدس سرہٗ کا ایک مقطع ہے جس پر آجتک خانقاہوں میں بقول غالبؔ "چا کہا ایثار رہیب و پیرہن خواہد شدن" کا منظر پیش ہوا کرتا ہے۔

اے حسن بوسہ بپایش زون از بے ادبی ست ۔۔۔ پائے نازک نشود رنجہ ز بوسیدن من

کوئی اور پیش رو شاعر اس سے زیادہ قریب المعنی شعر کہتا ہے

تو بخواب ناز بودی و من از رقیب پنہاں ۔۔۔ کف پائت بوسہ دادم زحنا شنیدہ باشی

مگر اب یہ بھی دیکھ لیجئے کہ ایسے موقعہ پر غالبؔ کے "خذ ما صفا ودع ما کدر" "گنجینۂ معنی کا طلسم" منکر کس پیرائے میں ظاہر ہوتے ہیں

لے تو لوں سوتے میں اسکے پاؤں کا بوسہ مگر ۔۔۔ ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

مابہ الامتیاز اظہر من الشمس ہے!

(۱۱)

"ہوا میرے بعد" "جفا میرے بعد" کی مشہور طرح میں خدائے سخن میر تقی میرؔ کے وقت سے اسوقت تک جتنے شعراء نے طبع آزمائی کی ہے ان کے کلام دستیاب ہو سکتے ہیں سب کو بچا لیجئے۔ اور غالبؔ کی پوری غزل اس زمین میں موجود ہے اس سے مقابلہ کر لیجئے۔ "خودداری" ہی خصوصی امتیاز نظر آئے گی۔ مجھے صرف ایک مطلع کسی متقدم شاعر کا یاد ہے

آکے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد ۔۔۔ نہ ری دشت میں خالی کوئی جا میرے بعد

مجھے اسی پر ندامت محسوس ہو رہی ہے کہ ایسے موقعہ پر جب غالبؔ کی اسی زمین کی غزل کی طرف خیال کر چکا ہوں تو یہ مطلع یاد ہی کیوں آیا۔ غالبِ خوددار کی روح مجھے معاف کرے! غالبؔ کی اس غزل کے چند شعر یہ ہیں:۔

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد ۔۔۔ بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا! ۔۔۔ ہوئی معزول انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے ۔۔۔ شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پر معنی ۔۔۔ ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق ۔۔۔ ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا ہیں دنیا میں کوئی ۔۔۔ کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ! ۔۔۔ کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

(۱۲)

جہاں کہیں موقعہ پایا ہے معشوق کے حسن بےنظیر کی مدح سرائی کرتے ہوئے اپنے عشق ناگزیر کو بھی ست وگریبان کر لیا ہے جو بطور خود شاہکار خودداری ہے

از عشق و حسن ما و تو، با ہم گذر گفتگو ۔۔۔ خسرو بمجنوں یکطرف شیریں بہ لیلیٰ یکطرف

(۱۳)

انتہائے خودداری ملاحظہ ہو کہ معشوق کے ہاتھوں قتل رقیب بھی گوارا نہیں رکھتے۔ وہ بھی اس طرح نہیں کہ۔ ع۔ سرو دستاں سلامت کہ تو بخرآزمائی۔ یا کہ۔ ع۔ رہے تو دست قاتل میں چلے تو میری گردن پر۔ بلکہ یہاں تو بات ہی کسی اور آہنگ سے کہی جاتی ہے سنئے

سعی در مرگ رقیبان گرا نجاں کردی ۔۔۔ می شناسم کہ چہ از ناز و ادا گشت تلف

(۱۴)

"وعدۂ فردا" پر جہاں تک میری نظر پہونچ سکی ہے کسی نے اظہار خوشنودی نہیں کیا ہے۔ بلکہ اسپر عموماً احتجاج ہی ہوا کیا ہے جو

بجائے خود منافی خودداری ہے۔ چونکہ اس میں ردوبدل کا جب امکان ہی نہیں تو پھر ع۔ بات بھی کھوئی التجا کرکے۔ "احتجاج فضول" کے سوا اور کیا ہے؟ غالب سے اسی موضوع پر بھی کچھ سن لیجئے۔

صد کشاد آزاکہ ہم امروز رخ ننمودہ ۔۔۔ مژدہ باد آزاکہ محزونی فردا کردہ

(۱۵)

کفر و اسلام کے امتیاز کو خودداری کے تحت کس طرح مٹاتے ہیں ملاحظہ فرمائیے

گوید صنعا رتوبہ کرد از کفر ناداں بندہ ۔۔۔ کز خود فروشیہائے دیں بخشش زیرداں خوش نکرد

ذرا "خودفروشی" کی ترکیب پر بھی نظر رہے!

(۱۶)

میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ "وفا" سے دور بھاگنے کا کوئی اعتراف کرنے والا ہے؟ شاعروں اور عاشقوں میں عملاً چاہے سب بیوفا ثابت ہو جائیں مگر اپنے منھ سے کوئی اقرار بیوفائی نہیں کرسکتا۔ چہ جائے کہ وفاداری کو منافی خودداری ثابت کرنے کے لئے کوئی آمادہ ہو ع۔ ایں خیال ست و محال است و جنوں۔ لیکن حضرت غالب کس صفائی کے ساتھ غریب کوہکن کے سر پر "زہرہ آہن گداز" تیشہ لگاتے ہیں۔ حضرت عشق پر بھی سچے ہاتھوں وار کئے بغیر نہیں رہتے

ننگ فرہاد م بفرسنگ از وفا دورا فگند ۔۔۔ عشق کافر شغل جاں دادن بمزدورا فگند

(۱۷)

کہاں تک خودداری کے لطائف و ظرائف بیان کئے جائیں۔ غالب کے اس شعر سے جس کو خودداری کا درس نہ ملتا ہو وہ اپنے فہم و ادراک کا ماتم کرے۔

رند ہنرا ریشیہ را طاعت حق گراں نبود ۔۔۔ لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

جس غزل کا یہ شعر ہے اس کا مطلع بھی خودداری کا آئینہ ہے

آنچہ فلک نخواست است ہیچ کس از فلک نخواست ۔۔۔ ظرف فقیہ مئے نجست بادہ ما گزک نخواست

(۱۸)

اپنے قدردان کی پذیرائی میں انسان کے لئے لازم البشری ہے کہ خودداری کی گرفت کو ڈھیلی ہو جانے دے۔ اسکو مستحسن بھی سمجھا جاتا ہے۔ غالب اس استحسان کو اسکی حد تک پہونچا کر بھی خودداری برقرار رکھتے ہیں

بک جاتے ہیں ہم آپ متاع نہیں کسی کا ۔۔۔ تیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر

(۱۹)

بس حد ہو گئی کہ "فاعتبروا یا اولی الابصار" کی تاثیر انفعال پر بھی حرف زن ہو کر رہی

ہنگامۂ زبونی ہمت ہے انفعال! ۔۔۔ حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

دوسری جگہ ذرا اس سے کمر و زگر خوب فرمایا ہے

دیوار بار منت مزدور سے ہے خم ۔۔۔ اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

(۲۰)

اب ذیل میں چند متفرق اشعار پیش ہیں۔ جن میں غالب کی شان خودداری خود آشکارا ہے

یاد از عدو نیارم و اں ہم ز دور تر ۔۔۔ کاندر دلم گذشتن با یار ہمنشیں ست

صہبا حلال زاہد شنگ ز ندہ دار را ۔۔۔ (مابشرط آنکہ یماں مجدم کشد

تشنہ لب بر ساحل دریا ز خشکی جاں دہم ۔۔۔ گر بموج افتد گمان چین پیشانی مرا

ہوں ترے وعدہ نکرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کش گلبانگ تسلی نہ ہوا

بقدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

ہم پر جفا سے ترک وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

رنج نومیدیٔ جاوید گوارا رہو!
خوش ہوں گر نالۂ زبونیٔ کشتہ تاثیر نہیں

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

لو - وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

اسی خیال کو فارسی میں دیکھئے کس طرح ادا کرتے ہیں ؎

پس از عمرے کہ فرسودم بکشتِ پارسائیہا
گدا گفت و بمن تن در نداد از خود نمائیہا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

عشق و مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

واں وہ غرور عزّ و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

(۲۱)

میں نے جو آپ حضرت کو غالب کی خوددارانہ روش کی طرف توجہ دلائی ہے - یہ بھی غالب غیور کو گوارا ہونا یقینی نہیں ہے اسلئے خود انکی زبان سے جو کچھ بطور معذرت عرض کرتا ہوں وہ اپنی جگہ خود ہی خودداری کا شاہکار ہے ؎

وکیل غالب خونیں دلم سفارش نیست
شکوۂ تو زبان را نجاز می خواہم

ایک اعتراض اور اس کا ازالہ

غالب پر اعتراض کرنے والے یوں بجا معلوم ہوتے ہیں کہ انکے تمام مجموعۂ کلام میں "لال قلعہ" سے انتقال شاہی پر داد حسی نوحہ خوانی بھی نہیں - بلکہ بجائے اس کے حکام انگریزی کی خوشامدیں اور اپنی بریت پر کافی زور قلم صرف ہوا ہے - اگر حقیقت حال بھی یہی ہے تو مندرجہ بالا نمونہ ہائے خودداری کا ماحصل "زی بکواس" سے زیادہ نہیں - اور بقول خود حضرت غالب رح - ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا - گویا میری تعمیر کردہ عمارت اپنی سربلندی اور سپہر شکوہی کے باوجود صرف اس اعتراض کے سم سے تودۂ خاکستر ہو کر رہ جاتی ہے -

لیکن میں پوری دیدہ ریزی کے ساتھ کہنے کو تیار ہوں کہ غالب کی خودداری اس اعتراض پر غور کر لینے کے بعد بھی محفوظ ہے

پہلی بات تو یہ ذہن نشین فرمائیے کہ غالب خود ضرور متوسل دربار معلیہ تھا مگر باعث جد وہ اوروں کا وظیفہ خوار تھا - درمیانی واسطہ قلعہ سے اس کا ذاتی تھا - لہذا اگر اس نے اہل کی طرف رخ کیا اور ہنگامی سلسلہ کی فروگذاشت کو جائز رکھا تو ابتذال لازم نہیں آتا - علاوہ ازیں ماحول کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے - جس عالم رستاخیز میں کہ - رع - بگڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق! اور ؎

لبسکہ فعال مایرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستان کا

عام مسلمان آبادی پر سردار و تہ تیغ بیدریغ ہو رہی تھی۔ غالب بحیثیت متوسل قلعہ سب کی نظروں پہ چڑھے ہوئے تھے۔ حفاظت خود اختیاری پر کاربند ہو کر اگر بچ نکلے تو کسی اخلاقی جرم کے مرتکب نہیں کہے جا سکتے۔

تاہم اس سے اہم سوال دوسرا کہ غریب بہادر شاہ کے ساتھ "درفش کاویانی" جو سرنگوں ہو گیا اور "وقار اسلامی" جو خاک میں مل گیا اس پر ایک غیور فرد ملت اور "ترک ایمک" ہو کر حضرت غالب کی خاموشی چہ معنی دارد؟ سیدھا سا جواب تو اس کا یہی کافی ہے کہ ع

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید!

لیکن اس سے طبایع صرف مشتعل ہو سکتے ہیں۔ تسکین و تشفی کے لئے یہ کہہ کر کوئی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ لہذا اس کے متعلق ذرا ٹھنڈے دل سے معروضات ذیل پر انعطاف توجہ چاہتا ہوں۔

(۱) "درفش کاویانی" تو اسی دن سرنگوں ہو چکا تھا جب "شاہ عالم" نے غلام قادر خاں کی دست درازیوں کی منظوم فریاد۔ "مادھوجی سندھیا" فرزند نجیب بند آصف الدولہ دانگریز" کو دستور من اندگی حضور پرنش کی تھی۔ احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ درانی کی تاخت و تاراج مرہٹوں اور سکھوں کی چیرہ دستیاں اپنا اپنا کام کر چکی تھیں۔ دکن کی "آصف شاہی" اور اودھ کی "ظل الٰہی" اپنی بے نیازیوں سے نام نہاد "شہنشاہ" ہندوستان کو انگریزوں کے حوالہ کر چکے تھے۔ اس شطرنج کے بادشاہ کو صحیح معنوں میں کون بادشاہ تسلیم کرتا تھا؟ کیا آپ نے سنا نہیں کہ۔ ع سلطنت بخشی ہوئی اتری ہوئی پاپوش کی؟

(۲) "وقار اسلامی" کی بھی خوب رہی۔ "اورنگ زیب عالمگیر" کے سوا صحیح معنوں میں اس کا ادراک بھی "تخت طاؤس" کی زینت بننے والوں میں تھا؟ "رنگیلے پرا" اور ان کے اخلاف غریب کیا جانیں "وقار اسلامی" کا کیا مفہوم ہے۔ یہ استحفاظ وقار اسلامی ہی کے لئے تھا کہ منتقم حقیقی کی مشیت بے پروا نے ان الارض یرثہا عبادی الصالحون کی مشروط دفعہ کے تحت مغلوں کا تختہ الٹ دیا۔

کیا غالب کی چشم حقیقت شناس سے یہ باتیں چھپی ہوئی تھیں؟

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل — کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

اب بھی غالب سے مطالبہ جاری رہے کہ "نغان دلی" میں وہ بھی گلا ملائیں تو اس کا تو جواب ہی نہیں، اس پر بھی اگر اصرار ہو تو میں یہی کہونگا۔ کہ اگر واقعی اس واقعہ کی اہمیت کے کچھ لوگ شدت کے ساتھ قائل ہیں تو وہ غالب کی خاموشی ہی سے درس عبرت لیں کہ اس میں "خودداری" اپنی آخری حدوں کو پہونچ گئی ہے۔ بقولہ

دوستاں زینہار غم مخورید — شادی دشمناں نمی خواہم!

اس بحث کو غالب کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔ سمجھنے والے کے لئے اس میں سب کچھ ہے

بزم سوختہ دود از چراغاں برنمی خیزد — بیاغ خون شدن بہار گلستاں برنمی آید

لیکن آخر میں اس سلسلہ بحث میں بے موقعہ نہ ہوگا اگر حضرت غالب کی ایک خاص غزل کے متعلق اپنے ایک عجیب و غریب تاثر کا اظہار کروں۔ گرچہ اس تاثر کے ثبوت میں پیش کرنے کے لئے مجھے کہیں کوئی مواد نہیں ملتا ہے اور میں اسکو فی الحال "اختراع ذاتی" کے سوا اور کسی نام سے تعبیر نہیں کر سکتا امکان چاہے نہ ہو مگر تقاضائے دل یہی ہے کہ غالب کے متعلق اس بحث میں میرے تاثر کا ثبوت بہم پہنچ جائے۔

اب غزل ملاحظہ ہو:۔

در گرہ از بس نماز کی رخ ماندہ بر خاکش نگر — وان سینہ سودن از تپش بر خاک نمناکش نگر

رحمے کہ جا نہا سوختے دل از جفا سر دشش بہ بیں — شوخے کہ خونہا ریختے دست از حنا پاکش نگر

آں کو بخلوت با خدا ہرگز نہ کردے التجا — نالاں بہ پیش ہر گسے از جور او فلاکش نگر

تا نام غم بردے زباں می گفت در یاد رمیاں — دریائے خوں اکنوں رواں از چشم سفاکش نگر

آں سینہ کز چشم جہاں ماند جاں پوشے نہاں — اینک بہ پیراہن عیاں از روزن چاکش نگر

تا گشتہ خود نفریں شکوہ نخست بر لب خندہ اش — زہرے کہ پنہاں می خورد پیدا ز تیر ما کش نگر

خواند با صد اثر اشعار غالب بحر — از نکتہ چینی در گذد فرہنگ و ادراکش نگر

اس غزل کو جب میں نے پڑھا تو یہی محسوس کیا کہ لال قلعہ کی تباہی کے بعد کوئی کم سن شاہزادہ ہوگا جس کا گہرا تعلق آخری تاجدار دہلی کے ساتھ جناب غالب کے علم میں تھا۔ مگر خود اس فرضی شاہزادہ کے بقاء آزادی و حیات کے لئے اس کا ظاہر کر دینا مناسب نہ تھا۔ تقاضائے وقت یہی تھا کہ جس قابل عبرت دریوزہ گری میں غریب کی بسر ہوتی تھی اسکو دل پر جبر و کبر برداشت کر لیا جائے۔ لیکن اگر ایسا واقعہ پیش آیا تھا تو اس نے تاثر ناگزیر تھا۔ اور اس کا قلمبند کرنا دلپذیر تھا۔ پھر بھی کس قدر دشوار کام تھا۔ ظاہر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت غالب کا ناذرہ کا رتعلق ہی کا انجا ہو کہ فراوانی سوز و گداز کے ساتھ ساتھ ممدوح کی علوے شان کو بھی اس ندرت سے بیان کر جائیں کہ سمجھنے والے ہی سمجھیں اور اغیار کی خاک سمجھ میں نہ آئے۔ جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں۔ کہ میرے پاس اس تاثر کا ثبوت نہیں ہے لیکن میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کس معشوق کی صفت ہو سکتی ہے ؎

آں کو بخلوت با خدا گر گزنہ کردے التجا — نالاں بہ پیش ہر کسے از جور افلاکش نگر
تا گشتہ خود نفرین شنو تا مکنت بر لب خندہ اش — زہرے کہ پنہاں می خورد پیدا ز تریاکش نگر

اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ کہ شاعروں نے معشوقوں کا مرثیہ تک لکھا ہے۔ داسوختوں میں ایجو سے بھی بازنہ آئے ہیں۔ مگر خدا کے لئے مجھے بتائیے کہ اس غزل میں جس معشوق کو پیش کیا گیا ہے وہ عامۃ الورود "ذہنی پیداوار" ہو سکتا ہے؟ غزل کا ہر شعر غمازی کر رہا ہے کہ ؎

سراسر عجز ہائیت لاجوردی بود و من عمرے — معشوقی پرستیدم ملائے آسمانی را (غالب)

ایک اور غزل حضرت غالب نے ایسی ہی مرصع لکھی ہے۔ مگر اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ عام شاعرانہ تخیل آفرینی سے زائد کچھ اور بھی مفہوم ہے۔ حالانکہ خاتمۂ غالب اس غزل میں بھی اوسی طرح درافشاں ہے ؎

سرشک افشانی چشم تر شش بیں — شہ خوباں و کج گوہر شش بیں
ادائے دلستانی رفت از یاد — ہوائے جاں ستانی در سرش بیں
بجا ماندہ عتاب و غمزہ و ناز — متاع ناروائے کشورش بیں
گزشت آں کز غمش ما بنجر بود — بہ خویش از خویش بے پروا ترش بیں
مہ نو کردہ کاہش پیکر کش را — بچشم کم ہماں مہ پیکرش بیں
چکد در سجدہ ہوں از چشم مستش — گدازش ہائے نقش کافرش بیں
خدا دندش بخون ما مگیراد — بہ بیتابی نگر بر خنجر و سغش بیں
بہ سم چارہ جوئی پیش غالب — شکایت سنج چرخ و اخترش بیں

مطلع اور دو بعد کے شعروں سے کچھ شبہ سا ہوتا ہے کہ اس غزل کا معشوق بھی کوئی غیر معمولی جنس ہے مگر بعد کے اشعار اس معاملہ کو صاف کر دیتے ہیں۔ ممکن ہے یہ میرا ذاتی خیال سمجھا جائے لیکن فی الحال میرے لئے سوائے اس کے چارہ ہی کیا ہے۔ کہ ؎

باکہ گویم سراین معنی کہ نور سنبل و دست — در دماغ مائل و در چشم لیلیٰ آتش است

مجھے افسوس ہے کہ۔ ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم کے مصداق مضمون کافی طویل ہو گیا۔ لیکن میرے علم نے لاحاصل بحث بردے کار نہیں آئے۔ اب میں اس مضمون کو اس گذارش پر ختم کرتا ہوں کہ اس خود دار شاعر سے اور کچھ نہیں تو یہ سبق ضرور ملتا ہے کہ ہم اگر اپنی خودداری برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ تو غالب کو اردو شاعر کی حیثیت سے اتنا ہی مرتبہ دیں جتنا عزت روا عزت کر سکے۔ عام ازیں کہ علامہ اقبال مغفور اور عبدالرحمن بجنوری مرحوم نے غالب پرستی میں انتہائی غلو کیا ہے۔ اپنی اس گذارش کیلئے میری معذرت یہ ہے ؎

ندانم سلسبیلم داد یا کوثر نمیدانم
کہ ساقی ریخت آبے در دلم کاتش بجوش آمد

موجودہ طرز آفرینش اور اسکے اجزاء

از جناب محمد مظفر حسین صاحب ایڈوکیٹ

کسی چیز کی "آفرینش" یعنی صنعتی چیزوں کے بنانے اور زراعتی چیزوں کے پیدا کرنے یا فطری اور معدنی چیزوں کے حاصل کرنے کے طریقے کی اگر تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا سنگ بنیاد یا پیدا کیا جانا یا حاصل ہونا چند اجزاء کے اشتراک عمل کا نتیجہ ہے، جن چیزوں کے اشتراک عمل کا یہ نتیجہ ہے۔ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو وہ دو مختلف حصوں میں نظر آئیں گی۔ اول تو وہ مادی چیز یا چیزیں جو اس مخصوص چیز کے بنانے یا پیدا کرنے یا حاصل کرنے میں کام میں لائی گئیں۔ دوئم وہ آدمی جو اس مادی چیز کو اس طرح کام میں لایا۔ بنیادی طور پر ان دو اجزاء کا اشتراک عمل چیزوں کے بنانے پیدا کرنے اور حاصل کرنے کے لئے کافی ہے۔ مثلاً ایک جنگلی آدمی کے غذا حاصل کرنے کا طریقہ درختوں کے پھل یا پتے اپنی ضرورت کے لئے توڑ لینا ہے۔ یا جنگلی جانوروں کو بلا کسی ہتھیار کی مدد کے پکڑ لینا ہے ظاہر ہے کہ اس طریقے سے محض معمولی ضرورتیں محض معمولی طور پر پوری ہو سکتی ہیں۔ اور جنگلیوں کو بہت جلد کسی ایسی چیز کی تلاش شروع ہو جائے گی جو ان کے کام میں مدد دے سکے۔ مثلاً جانوروں کے پھنسانے کے پھندے یا اوپر کے پھلوں تک پہونچ سکنے کے لئے بانس وغیرہ۔ اب پھل زیادہ ٹوٹ سکیں گے اور جانور زیادہ آسانی سے پکڑے جا سکیں گے۔ مگر اس زیادتی تحصیل میں ایک اور نئی چیز کا اشتراک عمل شامل ہوا۔ یعنی مادی چیز جو حاصل کی جائے یا جس پر کوئی عمل کیا جائے اور وہ جو اس چیز کو حاصل کرے یا اس پر عمل کرے اس کے علاوہ ایک اور چیز مثل اوزار یا ہتھیار کے جو اس کے کام میں مدد دے اور اس کی کوشش اور محنت کے پھل کو بڑھا دے۔

اس تجزیہ سے یہ معلوم ہوا کہ کسی چیز کو بنانا پیدا کرنا یا حاصل کرنا حقیقتاً نام ہے کسی موجودہ مادی چیز پر کچھ عمل کر کے اس پر اختیار حاصل کرنے کا یا اس کو پہلے سے زیادہ مفید بنا دینے کا ورنہ انسان خود کوئی مادی چیز پیدا نہیں کر سکتا۔ جب ہم کہتے ہیں کہ لڑھئی نے کرسی بنائی تو اس کا محض یہ مفہوم ہوتا ہے کہ لکڑی یا کاٹھ پہلے ایک کم مفید صورت میں تھا۔ لڑھئی نے اس پر عمل کر کے اس کے فائدہ میں اضافہ کر دیا اور وہ اب پہلے سے زیادہ مفید اور کار آمد ہو گئی۔ سر اس قسم کی مادی چیز جس پر عمل کر کے اس کو اور زیادہ مفید بنا دیا جا سکے "میٹیریل" کہلاتی ہے۔ مثلاً خود زمین یا تمام چیزیں مثلاً اناج یا زمین کی اور پیداوار مثلاً روئی۔ سن۔ جوٹ وغیرہ وغیرہ۔

اسی تجزیہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی مادی چیز کا زیادہ مفید ہو جانا حقیقتاً کرشمہ ہے انسان کے عمل کا ورنہ کم مفید صورت میں تو چیز پہلے سے موجود ہی تھی۔ تو یہ زیادہ مفید بنا دینے کی طاقت اور قوت جو انسان میں ہے وہ اصطلاح میں "لیبر" یا محنت کہلاتی ہے۔ اور کل چیزوں کا حصول یا افزائش فائدہ مندی بالکل اسی پر منحصر ہے۔ یہی سرچشمہ ہے کل چیزوں کے حصول کا۔ کل "دولت" کا یہ بھی معلوم ہوا کہ "لیبر" کی یہ قوت اور صلاحیت اوزار یا ساز و سامان کی مدد سے بڑھ جاتی ہے۔ اور یہ اوزار یا ساز و سامان ایک بہت ضروری چیز ہے پیداوار کے بڑھانے کے لئے یا پیداوار کو اور زیادہ مفید بنانے کے لئے۔

اگر ہر شخص ہر وہ چیز جس کی اسکو ضرورت ہو خود بنالے اور اپنی ضرورت آپ پوری کر لے تو معاملہ بالکل اسی کی ذات تک محدود رہے۔ کسی دوسرے آدمی اور اس کے درمیان میں کسی قسم کے معاملہ کی ضرورت نہیں۔ خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ کا معاملہ ہو۔ وہی کارندہ بھی ہو وہی مصرف لینے والا بھی۔ وہی پیدا کرنے والا محنت کرنے والا اور خرچ کرنے والا۔ الغرض کل معاشی معاملات کا وہ خود مرکز ہو۔ نہ اسکو کسی اور کو کچھ دینا ہو اور نہ کسی غیر کو کچھ اس کو دینا پڑے۔ "حق المحنت"۔ "معاوضہ"۔ "تبادلہ" کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ مگر جب صورت حال یہ نہ ہو۔ کیوں نہ ہو کی بحث نہیں۔ یعنی یہاں پر اسکی ضرورت نہیں۔ یہاں پر اس بحث کی بھی ضرورت نہیں کہ صورت حال ایسا نہ ہونا مناسب ہوا یا نامناسب۔ جائز طور پر ہوا یا ناجائز طور پر۔ کہنا صرف یہ ہے کہ جہاں صورت حال یہ نہ ہو اور بدل کر یہ صورت اختیار کرے کہ اپنی ضرورت کی کل چیزوں کو بجائے خود بنا لینے کے وہ محض دو ایک چیز بنانے لگے۔ مثلاً جوتے یا کپڑے اور اپنی اور کل ضرورتوں کے پورا کرنے کا یہ طریقہ نکالے کہ اور چیزوں کے پیدا کرنے والوں

اور بنانے والوں کو اپنی بنائی اور حاصل کی ہوئی چیزدے اور اس کے عوض میں اُن سے انکی بنائی ہوئی چیزیں لے۔ اس صورت میں معاملات ذرا پیچیدہ ہو جائیں گے۔ اپنی کل ضرورتوں کو وہ پہلے کی طرح خود پورا نہیں کر سکے گا۔ اور اس کو کسی اور سے مدد لینا ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ ایک نیا معاشی عمل یعنی "تبادلہ" بھی رونما ہوگا۔ تبادلے کے ساتھ ساتھ لگے انداز میں یہ بھی سوال ہوگا کہ دو چیزوں میں شرح تبادلہ کیا ہوگی مثلاً جوتے اور کپڑے میں کیا نسبت ہوگی۔ جوتوں اور غلوں میں کیا نسبت ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ بہرکیف باوجود ایک نئے معاشی عمل "تبادلہ" کے رواج پاجانے کے معاملات پھر بھی بہت کچھ سدھرے ہوئے اور صاف ہوں گے۔ مگر فرض کیجئے کہ کسی چیز کی "آفرینش" کا طریقہ ذرا اور پیچیدہ ہو جائے یعنی چیزوں کے بنانے پیدا کرنے اور حاصل کرنے میں ایک نہیں دو نہیں بلکہ متعدد اشخاص حصہ لینے لگیں اور یہ تیار شدہ مال مصرف لینے اور خرچ کرنے والوں تک پہونچانے میں ان کے علاوہ اور بھی چند اشخاص شامل ہو جائیں۔ اب معاشیات کی پہلی سادہ صورت اور بدل جائے گی۔ ایک ہی شخص کل معاشی معاملات کا مرکز نہ رہ سکے گا۔ کام ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ مثلاً کوئی صرف جوتے بنائے گا کوئی صرف کپڑے بنائے گا کوئی صرف غلے اگائے گا اور اکیلے نہیں بلکہ اور شرکا کی مدد سے معاملات اور اس سے بھی پیچیدہ صورت اختیار کر سکتے ہیں یعنی یہ کہ جوتے بنانے والے خود اپنی خواہش اور مرضی سے نہیں۔ اپنے ذاتی طور پر نہیں۔ براہ راست جوتا بنانے کے کام کو اپنی روزی کا ذریعہ بنانے کے لئے نہیں بلکہ ایک دوسرے کی فرمائش سے یا حکم سے اس کے لئے جوتے بنانے یا کپڑے بنانے لگیں یا اناج اگانے لگیں اور فرمائش کرنے والے اور حکم دینے والے کی چیز مصرف میں لینے والے کہیں دور و دراز ملک میں رہتے ہوں جہاں انکو پہونچانا خود اس کے لئے ناممکن ہو اور محض اس قسم کا کام انجام دینے کا کام کچھ لوگ کرنے لگیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں بھی فی نفسہٖ بات تو وہی رہی یعنی ایک شخص نے بنایا اور ایک شخص نے مصرف میں لایا مگر اس بدلی ہوئی حالت کے اعتبار سے اب پھر ایک نئے تجزیے کی ضرورت ہو گئی یعنی ان اتنے کے بیچ میں آجانے والوں اور ان کی خدمت کی۔ اس پیچیدہ معاشی معاملے اور پہلے والے سادہ کیفیت میں تین فرق ہوئے۔ ایک تو یہ کہ بنیادی بنانے والا جو بالکل شروع میں محض اپنی ضرورت پوری کرنے کیلئے بناتا تھا اور بعد میں بھی گو محض اپنی ضرورت پوری کرنے کیلئے نہیں مگر پھر بھی اپنے طور پر ضرور بناتا تھا اب کسی اور کیلئے اور اسکے حکم سے بنانے لگا۔ دوسرے ایک قسم کا گروہ پیدا ہو گیا جو دور و دراز کے لوگوں کی ضرورت محسوس کر کے چیزوں کے بنائے جانے کا حکم دینے لگا۔ غالباً اس حکم کی تعمیل کیلئے کچھ خرچ بھی بنانے والے کو دینے لگا اور بنائے ہوئے مال کی بکری اور نکاس کا جزو کل ذمہ دار ہو گیا۔ تیسرے ایک اور گروہ پیدا ہوا جو محض بار برداری اور نقل و حمل کا ذمہ دار ہوا۔ سوال یہ ہے کہ "نفسِ آفرینش" میں ان کا کیا حصہ ہے؟ یہ کوئی مفید اور کارآمد کام کرتے ہیں یا نہیں؟ انکی وجہ سے فائدہ مندی میں افزائش ہوتی یا نہیں؟ یہ کسی معاوضہ کے مستحق ہیں یا نہیں؟ خود بنانے والے کا اب کیا حصہ رہا؟ وہ کس معاوضہ کا مستحق ہے؟ غرض "حق المحنت"، "معاوضہ" اور "منافع" کا سوال پیدا ہوا۔

پہلی والی سادہ شکل میں خود محنت کرنے والا ہی مصرف میں لانے والا بھی تھا اور محنت کرنے کی غرض ہی ذاتی ضرورت دور کرنی تھی جب محنت کرنیوالے نے اپنی کل ذاتی ضرورتوں کو آپ اپنی محنت سے دور کرنے کی کوشش چھوڑ دی اور محض ایک ہی چیز کے بنانے میں مصروف ہو گیا تو وہ ہر اس چیز کیلئے جسکو وہ خود نہ بناتا تھا کسی اور کی بنائی ہوئی چیز کا محتاج ہو گیا اور اسکی یہ ضرورت "تبادلہ" کے ذریعہ سے پوری ہوگی مثلاً دو آدمیوں نے جوتے اور کپڑے بنانے جوتے بنانے والے نے اپنی ضرورت سے بہت فاضل جوتے بنائے اور فاضل محض اسلئے بنائے کہ اسکو جو توں کی ضرورت ہوا سکو جوتے دے دے اس سے اسکی بنائی ہوئی چیز مثلاً کپڑے لے۔ اسی طرح کپڑے بنانے والے نے بھی اپنی ضرورت سے بہت فاضل کپڑے بنائے اور فاضل اس لئے کہ اس فاضل پیداوار کو کسی کو تبادلے میں دے اور اس سے اس کے بدلے میں اپنے مصرف کی کوئی چیز مثلاً جوتے لے۔ یہاں پر دو شخص ہیں۔ ایک جوتے بنانے والا اور دوسرا کپڑا بنانے والا اور ان دونوں میں سے ایک جوتے اس لئے فاضل بنائے ہیں کہ کپڑوں سے بدلے اور دوسرے نے کپڑے اسلئے فاضل بنائے ہیں کہ اس کے بدلہ میں جوتے لے۔ جوتے بنانیوالے کے پاس جوتے ضرورت سے فاضل ہیں۔ کپڑے بنانے والے کے پاس جوتے نہیں ہیں جوتے بنانے والے کے پاس جو فاضل جوتے ہیں خود اس کے لئے بیکار ہیں یا کم از کم اس کے لئے اتنے مفید نہیں جتنے کپڑے دانے کیلئے مفید ہیں۔ جس کے پاس جوتے ہیں ہی نہیں۔ اسی طرح کپڑے بنانے والے کے پاس جو فاضل کپڑے ہیں وہ اس کیلئے اتنے مفید نہیں جتنے جوتے والے کیلئے جسکے پاس کپڑے ہیں ہی نہیں۔ یہ اگر اپنے فاضل جوتے جو اس کیلئے کم مفید ہیں کپڑے والے کو دیدے تو اس کے فائدہ رسانی میں اضافہ ہو جائے۔ اسی طرح اگر دوسرا اپنے فاضل کپڑے جوتے والے کو دیدے تو اس کے فائدہ رسانی میں اضافہ ہو جائے۔ تبادلہ کے ذریعہ یہ عمل بالکل آسانی سے ہو جاتا ہے۔ جوتے والا کپڑے والے کو جوتے دیدے اور اسکے بدلے میں کپڑے لے۔ گویا تبادلے کا عمل کم مفید چیزوں کو زیادہ مفید بنا دیتا ہے۔ اور اسکے فائدے میں

اضافہ کرتا ہے۔ گویا تبادلہ بھی ٹھیک اسی طرح کا کام ہے جیسے جوتا یا کپڑے بنانا جس سے چمڑا اور روئی کم مفید صورت سے زیادہ مفید صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اگر کوئی شخص "تبادلہ" کی خدمت وسیع پیمانے پر اپنے تعلق لے لے۔ تو وہ بھی ایک مفید اور کارآمد کام کرتا ہے بالکل اسی طرح جیسے جوتا بنانے والا یا کپڑا بنانے یا بنے والا یا غلہ اگانے والا۔

اسی طرح وہ شخص بھی جو اوروں کی ضرورتوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ ان کے پوری ہونے کے لئے بنانے والوں کو بنانے کا حکم دیتا ہے۔ چیزوں کو اپنے طور پر بنواتا ہے۔ اور بنی ہوئی چیزوں کو اہل ضرورت تک پہونچواتا ہے۔ ایک مفید اور کارآمد کام کرتا ہے۔ ان چیزوں کی ترتیب میں اس کا بھی ایک حصہ ہے۔

معاشی معاملات کے دہرا اور پیچیدہ ہوجانے کے بعد اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس طرح کے کام کرنے والے کثیر مقدار میں ساز و سامان یا آلات اور اوزار کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اور "آفرینش" کے اس جزو کو ادا کرنے کے لئے کسی اور کی مدد لیتے ہیں۔ جب معاشی ترقی اور کاروبار اس حد تک پہونچ جائے تو ظاہر ہے کہ حکم دے کر بنوانے والوں اور بار برداری کا سامان کرنے والوں کی طرح ایک گروہ اس قسم کے لوگوں کا بھی ہوجائے گا۔

اب اگر پھر کسی چیز کے "بنانے" "پیدا کرنے" "یا حاصل کرنے" کے طریقے کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا بنکر تیار ہونا یا پیدا کیا جانا۔ یا حاصل ہونا بجائے صرف دو اجزا کے اشتراک عمل کے نتیجہ ہونے کے چند اور اجزا کے ملنے کا نتیجہ ہے۔ ان میں دو تو وہی ہیں۔ یعنی وہ مادی چیز جس پر عمل کیا جائے اور وہ آدمی جو عمل کرے مگر معاملات کے پیچ نے دو اور کا اضافہ کردیا یعنی وہ جو کام کروائے۔ یعنی جو تنظیم کی خدمت اپنے متعلق لے لے۔ اور وہ جو ساز و سامان اور آلات و اوزار بہم پہونچائے۔ ساتھ ہی ساتھ "تبادلہ" جو شروع میں اکا دکا پیدا اور بعد میں محض ایک آسان عمل تھا اور دو بنانے والوں میں براہ راست ہوجاتا تھا۔ اب بہت پیچیدہ عمل ہوگیا اور اس میں بہت سے مدارج ہوگئے۔

معاشی ترقی کے ساتھ معاشی معاملات اور پیچیدہ ہوتے ہوگئے بلکہ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ معاشی ترقی حقیقتاً معاشی معاملات کے پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوجانے کا نام ہے۔ روز بروز یہ پیچیدگی بڑھتی گئی یہاں تک کہ ایک ایک جزو کام کے خود الگ الگ ٹکڑے ہوگئے اور انکے کرنے والوں کی تعداد اور قسمیں اتنی ہوگئیں کہ انتہا نہیں۔ کام کے اتنے بڑھ جانے کے ساتھ ساتھ ہر کے ادا کرانے کا طریقہ بھی بدلتا گیا اور ہر کے ادا کرنے کے لئے ایک خاص قسم کے نظام کی ضرورت ہوئی۔

بہرکیف تفصیلات کو الگ کردینے کے بعد اور اجمالاً اگر موجودہ دور کے اجزا آفرینش کا تجزیہ کیا جائے تو اس تجزیہ کا خلاصہ یہ ہے کہ "آفرینش" کا کام چار قسم کے لوگوں نے اپنے تعلق لے لیا ہے۔ آفرینش ان چاروں کی اشتراک عمل کا نتیجہ ہے۔ اس کے مکمل کرنے میں ایک ایک قسم کا گروہ شامل ہے۔ اور اس کے مقصد کو پورا کرنے کا ذریعہ "تبادلہ" ہے۔

۱ سرمایہ داری نظم میں سب سے ممتاز اور جلیل القدر وہ گروہ ہے جس نے زمین پر قبضہ کرلیا اور کل زمین معدنیات اور دخام صنعتوں پر قابض ہوبیٹھا

۲ دوسرا وہ گروہ ہے جو مختلف طریقوں پر ایک کثیر سرمایہ کا مالک ہوبیٹھا۔

۳ تیسرا وہ گروہ ہے۔ جو تنظیم اور ترتیب کا کام ادا کرتا ہے۔

۴ چوتھا وہ گروہ ہے جو ان تینوں کے ہاتھوں اپنی محنت بیچتا ہے۔ اور کارخانوں۔ ملوں۔ اور فیکٹریوں میں کام کرتا ہے۔

یہ چاروں گروہ کے لوگ مل کر آفرینش کا کام انجام دیتے ہیں۔ اور ہر کو اپنا اپنا حصہ تبادلہ کے وسیلے سے ملتا ہے۔ دنیا کی کل دولت تبادلہ کے ذریعہ تقسیم ہوتی ہے۔ اور اسی تقسیم میں ہر ایک کو اپنا اپنا حصہ ملتا ہے۔ جب معاشی ارتقا اس حد کو پہونچ گیا یہ گروہ بندی ہوگئی۔ ان نئے حالات کی مطابقت میں ایک ڈھانچہ کھڑا ہوگیا اور معاشی تنظیم ان بناؤں پر ہونے لگی تو گویا موجودہ دور شروع ہوگیا۔ سرمایہ داری وجود میں آگئی

یہ نظم آفرینش اور تقسیم معاشی حیثیت سے نہایت پیچیدہ ہے۔ تنظیمی حیثیت سے ناقص ہے۔ تاریخی طور پر ناجائز طور پر عمل میں لایا گیا ہے۔ اجتماعی حیثیت سے ظلم رساں ہے۔ اخلاقی حیثیت سے نامناسب اور ناجائز ہے۔ سیاسی نقطہ نگاہ سے محض جبری ہے اور مجموعی حیثیت سے ناقابل برداشت ہے۔ مگر جیسا کہ اوپر کہا جاچکا یہاں ان پہلوؤں سے بحث نہیں یہاں صرف موجودہ طرز آفرینش اور اس کے اجزا کا بیان مقصود تھا۔ محض بیان واقعات۔ محض ایک تجزیہ۔

×××　　×××　　×××　　×××　　×××

تاریخ صقلیہ پر ایک نظر

از جناب پروفیسر ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب ایم اے - پی ایچ ڈی (برلن)

جزیرۂ صقلیہ (Sicily) جس کے عہد اسلامی کی تاریخ ہمارے فاضل دوست سید ریاست علی صاحب ندوی نے دو جلدوں میں لکھی ہے، بحر متوسط یعنی بحر روم کے قلب میں واقع ہے۔ اور اپنے مرکزی محل وقوع کے سبب سے نہایت قدیم الایام سے مختلف سلطنتوں اور تمدن کا مقام اتصال رہا ہے۔ اہل فنیقیہ، اہل یونان، اہل روما اور اہل اسلام سبھی نے اس جزیرہ کو قرناً بعد قرنٍ اپنا جولانگاہ بنایا، اور اس سرزمین پر باری باری حکومت کا ڈنکا بجایا۔ صقلیہ کے میدانوں میں نہ صرف مختلف اقوام کے نہ دو آدمیوں نے ایک دوسرے کے مقابلہ میں اپنی بہادری کے جوہر دکھلائے بلکہ متعدد مذاہب اور مختلف تمدنوں نے بھی اپنی اپنی مابہ الامتیاز خصوصیات کی بہار دکھلائی اور اس ملک کی ذہنی، اقتصادی اور تمدنی ترقی میں اپنی بساط بھر کم و بیش حصہ لیا۔ غرضکہ صقلیہ کی تاریخ محض ایک جزیرہ کی تاریخ نہیں ہے بلکہ کئی ایک متمدن اور ترقی یافتہ اقوام کا سنگم ہونے کے سبب سے "تاریخ مغرب" کا خلاصہ ہے۔ صقلیہ کے عہد اسلام کی تاریخ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ عربوں کا تمدن جہاں ایک طرف اندلس کے راستہ سے یورپ پر اثر انداز ہوا وہاں دوسری طرف صقلیہ اور جنوبی اطالیہ کے واسطہ سے بھی اس کے گوناگوں اثرات یورپ تک پہنچے۔

باوجود اس امر کے کہ یہ عہد سیاسی اور تمدنی لحاظ سے اس قدر اہم ہے، چند سال پیشتر تک کوئی مستقل اور جامع تاریخ اس عہد کی اردو زبان میں موجود نہ تھی سارا اردو تو کیا حال کی عربی اور انگریزی تالیفات میں بھی جو مواد اس موضوع پر تھا وہ اتنا ناکافی تھا گویا نہ ہونے کے برابر تھا۔ پچھلی صدی میں صرف اطالین زبان میں ایک مغربی مستشرق اماری (Amari) نے اس باب میں ایک مفصل تاریخ تین مجلدات میں لکھی تھی جس کا عنوان "تاریخ مسلمانان صقلیہ" ہے۔ مگر وہ بھی ایک مدت سے ناپید تھی اور زبان کی غرابت کے سبب سے ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کی دسترس سے باہر تھی۔ ہمیں سید صاحب موصوف کا غایت درجہ ممنون ہونا چاہئے کہ ان کے علم و فضل اور شوق تحقیق کی برکت سے یہ کمی بطریق احسن پوری ہو گئی۔

سید صاحب موصوف نے تاریخ صقلیہ لکھ کر جس احسن طریق پر اس کی کمی کو پورا کیا ہے اس کا کچھ اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ تصنیف دو جلدوں اور ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسے موضوع پر جس کے متعلق ہماری زبان کی کل کائنات چند ایک صفحوں سے زیادہ نہ تھی، فاضل محقق نے دو جلدوں میں ایک ضخیم کتاب تیار کر دی۔ مگر اس عجوبہ زائی کا راز ان کے علمی شوق ان تھک جستجو اور مآخذ کے استقصاء میں پوشیدہ ہے۔ دس سال کی شبانہ روز محنت شاقہ اور دیدہ ریزی سے انھوں نے عربی زبان کے تمام اہم تاریخی، جغرافی اور ادبی مصادر کو کھنگال کر اپنے حسب مطلب جواہر ریزے جمع کئے ہیں اور پھر انکو خوبی کے ساتھ ترتیب دیکر ایک بدیع المثال مرقع تیار کیا ہے۔ جو اپنے موضوع کی اہمیت اور ندرت کے لحاظ سے تمام مشرقی لٹریچر میں اپنی نظیر آپ ہے۔ عرب مورخین کے بیانات کے ساتھ ساتھ مغربی مورخوں کی تحریروں کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اس طریق عمل سے واقعات تاریخی کے متعلق مصنف کو صحیح رائے قائم کرنے اور ان کی اصلیت تک پہنچنے میں بڑی مدد ملی ہے۔

غرض کہ تاریخ صقلیہ اپنے حسن ترتیب تفصیل بیان، اصابت رائے اور اصول تاریخ نویسی کی پابندی کے لحاظ سے شبلی اسکول کی بہترین تصانیف میں سے ہے۔ روایت ہے کہ حضرت سلیمان نے اپنی روحانیت کے زور سے جن تسخیر کر لئے تھے اور اپنے محلات اور ہیکل کی تعمیر میں ان سے کام لیتے تھے۔ اعظم گڑھ میں بھی ایک سلیمان ہے۔ اس نے بھی چند ایک علمی جن قابو میں کر رکھے ہیں جو مل کر اسلام کے پارینہ علوم و مفاخر کی عمارت از سر نو کھڑی کر رہے ہیں۔ تاریخ صقلیہ بھی اسی عمارت کا ایک زرنگار عمود ہے۔

پہلی جلد میں فاضل مصنف نے فتح اسلامی سے لے کر عربی حکومت کے انقراض تک کی سیاسی تاریخ لکھ دی ہے اور اس تاریخی بیان

کو جزیرہ صقلیہ کے طبعی اور تاریخی جغرافیہ سے شروع کیا ہے۔ کیونکہ بغیر جغرافی واقفیت کے تاریخی واقعات کا بخوبی سمجھنا دشوار ہے۔ اس کے بعد ان تمام خاندانوں اور حکمرانوں کے حالات قلمبند کئے ہیں جنھوں نے یکے بعد دیگرے جزیرہ پر تسلط حاصل کیا۔ یہاں تک کہ پانچویں صدی ہجری کے وسط میں نارمن قوم نے حملے شروع کر دئے۔ جبکہ صقلیہ کے مسلمان باشندوں کے باہمی افتراق و اختلاف اور تائید الدولہ جیسے کوتاہ اندیش اور بدبخت حکمرانوں کی خانہ جنگی اور نفاق انگیزی سے اسلامی اقتدار کو گھن لگ چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جزیرہ میں اسلامی حکومت کا چراغ کچھ عرصہ ٹمٹمانے کے بعد آخر کار گل ہو گیا۔ عربی اقتدار کو جن اسباب سے زوال آیا یعنی باہمی حسد و عناد، نفاق و افتراق، اجتماعی شیرازہ بندی کی حفاظت اور اطاعت اولی الامر کی بجائے انفرادی اغراض کے حصول کی ہوس ان اسباب کو فاضل مصنف نے واقعات کے سلسلہ میں بسی و ضاحت سے لکھا ہے جس سے ہمارے لئے درس عبرت کا پڑھنا آسان ہو جاتا ہے۔

مگر عرب صقلیہ میں صرف باج ستانی کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ وہ اسلامی تہذیب و مشرقی تمدن کے علم بردار بھی تھے۔ اگرچہ نارمنوں کی پے در پے شورشوں سے صقلیہ سے ان کی حکومت مٹ گئی۔ مگر ان کے تمدن کے آثار مدت تک باقی رہے۔ وہ نارمن جو جزیرہ میں فاتح بن کر آئے تھے۔ ایک اعلیٰ تمدن کے ہاتھوں مفتوح ہو گئے اور عربی تمدن اور معاشرت کے ایسے گرویدہ ہو گئے کہ نہ صرف دربار شاہی بلکہ تمام جزیرہ پر ایک عرصہ دراز تک اسلامی عربی رنگ قائم رہا۔ مصنف نے اپنی تاریخ کی پہلی جلد کو ان نارمن حکمرانوں کے حالات پر ختم کر دیا ہے۔ جن کی عرب دوستی اور اسلامی تہذیب کی قبولیت ان کا طغرائے امتیاز تھا۔

مشرقی مورخوں کی تالیفات کے متعلق ایک عام شکایت ہے کہ ان کی نگاہ بالعموم صرف بادشاہوں ان کے امیروں وزیروں، انکی جنگوں اور تباہ کاریوں تک محدود رہتی ہے۔ ان باتوں کے سوا ان میں اور کسی قسم کی تفصیلات کا تلاش کرنا بے سود ہے۔ جن سے انکے عہد کی معاشرت اور تہذیب و تمدن کا حال وضاحت سے معلوم ہو سکے۔ مقام مسرت ہے کہ سید صاحب موصوف کی تصنیف اس الزام سے یکسر بری ہے کیونکہ انھوں نے اپنی کتاب کی دوسری جلد کو صقلیہ کے تمدنی مرقع کیلئے وقف کر دیا ہے۔ اور اس میں عربوں کی تمدن آفریں قوم کے اقتصادی، معاشرتی، تمدنی اور علمی خط و خال کو خوب وضاحت سے دکھلایا ہے۔ یہ جلد کئی ایک باب پر حاوی ہے۔ ایک باب میں اہل صقلیہ کی زبان۔ انکے ادیان و مذاہب اور عادات و رسوم کا بیان ہے۔ پھر معیشت کے باب میں ان کے طرز معاش اور اقتصادی زندگی کی تفصیل ہے اس ضمن میں زراعت و فلاحت صنعت و حرفت اور تجارت کا مفصل بیان ہے۔ پھر علوم و فنون والا باب مسلمانان صقلیہ کے ذہنی علمی اور ادبی ترقیوں کا آئینہ دار ہے۔ اس باب میں آپ کو رجال صقلیہ یعنی عہد اسلام کے علماء، ادباء، شعراء اور حکما کے حالات زندگی اور انکی تصانیف کی ترتیب وار تشریح ملے گی۔ آخری باب میں صقلیہ کے اسلامی تہذیب و تمدن پر ایک اجمالی نظر ڈالی گئی ہے اور یورپ پر اس کے جو مختلف نوعیت کے اثرات مترتب ہوئے انکو مستند ذرائع سے بیان کیا گیا ہے۔ غرضکہ لائق مصنف نے اپنے اختیار کردہ موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔

صقلیہ کی اسلامی حکومت کے انقراض پر پورے نو سو برس گزر چکے ہیں مگر آج تک کسی مشرقی زبان میں اس درخشاں عہد کی ایسی جامع تاریخ مرتب نہیں ہوئی تھی۔ گویا مسلمانان صقلیہ کا تمام عالم اسلامی پر ایک قرض تھا جو آج تک ادا نہیں ہوا تھا۔ ہمارے لئے یہ امر موجب صد ناز و افتخار ہے کہ اس فریضہ علمی کی ادائگی ایک ہندی صاحب علم کے ہاتھوں ہوئی۔ اور اہل بہار اور بھی زیادہ مستحق مبارکباد ہیں کہ انکی خوش قسمتی سے یہ اعزاز و امتیاز ان ہی کے صوبہ کے ایک نوجوان فاضل کے حصہ میں آیا۔ وھذا فضل من اللہ یؤتیہ من یشاء من عبادہ۔

اگر کسی بات کا افسوس ہے تو یہ کہ اس قسم کے ٹھوس علمی کاموں کی ہمارے ملک میں کافی قدردانی نہیں۔ بہر حال حضرت مصنف کو اس خیال سے تسکین ہونی چاہئے کہ انھوں نے وہ علمی کام کیا ہے جس کا سرانجام دینا ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ فخر درحقیقت اسلام کی ہے کہ اس بے نظیر تصنیف کو نہ صرف اس ملک کے اطراف و جوانب اور قوم کے تمام طبقوں میں بلکہ بذریعہ تراجم وہ اشاعت عام حاصل ہو جس کی وہ سرتاپا مستحق ہے۔

پورنیہ میں علم و ادب کا چرچا

از جناب مولوی محمد سلیمان صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ایل وکیل پورنیہ

مسلمانان بہت ہی ارمیں پورنیہ کے مسلمانوں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے لیکن اہمیت کا سبب محض کم ارز ہے یعنی بہار کے چالیس لاکھ مسلمانوں میں نو لاکھ کے قریب مسلمان اسی پورنیہ میں بستے ہیں۔ اور یہ صرف نقامت بہشکر کا مصداق ہے۔

فرانسیس بوچانن پورنیہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ "یہاں کی ایک کثیر تعداد فارسی پڑھتی ہے۔ ہندوستانی ترے گنواروں کے سوا سبھی سمجھتے ہیں" یہ ۱۸۰۸ء کی بات ہے۔

پورنیہ کی سب سے قدیم تصنیف جو آج مل سکتی ہے وہ بدیا دھر ہے۔ یہ تصنیف نواب سیف خاں کے وقت کی ہے۔ اسکے مصنف ایک صاحب شیخ کفایت نام بتلاتے ہیں۔ تاریخ تصنیف ۱۲۰۸ھ ہے۔ ان کی یہ تصنیف بڑی مقبول اور ہر دلعزیز رہی ہے۔ اور آج تک لوگ اس کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ اسکے اکثر قلمی نسخے پائے جاتے تھے اور اپنی مقبولیت کے سبب پہلے پہل گذشتہ سال چھپ کر شائع بھی ہو گئی ہے۔ اسکی زبان ہو وہ آج متروک ہے۔ نفس کتاب کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہندو مسلم اتحاد کا ایک بہتر نمونہ ہے۔ کتاب کے مصنف مسلمان ہیں اس لئے اس میں حمد بھی ہے نعت بھی۔ چار یار کا بھی ذکر ہے۔ آل اطہار کا بھی ازواج مقدسہ کا بھی بیان ہے اور شریعت طریقت۔ حقیقت معرفت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہتے ہیں۔

بنا محمد جو پنتھ سدھارے — پہونچے نہیں منجھار ہی مارے

یعنے خلاف پیمبر کسے رہ گزید — کہ ہرگز بہ منزل نہ خواہد رسید

لیکن اصل کہانی کا تعلق ایک ہندو راجہ کی لڑکی سے ہے ہیرو بھی ہندو ہے۔ بادی النظر میں قصہ کچھ بھی نہیں ہے لیکن مصنف نے بات میں بات نکالی ہے۔ اور اچھی سخن طرازی کی ہے اس میں مسایل بھی ہیں۔ دوائیں بھی فالنامہ بھی ہے تعبیر خواب بھی اور کوک شاستر بھی۔ ان کی شاعری کا اندازہ لگانے کے لئے میں انکا محض ایک شعر درج کر کے بدیادہر کا ذکر ختم کرتا ہوں۔ ہیروئین نکاح کے بعد ہیرو سے ملنے جاتی ہے ملنے سے پہلے کے جذبات کا بیان ہے

کچھ ہلسے کچھ ڈرے من مانہی — پر کھ ہیو ہم جانئے نا نہی

"خوش بھی اور دل میں ڈرتی ہوئی بھی۔ مرد کے ساتھ کیونکر برتاؤ کیا جائے معلوم نہیں" کسی نے کہا ہے

آہ وہ جوش مسرت وہ تقاضائے حیا — خندہ زیر لب نگاہ ناز شرمائی ہوئی

اسی سلسلے میں ایک مصرعہ ہے "تر و نا سای ہم ابلا تھر تھر کانپے رنگ" یعنی ہمارے شوہر جوان ہیں ہم انکا سارا جسم تھر تھر کانپ رہا ہے۔

فارسی کی تعلیم اگلے وقتوں سے ہوتی آئی۔ اور یہ معلمین بیشتر پچھم کی طرف سے آتے رہے۔ شیخ کفایت بھی اپنے تئیں شیخ محمد اعظم ناظر پوری کا شاگرد بتاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں "ناظر پور پچھم سوائے"۔

فارسی کی عام تعلیم کا اثر تھا کہ تھوڑے دنوں قبل یہاں کی کچہریاں دوسری جگہوں کے وکلا۔ اور مختاراں سے بھری ہوئی نہ تھیں بلکہ اکثر قصبوں میں وکیل اور مختار پائے جاتے تھے عدالت کے عملے بھی باہر سے نہ آتے تھے۔

انہیں وکیلوں میں سے منشی فرید بخش صاحب ۱۸۵۶ء میں منصف بحال کئے گئے اور ۸ اپریل ۱۸۷۰ء میں اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔ منصفی کے دوران میں آپ ستمبر ۱۸۶۵ء سے نومبر ۱۸۶۶ء ضلع گیا کے مختلف مقامات جہان آباد اور نوادہ میں بھی رہے ہیں۔

الحاج منشی فرید بخش صاحب موصوف کے سبب سے علم وادب کی تحریک میں بہت بڑی قوت پہونچی آپ بستی پلاس منی

میں جو مکتب قایم تھا وہ اجکل کے اچھے اچھے مدرسوں اور اسکولوں سے بدرجہا زیادہ فیض رساں تھا۔ دور دور سے طلبا آنے لگے اور فارغ التحصیل ہو کر نکلنے لگے اور اس ایک دئے سے سینکڑوں دئے جلتے چلے گئے۔ طلب علم کا کچھ ایسا شوق ہوا کہ آپ کا چھوٹا لڑکا عبدالرشید گھر چھوڑ کر بہت دنوں تک ہندوستان کے اچھے اچھے مدرسوں میں درس لیتے رہے اسکے بعد ہندوستان سے ممالک عربیہ کو چلے گئے انہین کے ساتھ ایک صاحب حافظ عبدالواحد صاحب بھی گئے جنکا ایک کارڈ مدتوں مفقود الخبر رہنے کے بعد ۱۹۱۸ء میں مکہ معظمہ سے موصول ہوا تھا۔

بلاس منی میں کتابوں کا بھی ایک نادر ذخیرہ جمع ہوگیا تھا جو خانہ سوزی میں نذر آتش ہوگیا قران پاک کا ایک قلمی نسخہ اب بھی موجود ہے جسکی تقطیع ۶×۸ ہے ہر صفحہ میں سات سطریں بخط جلی ہیں سنہری جدول ہے کاغذ سفید اور دبیز ہے دو جلدوں میں ہے۔ چرمی سنہری جلد سے مجلد۔ حرف ابھی تک صاف اور نہایت خوب ہیں۔ کاتب کی طرف سے اخیر میں یہ مضمون درج ہے ھذا ما املی و وضعتہ سید المسلمین محمد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین۔ کتبہ العبد الجلیل محمد اسمعیل غفرلہ فی سنتہ الف مایتہ واحدی اربعین۔

پورنیہ کی مطبوعہ کتابوں میں شاید کلیات عزیزی سب سے پہلی کتاب ہے جو ۱۳۱۲ھ ہجری میں چھپی تھی۔ یہ الحاج منشی فرید بخش صاحب کے لڑکے عبدالعزیز صاحب مختار مرحوم کی تصانیف کا مجموعہ ہے۔ اس میں آپ نے اپنی طبعت کی جولانی کا پورا ثبوت دیا ہے خوب خوب طبع آزمائیاں کی ہیں پوری کتاب فارسی میں ہے۔ لیکن آخر میں چند ورق عزلیات اردو کے بھی ہیں۔ منشی مہتر علی صبا بھی اچھے اہل قلم گذرے ہیں آپنے ایک قلمی نسخہ چھوڑا ہے جو ۱۳۰۸ھ ہجری کی تصنیف ہے۔ آپ سکندر نامہ کو مسدس کرنیکی فکر میں تھے چنانچہ ایک حد تک اس مہم کو انجام بھی دیا تھا۔

پورنیہ کے صاحبان تصنیف و تالیف میں منشی مراد اللہ صاحب یتیم کا بھی بڑا درجہ ہے آپ کی متعدد تصنیفات و تالیفات ہیں اور وہ طبع ہو کر شایع بھی ہو چکی ہیں۔ خطبہ جدید کہیں کہیں مقبول ہے۔

پورنیہ کے ذیعلم ہستیوں میں حضرت مولانا حفیظ الدین صاحب متوطن کنہر یا معروف بہ رحمان پور کو ایک ممتاز درجہ حاصل تھا۔ آپ کی ذات گوناگون صفات سے متصف تھی۔ آپ ایک جید عالم تھے۔ عرصہ تک بمقام شمسرام مدرس کے فرایض انجام دیتے رہے۔ آپ کی متعدد قابل قدر تصانیف ہیں عجالۂ نافعہ اور دیوان لطیفی بھی آپ کی تصنیفات سے ہیں اور چھپ چکی ہیں لطیفی آپ کا تخلص ہے

دور جدید میں شاید پہلا قدم محمدیہ کا تھا جس نے ایک جلسے میں سارے ضلع کے نوگون کو دعوت دی باہر سے علما بلائے گئے اور ایک تحریک کا اغاز ہوا۔ محمدیہ میں ایک مدرسے کی بھی بنیاد پڑی جسمیں کبھی پروفیسر عبدالماجد صاحب پورینوی بھاگلپوری بھی بحیثیت مدرس کے آئے تھے۔ لیکن مولوی لیاقت حسین صاحب مرحوم و مغفور نے جو پتھ لیا وہ انہین پورنیہ کے سرسید احمد ہونے کا درجہ عطا کرتا ہے انہوں نے ۱۹۰۸ء میں انجمن اسلامیہ کی بنیاد ڈالی اور ایک سال بعد مدرسہ اسلامیہ کی بنیاد پڑی۔

انجمن اسلامیہ کے سالانہ جلسوں نے وہ کامیابی حاصل کی کہ پورنیہ کا گوشہ گوشہ اسکے اثر سے متاثر ہوگیا اور ایک انقلابی کیفیت پیدا ہوگئی۔ انگریزی تعلیم کو حرام سمجھنے والوں کو شکست ہوئی لوگ تعلیم جدید کی طرف مایل ہو گئے پورنیہ پر باہر کے حضرات کا بھی بہت بڑا اثر پڑا ہے الحاج حضرت مولانا قادر بخش شمسرامی کے احسانات سے پورنیہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا ہے۔ آپنے اسلام کا پیغام پورنیہ کے کونے کونے تک پہونچایا اور پورنیہ نے اُسے گوش دل سے سنا۔ انجمن اسلامیہ کے جلسوں میں علامہ حضرت شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کی تشریف آوری کا بھی بہت اثر پڑا۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب دہلوی کے فیض سے بھی پورنیہ بے بہرہ نہ رہا۔

اخبارات جنکا اثر پورنیہ پر پڑا اُن میں پیسہ اخبار لاہور، وکیل امرتسر زمیندار لاہور کے نام لئے جا سکتے ہیں رسایل میں مخزن لاہور اور زمانہ کانپور کی اولین جلدیں مجھے کہیں کہیں دستیاب ہوئی ہیں۔

حالات حاضرہ پر نگاہ ڈالی جائے تو دیکھا جاتا ہے کہ تعلیم کا پرچار ترقی پر ہے۔ اسکولوں کی بھی تعداد بڑھ رہی ہے اور مدرسوں کی بھی پورنیہ کے طلبا علیگڑھ بھی جاتے ہیں ندوۃ العلماء کو بھی۔ بہار کے بھی اکثر شہروں میں یہاں کے طلبا پائے جاتے ہیں اخبار و رسائل کی اشاعت سے بھی پورنیہ بے بہرہ نہیں رہا۔

اپریل سنہ ۱۹۲۳ء میں مولوی ابراہیم صاحب صدیقی نے بار اعیدگاہ سے طلبہ نامی ایک ماہانہ پرچہ نکالا اور ۲۲ جون سنہ ۱۹۳۳ء کو پورنیہ سے مولوی محمد طاہر صاحب وکیل علیگ

وکیل ایم - ایل - اے نے ہفتہ وار اخبار آفتاب نکالا ۱۲ نومبر ۱۹۳۶ء کو کشن گنج سے ہفتہ وار اخبار آئینہ نکلا - طلبہ اور آفتاب کی اشاعت اب نہیں ہوتی - لیکن آئینہ خدا کے فضل و کرم سے نہایت پابندی وقت کے ساتھ جاری ہے اور آج پورنیہ کو دعویٰ ہے کہ بہار کے مسلمانوں کا بہترین ترجمان اگر کوئی ہو تو وہ آئینہ ہے جو کشن گنج سے نکلتا ہے - اور یہ ایک حقیقت ہے کہ آئینہ اپنے مالک مولوی فضل الرحمن صاحب ایم - ایل - اے کے بے نظیر ایثار کا آئینہ دار ہے -

اس سلسلہ میں انجمن ترقی اردو کشن گنج کا تذکرہ نہ کرنا بے انصافی ہوگی، کیونکہ اس کی تاریخ ان اخبارات و رسائل سے بھی پہلے کی ہے - ۹ اگست ۱۹۲۷ء کو انجمن ترقی اردو کشن گنج کی بنیاد پڑی اور اس کا پہلا سالانہ اجلاس ۳۰ اگست ۱۹۲۸ء کو بصدارت جناب مسٹر کے - بی سہنا آئی - سی - ایس ڈی او کے ہوا - اس انجمن کے ممبران اُن اخبارات و رسائل کی اشاعت میں شریک غالب رہے ہیں - اور آج کشن گنج میں بزم ادب کے تحت ایک گرانقدر لائبریری عزیز لائبریری کے نام سے قائم ہے جس سے کثیر التعداد اصحاب مستفید ہو رہے ہیں -

میں نے کوشش کی ہے کہ پورنیہ کی تعلیمی حالت کے متعلق قارئین کے سامنے ایک سطحی خاکہ پیش کروں - یہ صحیح ہے کہ پورنیہ آگے بڑھنے کے لئے بے چین ہے - لیکن ایک لحظہ کی غفلت نے اسے بہت زیادہ پسماندہ بنا رکھا ہے - صد شکر کہ پورنیہ کے جوانوں کا ترانہ آج بھی ہے کہ

ع ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو

کاش ہمارے وہ برادران جو ہم سے زیادہ توانا ہیں ہمیں دھکے دیکر پیچھے نہ ہٹائیں بلکہ ہماری دستگیری کریں - اور ہمیں آگے بڑھنے میں مدد دیں - کیونکہ

ع ان کی عزت ہم سے ہے اور ہم کو ان پر ناز ہے

KEORA KEORA

آگ

آپ واقعی دور اندیش ہیں

تو آپ ضرور اپنے مستقبل پر غور کریں گے اور سوچیں گے کہ اپنے لئے اس کو کس طرح زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکتے ہیں، اس لئے تھوڑی دیر کے واسطے اپنے نقطہ نگاہ کو وسیع کیجئے اور بڑھاپے کی تکالیف اور مشکلات پر بھی دھیان دیجئے، اگر آپ اب تک میری گذارش کو نہیں سمجھ سکے ہیں تو سنئے :-

ان تمام مشکلات کا حل صرف کیورا انٹی سپٹک ٹوتھ پوڈر ہے

جس کے استعمال سے ہلتا ہوا دانت ہمیشہ کے لئے جڑ پکڑ لیتا ہے، اگر خون پیپ آتا ہو تو پل بھر میں روک دیتا ہے - اور پیر یا جیسے خطرناک مرض کو فوراً رفع کر دیتا ہے جس کی بدولت کتنے ہونہار اور جوہر قابل ہونہار خاک ہو گئے - یہ پیر یا جیسے تباہ کن مرض کے لئے ایک نعمت ہے - انگریزی، جرمنی ٹوتھ پوڈر اور پیسٹ کے استعمال میں فضول پیسہ برباد کر کے اگر نا امید ہو گئے ہیں تو آخری علاج کے لئے صرف

کیورا انٹی سپٹک ٹوتھ پوڈر استعمال کریں کیونکہ تمام ڈاکٹروں نے اسکی متعلق تعریفیں کی ہیں

ہر بڑے شہر میں ایجنٹوں سے مل سکتا ہے - ورنہ براہ راست طلب کیجئے -

نمونہ مفت، آزمانا چاہیں تو ایک کارڈ لکھ کر کیورا انٹی سپٹک ٹوتھ پوڈر مفت حاصل کریں - آپ تمام کہے بغیر خود مطمئن ہو جائیں گے - اور ہم سے طلب کریں گے - صرف محصول ڈاک کیلئے ۴ کے ٹکٹ بھیجئے -

کیورہ کیمکل ورکس کمپنی اینڈ لمیٹڈ پوسٹ آفس کیورہ (پٹنہ) انڈیا

فن مصوری میں "پٹنہ قلم"

از جناب ادھا موہن صاحب بھام۔ اے۔ بی۔ ال پرنسپل پٹنہ اسکول آف آرٹس پٹنہ

دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ پتا چلتا ہے کہ قریب قریب تمام ملکوں میں فنون لطیفہ کی ترقی اور تنزلی اوس ملک کے چین اور امن پر منحصر رہی ہے۔ اگر کسی ملک کی اندرونی حالت نازک رہی ہے تو ضرور بالضرور اوس کے فن وصنعت کی حالت پر بھی اوس کا اثر رہا ہے۔ پس ہندوستان بھی اس حالت سے متاثر رہی یہ ایک ناممکن بات ہے۔ یہ کسے معلوم نہیں کہ تاریخ کے آغاز سے اور اسوقت موجودہ زمانہ تک ہندوستان کے اندر اوس کے علم۔ ہنر۔ ہر قسم کے فن وصنعت میں ملک کی اندرونی حالت کے مطابق ترقی وتنزلی ہوتی رہی۔ اگرچہ اس وقت ہمارا موضوع صرف فن مصوری اور خاص کر پٹنہ قلم کے آغاز کو دکھانا ہے۔ تاہم سلسلہ کے لئے اگر اس فن کی کچھ اگلے وقت کی تھوڑی تاریخ جس سے صوبہ بہار کا خاص طور پر تعلق رہا ہے۔ بیان کر دی جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

فن مصوری اور سنگ تراشی ہندوستان کے اندر موریوں کے وقت میں کہ جن کا دارالسلطنت پاٹلی پتر (پٹنہ) تھا۔ اپنے حد کمال کو پہنچ گئی تھی اور بلاشبہہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ بودھ مذہب کے پھیلانے کے خیال سے ان موریوں نے اسی صوبہ بہار میں بیٹھ کر اپنے ملک کے فن سنگ تراشی وفن مصوری کے نمونے تمام ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچائے اور ہندوستان ہی تک محدود نہ رکھ کر ہندوستان کے باہر بھی مثلاً تبت۔ چین۔ جاپان۔ جاوا۔ ملایا وغیرہ وغیرہ میں پھیلائے اور صوبہ بہار کو فخر بخشا۔

اس دور سے کچھ اور آگے چل کر اب ہندوستان کی حالت بدلتی ہے اور بہار کی بھی تاریخ ہم لوگ کی نظر سے غائب ہو جاتی ہے۔ بودھ مذہب کا زبردست پایہ اپنی جگہ سے کھسکتا ہے۔ برہمنوں کے دور کا آغاز ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ مسلمانوں کی آمد ہندوستان میں شروع ہو جاتی ہے۔ اون کے زوردار حملوں اور اونکی متواتر لوٹ مار سے ملک میں ایک زبردست بدامنی پھیلتی ہے۔ تمام چیزیں ردوبدل ہو جاتی ہیں مکانات مسمار ہوتے ہیں بھاگ بھاگ مچتی ہے غرضکہ تمام ملک ایک پریشانی کی حالت میں پڑ جاتا ہے اور یہ حالت کچھ روز تک کچھ ردوبدل کے ساتھ قائم رہ جاتی ہے۔ اتنے دنوں کے اندر ہندوستان کو کوئی موقع اپنے کسی چیدہ فن کو ترقی دینے کا نہ ملا اور اس وجہ سے کوئی نمونہ ہندوستان کے قلم مصوری یا سنگ تراشی کا ہم لوگوں کے سامنے نظر نہیں آتا[1] اتنے وقت کی کوئی تاریخ ہندوستان کی نسبت فن مصوری کی ہم لوگوں کے پاس نہیں ہے۔

یہاں تک کہ مغلوں کی سلطنت قائم ہوتے ہی ہندوستان کے اندر فن کا ایک نیا دروازہ کھلتا ہے اور یہ فن اپنے انتہائے کمال کو پہنچتا ہے اور اب اس وقت سے ایک اور نئی اور زبردست شاخ جو مسلمان مصوری کہی جاتی ہے شروع ہوتی ہے۔ مسلمان مصوری اسلئے کہ اب اس فن کی ترقی مغل بادشاہوں کے زیر نگرانی ہونے لگی جس وقت مغلیہ سلطنت کی بنیاد ہندوستان کے اندر ڈالی جاری تھی۔ اوسوقت یہ فن مصوری ملک ایران میں شاہی سرپرستی کے ماتحت ایک نہایت ہی اونچے پیمانہ پر ترقی کر رہا تھا چنانچہ بہزاد اوس زمانہ میں ایران کے اندر ایک نہایت ہی کامل مصور گذرا ہے۔

---

[1] ندیم لائق مضمون نگار کو یہاں پر یہ اشارہ کرنا چاہئے تھا کہ برہمنوں کے دور کے آغاز کے ساتھ خصوصاً فن سنگ تراشی کو سخت صدمہ پہنچا۔ بودھ کی لاکھوں مورتیاں توڑ پھوڑ کر ڈال دی گئیں۔ اس دور کی ٹوٹی پھوٹی مورتیاں آج صوبہ بہار کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جا بجا درختوں کے نیچے پڑی ہیں۔ بعض مندروں کی پھر زینت بن گئی ہیں۔ برہمن دور کی اس بت شکنی سے فن سنگ تراشی کے اعلیٰ نمونے ضائع ہو گئے۔ آج ہندوؤں میں سے بے پڑھے لکھوں کا طبقہ ان بتوں کی بربادی کا ذمہ دار مسلمانوں کو سمجھتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اہل علم اس قسم کے شکوک کو بھی آہستہ آہستہ دور کریں۔

چنانچہ مغل - شروع ہی سے اور تمام ایرانی فنون لطیفہ کے ساتھ ایرانی موئے قلم بھی اپنے دربار میں لائے اور قدر و منزلت کی جگہ دی - ہمایوں اکبر - جہانگیر وغیرہ نے مصوروں کو ایران سے بلا کر اپنے دربار میں مقرر کیا - ابوالفضل کی فہرست میں فرخ قلمک - ابوصمد شیرازی - میر سید علی تبریزی کے نام درج ہیں - اس کے علاوہ ان بادشاہوں نے ہندوستانیوں کو بھی اُن ایرانی مصوروں کے زیر تعلیم رکھا اور ہندوستانی خیالات کی بنا پر ان سے تصویریں بنوائیں - نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اسی وقت سے ایرانی اور ایرانی ہندوستانی قلم شروع ہوا کہ جس سے آنکھ چل کر لکھنؤ - پٹنہ - اور دکنی قلم ایجاد ہوئے - یہ لوگ دربار میں رہ کر ہر قسم کی تصویریں مثلاً شبیہ - جنگل کے شکار - تاریخی واقعات - درباری مجلس - پھول پتیاں اور جانوروں وغیرہ وغیرہ کی تصویریں بناتے ہیں - کام ان کا نہایت صاف اور اعلیٰ درجہ کا ہوتا تھا - کام میں نرمی انکی ایک خاص خوبی تھی اور ایرانی انداز انکی تصاویر سے صاف نمایاں تھے - رنگ زیادہ تر بیش قیمت پتھروں - لکڑی - دھات اور دوسری چیزوں سے تیار کرتے تھے - جہانگیر کے زمانہ تک یہ فن اپنے انتہائے کمال کو پہنچا رہا اور کافی عزت پاتا رہا - لیکن شاہ جہاں کے زمانہ سے فن مصوری کا وہ عروج نہ رہا بلکہ کچھ تنزلی کے آثار نظر آنے لگے - شاہ جہاں کو چونکہ عمارت بنانے میں زیادہ دلچسپی تھی - اس لیے اس فن سے اسکو کسی قدر بے توجہی رہی اورنگ زیب کے وقت سے اس فن مصوری کے اندر تنزلی کی ابتدا ہوئی - بہرحال اسوقت تک دہلی میں تمام مصور اپنی جگہ پر قایم رہے اور "دہلی قلم" "ایرانی قلم" بھی کہنا چاہئے قایم رکھے رہے لیکن اورنگ زیب کے گدی نشین ہوتے ہی جس طرح تمام فنون پر آفتیں آئیں اس فن میں فن مصوری بھی شامل ہوگیا - کچھ تو تبدیل سے اسکی حالت نازک ہو ہی چکی تھی اب اس کے اخیر دیکھنے کی بھی آگئی - شاہی امداد جو ایسے فنون کی ترقی کے لئے ضروری ہوتی ہے اور جو اس فن کو اب تک ملتی آئی وہ اس سے محروم کر دیا گیا - بلکہ اورنگ زیب کے صوفیانہ مزاج نے اور ایسے فنون سے اوسکی خاص نفرت نے اس فن کی تباہی میں پوری پوری مدد پہنچائی - تمام مصور جو ہمیشہ بادشاہ کے خاص درباریوں میں سمجھے جاتے تھے اور جن پر بادشاہ کی خاص نظر مہر باری رہا کرتی تھی اب وہ اپنے کو بالکل بے پناہ محسوس کرنے لگے اور اپنی اوقات گذاری کے لئے اب کوئی دوسری جگہ تلاش کرنے لگے - ہاں ایک بات اورنگ زیب کے زمانے میں یہ ضرور ہوئی کہ اوسکی دکن کی فتحیابی سے اس فن میں ایک نئی شاخ جسے دکنی قلم کہتے ہیں شروع ہوا - یہ قلم دلی قلم سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا - دکن والے اپنے کام میں سونا زیادہ استعمال کرتے تھے - اور رنگ بھی بہ نسبت دلی والوں کے کچھ شوخ لگاتے تھے -

بہرکیف اس فن کی حالت روز بروز ابتر ہی ہوتی گئی اور اس کا چرچا اب صرف درباریوں اور اُمرا کے درمیان باقی رہ گیا - اس کے بعد مغل خاندان کے بادشاہوں سے جدا ہوکر کچھ دن اودھ کے نوابوں نے اسے سایہ دیا اور قدر بھی اسکی کی - کئی گھرانے مصور فن کے آکر اودھ کے صوبوں میں بس گئے اور اپنے پرانے طریقے پر مصوری کرنے لگے - چنانچہ یہیں سے "لکھنؤ قلم" شروع ہوا جو کہ دلی قلم کا ایک خاص جزو ہونے کی وجہ سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا - کام میں صفائی ضرور تھی لیکن دلی والوں کی طرح اونچے پیمانہ کا نہ تھا - اپنی تصویروں میں یہ لوگ سفیدی زیادہ تر رکھا کرتے تھے اور یہ انکی ایک خاص خوبی تھی -

دلی سے جب مصوریں اپنی روٹی کی تلاش میں باہر نکلے اور ادھر اودھ بسنے لگے تو کچھ صوبہ اودھ میں بسے اور کچھ صوبہ بہار و بنگال میں آکر بسے - صوبہ بہار میں علاوہ اور جگہوں کے ان لوگوں کی خاص جگہ پٹنہ - بانکی پور - داناپور وغیرہ تھی - ان تین جگہوں میں سے پٹنہ میں زیادہ تعداد میں ہے اور زیادہ تر محلہ لودی کٹرہ اور محلہ مغلپورہ میں آباد ہوئے - دریافت سے معلوم ہوا ہے کہ صرف پٹنہ سٹی میں قریب ایک سو گھرانے مصوروں کے تھے - جن میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے -

---

[1] مثلاً اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں کیا کیا چیزیں ممنوعات میں داخل تھیں اس سلسلہ میں اس کے خلاف فرمان اور حکم جو تیار کی گئی ہے اس میں صیاد کہ مضمون نگار نے لکھا ہے فن مصوری کے اظاہر کرنے کا الزام تھا ہے - اورنگ زیب عالمگیر پر اس نوعیت کے الزامات کی کیا حقیقت ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے الحق پریس نے ایک مقالہ کا مطالعہ دلچسپ ثابت ہوگا - جو "کیا عالمگیر کے عہد میں تاریخ نویسی تھا نا ہوا تھا" کے عنوان سے معارف بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا ہے

"عالمگیر کے عہد میں فن مصوری" پر اگر جناب عبداللہ صاحب چغتائی (لاہور) یا پروفیسر نجیب اشرف ندوی (بمبئی) یا کوئی اور صاحب نظر نظر ڈالیں تو ایک مبسوط مضمون تیار ہو گی - ندیم کے مضمون نگار کے اس بیان میں اس موقع پر جو تضاد ہے وہ آشکارا ہے - ایک طرف وہ فرماتے ہیں کہ اورنگ زیب کے تخت نشین ہوتے ہی دوسرے فنون کی طرح فن مصوری پر بھی آفت آگئی - اور دوسری جلد دو سطروں کے بعد اقبال کرتے ہیں کہ عالمگیر کے فتح دکن کے بعد فن مصوری میں ایک نئے "قلم نیمی" (یعنی نیم قلم) کی داغ بیل پڑی - اور یہ قلم دلی قلم سے ملتا جلتا تھا - (دوسرے معنی یہ ہیں کہ دلی قلم تاجدارانی قلم سے ماخوذ تھا - دکنی قلم میں ملا اور اس سے تحکیم قلم میں اس نئی آمیزش سے ایک نیا قلم تیار ہوا) - اس لحاظ سے فن مصوری کو عالمگیر کے عہد میں ترقی ہوئی یا تنزلی اس کا فیصلہ اہل نظر کریں -

سچ پوچھا جائے تو فن مصوری میں "پٹنہ قلم" کے یہ موجد اوسی دلی گروہ کے ایک جزو تھے اور کام میں بھی لکھنؤ والوں کی طرح دلی قلم کا رنگ رکھتے تھے۔ ڈرائنگ میں ضرور اچھے تھے لیکن رنگ کے معاملہ میں انکا انداز کچھ بہاری پن لیے ہوئے تھا۔ رنگ لگانے کا انداز دلی والوں سے ملتا جلتا تو ضرور تھا لیکن انکی تصویروں میں وہ ملائمیت اور نرمی جو دلی قلم میں نمایاں ہوتی نظر نہیں آتی۔ پرواز (؟) دلی والوں کی طرح اپلائچی دانہ کی طرح پتے تھے رنگ زیادہ تر شوخ استعمال کرتے تھے۔ تصویروں کے اندر سونے کا استعمال بھی کرتے تھے اور آگے چل کر اور ورق کی صورت دونوں حالت میں لگاتے تھے ہاتھی دانت کے اوپر چھوٹی چھوٹی اور بہت باریک کاموں کی تصویر بنانا بھی اپنے ساتھ ضرور لائے تھے لیکن ہاتھی دانت کے اوپر کام باریک ہونے پر دلی والوں سے کچھ بھدا ہوتا تھا اور صفائی بھی اوس درجہ کی حاصل نہ کر پاتے تھے۔ ابرق پر مصوری انکی ایک خاص جدت تھی اس کے کچھ نمونے بھی تک خدا بخش لائبریری اور کچھ پٹنہ اسکول آف آرٹ میں نظر آتے ہیں۔ تصویروں میں شبیہ تو بناتے ہی تھے لیکن یہ لوگ زیادہ تر ہر روز کی نظر سے گذرتی ہوئی چیزوں اور جانوروں اور چڑیوں کی تصویریں زیادہ تر بناتے تھے۔ کیونکہ دلی والوں کی طرح ان کا ساتھ دربار سے تو تھا نہیں کہ انکی مصوری کے نمونوں میں سلطنت اور دربار کے مناظر کی بہتات ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ روزانہ کی پیش پا افتادہ چیزیں انکی مشق کا تختہ رہیں۔ اسی قسم کے متعدد نوادر پٹنہ اسکول آف آرٹس کی گیلری میں محفوظ ہیں۔

ان کے کام کے تمام انداز دلی والوں سے ملتے جلتے تھے فقط دلی والوں کی طرح کام میں ملائمیت اور نرمی حاصل نہ کر سکتے تھے۔ پھر انگریزی حکومت کے اثرات ان کے موے قلم سے بھی آشکارا ہوئے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی تصویروں میں بہت جلد رومی یعنی انگریزی قلم کے انداز بھی اوتارے گئے پٹنہ قلم کے اہل فن رنگ خود سے تیار کرتے تھے اور باریک سے باریک قلم بھی گلہری کے بال سے خود تیار کرتے تھے۔ رنگ کچھ تو پھول اور کچھ دھات اور قیمتی پتھروں سے نکالا کرتے تھے مثلاً سفید رنگ سیپ یا موتی جلا کر بناتے تھے۔ لال رنگ کرم دانے سے۔ زرد رنگ ہڑتال پتھر ریون چینی لکڑی۔ زنجفر دھات سے بنا تھا۔ اوسیطرح سیاہ کاجل سے تیار ہوتا تھا۔ نیلا نیل اور لاجورد پتھر سے تیار ہوتا تھا۔ غرضکہ اسی طرح تمام رنگ اپنے مصرف کا اپنی دیسی ہی چیزوں سے بنا لیا کرتے تھے۔ چنانچہ بصد عاجزی کے ساتھ بطور نمونہ کے میں دو تصویریں خاص پٹنہ قلم کی اپنے اسکول آف آرٹ کے مجموعہ سے اس پرچہ میں شائع بھی کراتا ہوں اور آیندہ بھی شائع کرانے کی امید رکھتا ہوں۔ ناظرین ان تصویروں سے "پٹنہ قلم" کے طرز کا ایک اندازہ لگا سکتے ہیں۔

بہرکیف سب ہوتے ہوئے بھی زمانہ ہمیشہ ان لوگوں کے ناموافق ہی رہا اور یہ لوگ روز بروز مٹتے اور برباد ہی ہوتے گئے۔ جے رام داس جی۔ جمنا پرشاد۔ شیولال جی بشیو دیال جی۔ پھیرو جی۔ مرزا نصار مہدی وغیرہ وغیرہ اپنے وقت میں اچھے اور بہت ہی اعلیٰ درجہ کے مصور گنے جاتے تھے۔ اب اس وقت موجودہ زمانہ میں صرف دو گھرانے قابل ذکر موجود ہیں ان میں سے ایک تو بابو دیہا دیو لعل صاحب کا گھرانہ اور دوسرا بابو اشوری پرشاد کا۔ اب یہی دو گھرانے بلکہ یہی دو شخص پٹنہ قلم کے خاص اور بچے ہوئے یادگار زمانہ نمونہ باقی رہ گئے ہیں جن کے کاموں میں ابھی وہی دلی کا رنگ نظر آتا ہے۔ بابو اشوری پرشاد تو اب کلکتہ میں قیام کرتے ہیں اور بابو دیہا دیو لعل صاحب بہت ضعیف ہو کر کام سے مجبور ہو گئے ہیں۔ ان کے کام کے نمونے ہمارا جہ رام نرائن کے خاندان والوں کے پاس بہت کافی تعداد میں موجود ہیں اور دوسرے ان کے کام پٹنہ اسکول آف آرٹ میں بھی کافی دکھائی دیتے ہیں۔ آپ نے اپنے ہنر کو بہت کچھ پھیلایا اور کئی شاگرد بھی تیار کئے چنانچہ اسوقت بھی جو کوشش اس فن کو پھیلانے کی پٹنہ اسکول آف آرٹس کے ذریعہ صوبہ بہار میں ہو رہی ہے وہ بھی آپ ہی کے شاگردوں کی ہے اور دراصل آپ ہی کی توجہ کی بدولت ہے۔ افسوس یہی ہے کہ آپ اور بابو اشوری پرشاد کے بعد پٹنہ قلم اپنی خاص خوبی کو لیکر اس صوبہ بہار سے معدوم ہی ہو جائے گا۔ اور فقط اس کا افسانہ ہی باقی رہ جائے گا۔

لہ ندیم افسوس کہ یہاں پر فاضل مضمون نگار کے قلم کے بعض فقرے صحیح طور پر پڑھنے میں نہ آ سکے۔

ندیم کی تاریخ اشاعت متعین ہو گئی

اب ندیم التزام کے ساتھ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو دفتر سے روانہ ہو جایا کرے گا۔

"منیجر"

حضرت صوفی منیری کی تاریخ گوئی کا ایک شاہکار

از جناب رخشاں ابدالی، اسلام پوری

حضرت صوفی منیری (۱۲۵۲ھ - ۱۳۱۸ھ) اپنے وقت کے ایک باکمال شاعر تھے، آپ کو حضرت غالب سے تلمذ تھا۔ آپکے سمندِ فکر کی جولان گاہ اُردو ہی کی وادی ... نہیں، بلکہ زمین پارس بھی تھی، اور نثر و نظم دونوں ہی میں۔ آپ نے اتنی وقیع یادگاریں چھوڑی ہیں جن میں بعض منظرِ عام پر آکر قبولِ عام کی سند حاصل کر چکی ہیں اور بعض ہنوز پردۂ گمنامی میں مستور ہیں۔ ان سطور سے مقصود آپ کے حالات پیش کرنا نہیں ہے کہ یہ راقم کے قلم سے رسالہ "معارف" (اعظم گڑھ) ماہ جون ۱۹۳۳ء میں شائع ہو چکے ہیں، بلکہ اس احساس کے پیشِ نظر کہ حضرت صوفی کی مختلف خلوصیات و حیثیات پر روشنی ڈالی جائے۔ آپ کی نثر نگاری سے روشناس کرایا جائے۔ مثنوی نگاری کے کمالات نمایاں کئے جائیں اور تاریخ گوئی کی جھلک دکھائی جائے، آپ کی شاعری کے ان تمام پہلوؤں کو ایک ایک کرکے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ آج کی صحبت میں حضرت صوفی منیری کی تاریخ گوئی کا ایک نمونہ پیش کر رہا ہوں۔

حضرت شاہ اعظم علی عرف شاہ بیکن فردوسی منیری رح کا شمار منیر شریف کے ممتاز بزرگوں میں ہے، حضرت جناب صوفی کے ماموں تھے، آپ کا وصال ۱۲۷۰ھ میں ہوا ہے۔ حضرت صوفی نے آپ کی تاریخِ وفات نظم کی ہے، نظم کی کل کائنات پانچ شعر ہے، لیکن کمال یہ ہے کہ سات سو تیس طرح سے تاریخ نکلتی ہے۔ مثلاً ہر مصرعہ علیحدہ تاریخ بتاتا ہے۔ تمام منقوطہ حروف یکجا کئے جائیں تو تاریخ نکل آتی ہے، اسی طرح حروفِ مہملہ کی یکجائی سے ایک تاریخ نکل آتی ہے۔ خود حضرت صوفی کے الفاظ میں اس کی تفصیل یہ ہے :-

تاریخ وصال جناب غفراں مآب حضرت شیخ محمد اعظم علی عرف شاہ بیکن فردوسی منیری قدس اللہ سرہ العزیز

کہ ہر مصرعش تاریخ است و سوای آن حروف منقوطہ یک مصرع با حروف منقوطہ دیگر مصاریع از ہر مصرعہ کہ خواہند لشمرند تاریخ است و ہمچنیں حروف مہملہ یک مصرع با حروف مہملہ دیگر مصاریع حساب کنند تاریخ یابند و ہمچنیں حروف منقوطۂ ایں و مہملۂ آں و مہملۂ ایں و منقوطۂ آں و شنجرفی با شنجرفی و سیاہی با سیاہی، و شنجرفی با سیاہی۔ و سیاہی با شنجرفی، و شنجرفی با مہملہ، یا با منقوطہ، و سیاہی با مہملہ یا با منقوطۂ ہر گونہ کہ شمار کنند تاریخ باشد، جملگی بہفتصد و سی نوع تاریخ برمی آید بدیں تفصیل

۱۲۷۰ھ

ہر مصرع مادہ تاریخ است

۱۰

منقوطہ با منقوطہ	مہملہ با مہملہ	منقوطۂ ایں و مہملہ آں	مہملہ ایں و منقوطہ آں	شنجرفی با شنجرفی
۴۵	۴۵	۴۵	۴۵	۴۵
سیاہی با سیاہی	شنجرفی ایں و سیاہی آں	سیاہی ایں و شنجرفی آں	شنجرفی ایں و منقوطہ آں	
۴۵	۴۵	۴۵	۴۵	
منقوطہ ایں و شنجرفی آں	شنجرفی ایں و مہملہ آں	مہملہ ایں و شنجرفی آں	سیاہی ایں و منقوطہ آں	
۴۵	۴۵	۴۵	۴۵	
منقوطہ ایں و سیاہی آں	سیاہی ایں و مہملہ آں	مہملہ ایں و سیاہی آں	جمع کل	
۴۵	۴۵	۴۵	۷۳۰	

تاریخ

قطب اوج وقت عالی وجہ عید روزگار — جلوۂ صبح ہدا صافی نفس قدسی شعار
کردہ جاں تسلیم حق ہادی بدیں ماہ ورا — شاہ بیکن ارم وجہ علم یقیں طارم وقار
رکن حج لطف شایاں کعبۂ فرو بسیاں — معدنِ جود و صفا و اہل صدق و اعتبار
کعبۂ حاجات صوفی کو حرم معنی مطاف — عیسیٰ اوجِ حقیقت وارد دل پر دہ دار
سال شد کل جملہ اے دل دیگر از جمعش بہم — واں بشنجرف و سواد و ہملہ و نقطہ دار

جملہ ہائے شنجرفی

قطب و عیدِ روزگار ، صبح صافی نفس قدسی ، جانِ تسلیم ما ، شاہ بیکن ارم وشان فرد ، معدن صفا وصدر ، کعبہ حاجا کو حرمِ معنیِ مطاف ، اوجِ حقیقت ، واشد گل دیگر بہم بشنجرف ۔

صوبۂ بہار کا کثیر الاشاعت بلند پایہ ہفتہ وار

آئینہ

اپنے دلچسپ مضامین، اہم سیاسی مقالات، تازہ ملکی، بیرونی خبروں اور دیگر پُر معلومات اطلاعات کی بنا پر اعلیٰ درجہ کے اردو جرائد میں شمار ہوتا ہے۔ فن صحافت کے مشہور مقبر حضرت مولانا ظفر علی خاں قبلہ ایم۔ ایل۔ اے (مرکزی) نے اس اخبار کے متعلق ذیل کے شاندار الفاظ میں اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار فرمایا ہے:۔

میری نظر سے "آئینہ" کی متعدد اشاعتیں گذریں۔ اس کے مدیر مولانا محمد اسمٰعیل تامیح ایک شاق صحیفہ نگار ہیں۔ اور ان کے قلم میں روانی کے ساتھ زور بھی موجود ہے۔ اخبار کے مین السطور سے بیباق صداقت اور آزادی صاف جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ میں مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس اخبار کی اشاعت میں کوشاں ہوں، اور ایک بہت بڑی ملی ضرورت کو پورا کریں۔ سالانہ چندہ تین روپیہ۔ نمونہ مفت

پتہ:۔ مینجر آئینہ۔ کشن گنج۔ ضلع پورنیہ

گوتم بدھ کے قبل جنوبی بہار[1]

از جناب سید اظہر الحق صاحب قادری سونہرسادی

درحقیقت گوتم بدھ کی پیدائش کے قبل بہار کی کوئی تاریخ موجود نہیں ہے۔ لیکن ہندو مذہب کی مذہبی کتابوں سے کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اوران سے قدیم بہار کی تاریخ مرتب ہوسکتی ہے۔ گوتم بدھ کی پیدائش کے قبل (۱۳۰۰ ق م) بہار کسی ایک حکمراں کے ماتحت نہ تھا بلکہ کئی ریاستوں میں منقسم تھا۔ مگدھ (Magadh) اور انگا (Anga) جنوبی بہار، اور ویسالی (Vaisali) اور ویڈیہا (Videha) شمالی بہار میں مشہور ریاست تھے۔

مگدھ قدیم مگدھ دراصل آجکل ضلع پٹنہ اور گیا کا نصف شمالی حصہ ہے مگر کچھ دنوں تک مگدھ سے صرف پٹنہ اور گیا کے یہ حصے مراد نہ لئے جاتے تھے بلکہ بہت وسیع صوبہ سمجھا جاتا تھا۔ اسکی چوحدی جنوب گنگا سے کوونڈیا (Kundya) تک کے شمالی حصہ تک جس کے مشرق میں ملگگری (Madgagri) (مونگیر) اور مغرب میں چرنادری (Charanadri) (چونار) واقع ہے پھیلا ہوا تھا۔ اس سرزمین کے باشندے مگدھا (Magadhas) کہلاتے تھے۔ اور یہاں کی زمین "مگدھ دیش" کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ اسوقت آریہ (Arya) (یعنی ہندوؤں کی موجودہ اعلیٰ ذاتیں) اس صوبہ میں آباد نہ تھے۔ وجاسینی یا سمہتا (Vajaseni-ya-Samhita) سے معلوم ہوتا ہے کہ مگدھوں کا کوئی مذہب نہ تھا نہ تو یہ برہمن تھے نہ شتدر (نیچی ذات) مگدھ والے گانے کے وقت بہت بگاڑ مچاتے اور یہی انکا پیشہ بھی تھا۔ چونکہ پوران سے ظاہر ہے کہ لفظ مگدھ کے معنی "بادشاہ کی شان میں زور و شور سے گانیوالا" ہے اسلیے اگر انکا امتیازی وصف کوئی تھا تو یہی تھا

ویترا Vratyas کچھ عرصہ کے بعد آریوں کی ایک جماعت مگدھ پہونچی اور یہیں آباد ہوگئی۔ یہ لوگ آریہ رسم و رواج کے پابند نہ تھے۔ اسلئے شمالی بہار کے آریوں نے انلوگوں کو ورتیا (Vratya) کے نام سے یاد کیا۔ اس جماعت کے رسم و رواج، طور و طریقہ، رہن سہن پنجاب کے آریوں سے بالکل جداگانہ تھے۔ انلوگوں کے کپڑوں پر سیاہ گوٹ لگی رہتی تھی۔ یہ لوگ نقرئی زیورات کا زیادہ استعمال کرتے تھے۔ اور دوسرے آریوں طلائی زیور پہنتے اس سے صاف عیاں ہے کہ ویتیا (Vratya) بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور خاصے مہذب تھے۔ ویتیا قدیم آباد شدہ قوم مگدھوں سے بالکل ہل مل گئے اور کافی رعب و داب بھی انکا مانا جاتا تھا۔

کیکاٹا (Kikatas) نووارد آریوں اور پرانی قوم مگدھوں کو کیکاٹا بھی کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ صلح کن اور ترقی پسند تھے۔ شہروں کے نام درختوں کے نام پر رکھے جاتے تھے یہ سنسکرت تعجب ہوگا کہ جنوبی بہار کا مشہور شہر پاٹلی پتر (Patrijnchra) پاٹلی درخت کے نام پر رکھا گیا تھا۔ دوسری جگہ کے آریوں جو مشرق کی طرف بڑھے آرہے تھے خواہش ظاہر کی کہ انلوگوں کو بھی اپنی ذات میں شامل کریں۔ چنانچہ چند شرائط منظور کرا کے انلوگوں کو اپنی سوسائٹی میں داخل کرلیا۔

برہمنوں کا عروج یوراں و مہابھارت سے پتہ چلتا ہے کہ برہمنوں نے کسطرح اپنا دارودورہ بہار میں شروع کیا۔ قصہ یوں ہے کہ ایک انگرس (Angiras) نامی ریشی (فقیر) بادشاہ کرندھم (Kazanadhama) کے یہاں پوجاری تھا۔ اور یہ بادشاہ ویسالا (Vaisala) خاندان کا بادشاہ تھا۔ چوہاری کے خاندان میں دیرگھاتما (Dirghatma) نامی ایک لڑکا تولد ہوا جو کہ بدفعلی اور بدچلنی کے وجہ سے گھر سے نکال باہر کیا گیا۔ وہ وہاں سے سلطنت انادا (Aanana) (مونگیر و بھاگلپور) پہونچا، اور وہاں کے راجہ بالی (Bali) نامی نے اسکا خیر مقدم کیا۔ دیرگھاتما نے ایک شدرعورت سے شادی کی جس سے چند لڑکے بھی ہوئے۔ دیرگھاتما اور اسکے لڑکے وہاں

[1] یہ مضمون پروفیسر ڈاکٹر پی۔ بی مزمدار کے ایک انگریزی مقالہ سے ماخوذ ہے۔

سے گریو راج (Grurixaja) اور اجگیر پہونچے اور اپنا سکہ جمایا۔ دیرگھاتا نے زندگی کے اخری دور میں راجہ بھرت کو مرید کیا۔ اسی کے بعد برہمن مذہب ہر چہار سو پھیل گیا۔

شہر گیا کی بنیاد مہابھارت میں سولہ بادشاہوں کے نام درج ہیں، جو ..... "راجہ بکروتی" (Rajahakharvarti) کہلاتے تھے۔ ان سولہ بادشاہوں میں سے دو برہدرتھ (Brunaarath) اور گیا امرتیس (Gaya Amar) بہار کے نامی بادشاہ گذرے ہیں۔ گیا، امرتیس کا لڑکا اور کنیا کبج (Kanya Kubja) کے بادشاہ کونسا (Kuna) کا پوتا تھا۔ اسکے والد نے ایک سلطنت قائم کی جسکو بعد میں مگدھ کہنے لگے۔ اور گیا امرتیس گیا پہ حکمراں رہا۔ اور اسی کے نام سے یہ شہر مشہور ہوا۔

مگدھ کا زوال برہدرتھ پسر باسو (Vasu) راجھرت کے خاندان سے تھا۔ یا سو ہی نے سلطنت گریو راج اور باسومتی (Vasumati) کی بنا ڈالی تھی۔ مہابھارت سے معلوم ہوتا ہے، مگدھ کا پایہ تخت گریو راج تھا۔ یہ اک بہت ہی مستحکم شہر تھا جسکے چاروں طرف سلسلہ کوہ تھا جراسندھ (Jarasandh) کے وقت مگدھ عروج پہ تھا اسنے اپنے اطراف میں بھی متہرا (Mathura) تک قوت بڑہائی۔ اور یہاں کے بادشاہ کنس (Kansa) نے جراسندھ کی لڑکیوں سے شادی کی، اپنے سر پر ہو سہ کرکے اپنی رعیت کو اذیت پہنچانے میں کوئی دقیقہ نہ باقی رکھا کرشنا (Karishna) نے کنس کو موت کے گھاٹ اتارا یہ اطلاع پاتے ہی جراسندھ برہم ہوا اور متہرا پر راجہ بھوج اور کرشن کے خلاف چڑہائی کی یہ لوگ کچھ دنوں اسکا مقابلہ کرکے گجرات اگر دوارکا (Dwarka) میں آباد ہو گئے اسکے بعد جراسندھ ارجن اور بھیم کے ہاتھ قتل کیا گیا۔ اسکے مرنیکے بعد ہی مگدھ کی شہرت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

سلطنت انگا (ANGA) سلطنت انگا مگدھ کے مشرق میں واقع تھی اسکا دارالسلطنت (Champa) چمپا تھا ایک طرف چمپا اور دوسری جانب دریا گنگا رواں تھا موجودہ چمپا نگر اور چمپا پور (بھاگلپور) قدیم دارالسلطنت کے مظاہر پیش کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگ بحری سفر کرنا خوب جانتے تھے۔ اور دوسرے ممالک سے تجارت بھی کرتے تھے کچھ عرصہ کے بعد چمپا سے کچھ لوگ کوچین چین (Cochin China) جاکر آباد ہو گئے، سلطنت انگا کی بنا ایک راجہ انگا ہی نے ڈالی تھی

ویدک تمدن جنوبی بہار پہلے ایک غیر متمدن سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اسکے بعد اسکو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی ویدک تمدن کی اشاعت میں جنوبی بہار کا نمایاں حصہ تھا اسلئے اسکی شہرت دور پھیلی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مضافات گیا میں ساوتری استھان (ساوتری کو پہچاننے کی جگہ) تھا۔

رامائن سے معلوم ہوتا ہے کہ فقیر وشوامتر (Vishwa mitra) نے رام اور لکشمن کو جبکہ یہ دونوں فقیری لئے ہوئے تھے۔ دریا سون (Sone River) کے کنارے پر لایا۔ وشوامتر نے بھوج قوم (Bhoj Tribe) کے ساتھ کچھ جشن بھی منایا اور انگلوگوں کو بھوج (Bhoj) کہا، موجودہ بھوج پرگنہ جو کہ بکسر (Buxar) سب ڈویژن میں ہے اسی بھوج قوم کے نام سے مشہور ہے اس بھوج پرگنہ کو اجین (Ujjain) کے راجہ بھوج سے کچھ تعلق نہ تھا۔

انہیں تاریخی حوادث کے بعد جنوبی بہار کے متعدد مقامات کو مذہبی عظمت حاصل ہوئی، جو آج تک قائم ہے۔

سول شوز کمپنی بانکی پور پٹنہ (نزد ٹریننگ کالج)
اگر سستے، اچھے، خوبصورت اور پائدار جوتے بنوا کر پہنا چاہیں تو حسب ذیل پتہ پر خود تشریف لائیں۔ یا آرڈر روانہ کریں۔ ایک مرتبہ کام لینے کے بعد آپ کبھی اس کمپنی کو نہ بھولینگے۔
CIVIL SHOE Co. BANKI PORE PATNA.
(APOSIT TRAINING COLAGE)

صوبۂ بہار کا ایک دلکش اجمالی مرقع

از جناب سید شاہ قاسم غنی صاحب رئیس گیا

نوٹ: ہمارے ایک بسیط مضمون نگار مخدومی مسٹر نصیر الدین حسین نصیر مدظلہ رئیس سرائیٹ نے اپنی سابق اقامت گیا کے علمی ذخیرہ میں محفوظ تھا۔ یہ مضمون صوبہ بہار کے چند سال پیشتر کا لکھا ہوا تھا۔ راقم سطور نے اسکی اشاعت "بہار نمبر" کیلئے مناسب سمجھی۔ مگر ندوہ کی تنگ دامانی کے سبب اس بسیط مقالہ کی ہمعنیں مرد علم تھی۔ بس اس میں اس کا مختصر مدرج موصوف مدظلہ کے تشکر یہ کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ سال یہ موقعہ ہمیں پھر حاصل ہوگا۔ اس مقالہ کی ترتیب میں بعض جگہ کچھ تلخیص بھی کی گئی ہے۔ اور بعض جگہ کچھ اضافہ بھی۔ تاہم مضمون بدستور قائم رہا۔ امید ہے کہ ناظرین موصوف کے اس مقالہ کی تلخیص سے بھی محظوظ ہوں گے ——— قاسم غنی

بہار بہت قدیم آبادی ہے۔ مگدھ دیش کا یہی دار السلطنت تھا موریوں کی سلطنت یہاں بہت قدیم زمانہ میں تھی اور بدھ مذہب کے ماننے والے بھی بہت سے سلاطین یہاں گذرے ہیں جین مذہب کی بنا بھی اسی علاقہ میں پڑی۔ اسکی انہیں خصوصیتوں سے پورے صوبہ کا نام بھی بہار ہی رکھا گیا۔

بارھویں صدی عیسوی میں محمد بختیار خلجی نے بہار کو فتح کیا۔ پھر ۱۱۹۳ء میں مسلمان صوبہ دار بنگالہ کے ماتحتی میں آیا اسکے بعد ۱۳۳۰ء میں صوبہ بہار کے دکھن کا حصہ دلی میں شامل کر لیا گیا اور اتر کا حصہ تھوڑے زمانہ تک صوبہ بنگال کی ماتحتی میں۔ رہا پھر ۱۳۶۹ء میں پورا بہار جونپور کی سلطنت کی ماتحتی میں چلا گیا سلاطین مغلیہ نے بھی ابتداً شہر بہار ہی کو اس صوبہ کا دار السلطنت قرار دیا۔ ۱۵۷۶ء میں صوبہ بہار صوبہ بنگال میں شامل کر لیا گیا۔ پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں رہا۔ ۱۹۱۱ء میں پھر بہار اڑیسہ مل کر ایک صوبہ بنایا گیا۔ اور ایک خاص گورنر کی ماتحتی میں اس کی ساری چیزیں صوبہ بنگال سے الگ کر دی گئیں اور اس صوبہ کا دار السلطنت پٹنہ ہی قرار دیا گیا۔ اس صوبہ کی علحدگی اور مستقل گورنری ہونے میں سر علی امام مرحوم نے بہت بڑا حصہ لیا۔ اور یہ انہیں کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ آج صوبہ بہار کی ایک الگ ہستی ہے اور ہائیکورٹ یونیورسٹی وغیرہ سب اسکے اپنے محکمے ہیں۔ اور یہ دوسرے صوبہ کا اب کسی امر میں محتاج نہیں ہے ۱۹۳۵ء سے صوبہ اڑیسہ بھی خارج ہو گیا۔ اور بہار مستقل صوبہ قرار پا گیا۔

قصبہ بہار

آج کل جنکشن پور جنکشن سے راجگیر تک ریل کی ایک چھوٹی لائن گئی ہے جس نے بہار کو پٹنہ اور راجگیر سے ملا دیا ہے اور بہار ہی میں سب ڈویژن کا افسر بھی رہتا ہے ماولیا اللہ کے مزاروں کی کثرت کی وجہ سے اب تک بہار شریف کا قدیم اعزاز مسلمانوں میں باقی ہے گو جیسا کہ جانے کیوجہ سے اکثر محلوں میں ریت پڑ گئی ہے بہار اجکل چند گلیوں اور انکی شاخوں میں آباد ہے یہاں کے اکثر مقبرے یا تو اینٹوں سے بنے ہوئے ہیں یا پتھر سے تراشے ہوئے ہیں نو وارد کی نگاہ میں اسکی پوری آبادی پرانے کھنڈروں پر آباد نظر آتی ہے۔ جا بجا پختہ قبریں ملتی..... ہیں۔ آبادی اجڑتی اور بستی گئی ہے۔ کہیں کہیں مکانوں کے اندر بھی قبریں آگئی ہیں یہاں کے آثار قدیمہ میں ایک قلعہ ہے جو کہ اونچی زمین پر واقع ہے اس قلعہ کی چہار دیواریاں پتھر کی بنی ہوئی تھیں لیکن اب یہ قلعہ ویران ہے اس کے بیچ میں ایک درگاہ حضرت قادر قمیش رح کی ہے اور اس سے تھوڑی دور پر ایک درگاہ حضرت مخدوم شاہ احمد چرم پوش کی ہے۔ اسکا پھاٹک گیارہ فیٹ اونچا اور سات فیٹ چوڑا ہے اس پر نازک نقاشی تھی۔ آبادی کے اتر اور بیچ ایک پہاڑی کی چوٹی پر ملک ابراہیم بیا کا مقبرہ ہے جس کے ارد گرد دس اور مجاہدین کے مزار ہیں۔ ملک بیا کے مزار کے اوپر ایک گنبد بنا ہوا ہے اور روضہ پر جو کچھ لکھا ہوا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ انکا انتقال ۱۳۵۲ء میں ہوا۔ یہ ایک بہت ہی مشہور مجاہد تھے۔ انہوں نے روہتاس گڈھ کے ہندوؤں کو سخت شکست دی تھی حضرت مخدوم شیخ شرف الدین رحمہ اللہ علیہ (جنہیں مخدوم الملک کہتے ہیں) کے مزار سے اس قصبہ کو شرف فضیلت حاصل ہے یہ درگاہ ۱۵۵۵ء میں تعمیر ہوئی اس کی زیارت کو لوگ دور دور سے آتے ہیں اور حضرت مخدوم الملک کا سالانہ عرس ۵ رشوال کو ہوتا ہے۔

چھوٹی درگاہ کے نام سے حضرت بدر عالم کا مزار مشہور ہے یہ بزرگ بھی برگزیدہ اولیاء میں سے تھے۔ جو چٹ گاؤں سے آکر بہار میں بس گئے تھے۔ انکا انتقال ۱۴۴۰ء میں ہوا ہے یہاں کی جامع مسجد اکبر کے وقت میں سعید خان صوبہ دار بہار نے ۱۶۰۱ء میں بنائی تھی جو اب تک قائم ہے

جو اب تک قایم ہے۔ حبیب خان نے جو خاندان سور سے تھا ایک تالاب اور ایک مسجد ۱۶۳۳ء میں بنائی تھی

صوبہ بہار بہار کا صوبہ جو زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے وہ گنگا کی وادی میں آباد ہے۔ نیپال کی ترائی سے چھوٹا ناگپور کی پہاڑی تک پھیلا ہوا ہے یہ چند کمشنریوں میں تقسیم ہے۔ پٹنہ کمشنری کا رقبہ ۱۱۱۵۴ مربع میل ہے جسکی آبادی ۶۲۲۴۴۲۵ اسمیں ترہت کا رقبہ ۱۵۹۸۰ مربع میل ہے جن میں ۱۰۷۳۹۲۷۴ آدمی بستے ہیں۔ بھاگلپور کمشنری کا رقبہ ۱۸۵۸۳ مربع میل ہے اس میں ۸۷۵۹۶۰۱ آدمی بستے ہیں۔ اس صوبہ کی آبادی ہندوستان میں ہر جگہ سے زیادہ گنجان ہے اسمیں چند درجہ ریلوے لائن بن گئی ہیں اور اسمیں کئی کمپنیوں کی گاڑیاں چلتی ہیں۔ یہ صوبہ بندوبست دوامی کا مرکز ہے جہاں زمیندار دن کی کثرت ہے زبان یہاں کی اردو ہے اور کہیں کہیں بھاشا آمیز یہاں کے لوگ پچھم کے لوگوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ زمین اسکی مسطح ہے سوائے مونگیر اور پورب دکھن کے علاقوں کے۔

دریائے گنگا بکسر میں صوبہ بہار میں داخل ہو کر پورب طرف بہتا ہے اور راج محل میں صوبہ سے باہر نکل جاتا ہے۔ گنگا کے اوتر طرف سارن چمپارن۔ ترہت پورنیہ اور مونگیر کے اضلاع کے کچھ حصے پڑتے ہیں دکھن جانب گنگا کے شاہ آباد اور پٹنہ گیا۔ سنتال پرگنہ اور باقی حصہ مونگیر اور بھاگلپور کا پڑتا ہے یہ تقسیم فطری ہے اور رقبہ زمین کا، اتر اور دکھن گنگا کے قریب قریب برابر ہے۔

آب وہوا آب وہوا میں اس صوبہ کے اعتدال ہے جاڑا اگرچہ برسات تینوں فصلیں یہاں کی خوشگوار ہوتی ہیں۔ گرمی ویسی سخت نہیں پڑتی جیسے دلی وغیرہ میں۔ نہ ویسی سخت سردی یہاں پڑتی ہے جیسے پنجاب یوپی میں۔ بارش بھی اتنی کثرت سے نہیں ہوتی جیسے بنگالہ میں۔ گرمی اس صوبہ میں وسط مارچ سے لیکر جون کے آخر تک رہتی ہے۔ جولائی سے آخر ستمبر تک برسات رہتی ہے اکتوبر سے لیکر وسط مارچ تک جاڑے کی فصل رہتی ہے

صنعت وحرفت ومعدنیات سارن چمپارن اور پورے ترہت میں شورہ صاف ہو کر کلکتہ روانہ ہوتا ہے۔ سوت کے کپڑے اور تسر کے کپڑے بہار میں نہایت اچھے بنے جاتے ہیں ململ اور ڈھاکہ آج بھی بہار کے خاص کپڑے ہیں۔ تسر کے کپڑوں کی تجارت اب بہار میں نہایت اچھی طرح سے اور ایک بڑی تجارت ہے اور طرح طرح کے کپڑے اب بہار میں بنے جاتے ہیں۔ گرچہ بھاگلپور نے تسر کے کپڑوں کے بننے میں قصبہ بہار سے زیادہ ترقی کی ہے اور قریب قریب بنارس کے تسری کپڑوں کے اب بھاگلپور میں بھی تسری کپڑے بنے جاتے ہیں۔ سونے چاندی کی چیزیں اور زیور پٹنہ میں نہایت عمدہ بنتے ہیں۔ گیا کے اطراف میں کمبل کثرت سے بنے جاتے ہیں۔ کاغذ بھی بعض بعض ضلعوں میں صوبہ بہار کے بنائے جاتے ہیں اب دالمیانگر کی کاغذ اور سمنٹ کی ٹیکری سے بہترین کاغذ اور سمنٹ تیار ہوتا ہے چھوٹا ناگپور کا علاقہ اپنے کوئلہ اور ابرک وغیرہ کی کانوں کیلئے مشہور ہے۔ رانچی میں لاکھ کے پیداوار ہوتی ہے۔

تعلیم بہار اسلامی عہد سے پہلے اپنی تعلیمی ترقیوں میں شہرت عام رکھتا تھا جس کے حالات دہرانے کی ضرورت نہیں پھر مسلمانوں نے بھی یہاں سیکڑوں مدرسے بنائے اور ہر امیر وقت کی یہ شان تھی کے وہ تعلیم گاہوں کی مدد کو اپنا فرض سمجھتا تھا علما مسجدوں کے حلقوں میں مدارس بنائے ہوئے تھے وہ لوگوں کو مفت تعلیم دیتے تھے اور ان مدارس کے اخراجات کا سامان یوں ہوتا تھا کہ کسی امیر نے کسی مدرسہ کی سرپرستی اختیار کرلی اور کسی دوسرے امیر نے کسی دوسرے مدرسہ کی۔ پرانے شہروں میں ان کے نشانات آج بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں

تعلیمی علمی ادارے انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں ضلع پٹنہ کی تعلیمی حالت یہ تھی کہ کسی تعلیم گاہ عامہ کا یہاں وجود بھی نہ تھا یا تو گرو یا کچھ مولوی امرا و رؤسا کی طرف سے معین تھے جو پنڈے یا مکتبوں میں لڑکوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔

یہاں کی عدالتوں کی زبان فارسی تھی اور ہندوؤں کو بھی ابتدائی تعلیم فارسی کی دی جاتی تھی حساب وکتاب بھی فارسی میں لکھا جاتا تھا۔ اور یہ کام اکثر کایستھوں کے سپرد تھا۔

جو لوگ فارسی میں خط کتابت کر سکتے تھے انکا لقب منشی تھا اور وہ اکثر خوشخط ہوتے تھے علماء کا کام فارسی سے لیکر عربی تک پڑھانا تھا جو اکثر نوجوانوں کو تعلیم دیا کرتے تھے اس زمانہ میں تقریباً بیس ہزار آدمی اس ضلع میں پڑھے لکھے تھے مستورات کی تعلیم اکثر چار دیواریوں

کے اندر رہوا کرتی تھی اور پردے کی وجہ سے غیر قوموں میں ان کی تعلیم کا موازنہ کرنا تو بے یہ محال تھا۔ لیکن انکی لکھی ہوئی قلمی کتابیں بہت سے پرانے گھروں میں آج بھی پائی جاتی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ یہ بھی لکھی بیبیاں کم ہوتی تھیں لیکن ان ..... میں جو قابل ہوتی تھیں ان کی خوشنویسی اور فارسی کی لیاقت ایسی ہوتی تھی کہ آجکل کے بہت سے پڑھے لکھے مردوں کو بھی ویسی خوشنویسی نصیب نہیں

۱۸۶۰ء میں پہلے پہل پٹنہ کو لیجیٹ اسکول گورنمنٹ کی طرف سے کھولا گیا اور ۱۸۷۰ء سے ۱۹۰۰ء تک اس صوبہ میں گورنمنٹ کی امداد سے چند اسکول کھولے گئے جن میں ایک ہزار یا پانچ سو طلبا تھے پٹنہ کالیجیٹ اسکول کھلنے کے چند دنوں بعد پٹنہ کالج گورنمنٹ کی طرف سے قایم ہوا اور اسمیں ایک قانون کی تعلیم گاہ بھی کھولی گئی۔

۱۸۷۲ء میں ڈاکٹری کا مڈل مڈیکل اسکول گورنمنٹ کی طرف سے کھولا گیا جو پٹنہ نورمل اسکول بھی گورنمنٹ نے کھولا۔ عورتوں کی عام تعلیم کے لئے ۱۸۸۸ء سے تعلیم گاہیں کھلنی شروع ہوئیں۔

جنوری ۱۹۰۹ء میں بادہ شاہ نواب رضوی کی مدد سے ایک تعلیمی کالج عورتوں کیلئے کھولا گیا جس میں انکی وقف کردہ سالانہ آمدنی ۲۷۶ روپے کی جاری ہے یہ کالج پہلے بتیا ہوس میں قایم ہوا۔ لیکن حال میں گورنمنٹ نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا اور اسمیں دستکاری سکھانے کیلئے بھی ایک تعلیم گاہ ہے اس کالج کی ایک ہندوستانی خاتون پرنسپل ہیں۔ اس کالج میں پردہ کا بھی انتظام ہے اور اکثر مسلمانوں کی لڑکیاں یہاں تعلیم پاتی ہیں۔ پھر پٹنہ یونیورسٹی یکم اکتوبر ۱۹۱۷ء سے کھلی اور کلکتہ یونیورسٹی کی جگہ تعلیم کی نگرانی کا انتظام صوبہ بہار میں یونیورسٹی نے کرنا شروع کیا۔ پٹنہ یونیورسٹی کیلئے ایک نہایت خوبصورت عمارت باقی پور میں پٹنہ کالج کے قریب بن گئی ہے جس میں امتحان کا کمرہ بہت ہی شاندار ہے اور اسی عمارت میں یونیورسٹی آفیس ہے۔ اسکے متعلق ایک پبلک لائبریری ہے جو خاص پروفیسروں کے لئے ہے۔

ضلع پٹنہ میں اول درجہ کے دو کالج ہیں ایک پٹنہ کالج دوسرے بہار نیشنل کالج جہاں میں سائنس کالج کی عمارت پٹنہ کالج کے قریب ہی بہت ہی شاندار بنائی گئی ہے اور اسمیں تمام آلات متعلق کمسٹری اور فیزیکس اعلیٰ درجہ کے مہیا کئے ہیں اور اسمیں لائبریری بہت عمدہ بنائی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ ہر قسم کی سائنس کا انتظام یہاں اول درجہ کا ہو گیا ہے اور ایم۔ اس سی تک کی تعلیم یہاں ہوتی ہے معلموں کیلئے ٹریننگ کالج بھی ہے۔ اور قانون کی درسگاہ الگ بن گئی ہے

ناگی پور میں لڑکوں کے قیام کیلئے ہوسٹل بہار نیشنل اور پٹنہ کالج کے بن گئے ہیں جن میں مسلمانوں کا انتظام جدا ہے ہندوؤں کا الگ

مڈیکل اسکول کا کمپونڈ اور اس کے آس پاس کی زمین لیکر پٹنہ پرنس اوف ویلس مڈیکل کالج اور اسپتال بنائے گئے جس میں ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم دیجاتی ہے

بہار اسکول آف انجینرنگ جو پہلے تھا اب وہ سعت دیکر بہار انجینرنگ کالج بن گیا ہے اور اسمیں عمدہ ترین تعلیم انجینرنگ کی ہوتی ہے

عربی تعلیم کیلئے اعلیٰ درسگاہ ۱۹۱۰ء میں مدرسہ شمس الہدیٰ کے نام سے مسٹر سید نور الہدیٰ سی۔ ائی۔ ائے نے قایم کیا اور اور ایک دو منزلہ عمارت اور ایک مسجد اس احاطہ میں بنائی جہاں مسلمانوں کو مذہبی تعلیم دیجاتی ہے اور اسکا انتظام گورنمنٹ نے اپنے ہاتھ لیا ہے صغریٰ وقف اسٹیٹ کا مدرسہ عزیزیہ بہار پیر مدرسہ اسلامیہ بہار مدرسہ خانقاہ شہسرام اور مدرسہ سلفیہ دربھنگہ مدرسہ حنفیہ ارہ مدرسہ انوار العلوم گیا وغیرہ صوبہ کی ممتاز عربی درسگاہیں ہیں مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی مدرسہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل اور جناب حاجی شرف الدین صاحب عزیزیہ بہار کے نگران ہیں ماہی پور میں طبیہ اسکول بھی قایم کیا گیا ہے۔ جہاں یونانی طب پڑھائی جاتی ہے اور یونانی علاج ہوتا ہے جناب حکیم محمد ادریس صاحب مدرسہ طبیہ کے پرنسپل ہیں اور ویدک اسکول بھی گورنمنٹ کی طرف سے قایم کیا گیا ہے

پٹنہ میں سب سے بڑی لائبریری خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری ہے جسے ۱۸۹۰ء میں خان بہادر خدا بخش خاں سی۔ ائی۔ ائے نے اسکو دو منزلہ عمارت میں کھولا اس کتب خانہ میں فارسی عربی کی نادر قلمی خوش خط کتابیں جمع ہیں بیشتر کتابیں ایسی ہیں جن کا واحد قلمی نسخہ اس لائبریری کی زینت ہے۔ اسکے ماسوا اور زبانوں کی بھی مفید کتابیں جمع ہیں۔ اسکا انتظام اب گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہے اور

جمعہ کے دن کے سوا ہر روز چھ بجے دن سے دس بجے دن تک پھر شام کو دو گھنٹے تک یہ لائبریری کھلی رہتی ہے اس کے پاس گورنمنٹ نے کتب بینی کیلئے ایک ہال بنایا ہے جس میں عامہ خلقت جاکر کتابوں کا مطالعہ کرتی ہے یہ تعمیر گورنمنٹ کے خرچ سے ہوئی ہے .... اس لائبریری کے سکریٹری ان دنوں مولوی عبدالحق بی اے ہیں خدا بخش بی اے ہیں اور نادر قلمی کتابوں کی تحقیق کی خدمت مولانا مسعود عالم ندوی کے سپرد ہے مسٹر سچدانند سنہا نے اپنی بیوی کی یادگار میں ایک لائبریری کھولی ہے جس کا نام شریمتی رادھیکا انسٹی ٹیوٹ ہے اس کتب خانہ کیلئے ایک نیا مکان انہوں نے پٹنہ گیا ڈویژن پر بنایا ہے اور یہ بھی پبلک لائبریری ہے نئے علوم کا نادر ذخیرہ یہاں فراہم ہو رہا ہے۔ گذشتہ سال انریبل ڈاکٹر سید محمود سابق وزیر تعلیم صوبہ بہار نے گورنمنٹ اردو لائبریری حکومت کی طرف سے قایم کی ہے یہ اردو کی خدمت کے سلسلہ میں انکا اہم کارنامہ ہے۔ اس لائبریری کیلئے اورینٹل لائبریری کے بغل میں لا کالج کی پرانی عمارت اسکو دیدی گئی ہے اور یہ اب اپنی مستقل عمارت میں قایم ہے اس لائبریری کیلئے گذشتہ سال پہلی مرتبہ کتابوں کا ستھرا انتخاب ہوا تھا لیکن افسوس ہے کہ امسال اسکا التزام قائم نہیں رہا۔ محض رطب و یابس کتابیں حکومت کے سالانہ عطیہ کو کسی طور پر صرف کر دینے کی خاطر اکٹھا کیجا رہی ہیں۔ ضرورت ہے کہ حکومت اپنی خاص توجہ اس جانب مبذول کرے اور کتابوں کے انتخاب کیلئے اہل علم کے مشورے حاصل کرے مولوی سید حسن آر زو صاحب پھلواروی اس لائبریری کے انچارج ہیں

طالب علموں کے ملنے جلنے کے لئے اور آپس میں اتحاد بڑھانے کیلئے چوہٹے میں بہار رینک مین انسٹی ٹیوٹ کی عمارت بنائی گئی ہے جسمیں ہر طرح کی دلچسپی کا سامان مثلاً بلیرڈ کارڈ اخبارات وغیرہ مہیا کیے گئے ہیں یہاں شام کو نوجوان باہر ملنے جلتے ہیں

پٹنہ کے دو اور کلب قابل ذکر ہیں۔ ایک تو "بانکی پور کلب" ہے جو گنگا کے کنارے پر فضا مقام پر واقع ہے اس میں رقص و سرود کے جلسے ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کلب کے ممبر بیشتر یورپی ہیں۔

دوسرا "نیو پٹنہ کلب" ہے۔ اس کے قائم کرنے میں جسٹس آف آر۔ رو، سر علی امام اور سر سلطان اور پی ارداس وغیرہ نے بڑا حصہ لیا تھا۔ اس کے ممبران کی تعداد ۸۰ ہے۔ جن میں ہندوستانی اور یورپین دونوں ہیں۔

پٹنہ میوزیم" بھی نظر انداز کرنے کے لایق نہیں یہ ابھی حال ہی قائم ہوا ہے اسمیں کتابوں کا قیمتی ذخیرہ بھی ہے۔

بانکی پور پٹنہ کی انجمن اسلامیہ بھی قابل ذکر ہے۔ اس کا مقصد آپس میں ارتباط بڑھانا ہے اور مسلمانوں میں ہر طرح کے آداب و اخلاق کی تعلیم کا پھیلانا ہے محلہ مراد پور میں اسکی شاندار عمارت ہے اور اس میں ہر طرح کے عام جلسے صوبہ کے مسلمانوں کی بہبودی کیلئے ہوتے رہتے ہیں اسمیں ایک بہت بڑا ہال (۱۲۰×۶۰) تعمیر کیا گیا ہے جسکے ایر کی منزل میں گیلری اور اردو کا کتب خانہ ہے جس میں ہر شخص جاکر کتابیں دیکھنے کا مجاز ہے اور اس کتب خانہ میں اخبارات اور رسائل بھی آتے ہیں۔

بھاگلپور میں ٹی۔ این جبوبلی کالج ہے۔ ہزاری باغ میں سینٹ کولمبس کالج اور اسمیں لڑکوں کیلئے دارالاقامہ بھی ہے یہ پادریوں کا بنایا ہوا کالج ہے

خاص قصبہ بہار میں نالندہ کالج دوسرے درجہ کا کالج ہے جسمیں ایف۔ اے تک کی پڑھائی ہوتی ہے۔ گرہ ننگ اسکول، اور بہار اسکول بھی قابل اعتماد تعلیمگاہیں ہیں پٹنہ کے دو انسٹیٹیوشن کا ذکر باقی رہ گیا۔ ایک مسلم ہائی اسکول ہے جسکو گذشتہ سال مسلمانوں نے نئے جوش و ولولہ سے جاری کیا ہے امسال یہاں کے طلبہ نے میٹرک کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی اسکے روح دروان مسٹر حیدر امام بیرسٹر اور ڈاکٹر سید عبدالحفیظ ہیں۔ دوسرا پٹنہ اسکول آف آرٹس ہے جس میں صنعت و حرفت اور مصوری کی اعلیٰ تعلیم دیجاتی ہے حکومت نے اردو لائبریری کے پہلو میں اسکو عمارت دیدی ہے جناب رادھا موہن صاحب اسکے بانی اور روح رواں تھے

کیا میں اسوقت تک افسوس کہ کوئی ڈگری کالج موجود نہیں چند ہائی اسکول ہیں ہادی ہاشمی ہائی انگلش اسکول سے اسلامیہ اسکول کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ مدرسہ انوار العلوم اس شہر کی دیرینہ عربی تعلیمگاہ ہے اس ضلع کے ممتاز قصبہ داؤدنگر میں سفٹن ہائی اسکول ہے جسکو اسکے ہر دلعزیز سکریٹری خان بہادر حکیم سید محمد صاحب خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں اسی طرح نوادہ، جہان آباد اور اورنگ آباد میں ہائی اسکول

---

۵ یعنی جسٹس سید شرف الدین صاحب مرحوم کا وسیع سکونتی مکان مسمی چوہٹہ ہاؤس

جاری ہیں اسی طرح ایک دوسرے قصبہ بیلا گنج میں ایک ڈگری کالج بھی قائم ہوگیا ہے خبر ہے کہ جناب لال جی بابو بیرسٹر کی کوششوں سے عنقریب شہر گیا میں بھی کالج کا افتتاح ہونے والا ہے۔ . . . . . .

نئی سرکاری عمارتیں - پٹنہ میں اس کے دارالسلطنت ہونے کی حیثیت سے جو چند عمارتیں بنائی گئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں پولس گورنری۔ اس کی . . . . . عمارت سہ منزلہ ہے اتر دکھن لمبی ہے۔ زمین کی منزل پر آفس اور دربار کا کمرہ ہے جس کمرہ کی بلندی دو منزل تک چلی گئی ہے یہ کمرہ ۶۵½ فیٹ لمبا ہے اور ۴۳ فیٹ چوڑا ہے . . . . . پچھ جانب دربار اور رقص کا کمرہ ہے اس کمرہ میں ٹیک کے تختے بچھے ہوئے ہیں جن کے نیچے کمانیاں دیکر لچک پیدا کیگئی ہے یہ سرکاری عمارتوں میں سب سے اچھا پیانو پہلی منزل میں ملاقات کے کمرے اور کھانے کے کمرے ہیں جنکی لمبائی ۴۳ فیٹ اور چوڑائی ۳۳ فیٹ ہے اسکے احاطہ میں ایک سو ایکڑ زمین ہے جسمیں ٹینس کھیلنے کی جگہیں بنی ہوئی ہیں اور خوبصورت چمن پھولوں سے آراستہ ہیں اواں گورنری کے پورب ایک بہت بڑی عمارت ۶۷ فیٹ لمبی اور ۳۴۶ فیٹ چوڑی ہے جس میں ایک سو پانچ کمرے ہیں پہلی منزل میں ۹۲ کمرے ہیں دوسری منزل میں . . . . . تیس اوفس ہیں اور ۵۰۰ کلرک کام کرتے ہیں گھڑی کا ایک منار ۱۷۸ فیٹ اونچا بنا ہوا ہے یہ عمارت سکریٹریٹ کہلاتی ہے۔

کونسل چیمبر سنہ ۱۹۲۰ء میں بنکر مرتب ہوا وہ سکریٹیٹ کے پورب ہے اور یہ عمارت بھی بہت ہی خوبصورت ہے۔ کونسل چیمبر کا ہال کمرہ ۶۰ فیٹ لمبا اور ۵۰ فیٹ چوڑا بنا ہوا ہے۔ ایک گیلری اُپری منزل میں بنی ہوئی ہے قانون ساز جماعتوں کے مباحثہ سے دلچسپی رکھنے والوں اور . . . . اخبارات کے نامہ نگاروں کو اس میں جگہ دیگئی ہے

دارالسلطنت بہار کیلئے سنہ ۱۹۱۶ء میں ہائیکورٹ کی عمارت الہ آباد ہائیکورٹ کی وضع پر بنائی گئی سوائے اسکے اس میں جدت یہ کی گئی کہ سامنے پچھم رخ سنگ مرمر کی سیڑھیاں اور ایک بڑا گنبد بنایا گیا۔

پٹنہ کا عجائب خانہ پہلے پہل سنہ ۱۹۱۵ء میں پٹنہ ہائیکورٹ کے اترے کے بارہ دری میں تھا مگر اب اسکی عمارت پٹنہ گیا روڈ پر نہایت خوبصورت بن گئی ہے اس عمارت کے چاروں کونے پر چار گنبد ہیں۔

رجال

صوبہ بہار کی سرزمین میں بڑے بڑے علمائے کرام پیدا ہوئے علم اور کمال زمانہ قدیم سے اس کا مایہ امتیاز رہا ہے سلم العلوم حاشیہ سرزاہد، ملا جلال وغیرہ یہاں کے علماء کی مشہور زمانہ کتابیں ہیں شیخ محب اللہ بہاری۔ امین اللہ مرحوم نگرنسوی مولانا علیم الدین حسین مرحوم مولانا شمس الحق مرحوم قاضی صادق علی مرحوم مولانا ولایت علی مرحوم مولانا احمد اللہ مرحوم مولانا یحیٰ علی مرحوم۔ مولانا عبدالقیوم مولانا عبدالرحیم مرحوم۔ مولانا حکیم عبدالحمید مرحوم اور مولانا نظیر حسین صاحب مرحوم وغیرہ یہاں کے متقدمین اہل علم میں عالمگیر شہرت کے مالک ہیں

اولیائے کرام صوبہ کے مشہور اولیائے کرام میں حضرت تاج فقیہ اور ان کے اخلاف کو بلند مرتبے حاصل ہیں وہ خود اپنے علمی تبحر سے امام محمد تاج الفقہاء کہلائے۔ ان کے پوتے حضرت مخدوم یحیٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو منیر ہی میں پیدا ہوئے آپ کا سنہ وصال سنہ ۱۲۹۱ء ہے آپ حضرت مخدوم شیخ شرف الدین بہاری قدس سرہٗ کے والد ماجد اور حضرت شیخ شہاب الدین پیر جگجوت قدس سرہٗ کے داماد تھے جنکا مزار شریف جیونھلی میں ہے حضرت پیر جگجوت کی دوسری صاحبزادی بی بی کمالو رحمۃ اللہ علیہا ہیں جو کامو میں مدفوں ہیں مخدوم شاہ یحیٰ منیری کا مزار بھی منیر ہی میں ہے۔ اس مزار کے حلقے میں ایک مسجد بھی ہے جو ایک بڑے تالاب کے پورب واقع ہے۔ اس تالاب میں سوں سے ایک نہر گرائی گئی ہے جو ۴۰۰ فیٹ لمبی ہے مسجد اور حجرہ ابراہیم خان صوبہ دار بہار کا تعمیر کردہ ہے اسی کے قریب تھوڑی دور پر سنہ ۱۶۱۶ء میں ابراہیم خان صوبہ دار بہار نے حضرت مخدوم شاہ دولت کا ایک روضہ بنوایا ہے جسکی دیواروں پر پاکیزہ نقاشیاں ہیں اور ہر گوشے پر ایک نہایت ہی خوبصورت مینار بنا ہوا ہے اسکا گنبد بہت رفیع الشان ہے۔ اس روضہ میں قرآن شریف کی آیتیں منقش ہیں اور اس احاطہ میں ایک خوبصورت مسجد بنی ہوئی ہے جسکے پھاٹک پر جو عبارت کھدی ہوئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۱۶۱۹ء میں یہ عمارت بنی تھی مخدوم شاہ دولت کا روضہ چھوٹی درگاہ کے نام سے مشہور ہے اور مخدوم شاہ یحیٰ منیری کا مقبرہ بڑی درگاہ کہلاتا ہے سنہ ۱۲۳۰ء میں بابر بادشاہ حضرت مخدوم یحیٰ منیری کے روضے

پر زیارت کیلئے آیا تھا۔ اور اس نے مسجد میں جو متصل مزار مخدوم یحییٰ منیری ہے نماز ظہر ادا کی تھی۔ بارہویں شعبان کو یہاں میلہ ہوتا ہے جس میں تبرکات حضرت تاج فقیہہ کی زیارت کی جاتی ہے جیسا کہ شروع میں بیان ہو چکا ہے حضرت مخدوم شیخ شرف الدین علیہ الرحمتہ کو مخدوم الملک کہا جاتا ہے اسی سے یہ ظاہر ہے کہ انکا پایہ فقر کس قدر بلند تھا انہیں علوم قرآن و حدیث میں بلند مرتبہ حاصل تھا آپکے مکتوبات کا مجموعہ خاص شہرت کا حامل ہے پھلواری شریف میں حضرت شاہ مجیب قدس سرہ اور حضرت منعم پاک قدس سرہ مدفن گھاٹ پٹنہ کے مناقب و فضائل بھی مشہور عام ہیں رائج تک اس خاندان میں صوفیائے کرام ہوتے آئے ہیں۔

یہ سب تو اگلے بزرگان دین تھے شاہ دلات علی صاحب اسلام پور حضرت شاہ حسین صاحب خانقاہ منعمیہ گیا حضرت شاہ قمام اصدق صاحب پرنگلیہ اور مولانا محمد سعید صاحب مرحوم اور شاہ ایں احمد صاحب سجادہ نشین بہار شریف حضرت شاہ عبدالقادر صاحب اسلام پلوار، مولانا قاری شاہ سلیمان صاحب پھلواری مولانا شاہ بدرالدین صاحب پھلواری اور جناب شاہ چاند صاحب بیتھو شریف صوبہ بہار میں دور اخیر کے ارباب کمال میں گذرے ہیں۔

ارباب کمال

صوبہ بہار کے جواہر دیا قوت رقم حضرات کے خدمات بھی لایق ذکر ہیں۔ جناب منشی الٰہی بخش صاحب (گیا) خوشنویسی کے بہت بڑے استاد گذرے ہیں جناب میر صاحب و مرزا صاحب پٹنہ میں نستعلیق کے اول درجہ کے ماہرین میں سے تھے جناب منشی واعظ علی صاحب مرحوم مغلپورہ ہفت قلم سمجھے جاتے تھے۔ نواب یوسف علی خان نستعلیق و شفیعہ اور مولانا تصدق حسین صاحب خلاق نگر نہسوی نستعلیق و شفیعہ کے ممتاز استاد تھے مجھے ان حضرات کی لکھی ہوئی وصلیوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے نوادر روزگار میں سے ہیں دور حاضر میں جناب شاہ اکرام الدین احمد صاحب عرفان رئیس اسلام پور خطاطی کا پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں اور اس دور زوال میں اس فن و کمال کو زندہ کئے ہیں موصوف کے یہاں مذکور الصدر اساتذہ کی لکھی ہوئی وصلیوں کا نادر ذخیرہ جمع ہے

شعرا

صوبہ بہار میں ۱۵۰۰ھ ہجری سے شعرائے دلی کی آمد شروع ہو گئی۔ دلی میں جو انقلابات ہوئے اور ہل چل مچی اس نے کسی کو چین سے رہنے نہ دیا۔ اور بارہویں صدی ہجری کے وسط ہی سے اکثر ارباب کمال دلی سے پٹنہ میں آئے اور انکو قدردانی نے اس صوبہ کا ایسا گرویدہ کیا کہ وہ یہیں کے ہو رہے

۱۱۵۰ھ سے لیکر ۱۳۰۰ھ تک قریب قریب تین سو شعرا اس صوبہ میں ایسے گذرے ہیں جو ممتاز اساتذہ کی صفوں میں داخل ہو سکتے ہیں اور جنکا کلام آج بھی تلاش کرنیوالے کو دستیاب ہو سکتا ہے ۱۳۰۱ھ سے لیکر ۱۳۵۰ھ تک کے چار سو کے قریب ایسے شعراء ہیں جنکی یادگار ین صفحہ دہر پر زمانہ دراز تک رہیں گی مولانا امین اللہ صاحب متوفی ۱۳۳۲ھ ..... نگر نہسہ ضلع عظیم آباد کے رہنے والے تھے تفسیر و حدیث میں مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ممتاز شاگردوں میں تھے ان کے فضل و کمال کا شہرہ پورے ہندوستان میں تھا مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ایک مدت تک مدرس اول رہے تھے اور انکی حدیث اور تفسیر کا علم مسلم الثبوت ہے۔ فارسی میں قصیدہ کے نام سے ایک عجیب و غریب قصیدہ لکھا جسمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک کو ولادت سے وفات تک مع غزوات اس فصاحت و بلاغت سے بیان کیا ہے کہ آج تک ارباب علم میں یہ قصیدہ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اس دور کے ممتاز شعرا میں مشہور مرزا بیدل نواب علی ابراہیم خان خلیل عظیم آبادی مصنف تذکرہ گلزار ابراہیم منشی سب سکھ خاکسار منشی ہلاس رائے رنگین مہاراجہ رام نراین دغیرہ ہیں ۱۲۰۱ھ کے بعد سے ۱۲۵۰ھ تک کے دور میں مولانا تصدق حسین نگر نہسوی المتخلص بہ خلاق ..... شیخ غلام علی راسخ راجہ پیارے لعل الفتی سید محمد عسکری اور مولوی انور علی یاس اور شاہ محمد ابوالحسن فرد سجادہ نشین پھلواری وغیرہ ہیں

۱۲۵۱ھ سے لیکر ۱۳۰۰ھ کے دور کے حکیم مولانا عبدالمجید پریشان شمس العلما مولانا حاجی محمد سعید صاحب حسرت قدس سرہ مولوی احمد کبیر صاحب حیرت منشی سید فرزند احمد صاحب صغیر آروی کو سنکھ رح بہادر رحمتی حضرت سید شاہ امین احمد صاحب سجادہ نشین خانقاہ بہار شریف المتخلص بہ ثبات شوق شاہ الطف حسین صاحب فریاد حکیم ہادی حسن خان رئیس بیسو پور وغیرہ ممتاز اکابر شعرا ہیں

۱۳۰۱ھ سے دور اخیر تک کے باقی اساتذہ میں حضرت شاد عظیم آبادی بشارت حسین محشر بہاری نواب سید امداد امام اثر حضرت فضل حق آزاد

بہار میں اُردو زبان اور شاعری

بہار اور اُردو

بہار کی بھی ہے شرکت بہار گلشن میں لہو سے ہم نے بھی سینچا ہے باغ اُردو کو

از حضرت حمید عظیم آبادی

تاریخ شاہد ہے صوبۂ بہار اپنی قدامت اور تاریخی عظمت، وقعت اور شہرت، تہذیب و تمدن، آداب نفس اور ارتقائے معاشرت میں ہندوستان کے کسی صوبہ سے کم نہیں۔ اس کی تاریخی قدامت بتاتی ہے کہ جس وقت سے ہندوستان کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی وقت سے اس صوبہ کا تاریخی دور بھی شروع ہوتا ہے۔ لیکن آج کے مضمون میں نہ مجھے صوبۂ بہار کے تمدن اور نہ یہاں کے طرز معاشرت پر روشنی ڈالنی ہے اور نہ تاریخی حیثیت سے اس کی قدامت سے بحث کرنی ہے بلکہ مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے وہ اس کی ادبی عظمت اور علمی وقعت سے تعلق رکھتا ہے

غیر آریہ تو میں جب ہندوستان میں آکر بسیں تو جس طرح اُن کی ٹولیاں الگ الگ تھیں، اُن کی بھاشائیں بھی جداگانہ تھیں، اور جس طرح وہ تمدن و معاشرت میں ایک دوسرے سے علیحدہ تھیں، اُسی طرح اُن کی زبانیں بھی ایک دوسرے سے بیگانہ۔ دلی اور بھٹیر کے علاقوں میں برج بھاشا، دکن میں مہاراشٹری اور اودھ و صوبۂ بہار میں پالی زبان بولی جاتی تھی۔ غرض ہر صوبہ کی جدا جدا الگ اور ہندوستان کے ہر ٹکڑے کی پراکرت جداگانہ تھی۔ لیکن جب قوم آریا نے ان غیر آریا قوموں پر فتح پائی اور نخست موکر بیٹھے تو اپنے فلسفہ، قانون اور مذہب کی تدوین و ترتیب کے ساتھ ساتھ وہ اپنی زبان کی تکمیل و تہذیب کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ ان نئے حکمرانوں کے اقتدار کی طرح ان کی زبان (سنسکرت) بھی بڑھی، لیکن یہ حکمران قوم اپنی مفتوحہ قوموں کو اس درجہ ذلیل سمجھتی تھی کہ وہ اُن کی زبانوں سے اپنی مقدس زبان کے الفاظ بھی سُننا گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ حاکم و محکوم کے مذہب اور اُن کی معاشرت کے اختلاف کے ساتھ ساتھ زبان کے فرق کا بھی یہ اثر ہوا کہ اُن کے تخیلات کسی طرح ایک نہ ہو سکے، اور آخر دونوں میں افتراق و نفاق کا بیج پڑ گیا۔ اس افتراق کا نتیجہ جو ہونا چاہیے تھا وہ ہوا یعنی اُن غیر آریا قوموں کی زبانیں جو عرصہ سے یہاں جاری و ساری ہو رہی تھیں جاری رہیں، اور اُن کی جسمانی علاج کے باوجود بھی اُن کی مختلف پراکرتیں سنسکرت کی نوٹنڈیاں نہ بن سکیں اور بدستور آزاد رہیں۔

اس کے بعد رامائن اور مہابھارت کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اس زمانہ کے بعد ہندوستان کی ریاستوں نے اپنے تمام کاموں میں زیادہ تہذیب اور ترتیب سے کام کرنا شروع کیا۔ صوبہ بہار کے ملکی نظام نے بھی اور دیسی ریاستوں کی طرح اگلے زمانے میں رونق پکڑ لی۔ مہابھارت کے زمانے میں جراسندھ نامی راجہ صوبہ بہار میں حکومت کرتا تھا۔ اس راجہ کے بعد اس کی نسل سے اٹھائیس راجاؤں نے بہار میں حکومت کی۔ ان اٹھائیس حکمرانوں کے بعد سیس ناگ (ششوناگ) نے ۶۱۲ ق م کے لگ بھگ اپنا خاندانی سلسلہ صوبہ بہار میں قایم کیا اور درحقیقت اسی سلسلہ سے بہار کی ملکی تاریخ کی بنیاد قایم ہوتی ہے۔

سیس ناگ کا دارالحکومت مقام راجگیر تھا۔ اس کی چوتھی پشت میں بمبسار (بمبھ سار) نامی حکمران نے ۵۴ برس بہار میں حکومت کی اور سلطنت کو بہت فروغ دیا۔ اسی کی حکومت کے زمانہ میں گوتم بدھ یہاں کی خاک سے اُٹھے۔ انہوں نے اپنے وعظ کی زبان اختیار کی اور یہاں کے عوام ہی کی بھاشا میں اپنا وعظ شروع کیا۔ یہ وہی پالی زبان تھی جو اودھ اور صوبہ بہار میں بولی جاتی تھی۔ چنانچہ گوتم بدھ نے اپنے چیلوں کو ان لفظوں میں مخاطب کیا اور کہا[1] دھرم کرو، دھرم کرو، دھرم کا سنکھ بھونکو، دھرم کی دُندبھی[2] بجاؤ۔" آج کون اُردو دان ہے جو ان فقروں کے الفاظ اور مطالب نہ سمجھتا ہو! اب آپ اسے پالی کہیں یا قدیم بھاشا کے نام سے پکاریں یا ولھائی ہزار برس اُدھر کی اُردو سمجھیں!! المختصر یہ پالی زبان بودھ مذہب کے ساتھ ساتھ آگے

---

[1] جس طرح گوتم جی کی پیدائش اور انتقال کے زمانوں میں مورخوں کا اختلاف ہے اُسی طرح اُن کی جنم بھوم میں کوئی نیپال کی ترائی بتاتا ہے اور کوئی خاص لگدہ ریس (قدیم بہار) کہتا ہے مگر اس مسئلہ پر سب متفق ہیں کہ اُن کی تعلیم و تربیت بہار کے دارالعلوم میں ہوئی اور اُن کا مذہبی عروج اسی سرزمین کا مستند پذیرہے۔

[2] دُندبھی بجانا، خاص اُردو کا محاورہ ہے۔ ملاحظہ ہو جامع اللغات ص ۶۸۱ الف ۔ سعیدی ڈکشنری ص ۵۲۱ ب ۔ شور و غل کرنا

بڑھی اور اس عروج پانے والے روشن آفتاب کی شعاعوں نے سنسکرت کے ٹمٹماتے چراغ کو گویا گل کر دیا۔ موریین اس باب میں ہمنوا ہیں کہ گوتم جی کی کامیابی کا خاص سبب یہ تھا کہ وہ عوام کی بول چال میں وعظ فرمایا کرتے تھے، عوام کے دل اُن کی طرف کھنچے، عوام کی اُمنگ ہمیشہ خواص سے زیادہ ہوتی ہے، پھر یہ اکثریت اقلیت پر بھی حاوی ہو گئی۔

بمبسار کے بعد اس کا بیٹا اجات شترو ۵۵۸ ق م میں سریر آرائے حکومت ہوا۔ اجات نے مشرقی بہار کو فتح کر کے اپنے حدود سلطنت میں ملا لیا۔ فتوحات میں برابر ترقی اور وسعت ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ تھوڑے عرصہ میں ریاست کوسلا کو بھی اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ اسی راجہ کے ایام حکومت میں توراینو ایک خانہ بدوش قوم ہمالیہ کی راہ سے بہار میں آئی اور یہاں کے باشندوں کی آزار رسانی کا باعث ہو گئی۔ راجہ نے بہار کو ان کی غارت گری (لوٹ مار) سے محفوظ رکھنے کے لئے شہر پاٹلی پتر (پٹنہ) آباد کیا اور ایک مستحکم قلعہ اور دروازے بنا کر اس مقام کو اپنی فوج کا مرکز قرار دیا۔

اسی خاندان کے عہد حکومت میں فارس کا بادشاہ "دارا گشتاسپ" افغانستان اور پنجاب پر حملہ آور ہوا اور دونوں خطوں کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں ملا لیا۔ لیکن جب چوتھی صدی قبل مسیح کے شروع میں فارس کی سلطنت روبہ انحطاط ہوئی تو یہ صوبے پھر خود مختار ہو گئے۔ ہندوستان پر اس فتح کا یہ اثر پڑا کہ یہاں ایک نیا رسم خط جاری ہو گیا جسے "کھروشٹی" رسم خط کہتے ہیں اور اسی وقت سے عمارتوں کے بنانے میں بھی فارسی طرز تعمیر کی نقل ہونے لگی۔

سیسی ناگ (ششو ناگ) خاندان کے خاتمہ کے بعد نند خاندان کے راجہ قابض ہوئے۔ سکندر اعظم کے حملہ کے وقت مگدھ (بہار) میں اسی خاندان کا راجہ مہاپدم نند سریر آرائے حکومت تھا۔ چنانچہ یونانیوں کے حملہ کو ہمارے ادیب الملک خیال مرحوم اپنے خاص انداز میں یوں تحریر فرماتے ہیں۔" بودھ مذہب کو پھیلنے اور عروج پکڑنے ہوئے اور پاٹلی کے نام نکلے ہوئے ابھی پورے ڈھائی سو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ یونانیوں نے دنیا میں سر اُٹھایا اور سکندر کی تلوار نے عالم میں خون کا مینہہ برسایا۔ آریوں کا قدیم ملک ایران اسی کے ہاتھوں سر ہوا، وہاں کی معاشرت اور تمدن میں فرق ڈالنا اور تر و تازہ کو روندنا پامال کرتا ہوا وہ یونانی سیلاب باغ ہند کی طرف بڑھا۔ اور سرحدی بند توڑتا ہوا پنجاب سے بھی آگے نکل آیا اور گنگا جمنا کے کنارے آ لگا۔ سکندر نے یہاں اپنے لشکر (لشکر) کی چھاؤنی ڈالی، اپنے لفاظ کے لشکر کو بھی خیمہ زن کر دیا۔ اس کے رخصت ہونے پر سیلوکس (selucas) اُس کا سپہ سالار ادھر ہوا کھانے نکلا۔ چندر گپت سے مڈبھیڑ ہوئی اور آخر اپنی ایک بیٹی دان کر کے لوٹ گیا۔ پاٹلی نگر سے نکل کر ہما اور چین میں جا پہنچی۔ یہاں کی زبانی اور یونان کے میل و آمیزش بلکہ اس کے گھر کرنے کی یہ دلچسپ تاریخ ہے۔

اسکندر کی وفات کے بعد مگدھ کا راج نند خاندان کے ہاتھوں سے نکل گیا اور چندر گپت نامی ایک نوجوان ۳۲۵ سنہ یا ۳۲۰ ق م میں تخت نشیں ہوا۔ اسی چندر گپت سے موریہ خاندان کی ابتدا ہوئی اور ہندوستان کے تاریخی دور کا یہ پہلا بادشاہ ہوا جس کو شہنشاہ کہہ سکتے ہیں لیکن اس کی سلطنت بھی شمالی ہند تک محدود رہی۔ چندر گپت کے بعد اس کا پوتا اشوک اس خاندان کا بہت ہی مشہور بادشاہ ہوا۔ اس کے دور حکومت میں بودھ مذہب نے بہت ترقی کی۔ اشوک نے اس مذہب کی اشاعت کے لئے جا بجا پتھر کی چٹانوں اور کھمبوں پر ہدایتی تحریریں کھدوائیں۔ یہ کل تحریریں پالی ہی زبان میں تھیں اشوکا کے بعد گرچہ اُس کے چھ ورثا یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے اور چالیس سالوں تک سریر آرائے حکومت رہے، لیکن یہ نظام مملکت داری میں کچھ ایسے کورے نکلے کہ مگدھ (بہار) کی وہ عظیم الشان اور مستحکم سلطنت مضمحل اور بالکل کمزور ہو گئی۔ اس سلسلہ کے اخیر حکمراں کو اس کے وزیر پشیامتر نے مار کر تخت سلطنت کو اپنے لئے خالی کر لیا اور ایک نئے سلسلۂ حکومت کی بنا ڈالی۔ ایک سو بارہ سالوں تک یہ سلسلہ حکومت کرتا رہا۔ لیکن نہ ملکی نظام درست ہو سکا اور نہ پہلی کمزوری کی تلافی ہو سکی۔ ملک میں بدامنی پھیل گئی اور کروکر نیافت" اس سلسلہ کے آخری بادشاہ کے بھی تمام اختیارات اُس کے وزیر باسدیو نامی نے ضبط کر لئے اور خود حاکم بن بیٹھا اور اپنے سلسلہ کو کنوآں کے نام سے مشہور کیا۔ ابھی سلسلہ نظام درست بھی نہ ہونے پایا تھا کہ سلسلۂ اندھرا کے ایک راجہ نے علاقہ ناگپور کی راہ سے آ کر بہار پر حملہ کیا۔ بہار اُس کے قبضۂ تصرف میں آ گیا۔ اس سلسلہ نے پانسو برس تک بہار میں حکومت کی۔ بعدۂ بہار کی تاریخ میں کا نشکا نام نظر آتا ہے۔ سنہ ۶ء میں اس نے مگدھ (بہار) پر فوج کشی کی اور بہار کو بھی اپنے اثر سے خالی نہیں چھوڑا۔ کانشکا کے بعد اُس کے ورثا کے زمانہ میں گپتا خاندان نے عروج پکڑا۔ پہلے یہ خاندان ساکا کا مطیع اور ماتحت تھا۔ مگر آگے چل کر وہ خود سر اور مختار ہو گیا۔

گپت اوّل کے علاوہ دو اور راجہ سمدگپت اور چندرگپت دوم بڑے نامی و گرامی نکلے۔ اسی راجہ کے وقت میں چین کا مشہور سیاح فاہیان ۴۰۰ء میں یہاں آیا۔

۴۷۶ء میں بہار کی علم خیز زمین نے ایک بہت بڑے ذی استعداد، قابل حکیم اور کامل اُستاد کو پیدا کیا۔ اس حکیم کا نام آریہ بھٹ تھا۔ اسی نے سب سے پہلے ثقل ارضی کی کشش کی (Gravitation of the earth) تحقیق کی اور اس کے ثبوت فراہم کر کے تمام دنیا تک پہنچائے۔ چار کا پنڈت جو علم طب کا موجد مانا جاتا ہے، بہار ہی کی زمین کا جوہر اعلیٰ تھا۔ دھنتر پنڈت بھی اسی معدن بہار کا گوہر یکتا تھا۔ یہ وہی حکیم ہے جس کی ریاضی میں اعلیٰ قابلیت دنیا تسلیم کر چکی ہے۔ اسی کو سُشرج کا موجد بھی کہا جاتا ہے۔

سلسلۂ کلام کی کڑیاں ملانے کے لئے مختصر آتا تاریخ سے روشنی ڈالتا جاتا ہوں۔ اس کے بعد ہندوستان کی بساط پر ہونوں کے پیادے دوڑتے نظر آتے ہیں۔ ۵۱۰ء میں ہونوں کے سردار تورمان نے ہندوستان میں اپنی سلطنت قایم کی۔ اس کے بعد اُس کا بیٹا "مہرگل" جانشیں ہوا یہ پہلے بودھ مذہب کا معتقد تھا لیکن بعد میں کسی وجہ سے بودھوں کا ایسا دشمن ہوا کہ اُن کے مٹانے پر آمادہ ہو گیا۔

مہرگل کے مرنے کے بعد یہ حکومت تہ و بالا ہو گئی۔ بعدہٗ ہرش وردھن کا نام ہندوستان کے حکمرانوں میں نظر آتا ہے۔ یہ ہندو اور بودھ دونوں مذہبوں کا یکساں احترام کرتا تھا۔ اسی راجہ کے وقت میں مشہور چینی سیاح ہوئن تسانگ ۶۳۰ء میں ہندوستان آیا۔ مغربی اور شمالی ریاستوں سے ہوتا ہوا بہار اور بنگالہ بھی پہنچا۔ بہار اُس وقت علوم و فنون کا مرکز تھا، ماہرین علم اللسان کا خیال ہے کہ لفظ "بہار"، "اصل" "ویہار" تھا جس کے لغوی معنی علم کے ہیں کثرت استعمال سے بہار ہو گیا، اور چونکہ یہ دارالعلوم یعنی علم کا مرکز تھا، اس لئے ہمارے صوبہ کو بہار کا لقب ملا۔

مختصر یہ کہ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں جو غیر ملکی ہندوستان میں آ کر بسے نہ انہوں نے بودھ مذہب کی طرف کوئی توجہ کی اور نہ اس سرزمین کی شجاع ترین قوم راجپوت نے اس کی طرف رخ کیا۔ یہی نہیں بلکہ آٹھویں اور نویں صدی میں کمارل بھٹ اور شنکر اچاریہ[1] نے بودھ مذہب کے خلاف آواز بلند کی اور ویدک دھرم کا پرچار شروع کیا۔ اس سے بودھ مت کی عمارت متزلزل ہو ہی چلی تھی کہ مسلمان آ دھمکے، اُن کے جنوبی بہار میں قدم جماتے ہی اس مذہب کی بنیاد کھوکھلی ہو گئی۔ نہ اب بودھ مذہب رہا اور نہ اُن کی پالی زبان، بلکہ اس پالی کی جگہ برج بھاشا نے لی اور یہ زبان نہ صرف صوبہ بہار بلکہ تمام شمالی ہند کی جائز وارث بیٹھی، اس تفصیل کا اختصار ہمارے استاد حضرت شاد عظیم آبادی اللہ مقامہٗ کے قلم فصاحت رقم کی زبانی سنئے! "جب تک بودھ مذہب کا اقبال تھا، بڑے زور شور سے پالی زبان بھی حکومت کرتی رہی۔ موریہ جنس راجاؤں کا خاندان جو چندر گپت سے ۳۲۵ برس قبل سنہ عیسوی سے تھا، یہ خاندان اور سنگا مبنی خاندان بودھ مت رکھتا تھا، اس لئے پالی زبان کا بھی خوب ستارہ چمکتا رہا، مگر ان جنسی راجاؤں کے بعد جب اندر جنسی کا اندر اپنے اکھاڑے میں آ بیٹھا تو بھاشا کی پریاں دربار میں اپنے اپنے سج دکھانے کو آئیں، مگر پالی زبان بھی اُن کے غول اور جمگھٹے میں ایسا ملی جلی رہی کہ ... ... مگر رفتہ رفتہ پالی متروک اور بھاشا مرغوب ہو گئی۔"

الحاصل سرو اسنی بھاشا (برج بھاشا) پر ہماری اُردو کی بنیاد اور سرو اسنی زبان کے خمیر میں پالی زبان کا کافی عنصر موجود، اور یہی پالی زبان مگدھ و بس (صوبۂ بہار) کی خاص پراکرت، لہٰذا ہمارا صوبہ اردو زبان کا دیرینہ مرکز!!

اس بیان کو ذرا اُس کے زندۂ جاوید قلم کی زبانی بھی سنئے جس نے آبِ حیات چھڑک کر اُردو کو حیات دائمی بخشی۔ "دفعۃً ۵۴۳ برس قبل عیسوی میں بدھ مذہب کے بانی شاک منی پیدا ہوئے۔ وہ مگدھ دیس سے اٹھے تھے، اس لئے دیس کی پراکرت[2] میں وعظ شروع کیا۔ کیونکہ زیادہ تر کام عوام سے تھا، عورت مرد سے لیکر بچے اور بوڑھے تک یہی اُس دیس کی زبان تھی۔ اُن کی آتش زبانی سے مذہب مذکور ایسا پھیلنے لگا جیسے بن میں آگ لگے، دیکھتے دیکھتے دھرم، حکومت، رسم و رواج، دین آئین سب کو جلا کر خاک کر دیا۔ اور مگدھ دیس کی پراکرت کل دربار اور کل دفتروں کی زبان ہو گئی۔ اقبال کی

---

[1] شنکر جایچ نامبودری برہمن تھے، اور دکھن میں بمقام ملابار پیدا ہوئے۔ یہ اپنے مذہب کے ایک جید عالم تھے، بودھ مذہب کے علما، مذہبی مناظروں میں ان سے نیچا دیکھنے لگے اور علمی قابلیت میں ان کا مقابلہ نہ کر سکے، لہٰذا ہندو مذہب ہر طرف بڑھنے اور پھیلنے لگا۔

[2] پراکرت کے معنی جو طبیعت سے نکلے، پس پراکرتیں وہ زبانیں ہیں جو طبیعت (نیچر) نے اپنی اپنی زمین میں پیدا کر دیں۔

پوری نے علوم و فنون میں بھی ایسی ترقی دی کہ تھوڑے ہی دنوں میں عجیب و غریب کتابیں تصنیف ہو کر اُسی زبان میں علوم کے کتب خانے سج گئے۔ اور فنون کے کارخانے جاری ہو گئے۔ کہیں کہیں کونے گوشے میں جہاں کے راجہ وید کو مانتے رہے، وہاں ویدوں کا اثر رہا، باقی راج کے دربار اور علمی سرکار سب ماگدھی ہی ماگدھی ہو گئے۔ ان کے حوصلے وسیع ہو کر دعوے بڑھے۔ اور یہ آوازِ بلند کہہ دیا کہ تمام زبانوں کی اصل ماگدھی ہے۔ برہمن اور کل انسان بات کرنے کے لایق بھی نہ تھے ۔ ۔ ۔

یہ لفظ اردو آریائی زبانوں میں ایک قدیم ترین لفظ ہے اور جو اپنے کسی طرح عالم بقا میں موجود ہے۔ اس میں قدیم آریا تمدن اور بنی نوع انسان کی جماعتی زندگی کی زندہ تصویر نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ وہی لفظ ہے جو آج اُردو، اُردو، کہا جا رہا ہے۔ اور جس سے ایک ایسی جماعت کی زبان مراد ہے جس میں ہر قوم و ملت کے لوگ شامل ہیں اور یہی زبان ہے جو واقعی صحیح طور پر تمام ملک کی ملکی زبان کہی جانے کی مستحق ہے۔ اُردو کی بنیاد برج بھاشا ہے صرف اس کی ظاہری نمایش اور آرائش ایرانی ہے، ہاں اس میں شک نہیں کہ اس کا وقار اکبر اعظم کے وقت میں بڑھا جبکہ مذہبی اور قومی علاقات مٹ رہے تھے۔ اور مغل سلاطین بہ فخر و ناز ہندوستان کو اپنا وطن تسلیم کر چکے تھے، اور یہیں کی زبان بولنے کے لئے بیتاب اور خواہشمند تھے۔

ہر کیف اسمجھے نہ اس جگہ یہ عرض کرنا ہے کہ کس طرح یونانیوں کے بعد تاتاری، پھر تورانی اور آخر میں ترکی ہندوستان پر یکے بعد دیگرے حملہ آور ہوئے اور ہندوستان کی مختلف پر اکرتوں پر ان کی آمد کا کس طرح اور کیا کیا اثر پڑا اور نہ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ترکی اور تازی زبانیں کس طرح یہاں کی بھاکھاؤں میں مل کر ایک نئے روپ میں، دنیا ہوئیں، اور نہ مجھے یہاں محمد بن قاسمؒ کی فتح کی داستان سُنانی ہے اور نہ محمود غزنویؒ کے متواتر حملوں کا تذکرہ کرنا ہے، بلکہ صرف اُس واقعہ کی طرف اشارہ کر کے اپنے سلسلہ کلام کی کڑی کو ملانا ہے جب بختیار خلجی کے بیٹے اختیار الدین محمد نے بنگال پر فوج کشی کی اور ۱۱۹۷ء میں اُس نے صرف دو سو سواروں سے علاقہ بہار کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ مسلمانوں کے صوبۂ بہار میں آنے کا زمانہ یہی گیارہویں صدی عیسوی ہے۔ اس وقت کی خالص زبان سنئے جو بالکل اچھوت اور خالص ہے۔

ایک شاعر کہتا ہے۔ ؎ پرسوں آون کہہ گئے کہ پرسوں نہ آیو پیو ✤ جو پرسوں آویں نہیں تو پرسوں آیں جیو
(آنے کو) (لیکن) (گئے) (آئے) (اپنا)

میرا پی (شوہر) مجھ سے کہہ گیا تھا کہ پرسوں آؤنگا لیکن وہ نہیں آیا۔ اگر واقعی پرسوں نہیں آئے گا تو میں اُس پر اپنی جان نچھاور کر دوں گی۔ پرسوں یعنی نچھاور کروں۔ شاعر نے صنعت ایہام سے شعر میں کیا لطف پیدا کیا ہے اور اسی لطف کے خیال سے پرسوں کی قید لگائی گئی ہے۔

گیارہویں صدی کے آخر سے اس صوبہ میں برابر مسلمانوں کی حکومت رہی اور اُسی وقت سے بنگال اور بہار سلطنت دہلی کے صوبے سمجھے جانے لگے جب دہلی کے حکمران کمزور ہوتے تو یہ صوبے خود مختار ہو جاتے۔ محمد تغلق کے عہد میں یہ صوبے بھی آزاد ہو گئے تھے، اتنا ہی نہیں بلکہ ۱۳۵۵ء میں فیروز شاہ تغلق نے بھی شمس الدین الیاس شاہ کو سارے بنگال کا آزاد حکمران تسلیم کر لیا۔ سید اور لودی خاندانوں کے حکمران بنگال کو مغلوب کر سکے۔ ۱۵۲۶ء میں نصرت شاہ کے عہد میں بابر نے بنگال پر فوج کشی کی تھی لیکن اُس نے صلح کر کے بابر کو ٹالا دیا۔

بابر کی وفات کے بعد لودی افغانوں نے بہار اور بنگال میں پھر اپنی جمعیت فوجیں بنا لیا۔ ہمایوں کے عہد میں شیر شاہ سوری بنگال پر اچھی طرح قابض ہو بیٹھا مگر شیر شاہ کی وفات کے بعد پھر افغانوں کا دور دورا ہو گیا۔ ۱۵۷۶ء میں شہنشاہ اکبر نے بیٹھا ان خاندان کے آخری حکمران داؤد کو شکست دی اور بنگال کو اپنے قلمرو میں شامل کر لیا۔ بنگال کے ساتھ ساتھ بہار کا صوبہ بھی مسخر کر لیا گیا۔

الحاصل گیارہویں صدی عیسوی سے برابر صوبۂ بہار مسلمانوں کے زیر نگیں رہا اور اُردو زبان کا بیج جو ہندوستان میں مسلمانوں کی لگاتار حملوں نے بویا تھا وہ شاہجہان کے عہد میں پھوٹا اور بڑھا۔ اورنگزیب کے دور میں بار آور و شاداب نظر آیا اور محمد شاہی دور میں پھول پھل بھی لے آیا۔ یوں تو شاہجہان دعا لبگر ہی کے زمانہ میں دہلی کے امراء پورب اور خصوصاً صوبۂ بہار، پٹنہ میں آ کے۔ قلعۂ معلی کی آواز یہاں بھی گونجی اور شاہزادہ عظیم الشان[1] کے مبارک قدموں کی بدولت یہاں کا پرانا قلعہ نیا آباد ہونے اور پٹنہ عظیم آباد بننے لگا۔ پھر فرخ سیر یہاں آیا اور اس کے داہنے بازو

---

[1] ۱۶۹۷ء میں شاہزادہ عظیم الشان پٹنہ میں تشریف لائے۔ اُن کے تشریف لانے سے پٹنے کی شان کچھ ایسی دوبالا ہو گئی کہ آج تک عظیم آباد اسی کے نام سے مشہور ہے۔ شاہزادہ نے اپنے قیام کے زمانہ میں پٹنے کے قلعہ کو از سر نو مرمت کرایا اور اس کی اندرونی عمارتوں کی بھی قرار واقعی درستی کر کے اپنی مستورات کو اسی میں رکھا۔ شہر کو از سر نو آباد کرتے وقت ہر فرقہ اور ہر گروہ کے لئے جدا گانہ بنائے۔ متصدیان دفتر شاہی کے لئے دیوان محلہ اور امراء فوج کے لئے دیگر محلہ بسایا۔ مغلوں کے رہنے کے لئے مغلپورہ اور شاہزادوں اور امراء کے لئے محلہ شکوہ جو اب بگڑ کر کوٹھوہ ہو گیا ہے عظیم الشان کا قصد تھا کہ عظیم آباد کو دہلی بنا چھوڑے لیکن وقت نے فرصت نہ دی۔

امیر الامرا نواب سید حسین علی خاں مُونگیر پٹنہ کے دست قوی کے بدولت شاہزادہ یہیں شاہ ہند بنا اور اسی جگہ پر تاج رکھ کر دلی کے تخت پر بیٹھا۔ اس کے بعد تو عظیم آباد، پٹنہ، دلی والوں کا گھر آنگن تھا۔ وہاں کے اکثر امرا کو اس صوبے اور اس شہر میں آل تمغا اور جاگیریں ملیں، اور وہ دلی چھوڑ کر پٹنہ ہی میں آ بسے۔ یہ امرا اپنے شاگرد پیشہ (عملہ نوکر چاکر) تک وہاں سے اپنے ہمراہ لانے اور ان کی پرورش کرتے تھے۔ اس لئے ان کی اور ان کے گھر کی زبان پر مدت تک دہلی کی زبان کا اثر رہا۔ ان امرا میں نواب لطف اللہ خاں صادق (عالمگیری) کی اولاد خاص ذکر کی مستحق ہے کیونکہ اُن کی جہت سے پٹنہ کی اور بھی رونق بڑھی۔ اس خانوادے کے ارکان زیادہ تر محلہ نون کوٹہ، پورب دروازہ۔ دول پورہ (دھوپ پورہ) ہو، جاجی گنج میں آباد ہوئے اور ان کی وجہ سے ایک عرصہ تک ان محلوں کی زبان و معاشرت اس شہر کے لئے باعث تقلید رہی۔ اس طرح اُردو کا گھر گھر چرچا پھیلا اور اردو خاص و عام کی زبانوں پر حکومت کرنے لگی۔

عالمگیری عہد میں پٹنہ میں مرزا عبد القادر بیدل سا باکمال پیدا ہوتا ہے اور فارسی کے ساتھ اُردو کا بھی دلدادہ بن جاتا ہے۔ بیدل جب پٹنے کو خیرباد کہتا ہے تو یہاں کے در و دیوار پر بہ حسرت نظر کر کے یہ شعر پڑھتا ہے۔

سر اوپر مایا رام نہیں دشمن آپن کیس — پٹنہ نگری چھوڑ دہن بیدل چلے بدیس

دو شعر اور ملاحظہ فرمائیے جائیں :۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں، — اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں،
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا — پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

بیدل جو تیور ہوتے ہوئے دلی پہونچے اور وہاں شاہزادہ عالمگیر (اعظم و معظم) کے استاد و اتالیق مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۱۳۳ھ میں شاہجہان آباد ہی میں رحلت فرمائی۔ اس صوبے اور اس شہر میں (جیسا میں قبل عرض کر چکا ہوں) اُردو نے اُس وقت ترقی کی جب کہ دلی کے باہر اس کی نشو و نما محمد و دہلی اور ہماری اُردو اُس کی زبان سے گویا ہوئی جو عالمگیری شاہزادوں اور امیروں کا اتالیق و استاد اور دکن و دلی کے سخنداںوں کا سرتاج تھا۔

مرزا بیدل عہد اورنگ زیب میں یہاں سے دہلی گئے اور فرخ سیر کے زمانے تک اپنی شاعری اور زبان کو پھیلاتے، اُردو کو فروغ دیتے اور بہار اور پٹنہ عظیم آباد کے نام کو روشن کرتے رہے۔ بیدل دلی سدھارے تو سمجھا گیا تھا کہ پٹنہ سونا ہو جائے گا، مگر اس شہر کا نصیبا ابھی جاگ رہا تھا، مرزا معز، موسوی خاں فطرت دلی سے ادھر آئے اور ان کے قیام سے پٹنہ دلی کا ایک ٹکڑا نظر آنے لگا۔ فطرت ۱۸۲ سنہ ۱۲ء میں ایران سے ہندوستان آئے۔ اورنگ زیب کا زمانہ تھا صوبۂ عظیم آباد کی دیوانی پر معمور ہوئے۔ شعرائے عظیم آباد میں میر محمد ہاشم مضمون وغیرہ ان کے فیض تلمذ سے بہرہ مند ہوئے۔ (مضمون پہلے مشرقی تخلص کرتے تھے، چنانچہ اپنے ایک مقطع میں موسوی خاں کی شاگردی پر یوں فخر کرتے ہیں۔

مشرقی منت تعلیم فلاطوں نہ کشم، — موسوی خاں چو بود صاحب و اُستاد مرا)

اسی زمانہ میں یہاں کی خاک سے ملا محمد علیم تحقیق سا محقق اٹھا، انہوں نے بھی مرزا موسوی کے آگے زانوئے شاگردی تہ کیا، فارسی کے علاوہ اُردو کو نوازا۔ فرماتے ہیں :۔

جھمکڑا باندھ کر دل موں سما جا، — سلونو سانورے ادھر کو آ جا،
سر جن تیرے مکھڑے میں سورج کی کرن ہیا ہر — دیکھوں ہوں جو تجھ مُکھ کوں نینا میرے چند ھر آ

سلہ مرزا پٹندیی محلہ کے رہنے والے تھے۔

سلہ ادیب الملک خیال مرحوم تحریر فرماتے ہیں :۔ "فرخ سیر کے زمانے میں ایک امیر باتدبیر تھا جسے تاریخی زبان عمدۃ الملک اور عوام محمد امیر خاں کہتے، اور انجمن شعرا انجام کے لقب سے یاد کرتی ہے۔ یہ نواب بھی بیدل ہی کا دلدادہ اور مقلد تھا۔ اور جس وقت استاد اُردو کی طرف مخاطب ہوا، مؤدب شاگرد بھی ہمہ تن ادھر متوجہ ہو گیا۔ اس کی اس توجہ و خیال سے اس زبان کا وہ آوازہ بلند ہوا کہ ساری دلی گونج اٹھی اور پھر تو گھر گھر سے اس کی صدا آنے لگی"۔

تحقیق[1] صرف شاعر اور ملّا ہی نہ تھے بلکہ علم موسیقی اور تیر اندازی اور بیراکی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ملّا صاحب کو جانوروں کے لڑانے کا بہت شوق تھا، دہلی بھی گئے، اہل کمال سے ملے، شعر و شاعری کا بھی مشغلہ رہا، وہاں کے شعرا کو داد سخن دیتے اور ان کی خراج تحسین حاصل کرتے رہے۔ تنگیٔ دامان کا خیال کرتے ہوئے بہت سے شگفتہ پھولوں کو بھی نظر انداز کرنا پڑا ہے۔ جن کی عطر بیز خوشبو سے شام بہار معطر رہ چکا ہے۔ لیکن پھر بھی چند نام لئے بغیر نہیں رہ سکتا اور جن کی یادگاریں آج تک کھڑی مرحوموں کی روحوں کی فاتحہ خوانی کر رہی اور چشم حقیقت نگر کو درس عبرت دے رہی ہیں۔ جب شائستہ خاں ناظم بہار، آگرہ بلائے گئے تو ان کی جگہ جعفر خاں بہار کے صوبہ دار مقرر کئے گئے۔ یہ وہی جعفر خاں ہیں جن کے نام کی یادگار آج تک باغ جعفر خاں پٹنہ میں موجود ہے اور اپنی گذشتہ بہار کا آج وہی باغ مرثیہ خواں ہے۔ جعفر خاں کے بعد سبحت خاں کو بہار کی صوبہ داری ملی۔ ان کی یادگار ایک بہت بڑا مدرسہ تھا جس کا نام اب باقی نہیں، مگر ہاں اس مدرسہ کے نام پر آج محلہ مدرسہ قایم ہے جو اس مدرسہ کی یاد تازہ کرتا اور اہل علم و تحقیق کو پٹنے کی علم دوستی کا سبق پڑھاتا ہے۔ اسی سیف خاں کی بنائی ہوئی مسجد گنگا کنارے مدرسہ گھاٹ کے متصل کھڑی، زبان کی شکست و ریخت کر رہی، اور زبان حال سے پکار کر کہہ رہی ہے ؎ بیا مسجد بنیاد نظر کن ❊ مصفا تر از سینۂ بار سا۔

بہر کیف! اگر اودھ کو شجاع الدولہ و آصف الدولہ کی بزرگی اور ان کی زبان دانی کی جہت سے کوئی امتیاز ہے تو صوبۂ بہار کو بھی نواب مہابت جنگ (نواب شہید) کے علاوہ مہاراجہ رام نرائن موزوں اور مہاراجہ شتاب رائے اور ان کے خلف الرشید راجہ بہادر کی ذات اور زبان پر بجا ناز ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

راجہ رام[2] نرائن تخلص موزوں فضلائے روزگار اور ادبائے مشرق دیار میں تھے۔ شیخ علی حزیں اصفہانی کے شاگرد تھے۔ فارسی کا دیوان شایع ہو چکا ہے۔ اردو ریختہ گوئی میں بھی پختہ کار تھے۔ نواب میر جعفر خاں ناظم بنگالہ کے نائب اور صوبۂ عظیم آباد کے فرمان روا تھے۔ نواب میر قاسم علی خاں کے عہد میں معزول ہوئے۔ اور گنگا میں ڈبو دئے گئے۔ یہ واقعہ ۱۷۶۳ء میں وقوع پذیر ہوا۔

مسند بنگالہ کی بساط جب میر جعفر اور میر قاسم کے سے فراشوں نے اٹھانا چاہی اور بے رحم اور نمک حرام میرن (پسر میر جعفر) نے سریر الدولہ کا کام تمام کر دیا تو اس حادثہ واقعہ کی خبر آگ کی طرح عظیم آباد پہونچی۔ راجہ اس وقت دربار کر رہے تھے۔ اطلاع ملتے ہی مسند سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بہت روئے اور درباریوں کو مخاطب کر کے فی البدیہہ یہ شعر نقطم فرمایا

عزیزاں تم نہ واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی، دوانہ مر گیا، آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

شعر جذبات کا مرقع اور واقعہ کی مکمل تصویر ہے۔ کوئی واقف کار اہل دل اس شعر کو پڑھ کر چشم پرنم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ راجہ کے دو اور اشعار ہدیہ ناظرین ہیں۔ :-

ابر تو خود ہی خجالت سے ہے پانی پانی، کب مقابل ہو مرے دیدۂ خونبار کے ساتھ
بھولی نہیں ہے مجھکو بتوں کی ادا ہنوز دل کے نگیں پہ نقش ہے نام خدا ہنوز

مہاراجہ شتاب رائے عظیم آباد کے نائب صوبہ دار اور مرشد آباد کے نائب دیوان تھے۔ ۱۷۷۲ء میں جب نند کمار کی سازش سے محمد رضا خاں دیوان و نائب ناظم گرفتار کر کے کلکتہ بھیجے گئے۔ تو ان کے ساتھ شتاب رائے بھی بہ حیثیت نائب دیوان عظیم آباد میں گرفتار کئے گئے اور ان کے ساتھ دو برس تک بغیر ثبوت جرم مقید رہے دو برسوں کے بعد رہا ہوئے، لیکن دنیا سے جی چھوٹ گیا، مرض استہال میں مبتلا ہوئے

---

[1] تحقیق کے والد سید بدیع الدین عرف میر متین (غالباً متین گھاٹ کا محلہ آپ ہی کی طرف منسوب ہے) سمرقند کے سید تھے مگر ملّا تحقیق کا مولد محلہ سنگلپورہ عظیم آباد خانیشہ ۱۰۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور بانوے سال کی عمر پا کر ۱۰۶۲ھ میں مہابت جنگ کے زمانے میں رحلت فرمائی اور عظیم آباد میں مدفون ہوئے۔ صاحب سیر المتاخرین، ان بزرگوار کی نسبت تحریر فرماتے ہیں۔ "میر محمد علیم کہ از مشاہیر و مشائخ عظیم آباد از جملہ شاگردان ملّا زاہد ہمو سوی خاں فطرت تخلص بود۔ شہرت علش بسیار و شاعر پیش ہم اشتہار دارد"

[2] خلف دیوان رنگ لال۔ قوم کائستہ سری باستو

تو پھر جانبر نہ ہو سکے، اور سنہ ۱۷۷۵ء میں اس دار فانی کو خیر باد کہا۔

اس مہاراجہ کی علم دوستی اور اُردو پروری نے بانکمالوں اور دلی کے زبان اوروں کو اودھر کھینچا۔ نواب اشرف علی خاں[1] کا ساہنگامہ آرا اور زبان پرور ان ہی مہاراجہ کی خاطر اپنا وطن دلی چھوڑ کر عظیم آباد چلا آیا اور بڑے دبدبہ سے یہاں رہا کیا۔ کئی سال لال قلعہ کی زبان یہاں بھی عام کرتا رہا۔ اس وقت عظیم آباد دلی والوں کا مگھر آنگن بنا ہوا، دار السلطنت کا مزا دے رہا تھا۔ یہاں نواب کی بڑی تعظیم و تکریم اور آؤ بھگت ہوئی۔ امرا و اعیان شہر بہ عزت و ادب پیش آئے۔ عظیم آباد میں نواب کا دربار مشہور تھا۔ فضلا و شعرا کا مجمع رہتا۔ زبان و محاورات کی چھان بین ہوتی۔ نوآبان پانی پت (جو اپنی جاگیر کے انتظام کی خاطر یہاں محلہ نون گولہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے) سے اور نواب سے خاص ربط تھا، نواب نے شاہانہ طرز سے یہاں زندگی بسر کی۔ سنہ ۱۱۸۶ھ میں وفات پائی۔ بڑے دھوم سے جنازہ اٹھا اور آغا حسینا کے امام باڑے میں دفن ہوئے۔ نواب کی یہ مشہور غزل یہیں کہی گئی تھی۔ جو اس درجہ مشہور ہوئی کہ مرزا سودا نے اُس کے ایک شعر کی تضمین کی اور وہ شعر مرزا کا حصہ سمجھا گیا۔

سودا لکھا فغاں کو یہ خط اُس کے یار نے ۔۔۔ جس وقت اُس کے حال کی اُس کو خبر گئی،

قطعہ اس شعر سے شروع ہو کر فغاں کے مندرجہ ذیل شعر پر ختم ہوتا ہے۔ :-

شکوہ کرے ہے تو جو مرے اشک سرخ کا ۔۔۔ تیری کب آستین مرے لوہو سے بھر گئی

غزل فغاں

کہتے ہیں فصل گل تو چمن سے گذر گئی، ۔۔۔ اے عندلیب تو نہ قفس بیچ مر گئی
مجھ سے جو پوچھتے ہو بہر حال شکر ہے، ۔۔۔ یوں بھی گذر گئی مری دوں بھی گذر گئی
شکوہ کرے ہے تو جو مرے اشک سرخ کا ۔۔۔ تیری کب آستین مرے لوہو سے بھر گئی

ق

تنہا اگر میں یار کو پاؤں تو یوں کہوں ۔۔۔ انصاف کو نہ چھوڑ، مروت اگر گئی
آخر فغاں وہی ہے اُسے کیوں بھلا دیا ۔۔۔ وہ کیا ہوئی نگاہ وہ اُلفت کدھر گئی

آپ کے سنگ مزار پر حکیم ابو الحسن مشتاق کا تصنیف کردہ قطعۂ تاریخ انتقال کندہ ہے۔ و ہو ہذا :-

قطعہ

کو کہ خاں آں بہار باغ سخن، ۔۔۔ سوئے خلد بریں ز دُنیا رفت،
کرد مشتاق چو فکر تاریخش، ۔۔۔ گفت ہاتف "سرور دلہا رفت"

۱۱۸۶ھ

راجہ بہادر المتخلص بہ راجہ خلف مہاراجہ شتاب رائے ان ہی اشرف علی خاں فغاں کے شاگرد تھے۔ اُن کا بھی ایک شعر ہدیۂ ناظرین ہے۔

یہ زخم دل ہمارے مرہم تلک نہ پہنچے ۔۔۔ ہم اُن تلک نہ پہنچے، وہ ہم تلک نہ پہنچے

اگر اکبر آباد کی بد دولت دلی کو میر تقی میر پر فخر ہے تو عظیم آباد کو بھی بلا شرکت غیرے اُن شیخ غلام علی راسخ پر ناز ہے اور بجا ناز ہے، جو میر تقی میر کے ہمعصر اور ہمزبان اور اُن کے نعم البدل کہلائے۔ جس سال عشق کے سے محقق سے پٹنہ خالی ہوا، اُسی سال اس باکمال کے وجود نے پٹنہ کی سرزمین کو نوازا۔

اس شہر کا یہی ادبی وقار اور شہرہ تھا کہ میر شیر علی افسوس اور میر آمن کے سے زبان داں اور نثار تک یہاں آئے اور رہے۔ اسی طرح دیگر باکمال یہاں کی خاک کی طرف کھنچے اور ڈھیر ہو گئے۔ ندیم کے دامن کی وسعت کا خیال کرتے ہوئے اس مختصر کو مقبول بنانے کی گنجایش نہیں

---

[1] نواب اشرف علی خان فغاں، احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ (دودھ شریک بھائی) قلعۂ شاہی میں پلے، لہٰذا ان کی زبان بھی وہی زبان تھی جسے اُردوئے معلّٰے کہتے ہیں۔

[2] راسخ مرحوم کی مکمل سوانح عمری مع انتخاب کلام مرتب کر چکا ہوں، ناظرین تا اشاعت انتظار فرمائیں۔

غالب کی نسبت مشہور ہے کہ اس ملک میں وہ پہلے بزرگوار ہیں جنہوں نے اُردو میں خط و کتابت شروع کی۔ لیکن یہ خیال اُنہیں غدر سنہ ۱۸۵۷ء میں آیا جب کہ اُن کے قوا ضعیف ہو چکے تھے، اور مشکل کو نباہ نہ کر سکتے تھے، مگر نواب جلال الدین خاں تاثیر خلف نواب مہدی علی خاں مہدی (جناب شاد کے جدِ امجد) نے سنہ ۱۸۴۸ء میں جبکہ وہ جوان تھے اُردو پر اپنی طاقت آزمائی کی ہے۔ اور وہ بھی کسی مجبوری سے نہیں بلکہ اس اردو کا خیال کر کے جو اُن کے خاندان کا آل مغاتھی، ہمارے اگلے امرا اور بزرگواروں میں دو ایک اور بھی ایسے نام ہیں جو نظر انداز نہیں کیے جا سکتے، نواب سید ہدایت علی خاں اسد جنگ بہادر المتخلص بہ ضمیر بڑے پائے کے بزرگوار اور امرا و اعیانِ دلی میں سے تھے۔ ناظم بنگالہ نواب شجاع الملک محمد علی وردی خاں، مہابت جنگ کے خویش تھے۔ شجاعت و سخاوت میں مشہور روزگار، کچھ دنوں نیک نامی کے ساتھ عظیم آباد کے صوبہ دار بھی رہے۔ یہ محمد شاہ بادشاہ کے مقربین اور نواب عمدۃ الملک محمد امیر خاں انجام (وزیر محمد شاہ) کے خاص دوستوں میں سے تھے نواب نے یہاں بھی ایک حویلی بنائی جسے بڑی حویلی کہتے تھے، حاجی گنج میں یہ حویلی اُن کے پوتے نواب سید کاظم علی خاں کے وقت تک آباد رہی، مگر اب ویرانہ اور کھنڈر ہے۔ نواب نے عظیم آباد میں انتقال کیا اور حسین آباد میں مدفون ہوئے۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی فرماتے تھے ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

ہر گز نہ مرے عشق کا سرفاش نہ ہوتا ✤ کرتا نہ اگر آہ کے مرا پردہ دری رنگ

پھر ان ضمیر کے خلف الرشید مشہور و معروف نواب سید غلام حسین خاں عظیم آبادی، صاحب سیر المتاخرین ہیں، جن کی تاریخ دانی اور زبان دانی جریدۂ عالم پر ثبت ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ شاعری میں شیخ علی حزیں اصفہانی کے شاگرد تھے۔ ان ہی غلام حسین کے ساتھ ساتھ میں غلام حسین شوخ کے نام کو بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ کہ جن کی بدولت عظیم آباد کو یہ بھی ایک خاص امتیاز حاصل ہے کہ سب سے پہلے عظیم آباد کے اس رکن رکین نے تقریباً سنہ ۱۱۶۵ھ میں شعرائے ریختہ کا تذکرہ ریختہ ہی میں قلمبند کیا۔ اسی طرح نواب علی ابراہیم خاں بہادر نصیر جنگ المتخلص بہ خلیل (عظیم آبادی) مؤلف تذکرہ گلزار ابراہیم بھی صوبہ بہار اور ہندوستان کی ادبی دنیا میں ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں اور مؤرخین کی جماعت کے بھی ایک ممتاز رکن ہیں۔ ہر گا دو شعر ہدیۂ ناظرین ہیں۔

اُڑ گئے کچھ حواس سے میرے ✤ اُٹھ گیا کون پاس سے میرے

بھور ونے سے میرے تر ہوا جیب و کنار آخر ✤ خلیل آنکھوں کے ہاتھوں ہو گیا گلزار پہلو میں

نواب آصف الدولہ کے عہد میں ان کے ایک بڑے کارکن راجہ جھاؤ لال لکھنؤ سے نکلے اور مع خدم و حشم عظیم آباد آ کر مقیم ہوئے۔ مدرسہ سیف خاں کی پشت پر پچھم طرف نواب مہابت جنگ کی تعمیر کردہ جو حویلی اور چہل ستون تھا وہ انہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے قیام کو عنایت ہوا اور راجہ بہ کروفر یہاں رہنے لگے۔ ہمارے یہ راجہ صاحب عربی، فارسی کے استاد اور شاعری میں بھی ممتاز تھے۔ ان کی زبان ٹکسالی اور اس وقت کے لکھنؤ کی بہترین سوسائٹی کا بہترین نمونہ تھی۔ لکھنؤ میں جس طرح ان کے نام سے ایک پل "جھاؤ لال کا پل" کھڑا ہے، اسی طرح یہاں کا محلہ "جھاؤ گنج" بھی انہیں یاد دلاتا ہے ہمارا پرانا قصبہ وہرانا ہے۔ یہ تھا عظیم آباد کا اگلا اور دیرینہ قصبہ لیکن جب نیا دور شروع ہوا تو ایسٹ انڈیا کمپنی اور شاہ عالم کے وقت میں دلی کا ایک اور چراغ یہاں روشن ہوا۔ راجہ پیارے لال الفتی ایک مدت تک دلی میں اکبر شاہ ثانی کے میر منشی رہے، لیکن بالآخر ترک نوکری کر کے عظیم آباد چلے آئے، اور یہیں کے ہو رہے۔ عربی میں ذی استعداد اور فارسی کے استاد تھے۔ اُردو کو بھی آپ نے نظر انداز نہیں فرمایا۔ آپ کا ایک شعر ہدیۂ ناظرین ہے۔ ؎

خاکساری سے مثالِ نقشِ پا[1] ✤ جس جگہ بیٹھے وہیں کے ہو گئے

راجہ کو کتب بینی کا از حد شوق تھا، چنانچہ اُن کے خانگی کتب خانہ میں کئی ہزار کتابیں تھیں۔ میرے اُستاد مرحوم حضرت شاہ علی اللہ مقامہٗ فرماتے تھے کہ "میں نے راجہ کے کتب خانہ کی کوئی ایسی کتاب نہیں دیکھی، جس پر راجہ صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا حاشیہ نہ ہو۔ یہ تھا اُس وقت کا عظیم آباد اور اُس دور کے ارباب کمال کا ذوق و شوقِ علم!!

کنور ہیرا لال ضمیر ان کے اکلوتے فرزند بھی عربی و فارسی کے استاد اور مستند شاعر تھے۔ انہوں نے کنور برج بہادر اور کنور سکھ راج بہادر دو لائق فرزند چھوڑے۔ کنور سکھ راج بہادر کی علم دوستی مشہور خاص و عام ہے۔ ان کے ہاں مشاعرے بھی یاد گار ہوئے۔ کنور صاحب کا خاندان ان کے قدیم محل واقع ہر مندر گلی میں سکونت پذیر رہا اور ہنوز قایم ہے۔ ان اگلی بہاروں کا آخری شگفتہ پھول فریاد (شاہ الفت حسین) کچھ

---

[1] مصنفِ تاریخ مشاہیرِ بہار جناب آزاد مرحوم عظیم آبادی نے "نقشِ پا" کی جگہ "کفشِ پا" تحریر فرمایا ہے۔ یا تو مصنف نے اس لفظ پر غور نہیں کیا یا کاتب سے سہو ہو گیا۔

اس طرح کھلا کہ عظیم آباد تو عظیم آباد تمام ہندوستان کو مسطر کر گیا۔ ان ہی حضرت فریاد کے شاگرد اور فخر استاد شاگرد ہمارے استاد مرحوم نور اللہ مرقدہ حضرت شاد تھے، جن کی نسبت نے عظیم آباد کی شاعری اور زبان دانی کے پلہ کو اور بھی گراں تر کر دیا۔ بقول میر انیس مرحوم۔

سُبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر ۔۔۔ مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا

اسی کی طرف حضرت سیماب اکبر آبادی مندرجہ ذیل سطور میں اشارہ فرماتے ہیں۔ "عظیم آباد یوں تو ہمیشہ فضلا و شعرا کا مولد و مسکن رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ علامہ شاد عظیم آبادی کی نسبت نے اسے ہندوستان کے ادبی جغرافیہ میں بہت ممتاز جگہ دے دی ہے، اور ہم عظیم آباد کو حضرت شاد مرحوم ہی کی وجہ سے زیادہ پہچان سکتے ہیں۔" اب میں اس سلسلہ کی آخری کڑی ملا کر یعنی اپنے محترم ادیب الملک نواب امیر حسین خاں خیال کا نام لکھ کر آج کی داستان ختم کرتا ہوں۔ ہمارے اسی خیال کے متعلق رشید احمد صدیقی (پروفیسر مسلم کالج، علی گڈھ صدر شعبۂ اردو) تحریر فرماتے ہیں:۔ "شاد اور خیال بہار کے انیس و آزاد ہیں۔" میں شاد اور خیال کی روحوں سے شرمندہ ہوں کہ طوالت مضمون کے باعث میں ان حضرات کے متعلق کچھ عرض نہ کر سکا، لیکن ان بزرگواروں کے متعلق اتنے مضامین شایع ہو چکے ہیں کہ ان حضرات کا تعارف میری جنبش قلم کا محتاج نہیں اور نہ یہ کی مضمون کو تشنۂ معلومات رکھ سکتی ہے۔

غرض اس صوبہ اور اس شہر کی زبان و شاعری آج کی نہیں بلکہ بہت پرانی، شہنشاہی اور شاہجہانی ہے اور ہند کے اکثر صوبوں اور شہروں پر اسے قدامت اور افضلیت حاصل ہے۔ یہ شہر اپنے مذاق شاعری میں کسی کا محتاج نہیں بلکہ آپ اپنا مقلد و شاگرد رہا۔ اور سبھی کے فیض سے اپنا کشکول بھر لیا ہے۔ بقول حضرت شاد:۔

"چو تعظیم بزرگاں ہست کیشم ۔۔۔ در اُردو پیرو آبائے خویشم
زبان دانانِ ایں شہرِ معظم ۔۔۔ نہ پنداری کہ بودند از کسے کم
زبان مادری من ہمان است ۔۔۔ نہ ماخوذ از کلام دیگراں است۔"

اصل حقیقت یہ ہے کہ دہلی و لکھنؤ و عظیم آباد وغیرہ وغیرہ شہروں کی زبانیں ایک ہی چنے کی دو والیں اور شاہجہانی اُردو کی بیٹیاں ہیں، ایک ہی گھر میں پیدا ہوئیں، ایک ہی جگہ کھیل کود کر بڑی ہوئیں۔ ایک ہی طرح کے جہیز پائے۔ کوئی بیاہ کر پورب گئی، کوئی پچھم، کوئی اتر اور کوئی دکھن، لہٰذا فرق بھی اتنا ہی ہونا چاہیے جتنا دو بہنوں میں ہوتا ہے، نہ یہ کہ ایک کی آواز اور لحن پر ہزاروں طوطی قربان اور سیکڑوں ارگن بلجے اور خوش آواز سازِ نثار، اور کسی کی بھدی آواز اور کریہہ الفاظ حسن سماعت کے لئے ایک غیر قابل برداشت بوجھ اور ثقالت کا انگم بار۔ ان آخری الفاظ کی میں ذرا وضاحت بھی کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ آج کا عظیم آباد، اب وہ اگلا عظیم آباد نہیں، لہٰذا اہل عظیم آباد یہ نہ سمجھ لیں کہ اب بھی یہاں کی عام زبان پہلے کی طرح فصیح اور لائق تقلید ہے۔ سوا چند نفوس کے (جن کی تعداد بہت ہی کم ہے) تمام اہل عظیم آباد کا شمار فصحا میں نہیں ہو سکتا۔ مثل مشہور ہے کہ شبنم سے پیاس نہیں بجھ سکتی۔ یہ چند نفوس کے فصحا تمام صوبے کی زبان کیونکر درست کر سکتے ہیں، جب تک کہ زبان کے ہر نام لیوا اور اس کے تمام ہمدردوں کو اس کی اصلاح اور ترقی کا خیال نہ ہو ہاں! پچاس ساٹھ سال اُدھر البتہ عظیم آباد فصحا کا مولد و مسکن تھا، لیکن ع "یہ فتنہ ہے جب کا کہ آنشس جواں تھا" اب تو جدھر جائے اور جس سے سُنئے وہ زبان بولی جاتی ہے کہ خدا دشمن کو بھی نہ سُنوائے۔

ہمارے اگلے بزرگواروں میں تہذیب زبان کے ساتھ تہذیب آداب مجلس و نشست و برخاست اور حفظ مراتب بھی ایسا تھا کہ ہمارے اس موجودہ شائستہ زمانے میں کوئی اس کا برتنے والا تو در کنار، جاننے والا بھی دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے اس وقت آداب مجالس کے متعلق کچھ عرض کرنا نہیں۔ ہاں! آداب زبان کی طرف توجہ دلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ ہر ملک کے دار السلطنت میں بہ نسبت دیگر شہروں کے تہذیب و شائستگی زیادہ اور وہاں کی زبان و لہجہ بھی فصیح تر۔ اسی کلیہ کے ماتحت عظیم آباد، پٹنہ بھی اپنے صوبہ کے دوسرے شہروں سے کیا بہ حیثیت معاشرت یقینی شرف امتیاز رکھتا ہے۔ لیکن نا ہم محاوروں کے استعمال میں چند ایسی بے احتیاطیاں اور بے پروائیاں بھی برتی جاتی ہیں کہ جن کو شستگی فصاحت و زبان دانی، بلاغت و شاعری انگشت بدندان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مثلاً

(۱) افعال میں تذکیر و تانیث و جمع کی غلطیاں:۔ روٹی کھایا۔ باتیں کیا۔ وغیرہ وغیرہ
(۲) جمع کی جگہ واحد:۔ دو چار بات سُنو۔

(۳) تانیث و تذکیر کے استعمال میں عدم احتیاط :- اُس کی مزار - چھوٹی تکیہ - بڑی پلنگ - کھٹی دہی وغیرہ وغیرہ

(۴) افعال میں حرف زاید لگانا :- کہس اور کہن - دہس اور دہن ، بجائے کہا اور دیا -

(۵) ایک دو وغیرہ کے بعد لفظ "ٹھو" کا استعمال :- ایک ٹھو - دو ٹھو -

(۶) اسمار کی غلطیاں :- بدھنا بجائے لوٹا - بارات بجائے برات وغیرہ -

(۷) "نے" کا غلط استعمال :- تم لائے کی جگہ تم نے لایا -

(۸) غلط مصادر کا استعمال :- پہرنا بجائے پہننا - چیپ دینا بجائے دبا دینا - ٹانگنا بجائے لٹکانا - وغیرہ وغیرہ -

(۹) غلط ترکیب :- ہر شہروں - ہر گھروں بجائے ہر شہر ، ہر گھر -

(۱۰) غلط تلفظ :- پکھنا بجائے پنکھا - رے ، کو لڑے تلفظ کرنا - وغیرہ وغیرہ

(۱۱) غلط محاورہ :- پانی پٹانا بجائے سینچنا - وغیرہ

میں اس جگہ غلط اور صحیح ، فصیح و غیر فصیح کی فہرست بہ خیال طوالت پیش نہیں کر سکتا ، لیکن اشارۃً توجہ دلانے کے لیے چند مثالیں عرض کر دی گئی ہیں - یہ ایسی پیش پا افتادہ اور سامنے کی غلطیاں ہیں کہ ذرا سی توجہ کے بعد بہ آسانی ان کی اصلاح ہو سکتی ہے صرف اچھے بڑے چند اشعار کہہ لینا اور اپنے کو شعرا و فصحا کی صفوں میں کھڑا کر دینا اور بات ہے اور سلیس و فصیح اُردو بولنا اور لکھنا اور بات ! ہمارے شعراء یاد رکھیں کہ زبان کے بننے یا بگڑنے کی سب سے زیادہ ذمہ داری ان ہی حضرات کے سر عاید ہوتی ہے ، صرف چند غزلوں کا کہہ لینے سے زبان کی اصلاح اور خدمت نہیں ہو سکتی ، اسی امر کی طرف جناب شاد (اشارہ فرماتے ہیں :- "لیکن بڑی حیرت ہے کہ ایسے لوگ بھی جن کو زبان دانی سے ایک طرح کا (غذائی ہی سہی) سابقہ پڑتا ہے جب اپنے اجلاس میں باتیں کریں گے تو اسی ٹھیٹھی اور بھدی زبان میں ، نہ یہ کہ اپنی تحقیق بھر اس میں عمدہ محاورے صرف کریں - اُن کا حال بعینہٖ اُس بھوکے کا ہے کہ تلاش سے نعمتیں جمع کرے اور بے پروائی سے بھوک کے مارے مر جائے "

" زبان کا سدھارنا شاعروں کے متعلق ہے "

" شاعر اور غیر شاعر میں کوئی ایسا ما بالامتیاز فرق نہیں ہے اور اگر ہے تو یہی ہے کہ اُس نے زبان کی ہر ایک نکتہ پر غوص کیا ہے اور کوڑے کے انبار سے گوہر شب چراغ چن لیے ہیں "

میں اپنے طبقہ شعرا کے متعلق تو مختصراً عرض کر چکا لیکن صرف یہ ایک طبقہ کیا کر سکتا ہے جب کہ ملک کا ملک و شہر کا شہر توجہ نہ کرے لیکن زبان کی اصلاح اور بگاڑ کی سب سے زیادہ ذمہ دار حکومت ہوتی ہے - پہلے تو غیر ملکی حکومت تھی لیکن جب صوبائی حکومتیں قائم ہوئی ہیں اور عنان حکومت کا ایک سرا ہمارے ہموطن بزرگواروں کے ہاتھوں میں آیا ہے ، جب سے تو اُردو اور بھی سخت کنجی میں آ گئی ہے - زبانی وعدے بھی ہوئے ، احکام بھی لکھ کر نافذ کیے گئے لیکن یا تو بھی سنت گنش عائد ہوا - ندیم نے بھی اپنے نظرات میں بار بار صوبۂ بہار کی گورنمنٹ کی توجہ اس طرف مبذول کی لیکن اُس کی آواز بھی صدا بہ صحرا سے زیادہ سماعت نواز ثابت نہ ہوئی - اس سے زیادہ اُردو کے ساتھ اور کیا بے انصافی کی جاتی کہ ہندو تو ہندو ، غیر مسلمانوں کی ہاں بھی سرکاری فارموں سے جتنے سمن (Summon) وغیرہ جاری کیے جاتے ہیں سب ہندی میں ، اور طرفہ تو یہ ہے کہ فارم چھپا ہوا تو انگریزی میں ہے لیکن ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارتیں ہندی میں - کاش وہ بھی اسی طرح انگریزی ہی میں ہوتیں ! کیا اُردو والے طبقہ اب اس امر پر مجبور کیا جائیگا کہ وہ اس طرح کے کاغذات واپس کر کے عدالتی حکام کی خلاف ورزی پر آمادہ ہو جائے ؟ میں عرض کر چکا ہوں کہ برادرانِ وطن غیر ملکی قوم کا شکوہ کرتے ہیں لیکن یہ خود اُن سے دو ہاتھ آگے نظر آتے ہیں -

مجھے ندیم کے نظرات میں یہ پڑھ کر فارم پر اُڑیا رسم خط تو ہے لیکن اُردو ندارد اور بھی افسوس ہوا - ذہنیت تو ایسی پست اور تمام ملک کی نمایندگی کا دعویٰ ! میں یہ پڑھ کر بہ بانگ دہل اعلان کرنے پر تیار ہوں کہ یہ سب کچھ نہیں صرف اُردو کی دشمنی اور مسلمانوں سے غلط نسبت دیکر اس کی جڑ کنی مقصود ہے - مجھے مدیر ندیم سے اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ وہ لجاجت سے یہ کہتے ہیں کہ "صوبۂ بہار میں اڑیا جیسی غیر ضروری زبان ہی کے پیچھے ہی غریب اُردو کو بھی رہنے کی جگہ عنایت کیجائے " میں کہتا ہوں کہ اُردو دان طبقے کو یعنی ہندو اور مسلمان دونوں کو مل کر گورنمنٹ کو مجبور کرنا چاہیے کہ وہ ہندی کے پہلو بہ پہلو اُردو کو بھی جگہ دے - یہ میرا حق اور جائز حق ہے ، پھر اس کا مطالبہ فقیروں کی طرح کیوں کیا جائے ! میں ایسے حضرات کو جو بھائی بھائی میں کسی طرح کا افتراق پیدا کریں اور ایک معمولی سازباز سوا اُن کے اور کچھ نہیں سمجھتا ، جوڑ میں فرق ڈالیں حتیٰ کہ زبان تک کو دو بنانا چاہیں ، وہ رقیبوں کے پوشیدہ قوت بازو اور اُن کے دام سازش کے چھپے ہاتھ ہیں -

ہمارے صوبے میں ایک اور عجیب ہیرو پرستی کا بھی رجحان ہے جس کی وجہ سے یہاں کے بالکل پراگندہ خاطر ہو کر خاموش ہو بیٹھتے ہیں ، یہ آئے دن کا مشاہدہ ہے کسی دلیل کی ضرورت نہیں - لیکن ؎

کوئی اے شاد پوچھے یا نہ پوچھے اس کی کیا طلب
خود اپنی قدر کرنی چاہیے صاحب کمالوں کو ،

ندیم کے بہار نمبر کے بعض مضامین سے ہمیں اختلاف ہے ، ہم اس کا اظہار کریں گے ، مدیر ندیم

ایک عظیم آبادی شاعر جس پر اکبر آباد نے قبضہ کر لیا

اور

اسکی ایک قلمی مثنوی

"پیام نظیر"

از جناب عبدالحمید صاحب حمید تاج محلی

اس تاریخی اجتماع میں جبکہ اردو زبان کا نقشہ بدلا جا رہا ہے تاریخ ایک جدید شکل اختیار کرتی جا رہی ہے میرے ایک کرم فرما نے رسالہ "ندیم" کو اپنی مختصر تحریر کے ساتھ تحفتہً میرے پاس ارسال فرمایا ہے۔ اور بہار نمبر سنہ ۴۰ء کے اشتہار کی سرخی اور ہر خبر جلی کی طرف خاص طور پر رجوع کیا ہے۔ حالانکہ میں مضمون نگار نہیں مگر میری دلچسپیاں قریب قریب ہر ایسے رسالہ سے جس کی سرگرمیاں زبان اردو کو زندہ کرنے میں پیش پیش ہوں۔ متاثر ہوتی رہتی ہیں۔ خصوصاً فرمائش پر عزیز دوستوں کا مشکور ہوتا ہوں۔

اس فرمائش کو جب میرے ضمیر نے قبول کر لیا تو دو جملہ اول یہ کہ "مضمون نگاروں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے مضامین روانہ کریں" دوئم یہ کہ "مضمون صوبہ بہار ہی کے کسی پہلو پر لکھا گیا ہو"۔ پڑھ کر سکتہ میں رہ گیا اور آفتاب آمد دلیل آفتاب کہہ کر رہ گیا۔ پھر دل اس تلاش اور جستجو میں رہا کہ ناظرین ندیم کو کس طرح خوش ہونے کا موقع دیا جائے۔

کوئی شہر ایسا نہیں کہ جہاں خوش گو ماہر فن شاعر نہ گذرا ہو یا موجود نہ ہو لیکن ایسا شاعر جو فطرت پرست مصور ان جذبات تمدن و معاشرت۔ نحاکات فکار کی تلاش مشکل اور بہت مشکل ہے اور پھر وہ جو اس قید کا موازنہ ہو پہچان کر ادب کی محفلوں میں استقبال کرنا کوئی آسان بات نہیں آسمان ادب کے ستاروں کا ہر مورخ نے ذکر کیا ہے مگر میاں نظیر ایک ایسے شاعر ہیں کہ گمنام ہی رہے۔ اس خدمت کے لئے صرف بزم نظیر ہی کو وہ دور اول کے شاعر کے واقعات کو موقع بموقع پیش کرتی رہتی ہے۔ وہ نظیر جو ہندوستانی شاعری کے لحاظ سے زبان اردو میں جواب نہیں رکھتا۔

نہ صرف اکبر آباد کا ذرہ ذرہ نظیر کا محبوب ہے بلکہ بہار کو بھی اس مناظر فطرت کی تصویر پر ناز کرنا چاہیے اس لئے کہ جو مرحوم عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور سن شعور کو وہیں گذارا پھر اکبر آباد پہنچے گویا وہ صوبہ بہار کے مہکتے ہوئے پھول تھے اور سو برس کے بعد اکبر آباد میں آکر مرجھا گئے اس لئے پیام نظیر بہاریوں اور اکبر آبادیوں دونوں کے واسطے یکساں ہے مگر دونوں کی ادبی تاریخیں تا ہنوز مرحوم کے ذکر سے خالی نظر آرہی ہیں تو یہ کہ اصلی نام کو بھی فراموش کر دیا اب صرف نظیر کے نام سے مشہور ہیں۔

میاں نظیر کی ذات ایسی ہے جس کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی شاہراہ سب سے علیحدہ بنائی اور اپنے لئے تقلید کا تنگ دائرہ پسند نہ کرتے ہوئے خود ایک صنف کے موجد ہو گئے۔ نظم اور مسلسل نظم جو اس وقت تک اردو شاعری کے لئے بالکل اجنبی تھی اب اس میں شامل ہو گئی۔ تعجب تو یہ ہے کہ مغربی تعلیم و تربیت کا قدم اس وقت تک ہندوستان میں نہیں پہونچا تھا لیکن نظیر کے یہاں فضاں کی ادائی اور خطابت کا جو عنوان اور اسلوب ملتا ہے وہ بالکل مغربی شاعری کے طرز پر ہے۔

اس تاجدار سخن کے کلام کو یورپ نے بھی قبول کر کے ترجمہ کر لیا ہے انکا قول ہے کہ شعرائے ہند میں نظیر ہی وہ شاعر ہے جس میں شیکسپیر کی عظمت کا راز نہاں ہے۔ نظیر نے دنیا کو جس حالت میں دیکھا اوسکو اوسی شکل میں تخمیند کر دیا۔ نظیر کے کلام کو اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو بلا مبالغہ ہر صاحب علم کہہ سکتا ہے کہ نظیر مصور فطرت تھے۔ نقاش حیات۔ الفاظ کے بادشاہ۔ خیالات کے مالک۔ جذبات کے فرمانروا

تھے، بے تعصبی کا یہ عالم کہ جہاں بزرگان اسلام کی منقبت میں نظمیں لکھیں، وہاں ہندو اوتاروں کے لئے بھی اظہار عقیدت کیا ہے۔

جس جوش و خروش سے عید منائی، اُسی سرمستی اور ہنگامہ سازی سے ہولی کی رنگ رلیاں قایم رکھیں۔ غزلیات میں میر کے دوش بدوش نہ سہی قدم بہ قدم چل رہے ہیں مگر فرق نظیر نے اپنے جوش کے عالم میں جو کچھ کہا ہے وہ بے مثل و بے نظیر ہے۔ نظیر کا مرعوبہ خیال اتنا بلند تھا کہ جس پر ظاہر بینوں کی نگاہ نہیں پڑی اور یہ اُس کو پا کر اگر خاموش ہو گئے۔ نظیر کو سمجھنے کے لئے پہلے دنیا کو سمجھنا چاہئے۔ ہندوستان اگر مغربی شاعر کے مقابلہ میں کسی شاعر کو پیش کر سکتا ہے تو وہ نظیر کی ذات ہے۔ بزم نظیر نے بہت کوشش کی کہ کہیں سے تصویر میسر آ سکے مگر معذور رہی۔ اکثر رسالوں سے قلندرانہ وضع میں ملاک پیش کئے ہیں مگر وہ تمام میاں نظیر کے حلیہ سے دُور تر ہیں۔ آپ نے اپنا حلیہ بخط قلم سے بند کیا ہے۔ قابل غور ہے ؎

مست روش بست قد سانولا ہندی نژاد — تن بھی کچھ ایسا ہی تھا قد کے موافق میاں
ماتھے پہ اک خال تھا چھوٹا سا مسے کے طور — تھا وہ بڑا آنکھ اور ابروؤں کے درمیاں
وضع بنک اُسکی تھی تس پہ نہ رکھتا تھا ریش — مونچھیں تھیں اور کانوں پہ پٹے تھے پہند ساں
پیری میں تھی جس طرح اُس کو دل افسردگی — ویسی ہی تھی ان دنوں جن دنوں میں تھا جواں

آنکھیں نم چھوٹی۔ کسرتی بدن۔ سوتواں ناک۔ کتابی چہرہ۔ خوش قیافہ۔ شگفتہ مزاج۔ بلا کی ذہانت تھی۔ لباس کرتہ، سیدھے پردے اور نیچی چولی کا انگرکھا۔ بڑے پائچوں کا پائجامہ۔ پگڑی محمد شاہی چکر دار کھڑکی دار۔ پٹکا کمر میں۔ گھیتلی جوتی۔ ہاتھ میں آڑو کی چھڑی۔ دو انگوٹھیاں انگلی میں عقیق اور فیروزے کی نگ دار۔ جاڑوں میں فرخ آبادی چھینٹ کا جوڑہ۔

میاں نظیر کا خط نہایت اچھا تھا۔ اُس کی نسبت آپ خود فرماتے ہیں ؎

لکھنے کی یہ طرز تھی کہ جو لکھے تھا کتاب — پختگی اور خامی کی اُس کا تھا خط درمیاں

تصانیف و تالیف۔ قصہ لیلےٰ مجنوں نظم۔ مثنوی حسن و عشق۔ نثر میں اثار نظیر۔ قدر متین۔ فہم ترین۔ بزم عیش۔ رعنا زیبا۔ اوجھڑ سعدی رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب کریما کے ہر شعر پر بند لگائے ہیں پھر صدہا نظموں کا مجموعہ کلیات ہے۔ جو بلا کسی نگرانی اور دیباچہ کے طبع ہو چکا اور صدہا نظمیں ایسی ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔ جب ہم حساب لگاتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ میاں نظیر کے بعد کسی شاعر نے آج تک اس قدر اشعار نہیں کہے۔ الفاظ، لغت، ردیف۔ قافیہ، یہ سب غلام تھے۔ جس طرح چاہا باندھا، جہاں چاہا کھپا دیا۔ گویا ان تمام کو نظیر نے فروغ دیا جو تمامتر مقامی تہذیب، تمدن اور معاشرت کی تصویریں ہیں۔

میاں نظیر کی پیدائش کا سنہ مورخین نے ۱۱۴۸ھ لکھا ہے گویا عالمگیر اورنگ زیب کی وفات کے تیس برس بعد ہے۔ آپ کا نام نامی سید ولی محمد تخلص نظیر تھا۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام سید محمد فاروق ہے جو سادات بارہہ میں سے تھے۔ اور عظیم آباد (پٹنہ) میں کسی نواب کے مصاحب تھے۔ چونکہ آپ کی شادی نواب سلطان خاں قلعہ دار آگرہ کی دختر سے ہوئی تھی، اُس سے آگرہ میں محلہ نوری دروازہ آکر مقیم ہوئے۔ اور شہر فارسی آباد میں سے مشہور ہوئے اور جب میاں نظیر سن بلوغ کو پہونچے تو ان کی شادی عبدالرحمن خاں چغتائی سنف محمد علی بیگ صوبہ دار جن کا سلسلہ نسب وزیر شاہجہانی حضرت حبیب اللہ سے ملتا ہے ہوگئی۔ اس لئے میاں نظیر تاج گنج گلی ملکہ زیر محل نواب بیگم صاحبہ باشندہ اکبر آباد ہو گئے اور کچھ اس رچھ ماؤس ہوئے کہ مسکن سے دو میل دور جانا بھی پسند نہ فرمایا۔

میاں نظیر نے باپ ہی کے زیر سایہ فارسی، عربی، ہندی میں کامل دستگاہ حاصل کی۔ شعر و سخن میں کسی اوستاد کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔ زور فکر، جودت طبع اور انقلاب زمانہ نے خود بخود یدطولےٰ عطا کر دیا اور آزادی کا جس طرح آپ نے ماحول پیش کیا ہے۔ اب جو مہذب زمانہ کہلاتا ہے، لکھ نہیں سکتا۔ جس موضوع پر قلم اٹھایا اُس کا مقصد پیش نگاہ رکھتے ہوئے ہر نشیب و فراز سے آگاہ کر دیا۔

جب ہم میاں نظیر، انیس اور غالب کے کلام کا موازنہ کرتے ہیں تو تاریخ بتاتی ہے کہ یہ شاعر اپنے رنگ کا استاد تھا۔ لیکن میر کی زبان کو کس شاعر نے قبول کیا اور زبان اردو کا لغت کس نے ترتیب دیا، کس نے پشت پناہی کی؟ مجھ سے اگر کوئی صاحب دریافت کریں تو میں بلا مبالغہ عرض کر دونگا کہ نظیر اور صرف نظیر کی وہ ذات ہے جس نے اردو ادب میں چار چاند لگائے۔ پھر وہ کلام جسے میاں نظیر نے مسدس منقبت وغیرہ وغیرہ میں گذشتہ

دور کے تمدن و معاشرت کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے اور وہ وہ الفاظ جذب کیے کہ آج کسی کی زبان پر نہیں، کانوں نے سُنا نہیں۔

غرضکہ میاں نظیر کی شاعری مبالغہ سے خالی، تصنع سے بیزار نظر آتی ہے۔ معاصرین کے رنگ سے جُدا رنگ ہے۔ سیدھی سیدھی باتیں، حقیقی کیفیتیں۔ سنہری زبان میں جو ایک شاعر اعظم کے لیے ضروری ہیں جمع کر گئے۔ ان کی بے تعصبی کہیے یا اظہار عقیدت سمجھیے ایک طرف رام چھسن۔ رادھا کرشن۔ بلدیو جی۔ مہادیو جی۔ گرونانک کے واقعات پر تبصرہ فرمایا تو دوسری طرف لیلےٰ مجنوں اور دیوالی کی سرمستیوں کو بھی پیش نظر رکھا۔ جہاں عید کی خوشی ہے وہاں ہولی کی ہنگامہ سازی اور بسنت کی رنگینیوں کو بھی نہیں چھوڑا۔

میاں نظیر حضرت میر سے جن کی پیدائش ۱۱۳۵ھ ہے عمر میں گیارہ سال چھوٹے تھے۔ اور غالب سے جو ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے تقریباً چونسٹھ سال بزرگ تھے۔ بہت ممکن ہے کہ میر نے دارالسلطنت آگرہ کی وہ جھلک دیکھی ہو کہ جب یہاں فہرِ بہشتی پیاسوں کو سیراب کرتی ہو شعر و سخن کا شور ایک عالم پر چھایا ہوا ہو حسین خوش ترکیب پاکیزہ طینت سرگرم کار ہوں۔ عارف، کامل، فاضل، قاری، محدث، شیخ اور حکیموں کا مجمع ہو۔ لیکن میاں نظیر نے جب ہوش سنبھالا ہے تو مغلیہ سلطنت کا دم نزع میں تھا۔ ایک ایک کر کے دلی، لکھنؤ، لاہور، حیدرآباد کو رخصت ہو چکے تھے۔ مگر میاں نظیر کے پاؤں میں حب الوطنی کی زنجیر پڑی ہوئی تھی، آپ نے باوجود اس کے کہ نواب واجد علی شاہ کا پیام آتا ہے، مگر آپ گھر سے قدم باہر نہیں نکالتے ہیں۔

نظیر کا انتقال ۱۲۴۶ھ میں ہوا۔ اور اپنے مکان کے سامنے ایک کشادہ زمین میں نیم کے درخت کے نیچے دفن ہوئے۔ بجز مزار کے مگر آہ! آگرہ میں اس مرد بے بدل وطن شاعر کی قبر کا یہ حال ہے کہ قبر موجود ہے۔ چہار دیواری فنا ہو گئی۔ ہر تیوہار پر خصوصاً ہولی اور دیوالی پر معتقدین جمع ہوتے ہیں، شعر خوانیاں کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ موجودہ فضا نے اسے بھی مٹا دیا تھا، ۱۹۳۷ء کے شروع میں بزم نظیر نے جشن یا صد سالہ برسی کا آغاز کیا۔ ۲۵ جنوری ۱۹۳۷ء کو تعمیر السنت منایا۔ عوام نے لبیک کہا، خصوصاً اہل ہنود نے بڑی دلچسپی ظاہر کی۔ اس وقت اس اکبرآباد کے تاج ثانی کی قبر کی پرتری کی اپیل کی تھی

سوتا ہے نظیر اس جا غربت میں بہت دن سے
مسکن نہیں بنتا ہے تو بتخانہ بنا دو

اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ کچھ اصلاح ہو گئی، ایک ہنڈا روشنی کا لگا دیا گیا۔ امید ہے کہ آنے والے بسنت تک جو ۱۹۴۰ء میں ہونیوالا ہے اور کچھ ہو رہے گا۔ [1]

علاوہ کلیات نظیر، آگرہ میں کئی جگہ نظیر کے کلام کے قلمی نسخے موجود ہیں، انہیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ نظیر ایک بحر زخار تھا جس کی موجوں میں جو آ گیا بہا چلا گیا۔ اس موقع پر مضمون کو طول ہو جانے کا ڈر ہے، ورنہ دل تو نہیں چاہتا کہ قلم کو روک دوں مناسب یہ ہوگا کہ اس مثنوی کے چند بند نمونہ کے طور پیش کر دوں۔ جو کلیات نظیر میں طبع نہیں ہوئے ہیں۔ اگر ناظرین ندیم کی توجہ ہوئی تو آیندہ اور روانہ کر سکوں گا۔ یہ مثنوی تین سو اشعار پر ختم ہوتی ہے جو ایک سو بیس برس قبل کی یادگار ہے اور عہد گذشتہ کی تصویر ہے، جب کہ اردو زبان نے جنم لیا تھا اور بڑی خوبی یہ ہے کہ بالکل اچھوتا مضمون ہے۔ [2]

جب تک تھی نہ جوانی تو بہت شادی تھی
کچھ نہ اپنے دلِ آزاد پہ بیدادی تھی،
حُسن اور عشق کے اُن جھگڑوں سے آزادی تھی
اس طرح راحت و آرام کی نہ بربادی تھی
سینۂ دل میں مے عشق کا کچھ جوش نہ تھا
وہی ایام بہت خوب تھے جب ہوش نہ تھا

---

[1] اس مزار کی چہار دیواری وغیرہ کا تخمینہ نو سو پچہتر روپیہ کل دار ہے۔ معتقدین کو شان ہیں، امید ہے کہ کوئی شکل ایسی نکل آئیگی کہ زائرین محفوظ ہو سکیں۔ ادب نوازنگاہیں فن شعر کے قدر دانوں ہی بھی درخواست کی گئی تھی کہ اس تشنہ کام ادب کی قبر کی تیاری میں حصہ لیں مگر ہنوز کوئی توجہ نہیں ہوئی۔ اب یہی پیام نظیر، ناظرین ندیم کو ہے کہ نظیر کی قبر جس بیکسی کی حالت میں ہے اُس پر عند اللہ توجہ فرمائیں ورنہ نظیر کی پیشین گوئی بالکل درست ہے۔

یہ کم نصیب ہوئے ہم کہ بعد مرگ نظیر
ہوئی نہ قبر کو ان کی کبھی بھی تربت نصیب

ہوش جب ہم نے سنبھالا تو سنبھلتا نہیں دل،
ایک دم اب تو بجز عشق سنبھلتا نہیں دل
آتشِ عشق سے کب سینہ میں جلتا نہیں دل
شمع کی طرح سے کس روز پگھلتا نہیں دل

پیشتر سوزِ غمِ ہجر سے نالاں کب تھے
ہمہ تن داغوں سے ہم سر دچراغاں کب تھے

تھے وہ دن خوب کہ تھی حسن سے واقف نہ نگاہ
دل کو معلوم نہ تھی کوچۂ الفت کی راہ
تھے نہ آگاہ کہ کس بات کو کہتے ہیں چاہ
عشق میں حالتِ دل ہوتی ہے کس طرح تباہ

ہائے کیا دن تھے کہ جب بیخبری رہتی تھی
کاہے کو آٹھ پہر نوحہ گری رہتی تھی

ظلم بیداد کسے کہتے ہیں واقف تھا کون
آہ فریاد کسے کہتے ہیں واقف تھا کون،
فتنۂ ایجاد کسے کہتے ہیں واقف تھا کون
جامہ برباد کسے کہتے ہیں واقف تھا کون

کسی صورت کی نہ غفلت میں خبرداری تھی
وہی دن خوب تھے جب تک کہ نہ ہشیاری تھی

پیشتر راتوں کو اس طرح نہ بیخوابی تھی،
کیا ہی آرام سے سوتے تھے نہ بیتابی تھی،
غنچۂ دل میں عجب تک کی شادابی تھی،
خوش گذرتی تھی غم و درد کی پامالی تھی،

موم تھا پہلے یہ دل سینہ میں کچھ سنگ نہ تھا
پر جو اب ڈھنگ ہے آگے یہ کہیں ڈھنگ نہ تھا

وہ بھی دن خوب تھے جب غم سے سروکار نہ تھا
عشق کے پیچ سے زنہار خبردار نہ تھا،
دامِ الفت میں دلِ زار گرفتار نہ تھا
عیش سو طرح کے تھے ایک بھی آزار نہ تھا

دل سے اس طرح نہ پہروں مجھے سرگوشی تھی
ایسے ہشیار سے بہتر وہی بیہوشی تھی

پیشتر دل کی اذیت سے نہ آگاہی تھی،
ان پریزادوں کی صورت سے نہ آگاہی تھی،
رنج کیا چیز ہے راحت سے نہ آگاہی تھی،
ہجر اور وصل کی لذت سے نہ آگاہی تھی

کچھ نہ خوبی سے صباحت کی خبر رکھتے تھے
نہ چاشنی سے نہ ملامت کی خبر رکھتے تھے

دل کو پہلے نہ سمجھتے تھے کہ رسوا ہوگا
نوجوانی میں ہمیں زلف کا سودا ہوگا
عشق کا کوچہ و بازار میں چرچا ہوگا
دیکھیں انجام اس آغاز کا اب کیا ہوگا

لطف سمجھے تھے جوانی میں دوچنداں ہوگا
یہ بھلا کس کو خبر تھی کہ پریشاں ہوگا

ہائے اے رنج! کہاں اپنا وہ پہلا آرام
ہائے بیتابیِ دل تو نے کیا کام تمام
سوزشِ عشق سے ہے آٹھ پہر زیست حرام
ہے تڑپ شام سے تا صبح سحر سے تا شام

اس قدر یوں نہ طبیعت پہ بلا کش ہوتی
آب و گل میں نہ اگر عشق کی آتش ہوتی

مدد اے اشکِ رواں ضبط سے گھبراتا ہوں
آتشِ عشق کی گرمی سے پگھلا جاتا ہوں،

سوزشِ داغ کی میں تاب نہیں لاتا ہوں
ہائے کیا آگ لگی ہے کہ جلا جاتا ہوں

سرد ہوتی نہیں اس اپنے دلِ زار کی آگ،
پھونک دی عشق نے کس شعلۂ رخسار کی آگ

ظلمتِ دل کو کیا عشق کے جب نور نے کم
صاف آئینہ کی صورت نظر آیا عالم

حسن دکھلانے لگا اپنے تماشے پیہم
پھنسے جاتے ہیں جوانی کے عجب پیچ میں ہم

دل کا پتلے نظر آتا تھا اولجھنا مشکل
کھل گیا اب کہ اولجھا ہے سنبھلنا مشکل

خلق میں سب کے لئے عشق کا دیں زیبا ہے
عشق پر کون سی یہاں شان نہیں زیبا ہے

گر کہیں ہم خصمِ راہِ یقیں زیبا ہے
عشق کا خاتمِ خاطر پہ نگیں زیبا ہے

دولتِ عشق جو عالم میں فراواں ہو جائے
کیا عجب ہو کہ یہ اک مورِ سلیماں ہو جائے

حسن اور عشق نہ ہوتے جو عیاں دنیا میں
ہوتے ظاہر نہ کبھی رازِ نہاں دنیا میں

جب کہ آرام کا ملتا نہ نشاں دنیا میں
دیکھتے لطف نہ کچھ پیر و جواں دنیا میں

ہر بشر مغتنم اس راہ نما کو سمجھے
خلعتِ عشق سے بندے بھی خدا کو سمجھے

عشق اپنی نہ اگر جلوہ گری دکھلاتا
کبھی مہتاب نہ داغِ جگری دکھلاتا،

حسن اگر شیشۂ دل میں نہ پری دکھلاتا
پردۂ چشم نہ اشکوں سے تری دکھلاتا،

دل نہ یوں شیفتہ زہرہ شمائل ہوتے
نہ فرشتہ بھی غریقِ چہِ بابل ہوتے

دلِ مجنوں کو اگر عشق کا آتا نہ پیام
کبھی بھولے سے بھی لیتا نہ وہ لیلےٰ کا نام

دلِ فرہاد میں کرتا نہ اگر عشق مقام
کبھی شیریں کی جدائی میں نہ پھرتا وہ تمام

سب کو عالم میں عجب عشق کی سرکار ملی
گر ملا یار مرادِ دلِ زار ... ملی

گر مئے عشق دلوں میں نہ اگر کرتی راہ،
شمع پر کرتے نہ پروانے بھی جانیکی نگاہ

محو گل پھر دلِ بلبل نہیں ہوتا واللہ
ماہ کنعاں کی زلیخا کو بھی پھر ہوتی نہ چاہ

عشق اگر چاند کی صورت نہ عیاں ہو جاتا
جلوۂ ماہ سے کیوں چاک گریباں ہو جاتا

چونکہ رسالہ ندیم بہار نمبر نکال رہا ہے، بہتر سے بہتر ذخیرہ جمع ہو چکا ہوگا اس لئے یہ سولہ بند ناظرین ندیم کو محظوظ کرنے کیلئے اور گمنام شاعر کے نام کو زندہ کرنے کی غرض سے ارسال کر رہا ہوں۔ آپ کی نظروں سے اس سے قبل اور بھی دو اسوخت گذرے ہونگے، آپ نے کبھی غور کیا کہ حسن اور عشق کا آغاز جس پیرایہ میں نظیر نے کیا ہے ایک جدید رومان نظر آرہا ہے۔ عشق کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے حسن کو غیر فانی نہ سمجھنا ثبوت مسرت پیدا کر رہا ہے۔ دولتِ عشق کا ہونا اور اس کے ذریعہ خدا کو پہچاننا کس قدر خوشنما لازم و ملزوم قرار دیا۔ یہ بیگانگی کی شمع گو بجھ چکی ہے۔ مگر بزمِ نظیر اس امر میں کوشاں ہے کہ ہند کا چپہ چپہ نظیر سے اور نظیر کے نام سے اور سوانح سے واقف ہو جائے۔

"شاد کا تغزل"

از جناب سید شاہ ولی الرحمن صاحب بی ام اے۔ ڈپٹی مجسٹریٹ، چمپارن

مشاطہ را بگو کہ برا سباب حسن یار چیزے فزوں کند کہ تماشا بہ ما رسید

"میخانۂ الہام" کی تنقید کے دوران میں میں نے اعلان کیا تھا کہ شاد مرحوم کے رنگ تغزل اور خصوصیات کلام سے بحث کرونگا۔ اس مقالہ کی ترتیب میں فرصت کا فقدان برابر سد راہ رہا۔ آج مہینوں کے بعد محترم ایڈیٹر ندیم کی فرمائش سے ندیم کے بہار نمبر کے لئے "تغزل فرسائی" کی نوبت آئی ہے۔ کئی دنوں تک سوچتا رہا کہ کس موضوع پر لکھوں۔ آخر دل نے یہی فیصلہ کیا کہ شاد مرحوم کے رنگ تغزل اور خصوصیات کلام سے سیر حاصل بحث کروں۔ قبل بھی اس موضوع پر ندیم میں مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ سب سے پہلے میرے عزیز دوست مولوی سید نصیر حیدر ڈپٹی کلکٹر نے شاد کے کچھ اشعار کی تشریح کی۔ اس کے بعد جناب حمید عظیم آبادی نے شاد کے سوانح حیات اور خصوصیات کلام سے ندیم کے بہار نمبر سنہ ۱۹۳۳ء میں بحث کی۔ لیکن یہ دونوں مقالے تشنہ نظر آتے ہیں۔ پھر ندیم کے بہار نمبر سنہ ۱۹۳۵ء میں محترمی سید اصغی احمد بلگرامی ڈپٹی کلکٹر نے "سرشک" کے مقالہ میں شاد مرحوم کا ذکر کیا لیکن رنگ تغزل اور خصوصیات کلام سے مطلق بحث نہ کی۔ بہرحیف اس تکرار کے باوجود بھی یہ داستان کچھ ایسی لذیذ و دلچسپ واقع ہوئی ہے کہ بار بار اس کے دہرانے میں مزہ آتا ہے ؎

جو سنے اسے بھی خلش رہے جو کہوں تو ختم نہ ہو سکے یہ فسانہ زلف دراز کا کہیں زندگی سے دراز ہے

ہر شخص کا معیار تنقید جدا گانہ ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا حضرات نے اس موضوع پر اپنے اپنے نقطۂ خیال سے لکھا۔ میں بھی اپنے نقطۂ خیال سے لکھونگا۔ شاد مرحوم نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی فرمائی لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب سے زیادہ قابل التفات انکی غزلوں کا مجموعہ ہے بلکہ بقول نواب سید نصیر حسین خیال مرحوم وہ کسی اور صنف سخن کے مالک ہی نہ تھے۔

علامہ شبلی کا خیال ہے اور نہایت صحیح خیال ہے کہ میر کا تغزل، درد کا تصوف اور غالب کا تفلسف شاعری کی جان ہے۔ میر کی دردمند طبیعت سوز و گداز کا آتشکدہ تھی جس نے اردو غزل کو درد و حسرت سے معمور کر کے عرش کمال تک پہونچا دیا۔ درد زاویہ نشین اور صاحب وجد و حال بزرگ تھے۔ انھوں نے اردو غزل کو تصوف کے رموز و نکات اور حقائق و معارف سے مالا مال کر دیا۔ نا رہا ہو غالب کی فلسفیانہ طبیعت دائم الجدت اور حسن حقیقت کی پرستار واقع ہوئی تھی جس و عشق ہو یا اخلاق و تصوف ہو یا توحید و معرفت ہو وہ ہر چیز کو فلسفیانہ انداز اور جدید اسلوب میں پیش کرتے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو کے تمام شعراء میں غالب کی شخصیت منفرد اور عدیم النظیر نظر آتی ہے۔ تخاطب کے تخیل کی رفعت و جدت اور بیان کی جزالت و ندرت اپنی آپ مثال ہے۔

ایک شاعر اور بھی ہے جس کا تغزل اردو کے لئے سرمایۂ ناز ہے۔ وہ کون؟ آتش۔ خواجہ حافظ کا انداز بیان اگر اردو کے کسی شاعر میں پایا جاتا ہے تو خواجہ آتش میں۔ رنگینی و دل آویزی، روانی و برجستگی، جوش و مستی، وسیع المشربی و آزادی آتش کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

کیا ان شعراء کے علاوہ کوئی اور بھی ایسا شاعر ہے جس کے سر آتش کے بعد تغزل کا سہرا رہا ہو؟ تحقیق کی عدالت کا فیصلہ ناطق یہ ہے کہ ایسی ہستی شاد عظیم آبادی کی ہے۔ آتش نے ۱۲۶۳ھ میں انتقال کیا۔ اسی سال شاد پیدا ہوئے۔ ایک تناسخ کا قائل کہہ سکتا ہے کہ آتش کی روح نے شاد کے پیکر میں دوبارہ جنم لیا۔ یہی پانچ شعرا یعنی میر، درد، غالب، آتش اور شاد اردو غزلگوئی کے عناصر خمسہ ہیں۔

صوبۂ بہار میں سلسلہ محمد عظیم محقق سے لیکر موجودہ دور تک سکڑوں شعرا پیدا ہوئے۔ ان میں سے راسخ اور وحشت سے زیادہ شاد کو میں۔ راسخ میر کے عکس ہیں لیکن نامکمل، وحشت درد کے پرتو ہیں لیکن ناتمام۔ اگر صوبۂ بہار کے تمام شعراء کے دواوین میرے سامنے رکھے جائیں اور کوئی کہے کہ ان میں سے صرف ایک دیوان لے لو اور بقیہ کو جلانے دو تو میں بے تامل کہہ دونگا کہ حضرت آپ یہ سب دواوین لے جائیے فرد دیوان شاد یہیں رہنے دیجئے۔

ہمہ شہر پرز خوباں منم و خیال ماہے — چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بہ کس نگاہے

کلام شاد پر تبصرہ کرنے سے پہلے ناظرین کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر شاد مرحوم سے مجھے عقیدتمندی ہے اور رشتۂ تلمذ بھی کچھ میں پڑا ہوا ہے تاہم میں نہایت آزادی و بیباکی سے تبصرہ کرونگا۔ روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں کو نمایاں کرونگا اور انصاف کو عقیدت پر ترجیح دونگا۔ اب میں اہل بحث کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

کلام شاد

شاد کی غزلیں "پستی میں بھی بلندی" اور "بلندی میں بھی پستی" کی مصداق ہیں۔ ان کے ضخیم دیوان غزلیات کا نہایت ہی غایت چوتھائی حصہ قابل اعتنا ہے۔ بقیہ حصہ بالکل ناقابل توجہ ہے۔ بہت سے اشعار ایسے ہیں جو شعریت سے یکسر معرا ہیں اور ان میں لوئی دلکشی و دل آویزی نہیں پائی جاتی۔ بہت سے اشعار ایسے ہیں جو نہایت دلکش اور بلند ہیں اور جن کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ شعر کے اساسی عنصر صرف دو ہیں خیال اور زبان۔ "کیا کہنا چاہئے اور کیونکر کہنا چاہئے"۔ ایک بات سیدھے سادے طریقہ سے کہی جائے تو اسے ایک معمولی بات کہیں گے اسے شعر نہیں کہہ سکتے۔ اگر اسکو نئے انداز اور جدید اسلوب سے ادا کیا جائے تو یہ شاعری ہے۔ بعض اہل فن کے خیال میں اسی جدت بیان اور لطف ادا کا نام شاعری ہے۔ مثال میں شاد مرحوم کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

محبت خاص نعمت ہے اسی کی ہے اور آدمی کس رکھ — یہ عزت تو نے مشک اپنے رتبہ سے سوا پائی

کوئے نیاز عشق میں آہو پڑا رہے نصیب — خاک پہ رکھ جبین شوق سجدۂ عاجزانہ کر

بات ایک ہی ہے لیکن انداز بیان نے دوسرے شعر کو آسمان پر پہونچا دیا۔ پہلا شعر بات ہی بات ہے جس میں مطلق علاوت نہیں "اور آدمی کس رکھ" یہ ٹکڑا غیر شاعرانہ ہے اور مصرع کی روانی کے منافی بھی ہے۔

میں نے جو شاد کو میر و درد، غالب و آتش کے بعد بہترین غزل گو کہا ہے تو میری یہ رائے ان کے منتخب اشعار کے لحاظ سے ہے۔ نیاز فتحپوری نے نگار میں صحیح تنقید کی تھی کہ شاد کے دیوان غزلیات کو ضرور شائع ہونا چاہئے لیکن انتخاب سختی کے ساتھ کیا جائے خواہ ایک ہی جزو کا دیوان کیوں نہ رہ جائے۔

زبان شاد

شاد عظیم آباد کے ایک معزز خاندان کے رکن تھے۔ اس گھرانے کی زبان متدین تھی۔ زبان کے معاملہ میں شاد نہ دہلی کے پیرو تھے نہ لکھنؤ کے۔ انکی زبان ایک خاص قسم کی زبان تھی۔ وہ یقیناً فصحائے عظیم آباد سے تھے۔ لیکن ان کا مذاق شاعری اتنا بلند واقع ہوا تھا کہ وہ زبان و بیان پر خیال و مضمون کو ترجیح دیتے تھے۔ کہیں کہیں وہ متروک الفاظ بھی استعمال فرماتے تھے۔ مثلاً ؎

عشق تو اس کا مشغل ہے اس سے کسے ضرر بھلا — دونوں جہاں کی نعمتیں اس کے سدے سے پائیاں

بار حسن کلیوں پہ تھیں پر جھائیاں — اے خزاں پتلے دبی مرجھائیاں

متقدمین فعل کو بہ ضیغۂ جمع استعمال کرتے تھے لیکن متاخرین بلکہ متوسطین ہی نے اسے متروک کر دیا ہے۔

شاد کی زبان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بعض بعض الفاظ اور ترکیبیں انہیں بہت مرغوب تھیں۔ مثلاً "بکنا" ؎

خالی نہیں اثر سے محبت جہان میں — ملسل تنے کی جو آہ تو کلیاں بکس گئیں

ابھی نوخیز ہیں رنگت زمانے کی نہیں دیکھی — بکتی ہیں جو کلیاں بعض منہ سے مسکراتے ہیں

بھچکنا ؎ دل بھچک کر صورت آئینہ حیراں رہ گیا — ہاں نقاب اٹھی پہ تو آنکھوں سے پنہاں رہ گیا

خدا کو مان ؎ تنگ نہ کر خدا کو مان اے مری دل گرفتگی — جاؤنگا میں قفس میں خود ہی بکے بہار دیکھ کر

دل کی گرہ کھلنا ؎ عدد کے دل کی گرہ اک ادا میں کھول گئے — وہ کیا چھپائے ہیں ہم اک نظر میں تول گئے

جسے جب جسے ؎ ہم اپنے ہاتھ میں جب جب لیا لب عام لیتے ہیں — تو ہر سر گھونٹ پر ساقی کا اپنے نام لیتے ہیں

گھبرا کے ؎ دل اپنی طلب میں فاختہ گھبرا کے لوٹے مطلوب گیا — دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا

ناشدنی ؎ دل کے دیتا ہے رو رو کے کلیجہ پانی — مجھ سے پھرنا شدنی داد طلب کرتا ہے

کمبخت ؎ بد کہا شیخ نے غصہ میں بتوں کو ناحق ! — یہ بھی کمبخت نہ سمجھا کہ مسلمان آئے گی

مقرر ؎ کھل ہی جائے گا مقرر کسی دن آپ سے آپ — چپ رہو شاد زمانے کی ہے طبیعت معلوم
دلا ؎ ہرگز کبھی کسی سے نہ رکھنا دلا غرض! — جب کچھ غرض نہیں تو زمانے سے کیا غرض
گھڑیوں ؎ مری دیوانگی ناصح کا عاقل بن کے سمجھانا! — اس افسانہ کو جو سنتا ہے گھڑیوں مسکراتا ہے

اردو میں ایک طریقۂ بیان یہ ہے کہ معہود ذہنی کو کبھی کبھی محذوف کر دیتے ہیں لیکن معنی میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔ مثلاً ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کا ایک دل پسند شعر ہے ؎

خدا جانے کہاں سے کیچ کے میخانے میں آتی ہے — خمار اتنی تو ہی شیشہ سے پیمانے میں آتی ہے

اس شعر میں شراب معہود ذہنی ہے جو اگرچہ محذوف ہے مگر شعر کا تلفظ ادا اس محذوف لفظ کو صاف ظاہر کر رہا ہے اور معنی سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اردو کے بہت سے شعرا نے اس طریقۂ بیان سے کام لیا ہے۔ شاد مرحوم ایک مخصوص محاورہ کے ساتھ معہود ذہنی کو محذوف کرنے کے عادی تھے "دورہ کے آنا" اس مخصوص محاورہ کو وہ ایک انوکھے انداز سے استعمال فرماتے تھے جس کی مثال شاید کسی شاعر کے کلام میں نہ ملے گی اس طریقۂ بیان میں کہیں حیرت کو کہیں غصہ کو کہیں ترس کو معہود ذہنی قرار دیتے ہیں۔ مثلاً ؎

مجھے اس بے مروت آہ پر آتا ہے رہ رہ کر — مزا دیکھو ہیں کی ہو ری کافر جہاں ہو نجی
رہ رہ کے مجھ کو آتی ہے اپنی امید کی — سکیں کی لاش پر بھی کوئی نوحہ گر نہ تھا
مجھے رہ رہ کے اس حسرت زدہ بلبل پہ آتا ہے — کسی دن چین سے رہنے نہ پائی آشیانے میں
ہمیں تو حشر کی آتی ہے دیکھئے کیا ہو؟ — یہ ایک وعدۂ نا استوار باقی ہے!

فارسی مصدر (کردن) کا ترجمہ (کرنا) بعض الفاظ کے ساتھ خلاف محاورہ استعمال کر جاتے تھے۔ مثلاً ؎

کہیں تو جام دھرا ہے کسی طرف ساغر! — کدھر جھکائے سر انساں کدھر نماز کرے
نشیمن کرے شاخ گل پر نہ بلبل — کسی کو بھی یہ شاخ پھولی پھلی ہے
محبت کے سوا کیا مل گیا مشق سخن کر کے — عدو چاروں طرف پیدا کئے تم نے یہ فن کر کے

اس کے ماسوا اوپر بہ معنی پر، پر بہ معنی لیکن، یاں، واں بجائے یہاں، وہاں۔ خالی بہ معنی صرف، موئے بہ معنی مرے، ذری بجائے ذرا بھی استعمال کرتے ہیں ؎

کعبۂ مقصود کا حج ترے اوپر ہے فرض — وسعت دل ہے سنا خون تمنا بہا
اے شاد رفتگان عدم پر نثار میں! — آنکھوں سے کوہیں دور پہ دل سے قریب ہیں
رہا کیا ہے دل ویراں میں اک ارمان خالی ہے — جدھر آنکھیں اٹھاؤ منزلوں میدان خالی ہے
فقط ایک شاد پر کیا موئے کتنے مرنے والے — کہ خدا کرے کسی دن وہ سر مزار آئے
اسی بہانے سے دل کو انہیں دکھا دیتا — یہ چیز کیسی پڑی ہے ذری اٹھا دینا

بقیہ الفاظ کا استعمال بہت عام ہے اس لئے مثالیں نظر انداز کرتا ہوں

شاد کے بعض اشعار لفظی و معنوی حیثیت سے ارباب نظر کو فوقیت بھی کرتے ہیں۔ جس کا شاید کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ؎

کہاں چھوڑا ہے مجھ وحشی کو قاتل نیم جاں تو نے — وہ کالی رات سناٹے کا عالم پو نار کا

پہلے مصرع میں صیغۂ حاضر (رہے) استعمال ہوا ہے اس لئے دوسرے میں وہ کی بجائے یہ ہونا چاہئے تھا۔ اسی طرح سے ذیل کے شعر میں ؎

جس کو اس حسن پہ شک ہو اسے ایمان نہیں — جو نہ سمجھے تجھے بیشک وہ مسلمان نہیں

لہ ان الفاظ و تراکیب کا استعمال شاد نے اکثر شعروں میں کیا ہے۔ طوالت کے خیال سے نظر انداز کرتا ہوں۔ ۱۲ ی

ع تیر کے وقت میں یہ محاورہ مستعمل تھا مگر اس کے بعد بالکل متروک ہو گیا۔

تجھے کی جگہ پر اُسے ہونا چاہئے تھا کیونکہ مصرع اول میں اُس ہے۔

ساقی مہ لقا نے جب خم کی سبوئیں ڈھالدیں — محلس مے میں چار سو شور مچا درود کا

شراب کی مجلس میں خم نہیں آتا، خم تو محلس سے باہر ہی رہتا ہے۔ خم سے سبوئیں شراب انڈیلنے کی خدمت منیجر یا غلامان مسکدہ انجام دیتے ہیں نہ کہ خود ساقی۔ خم ایک بہت بڑا ظرف ہے جس کا وزن شراب بھر جانے کی حالت میں اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ ایک معمولی طاقت کا انسان اسے اٹھا... کے خلاف ہے۔ ساقی مہ لقا کے حسن و لطافت اور رعنائی و نزاکت سے بعید ہے کہ وہ بھرے خم کو اٹھائے۔ یہی اعتراض اس شعر پر بھی وارد ہوتا ہے

ساقی نے خموں سے ڈھال کے دیتا تھا خود جسے — ہم اس شراب ناب کے لذت چشیدہ ہیں

ہاں اگر ساقی دیو پیکر ہو تو البتہ یہ خدمت انجام دے سکتا ہے۔

کوئی قطرہ بھی خم سے ڈھال سکے اذن کا ممکن — یہ میخانہ ہے ساقی کا یہاں کیا اختیار اپنا

خم سے صرف ایک قطرہ شراب ڈھالنے کا خیال ذرا مستبعد معلوم ہوتا ہے۔

میں نثار تجھ پہ ہوں ساقیا تجھے مل سکے تو کہیں سے لا — جو پلا دیا تھا الست میں اسی جام سے ہمیں کام ہے

اس شعر میں روز الست کی جگہ پر صرف الست استعمال کیا گیا ہے جو محل نظر ہے۔ اس کے علاوہ مشترگہ کا اعیب بھی موجود ہے۔ دوسرے مصرع میں ہمیں کی جگہ پر مجھے ہونا چاہئے تھا مگر غزل کی ردیف "سے ہمیں کام ہے" واقع ہوئی ہے۔ اس لئے شاعر کو مجبوری ہوئی پہلے مصرع میں ترمیم ہو سکتی ہے۔

غضب نگاہ نے ساقی کی بندوبست کیا — شراب بعد کو دی پہلے سب کو مست کیا

کتنا پر کیف شعر ہے۔ لیکن اس میں بھی تنقید کی گنجائش ہے۔ پہلے مصرع میں نگاہ ساقی فاعل ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ دوسرے میں فاعل کون ہے۔ ساقی یا اسکی نگاہ؟ اگر یہاں بھی نگاہ ساقی فاعل ہے تو شراب دینے کا مفہوم مہمل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ شراب سے یہی مادی شراب یعنی بادہ انگوری مراد ہے اور ظاہر ہے کہ نگاہ سے شراب انگوری کی تراوش نہیں ہو سکتی۔ تاہم اگر خوب نگاہ ساقی سب کو مست کر چکی تو یہ فکرا "شراب بعد کو دی" بیکار ہو جاتا ہے کیونکہ جس چیز نے سب کو پہلے مست کیا وہی چیز شراب کہی جا سکتی ہے۔ اگر دوسرے مصرع میں ساقی کو فاعل قرار دیا جائے تو بھی شعر میں نحوی اشکال رہ جاتے ہیں۔ نگاہ اور ساقی یہ دونوں الفاظ بہ حالت مضاف و مضاف الیہ واقع ہیں۔ نگاہ مضاف ہے اور ساقی مضاف الیہ۔ پہلے مصرع میں مضاف فاعل ہے۔ دوسرے مصرع میں مضاف الیہ کو فاعل قرار دینے میں نحوی قباحت ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود شعر اس قدر پر کیف ہے کہ نقص کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا۔

شعرا کے کلام سے استفادہ

ایک دن قیس مرحوم نے شاد مرحوم سے آتش کے کلام کے متعلق استفسار کیا۔ فرمایا کہ آتش کے کلام کا جو تھائی حصہ قابل اعتنا ہے اور بقیہ حصہ کوڑے میں پھینک دینے کے لائق ہے۔ میر کے کلام کے متعلق بھی یہی رائے ظاہر فرمائی۔ درد کے تصوف کی بہت تعریف کی۔ میں نے غالب کے متعلق سوال کیا تو فرمایا کہ غالب کے کلام میں ما ہموار ی ہے اور انداز بیان پسندیدہ نہیں۔ میں نے پھر پوچھا کہ خیالات کیسے ہیں تو فرمایا کہ ہاں خیالات اچھے ہیں۔ داغ کے خیالات کو عامیانہ و سوقیانہ قرار دیا مگر زبان کی تحسین کی۔ امیر کے متعلق فرمایا کہ جہاں تک ان کے پہلے دیوان (مرآۃ الغیب) کا تعلق ہے۔ انکا کلام بیشتر پسندیدہ ہے مگر دوسرا دیوان (صنم خانۂ عشق) بالکل داغ کے رنگ میں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ شاد مرحوم میر، درد اور آتش کے کلام کے بہت مداح تھے۔ اس سے ان کے مذاق کی سلامت روی کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن یہ امر یقیناً قابل افسوس ہے کہ وہ غالب کے محاسن کلام اور رتبۂ شاعری کے گویا منکر تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ شاد مرحوم نے کن کن شعرا کے کلام سے استفادہ فرمایا؟ یہ سوال بہت اہم ہے اور اگر اس کے جواب میں قلم اٹھایا جائے تو ایک طویل مضمون مرتب ہو جائے۔ اختصار کے ساتھ اس سلسلہ میں کچھ عرض کرتا ہوں۔

میں کہہ چکا ہوں کہ شاد کا ذوق سخن بہت بلند واقع ہوا تھا۔ انھوں نے صرف انہیں شعرا کے کلام سے استفادہ کیا۔ جن کا مذاق شاعری ان سے ملتا جلتا تھا۔ علی الخصوص میر، درد اور آتش کے کلام کو انھوں نے پیش نظر رکھا۔ شاد کی طبیعت سوز و گداز کا

آتش کدہ ادرمان کا دل درد و حسرت کا مخزن تھا۔ یہ زمانہ سالی، تنگدستی، زمانہ کی قدر ناشناسی اور گوناگوں مصائب نے اس وصف کو اور نمایاں کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شاد کے بہت سے اشعار میں میر کے رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس عنوان کے اشعار آگے چل کر پیش کرونگا۔ یہاں پر نمونہ کے طور پر صرف تین اشعار درج کرتا ہوں۔

میر۔ کرے گیا کہ انسان مجبور ہے — زمیں سخت ہے آسماں دور ہے
شاد۔ ستم ہے آدمی کے واسطے مجبور ہو جانا — زمیں کا سخت ہو جانا فلک کا دور ہو جانا

میر۔ اتنی سی ہستی پہ اللہ مصیبت یہ ہے — موت کی قید لگا دی ہے غنیمت یہ ہے
شاد۔ اپنی ہستی کو غم و درد و مصیبت سمجھو — موت کی قید لگا دی ہے غنیمت سمجھو

میر۔ ناصح تو خبر کیا ہے لذت سے غم دل کی — ہے ہوئے بطرف اس کے چھکے تو مزا جانے
شاد۔ مزا مل جائے کاہے کے تجھ کو — کسی ظالم پہ ناصح تو بھی مر دیکھ

دوسرا شعر میر کے دیوان میں مجھے نہیں ملا۔ اول اول میں نے اس شعر کو ثاقب عظیم آبادی سے ۱۹۱۰ء میں سنا تو میرا خیال ہوا کہ شاد کے کسی مخالف نے سرقہ کا الزام قائم کرنے کے لئے یہ شعر تراشا ہے۔ مگر مجھے سخت حیرت ہوئی جب ۱۹۳۰ء میں اسی شعر کو آب سید امداد امام صاحب اثر عظیم آبادی سے میں نے گیا میں سنا۔ میں نے مرحوم سے کہا بھی کہ یہ شعر میر کے متداول دیوانوں میں نہیں ملتا تو فرمانے لگے کہ میرے پاس جو نسخہ ہے اس میں یہ شعر موجود ہے۔ مرحوم اس شعر کو پڑھ کر اسکی کیفیات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بے اختیار رونے لگے۔ اس صحبت میں حضرت رسا ہمدانی بھی موجود تھے بلکہ انہیں کے دولتکدہ پر یہ واقعہ ہوا تھا۔

جہاں تک حقائق و تعارف کا تعلق ہے شاد کا بیشتر کلام خواجہ میر درد کے رنگ کی جھلکیاں دکھاتا ہے لیکن صوری حیثیت سے نہیں بلکہ معنوی حیثیت سے کیونکہ شاد کا انداز بیان درد کے انداز بیان سے الگ ہے۔

لیکن درحقیقت حضرت شاد مرحوم آتش کے رنگ سخن سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں کیونکہ بہت سے شعروں میں آتش کے رنگ سخن کا اثر پایا جاتا ہے۔ چند مثالوں سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی۔

آتش۔ مہتاب ہے کمال ہمارا دل حزیں — مہماں سرائے جسم کا ہوگا روانہ کیا
شاد۔ مہماں سرائے تن میں بہت دل ہے بیقرار — شاید عدم کو اب یہ مسافر روانہ ہو

آتش۔ دل کے آئینہ میں ہے طوطی صورت نہاں — درد و دیوار سے ہو صورت جاناں پیدا
شاد۔ غبار آئینہ دل کا صاف ہو تو پھر — انہی کی شکل نمایاں ہے جدھر دیکھو

آتش۔ باغ جہاں میں گل کی قناعت ہے جائے رشک — عمر دو روزہ ایک تماشا ہے تمام کی
شاد۔ تمام عمر رہا تن پہ ایک پیرہن — گلوں نے عمر بسر کی ہے کس قناعت کی

آتش۔ مردوں کی قناعتوں پہ ہو رشک — پہلے رہے اگ کفن ہمیشہ
شاد۔ ساقی زلال و درد جو توفیق ہو سوا — مستوں کو تیرے ہوش کہاں امتیاز کا

آتش۔ شراب خام میں بھر دی کہ زہر ساقی نے — کسے دماغ ہے اتنا کہ امتیاز کرے
شاد۔ خراب مٹی نہ ہو کسی کی کوئی نہ مردود دوستاں ہو — جدا ہوا شاخ سے جو پتہ غبار خاطر ہوا چمن کا

آتش۔ کسی پتہ کے لب پر بھی اگر نام خزاں آیا — نکالا باغباں نے اسکو روئے گلبن کر کے
شاد۔ نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھ کو — کوئی آئینہ خانہ کا رخانہ ہے خدائی کا

آتش۔ عبث پھر دیکھوئی شکلیں نئے نقشے نیا جلوہ — یہ دنیا بھی ہے اک گوشہ ترے آئینہ خانے کا
شاد۔ نکل اے جان تن سے تا وصال یار حاصل ہو — چمن کی سیر ہے انجام بلبل کی رہائی کا

آتش۔ نکلنا شرط ہے اس دام سے اے مرغ جاں تیرا — بیک پرواز تو ہی تو ہے اور گوشہ گلستاں کا

آتش۔ بولی یہ روح پھنک کے پشتارہ جسم کا — بھاری ہے بوجھ کون یہ بیگار لے چلے
شاد۔ کہاں پھینکا ہے لاکر روح نے اس جسم خاکی کو — یہی ہوتا ہے طاقت سے زیادہ بوجھ ڈھونے میں
آتش۔ مجھ رند کو حلال ہے گو مے حرام ہو — پیر مغاں کا حکم ہے اس میں جواز کا
شاد۔ پیر مغاں کے منہ سے دیکھ چکے ہو واعظو — تم نہ پیو جو تے تو خیر حکم تو دو جواز کا
آتش۔ تلاش یار میں کیا ڈھونڈھنے کسی کا تھا — ہمارا سایہ یہیں ناگوار راہ میں ہے
شاد۔ بسہ خاکی کے تعلق نے گرانبار کیا — کاش میں راہ میں تیری تن تنہا ہوتا
آتش۔ خبر اول و آخر نہیں مطلق آتش — نہ تو آغاز ہے معلوم نہ انجام اپنا
شاد۔ سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی — نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

مولانا عبدالسلام ندوی شعر الہند میں فرماتے ہیں کہ شاد نے کہیں کہیں غالب و مومن کی بھی پیروی کی۔ میں اس رائے کا ہمنوا نہیں ہو سکتا اور میں کیا شاید کوئی بھی اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ غالب و مومن کے مخصوص خیالات و جذبات اور اسلوب بیان و طرز ادا کی جھلک شاد کے کلام میں مطلق نظر نہیں آتی۔ دو چار شعروں میں اگر اشتراک خیال اور ہلکا رنگ تغافل سے پایا بھی جائے تو یہ اس بات کی محکم دلیل نہیں ہو سکتی کہ شاد نے غالب کا تتبع کیا۔ بہرکیف تلاش و تفحص سے مجھے چند اشعار شاد کے دیوان میں ایسے ملے ہیں جو غالب کے اشعار سے ماخوذ ہیں مگر اسلوب ادا جداگانہ ہے۔

غالب۔ زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
شاد۔ زیست کا حوصلہ نہ ہو مرگ کا آسرا نہ ہو — اس کی نہ پوچھ اے جو جس کا کوئی خدا نہ ہو
غالب۔ ہر آدمی بجائے خود اک محشر خیال — ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
شاد۔ اے بزم خیال تیری کیا بات ہے ہمدم — خلوت ہیں ہے انجمن ہمیشہ
غالب۔ تشنہ لب پر ساحل دریا ز غیرت جاں دہم — گر بہ موج افتد نشان چین پیشانی مرا
شاد۔ خوش ہیں گر تشنہ لبی نے یونہی مارا ہم کو — چین ابرو نہیں دریا کی گوارا ہم کو
غالب۔ لب تشنہ مرنا احسان سے بہتر — تکتا رہا منہ دریا ہمارا
غالب۔ کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر — پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے
شاد۔ شب آخر ہو دراغ نخچیں کو دیکھ اور خوش ہو اے بلبل — ترے نالوں سے کمبختوں کی چھاتی پھٹی جاتی ہے
غالب۔ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی
شاد۔ اہل ہوس بھی ہو گئے آکے حریف میکدہ — پیر مغاں الٹ دے خم بند شراب خانہ کر

اسی سلسلہ میں چار اشعار ایسے بھی سن لیجئے جن پر مومن کے رنگ کا شبہہ ہو سکتا ہے ؎

موت تھی غیر کی سچ ہے مرا مرنا کیا چیز — آج گیسو ترے شانوں پہ پریشان نہیں
کہاں نصیب کا گھر آپ کا گماں دیدار — برا ہو شوق کا کمبخت سب گوا تا ہے
خدو کے دل کی گرہ لگ ادا میں کھول گئے — وہ کیا چھپاتے ہیں ہم اک نظر میں تول گئے
پس از معشوق مرنا عشق کو بدنام کرنا ہے — خدا بخشوں کو بخشے مر گیا اور ہم کو مرنا ہے

شاد اور حافظ

بعض تلامذۂ شاد کا خیال ہے کہ شاد کا کلام ایک ایسا چشمہ ہے جس کی سوتیں "آب رکنا باد" سے ملی ہوئی ہیں یعنی شاد کا رنگ سخن حافظ شیرازی کے رنگ سخن کے مماثل ہے۔ خود شاد مرحوم کا بھی ایسا ہی خیال تھا چنانچہ فرماتے ہیں ؎

کہتے ہیں شعر کہتے بزم پہ کھل جائے گا — شاد آیا نہ کہو حافظ شیراز آیا
شعروں میں اے شاد یہ بلاغت — تم حافظ وقت ہو تم بااللہ!

یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے اسکی تصدیق یا تردید کیلئے فلسفۂ حافظ کی تشریح ضروری ہے اور میرے خیال میں فلسفۂ حافظ کی تشریح اردو زبان کے سب سے بڑے نقاد علامہ شبلی سے بہتر کسی نے نہیں کی اس لئے علامۂ موصوف ہی کی تحریر اس سلسلہ میں درج کر دیتا ہوں جو بہت اہم اور دلچسپ بھی ہے - وہ فرماتے ہیں :-

"خواجہ صاحب پر رندی اور سرمستی کا جذبہ غالب تھا - ان کے تمام کلام میں یہ جذبہ اسی جوش اور زور کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ فارسی شاعری کی ہزار سالہ زندگی میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی - اس کا اندازہ کرنے کے لئے پہلے ایک رند سرمست کی حالت کا تصور باندھو کہ جب وہ مستی کے جوش و خروش میں ہوتا ہے تو اس کے دل میں کیا کیا خیالات آتے ہیں وہ مزے میں آکر پکارتا ہے کہ مجھکو تمام دنیا کی کچھ پروا نہیں ساقی پیالہ پر پیالہ دئے جا اور کسی سے نہ ڈر - زاہد کیا جانتا ہے کہ جام میں کیا کیا گوناگوں عالم نظر آتے ہیں مطرب سے کہدو یہ ترانہ گائے کہ تمام دنیا پر میری حکومت ہے کل خاک میں جانا ہی ہے آج کیوں نہ عالم میں غلغلہ ڈال دوں - تم مجھے حقیر سمجھتے ہو شراب خانہ میں آؤ تو تم کو نظر آئے کہ میری کیا شان ہے میرے ہاتھ میں جو پیالہ ہے جمشید کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا میں شیشہ اب آج سے نہیں پیتا - مدت سے آسمان اس غلغلے سے گونج رہا ہے صوفی اور واعظ رازدانی کی شیخیاں بگھارتے ہیں عالانکہ جو کچھ کہتے ہیں مجھی سے سن لیتا تھا - یہ عالم لطف اٹھانے کے لئے کافی نہیں آؤ آسمان کی چھت توڑ کر ایک اور نیا عالم بنائیں"

پھر فرماتے ہیں :-

"یہ فلسفہ خواجہ صاحب پر اس قدر چھا گیا تھا کہ بوریائے فقر ان کو سریر جمشید نظر آتا تھا وہ خود اس خیال میں مست تھے اور چاہتے تھے کہ اور لوگ بھی اس عالم کا لطف اٹھائیں - وہ مناظر قدرت سے بہار سے آب رواں سے سبزہ و مرغزار سے لطف اٹھاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ خوش عیشی کا یہ عالم ہر شخص کو نصیب ہو سکتا ہے اس بنا پر وہ تمام دنیا کو خوش عیشی کے فلسفہ کی تعلیم دیتے ہیں - یونان میں اپیکیورس کی بھی یہی تعلیم تھی لیکن وہ فلسفی تھا اسلئے جو کچھ کہتا تھا فلسفہ کے انداز میں کہتا تھا خواجہ صاحب شاعر تھے اور فطری شاعر تھے اس لئے انھوں نے خوش عیشی کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ زمین سے آسمان تک جوش مسرت سے لہریں نظر آتا ہے اور یہی شاعری کا اصلی کمال ہے"

شاد مرحوم بھی بادہ و ساغر کے متوالے نظر آتے ہیں چنانچہ انکی کوئی غزل بادہ و ساغر کے مضامین سے خالی نہیں لیکن بایں ہمہ خواجہ شیرازی کا مذکورہ بالا فلسفہ ان کے کلام میں نظر نہیں آتا اور اگر ہے بھی تو اسی قدر جتنا آٹے میں نمک - چنانچہ صرف دو غزلیں ہیں جن کے کچھ اشعار میں فلسفۂ خوش عیشی کی جھلک نظر آتی ہے - ملاحظہ ہو :-

رند و مئے و عیش یہ میری صلاح ہے — ڈھالو پیو پلاؤ اسی میں فلاح ہے
واعظ بہشت و بزم حسیناں کو ایا جاں — تیرا لغت وہ ہے یہ مری اصطلاح ہے
کہدو یہ مفتیوں سے کہ نیت پہ ہے مدار — تم کو جو مے حرام ہے ہم کو مباح ہے

ڈھال ساقی کہ زمانہ کی یہ عادت معلوم — بعد کو فرصت تحصیل سعادت معلوم
چھیڑ مطرب کوئی ساز ایسے میں شب باقی ہے — اتنی فرصت ہے بہت پھر تو نہ فرصت معلوم
بزم ساقی کے نثار اسکی کہانی دہراؤ — قصہ کوثر و طوبیٰ نہ جنت معلوم

توقف نہ کر جام بھرنے میں ساقی — کہ پیمانۂ عمر پیماں گسل ہے

ممکن ہے کہ مزید تلاش و جستجو سے کچھ اور ایسے اشعار دستیاب ہوں جن میں فلسفۂ خوش عیشی کی تلقین ہو - لیکن حافظ کے کلام میں اس فلسفہ کا جیسا بلند مرتبع نظر آتا ہے اس مرتبع کی ایک بھی رنگین و دلآویز تصویر کلام شاد میں نظر نہیں آتی -

تاہم خواجہ حافظ کے کلام کا ایک حصہ تصوف کے حقائق و معارف اور اخلاق کے رموز و نکات کا بھی حامل ہے - اور جہاں تک

تغزل کے اس شعبہ کا تعلق ہی میرے خیال میں شاد نے حافظ کی پیروی یقینی کی ہے - شاد نے حافظ کی طرح بادہ و ساغر ہی کے پردے میں بہت سے بلند خیالات کی ترجمانی کی ہے اور میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ شاد نے اردو زبان کی شاعری میں خیالات و جذبات کا ایک معتدبہ اضافہ کیا ہے - انھوں نے اپنی اسی رنگ کی شاعری کے متعلق کیا خوب کہا ہے ؎

نہ آئینہ کا قصہ اور نہ حال شانہ کہتے ہیں
حقیقت میں جمال یار کا افسانہ کہتے ہیں

حافظ کی طرح شاد نے بھی غزل کو یہ وسعت دی کہ فلسفہ، تصوف، اخلاق، سیاست، موعظت، ہر قسم کے خیالات ادا کئے لیکن غزل کی لطافت میں فرق نہ آنے دیا - مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں: -

(۱) وحدت الوجود کے رو سے حسن حقیقت کا پرتو تمام کائنات پر ہے - ایک عارف جس کا دل عشق و محبت سے لبریز اور عرفان و حقیقت سے معمور ہے - جہاں یہ جلوہ دیکھتا ہے بیخود ہو جاتا ہے اور اسے اصل و فرع اور حقیقت و مجاز کی تمیز نہیں رہتی - دیکھئے اس وسیع مضمون کو غزل کے رنگ میں کس اہتمام کے ساتھ بیان کیا ہے ؎

وہ عالمگیر جلوہ اور وہ حسن مشترک تیرا
خدا جانے ان آنکھوں کو ہوا کس کس پہ شک تیرا

اسی خیال کو دوسرے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے ؎

ہر شئے میں تجھے دیکھ کے ہو جاتے ہیں بیخود
دیوانوں کا تیرے خفقان اور ہی کچھ ہے

(۲) علمائے ظاہر احکام شریعت کے محض ظاہری خط و خال کے پابند ہیں لیکن عارفین و ارباب باطن کا مرتبہ اس سے کہیں بالاتر ہے اور جب تک تائید ایزدی نہ ہو عرفا بھی اس بارگراں کے متحمل نہیں ہو سکتے - اس فلسفہ کو حافظ کے انداز میں کس خوبی سے نظم کیا ہے ؎

بار سبو ہی اٹھائے جس پہ ہو منت مے فروش
زاہد خشک یہ بھی کیا بوجھ ہے جانماز کا

اسی بنا پر حقیقۃً علمائے ظاہر دنیا پرست ہیں اور عرفا فردوس ہر کے عشوہ و غمزہ کے پھندے میں نہیں آسکتے ؎

آئے اگر وہ دہر بھول کے میکدہ میں آج
کہدو یہ صومعہ نہیں زاہد پاکباز کا

(۳) خدا نے ظلمت کدۂ عالم میں ایک ایسی ہستی (نبی آخرالزماں صلعم) پیدا کی جس کا اسوۂ حسنہ تمام کائنات کے لئے آئینۂ عمل ہے اور ایک ایسی کتاب (قرآن پاک) نازل کی جو ہر شعبۂ زندگی کے لئے دلیل راہ ہے - لیکن اس پر بھی مسلمانوں میں عمل صالح کا فقدان ہے - اس وسیع مضمون کو تغزل کے رنگ میں کس خوبی سے نظم کیا ہے ؎

لیکے خود پیر مغاں ہاتھ میں مینا آیا
میکشو شرم کہ اس پر بھی نہ پینا آیا

(۴) عرب کی حکومت میں وقتاً فوقتاً تغیر و انقلاب ہونے سے خانۂ کعبہ مختلف حکومتوں کے قبضہ میں رہا کیا اور ہر انقلاب کے بعد حجاج کو گوناگوں مشکلات کا سامنا ہوا - اس خیال کو شاد نے تغزل کے پیرایہ میں کس دلکشی کے ساتھ ادا کیا ہے سبحان اللہ ؎

حرفیوں نے بٹھا رکھے ہیں بدخو پاسباں در پر
یہ نوبت تیرے میخانے کی اے پیر مغاں پہونچی

(۵) حرام و حلال کا مسئلہ فقہ کا ایک خشک مسئلہ ہے لیکن شاد کے فلسفیانہ ذہن نے اسے نہایت دلکش پیرایہ میں پیش کیا ہے ؎

میں ندائے ساقی مہ لقا یہی میکشی کا ہے مسئلہ
وہی حکم دے تو حلال ہو وہی روکدے تو حرام ہے

ایسے ایسے اشعار نوادر ادب میں شمار ہونے کے لائق ہیں اور اردو زبان ان اشعار پر ایک عرصۂ مدید تک ناز کریگی -

اگر میں اسی طرح مختلف اشعار کے مفہوم کی تشریح اور ان کے محاسن کی تنقیح کرتا جاؤں تو ایک دفتر تیار ہو جائے - لیکن اتنی زحمت کہاں تک گوارا کی جائے اور کس کے لئے ؟ کتنے لوگ ہیں جو اس تنقید کو دلچسپی سے پڑھیں گے ؟ بیشتر حضرات تو اس کے مطالعہ کی زحمت بھی گوارا نہ کریں گے - علم و ادب کے فقدان کا ماتم !!! اس کے سوا ندیم کے صفحات میں زیادہ گنجائش بھی نہیں - اس لئے اب اختصار کے ساتھ مختلف عنوانوں کے کچھ اشعار درج کرنے پر اکتفا کرتا ہوں -

فلسفہ شاد نے اپنی غزلوں میں فلسفیانہ خیالات کا ایک انبار لگا دیا ہے - میں صرف وہی اشعار درج کرونگا جو دائرۂ تغزل سے باہر نہیں ہیں -

"حیرت کدۂ عالم کی ماہیت میں لب کشائی معصیت ہے"

جہاں ہے کتب حیرت سبق ہے چپ رہنا — بڑا گناہ یہاں ہے الف سے بے کہنا

"معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد"

ترے کمال کی حد کب کوئی بشر سمجھا — اسی قدر اُسے حیرت ہے جس قدر سمجھا

دنیا میں کوئی شئے بیکار نہیں

خالی سمجھ کے پھینک نہ اے موج رائگاں — ہر کاسۂ حباب کے اندر خزانہ ہے

تنازع للبقا

یہ بزم مے ہے یہاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی — جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

تماشا خانہ ہے بزم دنیا بڑے کھلاڑی کا سامنا ہے — گرہ سے پونجی گنوائی اس نے یہاں تو راہی جو چال چوکا

مادہ فنا نہیں ہوتا صرف شکل بدل جاتی ہے

لہو شہیدوں کا ہو رائگاں معاذ اللہ! — چمن میں پھول تو پھولوں میں رنگ و بو ہوگا

قطرہ قطرہ دریا می شود

یوں حبابوں کا نہ دل توڑ خدارا اے موج — انہی قطروں کی بدولت تو ہے دریا تیرا

راز کائنات کی گرہ کشائی بیکار ہے

پوچھو نہ حال چشم دلآویز یار کا — کھولو نہ راز گردش لیل و نہار کا

خیر و شر فرضی و اضافی چیزیں ہیں

بظاہر آلودہ سم ہے جس میں بھرا ہے امرت بھی اس نظر میں — جفا کو کیونکر جفا کہیں ہم تمیز مشکل ہے خیر و شر میں

لا تبدیل لخلق اللہ

دہر میں کیا کیا ہوئے ہیں انقلابات عظیم — آسماں بدلا زمیں بدلی نہ بدلی خوئے دوست

انگریز فلسفی جان لاک (John Locke) کا نظریہ ہے کہ ذہن انسانی پیدائش کے وقت ایک صفحۂ سادہ (Tabula Rasa) کے مانند ہوتا ہے انسان فطرت سے کچھ لے کر نہیں پیدا ہوتا بلکہ جو کچھ علم اسے حاصل ہوتا ہے تجربہ و مشاہدہ سے

مدرسۂ وجود میں صفحۂ سادہ بن کے آ — پیر خرد سے لے سبق مسئلۂ شہود کا

اخلاقیات

شاد کی غزلوں میں اخلاقی مسائل بھی بکثرت موجود ہیں اور وہ بھی حدود تغزل کے اندر ہیں اور نہایت دلکش ملاحظہ ہو

"جد و جہد لازمۂ کامیابی ہے"

نہ چھوڑ اے جستجوئے یار خضر شوق سے کہدو — کسی دن خود لگا لیگی پتہ عمر دراز اس کا

دنیا کی بے ثباتی کا احساس

یہاں نہ نشو و نما کا حاصل نہ کوئی ثمرہ ہے رنگ و بو کا — سنو گے خود اس چمن پہ غنچو زمانہ آئے ذرا تم کو

"فرصت کا ایک ایک لمحہ غنیمت ہے اسے برباد نہ کرنا چاہئے"

پکار کر وحشیوں سے کہدو خزاں کا بھی دور ہے غنیمت — قبا کے دامن کو تا تگ تو لیں اگر نہ موقع ملے رفو کا

"حوادث عالم انقلاب زمانہ"

پروں کے ڈھیر ہیں ویراں چمن میں آشیانے ہیں — یونہی ہوتی چلی آئی ہے اس کے کارخانے ہیں

اب اشک میں ترے آتا نہیں لہو اے چشم — تجھی پہ کیا ہے زمانہ کا خوں سپید ہوا

"زمانہ خود غرض واقع ہوا ہے کوئی کسی کا نہیں"

یہ اٹھتی بزم میں ساغر سنا گیا اب کے — کسی کا کوئی نہیں سب ہیں اپنے مطلب کے

"انسانی جوہر کا تقاضا ہے کہ مصائب برداشت کئے جائیں یہی زندگی ہے"

نگہ کی پرچھیاں جو سہ سکے سینا اسی کا ہے — ہمارا آپ کا جینا نہیں جینا اسی کا ہے

تصوف شاد کے بیشتر کلام میں صوفیانہ شان پائی جاتی ہے۔ اور بہت سے ایسے اشعار ہیں جو تصوف کے رموز و نکات سے لبریز ہیں مگر انداز بیان شاعرانہ ہے۔ مثالاً چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

"وحدت الوجود"

نہ دوست اور نہ کسی کا کوئی عدو نکلے — اگر یہ نقش مٹا دیں تو تو ہی تو نکلے

مہک اٹھا چمن دہر کا پتہ پتہ — راز چھپنے نہیں دیتی تری خوشبو تیرا

"کل یوم ھو فی شان"

جوں جوں بڑھا کر یکا تمنا کشوں کا شوق — دوں دوں بدلتی جائیگی اس رخ کی شان بھی

"سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود"

ستارے کی طرح پیشانیاں ان کی چمکتی ہیں — میسر ہے جنہیں سجدہ تمہارے آستانے کا

"تسلیم و رضا، صبر و توکل"

دیکھے تھی سب و مجھے صبر کا حوصلہ دیا! — جس کی طلب تھی ساقیا اس سے کہیں سوا دیا

ہزار تلخ ہے پیر مغاں نے جب دی ہے — خدا نہ کردہ جو میں منہ بنا بنا کے پیوں

طلب کرتے نہیں ساقی سے گو افراط سے ہے — زباں رد کے ہوئے ہیں رنگ محفل دیکھنے والے

ترے مہماں ہیں جہاں ٹھہا سر عرش و روئے زمیں سہی — ہمیں بیٹھ رہنے سے کام ہے کوئی جا نہیں تو نہیں سہی

ترے ظلم کا نہ کروں گلہ کہ تیغ سے بھی اگر گلا — کہوں وصد میں یہی برملا کہ انا لشہید بکربلا

عارف زندگی کو مصیبت سمجھتا ہے کیونکہ یہ باعث فرقت الٰہی ہے

زیست ہے نام تیری فرقت کا — کچھ ٹھکانا ہے اس مصیبت کا

"اور موت کو مژدہ وصال الٰہی جانتا ہے"

صعوبت سہ چکے اے شاد لو اب چین سے کاٹو — مبارک ہو قضا خود دے کے فرمان اماں پہونچی

عارف کے لئے زندگی کے تمام مصائب و آلام یہ منزلہ امتحان ہیں وہ ان تمام تکلیفوں کو خوشی سے برداشت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ نزع کی تکلیف و اذیت کا بھی مردانہ وار سامنا کرتا ہے اور اس کا دل اس امید سے سرشار رہتا ہے کہ یہی آخری امتحان ہے اور اس کے بعد وصل دوام کی لذتیں حاصل ہونگی ؎

آخر ہے عمر ضیق میں دل ہی ہے جان بھی — مردانہ باش ختم ہے یہ امتحان بھی

حسن و عشق شاد کے کلام کا ایک حصہ حسن و عشق کی رنگین تصویروں کا مرقع اور عشق و محبت کے رموز و کوائف کا آئینہ ہے۔ ان کے انداز بیان و طرز ادا میں ایسی شیرینی و دلآویزی ہوتی ہے کہ "شوق کے نظارہ خط و خال کے بیان میں بھی جذبات و کیفیات کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ چند دلکش تصویریں ملاحظہ ہوں ؎

ایک ستم اور لاکھ ادائیں اف ری جوانی ہائے زمانے — ترچھی نگاہیں تنگ قبائیں اف ری جوانی ہائے زمانے

ہجر میں اپنا اودھی عالم ابر بہاراں دیدۂ پرنم — چھٹے پہر اٹھ کے نمازیں ناک رگڑنی سجدوں پہ سجدے — جو نہیں جانتا اسکی دعائیں اف ری جوانی ہائے زمانے

انشاء اللہ آئندہ فرصت میں ان مایۂ ناز شخصیتوں کے کلام کو پیش نظر رکھ کر یہ دکھانے کی کوشش کرونگا کہ شاد کے یہاں مختلف مذاق کا باہمی امتزاج کس قدر حسن کارانہ اور دلفریب ہے۔ آج کی صحبت میں شاد کے اُن زندہ اور سربرآوردہ شاگردوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو دورِ جدید کی صف میں آتے ہیں تاکہ شاد اسکول کے کچھ خصوصیات پر روشنی پڑ سکے۔ سب سے پہلے میں شاد کے مقتدر معاصرین کے بارہ میں لکھنا چاہتا ہوں جو بفضلہٖ تعالیٰ بقید حیات اور مشق سخن فرماتے ہیں۔ اس سے ناظرین کو پتا چل سکے گا کہ آغاز دورِ جدید کے وقت بہار کا مذاقِ سخن کس نوع کا تھا اور کس طرح تدریجاً تبدیلیاں ہوئی ہیں۔

آزاد۔ حاجی حافظ سید فضل حق۔ جناب شاد کے ہم عصر دلی میں سب سے پہلے آپ ہی کا نام آتا ہے۔ آخری بار مجھے آپ کی زیارت شاد منزل کے ایک مشاعرے میں ہوئی تھی جو جناب شاد کے انتقال کے بعد ۷ جنوری ۱۹۲۸ء کو منعقد ہوا تھا۔ آزاد۔ شفق۔ بدر (مرحوم) مبارک۔ امداد۔ بیتاب (مرحوم) اور بہت سے سربرآوردہ شعرا کا مجمع تھا۔ غالباً عظیم آباد میں ان حضرات کا آخری اجتماع تھا جن کے دم سے ادبی صحبتوں کی تہذیب اور رونق باقی ہے۔ میں اس وقت ہائی اسکول کے ایک ابتدائی درجہ میں پڑھتا تھا۔ بزم سخن کا ہر رکن اپنی باوقار شخصیت کے ساتھ رونق افروز تھا لیکن پھر بھی اس بزم کے ایک خاص رکن جناب شاد کی کمی محسوس کیجا رہی تھی۔ جناب آزاد نے اس مطلع میں اسی رکنِ اعظم کی طرف اشارہ بھی کیا تھا

شمع ہے دلگیر میکش جمع ہیں ساغر چلے
دورِ ساغر آج اے ساقی لبِ کوثر چلے

ساقی سے مراد حضرت شاد مرحوم کی ذات مجمع الصفات تھی۔

اس مطلع کے متعلق اخبار اتحاد (پٹنہ) میں عرصہ تک مراسلہ نگاری ہوتی رہی لیکن یہ بحث چونکہ میرے موضوع سے خارج ہے اس لئے اس پر زیادہ روشنی نہیں ڈال سکتا۔ محض عظیم آباد کی ادبی تاریخ کے ایک واقعہ کی حیثیت سے اس کا ذکر میں نے یہاں مناسب سمجھا۔

میں گذشتہ سطروں میں اس امر کی طرف اشارہ کر چکا ہوں کہ شاد و آزاد کا دور وہ دور ہے جو دورِ قدیم اور دورِ جدید کا سنگم سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس دور میں دورِ جدید اور دورِ قدیم کی آمیزش کچھ اس انداز سے پائی جاتی ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ جناب آزاد کا کلام اس خصوصیت سے بری نہیں۔ لیکن مشکل پسندی بہت زیادہ نظر آتی ہے۔ آپ نے نظمیں بھی متعدد لکھی ہیں لیکن چونکہ اس دور میں شعراء نے زیادہ تر غزلوں پر زور دیا ہے، اسلئے اُن کے معیارِ شاعری کا صحیح اندازہ اسی صنف سے ہو سکتا ہے۔ نمونے کے طور پر آپ کی ایک غزل پیش کرتا ہوں۔

نوبہارِ زندگانی موت کا ساماں بھی ہے
درد ہے درماں ہمارا درد بھی درماں بھی ہے

منتظر ہیں دردِ دل حد سے گزر جائے کہیں
مشکلوں کا سامنا مشکل بھی ہے آساں بھی ہے

ہر نفس آئینۂ ماضی ہے پیشِ چشمِ دل
شکلِ مستقبل سے دل ششدر بھی ہے حیراں بھی ہے

جو دلِ دانا ہے اُس کے پیس دینے کے لئے
آسیائے آسمان بھی گردشِ دوراں بھی ہے

چپ رہے آزاد ہم اب تک تو تھے اس سوچ میں
اپنی گردن پر مشیت کا کوئی احساں بھی ہے

مبارک۔ (ڈاکٹر) سید مبارک حسین۔ شاد کے معاصرین میں جناب مبارک کا دم بہت غنیمت ہے۔ داغ کے مقتدر شاگردوں میں ہیں۔ لیکن آپ کا رنگ تغزل داغ کے عام رنگ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ داغ کو تو محض زبان کی صفائی اور سلاست بیان نے معماری شاعر بنا دیا، لیکن مضامین کے لحاظ سے دامن بہت تنگ ہے۔ جناب مبارک نے اس دامن کو وسیع کر دیا اور مضامین نے گہرائی رنگا رنگ سے بھر دیا ہے۔ سب سے پہلے ایک نہایت کیف بار اور رنگ بدیدیں ڈوبا ہوا مطلع سنیئے۔

گھٹا اٹھی ہے کالی اور کالی ہوتی جاتی ہے
صراحی جو بھری جاتی ہے خالی ہوتی جاتی ہے

گہنگی اور قرسودگی سے بچا کر اپنے استاد کے رنگ میں کیا اچھا مطلع کہتے ہیں۔

چتون جو قہر کی ہے تو تیور جلال کے
مطلب یہ ہے کہ رکھ دو کلیجہ نکال کے

اس کا مقطع بھی معنویت اور انداز بیان کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔

یہ دہر غم کدہ ہے مبارک خوشی کہاں، غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کے،

بعض وقت متانت کے دائرے سے بھی باہر آجاتے ہیں لیکن پھر بھی ابتذال سے دور رہتے ہیں۔

عمر کٹی ہے لالہ رخوں میں دیکھی ان کی فصل بہار آج بھی گل سے گالوں والے ہم کو مبارک پیارے ہیں

نمونۂ کلام کے طور پر مختلف اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

ہوائے شوق کے جھونکے سلامت رہو گے تم پس پردہ کہاں تک
نیاز و ناز کے چرچے رہیں گے ہماری اور تمہاری داستاں تک
سودائیان عشق کا سودا ہی اور ہے اس کی ہوا ہے اور یہ صحرا ہی اور ہے
دل ملا ہے خلش خار تمنا کے لئے یہ کھٹکتا ہوا پیکان کہاں جاتا ہے،
خانقاہوں پہ ہوا پیر مغاں کا قبضہ آج مے خانے کا سامان کہاں جاتا ہے،

شفق عمادپوری امیر مینائی کے مشہور شاگردوں میں سے ہیں۔ کلام میں جدت اور اچھوتا پن ہے۔ جام فکر تو وہی پرانا ہے لیکن اس کی شراب بعض وقت شراب نو کا مزا دے جاتی ہے۔ زندگی کے ایک رخ کی کتنی مکمل روداد پیش کرتے ہیں۔

مانند نبض ضعف دل ناتواں سے ہم، اب تک وہیں ہیں چل کے چلے تھے جہاں سے ہم
نالے ہمارے بانگ درا کا جواب ہیں ہیں کارواں میں رہ کے جدا کارواں سے ہم

واقعہ نگاری کے ساتھ ساتھ نفسیاتی واردات کی مکمل تصویر ملاحظہ ہو۔

نہ مرنے ہی کا موقع تھا نہ بس جینے پہ چلتا تھا، لئے تھے سر وہ زانو پر کسی کا دم نکلتا تھا

کیف تغزل ملاحظہ ہو۔

ذرا کہہ دے یہ بسمل ہمارا تماشا دیکھ پھر قاتل ہمارا
اک آہو جو کر دے دل دیوانہ ہمارا دو حرفوں میں بس ختم ہو افسانہ ہمارا

نصیر ۔ مسٹر نصیر الدین حیس بیرسٹر۔ متوطن نگرنہسہ ضلع پٹنہ۔ جناب مبارک کی طرح آپ بھی داغ کے جید شاگرد ہیں۔ کہنہ مشق ہیں اور کلام اپنے دور کی خصوصیات کا حامل۔ افسوس ہے کہ آپ کی غزلیں دستیاب نہ ہو سکیں ورنہ مذاق سخن پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا۔ ایک رباعی ہاتھ آئی وہ درج ذیل ہے

ہاتھوں میں چھلکتا ہوا پیمانہ ہے سر گام پہ اک لغزش مستانہ ہے،
ساقی تری آنکھوں نے عجب کام کیا اک رنگ میں ہے جو ترا دیوانہ ہے،

تمنا عمادی علمی استعداد اچھی ہے۔ کلام کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کاوش سے مضامین پیدا کرتے ہیں، لیکن مشکل پسندی کے سبب سے وہ نور اور وہ کیف مفقود ہے جو اس دور کے اکثر شعراء میں پایا جاتا ہے۔ تازہ ترین افکار میں سے چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں۔

جب سے ملی ہے چشم حقیقت نگر مجھے آتا نہیں کسی کو جو آتا نظر مجھے،
ہاں ہاں بھلا دے ذہن سے اے فتنہ گر مجھے ایسا بھلا کہ یاد رہے عمر بھر مجھے،
کوچہ سہی ترا نہ ملے خشت در مجھے اک دست خم زدہ ہی بہت زیر سر مجھے،
کھویا گیا جو عشق میں جاسوس دہر ہے رہتی ہے خوب بے خبروں کی خبر مجھے

تلامذۂ شاد

دبستانِ شاد کا اولین دور بہار کی ادبی تاریخ میں "دورِ نہضت" ہے جس میں مختلف مذاق کی پرکیف ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور اس وجہ سے یہ دبستان اپنی خاص خصوصیات کا حامل ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں تلامذۂ شاد کے کلام پر اس اسکول کی مختلف خصوصیات کے تحت میں تبصرہ کروں گا۔ میرے انتخاب میں کچھ تلامذۂ شاد تو ایسے ہیں جن کے کلام میں جدت اور قدامت کا باہمی امتزاج ہے اور کچھ ایسے جو قطعی طور پر رنگ جدید کے دلدادہ ہیں۔

امداد ۔ سید عنایت حسین ۔ انگلستان کا مایۂ ناز شاعر شیلی (Shelley) اپنی زندۂ جاوید نظم (Sky Lark) میں یوں رقمطراز ہے۔

Our truest songs are those that tell of sadest thonghts.

(ہمارے سچے نغمات وہی ہیں جو الم ناک خیال ظاہر کرتے ہیں) اس کا ثبوت ملٹن (Milton) کی دونوں نظموں Allegro اور Il pensoroso کے یک وقت پڑھنے سے ملتا ہے۔ حقیقتہً ہماری زندگی کا نشاطیہ پہلو اتنا اثر انگیز نہیں ہوتا جتنا حزنیہ پہلو جناب امداد کی شاعری میں حزن ملال کا عنصر بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے اُن کے درد و اثر میں ڈوبے ہوئے الفاظ صفحۂ دل پر جلد منقوش ہوجاتے ہیں۔ جناب حمید حضرت شاد کے رنگ شاعری کے متعلق لکھتے ہیں "شاد مرحوم اگرچہ میخانۂ درد کے جرعہ نوش اور اسی خانقاہ کے مجاوروں میں سے تھے لیکن بظاہر اُن کی شاعری میر کے بادۂ پرکیف سے زیادہ سرشار نظر آتی ہے اور ان کا سر اسی شاہِ سخن کے آستانہ کی طرف جھکا دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا سلیمان (ندوی) نے لکھا ہے کہ غزل گوئی کے لحاظ سے شاد میں میر کے انداز پائے جاتے ہیں" (ندیم بہار نمبر ۱۹۳۳ء صفحہ ۲۰) جناب امداد کو چونکہ اپنے استاد کی صحبتِ بابرکت سے زیادہ فیض اٹھانے کا موقع ملا ہے اس لئے دبستانِ شاد کی یہ خصوصیت اُن کے کلام میں نمایاں ہے۔ ؎

بڑھی کچھ اور بھی وحشت نکل کے صحرا سے، جنوں نے کر دیا برباد لا کے بستی میں،
اسیرِ ظلم مٹے، پر خبر نہ ایک نے بھی نہ اہلِ دل تھا کوئی کیا جہاں کی بستی میں،
ہمیشہ بادِ مخالف نے کی دراندازی اگر نمو مرے گلہائے آرزو نے کیا،

جہاں شاعری کی اور اور قسمیں ہیں وہاں ایک قسم "اخلاقی شاعری" بھی ہے جو تعمیری (Constructive) شاعری کے تحت میں آتی ہے۔ مغربی ادب میں اس قسم کی شاعری کی مثال اعلیٰ کے مایۂ ناز شاعر ڈانٹے (Dante) کی Comedy Perine میں ملتی ہے ایشیا میں اس قسم کی شاعری کے لئے حضرت سعدی کا نام مشہور ہے۔ دنیائے شعر میں اخلاق کی تعلیم نظموں میں بہ آسانی ہوسکتی ہے۔ جناب امداد کا کمال یہ ہے کہ بہ تقلید حضرت شاد اخلاق کی تعلیم غزلوں کے اشعار سے دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہاں پر ہرگز یہ نہیں کہ اوروں نے ایسا نہیں کیا ہے۔ مطلب صرف اسی قدر ہے کہ جناب امداد کے کلام میں یہ چیز خصوصیت سے اور بہت سادہ انداز میں پائی جاتی ہے۔ ؎

اسیرِ ظلم مٹے، پر خبر نہ ایک نے بھی نہ اہلِ دل تھا کوئی کیا جہاں کی بستی میں

کون کہہ سکتا ہے کہ مذکور الصدر شعر اخلاقی تعلیم کے ساتھ ساتھ آئے دن کے واقعات پر جامع تبصرہ نہیں؟ اور اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

ادب ضرور ہے ساقی سے جام لینے میں سبو کو شیخ نے توڑا دراز دستی میں
یہ خاک کہتی ہے اُس کی گلی کی اُڑ اُڑ کر نہاں ہے رازِ بلندی ہماری پستی میں
ضرورت جتنی ہی پی اتنی ہی اس بادہ خانے میں ہلاکت کا سبب ہے کاہے انداز ہو جانا

تصوف۔ فلسفۂ الٰہیات و معرفت کا عنصر بہت غالب ہے۔ جناب جگر مرادآبادی کی پوری غزل جس کا ایک مطلع یہ ہے ؎

باندھ کے ہاتھ خدمتِ خالقِ سوز و ساز میں، پڑھ دل مضطرب غزل خاص زبانِ راز میں

میرے دعویٰ کی تائید کو کافی ہے۔ جناب امداد نے بھی اس رنگ میں خامہ فرسائی کی ہے اور اس انداز کو بڑے مزے میں نباہا ہے۔ چنانچہ مندرجۂ بالا اشعار میں سے بعض علاوہ اخلاقی تعلیم کے ان مسائل کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ عارفانہ شاعری جناب امداد کا مذہب بھی وہی ہے جو مولانا روم اور ملا محمود صاحب "گلشن راز" کا تھا۔

ہوئے حجاب بیچ میں ہم ہوں وہ مست ناز ہو — عشق کی بارگاہ میں خم جو سرِ نیاز ہو
حیرتیِ جمالِ ہو بندۂ حسن و ناز ہو — عشق میں خود غرض نہ ہو ایسا تو باکباز ہو
لب پہ ہو مہر خامشی آنکھوں سے اشک ہو رواں — جذبۂ مدعائے دل رد و کشش کشفِ راز ہو
سجدۂ شوق پاک ہو شرکِ خیالِ غیر سے — کعبۂ عشق ہی مرا قبلۂ جا نماز ہو

واقعۂ کربلا کی عظمت اور اہمیت سے کون صاحبِ دل انکار کر سکتا ہے۔ جس طرح یہ سانحۂ عظیم ہمارے اور شعبۂ زندگی پر اثر انداز ہے۔ اسی طرح ہمارا ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مولانا روم فرماتے ہیں۔

اے دل بگیر دامنِ سلطانِ اولیا — یعنی حسین ابن علی جانِ اولیا

جناب شاد کا بھی یہی مسلک رہا اور آج دنیائے شاد کے جس رنگ شاعری کی معترف ہے وہ علاوہ اور خصوصیات کے زیادہ تر اسی سانحۂ عظیم کے گہرے فلسفیانہ، عارفانہ اور کارآمد نتائج کا رہینِ منت ہے۔ جہاں فلسفہ اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں، وہاں صاف لفظوں میں فرماتے ہیں۔

مورد آفاتِ رہ ظلم کا تابع نہ بن، — بھول نہ بھولے سے بھی واقعۂ کربلا

جناب امداد کی شاعری بھی اسی سے متاثر نظر آتی ہے۔

محو جمال یوں رہوں قتل بھی کوئی کر کرے — حلق پہ کب چھری پھری یہ بھی نہ امتیاز ہو
کٹا کر سر بنایا سرفروشانِ محبت نے — وفادار و ہنر ہے وقت پر جانباز ہو جانا

جس طرح ہر حقیقی شاعر کا ایک رنگ خاص ہوتا ہے اسی طرح جناب امداد کا بھی ایک رنگ ہے جس میں موجودہ دور میں ان کا ایک بھی حریف نظر نہیں آتا۔

تمام ہوتی نہ کیوں عمر مے پرستی میں — تھی خیر دونوں جہاں کی ہماری مستی میں
ادب ضرور ہے ساقی سے جام لینے میں — سبو کو شیخ نے توڑا دراز دستی میں
کوچۂ مے فروش کا میں بھی ہوں کہنہ مے گسار — اتنی مگر مجھے ہے قید بادہ خانہ ساز ہو
ہے وہ سبق مرے لئے جو ہے حدیثِ خاصِ دوست — صدق کا اس پہ ہو لقب جو بھی رقم طراز ہو
مزاجِ شمع کو امداد پروانے سمجھتے ہیں، — بہت مشکل تھا اور نہ سوز سے دمساز ہو جانا

نہال۔ (نواب) سید صادق حسین۔ حضرت شاد کے حقیقی بھانجے اور ادیب الملک نواب خیال مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ "دبستانِ شاد" جہانِ معنی آفرینی میں بہت ارفع ہے وہاں صفائی زبان کے لحاظ سے بھی ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے اس خصوص میں جناب نہال کا کلام بہت بلند ہے۔ فیس مرحوم آپ کے متعلق لکھتے ہیں۔ "کلام میں رنگینی، جذباتِ لطیف اور محاورے کا بہت خیال رہتا ہے۔ زبان نہایت شستہ و صاف، ترکیب بندش اور فکر رسا کہنہ مشقی کا پتا دیتی ہے۔ جدت تخیل اور طرز ادا آپ کا خاص حصہ ہے۔ اساتذہ میں حضرت آتش کے کلام کے دلدادہ ہیں اور اس کا تتبع اپنے لئے لازمی سمجھتے ہیں۔ نیچرل نظمیں اور نثر بھی اعلیٰ درجہ کی لکھتے ہیں۔" (گلشنِ حیات صفحہ ۱۳۵)

اردو غزل گوئی کا ایک دور یہ بھی رہا ہے کہ صفائی زبان (جو دنیائے شعر کا ایک خارجی پہلو ہے) کے لئے مضامین کا خون ہوا کیا، شعراء نے طبع آزمائی کے لئے مشکل سے مشکل زمین پسند کی اور خیالات کو نظر انداز کر کے اسی میں زبان کے جوہر دکھائے۔ جو طبیعتیں "نابغہ"

(Qevins) تھیں اُنہوں نے بعض وقت انہیں سنگلاخ زمینوں میں ایسے اشعار کہہ ڈالے جو اپنی مثال آپ ہیں۔ آتش کا ایک شعر ہے۔

امانت کی طرح رکھا میں نے روزِ محشر تک — نہ اک مُو کم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا!

جناب نہال کی شاعری کا امتیازی رنگ جیسا کہ اوپر درج ہوا، صفائی زبان کا لحاظ ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مضامین کے لحاظ سے آپ کا دامن تنگ ہے۔ آتش کی طرح آپ نے بھی خود کو مضامین کی پستی اور خیالات کی بے راہ روی سے قطعی طور بچایا ہے جیسا کہ ذیل کے اشعار سے معلوم ہوگا۔ صفائی زبان کے ساتھ ساتھ تغزل کا کیسا شگفتہ رنگ ہے۔

فلک کو پہلے سلیقے ستم کے یاد نہ تھے — یہ سب جناب کے انداز ہیں سکھائے ہوئے

نہ توڑ دل کسی بدمست رند کا ساقی — کہ پھر نہ جائیں گے شیشے دکان لئے ہوئے

نقادانِ علم و فن کے خیال میں تخیل کی سرمستی اور محاکات کی بلندی شعر کے قیمتی جوہر ہیں۔ یہ چیزیں بھی جناب نہال کے کلام میں جدت اور کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر صرف تین اشعار لکھتا ہوں۔

نجد کا ایک بگولا اے نہال! — قیس کی آنکھوں میں محمل ہو گیا

سوتے میں آپڑی ہیں لٹیں رُوئے یار پر، — مستی ہے چاندنی مہ کامل گہن میں ہے

نیچرل (Natural) نظموں میں آپ کی ایک نظم "کوئل" دنیائے ادب میں ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ افسوس ہے کہ دستیاب نہ ہو سکی ورنہ اس کے اقتباسات ہدیہ ناظرین کئے جاتے۔

حمید سید عبدالحمید۔ اردو غزل گوئی پر جہاں مختلف اعتراضات ہیں وہاں ایک عالمگیر اعتراض یہ بھی ہے کہ اس میں صرف تیر و پیکان۔ خنجر و نشتر۔ سنان و شمشیر۔ قتل و خون۔ ساقی و شراب۔ ناز و غمزہ۔ گیسو و شانہ۔ شمع و پروانہ گل و بلبل۔ قیس و فرہاد۔ شیریں و لیلیٰ۔ طور و موسیٰ۔ دار و منصور کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا، وہ بھی فرسودہ اور کہنہ انداز میں سرزمین بہار میں اس بدعت کو قایم رکھنے والی ایک ذات جناب حمید کی بھی ہے۔ لیکن آپ کے یہاں یہ بدعت اس انداز سے برقرار ہے جو علم جواز رکھتی ہے۔ میں تقلید۔ پیروی۔ اور تتبع کو بُرا نہیں سمجھتا، ہاں لکیر کا فقیر ہو جانا البتہ کسی طرح پر جائز نہیں۔ اگر کہنگی اور فرسودگی سے دامن آلودہ نہیں ہوتا تو اس کا برتنے والا شاعر حقیقۃً تلامیذ الرحمٰن کہے جانے کا مستحق ہے۔

ناقدین کا ایک طبقہ ادب میں روایات کی تبدیلی کا حامی ہے۔ کیونکہ بغیر اس تبدیلی کے مضامین میں تنوع اور خیالات میں بلندی نہیں پیدا ہو سکتی۔ اگر کوئی شاعر بغیر ان تبدیلیوں کے مضامین نوع کا انبار لگا دے تو اس کے متعلق کیا ارشاد ہوگا؟ جناب حمید کے کلام سے پتا چلتا ہے کہ وہ روایات کی تبدیلی کے قائل نہیں بلکہ حقیقت طراز غالب کے اس خیال سے لفظ بہ لفظ متفق ہیں۔

مقصد ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر،

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو، — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر،

میں تبدیلی کا مخالف نہیں بلکہ اس کو ادبی ارتقا اور وسعتِ تخیل کا پیش خیمہ سمجھتا ہوں۔ اُن حضرات کا شکوہ سنج ضرور ہوں جو اپنی سطحی معلومات اور کوتاہ نظری سے اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ

نہ آئینے کا قصہ اور نہ حالِ شانہ کہتے ہیں — حقیقت میں جمالِ یار کا افسانہ کہتے ہیں ——— (شاد)

اب میں جناب حمید کے کلام سے چند ایسی مثالیں پیش کرتا ہوں جو روایاتِ کہنہ اور فرسودہ مفروضوں کے دامن میں جواہر ریزے لئے ہوئے ہیں۔

اپنے تیروں کی تو اتنی دیکھ بھال ——— دوسرے کا دل تو کوئی دل نہیں،

آنے لگی نہو کہیں ہمدردیوں کی بُو ——— دل کو ہمارے چھوڑئے پیکان کو دیجئے

ہے تیغِ اجل وہ ترچھی نظر اور تیرِ قضا مژگانِ اُن کی — آفت یہ ہے آفت دل کیلئے ناوک سے ملی تلوار بھی ہے

اب ایسی مثالیں پیش ہیں جن میں زندگی کی تصویر ہے۔ فلسفہ حیات ہے۔ جوش ہے۔ سرمستی ہے اور سبق ہے۔

ظاہر میں حمید اپنا ہے یہ دل باطن میں مگر ہے دشمن جاں، تصویر ہے دنیا والوں کی بدخواہ بھی ہے غمخوار بھی ہے

تڑپ میں زندگی ہے اور سکوں کا نام مرنا ہے جہاں والو! سبق سیکھو ہمارے مضطرب دل سے

اس کو بنا دیا کبھی اُس کو مٹا دیا، دنیا کو اُس نے گھروندا بنا دیا

بننے کے شوق نے مری مٹی خراب کی مٹنے کی آرزو نے مجھے پھر بنا دیا!

محاکات۔ تصویر کشی اور جذبات نگاری کی مثالیں۔

ملے اس چشم سیہ مست کا انداز حجاب جب تلک ہم رہے گردش میں کئی جام رہے

ہر طرف اب تیرگی ہی تیرگی ہے جلوہ گر، بخت بد بھی کیا کسی پابند غم کی شام ہے

بل کھاتے وہ دیکھو آرہے ہیں، نظروں میں بھرے شراب خانے

یاس۔ مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی معروف بہ یگانہ لکھنوی۔ جناب یاس موجودہ دور میں زبان اُردو کے چوٹی کے غزل گو شعراء کی صف میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ کے متعلق قیس مرحوم مصنف "گلشن حیات" اپنی کتاب میں لکھتے ہیں "ان کی طبیعت مضمون آور، فکر تخیل دوست، مذاق معنی پسند، زبان متانت شعار، اور کلام اپنے استادوں کا جز اعتبار سے آئینہ دار ہے جس میں بیتاب کی تہذیب غزل سرائی اور مولانا شاد کی معنی آفرینی و سحر طرازی کے تتبع کا فیض بہت کچھ نظر آتا ہے" ——— "گلشن حیات" صفحہ ۱۴۱۔

دار المصنفین کے روح رواں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی فرماتے ہیں۔ "یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ میرزا یاس یگانہ اپنے وقت کے ایک کامل شاعر ہیں۔ ان کے خیالات بلند، زبان صاف ستھری۔ ترکیبیں چست اور کلام حشو و زوائد سے پاک ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ لکھنؤ کے طرز شاعری میں اُن کے ہنگاموں کے باعث مفید انقلاب پیدا ہوا ہے" ——— "معارف" اپریل ۱۹۳۴ء صفحہ ۳۱۴۔

علاوہ اس کے مسٹر مالک رام ایم۔اے۔ ایل۔ایل۔بی کا ایک تبصرہ یاس کے رنگ سخن پر رسالہ زمانہ کانپور کی فروری ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں شایع ہو چکا ہے اس لئے مزید تفصیل سے گریز کرتا ہوا صرف نمونہ کلام پر اکتفا کرتا ہوں۔ اگر موقع ملا تو ایک الگ مقالہ سپرد قلم کروں گا۔

خزاں سے پہلے ہی کاش اپنی آنکھیں بند ہو جاتیں بہار اولیں ہوتی نگاہ واپسیں ہوتی،

جو رو سکتے تو آنسو پونچھنے والے بھی مل جاتے شریک رنج و غم دامن سے پہلے آستیں ہوتی،

حسن فطرت بولتا ہے پردۂ اسرار میں معنی بے لفظ پنہاں ہیں زبان خار میں

چپ لگی مجھکو۔ گناہ عشق ثابت ہو گیا رنگ چہرے کا اڑا۔ راز دل مضطر کھلا

مسلم۔ محمد مسلم۔ پروفیسر سنٹ کولمبس کالج ہزاری باغ۔ تلامذۂ شاد میں خاص طور پر دور جدید کی صف میں جس کا سب سے پہلے نام آتا ہے وہ جناب مسلم ہیں۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ آپ کی شاعری کا یہی دور ہے اور کچھ اس وجہ سے کہ آپ کی تعلیم ہی ایسے ماحول میں ہوئی جس پر انگریزی ادب کا اثر غالب ہے۔ آپ کے کلام میں رفعت خیال کے ساتھ ساتھ فارسی ترکیبیں نہایت ہی حسن کارانہ انداز میں پائی جاتی ہیں۔ نمونے کے طور پر ایک غزل کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

دل پر داغ پہ بھی ایک نظر او گل چیں! کاش یہ گل بھی ترا زینت داماں ہو جائے

کیا ستم ہو کہ کرے تازہ ستم روز ایجاد جب پریشاں مجھے دیکھے تو پریشاں ہو جائے

یہ نہیں ہے کہ نہیں تاب فغاں اب ہم میں، خوف یہ ہے کہ کہیں تو نہ پشیماں ہو جائے

جناب مسلم نے اسی طرح کی متعدد غزلیں کہی ہیں۔ لیکن آپ کے مذاق سخن کا اصلی رنگ آپ کی نظموں کے دیکھنے سے کھلتا ہے۔ شیلی

(Shelley) کی طرح آپ بھی حیاتِ انسانی کو قعرِ مذلت کی طرف گرتا ہوا دیکھتے ہیں، لیکن اس کی موجودہ پستی مایوس نہیں کرتی بلکہ ہر جگہ روحِ امید سرگرم کار ہے۔ اس نظریے کا انکشاف آپ کی نظم "رازِ حیات" کے مطالعہ سے ہوتا ہے جو ایک حد تک اقبال کے فلسفہ سے بھی متاثر ہے۔ اس نظم کے پہلے حصہ میں تو بے ثباتیِ روزگار کا شکوہ ہے جس کا اختتام یوں ہوتا ہے ؎

کیا اسی بے رنگ و بو گلشن کا دم بھرتا ہے تو — کیا یہی وہ زیست ہے جس کیلئے مرتا ہے تو

دوسرے حصہ میں امید کی جھلک صاف نمایاں ہے۔

ہے زوالِ شام سے رازِ عروجِ صبح صاف — دل نہ ہار اے مہر تو رہ یوں ہی سرگرمِ طواف

اپنی ایک نظم "فطرتِ سیمابی" میں ترغیبِ عمل کا نغمہ اس طرح ستاتے ہیں۔ ؎

ہے چمن، دشت، صبا خواب میں گر ہو مصروف — بندِ پانی ہو تو ہوتی ہے تعفن اُس میں

ضربِ پیہم ہی پہ ہے نغمۂ بربط موقوف — دل بھی مُردہ ہے اگر ہو نہ کوئی دُھن اُس میں

انگریزی ادب میں ہارڈی (Hardy) کی زنانہ کردار نویسی کمال کا درجہ رکھتی ہے۔ اُردو ادب میں اگر فطرت نسوانی پر جامع تبصرہ دیکھنا ہو تو جنابِ مسلم کی نظم "مجھ کو نہ چھیڑو" کا آخری بند پڑھئے اور دیکھئے کہ ہمارا ادب بھی کس طرح مغربی ادب کے دوش بدوش ہو چلا ہے ؎

ہمدم کی غم خوار و دم ساز ہوں میں — دلداریوں میں ممتاز ہوں میں،

خود ناز بردار خود ناز ہوں میں — نغمے سے معمور اک ساز ہوں میں،

ناروں میں مستور آواز ہوں میں، — عاجز ہوں پھر بھی اعجاز ہوں میں،

"اک راز ہوں میں، مجھ کو نہ چھیڑو"

ولی

سید شاہ ولی الرحمٰن ڈپٹی مجسٹریٹ مونہاری۔ تلامذۂ شاد عظیم جنابِ مسلم کے بعد جس نے جدید رنگ میں کامیاب نمائندگی کی وہ جنابِ ولی ہیں۔ آپ کے کلام پر جدید تاثرات کے علاوہ غالب کا رنگ بہت نمایاں ہے اور اس رنگ کو برتنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں جیسا کہ خود ہی کہتے ہیں۔ ؏ خوشہ چینی خرمنِ غالب کی کرتا ہوں ولی

آپ کا مطالعۂ شعری بہت وسیع ہے اور خدمتِ علم و فن اپنا بہترین مشغلہ سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ آپ کے بلند پایہ تنقیدی مضامین سے پتا چلتا ہے۔ طبیعت میں زور، عالی خیالی اور ندرت بے انتہا پائی جاتی ہے۔ آپکے صحیح رنگِ سخن کا اندازہ ذیل کی غزل سے ہوگا۔ ؎

ترے آستانے پہ سر نگوں ہمہ تن ہوں ذوقِ نیاز میں — درِ کعبہ پر کوئی حق پرست ہو جیسے محوِ نماز میں

جھلک اُن کی شوخیِ حسن کی ہو ہر اک ذرّے میں جلوہ گر — مگر اُس پہ بھی یہ حجاب ہے کہ چھپے ہیں خلوتِ راز میں

ابھی جام بھی نہ لگا تھا مُنہ سے کہ مجھ پہ چھا گئی بے خودی — ہے عجب کرشمہ ساقیا تری چشمِ سحر طراز میں

مری حق شناس نظر بھلا کبھی چوک جائے مجال کیا — مجھے اس کا غم نہیں اے ولی وہ چھپیں کہ اس مجاز میں

اس غزل کے چند شعروں سے ناظرین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ "دبستانِ شاد" کی پاکیزہ غزل سرائی کا کتنا گہرا فروغ ولی کے کلام پر ہے۔ جدید شعر و شاعری کے میدان میں جنابِ ولی کس طرح سرگرم نگاہ ہیں ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

ہشیار ہو اے بادہ گسارِ ہستی — اُترے نہ کہیں ترا خمارِ ہستی

غافل! ہے خزاں بدوش اس کا ہر پھول — بجلی کا تبسم ہے بہارِ ہستی

"حسن"

سازِ گیتی کے لئے ہستی تری مضراب ہے — خرمنِ دل کو ہے بجلی جلوہ فرمائی تری،

تیرا منظر باعثِ صد نالۂ بیتاب ہے، — ہے ازل سے دہر میں ہنگامہ آرائی تری،

میری فطرت کے لئے بجلی ترا نظارہ ہے، جس سے پڑ جاتی ہے ہل چل محشر جذبات میں
جلوۂ زیبا کا تیرے دل مرا گہوارہ ہے، نور افشاں جس طرح خورشید ہے ذرات میں

دبستان شاد" کے نوخیزوں کی بھی ایک کثیر تعداد ہے جس میں خصوصیت کے ساتھ ذیل کے نام ادبی دنیا میں ایک حد تک متعارف ہو چکے ہیں ـــــ اختر کاکوی۔ صبا عظیم آبادی۔ ارشاد فاطمی وغیرہ۔ سبھوں کے کلام میں حضرت شاد کی پاکیزہ شاعری کے اثرات پائے جاتے ہیں اور آیندہ ترقی کی امیدیں بہت وابستہ ہیں۔

"دور جدید"

مولانا عبدالسلام ندوی مصنف کتاب شعر الہند کے خیال میں عظیم آباد اسکول کی شاعری شوق نیموی جیسے شاعروں کی کوششوں سے لکھنوی رنگ اختیار کرتی جا رہی تھی۔ یہ خیال بڑی حد تک صحیح ہے۔ سب سے پہلے جس نے یہاں کی شاعری کو بیرونی آلودگیوں سے پاک کیا وہ جناب شاد کی ذات تھی۔ اس "نابغہ" (Genius) کی پیدائش نے اسے ایک خالص معیار پر پہونچا دیا اور لحاظ سے دہلی اور لکھنؤ کے بعد عظیم آباد کو بھی مرکزیت حاصل ہو گئی، چنانچہ جناب سہاب اکبر آبادی جو خود بھی اس دور کے ممتاز شعراء میں سے ہیں مقدمہ مثنوی مادر ہند مصنفہ شاد میں تحریر فرماتے ہیں کہ عظیم آباد کو ہم زیادہ تر شاد کی وجہ سے جان اور پہچان سکے ہیں۔

گذشتہ صفحوں میں پچھلے دور پر جو نظر ڈالی گئی اس سے یہ بات ضرور روشن ہو گئی ہوگی کہ علاوہ جدید تحریکات کے صوبہ بہار کی شاعری کا دور جدید کن اثرات کا رہین منت ہے اور ہو سکتا ہے۔ اب ذیل میں یہ دکھانے کی کوشش کیجاتی ہے کہ دور جدید میں بھی صوبہ بہار کا خاصہ حصہ ہے، اور یہاں کی شاعری معیاری حیثیت رکھتی ہے۔

عظیم (ڈاکٹر) سید عظیم الدین احمد ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی موجودہ دور کی شاعری اقبال کے وجدانی نغموں اور جوش کے سرمست ترانوں کی رہین منت سمجھی جاتی ہے۔ صوبہ بہار میں عظیم کا بھی وہی مرتبہ ہے جو دوسرے صوبوں میں اقبال اور جوش کا، لیکن اس صوبے کا یہ پیامی شاعر بھی شاعری سے قطعی بے نیاز ہے جس کی وجہ سے اس کی ہستی "صدائے خاموش" کے پردے میں چھپکر رہ گئی۔ خبر ملی ہے کہ آپ کا ایک مجموعۂ کلام "گل نغمہ" کے نام سے چھپ رہا ہے جس کے مرتب آپ کے لائق فرزند پروفیسر کلیم الدین احمد ہیں خدا کرے یہ چیز جلد منظر عام پر آجائے[1]

جناب عظیم کے کلام میں ایک پیام ہے۔ جوش ہے، فلسفہ ہے اور وہ بلاشبہ بہار کے دور جدید کے قائد ہیں۔ آپ کی شاعری پر ایک بسیط تبصرہ نوشتہ پروفیسر اختر احمد اورینوی ندیم بابت ماہ مارچ ۱۹۳۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔ میں اس پر زیادہ روشنی ڈالنا تحصیل لاحاصل سمجھتا ہوں۔ رسمی طور پر آپ کی نظموں اور غزلوں سے چند انتخابات پیش کرتا ہوں۔

درد سے اور تڑپ اے دل ناکام ابھی — سوچتا کیا ہے اس آغاز کا انجام ابھی
اس کی کیا فکر کہ پروانے جلیں گے کہ نہیں، شمع ساں آپ ہی جلنا ہے ترا کام ابھی

"نوید امید"

کیا کوئی موت ہے "غفلت" کہ نہ چونکا جائے — زندگی ہے، تو سنبھلنے کا تقاضا ہوگا
بادِ صرصر نے جو چھوڑے ہیں خزاں میں تنکے — ڈوبتوں کو انہیں تنکوں کا سہارا ہوگا

"پیام ہستی"

تبسم کی ہوس ہی، زخم دامن دار پیدا کر — جو گریہ آرزو ہے چشم دریا بار پیدا کر
مرض ملی کیا مداوا جس کا آساں ہو طبیبوں پر — نہ پہنچانے مسیحا جس کو وہ آزار پیدا کر

[1] ندیم۔ گل نغمہ شائع ہو گئی ہے۔ جس کا تذکرہ ندیم کے پچھلے پرچہ میں گذر چکا ہے۔ الاس کے مفصل حالات اس نمبر میں کسی دوسری جگہ

پروفیسر ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ

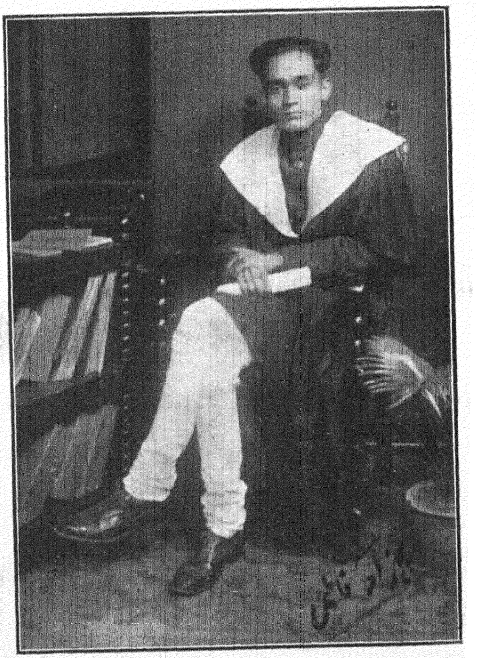

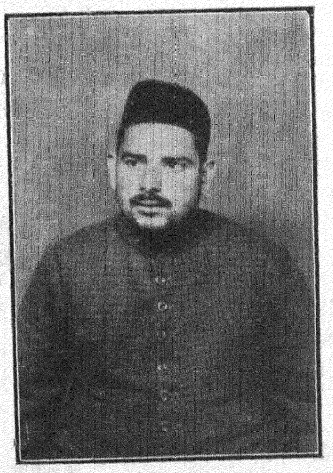

جناب سید محمد ایوب قدر

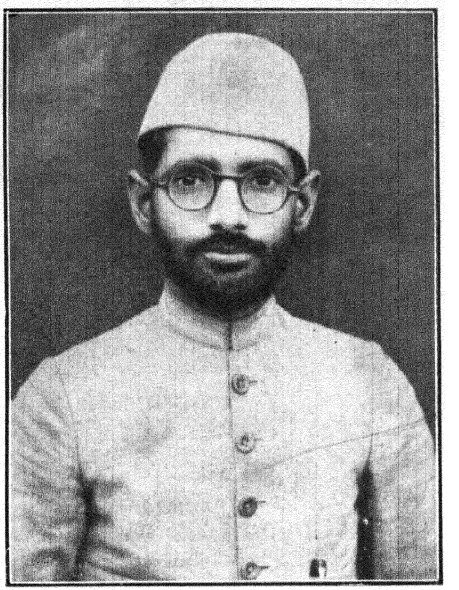

مولانا مسعود عالم ندوی

جناب نسیم گورگانوی

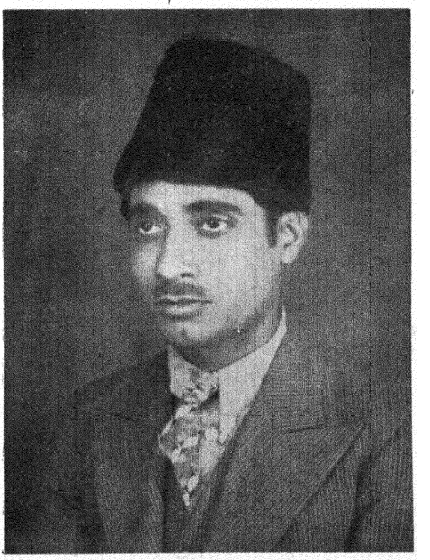

جناب جوہر فریادی

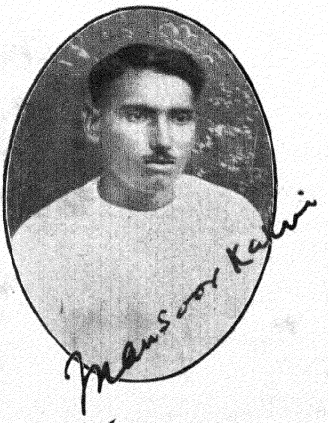

جناب منصور کاکوی

جمیل مظہری

جناب عظیم کی طرح جناب جمیل بھی ایک فطری شاعر ہیں۔ آپ کا کلام بھی زندگی کی مکمل تصویر کا آئینہ دار اور علو خیال کا علم بردار ہے۔ فلسفہ۔ ندرت اور سلاست بیان سب کچھ آپ کی شاعری میں موجود ہے۔ اگر اسی طرح شعر سخن جاری رہی تو نہ معلوم آپ کی شاعری کس منزل پر پہونچے گی۔

زندگی اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب اُسی وقت کامیاب کہے جانے کا مستحق ہے۔ جبکہ اُس کی ہر موج زندگی کی لہروں سے وابستہ ہو سطحی نقادوں کے جہاں اور سب اعتراضات ہیں وہاں یہ بھی ایک اعتراض ہے کہ اُردو شعرا کے کلام زندگی کی لہروں سے وابستہ نہیں ہوتے۔ اُن شعرا کو تو چھوڑئے جو محض رسمی طور پر یا تفنن طبع کے لئے شاعری کرتے ہیں مصیبت یہ ہے کہ جنہیں خود فطرت کی طرف سے شاعرانہ دل و دماغ ملے ہیں وہ بھی مورد الزام ٹھیرائے جاتے۔ سر دست مجھے اُن الزامات کا جواب دینا مقصود نہیں صرف یہاں پر جمیل کی شاعری کے چند نمونے پیش کرتا ہوں جس سے پتا چلے گا کہ ادب کی یہ لطیف ترین صنف کس طرح ہمارے لطیف احساسات کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ میرے مخاطب وہ حضرات نہیں جن میں صحیح ذوق ادب کا فقدان ہے بلکہ وہ ہیں جن کی بالغ نظری ہر انقلاب کو ایک آنے والے خوش گوار دور کا پیش خیمہ سمجھتی ہے۔

"پیام"

ہستی کا نظام ہے "تسلسل" "تکمیل" میں زندگی نہیں ہے
منزل کا وجود ہے خیالی، منزل کہیں شوق کی نہیں ہے
فطرت کبھی رک نہیں سکتی

وہ بلبل جو کل تھا نغمہ ناچیز وہ غنچہ جو پھول ہو گیا ہے
وہ قطرہ جو تاج قیصری میں موتی بن کر چمک رہا ہے
صورت گر راز ارتقا ہے

اس بزم عمل میں صرف انساں بے خود ہے خراب رنگ و بو ہے
ہونے کو ہے دل میں آرزو بھی لیکن رسوائے آرزو ہے
بیگانۂ راز جستجو ہے

بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا — اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا
ہے روح تاریکیوں میں حیراں بجھا ہوا ہے چراغ منزل — کہیں سر راہ یہ مسافر پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا
یہ کوئی بات نہیں ہے کہ ہوا کے رُخ پر — چھوڑ دوں دل کا سفینہ کہ جہاں تک پہونچے
مسئلہ جبر کا سمجھا گیا کانچن بہار، — رکھ لئے توڑ کے گل ہاتھ جہاں تک پہونچے

بیدل

پروفیسر عبدالسبحان صدر شعبۂ فارسی پٹنہ کالج۔ آپ کی اُردو غزل گوئی کے متعلق ایک مضمون نوشتہ پروفیسر اختر احمد اورنبوی نگار اگست ۱۹۳۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ میں صرف نمونۂ کلام پر اکتفا کرتا ہوں۔

طبیب درد کے بڑھنے سے کیوں ہراساں ہے — کہ یہ بڑھا تو پھر الفت کی مشکل آساں ہے
اُسے کہ تلخیٔ غم ہی مدار ہستی ہو — وہ زہر ہے جسے کہتے ہو تم کہ درماں ہے
نشاط غم کا دل شیفتہ ہوا خوگر، — کسی کے جور سلاسل کا مجھ پہ احساں ہے
اسرار محبت کی اتنی ہی حقیقت ہے — کچھ شوق مصیبت ہے کچھ ذوق اذیت ہے
تعمیر تمنا ہے پھر سامان حسرت ہے — اس بزم تماشا کی بس اتنی ہی غایت ہے
یہ جلوہ فروشی ہے بے خود ہیں تماشائی: — محفل کی یہ محفل ہے خلوت کی یہ خلوت ہے

شمس منیری پروفیسر حافظ شمس الدین احمد۔ صدر شعبۂ اردو پٹنہ کالج و پٹنہ یونیورسٹی۔ اردو غزل گوئی پر جو اعتراضات عائد کئے جاتے ہیں اُن کا ذکر میں جا بجا گذشتہ سطروں میں کر چکا ہوں۔ جناب شمس منیری بھی دور جدید کے غزل گو شاعر ہیں اور اس لحاظ سے معترضین کی زد سے نہیں بچ سکتے۔ لیکن جہاں تک معیاری شاعری کا تعلق ہے شمس منیری کی شاعری کا بھی ایک خاص معیار ہے جس کے خصوصیات کسی طرح نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ کلام کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شاعری دور جدید کے تاثرات قبول کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ میں اس کے متعلق ایک علیحدہ مضمون لکھ رہا ہوں جو کسی موقع پر ہدیۂ ناظرین کیا جائیگا جناب شمس کی شاعری میں حقیقت نگاری۔ جوش بیان۔ حسن ادا۔ نفسیات۔ فلسفۂ معرفت و حقیقت۔ رفعت خیال و علو نظر۔ تصویر کشی منظر نگاری اور موسیقی کیفیات، رنگینیات و سرمستی کا ایک بے پایاں ذخیرہ ملے گا۔

حقیقت نگاری
اُن کے چہرے کے رنگ دو ہی ہیں — یا چمیلی کا یا گلاب کا رنگ
یہ بھی آنا ہے کوئی آئے خفا ہونے کو — پیار سے آؤ تو بیشک ہو مزا آنے کا

جوش بیان
جی میں ہے کاٹ کے رکھ دیجئے خود سر اپنا — سر ہو اک ہاتھ میں اک ہاتھ میں خنجر اپنا
چمن کی خاک سے خونِ لالہ رو نکلے — اب آئی فصل کہ پھر شیشہ و سبو نکلے
لبِ دریا چلو کیفیتِ آبِ رواں دیکھو — وہ مستانہ روش موجوں کی وہ اٹکھیلیاں دیکھو

نجم کیلانی مولوی نجم الہدیٰ پروفیسر شعبۂ اردو پٹنہ کالج۔ جہاں اور بزرگوں نے سرزمین بہار کی شاعری کو دور جدید کے خصوصیات سے روشناس کرایا وہاں جناب نجم کا نام بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اگو کہ آپ نے اپنی صحت اور کثرت مشاغل کے سبب سے مشغلۂ شعر و سخن کو ایک حد تک ملتوی کر دیا ہے۔ ذیل میں آپ کی ایک نظم "پیغام عمل" کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ اس اقتباس سے پتا چلتا ہے کہ آپ کے جذبۂ شعری پر بڑی حد تک اقبال کی قومی نظموں کا رنگ اثر انداز ہے۔

ساز عجمی کیا۔ بزم عربی کیسی — اے دل! صف ماتم میں راحت طلبی کیسی
ہے شمع حرم مُردہ۔ اے سوز نہاں والے — آ دیکھ! مرے دل میں ہے آگ دبی کیسی
خالی کیا ساقی نے پیمانہ تو کیا پروا — ہے جلوۂ خوں جاری ہی جاں تشنہ لبی کیسی

اٹھ سینہ پر غم سے نالے کو رہا کر دے
اس طائر بے پر کو ہم دوش ہوا کر دے

ہستی میں سکوں کیا عزت ہو تموج میں — گنگا کا لقب کر دریائے رواں ہو جا
رہبر کی ضرورت کیا رہوار کی حاجت کیا — کاندھے پہ اٹھا بستر صحرا میں دواں ہو جا
ہنگام اگر فتنہ تابی اور تیری یہ خاموشی — یا شور جرس بن جا یا بانگ اذاں ہو جا

جا دیکھ لے مقتل میں حالت مرے بسمل کی
ہے عرصہ محشر میں قاتل کی

اختر اختر احمد اورینوی۔ پروفیسر شعبۂ اردو پٹنہ کالج۔ اردو شاعری کے دور قدیم میں زندگی کے مسائل اتنے پیچیدہ نہ تھے جتنے اب ہیں۔ ہماری سیاست کا دائرہ ہماری ضروریات زندگی کے مطابق محدود تھا۔ اسی طرح ہماری شاعری بھی ایک حد کے اندر رہی۔ عصر حاضر میں جس طرح اور باتیں خصوصیات شاعری میں داخل ہو گئیں اُسی طرح سیاست بھی ایک جزو اعظم قرار پائی۔ سب سے پہلے حالی نے اس طرف توجہ کی۔ اس کے بعد اقبال کی "پین اسلامزم" (Pan Islamism) کی تحریک اثر انداز ہوئی۔ چکبست اور جوش نے حب الوطنی کی طرف راغب کیا اور اس کو بعد رفتہ رفتہ سیاسیات کے کل مسائل اردو شاعری میں داخل ہو گئے۔ حالات حاضرہ پر آزاد نظمیں لکھی جانے لگیں اور اس قسم کی نظموں کا ایک معتد بہ ذخیرہ ہمارے ادب میں شامل ہو گیا۔ جو ہماری موجودہ کشمکش کا آئینہ دار ہے۔ جناب اختر نے بھی اس قسم کی نظمیں لکھی ہیں۔ آپ کی ایک نظم "ایک مجاہد فلسطین کی افتخار"

کے ایک بند سے چند اشعار درج کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو۔

اے فلسطیں! جوشِ ایماں اب بھی ناداروں میں ہے، اب بھی جرأت کی چمک مسلم کی تلواروں میں ہے
اک گراں مایہ امانت ہے شہیدوں کا لہو جان دے کر بھی بچاؤ نگا میں اپنی آبرو،
تیری خاکِ پاک سے وابستہ ہے الفت مری بک نہیں سکتی کسی قیمت پہ بھی عزت مری
سو تو سکتا ہے مسلماں پر یہ مر سکتا نہیں لشکرِ باطل کے ہنگاموں سے ڈر سکتا نہیں

روح پرور اہلِ ایماں کے لئے تکبیر ہے
مردِ مومن کا ارادہ خالقِ تقدیر ہے

تاریخ ادب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ جب زندگی کا دور کشمکش اور انقلاب سے گزرتا ہوتا ہے تو اُس وقت ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو جاتا ہے جو خیالی دنیا میں جا کر پناہ لیتا ہے۔ اس کا دل کشمکش سے گھبرا اٹھتا ہے اور وہ اس سے گریز پر مائل ہو جاتا ہے۔ مغربی ادب میں اس کی مثال کثرت سے ملے گی۔ یورپ کی رومانی شاعری میں ایک حد تک یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اُردو ادب بھی اس رومانی شاعری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ اس کے دورِ جدید میں رومانیت کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ ایسے شعرا تو بہت کم ہیں جو خالص رومانی ہوں، اُن شعرا کی کمی نہیں جنہوں نے اور اور صنفِ شاعری کے ساتھ اس صنف پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ جناب اختر کی بھی بہت سی ایسی نظمیں ہیں جن میں خالص رومانیت پائی جاتی ہے۔ ذیل میں آپ کی ایک نظم "ارمغانِ شباب" سے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

سبزۂ شاداب پر شہلا جمالوں کا ہجوم سون کی وادی میں رقصاں ہرنزالوں کا ہجوم
غنچۂ نورس غرور نو نہالوں کا ہجوم شاعرِ شہکار کے رنگیں خیالوں کا ہجوم
ساریوں کے رنگ میں یا لالہ زاروں کا ہجوم آنچلوں کی لہر ہے یا آبشاروں کا ہجوم
خندۂ بے باک میں لرزاں ہیں فواروں کے گیت قہقہوں کے راگ یا بجتے ستاروں کا ہجوم

موجودہ دور کی ایک خاص خصوصیت مکمل تصویر کشی بھی ہے۔ یہ چیز جوشؔ کے یہاں کثرت سے اور مکمل انداز میں پائی جاتی ہیں اختر کا کلام بھی اس خصوصیت سے متاثر ہے۔ نمونہ کے طور پر آپ کی ایک نظم "نغمے" کا ایک بند درج کرتا ہوں۔

موجِ نازک سے صبائے شوخ کی مستانہ وار، مخملیں سبزے پہ جیسے برگِ گل کی ہو پھوار
جس طرح پانی کی چادر پر نشیلی رات کو، بارشِ شبنم بنائے ریشمیں شکنوں کا ہار
جیسے بیمارِ محبت کی تھکی پلکیں جھکیں، دھیرے دھیرے دل پہ میرے چھا گیا نغمے کا خمار

کیف تھا اک روح افزا گیت کی ہر تان میں
لہر در لہر مسرت کی رواں تھی جان میں

رضوی۔ سید اجتبیٰ حسین۔ پروفیسر راجندر کالج چھپرہ۔ جناب رضوی بھی موجودہ دور کے ایک خوش گو شاعر ہیں۔ کلام میں انتہا سے زیادہ درد ہے جس کی وجہ سے آپ کے اشعار تاثیر اور کیف غم میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے آپ کو میرؔ کا مقلد کہنا بیجا نہ ہوگا۔ ذیل میں آپ کے تین اشعار لکھے جاتے ہیں جن میں میرؔ کے نشتر اور رشاد کی پاکیزہ غزل سرائی کی کیفیت بہت کچھ پائی جاتی ہے۔

احباب چھٹے اغیار چھٹے سر اپنا پرایا چھوٹ گیا جب روح بدن سے چھوٹ گئی سب رشتہ ناتا ٹوٹ گیا،
ہاں جن اک تجھے تھی ہم سے غرض، تھا جن کو ذوقِ عشق طلب رکھی رہی شانِ استغنا۔ آخر کو یہ بھانڈا پھوٹ گیا
کہتا ہی کہ رضوی مانگ دعا، خود تو ہی بتا ہم مانگیں کیا چاہا تھا کہ مانگیں تجھ سے تجھے یہ ہو نہ سکا جی چھوٹ گیا

پرویز شاہدی - سید اکرام حسین عظیم آبادی ایڈیٹر رسالہ اردوئے جدید کلکتہ - جہاں تک انسان کے لطیف احساسات اور اثر کا تعلق ہے جناب پرویز کی شاعری دورِ جدید میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے - آپ کا کلام پر تشنج (Pessimistic) خیالات کا گہرا اثر پایا جاتا ہے جس نے آپ کی غزل گوئی کو ایک معیاری درجہ دے دیا ہے -

قسمت میں لکھی تھی محرومی ناکام تمنا ہونا تھا — کیا کیجئے ہم کو فطرت کے ہاتھوں کا کھلونا ہونا تھا
کیا اس میں خطا تھی گر میں نے دو چار گلوں کو چوم لیا، — پابندی یہاں جب ایسی تھی ہر پھول کو کانٹا ہونا تھا
ہنستے ہو مرے تم رونے پر اللہ ہنسائے خوب ہنسو! — ہوتا جو تمہیں بھی درد کہیں پھر دیکھتے طوفاں کیا ہوتا

غزل کے ساتھ ساتھ جناب پرویز نے اپنے رنگ میں رباعیاں بھی خوب لکھی ہیں - فرماتے ہیں -

رفعت سے بہت دور ہے پستی میری — ہم دوش فنا رہتی ہے ہستی میری
پیتا ہوں جو مے بھی تو سمجھ کر اک زہر — اُترا ہوا اک نشہ ہے مستی میری

بینا رشیدی حافظ سید نظام الدین احمد رئیس راجگیر - حقیقی شاعر کے تلامیذ الرحمن ہونے میں اگر کسی کو شک ہو تو وہ جناب بینا کو دیکھے بعض کم سنی میں بینائی سے محروم ہو گئے - لیکن فطرت نے جو مواد آپ کے ذہن رسا کو بخشا وہ کب رکنے والا تھا - خیالات کی فراوانی اشعار کے پیکر میں ظاہر ہوئی اور مشق سخن نے اس کو ہر طرح مرصع کر دیا - پاکیزہ تغزل کی چند مثالیں آپ کے کلام سے درج کرتا ہوں -

تڑپ تڑپ نہ دلِ بے قرار پہلو میں — ٹھہر ٹھہر کہ ہے تصویرِ یار پہلو میں
یاس کا، حسرت کا، ارماں کا ہے دل میں اک ہجوم — ارتعاشِ غم ہے لیکن سازِ دل خاموش ہے
یہ وفورِ ذوقِ غم اے آہ کیوں، اور کس لئے؟ — اضطرابِ دل ٹھہر، تو ہے کہاں، کچھ ہوش ہے
نغمہائے تارِ دل سے چونکتا ہوں خواب میں — "ایک صوتِ سرمدی ہے جس کا اشتاقِ جوش ہے"

اپنے دور کی خصوصیات سے متاثر ہو کر آپ نے بہت سی بلند پایہ نظمیں بھی لکھی ہیں جو وقتاً فوقتاً "صحیفہ" "فطرت" "راجگیر" میں شایع ہوئی ہیں -

صبا رشیدی - سابق مدیر "فطرت" - جناب بینا کے چھوٹے بھائی اور دورِ جدید کے اچھے شاعر ہیں - کلام میں وہی سوز و گداز پایا جاتا ہے جو جناب بینا کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے - نمونہ کلام کے طور پر ایک غزل کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں -

موجۂ بادۂ الست عشق کے ہر خمار میں — جلوۂ طور کی تڑپ حسن کے ہر نکھار میں
ذرہ سوز و ساز ہے درسِ حیات کشمکش — دیکھ نشانِ کارواں اڑتے ہوئے غبار میں
حسنِ حقیقت آشنا محرمِ دیدہ ہے مگر، — شوقِ حجاب پھر وہی جلوۂ بار بار میں

دورِ جدید میں شعرا نے غزلوں سے زیادہ "نظم" کے میدان میں طبع آزمائی کی ہے، چنانچہ آپ کی ایک بلند پایہ نظم "کوئل" کا ایک جز لکھتا ہوں جس میں شیلی (Shelley) کی زندۂ جاوید نظم SKY LARK کا تتبع پایا جاتا ہے -

ہے زمزموں میں تیرے — آہنگ سازِ ہستی — جذباتِ بے خودی میں — سوز و گدازِ ہستی
تخئیل کی فضا میں — مستور رازِ ہستی — ہاں یوں ہی چھیڑتی جا — اے نے نوازِ ہستی
نغموں سے تارِ الفت — اک شاہکارِ الفت — دنیائے بے خودی میں — اک نغمہ زارِ الفت
کس طرح کی خلش ہے — کیوں بے قرار ہے تو

رضی عظیم آبادی - جناب رضی کا بلند پایہ کلام عرصۂ دراز تک "ندیم" اور "فطرت" کے اوراق پر نظر آیا کیا - لیکن نہ جانے کیوں اب آپ نے خاموشی اختیار کی ہے بہر حال جو کچھ بھی اشعار آپ کے ملتے ہیں وہ بجائے خود اپنے معیاری

سلہ ندیم زیر نظر بہار نمبر میں ایک تازہ نظم شریک اشاعت ہے - اب حضرت رضی ادب کی زمین سے کنارہ کش ہو کر سیاسیات کی پرخار وادی میں قدم رکھ چکے ہیں - حضرت رضی ہمارے

ہونے کی شہادت دیتے ہیں - نمونۂ کلام دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ آپ نے بڑی حد تک حضرتِ جگر مراد آبادی کے رنگ کو اخذ کیا ہے - ؎

مٹا مٹا! نظرِ انتخاب کے ہاتھوں، لٹا لٹا دلِ خانہ خراب کے ہاتھوں
سنبھل سنبھل کے وہ بھر مستیوں میں کھو جانا، نگاہ ساقیِ وکیفِ شراب کے ہاتھوں
ٹھہر ٹھہر کے مرے بے خودی سے چونک اُٹھنا جنوں سا ہے دلِ پُر اضطراب کے ہاتھوں
بہت بچا تھا مگر بے خودی میں پی ہی گیا کسی کے شیوۂ عذرِ حجاب کے ہاتھوں
وہ مستی نشۂ بے شراب کیا کہنا! تبسمِ نگہِ نیم خواب کے ہاتھوں
خمارِ حسن کی انگڑائیاں ارے توبہ! کہاں بچے کوئی کیفِ شباب کے ہاتھوں
تغیرات کی دنیا میں انقلاب آیا، بدل گئیں وہ فضائیں شباب کے ہاتھوں

رسا ہمدانی بو - پی میں جناب فراق گورکھپوری اور بہار میں جناب رسا ہمدانی بیسوادیسی کے لئے بہت زیادہ مشہور ہیں - ان دونوں بزرگوار نے جتنی بھرپور علم و ادب کی خدمت کی ہے وہ کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتی - جناب رسا نے غزلوں سے زیادہ نظمیں لکھی ہیں جو اپنے خاص رنگ کی آئینہ دار ہیں - آپکی بحر الظلموں میں زیادہ تر تصویر کشی کا انداز پایا جاتا ہے - مثلاً ؎

اُٹھا مشرق سے بادل اور سوئے کوہسار آیا صدا باد بہاری نے یہ دی ابرِ بہار آیا،
بڑھایا سبزے نے دامن گلوں نے جام دکھلائے لٹاتا گوہر شہواریوں ابرِ بہار آیا،
صراحی غنچہ ہے گل جام مے ہی بوئے گل مے ہے چلو رندو - ہوا ٹھنڈی چلی ابرِ بہار آیا،

بن سنور کر خوب اِک لالہ عذار دستِ نازک میں لئے پھولوں کی ہار
بام پر ہے آج محوِ انتظار

ارمان آروی جناب تمنا کے مایۂ ناز شاگرد اور دورِ جدید کے ایک نوش فکر نوجوان شاعر ہیں - آپ کا کلام جدید اعتبار سے اپنے اُستاد کے رنگ خاص کا آئینہ دار ہے - رعایتِ تخیل اور حسنِ ادا کی اچھی مثالیں آپ کے اشعار سے ملتی ہیں - آپ کی نظم "حیات" سے ایک بند درج کرتا ہوں ؎

نزع کا وقت ہے اِک موجۂ بیتابِ حیات عالمِ قبر ہے اک حلقۂ گردابِ حیات
موت کہتے ہیں جسے وہ بھی ہے اک خوابِ حیات یعنی ہر حادثۂ عمر ہے اِک بابِ حیات
جامۂ تن کو اُتارا کہیں چلنے کے لئے،
یعنی مرتے ہیں تو پوشاک بدلنے کے لئے

کشتہ گیاوی اودھ کشور پرشاد وکیل - آپ جناب نوح ناروی کے شاگرد اور اپنے استاد کے قدم بہ قدم چلنا اپنی بہترین سعادت سمجھتے ہیں - عرصے سے علم و ادب کی خدمت میں مشغول ہیں جو آنے والی نسلوں کے لئے ایک سبق ہے - غزل اور نظم دونوں صنف سے دلچسپی رکھتے ہیں اور بڑی حد تک اپنے اُستاد کا رنگ نبھانے کی کوشش کرتے ہیں - آپکی ایک غزل کے کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں - ؎

اقرارِ محبت کبھی انکارِ محبت کیا لطف مجھے دیتی ہے تکرارِ محبت
کوشش سے بھی مجھ پر نہ کھلا رازِ برہمن یہ تارِ گریباں ہے کہ زنّارِ محبت
کھل جاتے ہیں کھل جاتے ہیں سب پر چھپتے نہیں چھپتے نہیں آثارِ محبت

"ساون"

پاک دامن بھی نظر آنے لگے تر دامن کر گئی بارشِ مے آج گھٹا ساون کی
گر پڑے آ کے نہ بلبل کے نشیمن پہ کہیں یہ چمکتی ہوئی بجلی ہے بلا ساون کی

جناب سیّد برکاتی - جناب الیاس بہاری - جناب قتیل دانا پوری - جناب ثمر آروی - جناب رخشاں ابدالی - جناب عرفان اسلام پوری - جناب بسمل آبادی اور

جناب آبادی بھی اسی دور کے شعراء میں ہیں جو آزادی کے بعد ابھرے ہیں - آپ کا کلام ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا ہے - آپ کی غزلیں اور نظمیں ہندی رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں - آپ کی ایک نظم "ساون" سے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں - ؎

شعرائے بہار عہد حاضر میں

از جناب ڈاکٹر سید نسیم گورگانوی پٹنہ ،

ندیم گیا بہار نمبر سنہ ۱۹۳۵ء شایع ہوا اور ہندوستان کے قریب قریب تمام رسائل و جرائد نے اپنے اپنے خیالات آرا کا اظہار ریویو کی صورت میں کیا۔ حق تو یہ ہے کہ بہار نمبر جن خصوصیات کا حامل تھا، وہ اہل نظر و ارباب ذوق سلیم سے پوشیدہ نہیں۔ بہار نمبر کی خصوصیات میں سے سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے تمام تر مضامین صوبہ بہار سے متعلق اور بہاری ادبا و شعرا کے موئے قلم کے رہین منت ہوتے ہیں۔

رسالہ شاعر آگرہ کے فاضل ایڈیٹر حضرت سیماب اکبر آبادی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اور یہ حسرت ظاہر فرمائی کہ اگر بہار نمبر میں بہار کے ذی حیات شعرا پر بھی ایک دو مضمون ہوتا تو بہار نمبر کی خصوصیات میں چار چاند لگ جاتے۔ ہم حضرت سیماب اکبر آبادی کی اس اہم رائے سے کامل اتفاق رکھتے ہیں، اس لئے ہمیں فوراً خیال آیا کہ اگر ہماری عدیم الفرصتی نے جس وقت ذرا سی بھی اپنی گرفت ڈھیلی کی تو ہم حضرت سیماب ظلہ کے ظاہر فرمائے ہوئے ضروری عنوان پر ایک مضمون ضرور سپرد قلم کریں گے۔ آج ان ہی خیالات کا نتیجہ آپ کے پیش نظر ہے۔

ذیل کے مضمون میں ہم نے اپنی معلومات کی بنا پر یہ کوشش کی ہے کہ بہار کے ایک آدھ مشہور اور مستند شاعر کا بھی نام اس مضمون میں شریک ہونے سے نہ رہ جائے۔ اب اگر اس احتیاط کے باوجود ہم سے کوئی مستند شاعر کا نام سہواً درج ہونے سے رہ گیا ہو تو اسے آپ ہماری دماغی کمزوری پر محمول کیجئے۔ گلہ اور شکایت کی کوئی وجہ نہیں۔ زندگی نے وفا کی تو پھر کبھی۔

یہ مضمون کئی ہفتوں کی کاوش اور دماغ سوزی کا نتیجہ ہے۔ ایک ایک لفظ پر ہمیں شعرائے کرام سے ملنا اور خط و کتابت کرنی پڑی ہے ——— چونکہ اس مضمون کے مختلف حصے مختلف اوقات میں قلم بند کئے گئے ہیں، اس لئے اسلوب تحریر میں نمایاں فرق ہے۔

قارئین نے اگر ہماری اس سعی کو بہ نظر استحسان دیکھا تو ہم انشاء اللہ تعالیٰ انہیں صفحات پر بشرط حیات چند ماہ کے بعد دو اور مکمل مضامین "بہار کی موجودہ شاعرات" اور "بہار کے موجودہ مئورخ و شعرا" جو خاص طور پر بہار سے تعلق رکھتے ہیں، پیش کرنے کی جرأت کریں گے

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے — پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

۱- علامہ آزاد عظیم آبادی

آزاد تخلص کرتے ہیں، پورا نام سید شاہ فضل حق ہے۔ شاہ بلکہ ضلع گیا مضافات عظیم آباد) کے رہنے والے ہیں شعر و سخن کا ذوق آج کا نہیں، بہت قدیم ہے۔ آپ صحیح معنوں میں کہنہ مشق شاعر کہلانے کے مستحق ہیں۔ موصوف کی قادر الکلامی اور تبحر علمی کا سارا ہندوستان لوہا مان چکا ہے۔ اندنوں آپ زندگی کے آخری لمحات شاہ بلکہ میں رہ کر گذار رہے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

شوق ناحق شعلہ زار گرمیٔ التماس تھا — عمر بھر ڈھونڈا کئے جس کو وہ اپنے پاس تھا
چند قطرے تھے جفاکش کی جبین شوق پر — سیپ میں موتی نہ کانوں میں کہیں الماس تھا

۲- ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی

جناب ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی خاص عظیم آباد (پٹنہ سٹی) کے متوطن ہیں۔ اسم گرامی مبارک حسین ہے اور تخلص مبارک کیا کرتے ہیں۔ آپ داغ دہلوی مرحوم کے ممتاز ترین تلامذہ میں سے ہیں اور اس وقت صوبہ بہار میں ان کی یادگار ہیں۔ آپ کی ایک غزل کا مطلع ہے۔

یوں نہیں آپ کہنے اس میں کوئی بات بھی ہے — سچ تو کہئے مرے دشمن سے ملاقات بھی ہے

راقم الحروف کو حضرت مبارک سے خاص طور پر ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ آپ فی البدیہہ بھی ایسی ایسی غزلیں تصنیف کر جاتے ہیں کہ

سُننے والا محو حیرت بنا ہوا آپ کا مُنہ تکتا رہ جاتا ہے۔ ابھی حال کا ذکر ہے کہ بزم ادب پٹنہ کالج کا ایک غیر معمولی مشاعرہ مولانا انجم گیاوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ حُسن اتفاق سے علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ بھی اُسی وقت اعظم گڈھ سے تشریف لے آئے، مولانا انجم نے کرسیٔ صدارت علامۂ موصوف کے حوالہ کردی اور مشاعرہ شروع ہوا۔ جب حضرت مبارک کو یہ خبر ملی تو وہ فوراً مشاعرہ کی شرکت کے لئے آمادہ ہوگئے۔ ہال ہی میں آپ نے علامہ سلیمان ندوی کی شان میں فی البدیہہ دو رباعیاں تصنیف فرمائیں اور اُٹھ کر پڑھنے لگے۔ اجتماع کافی تھا، سرگوشہ سے واہ واہ کی صدا بلند ہونے لگی، حاضرین کے مکرّر اصرار سے حضرت مبارک نے ایک دو غزلیں بھی پڑھیں اور مشاعرہ نہایت کامیابی کے ساتھ برخاست ہوا، آپ کی ایک غزل جو داغ مرحوم کے مخصوص رنگ میں کہی گئی ہے درج کیجاتی ہے، پڑھئے اور مرحوم داغ کا رنگ ملاحظہ فرمائیے۔

دشمنوں سے گلا نہیں غم کا، دوستوں میں ہے جشن ماتم کا
جب سے بدلی ہے یار کی چتون رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا
میرے رونے پہ لوگ ہنستے ہیں مجھ کو رونا ہے چشم پُرنم کا

مولانا تمنا پھلواروی

قادر الکلام اور کہنہ مشق شاعر ہونے کے علاوہ دور حاضرہ کے بہت بڑے عروض داں تصور کئے جاتے ہیں، تمنا تخلص ہے، پورا نام سید شاہ محی الدین ہے۔ قصبہ پھلواری شریف ضلع پٹنہ کے رہنے والے ہیں شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ آپ کے شاگردوں میں سے حضرت احمد ارمان آروی۔ ایم۔ اے ونیائے شاعری میں نمایاں شہرت حاصل کرچکے ہیں اور کر رہے ہیں۔ حضرت تمنا کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

جب وہ تلوار کھینچکر نکلا ہر گریباں سے ایک سر نکلا
پھر کہاں چاندنی کہاں مہتاب جب وہ خورشید بام پر نکلا

ڈاکٹر عظیم الدین احمد

علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد پی۔ ایچ۔ ڈی عظیم آباد کے مشہور انقلابی محلہ صادق پور کے باشندے ہیں عظیم الدین احمد نام اور عظیم تخلص ہے۔ جرمنی سے واپس آنے کے بعد مستقل پانچ برسوں تک لاہور میں مقیم رہے پھر عظیم آباد آئے اور عرصہ دراز تک پٹنہ کالج میں عربی و فارسی کے پروفیسر رہے۔ اندنوں پٹنہ سٹی میں ریٹائرڈ لائف بسر کر رہے ہیں موصوف ایک کامیاب فلسفی شاعر ہیں، اُن کی نظموں کا ایک ایک شعر مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے متعدد نظمیں نصاب تعلیم میں داخل کرلی گئی ہیں، آپ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ زبان عربی میں بھی مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ آپ کی زبان دانی اور عدیم المثال شخصیت کے متعلق مولانا عبد الباقی کی یہ سطریں ناقابل فراموش ہیں۔

"ڈاکٹر عظیم الدین احمد علم و فضل کے اعتبار سے آج مستشرقین میں ایک بلند پایہ رکھتے ہیں، آپ کی تحقیق و اجتہاد سے اگرچہ مغربیت کا رنگ جھلکتا ہے لیکن ان میں مارگولیتھ کی سطحیت کہیں نہیں پائی جاتی۔ اُردو ادب پر ان کے احسانات ایک زمانے تک فراموش نہیں کئے جاسکتے، شاعری میں بھی آپ جدید الفکر شعراء کی صف اول میں جگہ رکھتے ہیں اور قلمروئے شاعری کی اگر کوئی وزارت مرتب کیجائے تو ڈاکٹر عظیم اس کے اہم ترین رکن ہوں گے"

موصوف کی ایک نظم ذیل میں درج کی جاتی ہے، پڑھئے اور دیکھئے کہ صوبہ بہار کی سرزمین بھی کیسی کیسی مایۂ ناز و صد افتخار ہستی پیدا کرتی ہے۔

سُننے والوں سے یہ کہہ دو نہ ہراساں ہونا طرز نو سے ہے مجھے آج غزل خواں ہونا
میرے نالوں سے یقیں ہے دل احباب ہلیں میری آہوں سے ہے محفل کو چراغاں ہونا
زیست کا راز مجھے اُن سے بیاں کرنا ہے جن کی قسمت میں ہے عالم کا نگہباں ہونا

علامہ جمیل مظہری

نام سید کاظم علی کا علمی اور تخلص جمیل ہے۔ حسن پورہ، چھپرہ کے رہنے والے ہیں، لیکن ایک عرصہ سے مظفر پور کی بود و باش اختیار کرلی ہے۔ ان دنوں پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کے شعبۂ اُردو کے افسر اعلیٰ ہیں حضرت

جمیل کو اردو ادب کی تمام اصناف پر کامل قدرت حاصل ہے، موصوف کے شعروں میں شعریت ہوتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں آپ ہندوستان کی عظیم ترین لٹریری سوسائٹی یعنی اردو لٹریری کانفرنس کلکتہ کی مجلس استقبالیہ کے صدر منتخب ہو چکے ہیں، یہ قوم کی سعادت مندی تھی جس نے ایک مسلم الثبوت ادیب و شاعر کو اس اہم فریضہ کی انجام دہی کی جانب آمادہ فرمایا۔ ہندوستان کا ہر صاحب ذوق اکثر آپکو ایک فطری شاعر کی حیثیت سے جانتا اور ان کے کلام کی قدر کرتا ہے۔ ایک مشہور نظم کے چند مصرعے بطور نمونہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ پڑھئے اور جھومئے، زبان کی خوبیوں کے علاوہ ادبی لطافتوں کی بھی داد دیجئے۔ مرحوم شاما کو متوجہ کر کے کہتے ہیں۔

اٹھو عمر شب مختصر ہو رہی ہے، دعا کامیاب اثر ہو رہی ہے
نکھرتے ہیں جلوے بکھرتی ہے ظلمت سحر ہو رہی ہے، سحر ہو رہی ہے

سرکتی ہیں چہرے سے زلفیں کسی کی، ہوئی جاتی ہے چاندنی پھیکی پھیکی
کہیں دل نے چھیڑا ہے سازِ محبت سنو آ رہی ہے صدا بانسری کی

یہ پچھلا پہر اور یہ تنہائی میری، تخیل کی دنیائے رنگیں اندھیری،
کدھر ہے اے او جواں مرگ شاما! جگہ بزم فطرت میں خالی ہے تیری،

ہے پھولوں کی خوشبو پریشان اب تک چمن کی فضائیں ہیں حیران اب تک
ترے سوگ میں ہیں تری سیر گاہیں ندی کا کنارہ ہے سنسان اب تک

جو بو تیری زلفوں کی پاتی نہیں ہے، چمن میں کلی مسکراتی نہیں ہے
تری جستجو میں ہیں گنگا کی موجیں، کہ تو اب نہانے کو آتی نہیں ہے

ہوا راکھ جل کر ترا جسم خاکی ہے مرگھٹ کا ہر ذرہ تربت وفا کی
صبا اپنے دامن میں مثلِ امانت لئے پھرتی ہے راکھ تیری چتا کی

بہار آ کے گلشن میں جاتی ہے اب بھی گھٹا بال بکھرائے آتی ہے اب بھی
وہ شاخ آم کی جس پہ جھولا تھا تیرا صبا آ کے اس کو جھلاتی ہے اب بھی

قسم تجھ کو افسردگیٔ نمر کی قسم تجھ کو تقدیر شمع سحر کی
ادھر آ تجھے ڈھونڈتی پھر رہی ہے نسیم جنوں خیز پچھلے پہر کی

مولانا شفق رضوی | مولانا شفق رضوی ایک کہنہ مشق اور کامیاب شاعر ہیں۔ پورا نام سید حسن مرتضیٰ ہے، شفق تخلص کرتے کرتے ہیں۔ عماد پور ضلع گیا کے رہنے والے ہیں۔ پہلے حضرت کوثر سحر آبادی کو کلام دکھاتے تھے۔ پھر حضرت امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ ان دنوں حضرت شفق کا قیام الہ آباد میں ہے۔ وہاں کسی سلسلہ کی وراثت میں جائداد مل گئی ہے۔ عرصہ ہوا کہ آپ ایک ادبی ماہنامہ "نسیم سحر" کے نام سے نکالتے تھے۔ نثر بھی خوب لکھتے ہیں۔ سنتے ہیں کہ حضرت شفق نہایت اچھے خوشنویس

بھی ہیں۔ خدا جانے اس میں صداقت کو کہاں تک دخل ہے۔[1] ان کے کلام میں سلاست، روانی اور پختگی تینوں خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

نہ مرنے ہی کا موقعہ تھا نہ بس جینے پہ چلتا تھا
لئے تھے سر وہ زانو پر کسی کا دم نکلتا تھا

گواہ درد فرقت ہر شکن تھی بستر غم کی
بڑی بیتابیوں سے کروٹیں کوئی بدلتا تھا

ادھر گرمی سے شمعیں ڈوبی جاتی تھیں پسینے میں
اُدھر اپنے پروں سے پنکھیا پروانہ جھلتا تھا

حضرت نجم گیلانی

گیلانی بہار شریف کے قریب ایک گاؤں ہے، پروفیسر نجیم گیلانی وہیں کے رہنے والے ہیں۔ نظم نجم الہدیٰ ہے اور تخلص نجم کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ سے پٹنہ میں مستقل قیام ہے، اس سے قبل عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن میں شعبۂ تاریخ کے پروفیسر تھے، ان دنوں پٹنہ کالج میں ایک پروفیسر کے فرایض انجام دے رہے ہیں۔ کچھ روز تک وکالت بھی کرتے تھے۔ صوبۂ بہار کی پچھلی حکومت نے جو ہندوستانی کمیٹی زبان کی ترقی کے لئے قایم کی ہے، موصوف اس کے سکریٹری ہیں۔ نیز مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کی نظامت کے فرایض بھی موصوف ہی کے سپرد ہیں۔ آپ کے اشعار بہت پاکیزہ اور لطیف ہوا کرتے ہیں۔ پروفیسر نجم عدیم الفرصت ہونے کی وجہ سے کہتے بہت کم ہیں۔ موصوف کو اپنے وطن سے بھی بڑی محبت ہے، چنانچہ انتہائی جوش اور ہمدردی میں آپ ایک بار بے قرار ہو کر "نغمۂ بہار" کے عنوان سے پکار اٹھے اور خدا کو متوجہ کر کے یوں کہنے لگے۔

لالہ کو ہمارے سبزہ مرغزار دے
میرے وطن بہار کو گلشن نو بہار دے

باغ بہشت کی نظیر یعنی وہ کوہ راجگیر
پھر اُسے لالہ زار کر سرو دے اور چنار دے

رقص کرے جو موج گنگ دل میں اٹھے نئی اُمنگ
روح کو کر تپش عطا، قلب میں اک شرار دے

حضرت رسا کیاوی

محلہ سنگ لڈھا بہار شریف کے رہنے والے ہیں۔ رسا تخلص کرتے ہیں۔ اسم گرامی سید محمد اسمٰعیل ہمدانی ہے، پیشۂ وکالت کے سلسلے میں قیام شہر گیا میں رہتا تھا، پھر شیخپورہ کالج میں گئے۔ اب پٹنہ کالج میں ریسرچ اسکالر ہیں۔ آپ حضرت کوثر مرحوم خیر آبادی کے تلامذہ میں ہیں۔ شاعری سے موصوف کو بہت کم دلچسپی ہے۔ شعر خوب کہتے ہیں۔ اور بہت کہتے ہیں۔ ایک بلند پایہ نظم جس کا عنوان "ایک نوجوان سپاہی کی موت میدان جنگ میں" ہے اُس کا ایک بند نمونہ کے طور پر درج ہے۔

سونے والے جاگ آئی ہوں جگانے کے لئے
پیاری پیاری شکل آئی ہوں دکھانے کے لئے

خود تیرے پاس آئی ہوں بلانے کے لئے
رُوٹھنے والے، میں آئی ہوں منانے کے لئے

حضرت حمید عظیم آبادی

حضرت حمید عظیم آبادی ملا مہ شاد اعلی اللہ مقامہ کے شاگرد رشید ہیں اور اپنے کو خاکپائے شاد لکھا کرتے ہیں۔ حضرت شاد مرحوم کی صحبت سے حضرت حمید بہت زیادہ مستفیض ہوئے ہیں۔ حمید تخلص ہے اور نام سید عبد الحمید ہے۔ لودیکرہ پٹنہ سٹی کے رہنے والے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

وفا کیسی، بس اب طوق جفا زیب گلو کر لے
جفا کاروں کی دنیا ہے، جفا سہنے کی خو کر لے

بنا دامن کو گلشن اور سیر رنگ و بو کر لے
ابھی آنکھیں ہیں قابو میں ابھی دل کو لہو کر لے

نہیں یہ دیجیاں صحرائے الفت کی ہیں گل بوٹے
یہ کیا کہتے ہو عاشق سے کہ دامن کو رفو کر لے

حضرت بدیل عظیم آبادی

"نظم جدید" کے مولف اور پٹنہ کالج کے پروفیسر حضرت عبد المنان بدیل عظیم آبادی کے نام نامی سے اخبار بیں طبقہ کافی حد تک روشناس ہو چکا ہے۔ آپ ڈیانواں ضلع پٹنہ کے رہنے والے ہیں۔ عبد المنان نام ہے اور بدیل تخلص کرتے ہیں۔ شاعری اور خصوصاً غزل گوئی میں پروفیسر بدیل کا پایہ بلند ہے۔ موصوف کی ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے اور ہماری باتوں کی تصدیق کیجیے۔

آنکھ ساقی کی کبھی ہوش رُبا ہوتی ہے
اور کبھی ہوش میں لانے کی دوا ہوتی ہے

لے گناہی بھی محبت میں خطا ہے شاید
جرم ثابت نہیں ہوتا ہے سزا ہوتی ہے

[1] ندیم:۔ موصوف کی خوشنویسی کا نمونہ زیر نظر نمبر کے باب فن و ہنر میں ملاحظہ فرمائیں۔

ہم کو دنیا سے مٹا کر یہ خوشی ہے کیسی؟ دیکھیں اب کس پہ تری زور جفا ہوتی ہے

حضرت سریر کابری

حضرت سریر کابری کی نظموں میں وہ کیفیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں جو ایک بلبلِ گل کے نغموں میں ہونی چاہئیں۔ حضرت سریر کا خاص وطن کابر ضلع گیا ہے۔ لیکن بسلسلۂ ملازمت قیام برابر حسین آباد ضلع پلاموں میں رہا کرتا تھا، اب بسلسلۂ ملازمت گیا میں مقیم ہیں۔ آپ ایک کامیاب ناظم ہیں اور نظمیں بڑی سلجھی ہوئی لکھا کرتے ہیں۔ ایک غزل کے چند شعر یہ ہیں۔

غم ہی سمجھے دے دے جو میسر نہ خوشی ہو، اے چرخ ستم ہے اگر اس کی بھی کمی ہو،
اندوہ و الم خواب مسرت کی ہے تعبیر آنکھوں میں بھی بوشک جو ہونٹوں پہ ہنسی ہو
اک ہم ہیں کہ اشکوں میں بھی تاثیر نہیں ہے اک وہ ہیں کہ جو منہ سے نکل جائے وہی ہو

حضرت مقبول آبگلوی

آبگلہ ضلع گیا کے رہنے والے ہیں۔ سید مقبول امام اسم گرامی ہے۔ مقبول تخلص کرتے ہیں جناب قاضی سید شاہ مظاہر امام صاحب کے خلف اکبر ہیں۔ قاضی صاحب موصوف کہنہ مشق شاعر ہیں۔ پچاس سال پیشتر فارسی میں کہتے تھے۔ پھر اردو میں بھی کبھی شوق فرمایا۔ سید مخلص فرماتے تھے۔ اس زمانہ کے صحائف میں آپ کے کلام چھپتے تھے۔ اب مشق سخن چھوڑ دی ہے۔ صرف سالانہ قریب عرس کے موقع پر منظوم نوید شایع کرتے ہیں۔ اس نوید کی خصوصیت ہر سال یہ رہتی ہے کہ ہر شعر کے پہلے مصرعہ کے پہلے حرفوں کے مجموعہ سے ہجری تاریخ اور دوسرے مصرعوں کے پہلے حرفوں کے مجموعہ سے عیسوی تاریخ نکلتی ہے۔

حضرت مقبول نے اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ سن شعور کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے۔ یہ ندوۃ العلماء کا دور اول تھا۔ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کے رفیق درس تھے۔ شعر و شاعری کا مذاق ابتدا ہی سے تھا۔ انہوں نے ذوق شعری اپنے والد بزرگوار سے پایا۔ حضرت کو شرف آبادی کے ممتاز تلامذہ میں ہیں اور کہنہ مشق ہیں۔ دلہا میں برس پہلے گیا کے مشاعروں میں ان کے دم سے رونق رہتی تھی، ادھر بیس پچیس سال پیشتر اردو اخبار و رسایل میں آپ کے کلام چھپتے تھے گیا کے رسالہ "بزم سخن" میں آپ اور آپ کے تلامذہ کی غزلیں خاص طور پر رہتی تھیں۔ لیکن اب مشق سخن جاری نہیں رکھی، ادھر ایک زمانہ کے بعد ایک دو غزلیں ندیم کے صفحات میں نظر آئیں جن میں کلام کی استادانہ چمک پورے طور پر موجود ہے۔ اگر مشق سخن جاری رکھتے تو اس وقت چوٹی کے شعراء بہار میں ہوتے۔ کلام کا نمونہ درج ذیل ہے۔

لب آشنائے نالۂ درد جگر نہ ہو، اے ضبط گھر کی بات ہے باہر خبر نہ ہو
چند قطرے آنسوؤں کے چند نالے دل گداز ہم غریبوں کے لئے ہیں فقد حال زندگی
آج ماتم میں مرے مقبول ہیں وہ بھی شریک زندگی میں جو نہ تھے پرسان حال زندگی

حضرت کشتہ گیاوی

صوبہ بہار میں ہندو شعرا کی تعداد اگرچہ بہت کم ہے، لیکن پھر بھی ہندو شعرا کی جو فہرست اس وقت ہمارے پیش نظر ہے وہ بہت امید افزا ہے۔ حضرت کشتہ گیاوی اس فہرست کی صف اول میں جگہ رکھتے ہیں۔ مشاعرے میں برابر کی شرکت کیوجہ سے آپ کے بہت زیادہ متعارف ہو چکی ہے۔ موصوف حضرت نوح ناروی کے شاگرد ہیں۔ ان کا پورا نام اودھ کشور پرشاد ہے اور کشتہ تخلص کرتے ہیں۔ مستقل قیام شہر گیا میں رہتا ہے۔ اور ذریعۂ معاش پیشۂ وکالت ہے۔ وکالت کی مشغولیت کے باوجود آپ اپنا فارغ وقت بہت زیادہ علمی مشاغل میں صرف کرتے ہیں۔ ان کے اشعار بہت سادہ اور مطالعہ کے لائق ہوتے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

نہ قابو آپ کے دل پر نہ بس اپنی طبیعت پر برستی ہے فور غم سے حسرت کیا ہی حسرت پر
اُدھر رنجش پہ رنجش ہے عداوت ہے عداوت پر اِدھر الفت پہ الفت ہے محبت ہے محبت پر
یہ اظہار تنفر ہے کہ اظہار محبت ہے؟ جو ہنس کر پھیرتے ہو منہ مری صاحب سلامت پر

حضرت اجتبیٰ رضوی

رضوی تخلص کرتے ہیں، نام سید اجتبیٰ حسین ہے، چھپرہ کے رہنے والے ہیں۔ عرصہ سے شعر و سخن کا ذوق ہے۔ راجندر کالج چھپرہ میں ... پروفیسر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں جریدہ "استقلال" پٹنہ کے ادارۂ تحریر سے وابستہ تھے۔ غزلیں اور نظمیں دونوں خوب کہتے ہیں، اہل ذوق کی نظر میں ایک اچھے شاعر ہونے کی حیثیت سے بڑی قدر ہے۔ ایک مطلع غزل کے چند شعر ملاحظہ فرمائے اور شاعر کی قادر الکلامی کی داد دیجئے۔

حدودِ جسم خاکی میں نہ پاؤ گے نشاں میرا
غبارِ کارواں ہوں دور پہنچا کارواں میرا

بلندی پر بہت نازاں ہے شمسہ تیرے ایواں کا
زمینِ عجز سے اٹھے غبارِ ناتواں میرا

مخجل ہے میری محرومی سے رحمت کی جہانگیری
بہ تیری وسعتِ دامن یہ دستِ ناتواں میرا

حضرت شمیم رائے پوری

سید مظفر حسین نام اور شمیم تخلص ہے، سبتل پور کساوہ ضلع پٹنہ کے رہنے والے ہیں۔ مگر بچپن سے اپنی ننہال رائے پور ستی۔ پٹی میں رہ گئے ہیں۔ آج سے دو ڈھائی سال قبل آپ کا تمام کنبہ میں تھا، یہاں کے مختلف علمی اداروں سے وابستہ رہے، کچھ دنوں سے دارالاشاعت کی ملازمت کے سلسلے میں لاہور میں مقیم تھے۔ اب مرکزی انجمن ترقی اردو (دہلی) میں تشریف فرما ہیں۔ بہت سے حضرات غلطی سے آپ کو کلکتوی یا لاہوری سمجھتے ہیں، گنتی کے چند افراد ہیں جو انہیں ہماری جانتے ہیں۔ آپ کے چھوٹے بھائی اختر حسین رائے پوری ہندی ادب کے اہل طرز اور بلند پایہ ادیب ہیں۔ کچھ دنوں سے اردو ادب کی طرف بھی توجہ مبذول کی ہے۔ نثر اچھی لکھتے ہیں۔ حضرت شمیم ایک مستند شاعر ہیں، لیکن ملازمت کی وجہ سے غزلیں کہنے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ آپ ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خیال مرحوم کی شاگردی کے بے مدد ارادہ اور عاشق ہیں۔ چنانچہ اسی جذبہ کے ماتحت حضرت خیال کے انتقال کے بعد حضرت خیال پر آپ کی کئی قابل قدر مضامین مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ موصوف کی ایک غزل ہیں یہاں نمونہ کے طور پر درج کرتا ہوں، امید ہے کہ قارئین بھی لطف اندوز ہوں گے اور سمجھ سکیں گے کہ شمیم کس پایہ کے شاعر ہیں۔

روئدادِ محبت کیا کہیے، بے داد محبت کیا کہیے
جب سننے والا کوئی نہ ہو تو غم کی حکایت کیا کہیے

دل کے کھوٹے سکے کا لینے والا کوئی نہیں ہے
ایک نگاہِ لطف سے بڑھکر اس کی قیمت کیا کہیے

سینے میں اک جمالا سا تھا کیا جانیں کب چھو گیا
پوچھ رہے ہو دل کی حالت، دل کی حالت کیا کہیے

حضرت ارمان آروی

احمد ارمان نام۔ ارمان تخلص ہے۔ علامہ ثمنا مذللہ کے شاگرد رشید ہیں۔ وطن مالوف شہر آرہ ہے۔ تعلیم کے زمانہ سے برابر قیام عظیم آباد اور مضافات عظیم آباد میں رہتا ہے۔ اہل ذوق انہیں "سحر البیان" کہتے ہیں۔ دنیائے صحافت میں شہرت بھی کافی حاصل کر لی ہے۔ کئی سال کا ذکر ہے کہ آپ نے اپنی سحر البیانی سے جناب حسینی پر جنہوں نے حضرت بیدل عظیم آبادی کی کتاب "نظم جدید" پر اعتراضات کئے تھے، کچھ ایسا زبردست اور زود اثر سحر چلایا تھا کہ بیچارے حسینی صاحب کے مینہ سے کوشش کے باوجود بھی ایک آدھ لفظ نہ نکل سکا۔ حضرت ارمان آروی کے کلام میں بڑی بے ساختگی اور برجستگی موجود ہے۔ ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ فرمائے اور موصوف کے افکار عالیہ کی داد دیجئے۔

اے جنوں آج پھر ایسا کوئی ساماں کرنا
کہ میسر ہو مجھے سیرِ بیاباں کرنا

میں نے مانا کہ مرا کام ہے دشوار مگر
تجھ کو مشکل نہیں مشکل مری آساں کرنا

حضرت نجم ندوی

سید محمد ابراہیم نام۔ اور نجم تخلص ہے۔ کسمہ ضلع چھپرہ کے رہنے والے ہیں۔ قیام اولن پور، چھپرہ میں ہے۔ اور وہیں کے مڈل اسکول میں ایک ٹیچر کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ حضرت نجم کے کلام میں پختگی بہت زیادہ نمایاں ہے۔ بعض بعض شعر بہت پاکیزہ اور لطیف ہوا کرتے ہیں۔ نثر بھی بہت سلجھی ہوئی اور سلیس لکھا کرتے ہیں۔ نمونہ کلام پیش ہے۔

ہے رفیقِ راہ الفت جذبۂ کامل مجھے
ننگ ہے اس میں تلاشِ رہبر منزل مجھے

اک دلِ درد آشنا پہلو سے کیا جاتا رہا
چار دن کی زندگی بھی ہو گئی مشکل مجھے

خواتین بہار

بہار کی ایک مایۂ ناز فاضلہ

از مولانا سید محمد طٰہٰ صاحب اشرف، امتھوی

زبان و ادب کی خدمت میں ہمارے صوبہ کی خواتین کا بھی کچھ کم حصہ نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ اُن کی ادبی خدمتیں منظرِ عام پر نہ آسکیں، آج میں ایک ایسی مایہ فخر و ناز ہستی کا تعارف کراتا ہوں، جو اپنی مجموعی خوبیوں اور اپنے علم و کمال کی وجہ سے موجودہ عہد میں صفِ نسواں میں ممتاز اور بلند نظر آتی ہے، جس نے تمامی مصروفیتوں کے باوجود خدمتِ زبان و ادب کا مشغلہ برابر جاری رکھا، شاعری کی، لیکن شاعری کا غلط مصرف نہ لیا۔ افسوس یہ گرانمایہ ہستی چند سال ہوئے کہ پیوند خاک ہو چکی۔

نام اور سلسلۂ نسب اس فاضلہ جلیلہ کا نام "صالحہ" سنہ ولادت غالباً ۱۲۹۸ھ، والد ماجد کا نام سید شاہ فضل عظیم جو عرصہ تک پٹنہ سٹی اسکول میں عربی کے ماسٹر تھے۔ جدِ امجد کا نام شاہ بہادر حسین ابن مولانا صمدیتاً ساکن دیاؤ، اور والدہ ماجدہ کا نام بی بی فاطمہ ہے جو شیخ محمد تقی بلخی کی دختر کی نواسی، اور شاہ بہادر حسین صاحب کے برادر حقیقی عارف باللہ حضرت شاہ امیر الحسن صاحب کی نواسی تھیں، اور آپ کی شادی موضع ہسری ضلع آرہ میں جناب مولوی شیخ شرف الدین صاحب سے ہوئی جو علمی حیثیت سے خود ایک ممتاز شخصیت کے مالک صاحب تصنیف و تالیف ہیں۔

حضرت صالحہ کے نانا جناب مولوی شیخ نور الحسن صاحب، اور شوہر مولوی شیخ شرف الدین صاحب کے والد ماجد جناب مولانا شیخ احمد حسین صاحب امتھوی حقیقی بھائی، اور حضرت مولوی معنوی جناب مولانا محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ العزیز کے اجازمین فتاویٰ عالمگیری[1] کے اولاد و احفاد میں ہیں، اس حیثیت سے بھی آپ صوبہ کے ایک قدیم ترین علمی خانوادے کی چشم و چراغ تھیں،

سلسلۂ تلمذ آپ نے اپنے مادری سلسلہ کے بزرگ مولانا شاہ وحید صاحب سے جو آپ کی والدہ ماجدہ کے خالو، مصنف "حالاتِ مولائے علی کائنات" تھے۔ اور مولانا شرف الدین برادر نسبتی مولوی نور الہدیٰ منجی وکیل گیا، پدر بزرگ مولوی قمر الدین صاحب مختار سے فقہ، تفسیر، حدیث میں شرفِ تلمذ حاصل کیا، پھر اپنے شوہر مولوی شیخ شرف الدین صاحب سے تکمیل کی۔ فارسی اور نحو و صرف کی ابتدائی تعلیم غالباً اپنے والد ماجد سے حاصل کی تھی،

حفظ قرآن کا شوق علوم متداولہ سے فراغت کے ایک عرصہ بعد آپ کو حفظ قرآن کا شوق ہوا، اور یہ آتش شوق اتنی تیز تھی کہ مکروہات دنیاوی، اور مصائب لامتناہی کے طوفان بھی اس آگ کو نہ بجھا سکے، اور مرحومہ نے ہر حال میں اس مبارک شغل کو جاری رکھا، ہمیشہ فرماتی رہیں کہ حفظ قرآن میری دوا اور روحی غذا ہے، چنانچہ آپ نے بیس پارے حفظ کر لئے تھے، اور دمِ واپسیں تک یہ شوق اتنا غالب تھا کہ دم نکلنے کے وقت بھی سورۂ "رعد" ورد زبان تھی۔ مرحومہ نے اپنے حفظ قرآن کا تذکرہ اپنی ایک نظم (مطبوعہ "الفقیہہ") میں اس طرح کیا ہے:-

شکر تیرا میں کروں کیونکر ادا، حفظ قرآں کی جو نعمت کی عطا،
فضل سے تیرے ہی اے مولا مرے بیس پارے حفظ مجھکو ہو گئے

آپ نے جو کچھ حفظ کیا اُس کو نہایت بہتر طریقہ پر محفوظ بھی رکھا، ضروریاتِ زندگی اور امور خانہ داری کی مصروفیتوں میں بھی زبان کو ورد و تلاوت سے فرصت نہ تھی، آپ کا معمول تھا کہ بچوں کو لوریاں بھی دیتیں تو قرآن ہی سے، اور مصائب و آلام میں تسکین

---

[1] حضرت مولوی معنوی رحمۃ اللہ علیہ اور اس علمی خانوادہ کے اکثر افراد کا ذکر رسالہ معارف اعظم گڑھ اپریل و مئی ۱۹۳۶ء میں خاکسار کے قلم سے نکل چکا ہے۔ اور حضرت مولانا سید شاہ احمد حسین صاحب کی بعض اردو تصنیفات کا حال رسالہ ندیم میں بھی "اردو نثر کی ارتقا میں ادبائے بہار کا حصہ" کے عنوان سے شایع ہو چکا ہے

قلب حاصل کرتیں تو قرآن ہی سے ،

خطاطی اور خوشنویسی معلوم نہیں آپنے اس فن میں کسی سے باضابطہ تعلیم حاصل فرمائی یا محض اپنے فطری ذوق سے اتنی مشق بہم پہنچائی، آپ کے حروف نہایت پاکیزہ تھے ، اور مرحومہ کے صاحبزادہ مولوی سید شاہد احسن الدین صاحب کی روایت کے مطابق خطِ نسخ ، خطِ نستعلیق ، خطِ طغریٰ ، خطِ تو ام ، خطِ گلزار ، خطِ غبار میں مرحومہ کو اچھی مشق اور مہارت تھی ،

مشاغلِ علمی اور دیگر حالات کتابوں سے آپ کو عشق تھا - اور کتب بینی میں ہمیشہ محو رہتیں ، ہمیشہ آپ کے گرد کتابوں کا انبار ہوتا ، بچوں کو صرف ونحو ، فقہ اور حدیث کا درس خود دیتیں ، اگرچہ گھر کا سارا انتظام متہمام مرحومہ کی ذات سے وابستہ تھا ؛ لیکن فرصت کے اوقات میں درس وتدریس مطالعۂ تفسیر و حدیث ، ورد و وظائف ، عبادت و ریاضت کے سوا کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا - کارِ خیر میں نہایت بلند حوصلگی سے حصہ لیتیں - فقرا و مساکین مسجد و مدرسہ کی مدمیں ان کا خرچ کافی تھا ، انہار الفقیہہ پریس کو خالص مذہبی و دینی جریدہ ہونے کی حیثیت سے نہایت عزیز رکھتی تھیں -

استعدادِ علمی مرحومہ نے چونکہ مشاغل علمی کو ہمیشہ جاری رکھا ، درس وتدریس اور کتب بینی میں برابر مصروف رہیں اسلئے عربی و فارسی کی استعداد نہایت جید اور مذہبی معلومات نہایت وسیع تھیں - آپ کی عربی استعداد کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ کے اشعار میں عربی تلمیحات بکثرت ملتی ہیں ، گاہے گاہے آپ نے عربی مصرعے اور اشعار تک موضوع فرمائے ہیں مثلاً اپنی چھوٹی صاحبزادی محمودہ بیگم کو ایک خط میں دعائے صحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں :-

صالحہ کی یہ دعا مقبول ہو رب الرشاد ، انت شافی انت کافی فی مہمات العباد

اور ایک دعائیہ نظم مطبوعہ رسالہ پردہ نشین آگرہ میں لکھتی ہیں :-

علم مجھکو کچھ نہیں یا ربنا ! ہاں مگر اتنا ہی ما علمتنا

بس اسی پر ختم کرتی ہوں دعا ربنا اتمم لنا ھذا الرجا

گو یہ سیدھے سیدھے اشعار ہیں ، اور ان میں کوئی معنی آفرینی اور جدت نہیں ، لیکن کم از کم یہ صاف ظاہر ہے کہ بغیر کافی استعداد وصلاحیت عربی میں صفائی کے ساتھ شعر اور مصرعے موزوں کر لینا ممکن نہیں ہے -

آپ کی فارسی کی مہارت کے ثبوت میں ایک قطعہ تاریخ درج ذیل ہے ، جو مرحومہ نے اپنے والد ماجد کے انتقال کے موقع پر لکھا تھا -

صالحہ دل پہ رکھ کے سنگ صبر فکر تاریخ کی جو میں نے ذرا

ہاتف غیب نے بصد حسرت دی ندا ، " صبر نہ بجکم قضا "

از حد رنج دل بحسرت گفت

کرد رحلت پدر بزرگوار ما

۱۳۱۸ھ

مادۂ تاریخ کی خوبی و بے ساختگی ، تاریخ گوئی اور اصول تاریخ گوئی میں مرحومہ کی واقفیت تامہ کے ساتھ آپکی فارسی دانی کے لئے ثبوت کافی ہے -

اولاد و اخلاف مرحومہ کے اس وقت ایک صاحبزادہ مولوی سید احسن الدین صاحب موجود ہیں جو اپنی تمام تر مصروفیتوں کے باوجود تصنیف و تالیف اور علمی خدمات میں مشغول رہتے ہیں ، اُن کی تصنیفات سے دو چیزیں شائع ہو چکی ہیں - ایک تو " گرامر منظوم " جس پر متعدد اخباروں میں ریویو ہو چکے ہیں اور گورنمنٹ بہار و اڑیسہ نے اس کی دو سو جلدیں خرید کی تھیں - دوسری " احسن المولود منظوم " شعر و سخن کا مذاق چونکہ فطری ہے اسلئے نثر سے زیادہ آپ نظم ہی میں کہتے ہیں -

تین لڑکیاں ہیں ، بڑی لڑکی پٹنہ سٹی میں ڈاکٹر سید محمد وارث مجنی کے صاحبزادے مولوی بشیر مجنی مرحوم سے منسوب تھیں ، اور دوسری لڑکی مولوی سید الطاف کریم ایم اے پروفیسر رانچی کالج سے بیاہی گئیں - تیسری کی شادی جوانا مرگ ادیب مولوی سید معراج الحسن ایم اے سے ہوئی تھی - بڑی صاحبزادی مرحومہ کی زندگی ہی میں بیوہ ہو چکی تھیں ، اسلئے ان کے نام سے مرحومہ نے جو منظوم خطوط لکھے ہیں وہ خصوصیت کے

ساتھ درد و اثر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

مرحومہ کو ایک خط سے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ کی مجھلی صاحبزادی خدیجہ بیگم زوجہ مولوی سید الطاف کریم ایم اے بھی شعر و سخن کا ذوق رکھتی ہیں، اللّٰھمَّ زد فزد ولا تنقص،

نمونۂ کلام اور ایک اجمالی تبصرہ

افسوس یہ کہ مرحومہ کا مجموعہ کلام میرے پاس موجود نہیں جو کوئی تفصیلی تبصرہ اور بہتر انتخاب پیش کرسکوں، مرحومہ کے دو ایک خطوط اور دو ایک متفرق نظمیں میرے پیش نظر ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلام میں سلاست و روانی کافی ہے۔ عالمانہ اور عارفانہ نصیحتیں موثر پیرایہ میں ادا کی گئی ہیں۔ درد و اثر سوز و گداز ..... کلام میں بھرا ہوا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعری ہر شاعر کے جذبات کی صحیح ترجمان ہوتی ہے۔ مرحومہ کے کلام سے ان کے فطری رجحان، انداز مزاج، افتاد طبیعت، عادت و سیرت کا صحیح حال معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کامل جو جوہر انسانیت ہے، آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھا، خشیت الٰہی سے آپ کا دل لبریز تھا، صبر و شکر کا آپ کے خانۂ دل میں ذخیرہ تھا، آپ نے اپنے ہر خط میں اپنی بچیوں کو صبر و شکر کی زبردست تعلیم دی، اور اس پر کاربند ہونے کی سخت تاکید فرمائی ہے، دنیاوی جاہ و جلال، شان و شوکت، قوت و ثروت، مال و دولت کی آپ کے دل میں مطلق قدر نہ تھی، آپنے اللہ تعالیٰ سے جب مانگا تو اس کی رضا مانگی، علم فقہ اور علم دین مانگا، حفظ قرآن کی دولت کونین مانگی، اور توفیق عمل کی داعی ہوئیں۔ آپکی ایک مناجات مطبوعہ رسالہ پردہ نشین آگرہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

تُو ہے دانا اور بینا اے خدا! ہے رضا تیری ہمارا مدعا
اے خدا اپنی عطا کے واسطے سرور ہر دو سرا کے واسطے
چار یار رہنما کے واسطے پیروان مصطفےٰ کے واسطے
مجھکو علم فقہ و دیں تو کر عطا اور توفیق عمل دے اے خدا

یا وہ چیز مانگی جو ہمیشہ اور دونوں جہان میں کام آوے۔ جیسا کہ اپنی ایک دعائیہ نظم مطبوعہ "الفقہہ" کے مقطع میں فرماتی ہیں۔

صالحہ پر رحم کر خیر النبیا کے واسطے بخشش وہ نعمت جو کام آئے سدا کے واسطے

اسلئے آپ کی شادی میں غزل سرائی، قافیہ پیمائی، گل و بلبل کی حکایت، عشق و محبت کے افسانے، غم ہجر اور رنج فراق کی فرضی داستان کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔

افسوس یہ ہے کہ مرحومہ نے اس فن میں باضابطہ کسی بلند پایہ اور مستند شخص سے تلمذ حاصل نہ کیا، اور ایک کوردہ کی مستقل اقامت اور کثرت مشاغل کی وجہ سے نہ بان کی تدریجی ترقیوں سے مستفید ہونے کا ان کو موقع نہ ملا، تاہم عبقریت مجموعی آپ کا کلام قدر کے لائق ہے۔ ذیل میں آپ کے ایک منظومہ خط کا اقتباس درج ہے، جو مرحومہ نے اپنی بیوہ اور غمزدہ صاحبزادی عائشہ بیگم کو تحریر فرمایا تھا، یہ خط طول و طویل ہے۔ تقریباً پچاس ساٹھ اشعار ہیں، اور ان تمام خصوصیات کا حامل ہے جن کی طرف میں نے سرسری اشارہ کردیا ہے۔ خط کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے :-

میری عائشہ! ماں تری صالحہ ہے جو ہر درد میں صابرہ شاکرہ ہے،

پھر اپنے اس صبر و شکر کے دعویٰ کی دلیل مشاہدات کی روشنی میں پیش کرتی ہیں :-

تن زار کی میرے تو دیکھ حالت نہ باقی ہے صحت، نہ باقی ہے طاقت
نہ تھا آسماں بوجھ اٹھانے کے قابل سب آفات سہنے کو آیا تھا یہ دل

اس کے بعد عالمانہ اور عارفانہ نصیحتیں شروع ہوتی ہیں :-

بشر کو ہے لازم کہ ہمت نہ ہارے نہ خائف بلا سے ہو، سب بوجھ اٹھائے
نہ ہو بیقرار اور نہ ہرگز ہو مضطر کہ ہے صبر اور شکر ہر شے سے بہتر
مصیبت حسینؓ اور نبیؐ نے اٹھائی کیا کربلا میں ادا شکر باری
نہ ایوبؑ و یعقوبؑ سے ہم ہیں بڑھکر کہ ہم چین لیں اور بلا آئے اُن پر

بتا تو نے کیا بیقراری سے پایا — وہی ہو رہا ہے جو منظورِ رب تھا

اُس کے بعد یہ چند شعر ملاحظہ ہوں جو درد و اثر سے لبریز ہیں، اور جد و جہد زندگی میں جوش عمل پیدا کرنے کیلئے ایک تازیانہ۔

دیا حق نے صبر و شکر اور ہمت — جو ہے کام، تو ہیچ ہیں ساری کلفت
رہی جب نہ راحت تو غم کب رہیگا — ہر اک شے ہے فانی وہی رب رہیگا

پھر روزانہ کے معمولی واقعات سے خداوند عالم کی رحمتِ بیکراں پر استدلال کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ تم ایک دفعہ اس درجہ بیمار ہوگئی تھیں کہ تمہاری زندگی کی کسی کو امید نہ تھی، تمہارے عزیز و اقران میں کوئی بھی تمہاری مصیبت اور تکلیف میں کام نہ آسکتا تھا، غیر تو غیر میں بھی مجبور اور بے بس تھی اور دعا کے سوا کچھ اختیار نہ تھا۔ مگر :-

سُنی جب خدا نے مری آہ و زاری — یکایک ہوا تم پہ پھر فضلِ باری
کبھی دل میں میمونہ کے درد بھر کر — ہوا خود تمہارا معین اور یاور
کبھی مہرباں کر کے خالہ کو بھیجا — کسی حال میں بھی نہ وہ تم کو بھولا

اس تمہید کے بعد اصل مطلب بیان کرتی ہیں :-

جلا جس نے مُردے سے زندہ بنایا — وہ کیا پھر خبر اب نہیں لینے والا
نہ ناشکری کا ایک فقرہ نکالو — نہ ہو کر کے مایوس اپنے کو، کوسو
یہ قدرت کا ہر دم تماشا رہا ہے — خدا بیکسی میں دکھائی دیا ہے
سنی جس نے آہ و بکا سب ہماری — ہے دریا کرم کا ابھی اُس کے جاری

شعر کیا ہے ایک زخمی دل کے لئے مرہم، ایک مضطرب اور بے قرار کے لئے وجہ سکون، اور ایک پریشان حال اور از خود رفتہ کے لئے سہارا ہے ـــــ خاتمہ کے اشعار نہایت پر لطف اور نازک جذبات کے حامل ہیں :-

عبث ہے یہاں جلد ہی تم ہو آتی — خوشی سے ہوں میں اپنے پھولے سماتی
برائے ہماری یہ امید یا رب! — کوئی ایسی پیدا ہو تمہید یا رب
مری عائشہ جلد سمری میں آئے — مجھے اپنی صورت وہ آکر دکھائے
ہے دیوار و در کو یہی انتظاری — کہ آجائے جلد عائشہ وہ ہماری

ہر اک کو سلام اور دعا میری کہدو
بس اب صالحہ روکتی ہے قلم کو

مرحومہ کا ایک دوسرا خط جو انتقال سے ایک ماہ قبل مرحومہ نے اپنی دوسری لڑکی خدیجہ بیگم زوجہ مولوی سید الطاف کریم۔ ایم۔ اے کو لکھا تھا، کچھ اشعار اُس کے بھی ملاحظہ ہوں :-

مری پیاری بیٹی کو میری دعا — رکھے خوش ہمیشہ اُسے کبریا
کروں اُس کے جذبات کا گیا بیاں — کہ منظوم خط اُس نے بھیجا یہاں
تمہارا یہ خط ہے محبت بھرا — کہ ہے میرے امراض کی اک دوا
مری پیاری بیٹی خدیجہ مری — ہیں پیشِ نظر سب سعادت تیری
عجب حوصلے والا دل ہے ترا — تو رکھتی ہے ہر اک کی خاطر مدارا
اِدھر اپنی بہنوں پہ ہے تو فدا — اُدھر میری دلجوئی مقصد ترا

یہ بات خاص طور پر ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ یہ مرحومہ کے ذاتی اور نجی خطوط ہیں جو انہوں نے محض بے تکلفانہ اور قلم برداشتہ اپنی بچیوں کو لکھے، ان کے متعلق مرحومہ کو شاید و ہم و گمان بھی نہ ہوگا کہ یہ چیزیں ایک دن شائع ہو کر منظر عام پر آئیں گی، اسلئے اس اشعار سے مرحومہ کی شاعری اور کلام کے معیار کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کرنا غلط ہوگا کہ یہ کلام مرحومہ کے نقطۂ نظر سے بہترین نمونہ نہیں ہے

آثارِ عتیقہ

قلعۂ رہتاس

از مولانا حافظ سید محمد عبدالروف صاحب ندوی، اورنگ آبادی

چند ماہ گذرے کہ میں دفتر ندیم میں بیٹھا تھا، اثنائے گفتگو میں اعزالاحباب عالیجناب مولانا سید ریاست علی صاحب ندوی، دام اقبالہٗ مدیر ندیم گیا نے قلعہ رہتاس پر ایک مکمل مضمون لکھنے کی فرمائش کی، میں نے اس خدمت کا بیڑا اٹھایا، یہ حسن اتفاق تھا کہ نومبر ۳۵ء میں ایک جماعت قلعہ مذکور کی سیر کو اورنگ آباد سے گئی ہوئی تھی جس میں قابل ذکر اصحاب مولوی ضیح الدین صاحب مجتبی ریونیو آفیسر پرانے کیلا اسسٹنٹ اور مولوی محمد یوسف صاحب ملتی ایم اے انگلش ٹیچر مدرسۂ شمس الہدیٰ پٹنہ تھے اور راقم الحروف بھی رفیق سفر تھا، اُسی موقع پر اس موضوع کے قیمتی معلومات اور مواد حاصل ہو چکے تھے اور محترم دوست کی فرمائش کو پورا کرنا راقم سطور کے لئے اب آسان تھا، چنانچہ اب اضافۂ مزید کے بعد ذیل کا مضمون ہدیۂ ناظرین ہے۔ امید ہے کہ آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اس تاریخی و ادبی مضمون سے لطف اٹھائیں گے ——— "عبدالرؤف"

خاک پاک ہر ہائے عہد عتیق کی زندہ یادگار، اور آثار سلف کی بے نظیر مثال قلعہ رہتاس ہے۔ اس پیر کہن سال نے اپنی طویل مدت عمر میں کتنے انقلاب دیکھے، کوئی تاریخ صحیح طور پر نہیں بتا سکتی ہے۔ اگر ایک طرف اُس نے ہند قدیم کے راجگان اولوالعزم کے نقش و نگار دیکھے تو دوسری طرف شاہان افاغنہ و مغل کے جاہ و جلال، شان و شکوہ دیکھے۔ قلعہ مذکور آثار قدیمہ کا ایک گہوارہ ہے جس کے ہر ہر ذرہ میں راجگان ہند اور شاہان ایران و ہندوستان کی داستانیں گم ہیں۔ آثار قلعہ سے کتنے سر بفلک قایم اور کتنے سر بزمین مسجود کتنے موجود کتنے مفقود ہیں۔ غرضکہ آثار نہیں عبرت کے مرقع ہیں جو بزبان حال فاعتبروا یا اولی الابصار پڑھ رہے ہیں۔

تاجدارانِ ہند قدیم اور شاہانِ عجم سے جو وابستگی رہی ہے اُس کو قلعہ رہتاس کی تاریخ مرتب کرنے والا کسی طور پر قلم انداز نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں اسلئے اس حصہ کو حذف کر کے ابتداً یہ کہہ سکتے ہیں کہ:-

قلعۂ رہتاس کا بانی

شاہ ہند شنکل کے فرزند رشید راجہ رہت[1] نے قلعہ رہتاس کی بنا ڈالی ہے۔ اس کی حکومت مالدہ تک پھیلی ہوئی تھی، چنانچہ فرشتہ تحریر کرتا ہے کہ

راجہ بود عابد و نیک اندیش و خوش خلق۔ حاصل ممالک خود را ترجمہ:- رہت عبادت گذار نیک خلق راجہ تھا۔ اُس کی حکومت گڈھ[2]

---

[1] رہتاس گڈھ پر مستقل ایک کتاب چند ورق کی بزبان انگریزی Description of Extract Rohtas garh یعنی بیان رہتاس گڈھ مارٹن صاحب کی پائی جاتی ہے جس میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ شہزادہ رہتاسوا کے نام سے نسبت رکھتا ہے۔ اور رہتاسوا مشہور ہند خاندان سورج بنسی کا راجہ ہریشچندر..... کا فرزند تھا۔ اور اسی تحقیق کو مولوی ابو محمد مصلح صاحب شہسرامی نے تاریخ شہسرام کے حصہ قلعہ رہتاس میں بروند طریق پر غالباً اضافہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مارٹن صاحب نے کسی پرانے کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے جو کچھ لکھا ہے مشہور عام کی بنا پر لکھا ہے۔ کیونکہ قلعہ مذکور کی بنا اور اُسکے بانی کی ہیئت ہندوؤں کی مشہور کتاب مہابھارت اور رامائن خاموش ہیں بے شبہ ہندوؤں کی ان کتابوں میں سورج بنسی خاندان کے راجہ ہریشچندر اور اُس کے فرزند رہتاسوا کی وہ مشہور داستان کہ وشوامترمرشی نے راجہ کے کسی ایک نامعلوم جرم کی سزا یوں کی کہ بیوی اور بیٹے رہت کے برہمن کے ہاتھ فروخت کرے۔ اور نیز ہریشچندر نے خود کو بنارس کے ڈوم کے ہاتھ فروخت کیا۔ اور مزید داستان اسی سلسلہ کی مشتہر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رہت کے اسی مشارکت سے لوگوں کو دھوکہ ہوا ہے۔

[2] گڈھ سے مراد یہی رہتاس گڈھ ہو جس پر قلعہ مذکور تعمیر ہوا۔ اور نیز اس عبادت سے ظاہر ہے کہ رہت کی راجدھانی رہتاس گڈھ قرار پائی تھی۔

از گذشتہ تا سہ حد مالوہ بود ۔ ۔ ۔

و فیصلے صادر ہوتے جن پر بنام سرکار رہتاس مہریں ثبت ہوتیں۔

مارٹن صاحب[۱] لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں اس قلعہ کے اندر ہمیشہ ایک قلعہ دار رہا جس کی ماتحتی میں ایک دیوان ہوتا۔ اور اُس کے انتظام میں چین پور، کیرا، موگرود، سرس[۲]، کمٹیا، ڈگل، چرنگنگا، جیلا، بلوجا، جاہا گڑھ، اکبر پور، تلوعفو، شہنسرام وغیرہ تھے۔ علاوہ ازیں قلعہ دار عموماً ۴۰۰ سے ۵۰۰ تک اشخاص اپنی ذات کے لئے رکھتا تھا۔ جن کے عزل و نصب کا اس کو پورا اختیار ہوتا تھا اور فوجی انتظامات دہ ہزاری عہدے رکھنے والوں کے ہاتھ میں ہوتے۔ اس منصب کی آخری یادگار کرامت خاں اور آخری دیوان کے گماشتہ کے نوشتہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دہ ہزاری چودہ ہزاری کے ماتحت ہوتے جو قلعہ ہی میں سکونت رکھتے تھے۔ اور اُن کے اہل وعیال اور دیگر وابستگان کے قیام کے لئے قلعہ کے اوپر مکانات ہوتے تھے۔ بہرکیف اُن کے متعلق تو پیخانہ و میگزین کا کام سپرد ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ قلعہ کئی فوج کا کام بھی انجام دیتے۔ علاوہ ازیں دو رسالے اسلحے اور بندوق سے مسلح ہوتے۔ اور ہر رسالہ دو ہزار سپاہیوں پر مشتمل ہوتا۔ اُن کی تعیناتی قلعہ ہی پر ہوتی۔ اور وقت ضرورت کبھی اُن میں اضافے بھی ہو جاتے۔ اور باضابطہ طور مسلح فوج سے پہرہ بدلتا رہتا۔

مزید براں قلعہ دار[۳] کی قیام گاہ سے راج گھاٹ تک پُر رونق بازار تھا۔ جس کی چھت پٹی ہوئی اور راستے پختہ و سنگین تھے۔ قرینہ سے دُوکانیں لگی ہوتیں اور کاریگران چابکدست اور صناع نازک خیال رہتے تھے۔ ضرورت کی چیزیں مہیا اور ہر جنس کی چیزیں ہر وقت وافر دستیاب ہوتی تھیں۔ متعدد مسجدیں اور ایک جامع مسجد اور مدرسہ[۴] بھی تھا۔ سپاہیاں متعلقہ قلعہ اور عملگان دفتر اور وابستگان منصبداران قلعہ اور پیشہ وروں سے قلعہ پر اچھا خاصہ شہر آباد تھا۔

قلعۂ رہتاس کی جغرافی حالت

بہار کی کمشنری پٹنہ میں شہر آرہ سے جنوب مغرب ۴۵ میل فاصلہ پر اور شیر شاہی سڑک (جو سونہ ایسٹ بنگ اور ڈہری اون سون سے گذرتی ہے) سے جنوبی سمت کو ۲۰ میل کے فاصلہ پر بندھیاچل کے کوہستانی سلسلہ کی شاخ کیمور نامی پہاڑی کی بلندی پر قلعہ مذکور واقع ہے۔ بائیں طرف دریائے سون بہریں لے رہا ہے تو دائیں جانب پہاڑیاں اور بکثرت جھاڑیاں ہیں۔ محیط قلعہ[۵] ۳۲ میل اور فصیل قلعہ ۴ میل ہے جس میں دوہری سنگین مورچہ بندیاں ہیں۔ اُس کے چہار طرف چودہ گھاٹیاں ہیں۔ پائیں قلعہ میں تین طرف شمال و جنوب و مغرب گھاٹیاں ہیں۔ آثار قلعہ مشرق سے مغرب تک تقریباً پانچ چھ میل اور شمال سے جنوب تک پانچ میل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بنا بریں ۳۵ میل مربع میں پہاڑی کا ایک حصہ ختم ہوتا ہے۔ دوسرا عمیق و عریض حصہ جسے کریاری کھوہ کہتے ہیں، وہ سطح مرتفع کو جدا کرتا ہے۔ اور پھر اسی کریاری کھوہ کی ایک شاخ گلیاری کھوہ بھی اُس مرتفع سطح کو جانب غرب جدا کرتی ہے۔ اور وہ اپنی منتہی جنوبی اور اُس چٹان کے درمیان جو سون پر واقع ہے۔ ایک جزیرہ نما شکل کی پہاڑی کو چھوڑ کر تقریباً چار سو گز عریض صاف ہو گئی ہے اور چٹان تک پہونچنے کے لئے گذرگاہیں استوار و محکم ہیں۔ چار بڑے بڑے پھاٹک ہیں، اور انہیں پھاٹکوں سے سطح بالائی تک رسائی بآسانی ہو سکتی ہے۔ استحکامات کے آثار فی الحال راج گھاٹ اور کھنڈ تیا میں موجود ہیں۔ یہی جزیرہ نما اُس سطح مرتفع کو اکبر پور سے ملاتا ہے ——— اس مرتفع سطح پر قلعہ کا جو حصہ واقع ہے وہ شکستہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حملہ آوروں کی مدافعت کے لئے ایک وسیع خندق تھی۔ ان آثار کو راجہ مان سنگھ نے ۱۵۹۷ء میں کچھ اور مستحکم کیا تھا جو بہترین استحکامات کے آثار ہیں۔ ان کی ساخت دو پھاٹکوں سے تمام ہوئی ہے۔ پہلا پھاٹک اُس جزیرہ نما شکل کے پہاڑی کی شمال کی طرف ۶۰ قدم کے فاصلہ پر راستوں اور شہر بناہوں سے علیحدہ ہے۔ یہ پھاٹک اور خندق دوہرے سنگین حصار اور قلعہ کی برجیوں سے مستحکم ہیں۔ یہ برجیاں پشت پہاڑی سے گذر کر تقریباً ۶۰ یا ۷۰ فیٹ ۴۰۰ گز لمبائی تک خندق سے اونچی ہیں۔ استحکامات کا دوسرا حصہ جزیرہ نما پہاڑی سے گزرتا ہوا شمال کی طرف چلا گیا ہے، اُن آثار سے آج صرف ایک

---

[۱] کتاب مذکور بیان رہتاس گڈھ۔ [۲] اسی پرگنہ سرس کا مشہور قصبہ اورنگ آباد ہے۔
[۳] مدرسہ، بازار کی بابت صراحۃً مارٹن صاحب نے تحریر کیا ہے اور دیگر حقیقتیں عنوانات بیان اور قرائن سے صاف ظاہر ہیں۔ [۴] ماخوذ از منتخب اللباب و آثار شرف۔
[۵] بیان رہتاس گڈھ مارٹن صاحب۔

خوبصورت دروازہ کھڑا ہے جسے لال پتھروں کی مناسبت سے لال دروازہ کہا جاتا ہے[1]

قلعۂ رہتاس کی راہیں اور اُس کے آثار

قلعہ مذکور تک پہونچنے کی دو ہی راہیں معلوم ہیں۔ ایک اکبر پور[2] سے جس کو صدر راستہ کہا جاسکتا ہے دوسری کوٹا گھاٹی شہسرام سے۔ مگر یہ دوسری راہ دشوار اور خطرناک بتائی جاتی ہے۔ قلعہ کی سیر کے دلدادہ سیاحان عالم براہ ریلوے[3] اکبر پور پہونچتے ہیں اور اکبر پور سے قلعے کے اوپر جاتے ہیں۔ قصبہ مذکور کے مغربی سمت کو قلعہ کے راستہ پر سنگیں حصار نظر آتے ہیں۔ جن کے پاس ہی ایک سنگین بڑی طویل باؤلی ہے اور نیز بڑے قطر کا چاہ پختہ اور سنگین چہار دیواری سے گھرا ہوا ایک مقبرہ ہے۔ جس کے اندر قنناتی مسجدیں اور قبریں ہیں۔ بعض تعویذ مزار پر سنگیں حروف میں کچھ لکھے نظر آتے ہیں، مگر پڑھے نہیں جاتے ہیں۔ مقبرہ کی پیشانی پر مندرجہ ذیل طویل کتبہ مکتوب ہے۔ عبارت کتبہ :-

"در عہد شاہجہاں بادشاہ غازی کہ حکومت قلعہ داری بمنصب سہ ہزاری و فوجداری از مکرآئن و پرگنہ سرس و کمتہ تا بنارس و جاگیر پرگنہ چندو و پرگنہ منگرو او تلوتھو و اکبر پور و بلوبچا و[4] بجے گدھ و چلا بہ نواب عالیمقدار، اخلاص خاں مقرر و مستلم بود اقل عباد اللہ ملک واصل کہ بہ منزل فرزند سرفراز بود دار و غگی قلعہ رہتاس فوجداری دیہات و نواحی قلعہ مسلم بود، دریں اثنا رخویش نزدیکی برحمت حق پیوست، بنابر آن توفیق حق بحاطر رسید کہ خانۂ آخرت در حین حیات صحن و عمارت چبوترہ مسجد چہار دیواری باولی و باغ طرف شمال و جنوب بنا کرد و شروع عمارت بتاریخ ۸ ربیع الآخر سنہ ۱۰۴۶ھ و بتاریخ ..... رمضان المبارک سنہ ۱۰۴۷ھ مرتب شد"

یعنی شاہجہانی عہد میں ملک واصل خاں فرزند نواب اخلاص خاں سابق قلعہ دار و فوجدار علاقجات جو بعد وفات نواب مذکور خود دار و غگی و فوجداری کے عہدہ پر سرفراز تھا۔ اُس نے زمانہ عہدہ داری میں اولاد کی وفات پر مقبرہ مذکور اور اُس کے متعلق عمارتیں تیار کرائی تھیں۔ اور یہ عمارتیں ایک سال پانچ مہینہ میں اختتام پذیر ہوئی تھیں۔ عمارات مندرجہ کے علاوہ ایک باغ کی طرف بھی اشارہ ہے مگر افسوس وہ دامن خزاں کی نذر ہوگیا جس کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔

علاوہ ازیں کتبہ مندرجہ سے قلعۂ رہتاس کے انتظامی امور پر روشنی پڑتی ہے کہ ایک قلعہ دار یا داروغہ قلعہ عہدہ فوجداری علاقجات نامیدہ رکھتا تھا۔ علاقجات و پرگنات کی تصریح سے اُس کے حدود و وسعت کا پتہ چلتا ہے۔ کہ موجودہ ضلعوار حدود سے اُس کی وسعت تقریباً دوگونہ تھی۔ اس سے آگے بڑھ کر اُس راستہ پر آتے ہیں جو رہتاس پہاڑ کو گیا ہے۔ راستہ میں چُونے کی قدرتی پہاڑیاں جابجا ملتی ہیں اور وہ جھاڑیوں سے ڈھکی و چھپی ہوئی ہیں۔ اسی کے بعد ہی وہ ڈھالو اٹیک کہئے یا راستہ ملتا ہے جس میں شکستہ سیڑھیوں کے آثار نظر آتے اور قدم قدم پر ملتے ہیں۔ اور نیز اس تنگ راستہ کے دونوں بازوؤں میں گھنے جنگل اور جھاڑیاں ہیں۔ اسی دشوار گذار راہ سے قلعہ کی بالائی سطح پر اس طرح پہونچتے ہیں کہ ہاتھ میں ڈنڈے لئے ٹیکتے ہوئے جابجا دم لیتے ہوئے۔ زاید از دو میل

---

[1] از تاریخ سہسرام مصنفہ ابو محمد مفلیح سہسرامی Description of Extract Rohtas-ghara From Martins eastern india Volum I

[2] اکبر پور سہسرام سب ڈویژن کا ایک بڑا گاؤں ہے جو دریائے سون پر واقع ہے۔ اور قلعۂ رہتاس کی ناہموار چٹانوں سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ہے ——— راجہ مان سنگھ نے شہنشاہ اکبر کے نام پر بسایا ہے۔ یہاں کے مسلم باشندے اُسی عہد اکبری کے کسی منصب دار اور عہدہ دار سے تعلق رکھتے ہیں۔

[3] گرین کارڈ لائن پر ڈہری اون سون مشہور جنکشن ہے۔ وہاں سے لائٹ ریلوے رہتاس فورٹ کو گئی ہے۔ رہتاس فورٹ اسٹیشن زمین اکبر پور میں واقع ہے۔ شائقین قصبہ مذکور سے اشیاء خوردنی ہمراہ لے کر قلعہ کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ ——— اور اوپر ڈاک بنگلہ میں قیام کرتے ہیں جہاں آرام کے سامان مہیا ہوتے ہیں۔

[4] سلاطین تغلقیہ کے زمانہ میں اور اُس کے بعد بھی فرمانروا اکثر ملک سے خطاب کئے جاتے تھے، بنابریں یہ ایک عہدہ ہے نہ قومیت۔

سنگ میل مسافت طے کرکے قلعہ کے حصار سنگین اور اُس دروازہ تک پہونچتے ہیں جہاں سے تقریباً دو میل پرے سمت مشرق اکبری قلعہ اور محل شاہی کی پُرشکوہ عمارتیں نظر آتی ہیں۔ اس دروازہ سے جو راستہ قصبہ مذکور کو گیا ہے، اس میں جا بجا جھاڑیاں اور عالیشان کہنہ درخت، تالاب، نہریں، رواں چشمے، بستیاں آباد یاں ملتی ہیں اور اسی راہ کے دائیں بائیں قلعہ کے آثار باقیہ پھیلے ہوئے ہیں۔

قلعہ کے آثار صنادید

آثار باقیہ پر نظر ڈالنے سے ہمیں ہر عہد کی ایک دو یادگاریں نظر آتی ہیں۔ چنانچہ تفحص مزید کے بعد بعنوانات مختلفہ چند یادگاریں ذیل میں درج کی جاتی ہیں :-

(عہد ہنود)

مذکورہ بالا جزیرہ نما کے شمال و مشرق گوشہ میں ایک پہاڑی پر خوشنما عمارت ہے جو چوراسی سیڑھی کی عمارت کے نام سے مشہور ہے[1]۔ ۸۴ زینوں کو طے کرنے کے بعد اُس عمارت تک رسائی ہوتی ہے۔ حقیقت میں یہ دو مندر ہیں جو ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ عمارت کی ساخت ستون دار کمروں پر مشتمل ہے۔ جس پر پانچ قبے ہیں۔ ان میں سے ایک مندر میں راجہ رہتک کے اور دوسرے میں اُس کے باپ راجہ شکل کے مجسمے بصورت مورتیاں نصب تھے۔ جس کے متعلق مہربان جناب مارٹن صاحب کتاب مذکور میں تحریر کرتے ہیں کہ رہتاسو اکے مندر کی پرستش عہد عالمگیری تک تھی، جن کی مورتیوں اور بتوں کو عالمگیر کے دست استبداد نے فنا کر دیا ——— یا انہیہ فیل شکلیں اور تصویریں اُس میں نظر آتی ہیں۔ بیچ چھت میں نقیش کی اور اُس کے اوپر چند نامعلوم پرندوں کی شکلیں ہیں جو ہنس وغیرہ سے مشابہت کچھ رکھتی ہیں، اور پھر انہیں شکلوں کے پائیں میں دونوں بازوؤں پر دو شمشیر بکف انسان کی شبیہیں ہے۔ ——— اور نیز مہربان مذکور لکھتے ہیں کہ مندروں کے عقب پر ایک عالمگیری مسجد تھی جس کے آثار شکستہ کچھ باقی ہیں ———

چوراسی سیڑھیوں کی پیمائشی حساب یہ ہے کہ ہر ایک زینہ آٹھ انچ اونچا اور دس انچ چوڑا۔ اور دس فیٹ لمبا ہے۔ اور نیز زینوں کی ہیئت و نوعیت سے ظاہر ہے کہ یہ زینے راجہ مان سنگھ کے پہلے کے نہ ہونگے۔

اسی چوراسی سیڑھی والی عمارت کے مقابل پہاڑی مذکور کے نیچے ایک کھلا ہوا ہشت پہل ستون دار کمرہ ہے جس پر نصف گنبد قبہ ہے۔ راجہ مان سنگھ کا بنایا ہوا مندر ہے۔ اس میں بھی مورتی موجود نہیں ہے۔ اور صاحب مہربان نے اس کی بابت بھی حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کو اُسی طرح بدنام کیا ہے۔

اسی جزیرہ نما پر مندر مذکور کے قریب ہی ناہموار پتھروں کی لاٹھ جو ۳۵ فیٹ بلند نظر آتی ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ رہتاسو اکے عہد کی کوئی یادگار مندر مذکور کے علاوہ ہو سکتی ہے تو یہی پتھروں کے سر بلند ٹوڈے ہو سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں قلعہ کی عمارت سے دو میل فاصلہ پر شمالی جہت کو لال دروازہ ہے جس پر ۱۱۱۱ھ کا کتبہ ہے، جس پر یہ تاب[2] ڈھولا سردار قوم

---

[1] قلعہ کے اس حصہ کا حصہ بہت بلند ہے۔ اس کی اونچائی کی بابت فرشتہ نے زاید ایک کروہ لکھا ہے اور دوسروں نے دو کروہ اور نیز زاید از دو کروہ تحریر کیا ہے۔ اگر کم از کم ڈیڑھ میل مسافت مان لیجائے تو از روئے حساب دس ہزار پانسو ساٹھ فیٹ اُس کی بلندی ہوتی ہے۔ [2] مغربی حکمرانوں نے ابتداً حکمرانی سے جس حکمت عملیوں کو عمل میں لایا ہے اُس کا اقتضا یہی ہے کہ شاہان اسلام کو عموماً اور اعلیحضرت اورنگ زیب عالمگیر نور اللہ مرقدہ کو خصوصاً بدنام کیا جائے۔ ان جیسے الزامات کے خلاف ایک نہیں بیسیوں محققانہ مضامین نکل چکے ہیں اس لئے اس پر مزید قلم فرسائی کی ضرورت نہیں ہے۔ جی تو یہ ہے کہ ہندو دنیا اور اُن کے شعار کے ساتھ شاہ ممدوح نے جو شاہانہ الطاف و نوازش مبذول رکھی اگر وہ فیاضان شعار اسلام کے ساتھ مبذول ہوتیں تو آج اسلامیان ہند اُن کو نام پر فاتحہ خوانی اور عرس کرتے۔ ہمارے ضلع گیا میں بودھ مندر میں شاہ ممدوح نے تقریباً پانچ لاکھ آمدنی کی جائداد التمغاوی بھی جو آجتک باقی ہے (ندیم : اس فرمان کا عکس اسی نمبر میں ملاحظہ فرمائیں) ——— اسی طرح بروبگر مقامات میں بھی اس کے اثرات بکثرت ملتے ہیں۔ ——— بنابریں مارٹن صاحب کے یہ الزام کا بے بنیاد اور سراسر غلط ہیں حقیقت یہ ہے کہ قلعہ رہتاس کے مندر اور اُن کے نصب کردہ بُت جنرل کارنوالس صاحب کے ہاتھوں برباد ہوئے، کیونکہ جنرل مذکور کا دورِ حکمرانی جدھر تھا جیسوں آثار نیست و نابود کروئے گئے ہیں۔ اس کا اقرار خود جناب مارٹن صاحب کو بھی ہے۔ اندریں صورت ملزم کون ہے، انصاف فرمائیں۔

[3] کہروار ایک جنگلی مگر قدیم العہد قوم ہے جو سورج بنسی کہنے کی مدعی ہے اور وہ اپنے کو راجہ رہتاس اور اُس کے پدر سے منسوب کرتی ہے۔ اسی قوم کا ایک سردار پرتاب سنگھ ڈھولا ہوا ہے جس کا آبائی اور قدیمی مسکن رہتاس بتایا جاتا ہے۔ علاقجات قلعہ کا حاکم مطلق تھا۔

کہروار کے جانشین وارث کا نام مذکور ہے۔

اور مختلف مقام پر تین تالاب نظر آتے ہیں جو راجگان قلعہ راجہ بین[1]، راجہ گور، راجہ چندر بھان کی طرف منسوب اور انہیں کے نام سے موسوم ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہر سہ راجہ ایک ہی برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شیر شاہ نے قلعہ رہتاس کو راجہ چندر بھان سے حاصل کیا، مگر اس کی تغلیط اس کتبہ سے ہو جاتی جو ہندو گھاٹ پر ہے۔

عہد افاغنہ

جزیرہ نما پرلال دروازہ سے دو میل فاصلہ پر ایک طرف شاندار اور استوار مسجد ہے جو جامع شیر شاہی کے نام سے مشہور عام ہے، جس پر قبے و گنبد چند ہیں، اس کی ساخت عظیم آباد[2] کے جامع مسجد شیر شاہی سے مماثلت رکھتی ہے۔

اس کے متعلق مارٹن صاحب لکھتے ہیں جامع مسجد شیر شاہی جو عالمگیری مسجد کے نام سے مشہور انام ہوئی ہے، اسکو بیبت خاں کا کتبہ[3] جو فارسی میں کندہ ہے اس کی تغلیط کرتا ہے۔ کتبہ سنہ ۱۰۴۳ھ کا ہے۔ مسجد کے اندر امام کا حجرہ بھی ہے۔ فصیل قلعہ کا وہ حصہ جو غربی سمت کو ہے اس کو شیر شاہ نے غلام حسنی داروغہ قلعہ اور ناظر تعمیرات کی نگرانی میں تعمیر کرایا تھا۔ یہی داروغہ جب قلعہ کا حاکم بنایا گیا ہے تو اسی نے مدرسہ و مسجد تعمیر کرایا جن کا اب نام و نشان نہیں ہے۔

عہد مغل (مسجد حبش خاں)

حبش خاں امرائے[4] عساکر سے تھا، محب علی خاں قلعہ دار رہتاس کے ہمراہ باغیوں کے مقابلہ میں سخت جنگ تھا۔ چنانچہ جنگ بکسر میں شہنشاہ اکبر کے عہد میں سنہ ۹۸۷ھ میں شہید ہوا۔ لاشہ جنگ گاہ سے قلعہ کے اوپر لایا گیا۔ اور اسکی بنائی ہوئی مسجد میں دفن کیا گیا۔ یہ عمارت درحقیقت مسجد ہے جس میں بانی مسجد کا مزار بھی ہے۔ اسی مناسبت اس کو مقبرہ اور روضہ حبش خاں مشہور کیا گیا اور مورخین[5] نے بھی روضہ کے عنوان سے اس کو بیان کیا ہے۔ مسجد مذکور کو حبش خاں نے حیات ہی میں محب علی خاں کی قلعہ داری کے زمانہ میں سنہ ۹۷۶ھ میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کی ساخت حبش خاں سور پدر شیر خاں کے روضہ سہسرام کی پوری مشابہت و مماثلت رکھتی ہے۔ مندرجہ ذیل تاریخ مسجد مذکور پر کندہ ہے۔

اکبر غازی آن کہ از رفعت — می کند رخش او بگردوں سیر
در زمانہ چنیں شہنشا ہے، — کہ بفرمان او سمت وحش و طیر
بود در خاطر ایں حبش خاں را — کہ کند مسجد از برائے خیر
سال تاریخ مسجد عالی، — شد زروئے حساب بقعہ خیر

در تاریخ شہر المرجب سنہ ۹۸۶ھ۔

عہد اکبری میں قلعہ پر سب سے پہلے جو عمارت تعمیر ہوئی ہے وہ یہی مسجد حبش خاں اور مقبرہ ساقی خاں ہے۔ کیونکہ سنہ ۹۸۳ھ میں قبضہ ہوا اور سنہ ۹۸۶ھ میں مسجد مذکور تعمیر ہوئی ہے۔

---

[1] راجگان مذکور کی بابت مارٹن صاحب نے تحریر کیا ہے کہ ان کا عہد سنہ ۱۰۰۰ھ و سنہ ۱۱۰۰ھ میں تھا اور یہ مالکان قلعہ رہتاس سے گذرے ہیں۔

[2] پٹنہ سیٹی محلہ دھولپورہ میں مسجد شیر شاہی ہے جس کی محیر العقول صنعت یہ ہے کہ صحن مسجد اور اندرونی حصہ سے بایں قیمے معلوم ہوتے ہیں اور اوپر سے صرف مینار معلوم ہوتے ہیں۔ (ندیم) :- اس مسجد کا فوٹو اسی نمبر میں ملاحظہ ہو۔ افسوس کہ زلزلہ میں اس مسجد کو غیر معمولی نقصان پہنچا۔ مولوی محمد قاسم صاحب رئیس دھولپورہ اس کی مرمت و تعمیر جدید میں ان دنوں مشغول ہیں، مسلمان اپنے عطایا سے اس کار خیر میں حصہ لیں اور اس تاریخی یادگار کو مٹنے سے بچالیں۔)

[3] مقابر و مساجد تعمیر شدہ کل جالیوں کے پردہ سے بنظر حفاظت اس طرح پر بند کر دی گئیں کہ اندر کی حالت دریافت کرنا مشکل ہے اور نظر محکمۂ آثار قدیمہ کیجانب سے مسدود دروازوں کے کھولنے کی سخت ممانعت ہے۔ بنابریں اندرونی کیفیت دریافت نہ کیجا سکی اور نہ کتبہ مندرجہ نقل کیا جا سکا۔ کتبہ مذکور اندرونی سمت کو شاید لگا ہوا ہے۔

[4] ماثر الامرا جلد اول

[5] مارٹن صاحب نے اور انہیں صاحب کی پیروی میں مولوی ابو محمد مصلح صاحب نے تاریخ سہسرام میں روضہ حبش خاں لکھا ہے اور حبش خاں کی بابت مارٹن صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اوس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیر شاہ کے عہد میں ایک حبشی غلام تھا جو داروغہ قلعہ تھا جس کی نظارت و نگرانی میں قلعہ کی فصیل کا بعض حصہ تعمیر ہوا ہے۔ اور اس کو بعد وہ قلعہ کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اور مدرسہ و مسجد بنوایا۔ جس میں اس کا مزار ہے اور اس کے مقبرہ و روضہ کی ساخت سن خاں سور کے روضہ سے پوری مشابہت رکھتی ہے۔ حالانکہ یہ حبش خاں وہ غلام حبشی نہیں ہے۔

مقبرہ ساقی خاں اسی سنہ میں ساقی خاں جو امرا ءِ عساکر سے تھا اُس کا روضہ بھی تعمیر ہوا ہے جس کا کتبہ بشکل نقل اور مرتب کیا گیا ہے۔ کتبہ مذکور حسب ذیل ہے :-

فغاں از گردشِ چرخِ ستمگر — کہ نبود باکسِ اورا مہربانی
خلافِ ساقیِ سلطاں داشت در دل — کہ گردد مفتخر با اسم خانی
قضا، آمد چناں رنجور گردید، — کہ از صحت نبود اورا نشانی
باو پیکِ اجل آمد بگفتا، — سفر کن زود ازیں دنیائے فانی
بچشم از خرد تاریخ فوتش — بگفتا در بہشتِ جاودانی

۹۸۶ھ تاریخ برآمد ہوتی ہے

مقبرہ کی ساخت چار ستون پر ایک گنبد دار عمارت ہے۔ مقابل گنج شہیدان ہے۔ پیشانی مقبرہ پر معمولی پتھر نصب ہے۔ جس پر تاریخ مندرجہ تراشیدہ حروف میں منقوش ہے۔

مسجد خواجہ سرا یہ ایک مختصر سی مسجد ہے جو گورستان کے بیچ میں واقع ہے۔ سنہ ۱۵۸۰ء میں تعمیر ہوئی تھی

نو تعمیر قلعہ اور اُس کی عمارتیں قلعہ کے دروازہ سے دو میل سمت مغرب مسافت طے کرنے پر بلند پختہ چہار دیواریاں ملتی ہیں۔ چہار دیواری کے وسیع صحن سے گذر کر ایک بڑے دروازہ سے محل کے بیرون صحن میں قدم رکھتے ہیں۔ یہ صحن غیر معمولی وسیع ہے۔ اس کے سہ طرف سر بفلک سنگین پھاٹک کھڑے ہیں اور شمال و مغرب گوشہ سے قوس کی شکل میں فوج کی بارکیں اور اصطبل کا سلسلہ شروع ہو کر جنوب و مغرب گوشہ پر ختم ہوتا ہے۔ افواج متعینہ کی قیام گاہ شاید یہی بارکیں ہیں۔ صحن کے جنوب و مغرب گوشہ پر محل کا وسیع اور سر بلند پھاٹک ہے جس کی محرابیں دوہری اور بہت بلند و کشادہ ہیں۔ اس کے دونوں بازوؤں پر بیرونی سمت کو پیل سیاہ سنگین دیواروں میں بیٹھائے ہوئے ہیں۔ شاید اسی مناسبت سے اس کو ہتھیا پول کہتے ہیں سمت جنوبی کی محراب جو اندرون صحن کی طرف نمایاں ہے۔ اُس پر سنگ سرخ کی لوح چسپاں ہے جس پر بخطِ ریحانی جلی حروف میں یہ عبارت اور قطع فارسی کندہ ہے۔

ایں تاریخ در زمان سلطان جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ وسلطانہ

دروازۂ ہفتم بنائے جو شد تمام — دروازہ سپہر زرشکش سقیم شد
سال عمارتش چوں نمودم بطبع گفت — از راجہ مان[1] سنگ بنائے نعیم شد

تحریر فی التاریخ بست و ہفتم شہر رجب المرجب سنہ ہزار و پنج الف[2] ع

پروہت سریر ھر دار و عنہ بل بقدر مارواڑ صنعت گر استاد مبارکہ فقط(؟) دوسری طرف شاید یہی مضمون سنسکرت لغت میں مکتوب ہے۔

---

[1] پنج الف ع " یہ ایک معمہ ہی سا ہے، اس کے حل میں باخبر اصحاب مختلف الرائے ہیں۔ حضرت مولانا مولوی ابوالحسن خوشدل شہسرامی رحمۃ اللہ نے اس کا منشا اپنی یاعن کبیر میں تحریر فرمایا ہے کہ عمارت کی صرف مزدوری میں ساڑھے تین لاکھ روپے صرف ہوئے اور یہی حل صاحب تاریخ شہسرام حاشیہ ذیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ پنج الف ع " یعنی ساڑھے تین لاکھ اس کی تعمیر میں خرچ ہوئے۔ ظاہر تو پنج الف کا یہی مطلب ہے

+ مجموع = ۳۵۰۰۰۰ = ۵۰۰۰ × ۷۰

واضح رہے کہ اخراجات کی یہ تفصیل صرف مزدوروں کی ہے ——

بعضوں کا خیال ہے کہ پروہت سریر پھر مذکور کا یہ اعزازی نشان ہے۔ ممکن ہے کہ یہی ہو۔

[2] پورے مصرع سے تاریخ سنہ ۱۰۰۰۰ھ برآمد ہوتی ہے۔

عبارت مندرجہ سے ظاہر ہے کہ راجہ مان سنگھ[۱] فرمانروائے بہار نے عہد اکبری میں اور اپنے دورِ حکومت ۱۰۰۰ھ میں استادان کامل کے ہاتھوں زر کثیر صرف کر کے اس محل کو تعمیر کرایا اور نیز اپنے مذہبی پیشوا سر بھر کے ہاتھوں شاید اس محل کی بنیاد رکھوائی ہو اور بل بھدر ماواز کی نگرانی میں اس عمارت کا کام تمام ہوا ہو۔ مارٹن صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اس کتبہ اور کھٹوٹہ گیٹ کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محل کی عمارتوں کے کام کامل دس سال میں ختم ہوئے۔

اس محراب و در سے ایک بڑے زمین دوز کمرے سے گذر کر بارہ دری تک راستہ گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہی مقام ناظم اعلیٰ کا دربار تھا۔ اسی مناسبت سے اس کو دیوان عام بھی کہتے ہیں متفرق سرشتے۔ امتیازی نشستیں، توڑا خانے، وہ کل چیزیں جو دربار عام کے لئے ہونی چاہئیں تقریباً سب موجود ہیں۔ اور ایک برآمدہ پوری لمبائی میں ہے ——— اس پر اس ہولناک زلزلہ کا اثر ہے جو ۱۸۳۴ء میں واقع ہوا تھا کہ جا بجا سنگین شہتیر چٹخ گئی ہیں

اس نو تعمیر قلعہ کے محل دو بڑے حصوں میں ہیں، ایک بیرونی، دوسرے اندرونی۔ اور نیز اندرونی حصے چند حصوں میں تقسیم معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ مختلف صحن پائے جاتے ہیں۔ محل کے حصۂ بیرونی میں بارہ دری اور تخت شاہی قابل دید اور لائق ذکر عمارت ہیں۔

فرمانروائے سلطنت کی قیامگاہ بیرونی تخت شاہی کے نام سے یاد کیجاتی ہے۔ یہ چہار منزلہ عمارت ہے۔ بالائی سطح پر جانے کے لئے دونوں بازوؤں پر چھت دار ٹھنڈی نازک سیڑھیاں ہیں جو اوپر تک چلی گئی ہیں۔ اوپر پہونچکر راستہ متفرق دالان اور سائبان کی طرف نکل گیا ہے ——— دالان و سائبان کے محراب و در اور ستون سب نقش و نگار سے مزین ہیں۔ اور اس کے بالائی حصہ پر خوشنما قبتے اور گنبد ہیں، اور محل کے اندرونی حصوں میں لائق ذکر اور قابل دید عمارت شیش محل ہے، جو اندرونی حصوں کے وسط میں اور ایک پر فضا اور دلکشا باغ کے بیچ میں واقع ہے باغ کا طرز خاص تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایرانیوں کی وضع پر اس کو ترتیب دیا گیا تھا۔ اس لئے اس کو فارسی باغ سے نامزد کرتے ہیں۔ یہی وہ عمارت ہے جس میں رانی اپنی سہیلیوں کے ہمراہ قیام رکھتی تھی۔ اور نیز شاہان ہند اور فرمانروائے صوبہ کے قیام کے موقع پر بیگمات خاص کے ہمراہ قیام فرما ہوئی تھیں۔

اس کے بالاخانے سب پردہ دار ہیں، پردہ کا پورا لحاظ کیا گیا ہے۔ اس کے بالاخانے کی سیڑھیاں بھی چھت دار اور ٹھنڈی ہیں ——— اس عمارت اور تخت شاہی کے بالائی حصوں کی سیر زیادہ پر لطف ہے۔

دوسری سمت تیسرے درجہ پر ایک قبہ دار کمرہ اور کھڑکی ہے جس سے حرم مذکور کی چھتیں نظر آتی ہیں اور محل کے سارے مناظر پیش نظر ہو جاتے ہیں۔ اور بائیں میں دریائے سون کی لہریں، گھنے جنگلوں کی فضا اور صحرا و پہاڑ کا دلفریب نظارہ عجیب لطف پیدا کر رہا ہے۔

ایک سمت بالائی سطح پر ایک نازک اور حسین کمرہ برآمدہ جس کے ستون نقش و نگار سے مزین و مرصع ہیں ——— محل کے حصۂ زیریں میں حمام خانے اور حوض پائے جاتے ہیں۔

اس نو تعمیر قلعہ کے بالائی حصوں میں سمت شمالی و مشرق جا بجا بڑے بڑے سوراخ نظر آتے ہیں، جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ گولہ باری برق اندازی اور نیز تیر اندازی کے لئے یہ سوراخ بنائے گئے تھے اور ایسا ہی کچھ معلوم ہوتا ہے۔ مگر مارٹن صاحب لکھتے ہیں کہ ابوالفضل کا یہ کہنا کہ یہ سوراخ گولہ باری کے لئے ترتیب دئے گئے تھے غلط ہے، کیونکہ عہد اکبری تک توپ و گولہ کا استعمال ہرگز نہ تھا۔ ابوالفضل[۲] نے خوشامدانہ یہ دل خوش کن باتیں لکھ دی ہیں۔

---

[۱] مان سنگھ شرفائے قوم کچھواہہ راجپوت سے تھا اور بھگونت داس ولد بہارمل کچھواہہ فرمانروائے جے پور کا لڑکا یا بھتیجا تھا۔ چونکہ بہارمل اکبر بادشاہ کا اور بھگونت داس جہانگیر بادشاہ کا خسر تھا بنابریں اس ازدواجی تعلق کے سبب مان سنگھ اکبری و جہانگیری عہد میں صوبہ داری و سپہ سالاری کے عہدہ پر سرفراز رہا چنانچہ پہلے کابل کی مسند نظامت پر تھا۔ ازاں بعد ۱۰۰۸ھ میں بہار آیا۔ قیام بہار میں اُسے راجہ کا خطاب حاصل ہوا۔ اور دس سال اس قلعہ رہتاس پر قیام کر کے قابل توجہ یادگار عمارتیں چھوڑیں۔ یہاں سے بنگال روانہ ہوا اور عہد جہانگیری میں ۱۰۲۳ھ میں وفات پائی۔

[۲] صاحب مذکور نے ابوالفضل علامی کی تحریر کا حوالہ دیا ہے مگر کسی کتاب کا ذکر نہیں کیا تعجب ہے۔ ممکن ہے کہ آئین اکبری کے دوسرے نسخہ جات ہوں مگر مذکور دفتر اول اور اکبر نامہ پیش نظر ہیں، ان میں کہیں نو تعمیر قلعہ یعنی محلات شاہی کا ذکر نہیں ہے۔

مجموعی حیثیت سے یہ نو تعمیر قلعہ اور اُس کے محل کی عمارتیں فن تعمیر کی نادر مثال ہیں اور بہار و بنگال میں شاہان مغلیہ کی یگانہ یادگار ہیں چنانچہ سر جوزف صاحب فرماتے ہیں کہ کوئی کلام نہیں کہ قلعہ رہتاس سے اچھی اچھی عمارتیں ہندوستان میں پائی جاتی ہیں۔ مگر بنگال و بہار میں مسلمانوں کی صنعت و عمارت کا نمونہ اس سے بہتر بتلایا نہیں جا سکتا ہے۔

قلعۂ مذکور کے بعض حصوں پر قیامت خیز زلزلہ ۱۸۳۴ء کا اثر نمایاں ہے۔

ایک بزرگ کا حجرہ

قلعۂ مذکور سے دو میل قفل پر جزیرہ نما کی مغربی سمت کو ایک عمیق غار ہے جس کی گہرائی ہزاروں فیٹ ہوگی۔ اُس کے دہانہ پر خطرناک مگر پُر فضا مقام پر ایک حجرہ ہے جس میں بزرگ مرحوم کا مزار بھی ہے۔ نام نامی بہاء الحق رہتاسی زبان زد خلائق ہے۔ آپ کی یابت صرف اسی قدر مذکور ہے کہ جس وقت آپ قلعہ رہتاس پر تشریف لائے ہیں اور قیام کرنا چاہا ہے تو راجہ قلعہ نے تین بار دست و بازو باندھ کر غار میں پھینکا، لیکن ہر بار زندہ اوپر برآمد ہوئے، یہ زندہ کرامت دیکھ کر راجہ مذکور آپ کا بہت معتقد ہو گیا۔ اور تعرض سے باز آیا۔ مزید احوال شاہ عبد الرحیم فردوسی بُودہن شاہی رحمۃ اللہ سابق سجادہ نشین درگاہ بُودہن شاہی شہسرام کے پشت نامہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ کہ شیخ المشائخ حضرت مولانا شاہ فرید الدین المعروف شاہ بُودہن دیوان قاضی رہتاس کے خسر تھے اور نیز آپ کے بنیرہ شاہ زاہد فردوسی رحمۃ اللہ کو بھی اُن کے اقربائے خاص سے نسبت مصاہرت حاصل تھی۔ چنانچہ عبارت پشت نامہ اس طور پر مسطور ہے کہ "زوجہ حضرت فرید الدین المعروف شاہ بودہن دیوان سلطانیہ بی بی بودندکہ دختر شیخ المشائخ حضرت سہوہ رہتاسی بودند۔ و شیخ بہوہ از بس نجیب و شریف بودند و فقیر و ہم رئیس قلعہ بودند۔

"شاہ محمد زاہد رحمۃ اللہ چہار زوجہ بودند، زوجہ ثالثہ دختر شیخ شاہ نور محمد کہ از شیخ بہوہ رہتاسی تعلق برادری خاص داشتند۔ بودند"

اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ شیخ رہتاسی اور دیوان صاحب ہمعصر ہیں اور دیوان صاحب نے ۹۰۰ھ میں تقریباً ستّر سال سے زاید کی

لہ تاریخ صوبہ اڑیسہ و بہار صفحہ ۴۰۰ مصنفہ جناب سید لولاد حیدر صاحب فوق بلگرامی کا نعرہ۔ ۲ تاریخ صوبہ اڑیسہ و بہار مذکور و تاریخ سہسرام۔

۳ آپ شہسرام کے درویش صفت رئیس تھے۔ علوم فارسیہ و صوفیہ اور نعوت کے ساتھ فنون لطیفہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور نیز بڑے جاؤ و سخی تھے۔ ساری جائداد فقراء و غربا کی نذر کر دی۔ بہر کیف بعد وفات آنجناب اور بسر اوسط شاہ غلام یحییٰ فردوسی جو مرید و مجاز خاص تھے بار سجادگی نہ اُٹھانے کی صورت میں آپ کے پسر اکبر شاہ غلام محمد دوم صاحب قبلہ مدرس اوّل فارسی مدرسہ خانقاہ کبیریہ شہسرام صاحب سجادہ ہوئے اور تا حال ہیں۔ خدا انہیں فرائض سجادگی کی انجام دہی کی توفیق عطا کرے آمین

۴ آپ کا وطن آبائی قصبہ رفوح نواح بہار ہے اور حسب ارشاد پیر آپ نے شہسرام میں اقامت اختیار کی سلسلہ نسب بسند صحیح حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ ارادتاً فردوسی تھے۔ حضرت مخدوم الملک بہاری کے بارگاہ قدس سے عقیدت تھی۔ حضرت ابو الخیر فردوسی دولت پوری رحمۃ اللہ سے بیعت حاصل کی مگر آپ کے مرشدان کامل اضافہ کی تعداد میں مختلف مقامات عجم و عرب کے ہیں۔ قادریہ، چشتیہ، مداریہ، فردوسیہ، ہر چہار سلسلہ میں مجاز تھے۔ اور خود سلسلہ بودہن شاہی کے بانی ہیں۔ علوم شرعیہ سے فراغت کر کے معرفت و عرفان کے طلب و حصول میں عجم و عرب کے متاہیر اور سرآمد روزگار درویشوں کی خدمت میں پہونچے ہیں۔ اور جادہ پیما عجم کے اور سارے عالم اسلام کی سیر کی ہے۔ رفیقان سفر میں حضرت شاہ ارزاں و میر ہاشم چہار ضرب و شاہ کرامت اولیا و شاہ نعمت کدسی اور شاہ مومن چپ و میر سید گوشائیں و شاہ شمس الحق دیوانہ کے نام نامی آئے ہیں۔ آپ کی کرامت و مناقب میں ایک دفتر سیاہ ہے۔ بغرضکہ آپ جامع شریعت و طریقت ایک مجاہد بزرگ تھے آپ کے مبارک عہد میں ہم آدشاہان افاغنہ مغل تھے۔ ہر ایک بذات خود اور اُن کے امراء و علمگان آپ کے ساتھ حسن ظن رکھتے تھے مگر آپ کی قانع طبیعت نے اُنکی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ بالآخر اسلام شاہ المعروف سلیم شاہ اور اُس کے فرزند ارجمند عابد جو مرید و معتقد رکھتے تھے خاص جاگیریں اور جائدادیں نذر کیں جن کے آثار باقیات حال ہیں۔ بیٹے اجمائیں۔ شاہ محمد خلیل دیوان سجادہ نشین اور شاہ کبیر الدین سجادہ نشین بلند اقبال اور خوش طالع بزرگ گذرے ہیں کہ ایک طرف شاہ محمد خلیل سجادہ نشین درگاہ بُودہن شاہ سیخ شاہ عالم ثانی اور اُس کی دختر و علمگان مرید ہوئے اور کثیر آمدنی کی جاگیر بہ نیاز درگاہ اور اخراجات اہل و عیال کے لئے دیں اور حرمسرا اور حویلی پختہ بنوا دے جو تا حال بحالت شکستہ موجود ہیں۔ اور دوسری طرف شاہ کبیر الدین کو کبیر درویش کی خانقاہ کی تولیت و سجادگی ملی جس کی آمدنی بھی تقریباً پچاس ہزار ہے۔ بنابریں خانقاہ بودہن شاہی اور خانقاہ کبیر درویش کی تولیت و سجادگی آپ ہی کی اولاد کو تا حال میں ہے خدا ہر دو صاحبان سجادہ کو توفیق زیادہ عطا کرے۔ سالانہ عرس اور برکات کی زیارت کا سلسلہ ۲۵ رمحرم سے ۳ صفر تک رہتا ہے۔ برکات کی فہرست حسب ذیل ہے:۔ موئے مبارک و شانہ موئے مبارک جناب سالمتاں نیکا

موئے مبارک و دیگر موئے مبارک جناب علی کرم اللہ وجہہ و موئے مبارک امام حسین و موئے مبارک غوث الاعظم و دریں مبارک حضرت نظام الدین اولیاء و قدم رسول و کدی مبارک شاہ دیوان و ... حسن تبرکات ... زیارت و سیاحت کردہ چار بار عجم سے ہمراہ لائے جس کی سند موجود ہے اور بقایا بعض تبرکات ان کے خلفاء نے حاصل کئے جس کی سند صحیح مرقوم ہے۔

عہد میں وفات پائی ہے۔ بنابریں شیخ رہتاسی کا زمانہ دسویں صدی ہجری متعین کیا جاسکتا ہے۔ زمانہ معلوم اور کرامت مشہور پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا قدم درویشانہ قلعۂ رہتاس پر اُس وقت پہونچا ہوگا جب کہ قلعہ پر راجہ پرکشن وغیرہ مالکان قلعہ کی حکومت ہوگی لہٰذا آپ کا قدوم شیر خاں کے لئے تسخیر قلعہ کی بابت نیک فال تھا۔ اگر یقینی طور پر کہا نہیں جاسکتا ہے کہ شیر خاں کے فاتحانہ درآمد کے وقت وہ بقید حیات تھے یا قید حیات سے آزاد ہو چکے تھے۔ بہر حال شیخ رہتاسی رحمہ اللہ دسویں صدی ہجری کے گمنام مگر ایک بلند پایہ متاہل درویش تھے۔

حجرہ مذکور میں داخل ہونے کے لئے مغرب رخ کا ایک سنگین دروازہ ملتا ہے، جس کے دائیں بازو پر غار کی طرف کچھ اونچی دیواریں ہیں۔ دروازہ سے نشیب میں حجرہ کے تنگ دروازہ تک گئے ہیں۔ چنانچہ بیسوں زینے طے کرنے پر حجرہ کے اُس تنگ دروازہ تک رسائی ہوتی ہے جہاں سے بیٹھ کر بمشکل اندرون حجرہ داخل ہوتے ہیں۔ مگر اندرون حجرہ پوری وسعت ہے۔ حجرہ میں مشرقی سمت کو ایک طرف مصلّی ہے اور مغرب سمت کو دوسری طرف ایسی نشیب زمین ہے کہ فاتحہ خوان بافراغت مغرب سمت رخ بمشرق کھڑا ہو سکتا ہے۔ مصلّے کے نزدیک مشرق و شمالی سمت کو دو روشن دان ہیں جن سے روشنی کے ہمراہ روح پرور ہوائیں آتی ہیں۔ اور مشرق سمت کو دریائے سون کا اور شمالی سمت کو آبشار کا منظر پیش نظر ہو جاتا ہے۔

اُس عہد سے آجتک مزار مقدس بوسہ گاہ خلائق ہے۔ منت اُتارنے والے اور چادریں چڑھانے والے عقیدتمند اصحاب بکثرت آتے ہیں۔ عقیدت کی بازگذاری میں ہندو مسلم دونوں شریک ہیں۔ برد اللہ مضجعہ، ونور اللہ مرقدہ۔

روضۂ سلطان فریدالدین شیر شاہ

شہسرام ضلع شاہ آباد (آرہ)

(از جناب سیّد محمد صابر صاحب قادری۔ قمر کاروی)

یہ سنگی روضہ جس کی تعمیر ۱۵۴۵ء میں ہوئی تھی شہر شہسرام کے مغرب میں دو ہزار فٹ طویل اور دو ہزار فٹ عریض احاطہ میں واقع ہے، جس میں گیارہ سو فٹ طول اور ہزار فٹ عرض کا ایک وسیع تالاب ہے۔ اس کا پانی بہت صاف رہتا ہے۔ اہل شہر اسی تالاب کا پانی پیتے ہیں، مگر چند سالوں سے اس کا پانی یک بیک سبز ہو گیا ہے۔ دیکھنے میں سبز معلوم ہوتا ہے، مگر مزہ میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ اس میں غسل کرنے کی اور کپڑا صاف کرنے کی گورنمنٹ کی طرف سے سخت ممانعت ہے۔ اس کے پورب طرف نہایت عمدہ سنگی گھاٹ بنا ہوا ہے اور اس کے کنارے (دیسی روڈ) کا سائبان ہے جس کے شمال و جنوب میں ایک ایک کمرہ ہے، گذشتہ دو سالوں سے اس میں ایک اعلیٰ ہمایہ پرائمری قایم ہے۔ تالاب کے کنارے ہر چہار طرف بہت گہری نالیاں ہیں جن کے ذریعہ سے باہر کی مٹی اور بارش کا (گندا) پانی دوسرے راستے سے الگ نکل جاتا ہے۔ اور تالاب میں کسی قسم کی گندگی پیدا ہونے نہیں پاتی۔ اس کے چاروں طرف پختہ سڑکیں ہیں، جن کا محیط ایک میل ہے۔ اس سڑک سے تالاب تک چاروں طرف تقریباً ۲۵ فٹ عریض زمین ہے جو پہلے غیر آباد تھی مگر ۱۹۳۰ء میں اس کے چاروں طرف خوشنما پارک بنا دیا گیا ہے، جس کا نام "ظفر پارک" ہے۔

روضہ میں داخل ہونے کے لئے شمالی سڑک سے راستہ ہے، اور ایک گنبد نما پھاٹک سے گذرنا پڑتا ہے جس میں شیر شاہ کے ایک بچے وفادار دربان کی قبر ہے۔ ۱۹۳۵ء میں اس پھاٹک پر بجلی گری تھی۔ جس سے خفیف سا ضرب آ گیا تھا، گورنمنٹ نے مرمت کر دی ہے۔ اور اس

لہ حجرہ کے دروازہ سنگین سے زینہ اول پر قدم رکھتے عمیق غار کی طرف جو نگاہ گئی تو بندہ کے قدم میں لغزش اور سر میں چکر آ گیا، آنکھ بند کر کے بیٹھ گیا اور مایوسانہ باہر نکل آیا۔ مگر رفیقانِ سفر کی شفقت کہ انہوں نے بازو پکڑ لیا اور بندہ نے آنکھ بند کئے ہوئے ہی اور گھسٹا گھسٹا زمینوں کو طے کر کے حجرہ کے تنگ دروازہ تک جا پہونچا آنکھ کھول کر اندر داخل ہوا۔ فاتحہ پڑھی، فاتحہ کے بعد سارا ہر اس جاتا رہا اطمینانیت و سکون حاصل ہو گیا۔ اور فیوض و برکات کی دولت لیکر باہر نکلا۔

مقبرہ کے جنوبی جانب کے دروازہ سے اُس پختہ راستہ پر جانا ہوتا ہے جو روضہ تک گیا ہے۔ اس کا طول ۳۵۰ فٹ ہے۔ اس کی مسافت طے کر کے زینوں کی راہ سے اوپر پہنچ کر پہلا دروازہ ملتا ہے۔ اس سے گزر کر ایک وسیع صحن میں پہونچتے ہیں جس کی بلندی ۲۰ فٹ اور وسعت ۳۰۰ سو مربع فٹ ہے۔ روضہ کے چاروں طرف سنگی زینے ہیں جو تالاب کے اندر تک چلے گئے ہیں۔ اس کا عرض تقریباً ۲۸۰ فٹ ہے۔ اس کے ہر چہار گوشوں پر آٹھ دروں والے ہشت پہل اور خوبصورت گنبد ہیں جن کی بلندی ۳۰ فٹ ہے، اس کے علاوہ چہار دیواروں میں چھوٹے خوبصورت گنبد چار سنگین ستونوں پر قایم ہیں جن سے تالاب کا منظر دیکھا جاتا ہے۔ اور اس صحن کے ہر چہار گوشوں پر سرو کے چھوٹے چھوٹے درخت ہیں جو غالباً ۱۹۳۷ء میں لگائے گئے ہیں، اس صحن کے عین وسط میں مقبرہ کی ہشت پہل عمارت ہے۔ بیرونی ہر پہل اس کا ۴۰ فٹ لمبا ہے۔ اور اندرونی پہل ۲۴ فٹ لمبا ہے۔ اس سائبان کے ہر پہل میں تین تین خوشنما محرابی دروازے ہیں۔ روضہ کے اندر ہر پہل میں ایک ایک دروازہ ہے، اس کے اوپر آٹھ گنبد شش پہل ہیں جن کی بلندی ۲۴ فٹ ہے۔ شمالی دروازہ عمدہ ہے اس سے ہو کر اندر داخل ہوتے ہیں جس پر سرخ پتھر کا فلک عالیشان قبہ تعمیر ہے، اس کے پہلے درجے میں ۱۶ کھڑکیاں ہیں، ان کے علاوہ متفرق جالیوں کے تراشے ہوئے پتھر اوپر کے حصے میں نصب ہیں۔ ان سے ہوا اور روشنی اندر آتی ہے۔ اس حصے میں ۲۵ قبریں ہیں جو شیر شاہ کے خاص افسروں اور مخصوص اہل خاندان کی ہیں، اور وسط میں شیر شاہ کی قبر ہے، جس پر سرخ چادر چڑھی رہتی ہے۔ اور اس کی قبر کے سرہانے چراغدان بھی ہے۔ اس حصہ کا طول ۲۱۵ فٹ بعرض ۲۱۵ فٹ ہے۔ روضہ کے پہلے درجے پر جانے کے لئے جنوبی مشرقی درے سے چھیالیس زینوں کو طے کر کے ۱۵ فٹ عریض صحن میں پہونچتے ہیں جس کے کنارے پر منڈیر لگی ہوئی ہے۔ اور آٹھ سنگی ستونوں پر گرگیاں ہیں، اور قبہ والی ہشت پہل دیوار میں متفرق تراش کی جالیوں والے سولہ در ہیں۔ روضہ کے اندر مزار شیر شاہ کے مقابل ٹھیک وسط میں کوئی چیز معلق کی صورت میں آہنی زنجیر میں قبہ کے بیچ سے لگی ہوئی لٹکتی ہوئی ہے۔ جو ان سولہ دروں سے مختلف شکل میں دکھائی دیتی ہے، کسی سے چڑیا، کسی سے طوطا اور کسی سے مچھلی وغیرہ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں سے دوسرے درجے پر جانے کے لئے دو راستے ہیں، اس درجے میں بھی پہلے درجے کی طرح ہشت پہل گنبد در گنبد ایک ایک چھوٹا گنبد اور ایک ایک دوسرے گنبد سے ملا ہوا ہے۔ پورے شہر اور پہاڑوں کا منظر نظر آتا ہے۔ اس درجے کے کچھ اوپر جا کر ہشت پہل دیوار ختم ہو جاتی ہے اور ۲۲ فٹ کا بلند گنبد نصف دائرہ میں شروع ہوتا ہے اور بتدریج مخروطی ہوتا گیا ہے اور اس کے سرے پر نہایت عمدہ کلس ہے۔ اس روضہ کی بلندی تالاب سے ۱۹۰ فٹ ہے، روضہ کے اندر جس میں شیر شاہ کا مزار ہے اس کے ہر پہل میں دروازے ہیں۔ پچھم طرف کی پہل میں محرابی مسجد ہے جس میں مندرجہ ذیل آیات قرآنی، درود شریف و تاریخ و اشعار خط طغریٰ میں منقوش ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد وبارک وسلم وصل علی جمیع الانبیاء والمرسلین وعلی ملائکۃ المقربین وعلی عباد اللہ الصالحین ۵ سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ اللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم ۵

گوشۂ محراب میں:- لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ - کلم اللہ موسیٰ تکلیما

ایک گوشہ میں:- یا بدوح یا فتاح حسبی اللہ بسم اللہ الرحمن الرحیم

استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ

ہر چہار جانب محراب کے:- سورۂ یٰسین - مزمل - آیۃ الکرسی - قل یا ایھا الکافرون

اور محراب کے اندر:- سورۂ والشمس وضحٰھا وغیرہ منقوش ہیں۔

اور ایک طرف یہ شعر کندہ ہے ؎

شاہا بقائے عمر تو بادا ہزار سال،
سالے ہزار ماہے او ماہی ہزار سال

سنہ ۵۷ء صوبہ بہار میں:۔

غدر میں گیا کے سیاسی حالات

از جناب خواجہ جلال الدین صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ایل وکیل، گیا

تاریخ ہند کے واقعات کا وہ اہم سلسلہ جو بعض اوقات صرف سنہ ۵۷ء میں ہندوستانی سپاہیوں کا غدر کہلاتا ہے۔ کیا واقعی صرف ہندوستانی فوج تک محدود تھا۔ یا بساط اور ..... حالات کے مطابق ہندوستانیوں کے اور طبقوں نے بھی اس میں شرکت کی؟ کیا یہ محض چربی دار کارتوسوں کا قضیہ تھا۔ یا کچھ اور شکایتیں بھی تھیں جن سے عام ہندوستانی دماغ برافروختہ ہو رہے تھے؟ واقعات شاہد ہیں کہ غدر میں تمامی حصہ لینے والی صرف ہندوستانی فوجی جماعت ہی نہیں تھی بلکہ علی قدر مراتب اور ہندوستانی طبقوں نے بھی اس میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

کچھ شک نہیں کہ انگریزی فوج کی برتری کا وہ طلسم جو پلاسی اور ارکاٹ کے مرغزاروں میں قائم ہوا تھا۔ ایک صدی کے وسیع عرصہ میں پنجاب کے میدانوں، افغانستان کی پہاڑیوں اور کریمیا کے ساحلوں پر ٹوٹ چکا تھا۔ ہندوستانی فوج نے انگریزی فوج کو دیکھا پھر اپنے آپ کو دیکھا۔ ایک اور پانچ کا فرق پایا۔ اس نے اپنے سامنے ایک نیا فوجی قانون دیکھا۔ جس کی دفعات کے مطابق اسکی خدمات کا دائرہ ہندوستان کی حدود سے باہر نکل چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ ابتدا میں یہ شرط نہیں لگائی گئی تھی۔ یہ تو صاف بدعہدی ہے۔ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ وہ منحوس رائفل اس کے ہاتھ میں دیدی گئی۔ جس کے کارتوس کے ایک سرے پر چربی لگی ہوئی تھی اور اس سرے کو دانت سے کاٹنا پڑتا تھا۔ بس۔ وہ بگڑ گئی۔ اور اس درجہ بگڑ گئی کہ تاریخ ہند میں ایک ایسے پنجاب کا اضافہ ہوا جو اہمیت کے لحاظ سے کسی اور باب سے نہیں شرما سکتا۔

ہندوستان کے مختلف حصوں میں ایسے عناصر بھی سرگرم عمل تھے۔ جو اگر لارڈ ڈلہوزی کی ہوس ملک گیری نہ ہوتی تو شاید کبھی نمایاں نہ ہوتے۔

واجد علی شاہ سے اودھ کا وسیع اور زرخیز خطہ چھین کر انکو مٹیا برج کی چند سگہ زمین زندگی کے بقیہ دن کاٹنے کے لئے دیدی گئی تھی۔ اور یہ خبر تو دہلی میں عام تھی کہ بہادر شاہ ثانی مرلیں تو انکی اولاد کو محلات شاہی سے نکال دیا جائے گا۔ باجی راؤ ثانی پیشوا معزول کئے گئے تھے اور آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ انکی پنشن مقرر کی گئی تھی۔ لیکن ان کے مرنے کے بعد ان کے متبنیٰ ڈھونڈھو پنتھ عرف نانا صاحب کو اس پنشن سے محروم کر دیا گیا تھا۔ جھانسی کی نوجوان خاتون اہلیا بائی جن کی شجاعت اور بلند حوصلگی کی داستانیں اب بھی وسط ہند میں خون کو گرما دیتی ہیں، انہیں لڑکا گود لینے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اور جھانسی کی ریاست ملحق کر لی گئی تھی۔ ارکاٹ کے نواب اور تنجور کے راجہ دونوں کا انتقال ہوا تو انکی اولاد پر وظیفہ اور خطاب کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ نظام حیدر آباد کے ذمہ امدادی فوج کے مصارف کا کچھ روپیہ باقی تھا۔ اسکے سلسلہ میں صوبہ برار ملحق کر لیا گیا۔ اس قسم کے اور بہت سے الحاق اور بدعہدی کے واقعات تھے جنھوں نے والیان ملک اور ان کے ہمدردوں کے دلوں میں انگریزی حکومت کی نیت اور عہد و مواثیق کے سلسلہ میں شکوک و شبہات پیدا کر رکھے تھے۔

ہندوستانی طبقہ عوام کو بھی بعض خاص شکایتیں تھیں۔ انگریزی فوجی چھاؤنیوں کے قرب و جوار کی بستیوں میں ہر جگہ انگریزی سپاہی اعلیٰ عادات و خصائل کا حامل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسکی شخصیت ملکی قوانین کی گرفت سے ذرا بلند رہتی تھی۔ عام طور پر انگریزوں کا فاتحانہ انداز ان کے ہر شعبۂ حیات پر حاوی تھا۔ مسیحی تبلیغی انجمنیں حکومت کے سیاسی غلبہ اور تفوق کو برقرار رکھنے اور ایک ایسی جماعت پیدا کرنے کی نیت سے

لہ مردانہ لباس میں سپاہیوں کی طرح لڑتی ہوئی، ۱۷ جون سنہ ۵۸ء کو میدان جنگ میں ماری گئیں۔ (ح)

جو کسی خاص ضرورت کے عالم میں ہم مذہب ہونے کی بنیاد پر اسکی اعانت ہو سکے۔ روحانیت کا حسین اور سنہری جام پے بہ پے ہر طرف برابر بھر رہا تھا۔ اور حکومت اصلاحات کے پردے میں آہستہ آہستہ رسم و رواج میں دخل انداز ہو رہی تھی۔

گو مختلف صوبے ذرائع رسل و رسائل کے افضل اور سامان نقل و حرکت کے محدود ہونے کے باعث آپس میں اتنے نزدیک نہ تھے جتنے کہ آج ہیں۔ لیکن چونکہ فرنگیوں اور فرنگستان ابھی عالم وجود میں نہیں آئے تھے اس لئے ہندوستانی علی العموم آپس میں بیگانے اور ایک دوسرے سے اتنے دور نہ تھے۔ جتنے کہ آج ہیں۔ عوام فوج کی بد دلی کو دیکھ رہے تھے۔ والیان ملک کی پریشانی کی داستانیں سن رہے تھے۔ اور خود اپنے دل میں خوف اور دہشت کے آثار محسوس کر رہے تھے۔ مشترک خوف و دہشت اور اغراض و مقاصد نے ایک ایسا خاموش اور مستحکم اتحاد پیدا کر رکھا تھا جو اکثر متحدہ قومیت کی بنیاد ہوا کرتا ہے۔

بعض ریاستیں چھن چکی تھیں اور بعض چھینی جا رہی تھیں۔ ہندوستانی عسکریت کی نگاہیں اپنی بلند قامتی اور بلند حوصلگی پر پڑ رہی تھیں۔ متحدہ قومیت کا احساس انگڑائی لے رہا تھا۔ خاموش مخالف طاقتیں مصروف کار تھیں کہ لارڈ ڈلہوزی ۱۸۵۶ء میں انگلینڈ واپس تشریف لے گئے۔ اور انکی جگہ پر لارڈ کیننگ گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ روانگی سے قبل ایک اعزازی دعوت کے موقعہ پر لندن میں انھوں نے کہا کہ "ہند کی فضا میں سکون تو نظر آتا ہے۔ لیکن ایک چھوٹے سے بادل کا ٹکڑا ابھی سارے آسمان پر پھیل کر ہمیں برباد کر سکتا ہے"۔ کیا ایک اتنا بلند پایہ ماہر سیاست نباضی میں غلطی کر سکتا ہے؟ لارڈ کیننگ ہندوستان آئے۔ اور ایک بادل کا ٹکڑا آسمان پر چھا گیا۔ اور جو سارے ملک کی فضا کو تاریک کر گیا۔

غدر کی پہلی چنگاری۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں بلند ہوئی۔ بہانہ چند سپاہیوں کا چربی والے کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کر دینا تھا۔ وہ قید کر دئے گئے۔ اُن کے ساتھی بگڑ گئے۔ افسروں کو قتل اور قیدیوں کو رہا کرا کے بجائے بہادر شاہ ثانی جو صفیعی اور بیکسی کے عالم میں پیری و مریدی اور شعر و شاعری کے مشاغل میں اپنے دن کاٹ رہے تھے انکو اُن کے انکار کے باوجود تخت حکومت پر بٹھایا گیا۔ انکی بادشاہت کا اعلان کیا گیا۔ بغاوت کی آگ بھڑکی اور پھیلی۔ لکھنؤ۔ کان پور ہوتی ہوئی بنارس اور دانا پور پہنچی۔ اور بنارس اور دانا پور میں آگ لگی ہو۔ تو کیا اسکی گرمی گیا میں محسوس نہیں ہو گی؟

اٹھارہویں صدی کے وسط میں جو مختلف رسمارے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ ایک حد تک گیا اُس کے اثر سے محفوظ نہیں رہا تھا۔ ٹکاری۔ گیا اور مان پور کی راہ کئی بار مرہٹہ سواروں کی یلغار اور تاخت و تاراج کے مناظر دیکھ چکی تھی۔ راجہ سندر سنگھ نے ٹکاری میں اور نامدار خاں معین ایک مشہور زمیندار نے گھے جنگلوں اور پہاڑیوں میں مغلوں کی مرکزی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ تو صوبہ بہار کے نائب ناظم علی وردی خاں کی فوجیں ۱۷۳۲ء میں انکی سرکوبی کے لئے اس ضلع میں آ چکی تھیں۔ اُن فوجوں کی واپسی کے بعد ایک ابتری سی پھیل گئی۔ ہر طرف زمینداروں نے اپنی چھوٹی چھوٹی سی فوجیں تیار کر لیں۔ آخر ۱۷۴۳ء میں چند زمینداروں نے متحد ہو کر رام گڑھ کے راجہ پر فوج کشی کی۔ انخادی فوجیں جن کی باگ راجہ ٹکاری۔ کا منگار خاں اور نامدار خاں زمینداران نرہٹ اور سماے اور بشن سنگھ زمیندار سہسیں اور کمبا کے ہاتھوں میں تھی۔ رام گڑھ میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوئیں۔ اور رام گڑھ کے جنگلوں اور پہاڑیوں میں یاد پیشقدمی نہیں کرنے پائی تھیں کہ ۱۷۴۳ء میں پیشوا بالاجی راؤ کے پچاس ہزار سوار بنگالہ پر حملہ آور ہونے کے لئے اس ضلع سے گذرے۔ اور جہاں پہنچے زمینداروں نے سر اطاعت خم کیا۔ ایک صرف احمد خاں چچا داؤد خاں بانی داؤد نگر کے پوتے تھے اور اچھا اور گوہ میں انکی زمینداری تھی۔ انھوں نے خوش گڑھ میں برائے نام کچھ مقابلہ کیا۔ لیکن انھوں نے بھی پچاس ہزار روپیہ جرمانہ دیکر اپنی گلو خلاصی کرائی۔ دو تین سال کے بعد مرہٹہ فوجیں بنگالہ کی مہم سے واپسی کے وقت گیا ہوتی ہوئی ٹکاری پہنچیں۔ اور ٹکاری کو تاخت و تاراج کرتی ہوئی دریائے سون کو پار کر کے اس ضلع سے باہر نکل گئیں۔ ۱۷۶۱ء میں جبکہ مرہٹہ اور افغان ایک فیصلہ کن جنگ کے لئے پانی پت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شاہزادہ

لہ دھیر سنگھ ایک معمولی زمیندار موضع اتیرن کے تھے جو ٹکاری سے ۴ میل جنوب کی طرف واقع ہے۔ انھوں نے ٹکاری میں سکونت اختیار کی۔ ان کے بیٹے سندر سنگھ نے زمانہ کے خلفشار اور طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھا کر اپنی زمینداری کی حدود میں بہت توسیع کی۔ اور خدمات شاہی کے سلسلہ میں بارگاہ مغلیہ سے راجہ کا خطاب عطا ہوا ۱۷۵۸ء میں اپنے ایک کپتان کے ہاتھ سے مارے گئے۔ (ع)

عالی گوہر (جو چند دنوں کے بعد شاہ عالم کے نام سے مشہور ہوئے) نے بہار اور بنگالہ میں مغلوں کا کھویا ہوا وقار اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے اس ضلع کو اپنی کوششوں کا مرکز بنایا تھا۔ کامگار خاں جن کا نام مقامی افسانہ گوئی میں اب بھی زبان پر آجایا کرتا ہے ان کے فوجی مشیر تھے۔

۱۵ جنوری ۱۷۸۸ء کو عالی گوہر شاہ زادہ ہی نہیں تھے بلکہ تخت دہلی کے مالک شاہ عالم ہو چکے تھے۔ لیکن وہ تاریخ اور یہ ضلع دونوں ان کے لئے سعید ثابت نہیں ہوئے۔ اس روز مان پور کی دیواروں کے پاس انگریزوں کے ہاتھوں سے انہیں ایک جنگی شکست نصیب ہوئی۔ اس واقعہ کے بعد تقریباً ایک سو سال تک گیا گویا سوتا رہا۔ اور جب ۱۸۵۷ء میں بنارس اور دانا پور میں ترائی اور بغاوت رونما ہوئی تو گیا میں بھی بے چینی اور بے اطمینانی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ لیکن علانیہ مخالفت کا کوئی واقعہ اواخر جولائی تک پیش نہیں آیا۔

اُس زمانے میں مسٹر فریڈرک ہیلیڈے[1] بنگال کے لفٹنٹ گورنر۔ مسٹر ولیم ٹیلر کمشنر پٹنہ ڈویژن اور مسٹر الونزو موفی گیا میں کلکٹر[2] اور مجسٹریٹ تھے۔ مسٹر ہیلیڈے امور حکومت کے سلسلہ میں کوئی آزادانہ رائے نہیں رکھتے تھے۔ احباب اور اعزہ کی رائے ہمیشہ ان کی رہنمائی کیا کرتی تھی۔ مسٹر ٹیلر اصابت رائے۔ ہمت اور اولوالعزمی جیسی صفتوں کے حامل تھے لیکن سانولی دہشت انگیزی اور تشدد کی پالیسی کے عامل تھے اور ہر باغی کی سزا انکے خیال میں موت ہی ہوا کرتی تھی۔ اور مسٹر موفی کی طبیعت میں نمایش، تلون اور جلد بازی تھی۔ اُن کا دماغ فوری رائے قائم کرنے سے معذور تھا۔ اور قوت فیصلہ ہمیشہ ڈگمگاتی رہتی تھی۔ اسی زمانے میں جگدیش پور (ضلع آرہ) کا ایک راجپوت زمیندار کنور سنگھ جو ۸۰ جاڑوں کی برف کی چادر میں لپٹا ہوا دل میں انگریزی شکتی کی چبھن محسوس کر رہا تھا باغی سپاہیوں کی حمایت میں میدان جنگ میں اتر چکا تھا۔ آرہ میں ۱۵ انگریز، ۵۰ سکھ اور ایک مسلمان ڈپٹی کلکٹر سید عظیم الدین خاں محصور تھے اور ان کی مدد کے لئے ۳۴۳ یورپین اور ۷۰۰ سکھ سپاہیوں کا ایک دستہ کیپٹن ڈنبار کی قیادت میں پٹنہ سے روانہ کیا گیا تھا۔ ۳۰ جولائی کو یہ دستہ تباہ کر دیا گیا۔ کیپٹن ڈنبار اور ان کے ساتھ کئی آفیسر مارے گئے۔ ۳۱ جولائی کو مسٹر ٹیلر کا ایک حکم مسٹر موفی کے نام موصول ہوا کہ "آرہ کے نزدیک انگریزی دستہ شکست کھا گیا ہے اب مرکزی مقام کی حفاظت کے لئے ہر شے قربان کر دینی چاہیئے۔ کلکٹر اور دیگر حکام فوراً پٹنہ چلے آئیں۔ اور اگر نقصان جان کا احتمال نہ ہو تو خزانہ کا روپیہ بھی ساتھ لیتے آئیں" اسوقت ۴۵ انگریز سپاہی اور ۱۰۰ سکھ سپاہی گیا میں موجود تھے کل انگریز ایک جلسہ میں مدعو کئے گئے۔ مسٹر موفی نے کمشنر کا حکم ان کو سنایا۔ بعض انگریزوں نے انکو مشورہ دیا کہ خزانہ کا روپیہ ساتھ لے جانے کے لئے بیل گاڑیاں فراہم کی جائیں اور روپیہ ساتھ لیکر روانہ ہوں لیکن مسٹر موفی نے اُن کے مشورہ پر عمل نہیں کیا۔ اور حالانکہ تین دن قبل یعنی ۲۸ جولائی کو خود انھوں نے ایک رپورٹ پٹنہ بھیجی تھی کہ شہر والوں سے مجھے کوئی خوف نہیں ہے اور اگر باغی بھی گیا کی طرف رخ کریں گے تو میں اُن کے مقابلہ کے لئے تیار ہوں۔ لیکن پھر بھی داروغہ آوز بجنیٹ[3] محافظوں کے صوبہ دار کے ذمہ سرکاری خزانہ کا ۸ لاکھ روپیہ عمر قید خانہ[4] اور سارے شہر کی عزت و آبرو اور جان اور مال چھوڑ کر فوجی سپاہیوں کے ساتھ شام کو ۲ بجے شہر سے روانہ ہو گئے۔

اس جماعت میں ایک انگریز مسٹر ہولمکس بھی تھے۔ جن کا تعلق محکمہ افیون سے تھا۔ انکو اپنی جماعت کی اس حرکت مذبوحی پر شرم سی آنے لگی۔ اور ذلت کا احساس ہونے لگا۔ اور جب یہ جماعت شہر سے تین میل یعنی موضع بیجھو سے کچھ آگے شمال کی طرف گئی ہوگی کہ وہ بیتاب ہو کر مسٹر موفی کے پاس آئے۔ انکو سمجھایا۔ اس حرکت کی ذلت کا احساس کرایا۔ مسٹر موفی کی غلط اندیشی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ انھوں نے رائے بدلی اور مسٹر ہولمکس کے ساتھ واپس لوٹے۔ تین گھنٹہ کی غیر حاضری کے بعد شہر کی حالت میں کوئی تغیر نہیں پایا شہریوں نے خیر مقدم کیا۔ زمینداروں اور گیا وال طبقوں نے شہر کی حفاظت کے لئے تین چار ہزار آدمی فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن اسپر بھی شہر کی حالت مخدوش تھی۔ نجیب محافظوں کے دلوں میں باغیوں کی ہمدردی کی لہر دوڑ رہی تھی سرکاری خزانہ میں ایک کثیر رقم موجود تھی جسپر نجیبوں

---

[1] ہیلیڈے روڈ۔ ٹیلر روڈ۔ اور موفی روڈ، یہ تین سڑکیں اب تک شہر گیا میں ان تینوں ہستیوں کی یاد دلا رہی ہیں۔ (ح)

[2] ۱۸۵۷ء میں یہ دونوں عہدے الگ الگ تھے۔ لیکن ۱۸۵۸ء میں باہم ملا دیئے گئے۔ (ح)

[3] نجیب، ایک سرکاری نیم فوجی جماعت کا نام تھا۔ مسٹر موفی اپنے نجیب محافظوں کا کبھی اعتبار نہیں کرتے تھے۔ (ح)

[4] اس زمانہ میں قید خانہ شہر کے شمالی حصہ میں تھا۔ محلہ پرانا جیل خانہ اسی کی یاد دلا رہا ہے۔ (ح)

کی لٹھائی ہوئی نگاہیں بچ بچ کر پڑ رہی تھیں۔ شہر کھلا ہوا تھا۔ اور غیر محفوظ۔ باغی دستوں کے لئے راہ صاف تھی۔ آرام طلب گیا وال طبقہ کی امداد کی زیادہ امید نہیں ہو سکتی تھی۔ اور اسپر انہیں یقین تھا کہ گیا ایک مقدس شہر ہے۔ باغی جماعتیں اس شہر پر حرص و آز کی نگاہیں نہیں ڈال سکتی ہیں۔ زمیندار بغض بددل تھے اور بعض بے اعتنائی برت رہے تھے۔ اور بعض ایسے بھی تھے جو حالات کا بغور مطالعہ کر رہے تھے۔ اور اودھ کے بعض زمینداروں کی طرح موقعہ کی تاک میں لگے ہوئے تھے

عیدالاضحیٰ کا زمانہ تھا۔ اور مسلمان آزادی کے ساتھ سر اٹھا سکتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ڈیڑھ مہینہ قبل ۱۹ جون کو مسٹر ٹیلر نے پٹنہ میں شہر کی حالت پر غور کرنے کے لئے عمائد کی ایک کانفرنس طلب کی تھی۔ جس میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تین سربرآوردہ اور با اثر علما، مولوی شاہ محمد حسین۔ مولوی احمد اللہ اور مولوی واعظ الحق بھی مدعو کئے گئے۔ لیکن شرکت جلسہ کے بعد یہ تینوں حضرات دھوکے سے حراست میں لے لئے گئے اور نظر بند کر دئے گئے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ۳ جولائی کو ۳۰۰ مسلمانوں نے گزری کے ایک غریب کتب فروش پیر علی کی سیادت میں پٹنہ میں علم جہاد بلند کیا تھا۔ اور اس سلسلہ میں پیر علی سولی کے تختہ پر اپنی جان دے چکے تھے اور نواب لطف علی خاں پر بغاوت کے متعلق ایک مقدمہ پٹنہ چل رہا تھا۔ ان حالات کو مدنظر رکھ کر مسٹر مونی نے انگریزی رجمنٹ کے ایک دستہ کو شیر گھاٹی سے گیا آنے کا حکم بھیجا۔ ۲ اگست کو ۸۰ گورے سپاہیوں کا ایک دستہ بیل گاڑیوں میں شیر گھاٹی سے گیا پہنچا۔ لیکن یہ دستہ بھی گیا کی حفاظت کے لئے کافی نہ تھا۔ کیونکہ ۳ اگست کو یہ خبر حکام کو مل چکی تھی کہ باغی دستوں نے شہر آرہ لوٹ لیا ہے۔ جو بنگال آرمی کی زد پر آگیا وہ تہ تیغ کر دیا گیا ہے۔ اور انگریز باشندے محاصرہ کی حالت میں ہیں۔ ۲ اگست کو گیا کے زمینداروں نے خدمت خلق اور حفاظت شہر کے لئے ایک سو آدمیوں کی ایک ٹولی پیش کی۔ لیکن یہ بھی دیہاتوں کے بوڑھے۔ بیمار۔ اور نکمے انسانوں پر مشتمل تھی۔ ۳ اگست کو ایک فوری پیغام مسٹر مونی کے پاس دانا پور سے پہنچا۔ کہ "۸ ویں دیسی پیادہ رجمنٹ دانا پور سے گیا کی طرف جا رہی ہے۔ خبر ملی ہے کہ ایک توپ بھی اس کے ساتھ ہے۔ خدا کے لئے ہوشیار ہو جاؤ"۔ ان حالات میں ۸۰ گورے سپاہی گیا کی حفاظت کے لئے کافی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ طوفان نزدیک پہنچ رہا تھا۔ اس لئے مسٹر مونی نے انگریز مقیمان گیا کی ایک مجلس منعقد کر کے جنگ طلب کی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ ۸۰ گورے سپاہی گیا کی حفاظت نہیں کر سکتے ہیں اس لئے مناسب ہے کہ خزانہ کا روپیہ ساتھ لیکر گرینڈ ٹرنک روڈ کی طرف نکل جانا چاہئے۔

۳ اگست ۱۸۵۷ء کی شام کو ۶ بجے یہ جماعت گیا کو خدا حافظ کہہ کر روانہ ہوئی اور روپیہ بیل اور بیل گاڑیوں پر لاد کر ساتھ لے چلی۔ یہ جماعت مغرب کی طرف چلی اور مسٹر مونی کچھ قیمتی چیزیں لینے کے لئے اپنی کوٹھی پر واپس آئے۔ ابھی پہنچے ہی تھے کہ شور و غوغا سنائی دینے لگا۔ ملازم چلاتا ہوا دوڑا آیا کہ جیل خانہ کے دروازے کھول دئے گئے ہیں اور قیدی نزدیک پہنچ رہے ہیں۔ مسٹر مونی اپنے اصطبل کی طرف لپکے۔ ان کی خوش نصیبی سے گھوڑا کسا ہوا تیار تھا۔ سوار ہوئے۔ ایڑ لگائی اور مغرب کی طرف نکل بھاگے۔ اور کچھ دور جا کر انگریزی فوج کے دستہ سے جا ملے۔

۴ اگست کی صبح کو مسٹر مونی کی روانگی کی خبر شہر میں پھیل گئی تھی جس سے مخالف عناصر کو یہ سمجھنے کا موقعہ مل رہا تھا کہ شہر کی حفاظت اور امن و امان قائم رکھنے کی نیت سے مسٹر مونی واپس نہیں آئے ہیں بلکہ ان کا اصل مقصد یہی ہے کہ خزانہ کا روپیہ اپنے ساتھ لے جائیں۔ ۴ اگست کی صبح کو اشخاص نے خزانہ میں جتنے اسٹامپ موجود تھے سبھوں کو عوام کی نگاہوں کے سامنے جلا ڈالا تھا۔ اور ۳ اگست کی شام کو جب خزانہ کا روپیہ روانہ کر دیا گیا تو باغی عناصر زیادہ دیر تک خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ نجمیوں نے جیل خانہ کے دروازے کھول ڈالے اور قیدیوں کو رہا کر دیا۔ لیکن یہ غیر مسلح چار پانچ سو قیدی ایک منظم اور مسلح فوجی دستہ کے ۸۰ سپاہیوں کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔ لیکن نجمیوں نے بھی ان کی شرکت کی اور دونوں ڈومبی روڈ میں موجودہ جیل خانے کے نزدیک اس جگہ حملہ آور ہوئے جہاں چھوٹی چھوٹی پہاڑی ٹیلوں کے درمیان سڑک پیچ و خم کھاتی ہوئی ڈومبی کی طرف نکل جاتی ہے۔ حملہ آور کچھ نقصان اٹھا کر پسپا ہوئے۔ اور یہ دستہ گرینڈ ٹرنک روڈ ہوتا ہوا رانی گنج اسٹیشن پہنچا۔ وہاں سے مسٹر مونی ریل گاڑی پر کلکتہ پہنچے۔ جہاں انھوں نے وہ روپیہ جمع کر دیا جو اس قدر پریشانی کے بعد وہ بچا کر لائے تھے ڈبھی گروہ چاہتے اور عجلت سے کام نہ لیتے تو نہایت آسانی کے ساتھ کئی دن قبل پٹنہ پہنچا سکتے تھے۔

کلکتہ میں ۱۰ لاکھ روپیہ بچا کر لے آنا کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا۔ ہر قدم پر پیش و پیش کرنے والا انسان اب مسٹر مونی "ہیرو آف بہار" کے معزز لقب سے یاد کیا جا رہا تھا۔ اگر انکی جگہ کوئی دوسرا شخص کلکٹر ہوتا اور جذبات سے زیادہ دماغ سے کام لیتا تو جس وقت مسٹر مونی گیا سے

کلکتہ کی طرف روانہ ہو رہے تھے اُس وقت سے کئی گھنٹہ قبل سرکاری خزانہ کا کل روپیہ پٹنہ پہنچ گیا ہوتا۔ لیکن مسٹر مونی کی قسمت میں "کمانڈر آف دی بانھ" کا خطاب تھا۔ اسکو کوئی کیسے روک سکتا تھا۔ اور بچارے مسٹر ٹیلر جنھوں نے کشنر پٹنہ ڈویژن کی حیثیت سے ایک گونہ بہادری دکھایا تھا۔ اُن پر مسٹر ہیلیڈے لفٹنٹ گورنر کی عتاب آمیز نگاہیں پڑ رہی تھیں۔ مسٹر ہیلیڈے نے مسٹر ٹیکر کے مخالفوں کی سازش سے متاثر اور معاملاتِ حکومت میں مسٹر ٹیلر کی بار بار اپنی آزادانہ رایوں کی مداخلت سے زچ ہو کر ان پر ایک فرد جرم قائم کی۔ ۳۱ جولائی کو جو حکم انھوں نے گیا کے کلکٹر کو بھیجا تھا وہی حکم انھوں نے مظفر پور کے کلکٹر کو بھی بھیجا تھا۔ مسٹر ہیلیڈے کی رائے میں یہ حکم انگریزی آبادی کے دل میں بیجا دہشت اور خوف پیدا کرنے کا باعث ہوا۔ دوسرا الزام باغیوں پر بیجا تشدد اور سختی انتقام کے سلسلہ میں تھا۔ اسی لئے وسط اگست ۱۸۵۷ء میں مسٹر ولیم ٹیلر کمشنر پٹنہ ڈویژن کے عہدے سے بیدخل اور سرکاری ملازمت سے برطرف کئے گئے۔ اور انکی جگہ مسٹر سیمویل کمشنر مقرر ہوئے۔

۴ اگست سے ۱۵ اگست تک گیا میں طوائف الملوکی کا عالم رہا۔ رہا شدہ قیدیوں اور نجیبوں نے خزانہ میں جو کچھ روپیہ باقی بچ گیا تھا وہ لوٹا۔ اور لوٹ کر قیدیوں نے اپنے اپنے گھر کی طرف رخ کیا۔ اور نجیب آرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ گیا میں اب ایسے افراد کا دور دورہ تھا جو فساد اور ہنگاموں میں اپنا ذریعۂ معاش تلاش کر لیتے ہیں۔ اب انہیں کی حکومت تھی اور انہیں کا راج پاٹ تھا۔ امن و امان کی قیمت مقرر کی گئی۔ مہاجنوں کو جی بھر کر لوٹا گیا۔ شہر کو کافی نقصان پہنچایا گیا۔ انگریزوں کی کوٹھیاں منہدم کر دی گئیں۔ جج اور کلکٹر کی کچہریاں خاکستر کر دی گئیں۔ محافظ خانہ نذرِ آتش کیا گیا اور جتنی چیزیں غارت گروں کے کام کی نہ نکلیں وہ برباد کر دی گئیں۔

۱۶ اگست کو ۳۲۰ سکھوں اور ۳۵ گوروں کی ایک جماعت نے بغیر کسی مزاحمت کے شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور گیارہ دن کے بعد انگریزی حکومت از سرِ نو قائم ہوئی۔ ۲۵ اگست کو مسٹر مونی کلکتہ سے واپس آئے۔ شہر گھاٹی اور نواده پر بھی دوبارہ قبضہ کیا گیا۔ تھٹا میں باغیوں نے افیون کوٹھی کا محاصرہ کر رکھا تھا وہاں وہ منتشر کئے گئے۔ ایک سوار رجمنٹ نے بھاگل پور میں بغاوت کی... اور اس ضلع پر حملہ آور ہوئی۔ زادہ میں سرکاری عمارتوں کو آگ لگاتی ہوئی وزیر گنج پہنچی۔ اس کی تعداد ۶۰۰ تھی اور اُن کے ساتھ ایک کثیر تعداد پیدل اور سوار مددگاروں کی بھی تھی۔ اس وقت گیا میں تقریباً ۳۰۰ سکھ اور گورے سپاہی کیپٹن راٹرے کی تحت میں تھے۔ مسٹر مونی کے تکلف اصرار پر باغیوں کا راستہ روکنے کی سعی لاحاصل کے لئے وہ گیا سے وزیر گنج کی طرف بڑھے۔ جہاں ۸ ستمبر کو سخت مڈبھیڑ ہو گئی کیپٹن راٹرے کے دستہ کو کافی نقصان پہنچا۔ اور ماجی راہ کاٹ کر اُن سے قبل گیا پہنچ گئے۔ جیل خانے کے دروازے کھول دئے۔ قیدیوں کو رہا کر دیا۔ شہر کو لوٹنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ جج کی کوٹھی کے چاروں طرف خندق کھود کر انگریزوں کے لئے ایک پناہ گاہ امن کی بنالی گئی تھی۔ اسپر باغی حملہ آور ہوئے۔ لیکن ناکامیاب رہے۔ منصف بہار[1] انکی زد پر آگئے وہ قتل کر دئے گئے۔ گیا سے آگے بڑھے اور ٹکاری کی راہ سے دریائے سون کے پار نکل گئے۔

اواخر اکتوبر ۱۸۵۷ء میں دو دیسی پیادہ کمپنیاں بھاگل پور میں باغی ہو کر اس ضلع میں یلغار کرتی ہوئی پہنچیں لیکن شہر گیا کی طرف انھوں نے رخ کیا۔ جہان آباد کی راہ سے وہ بھی دریائے سون کی طرف چلی گئیں۔ ۲۲ اکتوبر کو میجر انگلش انگریزی رجمنٹ کا ایک دستہ لے کر گیا کی حفاظت کے لئے آگئے اور حکام کو کچھ دنوں کے لئے اطمینان نصیب ہوا۔

۱۸۵۷ء کے تلاطم نے چند نایاب گوہر ایام روزگار کے سامنے پیش کئے۔ کون ہے جو مولوی احمد اللہ[2] تعلقہ دار فیض آباد کی عالی مرتبت بزرگانہ ہستی۔ سیاسی جد و جہد۔ اعلیٰ جنگی قابلیت اور حب الوطنی کے عمیق جذبات کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا؟ ادھر میں انکی مسلسل اور خاموش سرگرمیوں نے ایک صورِ قیامت پھونکا تھا۔ اور اُن کے جنگی نقشوں کی عمدگی اور ہمہ گیری۔ فوجوں کی تنظیم و ترتیب۔ وقت اور مقامِ جنگ کے انتخاب۔ اور حربی کارروائیوں میں صحیح رہنمائی نے بہترین انگریزی ماہرینِ جنگ کو اُن کے سامنے مقابلہ پر آنے کے لئے خیرہ

---

[1] ۱۸۵۷ء میں موجودہ بہار سب ڈویژن کا علاقہ اسی ضلع میں تھا اور یہ ضلع بہار کہلاتا تھا ۱۸۶۵ء میں بہار سب ڈویژن کا علاقہ ضلع پٹنہ میں ملا دیا گیا۔ اور ضلع گیا معرضِ وجود میں آیا۔ ۱۸۷۲ء میں گرہ جات جپلا و ٹکونجا ضلع گیا سے نکال کر ضلع لوہارڈنگا (لوہارڈنگا) میں جس کا کچھ حصہ اب ضلع پلامو کہلاتا ہے ملا دئے گئے۔ اور ۱۸۷۶ء میں ۶ مربع میل کا رقبہ ضلع ہزاری باغ میں منتقل کر دیا گیا۔ موجودہ گیا کا رقبہ وہی ہے جو آخری طور پر ۱۸۷۶ء میں مقرر ہوا تھا۔ ج

[2] ۵ جون ۱۸۵۸ء کو شہید ہوئے اُن کا سر پیش کرنے والے کو ۵۰ پاؤنڈ گورنمنٹ نے عطا کئے (ج)

گیا۔ کون ہے جو جگدیش پور کے اُس بوڑھے راجپوت کنور سنگھ کی الوالعزمانہ کارروائیوں۔ فوجی مہموں کی درستگی۔ اور طریقۂ جنگ سے مکمل شناسائی کے باعث اُن کا نام ادب سے نہیں لیتا؟ اُن کے فوجی دستے اعظم گڈھ تک فاتحانہ غلبہ کرتے ہوئے پہنچے۔ اور ایک وقت وہ بھی آ گیا تھا جب آرہ سے کلکتہ تک کوئی ان کے مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتا تھا۔ مولوی احمداللہ اودھ کی فضا پر چھائے ہوئے تھے۔ اور کنور سنگھ کا اثر بہار میں اور ایک بڑی حد تک گیا میں نمایاں تھا۔ بعض زمیندار علانیہ طور پر ان کے ہمدرد تھے اور بعض واقعات کی رفتار کو بغور دیکھ رہے تھے۔ اُسوقت جبکہ شہر گیا کی سرزمین دیسی اور انگریزی رجمنٹوں کی قدموسی میں لگی ہوئی تھی۔ شمال اور مغرب میں آرول کی طرف ایک زمیندار جودھر سنگھ نامی تاریخ گیا کے صفحات پر اپنا نام دھندلی روشنائی سے لکھنے میں مصروف تھا۔ موضع کھامنی کا رہنے والا۔ ایک معمولی حیثیت کا زمیندار ضلع آرہ کے بھوجپوری جوانوں کی ایک جماعت اُس نے فراہم کرلی۔ علم بغاوت بلند کیا۔ اور چاروں طرف اعلان کرادیا کہ انگریزی راج کا اب خاتمہ ہوگیا ہے۔ دوسروں کی زمینیں چھین چھین کر اپنے ساتھیوں کو تقسیم کرنے لگا۔ آرول کے اطراف میں شاید ہی کوئی جگہ ایسی ہو جو اُسکی تاخت وتاراج سے محفوظ رہی ہو۔ جو کوئی اسکی مخالفت پر اترا وہ موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ آخر انگریزوں کا ایک دستہ اسکی سرکوبی کے لئے گیا سے بھیجا گیا۔ جودھر سنگھ نے موضع کھامنی میں اپنے مکان کی کافی مورچہ بندی کر رکھی تھی اور اسکو ایک چھوٹا سا مستحکم قلعہ بنا رکھا تھا۔ ۷۰۔۸۰ جوانوں کا ایک دستہ اور ایک توپ اور توڑے دار بندوقیں لے کر وہیں پناہ گزیں ہوا۔ انگریزوں سے مصروف پیکار ہوگیا۔ انگریزوں نے کافی زور آزمائی کی۔ اور اس کے مکان میں گھس جانے کے لئے بے انتہا زور لگایا۔ لیکن نقصان اٹھا کر پسپا ہوئے۔ پھر اس مکان میں آگ لگا دینے کی تدبیریں کیں۔ لیکن وہ بھی بیکار ثابت ہوئیں۔ مجبوراً انگریزوں کو آرول ناکام لوٹ جانا پڑا۔

حکام گیا کو صرف جودھر سنگھ کے مقابلہ میں عارضی ناکامی ہوئی۔ ورنہ اور ہر طرف امن قائم کرنے میں وہ زیادہ کامیاب ہوئے باغیوں کی ایک کافی تعداد گرفتار ہوتی گئی۔ ان پر مقدمات چلائے گئے۔ اور اکثر پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیئے گئے۔ یورپین سوار توپچیوں کا ایک دستہ تیار کیا گیا۔ ۲۰۔۲۵ کانسٹیبل بطور مزید کمک نوادہ بھیجے گئے۔ جنوری ۱۸۵۸ء میں ہندی پڑہ کے ایک سوداگر نجمی سیاہی اور آفیسر گیا آگئے۔ ۱۸۵۸ء کے آغاز سے بغاوت کی آگ ہر طرف دھیمی ہونے لگی۔ ۲۶ اپریل کو جگدیش پور میں کنور سنگھ کا انتقال ہوگیا اور اُن کے بھائی امر سنگھ نے انصرام امور اپنے ہاتھوں میں لیا۔ ماہ جون میں آرہ کے باغیوں نے اس ضلع پر یورش کی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ باغی ٹکاری کے قلعہ پر حملہ کرنے کی نیت سے آرہے ہیں کیونکہ اُس زمانہ میں وہاں تقریباً پندرہ بیس لاکھ روپیہ جمع کیا گیا تھا۔ لیکن انھوں نے آرول کے قرب وجوار کے مواضعات کو لوٹنے اور مسٹر سکوٹو کے خاندان کی دو فیکٹریاں تباہ کر دینے پر ہی قناعت کی۔ چونکہ گیا پر حملہ ہونے کا پورا یقین تھا اس لئے کلکٹر نے ڈیڑھ سو خطرناک قیدیوں کو حراست میں شیرگھاٹی روانہ کر دیا۔ لیکن راہ میں شیرگھاٹی سے ۶ میل اسیطرف قیدیوں کے محافظ ہی باغی ہوگئے۔ اپنے آفیسر پر حملہ آور ہوئے۔ اسکو گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ اور قیدیوں کو رہا کروایا۔ ۲۳ جون کو شب کی تاریکی میں امر سنگھ نے ۲۰۰ باغی دیسی پاؤں جیل خانے کے دروازے تک آپہنچے۔ کسی کو خبر تک نہ ہوئی اور قیدیوں کو رہا کر دیا۔ ۲۴ جون کو جہان آباد کے تھانہ پر باغیوں کی ایک جماعت نے دفعتہً حملہ کر دیا۔ سرکاری عمارتیں جلا ڈالی گئیں داروغہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ اور اس کا دھڑ الٹے پاؤں تھانہ کے سامنے ایک درخت میں لٹکا دیا گیا۔ جودھر سنگھ کی ہمت بڑھ رہی تھی۔ اور اب علانیہ لوٹ مار کرنے لگا۔ "دریائے سون اور مونگیر کے درمیان جتنی سرکاری عمارتیں ہیں میں انکو تباہ کرکے دم لوں گا" حالت نازک ہو رہی تھی۔ جودھر سنگھ امن وامان کی راہ میں ایک بہت بڑا اور آخری کانٹا تھا اس لئے ۳۰۰ پیادہ سپاہی اور ۵۰ سوار کا ایک دستہ اُس کے استیصال کے لئے گیا سے روانہ کیا گیا۔ آرول کے نزدیک جودھر سنگھ کے ساتھیوں کی ایک جماعت سے اس دستہ کی مڈبھیڑ ہوئی۔ لیکن شکست کھا کر منتشر ہوگئی۔ جودھر سنگھ کی اصلی جنگی قوت موضع کھامنی کے پاس مجتمع تھی۔ وہاں ایک سخت جنگ ہوئی۔ جودھر سنگھ کو شکست فاش ہوئی۔ اسکے ۱۰۰ آدمی مارے گئے۔ اس کی جماعت منتشر ہوگئی اور اسکی طاقت کا خاتمہ ہوگیا۔ انگریزی حکومت کی اس جنگی فتح نے اس ضلع میں بغاوت کی آخری چنگاریوں کو بجھا دیا۔ بدامنی کے کانٹے الگ کئے گئے۔ امن کی راہیں صاف ہوئیں اور گیا آرام کی

لہ ایک یوروپین تھے۔ افیون کی کاشت کرتے تھے۔ ان کے خاندان کی جائداد اب تک اس ضلع میں ہے۔ (ح)

نیند سو گیا۔

مسٹر ہوئی نے ۱۸۵۷ء کے واقعات کو اپنی رپورٹ میں بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا تھا۔ انکی رپورٹ ایک خاص سیاسی نقطۂ خیال کی آئینہ داری۔ غدر کی متحارب طاقتوں کی ایک صف میں وہ بھی موجود تھے اور اپنے حریف کو شکست دینے کی کوشش میں انھوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ اس لئے دلچسپی کے لحاظ سے انکی رپورٹ کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"گیا۔ ۱۱ مارچ ۱۸۵۸ء

بخدمت کمشنر۔ پٹنہ

میں اجازت چاہتا ہوں کہ ۱۸۵۷ء میں جو واقعات اس ضلع میں رونما ہوئے انکی مختصر روئداد آپ کے سامنے پیش کروں۔

میں یہاں ۲۸ اپریل ۱۸۵۷ء کو آفیشیٹنگ کلکٹر کی حیثیت سے آیا۔ زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ شمال و مغرب کی فضا میں طوفان نے ایک تلاطم پیدا کر دیا۔ گو جنوب میں ہمارا ایسے دور مقام میں اس طوفان کے کبھی پہنچنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن وہ نزدیک سے نزدیک پہنچتا ہی گیا۔ اور اس کے پہنچنے کے قبل دو قدم آگے ہی اس بیکلی اور بے چینی کے عام جذبات نمایاں ہونے لگے جو بنیادی ہوں یا اخلاقی، عظیم ہنگاموں کے پیشرو ہوا کرتے ہیں۔ بنارس میں فوج بگڑی تو اسکی خبر اس ضلع میں بجلی کی لہر کی طرح دوڑ گئی۔ مجھے پورا یقین ہے اور میری رائے کی تصدیق یہاں کے سمجھدار لوگوں نے کی ہے کہ بنارس پر بہار کی قسمت کا فیصلہ موقوف تھا۔ ان دنوں اندیشہ کی معقول وجہیں موجود تھیں۔ خطرہ قریب آتے دیکھ کر شرفاء خوف کا اظہار کرنے لگے۔ گیا کے گنڈے شہدوں کی زبان کھلنے لگی۔ اور لاف زنی کے الفاظ ستانی دینے لگے۔ انکی جسارت کا یہ عالم ہو گیا کہ برملا کہنے لگے کہ آنے والی گھڑی آئے تو انگریز مردوں کا خون اور انکی عورتوں کی عصمت دری ہمارے لئے بھی مسرت کے اسباب پیدا کرے گی۔ ہنگامہ کے امکان کی علامتیں ظاہر ہو رہی تھیں۔ اور عام افواہ تھی کہ ہنگامہ کے لئے ۱۵ جون کا دن مقرر کیا گیا ہے۔ مجھے اسکی کوئی خاص وجہ نہیں ملی۔ لیکن عام طور پر اسی یقین کیا جاتا تھا۔ تار سے کلکتہ خبر بھیجی گئی۔ اور وہاں سے ہز میجسٹی کی ۶۴ ویں رجمنٹ کی ایک کمپنی کو جو اسوقت شیر گھاٹی کی راہ سے کوچ کر رہی تھی گیا آنے کا حکم صادر ہوا۔

اسی زمانے میں مجھے اپنے فرائض کے علاوہ مجسٹریٹ کا آفس بھی اپنے ذمہ لے لینے کی ہدایت ملی۔ میرا اولین مقصد یہ تھا کہ گنڈے بدمعاشوں کے دلوں میں دہشت پیدا کر دوں اور انکو منتشر کر دوں اس لئے ہر مشتبہ شخص کے ذریعۂ معاش کے سلسلہ میں میں نے سخت تفتیش شروع کر دی۔ جب مجھے کورٹمنٹ اور کمشنر سے پچاس آدمی پولیس میں بھرتی کرنے کا حکم ملا تو میں نے انکو چار بڑی سڑکوں پر جو شمال و جنوب و مغرب سے شہر میں آتی ہیں۔ پہرہ کے لئے سنتری کے طور پر متعین کر دیا۔ مشرق میں دریا حفاظت کے لئے کافی تھا۔ ان سنتریوں کے ذمہ یہ کام تھا کہ مشکوک اشخاص کو جن کی ایک فہرست تیار کی گئی تھی معقول تعداد میں گرفتار کریں۔ اور ایسے سپاہیوں اور مشتبہ افراد کو جو ٹولی بنا کر یا اسلحہ لے کر شہر میں داخل ہونا چاہیں روک لیں اور میرے سامنے پیش کریں۔ اس طریقہ سے شہر کے آوارہ بدمعاشوں پر ردبست دباؤ ڈالا گیا۔ اور ایک ہفتہ کے اندر یا تو وہ حراست میں لے لئے گئے یا شہر سے باہر کہیں نکل گئے۔ ۳۰ سکھوں کی کمک نے ہماری پوزیشن مستحکم بنا دی۔ لیکن سکھوں کو آئے ہوئے بہت دن نہیں گذرے تھے کہ مجھے خبر ملی کہ شہر والے انکو عیسائی کہہ کر پکارتے اور ان کے ساتھ بیٹھنے اور تمباکو[1] پینے سے انکار کرتے ہیں۔ ایک بڑھئی کے خلاف اس کا ثبوت بہم پہنچا کہ اس نے چند سکھوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ تمہارے گھاٹنے میں سور کی چربی اور بیل کی پسی ہوئی ہڈیاں ملی ہوئی ہیں۔ دوسرے ہی دن ۱۰ کمپنی سولی پر لٹکا دیا گیا۔ اور میں نے یہ شہر کرا دیا کہ اگر کوئی شخص کسی سکھ کے ساتھ اس وجہ سے تمباکو نہیں پیتے کہ وہ عیسائی ہو گیا ہے یعنی اس سکھ کو کھانے میں ناپاک غذا دی ہے تو اس شخص کو کوڑے سے پٹوایا جائے گا۔ اس کے بعد کوئی شکایت اور سننے میں نہیں آئی۔

۱۰ جولائی تھی یا اسکے قریب کوئی اور تاریخ کہ ۶۴ ویں رجمنٹ کے ایک دستہ کو گرینڈ ٹرنک روڈ پر کوچ کرنے کا حکم ہوا۔ اس کی روانگی کے ایک دن قبل کمشنر کا ایک اہم مکتوب مجھے ملا جس میں اس دستہ کو اسوقت تک روک رکھنے کی تاکید

---

[1] حقہ اور تمباکو پینے سے سمجھ میں آتا ہے۔ (جلال)

کی گئی تھی۔ جس وقت تک کہ ایک مخبر چٹکاری بھیجا گیا تھا واپس نہ آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سٹریٹیلر کو اطلاع ملی تھی کہ مودھ[1] نرائن سنگھ کی ۳۰۰ توپیں ٹکاری قلعہ پر چڑھا دی گئی ہیں۔ مجھ کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ اگر مخبر ٹکاری سے لوٹ کر اس اطلاع کی تصدیق کرے تو سکھ اور انگریزی فوج لے کر راتوں رات مارچ کروں اور ٹکاری قلعہ پر اچانک حملہ کردوں۔ لیکن مخبر نے آکر اس اطلاع کو غلط بتایا اور وہ دستہ شیر گھاٹی روانہ ہوگیا۔ اس انگریزی دستہ کے چلے جانے سے ہماری پوزیشن بہت کمزور پڑ گئی۔ داناپور کی پلٹنوں پر کسی کو بھروسہ نہیں تھا۔ پانچویں بے قاعدہ رجمنٹ ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ مزید برآں وہ انگریزی فوج جو ٹرنک روڈ پر آرہی تھی ٹھٹک رہی تھی۔ اسکو قیام کرنے کا حکم ملا۔ چند دنوں میں ٹرنک روڈ کی حالت بھی مخدوش ہونے والی تھی۔ میرے خیال میں انگریز بچوں اور عورتوں کے لئے اب گیا مناسب جگہ باقی نہیں رہا تھا۔ جج میرے ہمخیال تھے۔ اس لئے ہم دونوں نے کشتی بھیجنے کے ذریعہ سے سبھوں کو مشورہ دیا کہ بال بچوں کے ہٹانے کا انتظام کریں لیکن انگریزی قوم میں ہندوستانی انگریز گھر کی چار دیواری سے مانوس ہستی کا ایک نمونہ ہوتا ہے۔ اُن میں سے کسی مرد یا عورت نے ہمارا مشورہ بھی ادا نہیں کیا۔ اور جب تک کہ میری اور جج کی بیویوں نے رہنمائی نہیں کی۔ کسی نے ہلنے کا نام بھی نہیں لیا۔ اور جب یہ دونوں چلیں تو سب کے سب چل کھڑے ہوئے۔

میں یہ تذکرہ کرنا بھول گیا کہ ہمارے پاس ۶۴ ویں رجمنٹ کے ۸۰ سپاہیوں کے علاوہ ۸۴ ویں رجمنٹ کے ۴۵ سپاہی تھے۔ ۸۰ چلے گئے تو یہ ۴۵ ہمارے پاس رہ گئے۔ اس لحاظ سے ہمارا فوجی دستہ اب ۱۲۰ سکھوں اور ۴۵ انگریزوں پر مشتمل تھا۔

اواخر جولائی تک حالات میں ایک عارضی سکون قائم رہا۔ دیسی اور انگریز دونوں اپنی اپنی جگہ پر کشمکش کو بغور دیکھ رہے تھے۔ اسکے قبل آرہ میں کنور سنگھ کی سازشوں سے میری توجہ ادھر بھی مبذول ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے کانتنکاروں کو دقت پر تیار رہنے کے لئے جو تاکید کی تھی اور ضلع گیا کے دو سب سے بڑے زمینداروں کو جو خطوط لکھے تھے اُنکی رپورٹ میں کشنر کے پاس بھیج چکا تھا۔ ۲۷ جولائی کو داناپور کی تین رجمنٹیں باغی ہوگئیں۔ اور کوئی نقصان اٹھائے بغیر چل کھڑی ہوئیں۔ اس واقعہ کا انتظار بہت دنوں سے تھا لیکن اس کے ظہور پذیر ہونے کی اطلاع کشنر نے مجھے پانچ چھ سطروں کے ایک اہم مراسلہ میں دی جس کے آخری الفاظ یہی تھے کہ "ہشیار! سنا جاتا ہے کہ کثیر تعداد تمہاری طرف جا رہی ہے"۔ کثیر تعداد کے مقابلہ کی سکت تو ہم میں تھی نہیں۔ اس لئے سٹریٹیلر کو میں نے لکھا کہ "اگر فاضل آدمی ہوں تو مدد کے لئے بھیجدیجئے"۔ اگرچہ ہفتہ قبل یہ بغاوت داناپور میں ہو جاتی۔ تو یقینی گیا میں بھی ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ لیکن یہاں کے کنڈے اور شہدے اور رذیل قوم کے افراد دبائے جا چکے تھے۔ اُن کا کوئی سرغنہ بھی نہ تھا۔ مشہور بدمعاش جیل خانے کی چار دیواری میں بند کسی کو ضرر پہنچانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ اور جو اُن کا سردار مانا جاتا تھا۔ وہ پٹنہ بھیجدیا گیا تھا۔ اس لئے تین رجمنٹوں کی بغاوت کی صدا مقامی بازگشت سے یہاں محروم رہی۔ اس پر بھی یہ زمانہ پریشانیوں کا تھا۔ دو نجیب کمپنیاں ۱۶۰ آدمیوں کی یہاں موجود تھیں اور اُن میں بہت سے اعتبار کے قابل نہیں تھے۔ مجھے خبر مل چکی تھی کہ اُن میں بہت سے افراد خفیہ جلسوں میں شرکت کرتے ہیں۔ گو میں جانتا تھا کہ جتنی فوجی قوت ہمارے پاس اُسوقت تھی اُس کی موجودگی میں انہیں کھلم کھلا بغاوت پر اتر آنے کی ہمت نہیں پڑیگی۔ لیکن یہ ناممکن بھی نہیں تھا کہ کسی روز رات کے وقت وہ مغرب کی طرف روانہ ہو جائیں۔ اور روانہ ہونے کے قبل خزانہ کے کچھ حصہ پر بھی ہاتھ ڈالدیں جس کی حفاظت نجیب ورسکہ باری باری سے ۲۴ گھنٹہ کے وقفہ پر کیا کرتے تھے

۳۱ جولائی کو میں نجیبوں کے صوبہ دار سے اپنے کمرہ میں باتیں کر رہا تھا کہ کشنر کا ایک خط جس پر الفاظ "فوری اور ضروری" لکھے ہوئے تھے مجھے دیا گیا۔ میں نے خط کھولا۔ مختصر سی عبارت تھی کہ "ڈنبار کا دستہ آرہ میں شکست کھا گیا ہے۔ مرکزی مقام کو بچانے اور ملک پر قبضہ قائم رکھنے کے لئے اب ہر چیز قربان کردینی چاہئے"۔ مجھ کو اور ملکی حکام کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ "جس قدر فوجی قوت ہو لے کر خفیہ طور سے پٹنہ چلے آؤ"۔ آخر میں یہ حکم تھا کہ "اگر جان کا خطرہ نہ ہو تو خزانہ بھادو"۔ صوبہ دار نے مجھ سے پوچھا کہ "کمشنر صاحب کیا فرماتے ہیں؟"

---

[1] مہاراجہ مترجیت سنگھ والی ٹکاری کا انتقال سنہ ۱۸۴۰ء میں ہوا۔ اور ٹکاری راج دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ ان کے بڑے بیٹے مہاراجہ ہیبت نرائن سنگھ راج کے مالک ہوئے۔ اور چھوٹے بیٹے مودھ نرائن سنگھ ۱۰ راج کے مالک ہوئے سنہ ۱۹۰۷ء میں یہ دونوں راج ملادئے گئے۔ (ج)

میں نے کچھ کہہ کر ٹال دیا - اور دو ایک منٹ میں اُس کو رخصت کر دیا - اُس کے جانے کے بعد ایک گشتی چٹھی بھیجی اور ایک گھنٹہ میں سب لوگ جمع ہو گئے یہ فیصلہ ہوا کہ شام کے پانچ بجے ہم لوگ سب روانہ ہو جائیں -

مسٹر ٹیلر اب فرماتے ہیں کہ میرا منشاء تھا کہ "خزانہ بھی ہٹا لیا جائے" اور خزانہ ہٹانے میں جس قدر وقت لگتا اسکو میں نے پہلے ہی قیاس کر لیا تھا" لیکن ان کے حکم سے ایسا نہیں ٹپکتا تھا - اُس خط سے یہی مقصد نمایاں طور پر ظاہر ہوتا تھا کہ مرکزی مقام کی حیثیت سے پٹنہ کی حفاظت کی جائے - اور اُس کا ذریعہ یہی تھا کہ جس قدر جنگی قوت جتنی جلد مہیا ہو سکے ایک مقام پر خفیہ طریقہ سے نہایت جلد مجتمع کر دی جائے - اور اگر اس میں ذرا بھی دیر لگتی تو ان کے حکم کے الفاظ اور معنی دونوں کی خلاف ورزی ہوتی - اگر مرکزی مقام پر قبضہ قائم رکھنے کے لئے ہر چیز کی قربانی "ضروری تھی تو یہ ظاہر ہے کہ خزانہ کا روپیہ ہٹا لینے کے لئے گاڑیاں جمع کرنے اور اون پر روپیہ چڑھانے میں ضرور کچھ وقت لگتا - اور یہ یقیناً کمشنر کی خواہش اور اُن کے نقشہ کے خلاف ہوتا - ہر کیفیت کر از کم میرا یہ خیال ضرور تھا - اسوقت بھی میں نے یہی سمجھا اور اسوقت بھی یہی سمجھتا ہوں کہ افسر بالا کے حکم سے جو مقصد ظاہر ہو رہا تھا اسی پر تعمل کر رہا تھا ۶ بجے ہم لوگ روانہ ہوئے - داروغہ - صوبہ دار اور دو ایک دیسیوں سے میں نے باتیں کیں اور انکو امن و امان قائم رکھنے کی ہدایت کی -

ہم لوگ شہر سے باہر ایک میل جا چکے ہونگے کہ مجھے دفعتہً خیال آیا کہ میں کمشنر کے پاس جتنے سپاہی مل سکیں بھیجنے کے لئے مجبور ہوں لیکن اس امر کے لئے مجبور نہیں کیا گیا ہوں کہ مرکزی مقام کی حفاظت کے سلسلہ میں بذات خود بھی مدد کروں - مسٹر ہولنگس اور میں دونوں لوٹے - اور بھی سوچتے ہوئے لوٹے کہ آنیوالے خطرہ کے مقابلہ کے لئے ہمیں ابھی سے ہمت کا قدم اٹھانا چاہیئے - میں پہلے جیل خانہ گیا - وہاں ۸ سپاہی گارد تھے - اُنکو باہر بلایا - اُن سے کچھ باتیں پوچھیں - جیسے سپاہیوں کا عام قاعدہ ہے انھوں نے انقاظ اور چہرہ بشرہ سے وفاداری اور اطاعت کا اظہار کیا - وہاں سے میں خزانہ پہنچا - محافظ میرے ساتھ گئے - جیل خانہ کے سپاہیوں کی طرح خالی ہاتھ نہیں - بلکہ بندوقیں لئے ہوئے - میں نے یوں محسوس کیا جیسے اُن میں سے بعض دل میں کشیدہ ہیں - اُن کے سامنے ہندوستانی میں میں نے ایک تقریر کی - جواب میں سبھوں نے وفاداری کی قسمیں کھائیں - یہ سب کچھ ہو چکا تو ہم دونوں اپنی اپنی کوٹھیوں[1] میں چلے گئے - میں نے ایک سوار کے ذریعہ مختصر سا پیغام شیر گھاٹی بھیجا - اور رائے پوچھی کہ میں کیا کروں شیر گھاٹی سے ۴۶ ویں رجمنٹ بلوائی جا چکی تھی - اور ایک دوسرے سوار نے وہاں جا کر پکڑا - اور کیپٹن طامسن اپنی رجمنٹ لے کر گیا آ گئے - اُن کے آنے کے قبل دو دن اور دو راتیں بڑی پریشانی میں کٹیں - مجھے خوف لگا رہتا تھا کہ کہیں بجنب خزانہ ساتھ لے کر اپنے باغی بھائیوں کے پاس آرہ نہ چلے جائیں لیکن اس عرصہ میں بھی ہم لوگ غافل نہیں تھے - بڑے بڑے گیا وال جو یہاں کے پنڈے ہیں - انکو ایک جلسہ میں میں نے مدعو کیا - انھوں نے آدمی اور اسلحہ سے پوری طرح مدد اور حمایت کا وعدہ کیا - دیسیوں کے دماغ میں سکون پیدا کرنے کی غرض سے مسٹر ہولنگس اور میں دونوں اپنے اپنے اُفس میں گئے - لیکن گیا وال تو بھٹی ہوئی بانسری کی طرح نکلے - ان میں سے ایک دو نے ہاتھ سجوارنے تو چند آدمی کام کے بھیجے - بقیہ اوروں نے آدمی تو ضرور بھیجے لیکن لوڑھے - اندھے - پاؤں میں لنگ - ہاتھ میں کچھ نہیں - صرف تلوار اور وہ بھی زنگ کھائی ہوئی - یہ حقیقت عیاں تھی کہ عوام اپنی مدد آپ نہیں کرنا چاہتے ہیں - اور جب یہ حقیقت عیاں ہو گئی اور قبل اس کے کہ ۴۶ ویں رجمنٹ کا دستہ یہاں پہنچے - میں اس پر غور کرنے لگا کہ آخر کرنا کیا چاہئے - کلکتہ سے رسل و رسائل کا کوئی ذریعہ سوائے ڈاک کے نہیں اور اُس میں بھی دیر لگتی - اس لئے حالات کو مدنظر رکھ کر جو صحیح تدبیر میری سمجھ میں آئے اُسی پر مجھے عمل کرنا تھا - یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی کہ اگر پٹنہ کا خطرہ واقعی ایسا ہی تھا کہ اُسکی حفاظت کے لئے معمولی سی تعداد سکھوں اور انگریزوں کی جو گیا میں تھی اسکو بھی جانا پڑا تو یہ ۸۰ آدمیوں کا دستہ جو یہاں آیا تھا اُسکو بھی یقیناً بلا لیا جائے گا - اور میرا یہ فرض بھی تھا کہ جس طرح پہلے اپنی فوجی قوت

---

[1] ایسا خیال نہیں آیا تھا - بلکہ مسٹر ہولنگس نے خیال دلایا تھا - (ع)

[2] موجودہ ڈاک بنگلہ سے مغرب اور میکلوسکن روڈ کے جنوب اور مغربی کونے پر کلکٹر کی کوٹھی تھی - اور کلکٹر کی موجودہ کوٹھی میں مسٹر ہولنگس رہا کرتے تھے (ع)

[3] شیر گھاٹی میں ایک اسپیشل مجسٹریٹ رہتا تھا اور ایک چھوٹی سی فوج بھی متعین تھی - (ع)

مسٹر ٹیلر کے پاس بھیج چکا تھا۔ اسی طرح ان ۸۰ آدمیوں کو بھی اُنکی مدد کے لئے بھیجدوں - اور ایسی حالت میں جبکہ میں دیکھ چکا تھا کہ عوام پر کوئی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ہے - تو اس فوجی قوت کے ساتھ ساتھ خزانہ بچانے کی رہی سہی امیدوں کو بھی مجھے وداع خیر کہنا پڑتا - اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ ۸۰ سپاہی پٹنہ روانہ ہو جائیں اور اپنے ساتھ خزانہ کا روپیہ بھی لیتے جائیں - روانگی کے وقت سے ۶ گھنٹہ قبل کمیٹن طامس کو داناپور کے کمانڈنگ آفیسر کا ایک پرزہ ملا جس میں پنسل سے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے کہ "خدا کے لئے ہشیار ہو جاؤ - دیسی سپاہ رجمنٹ فعل مارچ کرتی ہوئی گیا جا رہی ہے جنرلی ہے کہ ایک توپ بھی ساتھ ہے" اب شمال کی طرف جانا اس رجمنٹ سے ٹکرانا اور خزانے کا چھن جانا یقینی تھا - اس لئے جنوب کی طرف سے کلکتہ جانے کا فیصلہ کیا گیا - پنسل سے لکھی ہوئی چند سطروں نے غالباً بہت سے انسانوں کی جان بچائی - اگر ہم لوگ شمال کی طرف روانہ ہوتے ابھی شہری میں ہوتے اور جیل خانہ کا دروازہ کھول دیا جاتا اور لمبی لمبی سڑکوں اور گلیوں کے طویل سلسلے سے ہم لوگوں پر حملہ کیا جاتا تو جان بچا کر بھاگنا ہی بہت کا بڑا کارنامہ ہوتا - اور جنوب جاتے ہوئے خزانہ کے دروازہ سے صرف میدان ہی کا راستہ تھا - نیچے یہ جماعت روانہ ہوئی - میں مکمل بالتفصیل لکھ چکا ہوں کہ میں پیچھے رہ گیا - نجیبوں نے جیل خانے کے دروازے توڑ ڈالے - اور قیدی اور محافظ دونوں مل کر میرے بنگلہ پر حملہ آور ہوئے - خوش نصیبی سے مجھے ایک گھوڑا کسا ہوا تیار ملا اوسپر سوار ہوا اور بچکر نکل گیا - اس بدمعاش ہجوم نے ہم لوگوں کا تعاقب شہر سے تقریباً تین میل باہر اُس جگہ تک کیا جہاں سڑک چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کو چیرتی ہوئی ایک تنگ راستہ کی صورت میں باہر نکلتی ہے - اور دو بار ہم لوگوں پر حملہ آور ہوا اور آخر ۶ - ساتھیوں کو مُردہ چھوڑ کر بھاگ نکلا - برسات کا زمانہ - سفر تکلیف دہ اور طویل لیکن انگریزی فوجیوں کی ہشیاری - جفاکشی اور ہمہ تن گوش مستعدی کی بدولت کلکتہ کے خزانہ میں ۷ لاکھ روپیہ جمع کرنے میں ہم لوگ کامیاب ہو گئے -

نیم بسمل خوردہ دشمن - قیدی اور محافظ دونوں شہر کی طرف واپس لوٹے - اور خزانہ میں تھوڑا سا روپیہ جو جیل خانہ کی رسد کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا - لوٹ لیا - اور منتشر ہو کر محافظوں نے آرہ کا رخ کیا - اور قیدی اپنے اپنے گھر کی طرف چلے گئے - شب کے وقت شہر پر ایک سکوت اور لرزہ کا عالم طاری تھا - صبح ہوئی - اور مشرق کے جشنی کی روح نے پوری طاقت کے ساتھ انگڑائی لی - ہر بچا شہید جو رات بھر لوٹ مار کا خواب دیکھ چکا تھا اب اُس خواب کی تعبیر کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا - دس دس بارہ بارہ برس کے لڑکے - ہاتھ میں تلوار لئے - اکڑتے ہوئے نکلے - من پسند اور اہل ثروت طبقے جو تعداد میں بدمعاشوں سے دس گنا زیادہ تھے اگر کسی دوسرے ملک میں ہوتے تو مشترک دشمن کے سامنے ایک ہو جاتے لیکن اپنا انتظام آپ کرنے کے عناصر اس ملک میں مفقود ہیں اس لئے شہر کے ذلیل ترین افراد اور گندے شہدوں نے من مانی کارروائیاں کیں - دو ایک گروہ کے سردار کو سمجھدار تھے انھوں نے جریدہ چندہ کیا تھا کاتی سمجھا - مگر مگر ہو جاتے اور امن و امان کی حیثیت وصول کرتے - اور بعض گروہ تو بلا امتیاز غارتگری اور لوٹ میں مست تھے - پانچ چھ گھنٹہ اس اپنے ساتھیوں کو لے کر آمادہ ہوئے اور ایک محلہ پورے کا پورا لوٹ لیا - خاص طور پر نقصان اُٹھانے والے بدنصیب ہندو جہاں تھے شہر کے نیچے حصہ کے رہنے والے مسلمانوں کے ادنیٰ طبقہ کے افراد نے اور بالائی حصہ کے ان پنڈوں نے اُن کو بیک وقت اپنا شکار بنا لیا -

۱۶ اگست کو شہر پر دوبارہ قبضہ کیا گیا - حکام پٹنہ سے واپس بھیجے گئے - اُن کے ساتھ ۸۰ دیں پلٹن کے ۳۵ انگریز اور کمپنی راترے کے ۲۲ سکھ تھے - شہر کی آبادی پہلے توڑی - کہ سرکاری عمارتیں جلادی گئی ہیں - پورپینوں کی جائداد تباہ کر دی گئی ہے - اس کا بدلہ شہر پر گولہ باری کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس لئے جس کو جو راہ ملی اُدھر بھاگ نکلا - لوٹ مار کرنے والوں نے لوٹی ہوئی چیزیں سڑکوں پر اور کھیتوں اور تالابوں میں پھینک دیں - لیکن جب انہیں یقین ہو گیا کہ مراجعت حکام کا مقصد عام طور پر انتقام لینا نہیں ہے بلکہ امن و امان قائم کرنا ہے تو اعتبار کی فضا قائم ہو گئی - دن دن کی تالیف القلوبی نے امن پسند طبقہ کے دل میں اُس چیز کے خلاف جو ہندوستانی راج کہلاتی ہے ایک نفرت سی پیدا کرا دی - انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ نو دانگی عزت و عافیت کے لئے بدیشی گورے کا وہ مضبوط ہاتھ کتنا ضروری ہے جس کا انہیں وہم ہوتا تھا کہ ذرا زور سے دبا رہا ہے - یہ بھی انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ صرف شہری میں نہیں بلکہ دیہاتوں میں بھی بدامنی اور تعدد ..... نے غلبہ پا لیا تھا - کس طرح دیہات کے کاشتکار اور شہر کے بدمعاش دونوں گویا اپنی فطرت

کی بھاری یغارت گری اور تشدد کی طرف جھکتے تھے ۔ اور انھوں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ جنگلی شکاری جانور کی وہ روح کس عالمگیر انداز میں کارفرما رہی جو نفس کی ہوسناکیوں کے سوا کوئی مشترک مقصد و تسلیم نہیں کرتی ہے اور نہ کسی آئین کے سامنے سر جھکاتی ہے ۔ کئی معزز ہندوؤں نے مجھ سے کہا کہ "ایسی غلامی میں دوبارہ زندگی بسر کرنے سے تو کہیں بہتر ہے کہ گورنمنٹ کے دامنِ امن میں پناہ ملنے کے لئے عیسائی بننے کی شرط ہو تو میں تیار ہوں"

دو واقعات جن کی کڑی اس ضلع کے فساد کے ساتھ ملتی ہے عجیب ہیں ۔ ایک ۔ کنور سنگھ کا اثر ۔ اگرچہ وہ خاص بہار کا زمیندار نہیں ہے اور دوسرے ۔ ہندوستانی گورنمنٹ کے مفہوم کے ساتھ لوٹ مار اور غارت گری کی عام مطابقت ۔ اگر کوئی زمیندار کسی کمزور پرگنہ آور ہو ۔ یا کوئی دیہات آس پاس میں کسی ولولہ پرستکاری کی طرح ٹوٹ پڑے ۔ یا دس بارہ لچے بدمعاش کسی تنہا راہ گیر کو مار کر گرا دیں اور سب کچھ لوٹ لیں ۔ تو صدا یہی سننے میں آتی تھی کہ "ہندوستانی راج ہوا ۔ کنور سنگھ کا راج ۔ لوٹ ۔ لوٹ" اس ضلع میں کوئی ایسا با اثر زمیندار نہ تھا ۔ جو اُن سڑے ہوئے مختلف اور منتشر مادوں کو گوندھ کر ایک متعفن انبار کھڑا کر دیتا ۔ ان ہنگاموں کو صرف تین جگہ وہ ابتری نصیب ہوئی جو غلطی سے بغاوت کہلاتی ہے ۔ اس ضلع کے شمال و مشرق کے حصہ میں حیدر علی خاں نے چند رفیقوں کی مدد سے پرگنہ اجگیر پر جو زمانہ سابق میں اس کے موروثوں کا تھا قبضہ کرنے کی کوشش کی ۔ ستمبر میں وہ گرفتار ہوا اور سولی پر چڑھا دیا گیا ۔ دو مخالفین راج نے ایک ٹھٹھا سا جھنڈا بلند کیا ۔ ایک تو درویش ہے اور دوسرا جیل خانہ میں بیٹھا اپنے مقدمہ کی پیشی کے دن گن رہا ہے ۔ وزیر گنج میں ۱۲ یا ۱۴ مواضعات نے ایک شخص خوشحال سنگھ (جو کئی مواضعات کا عہدیدار ہے) کی سیادت میں متحد ہو کر پہلے تو بلا امتیاز غارت گری کی ہمہدی رسمیں ادا کیں ۔ اور پھر خوشحال کا جھنڈا کھڑا کیا ۔ ان میں سے بعض بدبخت احمق کالا پانی بھیجے گئے ہیں لیکن خوشحال سنگھ اب تک نہیں پکڑا گیا ہے ۔ اس ضلع میں ایک مسٹر سلونی زمیندار یا افیون کی کاشت کرنے والے پورے پنڈ میں ۔ مغربی تھانوں میں انکی تین چار فیکٹریاں تباہ کر ڈالی گئیں ۔ دو شخصوں کے شریفانہ طرزِ عمل کا تذکرہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ انکی ہمت اور قوتِ فیصلہ نے شہر گھاٹی کو خطرہ سے محفوظ رکھا ۔ ایک شیر گھاٹی کے داروغہ رجب علی اور دوسرے بابو آنند کمار رائے جن کا تعلق محکمۂ انکیزی کیوڈ انجینئر کے ساتھ ہے ۔ یہ دونوں اپنے فرائض کی انجام دہی میں اس زمانے میں بھی نہتک رہے جبکہ سارے ضلع میں پولیس روپوش ہو گئی تھی ۔ خود نمونہ بنے ۔ خیر خواہوں کی جماعت کھڑی کی ۔ بدمعاشوں کو مرعوب کیا ۔ لوٹ مار نہیں ہونے دی ۔ اور انگریزی اور سرکاری جائداد کو کوئی ہاتھ تک نہیں لگا سکا ۔

میں ۲۵ اگست کو گیا واپس آیا ۔ اسوقت اس ضلع کا مشرقی حصہ پانچویں بے قاعدہ رجمنٹ کے باغی سواروں کے قبضہ میں تھا ۔ یوں نظر آتا تھا جیسے یہ بھلے آدمی یہ سمجھ رہے ہیں کہ گورنمنٹ کے پاس کوئی فوجی قوت اُن کے خلاف استعمال کے جانے کے لئے نہیں ہے ۔ کوچ آہستہ آہستہ ، قیام ایک ایک جگہ پر ۔ تین تین ۔ چار چار دن ۔ اور اس کا ذرا احساس تک نہیں کہ کہیں تعاقب تو نہیں ہو رہا ہے ۔ شروع میں انکو یہ یقین اس سمت کھینچ لایا تھا کہ گیا جنگی قوت سے اب تک محروم ہے ۔ اور جب انکو اپنی غلطی کا احساس ہوا تب بھی انکی نقل و حرکت میں عجلت نمایاں نہیں ہوئی ۔ وزیر گنج گیا سے ۱۴ میل کے فاصلہ پر ہے ۔ وہاں اُن کا قیام ۳ دن رہا ۔ اور اس عرصہ میں چاروں طرف سے رسد اور روپیہ تحصیل وصول کرتے رہے ۔ انگریز کی حکومت نگاہ حقارت سے دیکھی جا رہی تھی ۔ اور مجھے اندیشہ تھا کہ انکی موجودگی کے باعث اس ضلع میں بغاوت کا شعلہ کہیں پہلے سے زیادہ تیز نہ بھڑک اٹھے ۔ لیکن ہم لوگ ۲۵ ، ۲۶ انگریز اور سکھوں کو خاموش لئے بیٹھے رہیں اور ان لچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیہاتی علاقہ پر قبضہ جمانے اور مستانہ وار جھومتے پھرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیں ۔ یہ ہمیں گوارا نہ تھا ۔ تعداد میں ہم اُن سے آدھے تھے ۔ گورنمنٹ سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی ۔ ۶۰ ستمبر کو باغیوں کا سوار دستہ وزیر گنج سے جنوب کی طرف بڑھا ۔ بظاہر اس کے معنی یہی تھے کہ وہ ٹرنک روڈ کی طرف جا رہے ہیں اور گیا حملہ کی زد سے محفوظ ہو گیا ہے ۔ کیمپ پر رات کے حملہ کرنے کی تجویز پیش کی ۔ میں ہمیشہ جارحانہ اقدام کا حامی تھا ۔ اس لئے یہ کہتے ہوئے کہ حملہ کرنا اب کا فرض ہے ۔ انکی تائید کی ۔ اور گیا سے ہم لوگ ۸ ستمبر کو دشمن کے قریب جا پہنچے ۔ جنگی کارروائیوں اور ان کے نتائج سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے ۔ ہم نے دشمن کو شکست نہیں دی ۔ اور نہ دشمن نے ہمیں شکست دی ۔ گو اخبارات کے بیان اُن دنوں اصرار کے ساتھ کچھ اور ہوتے تھے ۔ ہمارا کوئی آدمی نہیں مارا گیا ۔ ۲۲ زخمی ہوئے ۔ جن میں دو جانبر نہ ہو سکے ۔ باغی جو میدان جنگ میں مقتول

ہوئے یا بعد کو زخموں سے جانبر نہ ہو سکے انکی مجموعی تعداد ایک درجن کے قریب ہے۔ اُن کے زخمیوں کی تعداد کا حساب نہیں مل سکا۔ باغی سوار ہم لوگوں سے رفتار میں تیز گیا پہلے پہنچ گئے۔ جیل خانہ کے دروازے کھول دئے۔ اور مغرب کی طرف نکل گئے۔ اندازاً دو ہفتہ اور وہ اس ضلع میں رہے۔ اور اس عرصہ میں کوئی سا قابل نفرت فعل ہی جو اُن سے سرزد نہ ہوا ہو۔ رسوائے عالم گنڈا اندر سنگھ اور اُس کے رفیق گیا کے کل بدمعاش اور لچے شہدے قیدی۔ سب اُن کے ہمراہ ہو گئے۔ عورتیں زبردستی پکڑ کر بھگائی گئیں اور پھر کسی تازہ مہم کے شکار کے واسطے جگہ بنانے کے لئے سڑکوں پر چھوڑ دی گئیں۔ یا محنتی اور جفاکش مرد۔ سب کچھ ان کا لوٹا ہوا عصمت ریزی۔ لوٹ مار۔ قتل و خون۔ اس قسم کے فتنہ قدم چھوڑتے ہوئے یہ کمینے بڑھتے چلے گئے۔

آخر کار اس پانچویں بے قاعدہ باغی رجمنٹ نے دریائے سون کو عبور کیا۔ ابھی وہ اور زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ رام گڑھ بٹالین کی ملیشیا رکی خبروں نے تشویش پیدا کر دی۔ اس رسالہ میں بہت سے سپاہی شیر گھاٹی اور گیا کے مضافات اور اس ضلع کے دیگر اطراف سے بھرتی کئے گئے تھے۔ مجھے جتنی خبریں ملیں اُن سے یہ یقین ہوتا تھا کہ ان کا ارادہ شیر گھاٹی ہو کر گیا پہنچنے کا تھا۔ اور ہماری فوجی قوت کا یہ عالم تھا کہ سکھ ۵۰ تھے۔ اور وہ بھی بیمار اور زخمی۔ اور ان میں بھی ایک درجن کے قریب چلنے پھرنے کے ناقابل۔ ۸۴ ویں پلٹن کے ۵۳ انگریز تھے۔ ان میں بھی ۸ بیمار اور زخمی۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات تھی کہ اگر رام گڑھی اس طرف رخ کرتے تو ہم انکا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ اس لئے میں خزانہ کا روپیہ بھیجنے کے سامان میں مصروف ہو گیا۔ ہاتھی منگوائے۔ ہزار ہزار روپیہ باکسنے کے لئے بڑی بڑی تھیلیاں بنوائیں۔ بیماروں کے لئے ڈولیاں فراہم کیں۔ فوری ضرورت کے عالم میں کہاروں کی معقول تعداد جمع کرنے میں دقت ہوئی اس لئے میں نے تقریباً ایک سو کہار ملازم رکھ لئے۔ اور سکھوں کو ہدایت کی کہ صبح و شام دونوں وقت اپنی صحت کی خاطر ہوا خوری کیا کریں۔ انکو یہ ہدایت پسند آئی۔ زخمیوں اور بیماروں کی ڈولیوں کی ایک لمبی قطار روزانہ دو بار بلیرڈ بنگلہ سے (جو ان دنوں سکھوں کے ہسپتال کا کام دے رہا تھا) نکلتی ہوئی نظر آیا کرتی اور جب پیچھے ۵۳ ویں رجمنٹ کے ہاتھوں رام گڑھیوں کو شکست نصیب ہوئی تو اس وقت تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ اور اگر رام گڑھیوں کو گیا آنا نصیب بھی ہوتا۔ تو قبل اس کے کہ شہر کے در و دیواروں پر ان کی نظر پڑتی یہ سکھ گیا سے پٹنہ جانے والی راہ پر آدھی مسافت طے کر لیتے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی کہ یہ ضلع مشرق کے باغیوں کی رہ گذر بننے والا تھا۔ میں نے جولائی میں اس حقیقت کی طرف گورنمنٹ کی توجہ منعطف کرائی تھی۔ اور پیشین گوئی کر دی تھی کہ جب پانچویں بے قاعدہ اور ۳۲ ویں رجمنٹیں بگڑیں گی تو اپنی اس محبوب دیسی سڑک پر گامزن ہونگی چودیوگڑھ۔ کرک ڈیہا اور نوادہ چھوتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ پانچویں بے قاعدہ نے وہی سڑک چنی۔ اواخر اکتوبر میں ۳۲ ویں رجمنٹ کی تین کمپنیوں نے دیوگڑھ میں بغاوت کی تو وہ بھی انہیں کے نقش قدم پر روانہ ہوئیں۔ یوں تو سارا غدر باغیوں کی حماقت کا ایک کارنامہ تھا۔ لیکن یہ ایک حیرت انگیز خدائی بات تھی کہ یہ صوبہ کس طرح محفوظ رہ گیا۔ اگر دانا پور کی رجمنٹ۔ رام گڑھ کی ملیشیا۔ پانچویں بے قاعدہ اور ۳۲ ویں رجمنٹیں یہ سب کہیں مل کر ساتھ نکلتیں تو کچھ مدت کے لئے تو ضرور اُن کا کوئی مقابلہ کرنے والا نہیں تھا۔ میں نے دیوگڑھ کی بغاوت کی خبر سنی تو فوراً ڈپٹی مجسٹریٹ نوادہ کو ہدایت بھیجی کہ نوادہ جیل خانے کے تین سو حاجی قیدیوں کو (یعنی جن قیدیوں کے مقدمات ابھی زیر سماعت تھے) گیا بھیجدیا جائے آپ واقف ہیں کہ پانچویں بے قاعدہ رجمنٹ کے دریائے سون پار کرتے ہی کمشنر پٹنہ سے اور اُن کے ساتھ مجھے سکھ بھیج سکے اس ضلع سے باہر سون کے کنارے ڈھیری بھیجدئے گئے تھے۔ پولیس کی تعداد میں اضافہ کر کے میں نے اتنی قوت پیدا کرنے کی کوشش کی کہ منتشر بستیوں میں وقتاً فوقتاً جو لوٹ مار اور بدامنی کی وارداتیں ہو جایا کرتی تھیں انکو مؤثر طریقہ سے دبا سکوں۔ لیکن اندرونی علاقہ کے جنگجو راجپوت اور برہمنوں کے مقابلہ کے لئے ہمارے برقندازوں کی معمولی تعداد کافی نہ تھی۔ اس لئے آپکی بھیجی ہوئی کمک کو دیکھ کر جو میرے پاس چالیس

---

(۱) کچہری روڈ میں میونسپل مارکیٹ کے نزدیک انٹا کوٹھی کے نام سے ابھی تک مشہور ہے اور ان دنوں جناب حاجی خان بہادر چودھری محمد یٰسین صاحب آنریری مجسٹریٹ سابق ام۔ ال۔ سی۔ کی تولیت میں ہے۔ (ح) (۲) میجر انگلش نے ۲ر اکتوبر ۱۸۵۷ء کو جگدیشپور کے قریب ۳۲ ویں رجمنٹ کو شکست دی تھی (ح) (۳) بابھنوں سے مراد ہے۔ (ح)

نجیوں کے دستہ کی صورت میں پٹنہ سے آئی - میرے دل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی - میں نے انہیں نوادہ بھیجدیا - میرا اعتبار اُن پر شام اُسی وقت تک تھا جب تک کہ وہ باغیوں سے دور رہیں - لیکن جب ۳۲ ویں رجمنٹ کی ۳ کمپنیاں مگر تھیں تو میں نے انکو اور اُن کے ساتھ حاجی قیدیوں کو بھی گیا منگوا لیا - اب گیا جیل خانہ میں حاجی قیدیوں کی تعداد ۶۰۰ سے تجاوز کر گئی - اور اُنکی حفاظت کے لئے یہ ۴۰ تجنیب اور چند برقندار تھے - یہ زمانہ میرے لئے بڑی پریشانی کا تھا - اور کیوں نہ ہوتا؟ ایک کثیر تعداد قیدیوں کی - اور وہ بھی ایسے جرائم میں ماخوذ جن کی سزا سخت سے سخت ہو سکتی ہے - محافظوں کی تعداد اس قدر کم - اور محافظ بھی ایسے کہ اُن کے بھائیوں نے قبل ایک بار جیل کا دروازہ توڑ ڈالا تھا - اور میری جان پر حملہ آور ہوئے تھے - باغیوں کی تین کمپنیاں گیا سے کچھ دور نہیں - اور وہ بھی اس شاہراہ پر قدم زن جو گیا کی طرف آتی ہے - خود گیا میں ایک مسلح بیمار اور زخمی سپاہیوں کا - اور میں سے بھی کم ایسے جو دشت پر کام آسکیں - ان دقتوں نے میرے فرائض کی گرانباری اور ذمہ داریوں کی سختی کو بڑھا دیا تھا - میں نے سوچا کہ کل قیدیوں کو بیڑیاں پہنا کر گرینڈ ٹرنک روڈ کے نزدیک کسی مقام پر بھیجدوں - اس لئے بیڑیاں بنوانے اور سکھوں کے لئے پھر صبح و شام دو وقت حوا فوری کا انتظام کیا - انتظام کیا ہی تھا کہ تار سے خبر ملی کہ میجر انگلش در آنکی ۵۳ ویں رجمنٹ کو گیا آنے کا حکم ملا ہے لیکن ابھی تک یہ امر مشکوک تھا کہ گیا پہلے کون پہنچتا ہے؟ یہ رجمنٹ یا تین باغی کمپنیاں؟ باغی وزیر گنج پہنچ چکے تھے اور ۱۴ میل کی مسافت حائل تھی - میجر انگلش ۲۰ میل دور شیر گھاٹی میں تھے - اُن کے پاس میں نے ایک تاکیدی پیغام بھیجا - اور دوسرے روز انگریزی سنگینوں کی چمک نے ہمیں تسلی دلا دی کہ اب کوئی خطرہ باقی نہیں رہا - اب باغیوں نے مغرب کی راہ چھوڑی اور شمال کی سمت رخ کیا - کرنیل انگلش کی یہ کوشش تھی کہ جہان آباد میں باغیوں کو روکیں اور وہیں اُن کا کام تمام کریں - لیکن وہ نظر بچا کر نکل بھاگے اُن کے پیچھے پیچھے ایک ہفتہ کے اندر ہی اُسی رجمنٹ کی اور دو کمپنیاں پہنچیں جنھوں نے راج محل کی پہاڑیوں میں علم بغاوت بلند کیا تھا - ان کی سرکوبی کے لئے ہم لوگ یکم نومبر کو روانہ ہوئے - ۳۰ میل مارچ کرنے کے بعد ہم لوگ مسوا پہنچے جہاں سے نوادہ ۹ میل کے فاصلہ پر ہے - اور باغیوں کا تعاقب شروع ہوا - نوادہ سب ڈویژن سے ضلع پٹنہ کا جنوبی حصہ طے کرتے ہوئے جہان آباد سب ڈویژن کی راہ سے دریائے سون تک اُن کا تعاقب جاری رہا - اور مسلسل چار دن اور پانچ راتیں ۱۳۰ میل تعاقب کرنے کے بعد باغی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے - ۱۸۵۷ء میں اس ضلع میں باغیوں کی یہ آخری تاخت و تاراج تھی -

میری دانست میں اس قسم کی تاخت و تاراج کے سلسلہ میں دو ایک نتیجے نکلتے ہیں اول یہ کہ عام خیال ہے اور اس خیال میں صحت کا کوئی وجود نہیں ہے کہ باغیوں کے ذرائع خبر رسانی عمدہ ہوتے ہیں - بلکہ اس کے برعکس مجھے یقین ہے کہ اُن کے ذرائع نہایت محدود اور ناقابل اعتبار ہوتے ہیں - پانچویں بے قاعدہ رجمنٹ کو گیا کے نزدیک پہنچنے کے قبل معلوم نہیں تھا کہ شہر پر سرکاری حکام دوبارہ قابض ہو چکے ہیں - جنھی باغی جماعتیں اس ضلع میں آئیں کوچ کے دوران میں جھوٹی خبروں سے برابر اثر پذیر ہوتی رہیں - ۳۲ ویں رجمنٹ کا پہلا دستہ یہ خبر پاکر جہان آباد چھوڑتا ہوا آیا کہ وہاں کچھ فوج انکی گھات میں بیٹھی ہوئی ہے - انکے کوچ کی راہیں ٹیڑھی اور پیچدار ہوتی تھیں - دیہاتی اپنی بستیوں کو اُن کے شرف قدم سے دور رکھنے کے لئے جھوٹی اور غلط اطلاعیں پہنچا کر انکو سیدھی راہ سے ہٹا دیا کرتے تھے -

صحیح اطلاعات کا تعلق جہاں تک خود میری ذات سے ہے مجھے اُن کے حاصل کرنے میں کبھی کوئی دقت پیش نہیں آئی - اس ضلع سے باغیوں کی کوئی جماعت ایسی نہیں گذری جس کے متعلق مجھے یہ نہ معلوم ہوا کہ انکی تعداد کتنی ہے - ہاتھی اور اونٹ اُن کے ساتھ کتنے ہیں - اور کس راہ سے کوچ کرنا چاہتے ہیں - غدر کی خبر سنتے ہی میں نے ہرکاروں کے دو سلسلہ اس سڑک پر مقرر کر دئے جس سے دشمن اس ضلع میں داخل ہونے والے تھے - یہ سلسلے اس ضلع سے باہر ۲۰-۳۰ میل تک پھیلے ہوئے تھے - ان کے علاوہ ہرکاروں کے کئی سلسلے قرب و جوار کے تھانوں اور اُن مختلف مقامات تک پھیلے ہوئے تھے جدھر میرا خیال تھا کہ باغی رخ کریں گے - داروغوں نے بھی اپنے اپنے تھانوں میں ہرکاروں کا اسی قسم کا سلسلہ قائم کر رکھا تھا - زر کثیر اس میں صرف ہو گیا - کیونکہ میں نے اجرت معقول ادا کی - لیکن نتائج قابل اطمینان نکلے -

کلکتہ اور انگلستان میں ایک خاص طبقہ کے انگریزوں کا یہ دستور ہو گیا ہے کہ سیاب غدر کا تذکرہ کرتے وقت وہ لوگ گورنمنٹ کی بدانتظامی ہمارے ملکی آئین - اور اُن کے طرز نفاذ کی مفروضہ سختی کا بھی ضرور تذکرہ کرتے رہتے ہیں - میں نے اس امر کی تحقیق کرنے میں جانفشانی

اور دہ ریزی سے کام لیا ہے کہ یہ دعویٰ کسی بنیاد پر - کمزور ہی سہی - قائم ہو یا نہیں - میرا تجربہ شاہد ہے کہ یہ دعویٰ سراسر بے بنیاد ہے - اس ضلع میں کبھی کسی باغی سپاہی نے اس قسم کا کوئی عذر اپنی سرکشی کے سلسلہ میں پیش نہیں کیا ہے - کاشتکاروں اور زمینداروں نے سپاہیوں سے بغاوت کرنے کا سبب دریافت کیا اور ان کے جواب مختلف اور اس طرح کے ہوا کرتے تھے کہ "ہمارا مذہب خطرہ میں آگیا ہے" اور "ہمکو توپ سے اڑا دیا جاتا" یا "ہمارے بہت سے ساتھی پھانسی پر لٹکا دیے گئے ہیں اور ہمارا بھی یہی حشر ہونا ہے" یا "ہماری تنخواہیں باقی رہ گئی ہیں" یہ سب یا اسی وضع کے اور جواب ملتے تھے - لیکن اتنی دروغ بافیوں پر بھی باغی سپاہی اتنا احمق نہیں تھا کہ ظاہراً قوانین اور عوام پر تشدد کا بھی عذر پیش کرتا - اگر پیش کرتا تو کاشتکار اپنی ذاتی واقفیت کی بنا پر خود اس کیلئے مجبس پڑتا - جو لوگ گذشتہ سال کے واقعات سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اب ان کے حصہ میں یہ بات رہ گئی ہے کہ عذر کے ایسے اسباب بتلائیں جو رہنمایان غدر کے دماغ میں بھی کبھی نہیں آئے - باغیوں کا اس قسم کی کوئی دلیل پیش نہ کرنا سب سے زبردست ثبوت اس امر کا ہے کہ عوام ہمارے قوانین میں کوئی سختی محسوس نہیں کرتے ہیں - اگر قوم کے قلب عظیم سے جواب کی ذرا بھی امید ہوتی تو ایسی پکار ملک کے سامنے بہترین فریاد کا کام دیتی - اور نانا جیسے انسان اس موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے - لیکن نانا کو معلوم تھا کہ ایسی پکار صرف صدا بصحرا ہو - کوئی گونج پیدا نہیں ہوگی - اس سے ہندو کے کسی جلسۂ عام میں جاہلوں کو ابھارا جا سکتا ہے - لیکن ہندوستان میں والیان ریاست اور کاشتکار کبھی اسپر کان نہیں دھرتے - میری سمجھ میں نہیں آتا کہ باغی سپاہی کو اپنی محرکات اور اپنے دلائل جاننے کا موقعہ کیوں نہیں دیا جاتا - اس نے یہ بانگ دہل ان کا اعلان کیا ہے - اور مختلف طریقوں سے اتنا کافی طور پر اعلان کیا ہے کہ دوڑنے والا بھی اسکو پڑھ سکتا ہے جس وقت اس نے اطاعت کا جوا اتار پھینکا - جیل خانے کے دروازے توڑنے لگا - خزانے لوٹنے لگا - عزت و آبرو مال و دولت پر دست درازی کرنے لگا - اسوقت وہ آسودہ شکم عسکریت کی تمام بدکاریوں کا مظاہرہ کر رہا تھا - اور دکھلا رہا تھا کہ اس کا مدعا غیر مشروط آزادی حاصل کرنا تھا - جس وقت اس نے چانکام میں بغاوت پر کمر باندھی یا پنجاب میں یا اور اپنے قدم یکساں طور پر پوربی کی طرح اٹھائے اسوقت وہ اپنے اس گہرے اور زبردست دیرینہ اور روایاتی جذبہ کی ایک بھیانک دکھلا رہا تھا جسکی چنگاری اب تک اسکے دل کی تہ میں سلگ رہی تھی - اودھ میں اس کی آویزشیں وطن پروری کے ان جذبات کا آئینہ تھیں جن کا اظہار غلط طور پر کرایا جا رہا تھا - افسروں کا خون جس سے اس نے اپنے ہاتھ رنگے تھے وہ خاموشی کے عالم میں طبعی قومی منافرت کی شہادت دے رہا تھا - میں نے خود ایک کمسن لڑکے کو دیکھا ہے کہ آنکھوں میں آنسو اور زبان سے یہ اقرار کہ "مجھے یقین ہو گیا کہ میرا مذہب خطرہ میں پڑ گیا ہے" یہ امر واضح ہے کہ ۱۸۵۷ء کے تاریخی واقعات کس بڑی حد تک مذہبی جنون کے مرہون منت ہیں - لیکن تنظیم کی غیر موجودگی سے اور نیز اس وجہ سے کہ عمل کی راہ میں بر یک وقت قدم نہیں اٹھائے گئے - اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے کہ عام طور پر کوئی مشترک وجہ شکایت کی پیدا نہیں ہوئی تھی -

میں ہوں آپ کا خادم

اے - مونی "

اب گیا تقریباً اسی سال سے سویا ہوا ہے - اور اگر فرقہ وارانہ اور جماعتی تحریکیں اس کے خواب میں گاہے گاہے مخل نہ ہوں تو شاید سمجھا جا سکتا ہے کہ گیا قیامت کی نیند سو گیا ہے - مگر پھر دور دور ہندو ملک میں بعض بعض سیاسی تحریکوں کے ہلکے ہلکے بادل گیا کے افق پر کبھی کبھی منڈلاتے نظر آجاتے ہیں - آئندہ ہندوستان کی قومی تحریکات کون سی کروٹ لیتی ہیں - اور ان کا کون سا اثر گیا پر مترتب ہوتا ہے اس کا فیصلہ ابھی مستقبل کے مورخ کے قلم میں پوشیدہ ہے -

---

(۱) پیشوا باجی راؤ ثانی کے متبنیٰ ڈھونڈھو پنت عرف نانا صاحب غدر کے زمانے کی ایک مشہور ہستی - دسمبر ۱۸۵۷ء میں نیپال میں روپوش ہو گئے - (ایڈیٹر)

صوبہ بہار کا ایک بہادر باغی[1]

از جناب خواجہ عبدالقیوم۔ بی۔ اے۔ آر۔ سی

حکومت اور اُس کے کارپردازوں کے خلاف باغیانہ خیالات کی ترغیب دینا قانونی جرم ہے۔ مگر ایک مستحکم حکومت کے باغی کی بہادری اور شجاعت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان ان بہادر باغیوں سے خالی نہیں۔ انہیں قوم، مذہب، ملک، عمر، کسی کہ تمام پہلوؤں سے کیوں نہ کیا جائے، تاہم انکی ہمت اور خودداری خراجِ تحسین وصول کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ انہیں باغیوں میں سے صوبہ بہار کا ایک بہادر راجپوت بابو کنور سنگھ بھی تھا جس کے نام سے آجکل بہت کم لوگ واقف ہیں مگر جس کی بہادری اس قابل ہے کہ اُسے ایک منٹل ہدایت کے ہندوستان کے نوجوانوں میں ایک نیا جوش اور ایک نیا ولولہ سرایت کیا جاسکے۔

کنور سنگھ ۱۷۸۲ء میں ضلع شاہ آباد میں آرہ کا ایک بوڑھا زمیندار تھا۔ وہ دراصل جگدیش پور کا رہنے والا تھا جو آرہ سے ساٹھ میل مغرب کی طرف واقع ہے۔ جائداد کم ہونے کے باوجود ایک قلعہ اور ایک عالیشان مندر اُس کے قبضہ میں تھا۔ اپنے علاقہ کے اطراف میں اُس کا اثر اس کا اثر اس قدر حاوی تھا کہ اُس کے مقابلہ میں ڈمراؤں کے مہاراجہ کا بھی اتنا جاہ وجلال نہ تھا۔

لڑکپن میں کنور سنگھ کو تعلیم سے بالکل رغبت نہ تھی۔ وہ لکھنے پڑھنے کو حقارت بھری نظروں سے دیکھتا تھا۔ مردانہ کھیل اُسے بہت عزیز تھے، اکثر اوقات وہ رہتاس گڑھ کے جنگلے جنگلوں میں شکار کے لئے نکل جایا کرتا۔ اپنے اطوار اور احساس خودی کے موجب وہ ایک راجپوت تھا۔ خودداری کے جذبہ کی وجہ سے وہ اپنے آغاز شباب کے پہلے ہی بہار کے راجپوتوں کا سرغنہ تسلیم کیا جانے لگا۔ شاہ آباد کے مسلمان اور جنبی زیادہ تعداد اور کثیر دولت کے باوجود اس کے قبضہ میں تھے اسکی عزت اور وقار کا یہ حال تھا کہ جسطرف سے وہ گذرتا عوام بلاتفریق مذہب وملت اسکی تعظیم کیلئے کھڑے ہوجاتے۔ ضلع کے تمام لوگ اسے اپنا خیرخواہ اور نیک حاکم سمجھ کر اسکی عزت کرتے۔ ضلع کے کلکٹر کی نظروں میں اسکی بڑی وقعت تھی ایک دفعہ جیل کے قیدیوں نے مٹی کے برتنوں میں کھانا کھانے سے انکار کردیا۔ کنور سنگھ سے کلکٹر نے مدد مانگی۔ اور جو کام کلکٹر کی دھمکیوں اور اسکی تمام کوششوں سے نہ ہوسکتا تھا وہ کنور سنگھ کے بھیجے ہوئے ایک پیغام سے انجام پاگیا۔

کنور سنگھ کے اخراجات اسکی آمدنی سے ہمیشہ تجاوز کرجاتے اسلئے اسے بہت زیادہ سود پر قرض لینا پڑتا۔ اسطرح وہ بیس لاکھ کا مقروض ہوگیا۔ قرض خواہوں نے اسکے خلاف بیس لاکھ کی ڈگری حاصل کرلی۔ مالگذاری کے محکمہ (BOARD OF REVENUE) نے پہلے تو جائداد کے انتظام کرنے کا اور قرض کو رفتہ رفتہ ادا کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد اس محکمہ نے کسی ذمہ داری کو اپنے سر لینے سے انکار کردیا۔ کنور سنگھ کی تمام جائداد اب نیلام پر چڑھنے والی تھی۔ اس تباہی کے زمانہ میں اسکے بیٹے کی وفات اور اس کے پوتے کے پاگل ہوجانے کی خبر نے اسے اور زیادہ پریشان کردیا۔ اسکی ناامیدی دن بدن زیادہ ہوتی گئی ساں مصائب وآلام نے اسے کچھ روز کیلئے نیم پاگل سا بنادیا۔ کنور سنگھ ابھی ان دنیاوی مشکلات میں گھرا ہوا تھا کہ پٹنہ کے کمشنر نے ایک ڈپٹی کلکٹر کو اسکے پاس بھیجا کہ وہ دوستی کے طبس میں اسکے گرفتار کرے۔ یہ اسکے جذبۂ خودداری کیلئے ایک زبردست ٹھیس تھی اور وہ اس توہین کو برداشت نہ کرسکا۔

یہ واقعات ۱۸۵۷ء کے ہیں۔ اس وقت کنور سنگھ کی عمر ۸۰ برس کی تھی۔ اتنی عمر ہونے کے باوجود وہ ایک مضبوط اور توانا پست قامت آدمی تھا۔ بہادری اور شجاعت اسکے چہرہ سے جھلکتی ہوئی نظر آتی تھی۔ عالم پیری میں بھی جوانی کی جو شیلی آنکھوں میں کسی قسم کی پژمردگی نہ آئی تھی۔ اسکی بڑی بڑی آنکھوں میں سے شباب کا جوش وخروش ابھی تک ٹپکا پڑتا تھا۔ اسکی گھنی داڑھی نے اسکے چہرہ کو اور زیادہ مدبر اور مرعوب کن بنادیا تھا۔ اسکے بازوؤں کی طاقت دیکھنے ہی سے ظاہر ہوجاتی تھی۔ اسکا لباس چست اور سادہ تھا۔ پنڈلیوں تک

[1] یہ مضمون ڈاکٹر الیشوری پرشاد کے ایک مضمون کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ جو گذشتہ ماہ دسمبر میں انگریزی زبان میں شائع ہوا تھا

مرچ اسکی آنکھوں اور چہرہ سے حکمرانی ٹپکتی تھی۔

کنور سنگھ کے دو مصاحب رندان سنگھ اور ہرکشن سنگھ انگریزوں کے سخت مخالف تھے اور وہ ہر وقت انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے کے متلاشی رہتے مگر کنور سنگھ کے بھائی دیال سنگھ اور امر سنگھ اپنی دور بینی کی وجہ سے ہمیشہ نرمی اور ضبط کی تلقین کرتے تھے کیونکہ انہیں اس بات کا کافی احساس تھا کہ چھوٹے پیمانہ پر بغاوت کرنے کا نتیجہ اپنے آپ کو برباد کر دینے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ اسی زمانہ میں کنور سنگھ کو اطلاع ملی کہ پٹنہ سے مسٹر ٹیلر اسے گرفتار کرنے کیلئے آرہا ہے۔ یہ وہی زمانہ تھا جس وقت غدر ..... شروع ہوتے والا تھا۔ ہندوستان کے تمام حصوں سے تشویس کن خبریں آرہی تھیں۔ کنور سنگھ کے سامنے دو راستے تھے اسے کسی ایک کو اختیار کرنا ضروری تھا چونکہ انگریز اسے پہلے ہی باغی قرار دے چکے تھے۔ اور اس کی گرفتاری کا سامان بھی کیا جا رہا تھا اسلئے اس نے کھلی بغاوت کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس نے ہرکشن سنگھ کو دانا پور کی فوجوں میں ایک باغیانہ لہر پیدا کرنے کیلئے روانہ کیا۔ اسے اپنے مقصد میں کافی کامیابی نصیب ہوئی۔ اور وہ آرہ کی حفاظت کیلئے بہت سے سپاہیوں کو اپنے ہمراہ لیتا آیا۔

۱۸۵۷ء میں غدر کے شروع ہونے کے وقت آرہ میں تقریباً پچاس سپاہی اور انگریز شہریں موجود تھے۔ ایک سول انجینر نے جسے فوجی فن کا کچھ علم حاصل تھا سامان رسد اور کچھ اسلحے جمع کر لئے۔ اور ریت کے بھرے ہوئے بوروں کو چھت پر رکھ کر سب کو اس قلعہ میں بند کر دیا کنور سنگھ باغیوں کا سرغنہ تھا۔ وہ رات کو اس قلعہ پر حملہ آور ہوا۔ اور اس نے قلعہ کے مکینوں کو دھواں سے دم گھٹ کر مارنے کیلئے چاروں طرف آگ لگانے کا حکم دے دیا۔ انگریزی فوج نے بوئیل (BOYLE) اور آئر (EYRE) کے زیر تحت جگدیش پور میں کنور سنگھ کے قلعہ پر حملہ کر دیا۔ بوڑھا راجپوت پہلے ہی سے ان تمام حملوں کیلئے تیار بیٹھا تھا اور اس نے ہر قسم کے جنگجو جوان اپنی حمایت کیلئے جمع کر لئے تھے۔ بیبیگنج (Baligangj) کے قریب کنور سنگھ کی فوج اور آئر کی فوج میں تصادم ہوا۔ مگر ایک گھنٹہ کی مسلسل لڑائی کے بعد باغی فوج کو مجبوراً بھاگنا پڑا۔ اور انگریزی فوج نے شہر میں داخل ہو کر انتقامی جذبہ کے ماتحت۔ شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

کنور سنگھ نے شہسرام میں فوجوں کو جمع کرنا اور اپنی تنظیم کرنا شروع کر دیا اور پھر فوج کو ساتھ لیکر اعظم گڑھ پر حملہ کر بیٹھا۔ اعظم گڑھ کے نزدیک اس نے دو لڑائیاں لڑیں جن میں اس نے انگریزی فوج کو جو ملین (Millman) کے ماتحت تھی شکست فاش دی۔ کپتان ڈگلس ان کی مدد کو پہنچ گیا اور گنگا کے کنارے سکندر پور میں پھر کنور سنگھ کی انگریزی فوج کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی۔ کنور سنگھ کو شکست کھا کر ہٹنا پڑا۔ اس نے دریائے گنگا کو پار کرنا چاہا۔ مگر انگریزوں نے تاکشتیاں غرق کر دی تھیں۔ آخر کار دیہاتیوں نے جن کے دل میں کنور سنگھ کی بہت وقعت تھی کشتیاں بہم پہنچائیں اور اسطرح کنور سنگھ کامیابی کے ساتھ بچ گیا۔

بھاگتے وقت کنور سنگھ ایک ہاتھی پر سوار تھا۔ اسکا مصاحب رندان سنگھ بھی اس کے ہمراہ تھا اور وہ چترشاہی کو پکڑے ہوئے تھا اس سے ایک فاش غلطی سرزد ہو گئی اس موقعہ پر اس نے چھتر کو کنور سنگھ کے سر پر بلند کر رکھا۔ کنور سنگھ اسطرح پہچان لیا گیا اور انگریزی فوج نے باغیوں کے سرغنہ کی طرف گولیوں کی بارش شروع کر دی۔ ہاتھی کا ہودہ سواروں کے ساتھ نیچے گرا دیا گیا۔ رندان سنگھ وہیں مر گیا۔ کنور سنگھ کے بازو پر گولی لگی اور وہ بیہوش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد جب اسے کچھ ہوش آیا اور اس نے اپنے بازو کو زخمی پایا تو اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ اسکا زخمی بازو اسکی تلوار سے کاٹ کر گنگا میں پھینک دیا جائے۔ چنانچہ طوعاً و کرہاً اسکے حکم کی تعمیل کی گئی اور اسے جگدیش پور پہنچا دیا گیا۔ ایک بازو کھونے کے باوجود بھی شکست خوردہ کنور سنگھ نے ہمت نہ ہاری اور ڈگلس کی بڑھتی ہوئی فوج کا ایک سخت مقابلہ کرنے کیلئے فوج منظم کرنے لگا۔ لیکن وہ زخموں سے جانبر نہ ہو سکا اور اسے جلد ہی اس دنیا سے گذر جانا پڑا۔

ایک معمولی زمیندار ہو کر کنور سنگھ اپنی طاقت اور خودداری کے زیر اثر ایک باغی فوج کا منتظم بن بیٹھا۔ انگریزوں کے خلاف لڑنے میں اس نے ایک زبردست شجاعت کا ثبوت دیا۔ اسکی فطرت میں باغیانہ جذبہ موجود نہ تھا مگر خارجی معاملات نے اسے باغی بننے پر مجبور کیا پہلے تو وہ انگریزوں کا نیز خواہ تھا اور انگریزوں کی طرفداری کرنا دھرم خیال کرتا تھا۔ مگر پٹنہ کے کمشنر مسٹر ٹیلر کی پالیسی نے اسے باغی بننے پر مجبور کیا۔ وہ انگریزوں کا مقابلہ نہ کر سکا کیونکہ ان کی فوج اسکی فوج سے بہت زیادہ تھی۔ اور وہ فوجی فن سے کہیں زیادہ واقف تھے اسکی جگہ اگر نپولین بھی ہوتا تو اسے بھی انگریزوں کے سامنے اپنا سر نیچا کرنا پڑتا تاہم اسکے بہادرانہ کام ہندوستان کے لوگوں سے تعریف تحسین و صول کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ صوبہ بہار کو اس بات کا فخر ہونا چاہیے کہ اس زبردست فوجی انسان نے اسی کی سرزمین پر شہرہ آفاق حاصل کی اور اسی کی زمین پر پروان چڑھا۔

منظومات:-

ترانۂ اردو

زبانِ خلق پر ہے نعرۂ مستانۂ اردو

از فخرِ بہار یادگارِ داغ تاجدارِ سخن حضرت مبارک عظیم آبادی

ہمیں افسوس ہے کہ منظوم کلام کی ترتیب میں اپنے دامن کی تنگی کے باعث کتابت کے بعد ردوبدل کی ضرورت ہوئی۔ بعض شعرائے کرام کے کلام سے ہم ناظرین کو لطف اندوز ہونے کا موقع نہ دے سکے۔ اور بعض کی نظم اور غزل میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے پر مجبور رہے۔ لہٰذا شعرائے کرام سے ہم بصدق دل معذرت خواہ ہیں۔ والعذر عند کرام الناس مقبول ان شاء اللہ باقی ماندہ پرکیف کلام جون اور جولائی کی اشاعتوں میں نظر سے گذریں گے۔

سید حسن امام حسن وارثی۔ رکن ادارۂ شعبۂ منظومات رسالہ ندیم

کہاں سے ہے کہاں تک دور میں پیمانۂ اردو
جسے دیکھو وہ ہے سرمست کشِ میخانۂ اردو

کم و بیش اس کی جولاں گاہ ہے ہر قطعۂ ارضی
کہ دنیا کا کوئی گوشہ نہیں بیگانۂ اردو

یہ وہ مقبول ہے مقبولیت کا جس کے سر سہرا
جگہ ہر دل میں ہے ہر دل ہے خلوت خانۂ اردو

مسلمانوں کو زمزم ہندوؤں کے حق میں گنگا جل
بٹی ہے اس طرح سب میں مئے خمخانۂ اردو

یہی تو وہ زباں ہے شمعِ محفل جسے کہئے
جدھر دیکھا اُدھر پایا گیا پروانۂ اردو

یہ وہ لیلیٰ ہے مجنوں جس کا ہے ہر نطقِ انسانی
یہ وہ پیاری زباں ہے ہر زباں دیوانۂ اردو

زبانیں سکے قبضے میں جہاں بان زباں ہے یہ
سلامت یا الٰہی دولتِ شاہانۂ اردو

زبانوں میں اسی کو کجکلاہی زیب دیتی ہے
زمانہ ہے قتیلِ غمزۂ ترکانۂ اردو

یہ وہ رنگین بیاں ہے کہتی ہیں رنگینیاں اس کی
کہ رنگینی سے رنگا رنگ ہے افسانۂ اردو

فقط اک ہند کیا سارا جہاں ہے کلمہ گو اس کا
پرستش گاہِ عالم بن گیا بت خانۂ اردو

مبارک اک ہمیں کیا نعرہ زن اس بزم میں نکلے
زبانِ خلق پر ہے نعرۂ مستانۂ اردو

قلعۂ رہتاس

از بلبل بہار حضرت سریر کابری مینائی گیاوی

آہ اے رہتاس اگلی عظمتوں کی یادگار
اے نشان بے نشاں اے عبرت آبادِ بہار
فخر آثار قدیمہ ہیں ترے نقش و نگار
قابل نظارہ ہے تیری خزاں دیدہ بہار
ذرہ ذرہ کہہ رہا ہے آج تیری خاک کا
تو نمونہ ہے جفائے گردش افلاک کا

تجھکو دیکھا ہی کروں ہر دم اسی قابل ہے تو
کتنے شاہانِ سلف کی آرزوے دل ہے تو
نقشۂ بربادی ہنگامۂ محفل ہے تو مُر
کاروانِ رفتہ کی اجڑی ہوئی منزل ہے تو
دہر میں تو انقلاب دہر کا آئینہ ہے
تیری تاریخ کہن اک دفتر پارینہ ہے

کوہ کی چوٹی پہ تیری راجدھانی الاماں
آسماں پر اک زمیں ہے یا زمیں پر آسماں
وہم کو بھی ہو نہیں سکتا رسائی کا گماں
پاؤں تیرے چھو سکا کب سون کا سیل رواں
مٹتے مٹتے بھی رہا ست جگ سے لیکر آج تک
کون جانے تو نے دیکھے کتنے منظر آج تک

تو نے دیکھی راجگان ہند کی سرکار بھی
قشقۂ صندل جبیں پر دوش پر زنار بھی
میہماں تیرے رہے اسلام کے جرار بھی
تجھ میں چمکی شیر شاہی عدل کی تلوار بھی
تو ہمیشہ اک انوکھی شان دکھلاتا رہا
پرچم اقبال اکبر تجھ پہ لہراتا رہا

تو وہی ہے آج لیکن وہ تری شوکت کہاں
کر دیا ہے تجھ کو ویرانی نے اک عبرت ستاں
اور اگر یوں ہی رہا دست جفائے آسماں
مٹ کے رہ جائیگا اک دن تیری ہستی کا نشاں
ہر نفس دیتا ہے دنیا کو پیام انقلاب
ہر گھڑی پیش نظر ہے صبح و شام انقلاب

حقیقتِ اُسکی

از حضرت جمیل مظہری ایم اے

یہ نظم عقیدہ جبر و قدر میں مشہور جرمن فلسفی شوپنہار کے مشہور عام نظریہ کے جواب میں لکھی گئی۔ (ندیم)

دل کی آنکھوں میں اترتی نہیں صورت اُسکی
گم ہوئی اس کے کرشموں میں حقیقت اُسکی

بے پناہوں کے لئے چاہئے تخئیل پناہ
وہ نہ ہو بھی تو مسلّم ہے ضرورت اسکی

وہ جو سجدوں کا ہی طالب تو تعجب کیوں ہے؟
اپنی فطرت سے سمجھ لیجئے فطرت اُسکی

یہ مسلّم کہ خودی کا ہے نتیجہ تخلیق
مگر اے دوست ذرا دیکھ تو رحمت اُسکی

دل یہ "تحریکِ محبت" ہے غزلخواں اُسکا
گل بہ عنوانِ تبسم ہیں حکایت اُسکی

جب ہے افعال و نتائج کا تعلق ظاہر
تو مسلّم نہ ہو کس طرح عدالت اُسکی

روح گھبراتی ہے تخئیل رہائی سے کیوں
گر یہ "قیدِ قفسِ جسم" ہے لعنت اُسکی

ہوا ثابت کہ نہ ہونے سے ہے ہونا بہتر
ہو گئے ہم تو یہ ہونا بھی ہے رحمت اُسکی

یہ جو بازارِ تمدّن میں ہے ہنگامۂ حشر
تیری آزادی ہے ملزم نہ کہ قدرت اُسکی

مصلحت تھی کہ رہیں تیرے ارادے آزاد
مصلحت تھی کہ نہ دے دخل مشیّت اُسکی

مصلحت یہ کہ بنے ہستیٔ آزاد ایسی
کہ جسے دیکھ کے آسودہ ہو حکمت اُسکی

یہ مصائب کا ہجوم اور یہ حوادث کا نزول
غور کیجئے تو نظر آئے گی حکمت اُسکی

ہمیں کرتا ہے وہ مجبور کہ مختار رہوں میں
زحمتیں کھینچتی رہتی ہے مشیت اُسکی

چاہتا ہے کہ بتدریج یہ انسانِ ضعیف
ہو خدا یعنی مکمل ہو یہ صنعت اُسکی

سلطان المجاہدین سید شاہ سبحان احمد سہسرامی

از ناخدائے سخن تاج الشعراء فصیح العصر حضرت نوح ناروی

ہمارے صوبہ کے بلند ہمت نوجوان جناب سید شاہ سبحان احمد صاحب شہسرامی حج و زیارت کے پیادہ سفر پر جس طور سے روانہ ہوئے ہیں وہ اخبار میں مفصل و مشروح پڑھ چکے ہیں۔ صوبہ بہار کے مشہور اخبار نویس جناب سید سلطان احمد (ایڈیٹر اتحاد پٹنہ) کے ہمراہ ۲۰ دسمبر ۱۹۳۹ء کو شہسرام سے یکہ و تنہا عازم سفر ہوئے اور الرشید ام پور رکھا کہ ہر پانچ قدم پر دو رکعت نفل ادا کرتے جائیں گے۔ ذہبی محبت سے اس اقدام پر کس نوعیت سے نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں۔ پروفیسر سید احمد (آباد یونیورسٹی) نے ایک مضمون میں اس سفر کی دینی و ملی اہمیت دکھانی چاہی ہے۔ اب اہل نظر جانیں کہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہوئے یا ناکام۔ بہرحال یہ تو ہے کہ اس نوجوان پیادہ پا مسافر کے جوش ایمانی کو عمومی حیثیت سے سراہے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ ان دنوں وہ لاہور کے مضافات میں ہیں۔ دعا ہے کہ بخیر و خوبی اپنی منزل مقصود تک پہنچیں۔ موصوف جہاں جہاں سے گذرے شائقین راہ کی اسلامی آبادیوں نے انکے غیر مقدم کیلئے دیدہ و دل فرش راہ کیا۔ ملک کے ممتاز شعراء نے انکی شان میں نظمیں کہیں۔ حضرت نوح ناروی نے موصوف پر اپنی ایک نئی نظم ارسال فرمائی ہے جو درج ذیل ہے۔ ندیم

اے یہ رب دیکھے کے مشتاق آگاہ
ہر پانچ قدم پر یہ نوافل سر راہ
مدح سفر پاک میں سبحان احمد
اللہ بھی کہتا ہے کہ سبحان اللہ

دیگر

شیدائے محمد محو احمد سبحان اللہ سبحان اللہ
سبحان احمد سبحان احمد سبحان اللہ سبحان اللہ

ہر پانچ قدم پہ رستے میں دو رکعت نفلوں کا پڑھنا
تسلیم و رضا کی ہو گئی حد سبحان اللہ سبحان اللہ

اول تو مدینے کا عالم پھر پاک مزار شاہ امم
نادر حالی عمدہ گنبد سبحان اللہ سبحان اللہ

کیا لطف حضوری رہتا ہے دن رات وہاں پہ رہتے ہیں
پہنچیں نہ جہاں ادراک فرد سبحان اللہ سبحان اللہ

دنیا سے نہیں مٹنے والا اس حسن مسافت کا چرچا
از روز ازل تا روز ابد سبحان اللہ سبحان اللہ

ہر وقت مصلے پر سجدہ ہر آن بھروسہ مولا پر!
یہ ہے تکیہ یہ ہے مسند سبحان اللہ سبحان اللہ

محبوب جہاں مرغوب جہاں مقصود جہاں مقبول جہاں
اعظم اکرم امجد ارشد سبحان اللہ سبحان اللہ

لوگوں نے دعائیں لیتے ہیں لوگوں کو دعائیں دیتے ہیں
یہ راہ خدا میں داد و ستد سبحان اللہ سبحان اللہ

آندھی آئے پانی برسے منزل کی طرف بڑھتے جانا
یہ سرگرمی یہ شد و مد سبحان اللہ سبحان اللہ

ٹھوکر سے کبھی مل جائیگی شربت میں کبھی ہو جائے گی
روضے کی زیارت حج کی سند سبحان اللہ سبحان اللہ

دم بھر میں یہاں دم بھر میں وہاں دن رات سفر پر جوش سفر
برکات افضل سرور اسعد سبحان اللہ سبحان اللہ

مقصود وہی مطلوب وہی ظاہر بھی وہی باطن بھی وہی
دل میں ہے احد لب پر صمد سبحان اللہ سبحان اللہ

احساس خدا پیارہ نہ گیا ایثار شاری ذوق کامل میں
مستغنی فکر نیک و بد سبحان اللہ سبحان اللہ

رحمت نے ادھر جھک کر دیکھا کیا ملکوں سے ملکے جھاڑ دی
جس سمت ہوئی آمد آمد سبحان اللہ سبحان اللہ

قسمت کی رسائی دل کی دعا سید کی لگن کوشش کی تڑپ
حضرت کی کشش قدرت کی مدد سبحان اللہ سبحان اللہ

گیا نوح کہے کیا نوح لکھے طوفان حزن کب تک اٹھے
اوصاف و فضائل ہیں بے حد سبحان اللہ سبحان اللہ

میری شاعری اور سامعین

از حضرت رضی عظیم آبادی

سننے والے شعر کے میرے جو کراہتے ہیں آہ
چوٹ سی اک دل پہ لگتی ہے نکل آتی ہے آہ

"واہ وا" کرا اٹھتے ہیں سن کے میرے اشعار جو
وہ کچل دیتے ہیں میری شاعری کی روح کو

شعر میں پڑھتا نہیں ہوں "واہ وا ہی" کے لئے
یہ تو اک توہین ہے قومی سپاہی کیلئے

شاعری کرتا ہوں کہ گراؤں انسانوں کے خوں
پیشہ ور شاعر نہیں ہوں میں کہ داد شعر لوں

سن کے یہ اشعار جن کے خون کرماتے نہیں
اف! وہ میری شاعری کو ہی سمجھ پاتے نہیں

جو کہ آتے ہیں میرے اشعار سننے کے لئے
واہ کرنے کے لئے اور سر کو دھننے کے لئے

خیر سے کہلاتے ہیں جو کہ پڑھے لکھے جواں
نوکری کے واسطے کرتے ہیں جو یاس امتحاں

اسکدر جن کا غلامانہ ہے تعلیمی نصاب
بے خبر سے ہیں کہ آزادی نے کیا کیا انقلاب

پست ہیں جن کے خیالات اور نظریں جنکی تنگ
جن کے دل کے گوشوں میں باقی نہیں کوئی امنگ

بوڑھی ہے جنکی جوانی زرد رو جن کا شباب
دوپہر کو جن کا پیلا پڑ چکا ہے آفتاب

جن کے جذبوں کو غلامی نے کچل کر رکھ دیا
پتلیوں میں کھلتی کلیوں کو مسل کر رکھ دیا

خون کے بدلے ہے پانی جن کی نسوں میں رواں
شرم آتی ہے مجھے تو جن کو کہتے نوجواں

جو کہ ہیں "دروبک" بزدل ہے جنکی قسمت بے خبر
ہے جھکا جن کے سبب دنیا میں ہندوستان کا سر

جن کے آگے جنگ آزادی کی قیمت کچھ نہیں
سامنے جن کے امارت اور غربت کچھ نہیں

چاہتا ہوں نظم کے شعلوں میں انکو ڈالنا
شعر کی گرمی میں پگھلا کر سپاہی ڈھالنا

وہ سپاہی جن کے سینے میں ہو دل بازو میں دم
دشمنِ حق پر ہو جنکے لہراتا بغاوت کا علم

وہ سپاہی کھیل سمجھیں جو مصائب جھیلنا
جو کہ آگ اور خون سے ہنس ہنس کے جانیں کھیلنا

وہ سپاہی دھمکیوں جو توپ کی کڑیاں توڑ کر
جو کہ دیو مرگ کا بھی رکھ دیں پنجہ موڑ کر

وہ سپاہی جنگ آزادی میں جو کر چل پڑیں
جو غریبی کے لئے سرمایہ داری سے لڑیں

وہ سپاہی لوٹ لیں جو فرقہ واری کی دکاں
جن کا نصب العین ہو آزادی ہندوستاں

وہ سپاہی دھجیاں جن کے نعروں سے ظالم کانپ اٹھے یہ خونی سامراج
جن کے للکاروں سے کانپ اٹھے

وہ سپاہی جو بدل دیں موت کا اندھا نظام
جس میں سرمایہ ہو حاکم اور محنت ہے غلام

وہ سپاہی جو کہ جنگی دیوتاؤں سے لڑیں
امن دائم کے زمانے میں جو پیغمبر بنیں!

سننے والوں کی رگوں میں گرم خوں دوڑے گا جب
شاعری سمجھی گئی ہے میری، میں سمجھوں گا تب

نغمۂ بہار

از جناب صبا رشیدی ام۔اے بی۔ال سابق اڈیٹر فطرت

جب سارے جگت کے والی نے
گلزارِ عدم کے مالی نے
اک باغ لگایا ہستی کا
ہاں! حسن کے نوریں مندر میں
جب پہلے پریم پجاری نے
اک راگ الاپا ہستی کا
جب مست بنانے والے نے
جب سندر موہن ساقی نے
میخانہ بسایا ہستی کا
میثاق کے رنگیں رندوں کو
جب صدر بزمِ جمالی نے
اک جام پلایا ہستی کا
فطرت نے خمارِ رنگیں میں
اک مستی کی انگڑائی لی
اور ساری فضائیں جاگ اٹھیں
اور حسن کی دیوی کے لب پر
اک ہلکی ہنسی سی لہرائی
اور عشق کا دیوتا چونک پڑا

اک بار فضا میں پھوٹ پڑیں
تروک کی رنگیں محفل پر
تروک کے بانی اترائے
کچھ نور کی پریاں اٹھلا کر
آکاش کی اونچی منزل پر
کچھ اپنی زلفیں بکھرائے
تھرائیں فضائے شبگوں میں
اور سازِ شوق کا بل پر
کچھ گیت انھوں نے دہرائے
بھارت کے بہاریں ریت پر
گنگا کے طلسمی ساحل پر
بس نوریں نغمے لہرائے
اک بار مگدھ کے ذروں سے
زردوسی نغمے پھوٹ پڑے
اور ڈالی ڈالی جھوم گئی
کچھ کونپل پھوٹی شاخوں میں
پھر غنچے غنچے بھائے
اور رنگ بزم کے پھول کھلے

کچھ کلیاں جنک کے باغوں میں
چن چن کے کبھی لائی تھی سیا
اور سارا دیس مہک اٹھا
فردوس شمائم کلیوں سے
اک سورج جوت کا پھول بنا
اور سیتا اس کا نام پڑا
اس حسن کی دیوی سیتا نے
بھارت میں پرچم لہرایا
اک سیتا رام کا شور ہوا
ہر ریت کے جمال کا فرمیں
حسن اس کا پھوٹا اور نکھرا
"رومان محبت" تازہ ہوا
بھارت کے جبین تاباں پر
گنگا کے روئے رخشاں پر

مشرق کی فضائے خنداں پر خورشید جہاں آرائے سحر
چمکا تھا تمہارا ماضی کا
شہرہ تھا تمہارا ماضی کا

گونجی تھی مگدھ کے کاشانوں میں کرشن کنہیا کی مرلی
فردوس محبت گونج اٹھا
گوتم کو اسی کے ذروں نے روحانی بات بتائی تھی
کچھ دھیان ہوا کچھ گیان ملا
اور جین دھرم کے بانی نے بھی پائی یہیں اک دن مکتی
اور ہستی کا کچھ بھید کھلا
سلطان ہمایوں شرف الدین مخدوم تمہاری فردوسی
خورشید ولایت ضو بخشے
اسلام کے سچے خادم نے اللہ کے سچے شیدا نے
نغمات حقیقت چھیڑ دیے
ناقوس کے شور و بہر میں اللہ کا نغمہ گونج اٹھا
ہندو و مسلماں ایک ہوئے

اک ذرا سی کے ذروں سے پھوٹی تھی ضیائے مہر مبیں
تھا اوج پہ ماہ علم و ہنر
اک ذرا سی کے ٹیلوں پر نالندہ کا تھا اک حصن حصین
ہر ذرہ یہاں تھا رشک گہر
اک ذرا سی کی وادی میں چلتی تھی نسیم شعر آگیں
ہر سبزہ تھا راز مہر گہر
ہیں بیدل و داغ جو شش کے نغمات میں خوابیدہ ہیں
استاد جہاں تھے شاد و اثر
فریاد و صفیر و راز اختر اک ایک نے کی نغمہ سرائی
گلزار سخن کے پھولوں کی
اور شوق و خیال سحر بیاں کس کس کا سناؤں قصہ یہاں
اے آہ اب اتنی تاب کہاں
گل پھول بہت سے اب بھی ہیں اس اجڑے ہوئے گلشن میں صبا
اللہ کرے پروان چڑھیں
آزاد و تمنا ماہر فن علامہ عظیم بے ہمتا
گلزار سخن میں پھیلیں پھولیں

ہیں شمس و مبارک بدل بھی گلزار سخن میں نو اپیرا
دنیائے سخن آباد کریں
اک سوز مجسم ہیں بیتاب اک شاعر فطرت ہیں بینا
شہباز تخیل شاد رہیں

علامہ سلیماں فخر زماں مولانا مناظر گیلانی
ہیں علم و ادب کے مہر و قمر
مولانا نجیب و ریاست بھی ادرقاضی و دود و طاہر بھی
ہیں باغ ادب کے چیدہ ثمر

پروین و جمیل و شرر اعماں اور نجم ندی گیلانی بھی
ہیں چرخ سخن کے جس تاباں
اور شرف جلیلی نسیم اختر محفوظ و شفق نجم ندوی
قدرت کے ہیں رنگیں شہپارے
وہ یاس و شفیع زمزمہ خواں وہ حشر و جگر کا شور فغاں
اک ایک ہیں ان میں نغمہ سحر
رنجور و حمید و وجد ہیں باطن ابھی یہیں کے گل ترہیں
ہیں پھول کوئی اور کوئی ثمر
سرمایہ شعر و جان سخن وہ پیکر عفت نخر زمن
وجدان تخیل کا تارا
وہ رشک ملک بلقیس جہاں یعنی وہ مجاب سحر بیاں
قدرت کا وہ قدسی شہپارا
فخر خواتین فخیر جہاں وہ شعر و ادب کی روح رواں
مخفی و سکینہ راز و وفا
سب اپنے وطن کی کلیاں ہیں عصمت کی بہار خنداں ہیں
اس دیس میں کیا کیا پھول کھلا
ہیں اور بہت سے لالہ و گل نشاد و ضمنو برادر سنبل
کس کس کی کہانی سنئے گا
رات آئی فضا تاریک ہوئی ہر سمت سے چھائی خاموشی
اب نغمہ شاعر ختم ہوا

ف مرزا عبدالقادر بیدل ف شیخ غلام علی و شیخ محمد پروفیسر حافظ محمد لدین ف پروفیسر عبدالسلام
ج مظہر حسین ف بنیاد حسین ف ضیاء الدین شرر سہسرامی ف اختر سہسرامی ف ام اے ف محترمہ فخری علیگ آبادی
ف محترمہ سکینہ بیگ ف محترمہ رضا علیگ آبادی ف محترمہ عائشہ سہسرامی وفا

یہ دنیا!

از جناب اختر قادری بلیاروی ایم۔اے

یہ دنیا! کشمکش کی جور کی پیکار کی دنیا
یہ دنیا! کلفتوں کی رنج کی آزار کی دنیا
یہ دنیا! جس میں ہر سو ظلم کی ہے گرم بازاری
یہ دنیا! جس میں ہر گوشے میں پلتی ہے سیہ کاری
یہ دنیا! جس میں لفظ رحم کہتے سے ہے بیگانہ
یہ دنیا! جس میں ہمدردی ہے خود غرضی کا بہانہ
یہ دنیا! جس میں ہے فقدان الفت کا مروت کا
یہ دنیا! جس میں ہے طوفان نفرت کا عداوت کا
یہ دنیا! جس میں سطلے مورد الطاف و عزت ہیں
یہ دنیا! جس میں اہل علم و عرفاں غرق ذلت ہیں
یہ دنیا! جس میں استبدادیت لیتی ہے انگڑائی
یہ دنیا! جس میں حریت ہے مجبور جبیں سائی
یہ دنیا! جس میں خوں مزدور کا پانی سے ارزاں ہے
یہ دنیا! جس میں جور زر دار و فرعون ساماں ہے
یہ دنیا! جس میں نیکوں کو نہیں جا اماں کوئی
یہ دنیا! جس میں بیکس کی نہیں سنتا فغاں کوئی
یہ دنیا! جس میں کم نظروں کو حاصل جاہ و سطوت ہے
یہ دنیا! جس میں نخوت ہے فساوت ہے شقاوت ہے

الٰہی! ایں جہاں با فطرت ما در نمی سازد
جہانِ تازہ فرما کہ طرح دیگر انداز د

خیالات کی رو میں

از مولوی سید ناظر امام صاحب بیخود ندوی

اے زینت و زیبائی اے خوبی و رعنائی
اے مخمور و آرائی اے جان تمنائی
محروم جواب اپنے مکتوب نیاز آگیں
شاخیں ہے ارماں کی پھل پھول کہاں لائیں
میں پیکر حیرانی۔ تصویر پریشانی
سکھیوں کی نہیں صحبت عشرت کی فراوانی
تفریح و تفرج ہے قصہ ہی کہانی ہے
گویا کہ نہ لکھنے کی آپ نے ٹھانی ہے
فرمائیے تو صاحب۔ رنجش کا سبب کیا ہے
یہ طور ستم کے کیوں۔ یہ ظلم کا ڈھب کیا ہے
کب میری وفاؤں کے انداز میں فرق آیا
کیا میں نے نہ دے ڈالا دل کا تجھے سرمایا
ابنائے زمانہ میں سرشار مے فرحت
امواج مسرت میں ڈوبی ہوئی ہے خلقت
دن آج ہے ہولی کا پچکاریاں چلتی ہیں
بے تاب تمنائیں سینوں میں مچلتی ہیں
افسوس! یہ ساماں ہوں اور آپ نہیں آتیں
کیا ایسی بہاریں بھی بے لطف گذر جاتیں
آباد ہے جو گھر ہے برباد فقط ہم ہیں!
دل شاد ہے اک دنیا۔ ناشاد فقط ہم ہیں

اس حال میں اے بیخود اک دست نے فرمایا
پائل کی ہیں جھنکاریں دیکھو بھی تو کون آیا!

منگل تالاب کی ایک رات

از جناب جوہر زیادی

آہ وہ تالاب ہاں جس کے کناروں پر کبھی
چاندنی راتوں میں یا نما تو نے عہد دوستی

آہ وہ تالاب کی پھر سبز سبز آغوش میں
بیٹھ کر وہ تیری باتیں وادیٔ خاموش میں

مضطرب کرتی ہیں روحانی ملاقاتیں تجھے
خون رُلواتی ہیں اب وہ چاندنی راتیں تجھے

ثبت صحن باغ میں جو ہیں محبت کے نشاں
کہہ رہی ہیں عشق کی گذری ہوئی وہ داستاں

یاد ہے وہ تیرا گانا ہاں درختوں کے تلے
وہ شرابی مسکراہٹ وہ محبت کے مزے

ہاں گھنی شاخوں پہ اکثر سبز ٹھنڈی چھاؤں میں
میں نے پہنائے ہیں موزے تیرے نازک پاؤں میں

ہاں لب تالاب کی تیزوں پہ اکثر بیٹھ کر
گفتگو کرتے تھے باہم عشق کے عنواں پر

حسن کی مے پی کے ہر شے مست تھی مخمور تھی
عشق کے نغمات سے ساری فضا معمور تھی

اے مرے محبوب سچ کہنا تجھے بھی یاد ہے
آہ وہ تالاب برسوں سے جو غیر آباد ہے

چمن اُردو

از جناب سید بدرالدین احمد صبیر رضوی سریری مخدوم آبادی - گیادی

اللہ رے بہار گلستان معانی!!
ہر پھول کی خوشبو ہے جدا رنگ جدا ہے

اردو کا چمن جس نے کیا ہے تر و تازہ
اے خاک دکن وہ ترے کوچے کی ہوا ہے

اے خاک اودھ تو بھی ہے صد رشک گلستاں
جو پھول ترے باغ میں ہے روح فزا ہے

اے سارا زمانہ تری خوشبو سے معطر
اے دہلی مرحوم تری بات ہی کیا ہے

اے خاک بھارا اپنی لطافت کی بدولت
جو نخل ہے تجھ میں ترو تازہ ہے ہرا ہے

زندہ ہے جہاں میں سخن راسخ و بیدل
ہر مصرعۂ تر میں اثر آب بقا ہے

سونی ہے بڑی انجمن عشرت و شاد آج
محفل سے ابھی شوق سخن سنج اٹھا ہے

آزاد و شہیر و شفق و یاس و مبارک
ان سب پہ اگر ناز ترا ہے تو بجا ہے

رنگینیٔ فکر سخن تازہ سے جنکی ہو
دامن ترا ہر رنگ کے پھولوں سے بھرا ہے

ہر گل کو ہے لیکن خلش خار کا شکوہ
بدلی ہوئی کیا صاحب زمانے کی ہوا ہے

ایسے بھی ہیں کچھ پھول ترے باغ سخن میں
بازار میں کبھی جن کو کوئی لا نہ سکا ہے

(صبر)

---

۱ شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی ۲ مرزا عبدالقادر بیدل ۳ سید احمد علی عشرت گیادی ۴ سید اشرف علی محسن عظیم آبادی ۵ نذیر حسن شوق نیموی ۶ علامہ حافظ سید محمد فضل حق آزاد گیادی ۷ جمیل بہار سید عباس سریر گیادی ۸ افصح المتکلمین علامہ حکیم سید حسن مرتضیٰ شفق عمادپوری گیادی ۹ حکیم سید شاہ محمد الیاس فردوسی بہاری ۱۰ محمد بہار۔ یادگار زمانہ ڈاکٹر مبارک حسین مبارک عظیم آبادی۔

اقبال

از جناب فخر الدین خاں صاحب بھاگلپوری ڈسٹرکٹ سب جسٹس مونگیر

معدن علم و عمل مخزن صد فضل و ہنر — موجد طرز سخن لطف زباں را مصدر
اے کلام تو پسندیدۂ ارباب نظر — ایکہ پرورد بیان تو اثر سر تا سر
نیز برج سخن روح معانی بودی
حافظ نکتہ بیاں سعدیٔ ثانی بودی

بند شیں چست تو فقرے ہیں غضب کے نایاب — جتنے الفاظ ہیں وہ پھول ہیں گویا شاداب
بحر سے وابستہ ہیں شیرینیٔ سخن کے ابواب — فکر روشن ہے تری رشک ضیائے مہتاب
دلربا طرز سخن شوخی بھی انداز بھی ہے
سننے والوں کے لئے سوز بھی ہے ساز بھی ہے

طائر فکر کی ہے عرش کے اوپر پرواز! — نغمہ سنجی کی جو پوچھو تو عجب سوز اور ساز
زمزمہ سنج حقیقت تھی تری طبع گداز — ہیں بھرے دامن افکار میں گلہائے مجاز
تیرے اعجاز کی اک خلق تماشائی ہے
جلوۂ شان کلیمی ہے مسیحائی ہے

بقعۂ نور مگر "بانگ درا" کی ہے زمیں — تابش روئے سخن آئینۂ مہر مبیں
ہیں ضیا گیر تری نظم سے درہائے ثمیں — یہ صباحت چمن دہر کے پھولوں میں نہیں
اے ہمہ شکل تو مطبوع ہمہ جائے تو خوش
دلم از عشوۂ شیریں شکر نائے تو خوش

اے خوشا تو جو ہوا سلسلہ جنبان کلام — فکر ہے شانہ زن زلف پریشان کلام
جلوۂ شان کلیمی ہے تری شان کلام — گل اعجاز سے لبریز ہیں دامان کلام
بے بہا وزن میں ہیں دام میں کوستے ہیں
دست پروردہ بیضا کے یگانہ ستے ہیں

سست ہیں بزم میں فراط سے مئے نوش — آج یاروں میں امنگیں ہیں نہ وہ جوش و خروش
ہے گلوگیر جو خم قلقل مینائے خموش — سر بکف جام ہے محفل میں تبسم خانہ بدوش
گریہ شیشہ کو ہے کوزوں کو گراں جانی ہے
حدت غم سے بطائے کا لہو پانی ہے

مسلم تفتہ جگر گھلتا ہے چوں شمع گداز — اب نئی لے سے نہیں کوئی بھی یاں زمزمہ ساز
کوشش زن کون کرے نغمۂ تہذیب مجاز — سازگر ہی نہیں اب نشۂ مضراب ہے ساز
"نالے بیتاب ہیں نغموں سے نکلنے کے لئے
طور آمادہ ہے اس آگ میں جلنے کے لئے"

مولینا سید منظر علی ندوی مرحوم

از حضرت اختر شہسرامی صاحب

صحبت علم و ادب میں کل جو تھا مصروف کار
آج سویا ہے کفن پہنے ہوئے زیر مزار

ایک مدت تک ادب کی جس نے خدمت کی سدا
محسن اردو میں پھر اُس کا نہ ہو کیوں کر شمار

اُسکی خلوت میں ہمیں جلوت کا ملتا تھا مزا
تشنگانِ علم اُس کے گرد تھے پروانہ وار

علم کا پرچار ہو پیارا وطن پھولے پھلے
بس یہی دل میں لگن اُسکے رہی تن من نثار

ذوق تھا نشر و اشاعت کا ہمیشہ کے لئے
انجمن ہی ہے اُسکے نام کی اک یادگار

مدتوں اخبار مسلم کا تھا وہ روح رواں
اُس کے قلم سے سائے صوبہ میں تھی اک دھوم مچا

شائقِ ہی سب کے دلوں پہ ندوی منظر کی موت
دوستوں کو کس طرح بہلائے آئے کے قرار

"صبح کا ستارہ"

از جناب محمد عبد الغنی صاحب شمس کرائے پرسرائے

سوئی تھی ابھی سیلائے سحر تاریکی کے گہوارے میں
اور باہم پہم سرگوشی تھی جاری اک اک تارے میں

موجوں کی ہر گہرائی میں پنہاں تھا سکون دریا بھی
ملفوف ردائے خاموشی میں جنگل بھی تھا صحرا بھی

سمت کہ نصب اک خیمہ کئے ظلمت کا کالا بادل تھا
دوشیزۂ صبح کے چہرے پر ڈالے ہوئے کوئی آنچل تھا

افلاک پہ چھوٹے اور بڑے کچھ تارے صرف چمکتے تھے
عشاق کی صورت آنکھیں بچھائے راہ کسی کی تکتے تھے

حوران بہشتی دنیا میں سوئی تھیں اونچے کوٹھوں پر
زلفیں تھیں بکھری عارض پر مستی کی دھڑی تھی ہونٹوں پر

تھے مست مئے خوابِ غفلت میخانۂ ہستی کے میکش
بے ہوش پڑے تھے سب کے سب پیمانۂ ہستی کے ہمکش

اک لہر تبسم زا دوڑی دوشیزۂ عالم کے لب پر
ہونے لگی طاری کیفیت رعشے کی سی ہر کوکب پر

ناگاہ ستارہ صبح کا اک دامان افق پر آیا نظر
یا شعلۂ جوالہ تھا وہ یا پارۂ عنائی کا اک پیکر

یا عکس بدیعی تھا وہ یا پرتو نور تجلی تھا
یا داغ تھا عاشق کے دل کا جو بجھ کے ستارہ چمکا تھا

یا برق تھی کوئی چمک زن یا محو تبسم آنگر تھا
یا کوئی قبائے سیمیں میں لپٹا ہوا از سر تا سر تھا

یا کوئی شمع فروزاں تھی خلوت گہ ناز جاناں میں
یا کوئی چراغ روشن تھا افلاک کے گوشۂ غریباں میں

فطرت نے اک انگڑائی لی انوار کی بارش ہونے لگی
عالم نے دبے دبے میں بیداری لی رد در گئی

اب ساری دنیا میں تھی دریائے ضیا میں نہا دھو کر
اور اٹھ بیٹھا عالم کا عالم بیتابی نیند سو سو کر

مندر سے صدائیں آنے لگیں ناقوس و جرس کے بجنے کی
اشنان کی خاطر جانے لگی مرہاروں کی ٹولی ٹولی

مسجد میں اذانوں کے نعرے افلاک سے سر ٹکرانے لگے
جس کی ہیبت اور عظمت سے باطل کے دل تھرانے لگے

سنسار کے پالنہار کو اے شمس چلو اب یاد کریں ! کیوں ناحق نظم سرائی میں ہم وقت اپنا برباد کریں

آنسو

از جناب سید مرتضیٰ حیدر صاحب نقاد عظیم آبادی

جو بجھ دل کی بجھا دیتا ہے وہ دریا ہے تو
ہیں سمندر تیری موجیں گرچہ اک قطرہ ہے تو

موجۂ اندوہ ہے تو ادر حباب بحر غم
تیرے قطروں میں نہاں ہے صورت ذر دوام

وہ جرس ہے تو کہ ہے جس کی خموشی میں صدا
کارواں جیسا بھی ہو چل جاتا ہے تجھ سے پتا

صدمۂ غم سے فقط رہتی نہیں سازش تری
ہوتی ہے ذرط طرب سے بھی کبھی بارش تری

قطرے قطرے میں ترے فطرت کی ہے وہ داستاں
جس کو کرتی ہے ادا تیری زبان بے زباں

تیرے قطرے وہ کہ شرمندہ ہے جس سے ابر تر
جب لڑی تجھ سے تو پھیکی ہو گئی آب گہر

دُرِ مکنوں سے کہیں تو تیز میں برتر ہے تو
ابر نیساں سے کہیں تاثیر میں بڑھ کر ہے تو

توجو فطرت کے دبستاں کا نہ ہوا کر منشر
کتنے ہی بچوں کا فقوں ہو تا کر ہے آب شیر

چشم سے انساں کی تو بہتا ہے جب وقت دعا
تجھ سے اخلاص دلی کا صاف جھلکتا ہے پتا

تجھ کسے بہتر زخم عصیاں کا کوئی مرہم نہیں
آب رحمت سے ترا قطرہ اثر میں کم نہیں

تیرا ہر قطرہ گناہوں سے ہے بخشش کی سبیل
رد فی آنکھوں سے نہ کیونکر شاد ہو رب جلیل

زشت اعمالی کے دفتر تجھ سے ہوتے ہیں سفید
تیری ہی بارش سے ہے سرسبزی کشت امید

اس جہاں میں تجھ سے کب خالی ہے کوئی اہل دل
ہے جگہ آنکھوں میں تیری تو ہی دل سے متصل

وائے اُن آنکھوں پہ جن آنکھوں میں آ جاں تو نہ سکے
منزل ویراں ہے وہ جس میں کہ مہماں تو نہ سکے

کسی کی یاد

از جناب فیصر عثمانی

(سانیٹ)

یہ آب جو یہ مستانہ ہوائیں
کسی کی یاد پیہم آ رہی ہے
دل مہجور کو تڑپا رہی ہے
نہ کیوں اشکوں کے ہم دریا بہائیں

طیور خوش نوا میرے لئے کیا
یہ سبزہ اور یہ رنگیں ابر پارے
مناظر حسن کے یہ پیارے پیارے
کروں کیا اس جہان رنگ و بو کا

عروس نو بنی ہے آج فطرت
ہر اک شئے جلوہ گاہ آرزو ہے
جدھر میں دیکھتا ہوں تو ہی تو ہے
کہ امڈا ہے مرا دریائے الفت

چلی آ اے مری رعنا چلی آ
کہ ہے ویران آغوش تمنا

شرابی سنسار

از جناب شفیق قادری سونبرسادی (رگیا)

(جناب سہیل عظیم آبادی کے افسانہ "شرابی" مطبوعہ ندیم ماہ اگست ۱۹۳۹ء سے متاثر ہوکر ــــــ "شفیق")

کتنا مورکھ ہے سنسار — آگ کو یہ کرتا ہے پیار
زہر کا پیالہ پی پی کر — مرنے کو ہے تیار
بوتل میں کیا چیز بھری ہے — یہ کیوں سوچے؟ کیا درکار؟
ڈوب رہی ہے اس کی ناؤ — اور یہ گاتا ہے ملہار
ناداں! سوچ تو ہوگا کیا — جینا ہوگا تجھ پہ بار
کھو دیگی وہ تجھ کو اک دن
جس سے گیا تو جیون ہار

مقصد حیات

از جناب نجم کاکوی

(ایک انگریزی نظم کا آزاد ترجمہ)

پیپل کے درخت کو تو دیکھو — صدیوں سے یونہی کھڑا ہوا ہے
دو دن کی حیات سے گل تر — نکہت افزائے بوستاں ہے

انساں کا بھی حال ہے اسیطرح — گر زندہ رہے جو ایک ساعت
کر جائے وہ کار نیک ایسا — نام اس کا جہاں میں جاوداں ہے

لیکن برسوں ہی زندہ رہیئے — کیا فائدہ ایسی زندگی سے
جب حاصل زندگی نہیں کچھ — اس زیست پہ موت کا گماں ہے

انتظارِ شوق

از جناب محمد کمال احمد صاحب رازؔ بھاگلپوری

جانِ تمنا جلد آجاؤ
دل کو شاد میرے تڑپاؤ
نغمۂ شیریں اپنا سناؤ
آؤ آؤ! پیاری آؤ!
جلوۂ ہوشربا دکھلاؤ!

چاندسی صورت پر میں قرباں
موہنی مورت پر میں قرباں
گوری رنگت پر میں قرباں
آؤ! آؤ! پیاری آؤ!
جلوۂ ہوشربا دکھلاؤ!

آتی ہیں یاد تمہاری باتیں
کیسے کٹیں گی برساتیں
اُس پر کافر کالی راتیں
آؤ! آؤ! پیاری آؤ!
جلوۂ ہوشربا دکھلاؤ!

گل جیسے رخسار دکھا دو
بلبے بال اک بار دکھا دو
مرتا ہوں دیدار دکھا دو
آؤ! آؤ! پیاری آؤ!
جلوۂ ہوشربا دکھلاؤ!

دل میں اک ہیجان بپا ہے
اشکوں کا طوفان بپا ہے
محشر میری جان بپا ہے
آؤ! آؤ! پیاری آؤ!
جلوۂ ہوشربا دکھلاؤ!

آؤ! غم کے گیت سناؤں
اپنا حالِ زار دکھاؤں
روؤں اور تم کو بھی رلاؤں
آؤ! آؤ! پیاری آؤ!
جلوۂ ہوشربا دکھلاؤ!

عشق کے نغمے گاتی آؤ!
زلفوں کو لہراتی آؤ!
ناز و ادا دکھلاتی آؤ!
آؤ! آؤ! پیاری آؤ!
جلوۂ ہوشربا دکھلاؤ!

اگلی صحبت یاد نہیں ہے؟
پہلی الفت یاد نہیں ہے؟
میری محبت یاد نہیں ہے؟
آؤ! آؤ! پیاری آؤ!
جلوۂ ہوشربا دکھلاؤ!

جناب محمد کمال رازؔ

جناب قمر کاردمی

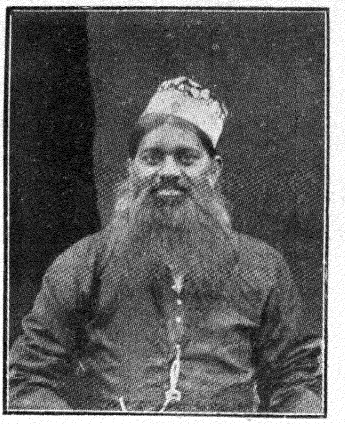

جناب سید عبدالغنی فخر مرحوم

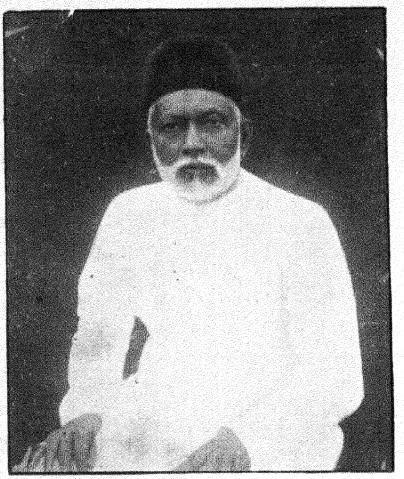

عالیجناب خاں بہادر احمد علی صاحب بالقابہ

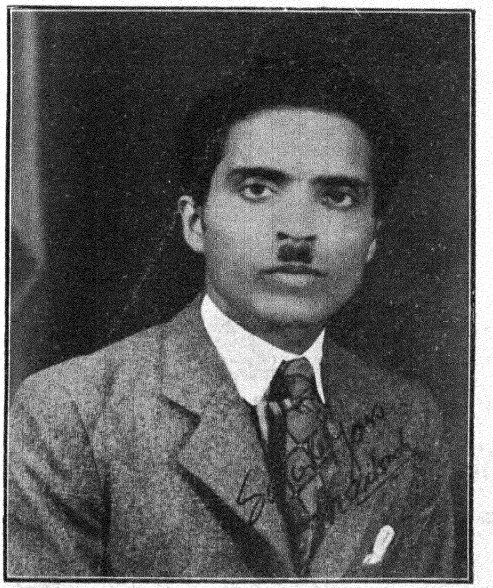

جناب مکیش عظیم آبادی

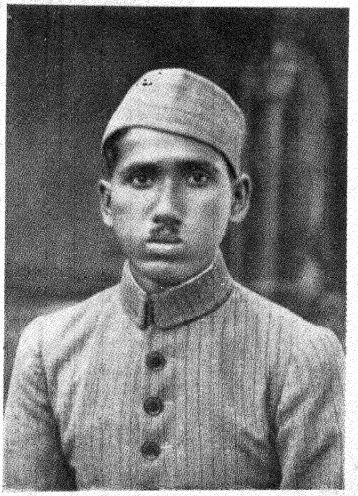

جناب ایم ذکی اختر

بادۂ کہن

سیّد محمّد عبدُالغنی فخر

اسم شریف محمد عبدالغنی تخلص فخر۔ والد کا نام و حیدالدین احمد۔ آپ کا سلسلہ نسب سادات سے تھا۔ آپکے جدامجد موضع باغی چکوہ بتھانہ وارث علی گنج سے منتقل ہو کر ضلع پٹنہ شہر بہار شریف محلہ لہیری میں آکر بسے تھے۔ آپ کی ولادت بمقام بہار شریف ۱۲۶۹ھ میں ہوئی۔ اور سال رحلت ۱۹۰۵ء تعلیم کا سلسلہ بہار ہی میں رہا۔ عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم کے علاوہ انگریزی کی تعلیم انٹرنس کلاس تک کی ہوئی تھی عمر کا زیادہ حصہ ضلع گیا میں بعہدہ اوورسیری ڈسٹرکٹ بورڈ صرف ہوا۔ حضرت جناب حضور شاہ امین الدین احمد قدس سرہٗ سجادہ نشین خانقاہ حضرت مخدوم الملک حضرت شیخ شرف الدین رحمۃ اللہ علیہ بہاری سے سلسلہ قادریہ میں شرف بیعت حاصل تھا۔ طبیعت میں اخلاص اور جذبات سنی بدرجۂ اتم تھی۔ چنانچہ اپنے نام کے بجائے اکثر حروف ع غ ف ق (عبدالغنی فخر قادری) تحریر فرماتے۔ شعر و شاعری میں کسی سے تلمذ حاصل نہ تھا۔ علاوہ شغف سخن کے باقو اپنے فرایض منصبی سے شغف تھا یا صناعی و دستکاری میں وقت صرف ہوتا تھا۔

عہد کٹوریا کے چھوٹے چاندی کے پوسٹ کارڈ پر حضرت سعدی کی کسی غزل کی نہایت صاف حرفوں میں تحریر فرمانا آپ کا محض بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اس کا ایک نسخہ اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں محفوظ تھا۔ اپنے احباب کو بھی اس کا ہدیہ کیا تھا۔ ممکن ہے کہیں اور بھی موجود ہو۔ اسٹیلج بونٹ کی صرف ڈال پر مشتمل سورۂ اقل ہوالمنڈ، مسطور کیا کرتے تھے۔ نجاری اور آہنگری سے میکر نازک تر کام خوش نویسی تک کا بغیر تکلف انجام فرمایا کرتے تھے۔ نجاری میں بھی صناعی اعلےٰ قسم کی ہوتی تھی۔ پلنگ کی بناوٹ میں اشعار بنتے تھے، اور پھول پتی کاڑھنا تو معمولی بات تھی۔

فن شاعری میں صنایع و بدایع سے خاص موانست تھی اور کسی صنف شاعری میں فکر طویل کے کبھی محتاج نہ ہوئے۔ خداداد عطیہ و ذہانت اعلیٰ سے مکلف تھے۔ فی البدیہہ اور قلم برداشتہ لکھا کرتے تھے۔ حضرت امیر خسرو کے رنگ و زبان میں چیستان خوب فرماتے تھے۔ اور اس میں اپنا انداز خاص بھی ضرور رہا کرتا۔ افسوس کہ بیاض ممتہ کسی کو پسند آگیا۔ دو ایک جو زبان زد ہے ذیل میں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے:۔

۱۔ تین جان اگیارہ پاؤں۔ چلے چھپے وہ گاؤں گاؤں۔ سیدھی سادی ہلکی پھلکی۔ بوجھو اسکو فخر بہاری۔ ..... ریل کی پہیلی

۲۔ ایک تریا کی سندر مورت۔ تھوڑی گھڑی میں دیکھو صورت۔ پاؤں نہیں دن رات چلے وہ۔ اپنی جگہ سے پر نہ ٹلے وہ۔ سوئی رکھے سیئے نہ جانے۔ اس کو بوجھیں اچھے سیانے۔ ..... گھڑی

۳۔ کیست آں مرد مسلماں کہ بدارد وہ پائے۔ سر ہزار و کمرش پنجہ و عبدالی بسرش ساختہ جائے ..... عبدالغنی

ی / ۱۰ غ / ۱۰۰۰ ن / ۵۰

مادہ تاریخ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور برجستہ فرماتے تھے۔ اور انواع و اقسام سے منظوم فرما دیتے۔ مثال کے طور پر ذیل کیا جاتا ہے:۔

قطعہ تاریخ رحلت جناب شیخ امید علی صاحب ساکن قصبہ روح ضلع گیا

جناب شیخ امید علی حمیدہ خصال — کہ روح در جسد روح بود در امثال
فجستہ یوم خجیسے کہ ہمدراں رونے — فراغ یافت ز تعمیر عید گاہ شمال
بہ ورد کلمۂ طیب بشکر مقالی کرد — سپرد جاں بہ جہاں بخش ایزد متعال
بداشت خفیۂ حق از رہ خردمندی — نہ داشت فرخشہ مطلق زمانہ دال مثال
حکیم شیخ محمد مواصل عالی — مہین پور گرامی آں ستودہ خصال
برائے سال بہ فخر بہار ایما کرد — زفیض ہاہم غیبی دو مصرعہ شد فی الحال
کہ بست و پنج ز ماہ مبارک رمضان — ہزار و سہ صد و بد جیجدہ ز ہجرتی سال

دیگر: چوں بہ دخترِ مولوی اطہر حسین — آنکہ در جھٹلی ہفت دولتخانہ اش — گشت تزویج محمد یوسف آنکہ — ہست دولتورار ہفت خانہ اش
چشمہ بے سرمہ مدام اور اسیاہ — جائے دل در گیسوئے بے شانہ اش — بست و یک شوال و یوم السبت بود — زیب تن شد جامہ شاہانہ اش
از خطاب حافظہ ظاہر گشت فخر — سال عقد و فضل شاہانہ اش، — بست و ہفتم از جمادی الآخریں — بود سہ شنبہ کہ از جانانہ اش
در ڈیاواں فخر بعد از نیم شب — گشت پیدا پور در کاشانہ اش — از قفقل سال ہجری شد عیاں — عین حق گفتا یکے فرزانہ اش
عمر مضرو طالع اسکندری — حق دہد با شوکت شاہانہ اش — دولت آباداں۔ بہی خواہاں شاد — کور بادا دشمن دیوانہ اش،

بد پریشاں گو ہر نا یکھا
نظم کردم فخر ایں دردانہ اش

دیگر:- اندھیری شب آج کیا بلا ہے کہ دل ہی خستہ بتاں جگر ہے، — یہ پنج ماہ ربیع ثانی شگون بد سی بھری مگر ہے،
وہ دیکھو محزوں ستم رسیدہ بلکتے آتے ہیں میر گھسو — طبیعت اپنی سنبھالیے تو اور کہیے صاحب کہ کیا خبر ہے،
کہوں میں کیا غم کی داستاں ہے عجب طرح کا یہ حادثہ ہے — خدا کے سب ہیں یہ کارفانے اسی کا بندہ ہی جو بشر ہے
اسی کے گھر کا یہ واقعہ ہے کہ منجھلا لڑکا ابو مظفر — سدھارا جنت کو داغ حسرت کہ خشہ ماں ہی حزیں پڑے ہے
یہ سنکے دل دھڑ سے ہو گیا فخر نہ دل ٹھکانے نہ ہوش برجا — پہونچ کے دیکھا تو سب فسردہ ہیں اور ماتم زدہ وہ گھر ہے
بفکر تجہیز و غسل ہیں سب یگانے بیگانے دوست ساتھی — خموش بیٹھے جو ہم نے سوچا تو سال نکلا غم پسر ہے

۱۳۱۷ھ

دیگر:- قطعہ تاریخ تعمیر مسجد واقع محلہ بنولیہ بہار شریف :-

بہ حسن سعی و بہیں انتظام مولا بخش — شد ایں عمارت مسجد مجرد اتمام یار — بہ سجدہ آمدہ فخر بہار روہ نمود — سبحان ربی الاعلا بے اصل سیار

۱۳۰۵ فصلے

افسوس کہ زمانہ کے دستبرد نے آپ کے اکثر سفائن کو ضایع کر دیا۔ کاش وہ کلام اور ضایع مطبوعہ ہوتے اور سخندان اس سے لطف اندوز ہوتے۔ یوں تو فی زمانہ کلکتہ اور اجمیر کا سفر ایک دوراں کی بات ہے اور کون ہے جو ان مقامات کی سیر و زیارت سے مشرف نہیں ہوا۔ اس میں چنداں کوئی اہمیت نہیں، مگر ایک زمانہ تھا کہ یہ سب سفر یادگار ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے سفر کے احوال کو قلمبند کر دیا اور طبیعت موزوں ہو گئی تو اوّل سفر نامہ کلکتہ میں ۱۴۳ - اشعار کہے، دوسرے میں ۳۴۰ - اسی طرح سفر نامہ دہلی مشتمل بر ۵۱۵ اشعار ہیں۔ اور سفر نامہ بنارس میں ۲۲۶ اشعار۔ پہیلی و معمہ وغیرہ کی تعداد ۳۷۶ تھی جو تلف ہو گیا۔ سفر نامہ کے چند اشعار قارئین کرام کے لئے ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

سفر نامۂ کلکتہ:- آیا جب سال چھیاسی کا مہ ستمبر — ہوا ولد کا ارادہ کہ ہو کچھ سیر و سفر
اپنے صوبہ سے نکلنا نہ ہوا تھا گاہے — گرچہ تھا خدمتِ سرکار میں ہر روز سفر

. . . . . .

موقع اس کا ہے کہ کچھ وصف ہو اسٹیشن کی — بے کم و کاست لکھوں لطف صحبت ہو جسپر
ہے کسی در پہ لکھا ٹیلیگراف آفس صاف — ہے بکنگ آفس و وے اوٹ کسی تخت پر
کمرہ ایک خاص ہے آراستہ بہر لیڈیز — دوسرا واسطے مردوں کے سجا ہے بہتر
ایک کمرہ ہے الگ جس میں ہے کلنگی دوکاں — چاہے جو لیجئے مے برف و طعام خوشتر
پوسٹ آفس ہے لکھا در پہ کسی کمرہ کے — ہر طرف بھیڑ ہے اشخاص کی اندر باہر
تازہ پھل پان مٹھائی و کباب و روٹی — بیچتے پھرتے ہیں خانوں میں صدائے دیگر
منتظر سب تھے کھڑے چیزوں کو اپنے سر پائے — اتنے میں آگئی موقع پر ادھر پاسنجر
کوئی مسافر کی صدا ہے کہ کوارٹا کھولو — کوئی بہشتی کو پکارے ہے کھڑا چلا کر
کوئی اندر ہوم سے چلاتا ہے پانی پانڈے — کوئی تماشہ میں ہے کھڑکی سے نکالے ہوئے سر

مدعا یہ ہے کہ جو آٹھ بجے ادھر ڈون ٹرین
ہم تھے موجود لئے بیگ بچھاون گٹھر
ایک ہی کمرہ میں ہم لوگ گئے جا کے جگہ
اک پہ والد تھے ادھر ایک پہ ہم دو برادر
بعد کچھ دیر کے معمول پر تب ریل کھلی
ٹھیک جب وقت ہوا پندرہ منٹ بارہ پر
کیفیت راہ کی کچھ لکھ چلوں حتے المقدور
گرچہ شب تھی پر میں بیدار رہا تا بہ سحر
لیٹ جاتا تھا میں جب کھل چکی گاڑی اور پھر
اٹھ کے بیٹھا جو پہنچ جاتے تھے اسٹیشن پر
جا بجا جب کہ پہاڑوں میں گذر ہوتا تھا۔
منکشف ہوتا تھا قدرت کا نمونہ مجھ پر

.....

الغرض قطع منازل ہوئے ہوڑہ پہنچے
دن کا جب تین بجا راہ چلے پانچ پہر

.....

جمعہ کو کھلتا ہے معمول ہے ہوڑے کا پل
کھل چکا تھا وہ نہیں جا سکے اس کے اوپر
ایک جب کھل چکے پل واں کا تو دستور یہ ہے
کہ مسافر کے لئے کھلتے ہیں کئی اسٹیمر
اور محصول بھی کم ایک ہی پیسہ فی کس
الغرض ہم بھی چڑھے لے کے ٹکٹ پھرتی کر

.....

مسجد ناخدا دیکھا۔ گئے ایڈن گارڈن
جنرل آفس بڑی بازار کبھی تھیٹر
مارکٹ در سر تالاب اور سرے وآفس
ہائیکورٹ اور کبھی رو گئے دل چاہا جدھر
گوک کیلوی وہملٹن کی دو دکانیں اے واہ
اسمتھ اسٹینیر ٹیٹ اور دو دکان آسلر

.....

سڑکیں کتنی ہیں اور ہوتا ہے تقاطع کتنا
کہکشاں ایک ہے ہو اس سے تشبیہ کیونکر
دل یہ کہتا ہے کہ از روے صفائی کہہ دو،
ہے خط نور سے تیار بساط چوسر

.....

باغ زولوجی علی پور کا سبحان اللہ
ایک عجب لطف کی ہے چیز پے حسن بشر
طوطی و فاختہ و شارک و طاؤس و بط
اشتر و شیر و زرافہ و غزال و بز و خر
جمع ہیں اس میں طیور اور بہایم صدہا
سیکڑوں وضع کے ذی روح ہیں اندر باہر
مارکٹ واہ رے بازار عجب منظر ہے
کس قدر چیز یہاں بکتی ہیں ہر دوکاں پر
چیزیں ہر جنس کی موجود بافراط تمام
ادویہ، اغذیہ، اجناس و گل و میوہ تر
قابل دید ہے بازار عجب دلکش ہے
لوگ ہر جنس کے ہیں بیع و شرا میں مضطر
ہندو پارسی و ترکی و برمی عربی،
مصری و جرمن و روسی و فرنچ و بربر،
وصف ہم لکھ چلیں کچھ یاں سے اڈن گارڈن کی
روح کلکتہ جسے کہئے تو کچھ ہو نہ ضرر
دلکشا روح فزا، بہر تفرج جا ہے
گوئی گلگشت مصلا کہ بود زیں کمتر

دیگر:-

خامۂ مدت سے تو ہے گوشۂ عزلت میں چھپا
چار دیوار قلمدان سے نکل باہر آ
لکھ سفر نامۂ اضلاع شمال و مغرب
جس کے شایق ہیں مرے بعض عنایت فرما

الغرض اس مختصر مقالہ میں اتنی گنجائش کہاں کہ پورا سفر نامہ پیش کیا جا سکے بس اتنے نمونہ از خروارے اور بس۔

ایک ترجیع بند موسوم بہ "بوٹ" از نتیجہ خیال مخمر بہاری مرحوم درج ذیل ہے :-

دوستو دیکھو میرے ہاتھ میں ایک بوٹ ہے یہ
جثہ میں کم تو ہے خوبی میں مگر اونٹ ہے یہ

یہ وہ شے ہے کہ ہے مقبول غریب اور رئیس، شوق لذت سے چرا لیتا ہے دانہ کو سئیس
اس کے کھانے کے طریقے بھی بہت ہیں دلچسپ گھگھنیاں اس کی بنیں اس کی قبولی موتنیس

دوستو دیکھو ..... الخ

جس قدر اس کو بڑا ہم کہیں وہ ہے تھوڑا پھر بھی لائے قوی تن ہو اسی سے گھوڑا
اس کی توصیف سے جس شخص نے موہ نہ کو موڑا سن کے یہ نظم خیال اپنا وہیں پر چھوڑا

دوستو دیکھو ..... الخ

منفعت پاتے ہیں اس جنس سے ہر خاص و عام رات کو دن کو اسے کھائے کیا صبح کہ شام
کب کسی کو ہوا اس جنس کی خوبی میں کلام، عرف میں لوگ اسے کہتے ہیں ہندی بادام

دوستو دیکھو ..... الخ

دل ہو خوش ذکر سے اس کے جو گذرے اک خیال حلوے خوب اس کے بنیں جس سے طبیعت ہو نہال
مونگ کیا ماش بھی کیا چیز ہے، ارہر کیا مال ہوتی ہے کیسی مزہ دار بھئی بوٹ کی دال

دوستو دیکھو ..... الخ

کیا قلم میں مرے قوت کہ لکھے اس کی ثناء عانا یعنی نخود اس نے کہا نام اپنا
کھا نیگا اس کو جو عادت سے رہیگا وہ بنا اک عجب چیز ہے بھائی مرے یہ جنس چنا

دوستو دیکھو ..... الخ

ساگ کھائیں تو وہ ترشی کا مزہ اس کا واہ جھنگڑیاں دیکھئے کیا چیز ہیں سبحان اللہ
اپنے ہر حال میں پیارا نہ ہے خالق سے گواہ خام سے خشک تلک اس کی ہے ہر شخص کو چاہ

دوستو دیکھو ..... الخ

اُنگڑیاں طوطوں کو مرغوب ہیں درطشت قفس ستو کچھ باندھ کے لے ساتھ مسافر ہے کس
بھوسی اس جنس کی بکری کی غذا ہے از بس الغرض کرتے ہیں اس چیز کی ہر کوئی ہوس

دوستو دیکھو ..... الخ

اس کی فصل آتے ہی اجل بھی گرہ کو کھولے، سیر دو سیر نہ تلوائے تو کچھ بھی تولے
جانگلے اس سے کنارہ نہ تو سادے بھولے واقعی لطف عجب دیتے ہیں سب کو ہولے

دوستو دیکھو ..... الخ

اس کے کھانے میں امیروں کو کوئی عار نہیں، اس کا ملنا کسی قریہ میں بھی دشوار نہیں
نہ یہ جس میں ملے۔ کہیے اسے بازار نہیں، کون ہے جس کو کبھی اس سے سروکار نہیں

دوستو دیکھو ..... الخ

بھون کھایا، کبھی کچا کبھی تلوا دیکھا کبھی ستو کبھی پختہ کبھی حلوہ دیکھا
ہے مزہ دار یہ جس حال میں جلوہ دیکھا الغرض اس کو بجائے من و سلویٰ دیکھا

دوستو دیکھو ..... الخ

ہے جزامی تو اسے کھائے فقط ہوگا صحیح — فیض کی جس کو شکایت ہو وہ پائے تفتیح
اس کے کھانے سے حسیں ہو جو ہو بد شکل فسیح — سچ تو یوں ہے کہ ہے دجال علالت کا مسیح

دوستو دیکھو ..... الخ

رکھ دو بھگو کے تو جھاڑ آئیں نکل لو پھر کھاؤ — اور بھی چاہو تو روغن میں نمک میں تلواؤ
دانت مضبوط اگر ہیں تو لو کچا ہی چباؤ — کچھ مضرت نہیں ہر حال میں ہے اس سے بناؤ

دوستو دیکھو ..... الخ

سچ تو یہ ہے کہ اگر اس کے ہوئے تم عادی — پھر تو خلصے ہو سدا کیسے ریاحی بادی
پہلواں تم ہو جواں بخت سدا ہے شادی — فخر دینے کو ہیں موجود مبارک بادی

دوستو دیکھو مرے ہاتھ میں ایک بوٹی ہے یہ
جثہ میں کم تو ہے خوبی میں مگر اونٹ ہے یہ

آپ کی تصانیف میں صرف ایک کتاب موسومہ "ٹرین ینگ اکیڈمی سکول" چھپ سکی جو اسکولوں کے مبتدیوں کے لئے بہت مفید ہے۔ انگریزی الفاظ معہ اردو معنی منظوم ہے - وہو ہذا

گاڈ خدا — انجل فرشتہ — پروفٹ نبی — ریلیشن رشتہ
اسٹار تارا — اکلپس گہن — پورچ اوسارا — یارڈ صحن

ملازمت سے بوجہ علالت رخصت لیکر وطن مالوف آئے اور چند سے علیل رہکر بہ ۱۹۰۶ء انتقال فرمایا - اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

زبان کی خدمت جتنی کر سکتے تھے نہ کر سکے۔ اپنی اولاد میں چار صاحبزادے مسمیان ابوالحسن محمد طیب ڈپٹی مجسٹریٹ مرحوم - ابوالخیر محمد طاہر ڈپٹی مجسٹریٹ - عثمان بہادر ابونصر محمد عمر فی الحال نائب کمشنر پٹنہ ڈویژن اور ابوالفتح محمد عثمان وکیل بہار شریف کو اپنی یادگار چھوڑا۔

"خانم" (ریزر وائیڈیشن)

غظیم بیگ چغتائی کی بہترین تصنیف ہے - اس دلچسپ اور درس کتاب کا ہر ایک باب ایک چمکتا ہوا مزاحیہ افسانہ ہے - ہر افسانہ ایک علیحدہ کہانی ہے - مگر سب کہانیوں کا ہیرو اور کردار ایک ہے - ایک سے ایک مزیدار اور ہنستی ہوئی کہانی - اس قدر پر لطف، اس قدر پر مذاق - اس قدر عجیب، اور اس قدر مضحکہ خیز - اس قدر ظرافت اور لطافت آمیز اور مزیدار پلاٹ کہ جو پڑھے ہنسے - دیورانی جیٹھانی کی دلچسپ نوک جھونک، اس کو افسانے برسوں اخباروں میں نقل ہوئے - ہندی رسالوں میں چھپے، بنگلہ زبان میں چھپ گئے - گجراتی میں چھپ گئے - اب چن کر ہندی میں علیحدہ چھپ رہے ہیں،

ڈبل سائز کی چار سو صفحے کی ضخیم کتاب ہے - بہترین لکھائی چھپائی، سنہرا آرٹ پیپر کا سرورق - فہرست مضامین دستخطی مصنف کتاب میں آرٹ کی بہترین رنگین تصویر بھی شامل ہے - بہترین کپڑے کی جلد - قیمت للعہ علاوہ محصول ڈاک ۱۰/

مقامی کتب فروشوں سے خریدیں ورنہ براہ راست - نوٹ :- اگر کتاب واپس کرنا چاہیں، شوق سے دو روز کے اندر پڑھکر بذریعہ رجسٹری واپس کر دیں، ہم نہ صرف پوری قیمت بلکہ وصول شدہ محصول ڈاک بھی منی آرڈر سے واپس کر دیں گے۔

دفتر کتابت (عظیم بیگ چغتائی) جودھپور

میر حسیر عظیم آبادی

از مولوی مسعود الحسن صاحب ندوی

بہار کے اُن باکمالوں میں جو وقت سے پہلے دار آخرت کو چل بسے اور دنیا ان کے کمالات سے روشناس نہ ہو سکی سید محمد قاسم رضوی حسیر عظیم آبادی بھی ہیں۔ یہ اُردو کے اچھے انشاپرداز اور شاعر تھے۔ مختلف علمی رسالوں (ادیب الہ آباد وغیرہ) کے ایڈیٹر رہے۔ نقاد اور دوسرے بلند پایہ رسالوں میں ان کے مضامین شایع ہوتے تھے، امپیریل لائبریری کلکتہ میں فہرست سازی کی خدمت بھی انجام دی۔ وفات ۱۹۲۲ء میں ہوئی، عمر چالیس سے زائد نہ تھی۔ سر دست ایک غزل نذر ناظرین ہے، انشاء اللہ ندیم کے کسی آیندہ نمبر میں مرحوم کی علمی، ادبی، زندگی کو اجاگر کرنے کی کوشش کرونگا۔

غزل

فلک پر جو شمس و قمر دیکھتے ہیں — تو ہم اپنا داغ جگر دیکھتے ہیں

سُنا ہی یہ جب سے وہ ہیں آنیوالے — تو پھر پھر کے دیوار و در دیکھتے ہیں

وہ آئینہ کے رُوبرو محوِ صورت — اِدھر دیکھتے ہیں اُدھر دیکھتے ہیں

شفق اُنکی آنکھوں میں کیا جلوہ گر ہے — کہ شام و سحر دوپہر دیکھتے ہیں

نزاکت کی حد ہی کہ ہر ہر قدم پر — وہ چلنے سے پہلے کمر دیکھتے ہیں

نہ مرتے ہیں بُت پر نہ حُوروں پہ زاہد — تماشا صنم کا مگر دیکھتے ہیں

کلیسا ہو، کعبہ ہو یا طُور سینا — سب اُسکے ہی جلوہ کا گھر دیکھتے ہیں

وہی ہے حسیر آپ کہتے ہیں سب سے
جسے کُو بکُو در بدر دیکھتے ہیں

افسانہ و محاضرہ :-

فرض کی قربانگاہ پر

چند افکار اور چند محسوسات کا ایک افسانوی خاکہ

از حضرت جمیل مظہری ایم - اے پبلسٹی آفیسر گورنمنٹ آف بہار

(سلسلے کیلئے ملاحظہ ہو بہار نمبر سنہ ۱۹۳۵ء)

مطبوعہ حصے کا خلاصہ :- سلیم اور محمود کے گھر وندے کی محبت جوان ہو کر ایک تلخ حقیقت بنتی ہے لیکن سماج کا قانون سلیم کو محمود سے بیاہنے کی جگہ محمود کے بڑے بھائی حامد سے بیاہ دیتا ہے۔ شاعر مزاج محمود سلیم کو محبت کے نام پر سماج کی دیواریں پھاندجانے کا مشورہ دیتا ہے لیکن سلیم روایت پرست دماغ سوسائٹی کے اس فیصلہ سے بغاوت کرنے سے انکار کرتی ہے وہ محمود کو ایک خط لکھ کر فلسفہ معاشرت کی روشنی میں قدیم طریقہ ازدواج کی خوبیاں جتلاتی ہے جس وعشق کے رنگین نظریوں کا مضحکہ اڑاتی اور محمود کو موجودہ حالت پر قانع رہنے کی تلقین کرتی ہے تلقین کرتی اور خود احساس فرض کے ماتحت اپنے جذبات کو ہمیشہ کیلئے کچل دینے کا عزم کرتی ہے ـــــ وقت کی گرم رفتاری جذبات شوق اور احساس فرض کی اس کشمکش کو ایک افسانہ بناتی جارہی ہے - ایک ایسا افسانہ جس کے صفحوں پر عورت کے خاموش آنسو کہیں کہیں زندگی کے بوتے ہوئے نقوش بھی بنا دئے ہیں۔

(۸)

ایک ہفتے سے کچھ زیادہ گذر گیا لیکن ملاقات جسے کہہ سکتے ہیں وہ مجھ سے اور محمود سے ایک لمحے کے لئے بھی میسر نہ آئی۔ وہ گھر میں آتے آکر بیٹھتے اور پھر فوراً ہی اٹھ کر چلے جاتے۔ گفتگو کا موقعہ نہ ملتا۔ میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ کنواری زندگی میں اکثر ایسا اتفاق ہوا کیا ہے کہ وہ مجھ سے اور میں ان سے ہفتوں کیا مہینوں تک نہیں بولی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ہوئیں اور صلح نامے بھی مرتب ہوتے رہے لیکن اب کے دل کا کچھ اور ہی حال تھا۔ کچھ اور ہی نوایش اور کچھ اور ہی تقاضا۔ اس ایک ہفتے میں اس نے کئی بار میرے قابو سے باہر ہو جانے کی کوشش کی مچلا اور بری طرح مچلا۔ میں اسے زنجیر پہنانا چاہتی اور زنجیروں کا فلسفہ اسکی سمجھ میں نہ آتا۔ میں کہتی کہ فطرت کے حدود کو پہچان وہ کہتا کہ فرض کو حدود فطرت کیوں کہتی ہو۔ غرض مجھ میں اور میرے دل میں وہ مباحثہ شروع ہو گیا جس کا سلسلہ عمر کی درازی کے ساتھ جوانی کی شام تک قائم رہا۔

ان چند دنوں میں محمود کی زندگی میں کچھ ایسی کایا پلٹ ہوئی تھی کہ گھر کے کونے کونے میں۔ انکے متعلق سرگوشیاں ہونے لگی تھیں جتنے منہ اتنی زبانیں کوئی کہتا کہ لڑکا باؤلا ہو گیا ہے۔ کوئی کہتا کہ انہیں کچھ پینے لگا ہے شرابی کی آنکھ نہیں چھپتی ایک دن آتو جی نے خود مجھ سے آکر میرے کان میں کہا کہ کل محمود میاں آدھی رات کو نشے میں چور آئے اور صبح تک دہان کی پلنگڑی پر پڑے سوتے رہے۔ "بچی جان حسب عادت انکا اترا ہوا چہرہ اور چڑھی ہوئی چتونیں دیکھ کر کہتیں۔ بیچارے کے گھر وندے کی سہیلی محمود نے چھین لی۔ کیسے جی نہ کڑھائے۔ کبھی منی بی ان سے مخاطب ہو کر کہتیں جی نہ کڑھاؤ تمہارے محمود میں تمہارے لئے چاند سی بہو ڈھونڈ کر لاؤنگی سلیمہ کس گت کی ہو تو یہ ناک بھوں کی منہ طباق۔ وہ سنتے اور کھسیانی ہنسی ہنستے۔ میں سنتی اور گھونگھٹ میں مسکرا کے رہ جاتی۔ لیکن یہ خیال رہ رہ کر میرے دماغ کی رگوں کا خون چوس رہا تھا کہ محمود کو میری محبت برباد کر رہی ہے اور میں اسے بچا نہیں سکتی ـــــ بہر حال مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اسے برباد ہونے کے لئے چھوڑ دیا۔ اور خود اپنی حفاظت کی فکر میں مبتلا ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ انکی نگاہ اور میرے دل میں جو ٹکریں ہوتی رہتی ہیں وہ ایک نہ ایک دن میرے "احساس فرض" کو ضرور پاش پاش کر کے رہے گی۔ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہو انکی نظروں سے بھاگنے کی کوشش کیجائے گی۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب وہ

اپنے بھائی کے پاس آتے تو میں فوراً وہاں سے اٹھ جاتی۔ ان کے تبدیلی کی چاپ سنتی اور بلا تہمید اٹھ کھڑی ہوتی ان کے بھائی جانی ملاقات میں ہر چھوٹی سی چھوٹی بات کو پرکھنے اور کریدنے کے عادی تھے میری اس اضطراری حرکت کو بھی انہوں نے دیکھا اور دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن تنہائی میں مجھ سے پوچھ ہی بیٹھے۔ کیوں صاحب! یہ محمود جب آتا ہے تو آپ بھاگ کیا جاتی ہیں میرے تر یا چڑنے صاف گوئی میں مصلحت سمجھتے ہوئے کہا۔ تو کیا آپ نہیں جانتے کہ وہ بچپن سے مجھ سے پیار کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ آپ پیار کرنے کی چیز ہی ہیں۔ میں نے کہا۔ پیار کی نظروں سے گناہ بھی جھانکتا ہے۔ بہت سنتے اور کہنے لگے کہ حسین عورت کو دیکھ کر جوان آدمی کی نظر سے گناہ بھی جھانکتا ہے خدا نہیں جھانکا کرتا ——— میں نے جھنجھلا کر کہا وہ جو کچھ بھی ہو یہ مرا طبعی میلان ہے۔ میرا بس ہو تو میں ان سے پردہ کروں ——— کہنے لگے کہ میرا بس ہو؟ کیا معنی۔ آپ کی ہر چیز آپ کے بس میں ہے لیکن گذارش یہ ہے کہ اس فیصلے پر نظر ثانی کی جائے۔ یہ تو کسی طرح ممکن نہیں کہ آپ محمود سے پردہ کریں۔ میرے خیال میں اسکی کسی حال میں ضرورت نہیں۔ ——— اور اگر آپ جھنجھلاتی نہیں تو یہ عرض کرنے کی جرأت کروں کہ مجھ سے بیوی کی عصمت سے زیادہ بھائی کی خاطر عزیز ہے۔

انکی گفتگو چونکہ مذاق کا پیرایہ اختیار کر رہی تھی اس لئے میں نے بھی وہی انداز اٹھانا چاہا۔ "بہت اچھا جیسی آپ کی رائے ہو لیکن میں بھی آخر جوان عورت ہوں۔ اور ان کے ساتھ کی کھیلی ہوئی ——— اگر کوئی فرق ذکر ہو تو مجھ پر الزام نہ رکھے گا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا اور انھوں نے ایک قہقہے کے ساتھ جواب دیا۔ بسم اللہ اگر آپ کے پاس خوش قسمتی سے ایک دو ریوالور مجھے بھی اللہ میاں نے سایاں دے رکھی ہیں۔ میں ہر صورت اپنا انتقام لے لونگا۔ غرض میری اسکیم ایک مضحکہ ہو کر رہ گئی۔ لیکن عورت کے دماغ میں اسکیموں کی کیا کمی ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنے مقصد کے لئے دوسری اسکیم بنانی شروع کی۔ میرے شوہر حال ہی میں برٹش کی ڈگری لے کر یورپ سے آئے تھے۔ اور کسی ہائی کورٹ میں اپنا پیشہ شروع کرنا چاہتے تھے۔ میرے صوبے میں گو ہائی کورٹ کھل چکا تھا لیکن میں نے انکی قوت فیصلہ کو اپنی بہت سی مضبوط اور کمزور دلیلوں سے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ وطن کو خیرباد کہہ کر کلکتہ ہائی کورٹ میں اپنے پیشے کی مشق شروع کریں یہ بچارے میری محبت کے ہاتھوں موم کی ناک تھے راضی ہو گئے ——— لیکن اغراض نے ایک خاصہ طوفان اٹھایا۔ بڑے بوڑھوں نے نشیب و فراز دکھلائے بڑی بوڑھیوں نے نہیں دے دیکر سمجھایا۔ لیکن بیرسٹر صاحب اپنے فیصلے اڑے ہی رہے۔ وہ کیا اڑے رہے میں اڑی رہی ——— غرض میں نے کلکتہ کے لئے رخت سفر باندھا اور وطن کو خیرباد کہنے میں بہت ہی محنت سے کام لیا اور یہ آپ جانتے ہیں کہ کیوں؟ ———

میں محمود کی نگاہوں سے بھاگ رہی تھی۔ اور بھاگ آئی۔ کلکتہ پہونچکر میری زندگی نے شادی کے بعد اطمینان کا پہلا سانس لیا۔ یہ سوچکر کہ محمود کے حلقہ نظر سے نکل کر دل کو سیدھی راہ پر لے چلنا شاید ممکن ہو گا آپ کا شاعرانہ ذوق مجھے بیوفا سمجھے گا اور سمجھنا بھی چاہئے۔ اس لئے اگر محبت کے مقدس ترین جذبے سے بیوفائی کی اور اس کی حقیقت کو کچھ نہ سمجھی مگر یہ کہ ایک عارضی ہیجان۔ ایک وقتی تموج۔ ایک نفسیاتی کمزوری ——— ہر کیف میں نے شوہر کے لئے عاشق کو چھوڑ دیا ——— گو اس کے ساتھ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اگر میں چاہتی تو دونوں سے بہ یک وقت کھیل سکتی تھی۔ عمر بھر کھیل سکتی تھی۔ مگر میرے غرور کے لئے اس دو عملی زندگی میں کوئی لذت نہ تھی۔ میرے غرور نے اسے گوارا نہ کیا کہ خود فریب کھاؤں اور دوسروں کو فریب دیتی رہوں ——— زندگی کی بولائی ناؤ نے گھاٹ کو بچانے میں غلطی کی یا نہیں اس کا فیصلہ وقت کر سکتا تھا اور اس نے کیا۔

(۹)

کون کہتا ہے کہ عقل جنون پر فتح نہیں پا سکتی اور عشق کے جذبات فرض کے احساس کے ماتحت مغلوب نہیں کئے جا سکتے۔ میں نے خود انہیں ایک حد تک مغلوب کیا اور حالات اگر میرے ناموافق نہ ہوتے تو شاید پوری طرح مغلوب کر لیتی۔

میں کلکتہ پہونچکر محمود کو بھولنے لگی ——— آپ سمجھیں گے کہ کلکتہ کی دلچسپیوں نے مجھے اپنے اندر گم کر لیا نہیں ایسا نہیں ہے مجھے تو اس شہر میں ہر جگہ نجد ہی نجد کی ہوائیں چلتی ہوئی نظر آئیں۔ ہر جگہ جنون کی دعوت۔ سینماؤں میں جنون کی دعوت و ناچ گھروں میں جنون کی دعوت۔ سوسائٹی کے ہر رنگین مشغلے میں جنون کی دعوت ——— میں دل کی موت چاہتی تھی اور دنیا میرے دل کے واسطے ہر طرف زندگی کا تحفہ لئے کھڑی تھی۔ یہاں تک میں نے اس کے تقاضوں سے گھبرا کر اس کے دروازے اپنے اوپر بند کر لئے اور گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ کتب بینی کا مجھے شوق تھا۔ میں نے کوشش کی اپنے کو کتابوں میں دفن کر دوں لیکن وہاں

بھی میرے لئے ادب لطیف کی مصیبت تھی۔ کوئی ماہوار یا ہفتہ وار رسالہ کوئی ناول یا کوئی افسانہ کوئی دیوان یہاں تک کہ کوئی نظم اور کوئی غزل مجھے ایسی نہ ملی جس میں میرے دل کے لئے میرے دل کی دشمنت کے لئے جنوں کا پیغام اور جنوں کی دعوت ہو، شاعری مجھ سے محمود کی سفارش کرتی، موسیقی میرے ضبط نفس کا مضحکہ اڑاتی، افسانے میرے احساس فرض پر طنز کرتے ——— اور معصوری حسن و عشق کی زندگی کے مرقعے پیش کر کے مجھے فرض کی دنیا سے خواب کی دنیا میں بلانا چاہتی میں نے عاجز ہو کر ادب لطیف کے ساتھ تمام فنون لطیفہ سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ لیکن ان آوازوں کا میرے پاس کیا علاج تھا جو میرے اردگرد گونجتی رہتیں۔ میرے مکان کے سامنے کالج کے چند لڑکے تڑکے تڑکے راتوں کے سناٹے میں اور علم سرمستی کے یہ ہونہار بچے جب موسیقی کی دیوی راگنی سے عشق بازی کا سبق پڑھتے تو میرا سونا سلہ یا جوادل انکی آواز سے چونک اٹھتا۔ اور انکی ہر تان مجھے محمود کا وہ گیت یاد دلاتی جو وہ اکثر تنہائی میں گایا کرتا تھا ؎

انار کی سیتاں کیا جانے پریت کی ریت

اور مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ محمود کی نشیلی آواز میرے دل میں اتر رہی ہے ایک دن کوئی لڑکا کسی شاعر کی یہ غزل گا رہا تھا ؎

محبت بھی اک عجب آشنائی
بہ معنی تعلق بصورت جدائی

میرا دل اچھلنے لگا اور میں نے محسوس کیا کہ اس "بہ معنی تعلق بصورت جدائی" میں میرا اور محمود کا افسانہ حیات بند ہے اسکے بعد چند اشعار اور تھے، ہر شعر پر میرا دل ایک کروٹ بدلتا۔ یہاں تک کہ مقطع میں شاعر نے مطلع کے مضمون کو الٹ کر میری اور محمود کی داستان محبت کی جگہ میری ازدواجی زندگی پر طنز کیا۔

جمیل اس تعلق سے ہے فائدہ کیا
بصورت تعلق بہ معنی جدائی

اور میں چند لمحوں کیلئے سمجھنے لگی کہ واقعی ایسا تعلق سوسائٹی کی زبردست اور سماج کا ظلم ہے ———

خدا سمجھے ان شاعروں سے جو اپنے دل کی شورشوں کو دوسرے دلوں تک پہونچانے کی کوشش کرتے اور اپنے ہیجان نفس میں ساری دنیا کو شریک کرنا چاہتے۔ صرف سلیمہ ہی کو نہیں بلکہ ہر محبت کے ستائے ہوئے انسان کو جو اپنے دل کو سمجھا بجھا کر زندگی کی سیدھی راہ پر چلانا چاہتا، شکایت ہے ان شاعروں سے ان افسانہ نویسوں ان مطربوں اور مہ قابوں سے۔ جو دلوں کو مچلنے کی ترغیب و رنس کو بغاوت کا مشورہ دیتے ہیں اور نہیں سمجھتے "انسان ان کے فنون کی مٹھاس میں گم ہو کر اگر ان تلخ حقیقتوں کو فراموش کر دے۔ جن سے اسکی زندگی اور اسکی سوسائٹی کی ترکیب ہے تو کیا ہو؟

جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا ان کے خوابوں کے پیچھے آوارہ ہے انہیں چاہئے کہ پہلے تمدن کا شیرازہ بکھیر دیں۔ سوسائٹی کے نظام الاوقات پھینکیں۔ فرض کی بندشوں کو ایک ایک کر کے کاٹ دیں۔ اور ان تمام ضرورتوں کا منہ بند کر دیں طبیعت کا قانون جن کی زبان سے بولتا ہے۔ اور جب یہ سب کچھ کر چکیں تو پھر اس کے بعد یہ فرمایش کریں کہ دنیا زندگی اور معاشرت کی ناقابل تردید حقیقتوں کو پوجنے کی جگہ صرف نوک پلک کو خط و خال کو رنگ و روغن کو پوجنے لگے۔ پرم سارگر میں غوطے کھاتی رہے پرم بانسری کی ہر دھن پر اپنی زندگی لٹاتی رہے۔ جب تہذیب کی تجلیاں اور لطافتیں اور مجلس تمدن کی ساری رونق اور چہل پہل موقوف ہو صرف ان محرکات پر جو سوائے ترغیب جنسی کے ہمارے اندر کسی اور جذبے کو حرکت میں نہیں لا سکتے تو پھر بہتر یہ تھا کہ سوسائٹی کا ایک ایسا نظام ہوتا جس میں گھر نہ ہوتے گھر والے اور گھر والیاں نہ ہوتیں۔ ازدواج کا قانون نہ ہوتا، اولاد کی ذمہ داری نہ ہوتی ماں باپ نہ ہوتے ماں باپ کے حقوق نہ ہوتے۔ یہی نہیں بلکہ سینوں میں ماتائے شعلے نہ اٹھتے۔ پیٹ میں بھوک کی جلن نہ ہوتی۔ سردیوں میں ہمارے اعصاب کی ٹھٹھرن نرم کپڑوں کا مطالبہ نہ کرتی۔ برسات میں بادل کی پھواریں ہم سے ایک چھت بنوانے اور ایک سایہ دار جگہ میں بسنے کی فرمایش نہ کرتیں ——— لیکن جب ایک ایسی سوسائٹی کی تشکیل ممکن نہیں ہے اور جب یہ تمام معاشرتی ذمہ داریاں ہمارا پیچھا نہیں چھوڑ سکتیں ——— جب بھوک لگنا ناگزیر ہے جب ازدواج کا قانون سوسائٹی کو گھیرے ہے جب برادری اور سماج کے حقوق ہمارے چاروں طرف دائرہ کھینچے ہیں۔ تو پھر غور کیجئے کہ ان نظموں ان افسانوں اور ان گیتوں کے کیا معنی ہیں جو ہمارے دلوں کو گدگدا کر ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے ذوق نظر کے مطلوب کے لئے اپنا سب کچھ لٹا دیں ساری زنجیروں کو توڑ دیں۔ تمام چار دیواریوں کو پھاند کر نکل جائیں۔ اور اپنا سفر۔ آزادی کی یہ ساری تبلیغ اور قانون شکنی کے تمام مشورے کس کے لئے ہیں۔ اپنی ایک خواہش کی غلامی کے لئے ——— میں نے اپنی ایک ذلیل خواہش کے لئے اپنے سماج کی بہترین خواہشوں کو نظر انداز کرنا نہیں پسند کیا اسلئے جہاں تک ممکن ہوا محمود اور محمود

کی محبت کو ٹھکرانے۔ اور بھلانے کی کوشش کرتی رہی۔ نیچروں کو پوجتی رہی تمناؤں کو ہلاتی رہی۔ محمود نے مجھے بیوفا سمجھا۔ میری شاعرانہ قسم کی سہیلیوں نے مجھے بے مروت کہا۔ میں نے آنچل پھیلا کر ان کے طعنوں کو شکریے کے ساتھ سمیٹ لیا اور جس راہ کو اپنے لئے بہتر سمجھا اس راہ پر چل پڑی ——— بلاشبہ مجھے اس راہ پر اپنے دل کی قربانی کرنی پڑی لیکن میں نے کسی طرح قانون شکنی کو گوارا نہیں کیا۔

بہرحال میں نے جب یہ محسوس کیا کہ سوسائٹی کے رنگین مشغلے مجھے گھر سے آشرم میں چلا نہیں بیٹھنے دیتے تو میں نے ٹریجر میں پناہ لینی چاہی۔ لیکچر میں بھی جب مجھے پناہ نہ ملی۔ تو میں نے دماغ سے پوچھا کہ اپنے بدبخت اور روشنی پھینک اور راستہ دکھلا کر خدا کی یہ بندی کدھر جائے۔ کدھر جائے بھاگ کر ان گلیتوں سے جو مجھے لوریاں دیتی ہیں کدھر جائے بھاگ کر خوابوں کی اس فضا سے جہاں محبت کے لئے نیند جھک رہی ہے ——— دماغ اگرچہ اونگھ رہا تھا لیکن ابھی اسے پوری طرح نیند نہ آئی تھی اس نے جماہی لیکر کہا۔ کہیں نہ جا اپنے گھر ہی میں رہ اپنی دنیا آپ بنا ——— میں نے اپنے گھر کو اپنی دنیا سمجھ کر اسے بنانا شروع کیا اور کوشش کی اسکے دھندوں میں اپنے کو گم کردوں کھو جاؤں ———

——— اور اپنے دل کی آگ کو چولھے میں جھونک دوں۔ اور اپنے دماغ کی الجھنوں کو سوئی اور دھاگے کی رشتہ دارانہ کشمکش میں الجھا دوں۔ یہ فیصلہ کرکے۔ میں نے جہاد شروع کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خانداری کی مصروفیتوں نے مجھے بہت جلد اپنا لیا ——— یہاں تک کہ میں محمود سے زیادہ اُنکی محمود سے زیادہ ان کے متعلق سوچنے لگی۔

میرے شوہر اپنے باورچی سے نالاں تھے وہ انکی پسند کے مطابق کھانا پکا نہیں سکتا اور یہ اپنی حد سے بڑھی ہوئی مروت کی بنا پر اسکو جواب نہیں دے سکتے تھے۔ غرض ایک کشمکش کو اس طرح حل کیا کہ ان سے کہا آپ اپنے باورچی کو تو اپنا اردلی بنالیں اور اپنا باورچی خانہ باہر سے اندر منتقل کردیں۔ میں خود آپ کی مرضی کا کھانا تیار کرنے کی کوشش کرونگی کہنے لگے کہ جو کھانا آپ کی تکلیف کے بعد پلیٹوں میں آئے گا وہ میرے حلق سے اتریگا کیونکر۔ میں نے کہا۔ شاعری چھوڑیئے آپ آج صاحب بنے ہیں اور میری اور آپ کی ماں بہنیں صدیوں سے یہی کرتی آرہی ہیں اور یہی کرتی رہیں گی۔ میں بچپن سے اسکی عادی ہوں اس کے علاوہ میرے ساتھ جو دائیاں آئی ہیں وہ میرا ہاتھ بٹائینگی آپ بسم اللہ کرکے جو کہتی ہوں وہ کیجئے۔ میں گھر کی مالکہ ہوں اور یہ مسئلہ میری مملکت کے حدود میں آتا۔ آپ کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ وہ مسکرا کر خاموش ہوگئے اور میں نے باورچی خانہ گھر میں منتقل کرلیا۔ باورچی صاحب اب دن بھر ناک بھیلا کر سوہا کرتے اور بیڑی پیا کرتے۔ ان کے متعلق اب گھر کی نگرانی کے سوا کوئی خاص خدمت نہ تھی۔ میں ان کے عوض باورچی خانہ میں جلتی۔ اور اس کے باوجود انکی شکر گذار تھی کیونکہ اس جلنے میں میرے لئے سکون تھا۔ باورچی خانہ عورت کے لئے خود فراموشیوں کی ایک ایسی جنت ہے جہاں پہونچکر نہ سنگار کی ہوس رہتی ہے نہ خود آرائی کا جنون نہ بچوں کی پرورش نہ پرویسی پیا کی یاد ——— کم از کم میرا تجربہ تو یہی ہے کہ جب باورچی خانے میں ہوتی تو چولھے کی حقیقی آنچ کے سامنے محبت کی مجازی آنچ بہت کم تکلیف پہونچاتی۔ یہ خوف کہ سالن کہیں جل نہ جائے دال میں نمک کہیں تیز نہ ہوجائے۔ روٹی کہیں زیادہ تاؤ نہ کھا جائے مجھے اپنے دل سے باتیں کرنے کا بہت ہی کم موقعہ دیتا۔ اور جب دل سے باتیں موقوف ہوگئیں ——— تو اس کے ساتھ محبت کا پیچ و تاب بھی خود بخود کم ہوتا گیا۔

خانہ داری کی ان مصروفیتوں سے مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی اس لئے کہ میری پرورش ایک ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں نئی تہذیب کی روشنی "زنان خانے" تک نہیں پہونچی ہے۔ میرے اباجان نے مجھے انگریزی کی کافی تعلیم دلوانے کے ساتھ جہاں تک پردے کی پابندیوں نے اجازت دی تھی مجھے نئی تہذیب سے وشناس بھی کرادیا تھا لیکن ماحول کا اثر مجھ پر تعلیم کے اثر سے زیادہ تھا۔

(۱۰)

آپ نے تصویر کا ایک رخ دیکھ لیا ——— دیکھ لیا کہ ایک کمزور عورت نے کس طرح اپنے جذبات پر فتح پانے کی کوشش کی اب تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ ہو ——— ملاحظہ ہو کہ طاقتور مرد جس کے اعصاب میں فطرت نے غیر معمولی طاقتیں ودیعت کی ہیں کس طرح اپنے دل کی غلامی کرتا رہا ——— وہ دل کی غلامی جو اکثر اوقات مرد سے عورت کی غلامی کراتی ہے ——— یادش بخیر محمود کا یہ عقیدہ تھا کہ عشق کا درد لذتوں سے معمور ہے اور اسنے اس عقیدے میں انکو اتنا غلو تھا انکی غزلیں ہمیشہ اس خیال کی تبلیغ

کرتی رہیں لیکن تجربے نے انہیں بتایا کہ یہ عقیدہ کچھ نہ تھا مگر ایک خالص شاعری - اگر درد میں واقعی لذت ہوتی تو ہرگز دوا کی تلاش میں انہیں بازاروں کی خاک نہ چھاننی پڑتی - اپنی محبوبہ کو کھو کر اسکی جدائی کے درد میں نہ جانے ان کے لئے لذت کیوں نہ رہی کہ انہیں اس سے چھٹکارا پانے کے لئے یک گونہ بے خودی کی تلاش میں بوتل کی لال پری کو منھ لگانا پڑا ——— اور جب بربادی کی یہ پہلی منزل بآسانی طے ہوگئی - تو یہاں سے دوسری منزل کا فاصلہ ہی کتنا تھا ؎

نکلے بتاں نہ سے اور کوئے بتاں تک پہونچے

کوئے بتاں کی آبادی میں شاید ہی کوئی تنکیدہ ایسا ہوس کی چوکھٹ پر محمود کی پیشانی نے اپنے سجدہ ہائے عبودیت کے اثرات نہ چھوڑے ہوں - "دل کی دوا" بیچنے والوں کے کوٹھے میں شاید ہی کوئی شغلانہ ایسا ہو جہاں محمود کے "درد" نے درمان کی جستجو میں نقد جوانی کی کوڑیوں کے مول نہ لٹایا ہو ——— حسن کی رعنائیاں محبت کے جذبات - اور عورت کا دل بکری کی چیز ہو یا نہ ہو لیکن ہمارے مردوں کے تجربے کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ یہ چیزیں بازار میں بکتی ہیں - سونے چاندی اور جواہرات کے بھاؤ بکتی ہیں - کیمیں بکتی ہیں - اور لوگ خریدتے ہیں ——— اور خریدکے خوش ہوتے ہیں - محمود بھی اسی خریداری کا سودا لے کر اس بازار میں گئے اور ثریا کی دوکان پر پہونچکر خود بک گئے - ثریا میرے شہر کی وہ مشہور مجلس آرا عورت تھی جس کے فتوحات کا دائرہ شہر کے سرمایہ دار طبقے سے نکل کر خانقاہوں تک پہونچ گیا تھا اور ایک پیر صاحب اسکی کافر جوانی میں خدا کے جلوے دیکھنے لگے تھے - ماں تو ایک ایسی خطرناک عورت جو پہلی ہی نظر میں اپنے شکار کا سالخوردہ پیش لینے میں مشہور ہو چکی تھی محمود کی طرف متوجہ ہوئی اور محمود اسکی نظر کے حلقے میں اس بری طرح گھرے کہ عید کی نماز کے لئے اس کے کوٹھے سے نہ اترے اور گھر میں عید کے چاند کی طرح بھی نمودار نہ ہو سکے - بھائی جان کے خط سے ہمیں محمود اور ثریا کا حال معلوم ہوا - ان کے بھائی نے کچھ دیر کے لئے تو یہ باتیں چڑھائیں لیکن میرا دل کئی دن تک سینے میں اچھلتا رہا - محمود کیوں بولوں اس خبر سے میرے غرور کو ٹھیس لگی اور یہ سمجھ کر کہ ثریا مجھ سے زیادہ حسین تھی مجھے تسلی ہوئی کہ اس نے محمود کو مجھ سے چھین لیا اور محمود مجھے بھول کر اس کا ہو رہا - خود غرضی کے پاس انصاف کی آنکھیں نہیں ہوتیں - میں محمود کو بھولتی جا رہی تھی بھول جانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن جب محمود نے مجھے بھول جانے کی اپنے نقطۂ نظر سے ایک صورت پیدا کی تو وہ صورت حال میرے لئے ناگوار ثابت ہوئی اور میں تھوڑی دیر کے لئے یہ سمجھنے لگی کہ مرد کی ذات خلقی طور پر بیوفا ہوتی ہے - بہرحال میں اپنے خیالات کے ساتھ چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح بل کھاتی رہی اور جب تک محمود کو ایک زہر میں بجھا ہوا خط نہ لکھ چکی وہ زہر نہ اترا جو میرے دل سے لے کر دماغ تک چڑھا ہوا تھا -

۷۸۶

محمود میاں کو - انکی پیاری سلیمہ کا سلام پہونچے - پھلے پھولے اور خوش رہنے کی دعاؤں کے ساتھ ——— گھروندے کی محبت اور پھلی زندگی کے تصورات کے ساتھ ——— جو اب ڈھلتی رات کے چراغ کی طرح گل ہونے جا رہی ہیں - موجودہ "مشاغل لطیف" میں ان کے "احساس کامیابی" پر مبارکباد کے مخلصانہ جذبات کے ساتھ - - - ——— محمود میاں کو انکی پیاری سلیمہ کا سلام پہونچے - محمود میاں! خدا مبارک کرے آپ اپنے حال سے خوش اور ماضی کی طرف مڑکر نہیں دیکھتے - میرے لئے اس سے زیادہ خوشی اور کیا ہو سکتی ہے - آپ کا کینہ آپ کی موجودہ زندگی سے مطمئن نہیں لیکن میں بہرحال مطمئن ہوں - "بھوک" کسی قسم کی کیوں نہ ہو "غذا" کی تلاش اس کے لئے ناگزیر ہے - آپ بھوکے تھے آپ کی بھوک نے پہلے گھر میں اپنے لئے غذا تلاش کی - میں سامنے تھی لیکن میری خود داری نے آپ کا لقمہ بننا گوارا نہ کیا - اور ظاہر ہے جب گھر میں کھانا نہیں مل سکتا تو بازار کا کھانا کھانے میں کون سا حرج ہے - دل کی بھوک بھی آخر بھوک ہے اور نفس کی پیاس بھی آخر پیاس ہے - اسکو بجھانا یا بجھانے کی کوشش کرنا کوئی اخلاقی جرم کیوں ہو ایک پیاسے کیلئے جو بہت زیادہ پیاسا ہو یہ سوال کبھی نہیں پیدا ہوتا کہ چشمہ گدلا ہے یا کنوئیں کے پانی میں مگرمچھ کے کیڑے ہیں - آپ کی تشنگی نے بھی اگر آپ کو ایک ایسے گھاٹ پر پہونچا دیا جس کا پانی خالص نہیں تھا تو دنیا آپ پر کیوں طعنہ زن ہو - پیاس بجھ جانے پر آپ کی آنکھیں خود کھل جائیں گی اور آپ کا فاقہ کروے اور میٹھے پانی میں خود تمیز کرنے لگے گا - جوانی کی نیند جھنجھوڑنے اور عقل جگانے سے نہیں ہوتی آپ کے بھائی نے مجھے ہدایت کی ہے کہ آپ کو ایک واعظانہ خط لکھ کر آپ سے زندگی کے تشیب و فراز پر غور کرنے کی فرمائش کروں - لیکن میرے خیال میں آپ جو زندگی آج کل بسر کر رہے ہیں اسپر غور کرنا ایک غیر شاعرانہ حرکت ہے - آپ شاعر ہیں اور زندگی کے متعلق شاعر کا نقطۂ نگاہ ہمیشہ یہی رہا ہے ——— کہ ؎

دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند
آزاد اگر عقل بیش غم روزگار بیش

پھر آپ حالات کی ان شیریں بیلوں میں جب کہ زندگی کا ہر گھونٹ شہد سے زیادہ میٹھا ہے ——— عقل کا مصرف کیوں لیں ——— اور عقل کا مصرف لے کر زندگی کے کسی ایک میٹھے کو بھی تلخ کام کیوں بنائیں یہ دیکھ کر کہ ثریا کے حسن کی جگمگاتی ہوئی روشنی نے میرے حسن کے نقوش کو آتشیں داغ سے محو کر دیا۔ میرے غرور کو تھوڑی سی چوٹ لگتی ہے لیکن جب یہ غور کرتی ہوں تو چوٹ کا احساس جاتا رہتا ہے کہ آپ شاعر ہیں اور شاعر ذات کا نہیں صفت کا پرستار ہوتا ہے۔ آپ کو میری آنکھوں کا نشیلا پن اور پلکوں کے نیچے کی طرف غیر معمولی جھکاؤ بہت پسند تھا۔ لیکن یہ جھکاؤ یہ نشیلا پن دنیا کی اور بہت سی آنکھوں میں ممکن ہے پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ آپ کا دو تین نظر میری ہی آنکھوں کے تصور کو پوجتا رہتا۔ حسن و عشق کی دنیا میں شاعر بلبل کا مقلد اور مسل کا حال یہ ہے کہ وہ کسی ایک پھول کی پابند نہیں وہ ہر پھول پر گھونگھنی مارتی ہے ہر شاخ پر ڈورے ڈالتی ہے۔ ہر کلی سے رس چوستی ہے۔ جب وہ مجرم نہیں تو شاعر کیوں مجرم ہو اور آپ کیوں مجرم ہوں۔

اب رہا یہ سوال کہ آپ ہمیشہ سے عشق کو ایک لازوال حقیقت سمجھتے آئے تھے تو یہ آپ کے فکر خامی اور تجربے کی بے مائگی تھی اور آپ کی ناتجربہ کاری کو کیوں قصوروار کیا جائے جب رومی عرفی اور غالب جیسے متفکر شاعر اس مسئلے پر غور کرتے ہوئے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے تھے اپنے پہلے خط میں آپ سے گذارش کی تھی کہ آپ جلد سے جلد اپنی زندگی کا خضر رفیق ڈھونڈ لیں لیکن اب سمجھتی ہوں کہ وہ تجویز سراسر غلط تھی اس لئے کہ آپ کے جیسی بے چین طبیعت والوں کے لئے "عمر خیامانہ" زندگی بہت موزوں ہے ——— جو خود پابند نہیں رہ سکتا اسے کیا حق حاصل ہے کہ دوسرے کو اپنا پابند کرے ———

کسی کا ہو رہے آتش کسی کو کر رکھے
دوزخ عمر کو انسان رائیگاں نہ کرے

لیکن آتش کا یہ پیام صرف ان کے لئے ہے جو کسی کے ہو کر رہ سکتے ہیں ورنہ بیکار کسی کو گرفتار کھنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ اپنی ثریا کے ساتھ خوش رہئے ثریا نہ سہی زہرا سہی مشتری سہی مریخ سہی آنکھوں کو مطلب تو بس روشنی سے ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ آپ برباد ہو رہی ہیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ کام آ رہی ہیں۔ کسی کے نہیں تو ثریا کے کام آ رہی ہیں ثریا اور اس کی بہنیں بھی آخر ملک کی بیٹیاں ہیں آپ جیسے خوش ذوق اور منچلے نوجوان اگر ملک میں نہ ہوں گے تو ملک کی وہ بیٹیاں جو شکار کے خون پر پلتی ہیں ان کے لئے شکار کہاں سے آئیں گے۔ جب تمدن اور سوسائٹی کا فیصلہ یہ ہے کہ ملک کی کچھ عورتیں حسن فروشی کی دوکانیں کھول بیٹھیں اور اسی کی روٹی کھائیں۔ تو جو لوگ برباد ہو کر انہی روٹی مہیا کر رہے ہیں انہیں برباد کہنا نہیں چاہئے۔ یہ ملک کی ایک اقتصادی خدمت ہے اور خدا مبارک کرے کہ آپ اس خدمت میں بہت پیش پیش ہیں۔ زیادہ دعائے خیر۔ اپنی ثریا کو میرا سلام کہئے اور خوش رہئے لیکن کبھی کبھی یہ بھی یاد کر لیا کیجئے کہ۔ ع

فراق میں ترے کوئی بچا بھی تھا
کسی زمانے میں

آپ کی
سلیمہ

خط کے جواب کا انتظار رہا ——— دوسرے ہفتے میں جواب آیا لیکن کس طرح میرا خط واپس کر دیا گیا تھا صرف اسکی پشت پر مہتاب کا یہ قطعہ تھا اور بس ؎

فریفتہ تجھے عالم کے رنگ و بو نے کیا
بڑا ستم تیرے ملنے کی آرزو نے کیا

(۱۱)

میری داستان میرے شوہر کے بغیر نامکمل ہے ——— اسلئے آیئے آج انکا تعارف آپ لوگوں سے کرا دیا جائے تندرست ہاتھ پاؤں لمبا قد متناسب خط و خال کا ایک معمولی آدمی، فطرت نے جس کے چہرے کی بناوٹ میں زیادہ فیاضی سے کام نہ لیا ہو ——— سر بڑا مگر پیشانی چھوٹی۔ آنکھیں سیاہ اور بڑی لیکن کیفیت سے خالی ——— مونچھیں خوبصورت مگر ناک بدنما ——— یہ تھا میرے شوہر ڈاکٹر حامد حسن بیرسٹر کا حلیہ ظاہری ——— اب رہی خصائل باطنی سوانحی طبیعت کا آدمی میری برادری میں تو کوئی نہ تھا خدا کی اس لمبی چوڑی دنیا میں ہو تو مجھے انکار نہیں ——— ایک انیسی طبیعت کا آدمی جس نے زندگی میں ایک بار بھی کسی حاجت مند کے سوال کا نفی میں جواب نہ دیا ہو۔ جو دوسروں کے حقوق کا لحاظ رکھنے میں اس درجہ فیاض ہو کہ اپنی شخصیت کو بھول جاتا ہو۔ جس کے نوکروں کو

یہ حسرت رہ گئی ہو کہ انکا مالک ایک بار بھی ان سے جھڑک کر گفتگو کرتا جس کی بیوی کو یہ ارمان رہ گیا ہو کہ ازدواجی زندگی کے دس سالوں میں ایک بار بھی اسکی تیوریاں چڑھی ہوئی دیکھتی ——— جس نے جاڑے کی سرد رات میں اپنا لحاف ایک سردی سے کانپتے ہوئے فقیر کو دیدیا ہو اور خود ساری رات اور کوٹ اوڑھ کر بسر کی ہو۔ جس نے عید کے دن اپنے بچوں کو ایک غریب بے وسیلہ کے یہاں بھیجتے ہوئے ان کے قیمتی کپڑے اس لئے اتار لئے ہوں کہ انکا ہائس دیکھ کر اس گھر کے بچوں کا غم وہ دل اور کڑھے گا ——— جو اپنی بذلہ سنجی کے لئے اس درجہ مشہور ہو کہ بغیر اس کے شہر کی محفلیں ہمیشہ سنسان سمجھی گئی ہوں جسکی علمی قابلیتوں کا یہ حال ہو کہ مورخوں میں مورخ۔ شاعروں میں شاعر اور فلسفیوں میں فلسفی بن جاتا ہو جس نے ملک کے سیاسی ہنگاموں میں حصہ لیا ہو اور اپنی پالیسی پر سختی سے قائم رہنے کے باوجود اپنی خوش طبعی سے تمام مختلف الخیال جماعتوں کا محبوب بنا رہا ہو۔

اس مزاج، اس طبیعت اور اس صلاحیت کا آدمی

یقیناً پوجنے کی چیز تھا ——— لیکن جیسا کہ خود انکا بیان تھا کہ ہندوستان سے لیکر یورپ تک کسی عورت نے انکی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا صرف اس لئے کہ وہ حسین نہ تھا اس کے چہرے میں کوئی جاذبیت نہ تھی ——— نہ جانے تمدن نے زمانے کی نظر کو اتنا سطحی پرست کیوں بنا دیا کہ اُسے جلد اور ہڈیوں سے نیچے کی حقیقتیں سوجھائی نہیں دیتیں۔ لیکن مجھے دوسروں پر اعتراض کرنے کا کیا حق حاصل ہے جبکہ میں خود ان کے ساتھ پرستش کا حق ادا نہ کر سکی اور پھر بھی ان کے قدموں پر ہر ان کے بھائی کی یاد کو پوجتی رہی میری رخصتی کا تیسرا دن تھا ——— وہ آئینے کے سامنے کھڑے شیروانی کے بٹن لگا رہے تھے میں پیچھے سے آئی آئینے پر میرا عکس پڑا کہنے لگے کہ "قسمت کے مذاق بھی عجیب ہوتے ہیں میرے جیسے عجیب الخلقت حیوان کو دیکھو اور پھر اس کے سامنے کو دیکھو جو صرف سونگھنے کی چیز ہو" ——— "تو پھر چھوتے کیوں ہیں؟" میں نے مسکرا کر کہا۔ کہنے لگے کہ "چھوئے بغیر رہا بھی نہیں جاتا" یہ کہہ کر آئینے میں اپنی صورت کو دیکھا پھر مجھے دیکھا اور ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ جس میں تاسف کا حصہ بہ نسبت خوش دلی کے زیادہ ہو۔ کہنے لگے "لوگوں نے تمہارا اور ہمارا رشتہ جوڑ کر تمہارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ کم از کم تمہارے حسن کے ساتھ تو بڑی ہی ناانصافی کی گئی۔ میرا اور تمہارا جوڑ سوسائٹی کی ایک ایسی غیر شاعرانہ حرکت ہے جس پر توضیح کی صفحت اور تناسب کا لفظ ہمیشہ ماتم کریگا" یہ چند جملے غالباً انھوں نے اس توقع سے کہے تھے کہ میں اخلاقاً ہی ان کے اس بیجا نہ اعتراف کی تردید کر کے ان کے دل کا بوجھ ہلکا کر دونگی ——— لیکن اسوقت میرے دماغ پر میاں محمود بری طرح مسلط تھے ——— میں صرف ہنسی اور مسکرا چپ ہو گئی اور انھوں نے ایک مرجھائے ہوئے تبسم کے ساتھ مجھے دیکھا اور باہر چلے گئے ——— بات ختم ہو گئی لیکن تجربے کی روشنی میں جب مجھے انکی اصلی شکل نظر آئی تو میں نے خود ایک دن چھیڑ کر یہی ذکر نکالا اور پیار سے جو بلاشبہ مصنوعی تھا۔ ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا "جی نہیں یہ آپ کا انکسار ہے۔ میرے لئے آپ سے زیادہ موزوں شوہر ممکن ہی نہ تھا ——— دنیا کی ہر عورت یہاں تک کہ دنیا کی سب سے بڑی عورت مسز سروجنی نائڈو بھی اگر حسن اتفاق سے آپ کی بیوی بن گئی ہوتیں تو آپ کی روح کی خوبصورتی دیکھ کر آپ کی لونڈی بن جاتیں ——— ہمیشہ کے لئے ——— رہا یہ کہ آپ اپنے کو خوبصورت نہیں سمجھتے تو یہ بھی آپ کی آنکھوں کا قصور ہے میرا معیار حسن آپ کے اس خیال کی تائید نہیں کرتا" بہت ہنسے بہت ہنسے اور بہت ہنسنے کی کوشش کی لیکن اس دن کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ کوئی چیز تھا جو میری اس گفتگو نے ان کے دل سے سرکا دیا ——— وہ پہلے سے زیادہ خوش نظر آنے لگے اور ان کے پیار میں جو ایک خاص قسم کی سردی تھی جسے میرے رخساروں نے اکثر محسوس کیا تھا وہ اس دن کے بعد گرمجوشی سے بدل گئی۔ میں سمجھتی ہوں کہ کوئی شخص بھی کسی مرتبہ کا کیوں نہ ہو اگر حساس ہے تو کسی حسین عورت سے اس وقت تک محبت کا مطالبہ نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ خود اپنے میں عورت کے لئے کوئی کشش محسوس نہ کرتا ہو ——— گو دنیا میں بہ خود غلط لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے لیکن ایسے لوگوں میں یا تو خود شناسی کا مادہ ہی سرے سے مفقود ہوتا ہے یا پھر یہ کہ انکا آئینہ ان سے جھوٹ بولا کرتا ہو۔ یا یہ کہ وہ دولتمند ہوں اور دولتمندی کو اپنے زعم میں سب سے بڑی خوبصورتی سمجھتے ہوں ——— یا پھر یہ کہ شاعر یا انشا پرداز فلسفی یا حکیم ہو کر اس دھوکے میں مبتلا ہوں کہ انکا علمی اور ادبی وقار عورت کو مرعوب کر لے گا۔ حالانکہ عورت کا دل ان چیزوں سے نہ مرعوب ہو سکتا ہے نہ متاثر۔ تمدن نے ابتدا ہی سے اُسے "تنگ چوٹی" میں مبتلا کر کے ظاہر پرستی" اور "سطح پروری" کو اسکی فطرت ثانیہ بنا دیا ہے ——— ظاہر ہے کہ وہ عورت جو ہاتھوں کو بقول غالب "مرہون حنا" اور گالوں

کو "رہن خانہ" کر چکی ہو اسکی نظر کی پہونچ اگر ہوئی تو کتنی؟ ——— بہرکیف یہ سطح پرستی کچھ ہم عورتوں ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہمارے مرد اس معاملے میں ہم سے کہیں زیادہ کمزور ہیں ———

ہمارے قدیم و جدید لٹریچر جنہیں ہمارے جذبات لطیفہ کی تاریخ کہنا چاہئے ہمیں کہتے ہیں کہ عشق کے بازار میں "دل کا سودا" ہمیشہ اسی قیمت پر بکتا رہا۔ سلیمہ اگر اپنے شوہر حامد سے باوجود اس کی بہت سی نفسیاتی خوبیوں کے محبت نہ کر سکی تو سوسائٹی اسے کیوں گنہگار سمجھے جبکہ آپ کے آغوش میں ہمیشہ سے رنگ و روغن کی پوجا ہو رہی ہے۔ اور اس کے متعلمین بھی ہمیشہ سے اسی رنگ و روغن کو اپنی بصیرت کا سرمایہ سمجھتے آئے ہیں اور اسی خط و خال میں حقیقت کے خط و خال دیکھتے آئے ہیں

(۱۲)

ہاں تو میں انکا ذکر کر رہی تھی ——— پچھلی سطروں میں آپ ان کے حلیہ ظاہری اور باطنی سے واقف ہو چکے اب رہے انکے خیالات تو فلسفے کی باقاعدہ تعلیم اور یورپ کے سہ سالہ قیام نے انکے اخلاقی اور معاشرتی نظریوں کو بہت کچھ تبدیل کر دیا تھا۔ گو عورتوں نے کبھی انکو اس کا موقعہ نہ دیا تھا کہ وہ ان سے دلچسپی لے سکیں، تاہم وہ حقوق نسواں کی حمایت اس گرمجوشی سے کیا کرتے کہ سمجھنے والا یہ سمجھتا کہ عورت کے دل کی نبض ہمیشہ اس شخص کی انگلیوں کے نیچے رہی ہے ——— ایک دن میں رسالہ عصمت کے لئے ایک مضمون لیکر گئی تھی۔ مضمون کے نیچے میرے دستخط تھے (سلیمہ حامد حسن)۔ کہنے لگے "یہ سلیمہ حامد حسن کیا بلا ہے۔ کیا تم میری ملکیت ہو کہ تمہاری شخصیت پر میرے نام کا لیبل ضروری ہو۔ یہ رواج ہی یورپ کے اس عہد جہالت کا جب وہاں عورت ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ شادی سے پہلے باپ کی اور شادی کے بعد شوہر کی۔ عورت باپ کی ملک ہو تو ہو شوہر کی تو کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ شادی معاشرتی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ ایک ٹھیکا ہے۔ ایک مفاہمت ہے، ایک معاہدہ ہے جیسا کہ عام طور پر دو فریقوں میں ہوا کرتا ہے" میں مسکرا کر چپ ہو گئی۔ اور انھوں نے قلم اٹھا کر اپنا نام کاٹ دیا

ایک دن ہندوستانی عورت کے مستقبل پر گفتگو ہو رہی تھی۔ کہنے لگے کہ کامنی (وہ مجھے پیار سے اکثر کامنی کہا کرتے تھے) اگر میں کسی دوسری عورت کا ہو جاؤں تو تم کیا کرو گی؟ میں نے کہا کہ گھر میں بیٹھی میرے نام کی تسبیح پڑھتی رہوں۔ میں نے کہا۔ بھارت کی بیٹیوں کا تو دھرم ہی یہی ہے "دھرم یہی ہے" (میرا منہ چڑھا کر بولے) یہی وہ بڑھاوے ہیں جنہوں نے عورت کے غرور کو جھوٹی آسودگی دے کر اس کے جذباتی حقوق غصب کر لئے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ جذباتی حقوق کیا بلا ہیں؟ جھنجھلا کر بولے پہلو میں دل اگر بالکل مردہ نہ ہو گیا ہو اور تمہاری بدبخت معاشرت نے اسے بالکل ماؤف نہ کر ڈالا ہو۔ تو اس سے پوچھو، میں نے کہا کہ وہ تو آپ کے جوتوں کے نیچے کچلا پڑا ہے۔ گھبرائیے نہیں آپ نے نہیں کچلا، میں نے خود اسے آپ کے جوتوں کے نیچے رکھ دیا ہے۔ ہندوستان کی بیٹیوں کا مذہب ہی یہی ہے۔ اسکے جواب میں وہ مسکرائے اور پھر ایک ذرا تیور کو سنجیدہ بنا کر بولے تو کیا اسی اخلاقی کمزوری کا نام آپ کے لغت میں وفا ہے۔ پٹکا کہ آپکی اس وفا پر ——— وہ عورت کاہے کو ہے مٹی کا ڈھیر ہے۔ جو جوتے کھاتی رہے اور منکھے کی ڈنڈی کی بھی جوتوں کا جواب نہ دے۔ شوہر ایک چھوڑ دس عورتوں سے بیک وقت کھیلتا رہے اور آپ شوہر پرستی کا دائرہ کھینچ کر وفا کا منتر پڑھتی رہیں نعوذ باللہ یہ شوہر پرستی نہیں ہے۔ جذبات کا افلاس ہے۔ دماغ کی موت ہے۔ ارادوں کا اضمحلال ہے۔ میں تو تم میں یہ جذبہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اگر میں پیمان وفا کو توڑ کر کسی دوسری عورت کے پہلو میں جا سوؤں تو تم بھی میرے جذبۂ رشک کو سزا دینے کے خیال ہی سے سہی ——— دوسرے کے آغوش میں جا بیٹھو ——— میں نے کہا بس بس اپنا فلسفہ رہنے دیجئے۔ برائی کی تنقید کسی حالت میں اچھائی نہیں بن سکتی اور پھر یہ کہ برائی سے برائی کا علاج بھی ممکن نہیں۔ کہنے لگے بالکل نہیں کامنی لیکن ذرا غور تو کرو کہ یہ کیسی کڑوی حقیقت ہے۔ فرض کر دو کہ میں آوارہ ہو جاؤں اور تم میری آوارگی کے باوجود مجھ سے محبت کرتی رہو تو کیا دنیا نہیں دیوی نہیں کہے گی اور تمہارے اس اسوۂ حسنہ کو دوسری عورتوں کے سامنے بطور نمونۂ تقلید پیش نہ کیا جائے گا۔ لیکن پھر اسی کے ساتھ ایسا کیوں ہو کہ اگر تم بدچلن ہو جاؤ اور میں تمہاری بدچلنی کے باوجود تمہیں چاہتا رہوں تو مجھے دیویوں کے لقب سے پکارا جائے اور سوسائٹی کی زبانیں اجتماعی حیثیت سے مجھ پر ملامت کی بوچھار کریں۔ آخر کیوں؟ وفا اگر بجائے خود کوئی قابل احترام جذبہ ہے تو کیوں نہ مرد کی وفا کی بھی اسی طرح قدر کی جائے۔ یہ کیسی کھلی ہوئی ناانصافی ہے سوسائٹی کی تم عورتوں کے ساتھ۔ کیا اس کھلی ہوئی ناانصافی کے لئے تمہاری روح میں بغاوت کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ تم یہ سمجھتی ہو کہ عورت کے جذباتی حقوق کیا ہیں۔ وہی جو مرد کو ہر حال میں حاصل ہیں۔ جذبۂ شوق ہو یا جذبۂ رشک۔ تعدد پسندی ہو یا اندرت پرستی عورت اور مرد دونوں ان فطری جذبات و خواہشات میں مساوی حصہ دار ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے

کہ مرد کے ان جذبات کا تو احترام کیا جائے اور عورت کی ان خواہشوں کے ساتھ مطلق رواداری جائز نہ رکھی جائے۔ آج دنیا کی تعلیم یافتہ عورتیں ہر ملک میں اپنے حقوق کی نوحہ خوانی کر رہی ہیں۔ حالانکہ انہیں خود خبر نہیں کہ انکے حقوق واقعی کیا ہیں۔ سیاسی حقوق حاصل کرکے وہ کیا کرلیں گی ——— جب تک کہ انہیں ہماری طرح جذبات کی پیاس تجھانے کی آزادی نہ مل جائے۔ میں تو یہی سمجھونگا کہ وہ سابق بدستور مردوں کی لونڈیاں ہیں ——— تقدیر کو کہاں تک پہنچا کے وہ خاموش ہوگئے۔ اور میری طرف جواب طلب تیوروں سے دیکھنے لگے۔ میں نے کہا صاحب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عورتوں کو مردوں کی طرح آزاد کردینے کی ایسی کیا ضرورت ہے۔ کیوں نہ ہم مردوں کو بھی عورتوں ہی کی طرح پابند کردیا جائے۔ کیا ماتحود اختیاری۔ دوسرے لفظوں میں فیوڈ پرستی۔ متمدن دنیا کیلئے اگر کسی حیثیت سے ضروری ہے تو کیوں نہ عورتوں کی طرح مرد بھی اسے اختیار کرلیں

ذرا غور تو کیجئے کہ نظام معاشرت کی بقا اور تمدن نفس میں ہے یا اس آزادئ نفس میں۔ نئی تہذیب جس کا خواب دیکھ رہی ہے ——— میرا یہ کہنا تھا کہ وہ کچھ سوچنے لگے۔ کھوگئے ——— اور بڑی دیر تک کھوئے رہے یہاں تک کہ گھڑی نے بارہ کا گجر بجایا اور میں نے دوپہر کے کھانے کیلئے انہیں چونکایا ——— چونکے اور مسکرا کر کہنے لگے۔ کامنی! تم جیتیں اور میں ہارا۔ بیشک عورتوں کو مردوں کی طرح خود مختار یا مطلق العنان کردینے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ضرورت اسکی ہے کہ عورتوں کی طرح مرد بھی اپنے نفس کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لیں عورتوں کی طرح مردوں کے جذبات اور جنسی میلانات پر بھی قانون کا پہرہ بٹھلا دیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ یہ ہے کہ مرد خود ان مراعات سے دستبردار ہو جائیں جو تمدن قدیم نے انہیں نا انصافی سے دے رکھے ہیں۔ سماج کی خیریت بلاشبہ اسی میں ہے

ہماری تہذیب جو بھی کروٹ لے لیکن تمدن کے لئے بہرحال ایک "فلسفہ اخلاق" کی ضرورت ناگزیر ہے ——— ورنہ حکومت کا قانون آخر کس بنیاد پر کھڑا ہوگا ——— اس کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب تک ہمارے معاشرتی میلانات میں تبدیلی نہیں ہوتی اسوقت تک ایک "اخلاق جنسی" کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ——— میرا دماغ تمہاری دی ہوئی روشنی کا شکوہ ہے ——— میں ہنسی اور میری ہنسی ایک فاتحانہ ہنسی تھی لیکن حیرت ہے کہ وہ اس بحث میں اپنی شکست پر مجھ سے کم خوش نہ تھے، کھانا کھاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ تم نے میرے دماغ میں ایک نئی کھڑکی کھولدی

(۱۳)

میرے خط کی پشت پر محمود نے مہتاب کا جو شعر لکھدیا تھا اس نے میرے دماغی ہیجان کو ایک بڑی حد تک سکون سے بدل کر میری خودی کے لئے تھوڑی سی غذا مہیا کردی اور میں یہ سمجھنے لگی کہ "محمود شریا کے گھر میں بھی میرا ہے" ——— لیکن اس خیال کیساتھ دل کا وہ زخم جو موسم کی ناموافقت سے کچھ مرجھا گیا تھا پھر رسنے لگا۔ چپکے چپکے رسنے لگا۔ میں نے بھی اسے رسنے کے لئے چھوڑ دیا ——— اور حسب معمول اسکی ناز برداری کے ساتھ خانگی زندگی کی ناز برداریاں بھی کرتی رہی ——— یہاں تک کہ میری شادی کا دوسرا سال شروع ہوا اور مجھے ایک بچے کی ماں بننے کی سعادت حاصل ہوئی ——— یہ زندگی کی وہ منزل ہوتی ہے جہاں پہونچکر ایک "معتدل عورت" کے کانوں کو زیوروں کی جھنکار سے زیادہ کھلونوں کی جھنجھناہٹ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اولاد کی نسبت ماں کے جذبات کی فاتح ہے اس کے تمام مشاغل اور اس کے تمام ہنگامات کی فاتح ہے ——— اس کے پورے وجود کی فاتح ہے

میرے فاتح نے بھی میری مملکت کے حدود میں قدم رکھتے ہی پہلی فتح میری اس ذہنی کشمکش پر حاصل کی جس کا تعلق محمود کی یاد سے تھا۔ اور اس کے بعد فتوحات کا سلسلہ شروع ہوگیا ——— یہاں تک کہ میں خانہ داری کے دھندوں کے لئے باقی نہ رہی۔ اپنے شوہر کی ناز برداریوں کے لئے باقی نہ رہی اپنی کتابوں اور اپنی سہیلیوں کے لئے باقی نہ رہی ——— انتہا ہوگئی کہ بعض اوقات نمازیں بھی چھوٹ گئیں اور مجھے اکثر و بیشتر اپنے خدا سے بھی فرصت لینی پڑی ——— ایسے عالم میں جبکہ میری زندگی میں خدا کی گنجایش بھی مشکل سے ہو محمود کی یاد کس منہ سے آتی ——— اور اگر آتی تو "نمبر ۱۰" کی ایک چمچ سنگر پر سے ہٹ جاتی۔ مختصر یہ کہ اس دوران میں محمود اپنی شریا سے مشغول رہے۔ اور میں اپنے اس کھلونے سے کھیلتی رہی جذبات کا طوفان جو بڑے زور شور سے اٹھا تھا خود بخود سو گیا

دریا نے بہاؤ کا رخ بدل دیا ——— اور زندگی اپنی طبعی حالت پر چل پڑی

ایک سال اور گذر گیا اور میں نے میکے جانے کا نام نہ لیا

بچے کی ولادت سے کچھ دن پہلے میری ساس کلکتہ آئیں اور سال بھر تک میرے ساتھ رہیں - جب جانے لگیں تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلنے پر مصر ہوئیں - وہ پوتے سے الگ ہونا نہیں چاہتی تھیں اور ان کے صاحبزادے بیوی سے جدائی گوارا نہیں کرسکتے تھے - ہفتوں کشاکش رہی نتیجہ وہی ہوا جو ایسی حالتوں میں ہوا کرتا ہے - ماں کی ضد نے بیٹے کی حیلہ سازیوں پر فتح پائی اور میں پورے دو سال کے بعد بادل ناخواستہ وطن چلی ——

بادل ناخواستہ اس لئے کہ محمود کی مصیبت میرے خیال میں میرے خیر مقدم کے لئے وہاں چشم براہ تھی - اور مجھے اندیشہ تھا کہ اس سے آنکھیں چار ہوتے ہی میرا احساس فرض نہیں مضمحل ہوجائے

راستے بھر اسی ادھیڑبن رہی لیکن گھر پہونچتے ہی یہ خوشخبری سنی کہ محمود شہر میں موجود نہیں ہیں - بمبئی کی ایک ایکسپورٹ کمپنی کے لئے شرما کے یہاں آکر ٹھہری تھی - جاتے ہوئے اس نے ثریا کی مہماں نوازیوں کا یہ صلہ دیا کہ اس کے محمود کو اس سے متعین کرانے ساتھ لیتی گئی —— یہ خبر سنکر مجھے مطمئن ہوجانا چاہئے تھا لیکن میں مطمئن ہونے کی جگہ مضمحل ہوگئی - یہ معلوم کرکے مضمحل ہوگئی کہ دو سال کے بعد محمود سے ملنے کے جو امکانات تھے وہ ختم ہوگئے آپ کو حیرت ہوگی اور ہونی بھی چاہئے کہ گھر پہونچنے سے چند گھنٹے پہلے میرے حواس اس تصور سے پراگندہ تھے کہ "محمود سے ملاقات ہوگی تو کیا ہوگا" لیکن جب وہ نہ ملا اور اس سے ملنے کا جو اندیشہ تھا وہ باقی نہ رہا تو دل اس حالت پر بھی قناعت نہ کرسکا - اور خواہ مخواہ کڑھنے لگا - یہ سوال نہ کیجئے کہ کیوں کڑھنے لگا کڑھنا تو اسکی طبیعت ہی بن گئی تھی داد دیجئے اس عورت کی جو سینے میں ایسا شریر دل رکھ کر بھی فرض کے راستے پر تھوڑی دور چل سکی نفسیات محبت کی گتھیاں سلجھانے میں میں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ صرف کیا زندگی کے شیریں ترین لمحے اس کوشش میں ضائع کئے اور آج تک یہ سمجھ نہ سکی کہ یہ بدبخت دل جس چیز سے بھاگتا ہے پھر اسی چیز کو ڈھونڈتا کیوں ہے —— جسے پسند کرتا ہے اسے پیار کیوں نہیں کرسکتا اور جسے پسند نہیں کرتا اسکی جدائی میں سوگوار کیوں رہتا ہے —— جو چاہتا ہے اس کے کرنے پر قادر کیوں نہیں اور جو نہیں چاہتا اسے ساختہ کیوں کر ہمیشہ کیوں نہ ہے - آج بھی جب اپنی گذری ہوئی زندگی کے اوراق الٹتی ہوں تو ایسی کتنی ہی فراوانی ہر کتنیں کتنے ہی غیر شعوری افعال میرے سامنے آتے ہیں اور مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا —— ؟ میں ان میں سے ایک کا بھی جواب نہیں دے سکتی - سوچتی ہوں اور پچھتاتی ہوں - میں شاید اس وقت تو عمر بھر نہیں بھول سکتی جب میں نے پہلی بار اپنے شوہر کے ساتھ کلکتے کا سفر کیا تھا اور محمود ہم لوگوں کو رخصت کرنے کے لئے اسٹیشن تک آئے تھے - رخصتی کی صبر آزما گھڑیوں اور انکی بے پناہیوں کو میں جانتی تھی - اس لئے میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ محمود کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھوں گی مجھے خوف تھا میں ڈر رہی تھی کہ اس کا سہما ہوا چہرہ دیکھ کر میرا احساس فرض شکست نہ کھا جائے میں گھر سے چلی اسٹیشن پر پہونچی اسٹیشن سے پلیٹ فارم اور پلیٹ فارم سے ٹرین تک کا فاصلہ طے کیا - لیکن اس عرصے میں ایک لمحے کے لئے بھی میرے ارادے میں ضعف نہ آیا محمود برابر میرے ساتھ رہا اور میری آنکھیں برابر جھکی رہیں جھکی رہیں - یہاں تک کہ گاڑی نے روانگی کی سیٹی دی ڈبے کی سامنے والی کھڑکیاں بند تھیں اور میں انکی آڑ میں سہمی بیٹھی تھی —— انجن کی سیٹی میں نہ جانے کون سی قوت تھی جس نے میرے ہاتھوں سے میرے سامنے کی کھڑکی گروادی ٹرین پلیٹ فارم کو چھوڑ رہی تھی —— اور میری خوددار نگاہیں محمود کی بے حس نگاہوں سے گلے مل رہی تھیں دل سے پوچھتی ہوں کہ ایسا کیوں ہوا؟ بس اس کے سوا کوئی جواب نہیں ملتا کہ یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے —— حافظے سے پوچھتی ہوں تو وہ کہتا ہے کہ جب ٹرین نے سیٹی دی تو دفعتاً اندر سے ایک فریاد نکلی کہ اے بدبخت! محمود سے بچھڑ رہی ہے اور شاید ہمیشہ کے لئے بچھڑ رہی ہے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو - رخصت کی آخری گھڑیوں میں تو ایک بار اسکی صورت دیکھ لے' یہ پکار سنتے ہی دل نے پوری طاقت سے دماغ پر حملہ کیا —— زنجیریں ٹوٹ گئیں اور اعصاب قابو سے باہر ہوگئے —— اور ہاتھ نے بے ساختہ کھڑکی کی طرف بڑھ کر وہ جرات کی جو ایک پردہ نشیں عورت سے عام حالات میں ممکن نہیں

بہرحال یہ میرا تجربہ ہے ایک ایسی عورت کا تجربہ جو زندگی کی چوتھی دوپہر سے عمر کی ڈھلتی چھاؤں تک اپنی خواہشوں کے خلاف جہاد کرتی رہی ہو —— یقین کیجئے —— کہ اعصاب پر جذبات سے مغلوب اعصاب پر عزم کا پہرہ بہت دیر تک نہیں

بٹھلایا جا سکتا۔ خواہشیں دل میں ایک مرتبہ پیدا ہو کر پھر کبھی نہیں مرتیں۔ ہاں ضبطِ نفس کے حملوں سے مرعوب ہو کر بھیس بدل لیتی ہیں۔ نقاب اوڑھ لیتی ہیں اور ان نفسیاتی لمحوں کا انتظار کرتی ہیں جب قوتِ فیصلہ حالات سے متاثر ہو اور عقل کا چراغ آندھیوں میں جھلملانے لگے ـــــ جب وہ نفسیاتی لمحے آجاتے ہیں تو فطرت کی یہ بے پناہ قوت نقاب الٹ دیتی ہے۔ کیچلی اتار پھینکتی ہے اور اپنی پوری طاقت سے ہم پر حملہ کرتی ہے۔ ڈرتا چاہتے ان لمحوں سے جب محبت پر ہیزگاری کا بھیس بدلے اور گناہ کا لبادہ اوڑھے میرا جی کلکتہ میں کتنی مرتبہ گھر والوں سے ملنے کے لئے کڑھا لیکن گھر آکر معلوم ہوا کہ وہ گھر والوں کی یاد نہ تھی محمود سے ملنے کی خواہش تھی جو بھیس بدلے ہوئی تھی۔

بہرحال ملال کی وہ کیفیت جو محمود کے لمبی چلے جانے کی خبر سے مجھ پر طاری ہوئی تھی۔ بہت دیر تک باقی نہ رہی۔ میں نے اسپر قابو پالیا۔ اور میں نے کیا قابو پایا بچے نے بیمار پڑ کر خود بخود اس کے لئے گنجائش پیدا کر دی۔ سال بھر کا کمزور بچہ جاڑے کا موسم اور ساری رات کا سفر۔ سردی لگنی تھی اور لگی گھر پہونچتے پہونچتے پنڈا بھیگا ہوا اور شام ہوتے ہوتے بخار چڑھ آیا۔ اور وہ بھی اس شدت کا کہ ایک ہفتے تک آنکھیں نہ کھولیں تیمارداری اور شب بیداری کے ساتھ مامتا نے مجھے اسکی مہلت نہ دی کہ بچے کے سوا کسی اور کے متعلق کچھ سوچ سکوں ـــــ فضا اگرچہ ملگدر اور رافق گرد آلود ہو چکا تھا۔ لیکن ہوا کا رخ بدل جانے سے آتی ہوئی آندھی واپس لوٹ گئی ـــــ بچہ جب چونچال تھا تو عزیزوں سے ملنے کا سلسلہ شروع ہوا ان کے بعد بچپن کی سہیلیوں نے مجھے گھیرا اور میں ان سے مل کر تھوڑی دیر کے لئے پھر زندگی کے اس سبزہ زار میں پہونچ گئی جسے وقت کی تقلید میں بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ بچپن کی یاد بھی کہیں دور نہیں گئی تھی بلاتے ہی آگئی اور اس کے اعزاز میں جھولے ڈالے گئے۔ کڑاہیاں چڑھیں پکوان پکے۔ آنکھ مچولی کھیلی گئی۔ غرض بچپن کا زمانہ اپنی تمام دلچسپیوں کے ساتھ کچھ دنوں تک ہمارا مہمان رہا۔ ایک مہینے تک ساس کے ساتھ سسرال رہی اسکے بعد امی جان نے مجھے میکے بلوا لیا اور میں نے پورے ڈھائی سال کے بعد اس ڈیوڑھی میں قدم رکھا جہاں سے میری کنواری زندگی کا جنازہ سہاگ کے تابوت میں کہاروں کے کاندھے پر نکلا تھا

پیاس کی شدت میں آپ بھوک کو کیوں بھول جاتے ہیں؟ بھوک جب ناقابلِ برداشت ہوتی ہے تو ایک خطرناک ماں کی مامتا کہاں گم ہو جاتی ہے؟ کیا یہ غلط ہے کہ تنازع للبقا کے معرکے ہمارے وجود کے اندر بھی چھڑے رہتے ہیں ـــــ اور بقائے اصلح کا قانون یہاں بھی طاقت کی حکمرانی کا ضامن ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری طرح ہماری خواہشیں بھی آپس میں ٹکراتی ہیں اور ہمارے ہر جذبے ہر میلان اور ہر احساس کی منشا یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہمارے وجود پر تنہا وہی حکمراں ہو اور ہمارے اعصاب اسی کے اشارے پر کام کرتے رہیں۔ جذبات کی اس کشاکش اور خواہشات کے اس تصادم میں جو جذبہ قوی ہوتا ہے وہی ہم پر حکمرانی کرتا ہے اور جو کمزور ہوتا ہے وہ بھاگ کر نفس کی کمیں گاہوں میں روپوش ہو جاتا ہے اور روپوش رہتا ہے اسوقت تک جب تک کہ اس کا حریف غالب حالات کی بنا پر کمزور یا غافل نہ ہو جائے۔ محمود کی محبت یعنی میرے اصلی میلان بچے کی پیدائش تک مجھ پر حکمراں رہا۔ لیکن بچے کی پیدائش کے بعد اس کا زور کم ہوتا گیا۔ یہاں تک میں سمجھے لگی کہ میں نے اس جذبے پر قابو پالیا ـــــ مگر سسرال سے میکے آنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سمجھنا میری خود فریبی تھی وہ کافر جذبہ میرے اندر اسی طرح موجود تھا صرف میری مامتا سے مرعوب ہو کر مقابلے کے میدان سے ہٹ گیا تھا۔ اس کمزور مگر چالاک حریف کی طرح جو غنیم کے بے پناہ حملے سے بھاگ کر گھاٹیوں میں چھپ جائے اور شبخون مارنے کے لئے رات کا انتظار کرے۔ یہ آپ سے کہہ چکی ہوں کہ ایک مہینے کے بعد میری امی جان نے مجھے سسرال سے میکے بلوالیا۔ میں سسرال سے میکے آئی اور محمود کی محبت نے حالات کو اپنے موافق پاکر ایک مرتبہ پھر مجھے چھیننے کی کوشش کی۔ اب سنئے کہ وہ موافق حالات کیا تھے۔ پہلی بات یہ ہوئی کہ گھر آتے ہی بچہ میری گود سے نکل کر اپنی نانی کی گود میں چلا گیا اور میں عملاً اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام نشیلے خیالات جو مجھے مصروف دیکھ کر منتشر ہو گئے تھے پھر میرے دماغ میں ہجوم کرنے لگے اور میں اپنی کیفیت میں گم ہونے لگی دوسری مصیبت ماحول کی مناسبت تھی۔ میں ان دنوں جس گھر میں تھی اسکی فضائیں گذرے ہوئے زمانے کو اپنی گود میں لئے تھیں۔ یہ وہی گھر تھا جس کی چہار دیواری میں دو معصوم روحوں نے اپنے معصوم

تخیلات کی ایک جنت تعمیر کی تھی۔ یہ وہی گھر تھا جس کی ہر دیوار پر ماضی کے ابھرے ہوئے نقوش مجھ سے میری پچھلی زندگی کی کہانیاں دہرا رہے تھے۔ انگنائی میں وہ امرود کا درخت اب بھی موجود تھا جس کی ہوا میں ہماری محبت نے شعور کی پہلی انگڑائی لی تھی۔ سائبان میں لگی انیٹوں کا وہ گھروندا اب تک موجود تھا جسے محمود نے میرے لئے بنایا تھا اور جس کی گری ہوئی چھت اور ٹوٹی ہوئی دیواریں مجھ سے آج بھی یہ سوال کر رہی تھیں کہ ۔۔۔ اسکی مزدوری؟ ——— جہتابی پر آج بھی چاندنی راتیں اسی طرح آتیں مگر مایوس لوٹ جاتیں۔ ان کے اجالے میں آنکھ مچولی کھیلنے والے اب ان سے کتنے بیگانہ ہو چکے تھے۔

مارچ کا مہینہ تھا اور بسنت کا موسم جو ہندوستان میں جنون کا موسم سمجھا جاتا ہے۔ پتنگ بازوں نے پتنگے جل جل کر راکھ کے نیچے دبی ہوئی چنگاریوں کو ابھارا ——— اور میری ہڈیاں پھر سلگنے لگیں ——— وہ ندی جو ریت کے نیچے بہ رہی تھی دھنا ابل پڑی ——— اور میں اس کے تیز دھاروں میں تنکے کی طرح بہنے لگی۔ پچھلی زندگی کے تمام مناظر سینما کی تصویروں کی طرح ایک ایک کر کے میرے سامنے آنے لگے اور مجھ سے اپنا حق مانگنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں تیزی کے ساتھ بدل رہی ہوں۔ جذبات میں تبدیلی افکار میں تبدیلی زندگی کے روزانہ پروگرام میں تبدیلی یہاں تک کہ ایک دن میرے آئینے نے بھی مجھ سے کہا "سلیمہ تو کتنا بدل گئی ہے"؟

دماغ جب جذبات سے متاثر ہو تو خواب کا "رنگ محل" تصور کی آنکھوں کے لئے اپنے تمام دریچے کھول دیتا ہے مجھے بھی نیند میں ——— اور اکثر بیداری میں وہ طرح طرح کے خواب آنے لگے۔ ڈراؤنے اور ہولناک خواب۔ دلچسپ اور رنگین خواب ——— بے حیا اور شرمناک خواب۔ نیند نے مجھے کبھی شکایت نہ تھی بچپن سے لے کر جوانی تک یہ میری وفادار سہیلی رہی ——— لیکن اس عالم میں وہ بھی کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے مجھ سے روٹھ جاتی۔ اختر شماری کا تجربہ اگر کبھی میری پوری حیات عشق میں باقاعدہ کبھی نہیں ہوا لیکن زندگی میں ایک چند باتی رات کا پچھلا پہر میں نے اس مشغلے میں بھی صرف کیا۔ واقعہ یوں ہے کہ گھر میں میری تصحیح کے "کن جھیدن" کی تقریب تھی۔ برادری کی تمام عورتیں دو دن تک گھر میں مہمان رہیں اور گھر کی ہر عورت انکی خاطر داری میں سراپا انہماک میں پہلے پان کے محکمے کی وزیر قرار دی گئی اور تمبولن کی جگہ پاندان مجھے سپرد کیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ یہ وزارت میرے لئے ٹھیک نہ ہوگی۔ مدت کے بعد میکے کی ایک تقریب میں شریک ہونے کا موقعہ ملا تھا۔ چاہتی تھی کہ جی کھول کے لوگوں سے ملوں اور جی کھول کے تقریب کا حق ادا کروں اور پان کا محکمہ ایسا ہوتا ہے جس کا دائرہ عمل زیادہ سے زیادہ ایک کوٹھری تک محدود ہوتا ہے۔ غرضیکہ سوچ کے میں نے اماں جان کی خدمت میں اپنا استعفا پیش کیا جو کسی طرح منظور ہوا اور اسکی جگہ مجھے استقبالیہ کمیٹی کی صدارت پیش کی گئی۔ اب میرے ذمے یہ خدمت تھی کہ جو بی بی تشریف لائیں ڈیوڑھی تک جا کر انہیں ان کی ڈولی سے اتار لاؤں اور جب وہ واپس ہونے لگیں تو پھر ڈیوڑھی تک انہیں چھوڑ آؤں۔ کام بظاہر دلچسپ اور آسان تھا لیکن دو گھنٹوں میں میرے پاؤں کے اعصاب نے بھی استعفا کی دھمکی دینی شروع کی نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے کوئی معقول عذر تراش کے یہ بلا اپنی بھاوج کے سر ٹالی اور خود میہمانوں کے پاس آ کر ان کی دلجوئی کی خدمت اپنے ذمے لے لی ——— آخر ان سے باتیں کرنے والا بھی تو کوئی چاہئے تھا ——— غرض شام تک گھر میں خاصی چہل پہل رہی۔ شام ہوتے ہی مہمانوں کی بھیڑ چھٹنے لگی۔ رات کے نو بجتے بجتے گھر میں سناٹا تھا۔ کھنے کا ہر شخص تھک کے چور ہو چکا تھا جسے جہاں جگہ ملی پڑ رہا۔ میں بھی اسی فرش پر یہاں بیٹھی تھی لیٹ گئی اور لیٹتے ہی نیند آ گئی ——— یہی رات میری زندگی کی وہ تاریخی رات تھی جس میں میں نے وہ خواب دیکھا جوانی کی شبہائے تاریک کا وہ سب سے زیادہ ڈراؤنا خواب جس نے میری محبت کا مزاج اور میرے جذبات کی دنیا بدل دی۔ رات شاید دوپہر آئی ہوگی کہ دیکھتی کیا ہوں کہ ایک جنگل میں جو پہاڑوں سے گھرا ہے ایک چھوٹی سی ندی بہ رہی اور میں اس کے کنارے کھڑی ایک گنول کا پھول توڑنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ندی کے اس پار برگد کے سایہ میں ایک جوگی دھونی رمائے ہے جس کی لمبی لمبی جٹائیں کمر تک آ گئی ہیں پھر کچھ تاریکی درمیان میں آ جاتی ہے اور خواب کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن پھر دیکھتی ہوں کہ جوگی کوئی اور نہیں محمود ہے اور خواب ہی میں یہ سوچتی ہوں کہ یہ جوگی کیسے ہو گیا۔ اتنے میں محمود آواز دیتا ہے کہ اس پار آؤ میں جواب دیتی ہوں "کیوں کر آؤں بیچ میں دریا حائل ہے"۔ وہ سامنے ایک ناؤ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ میں کہتی ہوں "ناؤ پر چڑھتے میرا جی ڈرتا ہے"۔ یہ سنکر محمود قہقہہ لگاتا ہے

اور پوچھتا ہے کہ میں آؤں؟ یہاں سے خواب پھر کچھ الٹ پلٹ ہو جاتا ہے لیکن پھر تھوڑی دیر کے بعد وہی منظر سامنے آتا ہے، اور دیکھتی کیا ہوں کہ محمود کشتی کھیتا میرے قریب چلا آرہا ہے۔ کشتی جب بیچ دریا میں پہونچتی ہے تو ایک گھڑیال پانی سے منہ نکالکر محمود کی طرف بڑھتا اور اُسے کشتی سے اٹھا کر نگل جاتا ہے ——— میں چیختی ہوں اور منہ ڈھانپ کے رونے لگتی ہوں ——— خواب یہاں تک پہونچا تھا کہ امی جان نے مجھے چونکا کر کہا سلیمہ! سلیمہ تو نیند میں رو رہی تھی کیا کوئی خواب دیکھا؟ میں نے چونک کر اور اپنے تکیے اور آنچل کو دیکھا تو وہ واقعی آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا ——— امی جان تو کروٹ بدل کر سو گئیں لیکن میں صبح تک جاگتی رہی۔ یہی وہ رات تھی جس کا پھیلا پہر میں نے واقعی اختر شماری میں گذارا۔ صبح تک خواب اور اس کی مختلف تعبیریں۔ میرے دماغ کے سامنے آتی رہیں ——— کہیں دریا زندگی کا دریا نہ ہو ——— کشتی محبت کی کشتی نہ ہو گھڑیال موت کا گھڑیال نہ ہو، کیا نصیب دشمناں محمود پر کوئی آفت آنے والی ہے ——— تو کیا میں اسیطرح کھڑی رہ کر اس منظر کا تماشا دیکھونگی ——— کیا میری آنکھیں اس تماشے سے پہلے پھوٹ نہ جائیں گی ——— غرض ان اوہام نے جو فی الواقعی اوہام تھے میری خود اختیاری کو مجھ سے بری طرح چھین لیا اور اس خواب کی کیفیتیں میرے اعصاب کو زندگی بھر متاثر کئے رہیں۔ وہ محبت جو کل تک شوق کی ایک تشنگی تھی۔ نفس کا ایک مطالبہ تھی جذبات کی ایک خودغرضانہ طلب تھی، ایک ایسی خودغرضانہ طلب جو جنون کی شوریدگی سے خالی ہو ——— جو قربانی کے تصور سے گھبراتی اور نتائج کی المناکیوں سے ڈرتی ہو ——— آج اس میں ——— اس خواب کے بعد عزم کی تھوڑی سی گرمی اور ایثار کی ذرا سی چاشنی پیدا ہو گئی ——— یہ نہیں کہتی اس خواہش میں سوز نہ تھا۔ سوز تھا لیکن سوز میں لذت نہ تھی اس خواب نے وہ لذت بھی پیدا کر دی ——— یہ نہیں کہتی اس آرزو میں درد کی تڑپ نہ تھی درد تھا اور درد کا احساس بھی لیکن محمود کے ساتھ ہمدردی نہ تھی ——— سو وہ ہمدردی یہ خواب دیکھنے ہی پیدا ہوئی اور عمر بھر مجھ پر حکومت کرتی رہی ——— صبح ہوتے ہی اس کا پہلا حکم یہ ہوا کہ محمود کو دریافت خیریت کا تار بھیجا جائے۔ میں نے کہا لوگ کیا کہیں گے۔ جواب ملا "کیوں ری سلیمہ پھر وہی کجی ابھی تک تیرا دل نہیں نکلا" مجھے یاد نہیں آتا کہ باوجود اس پیاس کے جو محمود کے لئے مجھ میں موجود تھی۔ میں نے کبھی بھی یہ سوچا ہو کہ محمود کس حال میں ہے۔ اس پر کیا گذر رہی ہے۔ لیکن آج پہلے پہر سے نہ معلوم دل کی کون سی رگ کھل گئی تھی کہ مجھے کسی کروٹ چین نہ آیا اور ایک لمحے کے لئے بھی یہ وہم دماغ سے جدا نہ ہوا کہ ہو نہ ہو محمود بیمار ہے ——— یا اسپر کوئی آفت آنیوالی ہے۔

محمود کا پتہ مجھے ان کے دوست بھائی اختر کی زبانی معلوم ہو چکا تھا۔ میں اپنے دل کی اس فرمایش کو بہت دیر تک ٹال نہ سکی اور قلم اٹھا کر یہ تار لکھا:-

"اپنی خیریت کا ایک بالتفصیل خط لکھئے"

خط لکھئے! اس لئے کہ تار کا جواب تار سے آنے میں یہ اندیشہ تھا کہ میرے تار کا حال گھر والوں پر کھل جاتا اور اس سلسلے میں ان کے سوالوں کا جواب میرے بس میں نہ ہوتا۔ لیکن اس احتیاط کے باوجود جب میں نے تار رحمن بوا کے ہاتھ دربان کے پاس بھجوایا تو امی جان یہ پوچھ ہی بیٹھیں کہ تار؟ یہ تار کس کو دیا جا رہا ہے؟ میں نے کہہ دیا کہ کلکتہ میں میری ایک ملنے والی ہیں۔ خط سے معلوم ہوا ہے کہ انکا بچہ بیمار ہے۔ سو وہی اس کی خیریت دریافت کرنے کی غرض سے ایک تار بھیجے دے رہی ہوں۔ یہ تھا میری زندگی کا وہ پہلا جھوٹ جو میں محمود کی محبت کے لئے بولی اس کے بعد سے پھر جھوٹ کا سلسلہ شروع ہو گیا

(۱۵)

فراق کی بے چینیوں کا حال جب میں کبھی محمود کی زبان سے سنتی تو اس کو ایک غزل سے زیادہ اہمیت نہ دیتی لیکن ان چند دنوں میں حالات نے مجھے خود بخود اس نتیجے پر پہونچا دیا کہ اس قسم کی رنگین بیانیوں میں تھوڑی سی سچائی ضرور ہوتی ہے۔ کئی دن تک میرے تار کا کوئی جواب نہ آیا۔ خط کے انتظار میں میں نے اپنے بھجوانے پر جتنی کروٹیں بدلی ہونگی اس سے کہیں زیادہ میرا دل میرے سینے میں کروٹیں بدلتا اور مجھے ایک نئی زندگی سے روشناس کراتا رہا۔ یہاں تک کہ چھٹیں یا ساتویں دن کی ڈاک میں ایک لفافہ ملا جس کے مٹے ہوئے حرفوں پر محمود کے آنسوؤں کی مہر تھی کھولا تو خط نہ تھا اس کے جذبات پریشان کا ایک مجموعہ تھا۔

کیوں جی سلیمہ؟ تمہیں یہ حق کہاں سے حاصل ہو گیا کہ خود جیو اور دوسرے کو جینے نہ دو۔ یہ تار مجھے کس لئے دیا گیا ہے؟ اسی لئے نا؟ کہ بمبئی کی باغ و بہار فضا میں اگر سکون کے چند لمحے میں نے کہیں سے ستعار لئے ہوں تو اُسے بھی ماضی کے تصورات سے تلخ کر دیا جائے۔ اگر یہی خیال تھا تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے سکون جس چیز کا نام ہے وہ مجھ سے بہت پہلے چھین لی گئی ——— کس نے چھینا؟ کہنے کی غالباً ضرورت نہ ہوگی اور اس کا جواب میں تم سے بھی نہیں مانگتا۔ چیز تھی چھن گئی اور ہمیشہ کے لئے چھن گئی۔ میں نے گھر سے نکل کر اسے احباب کے قہقہوں اور شراب کی بوتلوں میں ڈھونڈھنا چاہا اور نہ ملی۔ بازارِ حسن کی رنگینیوں میں تلاش کیا لیکن وہاں بھی اس کا سراغ نہ تھا۔ ——— کالج کے حلقے سے نکل کر روحانیت کے دائرہ میں آیا وہاں بھی مجھے پناہ نہ ملی ——— ایک مخصوص روح ہے جو عافیت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ راستہ تاریک ہو اور رات اندھیری۔ جہاں تک نظر کام کرتی ہے گرد و پیش کوئی سراغ نہیں اور اگر ہے تو اس کا چراغ روشنی نہیں پھینکتا ——— زندگی کے چٹیل میدان میں جہاں کوسوں تک سبزہ نہیں، یادش بخیر ایک درخت تھا چھوٹا سا سایہ دار درخت جس کی چھاؤں میں یہ مسافر گیت رہا کرتا تھا۔ تو اب اس کے نیچے کسی اور نے اپنا بھونپو ڈال لیا۔ بستہ پھیلا دیا، اس طرح پھیلا دیا کہ اس تھوڑی سی جگہ میں اب کسی دوسرے کے بیٹھنے کی گنجائش نہ رہی۔ اب مسافر کہاں جائے۔ یہ سوال تم سے نہیں ان لوگوں سے ہے جو ..... لیکن ان سے بھی کیوں ہو؟ خدا سے ہو ہاں خدا ہی سے اس لئے کہ ؎

جتنے شکوے ہیں اسی سے ہیں کہ اس گلشن میں
مجھ کو بلبل کیا صیاد کو صیاد کیا

تم پوچھتی ہو کیسے ہو اپنی مفصل حالت لکھو۔ میں پوچھتا ہوں کہ تمہیں یہ سوال کرنے کا حق کیا ہے؟ یہ سوال اسکو کرنا چاہئے جس نے اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی میرے متعلق یہ سوچنے میں گذارا ہو کہ میں کیسا ہوں کس حال میں ہوں کدھر جا رہا ہوں۔ وہ کہ جس نے اپنے دل کے تمام دروازے اور اپنے دماغ کی تمام کھڑکیاں میرے لئے میری یاد کے لئے میرے تصور کے لئے بند کر رکھی ہوں انصاف کرو اسے میرے متعلق کچھ پوچھنے کا کیا حق حاصل ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دنیا کیوں کر بدل گئی۔ آفتاب بھی اسیطرح نکل رہا اور ستارے بھی اسی طرح اپنے اپنے سورج کے گرد گھوم رہے ہیں۔ موجیں اسیطرح ساحل سے سر ٹکرا رہی ہیں اور ساحل اسی غرور کے ساتھ اپنی وارفتگی کو ٹھکرا رہا ہے

لیکن سلیمہ بدل گئی ہے ——— اس کا دل بدل گیا ہے ———
کیسی عجیب بات ——— کیسا عجیب انقلاب ———

——— پوچھتی ہو کہ کیسا ہوں؟ اچھا ہوں ——— زندگی کی وہ گنی ہوئی سانسیں جو گننے کے لئے ودیعت کی جاتی ہیں انکی گنتی کو جلدی جلدی ختم کرنا چاہتا ہوں ——— راستہ کتنا ہی لمبا اور منزل کتنی ہی دور کیوں نہ ہو، دوڑ کے چلنے سے جلد پہنچ جانے کا بہرحال امکان ہے۔ اور دوڑ کے کیوں نہ چلوں، ٹھوکر سے ڈرتا نہیں، گڈھوں سے خوف نہیں کھاتا۔ ببولے کانٹوں کے عادی ہو چکے ہیں بسر راہ کوئی چشمہ نہیں کوئی سبزہ زار نہیں جہاں کچھ دیر بیٹھ کر سستانے اور پیاس بجھانے کا سوال پیدا ہو۔ بس سر اٹھائے بھاگا جا رہا ہوں ——— اسیطرح بھاگتے بھاگتے کسی نہ کسی دن منزل پر پہونچ ہی جاؤنگا اور تم بھی سن لو گی کہ مسافر منزل پہ پہونچ گیا۔

شکر گذار ہوں ان مشغلوں کا جنھوں نے تندرستی کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ میرے دوستوں میں ایک صاحب ڈاکٹر ہیں انکی تشخیص ہے کہ میرے جسم میں شکر کے عناصر کم ہو رہے ہیں۔ ان احمق آدمی کو کیا معلوم کہ جس کی زندگی کی ساری شیرینیاں چھین لی گئیں ہوں اس کے جسم میں شکر کے عناصر کہاں سے آئیں گے۔ بہرحال غنیمت ہے کہ عناصر کی ایک دیوار تو گر رہی ہے جو باقی ہیں وہ بھی اسیطرح ایک ایک کر کے گر جائیں گی اور روح کا طائر پرواز کر جائے گا۔ بھائی جان کو خدا سلامت رکھے خیریت بھی پوچھتے ہیں اور ضرورت کے وقت روپے بھی بھیجدیتے ہیں۔ لیکن نفس کو خود اعتمادی کا سبق سکھلانے کے لئے ایک دفتر میں ملازمت کر لی ہے۔ صبح سے شام تک دماغ کو قلم کے اشاروں پر لگائے رکھنے کی کوشش کرتا ہوں شام ہوتی ہے تو سمندر کی طرف نکل جاتا ہوں مجھے اسکی گہرائیوں میں عافیت نظر آتی ہے لیکن وہاں تک پہونچ نہیں سکتا۔ قدم بڑھاتا ہوں تو جی ڈرتا ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ نہ ڈروں لیکن ڈرتا ہوں شاید کسی دن نکل جائے اور زندگی کا یہ کٹھن سفر بھری راستے سے یہ آسانی طے ہو جائے رات ہوتے ہی یہ یاد آتا کہ پرسوں منتظر ہوگی چونکہ نہیں چاہتا کہ کسی کو اپنے انتظار کی تکلیف دوں اس لئے وہاں سے اٹھ کر اس کے

گھر کی راہ لیتا ہوں - وہاں پروین ہوتی ہے اسکی رعنائیاں ہوتی ہیں
ساز ہائے موسیقی کی خواب آور لہریں ہوتی ہیں اور
شراب کے رنگین گلاس ہوتے ہیں اور میں تھوڑی دیر کے لئے اپنے دماغ
کے تمام ہنگاموں کو اپنے وجود کو اپنی خودی کو یہاں تک کہ تم کو تمہارے
تصور کو شراب کے انہیں خلاصوں میں غرق کر دیتا ہوں ——————
غرق ہو جاتا ہوں —————— اور صبح تک ایک دوسری
دنیا میں رہتا ہوں - صبح ہوتے ہی زندگی کی تمام کلفتیں جاگ اٹھتی ہیں
اور میرے دماغ سے اپنا خراج مانگنے لگتی ہیں یہ ہے میری روزانہ
زندگی اور اس کا نظام اوقات —————— پروین کو
تم شاید نہیں جانتیں —— یہ وہی عورت ہے جس نے مجھے ثریا کی لعنت
سے نجات دلائی اور اب ایک چور کی طرح چور دروازے سے میری
زندگی میں داخل ہونا چاہتی ہے - میں تم سے مایوس ہو کر محبت کی تلاش
میں ثریا تک پہونچا تھا - اور اس پیاسے کی طرح جو پانی کی جستجو
میں چمکیلی ریت کی طرف بڑھے وہاں پہونچکر اپنی تشنگی پر سیر دمن ہا
تھا کہ پروین ایک راہ چلتے مسافر کی طرح ادھر سے گذری اور میری تشنگی
پر رحم کھا کر اپنی چھاگل سے تھوڑا سا پانی دیا اور میں پانی کے لالچ میں
اسی کے پیچھے چل پڑا —————— یہ ہے میرے اور پروین
کے تعلقات کا خلاصہ وہ تمہاری طرح حسین نہیں ہے لیکن میری طرح وفا
دار ہے - ثریا میری طرح وفادار نہ تھی مگر تمہاری طرح حسین تھی - اس کے
حسن کے نقوش تمہارے حسن سے بہت ملتے جلتے تھے اور اسی
مشابہت نے مجھے اسکی طرف کھینچا تھا لیکن میں نے بہت جلد یہ معلوم
کر لیا کہ کسی سے محبت کرنا اس کے پیشے کے اخلاق کے منافی ہے
—————— اور میں نے پھول کے دھوکے میں چنگاری
پر ہاتھ ڈال دیا ہے —————— پروین نے میرے
قریب آکر محبت کا ہاتھ بڑھایا اور میں نے میری محبت کا ہاتھ جھٹک دیا
مجھ میں محبت کے کسی بڑھتے ہوئے ہاتھ کو جھٹکنے کی طاقت نہیں رہی
میں نے اسے قبول کر لیا - لیکن قبول کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا تم کسی
طرح میری زندگی میں آ نہیں سکتیں اس کے دروازے ہیں اور در
دروازوں پر کسی نے قفل چڑھا رکھے ہیں لیکن یہ غدار عورت
قفل توڑ دینا چاہتی ہے - چور دروازے تلاش کرتی ہے نقب
لگانے اور دیوار پھاندنے کی دھمکی دیتی ہے —————— میں
اس سے بھاگنا چاہتا ہوں —————— اس لئے
وہ مجھ سے وہ چیز مانگتی ہے جو میں نہیں دے سکتا جو میرے پاس
نہیں - میں اس کے احسانات کے معاوضے میں دل کہاں سے لاؤں -
جس نے لیا ہے وہ آج بھی واپس کر دے تو میں پروین کی یہ چیز پروین
کی طرف بڑھا دوں اس لئے کہ وہ اس کی مستحق ہے اور قدر داں بھی
بہر حال بھاگ جاؤنگا مقصد کی تلاش میں بھاگنا
اور دوڑنا ہی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے - میں بھی جب سے زندگی
کا ہوش آیا ہے بھاگ رہا ہوں اور بھاگتا رہوں گا - یہ وجود روح
مطلق سے جدا ہو کر جب سے انفرادیت کے عذاب میں مبتلا ہوا ہے
سے ڈھونڈ رہا ہوں اپنے ساتھی کو اپنے "جیون ساتھی" کو اپنی
روح کے شریک کو اپنے وجود کے دوسرے ٹکڑے کو - ڈھونڈ رہا ہوں -
آتش کہتا ہے - ع

عدم سے جانب ہستی تلاش یار میں آئے

اور بلاشبہ تلاش یار ہی روح کا سب سے بڑا مقصد ہے اور سب سے
قوی رجحان —————— انسانی زندگی میں شوق کے تمام
ہنگامے نفس کی تمام گمراہیاں اور جنسی جذبات کی تمام بے اختیاریاں
اسی تلاش یار کا نتیجہ ہیں - ایک روح جب کسی دوسری روح کو دیکھتی
ہے جو کسی عالم میں اس سے ہم آغوش تھی یا کسی زندگی میں زندگی کی
شریک تھی تو بے اختیار بڑھتی لیکن جب ایک جزو نور دوسرے
جزو نور کو ایک مانوس روح دوسری مانوس روح کو کھینچتی ہے تو
سماج دونوں کے بیچ میں دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے -
سلیمہ غور تو کرو کہ یہ فطرت کا کتنا بڑا گناہ ہے
میں نے فطرت کے اشارے پر اپنے دل کی دنیا میں
اس گناہ کے خلاف جہاد کرنا چاہا تھا یہ ایک مقدس جہاد
ہوتا لیکن تم نے سماج کے خود ساختہ اصولوں کی غلامی کو اپنے لئے
بہتر سمجھا —————— یہ جواب ہے تمہارے ان خطوط کا جو میری
محبت کے فطری تقاضوں کے جواب میں طمانچوں کی طرح آتے رہے
بہر حال جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے میری شاعری نہ سمجھو
سماج کے لئے یہ بہت ہی آسان ہے کہ ان حقیقتوں کو جو اسکی سمجھ میں
نہ آئیں یا جو اس کے مذاق کے موافق نہ ہوں انہیں شاعری کہہ کے
جھٹلا دے اور تم بھی اسی سماج کی ایک سعادت بیٹی ہو نا -
غالباً بھولی نہ ہو گی میرے اور ثریا کے تعلقات
کی خبر پا کر جو عتاب نامہ تم نے کلکتہ سے بھیجا تھا اس کے جواب میں
میں نے لاڈلے صاحب میخانہ کا یہ شعر کافی سمجھا تھا ؎

فریفتہ مجھے عالم کے رنگ و بو نے کیا

بڑا ستم ترے ملنے کی آرزو نے کیا

کبھی تم نے سوچا ہے کہ زندگی کی کتنی بڑی حقیقت اس شعر میں بند ہے نظر کا مطلوب اور روح کا انتخاب جب کسی شخص سے چھین لیا جاتا ہے تو یہی ہوتا ہے ——— یہی ہوتا ہے کہ باغ کا ہر پھول جاذب نظر ہو جاتا ہر کلی دعوت دیتی ہے ہر خوشبو پکارتی ہے کہ ادھر آ جس چیز کی تجھے تلاش ہے وہ میرے پاس ہے ——— شوق کی ماری ہوئی روح ایک ایک کلی کو سونگھتی ایک ایک پھول کا رس لیتی ہے اور جب وہ چیز نہیں پاتی جس کی تلاش ہے تو بھاگ جاتی ہے یہ کہتی ہوئی بھاگتی ہے کہ

ع۔ تم سے جہاں میں آ کر سہی ہم مگر کہاں

اور بھاگتی رہتی ہے اس وقت تک جب تک کہ اسکی چیز اسے نہ مل جائے وہ اس زندگی میں ملے یا کسی دوسری زندگی میں لیکن تلاش ختم نہیں ہوتی ——— یہی ہے فطرت کی آواز کی اور اسی کا انام نے عیاشی سماج کی اصطلاح میں ہے کاش ان عیاشوں کے دل کی آگ کوئی پہچانتا۔ کاش انکی بیقراری کی حقیقت تک پہونچنے کی کوئی کوشش کرتا۔ خدا کی اس دنیا میں کوئی نہیں جو ان غریبوں پر رحم کھائے۔ مذہب ان سے قیودیاں چڑھاتے ہے۔ قانون ان سے ہمدردی کی ضرورت نہیں سمجھتا ——— سوسائٹی انکا مضحکہ اڑاتی ہے اور سماج انکی آوازوں پر کان نہیں لگاتا۔ یہ کیسا اندھیر ہے کہ روح اگر روح کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتی پھرے تو اس ٹھوکر کا اس قابل رحم گھر کی کا اس معصوم گھر کی کا نام گناہ رکھ دیا جائے۔ سلیم؟ جو پیاسا نہیں وہ پیاس کی قدر کیا جانے وہ تمام اخلاق کی بندشوں سے گرے ہوئے لوگ جو معاشرت کی سیدھی سڑک سے کٹ کر بازار حسن کی خاک چھان رہے ہیں۔ اگر ان کے دلوں کو ٹٹولا جائے ان کے وجود کے پردوں کو چاک کر کے دیکھا جائے۔ انکی زندگیوں کے اوراق الٹے جائیں تو ہر کتاب یہی کہانی کہے گی کہ جس چیز کی تلاش تھی وہ نہ ملی اور اگر ملی تو چھین لی گئی۔ ان کشتگان تلاش میں کچھ تو ایسے ملیں گے جنھوں نے پا کر کھویا اور کچھ ایسے جنھوں نے پایا ہی نہیں روح کا مقصود نظر کے دائرے میں آیا ہی نہیں۔ اس لئے نہیں آیا کہ دونوں کے درمیان میں زمان و مکان کی بہت سی دیواریں حائل تھیں۔ زندگی کی دوڑ میں ایک پیچھے رہ گیا تھا اور ایک آگے بڑھ آیا تھا یا پھر آدم و حوا کی طرح ایک لنکا میں اتارا گیا تو دوسرا جزائر کے رگستان میں۔ آدم و حوا کا افسانہ جو تحقیق جدید کی روشنی میں واقعی ایک افسانہ ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اسی تلخ حقیقت کی ایک تمثیل ہو۔ بہت ممکن ہے کہ انسانیت کے سلسلۂ ارتقا کی موجودہ کڑی کے آدم نے اپنے جوڑے کی تلاش میں اسیطرح مشرق و مغرب کی خاک اڑائی ہو۔ وہ آنسو وہ رواتی آنسو جو بہشت کے فراق میں آدم کی آنکھوں سے نکلے بہت ممکن ہے کہ وہ بہشت کے فراق میں نہ ہو کی اس محبوب نور کی تلاش میں ہوں جو عالم ازل میں اس کے وجود کا شریک ہو۔ بہت ممکن ہے کہ اس عہد کا فوق البشر فوق البشر کو ڈھونڈھ رہا ہو روح اعظم روح اعظم کی تلاش ہو ایک نئی نسل کی اشاعت کے لئے ایک نئی دنیا کی تعمیر کے لئے ایک نئی حقیقت کے ظہور کے لئے اور جب وہ جوڑا زمین کے کسی حصے پر مل گیا ہو تو اس کے اتحاد سے نسل چلی ہو۔ اور شاید یہی وجہ ہو کہ انسانیت کی اس نسل میں تلاش جنسی کا یہ جذبہ تمام جذبوں سے زیادہ قوی ہے اور زیادہ سرکش اس طرح کہ نہ معاشرت اس پر اخلاق کا پہرہ بٹھلا سکی نہ قانون اسے اپنے دائرے میں نظر بند کر سکا۔ بہر حال یہ ہمارے تاریخی عہد سے پہلے کی داستان ہے کیوں نہ اپنے بیان کی تصدیق میں تاریخ کے اوراق تمہارے سامنے کھول کر رکھ دوں۔ نور جہاں کو تم جانتی ہو جہانگیر کا یہ روحانی جوڑا جہانگیر کو بہت دیر میں ملا اور جب تک نہیں ملا اس کے نفس کی آوارگی محبت کے گھروندے بناتی اور توڑتی رہی۔ شاہجہاں کو ممتاز محل ابتدائے عمر ہی مل گئی اسلئے شہزادہ ہونے کے باوجود اسکی پوری جوانی بے داغ رہی لیکن عمر کی دوپہر ڈھلنے سے پہلے موت نے ممتاز محل کو اس سے چھین لیا اور مورخ جانتا ہے کہ اس حادثے کے بعد اس نے اپنا اخلاقی توازن کسی بری طرح کھو دیا انگلستان کا بادشاہ ہنری ہشتم جنتری کی طرح بیویاں بدلتا رہا تلاش جنسی کا یہ جذبہ نہ صرف اسکی زندگی بلکہ اسکی سیاست پر بھی حکمراں رہا اور مورخ آج بھی مشتبہ ہے کہ مسلسل آٹھ بیویاں کرنے کے بعد بھی اسے جنسی اور روحانی سکون میسر ہوا یا نہیں۔ مصر کی ملکہ قلوپیطرہ کی پوری جوانی اسی تلاش میں صرف ہو گئی ہر رات ایک نیا مرد اس کے پہلو میں ہوتا اور ہر صبح اسکی نظر ایک نئے جوان کی تلاش میں اپنا سفر شروع کر دیتی جوانی کی شام ہو رہی تھی کہ روم کا سپہ سالار انٹونی اس سے ملا اور تلاش دفعتاً ختم ہو گئی ——— مشہور رومانی شاعر شیلی کی ساری زندگی اسی تلاش جنسی کی سوگوار رہی اور باوجود اس اخلاقی حس کے جو ایک مفکر اور شاعر ہونے کی حیثیت سے اس میں بہت قوی تھی وہ اپنی بیوی کو چھوڑ دینے

سے زیادہ کچھ نہ دے سکا۔ اور تمام عمر انی روح کی بیقراری پر ماتم کرتا رہا۔ کون جانتا ہے کہ میری زندگی بھی انہیں افسانوں کی طرح ایک افسانہ نہیں بنا رہی ہے۔

یہاں پہونچکر تم یہ سوال کر سکتی ہے ہو کہ عشق یا اس نوع کا کوئی تعلق اگر کچھ ہے دو روحوں کی دو مانوس روحوں کی باہمی کشش کا باہمی میلان کا تو اکثر حالتوں میں یہ کشش یہ میلان چھکاؤ یک طرفہ کیوں ہوتا ہے، ہر حالت میں محبت کا جواب محبت سے کیوں نہیں ملتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک روح دوسری روح کو کسی عالم یا کسی زندگی میں آزردہ کر دیتی ہے، اپنی کسی حرکت یا کسی عمل سے اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ آزردگی دوسری زندگی میں طبیعت کی رکاوٹ بنکر نمایاں ہوتی ہے اور بعض اوقات تو یہ رکاوٹ اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ اس کے مقابلے میں کشش عنصری بھی کمزور پڑ جاتی۔ شاید اسی قسم کی کوئی رکاوٹ میری جانب تمہاری طبیعت میں بھی ہے ——— ورنہ تم اور میری محبت کے حملوں کا مقابلہ سلیمہ؟ ——— فطرت کا سیلاب فرض کا حصار باندھنے سے نہیں رکتا۔

سلیمہ! میری اپنی سلیمہ ——— یقین کرو کہ میں جب اپنی روح کی گہرائیوں میں اتر کے دیکھتا ہوں مجھے نظر آتا ہے کہ تم نہ صرف ایک زندگی میں بلکہ کئی زندگی میں میرے جیون کی ساتھی تھیں میرے جذبات کی شریک تھیں بلکہ اس سے بھی زیادہ میری ہستی کی شریک تھیں۔ عالم ازل میں میرے وجود کا نصف حصہ تھیں۔ عالم ارواح میں میری روحانی رشتہ دار تھیں اور عالم عناصر میں جسمانی حیثیت سے مجھ سے میرے عناصر سے میرے ذرات سے قریب تھیں ———

تم یہ سنکر تعجب تو نہ کرو گی کہ روحیں روحانی تعلق کے علاوہ جسمانی تعلق سے بھی متاثر ہوتی ہیں اور ان تاثرات کو کئی زندگیوں تک لئے رہتی ہیں۔ عشق کیا ہے روح کے اندر انہیں تاثرات کا ایک شعور ——— اور حسن کیا ہے روح کے حافظے میں ان مانوس چہروں کی ایک جھلک جو کسی عالم یا کسی زندگی میں ہمیشہ پیش نظر تھے۔ اور روح جنکی قربت سے لطف اندوز تھی ——— چہرے کی ترکیب اور جسم کی بناوٹ میں تناسب و ترصیع کی فنی نگاریوں کا شعور جو تہذیب کی برکت سے ہم میں پیدا ہو گیا ہے قطع نظر اس کے من اگر کچھ ہے تو وہی چہرے کی مانوسیت ——— وہ مانوس صورتیں

جن سے کسی عالم میں انس تھا جب ان کا عکس کسی دوسرے چہرے میں نظر آتا دل لئے اختیار کھنچتا ہے اور طبیعت بے ساختہ لپکتی ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی صورت فنی اعتبار سے کتنی ہی معیاری کیوں نہ ہو مگر آنکھوں میں نہیں کھبتی اور اگر نظر میں چڑھ بھی جاتی ہے تو دل میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتی ——— کچھ کو یہ مانوسیت عشق کا باعث ہوتی ہے۔ اور کچھ روحانی رشتہ داری یعنی عالم ارواح میں روحوں کی باہمی قربت۔ یا پھر بعض حالتوں میں عناصر کی کشش ان عناصر کی کشش جو پچھلی زندگی میں اپنے جسم کے شریک تھے اور اس زندگی میں ایک دوسرے کے جسم کے اجزا بنے ہوئے ہیں ——— اس کے علاوہ ان اجزائے نور میں بھی روح کی جن سے ترکیب ہے، کشش ہوتی ہے۔ یہ کشش تمام کششوں سے زیادہ بے پناہ ہے۔ روحوں میں جنسیت کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ یوں سمجھو کہ نور کے ایک ٹکڑے سے جب دو روحیں بنتی ہیں تو ایک ٹکڑے میں دوسرے ٹکڑے کے لئے قدرتی کشش ہوتی ہے اور یہی کشش زندگی میں جنسی کشش بن جاتی ہے اور ایک جزو نور دوسرے جزو نور کو بے اختیار ڈھونڈھتا ہے۔ زمانہ حال کے صوفیوں کا خیال ہے کہ جب تک دونوں بچھڑے ہوئے ٹکڑے ایک انفرادیت میں آکر مکمل مل نہیں جاتے۔ اس وقت تک وہ وصال حقیقی حاصل نہیں ہوتا جو روحوں کے ارتقا کی آخری منزل ہے۔

اب تو تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ جس عشق کا تم مضحکہ اڑاتی ہو اسکی بنیادی حقیقت کیا ہے؟ ہر انسان انفرادی حیثیت سے کیوں بیقرار ہے۔ حقیقی سکون اسے کیوں نہیں ملتا؟ عام طور پر ازدواجی زندگی کیوں کامیاب نہیں ہوتی ——— تم نے دیکھا ہوگا اور دیکھا نہیں تو سنا ہوگا کہ ہماری سوسائٹی کے اکثر منچلے لوگ جن کی سینکڑوں دوکانوں پر اشرفیاں کوڑیوں کے مول بکنے کے بعد سینکڑوں حسین کھلونوں سے کھیلنے کے بعد ایک کالی کلوٹی کمزور عورت پر بری طرح ریجھتے ہیں۔ اور زندگی بھر کے لئے اسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں آنکھوں کا سرکش سے سرکش جادو اور وفا و محبت کا بہلک سے بہلک منتر انہیں اس عورت سے جدا نہیں کر سکتا۔ ایسی درجن سے زیادہ مثالیں میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ کہو تو گنوا دوں۔ اسکے علاوہ پندرہ سال کے چھوکروں کو ساٹھ سال کے بڈھوں پر اور پچیس آٹھ جوانوں کو پچاس سال کی بڑھیاؤں پر جان چھڑکتے بھی دیکھا

ہے۔ دنیا یہ سارے تماشے حیرت کی آنکھوں سے دیکھتی ہے اور نہیں جانتی کہ یہ کیا ہو رہا ہے ——— حیرت سوچتی ہے اور عقل مچاتی ہے وہ روحانیت کا یہ گہرا راز کیا سمجھے وہ کیا جانے کہ ازدواجی زندگی کے سفر میں چند قدم آگے یا پیچھے رہنا محبت کی نظر میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا وہ تو صرف یہ جانتی ہے کہ سلیمہ محمود سے چند مہینے پہلے دنیا میں آگئی اس لئے برادری کے قانون اور عورتوں کی شریعت کے رو سے محمود کی بیوی بن سکتی ——— سلیمہ مجھے تم سے کوئی شکایت ہے تو یہ کہ تم دوڑ کے کیوں چلیں اور مجھ سے پہلے کیوں پہنچ گئیں۔ یہ کیوں نہ دیکھا کہ میں پیچھے آ رہا ہوں۔ مجھے آگے کیوں نہ بڑھنے دیا۔ یہ کیوں نہ سمجھیں کہ چند قدم سست چلنے کے جرم سے تم مجھ سے چھین لی جاؤ گی ایک پوری زندگی کیلئے چھین لی جاؤ گی سلیمہ اگر تناسخ کا عقیدہ صحیح ہے تو تم کئی زندگیوں میں میری رہی ہو اور میں کئی زندگیوں سے تمہارا پیچھا کر رہا ہوں اگر تناسخ کے عقیدے کے مطابق روحیں اس دنیا میں اپنا پچھلا قرض ادا کرنے کے لئے آتی ہیں تو میں بھی تم سے بچھڑ کر اپنا قرض ادا کر رہا ہوں۔ یاد نہیں آتا کہ یہ قرض کیسا ہے۔ پچھلی زندگی میں مجھ سے کون سی ایسی بھول ہوئی تھی یہ جدائی جس کی پاداش ہے ——— تمہیں بتاؤ کہ تم کس جرم پر مجھے چھوڑ کر بھاگ آئیں۔ اچھا کیا بھاگ آئیں۔ میں بھی بھاگ رہا ہوں ——— بھاگ جاؤنگا اتنی تیزی سے بھاگونگا کہ تم پیچھا نہ کر سکو اتنی دور نکل جاؤنگا کہ کئی زندگیاں میرے اور تمہارے درمیان میں حائل ہو جائیں۔

بس اب زیادہ نہیں لکھ سکتا دماغ جذبات سے مغلوب ہو رہا ہے۔ تمہاری یاد آوری کا شکریہ میری حالت نہ پوچھا کرو اپنی زندگی کا ماتم دار ہوں۔ کاش تم اس ماتم میں شریک ہوتیں تعزیت دیتیں ہمدردی کرتیں۔ آنسو پونچھتیں لیکن اے گھروندے کی بیوفا ساتھی ——— تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا ——— اپنی ہی آستین اور اپنے ہی آنسو ——— قابل رحم ہے یہ بیکسی جن آنسوؤں کو تمہارے دامن میں جگہ ملنی چاہئے انہیں بیکسی کی خاک جذب کر رہی ہے ——— کیا کسی زندگی میں تم اپنی یہ امانت اس سے واپس لے سکو گی؟ اچھا خدا حافظ دل کی آنکھیں کھول کر دیکھو ایک ٹوٹی ہوئی کشتی سمندر کی لہروں سے کھیلتی طوفان کے جھونکوں کا مضحکہ اڑاتی ——— ساحل سے قریب ہوتی جا رہی ہے ——— پہچانتی ہو؟ یہ کشتی نہیں میری زندگی ہے ——— میری زندگی کی بھولائی ہوئی ناؤ جسے پڑھنے سے تم نے انکار کیا تھا اور میں جسے آج کل تنہا کھے رہا ہوں گو تنہا نہیں کھے سکتا بازو شل ہو رہے ہیں اور دم پھول رہا ہے ——— بہت ممکن ہے کہ تیز ہوا تھپیڑوں سے چھوٹ پڑے اور میں اپنے کو موجوں کے رحم پر چھوڑ دوں ——— مگر نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ——— پروین میرے پیچھے تیرتی ہوئی آ رہی ہے وہ میری کشتی پر زبردستی چڑھنا چاہتی ہے ——— میں اپنی کشتی تیز بھگاؤنگا اور بہت جلد اسکی پہونچ سے باہر ہو جاؤنگا ——— اچھا سلام لو ——— ساحل قریب ہے اور ——— تم بہت دور ——— اپنی زندگی کا سوگوار

محمود

مجھے خط کی ہر سطر میں محمود کا دل کروٹیں لیتا ہوا نظر آ رہا تھا میں خط پڑھتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی دل اس کے تلم کے چرکوں سے تلملا رہا تھا اور میں محسوس کر رہی تھی ان چرکوں کے بعد میرا احساس فرض پھر پنپ نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے فلسفۂ عشق کی تفسیر شروع کی اور میرا داغ اپنی نیم شعوری حالت سے چونکنے لگا اور جذباتی کیفیت کی جگہ ایک ذہنی کیفیت مجھ پر طاری ہونے لگی۔ اسکی دلیلوں کے جواب خود بخود میرے سامنے آنے لگے۔ لیکن خط کے اختتام پر پھر ایک طوفان اٹھا اور میری خودی پھر اس میں ہچکولے کھانے لگی ——— آخری سطروں میں اس نے اپنی زندگی کا کشتی سے استعارہ کیا تھا ——— نظر وہاں تک پہونچی ہی تھی کہ مجھے اپنا ہولناک خواب اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ یاد آیا ——— اور میں پھر بے حس ہو گئی۔ دو دن تک میں خط کو بار بار پڑھتی رہی اپنے اوہام کو ٹالتی اور اپنے دل کو سمجھاتی رہی۔ اسی عالم میں میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے فوراً کلکتہ واپس جانا چاہئے ورنہ جو زندگی آج کل شروع ہو گئی ہے وہ مجھے ایک نہ ایک دن گھر ست آشرم کی چار دیواریوں سے باہر نکال کر رہے گی۔ چنانچہ یہ سوچ کر میں نے محمود کے خط کا جواب لکھنے سے پہلے اپنے شوہر کو خط لکھا اور یہ فرمائش کی پہلی فرصت میں مجھے کلکتہ بلوا لیا جائے۔ طبیعت کچھ ٹھکانے ہوئی تو محمود کے خط کا جواب لکھنے بیٹھی اور یہ سوچ کر بیٹھی کہ اپنے دل کی تمام کیفیتوں کو کھول کر اس کے سامنے رکھ دوں گی ——— اس لئے کہ مجھے خوف تھا کہ وہ میری محبت کی طرف سے قطعی مایوس ہو کر کہیں واقعی خودکشی نہ کر لے ——— اور میں اسکو ہر حیثیت پر زندہ

دیکھنا چاہتی تھی ——— بہرحال میرا خط ملاحظہ ہو

۷۸۶

میرے اچھے محمود خدا تمہیں توفیق دے کہ تم مجھے اور میرے دل کو پہچاننے کی کوشش کرو ایک گھروندے کے کھیلے ہوئے دو بچے جوان ہو کر ایک دوسرے سے اتنا بھی اجنبی ہو سکتے ہیں؟ ——— جتنا کہ تم اپنی سلیمہ سے ہو ——— اے دیوانے! محبت کوئی چراغ نہیں ہے جسے پھونک مار کے بجھا دیا جائے ——— یہ دل کی آگ تو ہڈیوں تک کو سلگائے رہتی ہے یہ اور بات ہے کہ دھواں نہ اٹھے یا نہ اٹھنے دیا جائے۔ چولہے میں آگ جب موجود ہو تو یہی غنیمت ہے کہ شعلے نہ بلند ہوں ——— اس سے زیادہ تو میں نے کبھی بھی حوصلہ نہیں کیا ——— آنچ تیز تھی اسے دھیمی کرنے کی کوشش ضرور کرتی رہی اور کئی مرتبہ اسے دبا رکھنے میں کامیاب بھی ہوئی۔ لیکن نہ جانے کون سا ہاتھ تھا؟ ——— کس کا ہاتھ تھا؟ جو سلگائی ہوئی چنگاریوں کو اکساتا رہا اور آنچ دھیمی ہو ہو کر تیز ہوتی گئی ——— اے جذب و کشش کے فلسفی ——— دیکھ تو کہیں اس آگ کو بھڑکائے رکھنے کی ذمہ داری تجھ پر تو نہیں ہے ——— میں نے چاہا تھا کہ جلنا جب مقدر ہو چکا ہے تو خود جلوں گھر کو نہ جلنے دوں ——— مشیت نے جس امتحان میں ڈالدیا ہے اس سے سرخرو ہو کر نکلوں ——— زندگی کے معرکے میں ——— فرض کی قربانگاہ پر ——— ایک مجاہد کی طرح ثابت قدم رہوں۔ بزدلوں کی طرح میدان چھوڑ نہ بھاگوں ——— اپنے کام نہیں آسکتی تو دوسروں کے کام آؤں خود دوسروں کے لئے جیتی رہوں ——— اور تجھے اپنے لئے جیتا رکھوں ——— لیکن اپنے کاروبار حیات کے بزدل سپاہی جب تجھے یہ منظور نہیں ——— اور زندگی سے بھاگ کر موت کی گود میں پناہ لینا ہی تیری نظر میں حیات عشق کا سب سے بڑا کارنامہ ہے ——— تو اے مشیت کے سپنے تجھے بسم اللہ کر ——— تیری سلیمہ اس راہ میں تجھ سے پیچھے نہ ہوگی۔

صحرائے زندگی کی آوارہ گرد کی مبارک

لیکن اے منزل کی طرف تیزی سے بھاگنے والے مسافر! قریب آ کر دیکھ ——— وہ درخت وہ سایہ دار درخت جس کی چھاؤں میں تیرا بسیرا تھا اور جس کے نیچے کسی دوسرے نے اپنا بستر پھیلا دیا ہے زندگی کے کیڑے اسکو چاٹ رہے ہیں اور حالات کی رفتار اس میں گھن لگا رہی ہے۔ گو اب بھی کھڑا ہے لیکن گردوپیش کی تند و تیز ہواؤں کا مقابلہ اب اس سے نہیں کیا جاتا طوفان کا ایک تند جھونکا اور بس ——— گر رہا ہے اور گر جائے گا اسکو گرتا ہوا دیکھ لے ——— اور اس کے بعد اپنی راہ لگ

بیوفائی کا الزام شکریے کے ساتھ قبول لیکن اے میرے عادل کس نے کس سے بیوفائی کی ——— میں نے ایک سے محبت کرنے کے بعد دوسرے سے محبت کی ہوتی ——— دل کا تحفہ ایک سے چھین کر دوسرے کو بڑھا دیا ہوتا تو شاید یہ الزام انصاف کی نظر میں کوئی وقعت رکھتا۔ لیکن واقعات تو کچھ اور کہتے ہیں ——— میں زبردستی ایک مرد کی گود میں پھینکدی گئی اور تم شوق سے ایک عورت کے آغوش کی طرف بیتابانہ بڑھے ——— محمود گریبان میں سر ڈالو۔ کیا یہ حقیقت نہیں؟

میں نے تم سے محبت ضرور کی لیکن پیمان محبت باندھتے ہوئے میں نے تم سے یہ معاہدہ کب کیا تھا کہ میں تمہیں وہ سب کچھ دیدونگی جو میرا نہیں ہے۔ دل میرا تھا سو وہ میں نے تم کو بہت پہلے سونپ دیا۔ میں اپنی نہ تھی پھر میں اپنے کو تمہیں کیونکر دے ڈالتی۔ تم اپنے کو اپنی ملکیت سمجھو لیکن میں اپنے کو اپنی ملکیت کیوں کر سمجھتی۔ میں اپنی نہ تھی اپنے ماں باپ کی تھی، اپنی برادری کی تھی اپنے خدا اور اپنے سماج کی تھی اور انھوں نے اپنی چیز جس کو چاہا اٹھا کر دیدی ——— میں نے بہت سے لوگوں کی امانت چپکے سے اٹھا کر تمہیں کیوں نہ دیدی سماج اور فرض کی دیوار پھاند کر تمہارے ساتھ نکل کیوں نہ کھڑی ہوئی ——— ہندوستان کے بہت سے رومانی افسانوں میں حسن و عشق کی ایک رنگین داستان کا اضافہ کیوں نہ کر سکی ——— اگر یہی میرا جرم ہے اور اسی جرم کا نام تمہارے لغت میں بیوفائی ہے تو مجھے فخر کے ساتھ اعتراف ہے کہ میں بیوفا ہوں

اب رہا اس بیوفائی کے جرم میں اگر تمہاری عدالت کا فیصلہ ہے کہ تمہارا دل مجھ سے چھین کر کسی اور کو دیدیا جائے تو یہ فیصلہ بہت مبارک ہے ضرور دیدیا جائے لیکن عذر صرف یہ ہے کہ جس چیز کو میرے پاس سمجھا جا رہا ہے وہ میرے پاس نہیں اگر تمہارے

پاس ہوتی تو ژیاکے پاس کیونکر پہونچ جاتی ——— وہ شاید ژیاہی کے کہنے پر چھوٹ گئی ہے ——— مجھی تو پروین غریب اس سے اب تک فائدہ نہ اٹھا سکی - تم سمجھتے ہو کہ پروین اسکی مستحق بھی ہے اور قدرداں بھی ہے - بہت درست لیکن میرے خیال میں ایک مستحق اس کا اور بھی ہے یعنی یہ کہ وہ مستحق اور قدرداں ہونے کے علاوہ اسکی منہ مانگی قیمت بھی دے رہی ہے جو کم از کم میں نہ دے سکی اور درحقیقت کتنی ہی کروڑوں کیوں نہ ہو لیکن بہر حال حقیقت ہے کہ کچھ لوگ محبت کرتے اور کچھ لوگ محبت کے نام سے تجارت کرتے ہیں ——— تم شاید عاشق نہیں عاشق کے لبادے میں تاجر تھے جو کسی کو دل دے کر اسکی قیمت مانگنے رہے - اس کے معاوضے میں اپنے نفس کے مطالبات کی ایک طولانی فہرست پیش کرتے رہے اور جب وہ مطالبات پورے نہیں کئے گئے تو بدمعاملگی کا الزام دیتے رہے - میں بدمعاملہ ضرور ہوں لیکن تم سے نہیں تمہارے بھائی سے ——— اس شریف ترین انسان سے جس نے مجھ پر اعتماد کیا مجھ سے محبت کی ——— محبت نہیں غلامی کرتا رہا اور میں اس کے ان مخلصانہ جذبات کے معاوضے میں اپنے دل کا ایک ٹکڑا بھی توڑ کر نہ دے سکی - کیوں نہ دے سکی! اس لئے نہ دے سکی کہ دل میرا نہ تھا یہ چیز دوسرے کی ہو چکی تھی

ایک کے ساتھ خوش معاملگی دوسرے کے ساتھ بدمعاملگی ہو جاتی ——— میں اپنے شوہر کی قرضدار ہوں لیکن یہ قرضداری کسی بدنیتی کی بنا پر نہیں ہے میری مفلسی کی بنا پر ہے، میں دل کی پونجی اور جذبات کا سرمایہ لٹا کر مفلس ہو چکی تھی، قرض کہاں سے ادا کرتی ——— نتیجہ یہ ہوا کہ قرض رہ گیا - اور قرضداری کے احساس نے روح کو اتنا ڈپوک کر دیا کہ وہ اب اس سلسلے میں کسی دوسری خیانت کا تصور بھی نہیں کر سکتی -

محمود ؟ ہوش میں آؤ کیسی تلاش اور کیسا سکون ——— یہ چیز تو انہیں ملتی ہے جو کچھ نہیں چاہتے ——— جو کچھ چاہتے ہیں یہ چیز انہیں نہیں ملا کرتی ——— وہ کہ جو اپنی ہر خواہش کا پجاری ہو ——— وہ کہ جس کی زندگی اس کے نفس کے مطالبات کی آواز ہو ——— وہ کہ جو اپنے دل کے حکم پر غلاموں کی طرح دوڑتا ہو ——— سکون کی تلاش کا حق اسے کبھی نہیں ——— خواہش اور سکون نیازمندی اور بے نیازی - آگ اور پانی - یہ اچھا رشتہ ہے تم نے لگا رکھا ہے تڑپنا بھی چاہتے ہو اور پھر اس کے ساتھ یہ بھی چاہتے کہ نہ تڑپو - یہ کیسی دیوانگی ہے تم نے تڑپنا چھوڑا ہوتا خواہش کی غلامی ترک کی ہوتی نفس کی باگ موڑی ہوتی تو سکون ہی شاید نہیں کہیں نہ کہیں مل جاتا - اور پھر یہ کہ سکون کی اگر تلاش ہی تھی تم نے اسے لال پانی کی رنگین بوتلوں میں کیا ڈھونڈھا بازار حسن کی چمکیلی دوکانوں پر کیا تلاش کیا - ڈھونڈھنا ہی تھا تو ایک دن ماں کی گود میں اسے ڈھونڈھا ہوتا - ماں کے پیار سے مانگا ہوتا - ماں کے پیار سے اس ماں کے پیار سے جو روزانہ آدھی رات سے پچھلے پہر تک تمہارے جینے کی دعائیں مانگا کرتی ہے ——— اور جب سے تمہارے بمبئی جانے کی خبر سنی ہے اس دن سے آج تک جس کی آنکھوں کی برسات کسی طرح ختم نہیں ہوتی - حالانکہ موسم بدل رہا ہے جاڑا غائب ہو گرمی آئی لیکن اس کے آنسوؤں کی جھڑی جو ایک بار لگی تھی سو لگی ہوئی ہے - تمہاری بہنیں تمہارے لئے بے چین ہیں تمہارا بھائی تمہارے مستقبل کے لئے متفکر ہے لیکن تم کس عالم میں ہو کہ وہاں تک کسی کے دل کی آواز نہیں پہونچتی - محمود! اگر وہ تمام جذبات لطیف جو کل تک تمہارے سینے میں موجود تھے اگر آج مجھے پا لینے اور مجھے پاکر خوب بھینچ بھینچ کے پیار کرنے کی خواہش میں گم نہیں ہو گئے تو میرے بھائی تمہیں شرم آنی چاہیے کہ تمہاری ایک ذلیل سی خواہش نے کتنے مقدس جذبوں اور کتنی معصوم تمناؤں کو پامال کیا ہے - کاش تم نے یہ دیکھنے کی ضرورت سمجھی ہوتی کہ جس راہ میں تم چل رہے ہو اس راہ میں کتنے دل تمہارے قدموں کے نیچے بچھے ہوئے سسک رہے ہیں ——— مگر نہ جانے تمہارا ضمیر کتنی گہری نیند سو رہا ہے - تم اپنی موجودہ حالت پر غور کرنے اور فرمانے کی جگہ الٹا اسپر اصرار کرتے ہو - اپنی کمزوریوں میں فلسفے کا رنگ بھرتے ہوئے اپنی حماقتوں کو خرد کا فیصلہ بتلاتے ہو ——— محمود اس دنیا میں تم شاید پہلے شخص ہو جس نے عیاشی کے جواز میں روحانیت کی مدد سے ایک فلسفیانہ استدلال پیش کیا ہے - کہتے ہو کہ جب نظر کا انتخاب اور روح کا مطلوب کسی سے چھین لیا جاتا ہے تو یہی ہوتا ہے ——— میں پوچھتی ہوں کہ کیوں ایسا ہوتا ہے؟ کیوں ایسا نہیں ہوتا کہ اپنے محبوب نظر پھول کے چھین لئے جانے کے بعد دنیا کا ہر پھول نظر سے گر جائے ——— کوئی کلی بے اعتبار رنگ و بو کتنی ہی جاذب روح کیوں نہ ہو لیکن جبلتی طور پر ہو اور روح تو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے ——— یہ بات تو خیر سمجھ میں آتی ہے

کہ جب تک روح کا مقصود نظر کے دائرے میں نہ آئے اسوقت تک آتما اس کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتی رہے لیکن مل جانے کے بعد اگر وہ اپنی ملکیت نہ ہو تو ادھر ادھر اسکی تلاش میں سرگرداں پھرنے کے کیا معنی ہے ——— سلیمہ کو ٹھوکر ثریا کی چوکھٹ پر سجدہ کرنے کے کیا معنی کیا تمہاری سلیمہ نے ثریا سے اپنا جسم بدل لیا تھا، محمود میاں؟ یہ آپ نے عشق کی تعریف کی ہے یا عشق کا مضحکہ اڑایا ہے ذرا سوچئے تو ؎

ہم الزام انکو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

مصیبت یہ ہے کہ آپ نے ضرورت کے احساس کو عشق سمجھ لیا ہے خود فریب میں مبتلا ہیں اور مجھے بھی اسکی دعوت دیتے ہیں - اگر آپ یہ کہتے کہ سلیمہ کو ٹھوکر مجھے ایک ثریا کی ضرورت تھی تو آپ کی ضرورت کے اس احساس پر مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا مگر آپ تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آپ سلیمہ کی تلاش میں ثریا تک پہونچے حالانکہ سلیمہ ثریا کے کوٹھے پر نہیں - کلکتہ میں تھی اور یہ جاننے کے باوجود آپ نے ثریا کے کوٹھے کے سفر کو کلکتے کے سفر پر ترجیح دیا

شاید اس اقدام میں روحانیت کا کوئی بہت ہی گہرا راز ہو کوئی بہت ہی پیچیدہ فلسفہ ——— کوئی بہت ہی لطیف شاعری جو کم از کم میری سمجھ سے باہر ہے -

اب رہا اس سلسلے میں دوسرے مسائل

تو کشش روحانی کی میں قائل ضرور ہوں اور یہ بھی سمجھ سکتی ہوں کہ روحیں اپنے پیکر خاکی میں آنے سے پہلے ایک عالم میں رہتی ہیں اور اس عالم میں ایک دوسرے سے محبت اور نفرت بھی کر سکتی ہیں اور انکی اس محبت و نفرت کا اثر اس زندگی میں بھی نمایاں ہو سکتا ہے - اس کے ساتھ اجزائے نور کی کشش بھی مسلم ذرات کے مقناطیسی جذب کا فلسفہ بھی صحیح اور روحانی رشتہ داریوں کا تصور بھی غلط نہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ کیونکر نکالا جا سکتا ہے کہ بعض حالات کے ماتحت اگر دو اجنبی روحوں میں ازدواج کا رشتہ قائم کر دیا جائے تو یہ رشتہ ازدواج فطرت کے قانون کی خلاف ورزی ہوگی

فطرت کا تو کاروبار ہی یہ ہے کہ وہ موافق اور ناموافق ذرات کے اختلاط سے زندگیاں بناتی ہے - آگ و پانی کے امتزاج سے خاک و باد کے اتحاد سے نور و ظلمت کی ترکیب سے طبیعتیں تعمیر کرتی ہے ——— عناصر کی دنیا میں اگر اس کا قانون یہ ہے تو اس کے ساتھ اگر میں یہ بھی سمجھوں کہ روح کی دنیا میں بھی اس کا یہ قانون اسیطرح کام کرتا ہے تو میرا یہ عقیدہ کیوں غلط سمجھا جائے میں کیوں یہ نہ سمجھوں کہ فطرت کا قانون اجنبی عناصر اور اجنبی ذرات کی طرح اجنبی روحوں میں رشتہ ازدواج درشتہ اتحاد باندھ کر روحانی رشتہ داری اور روحانی برادری کے دائرے کو وسعت دینا چاہتا ہے ——— اور ہمارا سماج اور اس کا قانون بھی اسی قانون طبیعت کی پیروی میں دو اجنبی روحوں کو میاں بیوی بنا کر یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ خیالات سے مفاہمت کرنا سیکھیں ——— اور باہمی تعلقات سے ایک دوسرے کی روحانی اجنبیت کو دور کرنے کی کوشش کریں ——— ہمارا تمدن اور ہمارا سماج اپنے بچوں کو جزو نور کی جستجو اور روحانی رشتہ دار کی تلاش کے لئے مطلق العنان کیونکر چھوڑ دے ان میں سے ہر ایک کو وہ شاعر نہیں آدمی بنانا چاہتا ہے ——— ہر ایک سے کچھ کام لینا چاہتا ہے - ایک نسانیت کبریٰ کی تعمیر اس کے پیش نظر ہے - اس کے تمام بچے بچیاں اگر سیانے بھولوں ہی بن جائیں گے تو اس کا کارخانہ کون چلائے گا - اسکے خوابوں کو پورا کون کرے گا - فطرت کے مقصد آفرینش کی تفسیر کیونکر ہوگی ——— تم شاعر آدمی شاید بول اٹھو کہ مقصد آفرینش تو یہی تلاش ہے اچھا مقصد آفرینش ہی کہ انسانیت اگر اجتماعی حیثیت سے جی کھول کے اس کا حق ادا کرنے لگے تو شاید نصف صدی کے اندر تمدن کی یہ محفل نجبہ کا جنگل بن جائے جس میں اس کنارے سے اس کنارے تک سوائے ماتم فراق کے کوئی آواز سنائی ہی نہ دے - اچھا مقصد آفرینش ہی کہ خاطر جہان آفرین نور کے ایک ٹکڑے سے دو روحوں کی آفرینش کرے اور دونوں کو محبت کی تڑپ دیکر ایک کا سرانہ دوسرے پر گم کر دے اور گم کر کے انکی گمرہی اور پریشانی کا تماشا دیکھے - غور تو کرو کہ یہ جبلی ہوئی یا بازی گری ——— عوام کی تحقیق اصطلاح میں ایسے آدمی کو شیخ چلی کہتے ہیں ——— اور خدا شیخ چلی نہیں ہے ؎

بس کھل گئی حقیقت نقاشی خیال
سب اپنے رنگ بھر دئے تصویر یار میں

روحانی رشتہ داری کو میں حقیقت ضرور سمجھتی ہوں لیکن اس سلسلے میں میرے فکر کی لکیر بالکل سیدھی ہے جو تمہاری فکر کی لکیر کی طرح خم کھاتی اور قدم قدم پر نئی نئی گمنڈنیاں نکالتی ہوئی نہیں چلتی یہی وجہ ہے کہ میرا سفر ایک نتیجے پر پہونچ کر ختم ہو جاتا ہے اور تمہارا دماغ چوراہوں پر تھک کر رہ جاتا ہے - اچھا یہ تو بتلاؤ کہ اجنبی تفریق کا تعلق

جسم سے ہی یا روح سے؟ پھر یہ کہ ایک نور کے ٹکڑے سے صرف دو ہی روحیں ایک زنانی اور ایک مردانی کیوں بنتی ہیں دو سے زیادہ کیوں نہیں بن سکتیں۔ فرض کرو کہ اگر تین بن جائیں تو تیسری کا جنسی جوڑا کہاں سے لایا جائے گا؟

بات یہ ہے کہ یہ سب تمہاری شاعرانہ خوش فکری ہے نر روح کی ترکیب میں خواہ مخواہ جنسیت کو شامل کر کے غلط بنیاد پر غلط تصور قائم کرتے ہو۔ ورنہ روحوں میں نہ کوئی جنسی تفریق ہے نہ جنسی لگاؤ۔ ہاں روح کا وجود نورانی ہے اور اجزائے نور بھی مادی عناصر کی طرح آپس میں کشش رکھ سکتے ہیں اور اس کشش کے ماتحت روحیں عالم ارواح میں ایک جگہ رہ سکتی ہیں۔ اور ایک ملک ایک سماج ایک خاندان اور ایک بطن میں کھچ کر آسکتی ہیں دوسرے لفظوں میں ہمارے دنیاوی تعلقات اور یہ دنیاوی رشتہ داریاں اسی روحانی رشتہ داری کا پرتو ہو سکتی ہیں ——— تمہارے روحانی تعلق کے فلسفے سے اگر کوئی معقول نتیجہ نکالا جا سکتا ہے تو بس یہی ——— ورنہ تمہارے جنسی میلان کا ہماری روح سے کوئی تعلق نہیں۔ تمہارا فلسفہ روحانی طبیعتوں کے لئے کتنا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو لیکن اجتماعی حیثیت سے اس کا عملی رخ اتنا بھیانک ہے کہ انسانیت اسے کبھی قبول نہیں کر سکتی اس لئے کہ اس کے قبول کر لینے کے بعد زندگی کے سامنے کوئی مستقبل نہیں رہتا ——— ظاہر ہے کہ جب ایک مغرب میں پیدا ہو سکتا ہے اور دوسرا مشرق میں تو غور کرو کہ ایک عمر تک جون سا نتھی کی تلاش میں زندگی کا سرمایہ لٹانے کے بعد انسان کی جھولی میں کیا رہ جائے گا جسے لیکر وہ ارتقاء کا سفر شروع کریگا۔ زندگی کی شام ہونے کے بعد روحانی جوڑا کسی شخص کو اگر مل بھی گیا تو کیا؟ ارتقا کی منزلیں تو پوری نہیں ہو جاتی ہیں اور پھر یہ کہ مل جانے کے بعد بھی کون جانتا ہے کہ فطرت کا بیرحم قانون پھر جدائی کی صورت پیدا نہ کر دے گا۔ فرض کرو کہ موت نے اسے چھین لیا اور عدم کے سفر میں ایک دوسرے سے پیچھے رہ گیا تو پھر وہی تلاش۔ فرض کرو کہ تلاش کا سودائی اپنی زندگی ختم کر کے اسکی تلاش میں عالم ارواح تک پہنچے لیکن اس کے وہاں پہونچنے سے پہلے اس کا ساتھی عالم عناصر کی طرف منتقل کر دیا جائے تو پھر وہی تلاش۔ آخر تلاش کے اس غیر متناہی سلسلے کا کچھ اور بھروسہ بھی ہے کوئی مقصد بھی کوئی نتیجہ بھی یا بس یونہی اللہ میاں کا ایک شاعرانہ ذوق اور کارکنان قضا و قدر کی ایک شاعرانہ خوش فعلی۔

میں نے ایک مسلمان گھر میں آنکھیں کھولی ہیں میری فکر ایک خالص اسلامی ماحول میں پلی ہے اس لئے نتائج کے تعقید سے مجھے طبعاً کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی لیکن چونکہ تم تناسخ کے قائل ہو چکے ہو اس لئے تم سے پوچھتی ہوں کہ زندگیوں کا یہ تسلسل اور حیات مادی کی یہ تکرار اگر تربیت روح کی غرض سے ہے اگر مختلف زندگیوں کے مختلف تجربات سے روحوں کی ارتقا مقصود ہے تو ذرا سمجھ کے جواب دو کہ روح کی ارتقا اپنی خواہشات پر قابو پانے میں ہے یا اپنی خواہشات کے پیچھے آوارہ پھرنے میں۔ روح کی عظمت اور روح کی پاکیزگی کائنات کی تمام اجنبی روحوں سے مانوس ہو جانے میں ہے یا صرف اپنے جزو نور سے محبت کرنے میں اور اسکی محبت میں تمام مخلوق اللہ کے حقوق سے بے پروا ہو جانے میں۔ ایک روح حالات سے مفاہمت کر سکتی ہے دوسری نہیں کر سکتی۔ ایک روح زندگی کے معرکوں کو جھیل رہی ہے دوسری اس سے بھاگ رہی ہے ایک روح اپنی ہر خواہش کی غلامی کر رہی ہے دوسری اپنے ہر جذبے پر ایک شاہانہ تسلط کے ساتھ حکمراں ہے۔ اپنے روحانی گرد سے پوچھو کہ ان دو روحوں میں کون منزل سے قریب ہے اور کون صراط مستقیم سے بھٹکی ہوئی ہے اگر یہ جواب ملے کہ "وہ روح جو نفس پر حکمراں ہے" تو پھر کوشش کرو اپنے نفس اور اس کے تمام میلانات پر حکومت کرنے کی ترک کر دو غلامی اس خواہش کی جو تم سے کبھی سلیمہ کو بچاتی ہے کبھی ثریا کی چوٹ پر زناٹے کا رگڑ واتی ہے اور کبھی پروین کے مخمل حیات پر جھولنے ڈالتی ہے۔ اگر کسی زندگی میں کسی خاص چہرے کی کوئی خاص نوک پلک تمہیں محبوب تھی اور اس زندگی میں تمہارا ذوق نظر اسکی جھلک میرے یا ثریا کے چہرے میں دیکھ رہا ہے تو تم اپنے نفس کی ضد پر ادھر نہ دیکھو ——— اور سماج کے قانون کے رد سے رشتہ ازدواج باندھو یا ایک ایسی عورت سے جس کی آنکھیں میری آنکھوں کی طرح بڑی اور کنٹیلی نہ ہوں بلکہ بلی کی آنکھوں کی طرح گول اور چھوٹی ہوں۔ جس کی ناک میری ناک کی طرح اونچی اور سڈول نہ ہو بلکہ بندر کی ناک کی طرح چپٹی اور سطح ہو۔ جس کا رنگ میرے رنگ کی طرح شہابی نہ ہو بلکہ تجھ ایسا تن پوا کے رنگ کی طرح آبنوسی ——— مجبور کرو اپنے دل کو ایک ایسی عورت سے محبت کرنے پر ——— مجبور کرو اور کرتے رہو یہاں تک کہ واقعی وہ اس سے محبت کرنے لگے۔ اگر ایسا کر سکتے ہو تو پھر روحانیت کے دائرے میں پہنچنے کا تمہیں حق ہے ورنہ نفسانیت کا کوئی ادارہ تلاش کرو۔ قیس و فرہاد

جیسے لوگ جس کے سرگرم ممبر ہوں "شباب یات" اور "زنانیات" کی ترویج واشاعت جس کا محبوب مقصد ہو۔ مامتا کی کراہ فرض کی پکار اور دولت کا پیام جس کے دروازوں تک نہیں پہونچ سکتا ہو ایک ایسے ادارے کی صدارت تمہارے لئے بہت موزوں ہوگی

اس لئے کہ ——— ایک عورت کے لئے تم نے ایک کنبے کے حقوق کو اپنے پاؤں سے روندا ہے۔ ایک دنیا کی ذمہ داریوں کو پس پشت پھینک کر بھاگے ہو ——— ماں کو رولایا ہے بہنوں کو چھوڑا ہے بھائی سے حسد کیا ہے تمدن سے خفا ہو سماج سے بگڑے ہو ——— خدا سے اچھے ہو ——— اور نفسانیت کی تاریخ میں نفس کی غلامی کی مثال اس سے زیادہ بہتر اور اس سے زیادہ مکمل کیا ہوگی۔ تمہارے روحانی ادارے کے "اصول دین" سے تو میں واقف نہیں ہوں لیکن تمہارے بھائی نے تمہیا سوفیکل سوسائٹی کا ایک رسالہ مجھے لاکر دیا تھا جسے ——— دیکھنے کے بعد اس نتیجے پر پہونچی کہ یہ نئی روشنی کے صوفی بھی ہمارے قدیم صوفیوں کی طرح اپنے نفس کو قرار اپنے نفس کی ہر خواہش سے جہاد کرنے میں روح کی ارتقا سمجھتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو روح کی اس خواہش کا جس کا تعلق جذبات جنسی سے ہو اتنا احترام کیوں کیا جائے آرزو کے اس تخم کو جو روح کا ایک ہمیشہ رہنے والا ناسور ہو جائے ایک ہمیشہ رہنے والا ناسور جو بقول تمہارے ہر زندگی میں رستا رہتا ہے پنپتا رہتا ہے ——— کیوں نہ اسے کاٹ کے پھینک دیا جائے کیوں اسے پال کے رکھا جائے۔ کیوں اسکی پرورش کی جائے۔ کیوں اس کے لئے اپنے پندار کو اپنی خودی کو اپنی عزت نفس کو اپنے مقصد حیات کو اپنے روحانی ارتقا کو خطرے میں ڈالا جائے۔ تم کہو گے اسی پندار اسی غرور اور اسی خودی کے علاج کے لئے تو محبت کی جاتی ہے ——— یہ کہو گے اور شاید مولانائے روم کا یہ شعر پڑھو گے ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما

میں تم سے نہیں مولانا سے کہونگی کہ ہماری جملہ علتوں کا یہ علاج خود ایک بہت بڑی علت ہے۔ ایک ایسی علت ایک ایسی بیماری جو نفس سرکش ترین پندار کو اپنے آغوش میں لئے ہے عشق نام ہے اگر ذوق نظر کی ایک فرمائش کا اور عشق نام ہے اس فرمائش پر مسلسل اصرار کا۔ تو کیا یہ مسلسل اصرار خودی سے خالی ہے

اور کیا یہ خودی انسان کو حقوق العباد اور حق الناس سے بے پروا۔ اور زندگی اور اس کے فطری تعلقات کی طرف سے بے رحم نہیں بنا دیتی ——— اپنی زندگی کا جائزہ لو اور جواب دو۔ کیا تم نے اپنے جذبے کے مقابلے میں کسی دوسرے کے جذبے کا احترام کیا ——— اپنی شکستگی پر دوسروں سے ہمدردی کے مدعی رہ کر کبھی دوسروں کی شکستگی پر رحم کھایا ——— سچ بولو کیا تم نے اپنے خیال کے گھروندے میں ایک ایسی دنیا نہیں بنائی جس میں تم اور تمہاری سلیمہ کے سوا تیسرا کوئی نہیں ——— کیا یہ خالص ترین خود غرضی نہیں۔ اور کیا محبت خود غرضی خود ذوقی اور خود پرستی کا ایک خوبصورت نام نہیں ہے۔ لیکن اگر تم خودی کو بے خودی کہو ——— اور خرد کا نام خواہ مخواہ جنوں رکھ لو تو اس کا ہمارے پاس بجز یہ کہنے کے اور کیا علاج ہے کہ ؎

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اب اگر یہاں پر یہ سوال پیدا ہو کہ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں عشق سے عشق مجازی نہیں عشق حقیقی یعنی خدا کا عشق مراد لیا ہے۔ تو میں یقیناً ہار جاؤنگی اس لئے کہ میری نظر میں نہ خدا سے عشق کیا جا سکتا ہے اور نہ اسکی ضرورت ہے اور نہ وہ اپنے بندوں سے اس کا مقتضی ہے۔ عشق مجازی اور عشق حقیقی کی تفریق کی میں قائل ہوں لیکن میں اسکو اس طرح سوچتی ہوں کہ عشق اس قوت تک مجازی ہے جب تک کہ وہ ایک کے لئے ہے۔ ایک کو پوج رہا ہے ایک پر مٹ رہا ہے۔ لیکن جب کسی سے محبت کرتے کرتے طبیعت میں یہ گداز پیدا ہو جائے کہ دنیا میں کسی کا درد دیکھا نہ جائے ہر سانس لینے والی مخلوق کے لئے دل میں ہمدردی کی تڑپ ہو۔ ہر رونے والی کی آنکھ کے لئے تمہاری آنکھوں میں نمی ہو۔ ہر حالات کے ستائے اور روندے ہوئے انسان کیلئے تمہاری روح میں اعانت کا جذبہ ہو تو سمجھ لو کہ عشق حقیقی کی منزل آگئی۔ سچ پوچھو تو خدا کا عشق اگر کچھ ہے تو یہی عالمگیر ہمدردی اور یہی عالمگیر جذبہ ہے۔ جو اسکی مخلوق سے محبت نہیں کرتا وہ اس سے بھی محبت نہیں کرتا۔ اس کے قانون سے محبت نہیں کرتا۔ اس کی سنتوں سے محبت نہیں کرتا۔

اپنے اس نظریہ عشق کی روشنی میں جب تمہیں دیکھتی ہوں تو دیکھتی ہوں کہ تم اس راستے پر چل کر بھی الٹے پاؤں چل رہی ہو ——— تم کیا الٹے پاؤں چل رہی ہو۔ تمہارا "ادب"

جس نے تمہاری ذہنیت بنائی اسے پاؤں چل رہا ہے ہمیشہ سے
اسے پاؤں چل رہا ہے ——— کسی سے محبت اور کسی سے
محبت کے بعد ترک علائق اور ترک فرائض اور ترک علائق و ترک
فرائض کے بعد خدا سے عشق یہ ترتیب عمر بھر میری سمجھ میں نہیں آسکی
محمود! چہرے کی نوک پلک کا دھوکہ نہ کھاؤ - یہ آب و گل کی
ایک افتادِ عناصر کا ایک طلسم ہے فطرت کا ایک مذاق ہے ہماری
تمہاری آنکھوں سے ——— مجاز سے حقیقت اور سراب
سے پانی نہ مانگو اپنی پسند پر اصرار نہ کرو - مشیت کے دروازے
اور سماج کی عدالت بند ہو جائے اس پر قناعت کرو - گو خود نہیں
قناعت کر سکی - جو پوچھنے کی چیز ہے اسے نہیں پوچھ سکتی اور جسے نہیں
پوچھنا چاہئے اسے پوچھ رہی ہوں ——— مگر تمہاری ہی طرح اپنی کمزوری
کو فلسفہ نہیں بنائی ——— جانتی ہوں کہ یہ کمزوری یہ نفس کی کمزوری
یہ فتنہ یہ شعور کا فتنہ - یہ فساد یہ آب و گل کا فساد - یہ اوچھا پن یہ
جذبات کا اوچھا پن بہت دنوں کے لئے نہیں ہے اسکی عمر شباب کی
دوپہر کے ساتھ ختم ہو جائیگی ——— اور خون کی حرارت اور
ذہانت کی کمزوری کم ہوتے ہی وہ چراغ جو آج بجھ رہا ہے خود بخود جھ
جائے گا ——— آندھی رک جائے گی طوفان تھم جائے گا۔
اور حقیقت اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ زندگی کے سرگذارے ہوئے
لمحے سے اپنا خون بہا مانگ رہی ہوگی اور لمحہ یہ فریاد کر رہا ہوگا کہ
معاف کر میں سمجھ نہیں جانتا تھا ——— ڈرتی ہوں اس
وقت سے ——— محمود! ڈرو اس وقت سے جب تمہارے
شوق کی آنکھوں کے سامنے بڑیوں کا ایک ڈھانچہ ہوگا اور میرے
چہرے کی جھریاں تمہارے جذبات عشق کا منہ چڑھا رہی ہونگیں
اگر میں اس دن کے لئے زندہ رہی اور تمہارے بھائی
خدا نخواستہ زندگی کے سفر میں مجھ سے آگے بڑھ گئے
تو اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کے جواب دو کہ کیا تم اس وقت
بھی مجھے اپنی اپنے شبستان حیات کی دلہن بنانے پر اسی طرح
تلے ہوئے ——— یا ایک گھنٹہ بھی سانس بھر کے ایک شاعرانہ انتظار
کرو گے ——— ہاں تو جواب دو ——— میرے اس سوال
کا جو جواب ہوگا اعتبارات کی دنیا ہی کے موافق تمہارے جذبات
کی قیمت لگائے گی

محمود! اپنی زندگی کی قدر کرو ——— یہ گنوانے کی چیز
نہیں اس کے ایک ایک تار سے ہزاروں سال سے تم لاکھوں انسانوں کی
قسمتیں بدل سکتے ہو ——— تمہارا وہ حوصلہ جو ہندوستان میں
ایک اشتراکی جمہوریت کا خواب دیکھ رہا تھا اور اس جمہوریت میں
اپنے لئے صدر کی کرسی تجویز کر رہا تھا آخر کس کروٹ سو گیا تمہیں
اس کو جگاؤ سلیمہ نہ ملی تو نہ ملے تمہاری کوشش سے ہندوستان کو
ایک اشتراکی جمہوریت تو مل جائے - ہندوستان کے بھوکوں کو روٹی
تو مل جائیں ——— جان ہی دینا ہے تو سلیمہ کے لئے کیوں
جان دو - وطن کے مستقبل کے لئے کیوں نہ جان دو - مرنا ہی ہے تو
سمندر میں ڈوب کے یا موت کے بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کے کیوں -
مرو برطانوی سنگینوں کی چھاؤں میں سینہ پر گولیاں کھا کے
کیوں نہ مرو - یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ اس بچے کی طرح جو کسی
بھیانک چیز سے ڈر کے ماں کی گود کی طرف بھاگے نہ زندگی سے
ڈر کے موت کی طرف بھاگے جا رہے ہو ——— اگر اس فریب
میں مبتلا ہو؟ اگر حرص تمہیں موت کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہی
ہے کہ کسی دوسری زندگی میں مشیت کا ہاتھ تمہاری روح کے
شریک کو تمہاری روح تک پہونچا دے گا ——— تو مشیت کی
نبض کس نے ٹٹولی ہے کون جانتا ہے کہ اس زندگی میں تمہاری جیتی نہ
ہو جائے گی ——— بہت ممکن ہے کہ ذرات کی وہ کشش جو
آج ایک دوسرے کو کھینچ رہی ہے کل ہمیں اور تمہیں ایک ہی بطن میں
کھینچ کر لے جائے ——— اور پیدا بھی کرے تو اس طرح کہ میں
بھائی ہوں اور تم بہن - اس لئے کہ جہاں تک میں تناسخ کو جانتی
ہوں اس کی روحانی رشتہ داریوں میں جنسیت کو کوئی دخل نہیں
گو عناصر کی کشش اور روح کا میلان نہیں بدلتا لیکن زندگی کے ساتھ
جنسیت بدل سکتی اور اکثر بدل جاتی ہے پھر یہ کیوں سمجھتے ہو کہ سلیمہ
پہلی زندگی میں تمہاری بیوی ہی تھی بہت ممکن ہے کہ شوہر ہو بہت
ممکن ہے کہ بھائی ہو ——— بہت ممکن ہے کہ تم پچھلی زندگی میں ایک
عورت ہو - ایک حسین عورت - اور تمہاری باہمی چوٹ بھی تم پر جان
چھڑکتی ہو پچھلی زندگی میں مرد ہوں - تمہاری عاشق ہوں تم نے
اپنے جنسی ذوق کی تسکین چاہی ہو اور تم ان سے بھاگتے ہو -
بہت ممکن ہے آج بھی انکی یہ خواہش شعور کی گہرائیوں میں غیر
محسوس ہو - اور ایک دن دفعتاً محسوس ہو جائے اور وہ تم
سے نتائج کی رسائی میں دیدی تقاضا شروع کریں - تو تم ان کی اس
خواہش کا کیا جواب دو گے؟ محمود! جھنجھلاؤ نہیں تم ہار گئے اور
یہ کوئی نئی بات نہیں تم بچپن سے بحث میں مجھ سے ہارتے ہے

ہو رہ دھتے رہی ہو اور میں مناتی رہی ہوں اس وقت بھی جھنجلا رہی ہو گے ——— اچھا رہو مجھ نہیں میں تصور کی آنکھوں سے تمہاری جھنجلاہٹ کو پیار کرتی ہوں ——— لو اب تو خوش ہوئے؟ اچھا ایک سوال ——— ایک گذارش

ایک بھیک ——— وہ سلیمہ جو بقول تمہارے تمہارے دل کی تمہارے جذبات کی تمہاری تمناؤں کی سرمایہ دار ہی۔ آج اس کی پھر تم سے کچھ مطالبہ کر رہی ہی ——— کیا تم اس کے مطالبے کو ٹھکرا دو گے ——— نہیں سلیمہ بیوفا ہی تم تو بیوفا نہیں۔ اچھا تو اے وفا کے مبلغ دل کی آنکھیں کھول کر دیکھو کہ تمہاری سلیمہ تمہارے پاؤں پر سر کے آنکھوں میں خون جگر کا تحفہ لئے تم سے تمہاری زندگی کی بھیک مانگ رہی ہی ——— خدا کے لئے اس چیز کو جو تمہاری نظر میں اتنی حقیر ہی کہ اسے سمندر میں پھینک دینے کا ارادہ کر رہی ہو ——— غریب سلیمہ ہی کو دے ڈالو۔ اس کی نظر میں اسکی بڑی قیمت ہی۔ وہ اسکی قدر کریگی اور اس کا صحیح مصرف لیکر دیتے ہو؟ دیکھو میرا آنچل پھیلا ہوا ہی ——— دیدو خدا کے لئے دیدو اور آج سے اس چیز کو میری امانت سمجھو ——— اور میں اس کے متعلق جو فیصلہ کروں اس میں مداخلت نہ کرو ——— یہ ہی میری معصوم محبت کا معاوضہ اور یہ ہی میرے ان انمول آنسوؤں کی قیمت جو میں فرض کے مندر میں بیٹھ کر تمہارے لئے بہاتی رہتی ہوں۔ یقین کرو کہ میں تم سے بچھڑ کر زندگی کا یہ کام کر سکتی ہوں صرف سچی نہیں بن سکتی ——— مجھے جھنجھنے دو اور اگر وفادار ہو تو کرکے دکھاؤ۔ تڑپو۔ جلو۔ مگر جیتے رہو۔ کیونکہ جانتی ہوں کہ عشق کی فطرت میں بیرحمی ہی وہ کبھی اور یہ تو خیر خود حسن پر بھی رحم نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے باوجود تمہارے عشق کی عدالت سے انصاف چاہتی ہوں ——— ہاتھ جوڑتی ہوں۔ ناک رگڑتی ہوں۔ روتی ہوں گڑگڑاتی ہوں۔ کیا یہی انصاف ہی کہ خود پروانوں کی طرح جلنے اور تڑپنے کے ڈر سے موت کی طرف بھاگو اور مجھے شمع کی طرح صبح تک جلتے رہنے کے لئے اکیلا چھوڑ جاؤ ——— خیر اگر موت مجھ سے زیادہ محبوب ہی تو میں نہیں روکتی خدا حافظ جاؤ ——— لیکن جانے سے پہلے اپنی روانگی کی اطلاع تو دیتے جانا تاکہ میں بھی رخت سفر باندھ لوں۔ اگر یہ بھی وعدہ نہیں کر سکتے تو سمجھ لو کہ تم انتہا درجہ کے خود غرض ہو اور دونوں جہان کی لعنتیں تمہاری منتظر ہیں۔ خبردار محمود! اگر ایسا کیا تو یقین جانو کہ تم میری روح کو اس حد تک آزردہ کروگے کہ فنا کے بعد بھی تو روح میرے عناصر وجود کا ایک ذرہ بھی تمہارے ذروں سے ہم آغوشی گوارا نہیں کرے گا۔

بہر حال خط ختم کرتی ہوں ——— اور ایک بار پھر تمہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی ہوں کہ تم میری زندگی میں ایک تلخ حقیقت کی طرح شامل ہو اور رہو گے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

اب تک

تمہاری سلیمہ

فرض کی قربانگاہ

کا

حصہ اول اگر آپ دیکھنا چاہیں

تو

ندیم بہار نمبر سنہ ۳۵ء منگائیے

اسکی صرف چند جلدیں دفتر میں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت صرف عہ منجہ

عورت اور شدت

از پروفیسر محمد مسلم صاحب ام۔ اے

اُس زمانہ کا ذکر ہے جب ہندوستان میں گاندھی جی کا ایجاد کیا ہوا مدافعت کا وہ عجیب حربہ چل رہا تھا جس نے دنیا کو متحیر اور انگریزوں کو زچ کر رکھا تھا، جسے مقاومت انفعالی یا مجہولی یا ستیہ گرہ کہتے ہیں اور تاریخ سیاست میں ایک انوکھا چٹکلا سمجھا جاتا ہے۔ مگر نوجوان بنوے کمار گھوش اُس جماعت کا رکن تھا جو آزادی کے لئے اپنی جان آپ کھپانے کی قائل نہ تھی۔ وہ بھوک ہڑتال اور اپنی مرضی سے زنداں کی سیر سے عاجز و متنفر تھی۔ وہ حریت کے لئے اپنے خاص نسخہ پر اعتقاد رکھتی تھی۔ حکومت نے اس گروہ کی طرف غیر معمولی اعتنا کر کے اسکی عزت و شہرت کو چار چاند لگا دئے۔ اس کے پیچھے جاسوسوں کی فوج لگا دی۔ ذہین۔ خوبصورت اور باوقار بنوے اس گروہ کا ایک معزز رکن تھا۔ اس نے اپنے سرداروں کو یقین دلا کر کہ وہ ان کے سیاسی پروگرام کی پیروی میں اپنی جان تک عزیز نہیں سمجھتا، خفیہ فوج کے کپتان کے عہدے کا منتظر اور پھر سپہ سالاری کا آرزومند تھا۔ اور انجام کار آمر مطلق (ڈکٹیٹر) کے درجہ کا خواب دیکھا کرتا۔

مگر ایک خواب اس سے بھی زیادہ شیریں جو وہ سوتے جاگتے چلتے پھرتے ہر وقت دیکھا کرتا۔ وہ اُس کی موہنی تھی۔ اس کی باغیانہ یا حریت پرور زندگی کی محرک، روح رواں پیٹرول بلکہ بارود۔ وہ خود صرف جلنے والی بتی تھا اور وہ آگ۔ اگر بنوے کی ساری زندگی کے مخلوط محرکات کا تجزیہ کیا جاتا تو یہ آسانی ثابت ہو جاتا کہ وطن پرستی، حریت طلبی وغیرہ صرف ضمنی اور ماتحتی اجزا تھے۔ اصل طاقت جو کام کر رہی تھی وہ موہنی کا عشق تھا۔

موہنی ایک سیماب سن آتش خو، پرجوش بہادر جوان کو، خواہ وہ قاتل ہو ڈاکو ہو یا ڈکٹیٹر، ایک سنجیدہ باوقار صلح پسند، علم دوست، پاکباز شخصیت سے افضل ہی نہیں بلکہ قابل محبت و پرستش سمجھتی تھی۔ اس کا معیار علم و فضیلت تھا نہ اخلاق، بلکہ شدت، حدت، حرارت، فتنہ۔ وہ دیوتا جس کے ایک ہاتھ میں بم دوسرے میں پستول ہو۔ بنوے اس حسین شعلہ کے لئے ہر خطرہ جھیلنے اور عزیز سے عزیز قربانی دینے کو تیار تھا۔ وہی اس کی حب وطن تھی وہی سیاست بلکہ دین و ایمان۔

بنوے اپنی جماعت کی سرداری اور آمریت کے صرف خواب ہی نہیں دیکھا کرتا بلکہ ان مدارج کے استحقاق کے لئے ایسے موقع کی تاک میں تھا کہ عملی صلاحیت کا ثبوت دے سکے اور قابلیت کی دھاک بٹھا سکے۔ راتوں کو اس کی آنکھیں چاند تاروں پر گڑی ہوتیں اور دل میں یہ اُدھیڑ بن کہ دن میں جن سفید فام صاحبوں کا پیچھا کرتا رہا ہے ان میں سے کس کو شکار منتخب کیا جائے اور حملہ کی کیا تدبیر اختیار کی جائے۔ دقت یہ تھی کہ کلکتہ کی سڑکوں پر صاحبوں کی کثرت تو تھی مگر کالے کوّوں کی طرح یہ گورے بھی سب یکساں ہی نظر آتے۔ یہ معلوم کرنا مشکل کہ ان میں کون انگریز ہے کون فرانسیسی، کون امریکی۔ کون جرمن ہے کون اطالوی۔ کون روسی۔ بالخصوص جرمن اور روسی کو دوست سمجھتا اور کوئی ضرر پہنچانا نہ چاہتا۔

ایک رفیق نے صلاح دی اخبار "دوست ہند" موزوں شکار ہوگا۔ جس کے دشمن ہند اور انگریز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ متواتر چار روز دفتر دوست ہند کے سامنے گشت لگاتے رہنے پر بھی کسی انگریز اڈیٹر کی شکل دکھائی نہ دی تو بنوے کو شبہ ہونے لگا کہ ایا اس اخبار کا کوئی انگریز اڈیٹر ہے بھی، اور اگر ہے تو سیاسی قاتلوں کے خوف سے کہیں مضافات میں رہتا ہو، جہاں سے وہ اختتامیے اور شذرات دفتر میں بھیج دیا کرتا ہو۔ بہرحال وہ اڈیٹر کا پیچھا چھوڑ کر دوسرے شکار کی فکر میں پڑ گیا۔

ایک رات بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اس کے دماغ میں یہ خیال کوند گیا۔ "میں شکار کی تلاش میں ناحق باہر مارا مارا پھرا

اور وقت ضائع کرتا رہا جب برابر کے کمرے میں ایک قیمتی شکار موجود ہے۔ میرے ماما وہ ماما ہیں سرپرست ہیں باپ کی جگہ پر ہیں، تو کیا ہوا۔ وطن کی محبت سب رشتوں سے زیادہ مضبوط اور عزیز ہے۔ وہ سرکاری وکیل ہیں۔ انھوں نے سرفروشانِ وطن کے خلاف قانونی پیروی کرکے ان کو پھانسی دلائی ہے اور جیل بھیجا ہے۔ ان کا داغِ مصیبت اگر دھل سکتا ہے تو انھیں کے خون سے انھیں بھارت ماتا پر اپنی جان کا بلدان دے کر آتما کو پاک کرنا چاہیے۔ یہ ان کے قریب ترین رشتہ دار خود میرے ہاتھ سے زیادہ قابل قبول ہوگا۔ وطن کو یہ میری نذر ہوگی۔ سب سے عزیز، گراں بہا جیسے اسرائیلیوں کے پیغمبر ابراہیم نے اپنے بیٹے اسمٰعیل کو اپنے معبود پر بلی دیا تھا۔ اس قربانی سے جماعت میں میرا وقار و اقتدار بھی سب سے آگے بڑھ جائے گا۔" صدر دفتر کو اپنی تجویز کی باقاعدہ اطلاع دے کر منظوری کا انتظار کرنے لگا۔

اب ایک لمحہ ضائع کرنے کا وقت نہ تھا۔ جب تک منظوری آئے سب سامان تیار رہنا چاہیے۔ بہترین موقع اور سہج گھڑی اختیار کرنا چاہیے۔ سب سے اہم مسئلہ ہتھیار کا انتخاب تھا۔ پہلے زہر کا خیال آیا جو سب سے آسان تھا مگر یہ مزہ نہ آیا نہیں سیاسی قاتل کو زہر خورانی سے کام لیتے نہیں سنا یا گیا۔ نہیں ریوالور سے زیادہ کوئی ہتھیار موزوں نہیں۔ مگر یہ آئے کہاں سے؟ ملک بھر کے پستولوں اور بندوقوں پر حکومت کی عقابی نگاہیں۔ ماما کے لئے اس کا لیسنس حاصل کرنا کتنا آسان تھا۔ مگر انھوں نے اس کی کبھی پرواہی نہ کی اپنے اوپر پورا بھروسا رکھتے ہیں۔ کسی دشمن کا خوف ہی نہیں۔ اور خبر نہیں کہ بھانجے کے ہاتھ سے ہی موت لکھی ہے۔ بنوے ماموں کی فراخ کن پیٹی سے بہتے ہوئے خون کا تصور کرکے مسکرانے لگا۔

ایک شام نرمل بابو عدالت سے تھکے ہارے گھر آکر حقہ پی رہے تھے۔ وہ ہر طرح مغربی معاشرت کے دلدادہ ہونے کے باوجود کبھی سگریٹ سگار کو منھ نہ لگاتے تھے۔ ایک خط میز پر دھرا تھا۔ اٹھایا، پڑھا۔ کاتب کا نام نہ تھا مگر وہ رات کے بارہ بجے ان سے ملنا چاہتا تھا۔ لکھا تھا "آپ اور آپ کا خاندان سخت خطرے میں مبتلا ہیں۔ میں بچا سکتا ہوں۔"

نرمل بابو گھبرا گئے۔ یہ آدھی رات کی ملاقات اور خطرے کی تنبیہ! وہ کسی خطرے کا گمان نہ کرسکتے تھے۔ وہ عملی سیاسیات میں حصہ ہی نہ لیتے تھے، نہ ان کے علم میں ان کا کوئی دشمن تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے وکیلوں کی طرح چھچھورے کم ظرف نہ تھے۔ مقدمات میں اپنے موافق ثبوت کے ایجاد و اختراع، غیر ضروری بیہودہ جرح .... و بحث یا اور کمینہ ہتھکنڈوں سے کبھی کام نہ لیتے تھے۔ ان کے نجی اور خانگی معاملات بھی صاف تھے پھر یہ خطرہ کیسا؟ شاید کسی نے مذاق کیا ہے یا کوئی سیاسی کچا استوصال بالجبر کا خواہاں ہے۔ یہ خط پولیس کے حوالہ کردیا جائے؟ پھر تسکین استعجاب کے شوق نے انھیں اس کارروائی سے باز رکھا اور وہ وقت مقررہ کا انتظار کرنے لگا۔

وہ اپنے کتب خانہ میں دیر تک پڑھتے رہے۔ بارہ کی گھنٹی بجتے ہی دروازے کی طرف نظر اٹھائی آنے والے کے انتظار میں سوا بارہ بج گئے۔ کتاب بند کرکے کرسی سے اٹھے، برقی لیمپ گل کیا، خوابگاہ کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ایک سایہ دروازے سے داخل ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ انھوں نے بٹن دبا کر پھر روشنی جلا دی، ایک خوش اندام قد رسے پست قامت شکل بنگالی لباس میں سر پر ٹوپی ٹیپ رکھے کھڑی تھی۔ آواز آئی "اندر آنے کی اجازت ہے؟" "آجائیے۔" آگئی۔ "بیٹھ جائیے" بیٹھنے سے پہلے اس شکل نے ٹوپی اتار دی، نقلی مونچھیں جدا کیں، فیشر کے بٹن کھول دئے اور ایک خوبصورت نوجوان شریف زادی بن گئی۔ وکیل صاحب کسی عورت ملاقاتی کے لئے تیار نہ تھے۔

نرمل بابو:۔ مجھے امید نہ تھی کہ میرا گمنام کرم فرما ایک خاتون ہوگی۔

لڑکی:۔ ہوا ہے مگر اس سے زیادہ خلاف امید باتوں کے لئے تیار ہو جائیے۔"

وہ چاروں طرف دیکھنے لگی۔ وکیل صاحب مطلب سمجھ گئے۔

نرمل بابو:۔ نہیں کوئی متنفس آس پاس نہیں۔ تم آزادی سے باتیں کرسکتی ہو۔"

لڑکی کرسی قریب کرکے بولی" آپ خطرے کی نوعیت معلوم کرنے کے لئے بے چین ہونگے۔ اور اس سے متنبہ کرنے والی ایک لڑکی کو دیکھ کر اور بھی حیران ہوں گے۔ پہلے میں اس دوسری حیرانی کو دفع کئے دیتی ہوں۔ دو پشتیں گذریں آپ کے خاندان کے ایک رکن شاید پردادا نے ہمارے خاندان کی آڑے وقت میں گرانقدر اعانت کی تھی جس کے بغیر ہمارا خاندان تباہ ہو گیا ہوتا شاید آپ کو اپنے بزرگ کے اس کارنامہ کی خبر نہ ہو۔ خود مجھے صاف طور پر معلوم نہیں کہ وہ کیا تھا۔ بہرحال ہمارے بزرگوں نے اس احسان کی یاد ہمیشہ ہمارے دلوں میں تازہ رکھی ہے۔"

نرمل بابو کے چہرے پر مسرت اور فخر کی چمک دوڑ گئی "ہاں مجھے بھی سننا ہے کہ میرے پردادا نے بنیایت رحمدل اور فیاض بزرگ تھے۔ اور ان کو سخاوت و فیاضی کے مواقع بھی زیادہ تھے۔ وہ بنگال کے سب سے دولتمند زمینداروں میں تھے۔"

لڑکی :- بے شک۔ اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ دو پشتیں گذر جانے پر بھی ان کے ممنون کرم خاندان کی ایک لڑکی اس احسان کا شکر ادا کرنے کے قابل ہوئی۔ مگر آپ کو وعدہ کرنا پڑیگا کہ کوئی سوال نہ کریں خصوصاً میری ذات سے متعلق، کہ میں اس کے افشا سے قطعاً مجبور ہوں۔ آپ سے اس وقت تنہائی میں ملنے کا موقع نکالنے کے لئے مجھے جن خطروں سے گذرنا پڑا وہ کچھ میں ہی جانتی ہوں۔ آپ اسے زیادہ نہ سمجھ سکیں گے۔ جب آپ کو معلوم ہوگا کہ جس سرکار کا نمک آپ کھاتے ہیں اسی کی نمک خوار میں بھی ہوں۔"

نرمل بابو :- کیا تم کسی سرکاری ملازمت ——

لڑکی :- (بات کاٹ کر) "جی ہاں۔ میں محکمۂ تفتیش جرائم کی ادنیٰ افسر ہوں۔"

نرمل بابو :- "خوب! اچھا اب میں سوال نہ کرونگا۔"

لڑکی :- "خوشی کی بات ہے کہ آپ موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہیں اور آپ نہ سمجھیں تو کون سمجھ سکتا ہے۔ خیر اب جو کچھ میں جانتی ہوں عرض کئے دیتی ہوں۔"

سرکاری وکیل نے سر آگے بڑھا دیا اور کان لگا دئے جیسے وہ موکلوں کی باتیں سننے کے وقت عادتاً کیا کرتے ہیں۔ لڑکی نے دبی آواز میں کہا" آپ نے کبھی یہ بھی محسوس کیا ہے کہ آپ کے خاندان میں کوئی سیاسی مخبوف ہو سکتا ہے؟"

نرمل بابو چونک کر پیچھے کی طرف جھک گئے مگر فوراً اپنے آپ کو سنبھال کر بولے" قاعدہ یہ ہے کہ ہمارا خاندان سرکار کا وفادار رہا ہے۔ اور ہمارے بچوں کو سرکار کی عزت کرنے اور ہر طرح کی بغاوت اور غداری سے نفرت کی تعلیم دی گئی ہے۔ اسی خاندانی روایت سے ہمارا کوئی فرد کبھی ایک اپخ باہر نہ ہوا۔"

لڑکی :- "جی ہاں سچ ہے۔ مگر سرکار تو آپ کے بیٹے اور بھانجے میں کوئی فرق نہیں کرتی، خصوصاً جو بھانجہ آپ کے ساتھ ایک گھر میں آپ کی زیر نگرانی و سرپرستی رہتا ہو۔"

نرمل بابو :- "اس کیا کہا؟ کیا تمہاری مراد یہ لڑکا بنوے ——— وہ جملہ تمام نہ کر پائے تھے کہ

لڑکی :- "جی ہاں۔ یہ ایک دردناک واقعہ ہے مگر واقعہ ہے کہ وہ سیاسی مخبوفین میں شامل ہو گیا ہے۔"

(نرمل بابو سامنے کتابوں کی قطار پر نظر گاڑے سوچنے لگے)

"آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا عزیز بھانجہ اسوقت کہاں ہے؟"

نرمل بابو :- "یقیناً وہ اپنے کمرے میں پڑا سوتا ہوگا۔"

لڑکی :- آپ ذرا تکلیف فرما کر وہاں جائیں اور دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کا یقین کہاں تک صحیح ہے (مسکراتے ہوئے) جناب عالی اس دم کہ تم آپ باتیں کر رہے ہیں بنوے مخبوفین کے ایک جلسہ میں صدارت کر رہا ہے۔ ممکن ہے صدارت کر رہا ہو۔ وہ اپنے حلقے کا سرغنہ ہے۔ ہمیں خبر ہے کہ آج ایسا ایک جلسہ ہے گو اب تک جگہ کا ہمیں پتہ نہیں۔"

نرمل بابو :- "میں ابھی دیکھے آتا ہوں۔ ایک منٹ میں۔"

نرمل بابو اٹھتے ہوئے بولے۔ انھوں نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اندر بچوں کے بل زینوں پر چڑھ گئے۔ فوراً لوٹے۔ "واقعی وہ وہاں نہیں ہے۔"

لڑکی :- "میں نے آپ سے کیا عرض کیا تھا؟ خیر اب وکیل کی طرح آپ مجھ سے پوچھ سکتے ہیں ایا رات کو گھر سے غائب ہونا اس الزام کا کافی ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ مخبوفین کی مجلس میں شریک ہے؟ مگر جناب عالی اس شبہہ کی گنجایش بھی باقی نہ رہے اگر ایک دفعہ اور زحمت فرما کر بنوے کی کتابوں پر ایک نظر ڈال لیں۔ آپ انقلابی ادبیات کا ایک کافی ذخیرہ پائیں گے۔"

نرمل بابو :- (بپھرے ہوئے) "ہمیں پورا یقین ہے؟"

لڑکی :۔ "ایسا ہی یقین کہ یہ رات ہے اور میں آپ کے سامنے کھڑی ہوں۔ میں یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ یہ ناپاک چیزیں کمرے کے کس گوشہ میں ہیں"؟

نرمل بابو :۔ (دروازے سے مڑتے ہوئے) "کہاں"؟

لڑکی :۔ "کمرے کے جنوبی گوشے میں ایک لکڑی کے پرانے صندوق میں ان کے پرانے اخبار ہیں۔ ان کو اٹھائیے۔ نیچے وہ خزانے گا"۔

اگلے نرمل بابو دس منٹ غائب رہے۔ اور ہاتھوں میں کتابیں اور پرانے رسالے لئے لوٹے۔ اور میز پر رکھ دئے۔ حیات لینن۔ انقلاب آئر لینڈ۔ اصول فلسفہ میکیاولی۔ رسالوں کے سرورق غائب تھے۔

لڑکی :۔ "اب میں کچھ باتیں اور بتاتی ہوں"۔ بٹوے سے ایک خط نکال کر بڑھایا۔

نرمل بابو :۔ (لیتے ہوئے) موجودہ قانون تعزیرات اور آرڈیننس کی رو سے اس کے محکمے میں طوق اسیری ڈالنے کے لئے یہ کافی ثبوت ہے۔ اس سے زیادہ کی ضرورت نہ تھی"۔ عینک لگا کر خط کھولتے ہیں

لڑکی :۔ "آپ اس کا ہر لفظ شاید سمجھ نہ سکیں یہ لوگ کچھ علامتا استعمال کرتے ہیں۔ پھر بھی سکیس بنگلہ میں اتنا کچھ موجود ہے کہ آپ کو سازش اور بنوٹے کی اس میں شرکت کا اندازہ مل جائیگا"

نرمل بابو نے خط پڑھ کر کانپتے ہوئے ہاتھ سے اسے میز پر رکھ دیا۔

لڑکی :۔ "آپ کو اس تحریر میں کوئی شبہہ تو نہیں"؟

نرمل بابو :۔ "بالکل نہیں۔ یہ بنوے کی تحریر ہے"۔ چھت کی طرف دیکھنے لگے۔ گویا بلائے آسمانی کی طرف گھور رہے تھے۔

لڑکی :۔ "نرمل بابو آپ گھبرائیں نہیں۔ اب تک وقت ہاتھ سے نہیں نکلا"۔

نرمل بابو کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے جیسے کچھ سنا نہیں پھر ایک بھاری سانس لے کر :۔

"عزیز خاتون! تم کہتی ہو کہ کبھی میرے خاندان نے تمہارے خاندان کی کوئی خدمت انجام دی ہے۔ یاد کرو اگر تم نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائی تو مجھے اور میرے خاندان کو ہمیشہ کے لئے خرید لوگی"۔

نوجوان خفیہ افسر کے خوبصورت لب ہمدردی کے تبسم سے پھیلے اور سمٹے، کھلے اور بند ہوئے۔

——— نرمل بابو آخر اس سے میں آپ کے پاس آئی کس لئے ہوں؟ سنئے ہمارے پاس لے دے کر یہی (کتابوں اور خط کی طرف اشارہ کرکے) شہادتیں ہیں۔ باستثنا ایک اور خط کے جو بدقسمتی سے ان سب سے زیادہ ناطق ثبوت ہے۔ وہ میرے ایک رفیق کے پاس ہے۔ آپ کو معلوم ہو یا نہ ہو کہ ہمیں کسی مقدمہ کی تفتیش میں تنہا کام کرنے کی اجازت نہیں۔ ہر مقدمہ میں کم سے دو کارکن ہوتے ہیں۔ بہرحال اگر وہ خط حاصل کیا جا سکے تو کوئی اندیشہ باقی نہ رہے۔ بشرطیکہ آپ اپنے بھانجے کو آئندہ ایسی حماقتوں سے باز رکھ سکیں"۔

نرمل بابو :۔ "تم اطمینان رکھو میں اس کی سبیل کرونگا۔ ضرورت ہوئی تو (دانت پیسکر) میں بنوے کو گھر میں مقفل بھی کر دونگا۔ مگر پلیز یہ بتایئے کہ وہ خط حاصل کس طرح کیا جائے تم غالباً اُس رفیق افسر کا نام پتہ تو بتاؤ گی نہیں جس کے قبضہ میں وہ خط ہے؟"

لڑکی :۔ "اولاً وہ میرا دوست نہیں، صرف رفیق کار ہے۔ بہر صورت میں اس کی شخصیت پر سے پردہ نہیں اٹھا سکتی۔ اور اگر آپ اُسے جانتے بھی ہوتے تو اُس سے خط واپس لینے کی توقع کیسے کر سکتے ہیں؟

نرمل بابو :۔ "عزیز خاتون" میں سوچ رہا تھا کہ اس افسر کے ذاتی حالات معلوم ہوتے تو ممکن تھا کوئی کوشش کی جاتی ——— کردہ ——— آآآ ———"

لڑکی :۔ "ہاں ہاں۔ میں آپ کا مطلب سمجھ رہی ہوں۔ روپیہ رشوت؟ تو واقعی وہ کوئی خوشحال آدمی نہیں۔ میں اتنا ہی بتا سکتی ہوں۔ کسی بہانے سے اُس کو آپ کے پاس بھیج دے سکتی ہو معاملے کر لیجئے گا"۔

نرمل بابو :۔ "نہیں نہیں، میرا ملے کرنا کچھ ٹھیک نہیں۔ رفیق کار کی حیثیت سے تم کو سربراہ کرنے کا بہتر موقع حاصل ہے"۔

لڑکی :۔ (تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد) "نرمل بابو میں آپ سے کچھ وعدہ نہیں کرتی۔ آخر وہ انسان ہے اور ممکن ہے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا جا سکے"۔

نرمل بابو :۔ "تمہارے خیال میں کتنی رقم درکار ہوگی"؟

لڑکی :۔ "میں کوئی صحیح اندازہ نہیں بتا سکتی۔ مگر قیاس کرتی ہوں کہ اگر اس نے ہاں کہی تو دو ہزار تک شاید راضی ہو جائے"۔

زمل بابو:- (اٹھتے ہوئے) "تو روپیہ آپ کے حوالہ کر دوں۔ چک تو یقیناً خارج از سوال ہے؟"

لڑکی:- "ظاہر ہے۔ بالکل بیکار۔"

آخر جب وہ خفیہ پولیس کی نوجوان خوبصورت افسر نوٹوں کی گڈی اپنے دستی بیگ میں رکھ کر اٹھنے لگی تو میز کے کاغذات کی طرف اشارہ کرکے بولی "زمل بابو شاید یہ یاد دلانا آپ کے لئے غیر ضروری ہے کہ ان سب کو فوراً جلا کر فنا کر دیجئے"

"ہاں ہاں! ابھی ابھی! مگر بتاتی جایئے کہ پھر آپ سے حال کب معلوم ہوگا؟"

"کل اسی وقت۔ یا آپ کے ہاتھ میں وہ خط ہوگا یا یہ نوٹ۔"

نوٹ لوٹانے کا ذکر نہ کیجئے۔ خدا کرے آپ خط ہی واپس لائیں۔ شکریہ۔

صبح صادق کے دھندلکے میں میدان کے درخت کے نیچے مونی بنوے سے آملی۔ اور نوٹوں کی گڈی بڑھاتی ہوئی بولی "پیارے بنوے۔ یہ لو روپے جن کے لئے تم اتنے فکرمند تھے۔ جیسے ہم نے نقشہ بنایا تھا ٹھیک ویسے ہی ظہور پذیر ہوا۔ بڑے میاں سے مجھے زیادہ زحمت نہ ہوئی۔ اب نصف درجن ریوالوروں کے لئے کافی سے زیادہ رقم مہیا ہوگئی۔"

بنوے:- پیاری مونی! اب ہمیں روپے کی کیا ضرورت رہی؟

مونی:- کیوں؟ کیا ہوا؟

بنوے:- پیاری مونی! کیا یہ افسوسناک واقعہ نہیں کہ جب ہم نے اتنی پریشانیوں کے بعد سب سے بڑا مرحلہ طے کر لیا۔ تم ایسی چالاکی سے ماموں جان جیسے فرزانہ سے روپیہ اینٹھ لائیں، صدر مقام نے پالیسی ہی بدل دی۔ جس وقت تمہارے پاس تھیں صدر مقام سے جواب آیا کہ انجمن نے گورنمنٹ کے ہندوستانی طرفداروں کے قتل کی تجویز کو مسترد کر دیا۔ اب کیا کروں؟"

مونی:- اس میں افسوس اور مایوسی کی کیا بات ہے؟ میں تو سمجھتی ہوں یہ اچھا ہی ہوا۔ سچ پوچھو تو تمہارے ماما سے ملنے کے بعد ان کو خاک دھوں میں تڑپتا دیکھ کر مجھے بڑا دکھ تھا۔"

بنوے:- آخر ہو نہ عورت؟ پسیج گئیں۔ افسوس میری قتل کی یہ گیارھویں کوشش تھی جو یوں برباد ہوئی۔ شاید میرے ہاتھ سے کچھ برا آنا مقدر ہے۔ نہ تمہارا ہاتھ آنا۔"

مونی:- "پست ہمت منصوبے سوچتے اور جھجکتے رہ جاتے ہیں اور کرنے والے کر گذرتے ہیں۔"

مونی آہستہ بولی مگر بنوے نے سن لیا اور ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگیا۔

ہفتوں گذر گئے بنوے کو جانبازی دکھانے کا موقع نہ ملنا تھا نہ ملا۔ شاید وہ اس جنون سے نجات پا جاتا اگر آزاد ہوتا۔ مگر مونی کی توجہ اور اغتلاط میں کمی دیکھ کر اور ایک آدھ بار چبھتا ہوا فقرہ سنکر اس کا خون تازہ جوش سے کھولنے لگتا۔ آخر گورنر بنگال کے اسپیشل ٹرین کو پٹڑی سے اتار نیوالی جماعت میں بنوے کا انتخاب ہوگیا۔

پٹڑی کے فش پلیٹ کھول دیے گئے مگر فلیتہ لگانے کی کوشش میں سب پکڑے گئے۔ بنوے چاہتا تو بھاگ نکلنے کا موقع تھا مگر بھاگنا ایک خطرے سے نکل کر دوسرے خطرے کے منہ میں جانا اور انقلابیوں کے ہاتھوں کتوں کی موت مرنا تھا۔ خوف سے دل لرز رہا تھا مگر کوئی جنون سہارا دے رہا تھا۔ دھائی سے اسے پولیس افسر کے روبرو کھڑا کیا گیا تھا۔ مقدمہ ہوا۔ اخبار میں بیانات سے اس نے سارا الزام قبول کر لیا اگر اسے وطن کی خدمت اور قربانی سے تعبیر کیا۔ اخباروں میں اس کا بیان شائع ہوا۔ واہ واہ ہوئی۔ شہید حریت قرار دیا گیا۔ بنوے نے سکون سے کچھ سال قید یا مشقت کا فیصلہ سنا۔

اس کا ہاتھ جیل کے ہتھوڑے پر اور دل مونی کے پاس رہتا۔ "اسے اپنے جانباز شہید وطن پر کتنا ناز ہوگا! وہ اپنے بنوے سے ملنے کے لئے کتنی بیتاب ہوگی! چھ سال، چھ لمبے پہاڑ سال! پھر؟ پھر مونی، حسین دلیر مونی! اس کی ناگن جیسی زلفیں، نشیلی آنکھیں، حرمت نشان پیشانی، بھنوؤں کے کمان، بنوے کی ہلاک ہوں گے۔ وہ راجہ ہوگا، مونی رانی۔ وہ ہیرو ہوگا مونی ہیروئن، وہ رام چندر ہوگا مونی سیتا۔"

مگر مونی کبھی جیل میں بنوے سے ملنے نہ آئی۔ بنوے نے سوچا مونی کو تاب ملاقات نہ ہوگی، یا جیل کے افسروں کی اجازت نہ ہوگی۔

بنوے ایک فرمانبردار، نیک چلن، فرض شناس قیدی ثابت ہوا۔ کسی مشقت سے جی نہ چراتا۔ جو خدمت اسکے ذمہ ہوتی ہمت سے پوری کرتا۔ جیلر کلیم خاں ایک تنومند، خوبصورت، بلند خیال جوان تھا۔ بنوے سے اس کی دلچسپی ہونے لگی جو دوستی کے درجہ پر پہنچ گئی۔ کلیم خاں اور بنوے میں سیاسیات کے ساتھ اکثر ہندو مسلم اتحاد پر گفتگو رہتی۔ کلیم خاں اس اتحاد کے جوش میں ہندو مسلم مخالفت، معاونت، موالات کی تجویز سے گذر کر متناکحت تک کی حمایت کرتا۔ اور لے دے کر اسی اتحاد نسل دخوں کو ہندوستان اور دنیا کی آزادی و صلح کا واحد علاج قرار دیتا۔ بنوے اپنی سیدھی کے اعلان اور اشتراکی مشرب کے اقرار کی بنا پر کلیم کے دعوے سے اختلاف نہ کرتا۔ مگر اس خیال سے اتنا شغف نہ دکھاتا جتنا اور انقلابی پروگرام سے۔ انقلابی دونوں جوان تھے مگر دونوں کی راہیں دو تھیں۔ ایک سیاسی اشتداد، تخویف، قتل و غارت، سرفروشی و بغاوت کا قائل تھا۔ دوسرا سماجی انقلاب کو سیاسی انقلاب کا پہلا زینہ قرار دیتا تھا۔ کلیم جس طرح تندرستی اور وجاہت ظاہری میں بنوے سے برتر تھا۔ علم و تجربہ اور قوت گویائی میں بھی اس پر فضیلت رکھتا تھا۔ بنوے زیادہ تر اس کی منطق سے قائل ہو جاتا۔ وہ کلیم خاں کی عزت کرنے لگا تھا اور کلیم خاں اس کی۔ بیش و کم دونوں کے خیالات ایک دوسرے سے متاثر ہو رہے تھے۔ کلیم کی بدولت بنوے کی زندگی نسبتہً آرام اور گونہ دلچسپی سے گذرنے لگی۔

پانچ برس کی طویل مدت میں ملک کی سیاست میں عظیم الشان تغیر پیدا ہو چکا تھا۔ جدید اصلاحات سیاسی کو آزما دیکھنے کے لئے حکومت و رعایا دونوں کے طرز عمل میں مفاہمت شروع ہو چکی تھی۔ تخویف و تشدد کی پالیسی برطرف اور انقلابی سازشیں موقوف ہو چکی تھیں۔ ہندو مسلم اتحاد کی ہوا چل رہی تھی۔

ایک روز کلیم بنوے کی کوٹھری میں بشاش اور شگفتہ داخل ہوا۔

بنوے :۔ "خاں صاحب آج آپ بہت خوش ہیں۔ کوئی نئی خبر ہے"؟

کلیم :۔ "بنوے بابو آخر میری اس تحریر شاعرانہ پھیکی زندگی میں شیریں شعر کے دخل پا لیا۔ شعر بھی کیسا؟ مطلع تا باتیں سمجھے؟ کیا سمجھے؟"

بنوے :۔ "سمجھا۔ آپ کی شادی ہو رہی ہے۔ خدا کرے یہ شعر آپ کی زندگی کا وہ لازوال نغمہ ہو جو آپ کو عمر بھر مست رکھے۔ کاش میں بھی آپ کی خوشی میں شریک ہو سکتا"؟

ساتھ ہی موتی کی یاد میں اسکی آواز بھرانے اور آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

کلیم :۔ "بنوے بابو گھبرائیے نہیں۔ آپ کیلئے بھی جا نفزا خوشخبری لایا ہوں۔ آپ کی نیک چلنی کی بنا پر آپ کی میعاد سے ایک سال گھٹا دیا گیا۔ جس دن آپ آزاد ہوں گے دی میری شادی کی تاریخ ہوگی"

آخر وہ ہزاروں حسرتیں دل میں دبائے زنداں سے نکلا۔ جیلر صاحب کے اصرار سے ان کا مہمان ہوا۔ ان کی طرف سے اسے ایک نفیس جوڑا تحفہ ملا۔ اس نے سوچا خاں صاحب کی دلہن کیلئے بہترین تحفہ کیا ہوگا؟ موتی کو آسمانی ساڑی اور فیروزی بلاؤز سے بہت رغبت تھی۔ لاؤ یہی لباس میں اس محسن دوست کی دلہن کو پہنا کر تصور ہی میں موتی کی ایک جھلک تو دیکھ لوں۔

کلیم خاں نے از راہ محبت اسی کا نذر کیا ہوا جوڑا بیوی کو پہنا کر اسی کے ہاتھ لایا۔ مسز کلیم موتی کے لباس میں نہایت شاندار دکھائی دی۔ سامنے آکر اس نے ایک ادائے حیا سے ذرا منہ پھیر لیا اور آنکھیں جھکا لیں تو بنوے "موتی" پکار کر گرتے گرتے سنبھلا۔ وہ صرف موتی کے پسندیدہ لباس ہی میں نہ تھی بلکہ خود موتی تھی۔

اب بنوے پر کھل گیا کہ اس کے ساتھ مسٹر کلیم خاں کی رعایت و مروت اور شادی میں دعوت شرکت، سب موتی ہی کی ستم ظریفی تھی اور یہ قیمت تھی اس کی جانبازیوں کی۔ بول اٹھا "آہ عورت! کمزوری تیرا نام عورت ہے"۔ مگر جب وہ باہر نکلا اور نئی دنیا دیکھی تو ماننا پڑا "کمزوری تیرا نام انسان ہے"۔ "فریب تیرا نام زندگی ہے"۔ "مایہ ہے سب مایہ"۔

بنوے اب جہاں گرد سیاسی ہے۔

دماغ کی شکست

از جناب پروفیسر شبلی ابراہیمی ایم اے

ہندوستان کی موجودہ معاشی حالت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے شادی خانہ آبادی نہیں بلکہ خانہ بربادی ہے۔ پھر اگر کوئی نوجوان دیس، جننا، اور انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا ہو تو اُس کے لئے تو زہر ہلاہل ہے۔ عورت ایک دلکش فریب ہے۔ اُس کے خوبصورت جال میں ایک بار پھنسکر پھر رہائی مشکل ہے .....

"..... ....."

جوتش یہیں تک کہنے پایا تھا کہ بمالا نے بات کاٹکر کہا

"اچھا! اچھا!! یہ سب لکچر کسی اور کو پلاؤ۔ سب مرد اسی طرح بکتے ہیں، لیکن جب وقت آتا ہے تو دیوی کی طرح پوجا کرنے لگتے ہیں"

"لیکن میں اُن لوگوں میں نہیں ہوں"

"اچھا دیکھوں گی، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا"

بمالا اُٹھ کر چلی گئی، مگر جوتش بہت دیر تک شادی کے فلسفہ پر غور کرتا رہا، سوچتے سوچتے وہ گھبراکر اُٹھ کھڑا ہوا اور کوٹ پہن کر باہر نکل گیا ——— وہ آہستہ آہستہ بدبداتا ہوا چلا جارہا تھا۔

میں کبھی بیاہ نہیں کروں گا ——— اِس کمبخت بمالا نے مجھکو معمولی مردوں کی طرح سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ اس کو معلوم ہی نہیں کہ مجھکو مصطفےٰ کمال اور سولینی بننا ہے۔ پھر میں اس جال میں کیونکر پھنس سکتا ہوں۔ خود بمالا ہی نے مجھ پر کیسے کیسے وار کئے کہ میری جگہ پر کوئی دوسرا ہوتا تو اب تک کب کا شہید ہوچکا ہوتا ——— اُس کو غرور ہے اپنی جوانی اور حسن پر اور اس بات کا کہ ایم۔ اے میں پڑھتی ہے۔ مگر وہ جانتی ہی نہیں کہ میرا جگر لوہے کا اور دل پتھر کا ہے۔ جس پر کوئی تیر اثر نہیں کرسکتا .....

یکایک پیچھے سے کسی نے اُس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ جوتش چونک پڑا۔ اُس نے اپنے دائیں طرف ایک شخص کو دیکھا جس کا منہ حبشیوں کے جیسا کالا، آنکھیں چھوٹی چھوٹی، گال پچکے ہوئے اور قد بہت ہی چھوٹا تھا، کمر قدرے جھکی ہوئی تھی ——— بوڑھا آدمی تھا۔

"کیا تم سُنیل کمار چٹرجی کو بھول گئے۔ تمہارے باپ ہیشش بابو سے میری کتنی دوستی تھی ——— مگر ہاں اُس وقت تم بچے تھے اسکول میں پڑھتے تھے۔ اب جوان ہوئے، ایم۔ اے میں پڑھتے ہو، مجھے سب خبر ہے۔ میں تمہارے بارے میں برابر لوگوں سے پوچھتا رہا ہوں۔ تم بچے ہی تھے کہ میں رنگون چلا گیا تھا ....."

"جی ہاں اتنے زمانہ کی بات ہے، اسی لئے مجھے یاد نہ رہ سکا" جوتش نے بات کاٹ کر کہا۔

"ہاں بیٹا تم بچے تھے، تمہیں کیونکر یاد رہتا جیتے رہو بیٹا۔ میری تو لو لگی ہوئی ہے کہ تم ڈپٹی کمشنر پولیس ہوجاؤ۔ بیاہ کرو۔ خوبصورت بہو لاؤ۔ اور یہ کوئی بڑی ..... "

"....."

آپ کہاں رہتے ہیں۔ اپنا نمبر دیجئے، میں آپ سے پھر ملوں گا۔ اِس وقت مجھے ایک بہت ضروری کام ہے" جوتش نے گھبراکر کہا۔

کیا بیٹا اپنی چچی کو اپنی پیاری صورت دکھاکر اُس کا دل خوش نہ کروگے۔ کتنا تم کو یاد کرتی ہے۔ سچ پوچھو تو میں کبھی کبھی بھول بھی جاتا ہوں۔ لیکن وہ تو برابر تمہاری رٹ لگائے رہتی ہے"

جی ہاں! جی ہاں!! ضرور ملوں گا۔ مگر اس وقت ایک بہت ضروری کام ہے۔ آپ اپنا پتہ دیدیں۔ میں پھر کسی وقت مل لونگا"

"اچھا بیٹا جیسی تمہاری مرضی۔ مگر ملو ضرور۔ اُس کو کتنی تمنا ہے کہ تم ڈپٹی کمشنر پولیس ہوجاؤ، تمہارے سر سونے کا سہرا چڑھے، خوبصورت بہو لاؤ ——— جس کا سن سولہ برس کا ہو اور جو ہمیشہ سُنہری کوری گلابی ریشمی ساڑی پہنے رہتی ہو ——— بھی رٹ برابر لگائے رہتی ہے ....."

"....."

"اچھا تو اب اجازت دیجئے" جوتش نے گھبراکر کہا۔

"تم کدھر کو جاؤگے بیٹا" بڈھے نے کہا۔

"میں اس وقت پارک سرکس جارہا ہوں" جوتش نے جواب دیا۔

"میرا ڈیرہ بھی تو اسی طرف ہے۔ ——— چلو پھر تو ساتھ ہی چلنا ہوا۔ ——— تو ہاں بیٹا! اس بوڑھے کی بات مان لو۔ تمہارے ماں باپ تو اسی تمنا میں سُرگ باش ہو گئے ——— تو اب بیٹا میں اور تمہاری چچی ہیں یہ بہا دیکھنے کو زندہ رہ گئے ہیں۔ کیا چاہتے ہو کہ ہم لوگ بھی مر لیں تب اپنا بیاہ رچاؤ گے۔ تو یہ نہ ہوگا، نہ ہوگا۔ ہرگز نہ ہوگا۔ ——— رشتوں کا پرمالا ہے بیٹا کہ بیس برس میں انسان کو بیاہ کر لینا چاہئے اور اکیس سال میں لڑکا ہونا چاہئے ——— ——— بس بیٹا تم بیس برس کے ہو گئے۔ بس اب بیاہ کرو اور بہو لاؤ ——— سندر، منوہر، چندرما ایسی ہو ——— سولہ برس کی۔ ریشمی کی گلابی ساری والی، جس کا کور سنہری ہو ——— اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، بس ہاں کرو ——— اور میں ہوں کس دن کے لئے؟"

"اچھا تو اب پارک سرکس کا موڑ قریب آگیا۔ مجھے ذرا جلدی جانا ہے۔ اجازت دیجئے" جوتش نے گھبرا کر عاجزی کے لہجے میں کہا۔

"اچھا بیٹا! تمہاری خوشی ——— مگر ذرا کچھ کھا تو لو، ہوٹل وہی سامنے ہے ———"

"نہیں! نہیں!! میں جلپان وغیرہ اچھی طرح کر کے باہر نکلا ہوں" جوتش نے کہا۔

"بس بیٹا! یہ کوئی بات ہے ——— جب میں تمہاری عمر کا تھا تو دن بھر میں سات آٹھ مرتبہ کھانا تھا۔ یہ تو تم بوڑھوں کی سی باتیں کرتے ہو"

بڈھے کی ہیئت کذائی، اُس کی بکواس، اور اُس کا بار بار بیاہ کا رٹ لگانا، ایسی باتیں تھیں کہ جوتش کو اُس سے گھن آنے لگی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ کسی صورت سے اپنی جان چھڑا کر بھاگ جائے۔ لیکن بڈھا تہیہ پر اتھا اور جوتش اپنی گردن چھڑانے میں کامیاب نہ ہوتا تھا۔ نہیں نہیں کر کے اُس کو ہوٹل بھی جانا ہی پڑا۔

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی دو نوکر سیوں پر بیٹھ گئے۔ بوائے سلامیے سے نمودار ہوا اور آتے ہی بڈھے سے کنکھی مار کر بولا "کیا کوئی شکار پھنسا ہے؟"

بڈھے نے جواب میں جھنجھلا کر کہا "جا جا جلدی سے توس، کیک، انڈے، مٹن چاپ اور چائے لا"

بوائے گیا مگر "شکار" جوتش کے کانوں میں اب تک گونج رہا تھا۔ اُس نے چند منٹوں تک غور کیا کہ اس کے کیا معنی ہیں! پھر اُس نے کہا کہ شاید یہ مختار کاری وغیرہ کرتا ہوگا اور شاید بوائے مجھکو موکل سمجھ رہا ہے۔ یہ سوچ کر جوتش چپ ہو گیا۔

اتنے میں بوائے نے چائے اور کھانے کی چیزیں ٹیبل پر لا کر رکھ دیں۔

"بس بیٹا! شروع کرو۔ شرمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو بوڑھا آدمی ہوں صبح کو جو کھا کر چلا ہوں وہی ابھی ہضم نہیں ہوا ہے۔ میں تو کھانے سے رہا ——— ایں تم شرما رہے ہو ——— لو یہ کیک تو کھاؤ ——— اور لو اس انڈے کو تو ختم کرو ——— اور ہاں یہ مٹن چاپ تو کھا لو ——— جب سسرال جانا تو شرما لینا۔ یہاں شرمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سسرال میں سالیوں کی ہنسی کے ڈر سے نہ کھانا ——— ہاں کیا ہے....."

جوتش واقعی شرما رہا تھا اور اُس نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا "جی نہیں میں کھا تو رہا ہوں ——— اصل یہ ہے کہ میں کھا کر چلا ہوں، اسلئے زیادہ کھانے سے مجبور ہوں"

"نہیں بیٹا! تم کو ہمارے سر کی قسم یہ سب کھانا ہوگا۔ ——— دیکھوں گا جب تمہاری دولہن کھڑی ہو کر کھلائیں گی تو کیسے عذر کرتے ہو۔

بیٹا! میں بھی جوان تھا اور سب جانتا ہوں، اور آج بھی تمہاری چچی ایک نہیں سُنتی ہے ——— تمہارے سر کی قسم بیٹا کیا کہوں اُس کو کتنی تمنا ہے کہ تمہارے سر سہرا دیکھے اور برابر یہی رٹ لگائے رہتی ہے کہ جوتش کی ایک خوبصورت چاند ایسی، سولہ سال کی دلہن آئی جو ہمیشہ سرخ سنہری کور کی ریشمی ساری پہنے رہتی....."

جوتش اس اثنا میں چائے وغیرہ سب ختم کر چکا تھا، اور بغیر انتظار کئے ہوئے وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بڈھے سے رخصت طلب کی۔

"ہاں بیٹا! اب تم جا سکتے ہو ——— کیا کہوں بیٹا! تم کو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا....."

جوتش بغیر انتظار کئے ہوئے چل کھڑا ہوا۔ لیکن بڈھا بھی

ساتھ ساتھ تھا۔ اُس کے بک بک کے خوف سے جوتش دم سادھے چلا جا رہا تھا، یکایک ایک موڑ ملا اور بڈھے نے بڑھ کر جوتش کے کاندھوں پر شفقت سے ہاتھ رکھ دیا۔

"بیٹا! اتنی جلدی کیا ہے۔ کام کرنے کو بہت سارا وقت پڑا ہوا ہے۔ بس اسی گلی میں ہمارے دوست مسٹر سوشل کمار مکرجی ڈپٹی کمشنر پولیس رہتے ہیں، کیا کہوں بیٹا ایسے اخلاق کے آدمی ہیں، بس آدمی کا ہے کو ہیں دیوتا سمجھو دیوتا ——— "

جوتش مسٹر مکرجی کا نام سن چکا تھا اور اُس کا بھی جی چاہا کہ اس کا موقع مل گیا ہے تو مل لینا چاہیئے۔ اس لیئے جلدی سے بات کاٹ کر اُس نے کہا "اگر آپ کی یہی اچھا ہے تو مجھے کوئی عذر نہیں ہے "

"ہاں بیٹا! بڑے لوگوں سے ملنا بھی ایک قسم کی تعلیم ہے، جو بات آدمی کتابوں میں پڑھ کر نہیں سیکھ سکتا ہے وہ ایسے لوگوں سے مل کر سیکھ سکتا ہے۔ ——— "

مسٹر مکرجی کا پھاٹک سامنے آگیا اور بڈھے نے جوتش کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا آؤ بیٹا۔

پھاٹک پر دربان تھا مگر اُس نے بڈھے سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ پھاٹک کے بعد احاطہ اور احاطہ سے بیس قدم کے فاصلہ پر ایک خوبصورت دو منزلہ مکان تھا۔ بڈھا جوتش کا ہاتھ پکڑے ہوئے تیزی کے ساتھ قدم بڑھاتا ہوا جا رہا تھا، اُس کی تیزی دیکھ کر جوتش ہکا بکا ہو رہا تھا۔ لیکن بڈھا بغیر کسی بات کا خیال کیئے ہوئے کوٹھی میں چلا جا رہا تھا اور اُس نے ایک دم دوسری منزل پر جا کر دم لیا۔ اور ایک بڑے کمرہ کے دروازہ پر جس پر خوبصورت پردہ پڑا ہوا تھا جا کر رکا۔ پاؤں کی آہٹ پا کر ایک قوی ہیکل خوشرو آدمی جس کا سن تقریباً چالیس یا بیالیس کا ہوگا، کمرہ سے باہر نکل آیا اور بڈھے کو دیکھتے ہی اُس نے نہایت گرمجوشی کیساتھ اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میں آپ کا تعارف مسٹر جوتش چندر بنرجی سے کراتا ہوں یہ مسٹر مکرجی! یہ ایم۔ اے کے طالب العلم ہیں۔ ان کے باپ جی یہیں ہائیکورٹ کے بہت بڑے وکیل تھے، اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ وراثت میں چھوڑ گئے ہیں۔ باوجود اس کے ہمارے جوتش بابو ایسی سادگی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں جیسی کہ طالبعلموں کو چاہیئے۔ میں ان کی کیا تعریف کروں ——— "

بڈھا یہیں تک کہنے پایا تھا کہ مسٹر مکرجی نے جوتش سے گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔

"اور ہاں! آپ کی تعریف کرنا تو میں بھول ہی گیا۔ مسٹر مکرجی " بڈھے نے تیزی کے ساتھ کہا۔

"ہاں جوتش! یہ مسٹر مکرجی ہیں۔ ڈپٹی کمشنر پولیس۔ مسٹر مکرجی سب انسپکٹر سے اپنی قابلیت کی بدولت آج اس عہدۂ جلیلہ پر پہونچے ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی ایسے ایسے لوگ ہیں۔ ان پر ہم جتنا فخر کریں کم ہے ——— اور کیا تعریف میں ان کی کروں ——— "

بس بس!! میں اپنی تعریف خود کر لوں گا۔ آپ زیادہ تکلیف نہ کریں" مسٹر مکرجی نے ہنس کر کہا۔

مسٹر مکرجی جوتش کو اپنے ڈرائنگ روم میں لیگئے اور ایک کوچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "تشریف رکھیئے جوتش بابو! "

بڈھا بھی جوتش کے بغل والے کوچ پر بیٹھ گیا۔

"آپ کے باپ جی سے کافی ملاقات تھی اور میں نے آپکو بچپن میں بارہا دیکھا تھا۔ آپ اُس وقت اسکول میں پڑھتے تھے۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" مسٹر مکرجی نے جوتش سے مخاطب ہو کر کہا۔

جوتش کے لیئے کچھ جواب دینا ضروری تھا۔ لیکن اس وقت اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ تنہا اس کمرہ میں رہتا اور کوئی اس سے بولتا چالتا نہیں، کیونکہ کہیں بغل کے کمرہ میں کوئی بیٹھے بیٹھے سُروں میں گا رہی تھی۔ آواز میں ایسا رس اور درد تھا کہ دل بے اختیار کھنچا چلا جاتا تھا۔ مگر اُس نے اپنے کو سنبھال کر جواب دیا "مجھے بھی آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ آپ کی تعریف میں نے بہت سنی تھی اور آج میرے اچھے بھاگ تھے کہ آپ کے درشن ہو گئے۔"

"مجھے پانچ منٹ کی اجازت دیجیئے جوتش بابو! میں ابھی آیا" مسٹر مکرجی نے کہا۔

یہ کہہ کر مسٹر مکرجی چلے گئے۔

اب جوتش بالکل محو تھا۔ گانے کی آواز صاف آ رہی تھی۔۔۔

———

پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں، تج کے سب سنسار۔
پریم سدھا میں سنان کروں گی، پریم کی ہونگی مہار
پریم ہی دھرم ہے، پریم ہی کرم ہے، پریم ہی سب سنسار
پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں.....

.....

یکایک گانا ختم ہو گیا مگر جوتش اب تک محو تھا۔ وہ اس وقت ایک دوسری دنیا میں تھا، "پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں" کی بدھرتا، اب بھی اُس کے کانوں میں ناچ رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر جذبات کی تھرتھراہٹ ہوئی لہریں کھیل رہی تھیں۔۔

"یہ مسٹر بکرجی کی لڑکی گا رہی تھی ——— میں کیا کہوں جوتش بابو کیسی پیاری لڑکی ہے۔ ابھی صرف سولہ سال کا سن ہے مگر ایسی سندر، سنوہر، گمبھیر گیانی کہ بس کیا کہا جائے۔ برابر سنہری کور کی سُرخ ریشمی ساری پہنے رہتی ہے ——— اور گانے میں تو ایسی استاد ہے کہ بڑے بڑے استاد گھبراتے ہیں ———"

بڈھا نہ معلوم کب تک بکتا رہا مگر یک بیک پردہ ہٹا اور جوتش چونک پڑا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اُس پر کوہ کرکا اتی موٹی بجلی گر پڑی ہے۔ اُس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھی۔ اُس کے نازک ہاتھوں میں سونے کی خوبصورت چوڑیاں زیب دے رہی تھیں اور ان نازک ہاتھوں میں ایک چاندی کا طشت تھا جس پر چائے کی خوبصورت پیالیاں اور کھانے کی چیزیں تھیں ——— اُس کا چمپئی رنگ جس پر ملاحت کی چھاؤں نے دلکشی کو دوبالا کر دیا تھا، اُس کے خوبصورت سیاہ عنبر فشاں بال، اُس کا گدرایا ہوا بدن، اُس کا سولہواں سال، اُس کی سنہری کور کی سُرخ ریشمی ساری ——— ایسی چیزیں نہ تھیں کہ نوجوان جوتش اپنے ہوش و حواس نہ کھو بیٹھتا۔

اُس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی دوسری دنیا میں پہونچ گیا ہے ——— "پریم نگر" میں، ڈرائینگ روم کی در و دیوار، فرنیچر، نقش و نگار، غرضکہ گوشہ گوشہ اور ذرہ ذرہ سے پریم کی تیز شعاعیں نکل رہی تھیں اور جوتش اُن میں غرق تھا۔ وہ پریم کے اتھاہ سمندر میں بہتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

——————

دو ہفتہ کے بعد اتوار کے دن تقریباً نو بجے بھالا اپنی سکھی کملا سے ملنے کے لئے گئی۔

"کہو بھالا! آج کہاں سے راستہ بھول پڑیں۔ جوتش کے یہاں سے آ رہی ہو نا..... ہاں ایک بات تو میں تم سے پوچھنا بھول ہی جاتی ہوں۔ تمہاری شادی کب ہے؟" کملا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پاگل لڑکی! شادی! کیسی شادی! کس کی شادی! کس سے؟ ہمیشہ وہی شرارت کی باتیں۔ ایم۔ اے میں پڑھتی ہے۔ مگر اب تک تیرا بچوں کا سا پن نہ گیا ——— اور ہوا اب میں بھی تیرا بیاہ ہونے والا ہے اور تو اس طرح گھما کے مجھ سے کہنا چاہتی ہے۔ بول! وہ کون بدقسمت ہے جو تجھ جیسی چھوکری سے بیاہ کرنے پر تیار ہو گیا ہے" بھالا نے کملا کو اُس کے گالوں پر آہستہ آہستہ مارتے ہوئے کہا۔

"بھلا تم کچھ جانتی ہو۔ اوئی مرے تیرا بھولا پن، کس کا بیاہ؟ تمہارا اور کس کا ——— کس سے؟ ——— جوتش سے اور کس سے" کملا نے منہ چڑھا کر کہا

بھالا نے ایک آہ سرد بھری اور یکایک اُس کے چہرہ پر سنجیدگی اور متانت چھا گئی۔

"کیوں بھالا؟" کملا نے حیرت سے پوچھا۔

"آج کا اخبار تم نے پڑھا ہے" بھالا نے کہا

"ہاں! ہاں!!" کملا نے ہمہ تن متوجہ ہو کر جواب دیا۔

"تو جوتش کے متعلق تم نے اس میں کچھ نہیں پڑھا؟" بھالا نے کہا۔

"نہیں تو! کیا ہوا جوتش کو ..... موٹر یا ٹرام کے ساتھ ٹکر وکر تو نہیں لگی۔"

"ایسے نہیں پاگل ——— مگر تو نے کون سا اخبار پڑھا ہے؟" بھالا نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"اسٹیٹسمین! ——— اُس سے بڑھ کر کون اخبار ہے؟" کملا نے جواب دیا۔

"سب کچھ سہی مگر اسٹیٹسمین میں انوا اور شادی بیاہ کی خبریں کہاں؟ امرتا بازار پتریکا پڑھو۔ امرتا بازار پتریکا" بھالا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ کیا بک رہی ہے پگلی کہیں کی۔ جوتش اور انوا!

کملا نے حیرت سے کہا۔

"ارے نہیں پاگل! جوتش کا بیاہ ہونے والا ہے آج کے اخبار بانبار میں پتر کا میں یہ خبر شائع ہو ....."

بمالا یہیں تک کہنے پائی تھی کہ کملا زور سے قہقہہ مار کر ہنسنے لگی اور ہنستی ہوئی جانے کے لیے مڑی۔ بمالا نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "پاگل تو نہیں ہو گئی ہے۔ کہاں جاتی ہے۔"

"ماں کو یہ خوشخبری سنانے جاتی ہوں" کملا نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کیسی خوشخبری؟" بمالا نے اچنبھا ہو کر پوچھا۔

"کیسی خوشخبری! کیسی خوشخبری!! لو لو! لو لو!!" کملا نے منہ چڑھاتے ہوئے کہا۔

"ارے ہاں! کیسی خوشخبری؟" بمالا نے بہت زیادہ اچنبھا ہو کر پوچھا۔

"خوشخبری یہ کہ تمہارا بیاہ جوتش کے ساتھ ہونے والا ہے جس کا اعلان آج کے پتر یکا میں ہو گیا۔ اب سمجھیں یا تم تو بالکل بھولی ہو۔ تم کیا سمجھو گی" کملا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دور! دور!! پاگل جاہل کہیں کی۔ نہ معلوم تو نے بی۔ اے کی ڈگری کس طرح حاصل کر لی۔ پہلے پوری بات سن لے" بمالا نے کہا۔

"ہاں ہاں!! تو پھر کہہ نہ ڈالو۔ یوں چبا چبا کر باتیں کرنے سے کوت چھپے گا" کملا نے کہا۔

"ارے پگلی! بات یہ ہے کہ جوتش کا بیاہ مسٹر مکرجی بیرسٹر ایٹ لا کی لڑکی سے دوسرے مہینہ میں ہونے والا ہے، اس کا اعلان آج کے پتر یکا میں ہوا ہے" بمالا نے کہا۔

"نہیں میں ہرگز نہ مانوں گی۔ اولاً تو جوتش شادی ہی کے خلاف ہے۔ پھر دوسرے یہ کہ اگر وہ شادی کرے گا بھی تو ایک جاہل لڑکی سے کیوں کرنے لگا۔ مسٹر مکرجی سے میری دور کی رشتہ داری ہے۔ میں اُن کی لڑکی ارملا کو خوب جانتی ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ لڑکی خوبصورت اور سلیقہ مند ہے۔ گانا بجانا جانتی ہے مگر اس کی تعلیم صرف معمولی ہوئی ہے۔ کچھ انگریزی اور بنگلہ پڑھی ہوئی ہے پھر بھلا جوتش ایسی جاہل لڑکی سے کیوں بیاہ کرنے لگا۔ تمہاری ایسی پڑھی لکھی کو چراغ لیکر ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملے گی۔ نہیں بمالا تم کو دھوکا ہوا ہے" کملا نے کہا۔

"کملا! یہ خبر غلط نہیں بالکل صحیح ہے۔ میں نے خود پتر یکا میں پڑھا ہے۔ یقین نہ آتا ہو تو پتر یکا منگوا کر پڑھ لو۔ میں جھوٹ کیوں کہوں گی" کملا مجھے بھی اس خبر کو پڑھنے کے بعد دو گھنٹہ تک جوتش پر غصہ رہا کہ اس نے میری محبت کو یوں ٹھکرا دیا۔ مگر جب میرا غصہ تھما اور میں نے غور کیا تو میری آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ اور میں نے حقیقت کو پالیا۔"

"تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ وہ گنوار ہے۔ ہرگز اس قابل نہیں کہ تم جیسی تعلیم یافتہ خاتون سے اس کی شادی ہو ....."

"نہیں کملا! میرا یہ مطلب نہیں ہے" بمالا نے بات کاٹ کر کہا۔

"تو پھر تمہارا کیا مطلب ہے؟ اور تمہاری یہ لمبی اس پڑھے لکھے جاہل کے متعلق ہو یا نہ ہو۔ میری رائے تو یہی ہے۔ بس تو اس کو بالکل دیہاتی سمجھتی ہوں اور ایشور کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ اس نے تم کو بچا لیا" کملا نے کہا۔

لیکن اگر تم سوچ وچار سے کام لوگی تو تمہیں بھی میری طرح ماننا پڑیگا کہ جوتش نے جو کچھ کیا ٹھیک" بمالا نے کہا

"یہ کیسے؟" کملا نے حیرت سے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ ہم لوگوں نے اونچی تعلیم پائی ہے اور غور و فکر میں، بحث مباحثہ میں، آزادی رائے میں، اور اپنی ذہانت میں ہم لوگ مردوں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ لیکن یہ سب باتیں کبھی ہم لوگ گھاٹے ہی میں ہیں کیونکہ ہم لوگوں نے اپنی نسائیت کھو دی ہے۔ ہماری اونچی تعلیم کی جو کچھ بھی قدر و قیمت ہو لیکن یہ سچ ہے کہ مردوں کے لئے اس میں کوئی موہنی نہیں ہے۔ کیونکہ قوت فکر اور علم و فضل میں عورتیں مردوں کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتیں"

"ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتیں! یہ تم کیا بک رہی ہو، آخر یہ سروجنی دیوی، خالدہ خانم، مارگریٹ مادام، میڈم صوفیہ وادیا، میڈم میری مونٹسوری عورتیں نہیں تو کیا مرد ہیں۔ پھر ہے کوئی مرد جو ان کا مقابلہ کرے۔" بمالا نے چلا کر کہا۔

"ذرا سوچ سمجھ کر بات کرو کملا! ایسے یہ عورتیں بیشک بڑی ودوان ہیں، لیکن ان ہی کے مقابلہ کے مردوں سے ان کا مقابلہ کرو تو بہت نیچی نظر آئیں گی" بمالا نے کہا۔

"اچھا میں ہار گئی۔ جانے دو۔ مرد ہی بڑے دماغ والے ہوتے ہیں۔ مگر اس سے تم یہ کیسے منوانا چاہتی ہو کہ جوتش نے ایک جاہل لڑکی سے بیاہ کر کے اچھا کیا" کملا نے جھنجھلا کر کہا۔

"میرا مطلب تو بالکل صاف ہے تمہاری سمجھ کا پھیر ہے۔

تاریخ بہار کا ایک خون آلود ورق فسانہ کے رنگ میں

میر قاسم کے دو ننھے معصوم بچے

جناب رحمت علی صاحب صابر نور محلوی

صوبہ بہار میں مونگیر کا قلعہ ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ صرف اس لئے نہیں کہ بنگال و بہار کے آخری ہندوستانی فرمانروا نے آزادی کی آخری جدوجہد کا مرکز مونگیر کو ٹھیرایا تھا۔ بلکہ میری نظروں میں اس کی اہمیت اس لئے بھی کہ اس کے ساتھ ایک نہایت ہی المناک اور دردانگیز کہانی وابستہ تھی جسے عرصہ ہوا، میں نے پروفیسر ایس۔ سی چٹرجی کی مشہور کتاب "بنگال کے نواب" میں پڑھا تھا۔ مجھے اسے دیکھنے کی ایک عرصہ سے تمنا تھی کہ کوئی واقف کار مل جائے تو اس کی سیر کروں۔ اور قدرت خدا سے ایک ایسا موقع مل گیا، اور میرے عزیز دوست سید آل حسن میرے شریک سفر ہونے پر آمادہ ہو گئے۔ گو اس کا افسوس مجھے عمر بھر رہیگا کہ میں نے اس قلعہ کو زلزلے سے پہلے کیوں نہ دیکھا۔ ورنہ ہر ایک چیز جس پر مرمت کا غلاف چڑھ گیا ہے، یا پھر بالکل ہی شکستہ ہو گئی ہے۔ اپنے اصلی رنگ و روپ میں نظر آتی۔

ہماری گاڑی صبح آٹھ بجے کے قریب ہی وہاں پہنچ گئی۔ میرے دوست کے ایک عزیز مونگیر کی عدالت میں پیشکار تھے۔ سب سامان اُن کے یہاں چھوڑ کر ہم لوگ سیر کی غرض سے نکلے۔ ۱۹۳۴ء کا زلزلہ..... خدا نے تمہارو جبار کے قہر و غضب کی نشانیاں کھنڈروں اور ٹوٹی پھوٹی عمارتوں کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کر رہا تھا۔ صوبۂ بہار میں شاید مونگیر ہی وہ بدنصیب شہر ہے۔ جسے زلزلے کی ہولناک تباہی کا خصوصیت سے شکار ہونا پڑا۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی۔ ساکنان شہر میں سے بہت سے تو ہجرت کر کے دوسرے دوسرے مقامات پر پہنچ چکے تھے باقی ماندہ جو۔۔۔ کا کہیں ٹھکانہ نہ تھا۔ کس مپرسی کے عالم میں یہیں مارے مارے پھر رہے تھے۔ امدادی ٹیمیں، غلے اور کپڑوں کی شکل میں حتی الامکان امداد پہنچا رہی تھیں۔ اس پر بھی تباہ حال مکینوں کی آہ و پکار سے گلی کوچے گونج رہے تھے۔ جا بجا ملبہ کھود کر لاشیں اور سڑی مسڑی ہڈیاں نکالی جا رہی تھیں۔ ورثا کی اُس وقت کی گریہ وزاری اور بین و بکا کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں تو محال تو ضرور ہے۔ اس زہرہ گداز منظر سے ہم اتنے متاثر ہوئے کہ باوجود کوشش ضبط کے آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ اُبل پڑا۔ اور بادل ناخواستہ قلعے کی طرف روانہ ہو گئے۔

میر قاسم کا قلعہ، جس کے دو طرف دریائے گنگا کا پُرشور پانی فصیل سے ٹکراتا ہوا بہتا تھا۔ شہر کی طرف ایک مستحکم فصیل تھی۔ اور فصیل سے باہر کافی گہری خندق تھی جو ہر وقت گنگا کے پانی سے لبریز رہتی تھی۔ قلعے کے دروازوں پر ہر وقت مسلح سپاہیوں کا پہرہ رہتا تھا اٹھارہ برج تھے، جس میں کم و بیش چالیس توپیں ہر دروازہ ماہر وقت غنیم کے چھکے چھڑانے کے لئے "لیس" رہتے تھے۔ مگر آج..... قلعے کی فصیل..... برج کے کنگرے اور مضبوط مستحکم دروازے زلزلے کے تاب نہ لا کر سرنگوں پڑے ہوئے اپنے بنانے والے کی ناکامی کا افسانہ دہرا رہے تھے۔ خندق جو کبھی پانی سے لبریز رہتی تھی۔ جس کی گہرائی کا کوئی اندازہ نہ تھا آج لوٹ کر کھڈ سے پُر ہو جانے کے بعد مشکل سے اٹھارہ انیس فٹ گہری رہ گئی تھی۔ کتنا الم انگیز انقلاب تھا۔ کہ قلعہ جو کل تک آزادی کے لئے مرمٹنے والوں کا مسکن تھا، آج مختلف شعبوں کے دفاتر کا کام دے رہا تھا۔ پبلک گارڈن۔ کچہری اور دوسری عمارتوں کو جو آجکل گورنمنٹ کے قبضے میں ہیں، گھوم پھر کر دیکھا۔ باوجود اس ہاہمی کے ہر جگہ فسردگی کا دور دورہ معلوم ہو رہا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ان شاندار عمارتوں کو بنانے والے کو چنے چبانے بھی میسر ہوتے یا نہیں اور آج نہ جانے وہ کہاں ابدی خواب کے مزے لے رہا ہوگا۔ طبیعت پر فسردگی سی چھائی ہوئی تھی، جی بہلانے کی نیت سے مردانہ گھاٹ۔ کسٹ ہرنی گھاٹ، نی کارڈن اور بیگمات کے نہانے کے حمام کی یکے بعد دیگرے سیر کی۔ میر قاسم کا محل جو آجکل جوینائل جیل کا کام دے رہا ہے، ہر وقت بند رہتا ہے۔ میرے دوست جیلر صاحب سے اجازت لینے کی غرض سے چلے گئے۔ اور میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ ماضی کے واقعات میں کھویا ہوا ایک اونچے سے چبوترے پر آبیٹھا، جو محض دریا کی سیر کی غرض سے ہی تعمیر کیا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دریائے گنگا کا شفاف پانی اپنی روایتی آن بان کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ بہت دُور تک پانی ہی پانی تھا۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں کو ملاح کھیتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ گھاٹ پر اشنان کرنے والوں کے مدھم گیت ماضی کی داستان دہرا رہے

ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ موسم خوشگوار تھا۔ میر قاسم کا قلعہ تھا۔ اور سامنے گنگا کا پھیلا ہوا پانی، آسمان پر گھر سیاہ رنگ کے بادل دوش ہوا پر اڑے جا رہے تھے۔ دریائی بگلے کی کرخت آواز سے کبھی کبھی سناٹا مرتعش ہو جاتی، اور پھر وہی اشنان کرنے والوں کے سہانے گیت، اور میں دنیا و ما فیہا سے بے خبر اُن کی سماعت میں کھویا ہوا تھا۔ اتنے میں میرے دوست نے مجھے جھنجھوڑ کر اس خواب محویت سے بیدار کیا۔ میں ناول ناخواستہ اُن کے ہمراہ جیل کے پھاٹک سے اندر داخل ہوا۔ پیپل کی گھنی چھاؤں میں سُرنگ کے دہانے کو لوہے کی ایک مضبوط چادر سے بند کیا گیا تھا۔ اور یہی وہ سُرنگ تھی، جس کی ایک شاخ میں بھاگلپور میں دیکھ چکا تھا۔ اور جس کی راہ سے، بدنصیب میر قاسم اپنی شکست کا سامان دیکھ کر فرار ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میں نے اُس میں اُترنا چاہا، مگر وارڈر نے منع کر دیا۔ کہ اس میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں۔ کیونکہ سُرنگ جا بجا شکستہ ہو چکی ہے اور زہریلی گیس سے بھری ہوئی ہے۔ فوراً مجھے میر قاسم کے دو معصوم بچے یاد آ گئے جن کی حسرت ناک موت مجھے آج تک خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیتی ہے۔

غدار میر جعفر جب سراج الدولہ کو دھوکہ دے کر انگریزوں سے مل گیا اور اُنہوں نے اُسے بہار و بنگال کا نواب بنا دیا۔ تو اُس کی حکومت شطرنج کے مہروں سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ کیونکہ لارڈ کلائیو نے اپنی فطری چالاکی سے کام لیکر تمام املاک اور نظم و نسق پر اپنا قبضہ کر لیا تھا۔ اور میر جعفر بے نام نواب تھا۔ مگر میر جعفر کا داماد میر قاسم جو شروع سے ہی بہادر اور خود دار تھا۔ جب تخت پر بیٹھا تو اُسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ وہ لارڈ کلائیو کے ہاتھ میں کٹھ پتلی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ تو اُس نے اپنے ملک کو فرنگی اثر سے محفوظ کرنے کے موقعے سوچنے شروع کر دیئے۔ مگر اپنے حقوق کی واپسی اور آزادی کے لئے جدوجہد وہ مرشد آباد میں رہ کر نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے اُس نے سب سے پہلے تو اپنا دار الخلافہ مونگیر کو بنایا۔ اور اس تحریک میں شاہ اودھ اور شاہ دہلی دونوں اس کے ہمراز و مددگار تھے۔ فوج کی بھرتی کے بعد اُس نے مونگیر میں ایک شاندار اور مضبوط قلعے کی بنیاد ڈال دی۔ سامان حرب کافی تعداد میں جمع کیا جا چکا تھا۔ مگر انگریزوں کی اطلاع قبل از وقت ہی لارڈ کلائیو کو ہو گئی۔ اور وہ ایک کثیر فوج لیکر مونگیر کے فوج میں پہونچ گیا۔ جب اُسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ میر قاسم انگریزوں ہی سے لڑنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ تو اُس نے حملہ کر دیا۔ نواب کی فوج نے کمال بے جگری سے انگریزی فوج کا مقابلہ کیا۔ مگر آخر کو قلعہ بند ہو گئی۔ اور انگریزی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اکے دکے حملے ہوتے رہے۔ مگر کوئی فیصلہ کن جنگ نہ ہو سکی۔ کئی روز تک محاصرہ جاری رہا۔ اور آخر کار قلعے کا دروازہ توڑ کر انگریزی فوج اندر داخل ہو گئی۔ اور قتل و خون کا معرکہ ہونے لگا۔ حریفین نے خوب ہی داد شجاعت دی۔ میر قاسم اُس وقت اپنے سپہ سالار کو کچھ ہدایات دے رہا تھا کہ یہ دلشکن خبر پہنچی کہ علی کے وزیر سپہ سالار نے اُسے فرار ہونے کی رائے دی۔ پہلے تو اُس نے اس تجویز کو ٹھکرا دیا۔ مگر موقع نازک تھا۔ اور مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ کہ اسے کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچانی چاہیے۔ زندہ رہنے پر وہ پھر بھی کسی وقت اپنے ملک کو واپس لینے کے لئے جدوجہد کر سکتا تھا۔ اگر وہ اس وقت بھاگنے سے انکار کر دیتا، تو نتیجہ معلوم تھا۔ قید ہو جانے کے بعد خدا معلوم فاتح فوج اُس کے ساتھ کیسا سلوک کرتی۔ جانے سے پہلے اُس نے تمام بچوں اور بیگم سے ملنا چاہا۔ مگر غنیم کی فوج پہلے ہی محل پر قبضہ کر چکی تھی، اپنے معتمد نوکر اور بچوں کے اتالیق کو کچھ ہدایات دے کر بدنصیب نواب سُرنگ میں اُتر گیا۔ کچھ عرصہ بعد جیسے ہی نوکر بچوں کو ہمراہ لیکر سُرنگ کی طرف آیا۔ تو اُس نے انگریزی فوج کے سپاہیوں کو شکاری کتوں کی طرح ہر چہار طرف گھومتے دیکھا۔ اُس نے بچوں کو جو اس مصیبت سے بے خبر تھے ایک مخفی مقام پر چھپا دیا۔ اور خود کسی اچھے سے موقع کا منتظر رہا۔ رات کے دوسرے پہر اُس نے خوابیدہ بچوں کو گود میں اُٹھا لیا۔ اور بچتا بچاتا سُرنگ میں اُتر گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اُس نازک موقع پر نوکر کی جسارت اور بہادری حقیقت میں ایک قابل ستایش فعل تھا۔ آج ایسے وفادار نوکروں کا ملنا صرف ناممکن ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ کیونکہ میر قاسم اور اُس کے بچوں کے لئے انعام کا اعلان ہو چکا تھا۔ نازو نعمت میں پلے ہوئے بچے سنگ و آہن میں گھبرا رہے تھے۔ اُدھر میر قاسم دریا کے اُس پار ایک جھونپڑی میں بیٹھا ہوا نوکر اور بچوں کا انتظار کر رہا تھا۔ بار بار باہر نکل کر دیکھتا۔ مگر اُن کو نہ آنا تھا اور نہ آئے۔ گھنٹوں پر گھنٹے گذر گئے۔ انتظار کی سختی سے گھبرا کر اور بچوں کی طرف سے مایوس ہو کر بدنصیب نواب کسی طرف کو نکل گیا۔

بچوں کو لیکر جب نوکر سُرنگ کے باہر نکلا، تو اُسے نہ تو حسب وعدہ میر قاسم ہی ملا، اور نہ ہی کشتی کا کہیں نشان ملا۔ وہ کافی عرصہ تک اُس کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ مگر نا کام رہا۔ اُسے خیال گذرا، ممکن ہے دیر ہو جانے کی وجہ سے نواب پھر لوٹ کر قلعے میں چلا گیا ہو۔ اُس نے بچوں کو ایک محفوظ جگہ پر بٹھا دیا اور جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے وہ نواب کی تلاش میں پھر سُرنگ میں داخل ہو گیا۔ سُرنگ کا دہانہ قلعے کے اندر قبرستان میں

ایک پیپل کے درخت کے پاس تھا، اُس نے باہر نکلتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ مگر بدقسمتی سے پہرہ دار وہیں نظر آ گئی۔ انہوں نے لاکھ پوچھا، دھمکایا، مگر اس نے نواب یا بچوں کے بارے میں کچھ بتانے سے صاف انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ سُرنگ کا دروازہ بھی نہ بتایا۔ رہنما کر لیا گیا۔

بچے بڑی بے صبری سے اپنے استقبال کا انتظار کر رہے تھے۔ جو جلد ہی آنے کا وعدہ کر گیا تھا، مگر ابھی تک اُس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ منتظر نگاہیں ہر آہٹ پر اپنے نجات دہندہ کی تلاش میں اُٹھ جاتی تھیں۔ مگر نا کام لوٹتیں۔ جب کافی عرصہ گذر گیا تو گل (لڑکے کا نام) نے کھڑکی کھولی، جو آنے کے وقت نوکر اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور اس میں سے شیر کی کھال کا لباس نکال کر پہنا، شاید بھیس بدلنے کی نیت سے ہی یہ کپڑے لائے گئے تھے۔ اور ہاتھ میں ستار لیکر سُرنگ کی طرف بڑھا۔ اور اپنی بہن صنوبر کو تسلی دیتا گیا کہ تم یہاں ٹھیرو، میں ابھی آیا اور منجی (نوکر کا نام) کو ڈھونڈ لاتا ہوں"۔ یہ سُنتے ہی مظلوم کا ننھا سا دل سینے میں لرز کر رہ گیا۔ باپ کی جدائی، منجی سے معتمد نوکر کی گمشدگی، تنہائی اور رات کا سناٹا۔ اس پر طرہ اُس کا عزیز بھائی بھی ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ پہلے تو وہ خاموشی سے اُسے کھڑی دیکھتی رہی، پھر دوڑ کر اُس سے لپٹ گئی، اور اُسے جانے سے روکنے لگی۔

"نہ جاؤ بھیا! مجھے اکیلے میں بہت ڈر لگے گا"، وہ منت بھرے لہجے میں بولی۔

"پگلی ہوئی ہو" گل بولا "میں ابھی لوٹ آؤنگا۔ اس میں خوف کی کون سی بات ہے..... اور پھر ہم لوگ یونہی اُن کے انتظار میں کب تک بیٹھے رہیں گے؟"

"یہ دیکھو!..... میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے" وہ اپنی آخری کوشش اُسے روکنے کیلئے کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے خوف ہے کہ میں تمہیں پھر..... دیکھ نہ سکوں گی....."

گل نے بچپن سا ہو گیا، اور صنوبر اُس کے سینے سے لگ کر سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ اُس نے اُسے دلاسا دینا چاہا۔ مگر الفاظ ہی نہ ملتے تھے۔ پھر آنسوؤں کا ایک پھندا سا اُس کے اپنے گلے میں بھی پڑا ہوا تھا۔ آخر کار اُس نے محبت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھتا ہوا سُرنگ میں داخل ہو گیا، اور صنوبر سسکیاں لیتی ہوئی وہیں بیٹھ گئی۔

میر قاسم کے ڈوب کر مر جانے کی خبر پا کر انگریزی فوج اعلمدیان سے خواب نوشین کے مزے لے رہی تھی۔ گل ٹھوکریں کھاتا ہوا سُرنگ کے تنگ و تاریک راستے میں بڑھا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ سُرنگ کے دہانے کے قریب پہنچ گیا جس کو اُس نے معمولی سی کوشش کے بعد کھول لیا۔ اور باہر نکل کر وہ قبرستان میں سے ہوتا ہوا اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ بدنصیب باپ جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھا، یہاں موجود نہ تھا، اور منجی کا بھی کہیں پتہ نہ تھا۔ فراق وغم نے اُسے نیم پاگل کر دیا۔ اور جہاں تاب اُس سے ہو سکا۔ وہ تلاش میں سرگرم رہا۔ مگر جب باوجود کوشش کے اُسے دونوں میں سے کوئی بھی نہ مل سکا، تو پھر لوٹ کر سُرنگ کی طرف بڑھا۔

بچپن سے ہی اُسے علم موسیقی سے بہت شوق تھا، بنگال میں اس فن کو جو اہمیت اور وقعت حاصل ہے وہ ظاہر ہے۔ اس کو موسیقی کی طرف مائل دیکھ کر نواب نے ایک ماہر فن موسیقی داں کو اُس کی تربیت کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ جس نے کچھ ہی عرصے میں اُسے اس فن میں طاق کر دیا تھا..... یہ بات بار بار تجربہ میں آ چکی ہے کہ مجبور و مغموم انسان رنج و غم کی تاب نہ لاکر بجائے رونے کے اپنے دل کی بھڑاس اور اپنے جذبات کا اظہار درد بھرے نغموں سے کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس گلوئے نے یہاں بھی کام کیا..... ٹھنڈی ہوا۔ کامل سکوت، ماضی کے خوشگوار زمانے کی یاد۔ اور مستقبل کے ہولناک تصور نے نواب زادہ کو سوز و غم میں ڈوبے ہوئے نغمے بلند کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے ستار کو سنبھالا لیا۔ اور پیپل کی جڑ پر بیٹھ کر اُس پر اُنگلیاں چلانے لگا۔ ستار کی محویت طاری کر دینے والی آواز اور غم نصیب نواب زادے کے مضطرب کر دینے والے نغموں نے فضائے سکوت کو گرما دیا۔ آواز لحہ بہ لحہ بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ اور اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ موجودات عالم اور فطرت کی ہر شے اُس کی آواز کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ رقص کر رہی ہے۔

انگریزی فوج کے سپاہی خواب غفلت سے بیدار ہو گئے، اور رائفلیں سنبھالے ہوئے آواز کی طرف بڑھنے لگے۔ چاند آہستہ آہستہ اُفق سے طلوع ہو رہا تھا۔ دُور ہی سے اُنہوں نے پیپل کی جڑ پر کسی سماوی مخلوق کو محو مضراب دیکھا۔ جو ایک ہی گت کو بار بار بجا کر گا رہا تھا۔ گت ختم ہو گئی اور اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ وہ فسوں کے عالم میں اُٹھا۔ اور ستار بغل میں دبا کر آہستہ آہستہ سُرنگ کے دہانے کی طرف بڑھا لارڈ کلائیو ایسے وقت میں پہنچا، جب کہ اندھیرے میں بدنصیب نوابزادہ ٹھوکر کھا کر گر جانے کی وجہ سے جھک کر گھٹنے کو سہلا رہا تھا۔ اس نے لباس کو دیکھ کر یہی خیال کیا کہ کوئی شیر ہے۔ اور پھر سرعت سے اُس کی طرف بڑھا۔ جب نوابزادہ چونک کر پیچھے کی طرف گھوما۔ اور پھر متعاقبین سے آگاہ ہو کر

سُرنگ کی طرف دوڑا۔ تو کلایو نے رائفل داغ دی۔ ایک مدھم سی چیخ فضائے سکوت کو چیرتی ہوئی آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ سب سپاہی مُردہ شیر کی لاش کی طرف دوڑے۔

"آہ ..... یہ کیا!" کلایو گھٹنے ٹیک کر لاش پر جھکتے ہوئے بولا۔ "یہ شیر تو نہیں ..... بلکہ ..... کوئی سادی مخلوق ہے۔ جسے میں نے شیر سمجھ کر مار دیا ....." اُس نے آہستگی سے اُس کا سر اُٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا اور پھر کہنے لگا "خدایا مجھے معاف کر۔ میں نے ایک قابل معافی گناہ کیا ہے۔ ایسا حسین اور معصوم بچہ ..... اور میری گولی کا نشانہ بنا ....." وہ ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔

گولی ٹھیک بائیں پہلو کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ نرم و نازک ہاتھ میں ابھی تک ستار تھاما ہوا تھا۔ جس کسی نے دیکھا، اُس کی بیوقت اور حیرت خیز موت پر متاسف ہوا۔ اور کئی ایک تو اس زہرہ گداز منظر سے اتنے متاثر ہوئے کہ آنکھوں سے آنسو ڈھلک آئے۔ اور کلایو اسے ابھی تک غیر ارضی مخلوق سمجھ رہا تھا۔ اور اگلی صبح اُسے عزت و احترام کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔

ساری رات اور دوسرا دن تنہائی میں انتظار کرتے کرتے معصوم بچی نے گذار دیا۔ اُسے کامل امید تھی کہ میرا پیارا بھائی ابھی میرے مہرباں ابا کو لیکر آئے گا۔ مگر وائے ناکامی اُس کی بیقرار و شوریدہ تمنا تکمیل نہ ہوئی۔ اس صبر آزما انتظار کا اندازہ کچھ وہی کر سکتے ہیں جن کو ایسی ہی ناکامی و نامرادی میں اپنے کسی عزیز کی آمد کا انتظار رہا ہو۔ اور ایسے ہی مصائب کا سامنا ہوا ہو۔ مگر میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس ہولناک واقعے کا تصور بھی کوئی شخص نہیں کر سکتا۔ سات آٹھ سالہ معصوم سی جان۔ غم و الم کے پہاڑ۔ بھائی اور باپ کی جدائی۔ ڈراؤنی اور بھیانک رات۔ جنگلی جانور کرخت آوازیں نکالتے ہوئے اور شور برپا کرتے ہوئے پاس سے گذرتے تو ننھا سا دل پہلو میں زور سے دھڑکنے لگتا۔ وہ خوف کے مارے آنکھیں بند کر لیتی۔ اور موت ..... بھیانک موت اُسے اپنے گرد منڈلاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ خوف و دہشت اور غم و ہراس کے مارے نیند یکسر موقوف تھی۔ بھوک کے مارے آنکھوں کے آگے تارے سے ناچ رہے تھے۔ پیارے باپ سے ملے ہوئے تیسرا دن تھا۔ مہربان قبچی جو بمنزلہ باپ کے تھا، وہ بھی ساتھ چھوڑ کر چلتا بنا۔ ایک غمگسار بھائی تھا جو لوٹ الذکر کی تلاش میں ایسا گیا کہ خود بھی نہ لوٹا۔ ..... وہ ان کا مفعول ہی انتظار کر رہی تھی۔ اے کاش اُس کو معلوم ہوتا کہ باپ سے ملنا اب محال۔ نوکر جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں بند، اور ..... جان سے پیارا بھائی گوشۂ لحد میں ابدی نیند سو رہا تھا۔ جس سے بیدار کرنا انسانی قوت میں نہ تھا۔ مگر وہ ابھی تک انتظار کر رہی تھی۔ اور آنکھ اب بھی پھڑک رہی تھی۔

دوسری رات مصیبت آزما گذری۔ یوں کی تاب نہ لا کر وہ خود اُن کی تلاش میں جانے کے لئے تیار ہوئی۔ پہلے پہل اُسے سُرنگ کی تاریکی میں بہت خوف معلوم ہوتا رہا۔ اور وہ چند قدم جا کر پھر پیچھے کر ہٹ آئی۔ مگر قانون فطرت کے مطابق وہ غم اُٹھانے اُٹھاتے بہت حد تک دلیر ہو گئی تھی۔ اور جی مضبوط کر کے وہ سُرنگ میں اُتر گئی اور اندھیرے میں ٹٹولتے ٹٹولتے آگے بڑھنے لگی۔ تاریکی کی وجہ سے سینے میں دم گھٹتا ہوا معلوم ہوتا تھا مگر اُس نے ہمت نہ ہاری۔ اور اپنے سفر کو جاری رکھا۔ سُرنگ کے دہانے کے قریب پہنچی تو دروازہ بند پایا۔ نرم و نازک ہاتھوں نے اُس رات وہ دلیری اور مشقت کا کام کر دکھایا۔ جو شاید نوعمر کے پلے ہوئے نوجوان بھی نہ کر سکیں۔ اپنی پوری قوت سے کام لیکر اُس نے دروازہ کا پٹ کھول دیا۔ اور باہر نکل آئی۔ چار سُو اندھیرا تھا۔ آدھی سے زیادہ رات گذر چکی تھی۔ کانٹوں اور جھاڑیوں سے اُلجھتی ہوئی وہ آگے بڑھنے لگی۔ آخر کار وہ ایک کھلے میدان میں پہنچ گئی۔ اور اپنے بھائی کا نام لیکر آوازیں دینا شروع کر دیں۔ رات کی خاموشی کو چیرتی ہوئی، اُس کی آواز بلند ہوئی۔ انگریزی فوج کے خوابیدہ سپاہی چونک کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور بندوقیں چھتیائے ہوئے آواز کے رُخ پر بڑھنے لگے۔ اندھیرے کے مارے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ بدنصیب لڑکی گرد و پیش کے حالات سے بیخبر اپنے بھائی، باپ اور اپنے مہربان اتالیق کا نام لے لیکر آوازیں دیئے جا رہی تھی۔ مگر اُس کی اپنی آواز کے سوا جواب میں کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر وہ پیپل کی جڑ کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ جہاں پر کل رات اُس کا بھائی سوز و ساز میں مصروف تھا۔ اُسے اپنی پشت پر کچھ کھٹکا سا محسوس ہوا۔ اُس نے گھوم کر دیکھا تو لالٹین کی دھیمی روشنی نے عجیب و غریب نقشہ اُس کے سامنے پیش کر دیا اور وہ جان کے خوف سے چیخ کر سُرنگ کے دہانے کی طرف بھاگی بیشتر اس کے کہ وہ دروازے تک پہنچے، رائفل کی گولی نے اُسے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔ فائر کی آواز سے قلعے میں ہل چل سی مچ گئی۔ تمام سپاہی اندھا دھند بتیاں لیکر اُس مقام کی طرف بھاگے، جہاں بدنصیب نوابزادی گولی کھا کر گری تھی۔ اور سب سے پہلے جو شخص لاش کے پاس پہنچا وہ کلایو تھا۔ جیسے ہی اُس نے اپنے ہاتھ کی بتی کو اوپر اٹھا کر لاش پر ایک نظر ڈالی۔ تو بے اختیار اُس کے منہ سے نکل گیا:۔

"آہ میرے خدا! یہ خواب ہے یا حقیقت!! کل ہی تو یہ بدنصیب مخلوق میری گولی کا نشانہ بنی تھی۔ اور آج پھر کہاں سے آگئی" اتنے میں بہت سے سپاہی بتیاں لیکر لاش کے گرد جمع ہو گئے، اور جھک جھک کر دیکھنے لگے

"اگر یہ کوئی غیر ارضی مخلوق نہیں" کلاڈیو اپنی تر پیشانی کو خشک کرتے ہوئے بولا "تو پھر کس بدنصیب کی آوارہ بخت روح ہے۔ جو رات کی تنہائیوں میں در و بھرے لمحے بکھیرتی پھرتی ہے۔ کل ہی تو اسے قبرستان میں دیکھا..... آج پھر یہ اسی جگہ طواف کرتی ہوئی پائی گئی ..... آخر اسے کس کی تلاش ہے....." اُس نے پھر اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور افسوس بھرے لہجے میں بولا۔ "چہرے پر کتنی معصومیت برس رہی ہے، اور نقاہت بھی..... اگر یہ کوئی انسانی بچہ ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اس سے حسین انسانی بچے کا ہونا ممکن نہیں....." وہ اُس کے پریشان بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔ اور بسملی کے پاس سے سرخ خون کی دھار بہ کر زمین پر جمع ہو رہی تھی۔

"آج اس نے لباس بھی تو بدلا ہے" ایک افسر نے اُس کے ریشمی لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی ہو" دوسرا بولا۔ "لباس چاہے کسی قسم کا پہنے۔ مگر ہماری نظریں دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔ اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہی ہے جسے کل ہم نے دفن کیا تھا" "بیشک یہ وہی ہے" سب سپاہی بول اٹھے۔

حقیقت میں دونوں بھائی بہن شکل و صورت میں مبالغے کی حد تک ملتے چلتے تھے۔ بعض اوقات ماں باپ اور نوکروں تک کو مغالطہ ہو جاتا تھا کہ کل کون ہے اور کون صنوبر!!!

اگلی صبح بڑے احترام کے ساتھ اس کے بھائی کی بغل میں قبر کھود کر میر قاسم کے سرمایۂ حیات اور تخیل تمنا کے آخری خوبصورت ثمر کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ اور اس مضمون کا کتبہ لارڈ کلاڈیو نے اُن کے قبروں پر نصب کر دیا۔

"کلاڈیو نے اپنی عمر میں دو بیگناہوں کا خون کیا ہے۔ جس معصیت کی پرسش کے تصور سے ہی وہ کانپ جاتا ہے۔ حقیقت میں وہ نوری فرشتے تھے۔ اور سماوی مخلوق سے تعلق رکھتے تھے۔ میرے بے رحم ہاتھوں نے انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گلشت جہاں سے محروم کر دیا۔ خدا اُن پر اور مجھ پر رحم کرے۔ آمین!"

میں نے اُن کی آخری یادگاروں کو ڈھونڈنے کی لاکھ کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ کیونکہ زلزلہ بہار نے مکان اور مکینوں کو ہی صرف پامال نہ کیا تھا بلکہ مرنے والوں کی آخری یادگاروں کو بھی انکے نام کے ساتھ ہی دنیا سے ناپید کر دیا تھا۔ ..... اے کاش! میں ان معصوم کشتگان ستم کی آخری آرامگاہوں کو دیکھ سکتا۔ اور اپنی عقیدت و محبت کا اظہار چند حقیر آنسوؤں اور پھولوں سے کر سکتا تھا۔ جن سے وہ گرچہ خود بے نیاز ہیں

گیا میں مچھروں سے

سخت بیزاری ہونے والی ہے

کیونکہ آپ کے علوی دواخانہ (رجسٹرڈ) نے علوی اگربتی (رجسٹرڈ) تیار کرلی ہے جو کہ آپ کو صرف ایک پیسہ میں ملے گی اور تمام رات کام دے گی۔

جنرل مینجر :- علوی دواخانہ - دھلے

برانچ :- پرانی جیل خانہ - گیا

ہر بونگ سبھا

از حضرت مانپوری

یوں تو ہمارا جنم بھومی شہر گیا اپنی قدامت اور مذہبی تقدس کے باعث آئے دن آل انڈیا ہندو مہاسبھا کی انجمنوں کانفرنسوں اور سبھاؤں کے سالانہ جلسوں کی آماجگاہ بنا ہی رہتا ہے لیکن گذشتہ سال آل انڈیا ہر بونگ سبھا یعنی کسان سبھا کے جلسہ کے موقع پر جو سارا شہر جیتر کا میلہ بن گیا تھا وہ بھی ایک قابل دید تماشا تھا۔ جدھر دیکھئے ہاتھ میں لاٹھی لئے سر پر پگڑی لیسے کاندھے پر دوہر یا لحاف رکھے کمر کی پچھلی جانب کپڑا یا چوڑے کی گٹھری باندھے دیہاتیوں کی مسلسل ٹولیاں آگے آگے جھنڈا لہراتے "بدیسی راج ناس ہو۔ زمینداری ناس ہو" کا نعرہ لگاتے ہوئے جلسہ گاہ کی طرف جا رہی ہیں۔ میں میشیا کی اس بے قاعدہ فوج کے کوچ کا تماشا کمرہ کے باہر سائبان میں بیٹھا دیکھ رہا تھا کہ میرے کانگریسی بلکہ کسان سبھا مسٹ دوست میاں مظہر سہو پہنچے اور آتے ہی انھوں نے کہا۔ چلئے ہو کسان سبھا کے جلسہ میں؟ میں نے انکار کیا۔ نا بھائی! کس کی شامت آئی ہے کہ اس طوفان بدتمیزی میں جا کر دھکے کھاتا پھرے۔ اسپر انھوں نے طنزاً کہا ٹھیک ہے۔ زمیندار ہو کر تم کیوں کسانوں کی ہمدردی میں شریک ہونے لگے۔ باقی رہا دھکے کھانے کا سوال تو اس کا وعدہ کہ میں اپنے ساتھ لے جا کر ڈائس پر بٹھا دونگا۔ میرے دل میں اس محشرستان کے دیکھنے کا شوق ضرور تھا لیکن وہی کسی نہ کسی پرسد کی وجہ سے تذبذب میں تھا۔ مظہر کے اس کہنے پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر گرجا کے میدان کی طرف روانہ ہو گیا۔

اب جو جلسہ گاہ کے پھاٹک پر پہونچکر دیکھتا ہوں تو بانس سے دور تک گھرے ہوئے احاطے کے اندر ٹھٹ یا دھسان ٹھسے ہوئے دیہاتیوں کا عظیم الشان مجمع بغیر فرش کی ہموار زمین پر بیٹھا ہوا اپنے شور و شغب سے پورے جلسہ گاہ کو مچھوا بازار بنائے ہوئے ہے۔ فرش تو خیر۔ دھوپ سے بچنے کے لئے شامیانہ تک ندارد۔ اس کھلے میدان میں "تلے آسماں کے بسیرا تھا سب کا" البتہ اُتر جانب ایک بڑے شامیانے کے نیچے مٹی کے اونچے چبوترہ پر دری بچھا کر کسان لیڈروں کے بیٹھنے کے لئے ڈائس یا اسٹیج بنایا گیا تھا۔ جس کے بیچ میں پریسڈنٹ کے لئے اسی شامیانہ کے نیچے ایک چترنما چھوٹا سا کارچوبی شامیانہ تھا گویا "چھوٹا سا ایک مزار کے اندر مزار تھا" شہ نشین کے سامنے گنگا جمنی عطردان۔ گلاب پاش، چاندی کے طشت میں رکھے تھے۔ دونوں جانب چاندی کے عصا لئے دو مسند دیہاتی کھڈر پوش راہ اندرکے دیو کی طرح ایک عجب شان سے کھڑے تھے۔ مظہر نے (مسکراتے ہوئے) کہا۔ یہ کارچوبی شامیانہ زرین مسند گاؤ تکیہ عطردان گلاب پاش عصا وغیرہ جو دیکھتے ہو ایک زمیندار صاحب نے کسان سبھا کے سکریٹری کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے از خود خوشامدانہ عاریتاً پیش کیا ہے۔ اس چبوترہ کے پورب اور پچھم دونوں جانب فرش زمین پر پیال بچھا کر ڈیلیگیٹوں کے لئے بھوس کا چھپر ڈال دیا گیا تھا جس میں ڈیلیگیٹ بے دھلے کھدر کی بھاری بھاری پگڑی باندھے بیٹھے ہوئے اپنی شان ڈیلیگیٹی نمایاں کر رہے تھے

ان سب کا جائزہ لینے کے بعد مظہر نے چاہا کہ ساتھ لے جا کر ڈائس یعنی لیڈر گاہ پر مجھے بٹھا دے۔ مگر پھاٹک سے اسٹیج تک جانے کے لئے پیال بچھا کر جو بیچ سے ایک راستہ بنایا گیا تھا۔ ناہموار زمین کے ڈھیلے گرنے کی وجہ سے کسان بھائی سب سے پہلے اسی پر براجے۔ اس لئے اسٹیج تک پہونچنے کے لئے سر و نکو پھاند کر جانے کے سوا اور کوئی

صورت ہی نہیں تھی۔ میں اور منظر اسی حیص بیص میں تھے کہ چند والنٹیروں کی نظر پڑ گئی۔ کامریڈ منظر کا مرید منظر کہنے لگے ہوا تھوں ہاتھ سنبھالے اونہیں لے لیا اور لوگوں کو ادھر ادھر ہٹاتے بیچ میں راستہ بناتے ڈائس کی طرف لے چلے "بداں را بہ نیکاں ببخشد کریم" کے اصول پر منظر کا دامن تھام کر دل میں یہ شعر:-

"دریں دریائے بے پایاں۔ دریں طوفان موج افزا
دل افگندہ رسم اللہ مجو پہنا و مرسا ہا"

پڑھتا ہوا میں بھی پیچھے ہو لیا۔ مگر عام محاورہ کے مطابق تل رکھنے کی تو جگہ ہی نہیں تھی دو دو مسلم پاؤں رکھنے کی گنجائش کہاں۔ مجبوراً منظر کا دامن چھوڑ کسی کے سر۔ کسی کی گردن۔ کسی کے مونڈھے پر ہاتھ رکھتا سہارا لیتا احتیاط کے ساتھ پاؤں رکھتا ہوا آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اس احتیاط کے باوجود کسی کی ران پر پاؤں پڑ گیا تو گرجدار نے کہا "عجب گنوار ہے۔ سوجھے نا" کسی کی ٹخنی پیروں کے نیچے آ گئی تو بے ساختہ اسکے منہ سے نکلا "انکھیا پھوٹ گئی ہو" دیکھ کے نہ چل جاؤ" کسی کی انگلی دب گئی تو سورہ اس اندھا کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی پیستے ہوئے فقرے کہہ ڈالے۔ میں اپنی شان میں کلمات خیر سنتا۔ لوگوں سے معافی مانگتا۔ جلدی جلدی اس مرحلہ کو طے کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور لوگوں کی مسلم بھی کہہ رہی تھی ؎

آہستہ خرام ملکہ مخرام
زیر قدمت ہزار جانست است

کامریڈ منظر تو والنٹیروں کی مدد سے کسی طرح ڈائس پر پہونچکر ہم لباس گھدر پوشوں کے ساتھ خوش گپی میں مصروف ہو گئے اور میں بے یار و مددگار بیچ منجدھار میں کھڑا اسٹیج اور والنٹیروں کی طرف نگاہ حسرت سے دیکھ دیکھ کر دل میں یہ شعر پڑھ رہا تھا ؎

رہ تماشا و بیم کشمکش مجمع چنیں حائل
کجا دانند حال ما رضا کاران غفلت ہا

میں نے سوچا کہ جب اتنی ذلت و رسوائی کیساتھ نصف راہ طے کر کے آدھی مصیبت ختم کر چکا ہوں تو ہمت نہیں ہارنی چاہئے۔ چند سخت و سست جملے اور سہی۔ آگے بڑھ کر پیچھے قدم ہٹانا بزدلی ہے چنانچہ ہمت کر کے ایک بہاتی کا مونڈھا پھاند کر جیسے ہی ایک پیر آگے رکھنا چاہا کہ ایک چوڑے کی گٹھری سے جو لاٹھی میں بندھی ہوئی تھی۔ اس طرح الجھ گیا کہ گرنے سے بچنے کے لئے ایک گھٹنے ہوئے سر کی ٹیک مضبوطی سے تھام لینے کے باوجود لڑھک کر ایک شخص کی پیٹھ پر آ رہا۔ وہ "باپ رے باپ ٹیک نو چائل" چلا تا ہوا الگ ہو بھلا بکنے لگا اور جس کی پیٹھ پر گرا وہ جدالزنے پر تیار۔ اس کے اور ساتھیوں نے علیحدہ لے دے شروع کر دی۔ کوئی بولا۔ "کتنا جوت ہو میاں جی۔ جبکہ جوم (زخم) میں سکے سر پر کودل چل ہیں" دوسرے نے کہا "اسے ہی بڑا سو کھین (شوقین) ہو کر سرکس آگے جا کے بیٹھل چاہے" تیسرے نے زیر انشائی کی "نہ کھدر کے کرتہ تہ سر پر گاندھی ٹوپی اور چپل جاہی لیڈرن کے ساتھ برابر بیٹھے لا"

غرض جو تھا حسب استطاعت کچھ نہ کچھ بدزبانی کے پھول مجھ پر نچھاور کر رہا تھا اور میری حالت کہ :-

"ترنج تیں دشمنوں کے اکسلا امام ہے"

دل ہی دل میں منظر کو کوس رہا تھا کہ اس بہودہ نے کہاں لاکر پھنسا دیا۔ ساتھ ہی آپ اپنے اوپر بھی لعنت بھیج رہا تھا کہ کیا شامت آئی تھی کہ بیٹھے بٹھائے یہ مصیبت مول لی۔ مول کیا کی بلکہ مفت خریدی۔ چاروں طرف سے یہ بوچھار ہو رہی تھی جس کو نہایت تحمل کے ساتھ مجبوراً برداشت کر رہا تھا اسپر ایک اور نئی آفت کا یہ اضافہ ہوا کہ اس گھٹے ہوئے سر والے ٹیک چند نے کسی کے پوچھنے پر جب کہا کہ "دیکھو نہ بھیا۔ ای مسلمنوں نے ناپاک (ناحق) ہمرا ٹیک پکڑکے نوچے لگل" سنکر میں کچھ گھبرا سا گیا کہ یہ ٹھکا کہیں فلنگ کی آگ بھڑکا کر لوگوں کو مشتعل نہ کر دے۔ جلدی سے ٹیک کے وہ چند بال جو بچکر میرے ہاتھ میں رہ گئے تھے اوس کے سامنے پیش کر کے کہنے لگا "لے بھائی! اپنی ٹیک اپس لے لے۔ میں کھا تھوڑے ہی گیا ہوں" ساتھ ہی سب کو مخاطب کر کے میں نے کہا "ایسے سمے میں جبکہ ہم سب کسان بھائی مل کر زمینداری کے مٹانے کے لئے سر تک دینے کو تیار ہیں تو معمولی ایک ٹیک کے واسطے آپس میں سر پھٹول کرنے سے کیا کام چلے گا۔ اور پھر جب ہم کسانوں کے ہندو مسلمان لیڈر داڑھی مونچھ کے ساتھ

ٹیک بھی کنارے آپس میں ایسے مل جل گئے ہیں کہ دونوں کی صورت شکل میں بال برابر فرق نہیں رہا تو ہم سب داڑھی یا ٹیک کے واسطے بال کی کھال نکال کر کیوں جھگڑا کریں"۔ میری اس صلح جویانہ تقریر کا اچھا اثر پڑا اور فوراً ہی کسانی بھائی چارہ قائم ہوگیا۔ چنانچہ اسی وقت ایک کسان بھائی نے اپنے بٹوے سے کھینی یعنی تمباکو کی پتی نکال کر اپنی ہتھیلی پر ملتے ہوئے مجھ سے اخلاقاً فرمایا کہ" بھائی صاحب! تو را پاس چنوٹی تو ہوت۔ کھینی میں ملاءے لاجرا چونا تو دیل جائے"۔ بھلا چنوٹی سے مجھے کیا واسطہ۔ میں نے کہا" بھائی صاحب! چنوٹی تو گھر چھوٹ گئی"۔ یہ کہہ کر جیب سے پان کی بٹی" نکالی اور بنے ہوئے پان سے چونا پونچھ کر کھینی کے لئے دینا ہی چاہتا تھا کہ ایک دوسرے نے اپنی چنوٹی اسی طرف بڑھادی اس وجہ سے میری پیش کش شرف قبولیت نہ حاصل کرسکی۔ اب اسی کسان بھائی نے کھینی کو چٹکی میں لیکر منہ میں رکھنے کے چند ہی منٹ بعد پیچ سے ایک پیک پھینکی جس کی چھینٹ کچھ میرے جوتے اور کچھ پاجامے کی جھری پر آپڑی تو بیچارے نے اخلاقاً فوراً اپنے گرد و پاؤں سے پونچھ کر معذرت کرتے ہوئے کہا" معاف (معاف) کریں، گسہ (غصہ) کی بات ناہی۔ گلتی سے (غلطی سے) پڑگیل۔ جان تے نہ پھینکی ہے"۔ میں نے دل میں کہا۔ جان کے کیا بلکہ سیت باندھ کر بھی پھینکتے تو ایسے نازک موقع پر مجھے غصہ تھوک دینے کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک دوسرے کسان بھائی نے ازراہِ اخلاق میری طرف بیڑی بڑھاتے ہوئے کہا" ذرا ماچس تو نکالی بھائی صاحب" میں نے اس اخلاق کا جواب یوں دیا کہ جیب سے نکال کر مرت سلائی کی ڈبیا ہی نہیں بلکہ پاسنگ شو سے بھرا ہوا سگریٹ کیس بھی حوالے کردیا۔ میں نے سمجھا تھا کہ ایک یا زیادہ سے زیادہ دو سگریٹ لے کر واپس کردیگا۔ مگر اس نے میرے اخلاق کو جو صرف اسی تک محدود تھا اور زیادہ وسیع کردیا یعنی اپنے اور ساتھیوں کے سامنے بھی پیش کرکے پورا سگریٹ کیس خالی کرانے کے بعد مجھے واپس کیا۔ اسی کو میں نے غنیمت سمجھا اگرچہ نایاب کھینی رکھنے کے لئے کسان بھائی کا مال سمجھ کر کوئی کسان بھائی لے لیتا تو اپنے برادران یوسف کے ساتھ میں کیا ہوتا۔ اسپر یہ ارشاد ہوا" ای سگریٹ میں او مجا کہاں۔ آدمی سگریٹ پیئے تو جاگاڑی والا گر ایک ایک ہی کش (کش) میں منہ دھواں سے بھر جائے"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ" انقلاب زندہ باد۔ زمیندار ناس" کے نعرہ کی آواز سنکر سب سمجھے کہ سبھاپتی آگئے۔ پورے جلسہ میں کھلبلی مچ گئی مگر جب یہ معلوم ہوا کہ ایک دوسرے لیڈر کی آمد پر یہ نعرہ بلند ہوا تھا۔ سبھاپتی کے آنے میں دیر ہے تو پھر اطمینان سے اب رعایا اور زمیندار کے تعلقات پر گفتگو ہونے لگی۔ مزید بے تکلفی بڑھانے کے خیال سے میں نے ان میں کئی آدمیوں کے نام و پتہ بھی دریافت کرلئے۔ بھائی بدھن گوپ نے مجھ سے پوچھا۔ کہئے بھائی صاحب! تو ہر مالک کے جو رحلم (زور ظلم) کے کا حال ہے۔ دودھ۔ گھی۔ بیگاری۔ جرمانہ طلبانہ۔ سب موکوف (موقوف) بھیل کی اب تک باکی ہے (باقی ہے)۔ جی تو چاہا کہ اپنی حیثیت ظاہر کرنے کے بعد کہدوں کہ میرا کون مالک ہوگا۔ خدا کے فضل سے میں تو خود بلا شرکت غیرے اپنے مواشیات کا مالک ہوں۔ باقی رہا دودھ گھی اور جرمانہ طلبانہ۔ بیگاری وغیرہ تو ہماسی کی کیا مجال جو ہمیں بھی کرے۔ گھر نہ اُجاڑ دوں تو زمیندار نام نہیں، مگر ایسے موقع پر ان صحیح واقعات کو ظاہر کرنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ اس لئے میں نے دوسرے پہلو سے کہنا شروع کیا۔

میں:۔ بھائی صاحب! بات اصل یہ ہے کہ میرے یہاں کے زمیندار ذرا بگڑے دل واقع ہوئے ہیں اور ان کے گماشتہ برا ہیں بھی ویسی ہی کڑے مزاج کے ہیں۔ ذرا کسی نے عذر کیا اور جوتا برسنا شروع ہوگیا اور یہ بات تو تب جانتے ہیں کہ مار کے آگے بھوت بھی بھاگتا ہے۔ ہم سب تو آخر آدمی ہیں۔

رگھوسنگھ:۔ سب اسامی آپس میں بندس کرکے کرِیا کسم (قسم) کھاکے ایک رائے ہوجائیں تو برابل۔ گماشتہ کے مجال ہے کہ کوئی رعیت پر حلم (ظلم) کرے اور اگر کچھ ہیں چیڑ کرے تو اوکرا ایسن ٹھوک دیل جائے کہ سب حکومتے بھول جائے۔

ہلاس کے ای ناجائز (ناجائز) رسم رسوم اُٹھنے والا ناہے۔

میں:۔ بات تو ٹھیک ہے لیکن فوجداری کرنے اور عملوں کو مارنے پیٹنے کے بعد زمیندار کے طلبانہ جرمانہ سے کہیں زیادہ خرچ پولیس کے رسم رسوم نذرانہ سلامی پر بیٹھ جاتا ہے۔

سرجو پانڈے:۔ پولیس کے تو بات ہی دوسرے ہے۔ او حاکم ہوکے اپن بجر (نذر) سلامی کا ہی چھوڑے مگر جمیندار (زمیندار) کے ناجائز (ناجائز) رکم (رقم) لے وے کا کا ہک (حق) ہے۔

بھکت (فقط) اپن مالگجاری سے اوکرا سروکار۔ اُو بھی سال بھر کھا پی کے۔ سادی بیاہ۔ کپڑہ لتہ کے بعد اگر بچل اور کسان کے جی من آئل تو مالگجاری کچھ ادا تے کردیت نہیں تو جمیندار کے ناس کرکے تھت بیلام کراوے کے سوا اور کا اختیار ہی (اختیار ہی) کاہے کی کانگریسی گورنمنٹ میں تو لیلامی (نیلامی) کھیت پر ٹھپہ کجیہ (قبضہ) دلا ہی دیل جاہی۔ پھر تو جمیندار سر دن کو بھیک مانگے نہ ملت۔

نتھوا ہیر:۔ (خوش ہوکر) کسان راج میں سب جمیندارن کے گردن میں ہر (ہل) باندھ کے کھود کاس (خود کاشت) جوتا دل جائے تو بڑا مجا (مزہ) آوے۔

ایک زمیندار کے سامنے زمینداروں کی ایسی تو ہین آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کس قدر غصہ آور بات تھی۔ جی میں کہا۔ کاش! اسوقت ہوتا تمہارے ساتھ ہاں اور یہ سب مردود میرے اسامی اور نہ ہوتی کانگریس حکومت تو مشک باندھ کر خوب پٹواتا اور ہل پھال بھی چھین کر ضبط کرالیتا۔ پھر دیکھتے زمینداروں سے ہل جتوانے کا منصوبہ لیکن کسان سبھا کے اندر اتنے کسانوں کے بھیڑ میں اس کا موقع کہاں تھا مجبوراً جواب جاہلاں باشد خموشی پر عمل کرکے بحالت مجبوری اپنے غصہ کو فرو کر ہی رہا تھا کہ سکریا نجھی نے منگرو مہتو کو مخاطب کرکے کہا۔

سکریا نجھی:۔ بھائی منگرو مہتو۔ تو را تو مکدمہ (مقدمہ) کے پیروی (پیروی) میں سہر میں پرابر آمد رپھت (آمد و رفت) لگل رہ بے گرو نہ اور تو ہرا اکھبار (اخبار) کے کھبر (خبر) کے بھی بڑا سو کھ (شوق) ہو۔ اِی تو بتائی کہ اکھبار میں کسان راج کب تک ہوے کے کھبر (خبر) ہی

منگرو مہتو:۔ (واقفت کارانہ شان سے) ارے بھائی، سو باس بابو کو نہا تما جی کانگریس سے نہ نکال تھن ہل تو کسان راج کب نہ ہو جائیت ہل۔ کاہے تیواری جی۔ کمیتیار (مختار) صاحب تو را سامنے نہ گاندھی جی اور سو باس بابو کے جھگڑا کا کھسہ (قصہ) اکہ ہل تھن ہل۔

تیواری جی:۔ نہا تما جی کا کہنا ہی کہ اچھوت اُدھار ہم کریں۔ کھر پرچار ہم کریں لنگوٹی ہم پہنیں۔ بات بات پر برت ہم رکھیں۔ دیہات سدھار ہم کریں۔ پھن (پھر) اِی سو باس بابو بیچ میں کود کے کسان کے ہل پھار (اُکھاڑ) ہل کے جنتا کے لیڈر بنے لاگل کون اور سب کے سر دار بنے لاگل انگریج (انگریز) بہادر کے کھلاپھ (خلاف) جو ہر (زہر) اُگلتے پھرے ہیں۔ دیکھو تو کیسے ہندوستان سے سرکار بہادر کو نکال کے سب لیڈر بن جاہتن۔

بدھن گوپ:۔ تو تو ہر اکہے کے مطلب (مطلب) اِی ہی کہ انگریج (انگریز) بہادر کے میل میں گاندھی جی اُگلین ہیں؟

منگرو مہتو:۔ نہا تما جی کا سونچنا بھی ایک طرح تھیکے ہی کہ جادہ (زیادہ) دک (دق) کرے سے کہوں سرکار بہادر گسہ (غصہ) میں ہندوستان چھوڑ چھاڑ کر اپن ملک چل گیل (چلے گئے) اور دوسر پریسی راج تو پ بندوک لیکے کجیہ (قبضہ کرے واسطے ہندوستان پر حملہ دوڑل تو تم سب دسمن پھوج (فوج) کے آنکھ میں مرچ کھر (چرخہ) کے ٹکو اپھونک کے مکابلا (مقابلہ) تو کرسکی۔ اِی واسطے تو ملک ہر ملک کے پھوج (فوج) لوگ تن بیلیس (ٹوپن واکیلیس) کا کسم (قسم) کھاکے لڑائی جھگڑا سے باج (باز) نہ آوین اور گھڑی ملک ہندوستان کے سہاجت (حفاظت) واسطے انگریج بہادر کا رہنا جروری ہی اور انگریجی سرکار کے رہے سے نہا تما جی کا لنکان (نقصان) کاہی۔ اُنکر حکم رکھ چل ہی رہل ہی۔ چھوٹے لاٹ سے بڑا لاٹ تک بلا بلا کے صلاح لے ہی رہن ہیں۔ پھن سرکار سے مچھت (مفت) سو باس بابو کے جوگ (طرح) لڑائی لیوے سے کا پھائدہ (فائدہ) رگھو سنگھ:۔ سناہو کہ سو باس بابو کے ساتھ کوئی بوس بابو بنگالی بھی انگریجی سرکار کے کھیلاپھ لیکچر دے چل رہت ہن (لیکچر دیتے چلتے ہیں)۔

منگرو مہتو:۔ (اُسی واقفکارانہ شان سے) ارے بے کو پھ (بیوقوف) سو باس بابو اور بوس بابو دونوں ایکے ہیں۔ اصل نام سو باس بابو اور پکارو نام بوس بابو ہی جیسے گاندھی جی کا اصل نام گاندھی ہی اور پکارو نام مہا تما جی ہی اسے ہی طرح سب لیڈرن کے دو دو نام ہی۔ ہمرا سے نہ سب کا حال سن۔ پٹیل۔ پولا بھائی دیسائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سرجو پانڈے:۔ اِی دونوں تو ہر رشتہ میں کیسن بھائی ہوئے تھن (کیسے بھائی ہوتے ہیں)

منگرو مہتو:۔ پانڈے جی تو ایکدم نیٹ گیر جاہل ہی رہ گیلا۔ بھلا ہم بھائی کا ہی لا ہوتن (میرے بھائی کیوں ہونے لگے) اِی سب لیڈرن کے جات پات کھائے پیئے کے کچھ ٹھکانہ تو ہئی نہیں۔ اِنکا سے نا تا جوڑ کے کون اپن دھرم برباد کرے۔ اصل بات اِی ہی کی تم بھائی اور بولا بھائی دیسائی دو تو آپس میں بھائی بھائی ہتھن۔ بولا بھائی بڑ بھاری بوکڑو لیڈر ہتھن اور تم بھائی گاندھی جی کے منہ نگوا چیلا ہتھن جیسے محمد تی اور سوکتلی ذات دونوں

بھائی کے علی برادر اور نام پڑگیل ہی طرح ای دونوں بھائی کے نام کے ساتھ بھی بھائی جوڑ دیل گیل ہی۔

بدھن گوپ:۔ (فخریہ انداز سے) ابھی اور نام سن۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد عرف (عرف) راجن بابو۔ بڑا کابل آدمی ہتھن۔ ڈاکٹری ایکو حرفھ (حرف) نہ پڑھلن ہی۔ کھالی دمہ کے دوائی کھاتے کھاتے ڈاکٹر ہوگلن اور مولانا عبدالکلام اجات (آزاد) گاندھی جی کے بڑا بھاری بھگت اور مسلمین کے بڑا بھاری پنڈت ہتھن۔ رات دن حدیثے کرآن (قرآن) بتاوتے رہا ہتھن۔ اور ایک ٹھو بڑا بھاری لیڈر کوئی پنڈت جی ہتھن۔ روس۔ جپان۔ سب ملک سے گھوم کے آیلن ہتھن۔ انکا کہنا ہی کہ روس کے آیسن ہندوستان میں بھی کسان راج جلدی ہونا چاہیئے۔

منگرو مہتو:۔ ہمارے سن۔ او پنڈت جی کا نام نہرو لال جواہر ہی پنڈت تو کھالی کہلاوے کے ہتھن۔ دھرم اُورم سے انکا کوئی سروکار ناہی۔ البتہ کسان کے طرفدار اور بدیسی انگریج کی راج کے کھلا پھیم میں سوباس بابو کے ساتھی ہتھن۔ ہما تماجی جب دیکھلن کہ سوباس بابو اور ای پنڈت جی اگر ایک رائے ہوجیتن تو ہم اکیلے رہ جائب اپن دُھرتی سے پوٹ پاٹ کے پنڈت جی کے اپن ساتھ ملالے لن۔ نہیں تو سرکار بہادر ہندوستان چھوڑ بھاڑ کے کہئے نہ اپن ٹنک بھاگ جیتل ہل۔ کاہکہ جرمنی سرکار کے دشمن ہئی ہی۔ روس سے لاگ ڈانٹ چلل ہی جاہی۔ جپان دھمکی دے ہی چُپل ہی کہ ہمرا ایسیائی بھائی ہندوستان کو اجاد کردو نہیں تو ہم ہندوستان پر کبجہ کرلے گا۔

راگھو سنگھ:۔ مہتو جی! ای ہم نہ سمجھ لی۔ ای جپان بودھ مت کے ہی اور ہمنی سب سناتن دھرمی ہی۔ ای تون دونوں کے عیسائی بھائی کا کہدے لا۔

منگرو مہتو (منسکر) تم سب پال ٹیس (پولیٹکس) کیا جانو۔ ارے بھائی! عیسائی نہیں ایسیائی بھائی۔ بمبئی سے پچھم یورپ ویا کرے بگل جرمن پھر روس اور بلایت ہی اور بمبئی سے پورب ہندوستان کلکتہ۔ چین۔ جپان اور امریکہ وگیرہ (وغیرہ) ایسیا کہلاہے۔ ای حساب سے جپان کے ہندوستانی ایسیائی بھائی ہولن کی نا۔

مختصر یہ کہ مہتو جی اندھوں میں کانا راجہ بنے ہوئے ایک ماہر سیاسیات کی حیثیت سے لوکل پولیٹکس۔ انڈین پولیٹکس ہندوستانی لیڈروں کے حالات اور بین الاقوامی پولیٹکس۔ دنیا کی جغرافیائی پوزیشن پر تبصرہ کرتے کرتے فارن پولیٹکس اور سلطنتوں کے بین الاقوامی تعلقات پر روشنی ڈال ہی رہے تھے کہ پھر انقلاب زندہ باد کسان زندہ باد کے فلک شگاف نعروں نے سب کی توجہ اس طرف پھیر دی اور اس سلسلۂ تقریری کو درہم برہم کردیا ورنہ خدا جانے ابھی اور کیا کیا سیاسی معلومات کا خزانہ لٹایا جاتا۔ پریسیڈنٹ کی آمد کی اطلاع ملتے ہی پورا مجمع زندہ باد۔ مردہ باد کا نعرہ لگاتا ہوا سبھا پتی کو دیکھنے کھڑا ہوگیا اور شوق دیدار میں ایک دوسرے پر اس طرح گرنے لگا کہ سارے جلسہ میں ایک ہڑبونگ مچ گئی۔ سبھا پتی کے ڈائس پر آنے کے بعد بھی پندرہ منٹ تک وہ ہنگامہ و شور برپا رہا کہ خدا کی پناہ! مسلسل بدیسی راج ناس شیطانی گورنمنٹ ناس۔ زمیندارنا س۔ زمیندارنا س کا نعرہ اتنے زوروں سے بلند ہوا کہ گھبرا کر دو بلا کے طور پر میں بھی سورہ ناس پڑھنے لگا۔ اس طرح ان ستیا ناسیوں کے ناس میں میں بھی ہم آواز ہوگیا۔ اسٹیج سے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ کی کئی ہدایت کے بعد جب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھنے لگے تو "ای ساز ہمرا گرل جاہی۔ لے ہم موٹر یا پر بیٹھ گیل۔ دیکھتے نا ہمرا جگہتا (جگہ) پر کبجہ کرنے ٹنک" کا ہنگامہ شروع ہوا۔ پھر اسی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ خاموش۔ خاموش کی آواز آئی تو اب ہر شخص ایک دوسرے کو چپ رہنے کی چلا چلا کر ہدایت کرنے لگا۔ جس کی وجہ سے خاموش چپ۔ ملامت کرو۔ شور بند کرو کی آواز دیر تک ہر طرف سے آتی رہی۔ آخر خدا خدا کر کے یہ خاموش کرنیوالا شور قدرے کم ہوا تو کسانوں کے مہارا بر سبھا پتی بہادر! بھیوں کے بھاری بھاری گجرے۔ جس میں نوے فی صدی گیندے اور سورج مکھی کے پھول تھے گلے میں ڈالے اپنی سنگھاسن سے اٹھے اور اسی مردہ باد زندہ باد کے شور میں سٹیج پر آکر خطبۂ صدارت شروع کردیا۔ دس پندرہ ہی منٹ گذرے ہونگے کہ آپس میں یہ سگوئیاں شروع ہوگئیں۔

بدھن گوپ:۔ سبھا پتی جی یہ رامائن کا پڑھ رہی ہیں۔

سکرا مانجی:۔ رامائن نہیں بھگوت گیتا سو جاہی۔

نتھو امیر:۔ ہم جانتے تو بید کے اسلوک پڑھ رہی ہیں۔

منگرو مہتو:۔ تم سبکے تو اکل (عقل) سے کچھ سروکار تے ناہی ارے بھائی! یہاں پوجا پاٹ ای گھڑی تھوڑے ہورہل ہے کہ گیتا اور بید پڑھل جائے۔ یہ تو سبھا پتی جی پھر مارفرما (رہنما) ہیں۔ اکرا اڈریس کبل جاہی۔ ای میں ہم سب کسان کے بھلائی کی

بات چیت ہو۔

بدھن گوپ :۔ تو جب کسان کے بھلائی کی بات ہی تو ہم سب کے بولی میں کاہے نہ سمجھا تھن ۔ یسن پنڈتائی جبان میں بولنے کا کا پھائدہ جیکرا (جس کو) کوئی نہ سمجھے۔

اب ان ناسمجھوں کو کون سمجھائے کہ ہم لوگوں کی دیہاتی زبان صرف ہندوستانی نہیں بلکہ اتنی فیصدی عربی و فارسی کے بگڑے ہوئے الفاظ کے غلط تلفظ سے بنی ہے اور سبھاپتی جی کے بیاکھان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندی سبھا بتھا سمیلن اور ناگری پرچارنی سبھا کے ممبر ہیں۔ اب صرف عوام کے سمجھنے سمجھانے کی خاطر سنسکرت پرچار کے موقع کو کیوں ہاتھ سے جانے دیں۔ مختصر یہ کہ سبھاپتی جی کی سنسکرت کے بھاری بھاری مقفے ہوئے الفاظ والی تقریر ختم ہونے کے بعد لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ اعلان ہوا کہ بابو اودے پرکاش کسانوں کے بہت بڑے نیتا کا لکچر اب شروع ہوتا ہے۔ پرکاش جی بھی اسی نعرۂ ناس کے ہنکار کے ساتھ اسٹیج پر تشریف لائے۔ انکا لکچر سنسکرتا عام فہم تھا۔ لوگوں نے دلچسپی سے سنا اسکے بعد پھر حسب معمول سبھا کے سکریٹری نے اسی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ کہا کہ "آپ لوگ شانتی سے لکچر سنئے۔ کا مریڈ مظہر جو ایک بہت بڑے زمیندار کے ہونہار پوت ہیں۔ صرف کسانوں کی سیوا کے واسطے خاندانی زمینداری کو لات مار کر دیہات دیہات گاؤں گاؤں مارے مارے پھرتے ہیں۔ زمیندارانہ خیالات اور زمینداری کو ملک کی ترقی میں روڑا سمجھتے ہیں۔ اسی لئے تمام زمیندار برادری سے اپنا ناتہ کاٹ کر آج کسانوں میں شریک ہیں۔

اسپرویر تک زمیندار ناس۔ بدیسی راج ناس۔ شیطانی گورنمنٹ ناس کا اس طرح شور رہا کہ ناک کے بدلے کان ناس سے بھر گیا۔ جب قدرے اس ہنگامی دورہ سے لوگوں کو افاقہ ہوا تو مظہر نے اسٹیج پر آکر دیوانہ راہی ہوئے بس است کا سماں پھر مجمع کے لئے پیدا کر دیا۔ چنانچہ اسٹیج پر آتے ہی انھوں نے پہلے ہاتھ اوٹھا کر بلند آواز سے کہا' انقلاب' مجمع نے پوری قوت سے چلا کر اس ادھورے جملہ کو زندہ باد کہہ کر پورا کیا۔ اسیطرح مظہر کے ساتھ پورے مجمع نے ہاتھ اوٹھا اوٹھا کر بہ آواز بلند تین بار تکبیر کی طرح نعرہ زنی کا فرض ادا کیا جس سے مجمع میں ایک خاصا جوش پیدا ہو گیا اسی جوش کے عالم میں کامریڈ مظہر کی تقریر شروع ہوئی "کسان بھائیو۔ اٹھو۔ زمینداروں کو تباہ کر کو الو۔ انکی جائدادوں کو لوٹ لو۔ ان کے کھیتوں پر قبضہ کر لو" اس پر کامریڈ مظہر کی جے' زمینداری کی جھیئے۔ انقلاب زندہ باد کا نعرہ مسلسل اتنی دیر تک بلند ہوتا رہا کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ واقعی انقلاب برپا ہو گیا۔ منگر مہتو (اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر) "بس لیڈر ہوتو ایسن ہو۔ کیسن کس کس کے پھر میاک (فرمایا) آکھر جمیندار (تو خود زمیندار) کے پوت ہو نہ دوسر کے ایسن دماگ (دماغ) کہاں! مظہر نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا" سوویٹ روس میں زمانہ ہوا کہ زمینداری ختم ہو چکی۔ زمینداروں کی کل زمین کسانوں میں ہر ایک کی ضرورت کے مطابق تقسیم کر دی گئی۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان میں بھی انقلاب برپا کر کے کل کاشت کسانوں کو بانٹ دی جائے"

بدھن گوپ :۔ (اپنے ساتھیوں سے) ہم تو ڑکا آہر کے پھپھاڑی آ بھٹو بگہ کھوڈ کا س (خود کاشت) والا لیب (لیں گے)۔

را گھو سنگھ :۔ اتواری پین لگل نیلامی کھیت کے نیوے (نزدیک) تو ہم لہاؤ کے ہو۔ اوکر پر تو ہم ہک (حق) ہو۔

سرجو پانڈے :۔ ہم اہری کے پیٹ والا بکاس (بکاشت) ربعہ لا لیب۔

منگر مہتو :۔ (ساتھیوں کو ڈانٹ کر)۔ ابھی کاہے لاتوں سب آپس میں جھگڑا کرا ہا۔ ہندوستان میں انقلاب پائندہ باد ہو جائے کے بعد جب سرکار بنا در ہندوستان چھوڑ کے اپن ملک جائے لگتن تو ہم سب کہب کر سرکار اتوں ہی نصاف (انصاف) سے سب کے لہاؤ دیکھ کے تکسم (تقسیم) کرکے جانہیں تو تو را جائے پیچھے کھیت کے ہوارہ واسطے آپس میں بڑائی پھوجداری ہو جایت"

منگر مہتو کے اس تمثیل کو سب نے پسند کیا۔

مسٹر مظہر نے اپنی تقریر کے سلسلہ میں کہا :۔

"کسان بھائیو! تم کو اپنی قوت کا اندازہ خود نہیں۔ ہندوستان کی قسمت کی باگ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم اسمبلی سے جیسا چاہو قانون پاس کرا سکتے ہو بشرطیکہ اپنا صحیح نمائندہ اسمبلی میں بھیجو۔ موجودہ کانگریسی حکومت کی باگ جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے وہ جو تا گندم فروش بلکہ کھدر تماقوم فروش ہیں۔ اگر واقعی کسان راج چاہتے ہو تو پہلے اسمبلی پر قبضہ کرو"

بدھن گوپ :۔ (منگر مہتو سے)۔ مہتو جی! توں ابکی الکشن میں کاہے نا کھڑا ہو جا۔ اور جات (ذات) کے چھوڑ کے تو ہر کھوڑ کی

بھائی بند کے اتنا اوٹ ہوکہ اپن ساتھ ایک اور ممبر بنا سکا ہی۔
منگرو مہتو:۔ ہمرا اکیلے سبھا میں جاے سے کا ہوت۔ اوہاں تو سب ممبر کے ایک ایک الگ چٹائی ہی اور کنام پارٹی ہی۔ سو ہمر رائے ہی کہ سب کسان اپن اپن جات کے پنچایت کرکے ٹریا کسم (قسم) کھاکے اگرای بات کا چلیھ (حلف) اوٹھالیں کہ اپن جات کے چھوڑکے دوسر کے اوٹ نہ دیب تو۔ .. .. بھائی کوری بھائی کورمی سب جات کسان بھائی ممبرن کے سمبل پر کنجہ کرلیں اور سب ایک رائے ہوکے ہر جات کے کسان کو ایک ایک محکمہ کا منسٹر بنا دیں تو پھر کسان راج رہے میں باکی کا رہت
نتھوا ہیر:۔ مہتو جی! تورا پالیٹس (پولیٹکس) کے سب بات مالوم ہی۔ ای واسطے تون تو سب منسٹر کے سردار ہوکے جیکرا بے کام سپورد (سپرد) کردیب اُو تو ہرے رائے سے کام کرت۔
منگرو مہتو:۔ منسٹر کے سردار یا سرپنچ کو چیپ (چیف) منسٹر کہل جاہی۔ اگر تون سبکے اِی رائے ہی تو ہمرا کوئی اُجر (عذر) ناہی ہمرا رائے ہی کہ رامگھوسنگھ بھوجداری میں سب کے آگو دوڑھا تھن اِنکا بھوج کے منسٹر اور سکرا مانجھی لاٹھا چلاوے میں حاتم ہو اور کرا امپاسی (آب پاشی) کے منسٹر۔ سرجو پانڈے کے روپیہ پیسہ اِدھر اُدھر نکل بھل ہی کھیت کے ساتھ جہا جی کرا تھن۔ اِنکا چائیگس (فائنس) منسٹر۔ بینی تیواری بھوجداری میں جہل سے ہوا لین ہی۔ اِنکا جہل منسٹر۔ اسے ہی طرح جیکرا جیکرا بے کام سے لگا دی ہی ادھی کام کا منسٹر بنا دل جائے اور ہم تو سبکے راہ بتاوے لا موجود ہی رہب۔

ادھر منسٹری فورم ہو رہی تھی ادھر میں دل میں کہہ رہا تھا' ہاں! تب البتہ ہندوستان کی صحیح نمایندہ اسمبلی کا دعویٰ ناقابل تردید ہوگا۔

یہ لوگ وزارت مرتب کرنے میں کچھ اس طرح منہمک تھے کہ کسی نے اسکی طرف دھیان بھی نہیں دیا کہ مقرر کیا کہہ رہا ہی جب مسٹر مظہر نے لکچر ختم کرنے کے کچھ قبل لوگوں کو جوش دلانے کے لیے یہ کہنا شروع کیا کہ "کسان بھائیو! ہمت مت ہارو۔ کسان راج قائم کرنے کے لیے جان لڑا دو۔ بدیسی راج کو ختم کردو۔ زمینداروں کو اکھاڑ پھینکو۔" اس جوشیلی تقریر پر "زندہ باد۔ مردہ باد۔" کے نعرے بلند ہوئے۔ اور تماس کا ایسا شور ہوا کہ یہ لوگ بھی اسمبلی سے نکل کر پھر کسان سبھا میں چلے آئے اور سب کے ساتھ "آنچہ مردم میکنند بوزینہ ہم" میں شریک ہوکر تماس کا نعرہ لگانا شروع کردیا۔

جس جگہ میں بیٹھا تھا اس کے آٹھ دس قدم کے فاصلہ پر ایک دہاتی جوش میں کھڑے ہوکر اور ہاتھ اوٹھا اوٹھا کر بلند آواز سے زمیندار تماس۔ زمیندار مردہ باد چلا رہا تھا۔ منگرو مہتو نے جب ڈانٹ کر اسے کہا کہ ہو تو گیل اب بیٹھ جاؤ۔ اسپر اس نے منگرو مہتو کی طرف گردن موڑ کر دیکھا تو میں نے پہچانا' یہ تو میرے موضع کا اسامی سینچو اگوالا ہی۔ اب جو اس کی نظر مجھ پر پڑی تو زمیندار تماس کے بجائے گھبرا کر لگا جھک جھک کر سلام سرکار۔ سلام سرکار کہنے۔ ساتھ ہی خوشامدانہ معذرت کے انداز میں بولا کہ سرکار اپنے بھی ایلی ہی۔ ہم ہوں کھالی تماسا دیکھے چلی ایلی سرکار تو گھوڑے جان بے گرا ہی کہ ای سب بات میں ہم نا رہی۔ اپنے مالک ہیں۔ مالک کے کھلا پھو ہو کے ہم کہاں جائب۔

میں نے دل میں کہا انا للہ۔ .. .. .. اس مردود نے تو میرا سارا تھانڈا ہی پھوڑ دیا۔ اب یقینی میری شامت آئی۔ میں تو کبوتر باکبوتر باز باز کے اصول پر تماس جھنڈ میں کبوتر بنا ہوا کبوتروں کی غٹرغوں میں شریک تھا مگر اس کمبخت نے کبوتروں کا شکاری مجھے باز کہا ہر کے مجھب نازک پوزیشن میں ڈالدیا جس کا فوری اثر یہ ہوا کہ ادھر تو سب نے غصہ اور نفرت کی نگاہوں سے مجھے گھورنا شروع کیا اور ادھر میں غضب آلود نگاہوں سے اپنے اس بدتمیز اسامی کو دیکھنے لگا جس نے سرکار سرکار کہہ کر اس جمع میں مجھے ذلیل و رسوا کرنے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا اور جسنے خواہ مخواہ سب کی غصہ آلود نگاہوں کا مجھے نشانہ بنا دیا تھا۔

یہ سوچکر کہ حقیقت عریاں ہو جانے پر یہ سب غصہ میں زمیندار مردہ باد کے زبانی نعرہ کو کہیں عملی جامہ پہنانا شروع نہ کردیں۔ میرے دل کی جو حالت تھی اسکو خدا ہی بہتر جانتا ہی۔ دل میں دعا کرنے لگا کہ بار الٰہا۔" زخمیں ان کسانوں کے تہا غلام ہی" عزت و آبرو کے ساتھ گھر واپس پہنچا"

میں تو ادھر دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا اور ادھر سب نے بگڑے ہوئے تیوروں سے مجھے دیکھ کر آپس میں یہ سرگوشیاں شروع کردیں۔ کسی نے کہا۔ یہ اچھن پچھا مہ دیکھے ہو تو پہلے ہی سو بہہ (شبہہ) بھیل بل کر ای لبا چوڑا نپھا پھا (لفافہ) چھننے والا کسان کھجو نہ رہ سکے ہی۔ دوسرے نے کہا۔ جرور کوئی

جمیندار کے گوندہو۔ تیسرے نے کہا ہم اجانتے تو کھوپیہ پولیس (خفیہ پولیس) مالوم ہوبو۔ چوتھے نے گھبرا نشانی کی کہ دیکھ تو اجیر جمیندار کے چال۔ کسان بن کے ہم سب کے بھید لیوے آئیل ہی۔ اسپر راگھو سنگھ اور تیواری جی نے میری طرف غصہ سے گھور کر سب کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر تو ہنی کا رائے ہوئے تو ابھی ایکر سب جمیندار بھلا۔ .. .. یہ جملہ پورا ہونے بھی نہ پایا تھا کہ مسٹر مظہر کی تقریر ختم ہونے کے ساتھ ہی سبھا پتی نے اعلان کر دیا کہ اسوقت کا جلسہ برخاست۔ آج رات کو آٹھ بجے سے باہر کے آئے ہوئے بڑے بڑے نیتاؤں کا لکچر ہوگا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی پورے جلسہ میں ہڑبونگ مچ گئی۔ ہر شخص سب سے پہلے جلسہ سے باہر نکلنے کی کوشش میں ایک دوسرے پر اس طرح گرنے لگا کہ کسی کو کسی پر کا ہو شش نہ تھا۔ موقع کو غنیمت سمجھ کر میں بھی اپنی جگہ سے اوٹھ کر جلدی سے دوسری طرف جا گھسا اور اِدھر اُدھر ہچکولے کھاتا ہوا پھاٹک تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ اتفاقاً ایک ریلا ایسا آیا کہ بلا ارادہ صحیح سلامت جلسہ کے باہر پہنچ گیا۔ اب ایک منٹ بھی ٹھہرنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ جان بچی لاکھوں پائے کہتا ہوا اس ہڑبونگ سبھا سے سیدھا گھر پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا۔ وہاں سے خیر و خوبی کے ساتھ گھر پہنچنے کے بعد میں کئی روز تک سوچتا رہا کہ اگر مہاتما جی کی تجویز کے مطابق ہندوستان کی صحیح نمائندہ اسمبلی اور صحیح معنی کی عوام کی حکومت ہوگئی تو ہندوستان کا کیا حشر ہوگا۔ اس کا بہتر علم مہاتما جی ہی کو ہوگا۔

اقبال
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

مانپوری
اور کچھ ہو یا نہ ہو اتنا مگر ہوگا ضرور
ہر جگہ ہڑبونگ کی قائم بھا ہو جائے گی

البیان

امت مسلمہ امرتسر کا ماہوار رسالہ

آج جبکہ دنیا اس حد تک ترقی کر چکی ہے کہ جب تک کوئی اصول عقل و تحقیق کی کسوٹی پر پورا نہ اترے قبول نہیں کیا جاتا۔ ایک ایسے علمی اور دینی پرچے کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو قرآن حکیم کی تعلیمات کو Rational یعنی عقلی طور پر مغرب زدہ دماغوں کے سامنے پیش کرے۔ یہ امر تمام مسلمانان ہندوستان کیلئے فخر و مسرت کا موجب ہونا چاہئے کہ البیان اسی معیار پر قرآن عزیز کی خدمت و اشاعت کا فرض سرانجام دے رہا ہے۔ یہ پرچہ تمام ہندوستان میں اپنے رنگ کا واحد پرچہ ہے۔ اہل تحقیق اصحاب اسکی معقول اور معتدل روش کو دیکھ کر تسکین حاصل کریں گے۔

البیان ہر مہینے کے پہلے پہلے ہفتے ۲۰×۲۶/۸ کے سفید چکنے کاغذ پر شائع ہوتا ہے اور صرف تین روپے سالانہ چندے میں سات سو صفحات کے علمی و دینی مضامین کا مجموعہ پیش کرتا ہے۔ نمونہ مفت طلب کیجئے۔

منیجر رسالہ البیان امرتسر (پنجاب)

ٹل ٹل کی موت

از جناب عبدالباقی خانصاحب بی اے، جامعی مفصل پروپگنڈا آفیسر صوبۂ بہار

(اسے افسانہ سمجھنا یا کوئی واقعہ، ایڈیٹر کے اختیارات خصوصی میں سے ہے۔ تاہم یہ پچھلے دنوں کا ایک واقعہ ہے، جب کچھ دوست ہزاری باغ جیل میں جمع ہو گئے تھے۔ آج کہ جے پرکاش جیل میں ہیں، اور میں ایک سرکاری نوکر، میں ان کی یاد میں ماضی کی ایک کہانی دہراتا ہوں۔ شاید وہ میری یہ خطا کبھی نہ معاف کریں گے۔ عبدالباقی)

جیل میں جہاں انسان بہت سے کام بے سوچے سمجھے کرتا ہے، ہمارا ایک کام پیشو اور پچیسوں کی رکشا کرنا بھی تھا۔ اور میں صاف کہہ دوں کہ اس میں میرا حصہ سب سے کم تھا۔ سید احمد حبیب صاحب ندوی بلیوں، طوطوں، بگلوں اور گوریّوں کے بڑے پریمی تھے۔ "بگھا" (یہ جیل کی اصطلاح تھی، جس کا مطلب بلّا تھا) سے کھیلتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کرسٹن جی گوپیوں سے کھیل رہے ہیں۔ یا مہاتما گاندھی اپنے چرخے سے۔ ایک دھاگے کو ہلکی ہلکی جنبش دی۔ 'بلّا' اس پر جھپٹا، دھاگا زمین پر چوہا کی طرح رینگنے لگا، 'بلّا' چوہا سمجھ کر اس پر لوٹا۔ سید حبیب صاحب پورے پورے کھلاڑی معلوم ہوتے، اور وہ بھی نذدیکی جو ایک ہاتھ سے ہاکی، کاؤنٹر پکڑ کر کارنر سے گول کرتا ہے۔

لیکن سچ یہ ہے کہ چڑیوں کے 'پالن پوسن' میں سارے کام بڑے سے پرکاش نرائن، کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اور مجھے کبھی کبھی خوشی ہوتی کہ ان کی یہ پدرانہ جگت کس خوبصورتی سے جیل میں تربیت پا رہی ہے۔ ہم چار پانچ میں سے ہر شخص کا کوئی نہ کوئی خاص شوق تھا جو (بعض حالات میں) جنون کی حد کو پہنچ گیا تھا۔ مثلاً سید حبیب صاحب کسرت کرتے تھے، اور للّو لال کی پریم ساگر پڑھتے تھے، اور ہمیشہ 'داستان امیر حمزہ'، اور 'طلسم ہوشربا' کو یاد کیا کرتے تھے۔ بینی پوری دھڑا دھڑ لکھے جاتے تھے، یہاں تک کہ ان کا یہ خواب بھی شرمندۂ معنی نہیں رہا تھا۔ کہ جیل کے لکھے ہوئے کاغذوں سے "میں اپنا کفن تیار کراؤں گا۔" لیکن جے پرکاش جی ایک طرف تو "Marxism and Freedom" پر نظر ثانی کرنے، کتاب لکھنے جس میں یہ دو فیسروں اور وکیلوں کی درگت بناتے، دوسری طرف زیادہ وقت اسی شاعری میں صرف کرتے 'جسے انقلاب پسندی' کی طرح 'پرند پسندی' نہیں تو اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اور کچھ روز بعد میں نے محسوس کیا کہ ایک طرف کتاب پڑھنا اور لکھنا، دوسری طرف چڑیں پالنا، دونوں کام بیک وقت نہیں ہو سکتے، خواہ گاندھی جی روٹھ جائیں یا جواہر لال۔

ہمارے لمبے بارڑے کی چھت میں جو کئی فٹ چوڑا، اور گئی فٹ لمبا تھا، سیلانی گوریّوں کی ایک بڑی فوج نے ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ چھت اور شہتیر کی مدد سے جتنے زاویے بن سکتے تھے، سب میں کوئی نہ کوئی چڑی اپنے پریوار کے ساتھ آرام کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ برسات ابھی نہیں آئی تھی، لیکن چڑوں کا قحط، قیدی کے قفس میں بسیرا لیے آ گیا تھا جیسے آزادی کا سیاہر آیا ہو۔ باہر جاتا، چونچوں میں بھر بھر کے تنکے لانا، انہیں سجانا اور گھونسلے بنانا، تاج محل کی تعمیر سے کم اہم نہ تھا۔ جہاں زندگی تھی، جیتی پھرتی زندگی، وہاں ہیں تھیں، اپنی رفاقت پر مسرور۔ پرندوں کا یہ بے طرح قافلہ اپنے نئے مکانوں میں بہت جلد بس گیا۔ یہاں کوئی راون تو تھا ہی نہیں جو ان کی عورتوں کو اغوا کرنے کی تاک لگاتا۔ انہوں نے اپنی زندگی شروع کر دی۔ ہر چڑا دانا چرنے جاتا، چرچگ کر آتا تو چہلیں کرتا، ناچتا، تھرکتا، پر پھڑپھڑاتا، اور چڑا چڑی کی چونچ سے چونچ ملا کر پریم کتھا کا دیباچہ چھیڑ دیتا، چڑی دُم ہلاتی، پر تولتی، اڑ جاتی، چڑا بھی اس کے ساتھ ساتھ جاتا، اور دونوں میں آخر سمجھوتہ ہو جاتا۔ وہ سمجھوتہ جس پر جنسیات کی بنیاد قایم ہے۔ مادی زندگی کا اٹل قانون، کبھی کسی دوسرے جوڑے کے چڑے کی جو کتابی اعمال آجاتی تو وہ رشک سے جل اٹھتا۔ اور ان جوڑوں کے رنگ میں بھنگ ڈالتا۔ وہ جھپٹ کر چڑی کے سر پر چونچ مارتا۔ چڑی دبک کر الگ ہو جاتی۔ چڑا اب بھڑک بھڑک کر حملہ آور کے چونچیں مارتا۔ کوشش کرتا کہ رقیب رو سیہ کے بازوؤں کو اپنے پنجوں سے لہولہان کرے اس کے حملہ میں جوش ہوتا، شدت ہوتی۔ یہ لڑائی کبھی کبھی تو فوراً ختم ہو جاتی۔ کبھی کبھی دوسری بڑی بڑی طاقتیں مداخلت کرتیں۔ کچھ غیر جانبدار ہو جاتے۔ ایک جنگ عظیم چھڑ جاتی۔ ان کی وہ انتاکل کل۔ بم چیخ سے میں کبھی کبھی اُکتا کر کہتا "یہ کس قدر بدتمیز لوگ ہیں۔ خواہ مخواہ

سکون میں خلل ڈالتے ہیں۔ بھلا اس حالت میں کوئی کیا لکھیگا۔"
لیکن جسے پر کاش جی ہماری کبھی تائید نہ کرتے سو وہ لڑائی غور سے دیکھتے۔ معلوم ہوتا جیسے Love instinct (مزاجِ محبت) اور Economic instinct (مزاجِ معیشت) میں جو قدر مشترک ہے، اسے تلاش کر رہے ہوں۔ بھلا جو لوگ ایک ساتھ رہتے ہوں، ایک ساتھ دانا چُگنے جاتے ہوں، ایک ساتھ زندگی کا سہارا ڈھونڈتے ہوں، انہیں کون سا احساس، کون سا محرک، کون سی جبلت آمادۂ پیکار کر رہی ہے!!

اہلی زندگی یا سماجی ربط کا لازمی نتیجہ آبادی میں اضافہ ہے۔ جس کی پہلی شکل ان پرندوں میں انڈے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ چڑی، چڑے کے ساتھ کچھ روز تک باہر نہ نکلی۔ اس کے تیور بدلے ہوئے تھے، اس کے پر اکثر کھڑے رہتے۔ سر کے بال اکثر الجھے رہتے۔ دُم کے بال اکثر جھڑتے رہتے۔ چڑا باہر سے آتا تو وہ اس سے کھُل کر نہ ملتی، اس سے باتیں نہ کرتی۔ چونچیں نہ ملاتی، جیسے بیزار ہو۔ وہ ایک مہتم بالشان کام میں مصروف تھی، جو اس کی زندگی کا حاصل تھا۔ ایک روز اتفاق سے ایک چڑی کے تین انڈے ہمارے باڑے کے فرش پر گر پڑے۔ ٹوٹے تو اس میں بچوں کے خطوخال ابھر چکے تھے، سر پورا بن چکا تھا، باقی جسم نے دھندلے دھندلے نشان تھے، ابھی جان نہیں پڑی تھی۔ چڑی شاید اپنے انڈوں کو گنتی۔ شاید ربانی مجھ سے بہتر جانتی ہو۔ شاید فیثاغورث نے ریاضی کے مسئلے اسی سے سمجھے ہوں۔ یا یہ ہر حال انداز سے، احساس سے، گھونسلے کے خلا سے، وہ سمجھ گئی کہ اس کے انڈے ضایع ہو گئے، کوئی چور اچکا اڑا لے گیا۔ جانے وہ ہمیں چور سمجھی، یا ہمدرد، چیخنے لگی، اس شہتیر پر سے اُس شہتیر پر، اس کھڑکی پر سے اُس کھڑکی پر، وہ بتابانہ پھُدکتی، اسے ایک لمحہ کیلئے قرار نہ تھا، وہ ہر گھونسلے میں جاتی، اپنے ہم جنسوں سے اپنی زبان میں کچھ کہتی پھر لوٹتی اپنے گھونسلے میں جاتی۔ کچھ دیر بعد نڈر آیا۔ جانے اس نے اپنی زبان میں کیا کہا، اور چُپ ہو گئی۔ شاید اس نے نر سے یہی کہا ہو۔

"دیکھو جی! تم مارے مارے پھرتے ہو، اور انڈے کوئی اُڑا لے گیا۔"

نر بولا: "پریشان کیوں ہوتی ہو، دوسرے توڑ میں بہت انڈے مِل جائیں گے۔"

"واہ کیا بات کہی، میں دن رات انڈے ہی سیتی رہوں۔"

"لیکن تمہیں فکر ہی کیا ہے۔ میں تو اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ تمہیں کھلاتا ہی ہوں۔ آرام سے بیٹھی رہو۔"

"دانا لاکر آپ بڑا احسان کرتے ہیں نا۔ فوج ایسے انڈے کو"

"احسان تو نہیں کرتا، ہاں فرض پورا کرتا ہوں"

چڑی روٹھ گئی۔ لیکن کچھ دیر بعد یہ سوچ کر اس نے چڑے سے ملاپ کر لیا کہ "ٹھیک تو کہا ہے۔ مجھے کتنا آرام دیتا ہے۔ میں گھونسلے کی ملکہ بن کر بیٹھی رہتی ہوں، اور وہ مارا مارا پھرتا ہے۔" غرضکہ دانا دنکا بہم پہنچانے کی قوت نے نر کی ساری اس کاج پر آخر جا ہی دی۔ دونوں پھر ساتھ چہچہانے لگے۔

انڈوں کے بعد اب بچوں کی باری آئی۔ شہتیر کافی چوڑی تھی گھونسلے بھی کافی بڑے تھے۔ لیکن چڑی بچوں کو دانا کھلانے میں کچھ اس طرح جلدی کرتی کہ بچے نیچے گر پڑتے۔ وہ لال لال گوشت کا لوتھڑا جس کی رگوں میں زندگی کی بھی دوڑ تی ہوتی، کس قدر قابلِ نفرت ہونے کے ساتھ ہی لائقِ ہمدردی بھی ہوتا۔ زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو شاید وہ ایک قطرہ ہو۔ سیال۔ ناپاک، کیا یہ خیال کرا ہمیت کے لئے، ہر بچے کو قتل کر دینے کے لئے کافی نہیں۔ لیکن اس کا منطقی تجزیہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ناپاک قطرہ بننے سے پہلے شاید یہ بہت سی پاکیزگیوں کا نچوڑ ہو۔ جوہر ہو، اور اب ان پاکیوں اور ناپاکیوں کی کیمیاوی ترکیب سے ایک تیسری چیز بننے والی ہو جسے زندگی کہتے ہیں۔ جو سب سے زیادہ مقدس، پاک اور لائقِ احترام ہے۔

بچے جب نیچے گرتے تو میں تو اپنی کرسی پر بیٹھا، ہیگل کا فلسفہ پڑھتا ہوتا۔ لیکن جسے پرکاش بیچین ہو جاتے۔ بچے کی ماں اوپر اپنے نالوں سے آسمان سر پر اٹھائے رہتی۔ ادھر ہمارا کامریڈ تڑپتا رہتا۔ وہ جی ہی جی میں کہتا بچے کو گھونسلے تک کیسے پہنچاؤں۔ ماں کا کلیجہ کیسے ٹھنڈا کروں۔ میری بھی تو ماں تھی۔ میں امریکہ سائنس پڑھنے چلا گیا تھا، تو اس نے بھی سائنس پڑھنے کی بڑائی تھی کہ ہوائی جہاز بنائے گی اور ہوائی جہاز پر اڑ کر مجھ تک امریکہ پہنچے گی۔ وہ میرے امریکہ آنے کے بعد مری تھی تو مرنے کے بہت دیر بعد بھی اس کی خوبصورت آنکھوں کی کالی کالی پتلیوں میں ہم دونوں بھائیوں کی صورت ناچ رہی تھی۔ آج اس چڑی کا کیا حال ہو گا۔ اور چڑھی جسے پرکاش کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ شاید سمجھتی ہو کہ یہ مرے بچوں کا اغوا کریگا یا انہیں دوست سمجھتی۔ اللہ ہی جانے۔ چھت اور فرش میں قریباً پندرہ فیٹ کا فرق ہو گا۔ لیکن جسے پرکاش جی کو اپنی ہلپائی پر

بھی بڑا مغرور تھا۔ جلدی میں ہاتھ بڑھا کر بچے کو گھونسلے میں رکھنا چاہتے، پھر جھینپ کر کرسی لاتے، پھر بھی ناکامی ہوتی تو ایک اور کرسی ڈال کر زینہ بناتے۔ سیدھا ٹک چڑھ جاتے اور گھونسلے میں بچے کو ڈال دیتے۔ نپولین کو شاید اپنی فتوحات پر اتنی خوشی نہ ہوتی ہو جتنی جے پرکاش کو اس کارنامہ پر ہوتی۔ طمانیت ان کے لبوں پر مسکراتی ہوتی۔ وہ طمانیت جو کامیاب زندگیوں کا راز ہے۔

بچوں کا روز گرنا اور جے پرکاش جی کا انہیں پھر گھونسلے میں بٹھانا۔ ہبوطِ آدم سے بھی زیادہ کچھ دلچسپ واقعہ ہو گیا تھا۔ اسلئے کہ حضرت آدمؑ کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچانے والا کوئی دوسرا نہ تھا۔ اور اگر تھا تو یقیناً وہ حضرت آدمؑ کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ بنی پوری اور سید حبیب صاحب بھی اس مشغلہ میں جے پرکاش جی کا ساتھ دیتے۔ لیکن میں ہمیشہ "غمگساروں" میں رہتا۔ یہ پارٹ میں کالج لائف سے برابر کھیلتا آیا ہوں۔ اور اب کوئی وجہ نہ تھی کہ اسے چھوڑ دیتا جبکہ جے پرکاش سا دلچسپ آدمی یہاں موجود تھا۔ ایک روز باتوں باتوں طے پائی کہ ہم جو روز روز بچوں کو گھونسلوں میں رکھنے کی زحمت گوارہ کرتے ہیں۔ تو ہمیں کچھ فائدہ بھی ہونا چاہیے۔ کچھ مزدوری بھی ملنی چاہیے۔ کسی نے کہا "چڑی کے انڈے اتارے جائیں۔ انہیں تل کر کھایا جائے۔" لیکن جے پرکاش جی کو اس تجویز سے گھن آئی۔ انہوں نے کہا "بھلا گناہ بے لذت سے فائدہ اجی اب کے بچے گرے تو انہیں گھونسلے میں نہیں رکھوں گا، پالونگا" ایک دوست نے کہا "اگر مر جائے تو!" "منہ توڑ جواب ملا" اور اس کے مرنے سے پہلے میں ہی مر جاؤں تو۔ قیامت ہی بھجائے تو"، جواب مسکت تھا۔ اور باتفاق رائے فیصلہ ہو گیا کہ کل سے جے پرکاش جی بچے پالیں گے" اور ہم بھی واہ، ورے، قرے سنجنے اس سماج کی پرورش و پرداخت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔

اتفاق کہیئے کہ چڑیا سے پھر دوسرے روز غلطی ہوئی، اور اتفاق سے ایک نہیں دو بچے ایک ساتھ گرے۔ جیسے آدمؑ کیلئے حوا کا پہلے ہی سے بندوبست ہو گیا تھا۔ بڑی خوشی ہوئی۔ پڑوسی نے بہت منتر مچایا، ہاتھ پاؤں مارا، روئی بلکی، لیکن ہم نے صاف کہہ دیا کہ یہ بچے تو ہمارے پاس رہیں گے۔ یہاں سوشلسٹ اسٹیٹ قایم ہو گیا ہے۔ اور بچوں کی پرورش کا بار بھی اسٹیٹ ہی پر ہے۔ تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ خواہ مخواہ گلا پھاڑنے سے کچھ نہ ہوگا۔"

جے پرکاش جی نے اب باقاعدہ اپنا انسانی فرض ادا کرنا شروع کیا۔ عمت خانہ کے اوپر ۱۰ صابن کے کٹے کے ڈبے سے گھونسلا بنا۔ گھاس پھونس چن کر لائی گئی۔ انہیں بڑے جتن سے بچھایا گیا۔ نیچے کپڑے کا گدا دیا گیا۔ اور دونوں بچوں کو اس میں رکھ دیا گیا۔ جب دیکھو جے پرکاش جی ان گھونسلوں کے پاس ہیں، کبھی بچوں کی ٹانگ سیدھی کر رہے ہیں۔ کبھی سر کو سہارا دے رہے ہیں۔ کبھی غور کر رہے ہیں کہ ان بچوں کی فطری نشست کیا ہونی چاہیئے۔ یہ کس طرح بیٹھتے ہیں۔ کس طرح سوتے ہیں۔ کس طرح جاگتے ہیں اور سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ یہ کس طرح کھاتے ہیں۔ کچھ قیاس سے، کچھ انسانی تجربے سے۔ کچھ اٹکل پچو، بچوں کا پالن پوسن باقاعدہ شروع ہو گیا۔ اتفاق سے ان دو بچوں میں سے ایک بچہ ذرا زیادہ بڑا تھا۔ اس کے روئیں بھی کافی نکل آئے تھے۔ وہ سمجھتا تو سمجھا جاتا کہ کھانا مانگتا ہے۔ رینگتا تو سمجھا جاتا کہ کروٹ بدلنا چاہتا ہے۔ پہلے تو کوشش کی گئی کہ دونوں بچے کو دو سادا اں کے مہین مہین چاول کھائیں۔ لیکن اس تجربہ میں ناکامی ہوئی، چھوٹے چھوٹے پھنگے مارے گئے۔ انہوں نے یہ بھی نہ کھائے۔ آخر یہ ترکیب سوجھی کہ بچوں کو ذرا اور بلندی پر ماں کے قریب رکھ دیا جائے، وہ بچوں کو دانا کھانا سکھائے گی، اور مامتا کی ماری اپنا دل بھی بہلائے گی۔ یہ ترکیب کارگر ہوئی۔ ہم جب کھانے اور ناشتہ کے لئے باہر سائبان میں جاتے تو ماں چپ چاپ آتی، بچوں کو چونچیں مار مار کر کھلاتی، خوب ناچتی، ادھر سے نیچے، نیچے سے اوپر۔ بچے بھی گردن اٹھاتے، ٹکٹکاتے، چوں چوں کرتے۔ ادھر جے پرکاش کھڑکی سے ٹک ٹک کر یہ تماشا دیکھتے، اور اس "لیلا" کی ادنیٰ سے ادنیٰ تفصیل ہمیں سناتے۔ میں کبھی کبھی سوچتا کہ یہ شخص اس ادھیڑ بن میں جتنا وقت برباد کرتا ہے۔ وہ تو ایک کتاب لکھنے کے لئے کافی ہوتا، لیکن یقین جانئے جے پرکاش کتاب ہی تصنیف کر رہے تھے۔ اور اس کی اہمیت کوئی ان کے دل سے پوچھتا۔ میں بھی اس کی اہمیت سمجھنے لگا تھا۔

بچے جوں جوں بڑھتے، جے پرکاش جی کی دل کی کلی کھلتی جاتی مستقبل درخشاں معلوم ہوتا۔ زندگی کی تمام مشکلات پر غلبہ پانے کا یقین ہوتا چلا جاتا تھا۔ اور واقعی یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ایک غیر جنس، گوشت کے ایک لوتھڑے کو یوں زندگی بخشنا، اس شخص کے لئے جو اپنی نجی زندگی میں بھی ان جھمیلوں سے چھٹ ہی رہا ہو، کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ ایک بچہ بہت بڑھ گیا۔ اس کے پر اتنے بڑھ گئے

کہ وہ اُڑنے لگا۔ تمنا ہوئی کہ دنیا کی سیر کرے۔ اب تک وہ صرف اس دنیا کو جانتا تھا، جو اس مصنوعی گھونسلے میں اسے پناہ دے رہی تھی۔ اور ممکن ہے اس کے باہر وہ کچھ روشنی بھی پاتا ہو۔ اب وہ اڑنا چاہتا تھا، آسمان کی فضاؤں میں، سورج کی کرنوں میں۔ اور وہ اڑ گیا۔ جے پرکاش اور ان کے ساتھ ہم نے بھی گوشہ گوشہ چھان مارا، اپنے "ہنیا" (بھنگی) کو درخت پر چڑھا کر دیکھا۔ اس کا کہیں سُراغ نہ لگا۔ افسوس ہوا، لیکن بہت زیادہ نہیں۔ اس لئے کہ جے پرکاش کو اس کے پوسنے میں بہت زیادہ زحمت نہیں ہوئی تھی۔ انہیں اس کے بارے میں یہ فخر نہ تھا کہ میں نے اسے زندگی بخشی ہے۔ تیسرے روز معلوم ہوا کہ سرکاری باغ کے جنگلوں کا خطرناک "کوّا" جس کی چونچیں شیر کے پنجے سے زیادہ تیز ہوتی ہیں، گورییا کے ایک بچے کو چیر پھاڑ کر کھا رہا ہے۔ بچے کی ایک ٹانگ بھی ہنیا نے لا کر دکھائی جے پرکاش نے کہا "یہ وہی بچہ ہے"۔ وہ دیکھئے اس کے پاؤں کے اوپر کے بھورے اور سیاہ بال" یہ اس کی خاص پہچان تھی۔ میں کیا کرتا۔ وہ آپ سے آپ اڑ گیا۔ اسے قبل از وقت دنیا دیکھنے کا شوق چرایا۔ شاید اس کی یہ خصلت، میری مصنوعی پرورش غیر فطری پرداخت کی بنا پر نشو و نما پا گئی ہو، شاید اس کی ماں جانتی ہو گی کہ اس کے اڑنے کا ٹھیک وقت کون ہے مجھے تو اس کا کوئی تجربہ نہ تھا۔

دوسرے بچے سے جے پرکاش زیادہ مانوس تھے۔ اور شاید وہ بھی ان سے زیادہ مانوس تھا۔ لیکن بڑے بچے کے اس حسرتناک انجام نے انہیں مایوس سا کر دیا۔ انہوں نے سوچا کہ اس بچے کو ماں کے ساتھ گھونسلے میں رکھ دینا چاہیے۔ کرسیوں کا زینہ بنا کر چڑھنا، ایک معقول سی بات ہے۔ اس میں زحمت بھی ہے اور زحمت سے زیادہ خطرہ (اس موضوع پر میری ایک مبسوط تقریر ہو چکی تھی) ہمارے لوہے کے ہسپتالی پلنگ کے چار پاؤں سے بندھے ہوئے بانس کی قینچی جو فائر مچھر مارنے کی دوائی جاتی تھی، ہمارے آڑے آئیں۔ ایک قینچی نکال لی گئی۔ اور اس کے سرے پر بچے کو احتیاط سے بٹھا کر گھونسلے میں ڈال دیا گیا۔ جے پرکاش جی نے اگرچہ ہم سے نہیں کہا تھا، لیکن وہ جانتے تھے کہ معاملہ اس آسانی سے طے نہ ہو گا۔ بچے کے پہنچنے کی دیر تھی کہ ماں چاہیں چاہیں کرنے لگی۔ جیسے بھیم سین سانپوں کے دیس سے کئی ہفتہ بعد اپنی غم زدہ ماں کنتی کے پاس آئے ہوں۔ میں لکھنے میں مصروف تھا۔ لیکن جے پرکاش کی نگاہیں گھونسلے کا طواف کر رہی تھیں۔ ماں فوراً اڑ کر باہر گئی، جیسے بچے کے لئے کچھ کھانے پینے کا سامان کرنے گئی ہو۔ اس کرموں جلی کا لال مدتوں بعد پردیس سے لوٹا تھا۔ اتنے میں باپ پہنچ گیا۔ بچہ کو ٹھونک کر اس نے دیکھا، اور فوراً کچھ فیصلہ کیا۔ اب اس نے بچے کو چونچیں مارنا شروع کیں۔ گریدا، بچہ اُداس ہو کر نیچے گر پڑا۔ جے پرکاش دوڑے، بچہ کو اُٹھایا۔ چمکارا، اور پیار کرنے لگے، جے پرکاش جب موجود ہی تھے، تو باپ نفرت کیوں نہ کرے۔ انسانی فطرت اور حیوانی فطرت میں یہ زبردست فرق ہے۔ میں نے سوچا، میں بھی کبھی باپ تھا، ماں کے مقابلہ میں مجھے بچے سے شاید کم محبت تھی، لیکن میں اپنے بچے کے ساتھ ایسا سلوک کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن پرندوں کا یہ سماج، سماج کی ایک شکل ہی ہے۔ کیا عجب ہے کہ کسی وقت ماں اور بیٹے میں بھی جنسی رابطہ ممکن ہو۔ اس لئے باپ بیٹے سے نفرت کرتا ہو۔ وہ زمانہ بھی کیا عجیب ہو گا۔ بچے سے نر کی نفرت کی شاید ایک اور وجہ بھی ہو۔ توالد و تناسل کے اس سلسلہ میں نر اور مادہ کے درمیان اڈے حائل ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی سبب ہو گا کہ نر میں وہ پدرانہ احساس نہ پیدا ہوتا ہو گا جو انسانیت کا طبعی خاصہ ہے۔

جے پرکاش اتنی جلد ہمت ہارنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے سوچا کہ ماں کے غائبانہ میں باپ نے یہ بے رحمی دکھائی ہو، ماں کے سامنے شاید اسے یہ ہمت نہ ہو۔ اب ایسا بندوبست کرو کہ ماں کو باہر جانے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ انہوں نے کچھ پکے ہوئے چاول منگائے۔ بانس کے چھلے کی مدد سے پہلے چاول گھونسلے میں رکھ دئے گئے۔ پھر بچے کو بانس کے جنڈول پر بیٹھایا اور گھونسلے میں رکھ دیا۔ مادہ پھر چہکنے لگی، نر کہیں باہر گیا تھا، مادہ دُم ہلانے لگی، بچہ کے پر دیکھنے لگی۔ کبھی اس کی پیٹھ پر بیٹھتی، کبھی اسے نجاتی۔ کبھی خود ناچتی، کبھی اسے چوگے سے چاول کھلاتی۔ کبھی کبھی دُم کے پاس بھی جاتی۔ اتنے میں نر آ گیا۔ اور اس نے اپنے گھر میں یہ ہنگامہ شادی دیکھا تو جل گیا۔ مادہ کا بچے کی دُم کے پاس جانا، اسے ایک آنکھ نہ بھایا۔ اس نے بچے کو بھر گرانا چاہا، مادہ آڑے آئی۔ اب دونوں میں نوچ کھسوٹ، لپاڈگی، داؤ پیچ ہونے لگا۔ پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ شاید تھک گئے تھے، لیکن نر اپنے موقع کی تاک میں تھا۔ اس نے اچانک بچہ پر پھر حملہ کیا اور بچہ پھر لڑھکتا ہوا فرش پر تھا۔ ہم نے کانفرنس کی، ہم میں سے اکثریت کی رائے یہ تھی کہ بچے کی جان پیاری ہے تو اب اسے گھونسلے میں نہ رکھا جائے۔ ورنہ یہ ظالم باپ اسے مار ہی ڈالے گا۔ لیکن جے پرکاش کی یہ رائے نہ تھی۔ سمجھوتہ ہوا کہ ایک بار اور بچے کو گھونسلے میں

رکھ کر دیکھا جائے۔ بچہ گھونسلے میں رکھ دیا گیا۔ اتنی دیر میں مادہ اپنے پڑوسن میں گھوم آئی تھی۔ صلاح مشورہ کر چکی تھی۔ اور اس کی پختہ کوئی آخری فیصلہ دے چکی تھی۔ اسلئے کہ اب جو بچہ گھونسلے میں پہنچا تو ماں باپ دونوں ایک کونے میں دم سادھے بیٹھے تھے۔ دونوں نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ بچے پر ڈالی اور پھر چونچیں ملا کر باتیں کرنے لگی۔

نر بولا "ہاں دیکھو! اب تم بھی نہ بولنا"

مادہ بولی "نہیں جی، میں کبھی نہ بولوں گی"

نر۔ "بھلا ان انسانوں کو کیا حق ہے کہ ہمارے پھٹے میں ٹانگ اڑائیں"

مادہ۔ "اور کیا، اور بھلا ہم اس بچے کی خاطر کیوں لڑیں"

نر۔ "ٹھیک تو کہتی ہو، کل کو اس کے پر اگ جائیں گے۔ یہ اڑ جائیگا۔ بیاہ کرے گا۔ دانا لائے گا۔ میاں بیوی مل کر کھائیں گے اور نہیں پہچانے گا بھی نہیں کہ یہ بڑھیا کون ہے"

مادہ۔ "ہاں، ٹھیک ہے۔ پر اس کی دُم بڑی سخت ہوئی ہے"

نر۔ "پھر وہی دُم کی بات، اور میرے سامنے۔ دیکھو اچھا نہ ہوگا"

مادہ۔ "توبہ جانے بھی دو، یہ تو انسانوں میں رہتا ہے، انکی سی عادتیں سیکھتا ہے۔ ہمارے سماج کا دروہی (باغی) ہے"

اور تھوڑی دیر بعد نر آیا اور اس نے بچہ کو آہستہ سے گرا دیا۔ ہم آنکھیں بھاڑ بھاڑ کر تماشا ہی دیکھتے رہ گئے۔ اس واقعہ کے بعد بچے پر کاش جی اپنی ونڈیاں دو چند محسوس کیں۔ اور تھوڑے سے غور کے بعد یہ نظریہ بھی قایم کیا گیا کہ شاید اسباب، ماحول، اور سماج کے بدلنے سے اس بچے کے طبعی خواص میں کوئی ایسا انقلاب ہو جائے جو B15657 (علم التشریح) اور علم نفسیات میں ایک نئے باب کا اضافہ کرے۔ اور ہیچ میچ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ بچے پر کاش جی کو یہ بھی فکر رہی کہ اس کا جوڑ ملنا چاہیئے۔ ورنہ تجربہ ادھورا رہیگا۔ نام کا مسئلہ بھی اکثر زیر غور آیا، یہ بچہ چونکہ نر تھا، اس لئے کسی نے آدم نام تجویز کیا۔ کسی نے باغی، کسی نے بدھو، لیکن اتفاق کسی نام پر نہ ہوا۔ باغی سب سے بہتر نام تھا معناً اور لفظاً بھی، لیکن چونکہ ..... کا ہم قافیہ تھا، اس لئے مسترد کر دیا گیا۔

جیل کی مختصر لائبریری کا نام ہمارا بھلا ذخیرہ ہم چاٹ چاٹ پر تلے ہوئے تھے۔ ہم نے جہاں ایک رومانہ اور بہت سی کتابیں منگوائیں وہاں مشہور تمثیل نگار مسٹر باٹلنگ کے شاہکار "نیلی چڑیا" کا نیمیکہ بھی منگوایا۔ یہ کتاب سعید حبیب صاحب کے سوا سبھی نے پڑھی۔ یہ کتاب بچوں کے لئے نہایت ہی دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ اس کا ہیرو ایک ۱۶ سالہ لڑکا "ٹِل ٹِل" ہے۔ مسٹر باٹلنگ اس کی شادی کرانا چاہتے ہیں۔ ایک پری کو بلاتے ہیں، پری

"ٹِل ٹِل" کو خواب میں عالم مثال اور عالم ارواح کی سیر کراتی ہے۔ حسین سے حسین لڑکیوں کو بلاتی ہے، ٹِل ٹِل کو انتخاب کی آزادی دیتی ہے، اور اس کے بعد ٹِل ٹِل کی آنکھ کھلتی ہے تو کچھ روز میں وہ اسی لڑکی سے شادی کرتا ہے۔ جس کا انتخاب اس نے عالم مثال میں کیا تھا۔ یہ ایک عجیب تخیلی ڈراما ہے، اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ لوگوں کو یہ سقیم کیوں پسند ہے۔ تخیل کا کچا دھواں پوری بے پناہی سے اڑایا ہے۔ جس میں پریوں، دیووں اور روحوں کے دھندلے نقوش کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ نہ ذوق کسی نقطہ سے ٹکراتے، نہ وجدان، نہ تعشق۔ وہ دنیا تھی جس میں نہ عمل ہو نہ ردِ عمل، بھلا کوئی دُنیا ہوئی۔

بہرحال، اس پر سب کا اتفاق ہو چکا تھا کہ "ٹِل ٹِل" بڑا اچھا نام ہے۔ اور دوسرے روز سے چڑی کے بچے کا نام ٹِل ٹِل پڑ گیا۔ اور اس نام کے ساتھ ہمارے سماج میں اس کا باقاعدہ اضافہ ہوا۔

ٹِل ٹِل کی ہر ادا نرالی تھی۔ اب ماں نے بھی اس سے بالکل تعلق اختیار کر لی تھی۔ جسے پرکاش ہی اسے کھانا کھلاتے، پانی پلاتے، انہوں نے جہاں دو چار بار اپنی انگلی کو حرکت دی، اس نے چونچ کھول دی۔ ذرا بھڑا دیا اور وہ اچکنے لگا، جہاں ٹِل ٹِل کہہ کر آواز دی، اس نے گردن کھڑی کر لی۔ سعید حبیب صاحب کو حسرت ہی رہ گئی کہ کبھی ان کی آواز پر بھی 'ٹِل ٹِل' میاں بازو تولتے، لیکن بیکار۔ جسے پرکاش کی آواز اس کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔ وہ اس صورت کو پہچانتا تھا۔ ان انگلیوں کی ہر جنبش کو پہچانتا تھا۔ آنکھوں کے اشارے تک کو جان چکا تھا۔ پر کچھ چکا تھا جسے پرکاش اکثر اسے ڈانٹتے تو وہ لاڈلے بیٹے کی طرح اترانے لگتا۔ پھدکتا، پر تولتا، اڑنا چاہتا۔ جسے پرکاش کو ایک ہی فکر تھی کہ 'ٹِل ٹِل' اب بڑا ہو رہا ہے، اڑ جائے گا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی اطمینان ہو جاتا کہ "میں نے اسے کافی سدھا لیا ہے۔ یہ مجھے کبھی نہ چھوڑیگا"

شادی کا مسئلہ بھی کچھ کم اہم نہ تھا۔ ایک روز قیدیوں کے دوسرے باڑے سے نہ جانے کس طرح ایک بچہ آ گیا، جیسے کوئی پری لائی ہو۔ ٹِل ٹِل اور یہ نووارد اکٹھا ہوئے تو ٹِل ٹِل نے پر پُرزے جھاڑنے شروع کئے۔ کان سے کان ملا کر کچھ سرگوشیاں ہونے لگیں۔ خوشی کے مارے پر بار بار چھترانے لگے۔ ہم نے قرینہ سے سمجھا کہ نووارد مادہ ہے۔ اور 'ٹِل ٹِل' اپنی فطرت کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہے۔ طبیعت کی یہ افتاد خطرناک تھی اور سرِ دست بے نتیجہ بھی۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ ان نووارد صاحبہ کو مسٹر باٹلنگ صاحب کی پیروی میں "خواب کی دلہن" سمجھ کر سردست اپس کر دیا جائے۔ ٹِل ٹِل جب نیند سو جائیں گے تو انہیں عالم مثال یا عالم ارواح سے

(جاری ہے)

جے پرکاش جی اکثر ٹِل ٹِل کے ساتھ کھیلتے۔ میں ایک دن ان کی یہ اداد یکھ کر مسکرانے لگا۔ اس کے بعد ذرا وہ محتاط ہو گئے۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے یہ بہت بڑا ظلم کیا۔ ہمارا معمول تھا کہ شام کے پانچ بجنے کے بعد ہم کوٹھری سے باہر نکل جاتے، کوئی گفتگو کرتا، کوئی احاطہ کا چکر لگاتا، اور بعض لوگ غسل بھی کرتے اور ہنکر بھی لگاتے اور یہ قابل تعریف بات تھی کہ میں انہی میں سے تھا۔ ایک روز ہم حسب عادت باہر نکلے۔ تو جے پرکاش جی نے ہمارا ساتھ نہ دیا۔ میں کچھ سمجھا مگر انجان بن گیا۔ غسل کر کے جب میں واپس آیا تو جے پرکاش چپ چاپ بیٹھے تھے، جیسے کسی بہت حسین آدمی سے لڑنے کا ملال ہو۔ ٹِل ٹِل ان کے ہاتھ میں تھا۔ چہرہ سرخ تھا۔ آنکھوں میں نشوشیں تھی، انداز میں مجرمانہ تامل تھا، لب دانت سے بھینچے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا "ٹِل ٹِل خیریت سے تو ہے۔ بولے "ہاں"۔ لیکن یہ ہاں، کسی خونی مجرم کے اقبال جرم سے کم نہ تھی جے پرکاش اس کے بعد بارہ گھنٹے تک کچھ نہ بولے۔ بحثوں میں بات چیت میں، کھانے پروہ کھوئے کھوئے سے رہے۔ انہوں نے کئی بار ٹِل ٹِل کو گھونسلے سے نکالا، دیکھا، رکھا۔ میں سمجھ رہا تھا کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ لیکن کیا بولتا۔ مجھے بھی ان کی رازدارانہ خاموشی کے خلاف خاموش احتجاج کرنا تھا۔ دوسرے روز صبح کو آپ فرمانے لگے "ٹِل ٹِل کی ٹانگ ٹوٹ گئی، اب نہ جیے گا"۔ "کیسے ٹوٹی"۔ "میں کیا جانتا تھا کہ وہ ایسا نازک ہوگا۔ میں اس سے کھیل رہا تھا۔ ذرا جھٹکا دیا بس یکایک اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی"۔

جے پرکاش کے لئے یہ حادثہ کیا معنی رکھتا تھا۔ مجھے اس کا اندازہ تھا، لیکن ہم سب نے تسلی دی اور پورے وثوق کے ساتھ کہا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ٹِل ٹِل ضرور جیے گا"۔

جیل کے نگالی ڈاکٹر بھی بہت دلچسپ آدمی تھے۔ اور ہماری نبض شناسی میں انہیں کمال حاصل تھا۔ وہ آئے تو ٹِل ٹِل مریض کی حیثیت سے ان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ جے پرکاش بڑی سنجیدگی سے بولے "ذرا دیکھئے تو اس کی ٹانگوں میں موچ آ گئی ہے"۔ ڈاکٹر صاحب نے اطمینان سے معائنہ کیا، اور بولے "ہلدی پیس کر لگائیے"۔ اور اپنا تجربہ بیان کرنے لگے "میرے پاس بھی ایک کبوتر تھا۔ ایک بلی بھی تھی۔ ہم نے بلی کو اس طرح سدھایا تھا کہ وہ کبوتر پر حملہ نہیں کرتی تھی لیکن ایک روز جانے کیا وحشت سوار ہوئی کہ بلی نے کبوتر کو جا دبوچا۔ اور سینہ پھاڑ دیا۔ میں آیا تو میری چھوٹی بچی بلک بلک کر رونے لگی۔ مجھے تاؤ آ گیا۔ میں نے بندوق اٹھائی اور بلی پر داغ دی۔ بلی بات کی بات میں ٹھنڈی ہو گئی۔ اب کبوتر کا علاج میں نے یوں کیا کہ پھٹے ہوئے چمڑے کو سوئی سے سی دیا۔ اور اس کے زخم پر ہلدی لگانے لگا۔ کبوتر چند دنوں میں چنگا ہو گیا۔ آپ بھی وہی کیجئے پر کبوتر اچھا ہو سکتا ہے تو آپ کا ٹِل ٹِل بھی اچھا ہو سکتا ہے"۔

ڈاکٹر صاحب کے علم الجراحت نے انہیں یہی سکھایا تھا کہ بلی نے کبوتر کا جو سینہ پھاڑا اور جے پرکاش نے ٹِل ٹِل کی ٹانگ توڑی تو دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ صرف مرہم چاہیے۔ جے پرکاش جی نے ٹِل ٹِل کی ٹانگ پر ہلدی چڑھانی شروع کی۔ ۸ بجے صبح سے لیکر شام کے ۵ بجے تک پانچ مرتبہ ہلدی کا لیپ چڑھایا جاتا۔ شام لال (یہ غریب جیل میں آنے سے پہلے اچھا خاصہ سُنار تھا۔ اور اب ہم سوشلسٹ قیدیوں کا اچھا خاصہ باورچی بن گیا تھا) ہلدی پیس لی؟ "ہاں پیس لی"۔ "دے جاؤ"۔ "ہلدی اچھی نہیں پسی"۔ "مہین مہین پیسا کرو۔ دیکھو یہ ہلدی کی گانٹھیں۔ اس سے ٹِل ٹِل کو تکلیف ہو گی نا۔ ذرا خیال کیا کرو"۔ اور واقعی ایک طرف تو ہلدی کے ان لیپوں سے ٹِل ٹِل اچھا ہو رہا تھا۔ اور دوسری طرف شام لال کو ہلدی پیسنا آ رہی تھی۔ ہلدی پیسنا کوئی آسان کام تھوڑا ہی ہے؟"

ٹِل ٹِل کو ابھی شفا عاجل و کامل تو نہیں ہوئی تھی لیکن وہ پھر چھُد کنے لگا تھا۔ ہم شام کو بیٹھتے تو ٹِل ٹِل جے پرکاش کے ہاتھ میں ہوتا۔ کبھی وہ اسے اپنے انگوٹھے پر بٹھاتے۔ کبھی ہتھیلی پر۔ کبھی انگلیوں کا اڈہ بنا کر ہوا میں اڑا دیتے۔ کبھی زمین پر پھینک دیتے۔ ایک روز ہم گھاس پر بیٹھے تھے۔ ٹِل ٹِل کی تیز آنکھوں نے گھاس پر رسوں کے کچھ دانے پڑے دیکھے اور چونچ مارنے لگا۔ بس اتنی سی بات تھی۔ ہم میں مکالمہ چھڑ گیا۔ اس مشاہدہ پر بحث ہونے لگی۔ آدھ گھنٹہ کے بعد بحث کا موضوع یہ طے پایا کہ "انسان اور پرندوں میں کیا فرق ہے؟" بحث کی نکلاؤ کے پیش نظر سب نے یہ بھی مان لیا کہ قرآن و احادیث۔ وید، شاستر اور پران کی سند اس وقت تک نہیں مانی جا سکتی جب تک سید احمد حبیب صاحب کے آلۂ سماعت کی بیٹری انگلستان سے نہ آ جائے۔ (سید صاحب اتنا اونچا سنتے ہیں کہ آلۂ سماعت کے استعمال کی ضرورت پڑتی ہے اور آلہ کی بیٹری جب ختم ہو جاتی ہے تو انگلستان سے منگائی جاتی ہے۔

یہ معاملہ بھی ابھی اسی اسٹیج میں تھا۔) ایک گھنٹہ تک خوب خوب دلیلیں دی گئیں۔ یہ بھی بتایا گیا کہ فلسفہ اور منطق جسم کے بیری ہیں، اور ہر بات میں منطق کی رٹ لگانا کوئی دانشمندی نہیں، لیکن آخر ایک فیصلہ ہو ہی گیا اور اسکے الفاظ یہ تھے:-

"انسان اور پرندوں میں فرق یہ قرار پایا کہ انسان اپنے کھانے کیلئے چیزیں پیدا کر لیتا ہے، پرند نہیں پیدا کر سکتا۔ نیز یہ جملہ "پیدا کرنے" کے الفاظ پر خاص طور سے زور دیتا ہے۔ جس کے معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ انسان فطرت پر قابو پا سکتا ہے۔ چیزیں پیدا کر سکتا ہے اور اگر ٹل ٹل بھی اپنا پیٹ پالنے کے لئے چیزیں پیدا کرنے لگے تو اس کا شمار بلاشبہ انسانوں میں ہو گا۔"

یہ فیصلہ بہت اہم تھا، اور لارڈ لٹھگو کی تقریر سے بہت پہلے کیا گیا تھا۔

اس بحث میں جے پرکاش جی نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ٹل ٹل کو انسانیت کے دائرے میں داخل کرنے کی تجویز ان کے دماغ کا نتیجہ تھی، جس کی پرجوش تائید میں نے کی تھی۔

اتفاق کی بات کہئے کہ اسی روز رات کو ٹل ٹل صاحب بار بار اپنے گھونسلے سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ گرمی بھی زیادہ نہ تھی، جے پرکاش جی بہت پریشان تھے، اسے بار بار گھونسلے میں رکھتے بار بار اپنی میز پر بٹھلاتے، آخر ٹل ٹل خاموش ہو گیا۔ جے پرکاش اس روز بارہ بجے رات کو سوئے۔

صبح اٹھے تو ٹل ٹل اپنے گھونسلے میں دائمی نیند سو رہا تھا اور دنیا کی کوئی طاقت اسے جگا نہیں سکتی تھی، گھونسلا، اس کی قبر بن چکا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، ہاتھ پاؤں اینٹھ گئے تھے، پر بدن سے چمٹ گئے تھے۔ سید احمد حبیب صاحب نے دیکھا تو انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پڑھا۔ بینی پوری نے دیکھا تو دیا سلائی کا کوئی شعر پڑھ دیا۔ میں نے دیکھا تو جے پرکاش زائن کو دیکھا جو آنکھیں ہوئی ہوئی، آواز سے بھرائی ہوئی" کی تصویر درد بنے ہوئے تھے۔ اور وہ یکایک بولے "دیکھئے نا! کسی زہریلے کیڑے نے اسے ٹانگ میں ڈس دیا ہے۔ یہ دیکھئے! یہ خراش، یہ خون جم گیا ہے"

"ٹل ٹل" کی موت کی کوئی وجہ نہ تھی، اس کی ٹانگ اچھی ہو رہی تھی، لیکن اتفاقات ——— زندگی اور فلسفۂ زندگی میں اتفاقات کو کتنا دخل ہے۔

دن کے ۱۲ بجے ٹل ٹل کو کھانا کھلایا جاتا تھا ——— جے پرکاش اس وقت اس کے گھونسلے کے قریب چپ چاپ کھڑے تھے۔

ٹل ٹل کی موت ہماری زندگی کا ایک اہم ترین واقعہ تھی جس نے بار و طبیعتوں میں بھی ایک خلش پیدا کر دی تھی۔

شیریں بیوی

چغتائی صاحب کی اس مشہور و معروف کتاب کو منگاتے وقت صاف لکھیں کہ "اردو" چاہیئے یا "ہندی"

دونوں ایڈیشن ایک سے ہیں۔ سہ رنگا مصور سرورق۔ اندر چار فوٹو بلاک کی تصویریں۔ اردو ایڈیشن مجلد ہے۔ قیمت اردو اور ہندی دونوں ایڈیشنوں کی ایک ہی یعنی ۸ بہ ہر کتب فروش سے مل سکتی ہے ورنہ براہ راست دفتر کتابت - جودھپور

شادی

از جناب آفتاب حسن صاحب ایم۔ ایس۔ سی علیگ

شام کے وقت جب شکری ندی کے پار سورج ڈوب رہا تھا اور مغربی آسمان سنہرا لگا لی اور نارنجی ہو گیا تھا، اور مویشی آہستہ آہستہ چلتے گرد اڑاتے، اپنی گھنٹیاں بجاتے ندی سے بستی کی طرف لوٹ رہے تھے، چند بوڑھے، کچھ نوجوان اور بہت سے بچے ندی کے اُس پار بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔

شکری ندی کسی زمانے میں ندی ہو گی، اب تو خشک ہے، اور ندی سے سرے بھرے میدان میں تبدیل ہو گئی ہے۔ پاٹ اس قدر چوڑا ہے کہ اُس پار کے درخت تو نظر آتے ہیں لیکن شام کے وقت آدمیوں کا نظر آنا مشکل ہے۔ لوگ دیکھ ہی رہے تھے کہ دُور سے انگریزی باجے کی آواز آئی ——— برات نزدیک پہنچ گئی۔

صبح ہی سے بستی میں بڑی چہل پہل تھی۔ مولوی سلطان احمد کی بچی کا بیاہ تھا۔ گاؤں کی بچی کا بیاہ تھا۔ گاؤں کے سارے لوگ خوش تھے۔ ایک گھر میں خوشی سارے گاؤں والوں کو رلاتی ہے اور ایک گھر کی خوشی سب لوگوں کو خوش کر دیتی ہے۔ سلطان احمد کی خوشی سے سارے بستی والے خوش تھے۔ یہی دیہات کا دستور ہے۔

برات کو باغ میں ٹھہرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ باغ کے بنگلے کو فرش فروش سے آراستہ کر لیا گیا تھا۔ ادھر اُدھر روشنی لگا دی گئی تھی۔ ایک طرف کورے مٹکوں اور گھڑوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ دوسری طرف ایک بڑی دیگ میں شیرجا، اور دوسری میں شربت تیار تھا، بستی کے چند نوجوان انتظامات میں مشغول تھے۔

باجے کی آواز کے بعد کچھ لوگ بھی نظر آئے، لیکن وہ ندی کے اُس پار ہی جمع ہونے لگے، اور ساتھ ہی ساتھ دو تین گیس کی روشنیاں بھی نظر آئیں۔ اسی وقت فضلو دوکاندار شکر اور گھی بیچنے میں اپنی دوکان پر بہت منہمک تھے۔ برات آنے کا شور جو ہوا تو انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دوکان اپنے چھوٹے بیٹے کے حوالے کر لپکتے جھپکتے ندی کے کنارے پہونچ گئے اور بیٹھ گئے۔ اب براتی ہیں کہ آتے ہی نہیں اور فضلو کی دوکان کھلی تھی، یہ ذرا بیچین ہوئے۔ کہنے لگے :-

"بھئی یہ لوگ آخر وہاں سے چلتے کیوں نہیں؟"

ان کے ساتھی نے کہا "تمہاری شادی کو کتنے دن ہوئے؟"

فضلو کو اس سوال سے تعجب ہوا۔ کہنے لگے "مطلب؟"

"جو پوچھتا ہوں جواب دو"

"میری شادی کو؟"

"ہاں"

"یہی کوئی پندرہ بیس سال"

"پھر اتنی جلدی بھول گئے؟ ارے بھئی وہ لوگ ذرا برات کو ٹھیک کر رہے ہیں۔ سج دھج کر جلوس کیسا تھ آئیں گے"

"اچھا یہ بات ہے"

"اور نہیں تو تم تو جانتے ہو کہ برات کہیں لے جانا گویا ایک طرح کی فوج سے چڑھائی کرنا ہے۔ لڑکے والے تو ہمیشہ اپنے کو فاتح ہی سمجھتے ہیں مصیبت تو لڑکی والے کی ہوتی ہے"

یہ سن کر فضلو نے سر ہلایا، کیونکہ چند سال بعد انہیں بھی ایک لڑکی کیا ہی تھی۔

دامودر حلوائی نے جب یہ گفتگو سنی تو کہنے لگے "سنا ہے بھیا! بلایت میں تو عورت ہی کا پلہ بھاری رہتا ہے۔ اور میم لوگ صاحب لوگ کو کھوب مارتی ہے۔ کیا سچ بات ہے؟"

بہاری حجام کو اس وقت اپنی معلومات کا اظہار کرنا ضروری تھا۔ "بھیا ہم تو جب پٹنہ گیا، گئے تو میم لوگ کو کتے ہی کے ساتھ کھیلتے دیکھا۔ جب دیکھو سڑک پر گتا آگے آگے۔ میم صاحب پیچھے پیچھے۔ ایک کھن ساماں برابر دوست ہے" یہ کہہ کر انہوں نے مجمع کی طرف نظر اٹھائی دیکھنے کے لئے کہ خانساماں کی دوستی کے بیان نے ان کو لوگوں کی نظر میں کتنا بلند کیا ہے "وہ کھن ساماں مجھ سے کہتا تھا کہ گھر کا پہلے کتے کو ناشتہ دیا جاتا ہے، پھر صاحب لوگ کھاتا ہے"

دامودر نے اس گفتگو کو نہایت متانت سے یوں ختم کیا کہ "نا بھائی! ہم میم سے شادی نہیں کریں گے"

اتنے میں برات کا جلوس چل پڑا۔ اور فضلو بڑے شوق سے دیکھنے لگے۔ ابھی منٹ بھر بھی دیکھنے نہ پائے ہونگے کہ ان کا لڑکا دوڑتا ہوا آیا، کہنے لگا "ابا ابا! اماں بہت خفا ہو رہی ہیں، دوکان کھلی چھوڑ دی ہے" فضلو بیچارے ان نیک لوگوں میں تھے جو دل میں بیوی سے بہت ڈرا کرتے ہیں لیکن پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا جائے جب بھی باہر والوں کے سامنے اس کا اعتراف نہیں کریں گے۔

بچے نے غصہ کی خبر جو اگر سنائی تو بہت گھبرائے لیکن بستی والوں کے سامنے وقار جا رہا تھا۔ گھبراہٹ کو ہنسی میں ٹال کر بولے "ارے بیٹا! اب دوکان دیکھیں یا برات دیکھیں! تم بھی دیکھو آؤ بیٹھو"

لیکن بچہ اپنی ماں کو جانتا تھا، کہنے لگا "نہیں اماں مار ینگی کہتی ہیں کہ پہلے بلا کر لے آؤ۔ پھر دیکھنا"

فضلو بیچارے دوکاندار ضرور تھے لیکن تاجر نہ تھے۔ ان کے نزدیک اگر شادی دیکھنے کے سلسلہ میں ایک آدھ گاہک نکل جائے تو ایسی کوئی نقصان کی بات نہ تھی۔ اور پھر اس وقت گاؤں کا کون سا پیشہ ور تھا جو برات دیکھنے کے لئے وہیں پر موجود نہ تھا۔ نھو دھوبی۔ رحیم درزی، بہاری حجام، جھری مستری بڑھی، چراغن خلیفہ معمار، چھوٹن پارچہ باف، اور حد یہ کہ دامو در حلوائی جو رات دن اپنی دوکان سے مکھیوں کے ساتھ جونک کی طرح چمٹا رہتا تھا وہ بھی موجود تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ احتیاطاً مٹھائی کا ٹوکرا بھی ساتھ لیتا آیا تھا کہ شاید کچھ بکری ہو جائے۔ پھر فضلو اور دامو در میں کچھ فرق بھی تو ہونا چاہیے۔

لیکن فضلو پریشانی میں تھے۔ ادھر تماشے کا شوق۔ ادھر بیوی کا ڈر۔ اور پھر شرمندگی کا خوف۔ اور لونڈا ہے کہ کسی طرح مانتا ہی نہیں، چلنے کے لئے اصرار کر رہا ہے۔ مجبوراً انہوں نے نہایت وقار سے جواب دیا "جاؤ کہہ دو ابھی آتے ہیں"۔ بچہ یہ جواب لیکر نہایت تیزی سے گھر کی طرف دوڑا۔ اسے بھی تماشہ دیکھنے کی جلدی تھی۔ دو منٹ میں واپس آیا اور کہنے لگا "اماں کہتی ہیں کہ بڈھے ہو گئے ہو اور بچے سے بدتر....."

بچہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ سارا مجمع زور سے ہنس پڑا، اور فضلو اپنی خفت مٹانے کو اس کو مارنے کو دوڑے۔ بچہ یہ دیکھ کر بدحواس بھاگا۔ اور فضلو اسی بہانے دوڑتے ہوئے دوکان کی طرف روانہ ہوئے۔

برات باجوں کے شور، گھوڑوں کی ہنہناہٹ، لوگوں کی چیخ و پکار، اور بچوں کے رونے چلانے کے درمیان نہایت شان سے پہونچی۔ سب سے پہلے سمدھی صاحب اپنی پالکی سے اترے اور ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ اس کے بعد ان کے عزیز اقربا اور سب سے آخر میں دولہا میاں مع اپنے ننھے بھائی کے پالکی سے اترے اور مسند پر بٹھائے گئے۔

سواریوں میں گھوڑوں کی کثرت تھی اور جیسا کہ اکثر شادی بیاہ میں ہوا کرتا ہے ہر سوار اپنے گھوڑے سے اجنبی تھا اور ہر گھوڑا اپنے سوار سے ناواقف۔ نتیجہ صاف تھا، بعض سواروں نے اپنے گھوڑوں پر فتح پائی تھی اور گھوڑے پسینے سے سیاہ ہوئے تھے۔ لیکن بہت سے گھوڑے سواروں پر غالب رہے تھے۔ سوار ادھ موئی حالت میں اترنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور ہاتھ پاؤں کو جکڑا ہوا پاتے تھے۔ چند چھوٹے چھوٹے ٹٹوؤں پر لمبے لمبے سوار جمے ہوئے تھے، اور لگام سیدھی رکھنے کی بجائے اس فکر میں تھے کہ ٹانگیں زمین پر رگڑ کھانے سے بچی رہیں۔ جس طرح لوگ گھوڑوں کو پانی میں ڈالنے سے پہلے اپنی ٹانگیں اوپر اٹھا لیا کرتے ہیں، اسی طرح یہ بیچارے اپنے پیر اوپر سمیٹے چلے آ رہے تھے۔

ایک سوار کا تھکن کے مارے یہ عالم تھا کہ اپنے پیر کو اس طرح ڈھیلا چھوڑے ہوئے تھا کہ اس کی ٹانگیں گھڑی کے قاص کی طرح ہل رہی تھیں۔

مجمع میں ہر شخص کا انداز جداگانہ اور ہر کا انداز فاتحانہ تھا۔ کوئی رات کے وقت انگریزی ہیٹ لگائے ہوئے گاؤں والوں پر رعب جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور کوئی شروانی سے رنگین رومال نکال کر بار بار منہ پونچھ رہا تھا۔

ہر شخص کچھ نہ کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عام طور پر

"ارے کوئی گھوڑے کو پکڑنے والا ہے؟"

"بدھوا! ارے بدھوا کہاں گیا۔ میرا بستر لا"

"فلانے میاں! میرے بیگار کو بھی دیکھا ہے؟"

اس قسم کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایک باپ صاحب نے اپنے گم شدہ بیٹے کی تلاش شروع کی۔

"چنو بیٹا۔ ارے چنو بیٹا کدھر گئے تم؟"

سلطان احمد صاحب تو چند بستی کے دوسرے بزرگوں کے ساتھ

ایک طرف علیحدہ بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن ان کے بڑے لڑکے سعید الدین اور ان کے پھوپھی زاد بھائی جعفر نوجوانوں کی ایک ٹولی کو ہدایت دیتے پھرتے تھے۔

"کیوں بھائی سب انتظام ٹھیک ہے؟"

جواب ملا "سب ٹھیک ہے۔"

"کہیں مہمانوں کو تکلیف تو نہ ہو؟"

"آپ اطمینان رکھیے"

ایک طرف سے آواز آئی "ارے بھئی کوئی ہم لوگوں کی خبر لینے والا بھی ہے۔ اُس وقت سے آئے بیٹھے ہیں، کوئی بات تک پوچھنے والا نہیں ہے۔"

سعید بھاگتے ہوئے اُس طرف گئے "فرمائیے کیا حکم ہے؟"

شکایت والے صاحب نے فرمایا "حکم کیا، اُس وقت سے بیٹھے ہوئے ہیں، اس بچے کو دیکھئے! پیاس کے مارے رو رہا ہے، آخر یہاں دو دن کس طرح گزریں گے؟"

سعید اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ بچہ چھوٹا ہے۔ اس لائق نہیں کہ خواہ مخواہ گھوڑے کی پیٹھ پر باپ کے آگے بیٹھ کر سفر کرے، اور پھر یہاں پہونچنے پر بجائے اس کے ... کہ کپڑے بدلوائے، اس کا ہاتھ منہ دھلائے، آپ فرش پر جم کر بیٹھ گئے اور سارے کپڑے پہنائے ہوئے اسے بھی بٹھائے رہے۔ سعید بولنے کیا خاموش رہتے۔ صرف اتنا کہا "میں ابھی شربت بھیجوا تا ہوں"

تھوڑی دیر میں ایک لڑکا شربت کا جگ لیکر آگیا۔ شربت پی لینے کے بعد ننھے میاں کے ابا کہنے لگے "بہت سُست کام کرتے ہیں آپ لوگ۔ بچہ پیاس کے مارے مرا جا رہا تھا۔"

لڑکے نے کہا "صاحب! آپ کے سامنے پانی کا گھڑا بھرا رکھا ہے"

اتنا سُننا تھا کہ ننھے کے ابا بگڑ ہی تو گئے "خوب مہمان بلایا ہے آپ نے، اب پانی بھی ہم لوگ خود ہی اُٹھ کر پئیں"

——— لڑکا اس جواب ہی دینا چاہتا تھا کہ جعفر جو اس کے نزدیک کھڑا تھا اُس کو ہٹا لے گیا اور کہنے لگا "اگر تم ان کو جواب دینے تو ساری برات رُوٹھ جاتی ——— ابھی یہ گفتگو ختم بھی ہونے نہ پائی تھی کہ دوسری طرف سے آواز آئی۔ "لاحول ولاقوت۔ ارے صاحب! میں آپ سے شربت مانگ رہا ہوں، اور آپ ہیں کہ چائے پہ چائے لائے چلے جا رہے ہیں"

تیسری آواز نے کہا "حضرت چلئے لائے۔ اب اس وقت شربت کون پیئے گا؟"

عجیب عالم تھا۔ برائی کسی حال خوش ہونا نہیں چاہتے تھے۔ چاہتے دو تو شربت کی پکار۔ شربت لاؤ تو چائے کے لئے ہنگامہ۔ بیچارے سعید کبھی ادھر بھاگتے کبھی اُدھر۔ جعفر نے کہا "آپ کیوں خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ ہم تو موجود ہی ہیں آپ کھانے والے کا سامان کرائیے۔"

ایک دوسرا لڑکا بھاگا ہوا آیا "بھئی یہ لوگ تو عجیب ہیں، کسی چیز سے خوش ہی نہیں ہوتے۔"

جعفر نے کہا "یار عجب سیدھے مسلمان ہو۔ دونوں چیزیں سامنے لے جاؤ، خوش ہو جائیں گے۔"

جب چائے اور شربت بالکل ختم ہو گیا تو ممیاتوں کو کچھ سکون ہوا۔

گھنٹے بھر بعد لڑکے والوں نے بری کا سامان کیا اور دولہن کا جوڑا سہاگ پڑے کے ساتھ دولہن کے گھر پہنچا آئے۔ ان کی غیر حاضری میں یہاں کھانے کا سامان ہو گیا۔ طے یہ ہوا کہ پہلے کھانا کھلا یا جائے۔ اس کے بعد نوشہ کو خلعت پہنانے کے بعد نکاح ہو اور پھر دوسری رسمیں

دسترخوان بچھ گیا اور کھانا چن دیا گیا۔ کھلانے کے سامان کرنے والوں میں بستی کے تقریباً سارے نوجوان تھے۔ خیال یہ تھا کہ کھانے میں برات والوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

تماشہ دیکھنے کے لئے بستی کے چند غریب بچے وہیں پر آکر بیٹھ گئے۔ دسترخوان جو بچھا تو ان معصوموں کو کیا معلوم کہ کس کے لئے ہے، وہ بھی بیٹھ گئے۔ برات والے جو واپس آئے اور دسترخوان بچھا دیکھا تو وہ بھی ہاتھ دھو کر بیٹھنے لگے۔ بہت سے باپوں نے دیکھا کہ ان کے بچے لاپتہ ہیں، فوراً تلاش شروع ہوئی اور فرش پر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور انہیں سوتا پاکر ان کے قریب پہونچے "اٹھو بیٹا کھانا آگیا"

بچے کو کھانے سے نیند پیاری ہوتی ہے۔ اس نے ایک بار "اہوں" کہا اور پھر سو رہا۔ "بیٹا اُٹھتے نہیں کھانا" اب بھی نہ اُٹھا تو اس کو جھنجھوڑنا شروع کیا۔ اور پھر دونوں ہاتھ پکڑ کر اُٹھا دیا۔ اب وہ اُٹھ کر بیٹھ تو گیا مگر اس حالت میں کہ آنکھ بند ہے۔ اِدھر باپ نے ہاتھ چھوڑا، اُدھر وہ فرش پر پھر لمبا ہو گیا۔

اکثر لوگوں نے دیکھا کہ بچوں کے سبب سے کھانے کا نقصان ہو رہا ہے۔ اس لئے ان کو اُٹھائے اُٹھائے ہاتھ مُنہ دھونے کی جگہ پر لے گئے۔ پانی کے دو تین چھینٹے مارے اور پھر اُٹھائے اُٹھائے دسترخوان پر لے گئے اور کچھ اُن کی اور کچھ اپنی طرف کو کھانے لگے۔

ہمارا دستور کچھ ایسا ہے کہ جس برات میں شکایت نہ ہو وہ کامیاب برات نہیں کہی جا سکتی، اور جس میں رنجش نہ ہو وہ برات کہے جانے کی مستحق ہی نہیں ہے۔ روٹھ نہ جانا، بیٹی والوں کو بس بھر تکلیف نہ پہنچانا، لڑکے والوں کی رسم اور شان کے خلاف ہے۔

شاید ہی کوئی ایسی برات ہو جس میں شکایت کرنے والے موجود نہ رہتے ہوں۔ اس دسترخوان پر بھی اس کی کمی نہ تھی، ایک صاحب کو جب شکایت کا کوئی خاص چیز نظر نہ آئی تو کہنے لگے "وہ پیالہ ذرا ادھر ہے، نزدیک کر دیجئے گا ——— پیالہ نزدیک کر دیا گیا۔

دوسرے صاحب فرمانے لگے "واہ حضرت یہاں سے پیالہ ہی ہٹا دیا۔ دوسرا لائیے" دوسرا آگیا

تیسرے صاحب کی نظر ان بچوں پر پڑ گئی۔ وہ صاحب کہنے لگے "یہ کون بچے ہیں؟"

دوسرے نے کہا "معلوم نہیں ہمارے ساتھ کے تو معلوم نہیں ہوتے"

"ارے تم کون ہو جی؟" بچے کھانا کھانے میں مشغول تھے، انہوں نے جواب نہ دیا۔

"ہیں! بولتے نہیں۔ تم ہو کون؟"

بچوں نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا اور "جی" کہا۔

"کون ہو تم! پوچھ رہا ہوں، کیا نام ہے باپ کا؟"

"بقائی"

"کیا کہا۔ بقائی؟"

"جی ہاں"

"کیا کام کرتے ہیں؟"

"کھانا پکاتے ہیں۔"

انہوں نے بڑے زور سے ڈانٹ کر کہا "کیا غضب ہے، اٹھو، فوراً اٹھو!"

بچے ڈر گئے، اور کھانا چھوڑ کر گھبرا کر اٹھ گئے۔ برائی صاحب کا غصہ بڑھ رہا تھا "کیا غضب ہے۔ اس بستی کو لوگوں کو عزت اور ذلت کا کچھ خیال ہی نہیں۔ کس نے تم کو یہاں بیٹھنے کے لئے کہا"——— ان کو بلند آواز سے بولتے دیکھ کر لوگ ادھر جمع ہو گئے——— جعفر ایک طرف دیکھ بھال کر رہا تھا، وہ بھی آگیا۔ اس نے دیکھا کہ دو بچے کھڑے۔ ڈر کے مارے ان کے مُنہ سے آواز نہیں نکلتی، اور گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھ رہے ہیں۔ برائی صاحب بولے چلے جا رہے ہیں "بتاؤ تم کو یہاں بیٹھنے کے لئے کس نے کہا؟"

"جی..... جی" بچوں نے کہا۔

"جعفر اس کی تاب نہ لا سکا، کڑک کر کہنے لگا "میں نے کہا" اور بچوں سے مخاطب ہوا۔ "تم بیٹھ جاؤ" بچے بیٹھ گئے۔

برائی صاحب اب ادھر مخاطب ہوئے "آپ نے ان کو ہمارے ساتھ بٹھایا ہے؟"

"جی ہاں! آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"

"بیشک اعتراض ہے۔ آپ کو کوئی حق نہیں تھا کہ ان کو ہمارے ساتھ دسترخوان پر بٹھا دیں"

"کیا میں اس کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں؟"

"کیا یہ نوکروں کے لڑکے نہیں ہیں؟"

"نوکروں سے کیا مطلب؟"

"آپ نوکر کے معنی بھی نہیں جانتے۔ کیا ان کا باپ کسی کا نوکر نہیں ہے؟"

"کیا آپ کسی کے نوکر نہیں ہیں؟"

"لیکن میں کھانا نہیں پکاتا"

"خدا کا شکر کیجئے قسمت اچھی تھی" سب لوگ ہنس پڑے اور ان حضرت کا پارہ حرارت غصہ اعتدال سے اور چڑھ گیا۔

"آپ ہم لوگوں کی بے عزتی کرتے ہیں، اور پھر مذاق اڑاتے ہیں؟"

"بے عزتی خدا نہ کرے آپ کی ہو"

"پھر نوکر کو ساتھ بٹھانے کے کیا معنی؟"

"جناب آج شادی کا دن ہے۔ خوشی ہے۔ اگر بچے آپ کے ساتھ کھانا کھا لیں گے تو کیا حرج ہے؟"

برائی صاحب بے حد غصہ میں تھے "جناب ہم لوگ غیرت دار لوگ ہیں اعزت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ برات میں آئے

ہیں، کچھ سرات کے نہیں ہیں۔ آپ کے یہاں نوکروں کو ساتھ بٹھانے کا رواج ہو تو ہو، ہمارے یہاں نہیں ہے"

جعفر کو بھی اب غصہ آرہا تھا "جناب عالی! آپ خواہ مخواہ خفا ہوئے چلے جارہے ہیں۔ برات میں آنے سے کیا آپ کے لعل لگ گئے؟ ہمارے یہاں اس کو بُرا نہیں سمجھتے اس لیے لڑکا کھا رہا ہے۔"

براتی نے اُسی انداز سے جواب دیا "اگر آپ بُرا نہیں سمجھتے تو اپنے دسترخوان پر کیوں نہیں کھلاتے؟"

"تو کیا یہ دسترخوان آپ اپنے ساتھ لیتے آئے تھے؟" اتنا سُننا تھا کہ براتی صاحب کو جیسے کسی باؤلے کتے نے کاٹ لیا۔ چیخ کر کہنے لگے "کہاں گئے ہمارے سمدھی صاحب؟ دیکھ رہے ہیں ہماری بے عزتی؟ کیا اسی لیے ہمیں یہاں لائے تھے؟" ــــ پھر جعفر سے مخاطب ہوئے "سُن لیجیے جناب! اگر آپ ہم لوگوں کو کھانا کھلانا چاہتے ہیں تو ان لڑکوں کو یہاں سے ہٹائیے"

جعفر نے ایک مصمم انداز میں جواب دیا "اب یہ لڑکے بیٹھ چکے ہیں، کھانا کھائے بغیر نہیں ہٹائے جاسکتے۔ بہتر تو یہی ہے کہ آپ ہی اُٹھ جائیں۔" آپ کی خوشی" ــــ یہ سُن کر براتی صاحب دو چھلانگ میں کمرے سے باہر ہوگئے۔ اور شور کرنے لگے ــــ "کہاں گیا میرا سائیس۔ کدھر ہے میرا سائیس۔ لاؤ جلدی سے گھوڑا۔ اب یہاں ایک منٹ کے لئے بھی میں ٹھیر نہیں سکتا۔"

ہر طرف ایک حشر کا ہنگامہ ہوگیا۔ سعید سمدھی کی طرف چلے، اور کچھ لڑکے رُوٹھے صاحب کو منانے کے لیے دوڑے ــــ "ارے صاحب جانے دیجیے، ایسی باتوں کا کہاں تک خیال کیجیے گا۔"

"اب اس وقت اندھیرے میں آپ کہاں جائیں گے۔"

"آپ کے سائیس ہی کا پتہ نہیں ہے۔ شاید سو گیا"

"جانے بھی دیجیے غصے کو تھوک دیجیے۔"

ادھر سمدھی صاحب رُوٹھ گئے اور بڑبڑانے لگے "میرے براتی کی توہین ہوئی ہے۔ میں ساری برات لوٹا لے جاؤنگا۔ لڑکا سلامت رہے، لڑکیاں بہت مل جائیں گی"

سعید نے دانتوں سے انگلی کاٹ لی "آپ کیا فرما رہے ہیں، ایسا بُرا کلمہ تو مُنہ سے نہ نکالیے"

اِدھر جعفر پر لوگ لعن وطعن کر رہے تھے کہ ساری خرابیوں کے تم ہی ذمہ دار ہو۔ اس کے مخالفوں کو ہنسنے کا موقع مل رہا تھا "یہی ہم کہا کرتے تھے۔ اصلاح کا بھی موقع اور محل ہوا کرتا ہے"

جتنے مُنہ اتنی ہی باتیں تھیں۔ سلطان احمد بہت پریشان تھے، کہ کہیں سچ مچ سمدھی برات واپس نہ لے جائیں۔ سہت کہنے سُننے پر سمدھی صاحب راضی ہوئے کہ اگر جعفر صاحب باضابطہ معافی مانگیں تو خیر اب بھی معاملہ درست ہو سکتا ہے"

سعید جعفر کو علیحدہ لے گئے "جعفر اب تو بڑی مشکل کا سامنا ہے، وہ لوگ رُوٹھے چلے جارہے ہیں"

"تو فرمائیے اب کیا کیا جائے؟"

"وہ تم سے معافی منگوانے کے لئے کہہ رہے ہیں"

"اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو بسر وچشم۔ لیکن کس بات کی معافی مانگوں؟"

"غالباً ان سے سختی سے گفتگو کی تھی اس کی"

"لیکن سعید بھائی میں نے تو صرف واقعات کا اظہار کیا تھا"

"واقعات میں جب سچی باتیں ہوں تو تلخ معلوم ہوتی ہیں" لیتے میں سعید کے والد بھی وہیں پر آگئے۔ بچارے بے حد پریشان تھے کہنے لگے "بیٹا جعفر! میں جانتا ہوں، تم نے کوئی ایسی بُری بات نہ کی، لیکن اس وقت اپنے خاندان کی عزت انہیں لوگوں کے ہاتھ میں ہے"

جعفر کو ان کی پریشانی دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ کہنے لگا "میں نہایت نادم ہوں، ایسی وجہ سے ایسی پریشانی ہوئی۔ ماموں جان آپ اطمینان رکھیے۔ میں ابھی جاتا ہوں، مجھے یقین ہے وہ لوگ مان جائیں گے" مگر دل ہی دل میں وہ بہت ڈر رہا تھا۔ وہ جہالت کی مضرت سے واقف تھا۔ وہ تنگ خیالی کی ہٹ کو جانتا تھا۔ وہ دل میں عہد کر چکا تھا کہ اپنے سماج کی خرابیوں کو دُور کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔ چاہے اس میں بدنامی ہی کیوں نہ ہو۔ آج اس کا امتحان تھا۔ یا تو اپنے اصولوں پر قایم رہے یا پھر مخالفت کے آگے سر جھکا دے۔

برات میں بڑا شور وغل ہو رہا تھا۔ ہر شخص بحث کرنے کی اور اپنے کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ صرف ایک نوشہ تھا جو ایک طرف گم سُم بیٹھا تھا۔ دوسری طرف اس کے والد اور رُوٹھنے والے صاحب گفتگو کر رہے تھے۔ رُوٹھنے والے صاحب ابھی تک گرم تھے۔ بار بار کہہ رہے تھے "میں ہرگز

دو تین براتوں میں جاتا ہوں - جوار کی کون سی مشہور برات ہے جس میں میں نہیں گیا - اجی یہ تو بہت بڑی بات ہے - حسن الدین خاں کے لڑکے کی شادی میں تو صرف اس واسطے کہ گوشت میں نمک زیادہ تھا ساری برات لوٹ گئی - اور اس کے بعد جو مقدمہ بازی چلی تو دونوں دو تین لاکھ کے مقروض ہو گئے - اور دونوں گھر تباہ ہو گئے یہ لوگ تھے غیرت پر مرمٹنے والے - خدا جانے آپ کو کیا ہو گیا ہے"

سمدھی اپنے کو حسن الدین خاں سے نیچا کب سمجھتے تھے، ان کا غصہ بھی بڑھ رہا تھا ——— سعید اور ان کے ساتھی ہوتے نظر آئے تو روٹھے حضرت اور زور سے بولنے لگے " بس اب ہم سب لوگوں کو یہاں سے واپس چلنا چاہیے - سمدھی صاحب! اب آئندہ آپ کسی کو شرکت کی دعوت دیں تو اس کا خیال رکھیں کہ اس کی توہین تو نہ ہو " نوشہ کے والد بھی ہاں میں ہاں ملاتے چلے جا رہے تھے

سعید اور جعفر وغیرہ نزدیک آگئے اور ادھر کے لوگ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے - سعید کے پیچھے پیچھے بینی کی پوری خلقت تھی - انہوں نے سمدھی سے کہا " معاف فرمائیے - ہم لوگوں کے سبب آپ کو بہت پریشانی ہوئی - جعفر صاحب موجود ہیں "

روٹھنے والے صاحب نے بات کاٹ کر کہا " بس بس اب ہم لوگ کچھ سننا نہیں چاہتے - اس کا آپ کو اسی وقت خیال ہونا چاہیے تھا "

سعید نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا " جعفر صاحب معافی مانگنے کے لئے تیار ہیں "

سمدھی جعفر سے نہایت پُرغرور انداز میں مخاطب ہوئے - " آپکو معلوم نہیں کہ برائی کا درجہ بلند ہوا کرتا ہے "

" جی نہیں یہ تو مجھے نہیں معلوم "

" اور میرا ہر مہمان اتنی ہی عزت کے لائق ہے جتنا میں ہوں "

" یہ آپ بالکل درست فرما رہے ہیں - "

پھر آپ نے کس طرح میرے مہمان کی توہین کی "

" میں نے آپ کے مہمان کی کوئی توہین نہیں کی "

" آپ پھر وہی بات دہرائے چلے جا رہے ہیں - کسی نوکر کو ساتھ بٹھا دینا آپ کے نزدیک توہین نہیں ہے "

" لیکن آپ تو خود صاحب عقل ہیں - اس کے بیٹھ جانے سے آپ کے معزز مہمان کی توہین کس طرح ہو گئی ؟ "

" ہمارے آباء اجداد نے اس اصول کو پسند نہیں کیا ہے، اور ہمیں آپ سے زیادہ اپنے پرانوں کا اصول پسند ہے - "

" لیکن مہمانِ محترم! کیا آپ کے آباء و اجداد کے پسند ناپسند سے اسلام کے اصولوں میں فرق پڑ جائیگا - کیا آپ کے سماج کو خوش رکھنے کے لئے اسلامی مساوات کا اصول بھلا دیا جائیگا - کیا ہماری معاشرت میں بھی چھوت چھات کی لعنت اپنا گھر بنا لیا ہے؟"

روٹھے ہوئے صاحب پھر بول اٹھے " آپ کو لعنت کرنا ہو اپنے اوپر کیجئے، اور وعظ کرنا ہو، مسجد جائیے "

اس گرم بحثی سے جعفر جھلا اٹھا " آپ کی سمجھ تو الٹی معلوم ہوتی ہے، میں لعنت بھیج رہا ہوں چھوت چھات پر اور آپ اپنے اوپر لئے چلے جا رہے ہیں "

روٹھے صاحب ایک دفعہ پھر خفا ہو گئے - کھانا نہ کھانے سے ذرا ان کا مزاج تیز ہو گیا تھا " اور سنئے میری سمجھ الٹی ہے، کیوں صاحب! میری سمجھ الٹی ہے ؟ " ——— سن رہے ہیں سمدھی صاحب! میری رسوائی ہو رہی اور آپ کے کان پر جوں نہیں رینگتی - میں نے ایسی بودی برات آج تک نہیں دیکھی تھی - اچھا خدا حافظ " ——— یہ کہہ کر وہ اپنے سائیس اور گھوڑے کو پکارتے ہوئے پھر آگے بڑھے - سمدھی نے ان کو پکڑ لیا - " ذرا ٹھیر جاؤ - اس میں تمہاری میری دونوں کی بے عزتی ہے - میں ابھی فیصلہ کئے دیتا ہوں " ——— یہ کہہ کر وہ غصہ میں بھرے ہوئے سلطان احمد صاحب کے قریب گئے " سنئے جناب آپ نے لونڈوں کو انتظام سپرد کر کے میری بڑی بے عزتی کرائی ہے آپ میں بہت خاموش رہا - براتیوں کو چاہئے ٹھنڈی ملی - میں کچھ نہ بولا - شربت پھیکا تھا، میں خاموش رہا - لیکن صبر کی ایک حد ہوتی ہے - آپ اس قصہ کو فوراً یہیں پر ختم کیجئے - ورنہ میں واپس جاتا ہوں - ساری برات کو واپس لے جاؤنگا - نوشہ کو واپس لوٹا دونگا"

سلطان احمد صاحب پر جوش اور افطار سے لرزہ طاری ہو گیا - برات واپس لیجانے کے لفظ نے ان کے ذہن کو موجودہ واقعات کے لئے بیکار کر دیا - اور ان کے سامنے انیس سال پہلے کا نقشہ پھر گیا - ان کو وہ وقت یاد آیا جب یہ بچی پیدا ہوئی تھی - اور اس کو دیکھنے کے لئے وہ پہلی بار گھر کے اندر گئے تھے - اور اس کی ماں نے جس کے چہرے پر مسرت کی ایک غیر معمولی جھلک تھی، بچی کو سامنے کرتے ہوئے پوچھا " کیا آپ مایوس ہوئے ؟ "

سلطان احمد نے حیرت سے کہا " نعوذ باللہ! ایسا کیوں کہتی ہو؟

خدا مبارک کرے "

" لوگ کہتے ہیں کہ بیٹا ہو تو اچھا ہے "

" زمانہ جاہلیت کی باتیں ہیں "

" لوگ کہتے ہیں کہ بیٹی کی شادی کی فکر میں والدین کو بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ اس سے بیٹی نہ ہی پیدا ہو تو اچھا ہے "

" توبہ کرو۔ توبہ کرو! اس میں شک نہیں کہ ہم لوگوں میں غیر قوموں کی بُری رسمیں بہت آگئی ہیں۔ لیکن ہماری قوم گر کر کے بھی اتنا نہیں گری ہے کہ بیٹی کو بُرا سمجھنے لگے۔"

" تو آپ خوش ہیں ؟ "

" بہت خوش۔ بہت دنوں کے بعد گھر میں چاند آیا ہے "

بیوی نے ہنس کر پوچھا " اور ہمارے بیٹے ؟ "

" بیگم! گھر کی رونق تو گھر ہی کے چراغ سے ہوتی ہے۔ سڑک پر گیس جلے یا بجلی۔ ذرا اپنے بیٹوں کو کچھ اور پڑھ لینے دو۔ تھوڑے دنوں میں نہ وہ میری سنیں گے نہ تمہاری۔ وہ تو باہر ہی کی روشنی بن کر رہیں گے "

اس گفتگو سے دونوں ہنس پڑے۔

پھر سلطان احمد کو وہ زمانہ یاد آیا جب ان دونوں نے مل کر اس بچی کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اور پوری کوشش کی تھی کہ بچی کو ایسی سلیقہ شعار اور ہنر مند بنا دیں، جس گھر میں وہ جائے مبارک قدم ثابت ہو اور اپنے ماں باپ کا نام اونچا کرے۔

اس کے بعد ان کو وہ وقت یاد آیا جب بچی سولہ برس کی ہو چکی تھی اور بیوی کے اصرار سے انہوں نے لڑکے کی تلاش شروع کی تھی۔ اس وقت اور صرف اسی وقت ان کو معلوم ہو سکا تھا کہ ان کی قوم کس درجہ نیچے گر چکی ہے اور اس کے نوجوان کس قدر بے غیرت ہو چکے ہیں ——— کیا کوئی گھر نہیں ایسا بھی ملا جو چھوٹتے ہی یہ سوال نہ کرے کہ آپ کتنا روپیہ دیں گے ؟ نہیں ——— کیا کوئی باپ ایسا دکھائی دیا جو یہ کہے کہ آپ جو کچھ دیں گے، اپنی بیٹی کو دیں گے۔ مجھے تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ میری بہو کیسی آئیگی ؟ ——— نہیں ——— کیا انہیں کسی نے یہ بھی کہا کہ میں شادی بیاہ میں مطالبات کا قائل نہیں۔ یہ تو خوشی کی بات ہے، جو ہم سے ہو سکے گا ہم کریں گے۔ جو تم سے ہو سکے تم کرو ؟ نہیں ——— کیا انہیں کوئی ایسا غیرت دار نوجوان نظر آیا جو اپنے کو ایک بیجان بے حس لکڑی کے ٹکڑے کی طرح بکتا ہوا دیکھ کر جوش میں آجائے۔ اور صاف کہہ دے کہ میں شادی روپیہ سے نہیں کروں گا۔ نہیں نہیں نہیں۔

وہ جہاں گئے روپیہ کی فرمائش۔ جہیز نگاہ اُٹھائی لین دین کا قصہ۔ کہیں جواب ملتا کہ لڑکا ابھی طالب علم ہے۔ شادی سے پہلے اتنا دینا ہوگا۔ کہیں کہا جاتا کہ شادی کے لئے تیار ہیں لیکن نوکری دلانے کا وعدہ کرنا ہوگا۔ کہیں مطالبہ ہوتا کہ آپ اپنی بیٹی کو جتنا زیور دینا چاہتے ہیں، پہلے اس کی فہرست دیجئے ——— اور پھر غضب پر غضب یہ کہ بہت سے نوجوان ایسے بھی نظر آئے جنہیں ہونے والی سسرال سے روپیہ کا مطالبہ کرتے کسی قسم کی شرم محسوس نہیں ہوتی تھی۔

تین سال کی کوشش اور محنت کے بعد ایک لڑکا ایسا نظر آیا جس کے گھر والوں کے مطالبات کچھ کم تھے۔ اور وہ خود تعلیم یافتہ تھا اور اُس کے ساتھی اس کو روشن خیال کہا کرتے تھے۔

سلطان احمد صرف نکاح کے قائل نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ نکاح اور رخصتی ساتھ ساتھ ہو۔ لیکن لوگوں نے انہیں سمجھایا کہ زمانہ کی روش کو دیکھئے۔ اگر آپ دیر کریں گے تو کیا معلوم کہ کوئی دوسرا بھٹی والا اونچی بولی بول دے۔ کم از کم بات پکی کر کے منگنی کر لیجئے اور جلد از جلد شادی طے کیجئے۔ چنانچہ منگنی ہو گئی اور طے یہ پایا کہ چھ مہینے بعد شادی ہو جائے۔ اس کی خبر تمام اطراف وجوار کے لوگوں کو ہو گئی۔

بات پکی ہو گئی۔ منگنی ہو گئی۔ لیکن لوگ یہ بھول گئے کہ کوئی چاہے تو اس موقع سے کافی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ سلطان احمد کے سمدھی نے روپیہ کا مطالبہ نہیں کیا۔ لیکن اپنی مجبوری اور اپنے روپے کی کمی کو ان پر ظاہر کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کی۔

چھ مہینے ہو گئے، لیکن لڑکے والوں کی طرف سے شادی کا کوئی ذکر نہیں ہوا تو لوگ ذرا چونکے ہوئے۔ خط و کتابت شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ روپیہ کا انتظام ہو رہا ہے۔ تین مہینہ بعد شادی ہو جائیگی۔ تین مہینے جب گذر گئے تو جواب آیا کہ ابھی تک انتظام نہیں ہوا ہے۔ لوگوں نے سلطان احمد کو رائے دی کہ یہ سب بہانہ ہے قیامت تک انتظام نہ ہو سکے گا۔ آپ کسی بہانے سے روپیہ ان کو بھجوا دیجئے ——— چنانچہ یہی ہوا۔ کپڑے کے بہانے روپیہ بھیجا گیا، اور برات آگئی۔

اتنی مالی زیر باری اور پریشانی کے بعد تو یہ برات آئی۔ اب اسکے واپس جانے کا خیال کرکے اور اپنی بے عزتی کو محسوس کرکے ان پر سکتہ طاری ہوگیا۔ وہ بولنا چاہتے تھے، لیکن بول نہ سکے۔

جعفر نے آگے بڑھ کر کہا "جناب! جھگڑے کا بانی میں ہوں۔ آپ ماموں جان سے کیا کہتے ہیں۔ مجھ سے کہیئے"

"آپ کو معافی مانگنی ہوگی۔"

"میں حاضر ہوں۔ کس بات کی معافی مانگوں؟"

"آپ نے ان کی توہین کی ہے، اس کی معافی مانگئے"

"اگر میری باتوں سے آپ کی توہین ہوئی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔"

"روٹھے بارانی کچھ خوش ہوئے۔ لیکن اُسی مصنوعی آواز میں کہنے لگے "آپ کی باتوں سے نہیں، آپ کی حرکات سے میری توہین ہوئی ہے، آپ اس کی معافی مانگیں ورنہ ابھی ابھی برات واپس جاتی ہے"

"صاحب کہہ تو رہا ہوں کہ اگر میری باتوں یا میری حرکات سے آپ کی توہین ہوئی ہے تو اس کی معافی مانگتا ہوں۔"

"آپ معافی مانگتے ہیں یا ڈانٹتے ہیں؟ کہیئے کہ دسترخوان پر جو آپنے ان لڑکوں کو بٹھا دیا وہ بڑی غیر شریفانہ بات تھی"

جعفر بڑی مشکل سے ضبط کر رہا تھا۔

"جناب عالی! میں اس کو ماننے کے لئے تیار ہوں کہ ان کے بٹھانے سے ممکن ہے کہ آپ کی توہین ہوئی ہو۔ لیکن میں اسے غیر شریفانہ بات نہیں کہہ سکتا، میں مجبور ہوں۔"

"سمدھی نے خفا ہو کر کہا کہ تو آپ معافی نہیں مانگیں گے؟"

"جناب میں معافی تو مانگ چکا۔ لیکن آپ معاف ہی نہ کرنا چاہیں تو میں کیا کروں۔ آپ کو خوش کرنے کیلئے میں اپنے عقائد تو نہیں بدل سکتا"

سمدھی جوش میں آکر کہنے لگے "ہم لوگوں کو خوش کرنا آپکا فرض ہے۔ ہم لوگ اس وقت غرض کے بندے نہیں ہیں، آپ ہیں۔ کنواں پیاسے کے پاس نہیں آتا۔ سمجھ لیجیئے"

لڑکے بھنے والے صاحب بولے "معلوم ہوتا ہے ان لوگوں میں شرافت نہیں ہے۔ لڑکے کیلئے آپ کو کہیں اور دیکھنا تھا۔"

سمدھی بولے "ٹھیک کہتے ہو، بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے یہاں نسبت کرنے میں اپنی عزت کھوئی۔"

اتنا سُننا تھا کہ سلطان احمد ضبط کی حد سے باہر نکل گئے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر کہا "بس بس بہت ہوا۔ دنیا میں ایک عزت والے آپ ہی تو رہ گئے ہیں؟ شام سے عزت۔ عزت عزت۔ ایک رٹ لگا رکھی ہے۔ اگر تم لوگوں میں غیرت اور شرافت ہوتی اور دوسروں کی عزت کا ذرا بھی خیال ہوتا تو اس وقت جو کچھ بول رہے ہو ہرگز نہ بولتے ——— لڑکے کیلئے آپ دوسرا گھر ڈھونڈ لینگے۔ آپنے یہاں نسبت کرکے عزت کھوئی جیسے آپ نے ہم پر بڑا احسان ہی تو کیا؟

جاہلو! بدتہذیبو! تم کو عزت اور بے عزتی سے کیا مطلب تم کو تو پیسہ چاہیئے۔ پیسہ، میرا لڑکا بی اے ہے، اس کی قیمت میں زیور لاؤ۔ نوکری لاؤ۔ جہیز لاؤ۔ سب کچھ لاؤ۔ اور نہ ہو سکے تو قرض لیکر لاؤ۔ گھر بیچکر لاؤ۔ تم کو کیا خبر کہ آجکل کے بی اے گھاس کھودنے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔"

سمدھی صاحب بھی ترکی بہ ترکی جواب دینا چاہتے تھے۔ "اب ہم لوگ زیادہ نہیں سُننا چاہتے۔ خاموش رہیئے ورنہ بعد میں پچھتائیگا"

سلطان احمد کا غصہ اور بھی بڑھ گیا۔ بہت ہوئی خاموشی، اور بہت ہوئی معافی۔ جب تک تمہاری ذہنیت کو لوگوں کا داغ درست نہ کیا جائیگا، ہماری تباہی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ آخر تم یہ دھمکیاں کیوں دے رہے ہو؟ صرف اسی سبب سے کہ تم جانتے ہو کہ ہمارے سماج کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ برات واپس جائیگی، لڑکی والوں کی جگ ہنسائی ہوگی۔ چاہے ان کا قصور کچھ نہ ہو۔ لڑکی کی تباہی ہوگی چاہے وہ معصوم ہی کیوں نہ ہو۔ تم تو لڑکے والے ہو۔ کہیں نہ کہیں سودا کر ہی لوگے"

اتنا سُننا تھا کہ سمدھی آپے سے باہر ہوگئے۔ "بس قصہ ختم۔ اٹھاؤ سامان۔ بس ہم لوگ ابھی ابھی واپس ہو جائیں گے۔ یہاں اب ایک منٹ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ ہم کوئی گرے پڑے نہیں ہیں۔ میرا لڑکا تعلیمیافتہ ہے۔ اس پر سے ہزاروں لڑکیاں قربان۔ اٹھاؤ سامان چلو ابھی چلو"

سعید کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ غصہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اس نے اسی شور و غل میں چیخ کر کہا "چلے جاؤ ابھی چلے جاؤ۔ جہنم میں جاؤ۔ اپنا منہ کالا کرو۔ اور جہاں زیادہ دام ملیں اپنے لڑکے کو بیچ دو۔ تم کو لڑکی کی روانی اور لڑکے کی خوشی سے کیا بحث....."

اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اتنے میں آواز آئی "ذرا ٹھہر جائیے"

شادی کے تحفے

از جناب پروفیسر سیّد اختر احمد صاحب اختر۔ اورینوی ایم اے

اِس کا مجھ سے پردہ تو نہیں تھا، مگر میرے اور ثروت کے درمیان حجاب حائل تھا، گہرا حجاب۔ اس کی شادی ہونیوالی تھی۔ اس بات نے شرم میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ جیسے جھاڑیوں کے درمیان ہرن چھپ جائے اور پھر نمودار ہو، اسی طرح وہ سائبان میں چلتی پھرتی ہوئی، پایوں کی آڑ میں مجھے دیکھ کر روپوش ہو جاتی تھی اور کبھی دوڑ کر جھلتی ہوئی چوٹی کے ساتھ در و دیوار کی اوٹ میں غائب ہو جاتی۔ میں نے اسے بال سنوارتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

اس کے سیاہ گھنیرے گیسو بڑے پیارے تھے۔ گھنے اور شاداب جنگل کی طرح سکون آفریں۔ وہ اپنی کوٹھری کی چوکھٹ پر اندر کی جانب رُخ کئے نادان سی کھڑی ہو جاتی۔ اس کے آبشار نما بال اس گوری گردن اور بھری بھری پیٹھ پر اس طرح چھا جاتے جیسے سنگِ مرمر پر کالی جمی ہوئی ثروت جانتی بھی ہوتی کہ میں کہیں سے یہ منظر دیکھ رہا ہوں، تو بھی وہ بنجارن بنی ہوئی دیر تک اپنی زلفوں کو اپنی نازک کمر کی طرح مچلنا اور بل کھانا سکھاتی رہتی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ یک بہ یک پیچھے مڑ کر دیکھتی، میری اس کی آنکھیں چار ہوتی اور وہ شرمائی ہوئی مسکراہٹ کی کلیاں کھلاتی ہوئی ساون کی ہوا کی طرح لہرا کر روانہ ہو جاتی۔

ایک روز میں گھر کی لائبریری میں بیٹھا ہوا دل بہلانے کو اُردو رسالے اور کتابیں اُلٹ پلٹ رہا تھا، محض دل بہلانے اور پریشانیوں سے دو گھڑی کے لئے نجات حاصل کرنے کو۔ میں دو سال سے ملازمت کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا تھا۔ میری شادی کو چار سال ہو چکے تھے اور اب بیکار رہنا میرے لئے دوبھر ہو رہا تھا۔ باپ اور سسر کی عنایتوں پر جیے جانا، دوسروں کے نزدیک اگر باعثِ ننگ نہ بھی ہو تو میری روح کے لئے سوہانِ روح ضرور تھا۔ پھر باپ اور سسر بیچارے بھی کیا۔ وہ لوگ اپنے انتہائی خلوص کے باوجود بھی میری پوری مدد نہیں کر سکتے تھے۔ آجکل شرافت نبھانا بھی بہت ہی کٹھن کام ہے۔ کالج کی تعلیم کا خرچ برداشت کرنے کے بعد والد صاحب میں بھی اب اتنا دم کہاں تھا۔ کہ وہ میری بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرتے رہتے۔ اور میرے سسر صاحب کو بھی کئی اور لڑکیاں بیاہنی تھیں۔ غرض میں غمِ روزگار کی گتھیاں سلجھانی چاہ رہا تھا، اور اُلجھنیں اور زیادہ بڑھتی جا رہی تھیں۔ رسالوں اور کتابوں کے اوراق میں بے معنی طور پر اس طرح اُلٹ رہا تھا، جیسے خزاں کی ہوا بلاغ میں آم کے پتے اِدھر اُدھر اڑاتی پھر رہی ہو۔ میں دل میں زندگی کا نشتر اور بے روزگاری کی چبھن محسوس کر رہا تھا۔ میرے جذبات کے دھارے بیزاری اور تلخی کی سوت سے ملے ہوئے تھے۔ میں اسی حال میں تھا کہ میں نے سائبان میں اُبلتی ہوئی شیریں زندگی کے قہقہے سُنے۔ چند لڑکیاں گنگھرو کی طرح ایک دوسرے سے اُلجھی ہوئی تھیں آفریں تھیں۔ کچھ پیاری چڑیاں تھیں، کچھ طنز آمیز منت سماجت۔ کچھ حسین مسکراہٹیں، اور کچھ ایسی ادائیں جن میں رقص، نغمہ اور تصویر کا جمال ملا ہوا پایا جاتا تھا۔

"دُلہا بھائی ..... یہ ہے ثروت ..... !

آپ ہی دوڑ کر آجائے نہ ..... اری ثروت! تو نخرے کیا کرتی ہے"

یہ نزہت کی آواز تھی۔

"اُون اُون ..... مجھے چھوڑ دو ..... میں بگڑ جاؤنگی" ثروت نے نخرے کئے۔

"چل! بڑی بگڑنے والی آئی ہے! ہر گھڑی دُلہا بھائی کو تکتی رہتی ہے اپنی کوٹھری سے اور یہاں آکر باتیں بناتی ہے ...." شرما نے شوخ لہجے میں کہا۔

"تو تو بڑی تکتی ہوگی دُولہا بھائی کو۔ واہ میں کیوں تکوں! ..... میں دولہا بھائی کی بہن ہوں تھوڑا ہی کرتی ہوں" ثروت منمنائی۔

"تو پھر سیدھی ہو کر چلتی کیوں نہیں دلہا بھائی کے پاس" ——— ثریا بولی۔

"تو مجھے چھوڑ تو دے۔ میری چوڑیاں گئیں ———"

ثروت نے ناز کیا۔

"اے چھوڑ دیا۔ اب آ! لائبریری میں دلہا بھائی بیٹھے ہیں ..... دُلہا بھائی بھی تو عجب اُلّو ہیں۔ دوڑ کر آکیوں نہیں جاتے" نزہت اور ثریا نے ثروت کو چھوڑتے ہوئے ایک ساتھ کہا۔ دوسری لڑکیوں کی ہنسی کی آوازیں بھی گونج رہی تھیں ..... ٹھیک اسی

موقعہ پر میں لائبریری سے باہر سائبان میں آنکلا۔

"لو میں آگیا" میں نے کہا۔

جھپاک سے ثروت لڑکیوں کے ہاتھ سے چھوٹ کر بھاگی۔ یہ گئی وہ گئی۔ مگر جاتے جاتے ایک دفعہ مڑ کر پیچھے دیکھ ہی لیا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اُس کا چہرہ لالہ گوں ہو رہا تھا، اُس کا آنچل ناہموار تھا۔ اور اُس کی موٹی سی چوٹی آبِ دان کے پلّو میں اُلجھ کر کچلی دار سیاہ ناگن کی طرح بل کھا گئی تھی۔ لڑکیاں عقب ثریا سے کہکشاں بن گئیں۔ اور میں ایک شہاب ثاقب کی طرح ثروت کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔ نہ معلوم میرے احساس کی تلخی اور بے کیفی یک بہ یک دُور کیسے ہوگئی۔ ہم لوگوں نے ثروت کو اس کی کوٹھڑی تک پکڑ پایا۔ اور اس کے بعد ثریا نے اُسے فریب دہی کی خوب خوب سزائیں دیں۔

ثروت کی سزا ہوئی یا نہیں، مگر مجھے تو دوڑ دھوپ کی فوری جزا مل گئی۔ میں نے ثروت کو جی بھر کے دیکھا، اور سب سے بڑا فکر یہ کہ اس کے بعد سے حجاب کہرے کی طرح غائب ہوگیا اور اب ثروت مہر و خشاں کی طرح میرے سامنے آیا کرتی تھی۔

ثروت دن میں کئی بار میرے پاس آکر بیٹھا کرتی اور کبھی میں خود اُس کی کوٹھری میں جا نکلتا۔ وہ مجھ سے بہت مانوس ہوگئی تھی۔ اور میں اُس سے کافی ہل مل گیا تھا۔ ثروت دیر دیر تک باتیں کرتی رہتی، معمولی معمولی سی باتیں۔ بیکار بیکار سی باتیں، مگر اُن باتوں میں بڑا رس ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ ادنیٰ سی باتیں بہت ہی ضروری ہیں۔ اُس کی آنکھیں بہت زیادہ خوبصورت نہ تھیں مگر بڑی زندہ اور گویا آنکھیں تھیں۔ اُن میں گلابی گلابی نازک ڈورے رگِ گل کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ ان آنکھوں میں سکون پر گہرائی تھی۔ میں اپنا دُزدِ غم اس رسیلے ساگر میں غرق کر دیتا تھا۔ مگر یہ کشش کی طرح اگر ایک غم کا سر کاٹ بھی لیا جائے تو اس کے سیکڑوں شاخسانے نکل آتے ہیں۔ میں جب ثروت سے علیحدہ ہو جاتا تو غمِ روزگار کے ہزاروں آرے دل پر چلنے لگتے۔ لہٰذا میں کوشش کرتا کہ اکثر ثروت سے باتیں کروں اور اس کی لشکین بخشش آنکھوں کے سایہ میں زندگی گذاروں۔ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ ثروت بھی مجھ سے باتیں کر کے خوش ہوتی ہے۔ اس کی حسین آنکھیں گفتگو کے وقت چمکنے لگتیں۔ اور گلابی ڈوریاں سُرخ ہو جاتیں۔ اثنائے گفتگو میں وہ یک بہ یک سٹپٹا بھی جاتی۔ اُس کے اس اچانک اظہارِ حیا میں ایک خاص دلفریبی تھی۔

میری بیوی پروین بہت ہی اچھی دلہن تھی۔ میں اُسے بیحد چاہتا تھا۔ اور وہ بھی مجھ سے والہانہ محبت کرتی تھی۔ ہم لوگ اچھی اچھی باتیں بھی کرتے تھے اور بہت سے امور میں باہم مل کر دلچسپی لیتے تھے۔ مگر جب سے میری پیشانیوں کی سرحد نا امیدی سے جا ملی تھی میں اپنی بیوی سے آنکھیں چراتا تھا۔ میں اس کے پاس یہ محسوس کرتا تھا کہ میں ناکامیاب حیات ہوں۔ اس کے قرب سے میرے وقار کو ٹھوکر لگتی تھی۔ میں ناکارہ ہوں اور اپنی بیوی کی کفالت نہیں کر سکتا۔ یہ خیال مجھے ستانے لگتا تھا۔ میری بیوی میری اس سریع الحسی کو اپنی نسائی جبلت سے محسوس کرتی تھی۔ اور غمگسارانہ طور پر اندر ہی اندر گھلتی رہتی تھی۔ میں جب خوش نظر آتا تو وہ میری کمیاب خوشی کا خیر مقدم کرتی۔ میں ایک دو سال سے اپنے سسرال میں تھا۔ اور سسرال کے رشتہ داروں سے کافی واقف ہوگیا تھا۔ اب کوئی انوکھا نہیں رہا تھا۔ سالے، سالیاں، سرہجیں سبھی روزانہ کی چیزوں کی طرح پھیکی ہو چلی تھیں، اور میری موجودہ مایوسانہ حالت میں تو کسی بات میں بھی مزہ نہیں ملتا تھا۔ سیر و ریا، شکار و صحبت اجرائے نازِ ممنوعِ حرم کی چھلیں سب بے مزہ تھیں۔ لے دے کر اُچٹتی ہوئی کتب بینی اور ادھوری مضمون نگاری رہ گئی تھی، میرا زیادہ وقت لائبریری میں گذرتا تھا یا بستر پر۔

ثروت کو میں نے پہلے پہل دیکھا تھا۔ میں نے جانا کہ اس کا نیا پن شاید میرے لئے سامانِ کشش ہے۔ ممکن ہے یہی ہو مگر مزید تجربہ حالات کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ثروت میں کچھ ایسی باتیں بھی تھیں جو دوسروں میں نہیں تھیں۔ مثلاً اس کی سادگی اور ایک گونہ دیہاتی پن۔ ان کے علاوہ چند اور ایسی معمولی خوبیاں جن کا اگر میں تذکرہ کروں تو آپ ہنس دیں گے کہ یہ باتیں بھی سامانِ کشش ہوتی ہیں۔ مگر اکثر یہی ناقابلِ بیاں چھوٹی چھوٹی باتیں ہی دل موہ لینے والی ثابت ہوتی ہیں۔ ثروت حسین نہیں تھی، لیکن اس کی اداؤں میں انہیں چھوٹے چھوٹے سادہ مگر چمکتے ہوئے نشتروں کی ارزانی تھی۔

ثروت کی شادی کو اب گنے ہوئے چند دن رہ گئے تھے۔ مہمان آنے شروع ہوگئے تھے۔ گھر میں زندگی اور شادمانی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ میں کہ اپنا زیادہ وقت الگ تھلگ ہی

گذارا کرتا تھا، اب اپنے حجرے سے باہر نکل آیا تھا عام دلچسپیوں کی کشش سے نہیں بلکہ ثروت کی جادو نگاہوں کے اثر کے ماتحت۔ ہم لوگوں کے درمیان ایک بہت ہی لطیف یگانگی کا احساس تھا۔ آپ کہیں گے جنسیات۔ جی ہاں جنسیات مگر جنسی اپیل کی بہت سی سطحیں ہوتی ہیں۔ دنیا میں کونسا جذبہ، کون سی خواہش ایسی ہے۔ جس کا نفسیاتی تجزیہ آپکو جنسیات تک نہ پہنچا دے۔ میں جیٹھ کے جھلسے ہوئے پودے کی طرح تھا؛ بارش کا ایک ننھا قطرہ بھی میرے لئے امرت سے کم نہ تھا۔ عورت زندگی کی سب سے بڑی رحمت ہے۔ اگر عورت کی فردوس بہ کنار نگاہوں کے ایک گوشے میں بھی زندگی کی لڑائی سے تھکے ہوئے مرد کو تھوڑی سی جگہ مل جائے تو وہ اس کے لئے ایک نعمت سرمدی ہے۔ عورت کی صرف ایک نظر التفات، ایک ہلکی سی یگانگی، ایک حقیر سی توجہ بھی کہانی ہوئی زندگی کے لئے سامان شگفتگی ہے۔ مگر زندگی کے انتہا ساگر میں عورت کی مسکراہٹ بھی سورج کی کرنوں کی طرح سطح سے تھوڑی ہی نیچے جا سکتی ہے۔ اس کے بعد تاریکیاں اور ایک نجیدہ گہرائی

ثروت میرے لئے بہار کی ہوا کی گذر جانے والی ایک لطیف و نازک لہر تھی۔ جس نے میرے احساسات کو گدگدایا اور بس۔ دوسری لڑکیوں نے مگر اس سے کچھ زیادہ محسوس کیا ——— میں ان کے تخیل کو کیا کروں ———!

"ثروت بہت خوبصورت ہے دلہا بھائی؟" ایک دفعہ ایک لڑکی نے خاص تیور سے دریافت کیا۔

ایک صاحبہ نے طنز سے فرمایا ——— "نئی سالی کے سامنے پرانے لوگوں کو کون پوچھتا ہے"

میں ان سوالوں کا جواب کچھ اس طرح دیتا ———

"آپ لوگ شادی کے ہنگاموں میں الجھی ہوئی ہیں بتائیے باتیں کس سے کروں ——— اتنی بات! آپ لوگوں نے مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے یا میں نے؟ ....."

میں نے لڑکیوں کو آپس میں بھی چہ میگوئیاں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ میری بیوی کو اس چھیڑ چھاڑ میں بہت لطف آتا تھا ایک دفعہ وہ کہنے لگی۔

"آپ کی سب سالیاں اور سرہجیں آپ پر گری ہوئی ہوئی ہیں۔ ثروت پر فقرے کسے جاتے ہیں ....." میں ہنس دیتا۔

ثروت بھی اپنی بڑی بہن سے اکثر میری ہی باتیں کرتی۔ آج دولہا بھائی سے یہ باتیں ہوئیں۔ آج انہوں نے یہ کہا، آج یہ ہوا وہ ہوا۔

"تو تو دولہا بھائی کے لئے پاگل ہو رہی ہے ....." ریحانہ ٹالتی ہوئی مسکرا کر کہتی۔

"نہیں دولہا بھائی بہت اچھے ہیں آپا۔ آپ تو ان سے ناحق کا پردہ کرتی ہیں۔ وہ بڑے ملنسار ہیں، اور پھر باتیں کتنی بناتی جانتے ہیں ....."

"دفعہ ہو اپنے دولہا بھائی کے پاس پھر۔ مجھے کام کرنے دے۔ ابھی درجنوں شلوکے گوٹ ٹانکنے کو پڑے ہوئے ہیں۔ اور اس ہفتہ میں تیری برات آ رہی ہے" ریحانہ آپا ثروت کو بنوٹ کے غصے کے ساتھ جواب دیتیں۔

ثروت کو مایوں بٹھا دیا گیا تھا۔ اب اس سے ملنے کا بہت کم موقع ملتا۔ پھر بھی شام کو جب لڑکیاں اور مہمان بیبیاں دوسری انگنائی میں گیت گانے میں مشغول ہو جاتیں تو ثروت اپنی بڑی بہن کے لڑکے کو بھیج کر مجھے مردانہ سے پختہ آنگن میں بلوا بھیجتی اور کہتی کہ ہر شخص مشغول ہے۔ اکیلے طبیعت نہیں لگتی، باتیں کیجئے۔

ثروت کی شادی کے دن بہت ہی قریب آ گئے۔ ایک روز میری بیوی نے رکتے رکتے کہا۔

"سبھی رشتہ دار عورتیں مانجھا دے رہی ہیں۔ میں تو خیر اپنی ہی کوئی نئی ساری اور دوسرے کپڑے دیدونگی ..... مگر مرد عزیز بھی تو ثروت کو شادی کے تحفے دیں گے ....." اتنا کہہ کر وہ رک گئی اور میرے سامنے تاریکیوں کے حلقے مگرمچھ کے کھلے ہوئے جبڑے کی طرح نظر آنے لگے .....

میں کود اپنی بیوی کے پاس سے اٹھ کر بھاگا اور اس روز سارا دن چڑچڑا رہا۔ دو تین بار لوگوں سے معمولی معمولی باتوں کے لئے الجھ پڑا۔ خارجی حالت کے کہر دے پن سے زیادہ میری داخلی کیفیت متلاطم ہو رہی تھی۔ عین نخلستان کے اندر دم لیتے ہوئے میں نے سموم کی ایک تیز لپٹ محسوس کی۔

اب ثروت کا خیال بھی میرے لئے محرومی و نامرادی کا استعارہ تھا۔ اُف! بیسویں صدی کا نوجوان کتنی تمنائیں، کتنے ارمان اپنے دل میں رکھتا ہے اور ان میں سے اکثر آرزوئیں گھٹ گھٹ کر دم توڑتی جاتی ہیں۔ اور جو پوری بھی ہوتی ہیں وہ کچلا کچلا اور مسلا مسلا کر پوری

ہوتی ہیں۔ میں دن بھر ایک وحشی بن جانے کی خواہش میں گھلتا، کھولتا۔ گھلتا اور منجمد ہوتا رہا۔ میں سوچتا تھا کہ اگر جائز تمناؤں کے گرد بھی زنجیریں پڑی ہوئی ہیں۔ اگر معصوم خواہشوں کی گردن میں بھی بھاری بھاری سلیں ہیں تو پھر دنیا کسی ستارۂ تخریب سے ٹکرا کیوں نہیں جاتی۔ زلزلہ صرف بہار اور کوئٹہ میں کیوں آتا ہے۔ سارے عالم میں بہ یک وقت زلزلہ کیوں نہیں آجاتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شام کو ثروت کا بلاوا آیا۔ میں نہیں گیا۔ اس نے کئی بار بلوا بھیجا۔ میں نے ہر بار انکار کیا۔ رات کو مجھے نیند بہت دیر میں آئی، اور جب آئی بھی تو خیالات کو اور بھیانک روپ دیتی ہوئی آئی۔ دوسرے دن میرے سر میں درد تھا اور دل و روح میں اس سے زیادہ دن کو ایک ہفتہ کے انتظار کے بعد والد صاحب کا کارڈ ملا جس میں انہوں نے اپنی مجبوریوں کا اظہار کیا تھا۔ ——— اب میری ناامیدی مکمل ہوگئی، اور شادی کے تحفہ کا خیال ہزاروں آرزوؤں کے ساتھ مدفون ہوگیا۔ دوپہر اور سہ پہر کو میں فلم کے ستاروں کا تصویری البم دیکھتا رہا۔ ایک ایک ستارے کی نوک پلک کا بہت ہی گہرا جائزہ لیا اور آج ایک ایسے صاحب سے اس کے متعلق تبادلۂ خیالات کیا۔ جن کو میں کبھی منہ لگانا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اس شام کو میں غیر معمولی طور پر خوش و خرم اور ہنسوڑ تھا۔ یہانتک کہ میں نے بذلہ سنجی کے علاوہ سوقیانہ مذاق کو بھی صرف روا ہی نہیں رکھا، بلکہ اس کی بہتات کر دی۔

سہ پہر شام ثروت نے کہلوا بھیجا کہ کیا آج بھی نہیں آئے گا آسمان پر تارے چھٹکے اور زنانخانے سے گیتوں کی جھنکار اٹھی میں ثروت سے ملنے چلا۔ اب وہ کوٹھری میں مایوں بیٹھی تھی۔ مستقل طور پر مقید۔ میں کوٹھری میں داخل ہوا اور ذرا جھجکا۔ ثروت کے پہلو سے پیوند ایک نئی کمسن سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔

"آئیے دولہا بھائی! یہ میری ممیری بہن فرحت ہے آپ کو دیکھنے کو دیر سے بیٹھی ہے۔" ثروت نے مجھے جھجکتا دیکھکر کہا۔

"بہت خوب! میں حاضر ہوں۔ دیکھیئے فرحت صاحبہ مجھے" میں نے مسکراتے ہوئے ذرہ شوخی کی۔ اور فرحت سے قریب پلنگ پر بیٹھ رہا۔ فرحت ثروت کے دوسرے پہلو کی طرف جاکر چمٹ گئی۔

"کیوں دولہا بھائی! کل تو آپ بہت خفا تھے۔ فرحت کل ہی آئی ہیں اور کل ہی سے آپ سے ملنے کے لئے بے چین ہیں۔"

ثروت نے اپنی مدھ بھری آنکھوں کا رس میری آنکھوں میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"فرحت مجھے کیا جانیں؟" میں بات ٹالتے ہوئے بولا۔

"اور میں جو جانتی ہوں آپ کو!" ثروت نے جواب دیا۔

"تو پھر یہ قصہ آپ کا پھیلایا ہوا ہے؟" میں نے اعصاب پندار کے ساتھ کہا۔

"آپ لوگ ابھی سے مجھے بھلا رہے ہیں؟ کل آپ کو کتنی دفعہ بلایا۔ آپ نے ہر بار مایوس کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ثروت کی آنکھوں کے سمندر میں موتی چمکنے لگے۔ شادی کے دنوں میں ایک ہندوستانی لڑکی موم کی طرح پگھلی رہتی ہے۔ اس کی آنکھیں اگر میکے کی محبت میں ہر وقت ساون بھادوں کا سماں نہ بھی پیش کریں تو ان کی لامحدود وسعتوں میں بن برسے ہوئے بادل ہر گھڑی مچلتے ضرور رہتے ہیں۔

"ثروت تم رونے لگیں! کل میری طبیعت اچھی نہیں تھی اسلئے نہ آیا۔" میں نے ثروت کو چپ کرتے ہوئے کہا ——— ثروت کچھ دیر تک روتی رہی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"تو میں چلا ثروت! میں باتیں کرنے آیا ہوں، اور تم رو رہی ہو۔ ۔ ۔ ۔" میں نے پلنگ پر سے اٹھتے ہوئے جھوٹ موٹ کی دھمکی دی ——— ثروت نے آنسو پونچھ ڈالے اور چپ ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے بہت سی دلچسپ باتیں کیں، اور خوب خوب ہنستی رہی۔

ثروت ڈھیلے ڈھالے جوگیا رنگ کے کپڑے میں بلبوس شفق کی دیوی معلوم ہو رہی تھی۔ اور اس کا سپیدہ چہرہ شفق بہ کنار ہلال کی نزاکتوں کا آئینہ دار تھا۔ اس کے کھلے ہوئے بال کی لٹیں اس کے سینہ و شانہ پر اس طرح بکھری ہوئی تھیں جیسے اُفق رنگیں پر سرمئی بادل کے ٹکڑے ایک خوابناک فضا پیدا کر رہے ہوں، وہ اُبٹنے کی خوشبو سے بسی ہوئی تھی۔ بکم اور بیلے کے پھول کی مہک کے ساتھ زعفران کی خوشبو شام جاں کو معطر کر رہی تھی۔

"تم انار کی کلی کو شرما رہی ہو ثروت!" میں نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ کو بھی میں انار کلی بنا دوں!" یہ کہتے ہوئے ثروت نے بہت سا اُبٹنا میرے چہرہ پر مل دیا۔ اس کی آنکھوں میں جرأت طلب شرارت مچل رہی تھی۔ میں دعوت نگاہ کو قبول کرکے بدلا لینا ہی چاہتا تھا کہ ایک چھپاکے نے مجھے بوقوف سا بنا دیا۔ فرحت نے مجھ پر رنگ کی بے پناہ بوچھار کی تھی۔ میں شرابور ہوگیا اور کچھ

اس ناگفتہ بہ انداز میں کہ فوراً میں مردانے کی طرف بھاگا۔

دوسرے روز ثروت کی برات آگئی۔ گھر باہر بڑی رونق تھی۔ ہر طرف لباس و زینت کی نمایش ہو رہی تھی۔ زنانخانے میں دن کو ہر سو قوس قزح کے رنگوں اور طاؤسانہ اداؤں کی دلفریبیاں نازفرما رہی تھیں، نوجوان تیتریاں گھڑی گھڑی لباس تبدیل کر کے اپنی ہوا باندھ رہی تھیں۔ رات آتے ہی گھر کا گھر سلمےٰ ستارہ کی ژرکاں اور ساریوں سے رشکِ کہکشاں بن گیا۔ ہر نوخیز بھلجھڑی تھی، ہر جوان لڑکی چھٹتا ہوا انار، اور ہر عورت مہتابی۔ میں اس رنگ و نور کے جلوۂ سبمائی کے دیکھنے میں محو تھا کہ ایک گوشہ میں میری بیوی سست اور مضمحل کھڑی ہوئی نظر آئی۔ وہ ایک پایہ سے لگی ہوئی کھڑی تھی اُسے دیکھکر میرا دل دھک سے ہو گیا۔ میں سب کچھ سمجھ گیا، اب یہ جلوے میرے لیے جلوۂ طور نہ تھے، بلکہ آتش نمرود۔ میری بیوی صبح سے اسی ایک لباس میں تھی۔ کاسنی رنگ کی کامدانی کی ایک پرانی ساڑی اس کی گرگابی بھی بہت ہی مفلوک الحال تھی۔ اس کی ہچکیاں کپڑوں پر آنسو بن کر بدل رہی تھیں۔ اور یہ پرانی جلد کی کتاب کی طرح بے رونق معلوم ہو رہی تھی۔

اُف! میں اس منظر کی تاب نہ لا سکا اور فوراً گھر کے ایک دُور افتادہ گوشے میں جا کر ٹوٹی پلنگ پر لیٹ رہا۔ یہ بڑی پُر رونق رات تھی، مگر میں کسی تقریب میں شریک نہ ہوا۔ اور رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ میں ایک وضع فرسا بے احساسی کے عالم میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ دن پر ایک سرد تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ دل ایک خاموش اذیت ایک افسردہ درد محسوس کر رہا تھا۔

صبح ہوئی۔ آج ثروت رخصت ہونے والی تھی۔ دوپہر کو سرد عزیز اپنے مخالف کے ساتھ اُس سے ملنے زنانخانہ میں گئے۔ میں نہ گیا۔ میرے پاس کیا تھا۔ غم، وحشت اور احساس ناداری کا تحفہ۔!

ثروت رخصت ہو گئی۔ اور پانچویں دن سُنا کہ واپس بھی آگئی۔ یہ پانچ دن کس طرح جینے میں نہیں بتا سکتا۔ ثروت سے چھوٹے کا کام؟ ۔ جی نہیں۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ ثروت واپس ہی نہ آئے۔ میں اُس سے آنکھیں چار کرنی نہیں چاہتا تھا۔ مگر ثروت آئی۔

شاید ثروت نے سسرال سے واپس آنے کے ساتھ ہی مجھے ملنے کو بلوا بھیجا تھا۔ مگر میں ایک ہفتہ تک اُس سے نہیں ملا۔ خدا جانے کیونکر میں خود بخود ایک مرتبہ ملنے چلا گیا۔ وہ اپنے عروسی کمرے میں چیزوں کی درستی میں مشغول تھی۔

"اللہ! آپ آخر ملنے آ گئے مجھ بدنصیب سے دولہا بھائی!" ثروت نے مشکوہ شانہ مسرت کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا۔

"خدا نہ کرے تم بدنصیب ہو؟ بدنصیب تو میں ہوں ثروت" میں نے جواب دیا۔

"آپ کیوں خفا ہیں مجھ سے دولہا بھائی؟ آپ مجھے رخصت کرنے بھی نہیں آئے تھے۔ میں مجمع میں آپکی آواز کی منتظر تھی میری آنکھیں بند تھیں۔ مگر جی چاہتا تھا کہ آنکھیں کھول کر دیکھوں کہ آپ ہیں یا نہیں۔" ثروت نے بڑی مایوسی سے کہا۔

"کوئی وجہ نہیں۔ یونہی میں نہیں آیا۔ یونہی ثروت ——— مجھے خود معلوم نہیں میں کیوں نہ آیا ..... " میں چاہتا تھا کہ اس بارے میں باتیں نہ ہوں۔

"ازدواجِ شادی کا تجربہ کیسا رہا۔ نئے لوگوں سے ملاقات ہوئی؟ اچھے لوگ تھے؟" میں نے موضوع گفتگو بدلتے ہوئے پوچھا۔

"آپ سے اچھے نہیں" اُس نے ایک پُر معنی حجاب کے ساتھ جواب دیا۔

"آئیے دولہا بھائی! آپ کو چیزیں دکھلاؤں۔ میرے مصرف کی چیزیں سب میرے ساتھ واپس چلی آئی ہیں۔ دُولہا بھائی غیر جگہ عزیزوں کی دی ہوئی چیزیں بھی کتنی بیاری معلوم ہوتی ہیں۔ ہر تحفہ مجھے عزیزوں کی یاد دلا رہا تھا۔ میں اکثر دیکھ دیکھ کر رو دیتی تھی ..... آپ مجھے بیوقوف کہیں گے۔ ہے نہ؟ میں آپ کو ہر وقت یاد کرتی تھی۔ آپ مجھے یاد کرتے تھے؟" ثروت آج اتنی بہت سی باتیں کر رہی تھی اور میری زبان پر مُہر سی لگی ہوئی تھی۔ "بولتے کیوں نہیں آپ؟ یہ دیکھیے! یہ سنگار میز احمد بھائی نے دیا ہے۔ یہ ہے ان کا نام لکھا ہوا۔ اچھا سا ہے نہ؟" وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بکس سے دوسری چیز نکالنے لگی۔

"دیکھیے اس بکس میں سلائی کا سٹ ہے۔ اور اس میں کروشیا اور کشیدہ کاری کی مشین ہے ..... دُولہا بھائی سب نے اپنا اپنا نام چھوٹے چھوٹے کارڈ پر لکھ کر لٹکا دیا ہے ..... یہ ایرنگ ہی دُولہا بھائی! یہ محمود بھائی کی دی ہوئی ہے ..... اور یہ دیکھیے! آف میں تھک گئی! کتنی ساری چیزیں ہیں! ..... وہ نو بکس کی تہ میں ہے ..... ایرنگ ہے نہ بہت پیاری سی؟ ..... میں آپ کو ایک اور بہت ہی اچھی سی چیز دکھلاتی ہوں! ....." ثروت اپنا ایک بکس اُلٹ پلٹ رہی تھی، اور میں اپنے تخیل کے تاریک خلا میں ارمانوں کی لاشوں کو دانت نکالے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ تحفہ! تحفہ! ..... زندگی کے ہاتھ میں موت

بھوک

از جناب سہیل عظیم آبادی

بھوک نے جب کروٹ لی تو آنتوں کے ساتھ ہی رامو کے دل اور دماغ میں بھی ہلچل مچ گئی۔ وہ سوچنے لگا، اب کیا کرنا چاہئے۔ بھوکے رہنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ فاقہ کو چار شام تو ہو چکے۔ صبح ہوگی تو پانچواں ہوگا۔ تین دن سے کام ڈھونڈتا پھر رہا ہوں، لیکن کام نہیں ملتا۔ اب صبح ہوتے ہی کام کہاں سے مل جائیگا۔ اور اگر کام ملا بھی تو کس کے بدن میں اتنا بوتا ہے جو کر سکے، کام ہوگا کیسے؟ وہ بھوک سے تلملا رہا تھا۔ اُس کے دماغ میں صرف ایک بات تھی کھانا کہاں سے ملے گا۔ اِس کے دل میں صرف ایک خواہش تھی۔ کچھ بھی ہو، مگر بھر پیٹ کھانا ملے۔ اس نے سوچا اگر صبح بھی کوئی کام نہ ملا تو، وہ کہیں سے کوئی چیز اُٹھا کر بھی کھا لیگا۔ یا بھیک ہی مانگ کر مل جائے۔ یا پھر میونسپلٹی کے ٹین ہی کو اندر ملے ——— مگر یکایک اُس کے دل میں امید کی روشنی پھیل گئی۔ اُسے یقین ہو گیا کہ کل اُسے کوئی کام ضرور ہی مل جائے گا۔ اس خیال کے آتے ہی معلوم ہوا جیسے اُس کے بدن میں کھوئی ہوئی قوت واپس آ رہی ہے۔ وہ دوسرے دن کے بارے میں سوچنے لگا۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی اُٹھ کر وہ ہاٹ جائے گا۔ وہاں بہت سی عورتیں ترکاریاں خریدنے آتی ہیں، اُن میں سے کوئی نہ کوئی اپنا بوجھ پہنچانے کے لئے ضرور ہی کہے گی۔ پھر وہاں سے مارکٹ جائے گا۔ وہاں بہت سے بابو لوگ اور میم صاحب چھل یا ترکاریاں خریدنے آتے ہیں۔ اُن سے کچھ مزدوری مل جائے گی، یا اور کوئی دوسرا کام۔ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ مگر اُس کو کوئی کام ضرور ہی مل جائے گا، اور اتنی مزدوری تو بھی مل جائیگی، جس سے وہ پیٹ بھر کر کھانا کھا سکے گا۔ اس خیال ہی سے وہ خوش ہو گیا۔ معلوم ہوا جیسے اس کا پیٹ بھر گیا۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ ایشور بڑا انصاف ہے۔ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ باقی دنیا میں آدمی تو ہر طرح کے ہوتے ہی ہیں یہی تو دنیا کی سوبھا ہے ..... مگر اس کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ نر اس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ صبح ہوگی تو دیکھا جائے گا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور پانی کے نل کی طرف بڑھا کہ چل کر پانی پیئے۔ مگر جب نل کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ پانی آنا بند ہو چکا ہے۔ اُس کا جی بیٹھ سا گیا۔ سر چکرا گیا۔ وہ نل کو پکڑے کھڑا رہا۔

آخر رامو تھوڑی دیر کے بعد سر جھکائے اور کچھ سوچتا ہوا نل کو چھوڑ کر ہٹا۔ اُس کا ہر قدم ڈھیلا پڑ رہا تھا۔ مگر دماغ میں ہلچل تھی شاید اُس کے دماغ میں ایسی ہلچل پہلے کبھی نہ مچی ہوگی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس بھوک کی مصیبت سے کس طرح بچے۔ فٹ پاتھ پر سونے سے کس طرح چھٹکارا پائے۔ اُس نے دل ہی دل میں فیصلہ کے طور پر کہا، اب اس زندگی سے نکلنا ضرور ہے۔ اور ..... کل ہی صبح اُٹھ کر زندگی بالکل بدلی ہوئی ہوگی۔ وہ یہی باتیں سوچتا اور اپنے آپ کو سمجھاتا آگے بڑھتا گیا ——— اس کا ارادہ پکا ہو چکا۔ اس نے یہاں تک سوچ لیا کہ اگر کل بھی اسے بھوکا رہنا پڑا تو پھر وہ "جے ماں" کہہ کر گنگا میں کود پڑے گا۔ اس فیصلے کے بعد وہ سوچنے لگا کہ ترکیب کیا کی جائے نوکری ——— نوکری کہاں ملتی ہے۔ مزدوری ——— مزدوری تو ہر روز ہی ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ پھر ——— ؟؟

اُس نے بہت سی باتیں سوچ لیں۔ بہت سی ترکیبیں اُس کے ہونے لگتا ہے۔ وہ سوچنے لگا، روز ہی اسی طرح امید بندھتی ہے مگر پوری کبھی نہیں ہوتی۔ دن بھر پائپ سے پانی پی پی کر پیٹ کی آگ بجھانی پڑتی ہے۔ لیکن آخر کیا کیا جائے۔ اس روز روز کے آپاس سے چھٹکارا کیسے ملے؟ میں نے پرماتما کا کون سا اتنا بڑا قصور کیا ہے جو یہ سزا ہے۔ دنیا میں سبھی آدمی کچھ نہ کچھ گناہ کرتے ہیں۔ لیکن سب تو بھوکے نہیں۔ مجھی پر یہ عذاب کیوں؟ گناہ تو سبھی آدمی کرتے ہیں مگر کسی کو تکلیف اور کسی کو آرام وہ کیوں دیتا ہے؟ مگر اس کا دماغ اُلجھ کر رہ گیا۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ ایشور بڑا انصاف ہے۔ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ باقی دنیا میں آدمی تو ہر طرح کے ہوتے ہی ہیں یہی تو دنیا کی سوبھا ہے ..... مگر اس کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ نر اس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ صبح ہوگی تو دیکھا جائے گا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور پانی کے نل کی طرف بڑھا کہ چل کر پانی پیئے۔ مگر جب نل کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ پانی آنا بند ہو چکا ہے۔ اُس کا جی بیٹھ سا گیا۔ سر چکرا گیا۔ وہ نل کو پکڑے کھڑا رہا۔

آخر رامو تھوڑی دیر کے بعد سر جھکائے اور کچھ سوچتا ہوا نل کو چھوڑ کر ہٹا۔ اُس کا ہر قدم ڈھیلا پڑ رہا تھا۔ مگر دماغ میں ہلچل تھی شاید اُس کے دماغ میں ایسی ہلچل پہلے کبھی نہ مچی ہوگی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس بھوک کی مصیبت سے کس طرح بچے۔ فٹ پاتھ پر سونے سے کس طرح چھٹکارا پائے۔ اُس نے دل ہی دل میں فیصلہ کے طور پر کہا، اب اس زندگی سے نکلنا ضرور ہے۔ اور ..... کل ہی صبح اُٹھ کر زندگی بالکل بدلی ہوئی ہوگی۔ وہ یہی باتیں سوچتا اور اپنے آپ کو سمجھاتا آگے بڑھتا گیا ——— اس کا ارادہ پکا ہو چکا۔ اس نے یہاں تک سوچ لیا کہ اگر کل بھی اسے بھوکا رہنا پڑا تو پھر وہ "جے ماں" کہہ کر گنگا میں کود پڑے گا۔ اس فیصلے کے بعد وہ سوچنے لگا کہ ترکیب کیا کی جائے نوکری ——— نوکری کہاں ملتی ہے۔ مزدوری ——— مزدوری تو ہر روز ہی ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ پھر ——— ؟؟

اُس نے بہت سی باتیں سوچ لیں۔ بہت سی ترکیبیں اُس کے

دماغ میں ایک ہی وقت آگئیں، جیسے زمین پر دانہ دیکھ کر کبوتر اُتر پڑتے ہیں، مگر پھر ایک ہی بار سب کی سب غائب بھی ہو گئیں۔ صرف ایک ترکیب اُس کے دماغ میں جم کر رہ گئی۔ اور یہی آخری ترکیب تھی جو کسی سے نہیں۔ بلکل مجبور ہو کر۔ دیر تک وہ ایک عجیب عالم میں رہا۔ دل کہتا یہ بڑی بری بات ہے۔ اس دنیا میں سزا بدنامی، اور مرنے پر بھی سزا دماغ کا جواب ہوتا۔ ہزار بُرا سہی، مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں آخر دل کی ہار ہوئی۔ دماغ جیت گیا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا۔ وہ چوری کرے گا ——

پھر دل اور دماغ میں کھینچ تان شروع ہوئی۔ مگر وہ اسے نتیجے پر پہنچا کہ چوری کر کے اگر بچ نکلا تو کچھ دنوں کھانے اور رہنے کا بھی سامان ہو جائے گا، اور اگر پکڑا گیا تو بھی گھاٹے میں نہیں رہے گا۔ پولس کے ہیرے تھپڑ کے بعد کھانے کو مل ہی جائے گا۔ اور رہنے کو حوالات، پھر جیل کی کوٹھری، کمبل اور کپڑے۔ واہ سب کچھ مل جائے گا۔ وہ مسکرا دیا۔ مگر دل نے پھر ایک بار کروٹ لی۔ اور اُس نے آپ ہی سوال کرنا اور جواب دینا شروع کیا ٹھیک ہے۔ کھانا تو مل ہی جائے گا۔ مگر پکڑا گیا تو بڑی بے عزتی ہو گی۔ اور جیل گیا تو پھر واپس آ کر لوگوں کو کیا منہ دکھائیگا؟ —— مگر آج چوری نہ کرنے پر کون بڑی عزت ہے جیل میں بیٹھ لگ جائے گا۔ جیل میں یہ شہر، یہ بازار کہاں؟ —— مگر باہر رہ کر تو اس کا بھی موقع نہیں —— کچھ بھی ہو کسی طرح سہی لیکن ہاں پیٹ بھر کھانا تو ملے گا۔ اس کا ارادہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔

وہ چوری کرنے کا پکا ارادہ کر چکا، اور بدن میں طاقت بھی محسوس کرنے لگا۔ وہ بھوک کو بالکل بھول گیا۔ اسے ذرا بھی احساس نہ رہا کہ وہ کس حال میں تھا۔ اُس کی نگاہوں میں روپیوں کا ڈھیر تھا کانوں میں روپوں کی کھنک گونج رہی تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ قدم بڑھانے لگا۔ اور بغیر کسی ارادہ کے ایک طرف تیزی سے چلنے لگا۔ اس کے دل سے تھوڑی دیر کے لئے چوری کرنے کا خیال بھی نکل گیا۔ اور شیخ چلّی کی طرح خیالی قلعے بنانے لگا۔ چوری کرنے کے بعد وہ مالدار آدمی ہو جائے گا۔ بوڑھی ماں کو آرام پہونچائے گا۔ اسی چوری کے روپے سے وہ کاروبار شروع کریگا۔ اور لوگ اُسے اچھی نظر سے دیکھنے لگیں گے۔ پھر بیاہ کرے گا۔ اچھی سی عورت مل جائیگی۔ اب تک صرف غریبی کی وجہ سے اس کا بیاہ نہیں ہو سکا۔ جب روپیہ ہو گا تو بیسیوں آدمی بیٹی دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ بیاہ کے خیال سے رامو کو بڑی خوشی ہوئی۔ وہ طرح طرح کی باتیں سوچنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خوبصورت عورت کی تصویر پھر گئی۔ جسے شام کے وقت اس موٹر میں جاتے دیکھا تھا۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی کو اُس عورت سے کم خوبصورت نہ چاہتا تھا۔ سوچنے لگا۔ وہ کام کر کے واپس جائے گا۔ تھکا ماندہ عورت فوراً کر کے اچھی اچھی چیزیں کھلائے گی۔

کھانے کا تصور آتے ہی سارا خیالی قلعہ چکنا چور ہو گیا۔ آنتیں اینٹھنے لگیں، اور وہ بے چین ہو گیا۔ وہ چوری کے فیصلے کو بھول چکا تھا۔ پھر وہ ارادے کو مضبوط کرنے لگا۔ اب اُس کے حوصلے میں ایک نئی طاقت تھی، اُس نے چاروں طرف نظر گھما کر دیکھا۔ ہر طرف اونچے اونچے مکانات تھے اور بجلی کی تیز روشنی۔ کسی مکان میں گھسنے کا موقع ہی نہ تھا۔ پھر وہ سوچنے لگا۔ آخر چوری کہاں کی جائے؟ —— کچھ دیر سوچنے کے بعد قدم سے خیال آتا۔ شہر کے آخری حصّے میں چھوٹے چھوٹے بنگلے ہیں۔ چار دیواری بھی نیچی ہے۔ سڑک پر دونوں طرف گھنے پیڑ بھی ہیں۔ وہاں آسانی کے ساتھ چوری کی جا سکتی ہے۔ وہاں کافی اندھیرا رہتا ہے۔

خوب اچھی طرح سوچنے کے بعد وہ اُسی طرف چلا۔ دُور سے گھنٹہ گھر سے دو بجنے کی آواز آئی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ وقت بھی اچھا ہے —— اب وہ تیزی کے ساتھ قدم بڑھا رہا تھا —— مگر یکایک اُس کو خیال آیا۔ اُن بنگلوں میں کُتے پلے ہوئے ہیں —— یہ خیال آتے ہی وہ سہم گیا۔ ہمت ٹوٹ گئی۔ اس کو یقین ہو گیا کہ بنگلے کے اندر قدم رکھتے ہی کُتے اُسے نوچ ڈالیں گے ..... اس کا ارادہ ڈانوا ڈول ہو گیا ——

بھوک نے پھر کروٹ لی اور وہ سوچنے لگا، سب سے پہلے اُسے کچھ کھانے کو ملنا چاہیے۔ اگر بنگلے میں گیا بھی تو اسوقت کچھ کھانے کو مل نہیں سکتا۔ بابو لوگوں کے یہاں اتنا اہتمام ہوتا ہے کہ باسی رہے۔ بنگلوں میں اس وقت کھانے کی کوئی چیز نہیں مل سکتی، سب کچھ ختم ہو چکا ہو گا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس وقت کھانے کی چیز کہاں مل سکتی ہے۔ آخر اس کے دماغ میں بات آ گئی کہ اس وقت کھانے کی کوئی چیز صرف حلوائی کی دُوکان میں مل سکتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی معلوم ہوا جیسے اُسے سب کچھ مل گیا۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ چوری کرنے کے لئے حلوائی کی کون سی دوکان مناسب ہے۔

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اُسے ایک حلوائی کی دوکان یاد آئی۔ یہ دوکان شہر کے آخر حصے میں تھی۔ وہاں پر کی آبادی بھی کم تھی۔ رامو کو چوری کرنے کے لئے یہ جگہ ہر طرح مناسب معلوم ہوئی۔ وہ اُسی طرف چلا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح دبے پاؤں دُوکان میں گھسیگا کس طرح الماری کھولے گا کس طرح کھانے کی چیزوں پر ہاتھ مارے گا۔ اور کس طرح روپے نکالیگا۔ مگر وہ کبھی کبھی ڈر کر چونک سا جاتا تھا۔ اس کو خیال ہوتا تھا کہ شاید چوری کر سکے

یا پکڑ لیا جائے۔ مگر چوری کرنے کا وہ پکا ارادہ کر چکا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کاش اُسے کوئی منتر معلوم ہوتا، یا مسان کی راکھ مل جاتی کہ تھوڑی دیر کیلئے جیسے چاہتا بے ہوش کر لیتا۔ پھر وہ اطمینان کے ساتھ جاتے ہی منتر پڑھتا یا مسان کی راکھ کو سوئے ہوئے آدمیوں پر چھڑک اطمینان سے چوری کر لیتا اُسے ایک پل کے لئے معلوم ہوا جیسے اُسے سب کچھ آتا ہے اور اُس نے حلوائی کو بے ہوش بھی کر لیا ہے۔ مگر اُس کا یہ خیال فوراً ہی مٹ گیا۔ پھر اُس نے سوچا کہ کبھی کسی چور سے مل کر وہ ضرور پوچھے گا۔ مگر تھوڑی دُور جا کر اس کا خیال یکایک اُچٹ گیا۔ دو کُتے اُسے دیکھ کر بھونکنے لگے۔ اس نے سوچا۔ کُتے چور کو دیکھ کر بھونکتے ہیں۔ یہ سچ ہے ——— چار قدم پر آگے بجلی کا ایک کھمبا تھا۔ سڑک پر کی روشنی جل رہی تھی۔ چار پانچ آدمی فٹ پاتھ پر ٹہلے جا رہے۔ اس روشنی میں تاش کھیل رہے تھے۔ رامو ان لوگوں کے پاس سے ہو کر گزرا۔ لیکن کسی نے دھیان نہیں دیا۔ ایک آدمی جلدی جلدی اپنے پتوں کو دیکھ رہا تھا۔ دوسرا آدمی ٹاٹ پر پڑے ہوئے پتوں کو۔ تیسرا سر اور انگلی ہلا ہلا کر کچھ سوچ رہا تھا۔ چوتھا اس شان سے بیٹھا تھا، جیسے سب کو اُس نے ایک چال میں مات دے دی ہے۔ ایک اور آدمی کسی دوسرے کے پتوں کو دیکھ رہا تھا۔

ایک نے بیڑی جلائی، اور لمبا دم لگایا۔ دوسرے نے پان کی لمبی پیک پاس ہی پھینک کر کہا۔

"یہ بازی ہماری ہے چھٹو بھیا!"

چھٹو نے جواب دیا۔

"دیکھا جائے گا"

رامو اور آگے بڑھا۔ تھوڑی دُور پر ایک آدمی فٹ پاتھ پر بیٹھا گا رہا تھا ——— "مرے دل کی لگی تو بجھی ہی نہیں۔ ارے ہاں ہاں رے۔ ارے ہاں ہاں رے" ——— رامو جب پاس پہنچا تو اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ رامو ڈر گیا۔ مگر وہ پھر گانے لگا ——— تری آنکھ میں مدھرا بھری ہے مگر۔ مرے دل کی لگی تو بجھی ہی نہیں۔ ارے ہاں ہاں ———"

پروائی تیزی سے چل رہی تھی۔ جیٹھ کا مہینہ تھا۔ رامو کا دل بھی گانے کو چاہا۔ اُس نے گانا چاہا — "جاتی جوبنا پہ نہ ....." مگر وہ نہیں گا سکا۔ کچھ گنگنا کر رہ گیا۔ حلق سوکھا تھا۔ آواز نکل ہی نہ سکی۔ اُسے معلوم ہوا جیسے کلیجے میں طاقت ہی نہیں۔ اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور گلا صاف کر کے کھنکھارتا ہوا آگے بڑھا۔ یکایک اُسے کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ ساتھ ہی دوسرا آدمی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ غریب فٹ پاتھ پر سویا ہوا تھا۔ رامو کو اُسی سے ٹھوکر لگی تھی۔ رامو نے بڑی عاجزی کے ساتھ اُس سے معافی مانگ لی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے پوچھا وہ تم کون ہو؟ اور میل جول ہو گیا۔ اُس نے رامو کو اپنے ٹاٹ پر بٹھا لیا، اور بیڑی پینے کو دی۔ رامو کا دل بھی چاہ گیا۔ اُس نے بیڑی پی۔ مگر اس کا سر چکرا گیا۔ اُس نے بیڑی پھینک دی اور سر تھام کر بیٹھ گیا۔ وہ تک وہیں بیٹھا رہا، اُٹھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔

جب اُس کی طبیعت سنبھلی تو وہ پھر آگے بڑھا۔ حلوائی کی دوکان اب بھی اُس کی نگاہوں میں پھر رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ امرتی اور بیسن کا لڈو کھائے۔ اس خیال کے آتے ہی اُس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ اب وہ ایک تین منزلہ مکان کے پاس سے ہو کر گزر رہا تھا۔ یکایک کسی نے اُس پر مکان پر سے تیز روشنی ڈالی۔ اُس نے نظر اُٹھا کر اوپر دیکھا۔ مکان کی دوسری منزل پر ایک کھڑکی سے دو آدمی نیچے دیکھ رہے تھے۔ کمرے میں بجلی کی روشنی تھی۔ اُن دونوں پر بھی روشنی پڑ رہی تھی۔ لیکن پھر وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر رامو نے اتنا سمجھ لیا کہ ان میں ایک مرد تھا اور ایک عورت تھی۔ عورت بولی

"کوئی غریب آدمی ہے، چور نہیں ہے"

مرد بولا۔ "تمہارا خیال ٹھیک ہے"

رامو آگے بڑھتا گیا۔ عورت کے جانے کسی بات پر ہنسی۔ رامو سمجھا کہ وہ اُسی پر ہنس رہی ہے۔ اُس کے دل پر چوٹ لگی۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ "اگر میرے پاس بھی دو منزلہ مکان ہوتا۔ روپیہ اور عورت ہوتی تو زندگی مزے سے کٹتی۔ کوئی مجھ پر ہنستا بھی نہیں"، اس کا دل مچل کر رہ گیا۔ وہ اور آگے بڑھا۔ کچھ دُور آگے جا کر ایک اندھیری گلی سے دو چار آدمیوں کی کانا پھوسی کی آواز آئی۔ وہ رُک گیا۔ لیکن اس کے رُکتے ہی آواز آنی بند ہو گئی۔ رامو نہ جانے کیا سوچے سمجھے آگے بڑھ گیا۔ اور اس راستہ پر ہو لیا جو حلوائی کی دوکان کی طرف جاتی تھی۔

تھوڑی دُور جا کر وہ ایک نکڑ سے جیسے ہی مڑا ایک موٹر کھڑی نظر آئی۔ ایک بابو صاحب موٹر کو دھکا دے رہے تھے۔ اور ایک عورت کھڑی تھی۔ رامو بھوک سے نڈھال تھا۔ اس کا ایک ایک قدم رُک رُک کر اُٹھ رہا تھا۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچا، بابو صاحب بولے۔

"لے! سنو۔ تم موٹر کو پیچھے سے دھکا دو۔ ہم تم کو انعام دیگا"

رامو نے اُس عورت کو دیکھا۔ دیکھتے ہی اُسے خیال آیا کہ اس عورت کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر اسے کہاں دیکھا ہے۔ بابو صاحب بولے "لے! سُنتا نہیں ہے!! تم موٹر کو دھکا دو ہم انعام دیگا"

رامو نے انعام کا لفظ سُنا تو اُس کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور

اُس کے مُنہہ سے نکل گیا -

"کتنا ؟"

"حرامزادہ، سُور ——— دو سو روپیہ لے گا -"

رامو کا خون کھول گیا - جی چاہا کہ جو بھی ہو، مگر ان کی ساری بالوں کو نکال دے - مگر غم کھا کر رہ گیا - انعام کے لالچ میں موٹر کو دھکا دینے کو آگے بڑھا - زور لگایا مگر موٹر بڑا تھا اور بدن میں طاقت کم - موٹر بال برابر بھی نہ سرکا، اور رامو ہانپنے لگا - تھک کر الگ کھڑا ہو گیا - بابو صاحب بولے

"بس سالے! اسی پر کتنا انعام دیں گے ؟"

دونوں نے مل کر دھکا دینا شروع کیا اور کچھ دُور لے گئے - رامو کھڑا کا کھڑا رہ گیا - اُن دونوں کے جانے کے بعد رامو کو یاد آیا - گاؤں کے زمیندار نے بیٹے کے بیاہ میں اس عورت کو بلایا تھا - وہ گانے کیلئے گئی تھی - رامو کو اس وقت اس کی کھنچی پر غصہ آیا اور بولا "پتہ پاسائی" تھوڑی دیر میں موٹر نظروں سے اوجھل ہو گیا -

رامو پھر آگے بڑھتا چلتا گیا - آخر اُس حلوائی کی دوکان پر پہنچا، جس کو اس نے تاکا تھا - دُکان بند تھی - حلوائی دُکان کے سامنے ایک لمبے بنچ پر چاروں شانے چت پڑا تھا - اس کا ایک ہاتھ زمین سے چھو رہا تھا، پروائی تیزی سے چل رہی تھی - ہر طرف اندھیرا تھا - حلوائی کے خراٹے کی ہلکی ہلکی آواز نکل رہی تھی ——— رامو کی ہمت ٹوٹ گئی - اس کا ارادہ بدل گیا - اس نے سوچا - چوری کرنا بُرا کام ہے - چاہے کیسی ہی مجبوری میں کیوں نہ ہو - اس سے بہتر تو یہ ہے کہ حلوائی کو اُٹھا کر اُس سے کچھ مانگ لیا جائے - یہ بھی معمولی آدمی ہے - کوئی بڑا آدمی نہیں ہے جو دھکا دے گا - اُٹھا کر مانگنے سے کچھ دے دیگا ——— مگر کہیں چوری کی اور جاگ گیا، تو پھر خیر نہیں یہ سوچ کر رامو حلوائی کے پاس گیا - چاہتا تھا کہ اُٹھائے - حلوائی کے مُنہہ سے بھک سے دیسی شراب کی بُو آئی - رامو سمجھ گیا کہ یہ نشے میں چور ہے - اگر اس حال میں اُٹھائے گا تو وہ ضرور ہی خفا ہوگا - تب نہیں کہ مار پیٹ بھی کرے ——— پھر اُس کو چوری کرنے کا خیال ہوا - اب حلوائی کی طرف سے اُس کو اطمینان تھا - اس کو یقین تھا کہ اس کو چوری کی خبر بھی نہ ہوگی نشے میں اتنا چت ہے -

رامو ہمت کر کے دوکان کے اوپر چڑھ گیا - ایک دو بار وہ اُس دوکان پر بیٹھ کر کچھ کھا بھی چکا تھا - اُسے ہلکا سا اندازہ تھا کہ کون سی چیز کہاں دھری ہے - اسی لئے ہر طرف اندھیرا ہونے پر بھی الماری تک پہنچ گیا - اُس نے جیسے ہی الماری کو ہاتھ لگایا، کھٹ سی آواز پیدا ہوئی - اس کے ساتھ ہی اندر کا کواڑ کھلا اور دھیمی آواز آئی -

"دروازہ ادھر ہے جگن !"

رامو کے سارے بدن کا خون سُوکھ گیا - وہ بالکل چپ کھڑا رہ گیا - ویسی ہی دھیمی آواز پھر آئی -

"جگن تمہاری عادت بہت خراب ہے - اتنی دیر کر دیتے ہو - دو بجے بہت دیر ہوئی اور تم بھٹی سے اب آتے ہو -"

مگر رامو ہلا تک نہیں - ڈر سے سارے بدن میں کپکپی پھیل گئی - پھر وہی دھیمی آواز آئی -

"ارے آتے کیوں نہیں - اب ہم تم کو پیسہ نہیں دیں گے"

اتنا کہہ کر ایک عورت دروازے سے نکل آئی، اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی -

"اب تم بہت راہ دکھاتے ہو ———"

رامو کے دماغ میں ساری باتیں آ گئیں - وہ سمجھ گیا کہ عورت کسی کے انتظار میں تھی ——— اور اسے دھوکہ ہوا ہے ——— اوہ بوڑھا حلوائی اور یہ کڑیل جوان عورت !! تو ندل کیسا بے پروا پاؤں پھیلائے پڑا ہے - وہ کمرے میں چلا تو گیا - مگر ڈر رہا تھا کہ کہیں پہچان نہ لے - عورت اُسے کمرے میں لیجا کر ایک پلنگ پر بٹھاتی ہوئی بولی -

"اب تم کو پیسہ نہیں دینگے جگن ! تم پی کر پگلے ہو جاتے ہو"

اتنا کہہ کر اُس نے رامو کے گلے میں باہیں ڈال دیں، اور پیار سے اُسے اپنی طرف کھینچا - رامو نے اُس کی محبت کا جواب ایک "چپ" سے دیا - عورت نے رامو کے مونڈھے پر سر رکھتے ہوئے کہا -

"پیسہ کم تھا اسلئے خفا ہو ؟ جانتے ہی ہو ہمیں زیادہ پیسہ نہیں ملتا"

رامو بہت سی باتیں سمجھ گیا - بوڑھا کنجوس بھی ہے - گھر میں روشنی بھی تھی - وہ خوش تھا - بوڑھے کی کنجوسی اُس کے لئے فائدہ کی ثابت ہوئی - رامو نے سوچا - آج تو خوب جاترا بنا - کھانے کو تو ملے گا ہی - عورت بھی "بھاؤ" میں ملی ——— عورت کا خیال آتے ہی اس کے سارے بدن میں سنسنی پھیل گئی - دل گدگدانے لگا - مگر اس کا دل الماری میں لگا ہوا تھا - بھوک نے بہت جلدی اس کے خیال کو دوسری طرف لگا دیا - وہ اندھیرے میں آنکھ پھاڑ پھاڑ کر کمرے میں چاروں طرف دیکھنے لگا - کہیں کھانے کی کوئی چیز تو نہیں دکھائی دیتی - مگر اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہ آیا -

عورت نے سمجھا کہ وہ نشے میں ہے - بولی

"اسی لئے زیادہ پیتے ہو - ہزار بار منع کیا - تم مانتے ہی نہیں - آؤ !!"

اتنا کہہ کر عورت نے پھر رامو کو اپنی طرف کھینچا - رامو نے مرنے میں آکر اپنا سر اُس کی گود میں ڈال دیا - اس میں اُسے بڑا مزہ آیا -

سارے بدن میں گدگدی سی ہونے لگی - سانس زور زور سے چلنے لگی عورت کی سانس کی گرمی اُسے اپنے گالوں پر محسوس ہوئی - اِس گرمی میں لُطف بہت زیادہ تھا - اُس کا دل چاہا کہ عورت کو کھینچکر اپنی گودی میں لے لے مگر وہ اُسی طرح اُس کی گود میں پڑا رہا - آخر وہ عورت اُس پر جھکنے لگی رامّو نے اُٹھ کر اُس کو اپنی گودی میں کھینچ لیا - عورت اُس کی گودی میں تھی اس کا بدن بالکل ڈھیلا پڑ چکا تھا - اُس نے اپنا ڈھیلا ڈھیلا ہاتھ رامّو کی گردن میں ڈال دیا - رامّو کا دل مچل گیا - اُس نے چاہا کہ اس کو اسی طرح لئے ہوئے سو جائے - مگر بھوک نے پیٹ میں مچل کر اُسے بیچین کر دیا - آنتیں اینٹھنے لگیں - بھوک نے سارا مزا کرکرا کر دیا - وہ عورت کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا - مگر یہ بھی چاہتا تھا کہ پہلے کچھ کھانے کو مل جائے - وہ عورت کو پلنگ پر چھوڑ کر دیوانوں کی طرح اُٹھ کھڑا ہوا - عورت بولی

"آج تم بالکل بدلے ہوئے معلوم ہوتے ہو جگن!!"

مگر رامّو کچھ بھی نہ بولا - بھوک سے بدحواس دیوار کے چاروں طرف ٹٹولنے لگا - شاید طاق پر کھانے کی کوئی چیز مل جائے - ایک تھالی میں لڈو دھرے ملے - اُس نے اُٹھا کر کھانا شروع کیا — ایک، دو —

عورت یکایک اُٹھ کھڑی ہوئی - تھالی اُس سے چھین کر الگ رکھ دی اور بولی

"جانتے ہو جگن! لڈو وہ گن کر رکھتے ہیں -"

رامّو کو پھر وہ پلنگ پر بٹھا کر پیار سے اُس کی طرف بڑھی - مگر دو لڈو تو پیٹ میں پڑ چکے تھے - سوئی ہوئی بھوک جاگ چکی تھی - اُس نے عورت کی طرف ذرا دھیان نہ دیا - وہ پھر لڈوؤں کی تھالی کی طرف بڑھا - دو لڈو اور اُس کے ہاتھ آئے - عورت تھالی لے کر دوسرے کمرے میں رکھنے چلی گئی - رامّو کو بڑا غصّہ آیا - اُس کا جی چاہا کہ اسے قتل ہی کر دے - مگر وہ لڈو کھانے لگا - یکایک اس کو کچھ خیال آیا - اور وہ ادھر ادھر ٹٹولنے لگا - بستر پر سرہانے اُس کو ایک چیز ہاتھ لگی - "ہنسلی" اُس نے دل ہی دل میں کہا "ارے واہ گہنا - ہنسلی بھاری تھی اُس نے اپنی کمر میں رکھ لی - پھر ادھر اُدھر ٹٹولنا شروع کیا - ایک کونے میں پانی کا بھرا لوٹا رکھا - اُس نے اُٹھا کر پینا شروع کیا - اتنے میں عورت واپس آئی اور دوسری تھالی لیکر چلی - رامّو نے جھپٹ کر تھالی پر ہاتھ مارا - عورت بولی - "ارے کھل دل ہیں - مت لو -"

عورت نے پلٹ کر اس سے چھیننا چاہا - لیکن رامّو نے اُسے زور کا دھکّا دیا اور کمرے سے نکل کر بھاگ گیا -

مشہور ہندکارخانہ تمباکو گیا

کرامت میاں صاحب پرانی کدّام گیا

قائم شدہ سنہ ۱۸۷۵ء

کرامت میاں صاحب تمباکو کا کارخانہ گیا تقریباً ۷۵ سال سے قایم ہے - اس کارخانہ کے تمباکو سے گیا کے تمباکو کو عالمگیر شہرت حاصل ہوگئی ہے - ہندوستان کے شہروں میں مشکل سے کوئی ایسا شہر ہوگا جہاں ہمارے کارخانہ کا بنا ہوا تمباکو آپ کو نہ مل جائے - ہندوستان کے بڑے بڑے مہاراجہ اور والیان ریاست کے محلوں میں اسی تمباکو سے تواضع کی جاتی ہے - اور بڑے بڑے رؤسا اور شایقین حسب خواہش ہمارے یہاں سے ہمیشہ مال منگواتے ہیں - پچھتر برس کی مدت میں ہزاروں ہزار سارٹیفکیٹ اس کارخانہ کو ملے مگر اب خود اس کارخانہ کا نام ہی سب سے بڑا سارٹیفکیٹ اور مال کی عمدگی کی نشانی ہے -

اس وقت تک جن لوگوں نے ہمارے یہاں سے مال منگا کر ملاحظہ نہیں فرمایا ہے وہ ایک مرتبہ مال ضرور طلب فرمائیں - ہم امید کرتے ہیں وہ ہمیشہ کے لئے ہمارے کارخانہ کے مستقل خریدار ہو جائیں گے

مال بذریعہ وی پی روانہ کیا جاتا ہے - مگر آرڈر کے ساتھ کم از کم چوتھائی قیمت بیشگی آنا ضروری ہے -

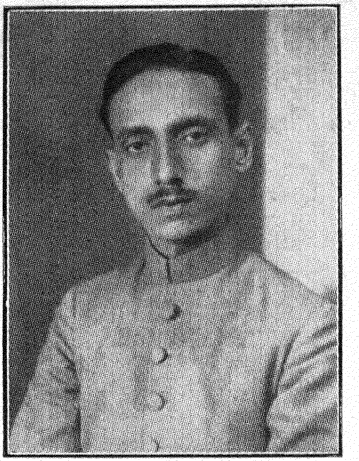

حضرت جمیل مظہری

جناب عابد نقوی

جناب شیدا کیوروی

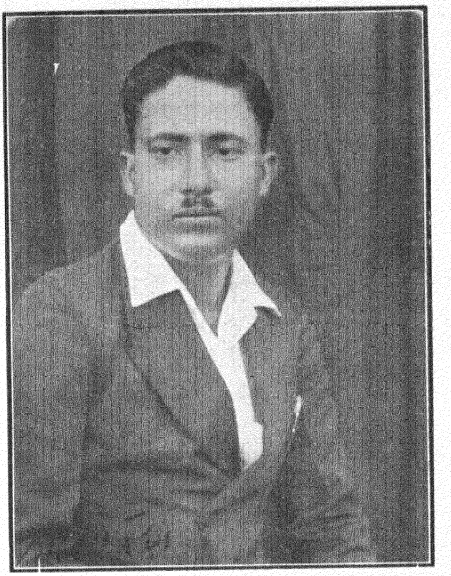

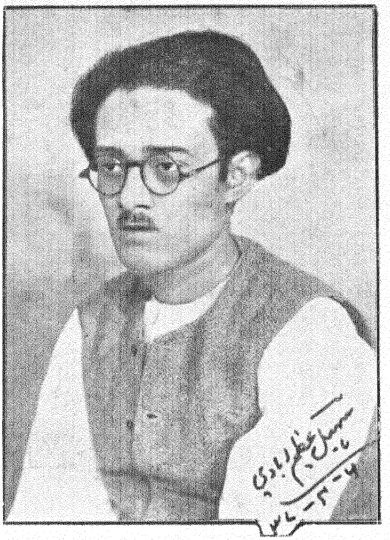

جناب خواجہ عبدالقیوم

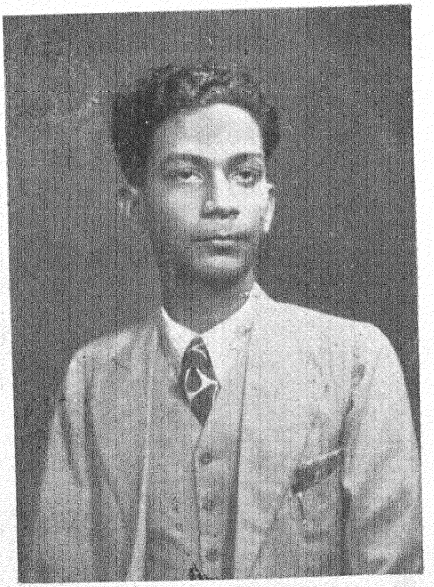

جناب قیصر عثمانی

"بہر زمیں کہ رسیدیم ....."

از حضرت الیاس اسلام پوری ؛

(۱)

اگر شاعری محض قافیہ و ردیف کا نام نہیں ہے اور جذبات سے بھی اس کا کوئی تعلق ہے تو اقبال صحیح معنی میں شاعر پیدا ہوا تھا۔ وہ فطرت کی طرف سے حد درجہ حساس دل لے کر آیا تھا ——— طلوع و غروب کے حسین مناظر کو دیکھتا اور محو ہو جاتا۔ وہ گلاب کی رنگینیوں اور شادابیوں پر نظر ڈالتا اور خود شاخ گل کی طرح مست و سرشار جھومنے لگتا۔ پپیہے کی صدا سنتا اور تڑپ اٹھتا۔ سمندر کی موجوں کا نظارہ کرتا اور خود اپنا وجود فراموش کر جاتا، غرضکہ چاند سورج، بہار و خزاں اور فطرت کے وہ تمام مناظر جو ایک سطح بین انسان کیلئے قدرت کے روزانہ کے معمولات سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے اقبال کیلئے ان میں وہ تمام ہنگامہ جذبات اور ہیجان کے سامان مہیا تھے، جن کے زیر اثر انسان کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

صفحہ سے محرومی ایسی چیز نہ تھی جسے اقبال کی فطرت آسانی سے برداشت کر لیتی، وہ متاثر ہوئی اور بری طرح متاثر ہوئی۔ اس میں ایسی شدت رونما ہوئی جس نے اقبال کے دل میں دنیا اور اس کے بسنے والوں کی طرف سے ایک استکراہ و احتراز کی کیفیت پیدا کر دی۔ شہر کے ہنگاموں سے پہلے بھی اسے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن اب تو اسے نفرت سی ہونے لگی تھی اور وہ ان سے نجات پانے کو بیتاب نظر آ رہا تھا۔ بالآخر گھر کا کاروبار ایک بوڑھے ملازم اور بھائی کے سپرد کر کے اپنی سکونت گنگا کے کنارہ ایک چھوٹے سے گاؤں فرید پور میں اختیار کی۔ وجہ معاش کی طرف سے بے فکری تھی۔ اس کی موروثی جائداد اس کے چھوٹے سے خاندان (جس میں اسکی ضعیف ماں اور ایک چھوٹا بھائی تھا) کی کفالت کے لئے بالکل کافی تھی زیادہ کی اسے تمنا نہ تھی، اس کی سادہ زندگی نے کبھی ان چیزوں کی ضرورت محسوس نہیں کی جو محض دولت اور تفوق و برتری کے احساس کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہی سبب تھا کہ اقبال کی نئی طرز زندگی میں کسی اختلال کا اندیشہ نہ تھا، اور وہ اپنی تمام تلخیوں کو سینہ میں دبائے ایک خود فراموشی کی حالت میں بسر کرنے لگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ نا کامیاں اب بھی اسے کبھی کبھی سخت آزمائش میں مبتلا کر دیتی۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اس کا یہ جذبہ اس کے سکون و طمانیت میں بڑی حد تک معاون ثابت ہوا، کہ سوسائٹی کے ظلم کا عوض اس نے اسے ترک کر کے لے لیا ہے۔ اور اب اس کے چہرہ کی رونق اور ظاہری رکھ رکھاؤ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ زمانہ آج نہیں تو کل اس کو بھی خموں کو بھی ہندسل کر دیگا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس کی تحریک نے خاک و خون کے عرض میں ایک ہنگامہ سا مچا دیا تھا، اور حکومت نے نئے قانون کے ذریعہ اس آگ پر پانی ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اقبال کو اخباروں سے ہمیشہ دل چسپی رہی اور یہی وجہ تھی کہ دنیا سے بالکل بے تعلق رہنے کے باوجود بھی تمام حالات کا اس نے بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن ملک کی یہ نئی شورشیں خود اس میں اور اس کی طرز حیات میں کوئی تحریک پیدا نہ کر سکیں، وہ اسی طرح خاموش اپنے گوشہ سکون میں بسر کرتا رہا۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کتنی مدت انہیں خود فراموشیوں میں گزار دیتا اگر اس کا پرانا رفیق ممتاز ایک دن آ کر اس کے دماغ کو ایک بار پھر دوسری طرف مائل کرنیکی کوشش نکرتا۔

ممتاز اور اقبال نے ساتھ ہی کالج میں تعلیم پائی تھی، اور ایک ہی سال بی۔ اے کیا تھا۔ ممتاز تعلیم ختم کرنے کے بعد کاروباری زندگی بسر کرنے لگا اور اس میں اس نے کافی ترقی بھی کی تھی، گرچہ اقبال نے اس کی آمد پر کبھی کسی تکلف کی خواہش نہیں کی لیکن اقبال کے خلوص اور اس کی فطرت کی سادگیوں میں وہ کچھ ایسی کشش اپنے لئے پاتا تھا کہ ناممکن تھا کہ وہ سال میں دو تین بار آ کر اقبال سے مل نہ جایا کرے۔

شام کا وقت تھا اقبال اور ممتاز ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول تھے، ممتاز نے آخر کار گفتگو کا رخ سیاست کی طرف پھیر دیا، اور اقبال سے پوچھا۔

"اقبال صاحب! آخر آپ نے اپنی رہبانیت کا حاصل کیا سمجھا ہے؟"

اقبال "کیا کہتے ہو ممتاز! میں ہوں کس کام کا۔ میں کسی کے لئے مفید ثابت ہو نہیں سکتا، اور نہیں تو یوں سمجھو کہ میں کسی کو اپنے موافق نہیں پاتا۔ تمہیں بتاؤں میرے لئے کیا رہ جاتا ہے، سوائے اس کے کہ کسی ایسے گوشہ میں زندگی بسر کروں گویا میرا شمار دنیا کی آبادی میں ہی نہیں"

ممتاز - ممکن ہے آپکا نظریہ آپ کی تسکین کے لئے کافی ہو لیکن ان حقوق کو تو آپ صرف یہ کہہ کر ٹال نہیں سکتے جو نوع انسان کے ہر فرد پر کسی نہ کسی صورت میں از خود عاید ہو جاتے ہیں۔ یہ تو آپ کو ماننا ہی پڑیگا کہ مادر وطن کی طرف سے کچھ نہ کچھ فرایض اس کے تمام فرزندوں پر لازم ہیں، پھر اگر وہی لوگ جن سے کچھ توقع ہو سکتی ہے سرے سے اس کے احساس ہی سے منکر ہو جائیں، تو بتاؤ ملک کا کیا حشر ہوگا۔ اقبال! "میں تمہاری صلاحیتوں سے ناواقف نہیں، تم میں وہ سب کچھ ہے جس کی وطن کو ضرورت ہے"

اقبال - ممتاز! میں نے اب اپنی دنیا الگ بنالی ہے اور جانتا ہوں پرانی الائشوں کا میرے سامنے تذکرہ بھی نہ آئے۔ اور یوں بھی تم جانتے ہو میرا نقطۂ نظر کتنا علحدہ ہے۔ میں ہر چیز پر نظر ڈالتا ہوں خود اپنی صلاحیت فکر کے اعتبار سے مجھے اگر تم یہ کہنے کی اجازت نہیں دیتے کہ دنیا صرف مطمع نظر ہی دیکھتی ہے تو مجھے یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ جس شے کا مطالعہ کروں میری نظر سطح کو چیر کر بالکل اس کے قلب میں پہنچ جائے اور ان تمام حقیقتوں کا نظارہ کرے جن پر چند در چند خوشنما غلاف چڑھا کر دنیا کے سامنے پیش کرنیکی کوشش کی گئی ہو۔ اور معاف کرنا ممتاز! اگر میں اس تلخ حقیقت کے اظہار پر اپنے کو مجبور پاتا ہوں کہ چمکنے والی تمام چیزوں میں بہت کم ہی سونا ثابت ہوتی ہیں۔

ممتاز - اول تو مجھے آپ کے تمام دعوؤں کے صحیح تسلیم کرنے ہی میں تامل ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہندوستان کے یہ لیڈر مادر وطن کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے حد درجہ بیتاب نظر آتے ہیں اور انتہائی قربانیوں کو گوارا کرنے کو تیار ہیں پھر کیا یہ چیزیں ایسی ہیں جنہیں آسانی سے فراموش کیا جا سکتا ہے۔ ان میں کون سی شے ایسی ہے جسے حقیقت کے خلاف پردہ سے تعبیر کیا جا سکے۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے میں یہ مان بھی لوں کہ وہ سب کچھ صحیح ہے جو آپ کہتے ہیں، پھر بھی آپ اس سے کیونکر انکار کر سکتے ہیں کہ آپ کی یہ تاویلیں ادائگی فرض سے خود آپ کو سبکدوش نہیں کر سکتیں۔

اقبال - صحیح ہے، مجھے بھی اس سے انکار نہیں۔ لیکن جب دیکھتا ہوں کہ ملک میرے مزعومات کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تو میں ان سطحی چیزوں کے نتائج سے واقفیت کے بعد کیوں اپنے ایمان و ایقان کی قربانی گوارا کر لوں۔ پھر میرا اس تحریک میں ہاتھ ڈالنا کیا معنی رکھتا ہے، خصوصاً اس صورت میں جب میں جانتا ہوں میں موجودہ اصول کار کی ہمنوائی نہیں کر سکتا۔ ایسی صورت میں میری ذات سے اس تحریک کو نقصان ہی پہنچنے کا زیادہ اندیشہ ہے۔ تم نے لیڈروں کا تذکرہ کیا ہے۔ میں جانتا ہوں تم میری کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو۔ اور وہ سب کچھ کہلوانا چاہتے ہو جس کا نہ کہنا بہتر ہے۔ نہ کہنا بہتر اسلئے کہ ان پر کان دھرنے والا مشکل ہی سے کوئی مل سکے گا۔ باور کرو ممتاز! تمہاری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اسکی یہ تمنا کبھی پوری نہ ہوتی۔ لیکن تمہیں معلوم ہے، میرے احباب میں صرف ایک تم ہو جس سے میں کچھ توقعات رکھتا ہوں۔ صرف تمہاری ایک ہستی ایسی ہے جسمیں اپنے لئے کچھ سامان سکون پاتا ہوں۔ تم نے ایک اہم موضوع پر گفتگو شروع کر دی ہے۔ اور مجھ سے جواب کے لئے اصرار بھی کرتے ہو۔ تم یہ نہ سمجھو میں اس تحریک سے قطعی بے خبر رہا ہوں۔ میں نے بہت گہرا مطالعہ کیا ہے اور جس نتیجہ پر پہنچ سکا ہوں اس کا تزلزل بڑی مشکل چیز ہے، تم لیڈروں کو کہتے ہو ان میں کا ہر شخص یا تو خود فریب نفس میں مبتلا ہے یا دوسروں کو فریب میں مبتلا کرتے ہیں، اور میں سمجھتا ہوں موخر الذکر اتنا خطرناک نہیں جتنا اول الذکر۔

ممتاز! دنیا میں کسی انقلاب کا مطالعہ کرو تمہیں صاف پتہ چل جائے گا کہ وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکا جب تک اس قوم کے پست افراد میں خود انقلاب کی احتیاج اور اس کی برکات کا احساس پیدا نہیں ہو گیا۔ ان ممالک کا بھی یہی حال ہے جہاں اکثریت تعلیم سے بہرہ ور اور تہذیب و مدنیت کی برکتوں سے لطف اندوز رہی ہے۔ اب اس ملک کی بدنصیبی پر غور کرو جس کی نوے فی صدی آبادی دیہاتوں پہاڑوں اور جنگلوں میں زندگی بسر کرتی ہے اور موجودہ تہذیب کے لذائذ و نعائم کا کیا ذکر وہ تو معمولی انسانی ضرورتوں سے بھی واقف نہیں۔ تعلیم سے وہ ابتک اسی درجہ ناآشنا ہے کہ جتنا انسان دور وحشت و درندگی میں تھا۔ غور کرو ہماری اس نوع کی سعی کیا کارآمد ہو سکتی ہے جبکہ ۹۰ فی صدی آبادی کو اس سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔ آج جلسے ہوتے

ہیں اور ہنگامی نمائش میں روپے پانی کی طرح بہا دئے جاتے ہیں لیکن انہیں کون سمجھائے کہ انہیں روپیوں سے غیر تعلیم یافتہ طبقہ کی تعلیم کا سامان کیوں نہیں کیا جاتا۔ سب سے بڑی ضرورت عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنے کی ہے۔ جب تک وہ آزادی کے مفہوم سے نا آشنا ہیں یاد رکھو یہ ہنگامی شورشیں کوئی دیرپا نتیجہ پیدا نہیں کر سکتیں ضرورت ہے ان میں ایسی کیفیت ایقان و رسوخ کے پیدا کرنے کی جو نتیجہ ہوتی ہے محض انسان کے خود اپنے دماغی احساس و شعور کا اور جس سے ایک بار آشنا ہونے کے بعد آزادی کے لئے وہ اپنے سر کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ سب سے پہلے ان میں یہ احساس پیدا کرنا چاہئے کہ ان کی معیشت و معاشرت حد درجہ پست ہے، اور صرف آزادی ہی اسے اتنا بلند کر سکتی ہے جس کا وہ آج خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ لیڈروں کو دیوتا کی شکل دیکر عوام میں ایک طرح کی بندگی کا جذبہ تو پیدا کیا جا سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وقتی ہنگاموں میں ان کی جاعتیں بھی لیڈروں کے پیچھے پیچھے نعرے لگاتی ہوئی نظر آجائیں۔ لیکن ان میں وہ احساس و شعور کہاں سے آئیگا جو خود ان کے قلب و دماغ کو بے تاب بنا کر حشر سے بھی بے نیاز کر دیتا ہے۔ تم انہیں غلامی سے آزادی کا سبق دیتے ہو، لیکن دوسری غلامی میں مبتلا کرتے ہو۔ حیرت ہے ہمارے لیڈر اپنے تمام ادعائے آزادی کے باوجود اتنی سی معمولی شئے نہیں سمجھنا چاہتے اور صرف عارضی جلسوں عوام کے نعروں اور اپنی گاڑیوں کو نوجوانوں کے کندھوں پر دیکھ دیکھ کر مسرور ہوتے ہیں، حالانکہ یہ چیزیں اتنی پست ہیں کہ ان کی کوئی وقعت کم سے کم میری نظر میں تو پیدا نہیں ہو سکتی۔ معاف کرنا ممتاز! یہ لیڈر شپ کا ہیکڑ ہوئی ایک تجارت ہوئی کہ دو کا نداراس سے زیادہ دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ اس کے یہاں کتنے گاہک آتے ہیں۔ یا کتنے روپیہ کا لین دین ہوتا ہے۔ اس وقت تک اگر کسی بڑی سے بڑی کوشش کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ اچھوت ادھار ہے۔ یہ چیز یقینی قابل توجہ تھی لیکن افسوس یہ بھی خود غرضی ہی سے ملوث نظر آتی ہے۔ سوچو تو ہندوستان کا مسئلہ لیڈر اتنے بڑے پروگرام کو محدود کر دے صرف ایک طبقہ کے لئے اور وہ بھی مندروں میں داخلہ تک۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس طرح ان میں وہ عروج و استقلال کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ آج بھی ہندوؤں کے مختلف فرقے ایک ہی طرح ایک ہی مندر میں پوجا کرتے ہیں، پھر بھی معاشرت کے بہت زیادہ اختلافات ان میں پائے جاتے ہیں، اور ہزاروں برس کی پوجا کے بعد بھی ان میں کوئی فرق پیدا نہیں ہو سکا۔ ہمیں تو در اصل اس احساس کو مٹانا چاہئے جو اس تفریق کا سبب بنا ہوا ہے۔ اور اس کی میرے خیال میں صرف یہی ایک صورت ہو سکتی ہے کہ ہمارے لیڈروں کو عوام سے براہ راست تعلق پیدا کر کے ان میں وہ سب کچھ پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہئے جسے اب تک وہ صرف زبان سے کہتے رہے ہیں عوام سے میری غرض شہر کے بسنے والے نہیں کہ وہ تو یوں بھی تھوڑا بہت حالات کا علم رکھتے ہیں بلکہ وہ طبقہ ہے جو ملک کے دور دراز رہنے میں زندگی بسر کرتا ہے اور یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ غلام بھی ہے یا نہیں اور آزادی و غلامی میں فرق کیا ہے؟

آج ہم روتے ہیں کہ ہمارے یہاں مختلف اقوام میں اتحاد اور یگانگت نہیں پایا جاتا۔ ہر طبقے نے الگ الگ مجلسیں بنا رکھی ہیں اور آپس میں دست و گریبان نظر آتے ہیں۔ لیکن اس پر کبھی غور نہیں کیا گیا کہ اس کا اصلی سبب کیا ہے۔ میں ہرگز اسے برا نہیں سمجھتا کہ ہر قوم کو اپنی رہنمائی کے لئے الگ الگ مجلسیں بنانے پر اصرار ہے۔ یہ تو بہترین طریقہ کار ہو سکتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے ہر ملک میں مختلف صوبے، پھر مختلف اضلاع ہوتے ہیں۔ کیوں؟ صرف سہولت کار کے لئے۔ اسی طرح اگر مختلف جماعتوں کے لیڈر اپنے پیروؤں کی ایمانداری سے رہنمائی کرتے رہیں تو اس میں کیا حرج واقع ہوتا ہے۔ اگر یہ چیز پوری ذمہ داری کے احساس کے ساتھ انجام پا جائے تو عوام بھی بڑی آسانی سے راہ پر لگائے جا سکتے ہیں، اور پھر ہر قوم کی اپنی خصوصیتیں اور انفرادی حیثیتیں بھی قایم رہ سکتی ہیں۔ ہمیں اپنے بزرگوں کی اس کاوش پر ہنسی آتی ہے کہ وہ مختلف اقوام کو ملا کر ایک قوم بنانے کے جنون میں مبتلا ہیں۔ حیرت ہے ملک کی رہنمائی کا دعویٰ اور اس درجہ بے خبر کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ قومیں ہزاروں برس میں بنا کرتی ہیں اور ہر قوم کی روایات ایسا اہم جزو اس کی زندگی کے ہیں کہ صرف دسی چیزیں اس کی سربلندی و نجات کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ دوسری قوموں کی روایات اور رسوم اسے ہرگز اپیل نہیں کر سکتے۔ اس لئے اگر ایک بار ان سے یہ چیز چھین لیگئی تو پھر صدیوں کے لئے وہ قوم کبھی سر نہیں اٹھا سکتی۔ بتاؤ لیڈری ہوئی یا دشمنی، اس طرح ہندوستان کی ساری قومیں اپنی خصوصیات ضایع کر دیں گی، اور پھر معلوم نہیں کتنے طویل عرصہ کے لئے غلامی سے نجات ناممکن ہو جائے۔ کیا کروں ممتاز! ان تمام حقیقتوں پر غور کرنے کے

بعد میں صرف اسی نتیجہ پر پہنچ سکا ہوں کہ انقلاب کو کامیاب بنانے کی واحد صورت یہی ہو سکتی ہے کہ عوام کی ذہنیت میں بلندی پیدا کر کے ایسا عزم و رسوخ ان میں پیدا کر دیا جائے کہ انہیں کسی راہ نما کی ضرورت ہی باقی نہ رہے اور ان میں خود اپنی رہنمائی کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ لیکن ممتاز! مجھے جو چیز سب سے زیادہ بدحواس کر دینوالی نظر آتی ہے وہ ایمانداری و راست بازی کا فقدان ہے۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ ملک کہیں آگے بڑھنے کے عوض پیچھے نہ ہٹ جائے

ممتاز ۔ یہ کہنا تو غلط ہو گا کہ آپ کی تقریر کا بیشتر حصہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ لیکن یہ بتائیے کہ اس پر عمل کرنے کی کیا صورت ہے۔ جو لیڈر ہیں وہ آپ کے خیال کے مطابق ....." ممتاز یہ کہہ ہی رہا تھا کہ سامنے سے سنتھال قوم کی ایک عورت گزری۔ اقبال ممتاز کی گفتگو سے بے توجہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا اور جب تک وہ اس کے سامنے سے گزرتی رہی وہ غور سے دیکھتا رہا۔ پھر ممتاز سے مخاطب ہوا "دیکھو یہ ہیں وہ افراد جن کی طرف توجہ کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ لیکن ہے کون جو اس لوہے کے چنے کو گوارا کرے ——— ممتاز! کبھی تم نے ان کی اصلی زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔ میرا تو ارادہ ہے کہ کچھ روز ان کی صحبت میں رہ کر اس سادہ زندگی کا مطالعہ کروں۔ جس میں ابتدائے آفرینش سے اب تک مشکل ہی سے کوئی تبدیلی پیدا ہو سکی ہے۔ چلو ممتاز! ایک بار تاریخ کے ان بوسیدہ اوراق کا مطالعہ کریں جسے آج کے ذہن انسانی نے تقریباً فراموش کر دیا ہے ....."

(۲)

اقبال اور ممتاز ایک ہفتہ سے سندر پہاڑی کے بنگلہ میں مقیم ہیں۔ تمام دن سنتھالیوں کی بستیوں میں گھوم گھوم کر ان کی طرز زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اور شام کو اپنی قیام گاہ پر واپس آ جاتے ہیں تھوڑے ہی عرصہ میں وہ ان سے بہت مانوس ہو گئے۔ اور کوشش کر کے انکی زبان بھی سیکھ لی۔ اس عرصہ میں ممتاز بہت گھبرا گیا۔ اسے ان چیزوں سے فطرتاً کوئی خاص لگاؤ نہ تھا، اسلئے پہلے تو اقبال کو بھی واپس لے چلنے کی کوشش کی لیکن جب اقبال کسی طرح اتنا جلد واپس چلنے پر رضامند نہ ہوا تو تنہا روانہ ہو گیا۔ اقبال بھی اپنی جگہ تنہا رہ گیا لیکن اسے اس کی چنداں فکر نہ تھی، وہ فطرتاً تنہائی پسند بھی تھا اور اس کی تلخیوں نے اس میں شدت پیدا کر کے بڑی حد تک اس کا عادی بھی بنا دیا تھا ——— اقبال نے ایک پاٹ شالہ کی بنیاد ڈالدی اور پہاڑی قوموں کی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اسی طرح اسی کی مشغولی کا بھی سامان ہو گیا۔ وہ اس میں بے حد دلچسپی لینے لگا اور تھوڑے ہی دنوں میں پہاڑیوں کو اپنی طرف مائل کرنے میں اسے کامیابی ہوتی نظر آنے لگی .....

اقبال تمام دن انہیں مشاغل میں بسر کرتا لیکن شب کی تنہائیاں اس کے دماغ کے لئے ایسے ہیجان کا سامان پیدا کر دیتیں، جن سے وہ تھوڑا پریشان ہو جاتا۔ اس کے لئے ماضی میں کوئی دلچسپی نہ تھی کہ انہیں خیالات سے چندے دل بہلا کر اتنا وقت کاٹ دیتا کہ پھر نیند اسے تمام افکار سے نجات دلا دیتی اور نہ مستقبل ہی سے وہ کوئی امید وابستہ کرنا چاہتا تھا۔ ایسی ہی گھڑیوں میں گھبرا کر وہ اکثر چاندنی شب میں جنگل کی سیر کو نکل جاتا یا پہاڑی کی کسی چٹان پر بیٹھ کر شب کی اولین چند ساعتیں بسر کر دیتا۔

سندر پہاڑی کے جنگل بہار کی شفاف چاندنی میں کچھ اتنا دلکش منظر انسانی نگاہوں کے سامنے پیش کرتے ہیں جن کا ایک بار تجربہ کرنے کے بعد مشکل ہی سے کوئی شخص دنیا اور اس کی رنگینیوں کی کوئی وقعت اپنے ذہن میں قایم کر سکے۔ وہاں کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں جو خودرو جھاڑیوں سے آراستہ نظر آتی ہیں، انسان کے قلب و دماغ میں ایسی آگ لگا دیتی ہیں کہ پھر وہ چاہتا ہے کہ انہیں میں گم ہو جائے۔ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر فضائے بسیط کا مطالعہ کتنا دلکش تجربہ ہے۔ چاند کا دریائے نیل میں تیرنا، ستاروں کی سبک رفتاری، ہوا کے تیز جھونکے اور ماحول کی لامحدودیت یہ سب چیزیں کچھ ایسی کیفیتیں انسانی ذہن و ادراک پر مسلط کر دیتی ہیں کہ اس میں گم ہو کر اسے دنیا کی ایک ایک چیز حرکت کرتی معلوم ہوتی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی قوت متخیلہ اتنی تیز ہو گئی ہے کہ وہ ہر حرکت کو محسوس کرنے لگی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اسے پر لگ گئے ہیں اور وہ فضا میں پرواز کر رہا ہے، اور یہ ساری حرکتیں حقیقتاً استعاری ہیں جو نتیجہ ہیں خود اسی کی حرکت و پرواز کا۔

چاندنی کی ایک ایسی ہی پرسکون اور خنک شب میں اقبال معمول کے مطابق ایک چٹان پر بیٹھا، فطرت کے مطالعہ میں مصروف تھا کہ ایک خاص طرح کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ یہ جنگل کے معمولی خروش یا محض ہوا کے تیز جھونکے کا نتیجہ نہ تھی، ایک بانسری کی آواز تھی جس نے اقبال کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ آواز اقبال کے لئے اس علاقہ میں بالکل نیا تجربہ تھا۔ یہ کسی جنگلی باشندے کی بانسری کی آواز نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا لحن اور اس کا تسلسل اس سے قطعی

علٰحدہ اور انوکھا تھا۔ اقبال اُٹھا اور اُسی طرف روانہ ہوا۔ پہلے وہ پہاڑی سے اتر کر جنگل کی طرف چلا۔ لیکن اسے فوراً ہی معلوم ہوا کہ آواز کی گورغ امد باز گشت نے اسے غلط راستہ پر لگا دیا ہے۔ اسے دوسری پہاڑی پر چڑھنا تھا۔ جوں جوں چڑھتا گیا آواز زیادہ صاف آنے لگی۔ اوپر پہنچ کر وہ مبہوت رہ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی مصروف نغمہ ہے جو تصویر سامنے تھی وہ ماحول کے اعتبار سے پرے تھی۔ ہم وقیاس سے، وہ کچھ ایسا محسوس کرنے لگا کہ نغمہ کی کوئی دیوی آسمان سے دنیا والوں کو لوری دینے کو اتر آئی ہے۔ اقبال دیر تک اپنے خیالات سے لطف اٹھاتا رہا۔ اور وہ بانسری سے کھیلتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بانسری بند کی اور ایک طرف خاموش روانہ ہو گئی۔

اقبال کی جولانگاہ بڑی حد تک اب محدود ہو گئی، اس پہاڑی تک۔ اس کے لئے اس نئی سیرگاہ میں بہت زیادہ دلچسپی تھی، وہ تقریباً روزانہ وہاں جاکر لطف میں بسر کر دیتا۔ بارہا اسکے دل نے تجسس حال کے لئے اکسایا بھی لیکن اس خوف سے مبادا اس دیوی کو اس کے وجود کا علم ہو جائے اور پھر وہ اس مسرت سے جو روزانہ اسے حاصل ہے محروم ہو جائے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

ایک روز اسی طرح اقبال اپنی جگہ بیٹھا تھا کہ وہ آئی اور بالکل اس کے مقابل میں ایک چٹان پر اپنی نشست قایم کی۔ اقبال پہلے تو کچھ گھبرا سا گیا، لیکن پھر اسے بالکل اتفاقی چیز سمجھ کر خاموش رہا۔ ابھی اقبال پوری طرح مطمئن نہیں ہونے پایا تھا کہ اس نے اقبال کو مخاطب کیا "آیئے اقبال صاحب آپ اتنی دُور کیوں کھڑے ہیں"

اقبال کے کان شکل ہی سے یقین کر سکے کہ حقیقتاً وہی اس کا مخاطب ہے۔ وہ سخت حیرت زدہ تھا کہ اس کا نام اسے کیونکر معلوم ہوا اور پھر اپنی اس حرکت پر کہ وہ روزانہ چھپ چھپ کر اسے اس طرح دیکھتا رہا ہے، کچھ ندامت سی محسوس کرنے لگا۔ بہرحال وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اس کے قریب جاکر بیٹھ گیا اور پھر بڑی ہمت کر کے اس نے پوچھا "آپکو میرا نام کس طرح معلوم ہو گیا؟"

"اس میں حیرت کی کیا چیز ہے اقبال صاحب" اس نے جواب دیا "جب اول اول آپ اس علاقہ میں تشریف لائے، اور یہاں کے لوگوں سے آپ نے ملنا جلنا شروع کیا، آپ کی شہرت میرے کانوں تک بھی پہنچی۔ اُسی وقت سے میں برابر تقریباً آپ کی ہر نقل و حرکت کا مطالعہ کرتی رہی ہوں۔ آپ جس روز سے اس جگہ آنے لگے اس سے بھی بے خبر نہیں۔ آپنے اپنے کو میری نگاہوں سے اوجھل رکھنے کی کوشش ضرور کی لیکن آپ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے، جی تو چاہا تھا کہ اُسی روز آپ کو مخاطب کروں، لیکن میں باز رہی اس خیال سے کہ ممکن ہے آپ کا ادھر آنکلنا بالکل اتفاقی امر ہو اور میری یہ جستجو آپ کو ناگوار گزرے۔ مگر آپ کا یہ سلسلہ قایم رہا اور بالآخر آج میں نے ارادہ کیا تھا کہ اس خموشی کو توڑ دونگی اور آپ سے پوچھونگی کہ آپ تو اس دنیا کے سننے والے ہیں جس کی رنگینیوں کے لطف سے آگاہ ہونے کے بعد انسان کسی دوسری طرف دھیان دینا کبھی گوارا نہیں کرتا۔ پھر آپ کے لئے اس جنگلی علاقہ میں کیا لطف ہے؟"

اقبال جب تک اس کا مطالعہ دُور سے کرتا رہا تھا اقبال کے تاثرات اس کے نغمہ تک محدود تھے۔ لیکن اب کہ اس کے چشم و ابرو کا سحر جلال، پیشانی درخشاں کا رنگ نور، اعضاء و جسم کا تناسب و موزونیت، کمر و سینہ کا نشیب و فراز، زلفوں کی انعیت اور زبان و طرز کلام کی شیرینی تقریباً عریاں ہو کر سب کی سب اس کے سامنے آگئیں تو اقبال بالکل مبہوت ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔ اس کا وجود اقبال کے لئے بالکل معمہ تھا۔ اس علاقہ میں کسی ایسی ہستی کا پایا جانا جو حسن صورت کے علاوہ تہذیب و سائستگی سے بھی بڑی حد تک آگاہ ہو قطعی محال تھا۔ وہ کبھی اس آب و گل کی پیداوار نہیں ہو سکتی ۔۔۔۔۔۔۔۔

اقبال کو ابھی ان خیالات سے فرصت نہیں ملی تھی کہ اس نے پھر سوال کیا

"کیوں اقبال صاحب! آپ بالکل خاموش کیوں ہو گئے۔ آپ کچھ کھوئے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں"

اقبال ۔ صحیح ہے، میں یقیناً کھو گیا تھا اپنے سلسلۂ خیال میں۔ یکا میری آنکھوں کے سامنے ایک ایسا منظر آگیا ہے کہ مشکل ہی سے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کا وجود میرے لئے ایک معمہ ہو کر رہ گیا ہے اور باور کیجئے اسے سلجھانے کی صلاحیت میرے دماغ میں موجود نہیں۔ خدا کے لئے مجھے بتائیے کہ آپ کون ہیں، آپکا نام کیا ہے اور آپ یہاں کیوں رہتی ہیں؟"

"میرا نام مس جیمس ہیروم ہے۔ میں یہیں کی رہنے والی ہوں۔ کہیں دوسری جگہ سے نہیں آئی۔ دیکھئے وہ جو سامنے پہاڑی ہے اُس کے دوسرے نشیب پر میرا جھونپڑا ہے جہاں میں تنہا رہتی رہتی ہوں۔ ہاں اقبال صاحب! آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا"

اقبال ۔ آپ کا سوال اتنا اچانک ہے کہ شاید میں اس وقت اس کے

جواب کے لئے تیار نہیں اور ہاں ....."

اقبال کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ مس ہمروم یہ کہتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی "آج بہت دیر ہو گئی پھر کبھی باتیں ہونگی۔"

آج اقبال روزانہ سے زیادہ پریشان تھا، مس ہمروم کی گفتگو نے اس کی حیرت میں چند در چند اضافہ کر دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر وہ اسی آب و گل کی پیداوار ہے (جس پر یقین کرنے کو اب بھی اس کا جی نہیں چاہتا تھا) تو اس میں یہ تہذیب و علم کہاں سے پیدا ہو گیا اور پھر فطرت کی یہ کیا تم ظریفی ہے کہ ایک ایسے شگفتہ پھول کو ایسی سرزمین میں پیدا کر دیا ہے جہاں نہ تو کسی کی نگاہیں اس کی رنگینیوں سے لطف حاصل کر سکتی ہیں اور نہ کسی کے مشام اس کی عطر بیزیوں سے سرمستی ——— شاید فطرت کو اپنے ہی قلب و جگر کی تسکین منظور ہو .....

دونوں روزانہ ملتے رہے اور بے تکلف بھی ہوتے گئے۔

اقبال نے بھی اپنے لئے ایک چھوٹا سا گھر اسی پہاڑی پر بنا لیا جس پر مس ہمروم کا تھا۔ اور فرصت کے بیشتر اوقات اس کی معیت میں بسر کرنے لگا۔ اس عرصہ میں اقبال کے بار بار کے استفسار پر مس ہمروم نے اسے بتا دیا کہ "میرا باپ ایک انگریز مسٹر جیمس ایک عیسائی مشن کا پادری تھا، جو مذہب کی تبلیغ کے لئے یہاں آیا تھا اور مستقل یہیں بود و باش اختیار کر لی۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب باہر کے کسی انسان کا یہاں گزر بڑی مشکل چیز تھی۔ اور آپ کو جو یہ چند عیسائی نظر آتے ہیں وہ اسی کی تبلیغ کا نتیجہ ہے اور تھوڑی بہت جو ان لوگوں میں آپ کو آدمیت دکھائی دیتی ہے وہ اسی کی تعلیم کا اثر ہے۔ میری ماں بھلی عیسائی تھی اس سے میرے باپ نے شادی بھی کر لی۔ میری ماں کو اس نے کافی تعلیم دی تھی۔ ایک روز جب میں ابھی چھوٹی تھی کسی ضرورت سے میرا باپ باہر گیا اور آج تک نہیں پلٹ سکا۔ میری ماں جوں توں دن کاٹتی رہی۔ دو گائیں تھیں جن پر ہم دونوں کا گزر تھا۔ یہاں تک کہ ایک سال ہوا میری ماں بھی مجھے تنہا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔ میں نے جو کچھ تعلیم حاصل کی وہ ماں سے یا پھر اس چھوٹی سی لائبریری سے جسے میرے والد اپنے ہمراہ لائے تھے اور اب وہی تنہا میری مونس ہے۔ آپ کی دنیا کا تھوڑا بہت علم تو بچپن میں والد سے ہوا یا پھر انہیں کتابوں سے، ورنہ وہ تو میرے لئے ماورائے سرحدِ ادراک کا حکم رکھتی ہے ..... کیسی رنگین دنیا میں آپ لوگ بسر کرتے ہیں اقبال صاحب! جہاں ہر وقت ایک جھنکار سی انسان محسوس کرتا ہوگا۔"

اقبال۔ میری دنیا رنگین ہے آپکو کیا معلوم مس ہمروم کہ اس پر کتنے مصنوعی رنگوں کے غلاف چڑھے ہوئے ہیں، اگر ایک بار اس کا اصلی خط و خال آپ کی نگاہوں کے سامنے آجائے تو پھر آپ کو ایسی نفرت ہو جائے کہ ادھر دھیان دینا بھی شاید آپ گوارا نہ کریں۔" اس کے بعد اقبال نے اسے بتایا کہ اسے خود اس کی دنیا اور اس کی سوسائٹی نے کس طرح تباہ کیا ہے اور اس کی سوسائٹی نے کیسے کیسے امتیازات رنگ و نسل، مذہب و ملت اور جاہ و ثروت کے قایم کر رکھے ہیں۔ اور کس کس طرح انسانیت کا خون وہاں بہایا جاتا ہے۔

اقبال یہ کہہ رہا تھا اور مس ہمروم گہری فکر میں مبتلا ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے چہرہ کا تغیر اتنا نمایاں تھا کہ اگر شب کی تاریکی حائل نہ ہوتی تو ممکن تھا اقبال بھی اس سے متاثر ہو کر اپنا موضوع بدل دیتا۔

(۳)

اب تک اقبال اور مس ہمروم جس طرح ملتے رہتے تھے اس میں وہی جذبہ کارفرما نظر آرہا تھا جو وطن سے بہت دُور دو ہمجنس یا ایک ہی تہذیب کے دو آشناؤں کے درمیان پیدا ہوتا ہے۔ ان میں ایک طرح کا خلوص بھی پایا جاتا ہے اور ایک دوسرے کے مددگار بھی رہتے ہیں۔ اقبال بھی مس ہمروم کے کاموں میں مدد دیتا اور مس ہمروم بھی اقبال کے مشاغل میں ہاتھ بٹانے لگی۔

اقبال کی گذشتہ زندگی کا تجربہ اتنا تلخ تھا کہ وہ ایک لمحہ کیلئے بھی کسی مسرت کا خواب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ صنفِ نازک کی طرف سے ایک ایسی حقارت و نفرت اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی کہ سمجھنے لگا تھا کہ اس طبقہ کی آفرینش سے فطرت کی غرض بجز تباہی و ہلاکت پھیلانے کے کوئی دوسری ہو ہی نہیں سکتی۔ اسے یقین تھا کہ اسے اگر یکطرفہ مجانا ہوتا تو خواہ مخواہ کی پیدائش کا کوئی دوسرا مفہوم ہی متعین نہیں ہوتا.....

..... لیکن اب کہ اس کے دماغ کو وزارتِ صحت ملی تھی اور زمانہ نے اسکے زخم میں اندمال پیدا کر نا شروع کر دیا تھا۔ اس کے سامنے اس کی تلخیاں تھیں لیکن وقت و زمانہ کا ایک حجاب ان پر پڑتا جا رہا تھا اور اب ان میں وہ شدت نہ تھی جو ابتدا ًاسے بہت زیادہ پریشان کئے ہوئے تھیں۔ حالات کی اس رو میں مس ہمروم کا وجود اس کے سامنے آیا اور وہ ایک بار پھر کچھ سوچنے لگا۔ اول اول اس نے زیادہ اہمیت نہیں دی، لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا اقبال کا یہ جذبہ ایک بار

پھر عود کرتا ہوا اسے معلوم ہوا۔ اور وہ صاف طور پر محسوس کرنے لگا کہ جب مس ہمروم اس کے سامنے ہوتی ہیں تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے اور وہ اس میں ایک خاص طرح کی لذت محسوس کرتا ہے اور جب وہ سامنے نہیں رہتیں تو اس کی آنکھیں بے اختیار راہ تکتی رہتی ہیں ——— اقبال بُری طرح محسوس کر رہا تھا کہ اس کے دل کو مس ہمروم سے ایک خاص وابستگی ہوتی جا رہی اول اول تو وہ اس خیال ہی سے کانپ گیا، لیکن آخر اپنے دل کی تسکین کے لئے اس طرح تاویلیں کرنے لگا کہ دنیا کے گرد و غبار کا اس گوشۂ فردوس میں کیا ذکر۔ یہاں وہ کون سی شے ہے جو اسے ایک حور کی آغوش سے محروم کر سکتی ہے ———

ایک روز صبح کے ایسے تڑکے میں جب آسمان پر ابھی کچھ کچھ ستارے باقی تھے اور فطرت کا وہ شوخ مخملیں فرش جو شاخوں اور کی آمد پر وہ کائنات پر بچھاتی ہے، ابھی تاریکی سے پوری طرح نمایاں نہیں ہو سکا تھا کہ مس ہمروم کی بانسری ہوا میں گونجنے لگی۔ اقبال کی آنکھ کھل گئی، کچھ دیر تک اپنے بستر ہی پر پڑا پڑا کروٹیں بدلتا رہا لیکن تیرو پیکان کی مسلسل بارش اس کی برداشت سے باہر کی چیز تھی وہ بے اختیار اپنی جائے پناہ سے نکل کر مس ہمروم کے پاس ہی آ کر بیٹھ گیا، مس ہمروم نے اسی طرح اپنا شغل جاری رکھا۔ اقبال بُری طرح متاثر ہو رہا تھا اور حد درجہ بیتاب، وہ بالکل خاموش سنتا رہا اور آنسو بہاتا رہا۔ اس کا ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا گویا سیلاب کے بند کو توڑ دینا تھا۔ لیکن انتہائی کوششوں کے باوجود بھی وہ ضبط پر قادر نہ رہ سکا اور بالآخر پھوٹ پڑا ----------

"یہ آپ کی کیا حالت ہے اقبال صاحب!" مس ہمروم نے پوچھا، "میں دیکھ رہی ہوں آپ چند دنوں سے بہت اداس رہنے لگے ہیں۔ شاید وطن یاد آ گیا ہے"

اقبال "ہاں یاد آ گیا ہے، لیکن اس طرح نہیں جس طرح آپ سمجھتی ہیں۔ میں خود نہیں کہہ سکتا یہ کیا انقلاب مجھ میں پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ باور کیجئے میری زندگی کا وہ دیرینہ باب جسے میں قلب کے کسی گوشہ میں دفن کر کے خاموش ہو چکا تھا ایک بار پھر جگا ہوں کے سامنے آ گیا ہے۔ مس ہمروم! میں نے ایک بار پھر قسمت کی بازی لگائی ہے۔ میں نے اپنی زندگی دنیا سے بالکل علیحدہ گذار دینے کا عہد کر لیا تھا لیکن فطرت نے مجھے اس عہد پر استوار نہیں رہنے دیا میرے قدموں کو لغزش ہو چکی ہے اور کوئی شے مجھے آپ کے قدموں میں گرنے سے روک نہیں سکتی مس ہمروم! میں کئی دنوں سے اپنے ان جذبات سے جنگ کرتا رہا ہوں۔ لیکن اب کہ زیادہ کا یارا نہیں، صاف صاف سن لیجئے کہ میں بُری طرح آپ کو چاہنے لگا ہوں ———

——— کیا خبر تھی ہر جگہ کا آسمان ایک ہی ہے اور فلک روزگار کی گردش ایک ہی طرح کار فرما"

مس ہمروم "میں بھی آپکی حالتوں کا اندازہ لگاتی رہی ہوں اقبال صاحب! میں نے آپ کا مطالعہ ابتدا سے کیا ہے، اور باور کیجئے بڑی حد تک آپ کے تاثرات سے واقف رہی ہوں۔ یہ کہنا شاید غلط ہو گا کہ میں خود ان سے متاثر نہیں ہوتی رہی۔ آج میں بھی کچھ چھپا نہیں رکھوں گی۔ اس سے انکار نہیں کہ میں اسی جنگل میں پل کر بڑی ہوئی۔ لیکن شاید کچھ خون کے ربط نے اور کچھ تعلیم نے بعض ایسی خصوصیتیں مجھ میں پیدا کر دی ہیں جن سے میری قوت ادراک احساس میں ایسی تیزی پیدا ہو گئی ہے۔ کہ میں خفیف سے خفیف دل کی دھڑکن کو بھی محسوس کر سکتی ہوں۔ اسی بنا پر میں اپنی زندگی میں ایک ایسے انقلاب کی آرزو کرنے لگی ہوں جو اس خشک اور یکساں طرز میں دلچسپی کا کوئی شائبہ پیدا کر سکے۔ یہ جنگل اور اس کی دلفریبیاں جن کا تذکرہ آپ نہ جانے کس کس جوش و ولولہ سے برابر کرتے رہے ہیں، میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی ہیں ان میں ایسی غیر دلچسپ یکسانی پاتی ہوں کہ میری بے تابیاں ان کے شبانہ یوم کے تجربہ کے بعد بھی کم نہیں ہوتیں۔ ہر طرف ایک سناٹا ہے اور ایسا بے معنی خلا جس میں تمام عمر پرواز کرنے کے بعد بھی سوائے تکان کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میں تشنہ تھی لیکن یہاں کی تمام جویباریں مجموعی طور پر بھی میرے کام و دہن کی سیرابی کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ یہ سکون مسلسل جسے آپ اپنے درد کی دوا بتاتے ہیں برابر میری بے چینیوں میں اضافہ کر نیکے بجائے کوئی کیفیت طمانیت کی پیدا نہیں کر سکا، میں سرگرداں تھی لیکن یہ معلوم نہ تھا کس کی جستجو میں ——— یہاں تک کہ میری نظر آپ پر پڑی اور آنکھوں نے ایک مبہم پیام دل کو پہنچایا۔ اور جوں جوں میں آپ کا مطالعہ زیادہ قریب سے کرتی گئی، میں یقینی طور پر یہ محسوس کرنے لگی کہ آپ جب پاس بیٹھے ہوتے ہیں میرے جذبات میں ایک ہیجان بپا ہو جاتا ہے، اور ایسا دل خوش کن ہیجان کہ دل چاہتا ہے کہ اس کا ثبات و قیام اپنے پس کی چیز ہوتی ——— جذبات کے اس رو میں میں بہتی چلی جا رہی تھی اور باور کیجئے میں اپنے کو طوفان کے حوالہ کر دینے کے

بعد بھی اس سے نجات کیلئے ہاتھ پاؤں مارنا گوارہ نہیں کر رہی تھی، واقعات میرے ساتھ اسی طرح گزر رہے تھے کہ آپ نے افسانہ چھیڑا اسی کے ساتھ مجھے علم ہو گیا کہ آپ کے طبقے نے کیسے کیسے امتیازات رنگ و نسل اور مذہب و ملت کے، اور کیسی کیسی تفریقیں دولت و ثروت کی نوع انسانی میں قایم کر رکھی ہیں ۔ اب میری مناکیوں کا اندازہ کیجئے اقبال صاحب! جب میں یہ سمجھنے پر مجبور کر دی گئی تھی کہ آپ بھی اسی طبقہ کے ایک فرد ہیں ——— بس ایک بار پھر تڑپنے لگی، بلکہ زیادہ شدت کے ساتھ ——— ——— اُف! توقع کی شکست کس قدر تلخ ہے!"

اقبال ۔ مس ہمروم! آپ جس درجہ ذہین ہیں میرے وہم و قیاس میں بھی نہ تھا ۔ میں نے اگر اپنا افسانہ آپ سے دہرایا تھا تو اس کے ساتھ ہی اپنے جذبات سے بھی آپ کو ناواقف نہیں رکھا تھا ۔ پھر ایک حصّہ پر یقین کرنا اور دوسرے کو نظر انداز کر جانا آپ ہی بتائیے کہاں کا انصاف ہے ۔ آپ دیکھ رہی ہیں کہ میری سوسائٹی سے مجھے کوئی واسطہ نہیں رہا ۔ پھر اس کے مکروہات سے مجھے ملوث کرنا آپ کیوں جائز قرار دیتی ہیں ۔ ممتاز کئی کئی بار آ آ کر مجھ سے واپس چلنے پر اصرار کرتے رہے ۔ لیکن میرے فیصلہ میں کوئی لغزش پیدا نہیں ہو سکی ۔ میرا اگر بس چلتا تو ساری دنیا میں آگ لگا دیتا کہ موجودہ تہذیب و معاشرت کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے اور پھر خاک کے اس ڈھیر پر ایک ایسی نئی دنیا کی بنیاد ڈالدیتا جس میں یہ رسمی امتیازات بار آور ہی نہ ہو سکیں ایک ایسی دنیا ہوتی جس میں صرف انسانیت ہی کو میزان تہذیب بتایا جاتا اور پھر انسان جنت کے خواب دیکھنا بھی فراموش کر جاتا ۔"

مس ہمروم ۔ سب کچھ صحیح ہے اقبال صاحب! اور میرے لئے جس قدر دلخوش کن ہیں یہ جذبات، لیکن ڈرتی ہوں کہ جس ماحول میں آپ پل کر بڑے ہے وہ یقینی آپ کی فطرت بن چکی ہوگی ۔ ابھی آپ کا زخم پوری طرح مندمل نہیں ہوا ہے ۔ لیکن زمانہ اپنے اصول کے مطابق آپ کے دماغ سے بھی اسے فراموش کر دیگا

اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہو گئی اور آپ کے وہ نقوش جو فی الحال غیر متشاعر حصّہ دماغ میں دب کر رہ گئے ہیں، اگر ایک بار پھر سطح پر اُبھر آئے تو آپ ہی بتائیے میں کیا کرونگی اقبال صاحب

اقبال ۔ مطمئن رہئے ممکن ہے مس ہمروم ۔ اب ان دیرینہ جذبات کو اتنی مدت ہو چکی ہے دفن ہوئے کہ اس کی شاید خاک بھی باقی نہیں اور اگر بفرض محال آپ کے توہمات نے کوئی شکل اختیار بھی کی تو باور کیجئے ایک آپ کے لئے میں ساری دنیا سے جنگ کروں گا ۔ میں دوسری دفعہ سوسائٹی کو ایسی آسانی سے چھوڑ نہیں سکتا ۔ میں اسے بھی تباہ کر کے رکھ دوں گا ۔"

اقبال کی گفتگو میں ایک ایسا خلوص اور استقلال عزم کی ایسی جھلک پائی جاتی تھی کہ مس ہمروم کا دل متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا وہ خود اقبال کی طرف سے ایک جذبۂ پذیرائی اپنے دل کے اندر پاتی تھی اور چاہتی تھی کہ ایسی ہی کوئی صورت پیدا ہو جائے، اسلئے وہ اور زیادہ بُری طرح متاثر ہو گئی ۔ اور بالآخر ایک بار اقبال کی آغوش میں گر کر اپنے کو اس کے حوالہ کر ہی دیا ۔

(۴)

اقبال اور مس ہمروم کے نکاح کو کئی ماہ گذر چکے ہیں، اور اب ان کی محبت کے طوفان میں ایک ایسا سکون پایا جاتا ہے جو بالکل فطرت ہے ۔ اس عرصہ میں کئی بار ممتاز آ آ کر اس سے مل گیا ۔ اس کی والدہ کی بے چینیوں کا حال بھی بیان کیا لیکن اقبال نے کچھ زیادہ اس طرف دھیان دینے کی ضرورت نہ سمجھی یہ بھی صحیح ہے کہ اقبال کو بعض اوقات والدہ کی جدائی کی ٹیس محسوس ہوئی، لیکن اس کی تلخیوں کی یاد نے اسے دبا دیا ۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال اسی طرح اور کتنی مدت گزار دیتا اگر ممتاز یکایک آ کر اس کی والدہ کی شدید علالت کے سبب زندگی سے مایوسی کی خبر اسے نہ دیدیتا ۔ اقبال گھبرا گیا اور اب اس کے دماغ کو کچھ اور سوچنے کی فرصت نہ تھی وہ چلنے کو تیار ہو گیا ۔ اقبال کی روانگی کی تیاریوں سے مس ہمروم بھی سخت متوحش ہوئی اور ہمراہ چلنے پر اصرار کرنے لگی ۔ اقبال نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن بے سود، وہ کسی طرح رضامند نہ ہوئی اور آخر کار تینوں کے تینوں روانہ ہوئے ۔

گھر پہنچ کر اقبال ماں کے سامنے پہنچا اور سلام کر کے پیٹی کے نیچے بیٹھ گیا ۔ ماں حد درجہ نحیف ہو گئی تھیں ۔ ماں نے آنکھیں کھولیں "آخر تم آئے بیٹا!" ماں نے کہا "اقبال! تم نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ ایسے وقت میں جب تم میرے محتاج تھے میں نے تمہیں نہیں چھوڑا تھا بیٹا! لیکن جب مجھے تمہاری خدمتوں کی ضرورت ہوئی، تم مجھ سے کنارہ کش ہو گئے ۔ سچ ہے میں اس پر

قادر نہ تھی اور نہیں اپنے فعل پر اختیار تھا - یہی فرق ہے اقبال! والدین اور اولاد میں" یہ کہتے کہتے ماں نے آنکھیں بند کرلیں اور آنکھ سے آنسو کے قطرے ٹپک ٹپک کر بستر میں جذب ہونے لگے - اقبال بھی بُری طرح متاثر ہو رہا تھا اور بچوں کی طرح بلبلانے لگا - ماں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں اور کچھ بولنا چاہتی تھی کہ مسز اقبال پر نظر پڑگئی، تھوڑی دیر کے لئے لب کھلے کے کھلے رہ گئے - اور چہرہ پر ایک خفیف سی سُرخی نمودار ہوئی - گرچہ وہ اتنی خفیف تھی کہ اگر اقبال کی ماں بہت صاف ناک کی عورت نہ ہوتیں تو شاید دوسروں کی نظریں اسے دیکھ بھی نہ سکتیں، لیکن پیشانی کی چین اور لبوں کا ارتعاش یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس کی کمی جذبات کے برانگیختگی کی صحیح آئینہ دار نہیں، بلکہ بیماری کے سبب خود خون کی کمی کا نتیجہ ہے - ورنہ وہ اپنے جذبات کے اعتبار سے ایک طوفان میں مبتلا ہیں -

" اقبال! یہ لڑکی کون ہے ؟" آواز میں خفیف سی تیزی اور لہجہ میں کافی خشونت تھی " ہاں سمجھی شاید یہی ہے وہ لڑکی جس نے تمہیں اپنی طرف مائل کر کے گھر بار سب سے علیحدہ کرادیا - تم اسے یہاں کیوں لائے - تم نے کیسے ہمت کی کہ ایک مرنے والی ماں کے سینہ پر جس نے تمہاری تمناؤں میں زندگی بسر کی ہو کودو دلو - ابھی میرے خون میں شرافت باقی ہے، میں ہرگز یہ گوارا نہیں کرسکتی کہ ایک غیر معلوم خاندان کی لڑکی ایک سید خاندان سے متعلق ہو کر اسے داغدار بنادے - تمہیں اپنی جوانی کے جھونک میں کچھ سوجھائی نہیں دیتا - جانتے ہو تم نے کتنا بڑا ظلم کیا ہے - کیا تم سمجھتے ہو تمہاری سوسائٹی اسے گوارا کرسکتی ہے؟ میں نے مانا تم سوسائٹی کی پرواہ نہیں کرتے، لیکن کبھی تم نے سوچا کہ تم دونوں کی زندگی صرف تمہارے ذاتی تعلقات پر ختم نہیں ہوجاتی اس سے آیندہ ایک نسل کی عزت وابستہ ہے - کیا تم نے خود اپنی ہونے والی اولاد کے ساتھ ظلم نہیں کیا ہے - اسے ذلیل سمجھا جائیگا اتنا ذلیل کہ وہ کسی سے آنکھ بھی برابر نہیں کرسکیں گی - سوچو اور جواب دو تم اسے گوارا کرسکتے ہو - حیرت ہے جس سوسائٹی کے ظلم کی شکایت تم کرتے ہو - اس سے تم نے یہ توقع کیسے قایم کرلی کہ تمہارا باپ وہ برداشت کرے گی" اقبال کی ماں کا دم پھولنے لگا " اقبال! خدا کے لئے اسے کہو کہ جلد یہاں سے چلی جائے ڈ..... نہ ہے ..... ری ..... رُو ..... رُح کو ..... بھی ..... ہے ..... ن ..... ن ..... ھی ..... ب ..... ن ..... ہیں .... لب ساکت ہوگئے، اور آنکھیں بند ہوگئیں - اقبال کو آنسوؤں سے جو ذرا فرصت ملی تو ماں رخصت ہوچکی تھیں -

اقبال سخت پریشان تھا، اتنا پریشان کہ جب اتنے تجہیز و تکفین سے اسے فرصت نہ ہوئی اسے مس ہیروم کا خیال بھی نہ آیا - جب فرصت ہوئی تو اسے معلوم ہوا کہ آمد کے چند ہی ساعت بعد مس ہیروم گھر سے باہر گئیں اور پھر پلٹی نہیں - اقبال بدحواس تھا لیکن پھر یہ سمجھ کر کہ وہ سندر پہاڑی کی طرف چلی گئی ہونگی اپنے قلب کی تسکین کرتا رہا اور انہیں خیالات میں بڑی مشکل سے سوم تک دو تین یوم بسر کئے - اس کے بعد وہ بھی اسی طرف روانہ ہوگیا -

اقبال نے سندر پہاڑی پہنچ کر جو کچھ دیکھا اس نے اس کی نظروں میں دنیا تاریک کردی - جھونپڑی کی جگہ محض خاک کا سیاہ ڈھیر تھا - دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ ہی روانگی کے بعد مس ہیروم کو وہاں کسی نے نہیں دیکھا - دو دن بعد کسی نے اس کی جھونپڑی میں آگ بھی لگا دی -

اقبال ایک طرف جنگل میں گھس کر غائب ہوگیا، اور پھر اس کا کہیں پتہ نہ تھا، یہاں تک کہ ایک دن اس کی لاش ایک پہاڑی کے دامن میں پڑی پائی گئی - سر اور سینہ زخموں سے چور تھے

اب اسے دنیا کے گرد و غبار سے نجات مل چکی تھی - ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں غالب

دماغی کمپنی اور دوسرے افسانے :— از الیاس اسلام پوری

کی چھپائی جولائی کا ندیم چھپنے کے بعد شروع ہوجائیگی اور پھر جلد سے جلد شایع ہوگی - ناظرین اپنے نام درج رجسٹر کرائیں -

تالی

از جناب کامریڈ انیس الرحمٰن صاحب

ہم تین بھائی بہن تھے۔ مجھ سے چھوٹی ایک بہن اور اُس سے چھوٹا بھائی۔ میں دس گیارہ سال کا تھا کہ ابا جان نے دنیا سے مُنہ موڑا۔ ابا جان کے مرنے کی عمر نہ تھی، اور تھے بھی اچھے خاصے ٹھاٹھے۔ لیکن موت کا کوئی کیا کرے بچ رہی تھیں دائم المرض اُمّی، سو وہ بھی ایک سال کے اندر ابا جان کے پائنتی میں جا لیٹیں ——— بچاری اِس پہاڑ سے صدمہ کو نہ سہہ سکیں۔ اب ہم تین رہ گئے۔ ننھی سی عمر تھی، کھیل کود میں ہم نے ابّا اور اُمّی کو بھلا دیا۔ ہم کھیلنے کودنے قبرستان میں بھی چلے جاتے۔ سعید سے پوچھتے "ابّا کہاں ہیں"، وہ کہتا "یہاں چھوٹے (سوئے) ہیں"۔ اور "اُمّی؟" ——— "اُمّی یہ ہیں"۔ ان کی قبر کو بتا کر کہتا۔ اِس پر ہم دونوں ہنس پڑتے اور سعید کو پیار کرنے لگتے۔ لیکن مُنّا کچھ مغموم سی ہو جاتی، اور سعید کو بہت سنجیدہ ہو کر ٹھارس دینے لگتی۔

میرے گھر سے ذرا ہٹ کر چھوٹے ابّا (والد کے چھوٹے بھائی) رہتے تھے۔ وہ ہماری یتیمی پر بہت روتے۔ وہ سدّو کو گود میں لیکر پوچھتے "ابّا کہاں ہیں؟" وہ کہتا "درگاہ میں چھوٹے ہیں"۔ چھوٹے ابّا کہتے "نہیں بیٹا! تمہارے ابّا تو ہم ہیں"۔ تب مُنّا کہتی "اور اُمّی؟" "اُمّی وہ بیٹھی ہیں" چھوٹی چچی کو بتلا کر کہتے۔ غرضکہ سدّو اور مُنّا کو ابّا بھی مل گئے۔ اور اُمّی بھی لیکن خورشیدی اور ممتی سے ان کی بڑی لڑائیاں ہوتیں۔ وہ کہتی "نہیں یہ تو میرے ابّا ہیں"، غرضکہ ۴۔ اور ۶ سال کے یہ دونوں فرشتے مزے میں بہل گئے۔

ایک دن پکڑ کر ان دونوں کا مدرسے میں نام لکھوا دیا۔ مدرسے جانے میں یہ روزانہ کسر کرنے لگے لیکن میں بھی بغیر انہیں روانہ کئے اسکول نہ جاتا۔ چند ہی دنوں میں اسکول میں جو دل لگ گیا، تو بس روزانہ اگر مجھ سے اسکول ہی کا تذکرہ ہے۔ کبھی مِس باجی، کی تعریف ہو رہی ہے۔ کبھی اسکول کا سکھایا ہوا گانا گایا جا رہا ہے۔ اور کبھی قواعد ہو رہی ہے۔ قابلیت اتنی آ گئی کہ اب مجھ ہی سے سوالات ہونے لگے ——— "اچھا بھائی جان! بتلاؤ دنیا کا سب سے بڑا دریا کون ہے؟" میں کہتا "بھائی میں نہیں جانتا"۔ دونوں زور سے قہقہہ لگا کر کہتے "اہا ہا مسی سیپی، مسی سیپی"۔ یہ دونوں یہ سمجھنے کہ ان کی مِس باجی سے زیادہ پڑھا لکھا آدمی دُنیا میں کوئی نہیں۔ میں بھی ہاں میں ہاں ملا دیتا میرا دل انہیں دونوں میں بہلتا۔ سدّو کی یہ عادت تھی کہ وہ اُچھلا اُچھلا کے چلتا اور تالیاں بجایا کرتا۔ اور مُنّا میں یہ خصوصیت تھی کہ وہ ہنستی بہت۔ ہر وقت کھل کھل کھل کھل ہو رہی ہے۔ سدّو کو ہر بات میں تالی بجانا ضروری تھا۔ اور مُنّا کو بلا وجہ بات بات پر ہنسنا لازمی تھا۔ اگر مرغی کا بچہ اپنی ماں کی پیٹھ پر بیٹھ جاتا، تو مُنّا کو ہنسی آتی، اگر کوئی ٹیڑھی ٹوپی پہن لیتا تو وہ ہنسی سے لوٹی جاتی، اگر کوئی تتلا کر بولتا تو جاؤ اُسے گدگدی لگ جاتی ——— بس ہر وقت کھل کھل۔ کھل کھل۔

(۲)

میرا مکان دریا کے کنارے تھا۔ مکان لق و دق تھا لیکن یہ بھی ان کے کھیلنے کے لئے کافی نہ تھا۔ یہ دونوں اکثر محلے کے بچوں کے ساتھ بغل کے میدان میں کھیلتے رہتے۔ میں اکثر اپنے کوٹھے کے برآمدے میں بیٹھا بیٹھا ان کا کھیل دیکھا کرتا۔ وہ کھیلتے کھیلتے کچھ دُور بھی نکل جاتے۔ لیکن پھر بھی مُنّا کی ہنسی اور سدّو کی تالیاں بہت نمایاں رہتیں۔ میں اسی سے سمجھ لیتا کہ یہ دونوں شیطان کہاں ہیں۔

ان کے کانوں سے تو میرے کان بھر گئے۔ کبھی فلموں کے گانے، کبھی ریکارڈ کی نقل ——— لیکن کسی گیت کے دو تین مصرعوں سے زیادہ نہیں۔ ان کے اسکول میں بھی طرح طرح کے بچوں کے گانے ہوتے تھے۔ یہ سب بچوں کی نظمیں سدّو اور مُنّا کو زبانی یاد ہوتیں۔ اور کھیل ہو رہا ہے، اور ساتھ ساتھ گانا بھی ———

یہ سب گانے بڑی اچھی دُھنوں میں ہوا کرتے اور پھر بچوں کی مہین سُریلی آوازیں۔ یہ باتیں میرے دل پر ایک عجیب و غریب کیفیت پیدا کر دیتیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ میں ایک

نہایت پاک اور روحانی دُنیا میں آ گیا ہوں، جہاں فرشتے مجھے گیت سُنا رہے ہیں، میرا گھر اور خاصکر میرا کمرہ ان معصوم نغموں سے گونجتا رہتا تھا اور پھر گانا ختم ہوا تو مُدّا کی کھل کھل اور سدّو کی تالیاں، رات کے مطالعے کے خیال سے میں انہیں اپنے ہی کمرے میں سُلاتا۔

(۳)

میں آئی۔ اے کے دوسرے سال میں تھا۔ مُدّا گیارہ برس کی ہو چکی تھی، اور سدّو نو برس کا۔ یہ دونوں بچے اب تقریباً میرے ہی ساتھ رہتے تھے۔ کھانا پینا بھی چھوٹے ابّا کے یہاں سے علیحدہ کر لیا تھا۔ ایک نوکر تو تھا ہی، بچّوں کی نگرانی کے لئے ایک دائی بھی رکھ لی۔ میں گیارہ سے چار بجے تک عموماً کالج میں ہوا کرتا۔ مُدّا اے گرلز اسکول میں بگھی گاڑی میں پڑھنے جایا کرتی، اور سدّو لڑکوں کے اسکول میں۔ ان دونوں کے معمولات میں کچھ زیادہ فرق نہ آیا تھا۔ مُدّا کے ہنسنے اور سدّو کی تالی میں بھی کوئی کمی نہ تھی۔ بلکہ اب تو مُدّا ہارمونیم بھی سیکھ رہی تھی۔ ہاں فرق صرف اتنا ہوا تھا کہ مُدّا کی طرح طرح کی فرمائشوں سے قافیہ تنگ تھا۔ اور سدّو کا سینما کا شوق روز افزوں ترقی پر تھا۔ عید کے دن مُدّا طرح طرح کے کپڑے پہن کر گویا "بیٹا" ہی بن جاتی۔ اسے دیکھ کر میں مخمور اور خوشی سے پھول جاتا ——— "میری بہن کیسی اچھی ہے ———" میں دل میں کہتا اور سدّو میاں تو سوٹ بوٹ بدل کر ایسے معلوم ہوتے کہ فرسٹ کلاس کے مسافر ہیں۔ کبھی دربڑ کے غبارے اڑائے جاتے، اور کبھی نقلی ہارمونیم بجایا جاتا ——— اور مجھ پر نظر پڑی اور بس "بھائی جان فلاں چیز دلوا دیجئے، فلاں چیز منگوا دیجئے" ——— یعنی بھائی جان کا زندگی میں سوائے اس کے اور کوئی کام ہی نہ رہ گیا تھا کہ وہ ان کی فرمائشیں پوری کرتے رہیں۔

ہماری اس چھوٹی سی زندگی میں بعض مسائل بھی آ جاتے ہیں۔ میمونہ اب سیانی ہو گئی تھی، اس کی شادی کرنا ضروری تھا، جوان بیٹی کو کب تک گھر میں بٹھائے رکھتے۔ اسلئے مُدّا کی فرمائش ہوئی کہ میں اُس کا دولہا تلاش کروں۔ بڑا مشکل سوال تھا۔ آپ سمجھے یہ میمونہ کون تھی؟ ——— مُدّا کی چہیتی گڑیا۔ لیکن سدّو نے اس معاملے میں میری بڑی مدد کی۔ اُس نے یہ تجویز پیش کی کہ میمونہ کی شادی اُس کے ماٹھ کے خرگوش سے کر دینی چاہئے۔ ہار مان کر مُدّا بھی اس پر راضی ہو گئی آخر اس طرح بیچاری میمونہ کا انجام ہوا۔ غرضکہ ان دونوں سے میرا گھر

(۴)

کھلا کھلا جاتا

برسات کا موسم تھا۔ ندی لبالب بھری ہوئی تھی۔ یہ وہی ندی تھی جس کی ریت پر کہیں میرا بچپن پڑا تھا۔ بالو پر ہم کبڈی کھیلا کرتے اور بالو کے چھوٹے چھوٹے محل بنایا کرتے، اور پھر کبھی ٹہلتے ٹہلتے دُور دیار کے کھیتوں میں نکل جایا کرتے۔ جب برسات کے موسم میں ندی اُمنڈ آتی تو ہم اس میں نہانے جایا کرتے۔ موٹر کے ٹائر لیکر تیرتے، کشتی اور گھڑی پر سیر کرتے۔ یہ ندی میرے لئے بڑی جاذبیت رکھتی تھی، اس سے میرا بچپن چمٹا ہوا تھا۔ میرا بچپن تو مُردہ ہو چکا تھا، لیکن ندی ابھی تک زندہ تھی۔ بائیس سال سے اس کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی بیچاری خشک ہو کر ریگستان ہو جاتی۔ کبھی اُمنڈ کر طوفان بن جاتی۔ غرضکہ اس کے دن بھی کبھی خوشحالی اور کبھی تنگی ترشی سے گذر رہے تھے۔

برسات میں ابّا جان اور سب ہی بزرگوں کے بچّوں کو سخت تاکید رہا کرتی کہ ندی میں نہانے نہ جایا کریں۔ لیکن کون مانتا ہے ——— موقع دیکھا اور نکل بھاگے گھاٹ پر۔

اتوار کا دن تھا۔ میں باہر سے تھکا ماندہ لوٹا۔ بائسکل گھر میں رکھی اور پکارا "دِلّو"۔ کوئی جواب نہ ملا۔ مُدّا اور سدّو بھی نہ تھے۔ لیکن سلائی کی مشین کھلی ہوئی تھی، اور کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ مُدّا ابھی یہاں سے کہیں گئی ہے۔ میں نیک کر چھوٹے ابّا کے یہاں چلا گیا۔ مُدّا وہیں تھی۔ میں نے پوچھا "دِلّو کہاں گیا ہے؟" تو بولی کہ بازار گیا ہے۔ اور "سدّو؟"

"سدّو ابھی تک نہیں آیا"، مُدّا بولی

"وہ کہاں گیا ہے؟"

"مجھ سے تو کہا دریا نہانے جا رہے ہیں"، محمودہ بولی

دریا نہانے کا لفظ سُنکر میرے اعصاب جھن سے رہ گئے۔ میں بولا "اور تم نے منع بھی نہ کیا"

"منع تو کیا، لیکن مانتا کون ہے۔ سُنگی لی اور یہ جا وہ جا"

"اُس وقت دِلّو کہاں تھا"

"وہ بازار گیا تھا"

(۵)

سدّو تین ہی بچے دریا نہانے گیا تھا، اور اب پانچ بج رہے تھے۔ دوڑا ہوا گھاٹ پر گیا۔ وہاں سناٹا تھا۔ کچھ لوگوں سے دریافت کیا کہ سدّو کو نہاتے دیکھا ہے۔ لیکن کچھ پتہ نہ ملا۔ آخر ایک پڑوسن کی

گوالن نے کہا کہ سدّو بابو کو میر صاحب کے لڑکے کے ساتھ نہاتے دیکھا تھا۔ میں بے تحاشا میر صاحب کے یہاں گیا۔ لطیف کو پکڑا اور اس سے پوچھا۔ اُس نے کہا "ہم پانچ لڑکے ایک ساتھ نہا رہے تھے۔ نہا دھو کر ہم سب گھر چلے آئے۔ لیکن یہ خیال نہیں آتا کہ سعید (سدّو ہمارے ساتھ دریا سے آئے یا نہیں"۔ بقیہ تینوں نے بھی یہی بیان دیا۔ بلا ایک نے تو قطعی طور پر کہدیا کہ سدّو ہم لوگوں کے ساتھ پانی سے نہیں نکلے۔ جوں جوں میں ان کے بیانات سنتا جاتا تھا، میرا دل بیٹھا جاتا تھا۔ شہر میں ہر طرف آدمی دوڑائے گئے پر اور اُس کے آس پاس ملاحوں سے جال ڈلوایا لیکن کہیں پتہ نہ ملا۔ اب اندھیرا ہوتا جاتا تھا ——— اور اس کے ساتھ ساتھ سدّو کی آس بھی ٹوٹتی جاتی تھی۔ مگر امید بھی بڑی سخت جان چیز ہوتی ہے۔ دس گیارہ بجے رات تک دل میں یہ خیال آتا رہا کہ شاید ٹہلتے پھرتے یا کسی کھیل تماشے کے پیچھے کہیں دُور نکل گیا ہو۔ لیکن جب بارہ کا گھنٹا پڑا، تو مجھے یقین ہو گیا کہ پیارے سدّو نے ہمیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ اب محسوس ہوا کہ میرے سارے جسم سے کسی نے جان نکال لی۔ میں ایک پلنگ پر گر پڑا اور ایک چادر تان کر دراز ہو گیا۔ سارا گھر عورتوں اور مردوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہر اِک دھاڑیں مار کر رو رہی تھی، اُسے غش پر غش آ رہے تھے۔

یہ خبر نہیں کہ رات کیسے کٹی۔ ہاں جب جب ذرا غنودگی آجاتی تو اماں جان کو دیکھتا کہ بال بکھرائے پریشان، آنکھیں سے دریا تک جاتے ہیں اور پھر واپس آتے ہیں۔ اُن کے ہاتھ میں کسی بچے کے پیر کا جُوتا ہے۔ جُوتہ کو دیکھتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں "یہ کہاں گیا"۔ صبح سے پھر تلاش جاری ہوئی، لیکن بے سُود۔ سدّو کی قبر پانی کے نیچے کب کی بن چکی تھی۔ آخر شام کے اخبار میں ایک بچے کی لاش پائے جانے کی خبر بھی درج تھی۔ حُلیہ سدّو سی کا تھا اب شک اور شبہہ کی کیا گنجائش رہ گئی تھی۔ اچھی طرح رو پیٹ لیا۔ دس برس کی کمائی چند منٹوں میں پانی میں مل گئی۔

(۶)

تین سے اب دو ہو گئے۔ سدّو کی جگہ ہر وقت خالی نظر آتی۔ لیکن میں مُنّا کے ڈر سے نہ روتا۔ وہ تو جھوٹی اماں اور بہنوں کے ساتھ رو دھو کے اپنے دل کا بھڑاس بھی نکال لیتی۔ لیکن اس ضبط کا اثر میرے دماغ پر بُری طرح پڑنے لگا۔ مُنّا بھی اکثر سُست رہنے لگی۔ میں نے سوچا اگر یہی لیل و نہار رہے تو یہ ننھی سی جان گھبرا کر مر ہی جائیگی

سدّو اب واپس نہیں آ سکتے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا ——— یہ سوچ کر اب میں نے اپنے پروگرام میں تبدیلی کی۔ دوست احباب سے ملنا جلنا شروع کیا، کلب بھی جانے لگا۔ اور گھر پر بھی دوستوں کو اکثر بُلانے لگا۔ مُنّا بیچاری کو سینما سے کچھ زیادہ شوق نہ تھا۔ لیکن میں ہی اُس کا شیطان بنا، اُسے سینما کا چسکا دلایا۔ اُس کے کپڑے، لیس اور شوق کی چیزوں کے لئے بھی ہر مہینے ایک رقم نکالنے لگا۔

میرا مکان لب دریا ہے۔ سامنے پختہ بندھا ہوا ہے۔ پُشتے کے اوپر کوٹھا ہے، جس میں دو کمرے ہیں۔ دریا گویا اس کے نیچے ہی سے بہتا ہے۔ مُنّا و مُنّا کی دائی اور میں برابر اسی میں سوتے تھے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا اور دریا خشک ہو چکا تھا، ایک دن ہم تینوں چھت پر سوئے ہوئے تھے۔ کسی ضرورت سے میں اُٹھا۔ ضرورت سے فراغت کر کے پھر پلنگ پر چلا آیا۔ دیر تک نیند نہ آئی۔ چاندنی رات تھی۔ رات سائیں سائیں کر رہی تھی۔ میں اپنے دل کی دھڑکن بھی صاف سن رہا تھا۔ اُسی وقت ایک عجیب و غریب آواز آئی۔

"ٹھک! ٹھک! ٹھک" ———

جیسے کوئی تالیاں بجا رہا ہو۔

میں پلنگ سے اُٹھ بیٹھا۔ پھر غور سے سُننے لگا ——

"ٹھک! ٹھک! ٹھک" ———

تالیوں کی آواز تھی اور بالکل اسی طرح، جس طرح سدّو بجایا کرتا تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ دُور تک نظر دوڑائی۔ ریت پر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ دریا کا ایک مہین سوتا کوٹھے کے نیچے سے بہ رہا تھا۔ نہ دریا میں کوئی دکھائی دیا اور نہ ریت پر۔ چاند کی روشنی میں جتنا منظر نظر آ سکتا تھا اتنی دُور میں کوئی بھی نہ تھا ——— "پھر آخر یہ تالیاں کون بجا رہا تھا" میں نے سوچا ——— خوف و دہشت کی ایک لہر میرے دل تک دوڑ گئی۔ دل میں ایک کپکپی سی معلوم ہونے لگی۔ میں پھر پلنگ پر لیٹ گیا۔

"ٹھک! ٹھک! ٹھک!" ———

پھر آواز آئی۔ یہ تیسری بار آواز آئی تھی۔ میں سہما ہوا دم بخود لیٹا تھا۔ آواز آتی ہی رہی۔ یہاں تک کہ بلوغ چھ منٹوں کے بعد یک لخت موقوف ہو گئی۔ میں نے اسی طرح دم بخود آنکھوں آنکھوں میں صبح کر دی۔

اب تو روزانہ رات کو یہ معمول سا ہو گیا کہ میں پلنگ پر گیا اور تالیوں کی آواز آنی شروع ..... ہوئی۔ اور تالیاں بالکل اُسی طرح جیسے

سدّو بجایا کرتا تھا۔ مصلحتاً مدّا کو اس کی خبر نہ کی اور اُسے چچی جان کے ہاں سونے کے لئے بھیجوایا کرتا اور اُس کی دلائی کو بھی ان کی جگہ ملازم کو اوپر سُلانے لگا۔ میں نے سوچا، یہ ممکن ہے میرا خیال ہو۔ میں نے چچا سے یہ حال کہا۔ وہ بھی کئی دن میرے کوٹھے پر آکر سوئے۔ پہلی رات جب میں نے اُنہیں یہ بتلایا تو انہوں نے کہدیا ــــ "میں تو نہیں سُنتا، یہ تمہارا محض خیال ہے۔" ــــ لیکن دوسری رات اُنہوں نے بھی یہ آواز صاف سُنی، اب شبہ کی کونسی گنجائش تھی ــــــــ

سدّو کی روح تالیاں بجاتی ہے" مجھے یہ یقین ہوگیا۔

تالیاں سُنتے ایک سال گذر گیا۔ رات کیا آتی تھی ایک بھیانک عذاب بن کر آتی تھی۔ ایک دن کا واقعہ ہے جب شام کو میں کالج سے واپس آیا تو مدّا کو بُری طرح قے اور دست ہو رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ کسی سودے والے سے ہرے چنے کی گھنگنی لیکر کھائی تھی۔ شہر کے ایک حصّے میں کولرا پھیلا ہوا تھا۔ جلدی سے ڈاکٹر کو بلالیا۔ ڈاکٹر نے کہا ــــ "کالرا ہوگیا ہے"

پیر تلے کی زمین کھسک گئی۔ صبح شام دونوں وقت ڈاکٹر کو لاکر دکھاتا تھا ــــ "میسرے دن ڈاکٹر نے کہدیا۔ "بچنے کی کوئی امید نہیں"

مدّا بھی مر گئیں۔ میں نے کہا "چلئے قصّہ تمام ہوا۔ اُس رات پڑے بھیانک بھیانک خواب نظر آئے۔ اب وہ گھر مجھے کاٹے کھاتا تھا۔

میں چند مہینوں کے لئے پہاڑ پر چلا گیا۔ اور پھر کچھ دن کے شہروں کا چکر لگاتا رہا۔ تقریباً ایک سال کے بعد اسی مکان میں آیا پہلی ہی رات سے پھر وہی تالیوں کی آواز آنے لگی ــــ لیکن اب صرف تالیوں ہی کی آواز نہ تھی ــــ بلکہ اس کے ساتھ ہنسی بھی بالکل اُسی طرح جیسے مدّا قہقہے لگایا کرتی تھی ــــــــ "تالیاں" اور "کھل کھل"

آپ کو اعلےٰ اور لذیذ قسم کا کھانا کہاں ملے گا؟

مسلم لیگ ہوٹل کو نہ بھولئے!

خالص گھی جس پر کھانے کی اچھائی کا دارومدار ہے صرف آپ اسی ہوٹل میں پائیں گے، علاوہ موجودہ کساد بازاری کا خیال کرتے ہوئے

قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

تاکہ ہر طبقہ کے لوگ اچھا سے اچھا کھانا کھائیں۔ ایک بار تشریف لاکر ہماری صداقت کا امتحان کیجئے

مسلم لیگ ہوٹل اسماعیل مدن لین (ذکریا اسٹریٹ) کلکتہ ۷۳ { بڑا بازار فون ۹۲۴

کامریڈ

از جناب خواجہ عنایت اللہ صاحب گیا،

رجو کے باپ سے ایک بھول ہوئی تھی، جس کا خمیازہ وہ اپنی ضعیفی تک بھگتتا رہا۔ اور صرف اسی ایک بھول نے اس کو جیتے سے مرنے بھی نہ دیا۔ اس کی بھول کوئی بہت بڑا اخلاقی گناہ نہ تھی، بلکہ ایک سماجی غلطی تھی۔ یعنی اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی پر برادری میں اپنی ناک اونچی رکھنے کے لئے اپنی زمین پر کچھ روپے آیندہ فصل کی امید پر قرض لے لئے تھے، اور چونکہ چار مہینے میں تو روپیہ ادا ہی کر دینا تھا اسلئے سُود کی زیادتی کا بھی کوئی خیال نہ کیا۔ شادی تو خوب دھوم دھام سے ہوگئی، باجے بجے۔ آتشبازی چھوٹی، اور رجو کو ایک بہت خوبصورت بیوی بھی مل گئی، مگر نئی فصل کے پیدا ہونے کے پہلے ہی غلّہ کا بھاؤ اتنا گر گیا کہ ہر کاشتکار کی آمدنی نصف سے بھی کم رہ گئی۔

سرکاری مالگذاری وہی رہی۔ چوکیداری ٹیکس میں کوئی کمی نہ ہوئی اور گھر کا خرچ نئی نویلی بہو کے آجانے سے بہت بڑھ گیا۔ اور آمدنی کا صرف ایک ہی ذریعہ یعنی غلے کی بکری، وہ نصف ہوگئی۔ قرض تو کیا ادا ہوتا، سُود کا بھی کچھ حصّہ باقی ہی رہ گیا۔ غرض اسی طرح ہر سال فصل پکنے پر ہوتی تو نو دن والا مہاجن کھلیان ہی میں پہنچ جایا کرتا، اور سب کچھ بیچانے پر بھی اپنا بقایا بڑھا کر دونوں باپ بیٹوں سے انگوٹھے کا نشان لگا کر لیجاتا۔

رجو کا وہ گھرانا جو اس کی شادی کے پہلے فراغت سے کھاتا پیتا تھا، بلکہ ضرورت کے وقت اپنے غریب ہمسایوں اور رشتہ داروں کی بھی گاہے بگاہے مدد کر دیا کرتا تھا۔ اب سخت تنگی سے گیہوں اور چاول کھا کر نہیں بلکہ ستو اور کھساری وغیرہ سے اپنی بسر اوقات کرنے لگا۔ رجو جوان تھا، اس کا باپ گرچہ بتقاضائے عمر اور خاص اس رنج سے بوڑھا ہو چکا تھا مگر پھر بھی محنت کرنے میں رات کو رات اور دن کو دن نہ سمجھتا مگر قرض کی رقم سُود در سُود سے بڑھتی ہی گئی۔ اور آخر اس غم نے بوڑھے کسان کی کمر توڑ دی۔ اور ایک دن موت کے فرشتے نے اس کو سُود کے اس چکر سے نجات دلائی۔

باپ کی موت نے نوجوان محنتی اور جفاکش رجو کو ظالم مہاجن کے ہاتھوں میں اکیلا چھوڑ دیا۔ اس نے مہاجن کو اپنی نصف یا اس سے بھی زیادہ زمین دیکر اس کا حساب بیباق کر کے اپنا پیچھا چھڑانا چاہا، مگر مہاجن جونک کی طرح اُس کا خون چوس رہا تھا اور پہلے ہی دن سے پوری جائداد پر دانت لگائے بیٹھا تھا اور اسی نیت سے وصولی میں بھی نرمی کیا کرتا تھا کب ماننے والا تھا۔ بلّی کے بھاگوں چھیکا ٹوٹا۔ رجو کو تو اُس نے گول مول جواب دیکر ٹال دیا اور اپنی رقم کی وصولی کے لئے قانونی چارہ جوئی شروع کر دی۔

رجو کے پاس عدالت سے سمن آگیا، وہ مقررہ تاریخ پر بیس میل پیدل چلکر شہر پہونچا۔ لوگوں نے وکیل رکھ کر مقدمہ لڑنے کا مشورہ دیا، مگر رجو کے پاس فیس دینے یا پیشکار کو پیشی ادا کرنے کی ہمت کہاں تھی، کئی پیشیوں میں عدالت کے انصاف کی موہوم امید پر ٹھوکریں کھانے کے بعد آخر حشر وہی ہوا جو عدالتوں میں امیروں کے مقابلے میں غریبوں کا ہوا کرتا ہے، یعنی رجو پر پندرہ سو کی ڈگری ہوگئی، اور ڈگری کے چند ماہ بعد ہی رجو کے سب کھیت مع اُس سال کی پیداوار کے مہاجن نے ہڑپ کر لئے۔

رجو، اُس کی بیوی رسوتن اور تین ماہ کا ایک بچہ دنیا میں مفلس تو پہلے ہی تھے، اب بے سہارا ہوگئے۔ صرف دو تین دبلے پتلے بیل رجو کی طرح بھوک کے مارے ہوئے، ہل گھر پہ اور کدال وغیرہ ان کی زندگی کا سہارا باقی رہ گئے۔ مگر رجو نے مصیبت کے اس پہاڑ کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکے، اُس کا بہادر دل مایوس نہ ہوا۔ وہ اپنی بیوی اور تین ماہ کے بچے جگر کی پرورش کے لئے ہر مشکل سے مشکل کام کرنے کو تیار ہوگیا۔ اور اُسی مہاجن سے دو بگہہ زمین سالانہ مالگذاری مقرر کر کے جوتنے لگا۔ غریب رسولن نے بھی اپنے فرض کو پہچانا، اور بچے کو گود میں لیکر اپنے محنتی شوہر کا ہاتھ بٹانے لگی، جیٹھ بیساکھ کی جھلسانے والی لُو۔ ساون بھادوں کی موسلا دھار بارشیں، اور پوس ماگھ کی کپکپا دینے والی سرد ہوائیں ان بہادروں کی محنت اور مزدوری میں کوئی خلل نہ ڈال سکتیں، جب رجو کدال چلاتا ہوتا تو رسولن پانی باندھتی ہوئی نظر آتی۔ جب رجو ہل چلاتا ہوتا، رسولن بیلوں کے لئے چارہ کاٹتے

میں مشغول پائی جاتی۔ غرض دونوں میاں بیوی اپنا اور اپنے ننھے بچے کا پیٹ بھرنے اور تن ڈھانکنے کے لئے اپنا اپنا خون پسینہ ایک کر دیتے مگر سال کے آخر میں زمین کے مالک کو مالگذاری دینے کے بعد ان کے حصہ میں سوائے صبر کے اور کچھ نہ آتا۔ کھر کا اناج تو مالگذاری ادا کرنے کے لئے بک جاتا، اور دودھ گھی، ترکاری وغیرہ مالک کے علے نام نہاد قیمت دیکر چھین لے جاتے، اور اس طرح پسینہ بہا کر ساری چیزوں کو پیدا کرنے والے یہ غریب دنیا کی ہر نعمت سے محروم کے محروم ہی رہ جاتے۔

تین سال اس طرح بھی کٹ گئے۔ اور شاید ساری عمر اسی طرح کٹ جاتی مگر اُن کے بوڑھے سُود خوار مالک کی موت نے اُس کے عیاش نوجوان بیٹے کو اُن کا مالک بنا دیا۔ اور ایک دن جب کہ وہ نوجوان مالک اپنے چند عیاش دوستوں کے ساتھ شکار کے بہانے اپنی زمینداری کا دورہ کر رہا تھا اُس کی نظروں نے ایک شب کے لئے رسوکن کا انتخاب کر لیا، اور غریب مگر عصمت مآب رسوکن کے انکار کا نتیجہ بہت جلد مالگذاری کے بقایا کی نالش میں نکلا۔ پہلے مقدمہ کی طرح اس کا بھی حشر مالک کے موافق اور رجو کے مخالف ہوا، کیونکہ عدالت کے انصاف ..... کی قیمت ادا کرنا رجو کی استطاعت سے باہر تھا۔ اور رجو کا رہنے والا مکان بیل اور گائے وغیرہ اس ڈگری یا رسوکن کی عصمت کی بھینٹ چڑھ گئے۔

رجو اور اس کی بیوی اپنے تین سال کے بچے کو لیکر ایک لوٹا، ایک ٹوٹی ہوئی تھالی اور چار سیر ستو باندھ کر اپنے گاؤں اور ساتھیوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے شہر کو چل دئے۔

(۲)

شہر کے ایک گنجان محلہ میں ایک پتلی سی تین فٹ چوڑی گلی ہے، گلی کے دونوں طرف دو منزلہ اور سہ منزلہ عالیشان عمارتیں ہیں دونوں طرف کی عمارتوں کے پاخانے اسی گلی کے راستے صاف کئے جاتے ہیں، کسی مکان کا بھی صدر دروازہ اس گلی میں نہیں کھلتا۔ اور چونکہ کبھی کسی بڑے آدمی کو اس طرف آنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی، اسلئے اس گلی کی نالیوں پر جن میں غلاظت بہتی رہتی ہے اور طرح طرح کے گندے کپڑے رینگتے رہتے ہیں، میونسپلٹی کے جمعدار یا اور اہلکاروں نے کبھی کوئی توجہ نہیں کی۔ قطب شمالی یا قطب جنوبی میں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات رہتی ہے۔ مگر اس گلی کی زمین نے سالہا سال سے سورج کی ایک شعاع بھی نہیں دیکھی۔ اسی گلی میں ایک عالیشان محل کی سنڈاس کے نزدیک ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں رجو اُس کی بیوی اور اُن کا تین برس کا بچہ اپنی زندگی کی سانسیں پوری کر رہے ہیں۔ رجو توصبح سویرے ہی مزدوری کی غرض سے باہر نکل جاتا ہے سورج ڈوبنے کے بہت دیر بعد واپس لوٹتا۔ اُس کو کیا معلوم کہ اُس صابر عورت اور بچے کا دن اُس آٹھ فٹ کی اندھیری چار دیواری میں کس طرح کٹتا ہے۔ وہ صرف اسی پر مطمئن ہے کہ اُس کے بازوؤں میں ابھی اتنی طاقت موجود ہے کہ وہ ہر روز کی محنت محنت کے بعد دونوں کے پیٹ بھرنے کا سامان بہم پہونچا سکتا ہے۔

پرندوں کی طرح کھلی فضا میں رہنے والوں نے اس قبر نما تاریک کوٹھڑی میں گرمیوں کا زمانہ تو کاٹ ہی لیا، مگر جاڑے کی آمد نے اُن کا جینا محال کر دیا۔ دور اندیش رجو اور کفایت شعار رسوکن نے گرمیوں کے زمانہ میں بہتیری کوششیں کیں کہ آنے والی سردی سے بچنے کے لئے کوئی کپڑا اپنانے کا سامان ہو سکے، مگر پانچ آنہ روز میں وہ بھی آٹھ دس ناغہ کے ساتھ کس طرح ممکن ہو سکتا تھا، اور جب کبھی رسوکن نے جاڑے کے خوفناک خیال سے اپنا پیٹ کاٹ کر کچھ جمع بھی کیا تو گھر کی گندی فضا نے بچے کو بیمار کر دیا اور خیراتی ہسپتال کے ہوتے ہوئے بھی وہ اندوختہ ختم ہو گیا۔

غرض قدرت کا اٹل قانون اپنے راستہ پر چلتا رہا، اور بدن کو جھلسا دینے والی گرم لُو کی بجائے رگوں میں پیوست ہو جانے والی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں، امیروں نے تہ خانے چھوڑ کر گرم حماموں کی آرائش کر لی، خس کی ٹٹیاں اور بجلی کے پنکھے اتار کر الاؤ اور آتشدان اور انگیٹھیاں سُلگا لیں۔ مسوری اور نینی تال کی سیر گاہوں سے واپس آکر بند اور گرم کمروں میں تاش اور شطرنج کے شغلوں میں مشغول ہو گئے ململ اور تن زیب کے کپڑے اوتار کر مخملی گدیوں اور ریشمی لحافوں میں منہ چھپا لئے، مگر غریب رجو اُس کی بیوی رسوکن اور تین برس کا معصوم بچہ اُسی کوٹھڑی میں اپنے جسم کی قدرتی گرمی کو برقرار رکھنے کے لئے ایک دوسرے کے بدن سے مدد لیکر دن کاٹنے لگے۔ جاڑے کی ان منحوس راتوں کو جب کہ اُس شہر کے سیکڑوں امیروں کے کتے بھی سردی سے بچائے جا رہے ہیں، یہ تین نفوس نہیں بلکہ ایسے ہزاروں اشرف المخلوقات پھٹی پرانی سیکڑوں چیتھڑوں والی گندی گدڑیوں میں اپنے جسموں کو سکیڑے دن بھر کی محنت سے چور ہونے کے باوجود بھی نیند کو ترس رہے ہیں۔

دن چھوٹے ہو گئے، اس لئے رجو اب پیٹ پالنے کے لئے کما بھی نہیں سکتا، آخر ایک روز ماں نے بچے کی بھوک اور سردی میں غیر معمولی بے چینی کو برداشت کر کے خود بھی مزدوری کرنے کی ٹھان لی، غیور رجو بھی مجبور تھا، اُس نے اجازت دے دی اور چند روز کی تلاش میں رسوکن کو ایک پولیس آفیسر کے گھر میں نوکری مل گئی۔

اب کچھ اطمینان سے کٹنے لگی۔ کیونکہ اپنا اور اپنے بچے کے لئے کھانا تو رسوکن کو وہاں سے مل جاتا اور جو پیسے رجو کماتا اُس میں ایک دو پیسے کے سنتوکھا کر باقی سے کچھ کپڑے وغیرہ کا بھی سامان ہونے لگا۔

شاید دنیا میں غربت سے بڑھکر کوئی اور بڑا گناہ نہیں۔ ان لوگوں نے ابھی ٹھیک سے اطمینان کی سانس بھی نہ لی تھی کہ امارت کے حریص دیو نے ایک اور وار کیا۔ ان کی جائداد۔ صحت اور محنت کا پھل تو وہ پہلے ہی ہضم کر چکا تھا، اب ان کی غیرت، عصمت اور عزت کو تاکا۔

رسوکن غربت کے باوجود بھی حسین تھی، اُس کو چند روز پیٹ بھر کھانا اور کھلی فضا میں رہنے کا موقع ملا تو اُس کا چہرہ پھر نکھر آیا۔ بس پھر کیا تھا امیر تو غریب کی ہر چیز پر اپنا جائز حق سمجھتا ہے، غریبوں کی دولت امیروں کے خزانے بڑھانے کے لئے۔ غریب کی محنت امیروں کے آرام کے لئے۔ حتیٰ کہ غریب کی عصمت امیروں کی عیاشی کے لئے وقف ہوتی ہے۔

رسوکن جس کا سب کچھ امیروں کے ظلم پر بھینٹ چڑھ چکا تھا، غریب تو ضرور ہو چکی تھی مگر اُس نے بھی ایک شریف کسان کے گھر جنم لیا تھا۔ اُس کی رگوں میں بھی مالک کی بہو بیٹیوں کی طرح شرافت کا خون موجزن تھا، اُس کو معلوم تھا کہ گئی ہوئی سب چیزیں واپس آسکتی ہیں، اور اگر نہیں واپس آسکتی تو عصمت۔ یہی وہ شیشہ ہے جس پر بال آنے سے عورت اپنی نسوانیت کھو دیتی ہے۔ اسلئے اُس نے اپنے نئے مالک کی اس خواہش کے آگے سر تسلیم خم کرنے سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ نوکری چھوڑ دی۔ امیر اور وہ بھی پولیس افسر اپنی خواہش کا خون ہوتا دیکھے اور وہ بھی ایک غریب کے ہاتھوں پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اُس کا بہادر خون کھولنے نہ لگے، اس کے اقتدار کو ٹھیس نہ لگے اور اُس کے انتقام کی آگ اپنے حریف کو جلا نہ دے۔

شہر میں چوری کی ایک واردات ہوئی، اور رجو گرفتار ہو گیا۔

دیوانی عدالتوں کے انصاف کا تو اُس کو کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ مگر اس مرتبہ فوجداری عدالت بھی اُس کے لئے کچھ نہ کر سکی۔ اور کرتی بھی تو کیونکر، نہ رجو کے پاس وکیل، نہ کوئی صفائی کا گواہ۔ استغاثے کی طرف سے اُس کے خلاف مضبوط شہادتیں۔ چال چلن مشکوک، اور سب سے بڑی بات غربت اور بیکاری، چوری کرنے کے کافی وجوہ۔ رجو کو چھ ماہ کی سزا ہو گئی۔

فیصلہ کے دن اپنے بچے کو لیکر رسوکن عدالت کے دروازہ پر کھڑی قسمت کو رو رہی تھی۔ رجو نے پولیس کی حراست میں اُس کے پاس سے گذرتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا اور اپنے بچے کو پیار کرنے کے لئے ایک لمحہ رکنا چاہا۔ مگر دنیاوی قانون کے محافظوں نے قانون محبت کو ایک ٹھوکر سے توڑ دیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور اپنے ناسمجھ معصوم بچے کی اپنی طرف محبت کے ہاتھ پھیلائے ہوئے بڑھتا دیکھ کر بھی آگے بڑھنے پر مجبور ہو گیا۔ ناسمجھ بچہ رونے لگا۔ روتی ہوئی ماں نے اُس کو چھاتی سے لگا لیا۔ دیکھنے والوں کو بھی ترس آگیا۔ باپ کے قدم رک گئے۔ مگر سپاہیوں کے دلوں کو جنبش نہ ہوئی۔ اور ہوتی بھی تو کیسے ہوتی جبکہ اس غریب قیدی کے اور اُس کی بیوی کے نہ تو کپڑے سفید تھے، اور نہ ہی اُن کی جیبیں بھاری تھیں۔ رسوکن کو یقین تھا کہ رجو بے گناہ ہے۔ اُس نے چوری نہیں کی اور وہ بھوک سے مر جانے پر بھی چوری نہیں کر سکتا، اس لئے وہ خوش تھی۔ اس نے اپنی عصمت کو بچانے کے لئے پہلے اپنا گھر قربان کیا تھا۔ اب اپنے شوہر کی زندگی کا ایک چھوٹا سا حصہ قربان کر رہی تھی۔

رسوکن اپنے بچے کو چھاتی سے لگائے گھر واپس آئی۔ اُس نے کمر ہمت باندھ کر آسمان کی ہر گردش کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ وہ کئی دن تک دربدر ماری پھری۔ مگر کہیں نوکری نہ پا سکی۔ جہاں جاتی ایک چور کی بیوی اور وارونہ صاحب کی چوٹی دائی کہہ کر دھتکار دی جاتی۔ اُس نے مکان بنانے والے مزدوروں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہا مگر بچے والی عورت ہونے کی وجہ سے وہاں بھی اُس کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس بیکاری اور بھوک کی مصیبت پر ایک اور ستم ٹوٹ پڑا یعنی غذا کی کمی اور ناکافی کپڑے ہونے کی وجہ سے اُس کا لڑکا بیمار ہو گیا۔ گھنٹوں خیراتی ہسپتال کے دروازہ پر بیٹھے رہنے کے بعد اُس کو دوائی تو ملتی مگر ہمدردی کا ایک لفظ بھی نہ ملتا۔ موسم سرما کا شباب، علاج کی بے پروائی۔ خوراک کی کمی، اور ٹھنڈا مکان، نتیجہ یہ نکلا کہ بچے کو نمونیا

ہوگیا۔ اور حالت روز بروز خراب ہونے لگی۔ سرکاری ہسپتال کے عملے کی سرد مہری نے ماں کی مامتا کو دوسرے ڈاکٹروں کی طرف متوجہ کرنے پر مجبور کیا۔ مگر اس دروازہ کو کھولنے کے لئے توزر کی کنجی چاہیئے۔ ڈاکٹر کی فیس، دوائی کی قیمت، اینٹی فلوجسٹین

(——————) کے ڈبے بچاری رسولن کہاں سے لاتی۔ ایک ماں کا اکلوتا بیٹا، اس کی امیدوں کا سہارا، آنکھوں کا نور اور دل کی ٹھنڈک نمونیہ جیسے مہلک مرض میں اپنی آخری سانس گن رہا ہے۔ ماں کی مامتا اپنے خون کا آخری قطرہ دیکر بھی اس کی جان بچانے کو تیار ہے، مگر مفلسی اور غربت اس کے کسی ارادہ کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچنے دیتی۔ چاروں طرف سے مایوس ہوکر اس نے شہر کے قوی اداروں کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیڈروں کے سامنے اپنا دکھڑا رویا۔ مولویوں اور پیروں کی خوشامدیں کیں، مگر ان قوم کے درد سے گھل گھل کر مرنے والوں اور جنت دوزخ کے اجارہ داروں کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ مایوسی میں روشنی کی ایک کرن اسے نظر آئی۔ تقریباً ایک ماہ اس نے ایک پولیس افسر کے گھر نوکری کی تھی، جس کی شیطانی خواہش کے خوف سے پھر وہ کبھی اس کے گھر اپنی تنخواہ بھی مانگنے نہ گئی تھی، آج وہ اپنے بیٹے کے لئے سب کچھ بھول گئی۔ اور اس نیت سے اس کے گھر پہنچی کہ اپنی تنخواہ کا بقایا قریباً دو روپیہ مانگ کر اپنے بچے کا علاج کرے۔ اس کو دیکھتے ہی پولیس افسر فاتحانہ ہنسی ہنستے ہوئے بولا

"کہو رسولن آج کدھر راستہ بھول گئیں"۔

رسولن (آنکھوں میں آنسو بھر کر) "سرکار میرا بچہ سخت بیمار ہے۔ اس کا باپ جیل میں ہے۔ میرے پاس علاج کے لئے ایک پیسہ نہیں۔ میں آپ سے اپنی تنخواہ نہیں بلکہ بھیک مانگنے آئی ہوں۔ خدا کے واسطے میری میرے بچے کی جان بچانے میں مدد کیجئے۔ مجھ پر نہیں تو اس معصوم بچے پر رحم کیجئے"۔

پولیس افیسر "تو پاگل ہے۔ یہ سب مصیبتیں تیری اپنی بلائی ہوئی ہیں۔ ورنہ آج تو اس طرح در بدر کی ٹھوکریں نہ کھاتی ہوتی۔ اور اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ ون کا بھولا شام کو گھر واپس آ گیا ہے۔ اوئے اسی طرح رہو۔ بہت سے ڈاکٹر ہمارے دوست ہیں۔ تمہارا لڑکا بہت جلد اچھا ہوجائے گا۔ مگر....."

اس نے شیطانی جذبے سے مغلوب ہوکر رسولن کا ہاتھ پکڑ لیا۔

عصمت کے خیال اور ماں کی مامتا میں جنگ ہونے لگی۔ شیطان نے ملک الموت کی شکل میں اس کے لخت جگر کی جان کا لینے کا بھیانک تصور آنکھوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ شدت مرض سے کراہتے اور بھوک سے بلبلاتے ہوئے بیٹے کی تصویر مدد کے لئے رونی ہوئی سامنے آگئی۔ نیکی کے فرشتے نے شوہر کی امانت اور بزرگوں کی عزت کا دھیان دلوایا۔ مگر آہ غریب عورت کی مامتا کے چرنوں پر اس کی عصمت بھی بھینٹ چڑھا دی گئی، اور اپنی نسوانیت کی قیمت لیکر اپنے بچے کو موت کے پنجے سے چھڑانے دوڑی۔

مرض آخری درجہ پر پہنچ چکا تھا۔ مرض موت میں اسکی ماں کی عصمت کے آبدار موتی بھی اس کو حل کر کے بلائے گئے۔ مگر ماں کی سب سے بڑی قربانی بھی بیٹا کو زندہ نہ رکھ سکی۔ غریب رسولن شاباشی اور ظلم سہنے کی ہمت کرتی۔ مگر آہ اپنی نسوانیت کے جوہر کو کھو دینے کے بعد اپنے تئیں کو وہ کیسے منہ دکھائیگی۔ اس کا جواب اس کے بس میں نہ تھا۔ دو دن اس گلی میں دونوں ماں بیٹے کے لاشے گور و کفن کو محتاج پڑے سڑ رہے تھے۔ راہ کے چلنے والوں نے تھانہ میں اطلاع دی۔ اور پولیس کا سب انسپکٹر اپنے قتیل ہوس کی میت پر واقعہ کی تحقیقات اور مجرم کی تلاش میں اس گلی میں آیا۔

۳

چھ ماہ کے بعد جو جیل سے چھوٹ کر آگیا۔ وہ جیل میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ اتفاق سے اس کو جیل میں چند سیاسی قیدیوں کی صحبت ملی اور اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ گھر آکر جب اس نے بچے کی موت اور رسولن کی خودکشی کے پردہ واقعات سنے تو اس کا سرمایہ داری کے خلاف وہ جذبہ جس کا بیج اس کے دل میں پڑ چکا تھا، اور جس کی پرورش اس کی اپنی زندگی کے واقعات کر رہے تھے، بیدار ہوگیا۔ اب کسی کی پرورش کی فکر اسے باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنی دولت۔ بیوی، بچہ اور عزت سب کچھ کھو چکا تھا۔ اب اس نے سرمایہ داری کے خلاف جنگ کرتے ہوئے اپنی جان بھی قربان کر دینے کی قسم کھالی۔ وہ عوام میں انقلاب پیدا کر کے اپنا اور اپنے جیسے ہزاروں مظلوموں کا انتقام لینے پر تل گیا۔ اور آجکل دنیا و مافیہا سے بے خبر اسی دھن میں مگن رہتا ہے۔ کئی دفعہ پولیس کے ڈنڈے کھا چکا ہے۔ اور جیل کو تو اپنا گھر سمجھتا ہے۔ اب وہ کامریڈ جو ہے اور ہزاروں ہزار کسان اور مزدور اس کے ادنیٰ اشارہ پر اپنی جان چھڑکنے کے لئے تیار ہیں۔

وطن کی قربانی

(ایک ترکی شاہکار افسانہ کی ایک جھلک)

از جناب جی۔ آر۔ قیس صاحب شیخپوری

سلمیٰ پیاری اگر میں مر جاؤں تو تم کیا کرو گی ——— ؟

سلمیٰ جو تخیل کی دنیا میں بیٹھی ہوئی اپنی زندگی کی سنہری ساعتوں کو کچھ اور سنہری کر رہی تھی۔ اس اچانک سوال سے گھبرا سی گئی۔ مخمور آنکھیں اُداس ہو گئیں۔ شگفتہ چہرہ پر افسردگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ گلابی ہونٹوں پر جو تبسم کھیل رہا تھا مانند پڑ گیا، اور ایک شکستہ پر بلبل کی طرح دھیمی آواز میں بولی ——— !

اُونہہ ——— ! بس نہیں ایسی ہی دل لگی سوجھتی ہے۔ یہ دل لگی مجھے اچھی نہیں لگتی۔ تمہاری ان باتوں سے میرے دل کو دُکھ پہونچتا ہے۔ خدا نہ کرے تم مرنے لگو۔ پہلے میں مر جاؤں پھر تم۔ عورت کا پہلے مرجانا اچھا ہوتا ہے، وہ ہر آفت، مصیبت دُکھ، ستم، سے محفوظ رہتی ہے۔ خدا نہ کرے کسی عورت کو منحوس دن دیکھنا نصیب ہو۔

سلمیٰ کی رسیلی آنکھوں میں آنسوؤں کی بوندیں جھلکنے لگیں۔ کمال نے سلمیٰ کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے محبت سے کہا:۔

پیاری ——— تم اتنی سی بات پر رونے لگیں۔ میں تو یونہی ہنسی کر رہا تھا۔ تم جانتی ہو کہ میں ایک سپاہی ہوں، اور سپاہی کی زندگی ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے۔ اس کی جان دوسروں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ میں ایک سپاہی ہوں۔ میری زندگی کا کیا بھروسہ۔ میری زندگی تلواروں، اور نیزوں کی چھاؤں میں کٹتی ہے۔ ابھی ہنس بول رہا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد کچھ بھی نہیں!

سچ ہے پیارے ——— ! میں موت سے نہیں ڈرتی ہوں۔ اور نہ مرنے سے۔ میں بھی ایک سپہ سالار کی بیٹی ہوں۔ موت میری رگوں میں بھی وہی خون اور وہی جوش ہے جو تمہارے جسم میں ہے۔ جس وقت میدان عمل میں جاؤں، بھوکی شیرنی کی طرح جھپٹ پڑوں۔ لڑ کر بہادروں کی طرح جان دے دوں، پیچھے ہٹ کر بزدلوں کی طرح کبھی نہ بھاگوں۔ لڑائی میرا ایمان ہے، تلوار اور تیر میری جوانی کے خوشنما زیور ہیں۔

سلمیٰ! تم رنگین تتلی ہو، حسین پھول ہو۔ اور خوبصورت۔ تم میری زندگی ہو۔ تمہاری ہر ادا میں ایک سحر ہے۔ ہر تبسم میں سہانی صبح کی بہار ہے۔ تم راحت ہو، چین ہو۔ کمال بہت دیر تک اس قسم کی محبت آمیز باتیں کرتا رہا۔ جس سے سلمیٰ کے دل کو بہت کچھ تسکین ہوئی۔ اور اس کی بیقرار روح جو پژمردہ ہو گئی تھی، پھر شاداں ہو گئی۔ سلمیٰ کی باہیں، کمال کی گردن میں حائل ہو گئیں۔ اور دونوں محبت کی دنیا میں ڈوب گئے ———

وہ مسرت کا دریا جو ہر وقت سلمیٰ کے دل میں لہریں مارا کرتا تھا سوکھ گیا۔ اُس کے دل کا چراغ اس طرح دفعتاً بجھ گیا، جیسے جگنو جگمگا کر اپنے پروں کو سمیٹ لیتا ہے۔ اور اس کی روشنی غائب ہو جاتی ہے۔ وہ بار بار کمال سے منت اور التجا کر رہی تھی۔

پیارے! آج تمہارے سندر چہرہ پر افسردگی اور غمگینی کی گھٹا کیوں چھائی ہے؟ تمہاری موہنی صورت۔ اور کامنی رنگت میں یہ اُداسی کیسی؟ تمہارا روپ دار چہرہ بہت نڈھال معلوم ہو رہا ہے۔ آج تم مجھ سے ہنستے بولتے نہیں۔ کیوں ——— ؟ پیارے مجھ سے محبت نہیں ہے؟ تمہارا یہ حال دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں جاتا۔

"میری اچھی سلمیٰ! کچھ نہیں ہے۔ یہ تمہارا محض وہم ہے" نہیں پیارے، تم چھپا رہے ہو۔ ضرور کارنگ کبھی چھپائے نہیں چھپتا یہ تمہاری آنکھیں نمناک کیوں ہیں؟ دیکھو آواز بھی بھاری ہوتی جاتی ہے۔ مجھ سے اپنے دل کا راز نہ چھپاؤ۔ چپکے سے کہدو۔ میں تمہاری شریک زندگی ہوں۔ پیارے جلد بولو۔ میرا کلیجہ بیٹھا جا رہا ہے۔ میرے دل کی پریشانی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جاتی ہے۔

سلمیٰ میری پریشانی اور افسردگی کو سنکر کیا کروگی گھبرا جاؤ گی۔ تمہارا نفیس نازک دل ہل جائے گا۔ کانپ اٹھو گی۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ مگر ہاں یہ میری پریشانی تمہارے کسی آنیوالے

وقت کا دیوتا یہ ضروری ہے۔

"پیارے ——— میں نہیں سمجھی۔ اپنا زیادہ نہ ستاؤ۔ مجھے کیا آج اور اپنی پریشانی کا حال کہہ دو۔"

سلمیٰ کی پریشانی دیکھ کر کمال نے سلمیٰ کو گلے سے لگایا اور پھر نہایت غمگین آواز میں کہا:-

سلمیٰ! کیا تم نہیں دیکھ رہی ہو کہ آج وطن کی سرزمین پر کس قدر ظلم و ستم ہو رہا ہے۔ صفحۂ تخلیق سے بے گناہوں کو قتل کر کے اُن کے گھروں میں آگ لگائی جا رہی ہے۔ ننھے معصوم بچوں کو ماں کی گود سے چھین کر تہ تیغ کیا جا رہا ہے۔ حق و صداقت کی صدا بلند کرنے والوں کی گردن پر خنجر چلائے جا رہے ہیں۔ تمہارے بھائیوں پر جبکہ یہ ظلم ڈھایا جا رہا ہے تو ہم یہ دیکھ کر کس طرح بیٹھ سکتے ہیں۔ میری رگوں میں بھی اسلامی خون ہے۔ اور یہ تلوار جس کو تم دیکھ رہی ہو۔ اور جسے میں مقدس سمجھتا ہوں۔ جنت اسی کے سایہ کے نیچے ہے۔ جب تک میں باغیوں کا قلع قمع نہ کر دوں آج مجھ پر دنیا کی تمام چیزیں حرام ہیں۔ اسلئے آج میں مظلوموں کی حمایت کی خاطر دنیا کی ہر راحت کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ میں تمہیں یہیں چھوڑ کر میدان جنگ کو جا رہا ہوں۔ شاید اس معرکہ سے پھر زندہ نہ آسکوں۔ اسلئے میں تمہارے پاس صرف اس لئے آیا تھا کہ تم مجھے میری خاطر نہیں، بلکہ ——— ملک کی خاطر قربان کر دو۔ اور شوق سے چلے جانے کی اجازت دیدو بس اب صرف تمہاری اجازت کی دیر ہے۔"

سلمیٰ بالکل سرد ہو گئی، جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ کچھ جواب نہ دے سکی۔ زبان بند، لب خاموش، اور آنسوؤں کا چشمہ اُبلنے لگا۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ کمال نے پھر پیار کے ساتھ آخری بھجے میں کہا

"کیا سوچ رہی ہو، اب کچھ نہ سوچو۔ تم نہیں جانتیں کہ نافرمان باغیوں نے بزن بول دیا ہے۔ جنگ کے وقت بیوی اور بچوں کا خیال جائز نہیں۔ ملک کے امن کی خاطر زندگی کی ہر بیش بہا شے قربان کر دینی چاہئے۔ مسلمان بہادری، دلیری، اور جنگی قوتوں کے سامنے ملک کے غداروں کا سر جھکانے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ جھکنے کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ مجھ بھی سورماؤں اور بہادروں کی طرح میدان جنگ میں جا کر اپنی شجاعت اور مردانگی کے جوہر دکھانے چاہئیں۔

مظلوموں کی مدد کے موقع پر اپنی ہر خواہش کو قربان کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دینا چاہیے۔ تاکہ مرنے کے بعد لوگوں کی زبان پر ہمارا نام نیکی سے لیا جائے۔ چرواہے بھی ہمارے نام کے گیت گائیں۔ مغنی اپنے دھرپد میں ہمارے نام کی نغمہ سرائی کریں۔ اور محفل نشاط میں ہماری بہادری کے نغمے سنا کر سامعین کو بیخود بنائیں۔ مظلوموں کی محبت میں اپنے کو حوالہ قضا کرنا ایک جنگجو سپاہی کے لئے مایۂ فخر و اعزاز ہے۔

پیاری میری محبت کو ٹھکرا دو۔ لیکن اپنے فرض کو نہ ٹھکراؤ ورنہ قیامت کے روز ہم دونوں جواب دہ ہوں گے۔

"آج خدا کے سامنے میرا فرض وطن پر جان دینا ہے اور تمہارا فرض مجھے مرنے کی اجازت دینا ہے۔ میں اپنے فرض کیلئے تیار ہو چکا۔ اب تم ——— اپنے فرض کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

سلمیٰ غم کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ یہ سُن کر معاً اس کا کندن سا چہرہ خوشی سے جگمگا اُٹھا اور وہ بولی:-

"پیارے! جاؤ ..... خدا حافظ!
میں بھی تمہیں اجازت دیتی ہوں۔ جاؤ اور کامیاب واپس آؤ!!"

"بہ سلامت روی و باز آئی"

کمان سے تیر نکل چکا تھا۔ واپس آنا مشکل تھا۔ سلمیٰ نے اجازت نہ دینے کو دے دی، لیکن اُس کی نظروں میں ساری دنیا سیاہ خون میں ڈوبی ہوئی، اور گمنوئی نظر آنے لگی۔ سینہ میں آلام اور روح میں ہیجان پیدا ہو گیا۔

میدان جنگ کی خونی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگی۔ تلواروں کی جھنکار، اور بجلی کی چمک قتل، غارت، لوٹ مار، غیظ و غضب کے زور، شعلہ طوفان، آندھی، پھر ایک دم تیرہ و تاریک ———!

سلمیٰ چمک کر اٹھی۔ مگر صرف چمک کر رہ گئی۔ وہ اپنی بڑھتی ہوئی محبت کا خون کر کے شوہر کو وطن پر قربان کر دینا اچھا سمجھی۔

کمال نے سلمیٰ کو آخری پیار کیا۔ گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اور تکبیر پڑھتے ہوئے میدان جنگ کو چلا گیا۔

(۳)

ہر کھلنے والا پھول خاموشی کے ساتھ دنیائے احساس پر قیامت توڑ رہا تھا۔ شام کا سناٹا تھا۔ سورج کی کرنیں زرد پڑ چکی تھیں۔ ہوا موت کی طرح سرد تھی۔ سلمیٰ اپنے کوٹھے پر کسی گہرے خیال میں

جنّات

از جناب کامریڈ خیر النساء بیگم

(۱)

شام ہوتی اور میں کہتی

"دادی جان کوئی کہانی سُناؤ"

بچپن کا زمانہ تھا۔ قصّہ کہانیوں میں بڑا جی لگتا تھا۔ اور دادی جان بھی گویا اس کے لئے تیار ہی رہتی تھیں، بس اشارہ پاتے ہی وہ شروع ہو جاتیں، اور جن بھوت کے لچھے دار قصّے لے بیٹھتیں، یہاں تک کہ کافی رات آجاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ گھر کے ایک ایک دروازے سے بھوت نکلے چلے آرہے ہیں۔ میں سہم سہم کر دادی جان کے قریب ہوتی جاتی ——— یہاں تک کہ آنکھیں بند کر کے انکے کلیجے میں چپک جاتی۔ اور اسی حالت میں نیند آجاتی۔ سوتے میں بھی سفید سفید کپڑا پہنے بڑی بڑی داڑھی والے جن نظر آتے۔

۱۸-۱۹ سال کی میری عمر ہوئی، لیکن میں نے اب تک اپنی آنکھوں سے جنات کی شکل نہ دیکھی۔ ہاں قصّہ کہانیوں میں البتہ سُنا۔ لیکن آپا جان، اور چچا میاں کو اب بھی "جن" کے متعلق اسی طرح گفتگو کرتے سُنتی ہوں۔ جیسے "جن" کوئی ٹھوس حقیقت ہو۔

دوسری طرف میرے کالج کی سٹرسین یہ کہتی ہیں۔ کہ جن بھوت وغیرہ کوئی چیز نہیں۔ یہ سب اپنے خیالات اور وہم کی پیداوار ہے، میرے جو کتابیں پڑھیں، ان میں بھی کہیں یہ لکھا نہ پایا کہ واقعی جنات کوئی حقیقت رکھتے ہیں۔ نام تو بہت سُنا۔ لیکن میں نے بھی اپنی زندگی میں "جن" کو کبھی نہیں دیکھا۔ کسی چیز کو بغیر دیکھے مان لینا کس قدر جہالت ہے۔ انسان خدا کو بغیر دیکھے مان لیتا ہے تو کیا وہ ہر چیز کو بغیر دیکھے تسلیم کرتے۔[1]

دور کیوں جاؤں میرے محلّے ہی میں کسی ایک صاحب کے بالاخانے پر جنات رہتا ہے، ایک دوسری بی بی کی آنگن میں نیم کا پیڑ ہے۔ اُس پر رہتا ہے۔ کسی کے پاخانے میں رہتا ہے، اور کسی کے کھنڈر میں۔ لیکن جب ان بیچاروں سے پوچھو کہ کیا تم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے تو جواب ندارد۔ اسی لئے مجھے لوگوں وہابی، نیچری، دہریہ، لامذہب اور نہ جانے کیا کیا مشہور کر رکھا ہے۔

گرمیوں کا زمانہ تھا، میں اپنے میکے میں تھی۔ سُنا کہ پڑوس میں شیخوپورہ کی رابعہ بیگم آئی ہوئی ہیں۔ یہ رابعہ بیگم کون تھیں میری دل سے پیاری عاصمہ کی والدہ۔ عاصمہ اور میں برسوں اسکول میں ساتھ پڑھی۔ لیکن انٹرنس میں آکر اس نے پڑھنا ترک کر دیا، کیونکہ اس کی شادی ہو گئی۔ میں نے تعلیم جاری رکھی اور کالج میں چلی گئی۔ ہاں تو میں نے اُن کے آنے کی خبر سُنی تو جھٹ دوسرے دن انہیں چائے پینے کے لئے اپنے ہاں بلا لیا۔ ناشتے کا سامان آنگن ہی میں کیا گیا۔ مٹھائے توڑے کی چند اور بیبیاں بھی آگئی تھیں۔ سب آنگن میں بیٹھی خوش گپی کر رہی تھیں۔ رات آچکی تھی، رات اُجیالی تھی، سب آنگن ہی میں بیٹھی ہوئی تھیں میں نے بیگم صاحبہ سے پوچھا۔

"عاصمہ کے کتنے بچے ہیں؟"

میرے سُننے سے یہ بات نکلی تھی کہ وہ یکبارگی خاموش ہو گئیں ٹھنڈی آہیں بھرنے لگیں آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

"بیٹی عاصمہ کی قسمت میں اولاد کہاں؟ بچے تو تین ہوئے، لیکن دو چار دن سے زیادہ جینا انہیں نصیب نہ ہوا۔ عاصمہ پر جن کا سایہ ہے۔ بس بچہ ہوا اور جن نے اُسے گود سے چھین کر کوئیں میں ڈال دیا۔ تین بچے اسی طرح خدا کے گھر جا چکے۔"

میں یہ سُن کر اُن کا مُنہ تکنے لگی۔ "جنات۔ جنات آکر گود سے بچہ چھین لیتا ہے۔ یہ میں کیا سُن رہی ہوں"۔ مجھے یقین نہ آیا۔ میں نے اُن سے تین مرتبہ یہی سوال کیا، اور انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔ میں اسی سوچ میں پڑی ہوئی تھی کہ لوگوں نے اسے دوسرا پہلو دیدیا وہ سب لگیں مجھ پر مُنہ آنے۔ مجھ پر طرح طرح کے آوازے کسے جانے لگے۔ میرے مخالفوں کو موقع مل گیا۔ میں اس کا کیا جواب دے سکتی تھی۔ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ لیکن میرے دل میں یہ خواہش ضرور ہو رہی تھی کہ اب یہ مجلس برخاست ہو جائے تو اچھا ہے ——— میں تنہائی میں کچھ سوچنا چاہتی تھی۔

کچھ دیر کے بعد سب لوگ اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ میں رات کو

---

[1] ندیم۔ ۔۔۔ اس جزئی حقیقت کو بغیر دیکھے ہی تسلیم کرلینا پڑتا ہے جس کو بن دیکھے خدا نے بن دیکھے ہی مان لینے کو ہدایت کر دی ہے۔ البتہ اس کی حرکتوں اور کرتوتوں کو بغیر دیکھے ہر گز نہ مانئے۔ ان افسانوں کو افسانہ ہی سمجھئے۔

دیر تک اس واقعہ کو سوچتی رہی۔ دوسرے دن بیگم صاحبہ کو پھر اپنے گھر لائی کوٹھے پر جاکر تنہائی میں ان سے پھر اس واقعے کو چھیڑا۔ انہوں نے تفصیل سے سارا قصہ بیان کیا۔ انہوں نے کہا :-

"میرے خاندان میں آج تک کسی پر جن یا بھوت کا سایہ نہ ہوا۔ عاصمہ پر بھی بچپن سے لیکر شادی تک ایسا کوئی اثر نہ پایا گیا۔ شادی کے بعد عاصمہ زیادہ تر سسرال میں رہیں۔ اُن لوگوں کا بھی بیان ہے کہ عاصمہ کے بول چال، حرکات و سکنات میں کوئی غیر معمولی بات نہ پائی گئی۔ جب عاصمہ کو ولادت ہونے والی تھی تو وہ شیخپورے چلی آئیں۔ بہت خوبصورت بیٹا پیدا ہوا۔ دن بھر بچہ اچھا بھلا رہا۔ رات آئی تو سب لوگ سو گئے۔ رات کے وقت دو بجے کا عمل ہوگا کہ آنگن میں ایک زوردار چیخ کی آواز آئی۔ پھر رونے کی۔ اس کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ کوئی چیز دھماکے سے کنوئیں میں گری۔ ہم سب لوگ دوڑ پڑے۔ عاصمہ کو پکڑ کر کوٹھڑی میں لائے۔ وہ بیہوش تھی۔ جب ہوش و حواس بجا ہوئے تو کہا —

"ایک بہت لانبا سفید داڑھی والا آدمی آیا اور میری گود سے بچے کو چھین لیا، وہ بچہ کو گود میں لیکر آنگن کی طرف آیا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا لیکن میں جیسے ہی اس کے قریب پہنچی اُس نے بچے کو کنوئیں میں ڈال دیا.....!"

کنوئیں میں آدمی اُتارا گیا، لیکن لڑکا تو مر چکا تھا۔

اتنا کہنے کے بعد انہوں نے آنکھوں سے آنسو پونچھے، چند منٹ کے بعد پھر کہنے لگیں :-

"دوسری مرتبہ جب ولادت ہونے والی تھی، تو اُن کے سسرال والوں نے عاصمہ کو میرے یہاں نہ بھیجا۔ میں نے سوچا کہ بچہ بچ جائے تو غنیمت بات ہے، اس لئے زیادہ اصرار نہ کیا۔ لیکن یہ خبیث کب کسی کا پیچھا چھوڑنے والے ہیں۔ اس مرتبہ عاصمہ کو جڑواں بچیاں ہوئیں۔ مجھے تو دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ لیکن سُنا کہ بہت خوبصورت تھیں عاصمہ کے سسرال والوں نے بڑی حفاظت کی، لیکن ایک بچی چوتھے دن، اور دوسری بچی ساتویں دن آنگن کے کنوئیں میں مری ہوئی ملی۔

میں نے بیگم صاحبہ سے جرح کے طور پر متعدد سوالات کئے۔ لیکن میرے جتنے شکوک تھے سب رفع ہو گئے۔ نہ اُن سے بستی میں کسی سے ایسی دشمنی تھی کہ وہ ایسی حرکت کرتا۔ نہ اس خون سے کسی کو وراثت مل سکتی تھی، نہ گھر کی کسی دائی نوکر پر اس کا شبہہ کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ سب پرانے اور بھروسے کے آدمی تھے ——— لیکن میری جرح پر انہوں نے دو باتیں ایسی کہیں جنہیں میں حل نہ کر سکی ———

"عاصمہ جب جب آنگن میں بلائی گئی تو وہ چپل پہنے ہوئے تھی ——— اور عاصمہ کی چیخ کی آواز ہر مرتبہ آنگن ہی سے آئی، کمرے سے نہ آئی"

ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ پہلے حادثے کے بعد کمرے کا دروازہ برابر رات کے وقت بند رہا کرتا تھا، ہاں جب میں نے پوچھا کہ دوسری بار عاصمہ سے بچہ کیوں نہ لیا گیا، تو انہوں نے کہا کہ عاصمہ کسی طرح اپنے بچے کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوتی تھی۔

میں اب تک کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکی تھی۔ بہر حال یہ بڑی افسوسناک بات تھی، اور خاصکر میری غریب عاصمہ پر یہ آفت تھی، اسلئے میں نے بیگم صاحبہ سے باصرار یہ کہہ دیا کہ خدا کرے عاصمہ کو آئندہ ولادت ہونے والی ہو تو آپ مجھے بلوالیں۔ ممکن ہے میری کوشش سے بچہ بچ جائے۔

میں نے یہ سب واقعہ ممتاز صاحب (میرے شوہر) کو کہہ سُنایا۔ وہ باتوں کو بہت جلدی سمجھ جاتے ہیں۔ وہ ہر چیز کا کچھ نہ کچھ سبب نکال کر بتا دیتے ہیں۔ وہ کسی اہم مسئلے کو "خدا کی قدرت" کہہ کر ٹال نہیں دیا کرتے۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے دماغ کو روشن کرنے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ میں نے سمجھا شاید وہ اس گتھی کو سلجھا سکیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بول اُٹھے :-

"دیکھو، عاصمہ احتیاط سے نہیں سوتی ہے اور جب.....

....."بچہ دب کر مر جاتا ہے، تو وہ اپنی شرمندگی چھپانے کے لئے بچے کو کنوئیں میں ڈال دیتی ہے۔" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا :-

"بالکل ٹھیک"

"نہیں! اسلئے کہ ایک بچہ تو کنوئیں سے کچھ زندہ بھی نکلا"

اس واقعے کو دو سال گذر گئے۔ عاصمہ کے جنات کی گتھی دماغ کے کسی گوشے میں گرد سے اٹی ہوئی پڑی تھی۔ ایک دن مبارک کریم صاحب (عاصمہ کے والد) کا لانبا چوڑا خط آیا جس میں میری "خیر و عافیت خداوند عزوجل سے نیک خواہاں و جویاں" رہنے کے بعد بجھ "نور چشمی مدعا" سے یہ استدعا کی گئی تھی کہ میں اس خط کو تار سمجھ کر فوراً شیخپورہ چلی آؤں، کیونکہ عاصمہ سلہما کو ولادت ہونے والی ہے"

ممتاز صاحب نے بخوشی مجھے اجازت دیدی۔ تیسرے دن میں شیخپورے کے لئے روانہ ہو گئی۔

میں چھٹے یا ساتویں دن رہی ہونگی کہ عاصمہ پر ولادت کے

آثار شروع ہو گئے۔ اس عرصے میں ہم لوگوں کا صرف یہ کام تھا کہ پلنگ پر بیٹھے گپیں لڑایا کریں، لیکن جب عاصمہ کی یہ حالت ہوئی تو پھر گھر بھر سنجیدہ ہو گیا۔ شاید ہی کسی کے لب پر مسکراہٹ آتی ہو۔ ایک دن اور ایک رات یونہی گذر گئی، دوسرے دن کوئی دس گیارہ بجے ولادت ہوئی، سارا گھر خوشی میں ڈوب گیا۔ چار بجے شام کو میں اور کئی لڑکیاں زچہ خانہ میں گئیں عاصمہ کا چہرہ پیلا اور نڈھال ہو رہا تھا جس سے اُس کے حُسن میں عجیب دلکش کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ ننھی مُنّی بچی گود میں تھی، جیسے سیپ کے اندر موتی ہو۔ بچی کیا تھی موم کی گڑیا تھی۔ بالکل عاصمہ کی شکل۔ میں نے پہلے بچی اور پھر عاصمہ کا مُنہ چوما۔ بچی کو گود میں لیا۔ اور دیر تک دیکھتی رہی، عاصمہ کی ایک خاص بات اُس وقت مجھے نظر آئی ——— وہ بچی کو اپنے پاس سے جدا نہ ہونے دینا چاہتی تھی، اور اسے ناگوار ہوتا تھا۔

یہ سب تو ہوا، لیکن اب میرے امتحان کا وقت بھی آ گیا تھا۔ مجھے جن سے لڑنا تھا، کوئی معمولی بات نہ تھی ——— کہاں مٹی کا بنا ہوا انسان اور کہاں آگ کے بنے ہوئے 'حضرت جن'، ان کا کیا مقابلہ۔ جیسے جیسے رات آتی گئی، میں اپنے کو مقابلے کے لئے تیار کرنے لگی۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دماغ کے ایک کونے میں جنات اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ موجود تھا۔ اور کبھی کبھی دل دھک دھک کرنے لگتا تھا ——— بہر حال رات کا پورا اہتمام میں نے لے لیا۔ کمرے کے تمام دروازے بند کر دئے۔ کھڑکیاں تمام کھول دیں۔ میں کمرے کے اندر سوئی، اور ناظمہ اور سعادت (عاصمہ کا بھائی) کو بھی وہیں سُلا لیا۔ کمرے کے دروازے پر سعادت براہل کو جو بہت دلیر اور نڈر مشہور تھے، سُلا لیا۔ بڑی بی (عاصمہ کی والدہ) اور کئی شخصوں نے زور دیا کہ ہم بھی وہیں رہیں گے، لیکن میں نے پوری ڈکٹیٹر شپ کے ساتھ انہیں روک دیا۔ بوڑھے لوگ کام تو کچھ کریں گے نہیں، خواہ مخواہ ہنگامہ کریں گے۔ نو دس بجے تک یونہی بھی کمرے میں لوگ موجود تھے، اس کے بعد ہم لوگ پلنگ پر گئے۔ الارم گھڑی سرہانے رکھ لی، اور وقت مقرر کر لیا، کون کتنے گھنٹے جاگے گا۔ یہ سب طے ہو چکنے کے بعد ہم لوگ لیٹ رہے۔ روشنی خوب تیز جلا کر چھوڑ دی۔ ناظمہ اور سعادت میں یہ فیصلہ ہونے لگا کہ جب جن آئے گا تو اُس کے ساتھ اُن کا کیا طرزِ عمل ہو گا ——— کون اُس کا ہاتھ پکڑے گا، کون اس سے بچہ چھینے گا۔ تقریباً بارہ بجے تک یہ گپ رہی، اس کے بعد سناٹا ہو گیا۔ کہیں ایک پتہ بھی گرتا تھا تو زور کی آواز ہوتی تھی۔ کوئی ایک بجے رات کو میاں سعادت بولے:-

"باجی"

"ہوں" میں نے ہونکاری بھری

"ابھی کچھ آپ نے سُنا"

"ہاں سُنا۔ کسی چیز کے گرنے کی آواز تھی"، میں نے کہا۔

"اچھا اب چُپ چاپ غور سے سُنتی رہیے"

"چُپ چاپ سُنتے رہو تم! بھلا وہم کا بھی کوئی ٹھکانا ہے میں تو اب سو ؤنگی"

وہم بھی عجیب بلا ہوتی ہے۔ سعادت کو رات بھر نیند نہ آئی۔ کئی بار اُس نے مجھ سے پُوچھا، باجی! یہ کیا ہوا۔ وہ کیا ہوا ——— میں 'ہوں' 'ہاں' کرتی گئی۔ ایک بار اُس نے براہل جی کو مخاطب کیا انہوں نے کہا "کچھ نہیں بیٹا" بی وی ہو گی، سو جاؤ۔ ہم تو جاگ ہی رہے ہیں" پھر بھی میاں سعادت بولتے ہی رہے۔ ایک دو بار تو ناظمہ بھی چونکی، اور پوچھا "کیا ہے بھیا"۔ میں نے اسے ڈانٹ کر کہا "شور ہو سب لوگوں کے جاگنے کی ضرورت نہیں"۔ مگر میری آنکھیں غیر سے کسی جاری تھیں، میں نے سعادت سے کہا "لو اب اُٹھ جاؤ، گھنٹہ تمہاری باری ہے، میں سوتی ہوں۔ تم اُٹھ بیٹھو۔ بھور ہونے میں دو گھنٹہ ہے، اسی طرح گذار دو۔ مجھے نو بجے سونے کی عادت تھی۔ اگر نہ سوؤنگی تو بیمار ہو جاؤں گی"۔ میں سو گئی۔

صبح کو جو آنکھ کھلی تو میں نے فوراً بچے کی پلنگ کی طرف دیکھا بچہ موجود تھا، اور وہ جمع جمع کر دو دو کا مطالبہ کر رہا تھا۔

اسی طرح پانچ دن گذر گئے۔ اور ہمارا منظم پہرہ بھی جاری رہا۔

ہاں اس درمیان میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ولادت کے تیسرے دن لوگوں میں زیادہ گھبراہٹ پائی جاتی تھی۔ رابعہ بیگم تو بدحواس ہی ہو رہی تھیں مسٹر شہیدی (عاصمہ کے شوہر) بھی جو مردانے میں تلاوت کر رہے تھے اور بار بار نفل پڑھتے جا رہے تھے، اُس دن ایک قدم اندر اور ایک قدم باہر بوکھلائے پھر رہے تھے۔ اس گھبراہٹ سے میں نے ایک نتیجہ نکالا "یہ لوگ مجھ پر زیادہ بھروسہ نہیں کرتے، اور میرے الٹیمنیٹ لانے کے باوجود وہ نہیں سمجھتے کہ مجھ جیسی معمولی لڑکی اتنے بڑے جن کا مقابلہ کر سکے گی۔ اس خلفشار کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ آج تیسرا دن تھا، اور بڑی بوڑھیاں یہ کہتی تھیں "آج تیسرا دن ہے۔ خدا اپنا فضل رکھے" یعنی جنات تیسرے دن زیادہ آتا ہے ——— بہر حال اس گھبراہٹ کا

یہ نتیجہ ہوا کہ بچہ خانے کے دروازے پر براہیل جی کے پلنگ کے قریب مسٹر شہید کا پلنگ آگیا، اور بڑی بی خواہ مخواہ اندر دھنس پڑیں۔

بارہ بجے رات تک تو یوں بھی گپیں ہوتی ہیں لیکن اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ مکان میں ایک تکان بھی گھر تا تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ رفتہ رفتہ ہر شے پر گرا۔ کوئی دو بجنے کا عمل ہوگا کہ جس اُسارے میں براہیل جی وغیرہ سوئے تھے، اُس کے سامنے والے اُسارے سے "کڑ کڑ کڑ" کی آواز آنے لگی۔ عاطمہ نے کہا:۔

"اماں"

"کیا ہے جی" رابعہ بیگم نے کہا

"کچھ سُن رہی ہیں"

"ہاں سُن تو رہے ہیں۔ اچھا مہرو کو اٹھاتی ہوں"

یہ کہہ کر بیگم صاحبہ مجھے جگانے لگیں ——— میں تو جاگ ہی رہی تھی، میں نے بھی ہونکاری بھری۔ اتنے میں پھر آواز ہوئی

"کڑ کڑ کڑ کڑ"

"سخاوت نانا، سخاوت نانا" عاطمہ نے چیخنا شروع کیا۔

"کیا ہے بیٹی"

"یہ کڑ کڑ کی آواز کیسی ہے۔ یقینی کوئی دروازہ کاٹ رہا ہے" "کڑ کڑ" کی مسلسل آواز جاری تھی۔ اس گفتگو کے بعد سب لوگ پانچ چھ منٹ تک بالکل خاموش رہے۔ اس کے بعد براہیل جی کے اُٹھنے کی آواز آئی، وہ سیدھے باہر گئے اور مبارک کو روتے ہوئے اور دو تین آدمیوں کو بلا کر لیتے آئے۔ سہموں کے ہاتھ میں لاٹھی یا غیر کوئی تھی۔ کریم صاحب اپنی دونالی بندوق کارتوس بھر کر احتیاط سے لئے ہوئے تھے۔ ہم نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ مکان چھان ڈالا گیا لیکن چور چُور کا کوئی سراغ نہ ملا۔ سعادت نے کہا۔ "ابا چپ چاپ بیٹھ جائیے دیکھیے پھر آواز آئیگی۔ سب لوگ جہاں تھے وہیں دم سادھ کر بیٹھ گئے۔ دو تین منٹ کے بعد

"کڑ کڑ کڑ کڑ" پھر وہی آواز آئی

"آواز اُس طرف سے آرہی ہے" سعادت نے کہا۔ اور سب لوگ اُسی طرف بڑھ گئے۔ اُسارے میں لکڑی کا ایک بڑا کُندہ رکھا ہوا تھا اور اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ براہیل جی کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ وہ آگے بڑھے اور کُندے پر روشنی ڈالی۔

"لاحول ولاقوۃ یہ لے کُندے پر بھنورا بیٹھا لکڑی کاٹ رہا ہے" براہیل جی نے کہا۔

اس پر سہموں کو بڑی ہنسی آئی اور ہم لوگ ہنستے ہوئے عاطمہ کے پاس آگئے۔

یہ تیسری رات کا واقعہ تھا۔ اب چھٹی رات سامنے تھی، جبکہ میں نے اپنی زندگی میں خوفناک ترین سین دیکھا۔ جب تیسری رات کوئی نوعِ دیگر نہ ہوا تو گھر والوں کو تھوڑا سا اطمینان ہوا لیکن ابھی خطرے کا احساس دُور نہیں ہوا تھا۔ اس رات کو شہید صاحب سونے نہیں آئے۔ اور ہم لوگوں نے سمجھا بجھا کر بڑی بی کو بھی اندر سونے سے منع کر دیا۔ کیونکہ بڑی بی کی موجودگی سے اول تو ہماری بے تکلف گپ میں رخنہ ہوتا تھا۔ اور دوسرے وہ رات بھر محمد دوم بہادر سے بڑے پیر تک سب کا سایہ مانگتیں، اور خدا معلوم کیا کیا پڑھ پڑھ کر ہر آدھے گھنٹے کے بعد مجھی اور عاطمہ پر دم کرتیں۔ بہر حال اس دن ہماری تعداد وہی رہی جو اوّل دن تھی۔ فاطمہ سعادت اور میں۔ فاطمہ دس بجے سے ایک بجے رات تک اپنا پہرہ ختم کر کے سو چکی تھی۔ اس نے سوتے وقت مجھے جگا دیا۔ میں اُٹھی اور اُٹھ کر پانی پیا۔ اپنے دل کا ڈر مٹانے کے لئے ایک گیت گنگنانی رہی اور اس کے بعد خاموش پڑ گئی۔ سارا مکان سایں سایں کر رہا تھا۔ مجھے اپنے دل کی حرکت تک سُنائی دے رہی تھی۔ غرضکہ اس سناٹے کے عالم میں جب کوئی ڈھائی بجے ہونگے۔ مجھے پلنگ کی پچھلی ہٹ سُنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو کیا دیکھتی ہوں کہ عاطمہ اُٹھ کر بیٹھ گئی ہیں اور پلنگ پر ہاتھوں ٹٹکا کر کمر کمر جیل تلاش کر رہی ہیں۔

"کیا ہے عاطمہ" میں نے پوچھا۔

کوئی جواب نہیں۔ میں نے سمجھا کہ پانی پینا چاہتی ہیں۔ اُٹھ کر گلاس ڈھونڈھا، صراحی سے پانی ڈھالا۔ پانی ڈھال ہی رہی تھی کہ

"کوں اُوں"

غنچی کے آہستہ سے رونے کی آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا ——— کیا دیکھتی ہوں کہ غنچی کو گود میں لیکر عاطمہ بالکل دروازے کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

"عاطمہ" میں نے کچھ زور سے پکارا۔ لیکن عاطمہ نے کچھ خیال نہ کیا۔

"عاطمہ عاطمہ" میں کچھ اور جلدی جلدی پکارنے لگی۔

سعادت اور فاطمہ بھی جاگ گئی تھیں۔ اس سے میں نے چیخ کر کہا "اوہ عاطمہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس وقت عاطمہ جا رہی تھی۔

"میرا بچہ"

بیوی کہتی ہوں۔ بیوی بڑی خوبصورت ہے، مجھے بڑی پیاری لگتی ہے کل ہی تو اُس کا خط آیا ہے۔ مجھ سے "سوان" روشنائی کی فرمائش کی ہے۔ روشنائی "ع" سے (رشنائی) لکھا ہے اور "و"

آیا ہوگا۔ کباب پراٹھوں کی طرف رجوع ہوگیا۔ باقی کاہلی فیلڈ پر کچومر نکالا جا رہا تھا۔ جی تھا کہ دھڑکے کھانے میں۔ کہاں ایک حسینہ کا چہرہ اور کہاں ایک بھری پلیٹ مٹھائی۔ واقعہ یہ ہے کہ لفظ "شباب" کے بدلہ شعر میں لفظ "کباب" نہ آئے اور ایسے موقعہ پر کہ ڈال ساگ کئی دن سے کھٹکے ہوں تو شعر کمبخت میں پھر دھرا کیا ہے۔

اور جب ہنسی بیحد بے تکی ہوگئی اور "بہاری صاحب" کے لئے باعث شرمندگی اور مخلص شعرا کی شان میں کھلی گستاخی تو ہم نے ہنسنے کی وجہ دریافت ہونے پر بحث شروع کردی۔ یہ کہ لفظ کباب بجائے شباب کے زیادہ بہتر رہیگا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہماری بحث صدق دل سے اور علمی بحث تھی لیکن اس کے معنی دوسرے لے کر ہمیں نکال باہر کیا گیا اور "بہاری صاحب" نے آکر ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہا کہ کس طرح ہم نے اسکول کا نام بدنام کیا اور کیسی بدتمیزی کی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

اور اب ہم بھی ہار گئے۔ جوگی کا ہرن ہم نے لیا یا ہار کی خاطر۔ ارے صاحب شاعر بنے تھے بہاری صاحب کے خوشی کرنے کو، سو یہ راس نہ آئی۔ چولھے میں جائے شاعری۔ ہم بھی آخر آدمی ہیں۔ بہاری صاحب کو خوش رکھنے کی پوری کوشش کی۔ اب ہار گئے خدا مالک ہے۔

اور بہاری صاحب کی یہ غفلتی شباب ہی پر تھی کہ ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔ ہمارا ایک بیرا بھی شباب یات کے لانجل مسایل کی طرف کچھ ایسا رجوع ہوا کہ شادی کرلایا اور اس محترمہ ہم لوگوں کی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے "کباب یات" کے مسایل کی طرف رجوع ہوئیں۔ کہنے لگا کہ صاحب کباب پراٹھے تو ایسے پکاتی ہے کہ دیکھئے وہ یاد کرے۔ اور نہ نے سوچا کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہم بھی یاد کریں گے۔ مگر کبھی اطمینان سے اس لئے کہ جو کھائے وہ روپیہ بھی تو فوراً دے۔

اور جب ہم دو تین ساتھی سیر کو آگرہ جانے لگے تو بیرے کو ایک روپیہ دیا اور ریسد دھا اسٹیشن کباب پراٹھے لے کر پہونچا گاڑی سے بہت قبل آگئے تھے۔ اب یہ کبابوں کی آفت آئی۔ جی ہاں آفت، ہر دم خیال لگا کہ یقیناً سانپ کہیں بغیر ہمارے شروع اور ختم نہ کر ڈالیں۔ ریل آتے ہی پہلا کام یہ ٹھہرا کہ لاؤ کھانا کھا لیں تاکہ اس آفت سے نجات ملے۔ درجہ نسبتاً خالی تھا صرف دو تین آدمی اور تھے۔ اب کھانے جو لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پاس ہی ایک بڑا بھاری ناشتہ دان کہ قطب مینار شرمائے ایک بڑے بکس تلے کے پاس ڈٹا ہوا ہے! یہ کس کا ہے؟ معلوم ہوا ایک صاحب ہیں جو گاڑی رکتے ہی سکنڈ کلاس میں کسی سے بات کرتے گئے ہیں اور یہی حرکت ہر اسٹیشن پر دہراتے ہیں۔ بادل ناخواستہ بیٹھی ٹھہری۔ دو سیٹوں کے درمیان ایک اونچے سے بکس پر کھانا تجویز تھا۔ خیال آیا کہ اس ناشتہ دان میں کیا ہوگا۔ تجویز ہوئی کہ کچھ ہی سہی نکالو نا۔ چشم زدن میں ناشتہ دان کے خانے اتارنا شروع کئے۔ بھئی واہ! کیا کہنا۔ بہت سا انڈوں کا خاگینہ۔ گول کباب جیسے بم کے گولے۔ پھولا ہو سہی تو انڈے بھرے۔ شامی کباب اور پورا ایک خانہ لبالب بھرا بیسن کا وہ سوندھا سوندھا حلوا کہ ہم نے تو وہیں سے شروع کیا۔ اور یہ دوکان لگائی ہی تھی کہ "السلام علیکم" ایک صاحب کوئی پچاس اور ساٹھ کے درمیان عمر ذرہ بھدری ڈاڑھی۔ گٹھا ہوا بدن۔ سیاہ نچی سی اچکن۔ تسبیح ہاتھ میں۔ سر پر سیاہ الپکے کی مختصر سی پگڑی۔ آواز کے پیچھے بہاری صاحب! اشارہ سے بلاتے ہیں۔ کھڑکی ہی سے نکالا۔ بہاری صاحب نے بتایا "والد صاحب قبلہ ہیں"۔ ارے صاحب فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ پکڑ کر کھانے میں شریک کیا۔ زبردستی ہاتھ دھلائے اور زبردستی شریک کرلیا۔ بہاگی صاحب بھی قریب آکر بیٹھ گئے اور جلدی جلدی خفیہ طور پر ہمارے کان کے اندر تعارفی یا تعریفی امور ارشاد ہو رہے ہیں۔ اور ادھر والد صاحب قبلہ لگا رہے ہیں ہٹ پہ ہٹ۔

معلوم ہوا کہ نہ صرف تہجد گذار بلکہ "صاحب مراقبہ" واقع ہوئے ہیں۔ بڑی زبردست صوفی کیا بلکہ ولی اللہ قسم کے آدمی ہیں بشارتیں ہوتی ہیں، بزرگان دین اور اولیا اللہ سے ڈائرکٹ وائرلیس لگتا ہے اور مراقبوں میں ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ رات ہی کو کسی بزرگ نے آگرہ سے دھر کھینچا۔ گھبرا کر اٹھے۔ اسی وقت نہا دھو لیا اور صبح کھانے سے بھی انکار کیا کہ جب تک روانہ نہ ہوں کھانا پینا حرام۔ اب جا کر حقیقت کھلی! یہ جو ہٹ پہ ہٹ لگ رہی تھے ہمارا اصل وطن آگرہ۔ کیسے نہ قیام کی دعوت دیتے۔ جبکہ یہ بھی کہا گیا کہ روانگی زیارت قبل میں آرہی ہے لہٰذا خدا معلوم کہاں ٹھہریں گے کوئی انتظام نہیں۔ اور فقیر کا ٹھہرنا کیا۔ مگر صاحب بزرگوں کی کشش سے جا رہے تھے کھانے کا یوں انتظام ہوا ٹھنے کا کیسے نہ ہوتا۔ اور پھر ویسے بھی استاد کے باپ ٹھہرے۔ ہم نے

سلام کرکے سر بار کھڑکی سے

چلیے کہ بہاری صاحب کے والد صاحب قبلہ کی مہربانی کے بعد کم از کم ان کے اوپر احسان کا وہ لدادُ ہو جائے گا کہ گھنٹہ اپنا ہو گا۔ واضح رہے کہ کھانا میں بھی زور سے کھا ہی رہا تھا۔

اور ریل کی سیٹی ہوئی ہو کہ "صاحب کھانا" آگئے وہ جو سکنڈ کلاس میں بے خبر کبھی دوست سے گپا شپ ہانک رہے تھے۔ اور ان کے آتے ہی۔ ہم سب نے بڑے اخلاق اور پورے اسلامی جوش کے ساتھ انکو بھی کھانے پر مدعو کیا۔ اب وہ کھڑے دیکھتے ہیں کہ یہ ہو کیا رہا ہو۔ ایک بزرگوار کی قیادت میں چند لڑکے قیامت ڈھائے ہیں۔ اور والد صاحب قبلہ بولے "حضرت تکلف کیا۔۔۔۔ بسم اللہ۔۔۔۔"

"اجی آپ تو تکلف کرتے ہیں۔۔۔۔" میں نے بھی محبت سے کہا۔ مسکرا کر جائزہ سا لیا۔ اور کہا "کھائیے خدا زیادہ دے۔۔۔"

"تو لائیے۔۔۔۔" میں نے برجستہ طریقہ سے عرض کیا "کچھ اور بھی ہو" اور اب وہ ذرا بھنائے۔ اور اب والد صاحب قبلہ ذرا دیکھتے ہیں۔ کبھی انکو اور کبھی ہم لوگوں کو۔ مگر ہم سر ہو چکی تھی اور گاڑی بھی چل رہی تھی۔ اور قدرے اطمینان کے بعد اب انھوں نے ذرا گفت کی۔ والد صاحب قبلہ سے نام پتہ وغیرہ وغیرہ دریافت کرائے کہا۔ "معاف کیجئے گا یہ کہاں کا اور کون سا اسلامی شعار ہو" یعنی پرایا کھانا یوں کھا گئے۔

اور قبل اس کے کہ کچھ جواب دیں میں نے ان حضرت کو ذرا علیحدہ سر جھکا کر رازدارانہ طریقہ پر بتایا کہ حضرت جملہ کارروائی چرندم خورندم زیر بشارت عمل میں آئی۔ ایسے بزرگ دین بسبب احکام روانگی اپنے پر کھانا پینا حرام کئے ہوئے تھے۔ اس میں آپ مخل نہ ہوں۔ یہ سب کارروائی بزرگان دین کے اشارہ سے عمل میں آرہی ہو۔ جنھوں نے اپنے اس پیارے مہمان کے لئے کہاں تو کھانا پکوایا اور کہاں کھلوایا۔ آپ مفت میں ثواب لوٹتے ہیں کہ کھانے کو روتے ہیں۔ شکر بجا آر۔۔۔۔!!

ارے صاحب! یہ تو آگ بگولہ ہو گئے سخت برہم ہوئے۔ پھٹ پڑے مجھے احمق بتاتے ہیں۔ میرا مذاق اڑاتے ہیں بشرم نہیں آتی۔۔۔۔ بکھر گئے سمٹے نہ سمٹیں۔ اور سارا نزلہ بہاری صاحب کے آبا پر۔ "یہ آوارے ہیں مگر جناب کو۔۔۔۔ اب میں کیا کہوں۔ بڑے شرم کی بات ہو۔ افسوس۔۔۔۔ لاحول ولاقوۃ"

اب وہ لاکھ سمجھاتے ہیں پر سمجھنا شروع بھی تو ہو۔ جب وہ ٹھنڈے پڑے تب والد صاحب قبلہ نے افسوس ظاہر کر کے واقعہ بتایا جس کی دوسرے ہندو مسافروں نے تائید کی جو سارا تماشہ شروع سے دیکھتے تھے۔ ہم کیا کہتے۔ ہم نے کہا کہ "صاحب آج ہمارا تو عجیب عالم ہوا۔ ہمیں کسی پوشیدہ قوت نے مجبور کیا ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی بالاتر قوت ہو جو حکم دے رہی ہو کہ جلد دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے چنو"۔

اور ٹونڈلے کے اسٹیشن پر ہم والد صاحب قبلہ کو اس بات کا یقین دلانے میں کامیاب ہو چکے تھے اور انکی بزرگی سے خائف سے بن کر کہتے تھے کہ صاحب ہمیں تو ایسا معلوم دے رہا تھا جیسے حکم ہوا ہو۔ اور خود والد صاحب قبلہ نے کہا کہ قطعی ایسا ہی ہوا۔ ایسا ہی ہوتا ہو۔ کیوں؟ بس یہیں سے رموز شروع ہو جاتے ہیں۔ "تم کیا جانو"۔

آگرہ میں مکان کا بالائی حصہ مقفل تھا۔ اسکو کھولا۔ جہاں قیام کا پورا انتظام تھا اور چھوٹے کمرے میں قبلہ کو تنہا مقیم کر دیا۔ ہمارے دو ساتھی ہمارے اور مہمان تھے۔ مہمان اس طریقہ پر تھے کہ یہاں نوکر نہ چاکر۔ نہ کھانے پینے کا انتظام عزیزوں رشتہ داروں کو کھانے کے لئے حیران کرنا۔ خود ان کے اخلاق سے حیران ہونا۔ لہذا خود اپنے آپ مہمان تھے۔ جو خرچہ ہو اس میں سب برابر کے شریک۔ کھانا ہوٹل میں ناشتہ تو دوسرا پہلا چائے کا جو قریب ہی مل گئی۔ دوسرا ہوٹل میں زوردار۔ قبلہ فری! گویا سب کے مہمان۔

مگر ہمارے اور قبلہ کے مقاصد میں زمین و آسمان کا فرق انکا مقصد طواف قبور و مزارات بزرگان دین۔ ہمارا مقصد سیر سپاٹا۔ ہم سمجھے تھے کہ قبلہ اپنی راہ دیکھیں گے پر وہ تو ہمارے چمٹ گئے۔ خلقت خود اپنی ہوئی۔ ساتھ انکو لے گئے اور تانگہ کا کرایہ دیا۔ کرایہ دو گنا پڑا اس لئے کہ سیر و تفریح کے مقام دیکھنے کے بعد کسی کے مزار پر "جوڈ ٹاؤن" ہو گیا تو وہاں بیٹھے ہیں مزار کے پاس مراقبہ میں۔ اب کون کہے کہ حضرت تانگہ فی گھنٹہ پر ہو۔ وہ تو مراقبہ میں اور ہم کو پیسے ہیں۔

اور قبلہ نے جو تانگہ کا خرچہ یوں پایا تو سرے سے ہمارے

پروگرام میں شریک۔ شریک کیا مخل۔ ایک صاحب مسجد میں مل گئے جو مزارات کی ڈائرکٹری کرتے تھے اور میرے شیر نے جن جن کر مزارات بتا دئے۔ ہم کہیں جاتے میں اسی کے ساتھ ساتھ راہ میں یا بس ذرا ادھر یا ادھر ایک صاحب مزار باعث آزار۔ اور اب ہم نے دیکھا کہ بزرگوں نے ٹونا کے گھیر رکھے ہیں۔ قصہ مختصر حیران ہو گئے۔ سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ چھوڑ چھوڑ کے بھاگنے لگے۔ بڑی مصیبت یہ کہ تانگے والے تین آدمی سے زائد بٹھانے میں محبت کریں اور بسا اوقات یا تو دوسرا بھیجا کریں ورنہ ایک ساتھی چھوٹے۔ پر مولوی صاحب ہیں کہ جمے ہوئے ہیں۔

تاج محل دیکھ کر صدر دروازہ پر آئے اور واپسی میں سیدھی سڑک چھوڑ کر داہنی طرف باغ میں سے ہو کر میدان میں جا نکلو تو بیچ میں پرانا قبرستان اور پھر مردگھاٹ ہے۔

میں اور قبلہ والد صاحب۔ اب مصر ہیں کہ ادھر سے ہو کر نکل چلو۔ قبرستان میں سے گذرو۔ کہوں؟ "ایسے ہی" میں کیا عرض کروں۔ میں بھی اڑ گیا اور وہ بھی نہ مانے۔ ایسی ضد انھوں نے کاہو کو کی تھی۔ چار و ناچار چلا۔

اور قبرستان میں جو پہونچے تو بیچ میں ایک بلندی پر سفید عمارت چمک رہی ہے۔ "اوہو! یہ کس کا مزار ہے؟" "ہوگا کسی کا" نہیں دراصل نام بھول گیا۔ "آہا.... سبحان اللہ ..... کیا کہنے ہیں ..... کوئی بزرگ ہیں ..... کیا مقام ہے ..... بھئی عجیب جگہ ..... اللہ ہو ....."

اور میں چپ۔ مگر دیکھتا ہوں کہ راستہ کترا رہے ہیں اور بولا نہیں کہ تجھ پر کردوں گے کہ آؤ فاتحہ پڑھیں۔ اور ان کے "اللہ ہو" قسم کے جملے بڑھتے گئے اور کتراتے گئے حتی کہ "لو نکل چلو"

اور میں مگر ڈھٹا ہوا۔ مگر بات بھی ہو۔ ذرا سا کتراتے قریب سے گذر جائیں گے۔ اور واقعی ہوا ایسے فراٹے سے چل رہی تھی۔ مقام سنسان۔ ویران۔ سامنے مزار دھوپ میں چمک رہا تھا اور وہ مزار پر نظریں گاڑے ٹھوکریں کھاتے از خود کتراتے راستہ چھوٹتے چلے جا رہے ہیں۔ "واللہ کیا مزار ہے ..... بڑے بزرگ ہیں کوئی ..... ماشاء اللہ ....."

قریب پہونچے بہت مختصر سی عمارت اوپر سے آدمی جھانکتا تھا۔ پکار کر اوس سے پوچھا کہ کس کا مزار ہے۔ ہوا اس قدر فراٹے بھر رہی تھی کہ کچھ سنائی نہ دیا۔ اور قریب ہوئے۔

"ایں۔ ایں ..... کس کا ..... سیدنا ....."

اور قریب ہم دونوں پہونچے کہ مزار کے خادم نے زور سے پکار کر کہا:۔

"سیدنا جلال بخاریؒ ....."

اس کے منہ سے یہ نکلنا تھا کہ مولوی صاحب کے گولی سی لگی۔ منہ سے ایک زور کی چیخ نکلی اور بل کھا کر گرے اور تڑپ رہے ہیں مرغ بسمل کی طرح! خدا کی پناہ! میں نے یہ سین کاہو کو دیکھا تھا۔ گھبرا گیا۔ اب سنبھالتا ہوں تو اٹھ اٹھ کر گرتے ہیں۔ چیختے ہیں، اودھتے ہیں اور گرتے ہیں

اور مجاور دوڑا آیا اوپر سے۔ مزار کی چوڑی اور خاک کی مٹکی اور اُس نے فوراً سنبھال لیا اور اب یہ گرتے پڑتے ٹھوکریں کھاتے چاروں ہاتھ پیروں سے رینگتے اوندھتے بیٹھتے تیزی سے سیڑھیوں کی طرف چلے۔ میں نے اور مجاور نے سنبھالا اور وہ اسیطرح ہم دونوں کی امداد سے سیڑھیاں چڑھ کر ایک زبردست چیخ کے ساتھ مزار کے قدموں میں گرے اور آنکھیں بند سانس زور زور سے چل رہا ہے۔ پڑے ہیں سناٹے میں۔ اب میں چپ کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے۔ مگر تو قطعی نہیں ہے۔ مجاور برابر نگہبانی کرتا رہا۔

اللہ ہو کا نعرہ مار کر اٹھے۔ مزار کو بوسہ دیا۔ اور ہاتھ باندھ کر "اللہ ہو" کرکے جو مراقبہ میں ڈوبے ہیں تو غائب۔ اب آنسو ہیں کہ آنکھوں سے بہہ رہے ہیں۔ جھڑی لگ گئی۔ سسکیاں لینا شروع کیں۔ بڑھتی گئیں بڑھتی گئیں۔ ایک چیخ مار کر بیچ بیچ مجاور پھر ضروری کارروائیاں کرنے لگا اور میں تو تنگ آ کر دروازہ پر بیٹھ گیا۔

ہوش آیا تو پھر مراقبہ میں چلے گئے۔ بمشکل رفتہ رفتہ آپے میں آئے۔ مگر جذبات متلاطم اور "انوہ" کا نعرہ۔

بڑی مشکل سے یہاں سے رقت آمیز سین کے بعد رخصت ہوئے۔ ہر سیڑھی کو چومتے اٹھتے بیٹھ کر اتر رہے ہیں کہ گرپن تو پڑے مراقبہ میں جانا پڑے۔ میں حد درجہ مرعوب رہا۔ سوال کرنے کی جرأت نہ پڑی۔ پھر خود بتایا۔ بات صرف اتنی تھی کہ یہ حضرت

اس سلسلہ کے مریدوں میں تھے۔ جن میں حضرت سید نا جلال بخاری کا بڑا پایہ ہے۔ اور یہ سمجھے تھے کہ انکا مزار بخارا میں ہوگا غرض کچھ پتہ نہ تھا۔ خیال نہ تھا۔ کہ ایدھر سے یہ واقعہ ہوا۔ اور اب معلوم ہوا کہ حضرت ہی بلاتے تھے اور حضرت ہی کی نا معلوم کشش تھی۔ اور آج دل ہلکا ہوا ہے۔ گویا حضرت ہی نے بشارت دی تھی اور بلوا دیا تھا۔

اور دوسرے دن مولوی صاحب تہجد کے بعد ہی جو روز کے روز سیدھے پیدل مزار پر پہونچیں۔ تو سیدھے صبح تین ناشتہ کے وقت بعد مراقبہ واپس۔ فاشستہ تا غہ نہیں ہوا۔ اور شام کو جائیں سوار گ۔ ایک حد تک جان چھوٹی اپنی۔

رات کا ذکر ہے کہ ہم لوگوں نے مولوی صاحب کی "قبر باری" اور مراقبہ پر اعتراض کیا۔ اور محض مذاق اور بحث کے زور میں نہ معلوم کیا کیا رموز تصوف معلوم کر لئے۔ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب فاتحہ کو تا تھ اٹھاتے ہیں تو مردہ قبر میں اٹھ بیٹھتا ہے۔ اس کے مدارج سب معلوم ہو جاتے ہیں اور مدارج ہی کے لحاظ سے اس سے ملاقات ہوتی ہے۔ اور رازونیاز کی باتیں ہوتی ہیں اور حصول فیوض ہوتا جو نہیں بتایا جا سکتا۔ مثال کے طور پر مولوی صاحب کی زبان سے نکل گیا کہ انھوں نے سچ مچ حضرت سید نا جلال بخاری کے قدم چومے بڑی دیر تک یہی گفتگو رہی اور ہم لوگوں کو خاموش ہونا پڑا۔

دوسرے روز کا ذکر ہے کہ مراقبہ کے ذریعہ کئی مزارات پر سے فیض حاصل کر کے لوٹتے تھے کہ میری شامت جو آئے ایک پر تکلف مزار پر فاتحہ خوانی کی سفارش کر دی کہ مولوی صاحب اس مزار پر فاتحہ نہ پڑھئے گا۔ "اسپہ بھی لو"۔

ذرا قریب پہونچکر مولوی صاحب فاتحہ پڑھکر آنکھیں چمکا کر لگے اوپر کی طرف دیکھنے۔ میں بھی قریب آگیا تھا میں نے کہا "کہئے کیسے بزرگ ہیں" ہنسکر کہنے لگے "کیا کہنے ہیں" میں نے کہا فیوض حاصل ہوئے۔ کہنے لگے "نہ پوچھو۔۔۔۔"

ہر مزار پر مزاح کے طور میں اسی قسم کے سوال ضرور کرتا تھا اور مولوی صاحب ہنسکر جواب دیتے تھے۔

جیب میں سے منیک نکال کر جو مولوی صاحب نے اوپر کی طرف دیکھا تو پوچھئے! لاحول ولا قوۃ! جز بز ہو گئے۔ صاحب قبر پر لعنت اور پھٹکار۔ ادھر ادھر میرا منہ سے کہنی کے یہ حال کہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مولوی صاحب بگڑ کھڑے ہوئے "میرا مذاق اڑاتے ہو" یہ قبر آگرہ کے مشہور بھانڈ علی بخش کی تھی۔ خدا کی پناہ کیا منحوس تھا۔ صورت دیکھتے ہنسی آتی تھی اب مرگیا تو مزار دیکھو اور ہنسو۔ جو قبر پر آتا ہے ورس عبرت لینے کے بجائے لگتا ہے مزار پر اوپر کی طرف بڑے بڑے الفاظ میں لوگ خدا اور رسول کا نام لکھواتے ہیں مگر یہاں لکھی ہوئی ہے۔ بھانڈوں کی مخصوص گالی! اور اشعار علیحدہ۔ اسوقت سب شعر تو یاد نہیں۔ صرف دو بے ربط مصرعے یاد ہیں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس بھانڈ نے قبرستان ایسے پر ہول و عبرت انگیز مقام کی سنجیدگی کو کس درجہ برہم کر رکھا ہے کہ جو شخص بھی شہر خموشاں میں آتا ہے ہنسنے لگتا ہے:-

سو برس کی عمر تھی اور حال یہ شوخی کا تھا

.. ..

.. ..

آگرہ کی رنڈیاں اس بات کی سب ہیں گواہ

میں اس جگہ کبھی نہیں آیا تھا نہ مجھے معلوم کہ یہ علی بخش کی قبر ہے اور اس پر یہ مہمل باتیں لکھی ہیں۔ لیکن مولوی صاحب نے یقین نہ کیا اور اس قدر زیادہ خفا ہوئے کہ بیان سے باہر۔

یہ میری بدقسمتی ہے کہ ان فیوض کے بارے میں کچھ دریافت نہ کر سکا جو خود مولوی صاحب نے ابھی ابھی علی بخش مرحوم سے حاصل کئے تھے۔ خود ہی پوزیشن صاف کرنا مشکل ہو گئی۔ خطا وار ضرور تھا کہ فاتحہ کے لئے اشارہ میں نے کیا۔ مولوی صاحب اس درجہ برہم تھے کہ کوئی صورت سلجھنے کی نظر نہ آئی۔ اور اسی حالت میں ایک اور بھی عجیب معاملہ پیش آگیا۔

حضرت سید نا ابو النقطے کے مزار اقدس پر حاضری دی۔ مولوی صاحب تانگہ پر سے تیزی سے اتر کر آگے بڑھ گئے

---

[1] "ب ..... چ ....." یہ مخصوص گالی ناچ و رنگ کی محفل میں ایک شستہ بدتمیزی سے زاید وقعت نہیں رکھتی اور اگر قارئین کو نہ بتائی جائے تو ایک طرف قصہ کا لطف جاتا ہے اور دوسری طرف مرحوم بھانڈ کے بارہ میں غلط فہمی واقع ہوتی ہے۔ لہذا لفظ گالی کے بجائے بھانڈوں کا مخصوص لفظ کہنا زیادہ موزوں ہے

کچھ تو تھکا ہوا تھے اور کچھ اس لئے کہ تانگہ یہاں پر رخصت کرنا تھا اور ایسے موقعہ پر مولوی صاحب تانگہ والے کو چھوڑ کر ہدایت کرکے چلدیتے تھے۔ مولوی صاحب لیک کے آگے بڑھے۔ دروازہ ہی پر ایک پاکیزہ مزار ہے۔ مزار پر چادر پڑی ہوئی۔ سب سے زیادہ صاف ستھرا۔ پاکیزہ۔ شاندار۔ قریب اگردان سلگ رہا۔ مور کے پر کی جھاڑو رکھی ہوئی۔ اور مولوی صاحب تانگہ کی چپقلش سے بچنے کو ایکدم سے فاتحہ میں مشغول ہوگئے۔ میں نے تانگہ والے کو کرایہ دیا۔ ورا کمل مولوی صاحب کرایہ کی باتوں ہی سے بچنا چاہتے تھے۔ اور پھر ویسے بھی مزار کس قدر پرکشش۔ میں بھی کرایہ دے کر پہونچا۔

ایک لڑکا آگیا تھا۔ مولوی صاحب نے پوچھا "یہ کن بزرگ کا مزار ہے؟"

لڑکا کچھ چپ۔ میں نے پوچھا "ارے یہ کس کی قبر ہے؟"

"منی رنڈی کی"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کس قدر دلچسپ جواب تھا۔ مولوی صاحب سچ مچ ہاتھ بھر اچھل پڑے اور اس بری طرح ہاتھ جھٹک کر الٹا حول پڑھی ہے کہ گویا فاتحہ واپس چھین لیں۔ اور میرے اوپر پھر منی کا اور بھی خطرناک دورہ طاری ہوگیا۔ اور یہ میری سمجھ میں آج تک نہ آیا کہ منی کو یہ نواح کیسے نصیب ہوگئے۔ منی آگرہ کی بڑی مشہور طوائف گذری ہے اور اتنا روپیہ چھوڑا کہ آج تک اس کے مزار کی نگہداشت ہوتی ہے۔ یہاں بھی میں کچھ نہ پوچھ سکا کہ کیا فیوض حاصل ہوئے۔ مگر مجھے اس قدر ہنسی آئی ہے کہ اس شام کو مولوی صاحب باوجود ہر طرح کے روکنے کے اپنا پروگرام توڑ کر واپس چلے گئے۔ اور ہم سے بیحد خفا ہوکر گئے اس لئے کہ ہنسی کا روکنا ہمارے بس اس قدر محال تھا کہ عرض نہیں کرسکتے اور یہ بات مولوی صاحب کو گوارا نہ تھی۔

ایک دفعہ عجیب جرم میں گرفتار ہوئے۔ چوری نہیں ڈاکہ میں نہیں، جوئے میں نہیں بلکہ میلاد شریف کی شرکت کے جرم میں۔ اتشام کا وقت تھا راہ میں کیا دیکھتے ہیں کہ زور کا میلاد شریف ہو رہا ہے اور مین تو ڈکا وقت ہے۔ سلام پڑھا جارہا ہے۔ دو اور ساتھی تھے مشورہ ہوا کہ کیوں نہ تو اب میں شریک ہوجائیں اور جھٹ سے تبرک لے کر ہوا ہوں۔ ہمت کرکے جا گھسے ہوئے۔ ہم بھی اور ہاتھ باندھ کر آنکھیں میچ کر۔ یا نبی سلام علیک اور ایک دو لمبے لمبے کھینچی تھنیں کہ فاتحہ اور پھر تبرک۔

اکٹھے چار لڈو ملے۔ صف در صف لوگ تبرک لیتے چلے جاتے تھے۔ تبرک دینے والے نے ایک چار قدم چلے کر ٹوکا "اسکول کے لڑکے ہیں آپ"؟ جی۔ اور چار لڈو نی کس اور اب ان لڈوں کو رکھ بھلا کیا سکتے تھے۔ کھانے کی ایسی شئے دھری دھری کیا کچھ نہ طغیان پیدا کرتی سڑک ہی پر ذرا راستہ بچا کر منہ چلاتے جاتے تھے کہ سامنے سے ایکدم سے گویا آسمان سے ٹپک پڑے! بھاری صاحب۔ کیا کھاتے ہو؟ کہاں سے آتے ہو وغیرہ وغیرہ۔ سچ سچ بتادیا۔ سنکر مولوی صاحب نے ایکدم سے کہا "اچھا"۔ ۔ ۔ ۔ "اچھا آ۔۔۔۔ ہوں۔۔۔" اور سیدھے چلے گئے۔ اور اس عجیب و غریب بظاہر بے معنے "اچھا" کے معنی جب سمجھ میں آئے جب ایک انتہا سے زیادہ فضیل ماسٹر صاحب کے سامنے پیشی ہوئی۔ اور پیشی بھی ایسی کہ عدالت کا پارہ ایک سو دس سے متجاوز۔ الٰہی خیر! کیا معاملہ ہے۔ آخر کوئی بات بھی ہو۔ زبان کھولی کہ گرج پڑے برسنے کو تیار۔ چپ اکیا کرتے۔ اور ہمیں آگاہ کیا گیا کہ ہماری شرارتوں کی اب حد ہوچکی اور سارا نزلہ ہمارے اوپر۔ ایک حرف نہ بول سکے اور چپ چلے آئے۔ سخت سزا ملی۔ از قسم حبس وغیرہ

اب باہر جو آسکا تو اپنے ناکردہ جرم کا پتہ لگا۔ معلوم ہوا کہ خیر سے یہ میلاد شریف ایک طوائف صاحبہ نے کرایا تھا۔ وہ خود بھی تھی مع اپنی صاحبزادی صاحبہ کے اور صاحب قسمتے لیجئے کہ ہمیں پتہ بھی ہو۔ ہم نے دیکھا ہی کسے بہت دور "دو آتشہ والے" قسم کے لوگوں میں ذرا دیر کھڑے تو ہم رہے اور نظر تبرک پر رہی اور اب ہمیں ہوئی کہ یہ۔ معلوم ہوا کہ وہ لڑکی اس درجہ خوبصورت ہے کہ شہر دیوانہ ہے۔ اے واہ رے حسن و شباب! جس کے صدقے ہم یوں مارے جائیں۔ بھلا کون ہماری سنتا اور کون یقین کرتا کہ ہم ان صاحبزادی صاحبہ کے چہرۂ عام تک سے محض غافل اور ناواقف تھے۔ بالخصوص جبکہ بہاری صاحب کے والد صاحب قبلہ کے ساتھ جو یہ "حرکتیں" ہم نے نادانستہ طور پر کی تھیں ان سے متعلق نظر کرتے ہوئے نہ صرف ہم چھ ماہ کے "رسٹی کیشن" شدہ طالب علم تھے بلکہ ایک طوائف کے سلام شدہ بھی تھے۔ اور اس قسم کی "حرکتوں" سے باز آنے والوں میں نہیں تھے۔

اور اس کے بعد ہماری وہ ناگفتہ پوزیشن بہاری صاحب نے کردی ہے اس کا اندازہ دشوار ہے۔ کوئی بھی استاد دشمن ہوجائے تو طالب علم کے لئے کیسی کچھ مصیبت نہیں لاسکتا۔ اور ہماری عقل

کام نہ کرتی تھی کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں کہ خدا نے عجیب و غریب طریقہ پر ہماری مشکل حل کر دی۔ عرض ہو کہ اس واقعہ کے بعد ہماری معلومات میں یہ اضافہ ہوا کہ ان نیک و پارسا طوائف نے بھی عجیب دوہرا کھاتہ کھول رکھا ہے۔ کباب پراٹھوں اور دیگر مرغنیات کا جیسا کچھ بھی حصول جنت میں داخل ہی سب جانتے ہیں۔ اب یہ اپنی اپنی تقدیر ہے۔ کوئی خدا کو نمازوں اور روزوں کے زور سے جنت میں جائے اور کوئی جائے کباب پراٹھوں ہی کے زور سے یہ نیک بخت خاتون قوالی اور عرسوں سے لیکر میلاد و مجلس تک بلکہ ہر مذہبی معاملہ میں مرغنیات کا ہنگامہ بپا کرتیں۔ اور طالب علم جو ہماری طرح غفلت مآب نہ تھے جانتے تو دوہرا حصہ لائے۔ اور خاطر علاوہ۔

اور محرم پر یہ نیک بخت کیا کچھ نہ کرتیں مجلس۔ لنگر تک تو صبر مگر عین دسویں کے روز کربلا میں خیمہ تنگا کر وہاں نہ صرف لنگر بلکہ فرید برآں! اپنا تعزیہ دفن کرنے کے بعد دو باتھ خانسامہ سویچ کے دو کباب او۔ ایک گھر کا پیالہ ہر اس فقیر یا بھکاری کا حصہ جو وہاں جا پہونچے اور ہم ایسے طالب علم معصوم دور سے ترسیں۔

محرم کی دسویں۔ کربلا میں تعزیوں کا آخر نظارہ قابل دید تھا۔ تعزیوں کی چمک پر ڈھولوں کی گرج اور باجوں کا شور اور اس پر آدمیوں کا بے پناہ ہجوم۔ ایسے ایک جنت کا سودائی حسین کا شیدائی۔ ہر سائز کے بچے اور ہر قطر و حجم کے مردوں سے لیکر ہر رنگ کی عورتیں۔ وہ ریل پیل کے جاؤ کہیں پہونچو کہیں۔ کہو کچھ سنو کچھ۔ اور اس چھینا جھپٹی میں اسکول کے ہم ایسے معصوم لڑکے لنگر لوٹنے کی تمنا دل میں۔ کھڑے تک رہی ہیں ادھر ادھر کبھی سڑوں کی خوبصورت و دل آزار صورتوں کو تو کبھی مجمع کو۔ میلہ کا لطف ہی کیسر غائب۔ اور بہاری صاحب کی پہلے تو یہ تجویز تھی کہ کوئی لنگر کربلا نہ جائے پھر ترمیم ہو کر یہ ہوئی کہ مقررہ مقام پر بیٹھے یا کھڑے ہوئے دیکھو۔ یا نفاظ دیگر خود دیکھنے کی شے بن جاؤ۔

اور کھانے کو جی چاہا تو کر کرے کباب یا پھلکی پھلکیاں چٹ گئیں۔ تو یہ ہی تھی۔

اس شور و تشغب سے پرے ہٹ کر ایک درخت کے نیچے! افوہ! دوڑے تیزی سے پر پہونچتے پہونچتے نیا پار تھی۔ بمشکل باقر خانی کا ٹکڑا ہاتھ آیا۔ ہمارے ٹھکے بھوکے ویسے۔ کھایا جو سہی تو ذائقہ کی لکیر سی حلق میں بن گئی۔ یہ ہمارے ایک دوست کے جو یہ مال اڑا لائے اور ہم نے حسرت سے اوس طرف دیکھا۔

وہ سامنے۔ بہت فاصلہ پر۔ بالکل کنارے۔ انہی نیک بخت خاتون کے خیمے دور ہی سے چمک رہے تھے۔

اور گل بکاؤلی کو بھی تو کوئی لے ہی آیا۔ راستہ میں ایک ایک دیو موجود۔ وہ دیو کھا جائیں یہ دیو نہیں کھائیں۔

کوئی میل بھر کا چکر کاٹ کر تن تنہا کربلا کی پشت پر پہونچے۔ جنگل ویران بہت۔ اور میل بھر کا چکر اور دیا جو صحیح راستہ پر آئے۔ درمیان میں بہتری پہاڑیاں اور خندقیں حائل۔ گھرے ہوتے ایک جگہ۔ ٹھیک قناتوں کے وسیع احاطہ کی پشت پر نکلے ان قناتوں کے اندر کھانا پک رہا تھا۔

فاصلہ پر دو خیمے تھے۔ پھر واپس ہوئے اور خیموں کے دروازوں کی سیدھ میں آنے کے لئے بڑا لمبا چوڑا چکر کاٹا۔ ایک خیمہ بالکل علیحدہ تھا اوسپر سامنے چق پڑی تھی۔ کوئی عورت سبز دوپٹہ پہنے دوسرے چمک رہی تھی۔ اب پھر واپس لوٹے۔ قناتوں کی نشست کی طرف ہوتے ہوئے پہلا خیمہ چھوڑا۔ وہاں کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ دوسرے خیمہ کی عین پشت پر جا نکلے۔ اور لگا کر کان سننا۔ خاموشی۔ مگر نہیں کچھ۔ باتوں کی آوازیں۔ کان لگائے۔ منہ دوسری طرف سنتے ہی تھے کہ آہٹ ہوئی۔ مڑ کر دیکھتے ہیں تو ارے! کلیجہ دھک دھک ہونے لگا۔ یہی نیک اور پارسا خاتون کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

"آؤ۔۔۔ میاں اندر آؤ۔۔۔ تبرک کھانے آئے ہیں۔۔۔ آئے۔۔۔۔"

آخری آئے کے ساتھ ہی آگئے۔ چق اوٹھا کر خیمہ میں داخل ہوئے۔ بھی واہ۔ کمال ہو گیا! ہمارے ایک کلاس فیلو بیٹھے کس تیزی سے کھا اڑا رہے ہیں! ساتھ ایک ارتی حضرت۔ بڑی بڑی زلفیں۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے۔ انتظار کاہے کا۔ ہم بھی جھک پڑے اور یہ ہمارے دوست کھا چکے تھے لاکھ روکا پر نہ رکے۔ یہ وارثی حضرت بھی فارغ ہو چکے تھے۔ یہ بھی اٹھ گئے۔ اب ہم نے خیمہ کو دیکھا۔ کیسا صاف شفاف فرش۔ سر پر ایک چھوٹا سا جھاڑ۔ اور متعدد تبوری ہانڈیاں۔ قالین صاف ستھرے گاؤ تکئے لگے اور بیچ میں ایک لکڑی کی سینی میں کھانا تھا۔ گرما گرم

باقرخانیاں سیخ کے کباب - مولی کی قاشیں - پنیر کے ٹکڑے اور کھیر کے پیالے - ہم خوش ہوئے کہ یہ کوئی نہیں اور یہ پارسا خاتون کس قدر خاموش اطبع اور نیک ہیں -

لیکن ایک چار لقموں سے سوا نہ لئے تھے کہ آگئی آفت

ماسٹر صاحب کی چکی دلنے کی سی آواز یہ وہ ماسٹر جن کے روبرو میلاد کی پیشی ہوئی - سن سے بجلی کانوں سے پار - اور ان نیک بخت خاتون نے سر کو جھٹک کر ہاتھ سے اشارہ کیا - خیمے کے دو حصے تھے پشت کے حصہ پر پردے پڑے تھے - ایک کے ہم اندر رکھے - اور گھسے ہی تھے کہ ششدر رہ گئے - صاحبزادی صاحبہ بلند اقبال ایک رضائی اوڑھے قالین پر بیٹھی سگرٹ پی رہی تھیں - ماتھے پر بیڑی لگی تھی - انھوں نے مسکرا کر فرمایا - آیئے بیٹھئے - اور ساتھ ہی ماسٹر صاحب کے خیمہ میں داخل ہونے کے ساتھ ائی گرجدار آواز - اور میں نے اشارہ سے بتایا - لڑکی سمجھدار تھی - اشارہ سے انہیں پاس بیٹھنے کو اشارہ کیا -

ماسٹر صاحب شکاری کتے کی طرح دراصل ہمارے اُن دوست کے تعاقب میں آئے تھے جو کھابی کر چل بھی دیئے کیا صاف نکلا ہو - ان خاتون سے مکرر سہ کرر پوچھا کہ کوئی لڑکا تو نہیں آیا اور حلیہ بتایا - انھوں نے انکار کر دیا - پھر پوچھا - پھر پوچھا اور ہر دفعہ نرمی سے انھوں نے جواب دیا کہ کوئی نہیں آیا - اور تبرک کھانے کی دعوت -

ماسٹر صاحب قدرے بگڑ کر بولے کہ " دیکھئے آپ نہیں مانتیں لڑکوں کو چھپا کر کھلاتی ہیں اور ہم جو آپ کے یہاں آتے ہیں تو در اصل محض اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے کہ لڑکے تو نہیں آتے - اور اتفاقاً اگر ہم یہاں بے تکلفی برتیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ لڑکوں کو اپنے ہاں آنے کی ترغیب دیں - اور ان نیک بخت خاتون نے بڑی نرمی سے ماسٹر صاحب کو ٹھنڈا کیا - ماسٹر صاحب نے شب میں تبرک کھانے کا وعدہ اور پھر صاحبزادی صاحبہ کو پوچھا معصومہ کیسی ہو - اور قبل اس کے کہ وہ جواب دیں وہ ادھر ہی آئے

نہ سوچنے کی مہلت نہ بھاگنے کی فرصت معصومہ نے جلدی سے مجھے اپنے پاس ہی لٹا کر رضائی ڈھک دی اور میں اس میں بالکل گڑی مڑی ہو گیا - ایسا کہ سرانی پشت کی طرف اور ایک رضائی میں دو کیسے آئیں ! ضرورت سے زیادہ بے تکلفی نہ برتوں تو ٹانگیں نکل جائیں - اب ہم دونوں ایک رضائی میں وہ بھی

کیا میرے اوپر لدی ہوئی - اور میں گٹھری بنا - دل ہے کہ انجن کی طرح چل رہا ہے - یا میرے اللہ - عمر میں ایسا سخت وقت کب پڑا -

ماسٹر صاحب نے پردہ اٹھا کر جھانکا - " جیتی رہو... پیو پیو... " سگریٹ کے بارہ میں کہا جو انھوں نے خاکدان میں رکھ دیا تھا اور سلگ رہا تھا - اور مختصر مزاج پرسی ... یہ کون ہے ؟

" میری ایک بہن ہیں ... میری سہیلی ہیں ... "

ماسٹر صاحب خاموش ! برسوں لگ گئے - افوہ ! کس قدر طویل خاموشی تھی - برسوں کی طوالت -

" سو رہی ہیں کیا ؟ "

" جی ہاں "

" کیا کچھ طبیعت ... "

" جی ہاں ... کئی راتیں جاگتے کٹی ہیں ... "

" کون ہیں یہ ... ؟ "

اب میرے حواس اس درجہ زائل ہو چکے تھے کہ سوچا کہ اٹھ کر بھاگوں - ڈیوڑھی سے نکل کر اسٹیشن کی طرف اور چلا جاؤں گھر - اور نہ معلوم میں کیا کچھ نہ کر گذرتا کہ معصومہ نے (نام اصل اور تخلص قدرے غیر ٹھیرے) لہجہ میں ایک وقار کے ساتھ کہا -

" میری ایک سہیلی ہیں آپ نہیں جانتے ... "

اور اس جملہ کا مطلب تھا - کالا آدمی تم فوراً بھاگ جاؤ اور ماسٹر صاحب چل دیئے -

اور میں اس قابل رشک پوزیشن میں پہنچ کر اس غیر معمولی کشمکش کی تکلیف سے ادھ مرا سا ہوا پڑا تھا کہ خطرے سے بچنے کا احساس ہوا - اسی کے ساتھ اپنے نوعمر اور خوبصورت ساتھی کی معطر اور معنبر رضائی اور کپڑوں کا دماغ پر ایک پرسرور اثر ہوا -

" گئے ... گئے ... اٹھئے ... " رضائی گھسیٹتے ہوئے وہ بولی - اور میں اٹھا - اس کا روشن اور خوبصورت چہرہ کس قدر دلکش اور کس قدر جاذب نگاہ تھا - اور چہرہ پر ایک دلچسپ مسکراہٹ مسلط - آنکھوں میں شوخی - اور عجیب چمک - اور مجھے غور سے دیکھ رہی ہے -

" آپ تو بہن ہیں میری ... " اس نے ہنستے ہوئے کہا " دیکھ لیجئے کیسا بچایا ... "

میں نے کہا " بچایا تو خوب ... "

اور مسکراتی ہوئی وہ نیک بخت خاتون آئیں "تبرک تو کھا لیجئے۔۔۔۔"

"کھانے سے بھاگنا پڑا تھا۔۔۔۔" اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا جس کی آواز کی کھنک غم میں پہلی دفعہ محسوس ہوئی۔ اور اُٹھے اور بھولا ہوا سبق پھر سبق پھر شروع کیا۔ ابھی دفعہ ان نیک بخت خاتون نے ایک پہر جگا پڑھا دیا کہ دیکھتے رہو کوئی ماسٹر نہ آنے پائے۔

گرم پراٹھے آئیں اور ہم نے بھی نئے سرے سے کھانا شروع کیا۔ بڑے خیال سے چھوٹے تھے۔ مگر قسمت بھی تو عجیب لے کر آئے تھے۔

معصومہ نے ماں سے سر میں درد کی شکایت کی اور جلنے کو کہا۔ تانگہ موجود تھا اور ماں بیٹیاں دونوں جانے لگیں ماں بیٹی کو تانگہ تک پہونچانے۔ مجھ سے معذرت خواہ ہوئیں اور کھانے کی سخت تاکید کر کے روانہ ہوئیں کہ "ابھی آئی۔ بس ابھی ابھی آئی۔۔۔۔" تین دفعہ تکرار کے ساتھ اور تاکید کے ساتھ کھانے کی فرمائش۔

اور پانچ منٹ بھی بہت ہوتے ہیں بمشکل ایک دو نوالے لئے ہوں گے کہ وہ آ گئے۔۔۔۔ "مولوی بہاری" نوکر افیونی اونگھتا تھا۔ اس نے بتایا کہ "ادھر" گئی ہیں میں دسترخوان سے اُٹھ ہی چکا تھا اور قلعہ کی طرف بڑھ کر پردہ تھامے کھڑا تھا۔ کہ اگر یہ حضرت خیمہ کے اندر آنے لگیں تو پھر اسی طرح چھپ جاؤں اب اس نالائق افیونی کو دیکھئے کہ یہ نہیں بتاتا کہ بیٹی بھی گئی ہے۔ نہ ان حضرت کو "خالی" خیمہ میں آنے سے روکتا ہے۔ جس کی طرف پیٹھ ہے میں کہ میں جھٹ سے خیمہ کے دوسرے حصہ میں پہونچ کر اسی صفائی میں لپٹ کر پھر گڑی مڑی ہو گیا اور مولوی بہاری صاحب ایک عجیب بے تکلفی کے لہجہ میں آواز دیتے ہیں "معصومہ بی۔۔۔۔" اور یہ کہتے ہوئے سیدھے وہ میرے پاس پہونچے یا اللہ اب میں کیا کروں۔ مولوی صاحب رُکے اور آہستہ سے بولے "سو رہی ہو۔۔۔۔ معصومہ بی۔۔۔۔ معصومہ۔۔۔۔ ارے کیوں بنتی ہو۔۔۔۔"

خاموش ہو گئے اور میں سمجھا کہ دفعان ہوئے کہ وہ بولے "تم یوں نہ مانو گی۔۔۔ نہیں کیسے اُٹھے گی"

اور یہ کہہ کر میرے قریب آ کر انگلی سے حضرت لگے گدگدانے۔ ٹوٹتے۔ ہانپتے "ارے۔۔۔۔ بڑی شریر ہے۔۔۔۔ ٹھہر تو جا۔۔۔۔ اون۔۔۔۔ن۔۔۔۔ن۔۔۔۔ (ٹھٹک کر) ہم نہیں بولتے۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔ (چمکا کر۔۔۔۔) اٹھو۔۔۔۔ آنکھیں اپنے کون اُٹھے۔۔۔۔"

اور ممکن ہو کہ یہ "آنکھیں میچیں کون اُٹھے" والا لافانی جملہ بھی بیکار جاتا۔ اس سے بہتر کون موقعہ ہو سکتا تھا۔ لیکن میں ایسی صعوبت میں تھا کہ اب بھی نہ اٹھتا اگر ساتھ ہی مولوی صاحب یہ ایک "اور" کا رروائی نہ کی ہوتی۔ میرے کوٹ کے بٹن رضائی کے اوپر ہی سے کم از کم میرے تجربات زندگی کے لحاظ سے کچھ ایسے نئے طریقہ سے ٹٹولے اور کہا جو "آنکھیں میچیں کون اُٹھے" کہ بندہ پھڑ پھڑا کر اُٹھ بیٹھا! اور رضائی ایک طرف پھینک کے مودبانہ سلام عرض کیا۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ وہ سربستہ راز میں رہے گا۔ دو خدا حافظ کے پیالے۔ دو شیرمالیں اور کتاب لے کر جو بندہ وہاں سے غائب ہوا تو سیدھا جنگل کی طرف سے ہوتا خالی ہاتھ اپنے ساتھیوں میں آ ملا۔

گذشتہ سال اسی قسم کا مضمون بعنوان "معذرت" ندیم میں شائع ہوا تو پٹنہ کے ایک رسالہ کے ایڈیٹر صاحب نے خط لکھا کہ میں بھی اسی اسکول کا اولڈ بوائے ہوں اور پہچان کیا تمام مقامات وغیرہ اور تصدیق چاہی۔ میں نے جواب نہیں دیا۔ اس قسم کی باتیں کسی قومی اسکول یا ادارہ کے بارہ میں غلط فہمی پیدا کرنے علاوہ اس کے "کہانی" کا لطف غائب لہٰذا کوئی حضرت اس بارہ میں خیال آرائی نہ فرمائیں اور اسکو افسانہ ہی سمجھیں۔

اور ۳۴ء میں ایک مقدمہ کے سلسلہ میں مکلتہ سے واپسی میں حضرت انجم سابق ایڈیٹر ندیم کے درد ولت پر معرکہ کتاب گرم تھا کہ ایک صاحب "بمصداق "ٹوریٹ" چھڑی ہاتھ میں ٹرکی ٹوپی عینک لگائے تشریف لائے۔

حضرت انجم کے تعارف کرایا اور قبل اس کے کہ میں کچھ عرض کر سکوں۔ "ابھی حاضر ہوا" کہہ کر جو وہ غائب ہوئے ہیں تو۔

"تب سے اے حضرت منتظر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

شاد کے نئو شعر
قیمت ۴ر
منیجر "ندیم"

"..... بخیر گذشت"

از جناب محمد ایوب صاحب آبگلوی، بہار شریف

میں جانتی بھی نہ تھی کہ عشق و محبت کس کا نام ہے لیکن میں نے دیکھا کہ آپا جن کو میں اور میری دوسری ہم جماعت لڑکیاں مذاقاً عاقلہ بوا کہا کرتی ہیں وہ میاں فہیم پر بری طرح ٹھوہیں۔ میاں فہیم ہمارے ہی درجہ کے طالب علم ہیں اور کوئی تخاص بات لیتے اندر نہیں رکھتے، البتہ خوش پوش اور جاذب نظر ضرور ہیں تو بھلا ان سے کب کم تھی۔ جس جماعت میں آپا پڑھتی تھیں اسی جماعت میں، میں بھی پڑھتی تھی، جو جو سبجکٹ ان کا تھا، وہی ہمارا۔ چلنے، پھرنے، دوڑنے ہنسنے، پھلانگ مارنے، ناک، کان، آنکھ، دانت سب میں برابر بلکہ دامن ہاتھ میں ایک انگلی میرے ہی فاضل تھی۔ البتہ عمر میں آپا ہم سے دو ایک سال بڑی تھیں۔ تو اس کا چنداں اعتبار بھی نہیں، اور سعدی دادا نے تو فرمایا ہی ہے "بزرگی بعقل است نہ بسال"۔ وہ اپنا نام عاشقوں کی فہرست میں درج کرالیں اور میں فیل ہو جاؤں۔ بس میں نے بھی عشق و محبت کا سودا مفت دینے کی ٹھان لی۔ آن میں انسان کیا کچھ نہ کر گذرتا ہے۔ پیسہ کی کیا حقیقت ہے اور یہاں تو عشق کا سودا کرنے میں کچھ صرف نہ تھا۔ مفت ہی ـــ۔ مفت، تو پھر میں کیوں چوکتی۔

فکر یہ تھی کہ آپا کو تو ایک خوش پوش جاذب نظر معشوق دستیاب ہو گیا۔ میں کہاں تلاش کروں، کیا فرہاد کی طرح مجھے بھی کوہ بے ستون لانا پڑے گا، مگر آخر کل اپنا مقدر اوج پر ہے۔ بغیر جستجو کے ایک معشوق مل گیا، اور نہایت مناسب اور حسب حال، قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے آپا سنجیدہ اور متین، میں چلبلی اور شوخ مگر فیشن پرست آپا نے اپنی عادت کے خلاف معشوق منتخب کیا۔ یعنی معشوق ان کا چنچل اور فیشن کا دلدادہ مجھے تو صرف ریس کرنی تھی۔ عشق و عاشقی سے کچھ کام نہ تھا، میں نے سمجھا گھر سے دور دراز ہوں، طبیعت گھبراتی ہے لاؤ دلبستگی کا ایک سامان ہی خدا نے مہیا کر دیا ہے ہم جماعت لڑکوں کو میں اکثر مذاق کرکے دق کیا کرتی تھی یہ بھی ایک مذاق ہی سہی چنانچہ ایک سیاہ فام لاابالی قسم کا انسان جس کے بدن پر لکھیاں بھن بھن کرتی رہتی تھیں، اپنی غربت کی وجہ سے ہفتوں ایک ہی لباس پہن کر کالج آتا، اور سب سے علیحدہ ایک گوشہ میں سیٹ پر بیٹھ جاتا، اسکو میں نے اپنا معشوق منتخب کیا۔ اور دل ہی دل میں خوش تھی کہ چیر خوانی کا اچھا وسیلہ ہاتھ آیا۔

اب میرے سر دوہری ذمہ داری آن پڑی تھی۔ میں کیا جانوں عشق کس طرح کیا جاتا ہے۔ میں اس جستجو میں رہی کہ ہماری آپا اپنے عاشق کے ساتھ کیا کیا سلوک کیا کرتی ہیں، "جویندہ یابندہ" مجھے خاطر خواہ کامیابی ہوئی، میں نے دیکھا آپا مسٹر فہیم سے نہایت ہنس ہنس کر گفتگو کرتی ہیں، مسٹر فہیم کی سیٹ کے پاس ہی انھوں نے اپنی بھی جگہ بنا لی ہے۔ کالج سب سے پہلے آجاتی ہیں اور کلاس سے سب کے بعد جاتی ہیں، درجہ کا درجہ پروفیسر کا لکچر سنا کرتا ہے۔ لیکن آپا رخ یار کے مطالعہ کرنے میں مشغول رہتی ہیں۔ میں نے بھی پیروی شروع کر دی، خلاصہ یہ کہ میں آپا کی نقل و حرکت کا جائزہ لیا کرتی اور جب کوئی نئی بات ذہن میں آتی، میں بھی عمل پیرا ہو جاتی، ان واقعات نے مجھے پکا جاسوس بنا دیا۔ اور میں ایک پختہ کار کی طرح حرکات و سکنات کی نگرانی کرتی رہی، مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ درجہ میں قبل آنے اور بعد میں جانے کا سبب کیا ہے۔ دراصل اسی مہلت میں عشق و محبت کے متبادلہ نامہ و پیام کیا کرتے ہیں، آپا گھر سے خط لکھ کر لایا کرتیں، اور رکھ دیا کرتیں۔ مسٹر فہیم کی طبیعت میں امنگ اور چلبلاپن ہے، درجہ ہی میں مجھے جواب لکھ کر دراز میں رکھ دیتے، آپا فرصت کے بعد انتظار میں رہتیں۔ تمام ہم جماعت کلاس سے باہر ہوئے نہیں کہ انھوں نے دراز سے خط نکالا اور گھر کی راہ لی۔

خط و کتابت کا تو حال معلوم ہو گیا۔ لیکن کیا لکھا جاتا ہے مضمون اور القاب کی خبر نہیں، بڑی پریشانیوں اور الجھنوں کے بعد یہ خیال دماغ میں آیا۔ کہ آپا فونٹین پن سے زیادہ پنسل استعمال کرتی ہیں اور پنسل کو دانتوں تلے دبا کر لکھنے کی عادی ہیں۔ اسی

..... دوسرے پیراگراف کے آخر میں دراز سے

لئے اونکی پنسل برزنانہ قریب قریب بناکرتی ہے' اس خیال کا آنا تھا کہ میں نے انکی تمام کاپیوں میں دس بارہ ورق سادہ کاغذوں کے بعد ایک ایک کاربن پیپر رکھدیا اور اس ہوشیاری سے یہ کام عمل میں آیا کہ آپا کو تعلق اس کا علم بھی نہ ہوسکا۔ اس دن میں قصداً کالج نہ گئی' اب جو کاپیاں دیکھتی ہوں' تو پہلا ہی تیر نشانہ پر لگا تھا۔ ایک کاپی میں اس مضمون کا خط دستیاب ہوا' میں نے نہایت ہوشیاری سے اس صفحہ کو کاپی سے علیحدہ کرلیا۔ اور کاربن پیپر پھر اسی جگہ چھپا دیا۔

***

بمبئی

۲۵ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء

ڈیر فہیم!

تم آزاد ہو' ناں نہ باپ' اس پر استبداد مجھ سے بے اعتنائی برتتے ہو' اور میں ہر طرح پابند ہوں۔ سوسائٹی کا ڈر' والدین کا خوف' بدنامی کا ہراس' ان باتوں کے باوجود میں نے تم کو دل کی انتہائی گہرائیوں میں جگہ دی ہے' اور تم میرے تعلق دل کے واحد نگراں ہو' تعلیل کی وجہ سے تم پر دو ایک روز نظر نہ پڑتی ہے تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے' خدا کے لئے اس سلسلہ خط و کتابت کو جو میری زندگی کا ذریعہ ہے' قطع نہ کرو۔ میں رات بھر تمہارے خط کو آنکھوں سے لگائے رکھتی ہوں' والسلام۔

تمہاری کنیز

عصمت آرا

ایک ہفتہ کے اندر متعدد خطوط دستیاب ہوئے۔ ہر خط میں اظہار محبت رہتا' اور مسٹر فہیم کی سرد مہریوں کی شکایت رہتی' میں ان تحریروں سے مسکرا مسکرا کر خوب لطف اندوز ہوا کرتی۔ افسان کی بلند پروازیوں پر مجھے سخت حیرت تھی' میں خفا پڑھتی اور اضطراری طور پر قہقہہ لگایا کرتی۔ لیکن بہرحال خطوں کا طور طریق معلوم ہوجانے کے بعد مجھ میں بھی گدگدی سمائی اور اپنے معشوق کو حسب ذیل محبت نامہ لکھ مارا:-

جان عاشق

میں جب سے یہاں تعلیم حاصل کرنے آئی ہوں خدا معلوم کیا راز ہے کہ دل آپ کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ ایک نامعلوم کشش ہے کہ بار بار مجھے آپکی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ دو ایک روز نظر نہ پڑنے سے کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ میں گویا کھوئی سی رہتی ہوں۔ اندرونی کرب و اضطراب کے ماتحت یہ خط لکھ رہی ہوں' امید کہ آپ مجھ غریب الوطن کی حالت ناگفتہ پر رحم فرما کر سلسلۂ رسل و رسائل جاری فرمائیں گے' آپ کی موجودگی میں آپ کی دلکش صورت کو دیکھ کر اطمینان حاصل رہتا ہے۔ آپ کی غیر موجودگی میں آپ کی تحریروں کو دیکھ کر تسلی و تشفی رہے گی۔

آپ کی

عصمت آرا

لیکن میرے حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب سکوت کے اس مجسم تپنے میرے خط پر کوئی التفات نہیں کیا۔ یاد دہانی کیلئے میں نے دوسرا' پھر تیسرا' یہاں تک کہ سات خط لکھ ڈالے مگر کسی کا کوئی جواب نہیں ملا۔ اب میں سخت کش مکش میں مبتلا ہوگئی۔ میں چھیڑ چھاڑ کرنا چاہتی تھی' مگر وہ چڑیا ہاتھ نہ آرہی تھی' آخر عاجز آکر میں نے بناوٹ کے خاص انداز میں دبی صورت بناکر مسٹر تہمل سے عرض کیا۔ "میں آپ کو خط لکھتی ہوں لیکن آپ مجھے جواب سے محروم رکھتے ہیں؟" اسوقت تو میاں سہل خاموش رہے یہ کہتے ہوئے آنسوؤں کے دو قطرے اپنی تیہ بری ناکامی سے میرے رخساروں پر ڈھلک گئے۔ یہ آخری نسخہ کارگر نکلا۔ چنانچہ دوسرے ہی روز میری دراز میں ایک خط موجود تھا۔

***

بمبئی۔

محترمہ تسلیم

بلاشبہ آپ کے خطوط مجھے ملے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ غلط فہمی کی بنا پر مجھے خطوط مل جایا کرتے ہیں۔ اصل مخاطب کوئی اور ہی ہے۔ اور یہی میری خاموشی کا باعث تھا۔ لیکن آپنے صاف بالمشافہ جو فرمایا' تو مجھے بہت استعجاب ہوا۔ یہ آپکی ناتجربہ کاری ہے' آپ دیا نہیں

دیکھی ہے۔ میری ہنسی اور آپ کی اعلیٰ شخصیت کے درمیان بعد المشرقین ہے۔ میں روٹیوں کو محتاج دوسروں کی اعانت کے بھروسے تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ اور ماشاءاللہ آپ کے والدین صاحب ثروت ہیں۔ آپکی روٹیوں پر دوسرے پرورش پاتے ہیں۔ آپ حسین و جمیل ہیں اور صحت اور ملاحت کی دولت سے مالا مال ہیں اور میں کندہ ناتراش ہوں۔ میری صورت رات کو دیکھ کر لوگ خوف کھاتے ہیں۔ اس لئے دست بستہ گذارش ہے کہ اس خیال کو آپ ہمیشہ کے لئے دماغ سے نکالدیں ورنہ اس کا انجام ہم دونوں کے لئے خراب ہوگا۔

آپ کا خیر خواہ

سہیل

خط پڑھکر میری شریر فطرت کو ایک ٹھیس لگی۔ میں کمند پھینکتی ہوں اگر وہ زمین بوس ہو کر کمند سے باہر ہو جاتا تو میری فطرت بھی عجیب واقع ہوئی ہے جب میں کسی کام کا تہیہ کر لیتی ہوں تو پھر اس خیال سے باز نہیں آسکتی۔ اور مسلسل کوشش کے باوجود جب ناکامیابی ہوتی ہے تو مجھ پر غم و اندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔

اس خط نے میری جسر توں کا خون کیا تھا میں سخت مغموم تھی اسی حالت میں ایک خوشامدانہ خط لکھ مارا۔ الحمدللہ اس حالت میں جو خط میں نے لکھا تھا وہ میرے موجودہ حالات اور جذبات کا آئینہ دار ثابت ہوا۔ مجھے عشق کی تو بیماری تھی نہیں مگر ناکامیابیوں نے مجھے پریشان کر دیا تھا، جس سے مسٹر سہیل متاثر ہوئے اور قدرے راہ پر آئے، اور بعد کے خطوط نے تو انہیں رام کر لیا۔

میں اب ایک پختہ کار اداکار کی طرح اپنا پارٹ ادا کر رہی تھی اور میاں سہیل میدان عشق میں "واہق" فریاد" محبوں سبھوں سے بازی لے جا چکے تھے۔

(۲)

دو برس گذر گئے کوئی خاص بات ظہور میں نہیں آئی، البتہ میاں سہیل پہلے سے زیادہ پڑھنے میں غرق نظر آنے لگے، خدا خدا کر کے سالانہ امتحان ختم ہوا سب لوگ اپنے اپنے مکان روانہ ہوئے، آپا اور مسٹر فہیم میں خدا معلوم گھنٹوں کیا کیا راز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔ میں نے ابھی میاں سہیل سے تخلیہ میں پیار کی خوب خوب باتیں کیں۔ امتحان کا نتیجہ شائع ہوا۔ آپا اور ہم دونوں سکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔ مسٹر فہیم تھرڈ ڈویژن میں لیکن وہ دہقانی سہیل پوری یونیورسٹی میں اول آیا۔ پروفیسروں کی کوشش اور سفارش اور میاں سہیل کی قسمت نے اس کے اقبال کے ستارہ کو چمکا دیا اور وہ آئی سی ایس کے امتحان کے لئے لندن بھیجا گیا۔

اس کے بعد اتفاق دیکھئے وہ آئی سی ایس میں کامیاب ہو کر لندن سے واپسی کے بعد ہمارے ہی شہر میں بحیثیت جوائنٹ مجسٹریٹ اس کی تقرری ہوئی۔ لندن کے قیام کے دوران میں اور اس کے بعد بھی میاں سہیل مجھے عاشقانہ خطوط لکھتے رہے مگر وہ تو کالج کی زندگی تھی اور فضا و ماحول کی دلچسپیوں کے ماتحت میں اسے چھیڑا کرتی تھی ورنہ اس کی گھناؤنی صورت سے تو مجھے سخت نفرت تھی۔ چنانچہ میں اب بالکل خاموش تھی۔ اور اس سکوت کی وجہ سے بلائیں ٹلتی رہیں۔

(۳)

آپا کی شادی مسٹر فہیم سے ہو چکی تھی میاں سہیل کی ان لوگوں سے آمد و رفت تھی کبھی میاں سہیل ان کے ہاں جاتے کبھی یہ دونوں ان کے ہاں جاتے، فہیم بھائی نے ایک دن مجھے بغلوں میں سہیل کی سفارش کی اور آپا نے تو کھلم کھلا کہہ ہی دیا "تم کیوں اس کو ناحق پریشان کرتی ہو وہ تمہاری دن رات تسبیح پڑھا کرتا ہے، اور تمہارے ہی یاد میں وہ زندہ ہے۔ مگر تم اس قدر اس سے برگشتہ ہو آخر معلوم تو ہونا چاہئے اس میں کیا خامی ہے" اس کے کارنامے دیکھو برابر درجہ میں اول آیا، یونیورسٹی میں اول آیا۔ آئی۔ سی۔ ایس کے زبردست مقابلہ میں تمام ہندوستانیوں میں بھی اول آیا، اس وقت جوائنٹ مجسٹریٹ ہے، آئندہ مزید ترقی کی امید ہے"۔ مگر مجھے تو اسکی صورت سے نفرت تھی، اس وعظ و پند کا مطلق اثر نہ ہوا۔ بلکہ آپا فہیم بھائی اور میاں سہیل کی ہم جنسی سے مجھے اندیشہ ہوا اور اکثر چھیڑ کر رد دیا کرتی کہ کہیں تمہیں بھائی اور آپا میری شادی میاں سہیل سے کرانے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ البتہ اس خیال سے دھارس بندھتی تھی کہ والدین جب مجھ سے دریافت کریں گے تو اپنی فطرت کو مجبور ہو کر بھی جا لائے طاق رکھ کر صاف انکار کر دوں گی پھر اس خیال کی ناپسندی بھی ہوتی کہ ہندوستان میں لڑکیوں سے عموماً اور لڑکوں سے بعد (خراشت سمجھا جاتا ہے۔ اب میں شب و روز ایک روحانی اذیت میں مبتلا تھی۔

× کرتا ہے مجھے تمہارا خیال کہ تم ہو مصروف کار دنیا میں
خانہ داری کا ہاں وہ مصروفیت جس نے تمہارا دل لیا ہے چھین
ہاں مگر تم کو ہو مبارک ہو ہم کو ہے اس کا رنج اور یقین
اس کی تکمیل کے لئے تم نے کیا کیا کیا ہے کیا کیا ہے کیا کیا ہے

بھکاری

از جناب ایم ذکی اختر صاحب ہاشمی عظیم آبادی

ایک بھکاری مسجد نما خدا سے ہو کر اپنا دست سوال پھیلائے بغل میں ایک میلی سی جھولی لٹکائے "تمہارے کی کھمبو بابا ..... لاچار کی کھمبو بابا" کی رٹ لگاتا ہوا ادھر سے اُدھر نکل جاتا۔ کسی نے دیا کسی نے نہیں دیا۔ لیکن دنیا کا سرد گرم دیکھا اور سہا ہوا انسان کسی کے دینے اور نہ دینے کا خیال کئے بغیر اپنی زندگی کی راہ ناپتا اور سیاوتفات "کی ہولورے بابا ..... کو تھائی گیلورے بابا" کی بے سری آواز سے الاپتا ہوا اور چلاتا جاتا۔ داڑھی کے الجھے ہوئے گچھے میلے کچیلے بال اور چھوٹی چھوٹی گرداگرد آنکھوں سے اسکی پریشان حالی اور تیرہ روزگاری کے آثار ہویدا تھے۔ پہاڑ جیسی مصیبتوں کے بارگراں سے وہ دبا جا رہا تھا۔ اسکی ہر سانس موت کی ہچکی معلوم ہوتی، لیکن جب اس سے اسکی افسردگی اور رنج و ملال کی وجہ دریافت کی جاتی تو کوئی حرف شکایت اس کی زبان پر نہیں آتا۔ ہمیشہ یہی کہہ کر ٹال دیتا۔ "سنسار کی یہ ریت ہی بابا"

گرمی کی تعطیل تھی۔ نیشنل کالج طویل عرصہ کے لئے بند ہو چکا تھا۔ کدار ناتھ اس چھٹی میں کلکتہ کی سیر کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ اس لئے چھٹی کے دوسرے ہی دن اس نے اپنا رخت سفر باندھا۔ دوسرے دن وہ کلکتہ پہنچا اور ایک ہوٹل میں قیام پذیر ہو کر سیر کی۔ ایک دن وہ رکشے پر سوار مسجد نما خدا کے نزدیک پہنچا ہی ہوگا کہ سامنے سے وہی بھکاری میلی سی جھولی لٹکائے "کی ہولورے بابا ..... کو تھائی گیلورے بابا" کی بے لے راگ الاپتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ کدار کی آنکھیں اس پاگل بھکاری کی طرف آنکھوں سے جالڑیں اور اس کے نرم اور درد مند دل کو ٹھیس لگی اور اسکی زبان سے نکلا "یہ غریب ..... پاگل ہے"

"کیا دیکھتے ہیں بابو ..... اسکی تقدیر ہی خراب ہے" رکشے والے نے کہا سنتے ہوئے کہا۔

"تم اسکو جانتے ہو؟" کدار نے رکشے والے سے پوچھا۔

"جانونگا کیوں نہیں" رکشے والے نے جواب دیا "میرے مکان سے ایک ہی ڈیڑھ میل پر تو اس کا گھر تھا"

"زور زور سے یہ بک کیا رہا ہے"؟ کدار نے حیرت سے تکتے ہوئے پوچھا

"ایسے ہی بڑبڑاتا رہتا ہے۔ ابھی تو کہہ رہا ہے کہ "کی ہولورے بابا ..... کو تھائی گیلورے بابا"

"ایسا کیوں ..... ؟ کیا یہ خاندانی گداگر ہے"؟ کدار نے بھکاری کو بھانک کر غور و دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں بابو! اسکی تقدیر ہی اندھی ہے ..... زمانہ کے الٹ پھیر نے اسے غریب بنا دیا۔ بابو! یہ دکھیارا ہے۔ اسکی بپتا سکا دکھ ایسا نہیں جو منٹ دو منٹ میں کہا جا سکے"

"اچھا۔ پارک میں چل کر تمہیں اسکی بپتا سنانی ہوگی" کدار نے زور دے کر رکشے والے سے کہا۔

ایک درخت کے پاس جو پارک کا آخری حصہ تھا دونوں بیٹھ جاتے ہیں۔ اور رکشے والے نے کہانی یوں شروع کی۔

اس کا نام کلوا ہے۔ اس کا باپ اپنے گاؤں کا ایک کھاتا پیتا کسان تھا لیکن جب کسی کے بسے دن آنیکو ہوتے ہیں تو گھر میں بیماری آتی ہے۔ کلوا کے باپ اپنی طویل علالت کے زمانہ میں اور بیوی کی بیماری اور اسکے کفن دفن کے وقت گاؤں کے زمیندار کشن سنگھ سے بدفعات ایک سو بارہ روپے قرض لئے۔ اسی تھوڑے سے روپے کو بابو نے چار یا پانچ سال میں سود در سود جوڑ کر اتنا بڑھا لیا کہ اس بچارے کیلئے ادا کرنا مشکل ہو گیا۔ گھر کے سامنے کا پورا کھیت اور آموں کا بغیا چوڑا باغ چودھری نے ہضم کر لیا لیکن اسپر بھی اصل چھوڑ بیاج بھی ادا نہ ہوا۔ آخر جب قرض کی ادائی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو بچارے نے مجبوراً بابو صاحب کے یہاں نوکری کر لی اور اسکی پوری زندگی انہیں کی نوکری اور خدمت کرتے کرتے ختم ہوئی۔ لیکن پھر بھی قرض کا بھاری بوجھ ہلکا نہ ہوا اور یہ اب باپ کے مرنے پر یتیم کلوا کے سر آ پڑا۔ کلوا کی اس مصیبت میں اس کا کوئی سماجی

نہ تھا۔ اسکی بہن کے سوا جو باپ کے مرنے کی خبر سنکر میکہ آئی تھی کلوا کا حقیقی مددگار اور معاون کوئی بھی نہ تھا۔ سر سے باپ کا سایہ اٹھے ابھی دس دن بھی نہ ہوئے تھے کہ چودھری کشن سنگھ نے اصطبل کی صفائی کے لئے کلوا کو اور اناج کی رکھوائی کے لئے کلوا کی بہن کو بلا بھیجا۔ باپ کا غم مسلسل بھوک اور لگاتار شب بیداری نے انکو بالکل چور کر دیا تھا۔ ان میں اتنی طاقت کہاں باقی تھی جو کسی کی بیگاری کر سکیں۔ کلوا نے پیادہ کی منت وسماجت کی اور کچھ دنوں کیلئے بیگاری سے سبکدوشی چاہی لیکن غریبوں کا عذر کون سنتا ہے۔ ..... پیادے نے کلوا کے کہنے کو ان سنی کر دیا اور کلوا کو ساتھ لیکر چلا گیا۔

کلوا اور اسکی بہن چودھری کشن سنگھ کے غصہ سے بخوبی واقف تھے۔ پیادہ کا حکم کشن سنگھ کا حکم تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ یہ دونوں پیادہ کے ساتھ ہولئے اور کشن سنگھ کے سامنے اپنا عذر لیکر حاضر ہوئے لیکن ظالم اور سخت دل چودھری کو یتیم کلوا پر کوئی رحم نہ آیا۔ ڈیوڑھی میں حاضری ہونا پڑا۔ آخر اسی طرح کلوا اور اسکی بہن اس دن سے برابر چودھری کے یہاں کام کاج کرنے کیلئے آنے جانے لگے۔

دن ہفتوں اور مہینوں میں تبدیل ہونے لگے۔ کلوا کی مصیبت کے دن کسی طرح گذرتے گئے۔ ایک دن کشن سنگھ کے چھوٹے بھائی کی بڑی نظر کلوا کی بہن پر پڑی اور وہ اس کے پیچھے لگے۔ آبرو جاتی عزت اور عصمت کی حفاظت کے خیال سے اپنے بھائی کو آئے دن کی اذیتوں اور کلفتوں کے دلدل میں پھنسا چھوڑ کر اپنی سسرال چلی گئی۔

کلوا اب اس دنیا میں اکیلا تھا۔ بہن کی جدائی نے اسکی دنیا سونی کر دی اور وہ ہمیشہ مغموم اور متوحش رہنے لگا۔ اب وہ نہ صرف کشن سنگھ کے مظالم کا شکار تھا بلکہ اسکے بھائی کے انتقامی جذبہ کی سیری کے لئے مظالم کا ہدف بنا ہوا تھا۔ وہ اپنی تنہائی کی زندگی سے گھبرا اٹھا۔ اور نیک ساعت دیکھ کر "کرشنی" پر لیک عورت کو بیاہ لایا۔

کلوا کی شادی کو ایک سال کا عرصہ گذر گیا۔ اب چند دنوں کا بچہ اسکی بیوی کی گود میں تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ کشن سنگھ کے بھائی کی شادی کی دھوم دھام شروع ہوئی۔ اسی کے ساتھ غریب کلوا کے سخت سے سخت پسینے کے دن آگئے۔ وہ ایک دن اس شادی کے کام کاج کی دوڑ دھوپ میں سخت حیران اور پریشان تھا۔ کہ اسکو لو لگ گئی اور بیہوش ہو کر گر پڑا۔ دوسرے دن وہ کام کرنے نہ گیا۔ پیادہ بلانے آیا تو اس نے معافی چاہی لیکن پیادہ نے اس کے جواب میں کمسیٹ کرنے جانے کی دھمکی دی۔ کلوا کی بیوی سے ضبط نہ ہو سکا اور وارفتگی میں دو چار باتیں منہ سے نکل گئیں۔ پیادہ فوراً واپس ہو گیا اور کچھ بڑھ چڑھ کر کشن سنگھ کے کان بھرے۔ اب بابو صاحب کے غصہ کی کوئی انتہا نہ تھی۔ فوراً چار پانچ دیو ہیکل پیادے غریب کی جھونپڑی پر آدھمکے۔ کلوا سہم کر جھونپڑی سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ ایک پیادہ نے گالیاں دیتے ہوئے کھینچ کر اسے دو طمانچے مارے۔ دوسرے پیادے نے کلوا کی بیوی کی خبر لی۔ پھر کشاں کشاں دونوں کشن سنگھ کے سامنے حاضر کئے گئے۔ انہیں دیکھتے ہی کشن سنگھ کے غصہ کی آگ اور بھڑک اٹھی۔

"..... کا منھ کالا کر دو ..... جب سے آئی ہر روز ایک نئی بات نکلتی رہتی ہے ..... اس مردود نمک حرام کو دیکھو کہ باپ دادا نے تو ہمیشہ بیگاری کی ..... مگر انکو اب نوابی ہو گئی ..... مارو ..... کو"!! پیادوں نے کشن سنگھ کا تیور پہچان کر ان دونوں پر ٹوٹ پڑے۔ کلوا کی بیوی ابھی گویا زچہ خانہ ہی میں تھی اتنی مار کھا کر درد اور چوٹ سے تلملا اٹھی۔ پیادہ کا ایک جوتا اسکی گود کے بچہ کو بھی لگ گیا۔ چوٹ کی تاب نہ لاکر نحیف ایک ہلکی چیخ مار کر اس دنیا سے چل بسا۔ ماں کی ماتا نے زور کیا اور مارے تلوے کے وہ بھی زمین پر گر پڑی۔ لوگوں نے سمجھا کہ بیہوش ہو گئی مگر کچھ دیر بعد وہ کلوا کو اکیلا چھوڑ کر اس دنیا سے سدھار گئی۔

بدنصیب کلوا دکھ مصیبت سہنے کے لئے تنہا زندہ بچ رہا۔ نہ بیوی تھی اور نہ بچہ۔ اب اسی انتہائی غم واندوہ کا نتیجہ ہے کہ اس کے پاگل دماغ میں یہ بات سما گئی ہے کہ کھوج لگانے سے بیوی بچے مل سکتے ہیں اور اسی لئے مہب ہوش میں نہیں رہتا تو اپنے بیوی بچہ کی عبث تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اور بکتا پھرتا ہے

"کی ہو لورے بابا ..... کو تھائی گیلورے بابا ....."

یہ ہے اس کی صدا کی اصل حقیقت!

رکشا والے کی کہانی ختم ہوئی۔ کدار نے آہ سرد کھینچی اور رومال سے جلد جلد اپنی اشک آلود آنکھوں کو جو ابلی کھولتے چشمہ کی طرح ابل رہی تھیں خشک کیا اور آہستہ آہستہ بازار کی طرف روانہ ہو گیا۔

صد کان گہر حضرت عشرت گیاوی کی رباعیات
قیمت عہ
منیجر "ندیم" گیا

مکافاتِ عمل

(بھاگل پور کے دو افسانہ نویسوں کے مشترک قلم سے۔)

پہلا باب

(از جناب محزوں چکوئی)

موسم بہار کی ایک شام تھی ـــــ ہر شام سے زیادہ رنگین ـــــ فطرت جوان ہو گئی تھی اور ہمیشہ سے زیادہ حسین مگر سرلا کا فاقہ سے پژمردہ حسن اسے اب بھی شرمندہ کر رہا تھا ـــــ وہ حسن و معصومیت کی ایک پاکیزہ کلی تھی صنف نازک میں ایک انمول موتی۔

تین وقت گذر چکے تھے۔ اور سرلا نے ایک دانہ بھی نہ کھایا تھا ـــــ اس کا گھر بن اناج کے سنسان بن رہا تھا۔ جیسے چٹیل میدان بن گھاس کے ـــــ اس سنسان گھر میں اس کا مزدور باپ بیمار پڑا کراہ رہا تھا ـــــ اور اس کی ماں اس کے پاس میں بیٹھی اشک بہا رہی تھی۔ غم کے آنسو اور بھوک کے آنسو۔

بھولا اور الھڑ سرلا ـــــ بھوک سے نڈھال دروازہ پر بیٹھی ـــــ کبھی ہاتھ سے سر کو دباتی ـــــ کبھی کمزوری سے تھر تھر کانپتی۔

سندر دروازہ کے سامنے ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا ـــــ سرلا کو دیکھا اور اپنی ناکامی پر افسوس کرنے لگا ـــــ بستی کا امیرزادہ تھا ـــــ نوجوان اور آوارہ مزاج ـــــ سرلا کو اس نے اکثر اپنے دام ہوس کا شکار بنانا چاہا۔ مگر ناکام رہا وہ باغ ہستی کا پھول تھی ـــــ خوشنما اور خوبصورت ترین ـــــ جسے ہر ہاتھ توڑ لینے کا خواہشمند ہو ـــــ مگر اس نے گلچینوں کے دست برد سے خود کو بچائے رکھا ـــــ جیسے گنجان درخت کی حسین چہرہ کو دھوپ کی تمازت سے ـــــ کوئی اسے چھو نہ سکا ـــــ کوئی اس کی ہوس میں کامیاب نہ ہو سکا ـــــ اس کا حسن پر رعب تھا ـــــ اسکی خودداری غیر کیلئے حوصلہ شکن۔

جس سرلا کے باپ دادے سندر کی جوتیاں سیدھی کرتے تھے ـــــ اس کے حسین اور بے جوتیوں والے پاؤں کو سندر خود دھونا چاہتا تھا ـــــ طمانیت اور فطرتی سکون کی جھنکار سنا کر اسے موہنا چاہتا تھا ـــــ مگر سب بے سود!

وہ اسپر بغیر نگاہ ڈالے ـــــ اپنی سوکھی روٹی پھٹے کپڑے میں ـــــ حسن و عصمت کو انمول بنائے۔ جوانی کے راستہ پر گذرتی رہی۔

مگر اتفاق سے آج وہ سوکھی روٹی بھی نہ تھی ـــــ کپڑے بالکل جواب دے چکے تھے ـــــ زندگی و موت کا سوال اُسے دیوانہ بنا رہا تھا۔

زندگی تو بہر حال سب سے زیادہ عزیز ہے؟ ـــــ سندر نے اپنے ناپاک دل میں سوچا ـــــ جسے سرلا کی موجودہ حالت کا بخوبی علم ہو چکا تھا ـــــ اب وہ روپے کی قیمت پر زندگی بچانے کے لئے ـــــ اس چیز کو ضرور فروخت کرنے پر رضامند ہو جائے گی ـــــ جس کو وہ اب تک سب سے زیادہ عزیز سمجھتی رہی ہے ـــــ اس خیال کے ماتحت۔ اس نے سرلا کی مزاج پرسی کی ـــــ دشمن عصمت کی زبان سے اظہار ہمدردی ـــــ اس کی نرگسی آنکھوں میں آنسو سمٹ آئے۔

اس کا دل پھٹنے لگا ـــــ اس کی خودداری کا رنگین ساغر چکنا چور ہو گیا ـــــ اور زندگی کی شراب بہ کر مٹی میں ملنے لگی ـــــ اس نے بھاگ کر خود کو جھونپڑی کی آڑ میں چھپانا چاہا۔ مگر سندر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ـــــ اور اس پر دس روپے رکھ دیئے ـــــ میں تم سے کچھ نہیں چاہتا قریب وہ انسان کر گڑگڑا کر بولا ـــــ لیکن تمہاری زندگی کی سلامتی؟ بیوقوف بن کر زندگی برباد مت کرو ـــــ اتنا کہہ کر وہ رفوچکر ہو گیا۔ سرلا وحشت میں الجھ کر رہ گئی ـــــ اس نے روپے کو دیکھا اور پھر اپنے حسین جسم کو ـــــ کیا یہ رقم اس جسم کو حاصل کرنے کے لئے پیشگی کے طور پر نہیں دی گئی ہے؟ ـــــ

اس سوال کے ساتھ ہی ـــــ اس کا شہابی جسم تھرتھرایا اسکی سیاہ آنکھیں نمناک ہوگئیں۔

ان ردوپوں نے اسکی زندگی کو تو پلٹایا ـــــ مگر اسکی روح کو نیم جاں بنا ڈالا ـــــ اس کا حسن بلند پرواز ہوتا ہے کوئی چھو نہیں سکتا! ـــــ اس کی خودداری و استغنا مستقل ہوتا ـــــ دوسروں کی پرواہ سے بے نیاز ـــــ مگر افلاس نے اس کے تمام خصوصیات چھین کر اُسے آسمان سے تحت الثریٰ میں دے مارا ـــــ وہ اب سوچا کرتی اور ہر دے کی نیئوں سے رویا کرتی ـــــ وہ اب خود کو گلاب کا پھول سمجھنے لگی تھی ـــــ جو کسی حسین گلے میں ہونے کے بجائے گندی نالی میں پڑا سڑتا ہو ـــــ اور اس پر گندے کیڑے دوڑتے ہوں ـــــ کاش وہ دولت مند ہوتی ـــــ ورنہ بدصورت ہوتی ـــــ تو اسکی عصمت کا کوئی خواہاں نہ ہوتا ـــــ اسکی رنگین جوانی یوں نہ لٹتی جس حسن کا صرف تصور ہوسکتا تھا ـــــ جو انمول موتی صرف شاہی تاج میں ٹنک سکتا تھا ـــــ اب اُسے گندے ہاتھوں سے مسلا جائے گا ـــــ اسکی قیمت بالکل ادنیٰ بنا دی جائیگی۔

اور یوں ہی اگر زندگی بچا لے گئے ـــــ وہ روپیہ لینے کی عادی ہوتی رہی۔ تو ایک دن اُسے دام بھی چکانا پڑیگا۔ ایک بار تو گنگانے سے ـــــ ہر دم گنگانا ہوگا۔ رفتہ رفتہ کتنے لوگ آئیں گے ـــــ اور اس کے حسن و عصمت کی قیمت چکائیں گے۔ حتیٰ کہ ایک دن۔ اس کا حسن و عصمت زخم کھا کھا کر ـــــ کریہہ و متعفن بن جائے گا۔ جس پر مکھیاں بھی نہ بھنبھنا سکیں گی۔ جس پر لوگ تھوکنا بھی گوارا نہ کرسکیں گے

اسی طرح وہ دن رات سوچا کرتی ـــــ اور اپنی افلاس زدہ زندگی پر آنسو بہاتی۔

آخر وہ دن بھی گذر گیا ـــــ جب سرلا کو اس کے دام چکانے پڑے ـــــ ایک دکھیا کی عصمت سے ـــــ جس کے پھول جیسی جماعت سے ـــــ جس کا لوگ گمان تک نہ کرسکتے تھے۔ افلاس نے اُسے کھوٹے داموں لٹا دیا۔ اور یوں ہی لٹاتا رہا ـــــ حتیٰ کہ سرلا اس زندگی سے تنگ آگئی اور اُس نے سندر سے رحم کی بھیک مانگتے ہوئے کہا ـــــ "تو مجھے اب مرجانے دو ـــــ یا میرے عریاں جسم کو اپنی چادر سے ڈھک لینے دو ـــــ" سندر نے سماج کی اوٹ لی ـــــ وہ نیچ ذات اور غریب عورت کو اپنا کیسے بنا سکتا تھا ـــــ جس چیز کی اُسے خواہش تھی ـــــ اس سے تو آسودہ ہو چکا تھا اب اس چوسے ہوئے پھول پر سے اُسے صرف اُڑنا باقی رہ گیا تھا ایک دن وہ یہ بھی کر گذرا۔

ایک شام تھی اور بالکل اداس ـــــ سرلا گھاس پر بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ غم کے آنسو عصمت کے آنسو ـــــ پھول کا رس خشک ہوچکا ـــــ اور پژمردہ پھول زندگی کے سرد جھونکے سے مل کر تھرتھرا رہا تھا۔ سندر اسی راستہ سے گذرتا ـــــ اپنی قیمتی اور خوبصورت فٹن میں بیٹھ کر اپنی حسین اور نئی بیوی کو ساتھ لے کر سرلا کو دیکھتا اور مسکراتا۔ یہ اسکی عریاں عصمت کی تضحیک تھی۔ جسے سندر کی آنکھوں سے دنیا کی کوئی چیز ڈھک نہیں سکتی تھی۔ جب وہ سندر کو دیکھتی تو آنسو بہاتی اور روتی۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ بالکل عریاں کھڑی ہے۔ اور سندر اس کے عریاں جسم پر تھوک رہا ہے ـــــ وہ پھول جسے کسی کو سونگھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی ـــــ آج اسپر تھوکا جاتا تھا ـــــ عصمت کا درخت کٹ گیا تھا ـــــ اور رنگین حسن دھوپ میں کھلا رہا تھا ـــــ اب سندر کے پیسے بھی نہ تھے۔ وہی غربت و افلاس بھری زندگی تھی۔ چار دن کے سکھ کیلئے وہ کیسی لوٹی گئی۔

دوسرا باب

از جناب عبدالکریم صاحب آزاد بھاگل پوری

غریب سرلا اب کچھ سے کچھ ہوگئی تھی ـــــ اسکی سیاہ آنکھیں دھنس گئی تھیں اس کے سرخ گال زرد پڑ گئے تھے۔ وہ من ہی من میں کچھ بڑبڑاتی رہتی۔ آنکھوں سے آنسو بہاتی۔ مندر کے بڑے بت کے سامنے گردن جھکائے اپنے گناہ کی معافی مانگا کرتی۔ سندر کا تخیل اس کے دل میں کانٹے کی چبھن جیسا چبھتا وہ اس بوقلمیں سے انتقام لینے کی متمنی تھی۔ جواب کسی دوسرے پھول پر اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔

دو تین کلکتہ سے کافی روپے کما کر آیا۔ اسکی بتاتی تھی ہمیشہ یہی رہی تھی کہ خوبصورت سرلا اسکی ہو۔ حسین سرلا اسکو چاہئے۔ انکی خاطر وہ سب کچھ کرنے کو تیار رہتا۔ وہ دولت جمع کر رہا تھا۔ صرف اس لئے کہ شاید اس کے ذریعہ بھی وہ سرلا کو حاصل کرسکے ـــــ مگر سرلا کیلئے

اب رو پہلے سکے کی چمک میں وہ کشش باقی نہ رہی تھی سنہرے زیور کی لاچ میں کمی کی زینت پہلو ہونے کا خواب اس نے بھلا دیا تھا امیروں کی سرپرستانہ عنایت سے اُسے جھونپڑی اچھی معلوم ہوتی تھی ——— دولت کے ظلم نے اب اُسے بتلا دیا تھا کہ وہ ہمیشہ اُس سے نفرت کرے ۔ اور خود کو کسی غریب کی گود میں سکھ دے

——— جو اس کا قدرداں ہو جو اُسے فراموش نہ کرے
جو اسکی سیہ کاریوں پر پردہ ڈال دے ۔

دیوندر جب کلکتہ سے واپس آیا ۔ تو اس نے سرلا سے پھر محبت کی التجائیں کیں ۔ دل کی آہوں سے آنکھ کے آنسوؤں سے ۔ مگر سرلا نے اسے نفی میں جواب دیا ۔ کیونکہ وہ ڈرتی تھی کچھ تو مردوں کے جھوٹے عہدِ محبت سے کچھ اپنے کئے پاپ سے

اسی نفی نے دیوندر کی امید کو شکستہ کر دیا اسکی زندگی ویران ہوگئی ۔ وہ دنیا کو بھول گیا ۔ دیوانہ کی طرح نرکٹ کی بانسری بجا بجا کر وہ ہر روز سے آنسو بہاتا ۔ سرلا کی یاد میں سرلا بھی عشق میں ۔ سرلا جب پوجا پاٹ کے لئے مندر میں جاتی ۔ تو صبح کی نشاط فضا میں مندر کے نیچے سے دیوندر کی درد بھری بانسری رو رو کر اسے اپنی پریم کتھا سناتی ۔ اور اسکی جیون کو کپکپا دیتی اُسے محسوس ہوتا کہ سری کرشن کی بانسری اسکی کثیف روح کو جگمگائے جا رہی ہے کیا دیوندر سچ مچ مجھ سے پریم کرتا ہے ؟ کیا اس کی محبت سندر کی محبت سے مختلف ہے ؟ وہ جیسے جیسے اسکو سوچتی اُسے دیوندر کے سچے پریم کا یقین ہوتا جاتا حتیٰ کہ ایک دن وہ بھی آیا ۔ جب سرلا کی محبت میں اس امیرزادی کو بھی دیوندر نے تیاگ دیا ۔ جس سے اس کی شادی ہونے والی تھی ۔ اور وہ خود کو دنیا سے جدا کر بیٹھا

سرلا کا یقینِ محبت اب کامل ہوگیا ۔ مگر اسکی روح و ضمیر بے جان بن گئی ۔ خشک پتے کے مانند جو شاخ میں تھرتھراتا ہو وہ اپنے کو کپکپاتی وہ جب تصور کی آنکھوں سے اپنی عریاں زندگی کا نقشہ دیکھتی وہ جب اپنی معصیت کو کثیف اور میلا پاتی تو دیوندر کی پاکیزگی اور عظمت کا احساس اُس کے دل میں بڑھتا جاتا ۔ وہ اپنی جیون کا سکھ اسی میں محسوس کرتی کہ وہ اپنے ناپاک وجود سے ہمیشہ کے لئے اس دھرتی ماتا کو خالی کر دے ۔

ایک شام تھی اور برسات کی شام سرلا دنیا سے بچھڑنے کیلئے اپنے پریم دیوتا کو اپنی گندگی سے دور رکھنے کیلئے اپنے جسم کو دریا کے سپرد کر گئی ۔ مگر قدرت کو ابھی اسکی موت منظور نہ تھی ۔ بلکہ اسے سندر کے گناہ کی سزا دکھلانا مقصود تھا دیوندر نے اسے دریا میں کود کر اپنی آغوشِ محبت میں لے لیا ۔ اور دونوں پریم کی جیون میں کامیاب ہو گئے ۔

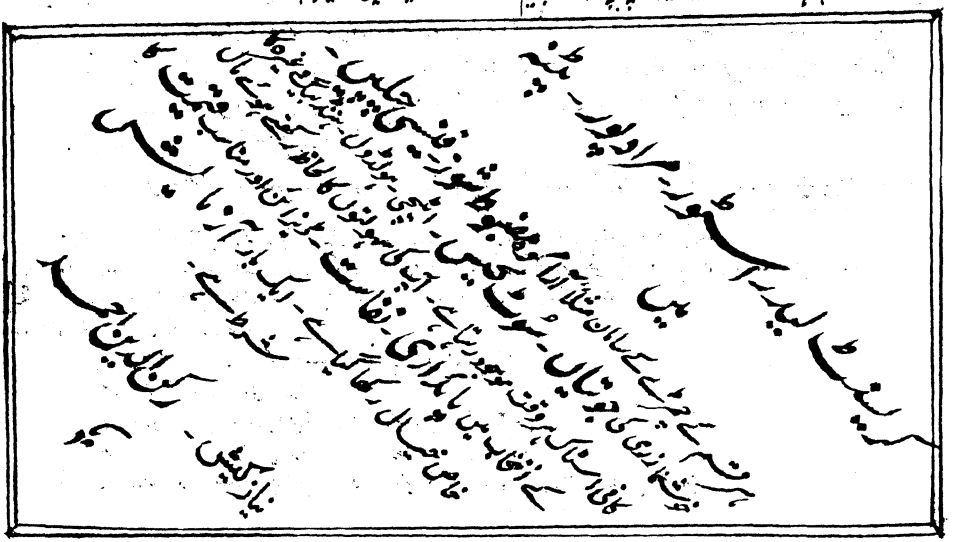

جہانِ اسلام ۱۰

نوخیز عراق
اور
اس کا پہلا بحری بیڑہ

از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی ٹھیلاگر اورینٹل لائبریری - پٹنہ ،

جنگ عظیم کے بعد ترکوں کے پنجۂ اقتدار سے الگ ہونے پر عربی ملکوں کو جن مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا ہے وہ باخبر طبقہ سے پوشیدہ نہیں۔ شریف حسین بن علی کی مجوزہ عربی سلطنت کا علاقہ چھوٹی چھوٹی نیم خود مختار ریاستوں میں بٹ گیا۔ شرق اردن کا علاقہ امیر عبداللہ کے زیر تنگیں کیا گیا۔ کوئی عمل دخل شاطران فرنگ ہی کا ہے۔ فلسطین پر برطانوی اقتدار کے ساتھ ساتھ صہیونیت کا عذاب مسلط ہوگیا۔ شام جس کی آبادی چار لاکھ بھی نہیں ہوگی، چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جمہوریہ لبنان جبل الدروز، بلاد العلویین، لاذقیہ اور سوریہ کے نام سے پانچ حکومتیں فرانس کے زیر اثر قائم ہوئیں۔ اور آخری زخم یہ لگا کہ سکندرونہ کا خالص عربی علاقہ اصل باشندوں کی مرضی کے خلاف اوران کے مسلسل احتجاج کے باوجود ترکوں کے حوالہ کر دیا گیا۔ جہاں روح مسلمانوں اور عربوں پر چنگیز کی روح مسلط کی جارہی ہے۔

کہنا یہ ہے کہ جنگ عظیم کے بعد عربوں کے حصہ میں استبداد اور مصیبتوں کے سوا کچھ نہ آیا۔ تمام سابق عثمانی مقبوضات کے حصے بخرے ہوگئے۔ سارے علاقہ میں اگر کہیں بیداری اور زندگی کے ساتھ ذرا سکون اور اطمینان کے آثار آتے ہیں۔ تو وہ عراق ہے۔ یہ خیال نہ ہو کہ عراق کو یہ سکون و اطمینان کچھ غیروں کی نوازش سے میسر آیا ہے۔ بلکہ یہ سراسر ان کی شجاعت و وحدت اور ان کے آزمودہ کار سرکردہ امیر فیصل بن شریف حسین کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ جنگ عظیم کے بعد پہلے پہل امیر فیصل کو دمشق کا تخت و تاج عطا ہوا اور وہ شاہانہ کروفر کے ساتھ جنوا میں کے واسلسلطنت میں منصب حکومت پر متمکن ہوئے۔ لیکن دمشق فرانس کے حصہ میں پڑ چکا تھا۔ جنرل گوروای ہزار فوج کے ساتھ دمشق داخل ہوا اور مسلمانوں کے مقام پر یوسف العظمہ کی سرکردگی میں شام کے سونہار و سجیلے جوان جو جاں سفاک کی خوں آشامیوں سے بچ رہے تھے کام آئے۔ گورو نا تحانہ داخل ہوا۔ امیر فیصل نے عراق میں قسمت آزمائی کی۔ نصیب نے یاوری کی خود انگریز بھی عراقیوں کی مسلسل تھپیڑ جھاڑ سے تنگ آگئے تھے۔ امیر فیصل کی بادشاہی مان لی گئی۔ سرکار برطانیہ اور عراق کے باشندے دونوں مطمئن ہوگئے تھے۔

شاہ فیصل نے حکومت کچھ اس ڈھنگ سے کی کہ شاہ برطانیہ بھی رام رہا اور رعایا بھی خوش رہی انگریزی سرکار سے پے بہ پے معاہدے

---

۱ یہ مضمون ماہنامہ الفتح سنہ ۳۹ء کی ایک خبر سے چار عربی جہازوں کے نام لئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے ذاتی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

۲ اسکندرونہ خلیج اسکندرونہ کے ساحل تک آباد قدیم عربی حکومت (عرب اسپارٹ)۔ الاعلاق الخطیرۃ العربیۃ کا عنوان سے دکھایا گیا تھا۔

۳ جنگ عظیم سے پہلے فلسطین میں شامل تھا۔ اب ہزار دن سے پورب کا حصہ شرق اردن کہا جاتا ہے۔

۴ عربی تحریک کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ملاحظہ ہو:

(۱) شاہ ڈرڈ : دی نیو ورلڈ آف اسلام (اردو ترجمہ از جمیل احمد بدایونی)

(۲) زکی علی : اسلام ان دی ورلڈ

(۳) مسعود عالم ندوی :- عربوں کی قومی تحریک مندرجہ المدینہ (جولائی سنہ ۳۸ء)

(۴) " " : دنیا میں اسلام " معارف " سنہ ۳۹ء

بقیہ جاننے والوں کے لئے حاضر العالم الاسلامی زائمہ شکیب ارسلان المنتخب (قاہرہ) مصنفہ (راقم مسعود عالم ندوی)

ہوئے تاآنکہ ۱۹۳۱ء کے معاہدہ کی رو سے عراق کی آزادی باضابطہ تسلیم کر لی گئی۔ عراق مجلس اقوام کا ممبر ہوا۔ عراقیوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ فوجی بھرتی جبری قرار پائی۔ تعلیم بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگی۔ پوری قوم شراب حیات سے پرکیف نظر آنے لگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا کہ براق کا دولہا ہی مل گیا۔ شاہ فیصل نے وطن سے دور جان جان آفریں کو سپرد کی (سوئٹزرلینڈ ۱۹۳۳ء) باغبان کا تمناؤں بھرا دل باغ کو ہرا بھرا نہ دیکھ سکا۔ قدرت کو یہی منظور تھا۔ جو اس سال غازی تخت و تاج کی زینت بنا۔ حکومت کا کاروبار اپنے حال پر قائم رہا نئے نئے منصوبے بنے اور عملی جامہ پہن کر باشندوں کی فلاح و بہبود کا باعث ہوئے۔ زمانہ نے ایک اور کروٹ لی۔ عراقیوں کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز غازی بھی گذشتہ سال اپنے باپ سے جا ملا۔ اور آج تخت عراق پر تھا فیصل (ثانی) اپنے دادا کی یاد تازہ کر رہا ہے۔

اس دوران میں مختلف وزارتیں بنیں اور بگڑیں۔ کبھی یاسین ہاشمی مرحوم اور جعفر عسکری کا دور دورہ رہا، تو کبھی سلیمان حکمت اور رکبہ دقی کا، اور آج پھر شاہ فیصل کا دست راست نوری سعید عراق کی سیاست کا پشتیبان ہے۔ پھر ان وزارتوں کی آمد و رفت کا ملک کی خوشحالی اور آئندہ کے منصوبوں پر کوئی اثر نہ پڑا۔ تمام کام بنے بنائے پروگرام کے مطابق چلتے رہے اور چل رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج عراق کو اپنی معمولی آبادی اور حقیر ذرائع کے باوجود فوجی لحاظ سے مصر پر برتری حاصل ہے۔

عراق اس وقت عربی تحریک اور اتحاد عرب کی آرزوؤں کا محور ہے یہاں کی ہر چیز 'عربیت' لئے ہوئے ہے۔ مصر میں آپ کو نکوں اور بڑی دوکانوں پر تختے فرانسیسی زبان میں لکھے نظر آئیں گے، عراق میں صرف عربی کا چلن ہے۔ مصر میں فوجی روح مفقود تھی اب کچھ ابھر رہی ہے۔ عراق کا بچہ بچہ سنگوں سے معمور اور سپاہیانہ جذبہ رکھتا ہے۔ مصر میں بایں ہمہ کبھی کبھی طہ حسین جیسے قلب و نظر کے اندھوں کی زبانی "فرعونیت" کی صدا سنائی دیتی ہے عراق میں یہ بیہودگیاں نہیں۔

یوں تو عراق کی "عربیت" ہر چیز سے نمایاں ہے۔ پر عراق کے جنگی جہازوں کے نام سن کر آپ بھی داد دیں گے اور اس جذبہ کی تعریف کریں گے۔ شاہ فیصل مرحوم نے اول ہی روز یہ محسوس کر لیا تھا کہ ایک طاقت ور بحری بیڑہ کے بغیر خلیج فارس میں عراق کی پوزیشن مستحکم نہیں ہو سکتی۔ پرے وقت اور ناگہانی موت کے باعث وہ اپنی آنکھوں سے اپنے خواب کی تعبیر نہ دیکھ سکے۔ قدرت کو کچھ ایسا منظور تھا کہ شاہ غازی کے زمانہ میں بھی یہ تجویز مکمل نہ ہو سکی۔ آخر ننھے فیصل (ثانی) کے دور حکومت میں فیصل اول کے شیریں خواب کی تعبیر نظر آئی۔ اور چار جنگی جہازوں کا پہلا بحری بیڑہ عباسیہ کے دارالحکومت کے سامنے دجلہ کی موجوں سے ہم کنار ہوا (رجب ۱۳۵۴ھ) جماعت فتوۃ[2] کے نوجوانوں نے پرجوش نعروں کے استقبال کیا۔ جہازوں نے ہارون الرشید کے محبوب شہر کو توپوں کی سلامی دی۔ بغداد کی چھاؤنی نے بھی رمضان محبت کو طور پر گیارہ توپوں کی سلامی پیش کی۔

ہادی زوال و انحطاط کے اس دور میں یہ عربوں کا پہلا بحری بیڑہ ہے یہ کل چار جنگی جہازوں سے مرکب ہے جن کے نام یہ ہیں:-

(۱) الجاسم: عبداللہ بن قیس الجاسی جنہوں نے ۲۸ھ میں جزیرہ قبرص فتح کیا۔ معاویہ شام کی فتح کے بعد یہ مسلمانوں کی دنیا میں پہلی بحری فتح تھی۔ یہ فتح حضرت عثمان رضؓ کے عہد میں ہوئی، حضرت عمرؓ نے امیر معاویہ کے پیہم اصرار کے باوجود بحری حملہ کی اجازت نہیں دی۔ انکی وفات کے بعد حضرت عثمان نے اجازت دی اور ممتاز صحابہ کی معیت میں عبداللہ بن قیس حاکم ہو کر روانہ ہوئے اور مظفر و کامران رہے دشمنوں نے دب کر صلح کی اس کے بعد اسی نے کوئی پچاس بحری حملے کئے اور ہمیشہ کامیاب رہے۔ (ابن خلدون جلد ۲ حصہ ۲ ص ۱۰۱-۱۲۰ مطبوعہ مصر)

نیز ملاحظہ ہو مقدمہ ابن خلدون: باب قیادۃ الاساطیل اور طبری: حوادث ۲۸ھ حضرت عمرؓ کے متعلق یہ غلط فہمی نہ ہو کہ وہ سمندروں سے ڈرتے تھے علاء حضرمی نے ایران پر جو بحرین کی راہ سے بحری حملہ کیا تھا اور ناکام رہے (طبری: حوادث ۱۵ھ) اس لئے فاروق اعظم بحری حملہ کی اجازت

---

[1] مصر میں فرعونیت کی تحریک کبھی بہت زوروں پر تھی جیسے آج ہندوستان میں براہمن بھارت کی احیاء کی تحریک اندھا دھند چل رہی ہے اسی طرح کچھ پہلے مصر میں بھی فرعونی دور پر فخر کیا جاتا تھا اور عام عربی ادب سے الگ مصری ادب گھڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی الحمدللہ کہ اب یہ تحریک جان توڑ رہی ہے۔

[2] فتوۃ ایک فوجی تحریک ہے جو کمال پاشا غازی کے نمونہ پر چل رہی تھی عہد نامہ ملی و وطن اور قوم کی خدمت پر زور ہے۔

[3] الفتح (مصر) ۱۹۳۹ء میں غالباً ہفتہ وار سے ۱۹۴۰ء میں چھپ گیا ہے

دینے میں منفعل تھے۔

(ملاحظہ ہو: عربوں کی جہاز رانی از علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ) (الضیاء جمادی الاخری ۱۳۵۳ھ)

(۲) جنادۃ: جنادہ بن امیہ الازدی، اس مشہور اسلامی بیڑے کے کپتان جس نے ۵۳ھ میں جزیرہ رودس فتح کیا، جنادۃ مشہور تابعی اور حدیث کے راویوں میں ہیں، حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ سے روایت کی، ۸۰ھ میں وفات پائی۔

(جنادہ کے بحری کارناموں کے لئے ملاحظہ ہو: بلاذری: باب فتوح الجزائر)

(۳) عبدالرحمن: عبدالرحمن بن حبیب گورنر افریقہ جنھوں نے صقلیہ پر نہایت کامیاب حملہ کیا اور مظفر و منصور لوٹے (۱۳۵ھ)

(تاریخ صقلیہ از سید ریاست علی ندوی، ۲۰۰ - ۲۰۳) ابن خلدون ج ۴ ص ۲۰۳)

(۴) ذات الصواری: ذات الصواری، اس مشہور بحری معرکہ کا نام ہے، جو ۳۱ھ میں، عرب اور روم کے درمیان، فلکس پہاڑی کے سامنے وقوع پذیر ہوا تھا۔ اہل فرنگ اسے معرکہ فلکس ہی کہتے ہیں۔ رومیوں کا قائد خود ہرقل کا بیٹا قسطنطین تھا، جس کا بیڑہ عربوں نے زیر و زبر کر دیا تھا تا آنکہ اس نے روم کے پائے تخت (قسطنطنیہ) میں پناہ لی۔

صاری کشتی کے پتوار کو کہتے ہیں۔ (الذی ینصب فی وسط السفینۃ۔ لسان العرب و تاج العروس) اسکی جمع صواری آتی ہے اس جنگ میں کشتیوں کے لنگر ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیے گئے تھے کہ جم کر لڑ سکیں (رومیوں نے بھی کشتیاں اسی طرح اکٹھی کر لی تھیں) اسی لئے عربوں کے ہاں اس معرکہ کا نام ذات الصواری پڑ گیا (طبری: حوادث ۳۱ھ) ابن خلدون کہتا ہے کہ صواری کی کثرت کے باعث عبداللہ بن ابی سرح سپہ سالار نے اس جگہ اور معرکہ کا نام ذات الصواری رکھ دیا (ابن خلدون "جلد دوم حصہ دوم ص ۱۳۰) مطبوعہ مصر۔

طبری کی روایت ترین قیاس معلوم ہوتی ہے۔

ان ناموں سے آپ کو عراق کی امنگوں اور عربی نخوت و غیرت کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

ان جیسی قوت کا دیو تا غیظ و غضب میں ہے یہ مسکین چار جہاز کس شمار میں ہیں؟ پر ان کے نام بڑے ہیں، شاید کہ دن پلٹ آئیں، و بقول استاذ الاساتذہ حضرت مولانا شبلی مرحوم و مغفور:-

عجب کیا ہے یہ بیڑہ غرق ہو کر پھر ابھر آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

مولانا مرحوم کا شعر خود بخود زبان قلم پر آگیا، اسلامیت کے تفوق کا یہ بیڑا غرق ہو کر پھر نئے سرے سے سندر کی گود میں اچھل کر آیا ہے۔ دعا ہے کہ ساحل مراد تک بخیر و خوبی پہنچے۔

---

۱ اس وقت اصل اردو پیش نظر نہیں عربی ترجمہ طاہر کے قلم سے "الضیاء" میں مسلسل شائع ہوا تھا" مجبوری میں اسی کا حوالہ دیا گیا ۲ الفتح ۶۹ء میں ات الفلوی (سین سے) چھپ گیا ہے جو صحیح نہیں ۳ الفتح ۶۹ء میں ۲۱ھ مرقوم ہے جو غالباً مطبع کی چوک ہے ۴ تفصیل کیلئے دیکھو طبری حوادث ۳۱ھ طبع یورپ سلسلہ جلد اول ص ۲۸۶۵-۲۸۷۰

شریر بیوی

چھاترا پبلشنگ کمپنی مالا۔ الہ آباد نے چغتائی صاحب کی اس مشہور کتاب کا دو ہزار کا سندی ایڈیشن شایع کر دیا۔ دونوں ایڈیشن ایک سی ہیں۔ یعنی سہ رنگا مصور سرورق اور اندر چار فوٹو ملاک کی تصویریں۔ اردو ایڈیشن مجلد ہے۔ قیمت ۴ عہ علاوہ محصول ڈاک۔ ہر عمدہ کتب فروش سے خریدیے۔ ورنہ براہ راست

دفتر کتابت (عظیم بیگ چغتائی) جودھپور

مصر کی نئی سیاسی تشکیل

(از جناب منصور کاکوی)

امریکہ کی جنگ آزادی کے بعد برطانی حکومت کی تمام تر توجہ مصر اور ہندوستان کی طرف رہی، یوں بھی سیاسی حیثیت سے مصر ایک خاص اہمیت رکھتا ہے - امریکہ اور ہندوستان کی طرح مصر کے بازار میں بھی ایک عرصہ تک فرانس اور انگلینڈ میں چھیڑ چھاڑ اور کشمکش رہی، مصر کو ایشیا کی کنجی کہا جاتا ہے اور یہ بالکل درست ہے - یورپ کی سیاسیات میں "مشرقی مسئلہ" (Eastern Question) صرف ترکی سلطنت کو ختم کرنے کے لئے ایجاد کیا گیا تھا، یہ وہ وقت تھا جب کہ ترکی کی وسیع سلطنت آپس کی نا اتفاقی، حکمرانوں کی نا اہلی اور صدیوں کی مسلسل جنگوں کی وجہ سے دم توڑ رہی تھی اور یورپ کے گرگ باراں دیدہ موقع کے منتظر تھے جب مرکزی سلطنت کمزور ہو گئی تو ماتحت صوبے خود مختار ہوتے گئے، مصر کا گورنر محمد علی برائے نام سلطان ترکی کا باجگذار رہ گیا -

۱۸۲۱ء میں یونانیوں نے سر اٹھایا، روس، فرانس اور انگلینڈ ان کی امداد کر رہے تھے - گرچہ محمد علی پاشا نے سلطان کی مدد بھی کی لیکن ۱۸۲۷ء میں انگریزی اور فرانسیسی بیڑے نے ترکی بیڑے کو "نوارینو" (Navarino) میں شکست دیکر سلطان کو یونان کی آزادی تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا - یہیں سے مصر میں فرانسیسی اور انگریزی اقتدار کی ابتدا ہوتی ہے - محمد علی پاشا کا انتقال ۱۸۴۸ء میں ہوا، اس نے اپنے دور میں جدید تعلیم کو رواج دینے کی کوشش کی، طلبہ کی ایک بڑی تعداد فرانس تعلیم کے لئے بھیجی گئی - نئے مدرسے قایم کئے گئے اور اصلاحات نافذ ہوئیں - محمد علی کے بعد اس کا بیٹا اسمٰعیل جانشین ہوا - بیٹے نے باپ کی پیروی کی، مصر میں نظم و نسق حکومت کی بھی سے تنظیم کی - محمد علی کے بنائے ہوئے فوجی اسکول کو از سر نو جاری کیا اچھنگی گھر تعمیر کیا - اور اور بہت سے تعلیمی ادارے بنائے - ریلوے لائن کی توسیع کی اور نہر سویز کے کنارے بندرگاہ تعمیر کی گئی، ان تمام اسکیموں کے لئے کثیر رقم کی ضرورت تھی، اس کے علاوہ وہ خود بھی بڑا فضول خرچ تھا اور مصر کا خزانہ خالی، روپیہ کی صرف ایک صورت تھی اور وہ قرض، دھڑا دھڑ فرانس اور انگلینڈ سے قرض لینا شروع کیا - جب یہ بھی ناکافی ہوا تو سویز کمپنی کے حصے کو فروخت کر دیا -

"ڈزرائلی" اس وقت برطانیہ کا وزیر اعظم تھا، اس نے وزارت کے ممبروں سے مشورہ کئے بغیر خدیو کے ۱۷۶۶۰۲ حصے ۷۶۵۸۲ پونڈ میں خرید لئے - پھر بھی مصر کی مالی حالت خراب ہوتی گئی - جب فرانس اور انگلینڈ کا لگا ہوا سرمایہ ڈوبتا نظر آیا تو اسمٰعیل پاشا کو ایک آئینی وزارت بنانے پر مجبور کیا گیا، ایک انگریز مشیر مالیات مقرر ہوا - اور ایک فرانسیسی امور عامہ کا انچارج، لیکن چند ہی مہینوں کے بعد اسمٰعیل کی سازش سے وزارت ٹوٹ گئی، سازش کا پتہ لگ گیا اور اسمٰعیل کو معزول کر کے اس کے لڑکے توفیق کو سلطان بنایا گیا - پھر نومبر ۱۸۷۹ء میں ایک دہری (Dual) حکومت قایم کی گئی، انگریزی اور فرانسیسی اقتدار مصر کے باشندوں کے لئے ناقابل برداشت تھا، بیرونی اثرات کے خلاف لوگوں میں نفرت و عداوت کا جذبہ پیدا ہونے لگا - اس وقت مصر سید جمال الدین افغانی کی سرگرمیوں کا مرکز تھا - گو توفیق کی ایما سے انہیں مصر چھوڑنا پڑا - لیکن ان کا لگایا ہوا پودا آخر نخل بار آور ثابت ہوا - مصر کی سیاسی بیداری جمال الدین افغانی کی مرہون منت احسان ہے - تمام قابل ذکر سیاسی رہنمان کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد تھے، پان اسلامیزم کی تحریک نے آگ پر تیل کا کام کیا اور ملک میں غیر ملکی اقتدار کے خلاف جدوجہد شروع ہو گئی - احمد عرابی پاشا اس تحریک کا قائد تھا - عرابی ایک معمولی کسان کے گھر پیدا ہوا تھا لیکن اپنی غیر معمولی صلاحیت اور لیاقت سے وزیر جنگ کے عہدے تک پہنچ گیا - عوام نے بھی اس تحریک کو لبیک کہا، عرابی پاشا اور انگریزی فوج میں کھلی ہوئی جنگ ہوئی - خدیو نے فرار ہو کر اسکندریہ میں جان بچائی - برطانیہ نے ترکی اور فرانس سے اس شورش کو دبانے کے لئے امداد طلب کی، لیکن دونوں کے انکار کرنے پر اس مہم کو سر کرنے کی ذمہ داری خود اس نے اپنے سر لی - سر گارنٹ وولزلی کے ماتحت ایک فوج بھیجی گئی عرابی پاشا کو گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا گیا - اور لارڈ ڈفرن کو جو قسطنطنیہ میں برطانی سفیر تھا - ہائی کمشنر بنا کر مصر بھیجا گیا - جب

شورش ختم ہوگئی تو خدیو اسکندریہ سے واپس آیا اور شریف پاشا نے وزارت ترتیب دی۔ سنہ ۱۸۸۲ء کے بعد سے مصر پر برطانیہ کا پنجہ سخت سے سخت تر ہوتا گیا۔ یہ زمانہ یورپ میں بسمارک کے عروج کا تھا۔ جرمنی کی بڑھتی ہوئی طاقت فرانس اور انگلستان کے لئے ایک مستقل خطرہ بنی ہوئی تھی۔ اس لئے انگلستان اور فرانس جرمنی کے خلاف ایک متحدہ محاذ کی سخت ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ آخر سنہ ۱۹۰۴ء میں دونوں ملکوں میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے فرانس نے برطانیہ کو مصر میں اور برطانیہ نے فرانس کو مراکش میں بالکل آزاد چھوڑ دیا۔

قومی تحریک

لیکن قومی تحریک کی جو آگ برسوں قبل سلگ چکی تھی اور جو ایک بار سنہ ۱۸۸۱ء میں بھڑک بھی اٹھی تھی اندر ہی اندر بڑھتی گئی اور سنہ ۱۹۰۷ء میں مصطفےٰ کامل کی قیادت میں جدوجہد شروع ہوگئی۔ اخبار اور پلیٹ فارم دونوں سے اس تحریک کی آواز بلند ہونے لگی۔ جزیرہ نما سیاسی کے بدوؤں نے بھی کچھ ہنگامہ کیا لیکن ان کو بھی سختی سے دبا دیا گیا۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں مصطفےٰ کامل کی موت سے قومی تحریک میں پھوٹ پڑ گئی۔ اسی سال یعنی فہمی پاشا پہلے مصری وزیر اعظم نے وزارت بنائی۔ بطرس پاشا کے خلاف نفرت اور حقارت کا جذبہ اتنا بڑھ گیا کہ وزارت قائم کرنے کے تیسرے دن اس کو قتل کر دیا گیا۔ اور محمود سعید پاشا وزیر اعظم ہوئے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں لارڈ کچنر کو مصر بھیجا گیا اور مجلس قانون ساز کو پھر سے ترتیب دیا گیا، اس سے پہلے دو ایوان تھے لیکن اب دونوں کو ایک کر دیا گیا۔ ممبروں کی کل تعداد ۸۳ رکھی گئی جس میں ۶۶ عوام کے منتخب کردہ اور ۱۷ حکومت کے نامزد کئے ہوئے تھے۔ ایوان کے صدر اور نائب صدر کی نامزدگی کا اختیار بھی حکومت کو تھا، انتظام سلطنت کی اصلاح اور کسانوں کو سود خواروں سے نجات دلانے کی کوشش بھی کی گئی لیکن قومی تحریک جو شروع ہو چکی تھی وہ بڑھتی ہی گئی۔ اس درمیان میں خدیو مصر، وزیر اعظم اور لارڈ کچنر کو قتل کرنے کی سازش کی گئی لیکن قبل از وقت اس کا پتہ لگ گیا اور سازش ناکام رہی، نئے دستور کے مطابق جو اسمبلی بنی اس کے صدر سعد زاغلول پاشا ہوئے لیکن یہ دستور خدیو کو بالکل ناپسند تھا اس لئے اس نے ایسی سازش کی کہ زاغلول پاشا کو مستعفی ہونا پڑا زاغلول پاشا کے بعد حسین رشدی نے قلمدان وزارت سنبھالا، لیکن تحریک آزادی جاری رہی، ساتھ ساتھ وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں یہاں تک کہ جنگ عظیم شروع ہوگئی اور مصر کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

جنگ عظیم اور برطانی انتداب

جب جنگ عظیم شروع ہوگئی تو لارڈ کچنر کو مصر سے واپس بلا کر وزیر جنگ بنایا گیا، جنگ شروع ہونے کے قبل خدیو مصر عباس حلمی دوم قسطنطنیہ گیا ہوا تھا۔ مصر کی اسمبلی توڑ دی گئی اور ۱۸ دسمبر سنہ ۱۹۱۴ء کو حکومت برطانیہ نے اعلان کیا کہ ——— ترکی کے اقدام سے جو صورت حال پیدا ہوگئی ہے اس کے پیش نظر اب سے مصر برطانیہ انتداب میں رہے گا۔ ترکی کا اقتدار ختم ہوگیا اور ملک معظم کی حکومت مصر اس کے مفاد اور اس کے باشندوں کی جان و مال کی حفاظت کے لئے تمام ضروری کاروائی کریگی۔

سنہ ۱۸۸۲ء کے قریب مسٹر گلیڈ اسٹون نے اعلان کیا تھا کہ برطانیہ کے عزائم ہرگز یہ نہیں ہیں کہ مصر کو اپنی سیادت میں لیا جائے لیکن سنہ ۱۹۱۴ء میں بالکل اس کے خلاف کام کیا گیا اور مصر کو برطانیہ کی محافظت میں لے لیا گیا، اس اعلان کے دوسرے ہی دن خدیو عباس حلمی کو معزول کر کے شاہزادہ حسین کامل کو خدیو مصر بنایا گیا۔ حسین کامل کی حکومت بہت کم دنوں رہی، ان کے بعد فواد تخت نشین ہوئے جو سنہ ۱۹۳۶ء کے اوائل تک حکمران رہے ہیں۔ مصر کے ہائی کمشنر سر میکموہن مقرر ہوئے اور ان کے ہاتھ میں مصر کے خارجی معاملات کا چارج دیا گیا۔ برطانیہ کی اس کارروائی سے تحریک آزادی کی شدت اور بڑھ گئی، طلبہ نے بھی اس میں خوب حصہ لیا، سر میکموہن کے بعد ہربرٹ لڈ ونگیٹ ہائی کمشنر ہو کر مصر آئے۔ صلح نامہ ورسائی کے وقت امریکہ کے صدر مسٹر ولسن نے جو اصول (self determination) مرتب کئے تھے، اس کا اثر مصر کے لئے بہت دور رس تھا اس اصول کے مطابق ہر ملک کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی قسمت کا فیصلہ آپ کرے، لیکن اس کے باوجود عراق، فلسطین اور مصر پر برطانیہ کا، مراکش اور شام پر فرانس کا انتداب قائم ہوگیا۔ اور (self determination) کا اصول دھرا کا دھرا رہ گیا۔ لیکن مصر کی تحریک آزادی بڑھتی ہی گئی۔ سعد زاغلول پاشا نے

"وفد" کی صورت میں لندن جاکر اپنے مطالبہ کو پیش کرنے کی اجازت طلب کی لیکن حکومت نے اجازت نہ دی، اس پر وزارت نے استعفےٰ داخل کر دیا۔ وفد کی (وطنی) تحریک اتنا زور پکڑ گئی کہ مارشل لا جاری کرنا پڑا۔ زاغلول پاشا کو تین جان نثار ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کر کے ۱۹۱۹ء میں مالٹا بھیج دیا گیا۔ قاہرہ میں مظاہرے ہوئے، جلسے کئے اور جلوس نکالے گئے، سپاہیوں پر حملہ کیا گیا۔ ریلوے لائن اکھاڑ دی گئی، تار برقی کے ستون کاٹ دیے گئے۔ دیروت اسٹیشن پر ایک انگریز انسپکٹر اور چند دوسرے فوجی افسروں کو دن دھاڑے گاڑی میں قتل کر دیا گیا۔ پورے ملک میں تحریک بجلی کی لہر کی طرح پھیل گئی۔ جامعہ ازہر کے طلبہ نے بھی خوب خوب حصہ لیا، اس شورش کو دبانے کے لئے لارڈ البنی کو فرانس سے ہائی کمشنر بنا کر مصر بھیجا گیا۔ زاغلول پاشا اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہا کر دیے گئے۔ برطانی حکومت نے اس ہنگامہ اور شورش کے اسباب معلوم کرنے کے لئے لارڈ ملنر کی سرکردگی میں ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا، کمیشن کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی رائے دے کہ مصر کے لئے کون سا دستور بہتر ہوگا۔ لیکن مصر میں اس کمیشن کی سخت مخالفت ہوئی اور کمیشن کے ممبروں کو جان کے لالے پڑ گئے اور ایک بار تو وزرا کو قتل کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ کمیشن جہاں گیا مکمل بائیکاٹ کیا گیا۔ اس پر برطانیہ نے مصالحت کا ہاتھ بڑھایا۔ سعد پاشا اپنے سات رفقاء کے ساتھ لندن آئے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ مصر کو آزاد کر دیا جائے لیکن سمجھوتہ کی گفتگو آگے نہ بڑھ سکی اور یہیں پر ختم ہوگئی، ۱۹۲۱ء میں عدلی پاشا کی پارٹی طاقتور تھی، برطانیہ نے اعلان کیا کہ ملک معظم کی حکومت ملنر رپورٹ کو پڑھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ اب محافظت مصری برطانی تعلقات کے لئے تشفی بخش حل نہیں ہے۔ ملنر کمیشن کی سفارشات کے متعلق ملک معظم کی حکومت ابھی کسی قطعی فیصلے پر نہیں پہنچی ہے، لیکن حکومت برطانیہ خدیو کے نامزد کئے ہوئے وفد سے گفتگو کرنا چاہتی ہے کہ انتداب کے بجائے کوئی ایسا دستور مرتب کیا جاسکے جو ایک طرف برطانی مفاد کی حفاظت کا ضامن اور دوسری طرف مصر کے باشندوں کے مطالبات پورا کرے۔ ——— عدلی پاشا کی پارٹی مضبوط تھی، اس لئے انہوں نے وزارت بنائی، اور سعد پاشا کو اشتراک کی دعوت دی۔ قوم پرستوں نے نئی وزارت کی مخالفت کی، کئی مقامات پر ہنگامہ اور فساد برپا ہوا۔ جولائی ۱۹۲۱ء میں ایک مصری وفد لندن گیا، اس وفد کے رہنما عدلی پاشا تھے، عدلی پاشا نے مطالبہ کیا کہ برطانیہ اپنی فوج نہر سویز کے کنارے سے ہٹالے، لیکن حکومت برطانیہ نے یہ شرط قبول نہ کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار پھر مصالحت کی گفتگو ناکامیاب ہوئی۔ عدلی پاشا لندن سے خالی ہاتھ مصر واپس آئے اور آکر استعفاء داخل کر دیا۔ مصالحت نہ ہونے سے ملک میں قومی تحریک پھر زور پکڑ گئی، زاغلول پاشا اور دوسرے لوگوں کو گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا گیا۔ قتل کے واقعات عام ہو گئے۔ اور قاہرہ کی حالت بہت نازک ہوگئی۔ لارڈ البنی ہائی کمشنر اپنی سفارشات اور جیب میں اپنا استعفا لیکر لندن گئے۔ ۲۸ فروری ۱۹۲۲ء کو برطانیہ نے اعلان کیا کہ

(۱) مصر سے برطانی انتداب ختم ہوتا ہے اور مصر کی آزادی تسلیم کی جاتی ہے۔

(۲) حکومت مصر جب عام معافی کا اعلان کر دیگی تو مارشل لا ختم ہو جائے گا۔

(۳) جب تک دوستانہ گفتگو اور رائے سے کوئی بات طے نہ ہو اس وقت تک کے لئے حسب ذیل امور ملک معظم کی حکومت کے لئے مخصوص رہیں گے:-

الف۔ مصر میں حکومت برطانیہ کے ذرایع رسل و رسائل کی حفاظت۔

(ب) بیرونی حملے سے مصر کی حفاظت۔

(ج) اقلیت اور غیر ملکی باشندوں کا تحفظ۔

(د) جب تک کوئی فیصلہ نہ ہو سوڈان کی حیثیت علی حالہ قایم رہیگی۔

گرچہ برطانیہ نے آئینی طور پر مصر کی آزادی تسلیم کر لی، لیکن یہ آزادی نام کی تھی (۱) نہر سویز کی حفاظت۔ (۲) غیر ملکی باشندوں کی حفاظت۔ (۳) ذرایع رسل و رسائل کی حفاظت۔ (۴) سوڈان پر برطانی قبضہ۔ اتنی حفاظتوں کے آگے مصر کی آزادی بالکل بے معنی ہو کر رہ گئی۔

ایک بار ثروت پاشا وزیر اعظم ہوئے۔ لیکن خدیو اور وزارت سے نہ بن سکی۔ ثروت پاشا کے بعد توفیق پاشا وزیر اعظم ہوئے، اسی زمانہ میں پھر تحریک شروع ہوگئی۔ تین مصری طالب العلموں نے پروفیسر ٹیوبی، ایسن کو مار ڈالا۔ توفیق پاشا چاہتے تھے کہ سب سے پہلے دستور کا اعلان کر دیا

جائے، اس پر خدیو سے مخالفت ہوگئی اور ان کو استعفےٰ دے دینا پڑا، مارچ ۱۹۲۳ء میں یحییٰ ابراہیم پاشا نے وزارت ترتیب دی اور اپریل ۱۹۲۳ء میں دستور کو مشتہر کر دیا۔

نئے دستور نے دو ایوان رکھے، ایک مجلس النواب (Senate) اور دوسرا مجلس الشیوخ (Chamber of Deputies) ہاؤس آف ڈپوٹیز کے ارکان کی تعداد ۲۰۰ رکھی گئی اور ان کا انتخاب پانچ سال کے لئے رکھا گیا۔ سینٹ کے ۲/۳ ممبر خدیو کے نامزد اور ۱/۳ منتخب رکھے گئے اور وزارت کو سینٹ کے سامنے جوابدہ قرار دیا گیا۔ اسی اثنا میں زاغلول پاشا کو مصر واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ ۱۹۲۴ء میں نئے دستور کے مطابق جو انتخاب ہوا اس میں وفد پارٹی کی شاندار فتح ہوئی۔ اور زاغلول پاشا پھر وزیر اعظم ہوئے۔ زاغلول پاشا نے کوشش کی کہ سوڈان کو مصر کی ملکیت تسلیم کر لیا جائے، لیکن یہ کوشش ناکامیاب رہی اور زاغلول پاشا نے استعفےٰ داخل کر دیا۔ زاغلول پاشا کی طاقت اور ہر دلعزیزی کے سامنے خدیو کو استعفےٰ منظور کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ زاغلول پاشا پر کسی نوجوان نے قاتلانہ حملہ کیا۔ گولی تو لگی، لیکن جان بچ گئی مگر صحت خراب ہوگئی اور وہ تبدیل آب و ہوا کے لئے یورپ چلے گئے۔

وزیر اعظم برطانیہ نے زاغلول پاشا کو لندن آنے کی پھر دعوت دی، چنانچہ زاغلول پاشا لندن گئے اور مصالحت کی گفتگو بھی کی لیکن اس بار پھر مصالحت نہ ہو سکی اور خالی ہاتھ مایوس واپس آئے۔ واپس آکر اپنا استعفےٰ داخل کر دیا۔ خدیو کو استعفےٰ قبول کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اسی وقت سوڈان کے گورنر جنرل سر۔ لی۔ اسٹیک کو کسی شخص نے دن دھاڑے قاہرہ کی سڑک پر قتل کر ڈالا۔ اس واقعہ سے عجیب سنسنی پھیل گئی اور برطانیہ نے نہایت سختی سے مطالبہ کیا کہ ——— (۱) حکومت مصر غیر مشروط معافی طلب کرے۔ (۲) مجرموں کو قرار واقعی سزا دے۔ (۳) تمام سیاسی جلسے اور مظاہرے بند کر دے۔ (۴) ۵۰۰۰۰۰ پونڈ بطور تاوان ادا کرے۔ اور (۵) ۲۴ گھنٹے کے اندر تمام مصری فوج اور افسروں کو سوڈان سے واپس بلائے۔

حکومت مصر نے پہلی چار شرطوں کو تو مان لیا لیکن آخری شرط سے انکار کر دیا۔ اس پر حکومت برطانیہ بھی سختی کرنے پر اتر آئی مصری پارلیمنٹ نے مجلس اقوام سے برطانیہ کے جور و تعدی کے خلاف اپیل کی، لیکن یہ مجلس بھی تو برطانیہ کی تخلیق تھی ——— غرضکہ وہاں بھی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔

اسی اثنا میں "اتحاد" نام کی ایک پارٹی وجود میں آئی۔ اس کا اصلی مقصد زاغلول پاشا کی طاقت کو توڑنا اور قصر شاہی کی طاقت کو بڑھانا تھا۔ در پردہ خود خدیو اس کی حمایت کر رہا تھا۔ جب ۱۹۲۵ء میں اسمبلی کا اجلاس ہوا تو زاغلول پاشا اور ایک سرکاری امیدوار اسمبلی کی صدارت کے لئے امیدوار کھڑے ہوئے جس کے انتخاب کا نتیجہ زاغلول پاشا کے حسب خواہ نکلا اور سرکاری امیدوار کو اپنے منہ کی کھانی پڑی۔ وزیر اعظم زوار پاشا نے خدیو کو اسمبلی توڑ دینے کا مشورہ دیا۔ اس سے گیارہ مہینے کے بعد صدقی پاشا کی ماتحتی میں انتخابی دستور کو از سر نو ترتیب دینے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ یہ کارروائی صرف اس لئے تھی کہ قواعد ایسے بنا دئے جائیں تاکہ آزادی خواہ زیادہ تعداد میں منتخب نہ ہو سکیں اور پھر پارلیمنٹ پر "قصر" کا اثر غالب رہے لیکن کمیشن کی سخت مخالفت ہوئی اور اس عام مخالفت کے سامنے شاہ فواد کو جھکنا پڑا۔ انتخاب پرانے دستور کے مطابق ہوا اور وفدی بہت بڑی تعداد میں کامیاب ہوئے۔ زاغلول پاشا نے انتخاب کے قبل ہی اعلان کر دیا تھا کہ وہ وزارت بنانا نہیں چاہتے، اسلئے زوار پاشا کے لئے وزارت بنانا ناممکن ہو گیا۔ عدلی پاشا نے ایک مشترکہ وزارت ترتیب دی۔ زاغلول پاشا ایوان کے صدر ہوئے۔ اس وزارت میں عدلی پاشا کی حیثیت کمزور تھی۔ اسلئے انہوں نے استعفےٰ دے دیا۔ ابھی ثروت پاشا کی وزارت قایم ہوئی تھی کہ سرکار برطانیہ سے فوجی مسئلے پر جھگڑا ہو گیا۔ شاہ فواد ثروت پاشا کے ساتھ لندن گئے۔ گفتگو کے بعد ایک معاہدہ مرتب ہوا لیکن قبل اس کے قاہرہ میں سرکاری طور پر اس کا اعلان ہو ۲۳ اگست ۱۹۲۷ء کو سعد زاغلول پاشا کا انتقال ہو گیا۔ نئے معاہدے کے رو سے یہ طے پایا کہ :-

(۱) اگر مصر پر حملہ ہوا تو حکومت برطانیہ مصر کی امداد کرے گی۔

(۲) اگر برطانیہ کو کوئی خطرہ پیش آیا تو حکومت مصر برطانیہ کے لئے تمام سہولتیں مہیا کریگی اور برطانیہ کے خلاف حریفانہ رویہ اختیار نہیں کریگی۔

(۳) انگریزی اصول پر مصری فوج کی تنظیم ہوگی۔

مصطفیٰ نحاس پاشا

سعد زاغلول پاشا کے مرنے کے بعد نحاس پاشا وفد پارٹی کے لیڈر منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں نحاس پاشا نے اپنی پہلی وزارت بنائی، یہ مخلوط وزارت تھی اور محمود پاشا وزیر اعظم تھے، نحاس پاشا کی پالیسی تھی کہ برطانیہ کے خلاف ایک متحدہ محاذ پیش کیا جائے لیکن یہ وزارت بھی زیادہ دن تک نہ چل سکی۔ اس کے ٹوٹنے کے بعد علی ماہر پاشا وزیر اعظم ہوئے، اس درمیان میں مصر کی سیاسی حالت پھر خراب ہو گئی۔ مظاہرے اور ہنگامے ہوئے۔ نحاس پاشا پر حکومت نے رشوت ستانی کا جھوٹا الزام بھی لگایا۔ ان تمام ہنگاموں کے پس پردہ شاہ فواد کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ ۱۹۲۸ء کا پورا سال اسی ہنگامے میں گزر گیا۔ ۱۹۲۹ء میں مزدور پارٹی کے برسر اقتدار آنے سے انگلستان کی سیاست میں نمایاں تبدیلی ہو گئی۔ مصالحت کی پھر گفتگو چھڑی۔ نحاس پاشا لندن گئے۔ سر جان ہنڈرسن وزیر خارجہ تھے، گفتگو کا آغاز ہوا، لیکن سوڈان کے مسئلے نے ایسی پیچیدگیاں پیدا کر دیں کہ مصالحت نہ ہو سکی۔ نحاس پاشا خالی ہاتھ واپس آئے اور آکر اپنا استعفیٰ داخل کر دیا۔ فواد کو موقع مل گیا، تمام طاقت اپنی مٹھی میں لے لی۔ صدقی پاشا وزیر اعظم ہوئے اور مصر پر فوجی حکومت مسلط کر دی گئی۔ وفد پارٹی کے اخبارات پر پابندیاں عاید کر دی گئیں۔ اسمبلی توڑ دی گئی، جلسے جلوس اور مظاہروں کا جواب پولیس کے ڈنڈوں سے دیا گیا۔ عورت مرد، بچے اور طلبہ نے اس ایجی ٹیشن میں خوب حصہ لیا۔ ملک و وطن کے لئے اپنی جانوں کی قربانیاں تک دیں۔ نحاس پاشا اور دوسرے لیڈروں نے فواد کے پاس اس نادر شاہی کو منسوخ کرنے کے لئے درخواست دی۔ صدقی پاشا نے نیا انتخاب کرانا چاہا۔ لیکن اپنی شکست کا ایسا یقین تھا کہ ایسا نہ کر سکے۔ ان کی وزارت بہت بدنام ہو گئی۔ خود ان پر پستول سے حملہ ہوا، آخر ۱۹۳۳ء میں ان پر فالج گرا اور وزارت سے علیحدہ ہو گئے۔ نئے وزیر اعظم عبد الفتاح یحییٰ پاشا فواد کے ہاتھ میں بالکل کٹھ پتلی تھے۔ نومبر ۱۹۳۴ء میں توفیق نسیم پاشا کی وزارت قایم ہوئی، قوم پرستوں نے مطالبہ کیا کہ ۱۹۲۳ء کا دستور پھر جاری کیا جائے۔ جنوری ۱۹۳۵ء میں قومی کانفرنس کا دوسرا اجلاس نحاس پاشا کی صدارت میں منعقد ہوا۔ تمام ملک کے تیس ہزار نمائندے شریک تھے۔ اسکول اور کالج کے لڑکوں نے مظاہرہ کیا، پولیس سے تصادم بھی ہوا۔ برطانی حکومت نے قوت ہی کا آڑے لیکر قوم پرستوں کو دبانے کی کوشش کی۔ ملک کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی کہ جنگ حبشہ چھڑ گئی، سیاسی حالات میں کایا پلٹ ہوئی۔ بحر روم میں اٹلی کا اقتدار برطانیہ کے لئے خطرہ بن گیا۔ مسولینی کی امنگوں کے آگے سویز اور برطانیہ کے مشرقی مقبوضات خطرہ میں تھے۔ ادھر قوم پرستوں کو موقع مل گیا، اپنے مطالبے پر سختی سے اڑے رہے، مصر کی تمام سیاسی جماعتیں متحد ہو گئیں۔ آخر برطانی حکومت مجبور ہوئی کہ مصر سے مصالحت کر لیجائے۔ فروری ۱۹۳۵ء میں علی ماہر پاشا وزیر اعظم ہوئے۔ لیکن فواد کے مرنے سے وزارت ٹوٹ گئی۔ اس بار نحاس پاشا وزیر اعظم ہوئے، اسی سال اگست کے مہینے میں نحاس پاشا لندن گئے۔ اور ۲۶ اگست ۱۹۳۶ء کو مصری برطانی معاہدہ مرتب ہوا۔ اور اس پر لوکارنو ہال میں فریقین کے دستخط ثبت ہوئے۔ نحاس پاشا نے زاغلول پاشا مرحوم کے قلم سے اس پر دستخط کئے۔ نیز حسب ذیل مصری اور برطانی مدبرین نے دستخط کئے۔

(۱) نحاس پاشا ——— صدر وفد پارٹی
(۲) محمود پاشا ——— صدر احرار پارٹی
(۳) مکرم عبید پاشا ——— وزیر خارجہ مصر
(۴) اسمٰعیل صدقی پاشا ——— صدر جماعت شعب
(۵) عبد الفتاح یحییٰ پاشا۔ (۶) علیبی پاشا۔ (۷) ڈاکٹر احمد ماہر۔ (۸) ڈاکٹر محافظ عفیفی پاشا۔
(۹) محمود فہمی پاشا۔ (۱۰) حمدی سیف پاشا۔ (۱۱) واصف علی پاشا (۱۲) عثمان محرم پاشا

برطانی مدبرین :-
(۱) مسٹر انتھونی ——— وزیر خارجہ انگلستان
(۲) لارڈ ہیلی فیکس ———

(۳) مسٹر ریمزے میکڈانلڈ۔ (۴) سر مائلز لیمپسن ہائی کمشنر مصر

اس معاہدہ میں کل سولہ دفعات ہیں، اس کی رُو سے مصر پر برطانی اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ معاہدہ بیس سال کے لئے تھا، دونوں ملکوں کی رضامندی سے اس میں ترمیم اور تنسیخ بھی ہو سکے گی۔ اصولی طور پر مندرجہ ذیل امور کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

(۱) دونوں ملکوں کے درمیان اتحاد رہے گا۔

(۲) کوئی فریق ایسا رویہ اختیار کرے گا جو معاہدہ کے خلاف ہو یا ایسا معاہدہ نہیں کرے گا جس سے اس کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔

(۳) اگر کوئی جھگڑا پیدا ہوا تو مشورہ سے طے کیا جائے گا۔

(۴) جنگ کے موقع پر ایک دوسرے کی امداد کریں گے۔

(۵) جنگ کے وقت یا فوری ضرورت کے موقع پر مصری بندرگاہ، ذرایع، رسل و رسائل، ہوائی اسٹیشن کے استعمال کا حق برطانیہ کو ہوگا، نہر سویز گرچہ مصر کی ملکیت ہے لیکن یہ عالمگیر رسل و رسائل کا رستہ ہے اس لئے حکومت برطانیہ مصری فوج سے تعاون کرتے ہوئے نہر سویز کی حفاظت کرے گی، نہر سویز کی حفاظت کے لئے فوجی بارکیں تعمیر کی جائیں گی۔ دس ہزار فوج اور چار سو ہوا باز اس وقت تک وہاں رہیں گے۔ جب تک کہ فریقین کو اطمینان نہ ہو جائے کہ مصری فوج اب نہر کی حفاظت کرنے کے لائق ہوگئی۔ برطانی طیارے تمام ملک میں پرواز کر سکیں گے۔ ۱۹۳۳ء میں European Bearean of Public Security Department جو قایم ہوا تھا اب ختم ہو جائے گا۔ پانچ سال تک فوج میں یورپین عنصر موجود رہیگا۔ مشرقی بحر الکاہل میں برطانوی بیڑے کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اسکندریہ میں عارضی انتظام کر دیا جائے گا۔ مصر میں رائل۔ ایر فورس (R. A. F.) کے جو دستے مقیم ہیں ان کی تعلیم و تربیت کے لئے حکومت مصر سہولتیں مہیا کرے گی۔ اسکندریہ اور نہر سویز کے درمیان رسل و رسائل کا بہترین انتظام کیا جائے گا۔ حکومت مصر کو اپنی فوجی قوت بڑھانے اور مزید سامان حربی خریدنے کی اجازت ہوگی۔ انگریزی افسر مصری فوج کو قومی فوج بنانے میں مدد دینگے۔ مصری فوج کو سوڈان کی حفاظت کرنے میں دخل دینے کا حق ہوگا۔ اہل مصر کو سوڈان میں آباد ہونے اور وہاں تجارت کرنے کی اجازت ہوگی اور حکومت برطانیہ اس کی مدد کرے گی۔

اس معاہدہ کے بعد حافظ عفیفی پاشا مصر کے پہلے سفیر بنا کر لندن بھیجے گئے۔ اور سر مائلز لیمپسن جو قبل مصر میں ہائی کمشنر تھے برطانی سفیر بن کر مصر آئے۔ ۲۶ مئی ۱۹۳۶ء کو مصر مجلس اقوام میں بحیثیت ایک رکن کے شامل ہوا۔ جب یہ وفد مجلس اقوام کے اجلاس میں شریک ہو کر مصر واپس آیا تو ملک میں بہت خوشیاں منائی گئیں۔ جلسے کئے اور جلوس نکالے گئے۔ نحاس پاشا کا ہر جگہ شاندار استقبال کیا گیا۔ اس کے بعد سویز کمپنی نے بھی ایک معاہدہ کیا جس کی رُو سے

(۱) مصر کو بجائے ..... ۲ پونڈ ..... ۳۰۰۰۰۰ پونڈ سالانہ ملا کریں گے۔

(۲) کمپنی پورٹ سعید سے اسمٰعیلیہ تک اپنے خرچ سے سڑک تعمیر کرے گی۔

(۳) کمپنی کی ملازمت میں مصر کا تناسب ۳۳ فیصدی ہوگا۔

مصر کی قومی اسمبلی نے ان معاہدوں کی تصدیق کر دی۔

"معاہدہ کے بعد" اور "وفد کا زوال"

معاہدہ کے بعد وفد پارٹی برسر اقتدار ہوئی۔ اور نحاس پاشا نے اپنی وزارت اس طرح ترتیب دی :-

(۱) نحاس پاشا ——— وزیر اعظم۔ (۲) مکرم عبید پاشا ——— وزیر مالیات۔ (۳) محمود فہمی نقراشی، وزیر مواصلات

(۴) محمد صفوت پاشا ——— وزیر اوقاف۔ (۵) عثمان محرم پاشا ——— وزیر امور عامہ

(۶) احمد حمدی ——— وزیر زراعت۔ (۷) علی ماہر پاشا ——— وزیر حرب۔ (۸) محمود غالب بک ——— عدلیہ

(۹) واصف جمال ——— وزیر خارجہ۔ (۱۰) علی زکی العرابی بک ——— وزیر معارف۔

برسر اقتدار ہونے کے بعد وفد پارٹی نے تمام اصول کو بالائے طاق رکھ کر "برادر نوازی" شروع کر دی۔ مخالف اخبارات کی زبان بندی اور دوسرے الزامات جو وہ ثروت پاشا اور صدقی پاشا کی وزارتوں پر عائد کرتے تھے، خود ان کے شکار ہو گئے۔ اس سے ملک میں ان کی ساکھ گر گئی۔ ان حالات میں انہوں نے قصر پاشاہی سے ٹکر لی۔ قصر پر اب نوجوان اور پرجوش عزیز فاروق کا سکہ چل رہا ہے۔ فواد بھی ہر دلعزیز تھے، لیکن اپنی ہوشیاری اور ڈپلومیسی کی بدولت فاروق کی مقبولیت ان کے چال چلن اور اسلامیت کی وجہ سے ہے۔ نحاس پاشا نے شاہ کی منظوری کے لئے ایک دستور کا مسودہ پیش کیا۔ اس نئے دستور کا مطلب بادشاہ کے اختیارات کو کم کرنا تھا، اب تک مصر کے وزیر اعظم قصر شاہی کے نامزد کردہ ہوتے آئے تھے، یہ دوسری بات ہے کہ شاہ اکثریت کے لیڈر ہی کو وزیر اعظم نامزد کرتا تھا۔ یہ ایک متنوع طریقہ ابتدا سے چلا آتا تھا، لیکن نحاس پاشا نے چاہا کہ شاہ کے ہاتھ سے اس اختیار کو لے لیں۔ شاہ نے اختلاف کیا، اور وزارت گر گئی۔

کھلا انتخاب ہوا۔ اب وفد کی وہ بات نہیں رہی تھی۔ نحاس پاشا کی بعض حرکتوں سے پارٹی کے اندر پھوٹ پڑ چکی تھی۔ مکرم عبید، احمد ماہر نے وفد سے الگ ہو کر سعد پاشا کے نام پر "سعدی" پارٹی بنائی۔ اس پر از سر نو طاقت کی پشت پر۔ انتخاب کا نتیجہ وفد پارٹی کے لئے ایک حادثہ تھا۔ نحاس پاشا اور ان کے دست راست مکرم عبید شکست کھا گئے۔ وفد کے کل بارہ آدمی منتخب ہو سکے۔ نئی وزارت محمد محمود (لبرل) نے سعدیوں کی امداد سے بنائی اور دو سال کامیابی کے ساتھ چلتی رہی۔ دو تین مہینے ہوئے کہ بعض باہمی اختلافات کی بنا پر لبرل وزارت سے علیحدہ ہو گئے۔ نئی وزارت علی ماہر پاشا (آزاد) نے سعدیوں کی امداد سے بنائی۔ اس وزارت میں مصر کے بعض ممتاز لوگ بھی۔ محمد علی علوبہ پاشا وفد فلسطین کے سلسلہ میں ہندوستان بھی آ چکے ہیں اور جنہوں نے ابھی قاہرہ میں فلسطین کانفرنس بلائی تھی۔ ان کے علاوہ عبدالرحمن عزام جو تلوار کے دھنی اور قلم کے بادشاہ ہیں اور جو طرابلس کے جہاد میں اپنی شجاعت اور جوش جہاد کا ثبوت دے چکے ہیں وزارت میں اوقاف کے انچارج ہیں۔ نیز منجھی نفر انشی سعدیوں کے رہنما بھی خاص شخصیت کے مالک ہیں۔

دنیا کی موجودہ متزلزل حالت میں مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا بہت دشوار ہے۔ حبشہ پر اٹلی کا قبضہ ہو جانے سے برطانیہ اور مصر ایک دوسرے سے موالات کرنے پر مجبور ہیں۔ معاہدہ کے بعد سے مصر مسلسل فوجی تیاریوں میں منہمک ہے۔ ابھی ایک ریزرو فوج (الجیش الاحتیاطی) عبدالرحمن عزام مشہور طرابلسی مجاہد کی نگرانی میں مرتب ہو رہی ہے۔

یہ تھا مصر کی نئی سیاسی تشکیل اور ارتقا کا مختصر خاکہ جو کم سے کم لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس سے ناظرین کو مصر کی سیاسی حالت کا اندازہ کرنے میں آسانی ہو گی۔

برقی پریس سبزی باغ میں

بجلی کے ذریعہ کم سے کم اجرت میں اچھی طباعت، اچھی کتابت کا کام پابندی وقت کے ساتھ انجام دیا جاتا ہے۔ یہ آپکا اسلامی پریس ہے۔

اسے بھولنے کی کوشش نہ کریں

منیجر برقی پریس۔ سبزی باغ۔ بانکی پور۔ پٹنہ

افغانستان

جنگِ عظیم کے بعد

از جناب سید محبوب احمد صاحب وارثی بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔ علیگ

جنگِ عظیم کے شروع ہونے سے پہلے اور ختم ہونے کے بعد تک افغانستان میں فی الحقیقت کوئی آزاد اور خود مختار حکومت نہ تھی، بلکہ حکومت برطانیہ کے زیرِ اثر یہ ایک ریاست کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس کے فرمانروا کو بادشاہ نہیں، بلکہ امیر کہا جاتا تھا۔ جنگِ عظیم کے دوران میں افغانستان میں امیر حبیب اللہ خاں سریر آرائے حکومت تھے۔ برطانیہ سے اُن کی دوستی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ افغانستان میں صرف برطانوی حکومت قایم ہونی باقی رہ گئی تھی ورنہ برطانوی اثر اور اقتدار دوستی کی حد سے تجاوز کر کے ملک کو محکومیت کے درجے پر پہونچا چکے تھے۔

۱۹۱۸ء میں جنگِ عظیم ختم ہوئی، اور افغانیوں نے محسوس کیا کہ برطانیہ کی دوستی ملک کے حق میں مہلک ثابت ہو رہی ہے۔ امیر حبیب اللہ کو اس خطرے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن ان کی دوستی عشق کی اُس حد تک پہونچ چکی تھی، جہاں خطرات کا احساس ممکن ہی نہیں ہے۔ لہٰذا ملک کے باشندوں کے دلوں میں بادشاہ وقت کے خلاف منافرت کے جذبات پرورش پانے لگے، اور ایک سال بھی گذرنے نہ پایا تھا کہ اس جذبہ نے خطرناک صورت اختیار کر لی اور ۱۹۱۹ء کے اوائل میں امیر حبیب اللہ خاں کو اپنی عزیز جان گنوا کر برطانیہ کی دوستی کا حق ادا کرنا پڑا۔

فروری ۱۹۱۹ء میں امیر امان اللہ خاں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ امیر امان اللہ خاں نے برطانیہ کی دوستی کا نتیجہ ملک اور بادشاہ کے حق میں بھی بخوبی دیکھ لیا تھا۔ ایک مدبر اور بہی خواہ وطن ہونے کی حیثیت سے ملک میں برطانوی اثر و اقتدار کو یک لخت ختم کرنا اُنھوں نے اپنا فرض اولیں جانا۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کی خاطر امیر امان اللہ نے مئی ۱۹۱۹ء میں افغانی فوج کا ایک مضبوط دستہ ہندوستان کی سرحد پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ کیا۔ جنگِ عظیم کو ختم ہوئے ابھی ایک سال بھی نہ ہونے پایا تھا کہ برطانیہ کے سر پر مصیبت کا نیا پہاڑ افغانی فوج کی شکل میں ٹوٹ پڑا۔ دو تین مقامات پر افغانی اور برطانوی فوجوں میں سخت مڈبھیڑ ہوئی۔ دو مقامات پر افغانستان کو فتح ہوئی۔ اور ایک مقام پر برطانیہ کو۔ جنگِ عظیم کی ماندگی ابھی دُور نہیں ہوئی تھی اسلئے برطانیہ نے اس جنگ کو ختم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور بالآخر یہ طے پایا کہ برطانیہ اپنی قدیم پالیسی کو افغانستان میں جاری نہ رکھے گا۔ صلحنامہ راولپنڈی پر فریقین کے دستخط ہو جانے کے بعد افغانستان کی سرحد متعین کر دی گئی۔ اور فرمانروائے افغانستان کا لقب "ہز میجسٹی" تسلیم کر کے برطانوی اثر اور اقتدار کو افغانستان میں ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔

اس کامیاب مہم سے فرصت پاکر امان اللہ خاں نے ملک کی اصلاح کی ٹھانی۔ امان اللہ ایک روشن خیال اور جدید روشنی کا دلدادہ فرمانروا تھا۔ ملک کی ابتری اور زبوں حالی نے اُس کے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ افغانستان کی ترقی اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ ترقی کے وہ ذرایع جنہیں اختیار کر کے دوسرے ممالک نے ترقی کے زینے طے کئے ہیں۔ افغانستان میں بغیر ترمیم و تنسیخ عمل میں نہ لائے جائیں۔ یورپ کی ترقی نے اُس کے دل میں رشک کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اور اس کی دلی تمنا تھی کہ اس کا ملک بھی ترقی کے میدان میں یورپ کے دوش بدوش نظر آئے۔ مذہبی پیشواؤں نے اپنے ذاتی اقتدار کو قایم رکھنے کی غرض سے ملک کو مذہب کے خود ساختہ اصولوں کی آہنی زنجیروں میں اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ گویا اسلام اصلاح اور ترقی کا دشمن ہے۔ اور تغیرات زمانہ کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے۔ امان اللہ خاں اس نتیجے پر پہونچنے پر مجبور ہوا کہ تاوقتیکہ ان آہنی زنجیروں کے ٹکڑے نہ کر دئے جائیں

ملک ہرگز ترقی نہیں کر سکتا ہے۔ مخالفتوں کی پرواہ کئے بغیر اُس نے اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ ملک کے باشندوں کی علاوہ بیرونی طاقتوں نے حریفانہ کارروائیاں شروع کیں لیکن امان اللہ کو اُن کے ارادوں سے باز رکھنا کوئی آسان امر نہ تھا۔ چنانچہ باوجود شدید مخالفتوں کے اصلاحات کی متعدد اسکیمیں ملک میں جاری کر دیگئیں۔

ملک کی اندرونی حالت کی درستی اگر ضروری تھی تو اس سے زیادہ ضروری ملک کے بیرونی اور بین الاقوامی تعلقات کا قیام تھا۔ بین الاقوامی تعلقات قائم کئے بغیر افغانستان کی آزادی نا پائدار اور غیر مستحکم ثابت ہو رہی تھی۔ چنانچہ مارچ ۱۹۲۱ء میں امان اللہ نے سب سے پہلے ترکی سے دوستانہ تعلقات قایم رکھنے کا معاہدہ کیا۔ اُسی ماہ میں ایران سے خوشگوار تعلقات قایم کرنے کے علاوہ تجارتی اور سیاسی معاملات کے لئے بھی ایک معاہدہ کیا گیا۔ ستمبر ۱۹۲۱ء میں روس کا وفد افغانستان آیا اور افغانستان اور روس میں بھی ایک معاہدہ کے ذریعہ دوستانہ تعلقات قایم ہو گئے۔

ان معاہدوں نے افغانستان کو آزاد ممالک کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔ اور جب امان اللہ خاں کو اپنے ملک کے مکمل آزاد ہونے کا یقین ہو گیا تو اُس نے یورپ کی ترقی کا راز براہ راست معلوم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر امان اللہ سنہ ۱۹۲۷ء میں یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ کامل ایک سال تک یورپ کے مختلف ممالک کی سیر کرتے رہے۔ اور وہاں کے حالات کا بغور مطالعہ اور ان کی ترقی کا راز معلوم کرنے کے بعد ترکی اور ایران کو دیکھ کر ۱۹۲۸ء میں افغانستان واپس آ گئے۔

یورپ کے سفر نے امان اللہ خاں کے خیالات میں انقلاب پیدا کر دیا، اور اپنے ملک کو یورپ کی تہذیب کا جامہ پہنانے کی فکر نے انہیں اس درجہ بیچین کر دیا کہ انہوں نے چشم زدن میں کابل کو پیرس اور قندھار کو لندن کی شکل میں دیکھنا چاہا۔ یورپ جانے سے بیشتر ہی بیشتر ملا ہی پیشواؤں نے مخالفت کا علم بلند کر دیا تھا۔ ملک سے مکمل ایک سال کی غیر حاضری سے مخالفین نے ہر قسم کا ناجائز فائدہ اٹھایا، چنانچہ امان اللہ کے واپس آنے کے بعد مخالفت کا طوفان اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ عمائد سلطنت و اکابر حکومت بھی مخالفین کی صف اوّل میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ امان اللہ خاں نے مصلحت وقت اور ہوا کا رُخ دیکھے بغیر شور اور سنگلاخ زمین میں اصلاحات کے پودے لصب کر ڈالے۔ موسم کی غیر موزونیت اور مخالفت کی تند ہوا نے پودوں کو جڑ پکڑنے نہ دیا۔ امان اللہ خاں نے اپنے جوش کے عالم میں مُلّاؤں کے علاوہ با اثر عمائد سلطنت کے خلاف بھی جارحانہ قدم اُٹھایا اور یہ اُن کی زندگی کی پہلی اور آخری غلطی ثابت ہوئی۔ ملک میں مخالفت کا ایک ایسا شور بپا ہوا کہ امان اللہ اس کی تاب نہ لا سکے اور اس شورش نے مُلّائے شور بازار کو مخالفت کا علمبردار بنا کر مئی ۱۹۲۹ء میں امان اللہ کو جلا وطن کر دیا۔

افغانستان کی اس خانہ جنگی نے بچہ سقہ نامی ایک جاہل غریب اور گمنام شخص کو تخت و تاج کا مالک بنا دیا۔ پانچ ماہ تک ملک کی حکومت کی باگ ڈور بچہ سقہ کے ہاتھوں میں رہی اور اس عرصہ میں افغانستان کے شاہی قلعہ اور شاہی دربار میں جو ڈرامہ اسٹیج ہوا کیا اس کا تذکرہ بھی شرمناک ہے۔ اس ڈرامے کا ڈائریکٹر بچہ سقہ تھا، اور اس کے ایکٹر بچہ سقہ کے وہ ساتھی تھے جنہوں نے بغاوت میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

بچہ سقہ کی حکومت افغانستان کے شرفاء و روسا کی عزت و ناموس پر ایک ایسا حملہ تھا جسے وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں نادر خاں کے زیر کمان افغانی فوج نے بچہ سقہ کی حکومت کا خاتمہ کر کے ملک کو مزید ذلت و رسوائی سے بچا لیا۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو نادر خاں کو ملک کے باشندوں نے بہ اتفاق رائے اپنا بادشاہ منتخب کیا۔ اس انتخاب نے افغانستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور جنرل نادر خاں، نادر شاہ کے لقب سے تخت حکومت پر بیٹھے۔

نادر شاہ کو ملک کا کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ اور انہوں نے ملک کے باشندوں کی ذہنیت کا بھی صحیح اندازہ لگا لیا تھا اس لئے انہوں نے امان اللہ کی پالیسی کو برقرار رکھتے ہوئے اس احتیاط کے ساتھ اس پر عمل شروع کیا کہ مخالفتوں کا طوفان تھمتا گیا۔ اور خلاف توقع ایک قلیل عرصہ میں زمین از خود ہموار ہو گئی۔

اصلاحات افغانستان نادر شاہ کے عہد حکومت میں

دستور اساسی نادر شاہ نے اصلاحات کے باب میں سب سے اوّل جگہ دستور اساسی کو دی کیونکہ سابق دستور اساسی کے رائج رہتے ہوئے ملک کی ترقی کے لیے مخالفت کے فتنہ کو جگائے بغیر کوئی اصلاح جاری کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے سنہ ۱۹۳۱ء میں نادر شاہ نے ایک مکمل جدید دستور اساسی کی تشکیل کر کے ملک کی ترقی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھول دیا۔ اور مخالفت کے سیلاب کی آمد کے تمام راستے بند کر دئے۔ اس جدید

دستور اساسی کی رُو سے ملک میں پہلی مرتبہ دو ایوانوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ایک ایوان کا نام سینٹ رکھا گیا۔ اور دوسرے کا نیشنل اسمبلی۔ سینٹ کے اراکین کا انتخاب بادشاہ وقت کے ہاتھوں عمل میں آتا ہے، اور نیشنل اسمبلی کے اراکین کو ملک کے باشندے منتخب کرتے ہیں ملک کے ہر بالغ اور صحیح الدماغ مرد کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ افغانستان کی بادشاہت موروثی ہے اور بادشاہ کا بڑا بیٹا تخت و تاج کا وارث ہوتا ہے۔ حکومت کے مختلف شعبے ہیں اور ہر شعبہ ایک وزیر کے سپرد ہے۔ وزیر اعظم کی تقرری بادشاہ وقت خود کیا کرتا ہے اور دیگر وزرا کی تقرری بادشاہ کی منظوری سے وزیر اعظم کرتا ہے۔ مختلف شعبوں کے نام حسب ذیل ہیں جو حال حال ذیل کے وزرا کی نگرانی میں نہایت سرعت کے ساتھ ترقی کے زینے طے کر رہے ہیں۔

۱	وزیر حربیہ	= شاہ محمود خاں
۲	وزیر خارجیہ	= فیض محمد خاں
۳	وزیر داخلیہ	= محمد گل خاں
۴	وزیر عدلیہ	= فضل احمد خاں
۵	وزیر معارف	= احمد علی خاں
۶	وزیر تجارت و مالیہ	= میرزا احمد خاں
۷	وزیر فوائد عامہ	= اللہ نواز خاں
۸	مدیر مستقل طبیہ	= محمد اکبر خاں
۹	ٹیلیگراف و ٹیلیفون	= رحیم اللہ خاں

فوج ایران کی مانند افغانستان کو بھی اپنی خوش قسمتی سے ایک فوجی سپہ سالار بادشاہ کی قیادت نصیب ہوئی، چنانچہ فوجی اصلاحات میں افغانستان کو بھی بڑی کامیابی ہوئی۔ نادر شاہ نے فوج میں اصلاح نہیں بلکہ ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ ملک میں ——— بدامنی بغاوت اور خانہ جنگی کے باعث افغانی فوج کی ذہنیت حد سے زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ نادر شاہ نے اپنی پیہم کوششوں سے فوج میں ڈسپلن کی ایسی روح پھونک دی کہ آج افغانی فوج کی ڈسپلن دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے کہ چند سال پیشتر اس ملک میں اتنی سخت بغاوت بھی ہوئی تھی۔ فوج کی ڈسپلن درست کرنے کے بعد فوج کے لئے جدید ترین سامان حرب مہیا کئے گئے اور آج افغانی فوج کے پاس ہر قسم کے جدید ترین لوازم جنگ موجود ہیں۔ افغانی فوج کا سپاہی آج جرمن اور انگلینڈ کی فوج کے سپاہی سے ہرگز مختلف نہیں ہے۔ فوجی افسروں کی تعلیم کے لئے نادر شاہ نے ایک ملٹری اکیڈمی بھی قایم کی جس میں اعلیٰ قسم کی جدید ترین فوجی تعلیم دی جاتی ہے۔

تعلیم افغانستان کی جہالت ضرب المثل ہے اور بلا تکلف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ افغانستان کی خانہ جنگی کا واحد سبب وہاں کی عام جہالت تھی جس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مذہبی پیشواؤں نے مذہب کے نام پر ملک کی ترقی کی راہیں روکنی چاہیں اور انہیں ایک بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ نادر شاہ نے اپنے دور حکومت میں جہالت کے خلاف ایک عام جنگ کا اعلان کر دیا۔ ملک میں جہالت کا دورہ ختم کرنے کے لئے متعدد مدرسے اور اسکول قایم کئے گئے۔ حکومت کی طرف سے وظیفے دیکر طلبہ کو یورپ کے مختلف ممالک میں تحصیل علم کیلئے بھیجا گیا۔ عام تعلیم کے علاوہ طلبہ سینکڑوں کی تعداد میں صنعتی تعلیم کے لئے جرمنی، انگلینڈ اور امریکہ بھیجے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ افغانستان کے طلبہ کی سب سے بڑی تعداد اس وقت امریکہ میں صنعتی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ نادر شاہ نے اپنی حکومت کی قلیل مدت میں ایک یونیورسٹی بھی قایم کی جس میں عام تعلیم کے علاوہ صنعتی اور حرفتی تعلیم کا بھی معقول انتظام ہے۔

زراعت و تجارت افغانستان دنیا کا ایک نہایت زرخیز ملک ہے۔ یہاں کی پیداوار کا مقابلہ دنیا کے کسی دوسرے ملک کی پیداوار سے نہیں کیا جا سکتا ہے۔ نادر شاہی حکومت نے آبپاشی کا معقول نظم کر کے اور زراعت کی دوسری جدید سہولتیں بہم پہونچا کر زراعت کی ترقی لامحدود کر دی ہے۔ تجارت کی ترقی کے لئے غیر ممالک سے تجارتی سمجھوتے اور ملک میں متعدد سڑکیں اور بینک وغیرہ بنائے گئے جن کا اثر ملک کی عام تجارت پر نہایت اچھا پڑا اور نئی تجارتوں کے دروازے کھل گئے۔

اسلامی ممالک سے تعلقات

دیگر اسلامی ممالک کی ترقی پذیر حالت کو دیکھتے ہوئے اور بین الاقوامی سیاست میں ان کے بڑھتے ہوئے اثرات کو محسوس کرتے ہوئے نادر شاہ نے یہ ضروری سمجھا کہ افغانستان دیگر اسلامی ممالک سے اپنے تعلقات قایم کرکے اپنا پوزیشن مستحکم کرے۔ چنانچہ نادر شاہ نے اسلامی حکومتوں سے نئے معاہدے کرکے ترکی، ایران، حجاز، مصر اور بغداد میں افغانی سفارت خانے قایم کئے، سفارت خانوں کے قیام نے افغانستان کے تعلقات اسلامی دنیا سے نہایت خوشگوار کردئے ہیں۔ اور امید کیجاتی ہے کہ افغانستان کو کسی اسلامی سلطنت کے خلاف فوج کشی کی ضرورت کبھی پیش نہ آئیگی۔

ملاؤں کا خاتمہ

نادر شاہ کی حکمت عملی نے افغانستان کو دوبارہ زندگی عطا کی ہے سب سے زیادہ خوش آئندہ امر یہ ہے کہ نادر شاہ کی دور اندیشی اور سیاست دانی نے خود غرض اور پیشہ ور ملاؤں کے اثر کو ایک بڑی حد تک ختم کردیا ہے۔ اور یہی افغانستان کی آئندہ ترقیوں کا راز ثابت ہوگا۔ نادر شاہ نے ملک میں کوئی نئی پالیسی رائج نہیں کی۔ اُن کے دور حکومت میں سلطنت کا ہر شعبہ امان اللہ کے نقش قدم پر چلتا رہا۔ امان اللہ کو ان کی ناعاقبت اندیشی نے ناکام کیا اور نادر شاہ کو ان کی دُور اندیشی نے کامیاب بنایا۔

نادر شاہ کا واقعہ شہادت

۸ نومبر سنہ ۱۹۳۳ء کو افغانستان میں ایک دوسرا جانکاہ حادثہ پیش آیا۔ نادر شاہ بعد نماز ظہر ایک جلسے میں طلبہ کو انعامات تقسیم کرتے ہوئے گولیوں کا نشانہ بنائے گئے۔ نادر شاہ کی شہادت نے ملک میں ایک ہیجان برپا کردیا اور دُنیا نے یہ سمجھا کہ افغانستان میں پھر ایک مرتبہ خونریزی اور خانہ جنگی کا بازار گرم ہوگا۔ لیکن ارباب حکومت نے فوراً ہی حالات پر قابو پالیا۔ اور دشمنوں کو اپنے ارادوں میں کامیاب ہونے کا موقعہ دئے بغیر نادر شاہ کے اکلوتے اور جواں سال بیٹے محمد ظاہر شاہ کو ملک کا تخت و تاج حوالہ کردیا۔ تخت نشینی کے وقت محمد ظاہر شاہ تحصیل علم میں مشغول تھے۔ اور اُنہیں یہ گمان بھی نہ تھا کہ اتنی جلد اتنی بڑی ذمہ داری اُن کے سر پر رکھ دیجائے گی۔ لیکن ظاہر شاہ جواں سال ہونے کے علاوہ جواں ہمت بھی ثابت ہوئے۔ انہوں نے اپنی تاجپوشی کے بعد وزراء عمائد حکومت اور حکام سلطنت کے نام جو فرمان جاری کیا اُس سے اُن کی بیدار مغزی اور اعلیٰ تعلیم و تربیت کا پتہ لگتا ہے۔ ذیل میں اس فرمان کا آزاد ترجمہ مختصراً ناظرین کی دلچسپی کے لئے درج کیا جاتا ہے۔

خط مشی حکومت اعلیحضرت محمد ظاہر شاہ

بنام محترم محمد ہاشم خاں - صدر اعظم مملکت افغانستان۔

۱ موجودہ حکومت اسلام کے احکام اور حنفی مذہب کے اصول کے مطابق تمام امور سلطنت کو انجام دیگی۔ مجلس شوریٰ اور وزارت مقننہ کا فرض ہوگا کہ شریعت محمدی کو ملک میں قایم رکھے۔ شعبۂ احتساب اس حکومت کا ایک جزو لازم ہے۔ سلطنت کے کاموں کی انجام دہی میں بلا تفریق قومیت و نسل ہر شخص کے حقوق مساوی تصور کئے جائیں۔ افغانستان میں پردہ اسی حد تک رہیگا جس حد تک شریعت نے تاکید کی ہے۔

۲ رشوت اور شراب نوشی کی سخت ممانعت ہے۔ میرے عہد حکومت میں سلطنت کے ہر رکن کو قرآن مجید کی قسم کھانی ہوگی کہ وہ سلطنت کے امور کی انجام دہی میں کسی شخص سے رشوت ہرگز قبول نہ کرے گا۔ اور اپنی تنخواہ پر اکتفا کرکے دیانتداری اور ایمانداری سے اپنے فرایض کو انجام دیگا۔ شراب نوشی کی سزا شریعت کے مطابق دیجائے گی۔ اور مامورین حکومت کو شرعی سزا کے علاوہ اُن کے عہدوں سے بھی برطرف کردیا جائیگا افغانستان میں شراب فروشی قطعاً ممنوع ہے اور اگر کوئی شخص اپنے مکان یا دوکان پر شراب بیچتا پکڑا جائے تو اس کی جائداد ضبط کرلی جائے۔ اور اس کی سزا شریعت کے اصول کے مطابق کیجائے۔

۳ امور حربیہ۔ موجودہ حکومت کی خواہش ہے کہ اس مسئلہ کو کافی اہمیت دیجائے۔ کیونکہ اس شعبے سے افغانستان کی حیات و ممات وابستہ ہے فوج کی جدید ترین اصولوں پر تنظیم کا معقول انتظام کیا جائے اور جدید سامان حرب مہیا کئے جائیں۔ فوجی افسروں کی تعلیم کے لئے فوجی اسکول کو ترقی دینے کے تمام ذرایع عمل میں لائے جائیں۔ اور فوج کی دلجوئی اور خوشنودی کا خاص خیال رکھا جائے۔

۴ شعبۂ خارجیہ۔ غیر ممالک سے وہ دوستانہ تعلقات قایم رکھے جائیں۔ جو سلاطین پیشین یعنی امان اللہ خاں اور نادر شاہ کے زمانے میں معاہدوں کے ذریعہ قایم کئے گئے تھے۔ اور افغانستان کے تحفظ و استقلال کیلئے اگر ضرورت پیش آئے تو نئے معاہدے بھی کئے جائیں۔

۵ امور داخلہ۔ وزارت داخلیہ کا فرض ہے کہ وہ حکومت کے ہر چھوٹے بڑے افسروں اور حاکموں کے کاموں پر نظر رکھے اور اس بات کی کوشش

کر کے جو شخص جس کام کا اہل ہو اُسی کے سپرد وہ کام کیا جائے اور تمام افسروں اور حاکموں کی مکمل فہرست رکھی جائے اور اُسے وقتاً فوقتاً مجلس انتخاب کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ اس پر غور و خوض کیا جا سکے، ٹیلیفون - ٹیلیگراف - سڑکوں اور دیگر ذرائع مراسلات کی ترقی و توسیع کے لئے ہر ممکن کوشش کو فوراً عمل میں لایا جائے۔

۶ے وزارت مالیہ - ملک کے باشندوں کو اختیار دیا جائے کہ حکومت کے ٹیکس قسطوں میں ادا کریں اور باقی ماندہ ٹیکس کی وصولی اس طرح کیجائے کہ لوگوں کو ناحق پریشانی اور ذلت اُٹھانی نہ پڑے - اور حکومت کے خزانہ کو بھی نقصان کا محل نہ ہونا پڑے - باقیات میں جس طرح سابق حکومتوں نے معافی کا اعلان کیا تھا، موجودہ حکومت بھی اس اعلان کو برقرار رکھے - کوشش کیجائے کہ ملک کی آمدنی میں اضافہ ہو لیکن اضافہ کی خاطر ملک کے باشندوں کو ناحق زیر بار ٹیکس نہ کیا جائے۔

۷ے تجارت و زراعت - افغانستان کی حکومت اس شعبہ کو ترقی دینے کی ضرورت آج سب سے زیادہ محسوس کر رہی ہے - حکومت کی خواہش ہے کہ بیرونی ممالک مثلاً ایران - ایطالیہ - فرانسہ - برطانیہ - اتحاد جمہوریہ شتراکیہ امریکہ - بلجیم - جرمنی اور جاپان سے تجارتی تعلقات قائم کئے جائیں اور ملک کی تجارت کو فروغ دیا جائے - معدنیات افغانستان کو ترقی دینے کے تمام ذرائع عمل میں لائے جائیں - آبپاشی کے لئے نہریں تعمیر کیجائیں اور زراعت کی ترقی کے وسایل دریافت کئے جائیں - (سالنامہ کابل)

پھر تخت نشینی کے وقت ظاہر شاہ نے جو عہد نمایندگان سلطنت اور اکابر حکومت کی موجودگی میں کیا تھا اُسے ذیل میں بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے اس عہدنامے کی عبارت سے ظاہر شاہ کی حکومت اور پالیسی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے - اور انکی پالیسی کی وضاحت اس سے بہتر کرنی ممکن نہیں ہے۔

تعہدنامۂ اعلیحضرت محمد ظاہر شاہ بمجلس شورائے ملی

"امروز کہ ایں خادم اسلام بہ فضل خدائے قادر متعال و اتفاق ملت عزیز نزم بہ پادشاہی افغانستان انتخاب و سلطنت ما از طرف جمہور طبقات ملت تائید شدہ بر اساس اصول نامۂ اساسی مملکت حاضر شدہ ایم، عہدنامہ را کہ قبول و تعہد آں بما متوجہ میشود بحضور شما نمایندگان ملت اظہار کردہ و صورت کتبی آنرا بمہر سعادت مملکت امضا نمایم - - بہ خدائے عظیم و قرآن کریم عہدی کنیم کہ در اعمال و افعال خود خداوند جل شانہ را حاضر و ناظر دانستہ بحفاظت دین مبین اسلام و استقلال افغانستان و حفظ حقوق ملت و فراہمت و ترقی و سعادت وطن بہ اساس شرع متین محمدی و مقررات اصول اساسی مملکت سلطنت نمایم و بہ برکت روحانیت مقدس اولیائے کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم برائے خود استمداد می نمایم - (سالنامہ کابل ۱۳۱۸ھ)

آدمخور

مرتبہ: عظیم بیگ چغتائی - بی - ایل، ایل، بی

کیا ۱۹۴۰ء میں بھی آدمخوری ہوتی ہے - اور آدمی کو آدمی مار کر کھا جاتا ہے، اس سوال کا خوفناک جواب کہاں؟ کیسے؟..... کس طرح آدمی آدمی کا شکار کرتا ہے - لاش کو کس شوق سے تندور میں بھونتے ہیں کس طرح گوشت تقسیم کر کے کھاتے ہیں کس طرح عورت اپنے پیارے بچہ کو بھون کر کھا جاتی ہے - اور اس کے گوشت کا حصہ اپنی بہنوں اور ملنے والیوں میں تقسیم کرتی ہے - عجیب و غریب اور خوفناک رسمیں اور رواج - کس طرح دولہا انسانی گوشت اور کلیجی کے ٹابت ٹکڑے نگلتا ہے اور منہ سے ٹکڑا اگر کر ہنس کر خود دولہا فرج ہو کر یا رانیوں کی خوراک بن جاتا ہے - عورتوں کو سزا دینے میں ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں - شوہر بیوی کو بطور سزا یا تفریح بھون کر کھا سکتا ہے - کس طرح انسانی شکار کے لئے ہڈیوں کے ہار ہٹو نیولے جوتے پہنے جاتے ہیں - اور کس طرح انسان کا انسان کھانے سے پیشتر خون چوس کر پی جاتا ہے - والدین اپنی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو مار کر خود اپنے ہاتھوں سے انکاروں پر اچھالتے ہیں اور جب جربی پگھل کر نکلتی ہے تو کمزور لڑکے کے بدن پر اس کی مالش کرتے ہیں اور انہیں کا گوشت کھلاتے ہیں

آدمخور کی شادی غمی وغیرہ کے دلچسپ مگر لرزہ خیز حالات - رسمیں رواج وغیرہ پرانی باتیں نہیں - افسانہ نہیں بلکہ آجکل کے سچے واقعات اور حالات - قیمت عہ علاوہ محصول ڈاک - دیسی کاغذ بکھائی بھپائی بہترین - فوٹو بلاک کی آدمخور کی تصویر مضبوط کپڑے کی جلد - ہر اچھے کتب فروش سے خریدیں ورنہ براہ راست -

دفتر کتابت (عظیم بیگ چغتائی) جودھپور

صوبہ بہار کے چند موجودہ مشاہیر:-

سید سلیمان ندوی

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ

سید صاحب موصوف کی ولادت ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۴ء) میں دیسنہ (Desna) ضلع پٹنہ میں ہوئی موصوبہ بہار میں سادات کا ایک مردم خیز گاؤں ہے۔ عربی کی تعلیم اپنے بڑے بھائی مولوی حکیم سید ابو حبیب صاحب رضوی مجذوبی سے شروع کی، پھر ایک برس پھلواری شریف میں، اور چند مہینے مدرسۂ امدادیہ دربھنگہ میں رہے۔ اس کے بعد ۱۹۰۱ء میں لکھنؤ کے دار العلوم ندوہ میں داخل ہوئے اور وہیں سات برس رہ کر علوم عربیہ کی تکمیل کی۔ مدرسۂ مذکور کے معتمد و ارکان میں مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری شاہ سلیمان صاحب پھلواروی اور مولانا شبلی نعمانی تھے۔ موصوف کی ذکاوت و ذہانت کی بنا پر ہمیشہ اُن پر شفقت فرماتے تھے۔ غالباً ۱۹۰۳ء میں نواب محسن الملک دار العلوم آئے تھے، اُسوقت شاہ سلیمان پھلواروی ندوہ کے معتمد تھے، نواب صاحب نے طلبہ کا امتحان لیا، اور عربی اخبار پڑھوا کر سنا۔ اس امتحان میں سید صاحب موصوف اول آئے ساتھ ہی انھوں نے نواب صاحب کی مدح میں اپنا عربی قصیدہ پڑھکر سنایا، نواب صاحب بہت محظوظ ہوئے۔ اور شاہ صاحب بھی بہت خوش ہوئے۔ اوسی زمانہ کے اخبارات میں شاہ صاحب نے اس کا حال چھپوایا۔ اور لکھا تھا کہ انشاء اللہ ہر زمانہ میں ایک سلیمان بہار کی سرزمین میں علم اور دین کی خدمت کے لئے موجود رہے گا۔ ۱۹۰۴ء میں مولانا شبلی مستعفی ہو کر آئے، تو مولانا شبلی نعمانی نے اون کو اپنے دامن تربیت میں لے لیا

سید صاحب کا خاندانی پیشہ طبابت تھا۔ اہل خاندان چاہتے تھے کہ یہ طب پڑھیں۔ مگر موصوف کی طبیعت ادھر مائل نہ تھی ۱۹۰۵ء میں مولانا شبلی پٹنہ آئے ہوئے تھے۔ اور حسبٹس مولوی شرف الدین صاحب یا مولوی خدا بخش خاں صاحب کے یہاں ٹھہرے تھے کہ اتفاقاً موصوف کے چھوٹے چچا مولوی ابو یوسف صاحب کی ملاقات مولانا سے ہوئی، مولوی صاحب موصوف نے عرض کی کہ سید سلیمان کو نصیحت فرمائی جائے کہ وہ طب پڑھیں۔ مولانا نے فرمایا "آپ لوگ اس کو کیوں خراب کرنا چاہتے ہیں اسکو میرے حوالہ کر دیجئے، میں اوسکی تربیت کرکے اپنے کام کا بنا لونگا" چنانچہ اوس دن سے اہل خاندان نے اونکو مولانا کی نذر کر دیا۔

سید صاحب موصوف کو ادب کا شوق پھلواری کی علمی صحبتوں میں ہوا، دربھنگہ جب گئے تو داخلہ کے پہلے ہی ہفتہ میں وہاں کے طلبہ کی انجمن میں ایسی اعلیٰ تحریر پڑھ کر سنائی کہ ہر طرف سے تحسین و آفریں کا نعرہ بلند تھا اور اوس ہفتہ کی وہی تحریر "اخبار" لینچ" میں چھپنے کے لئے بھیجی گئی سید صاحب کا سب سے پہلا مضمون "وقت" کے عنوان سے مخزن لاہور میں ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا، اسی سال اپنے وطن کی انجمن الاصلاح کے جلسۂ سالانہ میں "علم اور اسلام" پر ایک بسیط تقریر لکھ کر بھیجی جس کو اہل علم نے بہت پسند کیا، چنانچہ وہ تقریر علی گڈھ کے مشہور رسالہ "علی گڈھ منتھلی میگزین" میں ایڈیٹر کے تعریفی نوٹ کے ساتھ چھپی، اسکے بعد موصوف کی ادبی شہرت آہستہ آہستہ بڑھنے لگی، اوسی زمانہ میں ندوۃ العلماء کی طرف سے "الندوہ" نام مشہور علمی رسالہ نکلنا شروع ہوا تھا، جس کے اڈیٹر مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی تھے، سید صاحب نے علم حدیث پر پہلا مضمون لکھا جس کی داد مولانا حالی نے مولانا شبلی کو دی۔

۱۹۰۶ء میں اونکی اور اون کے رفقاء کی دستار بندی کا جلسہ فاہ عام لکھنؤ میں ہوا، فلسفۂ جدید و قدیم پر اونھوں نے تقریر کی مجمع بہت بڑا تھا، اہل علم بھی شریک جلسہ تھے، اتفاقاً مجلس میں سے کسی نے اوٹھ کر کہا "اگر یہ عربی میں تقریر کریں تو جانیں کہ مدرسہ کی تعلیم کیسی ہے" سید صاحب موصوف نے اسی وقت عربی میں ایسی تقریر کی کہ لوگ حیرت میں آگئے، یہ دیکھ کر مولانا شبلی مرحوم نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ یہ تقریر پہلے سے تیار کرالائے ہیں، اگر کوئی صاحب چاہیں تو اسی وقت موضوع مقرر کریں، یہ تقریر کریں گے۔ مولانا شبلی مرحوم نے اپنے خط میں یہ واقعہ خود لکھ کر ۱۵ مارچ ۱۹۰۶ء کو مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کے نام بھیجا ہے:-

"جلسہ بڑی کامیابی سے ہوا، سلیمان کی طرف سے درخواست کی گئی کہ فی البدیہہ جو مضمون بتایا جائے اسی وقت اسی پر عربی زبان میں لکچر دونگا، غلام الثقلین نے ایک مضمون دیا، اور بغیر ذرا سی دیر کے سلیمان نے نہایت مسلسل فصیح و صحیح عربی میں تقریر شروع کی، تمام جلسہ محو حیرت تھا۔ اور آخر لوگوں نے نعرہ ہائے آفریں کے ساتھ خود کہا کہ اب حد ہو گئی۔

(مکاتیب شبلی ص ۱۵۸)

استاد نے نہایت خوشی میں اوٹھ کے اپنے سر سے عمامہ اوتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا، یہ فی البدیہہ عربی میں تقریر ہندوستان میں بالکل نئی بات تھی، تمام ملک میں شور مچ گیا، اور عربی مدرسوں میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ اور اسی وقت سے مدرسوں میں عربی تحریر و تقریر کا وہ شوق پیدا ہوا، جو آج تک جاری ہے۔

سید صاحب موصوف کو طالب علمی سے "الندوہ" کی دیکھ بھال کی خدمت سپرد تھی، اب وہ ۱۹۰۶ء میں اوس کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے ان کے مضامین نے دنیا میں شہرت کو چار چاند لگا دئے۔ ۱۹۰۸ء میں دار العلوم میں علم کلام اور جدید ادب عربی کے استاد مقرر ہوئے، دو برس کے بعد مولانا شبلی کے قائم کردہ شعبہ "سیرۃ النبی" میں اون کے لٹریری اسسٹنٹ ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جب تمام ہندوستان طرابلس کی جنگ کے ہنگامہ سے پر شور تھا، پھر بلقان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ اور مسلمانوں کی سیاسیات کا نقطۂ نظر بدل گیا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ خالص علمی مشاغل کو چھوڑ کر سیاسیات میں آئے۔ مولانا شبلی مرحوم خود بہت آزاد سیاست داں تھے، وہ سرسید کے ساتھ رہ کر بھی سیاست میں اون سے الگ اور ملک کی آزادی کے حامی تھے۔ اور اسلامی سیاسیات میں اتحاد اسلامی پر ایمان رکھتے تھے۔ اور وہ سب سے پہلے مسلمان عالم تھے جنھوں نے اسی خیال سے ۱۹۰۶ء میں ٹرکی کا سفر کیا۔ یہی اثر اون کے شاگردوں پر ہے۔

جب ۱۹۱۰ء میں مولانا ابوالکلام نے جو خود بھی مولانا شبلی کے ہمنشیں اور صحبت یافتہ ہیں۔ کلکتہ سے الہلال نکالا جس کی دعوت بعینہٖ یہی تھی تو اس موقع پر سید صاحب موصوف علمی و تعلیمی مشاغل کو چھوڑ کر ۱۹۱۱ء میں الہلال کے اسٹاف میں داخل ہو گئے۔ اور اس کے اصلی ہیجان کے زمانہ میں اوس کے مضامین میں شریک رہے۔ بلقان اور مسجد کان پور کے زمانہ میں وہ کلکتہ میں مولانا ابوالکلام کے ساتھ سرگرم عمل رہے۔ الہلال میں واقعۂ کان پور پر "مشہد اقدس" کے عنوان سے سید صاحب نے جو مضمون لکھا تھا۔ وہ بڑا انقلاب انگیز تھا۔ گورنمنٹ نے اوسکو ضبط کر لیا۔

واقعات کے سکون کے بعد وہ پھر دفتر سیرت میں آ گئے۔ اور یہاں سے ۱۹۱۲ء میں مولانا کے حکم سے بمبئی یونیورسٹی کے ماتحت دکن کالج پونہ میں اسسٹنٹ مشرقیہ کی معلمی قبول کی۔ ابھی دو برس بھی نہیں گذرے تھے کہ نومبر ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی نے انتقال کیا۔ مرتے دم شاگرد کو تاردیکر بلوایا اور وصیت کی کہ وہ سب کام چھوڑ کر سیرۃ النبی کی تکمیل کریں۔ جس کو وہ تمام تر نامکمل چھوڑ گئے تھے۔ چنانچہ اونھوں نے استاد کی وصیت کے مطابق سرکاری نوکری سے استعفا دیدیا اور اس وقت سے لے کر آج تک اس کام کے انجام میں مصروف ہیں۔ اور اس وقت تک اوسکی چھ ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ جلدیں اسلامی معلومات کا خزانہ اور جدید علم کلام کی اساس ہیں۔

موصوف کی سب سے پہلی تصنیف دروس الادب لام عربی کی دو ریڈریں ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں مولانا شبلی کے اشارہ سے لغات جدیدہ کے نام سے اونھوں نے جدید عربی الفاظ کی ڈکشنری لکھی۔ اس کے بعد ارض القرآن کی دو جلدیں لکھیں۔ پہلی ۱۹۱۸ء اور دوسری ۱۹۱۹ء میں، اس کتاب نے ہندوستان کے علمی حلقہ میں ہلچل ڈال دی۔ بعد ازاں نواب سلطان جہاں بیگم والئی بھوپال کی فرمائش سے ۱۹۲۰ء میں سیرت عائشہ لکھی۔ ان تصانیف کے ساتھ ساتھ ملک کے دیگر علمی و تعلیمی و مذہبی مدارس و مجالس کی خدمات بھی بجا لاتے رہے۔

۱۹۱۵ء میں انجمن ترقی اردو کے سالانہ اجلاس منعقدۂ پونہ کی صدارت کی۔ اور اس میں وہ خطبۂ صدارت پڑھا جو

ل خواجہ غلام الثقلین مرحوم۔

آگے چل کر اردو کی تاریخ پر تحقیق کرنے والوں کے لئے پیش خیمہ ثابت ہوا۔

۱۹۱۴ء کے آخر میں ترکی نے جب جنگ عظیم میں شرکت کی تو مسلمانوں میں ہیجان ہوا۔ اور بڑے بڑے مسلمان ارباب فکر قید و بند میں ڈالے گئے۔ اس موقع پر جو نیا گروہ ان کی تعاقم مقامی کے لئے بڑھا ان میں ایک شخصیت اونکی بھی ہے۔ ۱۹۱۵ء سے لے کر ۱۹۱۶ء تک انھوں نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی سیاسی تحریکات میں شمولیت کی۔ ۱۹۱۷ء میں مجلس علمائے بنگالہ کلکتہ کے نہایت اہم اجلاس سالانہ کی صدارت کی جس میں تمام رہنمایان ہند شریک تھے۔ اس سال اسی کے ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس بھی انہیں تاریخوں میں کلکتہ میں تھے۔ اس لئے مجلس علمائے بنگالہ کا یہ اجلاس بڑا اہم تھا۔ اس اجلاس میں موصوف نے جو خطبہ پڑھا وہ بنگال میں بڑا اثر انداز ہوا۔ یہ پہلا خطبہ تھا جس میں جنگ کے بہیمانہ اثرات کے باوجود مولانا ابوالکلام وغیرہ کا نام جو اوس زمانہ میں نظر بندی جرأت کے ساتھ لیا گیا۔ اور لوگوں کے دلوں سے رعب اوٹھا۔

۱۹۱۹ء میں خلافت کے سب سے پہلے اجلاس لکھنؤ میں ممتاز شرکت کی، بلکہ علماء اور خالص ارباب سیاست کے درمیان حلقۂ اتصال کا کام دیا۔ اور ایسی پرجوش تقریر کی کہ مسند صدارت سے پائیں تک ساری مجلس بزم ماتم بن گئی، اور مولانا عبدالباری مرحوم اور چودھری خلیق الزماں صاحب وغیرہ کے سارے اختلافات کے خس و خاشاک اس سیل نم میں بہ گئے۔

فروری ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کی سرکردگی میں معاملات ترکی میں انصاف طلبی اور مسلمانان ہند کے مطالبات کی تشریح کے لئے جو خلافت ڈیپوٹیشن یورپ بھیجا گیا اوس کے تین ممبروں میں ایک ممبر وہ منتخب ہوئے۔ اس وفد کے ساتھ اٹلی، فرانس اور انگلستان میں حقوق ترکی کے لئے زبان و قلم اور دعوت و اشاعت کے ذریعہ سے لڑتے۔ اور وہاں کے وزراء، ارباب سیاست اور آزاد مسلمانوں کے گروہ در گروہ سے جو فرانس، سوئزرلینڈ اور اٹلی میں تھے ملتے اور تحریکات میں شمولیت کرتے رہے۔

۱۹۲۰ء کے آخر میں یورپ کے سفر سے واپس آکر وہ کانگریس میں داخل ہوئے۔ اور ترک موالات کی تحریک میں دیگر علماء وزعماء کے ساتھ مل کر ملک کا دورہ کیا۔ خلافت کے اجلاس سالانہ منعقدہ میرٹھ میں صدر ہوئے۔ اور دوسری سیاسی مجلسوں میں شرکت کی۔ اخبارات میں مضامین لکھے۔ پبلیٹ فارموں پر تقریریں کیں۔ ۱۹۲۱ء کی کانگریس احمد آباد میں اوسکی ورکنگ کمیٹی کے ممبر منتخب ہوکر سال بھر تک کانگریس کے کاموں میں شریک رہے۔ اسی طرح خلافت اور جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ کے رکن مقرر ہوئے۔ اور ۱۹۲۶ء تک اوس کے جزو کل میں شریک رہے۔

۱۹۲۴ء میں ابن سعود اور شریف حسین میں جب جنگ کا آغاز ہوا۔ اور دونوں نے مجلس خلافت کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تو مسلمانان ہند نے موصوف کی صدارت میں ایک وفد حجاز کو بھیجا۔ تاکہ وہ فریقین کے سامنے مجلس خلافت کی تجاویز کو پیش کرے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے دو ماہ جدہ میں عین جنگ کے زمانہ میں رہ کر مفوضہ فرائض کو انجام دیا۔ اور بڑی دلیری سے شریف حسین اور سلطان ابن سعود کی حکومتوں سے حجاز میں عربوں کی ایک جمہوری حکومت کے قیام کے مسئلہ میں گفتگو اور خط و کتابت کرتے رہے۔ اور جب اس میں ناکامی ہوئی تو خدیوی میل پر حجاز سے مصر کا سفر کیا۔ اور وہاں کے علماء اور اکابر سے مل کر حجاز کے معاملہ پر گفتگو کی۔ اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ ازہر نے ان تجاویز پر اپنی رضامندی ظاہر کی یہ اس وفد کی ایسی کامیابی تھی کہ رائٹر نے اس کی خبر مصر سے ہندوستان بھیجی۔ اور دنیا کے دوسرے شہروں میں نشر کی۔

مارچ ۱۹۲۶ء میں کلکتہ میں جمعیۃ العلماء کا جو اہم سالانہ اجلاس ہوا اس کے وہ صدر منتخب ہوئے۔ اس موقع پر موصوف نے جو خطبۂ صدارت پڑھا۔ وہ ہندوستان کے اسلامی سیاسیات میں یادگار ہے۔ اوسی سال وہ پھر دوسرے وفد حجاز کے صدر منتخب ہوئے یہ ہندوستان میں شدھی اور سنگھٹن کے زور کا زمانہ تھا۔ اس موقع پر دہلی میں مجلس خلافت کا خاص اجلاس ہوا اور حکیم اجمل خاں مرحوم کی تحریک پر موصوف نے اوسکی صدارت کی۔ اس اجلاس میں موصوف نے ہندو مسلمان تعلقات کی نسبت مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو علی [illegible] پیش کیا۔

اس کانفرنس سے فارغ ہوکر وہ حجاز کا وفد خلافت لے کر جس کے ممبر مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور شعیب قریشی [illegible] حجاز کو

روانہ ہوئے۔ اس وقت سلطان ابن سعود نے تمام دنیا سے مسلمانوں کی کانفرنس مکہ معظمہ میں طلب کی تھی۔ ٹرکی۔ مصر افغانستان۔ یمن اور دوسرے اسلامی ملکوں کے نمایندے شریک اجلاس تھے۔ اور چند ہفتوں تک برابر اوس کے اجلاس ہوتے رہے۔ تمام دنیا کے نمائندوں نے بہت بڑی اکثریت سے موصوف کو اس اجلاس کا وائس پریسیڈنٹ (نائب الرئیس) منتخب کیا۔ اور متعدد دفعہ انھوں نے صدر اجلاس کی غیر حاضری میں اس اسلامی موتمر کے جلسوں کی صدارت کی۔ اسی سفر میں حجاز کے معاملات اور ابن سعود کے تسلط کی موافقت و مخالفت کے مسائل میں وہ اپنے رفقا رمولانا محمد علی صاحب وغیرہ سے اختلاف رائے کی بنا پر سیاسیات سے کنارہ کش ہوکر خالص اصلاحی و علمی و تعلیمی کاموں میں مصروف ہوگئے۔

سید صاحب موصوف کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ دارالمصنفین ہے۔ جو مولانا شبلی کی یادگار میں ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی کے موطن اعظم گڈھ میں قائم ہوا۔ اس ادارہ نے اسلامی علوم و فنون پر بہت سی کتابیں ہمارے نوجوانوں کے لئے شائع کی ہیں "معارف" اس کا ماہوار رسالہ ہے جو پچیس برس سے اوسی آب و تاب سے نکل رہا ہے۔ دارالمصنفین اسوقت جو کچھ علمی خدمات انجام دے رہا ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں

۱۹۳۳ء میں ہز مجسٹی شاہ نادر خاں کی دعوت پر ڈاکٹر سر اقبال اور نواب سر راس مسعود کے ساتھ کابل یونیورسٹی کے قیام کے مشورہ کے لئے کابل گئے۔ اور وہاں حکومت کے مہمان رہے۔ اور اسی سلسلہ میں غزنی اور قندھار کا سفر کیا۔ ۱۹۳۶ء میں ریاست حیدرآباد نے اپنے ضابطہ فوجداری شرعی کی تدوین کی خدمت اونکو سپرد کی۔ جس کو بخوبی انجام دیا۔ ریاست نے اس ضابطہ پر نظر ثانی کرنے کیلئے ایک کمیٹی مقرر کی جس میں ایک سابق جج ہائی کورٹ۔ مفتی ریاست اور آپ تھے۔ اس کمیٹی نے ایک مہینہ میں اپنا کام پورا کیا۔

ادھر مدت کی سیاسی خاموشی کے بعد فلسطین کے مسئلہ میں انھوں نے اپنی آواز بلند کی۔ اور ۱۹۳۱ء کی آل انڈیا فلسطین کانفرنس دہلی کی صدارت کی۔ اس موقع پر جو خطبہ انھوں نے پڑھا اوس نے سارے ملک بلکہ دنیائے اسلام میں تہلکہ مچا دیا۔ مصر اور شام کے اخبارات نے اوس کے ترجمے چھاپے۔ مجلس اعلیٰ فلسطین کے صدر سید امین الحسینی نے تار سے اونکا شکریہ ادا کیا۔

اب وہ زیادہ تر علمی و تعلیمی معاملات میں حصہ لیتے ہیں ۱۹۳۲ء میں ہندوستانی اکیڈمی کی ادبی کانفرنس لکھنو کی صدارت کی۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد علی گڈھ یونیورسٹی کورٹ، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، مدرسہ ٹریننگ بورڈ پٹنہ، ہندوستانی کمیٹی حکومت بہار اور جامعہ ملیہ دہلی کے ممبر ہیں اردو زبان اور اردو ادبیات سے اون کو ہمیشہ ذوق رہا ہے انکے قلم کی لکھی ہوئی تحریریں ادب اردو کا اعلیٰ نمونہ سمجھی جاتی ہیں ہندوستانی زبان کی تحریک کی بنا انہی نے ڈالی ہے جو آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہے۔ اسوقت تک اونکی جو تصنیفات شائع ہوچکی ہیں۔ اون کے نام یہ ہیں۔

دروس الادب (عربی ریڈر) لغات جدیدہ (جدید عربی لغات) ارض القرآن دو جلدیں، سیرۃ عائشہ، سیرۃ النبی کی پانچ ضخیم جلدیں، حیات امام مالک خطبات مدراس، عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہاز رانی، خیام، خلافت اور تعلیم کے موضوع پر چند رسالے اور بے شمار علمی و ادبی مضامین، اور ابھی حال میں اونکے ادبی مضامین کا مجموعہ "نقوش سلیمانی" کے نام سے چھپا ہے۔ ان کتابوں میں سے سیرۃ عائشہ اور سیرۃ النبی کے ترجمے ترکی اور فارسی میں، اور خطبات مدراس، عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہاز رانی کے ترجمے انگریزی میں کئے گئے ہیں خیام کی داد ہندوستان سے لیکر ایران و کابل اور یورپ تک کے فضلائے دیی فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان نے ایران کو جو تحائف دئے ان میں ایک تحفہ "خیام" بھی تھا" ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے اسکو سال کی بہترین کتاب قرار دیکر اوس پر مصنف کو پانچ سو روپے انعام دئے خطبات مدراس عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہاز رانی۔ درحقیقت علمی خطبات کے مجموعے ہیں پہلا مجموعہ خطبات مدراس میں وہاں کی اسلامی جنوبی کانفرنس کی فرمایش پر ۱۹۲۵ء میں دیا گیا تھا" یہ مجموعہ ملک میں بیحد مقبول ہوا اور کئی دفعہ چھپکر شائع ہوچکا ہے اس خطبے کے معاوضہ میں کانفرنس مذکور نے ایک ہزار کی رقم پیش کی۔ دوسرا مجموعہ جو عرب و ہند کے تعلقات پر ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی فرمایش پر ۱۹۲۶ء میں پڑھا گیا تھا۔ اوس کا ترجمہ ہندی اور انگریزی میں بھی شائع ہوچکا ہے۔ اکیڈمی نے اس خطبہ کا معاوضہ ایک ہزار ادا کیا" تیسرا مجموعہ جو عربوں کی جہاز رانی پر ہے ۱۹۳۲ء میں بمبئی کی وزارت تعلیم کی سرپرستی میں بمبئی کی انجمن اسلامیہ ہال میں سنایا گیا تھا اور جس کے معاوضے میں گورنمنٹ نے پانچ سو روپے پیش کئے۔

اعلیحضرت سرکار عالیہ بیگم صاحبہ مرحومہ بھوپال کی فرمایش پر آپ نے سیرت عائشہ لکھی تھی جس کے معاوضہ میں سرکار عالیہ مرحومہ نے پانچسو روپے انعام مرحمت فرمایا۔ اعلیحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ نے کئی بار آپ کو شرف باریابی بخشا اور اپنے دست مبارک سے آپ کو لطف نامے لکھکر

... علوم فنون کی تدریس کا انتظام کیا اور ۱۹۲۰ء سے انجمن ترقی اردو کا منصب عطا فرمایا۔

ڈاکٹر سید محمود

از سید علی مظفر امام آنگلوی مدیر معاون و مہتمم رسالہ ندیم گیا

کسی ملک میں ایسے نفوس معدود سے چند ہوتے ہیں۔ جن کی شخصیت سے ملک قوم یا کسی مخصوص زمانہ کی تاریخ وابستہ ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کے دور حاضر کی تاریخ میں مسلمانان ہند کی انفرادی تحریکات کی سرگذشت اگر مرتب کی جائے تو سرسید کے بعد مسلمانان ہند نے جو سیاسی کروٹ لی ہے اس دور کے بنیادی پتھر کے رکھنے والوں میں ڈاکٹر سید محمود کا وجود گرامی بھی نظر آئے گا۔ اس دور میں ہندوستان کے اسلامی سیاسیات کا مرکز علی گڈھ تھا۔ نوجوان محمود وہاں موجود تھے۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنورنی عبدالمجید خواجہ اور بقدق احمد شروانی گویا یہ چار یار تھے۔ جدھر رخ کرتے ایک ساتھ جدھر قدم بڑھاتے ایک ساتھ جس تحریک کو ہاتھ میں لیتے، اپنی پوری طاقت سے ایک ساتھ چلاتے۔ نواب محسن الملک نواب وقار الملک اس دور میں اسلامی سیاسیات کے سرخیل تھے اور یہ چار یار ان کے قدم قدم کے محاسب اور ان کی عیشت پناہی کیلئے اس دور کے علی گڈھ کالج کے "طلنڈے گے تاخ" لڑکوں کی بے پناہ فوج ۱۰ اکابران نوخیزوں کے ہلکے کبھی جھنجھلتے، کبھی گوشمالی کرتی چاہتے اور کالج سے شہر بدر کرتے اور پھر منت و سماجت سے کالج میں بلائے جاتے اس طرح احباب باصفا ہندوستان کی اسلامی سیاسیات میں حصہ لیتے رہے۔ اور اپنی گویا کمر وندے کی زندگی میں ہندوستان کے مستقبل کا خمیر تیار کرتے رہے۔

علی گڈھ کے اس دور میں "پان اسلامزم" کی عالمگیر تحریک جاری تھی۔ یہی سودائے سید محمود ولایت گئے۔ اب "دشمنوں" سے مقابلہ انہیں کے گھر پر تھا، بہت سی غلط فہمیاں انکی دور ہوئیں اور بہت سی غلط فہمیاں انھوں نے دور کیں۔ یورپ میں اس دور میں اسلامی سیاسیات سے جو اکابر دلچسپی رکھتے تھے۔ ان سے ان کے براہ راست مراسم پیدا ہوئے۔ جو ذاتی تعلقات کی حد تک پہنچ گئے۔ چنانچہ آج بھی ذخیرہ مکاتیب میں یورپ کے برگشتہ مشاہیر کے بے شمار تاریخی خطوط محفوظ ہیں۔

یورپ سے واپسی کے بعد جنگ بلقان کا دور آتا ہے۔ پھر تحریک خلافت شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد تحریک ترک موالات کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۵ء میں اس کا پہلا ثمرہ صوبہ وار اصلاحات ۱۹۳۷ء کی شکل میں نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔ اور ڈاکٹر محمود ہمارے صوبہ کی وزارت کے عہدہ جلیلہ پر نظر آتے ہیں۔ اور وزارت کے خاتمہ کے بعد وہ پھر ہندوستان کی سب سے بڑی منظم سیاسی جماعت کی مجلس عاملہ کے رکن رکین منتخب ہو جاتے ہیں۔ یہ دور ابھی ہماری آپ کی نگاہوں کے سامنے سے گذر رہا ہے۔

ضرورت ہے کہ اس شخصیت کی زندگی کے جملہ خط و خال پوری تفصیل سے قلمبند کئے جائیں۔ یہ ارادہ ان شاء اللہ کتاب حیات محمود کی ترتیب سے پورا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب ممدوح نے ازراہ نوازش اپنے نام کے خطوط اور بعض دوسرے تعلقی مسودے عنایت فرمائے ہیں۔ موصوف سے ہم نے یہ چیزیں اس لئے حاصل کی تھیں کہ تاریخی شخصیتوں کی نادر روزگار تعلقی تحریریں ندیم کے ذریعہ وقف عام کی جائیں۔ لیکن جب میں نے ان تاریخی دستاویزات کا مطالعہ کیا تو سب سے پہلے جس چیز نے میرے دل و دماغ کو متاثر کیا وہ خود سید محمود کی قابل احترام شخصیت تھی۔ اور اسی وقت حیات محمود کی ترتیب کا خیال ذہن میں آیا۔ چنانچہ ہم نے مولانا سید ریاست علی صاحب ندوی مدیر ندیم سے درخواست کی کہ وہ ڈاکٹر صاحب موصوف سے یہ قیمتی تاریخی دستاویزات مستقل طور پر حاصل فرمائیں۔ موصوف نے میری درخواست قبول فرمائی اور ——— یہ قیمتی کاغذات دفتر میں آگئے۔ جو اب راقم الحروف کے زیر مطالعہ ہیں سردست بہار نمبر کی خاطر سے چند سطروں میں محمود کی سیرت کے مختلف ابواب کا خاکہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور پھر ان شاء اللہ ناظرین ان کے تفصیلی معلومات و مباحث حیات محمود میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

(۱)

ڈاکٹر سید محمود کی ولادت ۱۸۸۹ء میں ضلع غازی پور کے ایک قدیم تاریخی مردم خیز قصبہ سید پور بھتری میں ہوئی۔ مقام بھتری

کو ہندوستان کے عہد رفتہ میں غیر معمولی تاریخی اہمیت حاصل رہی ہے۔ بھتری "بھیم" اور "تری" سے مرکب ہے۔ یعنی یہ بھیم کی پیدائش کا مقام ہے یہ مقام اس زمانہ میں راجدھانی تھا۔ آج بھی آثار قدیمہ یہاں کثرت پائے جاتے ہیں۔ ایک لاٹ یہاں اب بھی موجود ہے۔ جو بودھوں کی پہلی شکست کی یادگار ہے۔ یہ فتح سمندر گپت نے پہلی مرتبہ یہاں حاصل کی تھی۔ ابھی کچھ زمانہ گذرا ہے کہ اس موضع میں پتھر کا ایک طباق ملا۔ جو دھوپ کے ساتھ رنگ بدلتا ہے۔ اس سے علم ہیئت کا گہرا تعلق تھا۔ مہاراجہ بنارس نے اس کو حاصل کرنا چاہا۔ مگر نہیں دیا گیا۔ اس موقع پر چاندی کی کچھ تختیاں برآمد ہوئی تھیں۔ جو کلکتہ کے عجائب خانہ میں محفوظ ہیں۔ اسی طرح وقتاً فوقتاً قیمتی اشیاء اس موضع سے برآمد ہوتی رہیں۔ جسکی وجہ سے اسٹیٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں اس قصبہ میں قدآدم سے زیادہ کھدائی قانوناً ممنوع قرار دیدی گئی۔ یہ ممانعت پھر کبھی اٹھائی نہیں گئی۔ اب بھی کبھی کبھی سونے کے چھوٹے چھوٹے سکے یہاں مل جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کا خاندان لودیوں کے زمانہ میں صوبہ بہار کے سرحدی علاقہ میں آکر آباد ہوا۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کا خانوادہ عہد قدیم سے ایک "بہاری خاندان" ہے۔ پھر یہاں سے منتقل ہو کر سیدپور بھتری چلا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا خانوادہ اس دور کے ممتاز مشائخ میں گذرا ہے۔ اکبر جب بنگال کی فتح کے خیال سے چلا تو سیدپور بھتری میں اس خاندان کے شیخ سے ملنا چاہا۔ مگر انھوں نے انکار کیا اور چند عدد بیل بھیجدئے۔ واپسی میں اس نے ملنے کی کوشش کی پھر وسیع جائداد وقف کی۔ وہ جائداد اب تک ڈاکٹر صاحب موصوف کے خاندان میں موجود ہے۔ رفتہ رفتہ موصوف کا خاندان رؤسا کی صف میں آگیا۔ اور ڈاکٹر صاحب موصوف کے دادا مرحوم کی وفات کے وقت ڈھائی لاکھ سالانہ آمدنی کی جائداد موجود تھی۔

مقام سیدپور اکبر کے زمانہ میں سرکار جونپور میں تھا۔ پھر نئی تقسیم سے غازی پور میں آیا۔ یہ خاندان اس جوار کے ممتاز ذی اثر رؤسا میں شمار کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کے دادا مرحوم قاضی سید فرزند علی صاحب تھے۔ وہ اس جوار کے ممتاز ذی علم و ذی اثر رئیس تھے انکی داد و دہش کے افسانے اب بھی اس جوار کی بڑی بوڑھیوں کی زبان پر ہیں۔ موصوف کے بڑے چچا مولانا اسمٰعیل شہید کے زیر علم آئے اور جہاد میں جام شہادت نوش کیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے والد بزرگوار کا اسم گرامی جناب ملا سید محمد عمر صاحب تھا۔ یہ علوم دینیہ میں دستگاہ رکھتے تھے۔ تصوف کا وجدانی ذوق تھا۔ مولانا عبدالعلیم آسی مرحوم کے تلامذہ میں تھے۔ جناب شاہ غلام معین الدین جو سارن میں مدفون ہیں۔ ان سے بیعت کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کو بھی مولانا عبدالعلیم آسی سے شرف بیعت حاصل ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کے ایک بہنوئی مولوی سید محمد عمر صاحب تھے۔ اگلے وقتوں کے بزرگوں کے حفظ مراتب کا یہ حال تھا کہ مولانا آسی شاہ غلام معین الدین کے عرس میں تشریف لاتے تھے۔ مولوی سید محمد عمر بھی یہاں اس سلسلہ میں آتے۔ مولانا آسی کسی مجلس میں ہوتے اور وہاں مولوی محمد عمر صاحب پہنچتے تو مولانا اپنے کہنی کے باوجود ان کی تعظیم کے لئے سر و قد کھڑے ہو جاتے اور ان سے خود آگے ملتے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ تقریباً تین سو برس پہلے ان کے خاندان کے کسی بزرگ نے مولانا کے عمر کے خاندان کے کسی بزرگ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اور محض اس وجہ سے اس جذبۂ احترام کے ساتھ وہ ان سے پیش آتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کے طریق زندگی میں پرانی تہذیب و تمدن کا جو غیر معمولی اثر ہے وہ انہی بابرکت صحبتوں کا فیض ہے۔ اس کا اعتراف الٰہ آبادی مرحوم نے اکثر اپنے منظوم خطوں میں کیا ہے۔ ان کے خطوں سے ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کی شرافت اور قدیم تہذیب و متانت کے حامل ہونے کی شہادت ملتی ہے۔ افسوس کہ ان خطوں کے نقل کرنے کا استحضار یہاں کے باعث یہاں پر موقع نہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے ابتدائی کتابیں مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب سے جونپور میں پڑھیں۔ پھر اپنے بہنوئی مولوی سید محمد عمر صاحب کی معیت میں بنارس چلے آئے۔ یہاں مولوی محمد عمر صاحب نے ڈاکٹر صاحب موصوف کے والد کے اختلاف کے باوجود ان کی انگریزی تعلیم شروع کرائی۔

بنارس میں تین سال تک انگریزی کی ابتدائی تعلیم جاری رہی۔ انگریزی تعلیم کے اثر سے آنکھیں کھلیں۔ مولوی محمد عرصاحب ملک کے نئے ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے یہاں کتابیں مہیا تھیں۔ علامہ شبلی نعمانی وغیرہ کی تصنیفات کا مطالعہ یہیں شروع کیا۔ ایک انجمن اخوان الصفا کے نام سے قایم تھی۔ جس میں ہر ہفتہ تقریریں ہوتی تھیں۔ موصوف اس انجمن سے وابستہ ہوئے اس کے جلسوں میں تقریریں کرتے رہے۔

ابتدائی تعلیم میں موصوف کے طبعی رجحانات کو دیکھ کر ان کے سرپرستوں کو ان کے علی گڈھ بھیجنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ وہ تعلیم کی غرض سے ۱۹۰۷ء میں بنارس سے علی گڈھ بھیج دئے گئے اور موصوف کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

(۲)

اس زمانہ میں علی گڈھ مسلمانان ہند کی ذہنی سیاسی تعلیمی اور علمی ترقیوں کا محور تھا جو آواز علی گڈھ سے اٹھتی سارے ہندوستان میں پھیل جاتی۔ حکومت برطانیہ مسلمانوں کے قومی دینی مفاد کے لئے علی گڈھ ہی کو مسلمانوں کا ترجمان جانتی تھی۔ سید محمود بچپن سے علی گڈھ گئے۔ گرچہ ان میں ذہنی بیداری بنارس ہی کے مختصر قیام میں پیدا ہو چکی تھی۔ مگر ان کی حقیقی نشو و نما علی گڈھ ہی میں ہوئی۔ یہی زمانہ تھا جب مسلمانوں میں ایک آزاد خیال طبقہ پیدا ہو رہا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم اور مولانا سید وحید الدین سلیم مرحوم وغیرہ مسلمانوں کو ایک نئی راہ پر لگانا چاہتے تھے۔ مغرب پرستی کا تخیل اب ننگا ہوں میں کھٹکنے لگا تھا۔

دوسری طرف جو انگریز پروفیسر علی گڈھ سے وابستہ تھے۔ انکے تخیلات بھی بدل رہے تھے۔ اس کا اندازہ طلبہ علی گڈھ کے رسالہ "عرض حال" سے ہو سکتا ہے۔ مرقوم ہے:۔

> سرسید کے دور میں علی گڈھ کالج کا بہت بڑا مقصد یہ تھا کہ یورپینوں اور مسلمانوں کے درمیان دوستانہ مراسم پیدا ہوں اور جو گوناگوں مغالطات ایک دوسرے کی نسبت دلوں میں بھرے ہوئے ہیں وہ رفع ہو جائیں
>
> ..... مگر سرسید کے انتقال کے ساتھ ہی بعض برس کے زمانہ ہی میں۔ یہ بات زبان سے سنی جانے لگی کہ پروفیسروں کا سلوک طلبہ کے ساتھ پہلا سا نہیں ہے ..... سرسید کے زمانہ میں جس شے کو ہم رحمت سمجھتے تھے وہ اب زحمت معلوم ہونے لگی۔ سرسید کے زمانہ میں جس قدر یورپین دخیل ہوتے تھے۔ ہم خوش ہوتے تھے ..... اپنی حالت غیر منظم نظر آنے لگی۔ اور آہستہ آہستہ بے اطمینانی کے بجائے تشکک اور شکوک کے بجائے بدظنی اور بدظنی کے بجائے منافرت پیدا ہو گئی۔ اور سب فرشتہ رحمت کی شکل آنکھوں میں عجیب ـــ معلوم ہونے لگی ہے"

(رسالہ عرض حال مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڈھ بحضور ٹرسٹیان و سابق طلبہ مدرسۃ العلوم صفحہ ۲۷)

جس وقت سید محمود نے علی گڈھ میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے گرد و پیش یہی ماحول قائم تھا اور اسی فضا میں انکی ذہنی تربیت کی داغ بیل پڑی اور آگے چل کر اسی بنیاد پر ایک وسیع عمارت تیار ہوئی۔

اس کے ساتھ ایک طبقہ ایسا بھی علی گڈھ میں موجود تھا جس کی ذہنیت مذکورہ بالا ماحول سے علیحدہ نشو و نما پا رہی تھی۔ اس زمانہ میں علی گڈھ پر انگریز پرنسپل اور پروفیسروں مسٹر مارٹن وغیرہ چھائے ہوئے تھے "انگریز بادشاہ" اور "ہم رعایا" کا احساس بڑھ رہا تھا۔ بعض دماغوں میں ہر بڑے شخص کے متعلق بطور ریکشن یہ تخیل آتا "یہ بڑا انگریز ہے" یعنی یہ خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں فطری بلندیوں کے جوہر موجود ہیں۔ "یہ بڑا ہندوستانی ہے" یعنی یہ برائیوں سے گھرا ہوا ہے اس میں فطری پستی پائی جاتی ہے"

کالج کے طلبہ میں سے چند ہوشمند حساس طبیعت والوں کو یہ ناگوار گذرا اور انہی میں سید محمود بھی تھے۔ اس پست ذہنیت کے خلاف جس نے عملی طور پر سب سے پہلے حصہ لیا وہ سید محمود ہی تھے۔ یہ اور ان کے چار یار عبدالرحمن بجنوری، نصیر الدین احمد خاں شروانی۔ عبدالمجید سرسٹر قاضی تلمذ حسین نے طالب علموں کی اس ذہنی مرعوبیت کو دور کرنا چاہا، ایک تنظیم "سائنٹی فک سوسائٹی" بنا ڈالی گئی۔ یہ گویا کالج کے احاطہ میں منجھے ہوئے آزمودہ کی ایک جماعت تھی۔ اس سوسائٹی کو اندر ہی اندر رسوخ حاصل ہونا شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ کالج میں گویا دو قسم کے نظریوں کے طلبہ تیار ہو گئے۔ ایک "بانی سرکار" دوسری "شہنشاہیت پرست" ـــــــ

اس خفیہ سوسائٹی میں مضامین پڑھے جاتے اور مباحثے ہوتے کہ انگریزی طاقت کو کیونکر فنا کیا جائے۔ اسی سلسلہ میں عملی جدوجہد شروع ہوئی۔ سید محمود نے مصر کے مشہور مخالف انگریز رہنما مصطفےٰ کامل سے خفیہ خط و کتابت شروع کی اس سلسلہ میں ان کے چند خط موصول ہوئے مگر افسوس کہ اب وہ ضائع ہو گئے۔

اسی زمانہ میں مسٹر کارنا جو اسکول کے ہڈ ماسٹر تھے کالج کے پرنسپل بنائے جانے لگے۔ نوجوان محمود کے لئے اس کا برداشت کرنا دشوار تھا۔ محمود نے سخت مخالفت کی۔ مسٹر مارنین محمود کو کالج سے نکالنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ مگر نواب محسن الملک نے پشت پناہی کی۔ ٹرسٹیوں میں معاملہ گیا اور پھر دب دبا گیا

اسی زمانہ میں نواب محسن الملک سے ان کے ذاتی مراسم پیدا ہوئے۔ رفتہ رفتہ انہیں محمود کی ذات پر اعتماد ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس زمانہ کی سیاست ہند میں صیغہ راز کا وہ اہم واقعہ بھی ان کے لئے راز نہ رہ سکا۔ جبکہ ایک وفد لارڈ منٹو سابق وائسرائے ہند کی خدمت میں مسلمانوں کی شکایت کا عرض حال کرنے کے لئے پیش ہوا تھا اور دراصل یہ وفد خود لارڈ منٹو کا دربردہ بلایا ہوا تھا۔ آگے چل کر جب سیاسی حیثیت سے اس واقعہ کے نشست از بام کرنے کی ضرورت پڑی اور سید محمود نے اس کو پریس میں شائع کرایا تو مسٹر محمد امین زبیری نے کمال بیباکی سے اس کی تردید کی۔ گرچہ اسوقت کوئی ثبوت سید محمود کے پاس موجود نہ تھا لیکن مشیت ایزدی دیکھئے کہ جب لیڈی منٹو کی ڈائری شائع ہوئی تو اس میں وفد کے خود بلانے کا تذکرہ نصریح سے موجود پایا گیا۔ اور ارباب سیاست انگشت بدنداں ہو کر رہ گئے۔

اگرچہ سید محمود، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے خاص معتمد تھے، کالج کے چھوٹے بڑے معاملوں میں ان سے مشورے کرتے، اسلامی سیاسیات پر ان کے نقطہ نظر کو معلوم کرتے اور ان کی رہنمائی کرنی چاہتے۔ لیکن انگریز قوم، انگریزی حکومت، اور کالج کے انگریز اسٹاف کے خلاف جو آگ اندر اندر سلگ رہی تھی وہ تیز ہوتی گئی۔ "کالج کا انگریز اسٹاف اپنے کو حاکم" اور طلبہ کو محکوم" سمجھنے لگا"۔ اس طرح خاص ہندوستانی طلبہ اور انگریز اسٹاف میں مغایرت کی خلیج پیدا ہو گئی۔ اور آہستہ آہستہ وہ بڑھتی گئی یہاں تک کہ ۱۹۰۷ء میں یہ آگ بھڑک اٹھی اور کالج کی اسٹرائک کا وہ مشہور واقعہ پیش آیا جس نے سارے ہندوستان کو ملی گڈھ کی طرف ایک مرتبہ پھر متوجہ کر دیا۔ اسٹرائک کرنے، کرانے، سزا بھگتنے اور معاف کئے جانے، غرض کہ اس کی ہر منزل میں سید محمود سب میں پیش پیش اور کالج کے نوخیز طبقہ کے محبوب ترجمان اور مخلص رہنما تھے۔

۱۹۰۷ء کی یہ اسٹرائک کن اسباب سے پیش آئی، اس کا اشارہ اس اقتباس میں گذر چکا ہے جو "عرض حال" سے اوپر نقل کیا گیا۔ بہانہ کے لئے واقعہ صرف اس قدر پیش آیا کہ انگریز پرنسپل نے غلام حسین کو ناروا طریق پر بعض غیر صحیح الزامات لگا کر کالج سے نکالنے کا حکم دیا۔ اور اس ہمدردی میں طلبہ نے متفقہ اسٹرائک کی۔ ٹرسٹی اور کالج اسٹاف نے گفتگو کے لئے طلبہ کے ترجمان طلب کئے۔ طلبہ نے ۱۵ طلبہ نامزد کیا۔ جن میں سید محمود صاحب کا نام صف اوّل میں تھا۔ پھر طلبہ کی سیکڑوں کی تعداد میں سے چار سرغناؤں کو چنا گیا۔ جن کے نکال دئے جانے کے بعد گویا کالج "مفسدوں" کے وجود سے پاک ہو جاتا تھا۔ یہ چاروں وہی چار یار یعنی "عبدالرحمٰن بجنوری، تصدق احمد شروانی، عبدالعزیز اور سید محمود" (عرض حال صفحہ) تھے۔

اسٹرائک کرنے والوں کے مطالبوں میں بعض مطالبات یہ تھے :-

" بوڈنگ اور ڈائننگ ہال بالکل انگریز پروفیسروں کے سپرد نہ کئے جائیں "، ——— اسی طرح

" ملازمان کالج ہندوستانی ہوں یا انگریز، اگر ان کی نااہلیت ثابت ہو جائے تو برطرف کر دئے جائیں "

اسی طرح شکایات میں انگریز پروفیسروں کے ہاتھوں ڈائننگ ہال کی بدنظمی، مسٹر کارنا کا برا سلوک، مسٹر براؤن کا برتاؤ، پروفیسری کا دباؤ، یونین کلب پر انگریزی اثر، تقریر کی آزادی کی روک تھام اور غیر ضروری سختیاں وغیرہ تھیں۔

یہاں تک کہ مسلم قوم نے اس معاملہ کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی تحریک سے دہلی میں اسٹرائک کے معاملہ کو سلجھانے کے لئے یادگار زمانہ اجلاس ہوا۔ نواب وقار الملک کو جلسے میں شرکت کے لئے سید محمود ہی لانے گئے۔ وہ شریک اجلاس ہوئے۔ پھر مولانا نذیر احمد کی خدمت میں چند طلبہ کو ساتھ لیکر پہنچے۔ ان سے دلچسپ گفتگو ہوئی، انہوں نے اثنائے گفتگو میں فرمایا۔

"تم جانتے نہیں ہو۔ انگریز کتے کی ذات ہے، جہاں ایک کتے نے پیشاب کیا۔ پیشاب لگے یا نہیں ہر کتا وہاں آکر ضرور پیشاب کرے گا"

پھر اثنائے گفتگو میں تیز ہو کر کہنے لگے۔

"بدمعاش! سودیشی سودیشی ہے، سودیشی! سودیشی سوت کہاں سے آئیگا۔ کیا تمہاری خالائیں سوت کاتینگی؟ انگریز کا مقابلہ کرنے چلے ہیں"

اس کے بعد جب سنجیدہ گفتگو پر آئے تو اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ دہلی کے جلسہ میں سب انگریزوں (اسٹاف کالج) کو نکالنا چاہیئے۔ لیکن نواب محسن الملک نے سمجھا بجھا کر رات بھر میں راضی کر لیا۔

اسٹرائک کے سلسلہ میں نواب محسن الملک نے جو خطوط لکھے تھے وہ سب ڈاکٹر سید محمود کے ذخیرہ کاغذات میں محفوظ ہیں۔ اور دفتر ندیم میں آ گئے ہیں۔

اسٹرائک کا خاتمہ بخیر و خوبی ہوا۔ سید محمود کالج میں دوبارہ داخل کر لیے گئے۔ اب یونین کلب میں سید محمود کی پارٹی کا قبضہ تھا۔ یوں تو قبضہ پہلے بھی تھا، مگر پرنسپل کی مداخلت سے بے اثر تھا۔ اسٹرائک کے بعد یونین کلب کو اس پارٹی نے آزادانہ استعمال کیا۔ اور اسکی آواز ملک میں ایک باوزن آواز سمجھی جانے لگی۔

۱۹۱۰ء میں مسلم لیگ کے قیام کے وقت یونین میں مباحثہ ہوا۔ حسین (سابق ایڈیٹر انڈیپنڈنٹ دہلی مقیم امریکہ) سید محمود کے ہم سبق تھے، انہوں نے یونین کے جلسہ میں مسلم لیگ کے پرانچے اڑا دیئے۔ کالج کے کارکنوں کا حصہ اس کی تاسیس میں نمایاں تھا۔ ان لوگوں نے لڑکوں کو بلایا اور سمجھا بجھا کر خاموش رہنے کی تلقین کی۔

علی گڈھ میں سید محمود کا زمانہ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۰ء تک رہا۔ اس اثنا میں ان کی ذہنی نشوونما حیرت رفتار پر رہی وہ ان کی کالج کی علمی زندگی سے آشکارا ہے۔ وہ ذہنی طور پر انگریز حکمرانوں کے دشمن بن چکے تھے، اور انگریز قوم کو ہندوستان کے لئے ایک عذاب تصور کرتے تھے۔

(۳)

سید محمود انگریزی قوم کی دشمنی سے تیار کیا ہوا دل و دماغ لیکر یورپ پہنچے اور انگریزوں ہی کے وطن میں تین سال قیام کیا۔ پھر جرمنی میں اور پھر کیمبرج آئے۔ انگلستان سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی، اور جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ ہندوستان کی تاریخ ان کا خاص موضوع تھی، اور اس پر وہ عالمانہ نظر رکھتے ہیں۔

وہ ہندوستان سے انگریزوں کے دشمن بن کر گئے تھے لیکن انگلستان میں ان کی محبت سے اس قوم کی خوبیاں آشکارا ہوئیں۔ اور ذاتی حیثیت سے انگریزی قوم سے جو تنفر تھا وہ دور ہوا۔ لیکن سیاسی خیالات میں مزید پختگی آئی۔ ہندوستان کی آزادی کا خیال ذہن میں جڑ پکڑ گیا۔ اور انگلستان میں نوجوانی کے جوش میں کچھ دنوں ریولیوشن (انقلابی) سوسائٹی سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن پھر اس پالیسی کی غلطی کا اندازہ ہوا۔ اور اس سے کنارہ کش ہو گئے

یورپ کے زمانہ قیام میں سیاسیات میں بھی نمایاں حصہ لیتے رہے۔ مسٹر بلنٹ، محمود جی کے ارشد تلامذہ میں تھے وہ ان سے مستقبل میں غیر معمولی توقعات وابستہ رکھتے تھے۔ مسٹر بلنٹ ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے انہیں سیاسات میں ایمانداری کے اصول پر استوار رہنے کا نکتہ ذہن نشین کرایا۔

مسٹر بلنٹ اس عہد کے ممتاز ترین اہل علم اور ماہرین سیاسیات میں سے تھے۔ لیڈی ایسکوتھ نے غیر معمولی اہمیت کے ساتھ ان کا تذکرہ اپنی ڈائری میں بار بار کیا ہے۔ اسلامی سیاسیات سے غیر معمولی دلچسپی اور اسلامیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہی مشہور زمانہ اعرابی پاشا کو پھانسی کے تختہ سے بھی اتروانے والے تھے۔ وہ ترکی خلافت سے مایوس اور عرب خلافت کے حامی تھے۔ "فیوچر آف اسلام" میں ان کے یہ خیالات موجود ہیں۔ سید محمود صاحب مسٹر بلنٹ کے ان خیالات کو پولیٹکل تخیلات جانتے تھے۔

مسٹر بلنٹ سے ان کے غیر معمولی ذاتی مراسم پیدا ہو گئے تھے۔ جنگ بلقان کے بعد انہوں نے ڈاکٹر صاحب موصوف کو پچیس تیس صفحوں کا مفصل خط لکھا تھا جو ترکی تحریک کے لحاظ سے مایوسانہ تھا۔ ڈاکٹر سید محمود کے نام وہ خط کا مرید میں شایع ہو چکا ہے۔ اس زمانہ میں اس خط سے اتفاق ممکن نہ تھا۔ لیکن یہ قابل ذکر بات ہے کہ اس مکتوب میں مسٹر بلنٹ نے جو جو پیشین گوئیاں کی تھیں وہ حرف بہ حرف پوری اتریں۔

مسٹر بلنٹ نے اپنی کئی کتابوں میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ افسوس کہ ان کے اقتباسات پیش کرنے کا موقع اس مختصر مقالہ میں نہیں ہے اور نہ ان مباحث کے چھیڑنے کا۔ حیات محمود میں یہ تفصیلات آپ کی نگاہوں سے گذریں گی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے ذخیرہ مکاتیب میں ان کے نام کے پچاسوں خطوط ہیں جن میں کا ہر مکتوب اپنی اپنی جگہ جداگانہ اہمیت رکھتا ہے اور مستقل سیاسی مباحث پر تفصیلی رائے۔ میرا یہ حال ہے۔ یہ مکاتیب دفتر ندیم میں آ گئے ہیں۔ ان کے بیشتر حصے حیات محمود میں ملاحظہ فرمائینگے۔ اور چند کے نمونے کسی آئندہ نمبر میں پیش خدمت ہونگے۔

۱۹۰۹ء میں جب ایران کی تقسیم کا مسئلہ پیش آیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ان دنوں انگلستان ہی میں تھے۔ پروفیسر براؤن اس میں غیر معمولی حصہ لے رہے تھے۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب ان کے بھی زیر درس تھے۔ پروفیسر موصوف بھی ان کی غیر معمول صلاحیتوں، اصابت رائے، فکر سیاسی، اور حسن تدبیر کے قایل تھے۔ ایرانی مسئلہ کے سلسلہ میں پروفیسر براؤن کے ذریعہ سے مشہور ایرانی قائدین مرزا یحیٰی، آقائفی وغیرہ سے ڈاکٹر صاحب موصوف کی تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان اکابر ایران کے مشورے سے ایرانی مسئلہ کے لئے انگلستان میں ایک بڑی میٹنگ کا اہتمام کیا۔ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ ایرانی مسئلہ میں ایران کے نمونہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف انہیں بھی شرکت کے لئے جلسہ میں لائے۔ جلسہ کی صدارت کے لئے میجر سید حسن بلگرامی کو انہوں نے آمادہ کیا۔ لیکن پھر انڈیا آفس کی دھمکی سے صدارت سے انکار کر گئے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے وعدہ کھلا پھر یاد دلا کر دوستگردن انہیں پھر آمادہ کر لیا۔ جلسے میں پروفیسر براؤن نے ایک ریزولیشن پیش کیا۔ لیکن وہ کما حقہ پوری وضاحت کے ساتھ نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے مسٹر بلنٹ کو ایک کھلا ہوا ریزولیشن پیش کرنے پر آمادہ کر لیا۔ جس میں سلطان ٹرکی و امیر افغانستان سے ایران کے مسئلہ میں مداخلت کرنے کی استدعا کی گئی۔ یہ ریزولیشن کامیابی کے ساتھ جلسہ میں منظور کر لیا گیا۔ اس ریزولیشن سے انگلستان کے سیاسی حلقہ میں ایک ہلچل پڑ گئی۔ ٹائمز نے دوسرے دن اس کی مخالفت میں سخت آرٹیکل لکھا۔ ہندوستان میں اس کے خلاف سخت آواز بلند کرائی گئی۔ اور بالآخر یہ مسئلہ دب دبا کر ادھورا رہ گیا۔ اسی طرح مختلف سیاسی مباحث خصوصاً مسئلہ ایران و ٹرکی پر یہ لوگ مختلف اکابر سے وہاں کے زمانہ قیام میں بحث و مباحثے جاری رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انگلستان میں انگریزی ماہرین سیاست کے پہلے سے دو طبقے رہے۔ ایک تو وہ جو حکمران جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے سیاسی نظریے، خیالات اور ہندوستان کے متعلق اس کی خواہشات جداگانہ ہیں۔ اور دوسرا آزاد خیال انگریز ماہرین کا طبقہ ہے۔ جس میں اس زمانہ میں مسٹر بلنٹ وغیرہ تھے۔ یہ لوگ ہندوستانی مسائل پر آزادانہ زاویہ نگاہ سے غور کرنے کے عادی رہے ہیں۔

مسٹر بلنٹ "ایجپٹ" نام سے ایک سالہ نکالتے تھے۔ وہ لارڈ لٹن کے عہد سے ہندوستانی سیاسیات سے انہیں غیر معمولی دلچسپی تھی۔ وقتاً فوقتاً یہ اپنے مسائل و مباحث اس کے اوراق پر آتے گئے۔ لارڈ رپن کا وہ واقعہ قابل ذکر ہے جس میں انہوں نے پٹنہ کے ایک قدیم شریف رئیس کے خانوادہ کے چشم و چراغ ولایت علی خاں پر ایک انگریزی ملیٹری نے کوڑا چلا دیا، اور لارڈ رپن نے فوراً وائسرائے کو تار دیکر مطلع کیا اور اس کا تدارک عمل میں آیا۔

ڈاکٹر صاحب کے مراسم اسی طبقہ کے مقتدر اصحاب سے تھے۔ وہ لوگ بھی اس بیدار مغز ہندوستانی نوجوان کے سیاسی افکار و جذبات کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے، اور ان سے متاثر ہوتے تھے۔ اور دوسری طرف ڈاکٹر صاحب موصوف کے سیاسی خیالات کی تربیت ہوتی رہی۔ اور دونوں، ایک دوسرے سے اثر قبول کرتے رہے۔ چنانچہ پروفیسر براؤن۔ ایرسٹ لیڈر، جان ڈڈمنڈ جو بعد میں ایران کے قونصل مقرر ہو گئے تھے، اور سر راس مسعود نے مختلف سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا تذکرہ اپنی تصنیفات میں کیا ہے اور یہ کتابیں مطبوع ہو چکی ہیں۔ نیز ان اکابر سے دیرینہ مراسم قایم رہے اور مسلسل خط و کتابت جاری رہی۔ ان مشاہیر کے مکتوبات کا ذخیرہ بھی محفوظ تھا اور وہ دفتر ندیم میں آگیا ہے۔ ان کتابوں کے اقتباسات ان کے مسائل و مباحث اور خطوط میں ان مختلف اکابر کے مختلف اہم سیاسی مسائل پر نقطۂ نظر کسی آئندہ فرصت میں نذر ناظرین ہونگے۔ ورنہ یہ ذخیرہ تمام و کمال حیات محمود میں تو منتقل ہو ہی جائے گا۔

ان اکابر نے ہندوستان کی سیاسیات پر وقتاً فوقتاً جو رائے زنی کی وہ حیرت انگیز ہے۔ مسٹر بلنٹ کی مسلمانان ہند کے متعلق یہ آخری وصیت حیرت سے پڑھنے کے لائق ہے کہ

"ہندوستان کی قومی تحریک میں مسلمان شریک ہوں ورنہ ہندو ہندوستان پر چھا جائیں گے"

مسٹر بلنٹ کی اس وصیت کے آئینہ میں ہم دور حاضر کی ہندوستانی سیاست کے جملہ خطوخال کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ترکوں کی ہمدردی میں انگلستان میں جلسہ کیا، اور یورپ کی نگاہیں ان کی جانب اٹھ گئیں۔

ڈاکٹر صاحب کے یورپ کے زمانہ قیام میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ رائٹ آنریبل جسٹس امیر علی نے لندن میں مسلم لیگ قایم کی یا رائے منٹو ریفارم کے سلسلہ میں ڈاکٹر سید محمود کو مسلم لیگ کا جوائنٹ سکریٹری بنایا گیا۔ لیگ کی میٹنگ میں سر علی امام مرحوم نے مسٹر آغا خاں کی تحریک پیش کی اور ڈاکٹر سید محمود نے اس کی تائید میں جلسہ کرا لیا اور وہ کامیاب ہوا۔

یہ واقعہ مسٹر امیر علی کے لئے ہوش ربا ثابت ہوا - انہوں نے انگلستان میں ایک پمفلٹ لکھ کر چھپوایا جس میں اس واقعہ کو دکھایا کہ ایک بہاری لڑکے (سید محمود) نے علی امام کے بہکانے سے یہ جرأت کی، اس کے بعد سر آغا خاں اور موسیٰ خاں وغیرہ نے امیر علی کو اس واقعہ پر سید محمود کی تادیب کے لئے زور دیا - اور عدم صورت میں علیحدگی کی دھمکی دی - آخر امیر علی اور سید محمود میں نہایت سخت سست کی نوبت آئی اور آخر سید محمود نے لیگ سے استعفیٰ دے دیا - امیر علی کے جو خطوط اس سلسلہ میں سید محمود کے پاس آتے گئے، اور جو اختلافات سے ملو ہیں اب تک محفوظ ہیں اور دفتر ندیم میں آگئے ہیں -

سید محمود کے خلاف امیر علی کا یہ پمفلٹ بہت بڑی تعداد میں ہندوستان بھیجا گیا اور یہاں اس کی عام اشاعت کی گئی - اس کی ایک کاپی ڈاکٹر سچدانند سنہا کے پاس اب تک محفوظ ہے -

ڈاکٹر صاحب موصوف ۱۹۰۶ء میں ولایت تشریف لے گئے تھے - ۱۹۱۳ء میں واپس آئے - چھ سال کے زمانہ قیام کے بعد علمی تعلیمی اور سیاسی حیثیت سے ایک پختہ کار انسان تھے - زمانہ کے سرد گرم اور نشیب و فراز کو پہچان چکے تھے - ۱۹۱۰ء میں علی گڈھ میں جس فضا میں انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں - اس فضا کا اب وہ گہرا مطالعہ کر چکے تھے - ان کی رائے پختہ اور نظر وسیع ہو چکی تھی - اور ہندوستان کی خدمت کا پرجوش ولولہ دل میں پیدا ہو چکا تھا - غرض انہیں تخیلات اور ذہنی نشو و نما کے ساتھ وہ ولایت سے واپس ہو کر ۱۹۱۳ء میں ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہیں -

(۴)

ہندوستان واپس آنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کے مستقبل مستقر کا سوال سامنے آیا - ایک طرف جونپور کے نامی رئیس نواب عبد المجید (نواب سر محمد یوسف کے والد محترم) وغیرہ تھے - دوسری طرف سر سید علی امام مرحوم تھے - الہ آباد یا پٹنہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو ان کی پریکٹس کے لئے منتخب کرنا تھا -

ڈاکٹر سید محمود پہلی مرتبہ ۱۹۰۷ء میں بہار تشریف لائے تھے، سر علی امام نے ان کی ہوشمندی دیکھی اور گرویدہ ہوئے - رفتہ رفتہ ان سے غیر معمولی روابط پیدا ہو گئے - اور انہیں چھوٹے بھائی کے بمنزلہ اپنے دل میں جگہ دی - ولایت سے واپسی کے بعد سر علی نے ڈاکٹر صاحب کو آخری مرتبہ آکر بادمیں زور دیا کہ وہ پٹنہ ان معیت میں چلے آئیں - دوسری طرف نواب عبد المجید نے روکا - لیکن سر علی کی کشش غالب آئی اور وہ پٹنہ میں پریکٹس کرنے کے لئے ۱۹۱۳ء میں چلے آئے - چند ہی دنوں میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی - دوسری طرف سیاسیات میں بھی عملی حصہ لینے رہے - ڈاکٹر صاحب کی رفتار و ترقی کو دیکھ کر سر مظہر الحق مرحوم بھی ان سے محبت کرنے لگے - اور ۱۹۱۵ء میں ان کی صاحبزادی سے ان کی شادی انجام پائی -

پٹنہ میں ڈاکٹر صاحب کی پریکٹس کا زمانہ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۱ء تک رہا - ان آٹھ برسوں میں وہ پٹنہ ہائیکورٹ کے ممتاز بیرسٹروں اور صوبہ بہار کے مدبر رہنماؤں کی صف اوّل میں داخل ہو گئے تھے - جنگ بلقان میں انہوں نے سخت تقریر کی، اور اہل شہر اور حکمران طبقہ دونوں ان کی طرف غیر معمولی طور پر متوجہ ہو گئے - اب وہ شہر کی رہنمائی کی خدمت انجام دینے لگے -

(۵)

اس کے بعد ۱۹۲۱ء کا ہنگامہ خیز انقلابی دور ہندوستان میں آیا - ڈاکٹر صاحب موصوف آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ۱۹۱۵ء سے مستقل ممبر تھے خلافت کی تحریک کے بانیوں میں تھے، اگر اس دور کی ان کی بنیادی خدمات منظر عام پر آئیں تو حیرت و استعجاب سے نگاہیں اٹھ جائیں لیکن افسوس کہ ان مختصر سوانح میں تفصیلات کی گنجائش نہیں - پھر اس دور میں ان کے جو خدمات ملک میں انجام پاتے رہے، وہ نگاہوں سے پوشیدہ بھی نہیں ہیں -

۱۹۲۱ء میں انہوں نے پریکٹس چھوڑ دی اور مرکزی خلافت کمیٹی کے جنرل سکریٹری کے اہم اور ذمہ دار عہدہ پر ان کا تقرر عمل میں آیا اور بمبئی میں قیام پذیر ہوئے - اس دور میں ان کے خدمات کا ایک جداگانہ باب ہے، جس کو ہم یہاں پر نظر انداز کرتے ہیں -

اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں پنڈت جواہر لال کے ساتھ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری کے اہم ترین عہدہ پر سرفراز کئے گئے اور ملک و قوم کے غیر فانی خدمات انجام دئے - قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں اور اثار و قربانی کے نہ مٹنے والے نقوش قائم کئے - لیکن افسوس کہ ان کی تفصیلات میں بھی ہم جانے کے لئے تیار نہیں -

اس کے بعد ۱۹۲۵ء سے دوبارہ پریکٹس شروع کی۔ اس اثنا میں ملک کے اکابران کی معاونت کے حاصل کرنے کے لئے اصرار کرتے رہے۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں دوبارہ جنرل سکریٹری بنائے جانے لگے۔ لیکن اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ بالآخر ۱۹۲۹ء میں ایثار و قربانی کی دعوت کو دوبارہ لبیک کہنے پر مجبور ہو گئے۔ اور ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۶ء تک مسلسل سات برس تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری کے عہدہ پر سرفراز رہے۔ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی ورکنگ کمیٹی کی ممبری کا سلسلہ جو شروع سے قایم ہوا وہ آخر تک جاری رہا۔ اس دور میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے ملک کے طول و عرض کا دورہ کیا۔ ہزاروں ہزار جلسوں میں پرجوش تقریریں کیں۔ خصوصاً صوبہ بہار کے چپہ چپہ کو پہچان لیا۔ بہت سے ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور جنرل سکریٹری کی حیثیت سے وہ لازوال خدمات انجام دیئے۔ جن کے پائدار نقوش ہندوستان کی تاریخ میں محفوظ رہیں گے اور جن کی تفصیلات تو ایک مستقل تصنیف کی محتاج ہیں۔

جس زمانہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی غیر قانونی جماعت تھی اور اس کی خبروں کا چھپنا چھپانا قانوناً ممنوع تھا۔ اس دور میں ڈاکٹر صاحب نے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے "خفیہ مسنجر سسٹم" کا جو حیرت انگیز طریق اختیار کیا۔ اس نے کانگریس کی تحریک کو بہت آگے بڑھایا۔ مسنجر سسٹم کو ڈاکٹر صاحب نے کس طور پر ترتیب دیا تھا اور کس کامیاب طریقہ سے اس پر عمل کیا گیا، اس کی تحریری تفصیلات محفوظ ہیں۔

پھر ہندوستانی ملوں پر معاہدہ کی جو پابندی عائد کی گئی وہ بھی ڈاکٹر صاحب ہی کے جنرل سکریٹری شپ کا رہین منت تھا۔ ایک دن انہوں نے بیٹھے بیٹھے ملوں کے لئے چند شرائط قلمبند کئے۔ پھر مل والوں کو اطلاع دی۔ پندرہ دن کی نوٹس جاری کی۔ اخبارات میں اطلاع شایع کرائی۔ پھر ملوں کی ایک فہرست چھاپی اور اس فہرست کی مندرجہ ملوں کی تجارت کو غیر معمولی فروغ، اور خارج شدہ ملوں کی تجارت کو پائندہ پڑھانے سے ساتھ ہندوستان کی ملوں میں ہلچل پڑ گئی۔ کانگریس کی شرائط پر دستخط کرنے کے لئے مل والے بیتاب ہو کر دوڑے آئے۔ دفتر میں تاروں کا تانتا بندھ گیا اور بمبے دلال اعلی وغیرہ نے ڈاکٹر صاحب کے دستخط رہے کر ان کے سارٹیفکٹ چھاپے اور سودیشی تحریک کے نقطہ نظر سے ہندوستان کی ملوں پر کانگریس کو کامل اقتدار حاصل ہو گیا۔ ملوں کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی تحقیقی تحریریں اس زمانہ میں اخبارات میں چھپتی رہتی تھیں۔ ان کے مطالعہ کرنے والوں کی یاد تازہ ہوگی۔ ان تحریروں کا مکمل مواد اس وقت ہمارے سامنے ہے، جن میں ملوں کے بائیکاٹ کے متعلق ان کی وہ مفصل مطبوعہ رپورٹ بھی ہے جو انہوں نے بمبئی پردیش کانگریس کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کیخلاف نوعیتوں کے تھے۔ ایک طرف وہ ملک و قوم کی بنیادی خدمات میں دیگر کارکنوں کے رفیق کار رہتے تھے دوسری طرف وہ مسلمانان ہند کے مفادات کی نگرانی ذمہ دارانہ طریق پر انجام دیتے تھے۔ موپلا قوم پر جو مظالم ڈھائے گئے تھے۔ ان کی تحقیقات کی پہلی آواز ڈاکٹر صاحب ہی نے اٹھائی۔ اور وہ کامیاب ہوئی، پھر سرحد کے مظالم کی تحقیقات کی تحریک بھی انہیں کی طرف سے پہلی مرتبہ اٹھائی گئی۔

دوسری طرف ڈاکٹر صاحب موصوف فرقہ پرور، حکومت پرست مسلم جماعتوں کے زہر کا علاج بھی کرتے رہے۔ اس دور میں مسلم لیگ دو جماعتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک جناح لیگ تھی، دوسری سر شفیع لیگ، اور اسی دوسری لیگ کو اقتدار حاصل تھا۔ مسٹر جناح سیاسیات سے گویا کنارہ کش تھے پھر آل انڈیا مسلم کانفرنس کا ڈھونگ رچایا گیا تھا۔ یہ تمام رجعت پسند عناصر ملک کی ترقی و بہبود میں سخت روڑے اٹکا رہے تھے۔ اور سب کچھ مسلم قوم اور مذہب اسلام کے نام سے انجام دے رہے تھے۔ ان رجعت پسند عناصر کے استیصال کے لئے ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے قیام کی تحریک پیش کی۔ ملک کے قوم پرور طبقہ نے اس صدا کو لبیک کہا۔ اور لکھنؤ اور دوسرے مقامات پر اس کے پرجوش جلسے ہوئے، اور آل انڈیا مسلم کانفرنس کو مجبوراً نیشنلسٹ مسلمانوں کی آواز سے دبنا پڑا۔ اور دوسری طرف حکومت برطانیہ نے بھی کوئی قدم جلد اٹھانے سے گریز کیا۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ڈاکٹر صاحب موصوف مسلمانوں کے ملی تحفظات کے مطالبے سے بے پروا رہے۔ اس سلسلہ میں ان کی جو سب سے نمایاں خدمت ہے وہ اتحاد کانفرنس الہ آباد کا انعقاد ہے، اس اتحاد کانفرنس کا تخیل پہلی مرتبہ ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں آیا اور انہوں نے ماہ جون ۱۹۳۲ء میں اس کانفرنس کے لئے اپنا بیان شایع کرایا۔ پھر کلکتہ روانہ ہوئے۔ وہاں راجندر بابو اور مالوی جی کو بلوایا۔ اخبارات کو مونکہ کرایا اور اس طریقہ سے رائے عامہ تیار کرائی۔ اس کے بعد اتحاد کانفرنس کے بنیادی مطالبات کا خاکہ کلکتہ میں بیٹھ کر تیار کیا۔ اس سلسلہ کے بیانات اخبارات کے آرار۔ مسلمانوں کے مطالبات کا وسیع مطبوعہ چارٹر اور ان پر قلمی اتفاق و اختلاف کے نشانات ہمارے پاس موجود ہیں۔ یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ان بنیادی مسایل میں بنگال میں مسلمانوں کے لئے ۵۱ فیصدی کا مطالبہ بدھان چندر نے مان لیا تھا۔ اور تحریر بھی دیدی تھی۔

ان بنیادی مساعی کے بعد ڈاکٹر سید محمود بمبئی تشریف لے گئے۔ ان دنوں مولانا شوکت علی آل انڈیا مسلم کانفرنس میں شرکت کر چکے تھے،

تجاویز و ذکر جلسوں کی صدارت کی اور خطبات صدارت میں صحیح رہنمائی کی خدمت انجام دی۔ اور

وہاں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنی سعی بلیغ سے اتحاد کانفرنس کے لئے مولانا شوکت علی کو آمادہ کر لیا۔ اس کے بعد مولانا شوکت علی نے لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند سے اس کانفرنس کے منعقد کرنے کا مشورہ دیا۔ اور سیاسی دنیا کے لئے اس امر واقعہ کا اعلان غیر معمولی حیرت و استعجاب کا باعث ہوگا کہ لارڈ ولنگڈن نے اس کانفرنس کے منعقد کرنے کی شدید مخالفت کی اور نامہ و پیام دیر تک جاری رہا۔

لیکن ڈاکٹر محمود کی کوششیں سرسبز ہو رہی تھیں، کانفرنس کے منعقد ہونے کے آثار پیدا ہو گئے۔ مولانا شوکت علی بھی شرکت پر آمادہ رہے اور دوسری طرف حریف برطانیہ نے یہ نئی چال دیکھ کر اپنا نیا پینترا بدلا۔ یہاں تک کہ الہ آباد کی اتحاد کانفرنس میں ہندو مسلمان رہبران قوم سر جوڑ کر بیٹھے۔ اور اسلامی تحفظات اور مطالبات کے بنیادی اصول اپنی پوری تشریح کے ساتھ مان لئے گئے۔ ادھر یہ رنگ دیکھ کر حکومت برطانیہ نے تیزی سے قدم آگے بڑھایا، اور ۱۹۳۵ء کے ریفارم میں "فرقہ وارانہ عطیہ" (کمیونل اوارڈ) کا اعلان کیا گیا۔ جس میں وہ سارے مطالبات موجود تھے جو اتحاد کانفرنس میں طے ہوئے تھے اور بعض دوسرے اہم قدم ——— یہ پوری صداقت اور صحت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ الہ آباد کی اتحاد کانفرنس نہ ہوتی تو کمیونل اوارڈ کسی دوسری شکل میں ترتیب دیا جاتا اور پھر بگال میں یورپین گروپ کو اہمیت دیکر مسلمانوں کی حقیقی اکثریت کا تو خاتمہ ہی کر دیا گیا۔

سیاسیات میں ڈاکٹر صاحب موصوف کے جو خدمات رہے، ان کی تفصیلات کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ الغرض ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۶ء تک کی مسلسل جدوجہد، ایثار اور قربانیوں کا ایک مختصر ثمرہ ۱۹۳۵ء کی اصلاحات کی شکل میں ہندوستان میں نمودار ہوا۔ اور اس کے بعد ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے اور ڈاکٹر صاحب بھی اپنی زندگی کے ایک نئے دور میں قدم رکھتے ہیں۔

(۶)

۱۹۳۵ء کی اصلاحات کے نفاذ کے بعد جب اسمبلی کے لئے الکشن کی نوبت آئی، اور آل انڈیا کانگریس نے انتخابات میں عملی حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو ڈاکٹر صاحب موصوف دو حلقوں سے کھڑے ہوئے۔ مخالفوں نے مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ الکشن کے زمانہ میں جو پمفلٹ، لیفلٹ اور پوسٹر شائع کئے گئے وہ مخالفین کی روش کو آشکارا کرتے ہیں۔ ان کا پلندہ بھی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ ان کے بعض اقتباسات بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے۔ افسوس کہ اس مختصر تحریر میں ان کی گنجائش نہیں۔

غرض ڈاکٹر صاحب موصوف دو حلقوں سے منتخب ہو کر اسمبلی میں آئے اور کانگریس نے عہدے قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلہ کے بعد جب بہار میں وزارت کی ترتیب ہونے لگی تو یہ سمجھی بوجھی بات تھی کہ بہار میں راجندر بابو کے بعد کانگریس کے حلقہ میں جو سب سے زیادہ ممتاز تھا، جس کے خدمات سب سے زیادہ وقیع اور کانگریس میں جس کی شخصیت سب سے زیادہ قابل ترجیح ہو سکتی تھی وہ ڈاکٹر محمود کی ذات گرامی تھی۔ ان کے ذاتی ایثار و قربانی کو نظر انداز بھی کیا جائے تو آل انڈیا ورکنگ کمیٹی کی ممبری اور جنرل سکریٹری کی اعزاز اس امر کے لئے کافی تھا کہ وزارت عظمیٰ کا قلمدان ڈاکٹر صاحب کے آگے ہوگا۔ لیکن اس موقع پر ہمیں برادران وطن کی تنگ دلی کا اظہار کرنا ان کے حق میں ناانصافی نہیں ہے کہ انہوں نے صحیح فیصلہ سے گریز کیا اور آل انڈیا کے سابق ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور جنرل سکریٹری کا احترام اس کے شایان شان نہ کر سکے۔ اور ملک کی وہ جماعتیں اور افراد جن کے دلوں سے برادران وطن اپنا اعتماد کلیتہً ضایع کر چکے ہیں ہمیں اپنی رائے کے مضبوط ہونے کا یقین دلایا۔ چنانچہ ہندوستان کے اسلامی پریس میں کلکتہ سے لاہور تک اس کے خلاف آوازہ اٹھائی گئی اور برادران وطن کی تنگ دلی کے ثبوت میں اس واقعہ کو بار بار پیش کیا گیا۔

بہر حال اس مسئلہ میں صحیح پوزیشن یہ ہے کہ یا تو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے سالہا سال تک ڈاکٹر صاحب کو جنرل سکریٹری رکھنے میں غلطی کی، یا بہار اسمبلی کی کانگریس پارٹی نے تنگ دلی کو راہ دے کر محمود کو صرف اس لئے وزیر اعظم نہیں بنایا کہ ان کا نام محمود تھا۔ ان دونوں جماعتوں میں سے غلطی کسی ایک نے ضرور کی، اب خواہ غلطی کے مرتکب گاندھی جی، پنڈت موتی لال، مسٹر سی۔ آر داس، پنڈت جواہر لال، پٹیل برادران اور راجگوپال آچاریہ وغیرہ ہوئے، جنہوں نے انہیں جنرل سکریٹری کا اہم عہدہ دیا اور سالہا سال اس پر قایم رکھا۔ اور یا ڈاکٹر راجندر پرشاد، بابو سری کرشن اور بابو انوگرہ نرائن وغیرہ سے یہ حرکت سرزد ہوئی کہ انہوں نے وزارت کی ترتیب کے وقت ان کو انکے شایان شان عہدہ پیش نہیں کیا۔ اگرچہ ہماری نظروں سے اسی زمانہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا وہ بیان گذرا تھا۔ جس میں انہوں نے از خود اس سے علیحدہ ہونے کا اعلان کیا تھا۔ اور وہ تراشہ ہمارے فائل میں موجود بھی ہے۔ لیکن ہمیں ڈاکٹر صاحب موصوف اپنے سوانح نگار کی حیثیت سے اس اظہار حق پر معاف فرمائیں کہ ہمارا ضمیر ان کے بیان سے مطمئن نہ اُس وقت ہوا تھا نہ ان سطور کے قلمبند کرنے کے وقت ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے اس بیان کی اہمیت اس سے زیادہ نہیں کہ معاملہ رفع دفع کرنے اور نکتہ چینوں

کو خاموش کرنے کا ایک ذریعہ تھا اس سے آگے کچھ نہیں۔

بہر حال ہمیں اس واقعہ میں بھی ڈاکٹر صاحب کی سیرت کی بلندی کے نشانات ملتے ہیں۔ جو روش انہوں نے اختیار کی وہ بلند اسلامی اخلاق کے اصولوں کے عین مطابق تھی، اور اس حیثیت سے وہ لائق مبارک باد ہیں۔

لیکن اس سلسلہ میں یہ امر واقعہ لائق ذکر ہے کہ وزارت کی تشکیل میں صیغوں کی جو تقسیم عمل میں آئی، اس میں اس کا لحاظ خاص طور پر کیا گیا کہ اہم صیغے جن پر صوبہ کی آئندہ تعمیری ترقیوں کا دارومدار تھا وہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے سپرد کئے گئے۔ چنانچہ وزارت تعلیم، صنعت، حرفت، تجارت اور زراعت کے محکموں کا قلمدان ـــــ ڈاکٹر صاحب موصوف کے سپرد کیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب اپنے دور وزارت میں غیر معمولی انہماک کے ساتھ مصروف رہے، اور اپنے تحت کے ہر صیغہ میں مفید تعمیری خدمات انجام دیئے ہمیں افسوس ہے کہ اس وقت دور وزارت کے مفید خدمات کی کوئی مستند رپورٹ حاصل نہ ہو سکی تاہم اخبارات کے ذریعہ جو کچھ علم میں آتا تھا وہ ناظرین سے پوشیدہ نہیں۔

صیغۂ تعلیم میں ڈاکٹر صاحب نے پرائمری تعلیم پر خاص طور پر توجہ کی۔ اس کی ترقی کے لئے بعض نئی اسکیم مرتب کی، اور اس کو جلد سے جلد نافذ میں لے آئے۔ چنانچہ ان دنوں اسی اسکیم کے ماتحت مختلف شہروں میں کمیٹیاں قایم ہیں اور شاید وہ تعلیمی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

اشاعت تعلیم عام کی تحریک شہرت عام حاصل کر چکی ہے۔ اس مسئلہ میں ڈاکٹر صاحب کی بدولت بہار نے دوسرے صوبوں کی رہنمائی کی۔ اس وقت صوبہ کے مختلف مقاموں پر تعلیمی مرکز قایم ہیں۔ جن کی نگرانی میں عام تعلیم پھیلانے کی مفید خدمت انجام پا رہی ہے۔ اور ہزاروں ہزار ان پڑھ اس وقت تک تعلیم یافتہ بن چکے ہیں۔

پٹنہ یونیورسٹی میں اردو کا مسئلہ بھی لاینحل بنا ہوا تھا، اردو کے پروفیسر کی جگہ کا تقرر عمل میں آیا۔

اصلاح نصاب کی کوششیں بھی شروع ہو چکی تھیں، مگر وہ شاید عمل میں نہ آ سکیں۔

ہندوستانی زبان کے مسئلہ میں ڈاکٹر صاحب کی بدولت بہار نے پورے ہندوستان کی رہنمائی کی، اردو ہندی کے مختلف فیہ مسئلہ کو اس ذریعہ بحسن و خوبی طے کیا۔ ہندوستانی کمیٹی کے نام سے ایک کمیٹی اس وقت تک موجود ہے جو ہندوستانی زبان کا معیار اور اس کے مطابق کورس کی کتابوں کی درستی کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ اگر برادران وطن نے آزاد خیالی کے ساتھ ہندوستانی کمیٹی کے ساتھ معاونت کی تو یقین ہے کہ جس اصول کے ماتحت یہ کمیٹی کام کرنا چاہتی ہے، اس پر اردو کے اختلافات کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

زبان کے مسئلہ میں جب ہندو پریس نے ہندوستانی زبان کی تحریک کی مخالفت شروع کی اور ہندو پریس نے یہ جائز روش بھی گوارا نہ کرنا چاہی تو ڈاکٹر صاحب نے پنڈت جواہر لال کو زبان کے متعلق اپنا تاریخی مکتوب بھیجا اور اس کا مفصل جواب پنڈت جی نے اخبارات میں شایع کرایا۔ وہ اس سلسلہ میں مطالعہ کے لائق ہے

محکمۂ زراعت میں بھی ڈاکٹر صاحب کے دور حکومت میں مفید اضافے ہوئے۔ صنعت و حرفت اور تجارت کے سلسلہ میں شکر کی ملوں سے متعلق بھی انہوں نے کچھ خدمات انجام دیئے ہیں، جن کی تفصیل اس وقت ذہن میں نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے ماتحت شعبوں کو ترقی دینے کے علاوہ چند ایسے مسائل بھی اپنے ہاتھ میں لئے جن کا تعلق صوبہ کے مسلمانوں سے تھا اور ان مسائل کو پوری مضبوطی کے ساتھ اپنے رفقاء کار سے منوایا۔ ان مختلف فیہ مسائل میں ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے حق تناسب استحفاظ اور لوکل بورڈ میں مسلمانوں کی نیابت کے مسئلے خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ اخبارات میں آیا۔ ان مسائل میں دیگر وزراء سے ان کی رسہ کشی بھی ہوئی لیکن ڈاکٹر صاحب نہایت مضبوطی سے اپنے مطالبہ پر قایم رہے۔ اور ملازمتوں میں تناسب کے مسئلہ کو گویا حل کرایا، اور بورڈ میں مسلمانوں کی نیابت کے متعلق اسمبلی میں بحث آنیوالی تھی کہ وزارت اچانک جنگ عظیم میں ہندوستان کی شرکت سے پہلے ہندوستان کی حیثیت کی وضاحت کے مطالبہ پر اپنے عہدوں سے مستعفی ہو گئی۔ اور رام گڈھ سیشن کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف پھر اپنے سابق اعزاز یعنی کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بن کر کانگریس ہائی کمانڈ کی صف میں داخل ہو گئے۔ اور ہندوستان کے اس نازک دور میں ہندوستان کے مستقبل کے متعلق نیک مشوروں میں شریک ہیں۔ دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ ان سے ملک اور اسلام کی خدمات لے۔

(۷)

ڈاکٹر صاحب موصوف کے سوانح کا خاکہ نامکمل رہ جائے گا اگر ان کی علمی مرتبت کی جانب بھی چند اشارات نہ کر دیئے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب کو علم کا پاکیزہ مذاق عطا ہوا ہے۔ درحقیقت اگر وہ سیاسیات کے پرخار وادی میں قدم نہ رکھتے تو ان کا صحیح مرتبہ کسی علمی خانقاہ میں ان کا زاویہ نشیں ہونا تھا۔

لیکن قدرتنے ان کو تاریخ لکھنے والوں کی صف کو بجائے تاریخ بنانے والوں کی صف میں رکھا۔ تاہم ان کے علمی رجحانات کے اثرات بھی ان کی زندگی کو مختلف دوروں میں ظاہر ہوتے رہے۔ پچھلے دور میں علامہ شبلی نعمانی مرحوم کو جو علمی مرتبت حاصل تھی وہ آشکارا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ان کے خاص معتمدین میں تھے۔ مختلف علمی مباحث پر مراسلت جاری تھی۔ اسی طرح ڈاکٹر آرنلڈ اور پروفیسر نولدیکی وغیرہ سے بھی مکاتبت رہی۔ یہ خطوط ندیم میں وقتاً فوقتاً شائع ہوں گے۔ ان سے ان کے علم کے ذوق کا اندازہ ہوگا۔ ہندوستان کی تاریخ پر عالمانہ نظر رکھتے ہیں اور انگریزی رسائل میں وقتاً فوقتاً مضامین لکھتے رہتے ہیں۔

ان کی تصنیفات میں ایک تو ان کا مشہور رسالہ "خلافت اور انگلستان" ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ہزاروں ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ دیوان غالب کے بدایوں ایڈیشن کو ڈاکٹر صاحب ہی نے مرتب کیا تھا۔ اور غالب کے کلام پر نئے انداز میں مقدمہ لکھا اسی طرح مختلف مطبوعات پر وقتاً فوقتاً مقدمے اور دیباچے لکھے ہیں بعض ناتمام تصنیفات اور مضامین ڈاکٹر صاحب کے ذخیرۂ کاغذات میں موجود ہیں۔

مختلف علمی، تعلیمی اداروں، علی گڈھ یونیورسٹی، دار المصنفین، جامعۂ ملیہ وغیرہ سے وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موجودہ ہندوستان کے اُن مشاہیر میں ہیں جو نئے ہندوستان کے بنانے والوں میں ہیں۔ ان کے خدمات نوجوان ہندوستان کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ صوبۂ بہار کے لئے یہ باعث فخر ہے کہ وہ اسی صوبہ سے ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو گئے۔ چمپارن میں مستقل وطن اختیار کر لیا ہے۔ گاندھی جی۔ مولانا ابوالکلام یا مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی کے خطوط جن میں سے بعض اس نمبر میں بھی کسی دوسری جگہ چھپ رہے ہیں۔ اندازہ ہوگا کہ ان بزرگوں کی نظر میں صوبہ کے سیاسی حالات کی نگرانی کی خدمت انہیں کے سپرد رہی ہے۔ جو خدمات انہوں نے اس صوبہ میں انجام دئے ہیں۔ باشندگان صوبہ ان کے احسانات کو فراموش نہیں کر سکتے۔

دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ ان کے ذریعہ صوبہ میں مزید مفید خدمات انجام دلائے۔ کہ یہ اس صدی کے بہترین دل و دماغ کے مالک ہیں، اور بہترین خدمات کے انجام دینے کی صلاحیتیں ان میں ودیعت کی گئی ہیں۔

مکتبۂ ندیم گیا کی چند اعلانات

پچھلے بہار نمبر کی قیمتوں میں تخفیف

پچھلے بہار نمبروں کے چند چند نمبر دفتر میں باقی رہ گئے ہیں۔ اگر آپ انہیں خریدنا چاہیں تو ان کی قیمتوں کی رعایت سے فائدہ اُٹھائیں :-

بہار نمبر ۳۳ء سابق قیمت ۱؎ رعایتی قیمت ۱؎

بہار نمبر ۳۵ء سابق قیمت ۱؎ رعایتی قیمت ۱؎

ان نمبروں کے بیش قیمت مضامین اور ان کی رعایتی قیمت سے فائدہ اُٹھائیے۔

مزاجیات مانپوری۔ جس کی طباعت رُک گئی تھی اب اختتام پر ہے۔ ماہ اگست تک دفتر سے شائع ہوگی۔

طنزیات مانپوری کی مجلد جلدیں ختم ہو گئی ہیں۔ چند غیر مجلد جلدیں باقی ہیں، جلد طلب فرمائیں۔ قیمت ۱؎

دماغی کمپنی اور دوسرے افسانے کی چھپائی جو رُک گئی تھی عنقریب شروع ہونیوالی ہے۔ نام درج رجسٹر کرائیں۔

مینجر :- مکتبۂ ندیم، گیا۔

عزیزِ ملّت

یعنی

نازشِ بہار فخرِ ملک عزیزِ ملّت عالیجناب سیّد عبدالعزیز بالقابہٗ

صدر المہام عدالت وامور مذہبی حکومتِ آصفیہ حیدرآباد دکن،

اثر خامہ جناب سید انوار الحق صاحب بی۔ اے۔ پٹنہ

ملّت اسلامیہ ہند اور جمعیت ملیہ بہار کے ان نامور زعماء کو جب مستقبل کا ماضی نواز قلم ڈھونڈھنے بیٹھے گا جو انگریزوں کے تسلط کامل اور مسلمانوں کے انحطاط روز افزوں کے تاریک دور میں پیدا ہو کر ملّت بیضا کی کشتی کو طوفان حوادث سے بچانے کے لیے روح فرسا کوششوں میں اپنی زندگی اپنی قوتِ عمل اور اپنا سرمایۂ حیات صرف کرتے رہے تو فخرِ ملک عزیزِ ملّت مسٹر سیّد عبدالعزیز بالقابہٗ کا نام اُس کی مرتبہ فہرست کا سرنامہ و رخشان ہوگا۔ قوم کے وہ فرزندانِ رشید جو اپنے پیشروؤں کی سعی و محنت کی منت شناسی کا حق ادا کرنے کے لئے اپنی جستجو کا قدم تاریخ ماضی کی وادی میں بڑھائیں گے۔ انہیں ہمارے **عزیز قوم** کا روشن نام بلندی پر چمکتا ہوا نظر آئیگا، اور وہ پکار اٹھیں گے کہ

فلعلّك لك اٰتی بشهابٍ قبسٍ لعلّی ابرقٍ من الطورِ و انست به

جس طرح آج زندہ قومیں اپنے اُن پیشروؤں کے نام پر فخر کرتی اور اُن کے ناموں کو اپنے قومی خزانے کا جواہر بے بہا سمجھتی ہیں جن کے ہاتھوں سے اُن کے قومی عروج کا پہلا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا، اسی طرح ہماری قوم کے وہ مایۂ ناز اخلاف جو چمنستانِ ملّت کے گلہائے تر سے کسی دن اپنے دامنوں کو معمور پائیں گے، اپنے اُن باغبانانِ قدیم کی تصویروں کو ڈھونڈھیں گے جن کے پسینے اور خون نے سینچ سینچ کر نازک اور کمزور پودوں کو اس کے قابل بنا دیا کہ وہ پھولوں سے اپنی لدی ہوئی ڈالیاں اُن کی گودوں میں ڈالدیں۔ کامیاب و بامنزل مقصود کو پہونچنے والے قافلے جو آیندہ نسلوں سے وابستہ ہوں گے، وہ تلاش کریں گے کہ ہمارے اُن رہنمایانِ پیشین کی مبارک صورتیں اور ہمایوں فال خط و خال کیسے ہیں جن کی صدائے جرس نے سوئی ہوئی جماعت کو بادیہ پیمائے جد و جہد و رہ نوردِ سعی و محن بنا دیا تھا، اور آنے والی شکر گذار نسلیں اُن گرانقدر مجسمۂ صدق و خلوص اور پیکرِ جانفشانی و ایثار ہستیوں کا مرقع صفحاتِ تاریخ میں ڈھونڈھیں گی جن کی تگ و دو ہمت و جرأت اور عقل و تدبیر نے وہ جادۂ عمل تیار کر دیا جس پر چل کر قوم اور اُس کے فرزند منزل کامرانی تک پہونچ گئے۔ اُس وقت ہماری آج کی غفلتوں اور بے پروائیوں نے اگر انہیں حسرت زدہ اور محروم تمنا رکھا تو یہ نہ صرف ہمارا اپنا ناشکر گذارانہ اور احسان فراموش کردار ہوگا۔ بلکہ آنے والی نسلوں کے جذبۂ محبت پر سنگدلانہ ظلم اور کاری وار ہوگا۔

اپنی دسترس کے مطابق مجھے عزیز قوم عالیجناب مسٹر سیّد عبدالعزیز بالقابہٗ کا نام اس عنوان کے ذیل میں حاصل ہونا ہی چاہتا ہوں کہ آپ کی مبارک و قابل فخر زندگی کے چند اوراق کو دنیا کے سامنے پیش کر سکوں تاکہ جس طرح میں نے اس سلسلہ کی پہلی کڑیوں سے اپنی یہ کڑی وابستہ کر دی ہے اور پہلے نقش قدم کو دیکھکر یہ قدم آگے بڑھایا ہے، اسی طرح آنیوالی کڑیاں اور نئے نقش قدم میرے پیچھے ایک سلسلۂ دراز قایم کر دیں جس سے آنیوالی صدیاں تلاش و جستجو کے حقائق میں پریشان نہ ہوں۔ اور انہیں اپنے پیش نظر منزل کے ساتھ پچھلے نشانِ راہ کا صحیح اندازہ مل سکے۔

ممکن ہے میری یہ کوشش مخدوم قوم کے افتادِ طبع کے خلاف اور آپ کی کبیدگی خاطر کا باعث ہو لیکن میں جناب ممدوح سے اس کی معافی چاہتا ہوں کہ اس جسارت بیجا کا حق مجھے اور قوم کے ہر فرد کو حاصل ہے کہ آپ کی سوانح حیات خود قوم کی داستانِ زندگی کا ایک صفحہ ہے اور وہ آپ کی چیز ہو یا نہ ہو مگر قوم و ملک کا ایک سرمایۂ گراں بہا ضرور ہے۔ پس ہم خدامِ قلم پر اگر الزام رہبری اور تصرفِ بیجا کی فرد جرم لگائی جائے

تو قوم کی عدالت ہمیں ضرور بری کردے گی۔

آسمان سعادت واقبال کا یہ آفتاب جس خاندان کا چشم وچراغ ہوا اُس کی خوش نصیبی میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ آپ کے والد بزرگوار عالیجناب حکیم سید حفاظت حسین صاحب مرحوم السنۂ مشرقیہ کے ادیب اور اپنے عہد کے نامور طبیب تھے، اور آپ کی فیض گستری سے روسا، ریاست وامرائے دولت کے ساتھ غربا و اہل حاجت بھی مستفید ہوتے رہے۔ عہد آخر میں آپ کی عمر کا بیشتر حصہ جودھپور (ریاست راجپوتانہ) میں گذرا، جہاں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ مہاراجہ جودھپور آپ کی عقیدتمندانہ نیازمندی کے ساتھ آپ کی قیام فرمائی جودھپور کے لئے اس قدر مصر ہے کہ آپ کی خواہش گریز و نیت پرہیز کامیاب نہ ہو سکی۔

عزیز قوم مسٹر سید عبدالعزیز نسبًا پھلواری شریف کے ایک پرانے علمی خاندان کے نخل آرزو ہیں۔ آپ کی والدہ محترمہ سید علی امام مرحوم کے خاندان نیورہ سے وابستہ تھیں۔

عہد طفلی کا موسم بہار علوم مشرقی کی تعلیم وتربیت میں گذرا۔ پھر آپ پٹنہ کالجیٹ اسکول میں انٹرنس تک میدان علم کو طے کیا اور یہاں سے فارغ ہوکر پٹنہ کالج میں بی۔ اے تک تعلیم پائی، اور اسی دوران میں آہستہ آہستہ آپ کا وہ جوہر بھی کھلتا رہا جو آج بے نقاب ہوکر "عزیز ملت" کو بارگاہ بلند تک پہونچا کر رہا، یعنی متعدد قومی اداروں اور مفید ملت انجمنوں اور قومیت پرور مجلسوں کی عنان ہدایت آپ کے ہاتھوں میں رہی یا جسے آپ کی حمایت حاصل ہوئی۔ ہزاری باغ کی تعلیم کے بعد آپ کا ذوق علمی آسودہ نہ ہوا اور یہ تشنگی آپ کو سرچشمہ انگلستان تک لے گئی جو آپ کے لئے مبارک ہوا تو قوم کے لئے بھی میمون ومسعود۔ یہ سفر ۱۹۰۷ء میں ہوا اور ۱۹۱۱ء میں آپ نے بیرسٹری کی سند حاصل کرلی اور سند لیکر دو سال مزید لندن میں قیام کیا۔ زمانہ قیام انگلستان میں بہاری طالبان علم کو آپ کی بلند حوصلہ طبیعت نے قیام انجمن پر آمادہ کیا اور اجتماعی ومحرک زندگی کا درس دیا۔ آپ کی روان وتیز طبیعت نے انگریزی اخباروں اور انجمنوں کے ممبروں کو تحریر وتقریر سے بہار وہندوستان کی قوت فطانت وذکاوت اور صلاحیت تدبر وفکر کی جلوہ گاہ بنا دیا۔

کیکسٹن ہال میں وہ معرکۃ الآرا تقریر آپ نے کی تھی جس کو آج تک ہندوستانی طلبہ یاد کرکے جھومتے ہیں، نہ صرف ہندوستانی اہل علم بلکہ خود انگریز مدبرین کی نظروں میں آپ کی تحریر وتقریر نگاہ قدر ووقار سے دیکھی جانے لگی۔

انگلستان سے آپ کی واپسی ۱۹۱۳ء میں ہوئی جب کہ آپ کی تشریف آوری کی تقریب پر اہل بہار کی طرف سے بلا قید مذہب وملت آپ کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ اور مخلصانہ دعوتیں دی گئیں۔ اور اس طرح انگلستان میں رہکر ہندوستانی علم ودماغ کی نمایندگی کی ہملک کی طرف سے منفقہ داد دی گئی۔

بیرسٹری میں آپ کو جو بیدطولی حاصل ہے اس کی شعاعیں ابتدائے ایام ہی سے نکلنے لگیں۔

بالائے سرش زہوشمندی — می تافت ستارۂ بلندی

جوہر شناس نگاہیں اُسی وقت سمجھ گئی تھیں کہ یہ ستارۂ درخشاں ایک دن آفتاب ہوکر چمکے گا۔ آپ کی انگلستان سے واپسی کے بعد ضلع شاہ آباد۔ گنجن پور۔ بہار شریف۔ داناپور، اور دوسرے مقامات میں جب فرقہ وارانہ فساد کی چنگاریاں شعلۂ جوالہ بن کر نمودار ہوئیں اور بہار کا ہر خطہ جب مسلمانوں کی قتل گاہ بننے لگا۔ تو اس وقت سب سے پہلے ان جلنے مرنے اور ڈوبنے والوں کو سہارا دینے کے لئے سب سے پہلے آپ ہی کی ذات ستودہ صفات آگے بڑھی۔ آپ کی دست گیری نے بہت سے خاندانوں کو بچا لیا، اور آپ کی ہوشمندانہ اور مدبرانہ کارروائیوں نے ہندو مسلم تعلقات کو خوشگوار بناکر کامل امن وامان اور شائستگی کی فضا پیدا کر دی۔

مقدمات کی کامیابی نے ایک طرف مسلمانوں کو بشارت وخوشخبری دی۔ تو دوسری طرف آپ کی اعلیٰ سیرت، صداقت شعاری اور حسن اخلاق کی وجہ سے برادران وطن بھی آپ کے مداح ہو گئے، اور بڑی عزت واحترام سے دیکھنے لگے۔

اس کے بعد آپ کا وہ حسن معنوی پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جو ان تمام کمالات سے زیادہ قیمتی اور دلکش ہے اور جس سے انسان کے "احسن تقویم" ہونے کا وہ باطنی جمال کھلتا ہے جو نہ کسی اسکول سے حاصل کیا جا سکتا ہے نہ کسی پروفیسر کی جیبوں میں پایا جاتا ہے، نہ کسی محلّ کدامن عطا میں ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست — تانہ بخشد خدائے بخشندہ

آپ کی نرم دلی۔ رقت قلب۔ سیر چشمی۔ انصاف پسندی و معدلت آبائی و کرم گستری یہ ایسے محاسن و فضائل ہیں جنہیں آپ کسی تعلیم گاہ سے نہیں لائے۔ بلکہ آپ کو بطور موہبت الٰہی ورثہ میں ملیں۔

صداقت شعاری و فیاضی کی روز افزوں واقعات کے شمار سے قطع نظر کرکے اگر صرف ایک ہی مثال پیش کیجائے تو تخمینہ تجھ کیلئے کافی ہو سکتی ہے۔ آپ اکثر و بیشتر مقدمات میں اپنے موکلوں پر اپنا دباؤ و اثر ڈال کر فریق ثانی سے مصالحت کرا دیتے کہ جناب ممدوح کو اپنے موکل کے ساتھ فریق کی تباہی و بربادی بھی بہ اصول ہمدردی نوع انسان منظور نہیں تھی۔ حالانکہ اس طریقہ کار سے ایک کامیاب بیرسٹر کو کہاں تک مالی نقصان پہنچ سکتا ہے، ظاہر ہے۔

۱۹۳۲ء میں دہلی کا تاریخی مقدمہ سازش جس میں حکومت ہند نے آپ کو ایک بڑی فیس پر تاج کا وکیل مقرر کیا تھا۔ وہ محض آپ ہی کے مشورہ سے اٹھا لیا گیا۔ اور ملزمین میں سے بعض کو بری کر دیا گیا۔ اور بعض کو خفیف تعزیرات ہند کے دفعات میں ماخوذ کرکے ہلکی سزائیں دی گئیں۔ ورنہ اس مقدمہ کے کافی عرصہ تک چلنے کی امید تھی، اور اندریں صورت آپ حکومت ہند کے خزانہ عامرہ سے لاکھوں روپے وصول کر سکتے تھے مگر آپ کی دیانت داری اور ضمیر نے اس کو پسند نہیں کیا۔

اس کے علاوہ مختلف مقدمات میں آپ نے اپنے پاس سے مصارف خطیر تک برداشت کرکے بلا فیس اور متعدد مقدمات میں ناقابل برداشت تخفیف کے ساتھ کام کیا ہے۔ اور اس کے خلاف بارہا ظالم اور برسر تاحق ملزمین کے مقدمات میں گرانقدر فیسوں کو ملتے ہوئے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

جوہر علم و ادب کے ساتھ یہ جوہر اخلاق و عمل آپ کی شہرت و منزلت کو اور بھی آب و تاب دینے لگا۔

انجمن اسلامیہ پٹنہ سٹی اس وقت مسلمانان بہار کی کوشش و ہمت کا ایک حوصلہ افزا نمونہ ہے۔ اور اس کی اصلاح و نگرانی میں آپ کی چشم عنایت کو بہت بڑا دخل ہے۔ آپ نے اس کی صدارت و سرپرستی قبول فرما کر اس میں چار چاند لگا دئے۔

آپ کی مقبولیت عامہ کا یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ آپ نے قوم کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے جب کبھی مجلس مقننہ صوبہ بہار میں جانے پر آمادگی ظاہر فرمائی۔ قوم نے ہاتھوں ہاتھ آپ کو بلا طلب آرزو الکشن کی ناخوشگوار کنوسنگ سے بے نیاز رکھکر اسمبلی کی کرسیوں تک پہونچا دیا۔ آپ پہلی مرتبہ ۱۹۲۶ء میں بہار کے سب سے وسیع حلقۂ انتخاب سے ممبر لیجسلیٹو کونسل ہوئے۔ پھر ۱۹۳۰ء میں آپ ہی منتخب ہوئے۔ پھر ۱۹۳۷ء میں آپ مع اپنے رفقا کی کافی تعداد کے جو آپ کی جماعت سے وابستہ تھے جدید دستور ہند کے ماتحت اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔

۱۹۳۷ء سے بیشتر ۱۹۳۴ء میں حکومت بہار کی نگاہ انتخاب نے وزارت صیغہ تعلیمات و ترقیات کے منصب کیلئے آپ ہی کو منتخب کیا۔ عہد وزارت میں آپ کے زریں کارناموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ مشہور و معروف تاریخی زلزلے کی تباہ کاریوں کے بعد جب کہ سلسلۂ رسل و سائل بند اور اکثر علاقے تہ آب اور نذر سیلاب ہو رہے تھے شدید موسم سرما میں بذریعہ ایر و پلین تفصیلات و قعریات دور افتادہ کا معائنہ فرمایا۔ کانگریس اور حکومت دونوں کی جداگانہ ریلیف پارٹیوں کی محض بہ سبیل خلاص نوع انسانی و ماورائے فرقہ آرائی جس سے نیشنل کانگریس اس وقت بھی غافل نہ رہی، آپ نے مدد فرمائی۔ آپ نے اپنے ذاتی و سکونتی مکان کا ایک حصہ کانگریس ریلیف کمیٹی کے حوالہ کر دیا۔ اور دوسری طرف حکومت کی امدادی مساعی میں پوری مدد دی۔ اور ریلیف فنڈ میں اپنے ذاتی اثرات کو استعمال کرکے حکومت ہند سے ایک کروڑ روپیہ کا گرانٹ منظور کرایا۔

آل انڈیا صنعتی اور زرعی نمائش جس حسن و سلیقہ شعاری کے ساتھ پٹنہ میں ہوئی، اس کو دیکھنے والے آج تک اس لطف نظارہ کو نہیں بھول سکتے۔ پھلوں کی کاشت کو ترقی دینے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے آپ نے اپنے عہد وزارت میں آموں کی نمائش قایم کی جس میں متعدد اور گوناگوں اقسام کے آموں کا انعامی مقابلہ کرکے اس فن کے شائقین کی ہمت افزائی فرمائی۔ اور اس کے ذریعہ نہ صرف ہندوستان کو بلکہ ممالک بیرون ہند کو بھی صوبۂ بہار کی اس نعمت الٰہی سے روشناس کرایا اور اس طرح اس شعبۂ تجارت کے فروغ پر اچھا اثر پڑا۔

معذورین بصارت پر بارش رحمت بھی آپ ہی کے ابر کرم کا کرشمہ ہے، اسی دور میں آپ نے اپنی فیض رسانی اور ہمدردی نوع انسانی کے جذبہ مبارک کا رخ معذورین بصارت کی طرف منعطف کر دیا۔ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں زن و مرد نزول الماء یعنی موتیا بند (کٹریکٹ) کے شکار صوبۂ بہار کے ہر قریہ و ضلع میں موجود تھے۔ جن کے علاج کے لئے بجز صدر مقام کے بعض ڈاکٹروں کے اور کوئی سبیل نہ تھی۔ اول تو ہسپتال ہی اس پایہ کے معدودے کلیل اور پھر ہسپتالوں میں ان کی سیٹیں اور بھی کم بمشاق و چابکدست ماہرین کا اور بھی خط۔ اس قلت و ندرت کی تہ بہ تہ آفتوں میں اتنے حاجتمندوں کی دستگیری کیونکر ممکن تھی۔ یہی تصور آپ کی اس تحریک ہمدردی کا باعث ہوا۔ اور آپ نے اپنی جیب خاص پر ہزارہا روپے کا اور اپنے مکانات و صحن مکان کی تمام گنجائشوں و نیز اپنے ذرائع اخلاق سے وابستہ محبت افراد کثیر کی رضا کارانہ خدمات کے ساتھ تمام ممکنہ سعی و کوشش کا سرمایہ اس فیض عام میں صرف کیا جو تفریق ملت و مذہب سے بالاتر رکھا گیا اور مجھے جہاں تک معلوم ہے کہ سندو مستفیدان فیض بمقابلہ مسلمانوں کے ۹۰ فیصدی زیادہ رہے۔ اس دریائے کرم کی یہ روانی دیکھ کر جو مسلسل چند سال سے تشنہ کاماں حاجت کو سیراب کرتی رہی، اور جس کا سرچشمہ صرف آپ کی ہمت و سخاوت اور آپ کی جیب خاص کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اور جس کا جوش خروج ہر سال روز افزوں ہوتا گیا۔ حکومت وقت کی غیرت بھی مجبور ہوئی کہ خزانہ سلطنت کو متوجہ کرے اور رام راج کے آرزومندوں کو اسلام راج کے طرز مروت اور عنوان مرحمت کی ان کرنوں کو دکھا کر جو روح وطن عزیز قوم کے برج سخا اور نیر کرم سے ہر قوم پر یکساں برس رہی تھیں، غیرت دلائے۔ چنانچہ کانگریسی حکومت نے بھی اپنے میزانیہ میں چار ہزار کی گرانٹ منظور کی، لیکن اخراجات کثیر کے مقابلے میں یہ رقم بالکل قلیل ہے۔ اسلئے اندھوں کے عارضی ہسپتال کے مصارف کا کافی بار عزیز ملت بالقابہ کی جیب خاص پر ہی اب تک پڑتا ہے۔

اس سلسلہ میں عزیز ملت نے اس عارضی ہسپتال کو مستقل شکل دینے کے لئے ایک مفید اسکیم پیش کی جس کی توصیف و تحسین میں "اسٹیٹسمین"، "سرچ لائٹ"، "انڈین نیشن"، "بہار سپرلڈر"، اور ملک کے بہت سے موقر اخبارات نے مقالے لکھے۔

وزارت صیغہ تعلیم کا ذمہ دار عہدہ نیکنامی اور کامیابی کے غلغلہ انداز نعرہ ہائے تحسین کے ساتھ ختم ہوا تو جدید دستور ہند کے ماتحت آپ اسمبلی کی کرسی رکنیت سے قوم و ملک کی خدمت انجام دیتے رہے لیکن کانگریسی حکومت کی تنگدلانہ روش اور جمہوریت کی غلط تعبیروں اور فرقہ وارانہ منظر کو دیکھ کر جو کانسل کے اندر موجود تھا۔ اور جہاں اب نہ معقولیت کو گنجائش باقی تھی نہ دلائل کا کوئی وقار، جہاں لاٹھی اور بھینس کی لڑائی جاری تھی، عقل و تمیز کو جہاں سے کوچ کر جانا پڑا تھا آپ نے اپنی آنکھوں کے سامنے شرافت اور حق و انصاف کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھنا گوارا نہ کیا اور استعفا دیکر اپنی جگہ خالی کر دی۔

اچھا سلام جاتے ہیں تیری گلی سے ہم

مسلم لیگ کی صدارت - برادران وطن کی ناہمواریوں اور دلآزاریوں کے باعث انہیں ایام میں جبکہ اندرون کانسل آپ بے ترتیبی و بے انصافی کا سماں دیکھ کر کنارہ کشی کی تھی، بیرون کانسل طائفۃ الملوکی کا دور چل رہا تھا اور مسلمانوں کے قلوب پر برادران وطن کے تیر و خدنگ لگ رہے تھے اور مسلمانوں میں ایک ہمہ گیر ہیجان اضطراب کارفرما تھا۔ جس کا لازمی انجام کار یہ ہوا کہ مسلم لیگ کا علم بلند ہوا اور مسلمانوں کی تنظیم و اجتماع اس کے پرچم کے نیچے شروع ہوئی۔ اور شہروں سے قصبات و قریات تک ایک جذبۂ بیداری اور حرکت زندگی کی لہر شروع ہوگئی۔ اس وقت آنکھیں چاروں طرف اٹھتی تھیں، مگر صوبۂ بہار کے شایان شان ایک ایسی ہمہ گیر اور وسعت پذیر تنظیم کی کرسی صدارت کا اہل بجز عزیز قوم کی ذات گرامی کے دوسرا نظر نہ آسکا۔ اور سر چند عزیز قوم اس بار عظیم کو برداشت کرنے سے انکار فرماتے رہے مگر قوم کے متفقہ اصرار و التجا کو آپ کی قوم پرور طبیعت رد نہ کر سکی۔ اور بالآخر قوم کی پیہم و پرخواستوں کے سامنے آپ کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔

آپ کے دور صدارت میں مسلم لیگ جس حسن اسلوب اور شائستگی اور ڈسپلن کے ساتھ میدان عمل میں ترقی کرتی رہی وہ مسلمانان بہار کے لئے ایک قابل فخر و ناز حقیقت ہے۔ اخر آپ اپنے کثیر مشاغل کے باوجود اپنے معزز پیشۂ وکالت سے بے نیاز ہو کر جس طرح پورے تعہد کی صدارت کے تمام لوازم خدمت سے عہدہ برآ ہوئے، وہ صوبے کے ہر مسلمان پر آشکارا ہے۔ یہاں گنجائش تحریر کی تنگی مانع ہے ورنہ آپ کے زمانہ صدارت سے وابستہ سوانح حیات خود ایک مستقل زندگی کی کتاب ضخیم ہیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا شہرۂ آفاق اجتماع الہ آباد کا ظاہری اور معنوی حسن و جمال آپ ہی کی تجویز تدبیر و حسن عمل کا نتیجہ تھا۔ پھر مسلم لیگ کی ورکرس کانفرنس کا عظیم الشان صوبائی اجلاس جو گذشتہ

دسمبر میں ہوا، آپ کے سلیقہ شعار فکر و تدبر کا دوسرا تاریخی مظاہرہ تھا۔

اسی سلسلہ میں یہ بھی ظاہر کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ مسلم لیگ کی ان گہری اور پُر اثر خدمات کے باوجود ہندو برادران وطن کی نگاہوں اور دلوں میں آپ کی عزت و عظمت اور محبت کم نہ ہوئی۔ انہوں نے آپ کی بلندی اخلاق اور اعلیٰ کیریکٹر کی پورے اعتماد کے ساتھ برابر قدر کی۔ چنانچہ کانگریس گورنمنٹ کو جب ضرورت ہوئی کہ "اندر اور رشوت ستانی" کی مہم کو سر کرنے کے لئے ایک کمیٹی کو تشکیل دے تو اس کی عنان صدارت کے لئے آپ کی طرف رجوع کرنا پڑا اور آپ نے اس مشنر کہ ملکی مفاد کو اپنے دائرۂ عمل یا مسلم لیگ کے ضابطہ کار کے خلاف نہ سمجھ کر اس کو بلا معاوضہ قبول فرمایا۔ اور گویا اس طرح اس طریقہ کار کو پیش کیا کہ جہاں مسلم لیگ مسلمانوں کے لئے عدل و انصاف اور رواداری و مساوات کی طلبگار ہے، وہاں ہندوؤں اور دیگر اقوام ہند کے لئے بھی انصاف و داد گستری کیلئے اپنی جدوجہد کو پیش کر سکتی ہے۔ اس کے بعد وہ دور آتا ہے جب آپ کی ہدایت و رہنمائی اور صدارت سے بہار صوبائی مسلم لیگ محروم ہوتی ہے اور اس کے ساتھ مسلمانان بہار کو اس منزل سے گذرنے کا موقع ملتا ہے جہاں "قدر نعمت بعد زوال" کا معمہ آسانی سے حل ہو جاتا ہے۔ آپ نے اپنے صوبے کی خدمات اور اندرونی اصلاحات کی مشغولیوں سے نہ کبھی مہلت پائی اور نہ کبھی آپ نے اس کی کوشش و آرزو کی کہ آل انڈیا کے کسی بلند افق سے اپنی تنویر و ضیا کی جلوہ باریاں فرما کر ہندوستان کے ہر گوشے کو مہارت علمی و قوت ذہنی سے روشناس کرتے۔ آپ کی قانونی لیاقت، آپ کا حسن تقریر روانی تحریر، انگریزی ادب کا بلند معیار، تدبر و تفکر، اصابت رائے مشک کی خوشبو بن کر اطراف دنیا میں پھیلی اور آپ پر جہاں ساری دنیا کی نگاہ قدر پڑ رہی تھی اعلیٰ حضرت نظام الملک آصفجاہ ہفتم شہریار دکن کی دُور بین نظر اور جوہر شناس نگاہ بھی تخمینہ و قیاس میں مشغول تھی، چنانچہ اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہٗ نے آپ کو طلب فرما کر صدر المہام عدالت و امور مذہبی کا مہتم بالشان منصب جلیل عطا فرمایا، اور اعلیٰ حضرت کی اس صحیح اور جنچی تلی ہوئی نظر پر ملک ہر اختیار نے بے انتہا داد دی اور ہر طرف اور ہر گوشۂ ملک سے خیر مقدم و مرحبا کی صدائیں آنے لگیں۔ ابھی کہ عزیز قوم کو دو مہینے ہوئے ہیں دکن کی خدمات عالیہ کی ابتدائی منزلیں شروع ہوئی ہیں، آپ ریاست فرخندہ بنیاد حیدرآباد کے ہر حلقۂ عزت میں شمع انجمن کی حیثیت سے جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔ اپنے جلیل القدر شہریار کی نظر میں بھی محبوب ہیں اور رعایائے دکن کی نگاہوں میں بھی عزیز۔

اس جگہ مختصر لفظوں میں ایک ہلکی سی جھلک دکھانا چاہتا ہوں، جو پتہ دیگی کہ آفتاب کی روشنی جہاں پہونچتی ہے یکساں طور پر ضیا باری و تنویر کا فرض انجام دیتی ہے۔ خواہ وہ افق مشرق میں یا دامن مغرب یا کنار جنوب میں۔ اہل بہار نے آپ سے چھٹنے اور آپ کے حیدرآباد دکن تشریف لیجانے کے موقعہ پر جس بے تابیٔ دل اور اضطراب قلب کا مظاہرہ کیا ہے، اسے وہ آنکھیں بتا سکتی ہیں جو خود اشکبار تھیں اور جنہوں نے دوسروں کو اشک بار دیکھا۔ ہر مذہب و ملت کے ہزاروں افراد بلا فرق قومیت و جماعت اس یوسف کنعاں کے دامن کو ہاتھ سے نکلتا ہوا دیکھ کر کف افسوس مل رہے تھے۔ مسلم لیگ کے علمداروں اور خدمت گذاروں کا حال کیا کہیئے کہ اُن کیلئے سرمایۂ صبر و متاع ناز و فخر آپ ہی کی ذات تھی اور بے اختیارانہ زبان حال سے یہ صدائیں نکل رہی تھیں ؎

اے تماشا گاہ عالم روئے تو ۔۔۔ تو کجا بہر تماشا می روی،

کانگریس کے حلقہ بگوشان وفا بھی آپ کی جدائی پر چشم پُرنم تھے۔ "سرچ لائٹ" اور "انڈین نیشن" جیسے کانگریسی کیمپ کے موقر اخبارات نے اپنے حلقے کی نمائندگی کرتے ہوئے جو مضامین لکھے ارباب نظر شاہد ہیں، ایک طرف یہ ہمہ گیر اضطراب تھا جو چھٹنے والوں اور کھونے والوں کی دنیا میں بپا تھا۔ اور عزیز قوم کی محبوبیت اور قدر و قیمت کو تاریخ بہار کے اوراق پر ثبت دوام دے رہا تھا تو دوسری طرف پانیوالوں اور جڑنے والوں کا ایک ہجوم تھا جو خندہ جبیں اور شاداں و فرحاں اپنے خزانۂ دولت میں ایک درگوہر شاہوار کے آنے پر مست و سرشار تھا یعنی حیدرآباد دکن کا ہر حلقہ خواہ وہ ارباب حکومت کا ہو یا افراد رعیت کا آپکی تشریف آوری پر بغرۂ مسرت ہر گوشۂ دکن سے بلند کر رہا تھا، جس پر دکن کے اخبارات کے فائل اور مضامین شاہد ہیں۔ اعلیٰ حضرت ظل سبحانی کی قدر افزائی برستی جاری ہے۔ عزیز قوم کی قوت عمل کے مظاہرے بھی یوماً فیوماً بحمد اللہ جلوہ ریز ہوتے جاتے ہیں۔ موقع اور وقت صفحات رسالہ اور راقم کی مجبوریاں نعمیں کہ اجمالاً بھی اُن تمام سپاسناموں اور اظہار خیال کا ذکر کر سکوں جو پٹنہ میں بوقت رخصت اور حیدرآباد میں بوقت آمد عزیز ملت کی بارگاہ تعظیم و تکریم میں پیش ہوئے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ایسے چشمۂ فیض کو تا دیر موجزن رکھے اور اس ذات حمیدہ صفات سے ملت اسلامیہ اور ملک و وطن کے ہر گوشے کو مستفید کرے۔

یہ مضمون آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر محترم قائد اعظم محمد علی جناح کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ ۱۲

جناب ڈاکٹر سید محمود

علامہ سیّد سلیمان ندوی مدظلہ

عزیز ملت سید عبدالعزیز

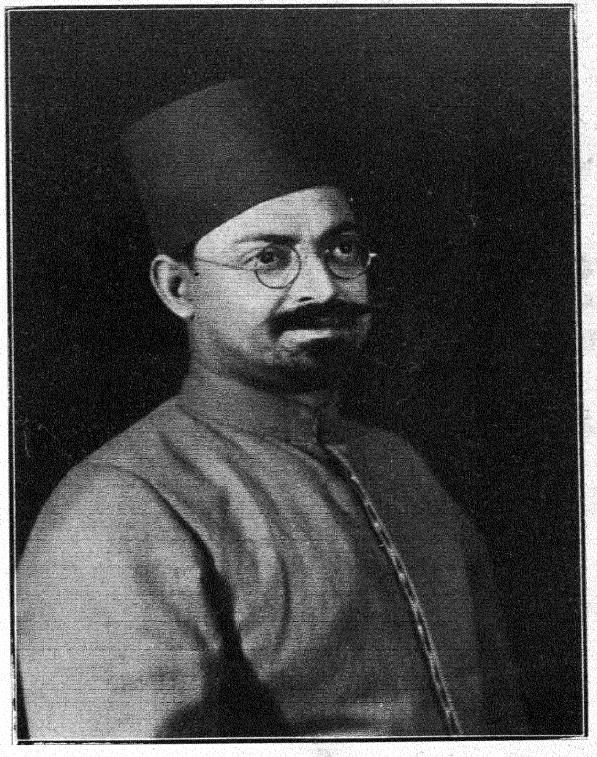

۔ناب آنریبل سید حسین امام

مسٹر سید حسن امام بیرسٹر مرحوم

آنریبل سید حسین امام

گیا کے دو اعلیٰ ترین فنی مجاہبت خاندانوں کا اجتماع جس ذات گرامی میں ہوا ہے، وہی آج ہمہ ہند شہرت کی مالک ہے۔ بہار کو خصوصاً اور مسلمانوں کو عموماً ناز ہے کہ اقتصادیات پر عام طور سے اور شرح تبادلہ (ایکسچینج) پر خصوصیت کے ساتھ سید حسین امام صاحب کی رائے کا وہی احترام کیا جاتا ہے جو صرف ماہرین علم کے لئے مخصوص ہے۔ تقریباً دس سال سے آپ ایوان مملکت (کونسل آف اسٹیٹ) میں تمام صوبۂ بہار کی طرف سے نمایندگی فرما رہے ہیں۔ کم از کم بہار کے نمایندوں میں سے کسی نے ایوان اعلےٰ میں اپنی نمایندگی سے بہار کو یہ سربلندی نہیں بخشی تھی جو آنریبل موصوف کی ذات سے حاصل ہوئی ہے۔

گیا کے شہرہ آفاق نیک نام وکیل مولوی سید مظہر امام صاحب مغفور صورت و سیرت میں اپنی نظیر آپ تھے۔ حضرت سید شاہ محسن صاحب قدس سرہٗ سے آپ کا سلسلہ جدی ملتا ہے۔ اور خانوادہ مودودی کے چشم و چراغ حضرت خواجہ عبداللہ چشتی بن خواجہ اسد اللہ چشتی شیر ملک صفح نشین ہیکر ی سے آپ کا مادری سلسلہ ہے۔ جناب وکیل صاحب کے ہمعصر خان بہادر میر ابوصالح صاحب تھے۔ جن کا جدی شجرہ حضرت سیدنا حسین خداقدس سرہٗ پر منتہی ہے۔ اور مادری شجرہ حضرت سید تاج العارفین القادری الجھری پر تمام ہوتا ہے۔ میر صاحب مرحوم دولت کے اعتبار سے "بے ملک کے راجہ" کہے جاتے تھے۔ مولوی صاحب مذکور الصدر کے صاحبزادے حاجی سید علی امام صاحب بیرسٹر ایٹ لا مرحوم کی شادی میر صاحب موصوف کی صاحبزادی صاحبہ سے ہوئی جو بفضلہٖ بقید حیات ہیں اور زہد و ورع عبادت و ریاضت میں رابعہ بصری کے نقش قدم پر ہیں۔ اس قرآن السعدین کے ثمر دو ہمیں ہمارے آنریبل موصوف ہیں۔ جو ۲۲ فروری ۱۸۹۳ء مطابق بستم رمضان المبارک ۱۳۱۰ھ کو پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ابتدائی کتب میں ناظرہ قرآن شریف، اردو۔ فارسی۔ پڑھنے کے بعد جناب سید امیر حیدر صاحب سے انگریزی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ کچھ دن مولانا عبدالوہاب منطقی سربہدوی کے جو امرتسر شاگرد مولانا توقیر الحسن صاحب سے اسباق پڑھے۔ مگر عربی علوم کی تحصیل زیادہ تر مولانا خیر الدین صاحب قبلہ سے کی۔ چند ماہ علی گڈھ کالج کے اسکول میں اور چند ہی ماہ گیا ضلع اسکول کے رجسٹر میں آپ کا نام درج رہا۔ علی گڈھ کا سلسلہ تو آپ کی یتیمی نے درہم برہم کر دیا جب کہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۱ء کو چھتیس سال کی عمر میں آپ کے حضرت قبلہ گاہی نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ کے قریب ترین عصبہ آپکے عم گرامی خان بہادر ڈاکٹر سید حسن صاحب آپ کے سرپرست و کفیل ہوئے اور اپنے ساتھ رکھنے لگے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب گورنمنٹ کے ملازم اور بارڈ ضلع پٹنہ کے میڈیکل آفیسر تھے لہذا بارڈ کے بلی ہائی انگلش اسکول میں قریب ڈھائی تین سال سلسلہ درس و تدریس جاری رہا۔ تا آنکہ مارچ ۱۹۱۳ء میں بمعیت عم بزرگوار آپ لندن تشریف لے گئے۔ وہاں آپ نے اپنی غیر معمولی صلاحیت کا پہلا ثبوت دیا یعنی لنڈن میٹرک پاس کر لیا۔ حالانکہ ہندوستان میں آپ نے محض سکنڈ کلاس تک تعلیم پائی تھی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ لندن میٹرک اس زمانہ کے نصاب تعلیم کے اعتبار سے یہاں کے بی اے کے برابر تھا۔ اس کامیابی کے بعد آپ نے سٹی اینڈ گلڈس کالج میں انجینیرنگ کی تعلیم کی تحصیل شروع کی مگر گذشتہ جنگ عظیم نے اس نصاب کو بھی پورا نہ ہونے دیا۔ ۱۹۱۵ء میں آپ واپس طلب کر لیے گئے۔ یہاں آپنے بھاگلپور کے سیپور انجینیرنگ کالج میں علم فلاحت حاصل کرنا چاہا۔ مگر پھر ہوڑہ کے قریب سیپور کالج میں آپ نے داخلہ لیا۔ ۱۹۱۶ء میں آپ کی شادی آپکے صاحب حشتام ماموں جان جناب سید نظر نواب صاحب مرحوم کی دختر خرد سے ہوگئی اور سلسلہ درسیات منقطع ہو گیا۔

جس زمانے میں آپ لندن میں تھے اُس زمانے میں خواجہ کمال الدین صاحب، مولانا ظفر علی خانصاحب، مسٹر شعیب قریشی وغیرہ بھی وہیں تھے جن سے آپ کا خلا ملا رہتا تھا۔ چونکہ آپ کے عم گرامی اپنے تکملہ کے تحت مجبور تھے کہ اسکاٹلینڈ اور آیرلینڈ میں قیام فرمائیں۔ موصوف پہلے مسلمان تھے جو فیلو آف دی رائل فیکلٹیز آف فزیشینز اینڈ سرجنس (Fellow of the Royal Faculties of the Physicians and Surgeons) منتخب ہوئے۔

کی سند لیکر ہندوستان واپس آئے تھے۔ اس کے علاوہ لندن سے ڈی۔پی۔ایچ کی سند بھی لی تھی۔ افسوس ہے کہ آپ کے ان اعلیٰ اسناد کا کما حقہ لحاظ نہ کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ کی ملازمت میں ڈاکٹر صاحب آخر تک اسسٹنٹ سرجن ہی رہے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب انتہائی نیک خو اور نام و نمود سے کوسوں بیزار طبیعت رکھتے تھے۔ اسلئے لازمی تھا کہ حق تلفیوں کی طرف سے چشم پوشی فرماتے رہتے۔ حسین امام صاحب کو اگر بروقت رکنیت ایوان مملکت کی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس نہ ہو جاتا تو خطرہ تھا کہ اپنے عم بزرگوار کے فیض صحبت کی زندہ یادگار ہو کر رہ جاتے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ عظیم کے بعد ہوم رول۔ خلافت۔ عدم تعاون وغیرہ سیاسی تحریکوں کا دور یکے بعد دیگرے پورے ہیجان سے آتا ہے، سر اٹھاتا ہے۔ اور پھر دب دبا کر رہ جاتا ہے۔ مگر حسین امام صاحب کہیں عملی حصہ لیتے نظر نہیں آتے۔ وہ ہیں اور ان کے خانگی معاملات۔ خاص اعزا و احباب کا بس ایک بے تکلف حلقہ۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے کانسل آف اسٹیٹ کے ممبر منتخب ہو جانے کے بعد ان کو بہت زیادہ قریب سے دیکھنے والے بھی مطمئن نہ تھے کہ ایوان مملکت میں وہ کسی خاص صلاحیت کا ثبوت دے سکیں گے۔ مگر یہ کیا معلوم تھا کہ آپ کو آپ کے بے تکلف اعزا و احباب کا مزاحاً "سیٹھ جی" کہنا، اور اپنے ہم درسوں میں آپ کا علم الحساب میں "اچھا" سمجھا جانا، ایک دن ان سے غیر معمولی قومی خدمات کے ادا ہو جانے کا ایک ذریعہ بن جائے گا۔ اقتصادی معاملات پر ایوان مملکت سے جب آپ کی کوئی آواز بلند ہوئی۔ لب کشائی کا حق رکھنے والوں نے تحسین و آفریں کی۔ وزرا و مندوبین نے اس میں گلا ملایا، اس وقت اعزا و اقربا کو معلوم ہوا کہ "چہ می ارزد و چوں داشتہ"۔

عام طور سے ابھی اس کا احساس نہیں ہوا ہے کہ بہار کے اس لائق فرزند نے کیا اور کیسی خدمتیں انجام دی ہیں۔ اس میں صرف پبلک کا قصور نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اصلی جوابدہی ملک کی نشر و اشاعت کی ایجنسیوں کے سر بھی ہے۔ جب تک حسین امام صاحب ہندو اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ جماعت پروگریسیو پارٹی (Progressive Party) کے صدر نامزد کی حیثیت سے کام کرتے رہے اکثر آپ کی موعظت الاکرا تقریریں اور نجف مباحثے مدح و ثنا کے ساتھ اخبارات کے کالموں میں نظر افروز ہوا کرتے تھے۔ لیکن مسلم لیگ پارٹی کی قیادت جب سے آپ سے متعلق ہوئی ہے۔ کچھ جمود سا نظر آنے لگا ہے۔ حاشا اس کا تعلق حسین امام صاحب کی بے عملی سے نہیں ہو سکتا۔ نہ مسلم لیگ کے ارباب حل و عقد کی یہ کوئی دانستہ حرکت ہو سکتی ہے بلکہ اس کی وجہ آپ کو قوم کی عام بے مائگی میں تلاش کرنی ہوگی۔ خصوصاً ذرائع نشر و تبلیغ کی تکلف وہ حد تک شدید کمی کا کوئی مداوا ہی نہیں معلوم ہوتا بے موقع نہ ہوگا اگر ایک پر لطف انقلاب کا تذکرہ کر دیا جائے۔ کبھی تو یہ تھا کہ ٹریزری بنچیس (گورنمنٹ حلقہ) سے حسین امام صاحب کی گفتگو کے نہ سمجھ پانے کا اعلان ہوتا تھا۔ مگر اب پنڈت ہردے ناتھ کنزرو جی بھی کبھی کبھی ہی نعرہ لگاتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا! ایوان مملکت کے اندر اور باہر ہمارے آنریبل ممدوح جس عزت کے ساتھ لئے جاتے ہیں۔ وہ بہار کے نوجوانوں کے لئے شگون نیک اور بڑوں کے لئے سامان تبریک ہے۔ "ذی فہم" کی محدود گنجائش اجازت نہیں دیتیں کہ حسین امام صاحب کے سرمایہ فخر و مباہات کے کارنامے دہرائے جائیں۔ بے لاگ اور نڈر نمایندگی بہار کی اگر کسی نے کی ہے تو وہ حسین امام ہی ہیں۔ مسلم کانفرنس کی کامیابی بڑی حد تک آپ کی دست نگر تھی، اور مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ میں آپکی مسیحائی کارفرما تھی۔

آنریبل حسین امام صاحب کو تعلیمی معاملات سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ دہلی یونیورسٹی کورٹ کے آپ ممتاز ممبر تھے۔ آپ بالطبع از حد غیور واقع ہوئے ہیں۔ عام روش کے طریق پر موقت الشیوع اکابر کی بیجا خوشامد کے ذریعہ آپ حصول اعزاز کو منافی غیرت سمجھتے ہیں۔ خود سے اپنے کو پیش کرنے کی ضرورت کے آپ کبھی قائل نہ رہے۔ خود ستائی اور جرگہ بندی کی خدا نے آپ کو صلاحیت ہی نہیں بخشی ہے۔ رخ دیکھ کر بات کرنا آپکو آتا ہی نہیں ہے۔ چونکہ فی زمانہ یہی ذرایع بیباک طور سے استعمال کر کے مناصب جلیلہ تک پہونچنے کے ہیں۔ اس لئے حسین امام صاحب بہت سے ایسے منصبوں سے محروم ہیں۔ جو ان ہی کے لئے مخصوص ہونا چاہئے تھے۔ ہر چند وہ ان سے بے نیاز سہی مگر حق ناشناسی اہل بصیرت کا جو ہر نہیں ہو سکتا۔ عام اس سے کہ اس کا تعلق ارباب حکومت سے ہو یا ملک و ملت سے۔ اسی طرح کونسل آف اسٹیٹ میں وقتاً فوقتاً آپ نے جو خدمات انجام دیں۔ ان کا ایک مختصر خاکہ حسب ذیل ہے۔ :-

(۱) صوبۂ بہار و اڑیسہ کی علیحدگی سے چھوٹا صوبہ رہ گیا ہے۔ اس کی توسیع کے لئے آپنے آواز بلند کی مگر نا کامی صرف اس وجہ سے ہوئی کہ اس کی تائید کافی نہ ملی۔

(۲) مسلمانوں کو ریلوے میں کافی ملازمتیں ملنے کے واسطے آپ نے انتہائی جدوجہد کی اور ایک وفد کے شامل سر جارج رینی ہرز اکسلینسی وائسرائے کے یہاں گئے۔ جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو ۲۵ فیصدی ریلوے میں ملازمتیں مل رہی ہیں۔

(۳) آئے دن اخراجات کی زیادتی ہی اضافۂ ٹیکس کا باعث ہوتی ہے تخفیف اخراجات کے لئے پرزور سفارش کی اور اس کے کمیٹی کی تجویز پیش کی اور خود بھی کمیٹی میں شامل رہکر دس کروڑ روپیہ سالانہ اخراجات کی کمی کے باعث ہوئے۔

(۴) اخراجات افواج کی کمی پر زبردست بحث کی۔ اور اس کا دعویٰ پیش کیا کہ انگریزی حکومت ہندوستان کو بطور اعانت اس مد میں سالانہ ملنا چاہیے۔ چنانچہ کچھ دنوں بعد حکومت برطانیہ نے دو کروڑ سالانہ دینا منظور کیا۔ گویا ہندوستان کو اس طرح پر دو کروڑ سالانہ اخراجات سے بچانے کے باعث ہوئے۔

(۵) بزمانہ بجٹ آپ نے زور دیا کہ SINKING FUND کی رقم بجائے ۶ کروڑ ڈھائی کروڑ کر دیجائے۔ اگرچہ سرکاری ممبر نے اس وقت نامنظور کیا، مگر ۱۹۳۳ء کے شروع سے یہ خرچ صرف ۳ کروڑ کر دیا گیا۔

(۶) بزمانۂ بیشی بجٹ آپ نے اس امر پر بھی زور دیا تھا کہ انگلش قرضۂ جنگ کا سود تعدادی ۸۶ لاکھ بدر کر دیا جائے۔ اگرچہ سرکاری ممبر نے اُس وقت جواب دیتے ہوئے نامنظور کیا تھا۔ مگر بعد میں بجٹ سے یہ رقم بدر کر دی گئی ہے۔

(۷) حادثۂ کراچی پر آپ نے بہت زبردست احتجاجی تقریریں کیں۔ اور حکومت سے تحقیقاتی کمیشن کا مطالبہ کیا۔

(۸) کلکتہ ہائیکورٹ میں ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۷ء تک مسلسل صرف ایک ہی مسلم جج ہوتا رہا۔ اس کے متعلق آپ نے چند بار حکومت سے احتجاج کیا۔ اور اپنے احباب سے بھی اس کے متعلق سوالات کرائے۔ جس کا نتیجہ اس وقت ظاہر ہے کہ اب وہاں دو مسلم جج ہیں۔

(۹) گذشتہ اجلاس کونسل میں آپ نے ایک پرزور تقریر اس مسئلہ پر فرمائی کہ مسلمانوں کی تقرری کے متعلق جو اعلان گورنمنٹ کا ہوا ہے اس میں بہت سی خامیاں باقی رہ گئی ہیں۔ جس کے سبب تناسب ملازمت پر برُا اثر پڑ رہا ہے۔ جس کے متعلق گورنمنٹ نے تحقیقات کا وعدہ کیا ہے۔

مندرجہ بالا روئداد کے مطالعہ سے یہ حقیقت صاف ظاہر ہے کہ جب جب موقع ملا، آپ نے ملک و ملت کی خدمت کے لئے نہایت پرخلوص طریقہ پر کام کیا۔ میں اس نتیجہ پر تنہا نہیں پہنچا ہوں بلکہ طول و عرض ہند سے ملوقات مختلفہ بطور اعتراف خدمات قابل رشک اعزاز اخوان ملت نے بخشش کرایا قدردانی کا ثبوت دیا ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے:۔

(۱) اپریل ۱۹۳۳ء میں یوپی مسلم کانفرنس منعقدہ فرخ آباد کی صدارت کے لئے مسلمانان یو۔پی نے آپ ہی کو اپنے اعتماد کا اعزاز بخشا۔

(۲) ۱۹۳۴ء میں مسلم کانفرنس نے سر آغا خاں کو ہیئت ترکیبی درست کرنے کے واسطے حَکَم مقرر کیا تو مسٹر حسین امام جب کو نظامت کا عہدہ دیکر ان کی خدمات ملی کا اعتراف کیا گیا۔

(۳) اکتوبر ۱۹۳۴ء میں مسلمانان آسام نے اپنے سالانہ اجلاس کی صدارت کے واسطے منتخب کیا اور طلب کیا۔ مگر بسبب علالت طبع آپ کو شرکت کا موقع نہ ملا۔ صرف خطبۂ صدارت وہاں پڑھا گیا۔

(۴) اپریل ۱۹۳۵ء میں پورنیہ ضلع مسلم کانفرنس جس کا افتتاح آنریبل وزیر تعلیمات نے اپنے ہاتھوں انجام دیا تھا اُس کی صدارت کا اہم فریضہ مسٹر حسین امام سے متعلق رہی۔

(۵) ۱۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو سالانہ اجلاس مسلم ریلوے ملازمین لاہور کی صدارت کے لئے مسٹر حسین امام ہی کو دعوت دی گئی اور آپ ایک سال تک من حیث صدر اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔

(۶) ۲۳ مئی ۱۹۳۶ء کو مسٹر حسین امام مو بلا بھائیوں کی دعوت پر اُن کے سالانہ سیاسی اجتماع کی صدارت کیلئے (CANNA NORE) جیسے دُور افتادہ مقام تشریف لیگئے۔

(۷) یکم اکتوبر ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے سالانہ جلسہ منعقدہ پٹنہ کی صدارت فرما کر طلبہ کی رہنمائی فرمائی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اپنی خدمات کی بدولت نہ صرف بہار میں بلکہ سارے ہندوستان میں مقبول و ہر دلعزیز ہیں۔ اور آپ کی خدمات کا ہر گوشہ ملک سے اعتراف

ریزرو بنک کمیٹی Reserve Bank committee میں کونسل آف اسٹیٹ کی نمایندگی کے لئے نگاہ انتخاب آپ ہی کی طرف اٹھی تھی۔ سنہ ۱۹۳۴ء کے اکتوبر میں آسام مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا انعقاد بمقام جورہاٹ ہوا تھا، اس کی صدارت حسین امام صاحب سے متعلق رہی۔ گرچہ آپ شدید علالت فرزند اصغر کی سبب شرکت نہ فرما سکے، مگر خطبۂ صدارت آپ ہی کا پڑھا گیا۔ اس خطبہ صدارت سے ذیل کا انتخاب دلچسپی سے دیکھا جائے گا۔ :-

"ہندوستان میں ایک قومیت کا تخیل کا ساتھ میں نہیں دے سکتا۔ آپ کی اجازت سے میں مدعی ہوں کہ ہندوستان میں مقاصد کا تنوع۔ آبادی کا تباین۔ جغرافیائی امتیازات اور معاشرتی اختلافات نے ایک مخصوص عقدہ لاینحل کی صورت اختیار کرلی ہے۔ تلازمہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان خود ہی ایک چھوٹی سی دنیا ہے۔ جب تک اس کے متعلقہ معاملات بین الاقوامی ذہنیت سے نہ دیکھے جائیں گے، کسی خوشگوار اور مستقل نتیجہ کی امید مجھے نہیں ہے۔ ہندوستان میں بسنے والی اور آپس میں شدید اختلاف رکھنے والی قوموں کے پیش کردہ علحدہ علحدہ مطالبے قلوب سے زیادہ دستی تبدیلی چاہتے ہیں۔ حالانکہ اس وقت تک زور صرف دل کی صفائی پر دیا جاتا رہا ہے۔ ہندوستان میں اتحاد قایم ہوسکتا ہے، مگر متحدہ قومیت اور ہندوستان خلط مبحث کے سوا اور کچھ نہیں۔"

مارچ سن رواں میں پاکستانی تخنیل لیگ نے پیش کیا۔ لیکن کئی برس قبل ہی حسین امام صاحب کی اقتدا کی جاسکتی تھی۔ اگر قوم واقعی پاکستان کی ضرورت سمجھتی۔

ہمیں اپنے صوبہ کے اس جلیل القدر رہنما سے امید ہے کہ وہ مستقبل میں ہماری ٹھوس رہنمائی کا صحیح حق ادا کرے گا۔ خداوند تعالیٰ ان کی خدمات میں حسن نیت برقرار رکھے۔ اور ان کے حسن عمل سے اس صوبہ کو بیش از بیش فوائد حاصل ہوں۔

رباعیات مبارک

از ناخدا رسخن حضرت مبارک عظیم آبادی

ہو نکہت گل تو اسکو خوشبو کہئے — صورت اگر پری تو خوشرو کہئے
جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا صاحب — اردو ہے مبارک اسکو اردو کہئے

کام اردو میں اردو کی زباں سے لیجئے — جنس اردو کی اردو کی دکاں سے لیجئے
جب دے نہ سکے آپ کو اردو بازار — آگے بڑھئے یہاں وہاں سے لیجئے

رباعیات حمید

از حضرت حمید عظیم آبادی

دنیا کے لئے دیں کی تباہی کیسی؟ — اور نفس لعیں کی خیر خواہی کیسی؟
توبہ کر واعظ بھی تو گناہوں سے حمید — اس ریش سفید پر سیاہی کیسی؟

بن بن کے لہو اشک بہا جاتا ہے — پانی یہ کلیجا بھی ہوا جاتا ہے
کیا جانے کہ کیا انکی نظر میں ہے اثر — اس پر بھی یہ دل ہے کہ کھچا جاتا ہے

اے دشمن دیں سیاہ کاری کب تک؟ — کمبخت تری گناہگاری کب تک؟
ہو کر بھی مسلماں نہ خدا سے ڈرنا — اے تیرہ دروں تو بوں کی یاری کب تک؟

ہیرالال بین جی

ہیرالال بین جی کی شخصیت ایک باکمال مصور کی حیثیت سے محتاجِ تعارف نہیں۔ متعدد آل انڈیا نمائشوں میں آپ طلائی و نقرئی تمغے حاصل کر چکے ہیں۔ اور آپ کی تصویریں خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ بنارس۔ پٹنہ۔ گیا۔ بھاگل پور۔ کلکتہ وغیرہ کی نمائشوں میں کئی بار آپ کی تصویریں کامیاب رہیں اور متعدد اور سرٹیفکیٹوں سے آپ کے کمالِ فن کی داد دی گئی۔ گذشتہ سال بھی پٹنہ کی پروونشل اگزیبیشن میں آپ کی تصویر "ستار نواز" پر ایک طلائی تمغہ ملا تھا۔ کلکتہ کی انڈین سوسائٹی آف اورینٹل آرٹ کی سالانہ نمائشوں میں آپ کی تصاویر اکثر جایا کرتی ہیں۔ انجمن مذکور کے بانی اور قدیم ہندوستانی آرٹ کو حیاتِ نو بخشنے والے ڈاکٹر براے۔ این گوپر آپ کے کمالِ فن کے معترف ہیں اور بزرگانہ شفقت کی نظر رکھتے ہیں۔ مسٹر پرسی براؤن سوپرنٹنڈنٹ وکٹوریا میموریل اور سابق پرنسپل گورنمنٹ آرٹس سکول کلکتہ کے ایسے نقاد فن نے آپ کی تصویروں کو ہندوستانی آرٹ کا نمونہ قرار دیا ہے۔ آپکے ہمعصر مشہور ہندوستانی مصورین جناب محمد عبدالرحمٰن صاحب چغتائی وغیرہ آپ کے کمالِ فن کے معترف ہیں۔

اردو داں حضرات آپکے نام اور کمالات سے کم واقف ہیں کیونکہ زیادہ تر آپ کی تصاویر ہندی اور بنگلہ کے پرچوں میں شایع ہوتی رہی ہیں۔ اردو کے رسایل میں تصاویر شایع ہونے کا بہت کم اتفاق ہوا۔ ایک دو مواقع پر تصویریں جو دی بھی گئیں تو اس کے تجربے کچھ اچھے نہیں ثابت ہوئے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بند کر دینا پڑا۔ رسالہ ندیم گیا۔ کے بہار نمبر سنہ ۱۹۳۵ء میں آپکی دو تصویریں شایع ہوئی تھیں اور انشاء اللہ اب یہ سلسلہ جاری ہی رہے گا۔

ہندی کے ماہناموں میں آپ کی تصاویر برابر شایع ہوتی رہی ہیں۔ شری شاردا۔ سرسوتی۔ مادھری۔ سدھا کے ایسے مقتدر پرچوں میں بیسیوں تصاویر شایع ہو کر ہندی داں پبلک سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ رسالہ مادھری۔ جو نول کشور پریس لکھنؤ کا خاص جریدہ ہے۔ تو آپ کی تصاویر کے لئے وقف سا ہو گیا تھا۔ نول کشور پریس ہی نے مشہور ڈراما "خان جہاں لودی" کو جب اصرار سے آپ سے مصور بھی کرایا تھا ——— بنگالی رسایل، نسی۔ بھارتی۔ پروا سی۔ بھارت ورش وغیرہ میں بھی آپ کی تصاویر شایع ہوتی ہی ہیں۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے آپ کی تصویروں کی اشاعت کا سلسلہ بند ہے۔ جسکی وجہ یہ کہ ادھر آپ کلام حافظ کو مصور کرنے میں مشغول ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی دوسری مصروفیتیں بھی بہت بڑھ گئی ہیں۔ اس سے بھی اس شغلِ لطیف کی طرف زیادہ توجہ صرف کرنے کا توقع نہیں ہے۔ پھر بھی شاعرِ حافظ پر مصوری کے کچھ نمونے نکال ہی لیتے ہیں۔ پانچ سال سے زیادہ سے یہ سلسلہ جاری ہے لیکن ابھی بیس بائیس اشعار سے زیادہ مصور نہیں ہو سکے ہیں۔ قدر دانانِ فن ہی کچھ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کس جگر کاوی اور دماغ سوزی سے تصویریں بنایا کرتے ہیں۔

حسنِ فنونِ لطیفہ کی طرح مصوری بھی اکتسابی فن نہیں ہے اکتساب اور ریاض سے فن میں پختگی اور استادی تو بے شک آ جاتی ہے لیکن فطری ذوق خداداد نعمت ہوتا ہے جو حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ آپکو بھی تصویروں سے شغف بچپن ہی سے تھا۔ گھر کے کتب خانے میں بہت سی علمی مصور کتابیں تھیں جو آپ نے نیز قدیم استادوں کے شاہکار کثرت سے تھے انہیں کو دیکھ دیکھ کے آپ کا شوق بڑھتا گیا اور انہیں کو نمونہ رکھ کر آپ مشق بھی کرتے رہے۔ اتفاقاً اسی زمانہ میں ہمارے صوبہ کے مایہ ناز مشہور مصور بابو ایشوری پرشاد ورما سابق معلم گورنمنٹ آرٹس اسکول کلکتہ والد صاحب سے ملے۔ آپ کے والد صاحب نے ان کے بڑھتے ہوئے شوق کو دیکھ کر ورما جی کو تصویر کشی کی تعلیم دینے کے لئے اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ چار ہی پانچ مہینے کے بعد بین جی کو انٹرنس کا امتحان دینے کے لئے کلکتہ جانا پڑا۔ بابو ایشوری پرشاد بھی آپ کی نگرانی کے لئے آپ کے ساتھ کلکتہ بھیجے گئے۔ اور استاد کی نظرِ توجہ اپنے عزیز شاگرد پر قائم رہی۔ کلکتہ کے اسی سلسلہ قیام میں بابو ایشوری

لہ نسل لیم موصوف کا تذکرہ جناب رادھا موہن صاحب کے مضمون "فن مصوری میں پٹنہ قلم" میں تفصیل سے گذرا ہے۔

پر شاد وہاں کے آرٹس اسکول سے وابستہ ہوئے اور بمن جی اپنی مزید تعلیم کے حصول میں مصروف ہو گئے - اس کے بعد پھر آپ نے کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا - صرف آپ کا ذوق سلیم اور استادوں کے شاہکار آپکی رہنمائی کرتے رہے -

مصوری کے علاوہ آپ کو مطالعہ کتب کا بھی بہت شوق ہے اور کثرت مطالعہ کی وجہ سے متعدد علوم پر عالمانہ دست رس رکھتے ہیں - تاریخ و فلسفہ میں آپکے معلومات بہت وسیع ہیں - اور چونکہ متعدد زبانوں پر عبور کلی حاصل ہے - علوم کے COMPARITIVE STUDY پر آپ اچھی طرح قادر ہیں -

ادب سے بھی آپ کو بہت شغف ہے - فارسی - سنسکرت - انگریزی - اردو - ہندی اور بنگلہ کے لٹریچر کا آپ نے بغایر مطالعہ کیا ہے - فارسی اور سنسکرت تو بی - اے میں آپ کے اختیاری مضامین رہ چکے ہیں -

ابتدائی تعلیم اپنے گھر ہی پر حاصل کی تھی - انٹرنس میں داخلہ کلکتہ کے ڈنکن کلیجیٹ اسکول میں کرایا - اف - اے سینٹ زیویرس کالج سے پاس کیا - اور بی - اے کے لئے پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں داخلہ کرایا تھا لیکن آخری سال کچھ ایسے حادثات پیش آگئے اور برادرانِ یوسف کی طرح عزیزوں نے اس طرح خانماں برباد کیا کہ بی - اے کا امتحان بھی نہیں دے سکے -

آپ کی پیدائش سنہ ۱۸۸۵ء میں ضلع شاہ آباد کی ایک ریاست سورجپورہ میں ہوئی تھی - ہوا ضلع گیا (بہار) میں آپکی شادی ہوئی اور اپنے والد کے انتقال کے بعد یہیں سکونت پذیر ہو گئے آپ کی جو لاکھوں لاکھ کی مالیت کی جائداد تھی وہ شریکوں ہی میں رشتہ داروں کے بغض و حسد اور مقدمہ بازی کی نذر ہو گئی افسوسناک گذرا وقات کا وسیلہ مہوا ریاست کی پنشن ہے - ریاست مذکور کا انتظام (منیجری) بھی ادھر چند سال سے آپ ہی کے ہاتھوں میں چلا آیا ہے -

انکی مصوری کے متعلق آخیر میں یہ عرض کر دینا ہے کہ بمن جی کی مصوری کا کوئی مخصوص طرز نہیں ہے اور نہ آپ کسی خاص تعلم کے پیرو ہیں - آپ کو جس طرح قدیم ہندوستانی مصوری پر قدرت حاصل ہے ہیں تحتی شہادت انکی مندرجۂ ذیل عنوان کی تصاویر دے رہی ہیں -

نمائندہ خیال - انتظار - انگڑائی - ستار نواز وغیرہ وغیرہ - ایرانی قلم پر آپکو جو قدرت حاصل ہے اسکی شاہد وہ تصاویر ہیں جو کلام حافظ پر بنائی جا رہی ہیں - اگرچہ ان پر بھی یورپین اثر بہت نمایاں ہے - آپکی تصاویر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے خط و خال سے جذبات و واردات نمایاں ہوتے ہیں - اور عموماً آپ نقاط سے سایہ پیدا کرتے ہیں - غالباً یہ خوبی آپکی مصوری کی امتیازی شان ہے جس کا بتاتا بعض ممتاز اور نامی گرامی مصورین ہند تک سے نہ ہو سکا اور اس حیثیت سے پورے ہندوستان میں آپکی انفرادیت قائم ہے - کبھی موقع ہوا تو آپکے فن کے کمالات پر فنی حیثیت سے ان صفحوں میں تفصیلی نظر ڈالی جائے گی -

---

۱ ندیم یا نمبر ۱۹۲۵ء میں شائع ہو چکی ہے ۲ ندیم یہ تصویریں دفتر ندیم میں آگئی ہیں - چند اس نمبر میں شائع ہو رہی ہیں - اور بعض آئندہ شائع ہونگی
۳ ندیم اس سلسلہ کی چند تصویریں بھی دفتر ندیم میں آگئی ہیں - بعض اس نمبر میں چھپ رہی ہیں - بعض آئندہ شائع ہونگی -

رباعیات توحید

از حضرت توحید عظیم آبادی

تکمیل صفات کی نظر پیدا کر — انسان بن اوصاف بشر پیدا کر
اشرف کے لقب کی لاج رکھ لے توحید — آنکھوں میں جگہ دلوں میں گھر پیدا کر

گلزار ارم مجکو ہے صحرائے الم — اے جام سرور اپنے لئے ساغر غم
حسرت ہمہ دم کرتی ہے ماتم میرا — کرتا ہوں تمنا کا میں ہر دم ماتم

تو موسم گل! وفا شناس کہاں — بیگانہ! تجھے چمن کا ہے پاس کہاں
گلہائے خزاں دیدہ کی فریاد ہے یہ — وہ رنگ کہاں ہم میں وہ بو باس کہاں

یاد رفتگاں :-

میت کی پریت

از جناب سید حسن امام صاحب رکن ادارہ شعبۂ منقولات رسالہ ندیم گیا

(۱)

سلطان الہند غریب نواز قدس سرہٗ کی درگاہ کی زیارت کے لئے اجمیر شریف جانے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا شخص نکلے جو تارا گڈھ کے گنج شہیدان اور امیر الشہدا سید حسن خنگ سوار قدس سرہٗ کی آستانہ بوسی سے مشرف نہ ہوا ہو مگر ان زائرین میں کتنے ہیں جو اس بات کو جانتے ہیں کہ حضرت خنگ سوار کے برادر حقیقی موضع بیورہ (ضلع پٹنہ) میں آسودہ ہیں۔ جن کی اولاد احترام وصیت کی وجہ سے خود حضرت خنگ سوار سے انتساب رکھتی ہے۔ میر فرزند علی صاحب رئیس بیورہ ان ہی سلف صالحین کی یادگار تھے۔ آپ کے تین صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تھیں۔ بڑے صاحبزادے سید فخر الدین صاحب تھے جن کی دو صاحبزادیاں سید علی امام و مسٹر حسن امام صاحبان کے حبالۂ عقد میں آئیں منجھلے صاحبزادے خان بہادر مولوی نصیر الدین صاحب سی ایس سی۔ ای نصیر المہام بھوپال تھے۔ اور چھوٹے صاحبزادے آنریبل مسٹر جسٹس سید شرف الدین صاحب بیرسٹر ایٹ لا و ممبر اگزیکٹیو کونسل بہار و اڑیسہ تھے۔ میر فرزند علی صاحب کی بڑی صاحبزادی نواب شمس العلماء مولوی سید امداد امام صاحب بالقابہم کی شریک زندگی تھیں جن کے بطن سے فخر بہار سر علی امام و مسٹر حسن امام صاحبان پیدا ہوئے۔ میر فرزند علی کی چھوٹی صاحبزادی خان بہادر مولوی سید ظہیر الدین صاحب بیورہ کے عقد میں آئیں جن کے دو صاحبزادے مولوی نذیر الدین صاحب پنشنر ڈپٹی مجسٹریٹ اور مسٹر بشیر الدین صاحب بیرسٹر ڈسٹرکٹ جج ہیں۔ خان بہادر ظہیر الدین صاحب پٹنہ ڈسٹرکٹ بورڈ کی وائس چیرمینی پر بہت عرصہ تک فائز رہی جس طرح شہر گیا میں پروفیسر اے۔ بی حلیم صاحب نے پروفیسر نگوار مسٹر عبد الحلیم صاحب بیرسٹر مرحوم تھے۔ خان بہادر صاحب کے بڑے داماد مولوی سید زین الدین صاحب سابق پرنسپل لا کالج ہیں جن کے نہ معلوم کتنے شاگرد صوبہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پرنسپل صاحب کے نواسے مسٹر شہاب الدین رحمت اللہ آئی۔ سی۔ ایس۔ بنگال میں برسر کار ہیں۔ دوسرے داماد خان بہادر مسٹر ذکریا ہاشمی بیرسٹر ایٹ لا و معتمد مسلم لیگ کے پرجوش حامی ہیں۔

راقم الحروف نے ان تمام آدرانِ بیورہ میں سے اپنے ہمنام بزرگ کے حالات قلمبند کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ دیگر بزرگوں کا ذکر خیر بھی اس سلسلہ میں آجائے گا۔ مگر معلومات کی کمی کی وجہ سے تفصیلی حالات سب کے علیحدہ علیحدہ لکھنا ممکن نہیں ہوا۔ حضرت مخدوم الملک بہاری قدس سرہٗ کا مشہور مقولہ کہ "بہار میرا بہاری میرے نہیں" آج بھی اپنی صداقت کی داد لے رہا ہے۔ سر علی امام صاحب بالقابہم سچ تو یہ ہے کہ اس صوبہ کے خالق مجازی تھے جسٹس شرف الدین صوبہ بہار سے کانگریس کے پہلے مندوب (ڈیلیگیٹ) اور پہلے ہائیکورٹ جج تھے مگر کس قدر شرم کی بات ہے کہ یادگاریں تو رہیں ایک طرف آج باوجود تلاش کوئی ایسی تحریر بھی نہ مل سکی جس سے میں اپنی خواہش کے مطابق ان بزرگواروں کے سوانح حیات کی ترتیب دے سکوں۔ میرا اپنا تیار کردہ نوٹ جس میں علاوہ مذکورہ بالا معززین کے بابو نند کشور لعل صاحب مختار وکیل گیا۔ ان کے چھوٹے بھائی مسٹر رمیشور لعل صاحب بیرسٹر انجمانی۔ بابو رام پرشاد قنس وکیل گیا۔ مستر نور اللہ شاہ صاحب وحشت مرحوم وغیرہ کے متعلق ضروری معلومات تھے افسوس ہے کہ تبدیل جائے قیام کے سلسلہ میں نہ جانے کتابوں اور رسالوں کے کس انبار کے ساتھ ضائع کیا ہے۔ ورنہ مجھے اسکی مجبوری نہ ہوتی۔ کہ اور کہیں سے معلومات بہم پہنچایا کروں۔

نواب شمس العلماء مولوی سید امداد امام صاحب زیدی سادات کے خانوادہ سے تھے آپ کے والد ماجد خان بہادر مولانا وحید الدین

صاحب صدر اعلیٰ اپنی شان کے ایک ہی بزرگ تھے ۔ سادہ منش بے ہمہ و باہمہ ۔ مرنجاں مرنج ۔ اور باوجود یکہ اپنے عہدہ جدیدہ کے اعتبار سے اُس زمانے کی اقتضا یہی تھی ۔ کہ جس قدر بھی اپنا اعزاز تمکنت چاہتے ۔ ہو سکتا تھا مگر انکسار کا یہ عالم تھا کہ ملنے ملانے میں نہ تو کسی سے دبتے تھے نہ کسی کے سر چڑھتے تھے ۔ آپکو تو میں نے دیکھا نہیں تھا ۔ بزرگوں سے سنی سنائی آپ کے متعلق عرض کر رہا ہوں ۔ مگر نواب صاحب مغفور کو خوب اچھی طرح دیکھنے کا اتفاق ہوا ۔ کم از کم اس خصوص میں ممدوح الولد سہ لابیہ کی پوری شان رکھتے تھے ۔ اسے لوگ اب کا کو پیدا ہوں گے ؟ صدر اعلیٰ صاحب کے مزاج میں ظرافت بھی بہت تھی ۔ ایک دفعہ جب علی امام صاحب اور حسن امام صاحب کالج کین تھا ۔ کھیل کود میں جوتوں کا نٹ بال مورہا تھا کہ کسی کا جوتا پانی کے خم میں جا گرا ۔ بہار شریف کے رہنے والے ایک نیم سالک نیم مجذوب رقم کے بزرگ تھے جو اپنے کو "کلک صاحب" کہتے تھے ۔ ان سے صاحبزادوں نے طہارت خم کا مسئلہ دریافت کیا ۔ آپنے چائے کی پیالی سے ساٹھ یا تین سو ساٹھ پیالیاں پانی خم سے نکال دینے کی ہدایت فرمائی ۔ اس ہدایت پر عمل شروع ہی ہوا تھا کہ صدر اعلیٰ صاحب جو اس وقت گھر پر موجود نہ تھے تشریف لے آئے ۔ آپ بہت کم کسی پر خفا ہوا کرتے تھے ۔ مگر آپ کا اٹل حکم تھا کہ جو بات ہو بے کم و کاست گوش گذار کر دی جایا کرے ۔ چنانچہ اس موقعہ پر بھی دریافت کرنے پر واقعہ اپنی پوری تفصیل کے ساتھ کہہ سنایا گیا ۔ سنتے ہی آپ نے کلک صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ نے مسئلہ کی توجیہ غلط کی ۔ کنواں زمین کے نیچے ہوتا ہے نہ کہ اوپر ۔ لہٰذا اس خم کو دال کا پیالہ تصور کرنا چاہیئے ۔ جوتے کو مکھی فرض کیجئے جس طرح مکھی کو دوبارہ دال میں غوطہ دیا جاتا ہے ۔ کہتے ہوئے آپ نے بھیگے ہوئے جوتے کو اٹھا کر خم میں غوطہ دیکر نکالا اور فرمایا کہ لیجئے مسئلہ درست ہو گیا ۔ اس کے بعد خم کا سب پانی پھکوا دیا ۔ صدر اعلیٰ صاحب کے علمی تبحر ۔ قانونی وقوف اور روکاوٹ و ذہانت کے یہ کثرت واقعات ہیں ۔ صرف آپ کے متعلق صفحے کے صفحے سیاہ کئے جا سکتے ہیں ۔ پھر نواب صاحب کے متعلق لکھنا شروع کروں تو بقول نظیر نیشاپوری ؎

ز شرح قصہ ما رفتہ خواب از چشم خاصاں را
شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد

نواب صاحب نے آخر عمر میں ایک عقد ثانی کر لیا تھا ۔ اس بطن سے آپ کے کئی صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہوئی صاحبزادی کی شادی مولوی اسد رضا صاحب وکیل سے ہوئی ۔ بڑے اور منجھلے صاحبزادے حسین امام اور کاظم امام نواب صاحب کو داغ جدائی دے گئے ۔ اور انہی کے داغوں نے آپکے دل میں ناسور پیدا کر دیا جس کا اندمال بغیر موت نہ ہو سکا ۔[1] نواب صاحب کو گیا سے اتنا ہی انس تھا کہ یہیں توطن اختیار کر لیا اور یہیں کی خاک کے پیوند ہو گئے ۔ اپنی خرید کردہ کوٹھی واقع آنگلر میں اپنے لختہائے جگر کو پہلو میں لئے آسودہ ہیں ۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو اس جامع کمالات ہستی نے دار فانی سے کوچ کیا ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ ندیم بابت اکتوبر ۱۹۳۳ء میں رضا قاسم صاحب مختار نے نواب صاحب کے متعلق کچھ وضاحت سے لکھا ہے ۔ اس تحریر کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے ۔ صرف ایک غلطی اس تحریر میں ہے جس کی ذمہ داری کاتب کے سر ہے ۔ جسٹس شرف الدین صاحب کی خواہر محترمہ کے بطن سے نواب صاحب کی جو صاحبزادیاں تھیں وہ مولوی عبد المجید کے بجائے مولوی عبد لمجید صاحب نیوزہ کی زوجہ محترمہ تھیں ۔ حاجی عبد المجید صاحب آپ کے بڑے صاحبزادے ہیں ۔ مولوی عبد الرشید صاحب اور مسٹر حفیظ امام صاحب بیرسٹر ایٹ لا ہیں جو مظفر پور میں پریکٹس کرتے ہیں ۔ اس صدی کے ابتدائی سالوں تک مولوی عبد المجید صاحب گیا کے پبلک پروسیکیوٹر تھے ۔ آپ کا قیام اسی مکان میں تھا جو اب ڈاکٹر محمد وحید صاحب کا ہے ، مگر اُس وقت شاہ درگا ہی صاحب کا کہلاتا تھا ۔ حفیظ امام صاحب سے راقم الحروف کی ملاقات اسی زمانے سے ہے ۔

(۲)

ایماں بغیب تفرقہ ہا رفت از ضمیر ، ز اسما گرشتہ ایم و مسمّے نوشتہ ایم

سید حسن امام صاحب کی ولادت بمقام نیورہ ضلع پٹنہ ۳۱ اگست ۱۸۷۱ء کو ہوئی تھی ۔ آپ اپنے بھائی بہن میں سب سے چھوٹے تھے ۔ آپ کے بڑے بھائی نواب موئد الملک سید علی امام صاحب کے بیٹے ۔ ایس آئی ، بیرسٹر ایٹ لا ، لا ممبر گورنمنٹ آف انڈیا ۔ جج پٹنہ ہائیکورٹ ، ممبر ایکزیکٹو کونسل بہار و اڑیسہ و صدر اعظم حیدر آباد دکن کی پیدائش ۱۱ فروری ۱۸۶۹ء کو ہوئی تھی ۔

حسن امام صاحب کا ابتدائی زمانہ تعلیم گھر پر گذرا ۔ پھر آپ پٹنہ کالیجیٹ اسکول میں انٹرنس تک پہونچے تھے اور

---

[1] دو صاحبزادے عابد امام و صادق امام آپ کی یادگار ہیں خدا عمر دراز کرے اور نیکی یادگار ہونا نصیب کرے ۔

پاس نہ کرنے پائے تھے کہ ۱۸۸۹ء میں آپ کو ولایت بیرسٹری کے لئے روانہ کر دیا گیا۔ جہاں ستمبر ۱۸۸۹ء میں آپکے بڑے بھائی سید علی امام صاحب روانہ ہو چکے تھے۔ ولایت میں آپنے مڈل ٹمپل میں داخلہ کرایا۔ جہاں ہفتہ کے پانچ دن التزام کے ساتھ ۱۰ بجے صبح سے ۴ بجے شام تک آپ دیوانی قانون کا مطالعہ فرمایا کرتے اور راتوں کو اس زمانے کے استاد فن مسٹر جولین[1] ایوان امانویل[2] وان برلن سے مشق خطابت فرماتے تھے۔ مسٹر برلن نے یہ کمال اپنے دادا برلن[3] سے حاصل کیا تھا جو اس فن میں شہرۂ آفاق ایکٹر سر ہنری ارونگ[4] کے شاگرد تھے۔ ادبیات و زبادانی میں آپ کو ریورینڈ چارلس[5] کیرون بس سے فیض تلمذ کا موقع ملا تھا۔ مسٹر مظہر الحق مرحوم ستمبر ۱۸۸۸ء میں اور مسٹر سچتانند سنہا ۱۸۹۰ء کے فروری میں ولایت پہونچے تھے۔ حسن امام صاحب اور سنہا صاحب بہت زیادہ یکجا رہا کرتے تھے۔ لندن یونیورسٹی کالج کے مشہور تاریخ دان پروفیسر ہنری[6] کے لکچروں میں دونوں معمول کیساتھ ایک سال تک شرکت کرتے رہے۔ لندن میں پیڈنگٹن پارلیمنٹ[7] کے نام سے ایک مشہور ادارہ تھا۔ جس کے مباحثہ میں حسن امام صاحب بہت پیش پیش تھے۔ ان کی تقریریں دلچسپی کے ساتھ سنی جاتی تھیں اور اکثر جریدوں میں اعترافی مقالے اُن تقریروں پر شایع ہوتے تھے۔ حسن امام صاحب اس ہندوستانی سوسائٹی کے سکریٹری بھی تھے جس کی صدارت دادا بھائی نوروجی سے متعلق تھی۔ انجمن اسلامیہ لندن کی نظامت بھی حسن امام صاحبی کے لئے مخصوص تھی۔ چار مہینے آپ نے مسٹر ولیم ڈگبی کے پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے ان کے ہمراہ صوبہ ولیس کی سیر کی۔ حسن منزل کی لائبریری میں ڈگبی صاحب کی مولفہ کتابیں خود ان کی پیش کردہ ان کے دستخط سے مزین موجود تھیں۔ ۱۸۹۱ء میں دادا بھائی نوروجی پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے جب کھڑے ہوئے تو حسن امام صاحب کی مساعی جمیلہ بڑی حد تک ان کی کامیابی کا سبب ہوئی تھیں اس طرح کا زار جہات کے لئے مسلح ہو کر ۱۸۹۲ء میں حسن امام صاحب مراجعت فرمائے وطن ہوئے، اور پٹنہ میں اپنے پیشہ کا اجرا فرمایا۔

(۳) بیرسٹری و دیگر مشاغل

آپ فوجداری اور دیوانی دونوں کے مقدمات میں برابر کی کامیابی کے ساتھ کام کیا کرتے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں آپ پٹنہ سے کلکتہ چلے گئے۔ ہائیکورٹ میں پریکٹس کرنے لگے۔ ۱۹۱۱ء میں حسن امام صاحب علی گڈھ کالج کے ٹرسٹی منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۶ء تک آپ ہائیکورٹ کلکتہ کے جج رہے۔ اس کے بعد جب پٹنہ ہائیکورٹ، کلکتہ ہائیکورٹ سے جدا ہو کر مستقل طور پر کھلا تو آپ اس عہدۂ جلیلہ سے مستعفی ہو گئے کیونکہ سر چارلس بیلی گورنر بہار کو کسی طرح گوارا نہ ہوا کہ آپ پٹنہ میں ہائیکورٹ کے قایم ہو جانے کے بعد اپنی ملازمت کے اقرار کے سر ارباب کے، جب اس صوبہ میں بطور جج چلے آئیں۔ راقم الحروف کو ایک موقع یاد ہے جب سر چارلس کی زبان سے ان کا بعض لفظی معلوم کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ علی اور حسن امام صاحب سے خار کھاتے تھے۔ پٹنہ کے صوبہ کے صدر مقام قرار دئے جانے پر اس کے نئے نام کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی تو انہوں نے خاص انداز سے فرمایا تھا کہ آپ لوگ تو چاہتے ہونگے کہ پٹنہ کا نام "امام آباد" رکھا جائے۔ ممدوح نے حسن امام صاحب کے پٹنہ ہائیکورٹ میں آنے کی صورت میں اپنے استعفا دینے کی دھمکی دی تھی، اس لئے گورنمنٹ نقض عہد پر مجبور ہو گئی، اور حسن امام صاحب کو اپنی نخچی خاط کا موقعہ ملا۔ کیونکہ در اصل ہائیکورٹ کی بنچ ان کو پسند نہ تھی، ان کا تقرر بھی میں جانتا ہوں کہ ان کی مرضی کے خلاف ہوا تھا اور محض سر علی کی زبردستی سے ان کو اس جوئے کو کاندھا دینا پڑا تھا۔

ہائیکورٹ کے جج کی حیثیت سے بھی آپ جہاں بڑے رد و رعایت انصاف اور قانون کی پابندی اور احترام پر سختی سے عامل رہنے سے اپنے ملک کی نظر میں غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل کی، وہیں سرکار بہادر کے لئے آپ کے اس طرز عمل سے مشکلات پیدا ہو گئی تھیں۔ بابو راسبہاری منڈل اور راجندر نارائن سنگھ زمینداران ضلع بھاگلپور حکام ضلع کی خفگی کا شکار ہو کر تعزیرات ہند کے کئی دفعات کے ہدف بنے ہوئے تھے، دونوں پر علیحدہ علیحدہ فوجداری مقدمات چل رہے تھے۔ مرافعات بڑھتے بڑھتے آخر حسن امام صاحب کے اجلاس میں پہونچی۔ حسن امام صاحب نے مسٹر ہیمنڈ اور مسٹر لائل کی جیسی خبر اپنے فیصلہ میں لی تھی، وہ آج تک یادگار ہے اور اس زمانہ میں تو اس سے سنسنی پھیل گئی تھی۔ یہ ہیمنڈ صاحب وہی ہیں جو جنگ عظیم کے زمانہ میں بہار کے ایکٹنگ

---

[1] Julian ivan Emanuel Von-Berlin [2] Baron Berlin
[3] Sir Henry Irving [4] The Rend Charles Coron-Bus
[5] Professor Henry. [6] Buddington Parliamint London.

چیف سکریٹری تھے اور آخر کار سر لاری ہیملٹن بنکر کو رزآسام ہوئے تھے۔

۱۹۱۶ء سے مرتے دم تک آپ اپنے پیشہ کی خدمت کرتے رہے۔ جس میں آپ کی کامیابی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت دیا جا سکتا ہے کہ آپ کی آمدنی کے برابر اس پیشہ سے ملک میں اور کسی قانوندان کی آمدنی نہیں تھی۔ سالانہ ۵۰ ہزار روپے سے بالا آپ صرف انکم ٹیکس ادا کرتے تھے۔ آپ کی پریکٹس صوبہ کے اندر محدود نہیں تھی بلکہ تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ چالاکی۔ دھوکا دھڑی، حصول مقصد کی خاطر ناجائز فائدہ اٹھانا یا اسی قسم کی اور اوچھی اور غیر شریفانہ حرکتوں سے آپ کو قطعی احتراز تھا۔ متانت۔ سنجیدگی اور معقولیت کو کبھی آپ ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ قانون وضوابط کا آہنی بت آپ کی توجہات کی گرفت میں موم کی گڑیا ثابت ہو کر وہی روپ دھار لیتا تھا جس صورت میں آپ پیش کرنا چاہتے تھے۔ آپ کا مدمقابل قانون دان کبھی مطمئن نہیں رہتا تھا کہ کس آن آپ مقدمہ کی صورت حال کو یا قانون کے مفہوم کو کون سا جامہ پہنا دیں گے۔ ایک دفعہ پٹنہ کے بعض سربرآوردہ وکلا روبرو سر حسن نزل میں میرے سامنے موجود تھے اور ایک مقدمہ کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی جو دوسرے ہی دن پیش ہونے والا تھا۔ حسن امام صاحب نے لائق ترلوگوں کو منتخب فرما کر مخالفت میں بحث کرنے کی اجازت دی اور محض کمسن جونیروں کو اپنے ساتھ لیا۔ سر آمد مخالفین نے جب اپنی بحث ختم کی ہے تو میں نے عرض کر رہا ہوں کہ مجھے یقین تھا کہ حسن امام صاحب تین دفعہ مر کر زندہ ہوں تو بھی ان کے پیش کردہ عقلی ونقلی دلائل کا جواب نہیں دے سکتے ہیں۔ لیکن حسن امام صاحب نے ع ایک رحمت اس کی ہے اس سارے دفتر کا جواب۔ کے مصداق دفعہ قانون کے الفاظ اور شارع قانون کے مافی الذہن کو جو بیان کیا تو اب نہ پوچھئے۔ کیا عالم تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ طرف ثانی کو واقعی دستور الصبیان کی واقفیت نہیں۔ باوجود یکہ یہ ساری باتیں تھیں۔ مگر حسن امام صاحب مقدمہ کی سل کو اس طرح دیکھتے تھے کہ کم از کم مجھے ہر بار یہ شک رہتا تھا کہ ممدوح نے عدم توجہ سے کام لیا ہے۔ مجھے اپنے ذاتی مقدمات میں موصوف سے کام لینے کا اتفاق ایک سے زیادہ بار ہوا۔ مگر ایک طرف مسٹر مانک بڑے ضابطے اور قاعدے کے ساتھ کاغذ دیکھنا، اور اس سے اپنی پوری تشفی حاصل کرنا ذہن میں رکھتے ہوئے دوسری طرف حسن امام صاحب کی جلد جلد ورق گردانی اور سطروں پر انگلی یا سرخ پنسل چلاتے جانے کو دیکھکر لازمی تھا کہ میرا دل پریشان ہوتا۔ ممدوح کو میری اس کمزوری کا احساس تھا۔ اکثر آپ اس کا اظہار فرما کر مجھے شرمندہ کرتے۔ مگر میری ندامت کی انتہا نہ رہتی تھی جب آپ مقدمہ کو خود بیان فرمانا شروع کرتے تو چھوٹی سی چھوٹی تفصیل بھی نہیں چھوٹتی۔ اسماء جس قدر ہوتے وہ صحیح صحیح زبان پر آتے ہوتے۔ واقعات کی تاریخ میں کبھی غلطی نہیں ہوتی۔ ایک دفعہ تو آپ نے کمال کر دیا کہ بعض جگہ سن اور بعض جگہ نام غلط بتا بیٹھے تھے۔ مقدمہ کو بیان کرتے وقت آپ نے اپنی اس غلطی کو بھی بیان کر دیا۔ میں نے ایسا محافظہ کبھی نہیں۔ حسن منزل ہی میں ایک دفعہ کا میرا چشم دید واقعہ ہے کہ جس زمانے میں مہاراجہ دربھنگا اور آرہ کے مشہور رئیس ہری جی سے برہما اسٹیٹ کے لئے مقدمہ بازی ہو رہی تھی تو ہری جی کی طرف سے حسن امام صاحب کام کر رہے تھے۔ ہری جی کے یہاں سے کاغذات کے پلندے کے پلندے لیکر کچھ لوگ آئے۔ حسن امام صاحب نے سب کاغذات میز کے ایک گوشہ کی طرف انبار کر دینے کی ہدایت فرمائی۔ لانے والے حضرات چلے تو ان میں سے ایک نحیف الجثہ شخص اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ حسن امام صاحب نے سمجھا کہ ان کو کچھ کہنا ہے لہٰذا ان سے مخاطب ہو کر دریافت حال کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ بعض آپ کے رشن کی خاطر ٹھیر گیا ہوں۔ حسن امام صاحب نے فرمایا کہ اچھا تو بیٹھ جائیے اور جی بھر کر درشن کر لیجئے۔ مگر وہ اسی طرح کھڑے رہے اور فرمایا تو صرف یہی کہ "آپ نے ہم کو کاہے کو پہچانا ہوگا"۔ حسن امام صاحب نے نہایت اطمینان کے ساتھ فرمایا کہ آپ نے کیوں ایسا خیال کیا۔ اس کے بعد جو بتلانا شروع کیا کہ آپ کا نام یہ ہے آپ آرہ میں اس مکان کے مقابل رہتے تھے جس میں ہماری سسرال مونف صاحب بحیثیت ڈپٹی مجسٹریٹ کرایہ دار تھے۔ ہم کمسن تھے، آپ کے اس وقت تو ند تھی۔ آپ جوان تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان باتوں کو سن کر لاریب کا حیرت سے کیا حال ہوا۔ الفاظ میں نہیں بیان کیا جا سکتا ہے۔ غریب رو دیئے۔ معلوم ہوا کہ تقریباً تیس برسوں سے زیادہ عرصہ پر حسن امام نے ان کو دیکھا تھا۔ بھلا کوئی حد ہے اس حافظے کی؟

(۴) رجحان سیاسی

حسن امام صاحب کو جو چیز سب سے ممیز کرنے والی تھی وہ ان کی بے رو و ریا آزادی رائے تھی۔ ان کی پوری زندگی اسی رائے کی آزادی کی مشق واستحفاظ میں بسر ہوئی۔ ایسی صورت میں حسن امام صاحب کے لئے سوائے کانگریس کی آزادی طلب فضا کے اور کہیں گذر ہی نہیں تھی ۱۹۰۸ء میں آپ نے کانگریس میں شرکت کر لی اور برابر اس ادارہ کی خدمت میں دامے درمے قدمے پیش پیش رہے۔ کانگریس کا پہلا اجلاس آپ ہی کی دعوت پر پٹنہ میں ہوا تھا۔ مگر آپ اس وقت کلکتہ ہائیکورٹ کے جج ہو چکے تھے۔ اسی لئے عملی حصہ نہ لے سکے۔ مسٹر مظہر الحق مرحوم کا صدر استقبالیہ ہونا

محض حسن امام صاحب کی معذوری پر مبنی تھا، اس سے مظہر الحق صاحب کی تنقیص مراد نہیں ہے بلکہ یہ دکھلانا ہے کہ حسن امام صاحب اُن سے آگے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں گاندھی جی جب بہار آئے تو کچھ لوگ تو ان پر ہنستے رہے مگر حسن امام صاحب نے اس منحنی اور کم رو شخص کے پیکر میں عزم راسخ کا بلند پہاڑ اور مستقبل کا محبوب ترین قائد دیکھ کر اس سے اپنا رشتہ عقیدت استوار کر لیا اور دو ہزار کی رقم پیش کر کے اُن کے ہاتھ بٹانے والوں میں سب پر سبقت حاصل کر لی۔ اس کے بعد ہی ہوم رول لیگ کی جب مسز اینی بسنٹ نے طرح ڈالی تو چونکہ کانگریس سے یہ ایک قدم آگے تھی اسلئے حسن امام صاحب پوری تن دہی کے ساتھ اس کے بھی حامی ہو گئے۔ مسٹر سیجہ نند سنہا اور انہوں نے ملکر اکثر اضلاع کا دورہ کیا۔ گیا میں بھی تشریف لائے۔ آنریبل بشن نرائن بابو کشن پرکاش سین سنہا۔ درگا پرشاد وکیل اور راقم الحروم نے لیگ میں شرکت کی۔ اسی سلسلہ میں ایک مجلس مشاورت حسن منزل میں بھی تھی۔ اس وقت سر علی مرحوم پٹنہ ہائیکورٹ کے جج تھے۔ اتفاق سے وہ اپنی برادر زادیوں کو دیکھنے کے لئے تشریف لائے۔ ہم شوریدہ سروں کو یہاں دیکھ کر ممدوح نے مزاحاً سوال کیا کہ "تم نیٹیو[1] شب بیٹھے کیا سازش کر رہے ہو" حسن امام صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ "ہم نیٹیو یہ سازش کر رہے ہیں کہ آپ جیسا کالا دیسی چیف جسٹس ہوا کرے"۔

۱۹۱۸ء میں مونٹفورڈ[2] اسکیم پر غور کرنے کے لئے کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس بمبئی میں منعقد ہونا قرار پایا تو مسز اینی بسنٹ اور سی آر داس صاحب کے کہنے سننے سے حسن امام صاحب نے اس کی صدارت قبول کی۔ یہ اجلاس اپنی اہمیت کے اعتبار سے بہت ہی یادگار تھا۔ کانگریس کو اعتدال پسند جماعت اسکیم کو چلانے کا وعدہ کر چکی تھی۔ اور کانگریس کی مخالفت پر کانگریس سے الگ ہوئی جاتی تھی۔ صرف مدراسی اعتدال پسند باقی رہ گئے تھے۔ مگر وہ بھی دھمکی دے رہے تھے۔ دیوان بہادر، گووندر کا دا آئر اعتدال پسندوں میں پیش پیش تھے۔ مگر ان کے مقابلہ میں تلک مہاراج اپنی پوری طاقت سے جمے ہوئے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس منجدھار سے کانگریس کی کشتی کو نکال لیجانا حسن امام صاحب ہی کا کام تھا۔ اسکیم کے متعلق جو ریزولیوشن کا مسودہ تھا اس میں ایک خاص ترمیم پر مدراسیوں نے پورا زور لڑا دیا مگر ناکامی کے آثار دیکھ کر علیحدگی کی دھمکی دی۔ جواب میں تلک مہاراج نے ایک سنسکرت اشلوک پڑھا جس کے معنی تھے کہ بچوں کی قوت اتنی ہی ہے کہ رو پڑیں۔ اس پر مدراسیوں کو موقعہ مل گیا اور وہ سر سے داد خواہ ہوئے کہ تلک مہاراج سے ان الفاظ کو واپس لینے کا مطالبہ ہو۔ عجب نازک موقع آگیا تھا، مگر حسن امام صاحب نے بلا پس و پیش یہ فرمایا کہ تلک مہاراج کو اپنے الفاظ واپس لینے پڑیں گے۔ تلک مہاراج اس پر کیوں راضی ہوتے، مگر حسن امام صاحب نے جب اعلان کر دیا کہ اگر تلک مہاراج اپنے الفاظ واپس نہیں لیں گے تو سبجکٹ کمیٹی کو توڑ دیا جائے گا۔ تو تلک مہاراج مجبور ہوئے اور بالآخر انہوں نے اپنے الفاظ واپس لے لئے۔ حسن امام صاحب نے ادھر تو یہ کیا اُدھر اجلاس کمیٹی کے ختم ہوتے ہی تلک مہاراج کو بھی یہ کہہ کر راضی کر لیا کہ جو کچھ میں نے کیا وہ محض اس عہدہ کا احترام تھا جسکی عزت آپ ہی نے بخشی تھی، ورنہ آپ کو تو میں خود اپنا گرو (قاید) مانتا ہوں، اس پر بھی از بزرگان خطا کے تحت میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ تلک مہاراج خود بڑے دل گردے والے تھے۔ یہی نہیں کہ وہ محض راضی ہی ہو گئے، بلکہ اس وقت سے حسن امام کی حمایت میں وہ دفن ہو گئے۔

۱۹۱۹ء میں آپ نے ایک وفد خلافت کی سرکردگی فرمائی تھی جو مسلمانان ہند کے خیالات کو وزرائے سلطنت کے حضور میں پیش کرنے کیلئے ولایت گیا تھا، رئیس الاحرار مولانا محمد علی صاحب بھی ایسا ہی وفد لیکر گئے تھے۔ دونوں بزرگواروں کے وہ خطبے موجود ہیں جو مسٹر لائیڈ جارج کے سامنے دئے گئے تھے۔ ممکن ہے کہ احباب مجھے شخصیت پرستی کا الزام دیں، مگر آخر میں بھی اپنے ممدوح ہی کے نام سے پکارا جاتا ہوں ہو سکتا ہے کہ اپنی رائے نہ بدلنے کی وجہ سے وہ نیک نام ہوں، اور میں اسی تصور کی وجہ سے بدنام کیا جاؤں۔ مگر میں مجبور ہوں کہ جو میرے دل میں ہو وہی میرا قلم بھی لکھے۔ میرے خیال میں مولانا کی خطابت اپنی تمام و کمال خوبیوں کے بعد بھی وہاں ختم نہ ہو سکی، جہاں سے حسن امام صاحب کی خطابت کی ابتدا ہوتی ہے۔ مسٹر لائیڈ جارج کو اعتراف کرنا پڑا، حسن امام صاحب مجھ سے فرماتے تھے کہ وہ چھوٹ کر رہ گئے جسٹس لائیڈ جارج نے ان کو وہ مراسد دکھایا جس میں ترکوں نے خلافت کے جوئے کو اتار پھینکنے کے فیصلہ کے ساتھ حجاز کی حکومت کی ذمہ داری سے انکار کیا تھا۔ اور اس طرح "دنائے راز" اقبال کا ۱۹۱۷ء کا لکھا ہوا شعر ۱۹۲۰ء میں عملاً "شرمندہ معنی" ہوا۔

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا ۔۔۔ سادگی تو تو نکی دیکھ اور دنکی عیاری بھی دیکھ

---

[1] Native [2] مینٹیگو چمسفورڈ کا مخفف مونٹفورڈ MONT-FORD :-

۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آیا۔ لالہ ہرکشن لال۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو۔ ڈاکٹر ستیہ پال وغیرہ پر بغاوت کا مقدمہ چلا۔ اسپیشل کمیشن کے سامنے حسن امام صاحب نے جس بیجگری کے ساتھ کام کیا۔ اس نے پنجاب والوں میں عموماً اور کانگریس کے حلقہ میں خصوصاً ان کی جو عزت قایم کرادی تھی اس کے مظاہرے ان آنکھوں نے دیکھے۔ کانگریس کا اجلاس اُس سال امرتسر میں ہوا تھا۔ گیا سے بابو کشن پرکاش سین سنہا اور مولوی تو قیر احمد بخاری کے ساتھ میں بھی ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شریک ہوا تھا۔ اتفاق سے جس ٹرین میں ہم لوگ سفر کر رہے تھے۔ اسی میں پنڈت موتی لال نہرو صاحب اور حسن امام صاحب کے خاص ڈبے بھی لگے ہوئے تھے۔ نہ معلوم پنجاب والوں کو اس کی خبر کیسے ہوگئی تھی مگر باوجود سرد مہری کے جس جس اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری تمام پلیٹ فارم آدمیوں سے بھرا ہوا تھا، جو صرف حسن امام صاحب کی زیارت کے مشتاق تھے۔ بھگٹ کمیٹی میں میں نے دیکھا کہ حسن امام صاحب کی ذات فیصلہ کن تھی۔ اوروں کی بڑی بڑی دلیلیں ایک طرف رہ جاتی تھیں۔ لیکن حسن امام صاحب جو کہہ دیتے تھے اسی پر اتفاق آرا ہو جاتا تھا۔

ناگپور سیشن میں کانگریس نے عدم تعاون شروع کرنے کی ٹھان لی تو حسن امام صاحب نے خاموشی اختیار کر لی۔ چونکہ وہ اس کے ساتھ نہ تھے۔ چنانچہ اس موقع پر گاندھی جی کی کوششیں بھی بار آور نہ ہو سکیں، حسن امام صاحب نے اپنی رائے نہ بدلنا تھی نہ بدلی۔ لیکن اس جمود کو سی آر داس صاحب کی گرفتاری نے توڑ دیا۔ اور حسن امام صاحب لی میڈیٹر صاحب گورنر کے پاس چاہو بیجے۔ اسی زمانہ میں تاجدار شاہ ایڈورڈ ہشتم بحیثیت شہزادہ ولیعہد بہادر تشریف لا کر پٹنہ میں دربار کرنے والے تھے۔ حسن امام صاحب نے صاف کہہ دیا کہ اگر ترمیم شدہ قانون فوجداری کے تحت گرفتاریاں ہندو پانی کی تو دربار میں شرکت سے وہ خود اور اُن کے زیر اثر احباب عمائد باز رہیں گے۔ دوسرے ہی دن دربار ملتوی تھا۔ گورنر صاحب کو بادل ناخواستہ احکام امتناعی جاری ہی کرنا پڑے

اس کے بعد ۱۹۲۷ء کی مقاومت بھول نے پھر حسن امام صاحب کی رگ حمیت کو چھڑکا دیا۔ باوجود اختلاف شدید کے آپ بنفس نفیس معہ اپنے بال بچوں کے میدان میں اتر آئے۔ چونکہ آپ سے دیکھا نہ گیا کہ بعض یورپین افسران پولیس اپنی بیبیوں کی مشق کانگریس والنٹیروں پر بلا خیال خطرے کے جاہیں۔ اس ایک ذات کا سینہ سپر ہونا تھا کہ پولیس کے افسروں نے بھی تہذیب کا چھوٹا ہوا دامن پھر پکڑ لیا۔ راقم الحروف نے علم میں اور آنکھوں دیکھی جتنی باتیں ہیں وہ اگر سب بیان کی جائیں تو دفتر کا دفتر سیاہ ہو جائے گا، جس کو رسالہ ہذا کی محدود گنجائش میں سمجھا ل نہ سکیں گی۔ لہذا اب اس روئداد کو یہ کہہ کر ختم کرتا ہوں کہ بظاہر گو حسن امام صاحب کا عملی تعلق کانگریس سے عدم تعاون کی تحریک سے اختلاف کی وجہ سے ختم ہو گیا تھا۔ مگر پورے ذوق کیساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مرتے دم تک آپ حافظ کے اس مصرع کی سا قس لیتی ہوئی تصویر رہے کہ ؎

دست از طلب ندارم تا کام من برآید ۔ یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

بلکہ میں تو یہ بھی کہنے کو تیار ہوں کہ ؎

مپندار اینکہ مہرت از دل عاشق رود ہرگز ۔ چوں میرد مبتلا میرد چوں خیزد مبتلا خیزد

(۶) عقاید مذہبی

کفر و ایماں را یکے گفتم دلش را غنی نشد
دیر و کعبہ ہر دو ویراں کرد از دنیش بپرس

جو لوگ میرے مینا پر الحاد و زندیقیت کا شبہ کرتے ہیں میرے نزدیک ان کی ایمانداری مسلم ہے۔ میں اس کا رد ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ اسی سے ممدوح کی روحانی رفعت قایم ہوتی ہے۔ بزرگان دین میں ہمارے مخدوم الملک بہاری قدس سرہٗ العزیز کے ایک مکتوب کا ایک اقتباس قابل غور ہے وہو ہذا ——— " تا ہلکتا و صدیق بر زندیقیت تو سوگند نہ خورند صدیق نہ شوی "

بعض احباب تو حسن امام صاحب کو غلوئے ہندو دوستی کی وجہ سے ہندو کہنے سے بھی باز نہ آئے، بلکہ اس مغالطے میں چند ہندو احباب ہنوز مبتلا ہیں۔ حالانکہ ؎

اگر مشہور ہو افسانہ اپنی بت پرستی کا ۔ برہمن کیا عجب ایماں لے آئے بنارس میں (مومن خاں)

میں کسی کو بھی غلط نہیں کہتا۔ جب تک مجھے خود حقیقت حال معلوم نہیں ہوئی تھی۔ میں بھی بعض وقت یہی کہہ اٹھتا تھا کہ ؎

در بتخانہ و عشق بتاں اور آپ اے مومن! ۔ یہ حضرت آگئی اکبار کیا طبع مقدس میں

واقعہ صرف یہ ہے کہ حسن امام صاحب کو ان کے پیر و مستند حضرت حاجی صاحب جناب اعظم وکرہ کے فیوض فاستقامی نے اس وادیٔ حیرت میں پہنچا دیا تھا جہاں ع

ہم کو متحد ہی سے ترکِ رسوم ـــــ کی کیفیت میں رنگ جانے کے بعد تعجب مطلقہ مومن بیساختہ کہہ سکتا ہو کہ ؎

ڈھونڈھنے تجھ کو ترے من نہ سوئے دیر گئے ۔۔۔ راہ ہی چھوڑ دی وہ ہم نے جدھر غیر گئے

اس کے بعد غلط فہمیوں کے احتمال کو کیا کیا جا سکتا ہے؟ ـــــ اور ؎

ما بزندی بدنام کردند ۔۔۔ پیران جاہل شیخان گمراہ

کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا تھا؟ مجھے حسن امام صاحب کے ساتھ آخری اشتراکِ عمل کا موقع اس وقت ملا جب انھوں نے ایک حد تک اصرار کے ساتھ خدمت آستانۂ فیض کا نشانہ دیوہ شریف کیلئے اپنے کو پیش کیا اور ۲۵ مئی ۱۹۳۰ء کو ہم لوگوں نے ان کو ٹرسٹ کمیٹی کا پریسیڈنٹ یہ کہہ کر مقرر کیا کہ ؎

خیر یارب ہو د عشق کی تغیر ۔۔۔ ایک کافر امام ہوتا ہے

۱۱ اکتوبر ۱۹۳۲ء تک وہ اس عہدہ پر فائز رہے۔ اسی زمانے میں اعتقادی مسائل پر تبادلۂ خیالات اور ان کے دل کی باتیں معلوم کرنے کا موقع ملا جس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان کا یہ دعویٰ بالکل بجا تھا کہ اب آزاد ہونے کا شدید ترین احساس انکو مجبور کرتا تھا کہ مادی اور خیالی کسی بت کو بھی وہ توڑے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ حالانکہ یہ بھی ایک بت تھا۔ بقول مصلح شیراز

تا در و تخت زپندار تو ہستی باقی ست ۔۔۔ می واں بتیں کہ بت پرستی باقی ست

گفتی بت پندار شکستم رستم ۔۔۔ ایں بت کہ تو پندار شکستی باقی ست

مگر یہ وہ بت تھا جس کو توڑنا ممکن نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔ رباعی کا جو تتمہ مصرع بھی یہی کہہ رہا ہے۔ اسکو بندگیٔ بیچارگی کی مجبوری کہئے یا تسلیم و رضا کا آخری زینہ مگر ہوتا یہی ہے کہ اس بت کو توڑنے کے بجائے اس کی پرستش کرنی پڑتی ہے ؎

رفتم بطواف کعبۂ دل کانجا ۔۔۔ دیدم خود را دخود پرستی کردم

لیکن مذہب کا ظاہری حلیہ جو بڑی حد تک انسان کی معاشرت کی تربیت کرتا ہے اور توریث و تملیک کے وقت کام آتا ہے۔ اسکے اعتبار سے وہ اپنے کو شیعہ کہتے تھے۔ لیکن اس میں بھی مسائل خلافت۔ تبرا۔ تقیہ۔ متعہ کا استثنا فرمایا کرتے تھے۔ کہ کے دبار تو اسکے متعلق مجھے پوری صراحت و وضاحت سے انکی زبان سے سننے کا موقع ہوا ہے۔ ایک مرتبہ تو لکھنؤ کے کارلٹن ہوٹل میں مولانا حاجی حکیم سید احمد صاحب کے ساتھ دوسری دفعہ گیا کے ڈاک بنگلہ میں اس آخری موقعہ پر مخدومی سید احمد نواب صاحب عظیم پوری ڈپٹی مجسٹریٹ اور مولوی خلیل الرحمن صاحب ایڈووکیٹ گیا اور بعض دوسرے اشخاص موجود تھے۔ برادران اہل تشیع کو برا نہ ماننا چاہئے میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر حسن امام صاحب اپنے کو سنی کہنے کیلئے تیار ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ اسمیں بھی بہت سے مستثنیات وہ ضروری نہ سمجھتے۔ البتہ بلا کسی قسم کے استثنا کے وہ اپنے کو "وارثی" بالاعلان کہا کرتے تھے جس زمانہ میں وہ ٹرسٹ کمیٹی دیوہ شریف کے پریسیڈنٹ تھے تو یہ بات بھی محقق ہو چکی تھی کہ سوائے حضرت حاجی فیضو شاہ صاحب خادم خصوصی حسن امام صاحب متقدم (سینیئر) اور کوئی وارثی نہ تھا۔ نہ تو تھا کہ تیج سنگھ عرف دقار شاہ صاحب ان پر سبقت لے جاسکے نہ بابو کنھیا لعل صاحب سکریٹری ٹرسٹ کمیٹی۔ بابو صاحب کے اس وارفتگی سے گذر جانے کے بعد راقم الحروف کے سپرد یہ خدمت ہوئی تھی۔

(۷) خانگی حالات تمہید سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ علی امام صاحب و حسن امام صاحب کی پہلی شادیاں انکے بڑے ماموں کی صاحبزادیوں سے ہوئی تھیں۔ ان سے علی امام صاحب کے یہاں چار بیٹیاں اور پانچ بیٹے علی امام صاحب کے بعد یادگار رہے۔ بڑی صاحبزادی کی شادی رئیس ڈمری مولوی نظیر الدین صاحب سے ہوئی۔ منجھلی صاحبزادی مولوی سید احمد صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ سابق رہائی کی شریک زندگی ہوئیں۔ سنجھلی صاحبزادی مسٹر سید جمال حسن صاحب بیرسٹر کے حبالۂ عقد میں آئیں۔ چھوٹی صاحبزادی نے بی بی پور کے سید مجید عالم صاحب بی اے (آکسن) انسپکٹر آف اسکولس کا گھر آباد کیا۔ صاحبزادے سب بیرسٹر ہوئے۔ بڑے صفدر امام صاحب نے منجھلے حمید رامام صاحب کی شادی نواب نورالحسن صاحب مکتوی کی صاحبزادی سے ہوئی۔ سنجھلے جعفر امام صاحب ایڈووکیٹ جنرل بہار نے اپنی خواہر عم زاد کو شریک زندگی بنایا۔ چھوٹے افسوس ہے کہ ۱۹۳۵ء میں جوانمرگ دنیا سے اٹھ گئے۔ ان کا نام سید ضیاء امام صاحب انکی شادی موجودہ مہاراجہ محمود آباد کی بھتیجی سے ہوئی تھی ـــــ

بانچوں شقیق امام صاحب میں جو کانگریس گورنمنٹ کے دور دورے میں کونسل کے ڈپٹی پریسیڈنٹ تھے۔ علی امام صاحب نے دوسری شادی ایک ولایتی خاتون سے کی تھی جو پہلے انکے یہاں ملازمہ تھیں۔ یہی پہلی لیڈی امام تھیں۔ ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی اور شادی کے چند ہی سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ علی امام صاحب نے تیسری شادی موجودہ لیڈی امیر امام صاحبہ سے کی۔ ان سے بھی کوئی اولاد نہیں ہے۔ لیڈی امیر صاحبہ پٹنہ عظیم آباد کے مشہور بااوضع وارثی بزرگ مولوی یحییٰ صاحب وکیل

منفرد کی نواسی ہیں۔ اور علم و اخلاق میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ سوسائٹی کے اعلیٰ ترین مگر مسموم ترین حلقہ کی وسیع و دراں پر ربع عہد و مہم زنانی ثابت ہونا آپ ہی کا کام ہے۔

حسن امام صاحب کو اپنی میری بہن کے بطن سے دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہوئے۔ جن میں سے ایک صاحبزادہ کا داغ حسن امام صاحب کے دل پر اپنا بڑی صاحبزادی فاطمہ سمیع مرحوم بیرسٹر مونگیر کی بیوی تھیں۔ دوسری صاحبزادی جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اپنے برادر عم زاد سید جعفر امام صاحب کی زندگی کی شریک ہیں۔ حسن امام صاحب کے صاحبزادے مسٹر سید مہدی امام صاحب کی شادی جسٹس فضل علی صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔ مہدی امام صاحب بیرسٹر ہونے کے علاوہ سنسکرت کے ماہر اور روحانیات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ خدا عمر میں برکت دے اور سیدھے راستے چلائے ——— حسن امام صاحب کی شریک زندگی عرصہ دراز تک جنون میں مبتلا رہیں۔ سالہا سال آپ اپنے تجرد میں بسر کیا۔ لیڈی میری امام مرحومہ کی بہن حسن امام صاحب کے یہاں لڑکیوں کی گورنس تھیں ان سے حسن امام صاحب نے عقد کر لیا تھا۔ ان کے بطن سے ایک لڑکا تھا۔ حسن امام صاحب کے انتقال کے بعد بیگم صاحبہ نے دوسرا عقد کر لیا۔ راقم الحروف کو معلوم نہیں وہ لڑکا کس ڈھرے لگا۔

"اول بہ آخر نسبتے دارد" کے مصداق حسن امام صاحب آخر زمانہ میں نہایت سادہ طرز معاشرت پر اتر آئے تھے۔ اس طرح آپ جب جیلہ آتے جاتے تو مجھے تار سے اکثر مطلع فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ جبلپور سے پٹنے جانے کی ایسی ہی اطلاع پر میں اسٹیشن پہونچا تو حسب معمول فرسٹ کلاس کے کسی ڈبہ میں ہونے کے بجائے صرف کرتے پائجامے میں آپ ڈیوڑھے درجے سے اترتے نظر آئے۔ انگریزی لباس آپ نے عرصے ترک ہی کر دیا تھا۔ ٹھیٹ ہندوستانی قدیم وضع کا لباس بندوار انگرکھا اور پنڈت جی والی ٹوپی ہی پر گاؤن اور سفید ٹائی مستزاد کر کے آپ جلاسوں پر بھی کام کیا کرتے تھے۔ گھر پر سگریٹ بہت پیتے تھے۔ ایک دفعہ سگریٹ دیا سلائی سے سلگا لیتے جب ختم ہونے پر آتا تو اسی سے دوسرا سگریٹ اور اسی طرح یکے بعد دیگرے روشن کرتے جاتے۔ مگر اجلاس پر گھنٹوں سگریٹ پینے کی نوبت نہ آتی تو بھی سخت عادی ہونے کے باوجود آپ پر انقباض کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوتا تھا۔ آپ بڑے مخیر تھے مگر اس میں نمائش یکدم روا نہیں رکھتے تھے۔ بہار نیشنل کالج اور اخبار سرچ لائٹ پر جب وقت پڑا تو حسن امام صاحب ہی آڑے آئے۔ مختصر یہ ہے کہ ——— خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

(۸) ختم کلام

از بہار رفتہ درس رنگ و بو دارم ہنوز — در عمت خاطر فریب جاں ناشاد خودم

اس بات کو ٹھنڈے دل سے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جب حسن امام صاحب آنکھیں کھولیں تو کیا دیکھا۔ سب سے پہلے تو یہ کہہ دیا ہے کہ انکے گھر میں اگر عسر و تنگ حالی نہ تھی تو ہن بھی نہیں برس رہا تھا۔ وہ خود بہت مزے لیکر اس واقعہ کو بیان کیا کرتے تھے کہ ایک دفعہ اسکول سے کئی روز متواتر چھٹی پر چھٹی کی تو دونوں بھائیوں نے گھر چلنے کی ٹھہرائی۔ دانا پور سے پیدل چلنے کو روانہ ہوئے۔ اتفاقاً تیز بارش ہونے لگی۔ نہر کے پل پر دونوں بھائی کھڑے رہکر پانی کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔ چونکہ ایک ہی چھتری تھی لہٰذا چلتے بھی رہنا اور تر ہونے سے محفوظ بھی رہنا ممکن نہیں تھا۔ یہ واقعہ انھوں نے مجھ سے وقت بیان کیا جو وقت قریب ستر ہزار سالانہ ٹیکس ادا کرتے تھے۔ باوجود فقدان امارت انھوں نے اپنے اعزاز و تقارب کو ممتاز و معزز پایا۔ بلکہ مسلمانوں کا وقار انتزاع سلطنت کے بعد بھی اتنا کچھ باقی رہ گیا تھا کہ سوسائٹی پر ان ہی کی معاشرت اپنا رنگ جمائے ہوئے تھی۔ حکام رسی دربارداری میں ان سے پیش پیش تھے کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ کوئی شک نہیں کہ علم جدید سے بڑی حد تک بے بہرہ تھے۔ دولت میں برادران وطن کی ان سے بہتر حالت اسوقت کے بڑے بننے والے بھائیوں کے نزدیک مسلمانوں ہی کو بڑا بھائی سمجھتے اور کہتے تھے۔ راج ہندو کا ہوتا تھا مگر کاج کرنوانے مسلمان ہوتے تھے اور کرنل نہ ہوتا اس وقت کا مسلمان زبان حال کہہ رہا تھا کہ ؎

تازہ دور افتادہ طرف بساط عشرتم — می تواں افشردمے ازلائے پالایم ہنوز

لہٰذا کوئی تعجب کی بات نہیں اگر حسن امام صاحب نے بھائیوں کے ساتھ ہمدردی کے جذبہ کے اپنے دل میں پرورش اس حد تک کی کہ وہ خود انکو بہالے جانے پر قادر ہو گیا۔ وہ سچے تھے انکی باتیں بھی سچی تھیں۔ اسپرٹ آندھی تھی طبیعت جد امجد آئی اور ہوا کی۔ میں نے انکو ہندوؤں کے متعلق باتیں کرتے جب سنا تو یہی محسوس کیا انکے خیال میں ہندو قوم کی قوم بدھوؤں کے لئے یا پیرس کے معصوم بچے تھے۔ لہٰذا انکے دل مہمان نزل نے ضرورت محسوس کی اسی طبقہ کو زیادہ ابھارا جائے اور مستقل کیلئے تیار کیا جائے انھوں نے ایثار اور نذر کی کے ساتھ ہی سمجھا اور اسی پر عمل پیرا ہوئے۔ خوش قسمت تھے وہ کہ اسی خوش خیالی کو لئے دئے چار شنبہ ۱۹ اپریل ۱۹۳۳ء کو علی الصباح اس دار فانی سے فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر کے جوار رحمت میں چل دئے انا للہ و انا الیہ راجعون۔ چنپا سین آباد ضلع پلاموں میں اپنی وصیت کے مطابق آسودہ ہیں۔ آج ۱۹ اپریل ۱۹۴۰ء کو یہ مضمون ختم کر رہا ہوں اور زبان حال سے سن رہا ہوں کہ اتنی زندگی کہہ رہی ہے کہ ؎

من آں نیم کہ ہر گم جہاں بسکم نخورد — نفغان زاہد و فریاد برہمن یاد آر

انکے تمام میں ہندوؤں نے مستلمانوں کو مات دیا مگر کس قدر افسوس کی بات ہے کہ شیشہ سے نام حکومت کا نشہ ایسا چڑھا کہ بھائیوں کو "میت کی پرستش" بھی یاد نہیں رہی۔ ہندو بھائی کا یہ کہنا بجا ہی کہ حسن امام کا سا مسلمان کہاں۔ مگر میرا صرف ایک سوال ہے کہ حسن امام اپنے محض نہیں بلکہ آج کے ماننے ہوئے بڑے بھائی ہو کر جو کچھ انکو چاہئے تھا اس سے زیادہ کر کے گئے۔ یہاں تک کہ اپنوں سے بڑے بنے مگر آپکی بھلائی سے باز نہیں رہے۔ کیا آپ بڑے بھائی بننے کے مدعی ہو کر انکا عشر عشیر کرنے پر تیار ہوئے یا وہ کریں کوئی غرض نہ تھا بیا یہ کہ نیا ہوں بر کنا نہ — اس کو بھی ایک زمانہ تھا اس کا بھی ایک زمانہ ہے

حسن امام صاحب نے انکو کرسی نوازی میں غلطی کی یا علی امام صاحب نے مسلم لیگ قایم کرنے میں اس کا جواب مستقبل دے گا مگر آج تو مبتلا رہا ہے کہ بڑے کی بڑی بات۔ مگر ہم کو تو اپنے میت کی پرستش سے کام ہے۔ رہے نام اللہ کا۔

افکار و خیالات :-

زندگی کدھر؟

از جناب کامریڈ علی اشرف محبوس سنٹرل جیل ہزاری باغ

زندگی کے دھارے میں بے سدھ بہتا جا رہا ہوں۔ کبھی کبھی ہوش آتا ہے تو ٹوٹا کر اس پاس دیکھنے لگتا ہوں۔ ماحول کو دیکھتا ہوں اور اس کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ سمجھنا چاہتا ہوں جیون کا یہ بہاؤ مجھے کہاں سے کہاں لئے جا رہا ہے۔ کس ساگر میں لا کر ڈالنے والا ہے۔ سوچتا ہوں میں کیا تھا۔ کیا ہو رہا ہوں، کیا ہو جاؤں گا؟

حافظہ کی تختی پر ماضی کے دیو نے چند لکیریں کھینچی ہیں ــــ بھدی اور بدصورت! آنکھیں جن کو دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتیں۔ میرے بیتے ہوئے دنوں نے ایک محل بنایا مگر محل کی دیواریں کالی ہیں اور اس میں بھوت بستے ہیں! میرے ماضی میں پھول نہیں سراسر کانٹے ہیں جہاں جا کر میں الجھتا ہوں۔ اور گرتا ہوں۔ وہ ایک جہنم زار ہے جس کی تپش میں تخیل کے پر جلنے لگتے ہیں۔ اس میں افلاس کی درندگی اور افلاس کی بہیمیت ہے ــــ گندگی اور گندگی کی عفونت!

زندگی کے گلشن میں آنکھ کھلی تو افلاس کے کانٹے دامن سے الجھے پائے۔ کانٹوں سے چبھن اور احساس ملا۔ احساس نے درد اور تجسید گی دی۔ میں اداس رہنے لگا۔ اور جب جوانی آئی تو میں بڑھاپے کی سرحد سے قریب تھا۔ چہرہ غم و مایوسی کی تصویر اور دھنسی دھنسی بھیانک آنکھیں بے بسی اور بے پناہی کی آئینہ دار ہو رہی تھیں۔ تنہائی میری عادت اور تنہائی کی عادت اداسی! اس حال میں کہ

دل مجھکو مناتا تھا میں دل کو مناتا تھا
آپس کی شکایت میں کٹ جاتی تھی تنہائی

میرا ہنسنا بناوٹ اور میری مسرت ظاہرداری ــــ پھر ایک دن تھا جب میں ہنسنا بھول چکا تھا۔ اور میرا فلسفہ ــــ شکست خوردگی یا آگے بڑھا تو شوپنہار۔

زندگی کی التجائیں بھلائی جا سکتی ہیں اور افلاس زدہ بچپن کی زندگی ہی کیا؟ مگر جب جوانی نے زندگی کی دھارا تھامی تو مجھے آگے بڑھنا ہی پڑا۔

جی چاہتا تھا کسی سے انتہائی شدت کے ساتھ محبت یا نفرت کروں۔ سماج اور یزداں کی سازش سے جو بندشیں ڈالی گئی ہیں انہیں توڑ ڈالوں کہ انسانوں کے ٹوٹے ہوئے رشتے پھر سے جوڑے جا سکیں۔ زندگی نفرت کا آتش فشاں ہو جائے جس کی گرم آہ فلک تک پہونچے اور اہرمن اور یزداں دونوں کو جلا کر خاک کر دے پھر نفرت کے اس ٹیلے سے محبت کا ایک سوتا پھوٹے جس سے انسانیت کی کھیتی کی آبیاری کی جا سکے ....

میں آگے بڑھا۔ اب میں نے اوروں کی زندگی دیکھی جو اپنی عریانیت اور غلاظت کے ساتھ سامنے کھڑی تھی۔ گھر کی چار دیواری کے باہر جو شفاف سمندر لہریں مارا کرتا تھا وہ سراب نکلا۔ وہاں ایک دلدل کے سوا کچھ نہ تھا۔ بے شمار انسانوں کا خون جم کر کیچڑ بنا تھا اور ان کے سڑتے ہوئے مردہ بدن جس میں کیڑے لگ چکے تھے!

میں نے دیکھا انکی زندگی اور اسکی کرب اور بے چینی، مرگھٹ کی پرسکون بھیانک سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ میں سوچنے لگا یہ سب کیوں؟ پھول بن کھلے مرجھائے کیوں اور دامن میں کانٹے کیوں الجھیں؟ انسانیت افلاس کے عذاب سے تڑپتی ہے ــــ مگر کیوں؟

شوپنہار نے جواب دیا ــــ باغبان کی مرضی۔ اور اس کے نام پر دو چار صلواتیں سنا گیا۔ اقبال نے آگے بڑھ کر کہا۔

درماں زدرد سازا گر خستہ تن شوی
خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

مگر جوانی کی زندہ اور بے چین عقل کی ان باتوں سے تسلی نہ ہو سکی۔ دونوں کے جواب میں شکست خوردگی کی مایوسی اور بے بسی کی جھلک تھی۔ میں اور آگے بڑھا۔ اقبال۔ شوپنہار اور نطشائی کے کاندھوں پر ہوتا ہوا مارکس کے قدموں تک پہونچا۔

یہاں آ کر یہ معلوم ہوا گویا میں منزل پر پہونچ گیا۔ مگر منزل کہاں؟ اس گتھی تک میں ذہنی مقاموں میں تخیل کے سہارے

بھٹکتا پھر رہا تھا۔ مارکس نے مجھے حقیقت کی روشنی دی اور زمین پر سیدھی طرح لا کھڑا کیا۔ اور اب چلتا ہوں۔

جہاں منزل سمجھا تھا وہاں سے منزل کی طرف سفر کا آغاز ہوا۔ اور تب تک؟ — نقشِ راہ کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔

اور زندگی؟ تو اسکی ہیئت بدل چکی ہے۔ بند پانی کی پیالی جس میں گندگی کی باس آ چکی تھی اٹھ گیا اور دریا سے ساگر میں مل چکی ہے۔ تاریک حجرہ کی گوشہ نشیں زندگی اب ہجوم میں آ ملی ہے اور تجلوس کے ساتھ چل رہی ہے۔ یہی اہم تاریخیت ہے۔ مگر اس میں انفرادیت کی نفی لازم نہیں۔ بلکہ انفرادیت کی نشو و نما کے حقیقی موقعے تو یہیں ملیں گے ندی میں لہریں کبھی کبھی اٹھکیلیاں ضرور کرتی ہیں مگر وہیں تو سمندر میں ہی اٹھ سکتی ہیں۔ اور یوں اپنی دو انگل کی ناؤ تو ہر شخص بنا سکتا ہے۔ مگر اس میں پڑے جہاز کو اپنی پیٹھ پر کہاں تک لادے پھرے گا۔ اس صورت میں کوئی ہنستا ہے کوئی مرثیہ کہتا ہے کوئی تو قول تھے [illegible] مرنا بھی جشن ہے۔"

حقیقت کی روشنی نے تخیل کی حد نظر کو وسعت دیا ہے۔ مستقبل اور مسئلے اپنی ذات تک محدود نہیں رہے۔ انکی حیثیت عالمگیر ہے۔ انکا حل بھی عالمگیر ہوگا۔ ہمارے چلنے کا راستہ سیدھی گلی نہیں ہو سکتا۔ اس سے افراد کو نہیں، ہجوم کو گذرنا ہے۔ اسے شاہراہ ہونا ہے۔ ہمارے مسایل جنہیں ہم انفرادیت کی تنگ عینک سے دیکھنے کے عادی ہیں حقیقت میں عالمگیر ہیں اور زندگی کے خاص حالات کی پیداوار ہیں۔ انکا درماں ان حالات کو بدلنے سے ہی ہو سکتا ہے اور اسکے لئے — عمل کی ضرورت ہے —

— اور عمل ہی میرا مستقبل ہے

کیا لکھوں؟

از جناب سید نصیر حیدر صاحب نصیر بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی ڈپٹی کلکٹر گیا

پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کچھ لکھوں تو کس زبان میں؟ ہوں تو فارسی انگریزی اپنی زبان نہیں علم حاصل کرنے کے بعد دوسری زبان میں بے تکلفی برتنی دشوار سی معلوم ہوتی ہے رہی اردو وہ بھی دہلی اور لکھنؤ کے ٹکسالی میں بہار والوں کی نہیں ہے یہ باس ہمہ گو بزعم خود کہی یہ دعوی ضرور ہے کہ اردو اپنی بھی ہے ہاں تو اردو میں لکھوں اب رہا یہ امر کہ یہ تحریر نظم میں ہو یا نثر میں۔ نثر میں لوچ نہیں۔ اچھا تو موضوع کیا ہو۔ جو لکھوں کچھ نئے بڑے بڑوں نے اس میدان میں جو کارنامے اظہار کے قلم رکھ دیا ہے۔ میں کس شمار میں ہوں۔ بھاری پتھر ہے۔ میں بھی چوم کر چھوڑتا ہوں۔ نعت اور منقبت اپنے بس کی نہیں۔ اگر عالم کے تمام اشجار قلم بن جائیں تمام دریا اور سمندر روشنائی کا کام دیں اور تمام انس و جن کاتبت کریں تب بھی کلمات اللہ کا احاطہ نہیں ہو سکتا اب بھلا بتاؤ تو سہی میں کیوں کر اس بات کی جرأت کر سکتا ہوں۔ نفوس عالیہ سے اتر کر کسی کی مدح میں قصیدہ لکھوں مگر اپنا تو کوئی ممدوح مطمح نظر نہیں طلاقت لسانی جب تک واقعات سے جوڑ نہ کھائے نتیجہ اچھا نہیں نکل سکتا یہ کام بھی میرے بس کا نہیں پھر رام سلام پیاری جیسے بڑے بڑے الفاظ قطب مینار جیسے بلند استعارے بحر الطلاطم کی گہرائی جیسی عمیق تشبیہیں کہاں سے لاؤں جھوٹ کا طومار پیسے گرز کے لئے اپنے کو کیوں کر اور کہاں تک تیار کروں۔

بس غزل لکھوں یہ کام کچھ آسان معلوم ہوتا ہے۔ ہلکے پھلکے الفاظ سیدھی سادی ترکیبوں کی ضرورت ہے معشوق کو ظالم جفا کار بے وفا ستمگر لکھنا پرانا چلن ہے۔ خود کو مجبور مہجور فراق دیدہ بدنصیب حرماں کشیدہ وحشی بدمست باندھنا آسان ہے۔ واعظ اور ناصح کو برا کہنا اصول تغزل ہے۔ خضر موسیٰ عیسیٰ اور داؤد پر زباں درازیاں سلف سے ہوتی آئی ہیں۔ میں اگر ان سے پرہیز کروں تو اردو کا شاعر فصوصاً غزل گو ہو ہی نہیں سکتا۔ فرضی عاشق بننا۔ رقیبوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مدمقابل بنانا۔ شراب سے شوق ہو نہ ہو ارتباط رکھنا لوازم غزل گوئی ہیں۔ اور میں یہ سب مرحلے جھیلنے کو تیار ہوں مگر دقت یہ آن پڑی ہے کہ استاد کہاں سے لاؤں اور بغیر استاد کی مدد کے غزل گوئی آسان نہیں کیوں کہ وہ دماغ ایک سے ضرور بہتر ہوتے ہیں۔ پھر رواج بھی یہی ہے کہ شاعر کو استاد کی ضرورت ہے الشعراء تلامیذ الرحمٰن کا تعلق ہندوستان کی خاک سے نہیں اور ہو بھی تو کیوں کر یہ تو عربی زبان کا مقولہ ہے اور ریگستان عرب ہی کے لئے سوزوں بھی ہے۔ یہاں کی فضا میں کثرت آبادی کی وجہ سے شاگرد سے زیادہ استادوں کی بہتات ہے۔ اس لئے یہاں خدا کے بندوں میں سے کسی نہ کسی کو استاد ضرور ماننا پڑیگا

ورنہ شاعر بننا ناممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور ہے۔ مگر قیامت تو یہ ہے کہ کچھ دنوں سے اساتذہ پر بھی نہیں رکتی۔ گردہ کا گردہ کچھ ایسا بدظن ہو گیا ہے کہ ذرا سی بنا پر نکتہ چینیوں کی بھرمار ان کی شعروں کے سامنے بات ہیں۔ اور یہ سب آفتیں جناب حقوق سندیلوی کی لائی ہوئی ہیں۔ جنہوں نے "اصلاح سخن" ایک کتاب چھاپ کر سارے استادوں کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔ او ہونہار شاگردوں سے اترائے ہوئے استادوں کو بدظن کر دیا ہے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ میری ہمت نہیں پڑتی کہ بغیر کسی استاد کو غزل دکھائے ہوئے مشاعرہ میں پڑھوں یا کسی رسالہ میں چھپواؤں غیر اصلاحی غزلوں میں جھول ضرور رہے گا اور روایاتی عاشقی کی غزلیں ناقابل قبول ہیں۔ سو اس کے اب کوئی چارہ نہیں کہ غزل گوئی کے خیال کو بھی دور کر دوں۔

اب تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔ ندیم کے لئے کوئی مضمون لکھوں۔ لاحول ولاقوۃ تو آخر یہ خامہ فرسائی کا تہیہ تھا کس لئے نظم سے اب کام نہیں نکلتا۔ بد نظمی کے آثار ہیں آخر نثر ہی میں تخلیل کے جذبات اور خیالات بھر کر نظم معراکیوں نہ کر دوں۔ نہ قافیہ کی ضرورت پڑے گی نہ ردیف کی پابندی۔ وزن کسی نہ کسی طرح درست ہو ہی جائے گا لیکن اگر یہ منثور اشعار "تقطیع" سے گر گئے تو گرفت ہو جائے گی۔ لو اس کی درستی میں بھی استاد کی ضرورت آ پڑی۔ نہیں میں اب نثر ہی لکھوں گا مگر نثر میں سوا افسانوں کے اور کیا لکھوں۔ بہتیرے سنے سنائے قصے ذہن نشین ہیں۔ انہیں کو الٹ پھیر کر کے اچھا خاصا افسانہ تیار کر لے سکتا ہوں۔ لیکن افسانوں میں جب تک عریانیت نہ ہو قبول عام نہیں۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ 'ندیم' کے مدیر صاحب بڑی پخ نکالتے ہیں کہتے ہیں کہ ندیم میں اخلاق سوز افسانے ہرگز درج نہ ہوں گے اب ان سے پوچھے کون کہ حضرت! افسانوں کو اخلاق سوز ہی ہونا چاہئے کیونکہ اگر اخلاق کو بلند کرنے والی باتیں لکھی جائیں تو وہ کوئی فلسفیانہ مضمون یا علمی تبصرہ ہو گا۔ افسانہ کا ہے کو ہو گا۔ نہیں میں افسانے ہرگز ان پابندیوں کے ساتھ نہیں لکھ سکتا۔ اگر لکھا بھی تو دوسری مصیبت یہ ہے کہ 'ندیم' میں ہر وہ نظم و نثر شائع ہو سکے گی جو کہ معیار پر پوری اترے۔ اب معیار کا کوئی معیار یا ہو تو ہو نہیں کہ جانوں پوری اتری یا نہیں اور معیار ہر شخص کا جدا گانہ ہے۔ میرے معیار پر پوری نہ اترے لیکن اگر ریاست صاحب کے معیار پر پوری نہ اترے تو میں کیا کروں۔ میں باز آیا اپنے معیار کا سربستہ راز کھولنے سے بھلے افسانوں سے بھی چھٹی ہوئی۔

سر میں کچھ نہ کچھ لکھنے کی کچھ ایسی دھن سوار ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں اور کیا لکھوں۔ ہاں خوب یاد آیا کوئی خط لکھوں۔ کسی کو لکھنے سے حاصل۔ مگر نامہ بر کہاں سے لاؤں۔ ڈاک کی مدد تو مجھے عار ہے۔ اس کو تو پاپوں اور اس کو صفیر بلگرامی کا وہ مشہور قطعہ جو لکھ کر قاتل کا پتہ بتاتا ہے حفظ کرا دوں۔ خیر۔ یہ سب سامان بہم پہونچ جائیگا۔ مگر پہلے لکھوں القاب میں کیا لکھوں "باعث فرحت و انبساط من" نہیں یہ تو نہ نظم ہے اور نہ اچھی نثر۔ اور پھر معشوق کو نہیں ہے بیوی کو ہے بیوی اور معشوق میں کچھ تو فرق ہونا چاہئے۔ ہو تیاں تو چار چار مل سکتی ہیں مگر معشوق ایک سے زیادہ ہوا اور عشق میں تخلیل آیا۔ اس ایک معشوق کے ہزاروں عاشق بھی ہوں تو بھی کچھ پروا نہیں۔ مگر معشوق تو جو ایک ہی بھلا معلوم ہوتا ہے ورنہ — وصل میں یکتائی اور ہجر میں وحدانیت کا تعلق قائم نہیں رہ سکتا۔ پھر معشوق اگر باعث فرحت و انبساط ہی ہو گیا تو وہ معشوق کیا ہوا اسکو عاشق کی ذلت کا سبب اور رسوائی کا موجب ہونا چاہئے۔ ورنہ چاک گریبانی، صحرانوردی، دربان کی خوشامد تو سب ندامت کا لطف ہی کیا رہے گا۔ یا القاب ٹھیک نہیں کچھ اور سوچوں خیر۔ القاب کو چھوڑیئے خط کا مضمون کیا ہو گا یہ مشکل سوال ہے۔ اگر فراق کا ذکر کروں تو اولاً طبع نازک کو گراں گزریگا۔ دوسرے یقین کب آئیگا۔ اس لئے ہجر کا ذکر فضول ہے۔ وصل کی تمنا لکھوں معاف کیجئے ایسی جرأت کو بنکر کروں تو آخر لکھوں کیا؟ ارد یا حسن کی دعا لکھوں گویا انکو یہ بتاؤں کہ آپ کا حسن ابھی ناقص ہے۔ اس میں ترقی کی ضرورت ہے واللہ یہ گستاخی ناقابل معافی ہو گی۔ تو پھر کیا لکھوں بس چپ ہی اسی میں ہے کہ کچھ نہ لکھوں ——— !

بیان اعجاز

از جناب سید احمد صاحب اعجاز

معلوم نہیں راز وجود ہستی
کچھ بھی نہیں کیا ہے نمود ہستی
بیچارہ یہی سمجھ رہا ہے شاید
سب کچھ ہے یہ بود و نبود ہستی

اصلاح و ترقی:-

صوبہ بہار میں محکمۂ ترقی دیہات یا دیہات سدھار

از جناب محمد مجتبیٰ صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ایل۔ ڈپٹی ارگنائزر محکمۂ دیہات سدھار صوبہ بہار

آپ نے "انقلاب زندہ باد" کے نعروں کی گونج میں جہاں بہت سے نئے نعرے سنے ہوں گے، وہاں "دیہات سدھار" کا نام بھی ضرور سنا ہوگا۔ مہذب اور تعلیم یافتہ مسلمان اس نئے لغت کو غیر فصیح کہتے ہیں۔ ایک نہایت ہی ممتاز "ایڈیٹر" یا صحافت نگار" نے مجھ سے کہا کہ "ترقی دیہات" کی اصطلاح استعمال کیا کروں۔ اسی "فہمایش" یا فرمایش کی بنا پر میں اس مضمون کی سرخی "ترقی دیہات" لکھنا چاہتا تھا مگر حق تک اس کا مستحق ہو کہ میں "دیہات سدھار" ہی لکھوں کہ ہمارے محکمہ کی زبان پر یہی لفظ رات دن جاری ہے، اور اسی کو جاہل، عالم، ہندو، اور مسلمان ہر شخص آسانی سے سمجھ جاتا ہے۔ پھر کیوں آپ نے "دیہات سدھار" کی اصطلاح فرمرشی ہے۔ اور شاید اتنا سمجھتے بھی ہوں گے کہ اس سے مراد "ترقی دیہات" کا محکمہ ہے، یعنی حکومت بہار کا وہ محکمہ جس کی غرض و غایت یہ ہے کہ دیہاتی باشندوں کی زندگی میں اصلاح و ترقی کی کوشش کی جائے اور ان کی زندگی کو شاد و مسرور اور فارغ البال بنانے کا ہر ممکن ذریعہ ڈھونڈ لیا جائے۔

اس ملک کے تمام صوبوں کی حکومتوں نے یہ محکمہ جاری کیا ہے، اور اغراض و مقاصد سب کے یکساں ہیں۔ یہی ایک تعجب کی بات نہیں ہے کہ دیہاتی آبادی تو حضرت آدمؑ کے بعد ہی سے پھیلنے لگی اور تاریخ عالم میں جب منظم حکومتیں قایم ہوئیں، اس کے صدیوں پہلے دیہاتی انسان بستے تھے۔ پھر یہ نیا محکمہ حکومتوں کی فہرست محکمہ جات میں معدوم کیوں تھا؟ اور اب کونسی ضرورت لاحق ہوئی کہ یک بہ یک تمام حکومتوں نے ایک نیا بوجھ اپنے سر پڑا ضروری سمجھا؟ آپ کی حیرت شاید اور زیادہ ہو جاوے گی، اگر میں آپ کو ایک بات اور بتلاؤں اور وہ یہ ہے کہ ماہ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں جنیوا کی انجمن الاقوام (لیگ آف نیشنز) کا ایک جلسۂ خاص اس مسئلے کو سوچنے کو منعقد ہوا تھا کہ دیہاتی آبادی کی ترقی و اصلاح کے لئے کون سے بہترین ذرایع اختیار کئے جائیں اور زندگی کے وہ کون سے پہلو ہیں جن کو دیہات میں ترقی دینا ضروری ہے۔ اسی جلسے میں تمام متمدن اقوام سے جو انجمن کے ممبر ہیں یہ استدعا کی گئی تھی کہ وہ اپنے اپنے ملک کی دیہاتی آبادی کے حالات زندگی اور ذرایع و وسایل ترقی و اصلاح پر ادبی ذخیرہ تیار کرائیں۔ چنانچہ ابھی چند ماہ ہوئے کہ باوجود اس عبرت خیز ہنگامۂ خونیں کے جو یورپ کی سیاسی فضا کو غلیظ و مکدر کئے ہوئے ہے، ڈنمارک۔ ہالینڈ۔ فن لینڈ۔ انگلینڈ۔ فرانس۔ امریکہ، زیکوسلاویکا۔ اسٹریا۔ اٹلی، یوگوسلاویا اور روس نے قابل قدر ادبی ذخیرے تصنیف و تالیف کر کے انجمن کے پاس بھیجے ہیں اور اگر آپ چاہیں تو اپنے کتب خانے میں بیٹھ کر متمدن دنیا کی دیہاتی آبادی کی سیر کر سکتے ہیں۔ غرض اس لطیف اشارے سے صرف یہ ہے کہ وہ قومیں جو اپنی ہست و بود کی فکر اور بقائے دوام کی کوشش میں لگی رہتی ہیں، تعمیری کاموں کو ہمیشہ آگے بڑھاتی رہتی ہیں اور اگر ایک طرف ان کے سورما سپاہی میدان جنگ میں نار تگری کا خوفناک منظر شب و روز پیدا کرتے ہوتے ہیں تو دوسری طرف ان کے مفکرین ارتقا نسل و بقائے اصلح کے خاموش سرچشموں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تشنہ کام کی سیرابی کا سامان کرتے ہوتے ہیں۔

ہمارے صوبہ میں حکومت کی طرف سے یہ دفتر کھل چکا ہے۔ کیوں کھلا، اور پوشیدہ اغراض کیا ہیں؟ اس سے بحث نہیں محکمہ کرنا کیا چاہتا ہے، اس کی تفصیل بتلانا مقصود ہے۔ طریقۂ کار کیا ہے، اس کی واقفیت آپ کے لئے ضرور مفید ہے۔ افسوس کہ اس وقت تک اس محکمہ سے عام مسلمان علیحدہ رہے ہیں۔ اور اس تعلق سے اردو زبان کو بھی اس محکمہ میں بہت کم حصہ ملا ہے۔ اس کی تلافی کی طرف آپ کو مائل کرنا ہے۔ ورنہ آپ بحسرت یہ شعر پڑھیں گے۔

یاران تیز گام نے منزل کو جا لیا ہم وقف نالۂ جرس کارواں رہے

اس محکمہ کے قیام کی غرض یہ ہے کہ دیہاتی آبادیوں میں تعلیم، حفظان صحت، زراعتی ترقیاں، ان پڑھوں کی تعلیم، سلسلۂ رسل و رسائل، شفاخانے، اور کتب خانے وغیرہ کے اجرا، اور نظم و نسق کے سامان بہم پہنچائے۔ کام بہت اہم ہے۔ ایک زمانے سے یہ کام غفلت کا

شکار ہے۔ خود حکومت کے پاس وسائل اتنے نہیں ہیں کہ فوری ترقی کی امید کیجا سکے۔ سرِ دست ہر ہر ضلع میں دفتر کھولے گئے ہیں۔ ان کی فہرستیں اخباروں میں شایع ہوگئی ہیں۔ اور آپ جب چاہیں اپنے ضلع کے دفتر کے اخبار سے مل سکتے ہیں۔ اور آپنے قصبہ اور گاؤں کی اصلاح و درستی میں اس سے مدد لے سکتے ہیں۔

چند جملے ہمیں ادیبوں کی خدمت میں بھی پیش کرنے ہیں۔ ہم نے ادب و شاعری کا لطف بہت اٹھایا۔ ارٹ اور فنون جمیلہ کو بہت سراہا۔ روم و عجم کی داستانیں خوب پڑھیں اور پڑھائیں۔ اب ہمیں اپنے قلم کی گردش کو دیہی زندگی کے خط و خال اتارنے کی طرف بھی مائل کرنا ہے۔ دیہاتی زندگی کی معمولی باتیں، دیہاتیوں کے عادات و اطوار کی درستی، ان کی تعلیم اور روزگار کا مسئلہ اور اس طرح کی ہزاروں باتیں ہمارے اہلِ قلم کے لئے قابلِ توجہ ہیں۔ برادرانِ وطن اپنی زبان و ادب کو مالا مال کر رہے ہیں۔ مگر ہم "دیہات سدھار" کتب خانے نئے اُردو حصے کے لئے رسائل و ادب کی تلاش میں ہمارے یوپی، دہلی اور پنجاب کی خاک چھانکر بھی ایک سو رسالے اور کتابوں کی فہرست بمشکل تیار کر سکتے ہیں۔

عملی خدمت کی ترکیبیں بلاشبہ بدل گئیں۔ وہ چیزیں جو زندگی کی حقیقتیں ہیں۔ جاہل دہقان، بے مایہ کسان، مزدور، اس کی کس مپرسی زندگی، دیہات کے جھونپڑے، ان کی غیر مرتب زندگی، بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کے مشاغل، کمیتی اور کھیتی کی آبادی یا بربادی اور اس کے متعلق تمام مضامین ہمارے پختہ و خام مصنفوں کے لئے کافی دلچسپی پیدا کر سکتے ہیں۔ وقت کی ضرورت اس طرف آپ تمام حضرات کو پکار رہی ہے ——ع آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند۔

حقیقی اشتراکیت تو یہی ہے کہ ہم اپنے پسندیدہ تمدن کو ہر دہقان کی جھونپڑی تک پہونچا دیں۔ قومیں جھونپڑیوں میں رہتی ہیں شہروں اور محلوں میں نہیں بستیں۔ شہروں کی پرفضا سڑکیں، پُررونق بازار، سینما گھر، بجلی گھر، جادو گھر اور تمام دلچسپیوں کے گھر ہائیکورٹ اور چھوٹی عدالتیں، سکریٹریٹ کا دفتر اور کچہریاں، اور وہ تمام خوشگوار اور خوش منظر زمین و مکان، جن سے بہترین شہر بنتے ہیں، دیہاتی آبادی کے اضطرابِ سکون کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ محض "آنکھ کا فرق" ہے۔ اگر جذبِ دل پیدا ہو تو اس سکونِ اضطراب کی دنیا میں جس کو دیہات کہتے ہیں جو فطری لہر دوڑتی ہے۔ وہ شہروں میں نصیب نہیں۔

خدا کی مخلوق تو خدا کی بنائی بستی میں آباد ہے۔ دیہات کی اصلاح و ترقی قوم کی حقیقی اصلاح و ترقی ہے، کیا آپ کبھی فرصت کے لمحے میں اس حقیقت پر غور کریں گے؟ اگر آپ اس سلسلہ میں خدمت کا کوئی بھی جذبہ رکھتے ہوں تو ہمارا محکمہ دیہات سدھار آپ کی ہر قسم کی علمی معاونت کیلئے آمادہ ہے۔ ہمارے محکمہ کے نمائندے آپ کے ہر ضلع میں موجود ہیں۔ ان سے آپ اپنے دیہات کی ترقی کی خدمتیں لیں، وہ آپ کی خدمتیں بجالائیں گے۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔

جرعہ

از جناب اختر قادری ایم۔ اے

جب کالی گھٹا چرخ پہ چھا جاتی ہے — پینے کو طبیعت میری للچاتی ہے
کرتی ہے بہت فساد "توبہ" لیکن — رحمت کی امید کام آجاتی ہے

ایامِ شباب اور یہ چڑھتی برسات — مے دیکھ کے پھر رک نہ سکے میرے ہات
مجبوری میں پینا ہی پڑا آخر کار — مالک ہے تو میں تجھ سے چھپاؤں کیا بات

آثارِ علمیہ ادبیہ :-

چند مشاہیر کے خطوط ڈاکٹر سید محمود کے نام

بہار نمبر میں آثارِ علمیہ و ادبیہ کے تحت مشاہیر کے ایسے خطوط درج کئے گئے جو علمی، ادبی اور زبان کے گرانمایہ جواہر پاروں سے مالا مال ہیں۔ ہر خط کے ساتھ اس قسم کا قیمتی ذخیرہ۔ مخدوم محترم ڈاکٹر سید محمود کے پرانے کاغذوں میں بے ترتیبی سے موجود تھا۔ حالانکہ ان میں سے بیشتر مشاہیر علامہ شبلی، اکبر الہ آبادی، محسن الملک وغیرہ کے خطوط کے مجموعے غیر مطبوعی اہتمام سے شائع ہو چکے تھے۔ اگر جناب موصوف انہیں شائع کرانا چاہتے تو وہ ان کتابوں کے اجزاء بن چکے ہوتے لیکن قدرت نے انکو تقدیم کیلئے وقف کر رکھا تھا۔ حسن اتفاق کہ موصوف سے پٹنہ میں اس کا ذکر آیا ——— اور موصوف نے اس ذخیرہ کو ندیم کے حوالہ کر دینے کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ پہنچ کر موصوف کا حسب ذیل گرامی نامہ موصول ہوا :-

حیدرآباد — ۲۸ ربیع ۶

برادرم — تسلیم

میں آج پٹنہ جا رہا ہوں — جہاں نے فرمایا آپ مجھے وہاں ۳۰ مارچ کو ملیں — اسقدر زیادہ کاغذات میں کہ میں رکنے کی بکس میں لا رہا ہوں — فقط

خاکسار سید محمود

من جانب سے تھا وہیں سے بھروسہ

ناظم مطبوعات تحریر کے مطابق جب پٹنہ گیا۔ اور دو دن گھنٹوں بیٹھ کر جناب موصوف کی معاونت سے اس انبار کو ترتیب دیا جا سکا۔ ہم موصوف کی اس غیر معمولی عنایات کے تہ دل سے شکر گذار ہیں ——— اس قیمتی ذخیرہ میں جو انمول جواہر ہیں ہمیں ان کے متعلق کچھ زیادہ کہنا نہیں۔ کہ وہ خود آپ اپنی اہمیت اور اپنے افادی پہلوؤں کو آشکارا کریں گے۔

ان خطوط میں بیشتر حصہ انگریزی مکتوبات کا ہے جن میں سے مسٹر ڈبلو۔ اس بلنٹ، مسٹر آچ۔ بیوٹلر، مسٹر ہیربرٹ کرسٹین، مسٹر رولین پال سرولیم ریڈ برون، پروفیسر براؤن، سر سٹینلی ریڈ، سر تھیوڈور ماریسن، ایڈون ہیوان، سر ڈبلو آرنلڈ، مارما ڈیوک پکتال، مسٹر جون، رائمنشن، مسٹر چیرو (مشہور پامسٹ) وغیرہ یورپین فاضل اہل علم ارباب سیاست میں سے ہر ایک کے متعدد خطوط ہیں۔ پھر ہندوستانی ارباب سیاست میں رائٹ آنریبل سید امیر علی، سر علی امام، محسن امام۔ ڈاکٹر انصاری، پنڈت موتی لال نہرو مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی۔ گاندھی جی۔ پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ کے مکتوبات ہیں۔ پھر اردو مکتوبات علامہ شبلی نعمانی۔ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اکبر الہ آبادی مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ ——— مولانا عبد الباری فرنگی محلی۔ شمس العلماء ذکاء اللہ۔ حالی پانی پتی۔ شبلی عظیم آبادی۔ پروفیسر نواب علی مولانا عبد الماجد دریابادی۔ مولانا عبد الباری ندوی۔ مولانا ابو المحاسن محمد سجاد۔ جناب ہادی حسن۔ مسز ڈاکٹر گلیوم (مسز ڈاکٹر گلیوم) وغیرہ کے مکتوبات ہیں۔ نیز شگفتہ اردو میں ایک مکتوب پنڈت موتی لال نہرو (مع سوتی علیہ) کا بھی ہے۔ ذیل میں اردو کے چند خطوں کا عکس پیش کیا جاتا ہے۔ ہمیں یہ مناسب نظر آیا کہ یہ خطوط جس شکل میں ہم تک پہنچے بالکل اسی شکل میں ہو انکو ناظرین کی خدمت میں پیش کریں تاکہ وہ اکابر کی شان تحریر کی زیارت بھی کر لیں۔ ان مکتوبات کے جملہ مکتوب الیہ مرحوم ہیں۔ ان خطوں میں سے دریابادی صاحب۔ جو مولوی مسعود عالم ندوی کے نام ہیں۔ اور جو اس مخزنِ علم استاذ مولانا سید سلیمان ندوی کے ایک مکتوب کی نقل پیش ہے جسکو انھوں نے فراہم سے مولانا عبد الماجد کے نام لکھا تھا۔ افسوس ہو کہ تلاش و تجسس کی وجہ سے اس قیمتی انمول چند خطوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ "آثار علمیہ" کا باب ندیم میں پہلے سے قائم ہے۔ آئندہ بھی قائم رہے گا۔

عکس تحریر علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمۃ

بخدمت

سلام مسنون۔ آپ سے تو بیٹھ نہ اسیروں کا ایک بڑا سلسلہ
خط کیا تھا جو پیچھے شاد و شگفتہ ہو گیا تھا۔
یہ سچ کہ جب پر نظر ڈالی جاتی ہے تو کتب نظر کی آڑ
بنا بالکل بیکار ہوں۔ آپ جب تاثیر پورا جواب تو مجھکو
لکھئے بیٹھ تو دو ایک نسخہ کے لئے ضرور آجاؤنگا۔
رگھوبنس نولکشور کے چھاپے سے بیٹھ کچھ نقل کرنا ہے تو
بہت مشکل انگیز ہونے ہیں۔ آج جو شمارہ زیر نظر تھا وہ یہ کہ
نولکشور کے آنریبل کا دہلی بھیجنا بیٹھ کیا ہے دلائل
نبوت پر شق انگیز ہے قرآن کی آیت ہے
وما کنا لہ لا لانزل ھذا القرآن علی رجل من
القریتین عظیم۔ یعنی کفار کہتے ہیں کہ قرآن دو شہروں بیٹھ

کسی رئیس پر کیوں نہ اترا۔
عظیم کا لفظ رئیس اور صاحب ثروت و اقتدار کے لئے بولا جاتا ہے
اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت
کو دولت اور ثروت حاصل نہ تھی۔ اس سے بدنصیب کہاں تک
نبوت پر ثابت ہوتا ہے نولکشور کا رشد لال پیش
ہے بے لطف نہ ہوگا کہ ان کے رسالہ
سچا طبرھا ہے عجیب حماقتوں سے بھرا ہوا ہے۔ رسالہ ہے
ثابت کیا ہے کہ علم اور اسلام جمع نہیں ہو سکتے۔ پورا
رسالہ اسی بحث پر ہے۔ ذلک مبلغھم من العلم
مجھکو تو اس کام سے ننگ نظر آتے ہیں۔
آپ کا خط جی چاہتا ہے کہ فی الحال وغیرہ شائع کر دوں
کل یا فرداً۔ پھر جی چاہتا ہے کہ مجلس یا فیصلہ پر ہے
آپکا کام شامل کر دوں۔
مخلص
۵ اکتوبر ۱۹۰۱ء

عکس تحریر حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ

46 Ripoh Lane,
CALCUTTA.

192

بسم اللہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ تار اور پھر خط ملا آپکا خط رمضان سے چند یوم پیشتر آیا تھا اور میں نے بروقت جواب دیدیا تھا منتظر تھا کہ آپکا جواب آپکی جانب سے موصول ہو تو بعض امور موعودہ کی نسبت لکھوں۔ بہرحال اب آپ کا منتظر ہوں اور احتیاطاً خط کا جواب بھی روانہ کردیا ہے، بہار کیلئے میری جانب سے کبھی کوتاہی نہ ہوگی بشرطیکہ آپ پوری طرح مستعد رہیں گاندھی جی سے بعض ضروری امور طے کرنے ہیں اسلئے غالباً عید کی شام ہی کو بہار کیلئے روانہ ہوجاؤں اور پھر واپسی میں بانکی پور ٹھہروں آپ بہار کیلئے ایک منظم اور طے شدہ پروگرام تیار کر رکھیں اور میرے لئے ایک ایک دو صرف ان جگہوں میں ٹھہراؤں جہاں دائمی اور ناگزیر ضرورت ہو کیونکہ علاوہ بھی اور مرکزی خلافت کی ضروریات اور ناظر کے عاجز کن تقاضوں کے خود بنگال کا تمام کام دیکھنا ہے اور شوال میں اسکے بعد کا فروقت کسی نہایت ضروری ہے ۱۲ بجے سے ۲ بجے تک بنگال کیلئے قرار دیدیا ہے اور بعض مقامات کہ مطلع بھی کرچکا تھا لیکن آپکے خط کی وجہ سے بہار

کو ترجیح دی اور گنگا کی تاریخیں پیچھے ڈال دیں پس ان کا خط رہے کہ کم سے کم وقت دیا جائے صرف ہفتہ اور صرف ناگزیر اور واقعی ضروری ملاقات سرِ راہ منتخب کر لیے جائیں پھر حویلی میں ان شاء اللہ بقیہ ملاقات کا بھی دورہ ہو جائیگا ۔

امید ہے کہ آپکی اور گیان جنکا میرٹھ میں تذکرہ ہوا تھا خاتمہ ہو گئی بلکہ مزید حکم و استوار میں نے طے کر لیا ہے کہ کچھ دنوں سیت رہے اور آپکی خواہش کے مطابق سفر و حضر میں کمی کی ہری علی الخصوص سفر میں خدا چاہے کہ تو جب نتائج و ثمرات ہوگا

امید ہے کہ مسٹر مظہر محمد (جنکو رب بہ فاعدہ عام مولانا مظہر الحق کہنا چاہیے اگر وہ اس سے خوش ہو گئے) بدستور مشغول و منہمک ہو گئے ۔ اب آپ سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ آپکے آثار و اخلاص کو مزید قبولیت و ثمرات عطا فرمائے

فقیر ابوالکلام عفی عنہ

عکس تحریر مولانا محمد علی مرحوم

۱۹۲۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آنمخدوم

مزاج محمود۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محبت نامہ جلی سے کچھ تسلی ہوئی تھی۔ مدت سے کچھ علالت کے لئے، کچھ جامعہ کے لئے، کچھ دعوت و تبلیغ کے لئے، کچھ ملی دعوت پر کھا آیا تھا پھر بار آنے کا خیال ترک کر چکا تھا۔ شوکت نے مجبور کیا۔ محمد کو سخت بیمار اور بچوں کو فاقوں الحال چھوڑ کر آیا تھا۔ وقت کافی نہ تھا اسلئے کہ مسلم لیگ جلسہ کی صدارت کرنے کے لئے دلی جانا تھا۔ پھر اگر معلوم ہوا کہ جو توقعات شوکت صاحب نے اس کے متعلق باندھی تھیں غلط نہیں۔ پھر مطلق کام کیا جائے۔ [illegible]

[illegible] ..... اس کی وجہ سے یہ خط نہیں لکھا گیا، اور عالباً اسی سے پیشتر میں ایک تار بھی کہ علالت کا لکھ کر بھیجا تھا۔ بہار سے کئی روز کا ہفتہ سے یا لیا ہے اگر ساتھ چل سکو تو چلو

لہ ندیم بعض عبارتوں اور ناموں کو شائع کرنا مناسب نظر نہ آیا اس لئے انہیں حذف کر کے نقطے دیدے گئے ہیں

شوکت کے خلاف تعلق کیسے نہیں کہہ سکتا۔ مگر اتنا جانتا ہوں
کہ رسوا نے ..... کی ڈیوڈھی پر بار بار کر مجھے اس
کا کیا کہنا۔ ہیرے کی کان نکلا۔ سیدھا سادا دل کا
Character کے ایسے کا زمانہ ہی سب کا پر لیا
ہو رہا ہے۔ ہم لوگ دشمنا ملک اور رعونت ہست ہست
آرجر ..... سا زرگیر دزد طلب ملک پدر اور ملت دشمن
یا ..... سا بے عقل اور بے طرف اور حرامی یا .....
ملک دے دین دیندار رہے اور وہ خود سلمان خادم دین ہیں
جو مسلمان کہتے ہیں سمجھنا چاہئے ہیں۔ مگر ان علمہ
نے ہیں تو زمانے ملت ہیں دھر ملک رملت فروش حکومت کے
پیشتار نظر آتے ہیں جن پر ساری عمر خود ہم نہ کیا دیں اور کوسا
یہ کھو اپنا آلہ کار بنانا چاہتے ہیں۔ سو حسب ہم ماتوی
اور بیچے کے، یا بہروپ چنانچہ ہیں سے آلہ کار بنانے

اس طرح شفیع اور عبدالحکیم کی آرزو پوری ہوئی۔

اس وقت سودائی اپنے کو بالکل تنہا دیکھ کر
دعا کرنے لگا۔ اے رہنمائی اور مسلمانوں کو اور ہندوستان
والوں کو خدا کی سیدھی راہ پر چلا اور اس وقت تک استقامت دے
جبکہ یہ اپنے نئے رہنماؤں کی ہدایت کا فرا چکر پھر
ہمارے پاس آئے اور التجا کرے کہ چلو ہمیں انگریزوں سے
نکالو۔ ہندو اور مسلمان علیحدہ علیحدہ سے نجات دلاؤ۔ خدا وقت جلد لائے
یا کھلو جلد اس دنیا سے اٹھائے۔ آمین۔ یہ کہہ کر اور آنکھوں کو بند کر
تمہارا بھائی محمد علی

دارالاقامہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۹/۸ ۱۹ مئی ۱۹۳۰ء

آپ کا خط مجھے بڑی تشویش ہوئی ہے۔ سنئے آپ کا خط
ہمارے ایک ساتھی کے پاس گیا ہے۔ وہ آپ کو لکھیں گے۔
خدا کرے کہ ہم لوگ ریچھ کو چھوڑ دیں۔ انشاء اللہ
ہمت نہ ہاریں۔ ہم لوگ ہر طرح سے آپ کی مدد کریں گے۔
عبدالحکیم صاحب کا آپ کے پاس جانا بہت اچھا ہوا۔
خط میں کسی کا نام نہ لکھئے۔ آپ کا خط بہت احتیاط سے
ہونا چاہئے۔ ان کو ہر طرح سے مطمئن کیجئے۔

آپ کا بھائی
محمد علی

عبدالحکیم صاحب کو میرا سلام کہئے۔
اور میں نے جو کچھ لکھا ہے
اس کا ذکر کسی سے نہ کیجئے۔
ہم لوگ ہر طرح سے آپ کی مدد کریں گے
انشاء اللہ

عکس تحریر پنڈت موتی لال نہرو ماسوف علیہ

سوئس ہوٹل ۱۸ - جون ۲۵ء

ڈیر محمود - محبت نامہ سے سبک جواہر بھیجا - شاعر اپنا قدر بہ دل نہایت خوبصورتی سے لوا کیا - زمانہ بیشک تبدیل ہو گیا اور ہو رہا ہے مگر کوئی اصلی انسان یا پائیدہ خیال بدلتا نہیں جاتا - ایک برس میں اس پاس رکھتا ہوں اور لفظ ہم قسمت آپکی خواہش تقسیم کردوں گا - اسکی تک نہیں کہ آپ بڑی خوش قسمت ہیں - کسی دن کا کوئی اب حصہ نہیں دلکشی دنیا کی جہاں جاکر اب تو جاؤں اور کسی کی خوبصورتی تک نہ ہو اور نہ کسی خوبصورتی کو ہے - بہت کمی ہے مہمانوں کے احکام ہیں آپکی کان تک نہ ہیں کہ جو اسوقت عام دنیا میں گونج رہی ہیں - عدم تشدد کے نام سے قتل عام ہو رہا ہے - سوراج جو تو جو ہے ہی میں خارج کھو گئی ہیں - اب تک عام حملہ ہمارے آل انڈیا کانگریس پر صادر ہوا ہے جو کہ روزانہ آنے گنڈہ چرخہ کا تیقا اور ہر مہینہ ۱۵ تاریخ کو انتظار کا ہوا سوت دینے یا اوسی کے زمانے کے بعد ورود دفتر میں داخل کرنا ہے آل انڈیا کانگریس کے خاتمہ سمجھا جاوے گا - اور ہر آریہ سماجیوں کے بند ہاتھ کرنے اور غنیمت موجد سوراج دینا بند کرنے کی بالکل گمراہ ہیں نان کوآپریشن کے معنوں سے بالکل ناآشنا ہیں - غرضکہ

عکس مکتوب ڈاکٹر سر اقبال مرحوم بنام مولانا مسعود عالم ندوی

۲۸ رلرز ۱۹۳۰ء

مخلصی سلام علیکم

آپ کا مرسلہ خط معلوم ہوکر بہت مسرت ہوئی
مولوی عبدالعزیز صاحب میمن علیگ کے عزیز لکھتا ہے
مولوی سید سلیمان ندوی صاحب کی علالت کی خبر سن
بہت تردد ہوا۔ خدا تعالیٰ ان کو جلد صحت کامل عطا فرمائے
میری طرف سے ان صاحب میں حاضر ہوکر ہمدردانہ
ہر وقت ملنا و ہمدردی کا اظہار کرنا
ان کو دیر تک رہنے کے لئے۔

امید کہ آپ بخیر ہوں گے

مخلص محمد اقبال

نقشِ سلیمانی

یعنی

مکتوب حضرت علامہ سید سلیمان ندوی بنام مولانا عبدالماجد دریابادی۔ بی اے

حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی وفد خلافت کے رکن ہو کر مولانا محمد علی مرحوم وغیرہ کے ساتھ یورپ تشریف لے گئے تھے، یہ مکتوب حضرت مدوح نے فرانس سے مولانا عبدالماجد کے نام لکھا تھا۔ مکتوب ادبی لطافتوں کے ساتھ نئی معلومات کا حامل ہے۔ یہ ذاتی مکتوب اب ناظرین بہار نمبر کی خاطر وقف عام کیا جاتا ہے۔ ناظرین بہار نمبر کی خوش نصیبی ہے کہ یہ نوادر ان کے حصہ میں آئے۔

السلام علی مبلغ السلام[1]

ادھر چند ہفتوں سے میں جناب کے علمکدہ میں حاضر نہیں ہوا۔ عفو کا خواستگار ہوں، واقعہ یہ ہے کہ میں یکایک سخت بیمار ہو گیا، میرے پیٹ میں ہندوستان میں دو دفعہ درد ہوا تھا جو ریاحی سمجھا گیا، مگر جہاز پر قدم رکھنے کے ساتھ وہ مابانہ دورہ کی شکل اختیار کرتا گیا، یہاں تک کہ پچھلا دورہ ۱۹ جون کو اس قدر سخت پڑا کہ میں مایوس سا ہو چلا، اور اس سکرات کے عالم میں تمام مقدس ادعیۂ ماثورہ و کلماتِ طیبہ میں سے "مرو آزاد" (غالب) کا یہ شعر زبان پر تھا

مارا ہے بیخبر میں مجھکو وطن سے دور رکھ لی میرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

بارے علاج سے تسکین ہوئی، "گال بلیڈر" نام ایک بیماری تجویز ہوئی، اور صرف آپریشن اس کا علاج بتایا گیا، تین چار انگریز ڈاکٹروں کی یہی رائے ہوئی، مگر ہم لوگوں کے ایک کرم فرما ترک ڈاکٹر نہاد شاد نے جو پیرس کے اخبار "ایکو دی اسلام" (نوائے اسلام) کے ایڈیٹر ہیں باصرار کہا کہ آپریشن کے بغیر علاج ہو سکتا ہے، اور اس سلسلہ میں انہوں نے یہ خوب کہا کہ ہندوستان میں انگریز ڈاکٹروں کا اعتبار کتنا ہی ہو، لیکن یہ یہاں ان کو کوئی ڈاکٹر تسلیم نہیں کرتا، فرنچ ڈاکٹروں کے سامنے ان کی کوئی حیثیت نہیں، چنانچہ وہ خود مجھے لیکر امراض معدہ و جگر کے ایک فرنچ ماہر کے پاس گئے، اس نے دیکھا تو کہا کہ آپریشن کی ضرورت نہیں، اور طبی رائے میں ڈاکٹر رشاد کی ہر طرح تائید کی، بہرحال ان لوگوں کے مشورہ سے چند روز کے لئے دیشی (فرانس میں) قیام ہے، یہ معدہ و جگر کی بیماریوں کے لئے تمام دنیا میں ایک ہی صحت گاہ، یہاں ان بیماریوں کے بہترین ڈاکٹر ہیں، یہاں کے قدرتی چشموں کا پانی معدہ و جگر کے لئے اکسیر ہے، ڈاکٹر رشاد کے ایک فرنچ دوست یہاں ڈاکٹر ہیں ماہنہ کے زیر علاج ہوں، دوا یہ ہے کہ دن میں پانچ چھ مرتبہ مختلف چشموں کا پانی پینا، صبح اٹھ کر انہیں چشموں کے گرم حمام میں خاص طریقہ سے غسل کرنا۔

آپ نے اپنے عنایت نامہ میں اپنے مذہب[2] کی جو تفصیل کی ہے مجھے اس سے قطعاً اختلاف نہیں، دنیا میں امن و سلامتی کے دور کا مسلمان

---

[1] اس زمانہ میں مکتوب الیہ "امن عام" کے فلسفہ کے منادی تھے اور رچرڈ بال کی کتاب "پیام امن" کا ترجمہ کر رہے تھے۔

[2] یعنی امن و سلامتی کی عالمگیری اور ہر طرح کی لڑائی سے پرہیز۔

سے پرمضمحل خواہاں کون ہوگا، کمزور قوموں کے لئے تو یہ آواز نوید حیات ہے، لیکن میرا یہ کہنا ہے کہ اس آب حیات کی ضرورت ستمگر، جفا پیشہ، اپنی قوت و طاقت پر مغرور، امن و سلامتی کو اپنی تلواروں سے وابستہ سمجھنے والی قوموں کو ہے، آپ ہندوستان کی اسپرٹ کو امن و سلامتی کے وعظ سے کیا فائدہ پہونچا سکتے ہیں، ہاں اس سے یہ ہوگا کہ اس میں زندگی کی جو کچھ بھی روح ہے اس کا بھی خاتمہ ہو جائے۔ ع

جو خود ہی مر رہا ہے اس کو گر مارا تو کیا مارا

میری قسمت میں ہندوستان کے ہیروؤں سے ملاقات بھی وطن سے دور ہی مقدر تھی، لندن میں ٹیگور کا شرف دیدار نصیب ہوا اور پیرس میں ڈاکٹر بوس سے نیاز حاصل ہوا۔ ۲۰ جولائی کو پیرس کے عجائب خانۂ تاریخ طبعی (میوزیم آف نیچرل ہسٹری) میں ڈاکٹر موصوف کا لکچر تھا، یہ عجائب خانہ ایک وسیع عمارت ہے جس کے اندر نباتات و شجریات کا مجموعۂ عجائبات ہے، میں نے اس کو بالکل سرسری دیکھا، کیونکہ یہ میری دلبستگی کی چیز نہ تھی، ڈاکٹر بوس کا لکچر طبعاً نباتات کے توالے احساس پر تھا، حاضرین میں فرانسیسیوں کے ساتھ ہندوستانی طلبہ کا بھی مجمع تھا، برقی روشنی کا عکس سامنے کی دیوار کے پردہ پر ڈال کر اپنے ایجاد کردہ نازک و لطیف آلات کے ذریعہ سے اس میں نباتات کی نہایت ہی لطیف حرکت کا نقش دکھا رہے تھے، اور زبانی مسائل کو سمجھاتے تھے، وہ فرنچ نہیں جانتے، انگریزی میں تقریر کر رہے تھے اور ایک فرنچ پروفیسر ان کی انگریزی تقریر کا فرنچ میں لفظی ترجمہ سناتا جاتا تھا، تقریر کے بعد چند پروفیسروں نے ڈاکٹر موصوف کی تعریف کی، اس کے بعد ہندوستانیوں نے ان کو اسٹیج پر جا لیا، اور وہ اس ہالہ کے چاند سنکر ہمارے درمیان کھڑے ہو گئے۔ ایک دوست نے میرا تعارف کرایا، انہوں نے کہا کہ مسلمان مایوس نہ ہوں، ترقی امید کے سہارے چلتی ہے، پھر کہا کہ میں بھی ایشیا ہی کی خدمت کر رہا ہوں، اور بتاتا ہوں کہ ایشیا کا دماغ خدا کے عطیوں سے محروم نہیں، میں چاہتا ہوں کہ ہندوستانی ادھر بھی توجہ کریں، ڈرتا ہوں کہ میرے بعد یورپ یہ نہ کہے کہ بوس ایک مستثنیٰ ایشیائی تھا، ورنہ ایشیائیوں کا دماغ حقیقت میں اس لائق نہیں،

پیرس میں میں نے عربی کی چند کتابیں دار المصنفین کے لئے خریدی ہیں، اکثر تاریخ و جغرافیہ سے متعلق ہیں، ان میں آپ کے کام کی کوئی چیز نہیں یعنی فلسفہ کی کوئی کتاب نہیں، ہیئت پر ایک دو کتابیں ہیں، اور یہ سب یورپ کی چھپی ہوئی ہیں، جس مقام سے میں آپ کو خط لکھ رہا ہوں یہ اس شہر کا ایک کلب ہے، جس میں مختلف مقامات پر کئی ہزار کرسیاں پڑی ہیں، جس کے ممبر ہی ان پر بیٹھ سکتے ہیں، اب آپ سنئے کہ یہ تمام کرسیاں شروع سے آخر تک ہمیشہ معمور رہتی ہیں، اس کے ایک گوشہ میں تھیٹر ہے، دوسرے گوشہ میں رسٹوران ہے، ایک کمرے میں اخبارات ہیں، جن کو لوگ پڑھ رہے ہیں، اس کے مقابل کے دو بازوؤں کے کمروں میں میز کرسی اور پیچ پر خط لکھنے کے لئے لفافہ، کاغذ اور دوات و قلم ہیں اور یہ دونوں کمرے لکھنے والوں سے بھرے ہیں۔ سامنے لائبریری ہے اور لائبریری کے سامنے ہی قمارخانہ ہے، جہاں تمام دن شرفائے فرانس بیٹھے جوا کھیلتے رہتے ہیں، کھیلنے والوں کے چاروں طرف تماشائی ہیں، باغ کی ایک روش پر "لذت شب" کے سوداگروں کا بازار ہے، تماشا خود محو خرام ہے، اور تماشائی زر بجیب چکر کاٹ رہے ہیں، ایک اور طرف رقص و سرود کا سامان ہے، یہ مجموعی نیرنگی اور ایک ہی دسترخوان پر صف بصف مختلف الوان طعام، فرنچ تمدن کی خاص خصوصیت ہے، کیا آپ ہندوستان میں بھی یہی نقشہ چاہتے ہیں؟

افسوس کہ میں "اہل تجربہ" میں نہیں، ورنہ مجھ "نیچرل میوزیم" کی "ہسٹری" بھی سنانا، دور سے دیکھنا ہوں اور سہم جاتا ہوں کہ یورپ کے علم کا سایہ جس سرزمین پر پڑا وہ اسی رنگ میں رنگ جاتا ہے، فلسطین اور عراق انگریزی برکات کے ظل ہمایوں میں، اور بلاد شام فرانسیسی ندیم ازل کے زیر سایہ انہیں سعادتوں سے مالا مال ہونگے، اب آپ سنیں گے کہ بیت المقدس میں، مقام خلیل میں، خانقاہ بغداد میں، مدفن بلال میں، مرقد حسن بصری میں، مقتل حسین میں، کس قدر قمار خانے، کس قدر فحبہ خانے، اور کس قدر دار الفواحش قایم ہوئے ہیں، اور تھیٹروں اور سینماؤں کے لئے ان مقامات مقدسہ کے کون کون سے موزوں قطعے منتخب ہوتے ہیں،

ترکوں کے عہد حکومت میں یہ چیزیں قانوناً ممنع تھیں، کیونکہ وہ جفاکار وحشی تھے، اور اب تو آزادی کا دور دورہ ہے، یورپ ہمکو اخلاقی آزادی بخشتا ہے، کیوں؟ تاکہ ہم سیاسی آزادی کے قابل نہ رہیں، ورنہ وہ کون سی آزادی ہے جو مغربی اقوام کے ماتحت مشرقی قوموں کو نصیب ہے، یہاں الجزایا کے مسلمانوں سے بکثرت ملاقاتیں ہوئیں، وہ اپنی آزادی کی وہ دردناک کہانی سناتے ہیں کہ آپ اپنے امن کا افسانہ اس کے سامنے بھول جائیں،

اب میرے پانی پینے کا وقت آگیا اسلئے خط تمام کرتا ہوں اور "گرادی تال" "چشمہ کا گرم، شور، بانی پینے جاتا ہوں، سلام رخصت

سید سلیمان، یکم اگست

ادبیات:-

عام فہم

از علامہ فضل حق آزاد عظیم آبادی

جھوٹ ہے اُس کے نہ آنے کا بہانا کیونکر
رو کے رکھتا ہے اب آنسو کا بہانا کیونکر

جسکو تا کام مرے عیار نے مارا نس کو
قدر انداز جو چوکے تو نشانہ کیونکر

دست نازک سے اگر پھول بھی وہ مایۂ ناز
پھینک مارے تو اتر جائے نہ شانہ کیونکر

دل دانا میں نہ ہو راز نہاں کیوں پنہاں
ایک خرمن ہی چھپائے ہوئے دانہ کیونکر

مشتِ گل گھموں کے زر باد خزاں نے لوٹا
ہو جو مسک نہ گئے اس کا خزانہ کیونکر

کل یوم ہونی شان کا مضمون ہے قدیم
جس میں حدت ہو بھری ہو وہ پرانا کیونکر

صبح کی سیر میں ہو ہمدم ہمرنگ کا ساتھ
وقت دلخواہ ہو ایسا نہ سہانا کیونکر

آنکھوں سے دیکھتے ہیں سنتے ہیں سب کانوں سے
مرد یک حشم کو پھر کہتے ہیں گانا کیونکر

عام فہم اس سے زیادہ ہو غزل کیا آزاد
نہ سمجھ والوں کا پلٹ آئے زمانہ کیونکر

عاشق ناکام

آبرو عاشق ناکام سے ہے سودا کی
قیس کے بعد وہ رونق نہ رہی صحرا کی

قیس ناکام کی وحشت نے بڑھائی شہرت
درد اک کو فت جو تھی خاص وہ تھی لیلےٰ کی

میں نے دیکھے ہیں بہت دشت میں خوش چشم غزال
شوخ چشمی تری دیکھی نہ تری چالاکی

تیرا ناکام جو ساحل کی طرف جا نکلا
آئی پابوس کو ہر موج رواں دریا کی

بوس در میں ہوا مائل دنیا طلبیاں
تو نے اے مرد خدا عقل و درایت کیا کی

مشغل امروز میں اتنا بھی نہ ہو تو مشغول
دل کو معلق نہ رہے فکر کوئی فردا کی

گھورنا اب بھی حسینوں کا نہ چھوٹا ہے ہے
دیکھے آزاد کی مسجد میں کوئی بے باکی

تعزیرات عشق

مجرم عشق بتاں لائق تعزیر نہیں
قید زلف کو کچھ حاجت زنجیر نہیں

حسن اخلاق سے بھی ہوتے ہیں دل گردیدہ
جس میں ہو ناوک دل دوز وہی تیر نہیں

عالی العزم جوانوں میں جوان سال کہاں
پیر ہے پیر اولوالعزم تو وہ پیر نہیں

کیا کرے عاشق بدحال پریشاں خاطر
آپ کو شرم نہیں آہ میں تاثیر نہیں

خیر کفارۂ عصیاں ہے پلا اے ناصح
کھول تو قل کے دہن خیر میں تاخیر نہیں

آج کل صحبت آزاد مقطع ہے بہت
بادہ و بنگ نہیں چنگ و مزامیر نہیں

لہ شعرائے حال مائی تخلص کو قافیہ میں لانے سے بدنا ضروری سمجھنے لگے ہیں حالانکہ حروف کو تلفظ سے بحث ہے نہ کتابت سے۔ خاقانی۔ کرد والنصب راوان مو لوا آدم من دونہ ۔ ۱۲ اسلئے کہ وہ قد رانماز ..... ہی نہ ہوگا جو نشانہ چوکے ۱۲ گوش گردن یعنی بلند گوش ہونا چاہئے تھا یا یعنی اور۔

جذبات مبارک

از تاجدار سخن یادگار داغ حضرت مبارک عظیم آبادی

عشق کی چوسر کس نے کھیلی یہ تو کھیل ہمارے ہیں
دل کی بازی مات ہوئی تو جان کی بازی ہاری ہیں

کیسے کیسے لختِ جگر ہیں کیا کیا دلکے پارے ہیں
ایسے لعل کہاں دنیا میں جیسے لعل ہمارے ہیں

اِسکو مارا اُسکو مارا یہ بسمل وہ لوٹ گیا
نوک پلک ابرو سے ڈریئے قاتل انکے اشارے ہیں

صدقے تیری محبت کے کیا داغ محبت ہاتھ آئے
باغ میں ایسے گل بوٹے نہ فلک پر ایسے تارے ہیں

چتون میں کی قہر الٰہی تیور جن کے قہر خدا
کون کہے ان بانکوں سے یہ تم نے ناوک مارے ہیں

سیر ہوئی کب چشم تمنا ذوقِ نظر بڑھتا ہی گیا
سیر جمالِ یار کی ہے کس لطف کے یہ نظارے ہیں

چھلنی چھلنی دل بھی جگر بھی روزن روزن سینہ بھی
ایک نگاہِ ناز نے تیری تیر ہزاروں مارے ہیں

کلبۂ احزاں گوشۂ عزلت حاصلِ لطفِ تنہائی
دنیا ہم سے کنارہ کش ہے ہم دنیا سے کنارے ہیں

اِسکی چمک پر جان تصدق اسکی کسک پر دل صدقے
دردِ محبت کی تکلیفیں راحت کے گہوارے ہیں

پھونک ہا دِ سوزِ نہانی کون اس آگ پہ ڈالے پانی
دل کی لگی نے آگ لگادی داغ نہیں انگارے ہیں

لالہ رخوں میں عمر گذاری اور بہاریں بھی لوٹیں
آج بھی گل سے گالوں والے مجھکو مبارک پیارے ہیں

بادۂ عرفاں

از جناب سید شاہ اکرام الدین احمد صاحب عرفاں رئیس اسلام پور پٹنہ

تو ادھر مست طرب محو خود آرائی تھا
دل ادھر محو طلب تیرا تماشائی تھا

لے گئی آہ وہ سب اک نگہ شوخ تری
دل کا سرمایہ جو دعوائے شکیبائی تھا

مل گیا خاک میں وہ ضعف کے ہاتھوں یکسر
دل میں میرے جو سر بادیہ پیمائی تھا

کیا کہوں شعلۂ دشت نوردی ہمدم
آہ کچھ بھی نہیں جز آبلہ فرسائی تھا

کیا کھلایا ہے گل زخم شہیداں سے چمن
اس ستمگر کو جو ذوق چمن آرائی تھا

اختلاط اہل جہاں سے نہیں کہتا تھا میں
سچ ہے یہ امن کی جا گوشۂ تنہائی تھا

اب یہ کہتا ہوں کہ مٹی اپنی جو ہستی صد حیف
اسی ہستی پہ مجھے دعوی پیدائی تھا

ہے گل عارض جاناں کی یہ خوشبو ورنہ
کب صبا تجھ میں یہ انداز چمن سائی تھا

شان کیوں بڑھتی نہ گلزار جہاں کی اس سے
حسن تیرا گل صد خوبی و رعنائی تھا

بزم ایجاد کا تو صدر نہ ہوتا کیونکر
خاص تو ہی سبب انجمن آرائی تھا

جان دی عشق میں عرفاں نے خردمندی سے
لوگ کہتے ہیں کہ دیوانہ تھا سودائی تھا

نالۂ بلبل

از بلبل بہار حضرت سرور میناوی کابری گیاوی

کوئی یہ کہہ گیا ٹھوکر لگا کر میری تربت پر
کہو اب بھی نہ کیا ایمان لاؤ گے قیامت پر

ہمارا قتل آساں ہی اگر تم کو طبیعت پر
تمہیں قاتل کہے گا کون بھولی صاحب صورت تر

ابھی اے جوش گریہ ضبط غم سے کام لینا تھا
ڈبویا مجھکو پانی پھیر گیا راز محبت پر

تہ خنجر یہ منظر بھی عجب منظر تھا اے قاتل
گڑے تھا ترا خنجر نظر تھی تیری صورت پر

یہاں تو وعدۂ دیدار تم نے حشر پر ٹالا
قیامت میں اٹھا کر گھونگھٹ اسکو کس قیامت پر

سر مرقد کہاں کی شمع کیسی پھول کی چادر
فقط اک بیکسی سر پھوڑتی ہے سنگ تربت پر

خیال نصح یا پاس آبرو و شرم رسوائی
یہ سب ہو جب رہی تھوڑا سا قابو بھی طبیعت پر

اثر کرتا ہے پتھر کے بھی دل میں حسن و شیدا ہے
دم زینت مجھے سکتہ ہے آئینہ کی حیرت پر

دوا کا ذکر کیا ہے آب خنجر کو ترستے ہیں
ستم یہ ہے کہ پانی پند ہے بیمار فرقت پر

اٹھانا آئینہ اور مسکرا کر ان کا فرمانا
مجھے تھی اب تو رشک آنے لگا ہے تیری قسمت پر

ستم سے تھک گئے ہیں بات کا پہلو بدلتے ہیں
ترس آ ہی نہیں سکتا انہیں میری مصیبت پر

کسی کی تو یہ رہ سکتی نہیں برسات میں ساتی
اٹھا بادل تو بجلی گر پڑی زاہد کی زیت پر

سرور اپنی جفائیں جیسیں دشمن کے ہے طعنے
ملیں وہ دوسرا میں مجھ کو اک برم محبت پر

افکارِ جمیل

از حضرت جمیل مظہری ایم اے پبلسٹی آفیسر صوبہ بہار

میں شبِ فراق کا خواب خوش ہوں جہانِ ناز و نیاز میں
میری زندگی نے حقیقتوں کو بدل دیا ہے مجاز میں

نہ فروغِ حسن ہے مضمحل نہ مزاجِ عشق ہے معتدل
وہی ایک محشرِ آب و گل کہیں سوز میں کہیں ساز میں

مرے شوق نے جو تری نظر سے ترے جہاں پہ نگاہ کی
تو نہ پستیاں تھیں نشیب میں نہ بلندیاں تھیں فراز میں

جو فزوں ہے جذبۂ بندگی تو ہے شوق مائلِ بت گری
کہ ازل سے فطرتِ آذری ہے مرے مذاقِ نیاز میں

جو یہی مزاج ہے حسن کا تو کسے ہو عشق کا حوصلہ
نظر آ رہا ہے کسی کا دل مجھے شمع تیرے گداز میں

ترے گیسوؤں ہی کی داستاں پہ نہیں ہے ختم یہ داستاں
کہ جنوں کا اور بھی سلسلے ہیں ہوس کی لفِ دراز میں

یہ خودی کہ عارضِ مہوشاں میں بھی محوِ خود نگری رہا
مرا آئینہ جو بنا ہوا تھا مذاقِ آئینہ ساز میں

نہ کہیں جہاں میں جگہ ملی تو نمود حسن میں کھل پڑیں
وہ حقیقتیں جو مچل رہی تھیں کسی کے سینۂ راز میں

یہ وہ زندگی ہے جمیلؔ سے بھی جو آج تک نہ سلجھ سکی
جو الجھ گیا سو الجھ گیا خم و پیچِ زلفِ دراز میں

نقوشِ عابد

از جناب سید زین العابدین صاحب عابد نقوی ایم۔ اے (منصف اول) گیا

گئے دین و ایماں بھی اس عاشقی میں
خدا جانے کیا کہہ دیا بیخودی میں
تمہیں نے زمانہ سے مجھکو چھڑایا
تمہیں یاد آتے ہو اب بیکسی میں
مرے عشق کے حوصلے بڑھ رہے ہیں
مزا آ رہا ہے تری بے رخی میں
یہ کیوں اپنے جلووں کو دیتے ہو زحمت
بھلا ہوش باقی بھی ہے اب کسی میں
مجھے اپنی ہستی کا احساس ہوتا
نہ وقت آیا ایسا کبھی زندگی میں
تڑپتا ہوا دیکھ لو آ کے مجھکو
مرا غم منا لو مری زندگی میں
اُسی سمت ہے منزلِ عشق اے دِل!
نگاہیں مڑیں جس طرف بے بسی میں
کیا اعتبار اُن کے وعدوں پہ عابد
نظر آئی تسکیں کی صورت اسی میں

اِدّعا

از حضرت تمنا عمادی مجیبی بھوارڈی

دل نشیں ہوتی نہیں طرزِ بیانِ ادعا
کند ہے ہر چند قینچی ہے زبانِ ادعا

رفعت افزائی ترقع میں نہیں اے مدعی
پست ہے گو فاختہ اونچی ہے شانِ ادعا

یاد رکھو وہ اسے واپس ہی کر دیگا تمہیں
جس کے آگے لے گئے تم ارمغانِ ادعا

کچھ مزا آئے نہ ان کا ہو سکے سقمِ صحیح
لاکھ ہیں الواں نعمت زیب خوانِ ادعا

سننے والے سن نہیں سکتے ہیں تھوڑی دیر بھی
اور ہوتی ہے مطول داستانِ ادعا

تم غلط سمجھے ہو اس کو رشتہ بامِ عروج
ہے یہ قعرِ مذلت نردبانِ ادعا

مدعا کھو بیٹھتا ہے با تو سے دو دمی
جس کے دعوی پر ہو سامع کو گمانِ ادعا

اس کا چہرہ زرد نہیں سکتا چڑھانے سے کبھی
صرف کھلائے گا حریر ہے کمانِ ادعا

سر کے بل گرتا ہے آخر منہ اٹھا کر جو چلا
سنگ کی کھاتے ہیں سر سر خوگرانِ ادعا

شکلِ محبت کی ہو کیوں پیدا دمِ عرضِ دلیل
کیوں کوئی دعوی کرے کوئی بسانِ ادعا

تم نے تو جب سے تمنا دونوں آنکھیں پائی ہیں
فلک مغروں ہی کو دیکھ تر زبانِ ادعا

مئے ہے دو میخانوں کی اک جام میں

از یادگار حضرت کوثر خیرآبادی جناب رضا بھدانی رئیس گیا۔ ایم۔ اے (ٹرپل) گولڈ میڈلسٹ

(ایک قافیہ کا رنگ تغزل)

وہ کہاں ہے گردشِ ایام میں
جو مزہ ساقی ہے دورِ جام میں

ہے نہاں حسرت دلِ ناکام میں
مئے بھری ہے ایک ٹوٹے جام میں

آہ جوشِ الم سے دل میں اٹھے
ہے شرابِ تند اٹلے جام میں

چشمِ ساقی کا تصور دل میں ہے
مئے ہے دو میخانوں کی اک جام میں

میکدے میں شیخ نے چپکے سے کل
رکھ لئے توبہ کے ٹکڑے جام میں

آہ او ساقی کی چشمِ نیم باز
مست ہو جاتا ہوں آدھے جام میں

مٹ کے بھی ہم مٹ نہیں سکتے کبھی
ہے بقا کی ہی فنا کے جام میں

لطف یہ ہے فیضِ کوثر سے رضا
بادۂ کوثر ہے میرے جام میں

رنگِ شفق

از مولانا ابو احمد عبدالوہاب صاحب شفق ایڈووکیٹ بگہا

کشمکشِ حوادث میں زندگی ایک خواب ہے
سلسلۂ سکون میں لمحۂ اضطراب ہے

عالم معرفت کو دیکھ جسکی فضائے نور میں
ذرہ بے وجود بھی ہمسر آفتاب ہے

معرفت وجود میں "موت" خود ہی کہاں
قطرہ "ہوتے" بحر میں لفظ "نا" حباب ہے

"آہ" کے بجھوں میں ہے آتش عشق کا دھواں
سینۂ سرد اہل دل مرکز انتساب ہے

جرعہ ہو دعا بنا میں لاکھ سر بفلک عمارتیں
چین کہاں سے لے اگر خانۂ دل خراب ہے

ناظرو میں نہاں کچھ تو ضرور ہے سرور
ورنہ سبب ہی کیا کہ نام اس کا شراب ہے

بادۂ نوران عشق کو نہ کدۂ سلوک میں
یاد حبیب جام ہے صبر و سکوں کباب ہے

تیری رضا بنا سکی دونوں سے دل کو بے نیاز
ایک طرف ثواب ہے ایک طرف عذاب ہے

عہد حیات ہے شفق مژدۂ فکر آخرت
لہو و لعب طفولیت جوش جنوں شباب ہے

کیف متغزل

از

جناب سید شاہ ولی الرحمن صاحب قادری ایم اے ڈپٹی مجسٹریٹ مونگیر

ادھر بھی آ تجلیوں کا کارواں لئے ہوئے
لب تبسم آشنا میں بجلیاں لئے ہوئے

بتا دے بزم میکدہ کو اک جہان بیخودی
نظر کے جام میں شراب ارغواں لئے ہوئے

دکھا کمال دلبری کرشمۂ فسوں گری تو
چار سمت انکھڑیوں میں خوبیاں لئے ہوئے

جمال برق ریز میں شباب فتنہ خیز میں
متاع عقل و ہوش کی تباہیاں لئے ہوئے

جفا ہو غیرت وفا ستم ہو رحمت کرم
جو چہ پہ چور ہو خیال امتحاں لئے ہوئے

کمی نہیں ہے آنسوؤں کی میرای چشم زار میں
ہر قطرہ قطرہ ایک بحر بیکراں لئے ہوئے

تری غزل کے طرز پر دلی ہزار آفریں
زمین شعر ہے طلوع آسماں لئے ہوئے

کوئی دیوانہ بنتا ہے کوئی دیوانہ ہوتا ہے

از

جناب اودھ کشور پرشاد صاحب کشتہ گیاوی

بہار آتے ہی یوں صحن چمن میخانہ ہوتا ہے
کہ اک اک پھول کھل کر صورت پیمانہ ہوتا ہے

جو ساقی کی نگاہ مست کا دیوانہ ہوتا ہے
وہ کب محتاج جام و ساغر و پیمانہ ہوتا ہے

وہی شمار ہوتا ہے وہی فرزانہ ہوتا ہے
جو تیرے عشق میں وارفتہ و دیوانہ ہوتا ہے

کسی کے حسن و صورت پر کسی کے عشق و الفت میں
نہ ہر دیوانہ ہیں ہوتا نہ ہیں ہر دیوانہ ہوتا ہے

تم اپنے چاہنے والوں کو چشم غور سے دیکھو
کوئی دیوانہ بنتا ہے کوئی دیوانہ ہوتا ہے

ہماری بادہ خواری کی کرامت دیکھ اے زاہد
جہاں ہم بیٹھ جاتے ہیں وہیں میخانہ ہوتا ہے

محبت میں کبھی جلنے کی جل کر خاک ہونے کی
ضد ہوتی نہیں پروا ویسی پروانہ ہوتا ہے

جنوں افزا تھا کتنا یہ میرے معشوق کا کہنا
کہیں دیوانہ بننے سے کوئی دیوانہ ہوتا ہے

مجھے بسمل بھی دل سے یاد کر لیتے ہیں اے کفتہ
جہاں بزم ادب کا جلسہ سالانہ ہوتا ہے

لبریز مئے شوق یہ ساغر تو نہیں ہے

از جناب توحید عظیم آبادی

ہمرنگ مرے دل کا گل تر تو نہیں ہے
لبریز مئے شوق یہ ساغر تو نہیں ہے

شرمندۂ احساں ہوں ترا اے طپش شوق
میں جیسا ہوں ایسا کوئی مضطر تو نہیں ہے

رہ رہ کے کھٹکتا ہے یہ کیا سینے کے اندر
حسرت جسے کہتے ہیں وہ نشتر تو نہیں ہے

کہتے ہیں کہ تم جیسے ہو ایسے بہت عاشق
ہم جیسے ہیں ایسا کوئی دلبر تو نہیں ہے

ارمان نکلتا نظر آتا نہیں اپنا
شمشیر تری میان سے باہر تو نہیں ہے

دل میرا سنبھلتا بھی نہیں بات میں تم سے
پھر یہ بھی کہے جاتے ہو مضطر تو نہیں ہے

سنتے ہیں مرے شعر تو وہ کہتے ہیں توحید
دیوانہ ہے کمبخت سخنور تو نہیں ہے

ہوتی ہے ابتو وحشت دو چار آدمی میں

از جناب سید بدرالدین احمد صابر رضوی مخدوم آبادی سہریکی

جس سے گذر نہ جائے ہرگز کوئی خوشی میں
دیکھا گیا ہے آنسو کرتے ہوئے ہنسی میں

جو کچھ نہ ہو وہ تھوڑا ہے نفس پروری میں
ممر عزیز کھوئی دشمن کی دوستی میں

ناموس کی بھی پروا رہتی نہیں ہے باقی
کر بیٹھتا ہے سب کچھ انسان بے بسی میں

ہوش و حواس رکھ کر سنبھلے تو کیا عجب ہے
جب تکلف تھا کہ لغزش ہوتی نہ بیخودی میں

دل ڈوبے ہے ہیں اسکو ہم بوفا سمجھ کر
اللہ یہ اندھیرا اور وہ بھی روشنی میں

تھا دوستوں کا مجمع اکدن خوشی کا باعث
ہوتی ہے اب تو وحشت دو چار آدمی میں

دولت بھی صابر کو کچھ ہوتی تو کیا نہ کرتا
شاہوں سے بھی غنی ہے دل اس کا مفلسی میں

پھول

از جناب شاہ علی شطاری صاحب رئیس پنہسہ

روکش ہوئے چمن میں جو اس گلبدن کے پھول
غیرت سے زرد پڑ گئے سارے چمن کے پھول

لہ جناب عبدالمنان صاحب بیدل - پروفیسر پٹنہ کالج
سے بزم ادب پٹنہ کالج

یکساں گواہ ہیں تری صنعت کے خار و گل
ہیں آنکھ والوں کے لئے کانٹے بھی بن کے پھول

ہر دم ہے انقلاب یہاں کس کو ہے ثبات
دو دن کی تازگی پہ نہ پھولیں چمن کے پھول

بزم جہاں میں کون ہوا کس کا آشنا
غافل! اس انجمن پہ نہ بے مغز بن کے پھول

ہر دم ہے تیغ فرقت جاناں سے لالہ زار
ہیں کیا سدا بہار دل پر محن کے پھول

آنکھیں اگر ہیں انکی بھی نرگس کے پھول ۔ موں
قطرات اشک اپنے بھی ہیں نسترن کے پھول

دشنام میں بھی اس کے عجب لطف ہے علی
گویا برستے منہ سے ہیں اس گلبدن کے پھول

کمال رضا

از مولانا حکیم سید محمد طہ صاحب کمال ندوی

جس حال میں رکھتے ہو اس حال میں رہتے ہیں
ہم ناز اٹھاتے ہیں ہم جور بھی سہتے ہیں

اچھا ہی جو کہتے ہیں وہ ان کو زلال دل!
میں اشک انہیں سمجھوں آنکھوں سے جو بہتے ہیں

اللہ ری ناچاری اکثا کے کہے ہمدم
رو رو کے خدا جانے کیا بات یہ کہتے ہیں

در پر ہیں کبھی آنکھیں دیوار کو تکتی ہیں
یوں کلبۂ احزاں میں اب ہم پڑے رہتے ہیں

جس حال میں وہ چاہیں رکھیں بخوشی ہم کو
مرضی پہ کمال انکی ہم شوق سے رہتے ہیں

تمہیں کیا ہو گیا کیوں چشم تر ہے

از جناب سید محمد ایوب قمر انگلوی

ستارہ بخت کا آج اوج پر ہے
مرے پہلو میں وہ رشک قمر ہے

نہ اب انکی نہ اپنی ہی خبر ہے
مآل زندگی درد جگر ہے

جلے جاتے ہیں مثل شمع اغیار
کرم کی مجھ پہ جو انکی نظر ہے

تغافل کا تری لے جا ہے شکوہ
میری آہوں میں خود ہی کب اثر ہے

ستم ہے مسکرا کر ان کا کہنا
تمہیں کیا ہو گیا کیوں چشم تر ہے

ہمارے زخم دل کا حال سنکر
لگے کہنے یہ الفت کا ثمر ہے

سوئے میخانہ واعظ جا رہا تھا
سنا ہے اب تو وہ کچھ راہ پر ہے

وہی ہے جستجو لیلیٰ حسن کی
وہی بیتابیٔ قلب و جگر ہے

جناب خندہ کا ہی فیض اے قدر
کہ تمکنت آفرین تیری نظر ہے

بادۂ میکش

از جناب مشہود عالم میکش عظیم آبادی۔ جمشید پور

گر کر قدم پہ ساقی رعنا کے پی گیا
مائل بہ لطف اسکو غرض پا کے پی گیا

اے ہوش! تیری خیر ہو ساقی کے ہاتھ کو
پیمانہ لیکے آج میں کھسرا کے پی گیا

جب میری بیخودی کو مٹانے لگی خرد
بدمستیوں کی اپنی قسم کھا کے پی گیا

میخانۂ خیال کی بدمستیاں نہ پوچھ
بادل شراب عشق کے برسا کے پی گیا

میکش ہوں میش غم کو سمجھتا ہوں نوش جاں
خنداں آنسوؤں کو آنکھ میں چھلکا کے پی گیا

رباعیات:-

"رباعیاتِ صبیح"

از مولانا سید شاہ صبیح الحق صاحب عمادی خانقاہ عمادیہ - پٹنہ

ظاہر میں اگرچہ دلربا ہے دنیا
لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کیا ہے دنیا
پھندے میں نہ اس کے کبھی آنا اے دل
آفت ہے، مصیبت ہے، بلا ہے دنیا

مانا کوئی راحت مری قسمت میں نہیں
قسمت کو بدلنا بھی تو قدرت میں نہیں
ہوگا وہی، ہوگی جو خدا کی مرضی
انسان کا کچھ دخل مشیت میں نہیں

اس عشق میں آتی ہے ملا روز نئی
دکھلاتے ہیں وہ اپنی ادا روز نئی
عاشق ہیں نئے ہم نہ وہ معشوق نئے
ہوتی ہے مگر ہم پہ جفا روز نئی

اگلی سی زمانہ کی وہ حالت نہ رہی
وہ ربط بہم اور وہ الفت نہ رہی
اپنوں ہی نے اس طرح کے آزار دئے
غیروں سے مجھے کوئی شکایت نہ رہی

افکارِ فلسفی

از جناب مولوی سید راحت حسین صاحب فلسفی بی - ایل -

کبھی اسرارِ محبت کا میں دم بھرتا ہوں
کبھی فطرت کے حقایق پہ نظر کرتا ہوں
جان کیا چیز ہے؟ میں کیا ہوں؟ یہ دنیا کیا ہے
رازِ سربستہ! تماشوں پہ ترے مرتا ہوں

غافل نہ ہو بے دلی کا عادی
جب تک نہ ہو وقت دل میں پیدا
ہے اس کا نتیجہ، نامرادی
بڑھتی نہیں قوتِ ارادی

ہستی

از مولوی سید محمد ایوب صاحب شمیم ندوی

مشہور ہے دنیا میں حباب ہستی
ہے بلبلہ پانی کا شباب ہستی
ہاں دیکھ کے مضراب لگا نغمہ سنج
اک ضرب میں ٹوٹے گا رباب ہستی

نوٹ:- (بقیہ رباعیات ملاحظہ ہوں صفحات ۴۰۸-۴۱۰-۴۲۱-۴۲۳ پر)

تصویرِ جذبات:-

حسن و محبت کا تذکرہ

از جناب سید عزیز الحسن صاحب ضیا بارہ بنکوی

کوئی شخص حسن و محبت کا نام نہ لے۔
کوئی شخص حسن و جمال کے تذکرے نہ کرے۔
میرا غم آلود دل اس کے تذکرے سے رو رو اٹھتا ہے
میں حسن و محبت کی باتیں سن سن کر پریشان ہو جاتا ہوں
اس لیے کہ آہ!
میں نے بھی کسی سے محبت کی تھی!
میں بھی حسن و محبت کا دلدادہ تھا۔
مدتوں میں اس کی محبت میں سرشار رہا۔
ہائے! احباب دنیا میں باقی نہیں
یہ خیال کتنا حزن آمیز ہے کہ انسان جس سے محبت کرے، وہ باقی نہ رہے!
جس سے ساری امیدیں، ساری خوشیاں وابستہ ہوں،
وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلے،
وہ ایسی نیند سو رہے، جس کو دنیا کی کوئی آواز جگا نہ سکے!
ہائے یہ خیال کتنا ملال پرور ہے
جب وہ زندہ تھا، میں کن کن خوشیوں سے خود کو گھرا ہوا پاتا تھا!
جب وہ قیدِ حیات تھا، میری دنیا میں بھی چاندنی امرت لٹاتی تھی،
میری دنیا میں بھی پھول کھلتے تھے ــــ طرح طرح کے پھول
میرے دل میں بھی آرزوئیں تھیں، تمنائیں تھیں۔ اسوقت میرا دل ایک
نوشگفتہ پھول کی مانند تھا۔
اور اب آہ! اس کے مرنے کے بعد
میرا دل سرد ہو چکا ــــ میرے دل میں کوئی آرزو نہیں مجھے اچھی
کوئی چیز نہیں بھاتی! خوشی میرے لئے غم کا پیام لاتی ہے، اور خون کے
آنسو رلاتی ہے۔
اس لئے اے لوگو!
حسن و محبت کا تذکرہ نہ کرو
مجھے اس کے تذکرے سے اس کی محبت کی بہار آفریں راتیں، اور
دل خوش کن ایام یاد آتے ہیں۔
وہ وقت یاد آتا ہے جب وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دیتا
تھا، اور اس کی تبسم ریزی میری کائنات دل میں ہنگامہ برپا کر دیتی تھی
وہ مسرت کے نورانی لمحے یاد آتے ہیں جب ہم دونوں بہار کی شاخ
افزا راتوں میں چمن میں آزادانہ پھرا کرتے تھے
اسوقت چاندنی اس طرح پھیلی رہتی تھی جیسے نور کا دریا بہہ رہا ہو،
اور خوشگوار ہوائیں ہمیں مس کرتی تھیں، اور ہم بے انتہا مسرور ہوتے تھے
اور اسوقت حسن کی سب ادائیں میرے لئے مکشف ہوتی تھیں
مگر آہ! اب وہ دن بیت گئے۔
اب اس کا حسین چہرہ کبھی نظر نہ آئے گا!
اس لئے لوگو! حسن و محبت کا تذکرہ نہ کرو
حسن و محبت کا تذکرہ میرے کانوں میں تیر بن کر چبھ جاتا ہے
بس! بس!
اب مجھ میں سننے کی تاب نہیں۔

سنگدل حسینہ

از جناب ملک فضل امام صاحب شیدا کیموری۔ پٹنہ

اے سلح بند نوجوان! تو افسردہ و تنہا کیوں بھٹکتا پھرتا ہے
تیرا چہرہ غم سے کیسے کے پتے کی طرح پیلا پڑ رہا ہے
بہار گذر چکی، جیل کے کنارے کی سرسبز گھاس کا مخملی فرش خشک ہو گیا
پرندے اپنا نغمہ ختم کر چکے ہیں۔
آہ! اے بدبخت و ناشاد انسان تیرے پژمردہ چہرہ پر رنج و غم
کے یہ آثار کیوں ہیں؟
دنیا مسرور و شاد کام ہے۔ گلہری نے سال بھر کے لئے دانے کا
ذخیرہ جمع کر لیا، کسان اپنی فصل کاٹ چکے ہیں۔

تیری پیشانی کے کنول کا رنگ فق ہوا جاتا ہے اور اس پر اندوہ یاس کی اداسی پڑی ہوئی ہے۔ تیرے عارض گلگوں خزاں رسیدہ پھول دیکھتے دیکھتے نذر خزاں ہوئے جا رہے ہیں۔

مرغزار میں ایک حسین خاتون میری نگاہوں کے سامنے آئی۔ اسکی نظر سے شراب کی سی نشہ نشہ بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ جن سے روح میں سیکڑوں سرور کی لطیف کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ایک تصویر تھی رقصاں ——— ایک مجسمہ تھی تبسم۔

میں نے اسے اپنے سبک رفتار گھوڑے پر بٹھا لیا۔ تمام دن وہ میری رفیق سفر رہی اور مجھے اسکے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ وہ گھوڑے پر کبھی ایک طرف جھکتی اور کبھی دوسری طرف۔ اور پرندوں کا سا کوئی نغمہ چھیڑتی۔

میں نے اس کے سر کے لئے پھولوں کا تاج بنایا۔ اس کے ہاتھوں کے لئے پھولوں کے گجرے اور اسکی کمر کیلئے پھولوں کا ایک پٹکا۔

جب وہ میری طرف دیکھتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی ساری رعنائیاں سمٹ کر میری آنکھوں ہی آنکھوں میں آگئی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں محبت کا رس بھرا ہوا۔ اور وہ میٹھے میٹھے نغمے ملند کر رہی ہے اس نے مجھے خود و پھول پھل، میٹھا میٹھا شہد اور جنگل کی قدرتی نعمتیں لا کر دیں۔ اور یقیناً میں نے آنکھوں کی عجیب و غریب زبان سے یہ بھی کہا کہ مجھے تم سے سچی محبت ہے۔

وہ مجھے اپنے پریوں کے مسکن میں لے گئی۔ جہاں اس نے مجھ پر اپنی پرشوق نگاہیں جما دیں اور لمبی لمبی سرد آہیں بھریں۔

میں نے اسکی غمگین اور وحشی آنکھوں کو نرمی سے بند کیا اور انکو چوم۔ چوم کر اسے سلا دیا۔

پھر ہم گھاس کے فرش پر اداس لیٹے رہے اور آہ اس پہاڑ کی ٹھنڈی زمین پر میں نے وہ آخری خواب دیکھا ——— جس کے بعد میری آنکھیں ہمیشہ کے لئے نیند سے محروم ہو گئیں۔

مجھے زرد رو بادشاہ، شہزادے اور سپاہی نظر آئے۔ ان سب کے چہروں پر موت کی سی زردی چھا رہی تھی۔

وہ بے باک زبان کہہ رہی تھی کہ سنگدل حسینہ نے تجھے اپنا حلقہ بگوش بنا لیا ہے۔ میں نے ڈوبتے ہوئے سورج میں اس کے ہونٹوں کو دیکھا جن پر پیٹرول جمی ہوئی تھی۔

میں چونک کر اٹھا اور میں نے اپنے آپکو پہاڑ کی ٹھنڈی زمین پر۔ یک و تنہا پایا یہی وجہ ہے کہ میں نے یہاں ڈیرہ ڈال رکھا ہے اور افسردہ و تنہا عشق پھرتا ہوں۔ حالانکہ جھیل کے کنارے کی سرسبز گھاس خشک ہو گئی ہے۔ اور پرندے اپنا نغمہ ختم کر چکے ہیں۔

(کیٹس)

کیوپڈ

ازجناب ملک ولی امام صاحب شباب کیرودی۔ پٹنہ

میں گہری نیند کی ان عمیق ترین گہرائیوں میں پڑی تھی جن سے میں پہلے آشنا نہ تھی کہ ایک عریاں لڑکے نے آکر میرے دروازہ کو کھٹکھٹایا اور ایک شور برپا کر دیا۔

وہ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ باہر بادل گرج رہے تھے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اور بجلی بار بار چمکتی تھی۔ میرا بھولا دل بہت نرم واقع ہوا ہے۔ میں نے دروازہ کھول دیا اور وہ لڑکا اپنے کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

میں نے اس سے اس کا نام دریافت کیا لیکن اس نے کہا کہ میں اپنا نام بھی بتا نہ سکوں گا۔ ابھی میں سردی سے کانپ رہا ہوں۔ مجھے آگ کی ضرورت ہے جو میرے جسم کو گرما دے۔ میں بالکل بھیگ رہا ہوں۔

وہ اپنی کمان کو نہایت احتیاط سے اٹھائے ہوئے تھا۔ اور اسے ڈر تھا کہ کہیں بارش نے اسکی تانت کو خراب نہ کر دیا ہو۔

وہ کانپ رہا تھا اور مجھ سے آنکھیں نہ ملاتا چاہتا تھا۔ میں نے اسکے سر دی سے ٹھٹھرتے ہوئے ننھے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ مادر کہا یہ بچہ ہی ہے۔ مگر کی کون سی بات ہے۔

لیکن اس لڑکے نے شوخی سے اپنے سر کو اس طرح حرکت دیا کہ اسکے دلکش لیکن سنہری بال اڑ کر جھڑ سے گئے۔ اور گوری گوری پیشانی نظر آنے لگی۔ اس نے اپنے ترکش سے ایک دل آویز تیر نکالا۔ اور پھر خطا نہ ہونیوالے نشانے سے میرے سینہ پر کھینچ مارا۔

او ظالم اور بے وفا لڑکے تیرا خوفناک اور زہرناک بخش نام میں جانتی ہوں۔ آہ! یہ تو نے میری مہربانی کا اجر دیا ہے۔ شوخ و بیتاب شرارت آمیز ہنسی کے ساتھ بولا۔

طوفان کی ان شورشوں کے باوجود جنکی اسوقت وضاحت کرنا میری کمان محفوظ ہے۔ لیکن اے بھولی لڑکی کیا تو کہہ سکتی ہے کہ تیرا دل بھی محفوظ ہے؟

(انگریزی سے)

نوادر:- عکس وصلی تحریر نمودہ حضرت سیدنا شاہ اکرام الدین احمد صاحب عرفانی رئیس اسلام پور

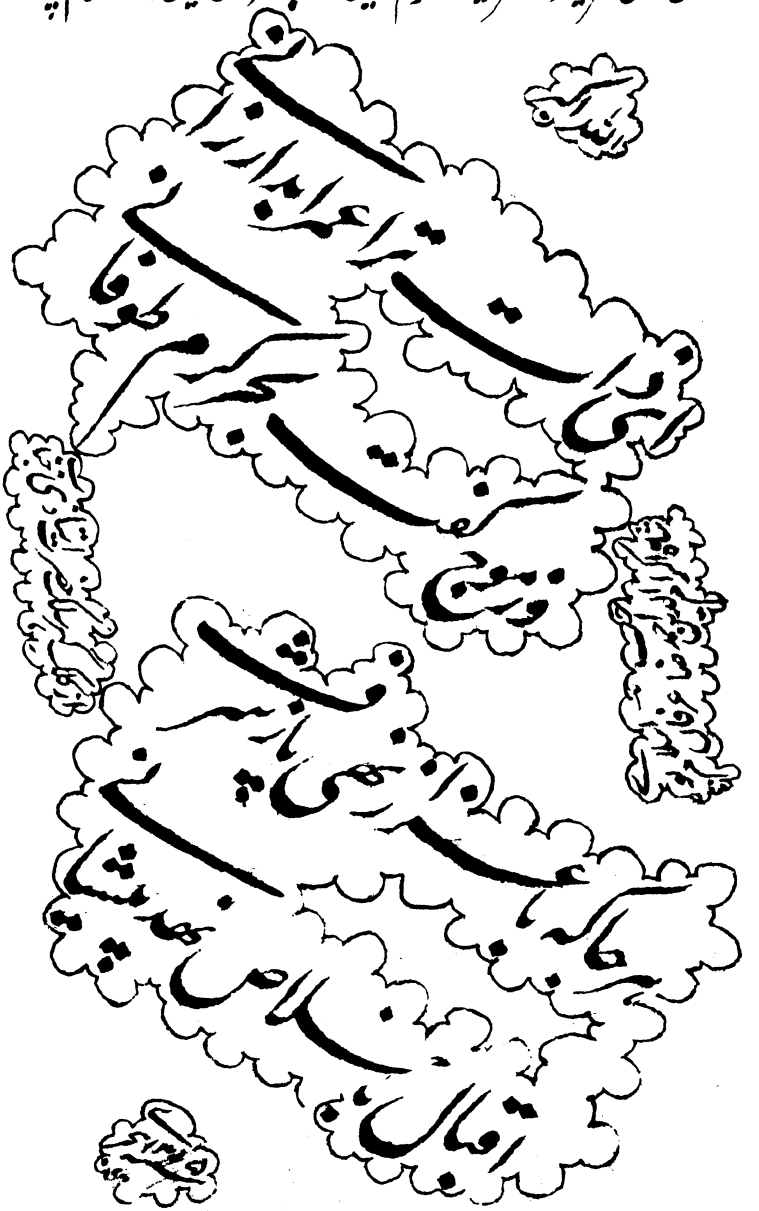

قند پارسی:-

گلگونۂ شفق

جناب شفقؔ کے سوانح میں موصوف کی خوشطعلی کا ذکر آیا ہے۔ پہلے مناسب نظر آیا کہ موصوف کی غزل کو موصوف کے عکس تحریر کیساتھ پیش کیا جائے۔
(ندیم)

غزل تازہ در زمین تازہ از ناچیز شفق بے خبر
برائے نذر سخنور فرخندہ سیر جناب حسن دالؔ گہر

زنگِ چمن از جوشِ بہاراں خبرم داد — دامانِ گل از چاکِ گریباں خبرم داد
ما و کبِ تو جنبشِ مژگاں خبرم داد — قربانِ نگاہیکہ بہ پیکاں خبرم داد
از سیلِ بلا دیدۂ گریاں خبرم داد — دریا شد و ہر قطرہ ز طوفاں خبرم داد
ہر آبلۂ اشک فشانِ کفِ پایم — از تشنگیِ خارِ مغیلاں خبرم داد
ہر ذرۂ خاکِ من سرگشتہ و حیراں — از گردِ جنوں خیزِ بیاباں خبرم داد
خاکسترِ دل یافت ز پروانہ فروغے — سوزِ جگرم از شمعِ شبستاں خبرم داد
با وسعتِ اندیشۂ دلِ تنگ من آخر — صحرا شد و از گوشۂ زنداں خبرم داد
خورشیدِ جمالِ تو سرِ عرصۂ محشر — بے پردہ ز حسنِ رخِ تاباں خبرم داد
وارفتگی از آئینۂ حسنِ تو افزود — آشفتگی از زلفِ پریشاں خبرم داد
بیچارگیِ من خجل از چارہ گراں شد — دردِ دلم از منّتِ درماں خبرم داد
درکے بدل از ہجرِ تو بیتاب و تعلّاں کرد — جانے بلب از وصلِ تو جاناں خبرم داد
از گریۂ بیخوابیِ من پنجۂ مژگاں — گوہر بکفِ و اشک بدامان خبرم داد
داغے بجبیں بر درِ بتخانہ نشستہ — از سجدۂ سنگِ درِ جاناں خبرم داد
چوں منفعلِ جرم و خطا دیدہ بہ محشر — لطفِ تو ز آمرزشِ عصیاں خبرم داد
نازم بہ عطائے نگہِ مست تو ساقی — در بیخبری از مےِ عرفاں خبرم داد

نیرنگیِ بخت شفقؔ اور دیکھئے
صبح وطن از شامِ غریباں خبرم داد

کلام حسنؔ

از جناب سید حسن امام صاحب حسنؔ رکن ادارہ شعبۂ منظومات "ندیم"

سرگشتگی از گردش دوراں خبرم داد — وز آبلہ پا خار بیاباں خبرم داد
از درس فسوں نرگسِ فتاں خبرم داد — وز مشق جنوں چاک گریباں خبرم داد
از سوز دلم سروِ چراغاں خبرم داد — وز سیل غمم گوشۂ داماں خبرم داد
از داغ غلامی ست ملکوعِ سرِ کنعانی — آسودگی از خواب پریشاں خبرم داد
تا راز اَنَا الحق بکسے باز نہ گویم — از نفس خودم مستیِ عرفاں خبرم داد
تاثیر عجب ریخت زچشمم دمِ آخر — یک قطرہ سرشکے کہ ز طوفاں خبرم داد
دامانِ ترم آتشِ شوقِ تو برافروخت — وز عفوِ تم لذتِ عصیاں خبرم داد
بدمست کہ بیہودہ دہد راز ز دل باز — از موجۂ گل گوشِ بہاراں خبرم داد
ہر خار کہ بوسید کفِ پائے تو نونم! — در دل ز خلشکاریِ پیکاں خبرم داد
پروانہ ہمراز رشکِ جگر سوزیِ من سوخت — وز داغِ دلم شمعِ شبستاں خبرم داد
ہنگامِ بہار آمد و بلبل بفغاں شد — آشفتہ بیانے چہ پریشاں خبرم داد
شد طائرِ جاں از قفسِ عنصری آزاد — خاموشیِ پرمعنیِ زنداں خبرم داد
صد دردِ سرافزود ز سامانِ مداوا — دردا کہ نہ از حاصلِ درماں خبرم داد

در جامِ شفق دوش حسنؔ خونِ جگر ریخت
ہنگامِ سحر سرگریباں خبرم داد

(ولہ)

طوفانِ بلا چشمِ پرآبِ دل ما ریخت — بر ساحلِ تمکین خود آبِ دل ما ریخت
جز چشمِ قبولِ تو لاک نداریم — ایں گوہرِ شہوارِ سحابِ دل ما ریخت
از شوقِ تو گبریلِ چناں گرم روی داشت — آمد شبِ معراج و شتابِ دل ما ریخت
اینک شبِ عصیان و سحرگاہِ کرامت — تعبیرِ زچشمِ تو بخوابِ دل ما ریخت
زیں تند خرامیِ براقِ شہِ کونین — سرمستۂ شوخی بشبابِ دل ما ریخت

معمورۂ پندارِ حسنؔ شد کفِ صحرا
ایں خانہ برانداز خرابِ دل ما ریخت

عکس تحریر حضرت شفق — چند حرف مزخرف از ننگ انام شفق رضوی برائے تمام

بر غزل لاجواب عالیجناب سید حسن امام صاحب وارثی

چون سوز غم عشق تو آبِ دلِ ماریخت — خونِ جگرِ ما بہ کبابِ دلِ ماریخت

مستی مے حسن تو آبِ دلِ ماریخت — از دیدۂ مخمور شرابِ دلِ ماریخت

عشق تو نہاں داشت چو سیلے بہ ترگاں — طوفاں بہ سرِ خانہ خرابِ دلِ ماریخت

ہیہات کہ چوں برگ خزاں دیدۂ زرصر — تازہ ورق غم ز کتابِ دلِ ماریخت

از دیدۂ خوبار چو کردند وضوئے — گلہا سرِ ترگاں بجوابِ دلِ ماریخت

تعمیر خرابات شد از پیکر خاکی — چوں روز ازل قطرۂ آبِ دلِ ماریخت

راز یکہ نہاں بود پس پردہ عیاں شد — حسن تو بیک جلوہ حجابِ دلِ ماریخت

شبہا صفتِ طالع بیدار زلیخا — تعبیر ہمہ مصر ز خوابِ دلِ ماریخت

ورقہ شفق آمیختہ بہ تیرگی دوراں
از بہر بیاض ننگ انام شفق ماریخت

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

از جناب خان بہادر نواب سید احمد علی خاں صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر رئیس عظیم آباد

یارے چنین ہمہ من کس نہ دیدہ ہیچ — با شد ز جبین تہ مو بدر دے رسیدہ ہیچ

ما را ہمہ دم آہ و بکا صبر و رضا ہیچ — او را ہمہ تن جور و جفا مہر و وفا ہیچ

باللہ چہ انگارم ز خد و ابرو خالش — ہیچست قمر پیچ ہلال است سہا ہیچ

در دست رخ او کہ بر آرش خورِ نثار است — وصف گل رخسار بجز صل علے ہیچ

واعظ کہ بہ بر دلق و بکف سبحہ دارد — در دل بودش پاس و را نوف خدا ہیچ

افسوس بر آں دل کہ براد نقش ولا نیست — سنگیست کہ آں را بہمانست بہا ہیچ

رو بہ چہ کند ز عم تقابل بہ عنصنفر — مکر است ورا فر بہ تن تاب و فا ہیچ

بے نور و لا تیرہ درونی بود انساں — دارد ہمہ تن شین ریا زین صفا ہیچ

چوں ماہ من اصلا نبود ماہ کہ ہر شب — بے پردہ بروں آید و در حشر حیا ہیچ

خورشید ہمی باشد بر آں شوخ کمن ناز — گو نام ذکا ہست ولے ذہن او ذکا ہیچ

دل صید کمند خم گیسوے بلند ست — در مخلصی اش کار کند بخت رسا ہیچ

از باد حوادث بہ خطر شمع حیاتست — اسباب فنا وافر و امید بقا ہیچ

ما را مرضے ہست کہ دارد نہ علاجے — در فعل دوا عاجز و تاثیر دعا ہیچ

ما جابل مخفیم و بلا وجہ شہیریم — گمنام بدن بہ کہ بود نشو و نما ہیچ

احمد بود ایں مصرع مشہور خورا — عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

قطعہ تاریخ وفات

حضرت سید شاہ حسین الدین احمد صاحب منعمی علیہ الرحمہ

از جناب سید ریاض حسن خاں صاحب خیال رئیس مظفر پور

حسین الدین احمد منعمی رفت — جہانے شد حزیں از فرقتِ او
زہے صوفی منش صافی نہادے — تعالی اللہ صفائے طینت او
نمایاں جلوۂ عرفاں ز رویش — درخشاں نور حق از طلعت او
جمال ظاہر و ہم حسن باطن — عیاں از صورت و از سیرت او
فیوض بوالعلا و شاہ منعم — شدے حاصل ز فیض صحبت او
بوقت چاشت در دیگر جمادی — بروز شنبہ ہم شد رحلت او
دعا این ست و تاریخ وصالش — منور باد الٰہی تربت او

۱۳۵۸ھ

دیگر

چوں حسین الدین احمد از جہاں — رخت برد و جا بہ علیین گزید
گفت تاریخ وصال او سروش — در جوارِ رحمتِ ایزد رسید

۱۳۵۸

قطعہ تاریخ طبع "بہار نمبر سنہ ۴۰ء"

از جناب خان بہادر نواب سید احمد علی خاں صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر رئیس عظیم آباد

ہزار شکر الٰہی ندیم یافت شیوع
بہ صوبہ ہائے بعید و بہ شہر ہائے قریب

بود رسالۂ سالانہ قابل تعریف
تو گفتی کہ بود شان آں عجیب و غریب

چہ بے عدیل مضامیں چہ بے مثیل اشعار
چہ اہتمام بلیغ و چہ احسن ترتیب

بود مدیر صحیفہ ریاست ندوی
فروغ بزم صحافت زہی ادیب لبیب

ز فیض او بہ گیا افتخار شد حاصل
بہار از ریاضش بود بہار نصیب

زند بہ کشور انشا مساعیش سکہ
بفیض احمد مختار و فضل رب مجیب

نوشت مصرع سالش دعایہ احمد
ندیم باد ندیم سخن شناس و ادیب

۱۳۵۹

فرمان عالمگیر (دیکھئے مضمون قلعہ رہتاس)

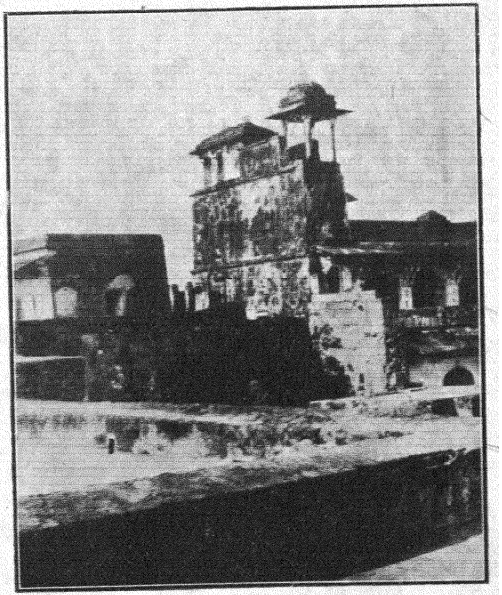

قلعہ رہتاس

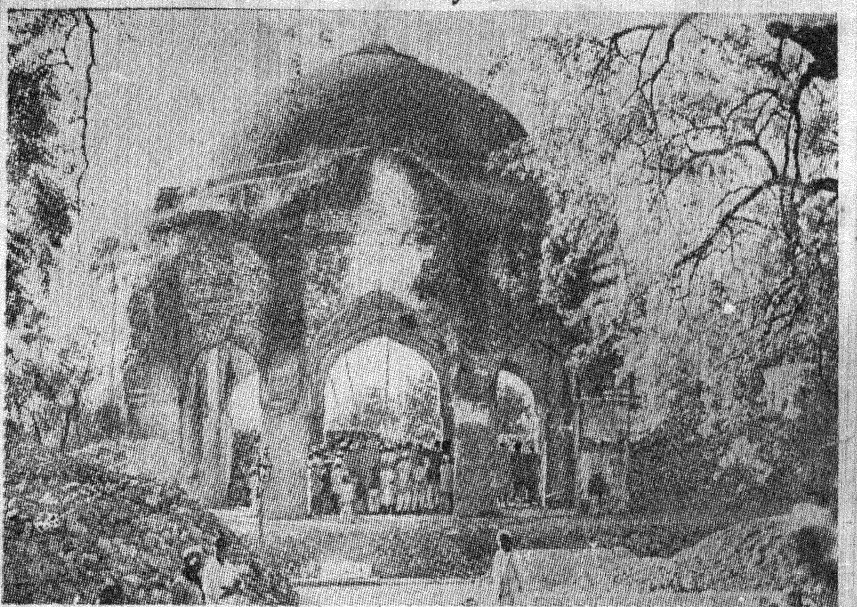

Post Graduate Library
College of Arts & Commerce, O. U.

مسجد شیر شاہ سنسل پورہ

OSMANIA UNIVERSITY
LIBRARY
HYDERABAD-7

بروضع شیر شاہ سوری